تکملہ

تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

للامام النواب محمد صدیق حسن خان القنوجی رحمہ اللہ

تالیف

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲۶۲-۱۳۴۰ھ)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل: محمد یحییٰ قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد پنجم

دار أبی الطیب للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ

نام کتاب: ———— تکملہ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ———— مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی

قیمت: ————

طبع اول: ———— جولائی 2021ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

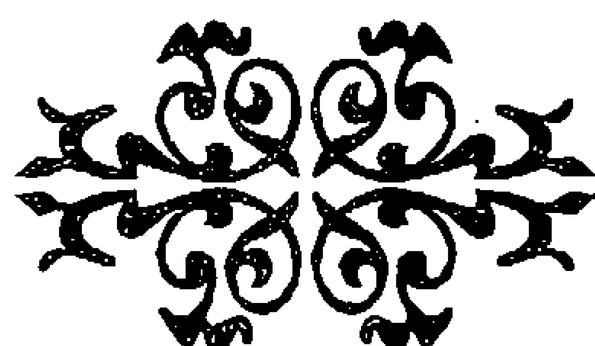
گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

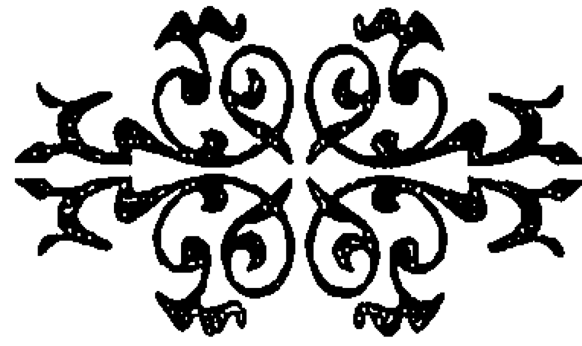
www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست



فہرست مضامین



بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عرضِ ناشر

بحمد اللہ تعالیٰ قبل ازیں والا جاہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی ''تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان'' کی چار جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جو پندرہ پاروں (سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف) کی تفسیر پر مشتمل ہیں اور صفحات کی مجموعی تعداد 4010 ہے۔ نواب صاحب مرحوم نے یہ تفسیر اسی قدر لکھی تھی کہ ان کی وفات (۲۹/ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۷ھ) ہوگئی، پھر اس تفسیر کا تکملہ ان کے قریبی شاگرد مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی نے لکھا۔

مولانا ذوالفقار بھوپالی ۲۲/ صفر ۱۲۶۲ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور ۲۲/ محرم ۱۳۴۰ھ کو بھوپال میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنے عہد کے اکابر علماء سے تحصیلِ علم کی جن میں ہندوستان اور حجاز کے نامور علماء شامل ہیں۔ پھر ساری زندگی تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ مختلف موضوعات پر اہم کتابیں تصنیف کیں جن میں ''المبتكر في المؤنث والمذكر''، ''طي الفراسخ في منازل البرازخ''، ''محاسن المحسنين في حكايات الصالحين'' اور ''الروض الممطور في تراجم علماء شرح الصدور'' نمایاں ہیں۔

مولانا نقوی کی علمی قابلیت اور تصنیفی صلاحیتوں کے پیشِ نظر نواب صاحب مرحوم نے ان کو اپنی نگہداشت میں لے لیا اور ان کی خصوصی تربیت کی جس کی بنا پر وہ والا جاہ مرحوم کی تصانیف کی تصحیح و مراجعت میں ان کا ہاتھ بٹاتے اور اسی کام میں ان کے شب و روز گزرتے۔ جب نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی تو ان کی اہلیہ نواب شاہ جہاں بیگم اور صاحبزادے نواب علی حسن خان نے انھیں تفسیر ترجمان القرآن کا تکملہ لکھنے کا فریضہ سونپ دیا جو انھوں نے بڑی عمدگی سے نبھایا، اس کی تفصیل ذیل کی سطور میں ملاحظہ کیجیے۔

- نواب صاحب مرحوم نے پہلے ایک جلد میں انتیسویں اور تیسویں پارے کی تفسیر لکھی، پھر سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکہف تک چھے جلدوں میں یہ تفسیر لکھی۔ یوں نواب صاحب مرحوم نے اس تفسیر کی صرف سات جلدیں ہی لکھی ہیں اور اس کا تکملہ (سورت مریم تا سورت تحریم) آپ کے شاگرد مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی نے لکھا ہے۔
- نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ میں اس تفسیر کا آغاز کیا تھا اور اس کی چھٹی جلد میں سورۃ الکہف کی تفسیر ۲/ رمضان ۱۳۰۶ھ کو مکمل کی۔ یوں آپ نے چار سال کے عرصے میں اس تفسیر کی سات جلدیں لکھیں۔ آپ کے بعد سورت تحریم تک اس کا تکملہ ان کے تلمیذِ رشید مولانا ذوالفقار احمد نقوی

بھوپالی رحمہ اللہ نے اسی انداز سے تالیف فرمایا، جس کی کیفیت خود موصوف نے ۲۸ ویں پارے کے آخر میں تفصیل سے لکھ دی ہے۔ انھوں نے ۲۳؍ صفر ۱۳۰۸ھ (۸؍ اکتوبر ۱۸۹۰ء) کو چہار شنبہ اور پنج شنبہ کی درمیانی رات کو اس کارِ خیر کا آغاز کیا اور ۱۵؍ ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ (اپریل ۱۸۹۸ء) کو آٹھ جلدیں لکھ ڈالیں۔ یہ مکمل تفصیل خود مولانا ذوالفقار بھوپالی نے اپنی تحریر کردہ تفسیر کی آخری جلد میں سورۃ التحریم کے آخر میں یوں لکھی ہے:

''الحمد لله والمنة کہ تفسیر سورۃ التحریم بروز جمعرات ۱۵؍ ذوالقعد ۱۳۱۵ھ کو محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی، اللہ سبحانہ قبول فرمائے۔ اس کے تمام ہونے سے ترجمان القرآن کی چودھویں جلد مکمل ہوئی۔ اب ترجمان کی پندرہ جلدیں ہوگئی ہیں۔ حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ نے ۱۳۰۲ ہجری سے ترجمان کا لکھنا شروع کیا تھا۔ فاتحہ سے لے کر سورۃ الکھف تک چھے جلدیں اور ایک جلد پارہ ''تبارک'' و پارہ ''عم'' کی لکھیں تو یہ سات جلدیں ہوئیں۔ سورت مریم سے سورت تبارک تک تیرہ پارے کی تفسیر باقی تھی۔ پس خاکسار ذوالفقار احمد۔ عفا الله عنه۔ نے بروز بدھ ۲۳؍ صفر ۱۳۰۸ھ سے تفسیر سورت مریم کا لکھنا شروع کیا تھا۔ اللہ پاک کے بے حساب احسان ہیں کہ اس نے محض اپنی حول وقوت سے آٹھ جلدیں لکھوا دیں۔''

اس سلسلے میں مولانا نقوی نواب صاحب مرحوم کی ترغیب وتحریض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شیخنا المرحوم صاحبِ ترجمان القرآن اکثر فرماتے تھے کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں، تفسیر کا لکھنا مجھ پر شاق گزرتا ہے۔ ذرا ذرا سے رسالے لکھنے میں جی لگتا ہے، اس لیے کہ وہ جلد تمام ہو جاتے ہیں۔ خاکسار سے فرماتے کہ تم لکھو۔ میں عرض کرتا کہ اللہ آپ کی عمر میں برکت دے، آپ ہی لکھیں گے تو فرماتے: بھائی ضعفِ قویٰ کے سبب اب ہم سے کچھ نہیں بنتا۔ جب مجھ پر زیادہ اصرار فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے کام سے فرصت نہیں ہے۔ ادھر ''مرآۃ النسوان'' لکھ رہا ہوں، آپ فلاں صاحب کو حکم دیں، وہ لکھیں گے۔ فرمایا: نہیں تم ہی لکھو۔

''جب میں نے سچے عذر پیش کیے تو میرے کہنے سے ان صاحب کو حکم دیا، انھوں نے بھی اپنے کاروبار کے سبب کچھ نہ لکھا۔ جب ''مرآۃ النسوان'' کے پچیس تیس اجزا تیار ہوئے تو ملاحظہ کے واسطے ان کی خدمت میں پیش کیے، انھوں نے دو دن میں سارے اجزا پڑھ لیے۔ پچھلے دن میں حاضر ہوا تو میاں عبدالحی صاحب مرحوم ان کے داماد بھی موجود تھے، فرمایا: میں نے ''مرآۃ النسوان'' کے سارے اجزا دیکھ ڈالے ہیں۔ بھائی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمان القرآن کو تمھی پورا کرو گے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ

آپ کو قوت دے، آپ ہی اسے پورا فرمائیں۔ فرمایا: بھائی! اب ہمارے قویٰ ساتھ نہیں دیتے۔ اس کے بعد بیمار ہوئے، پھر ایک مدت بیمار رہے اور وفات پا گئے۔"

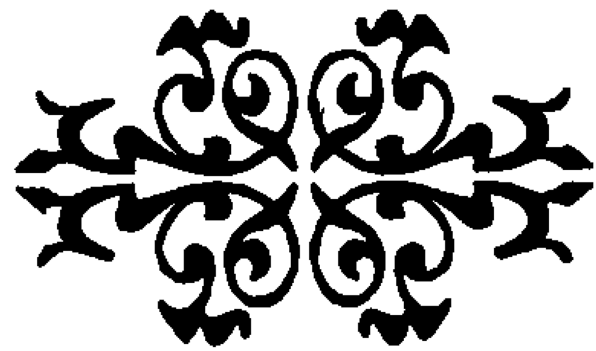
مولانا نقوی مزید لکھتے ہیں:

"(نواب صاحب مرحوم کی وفات کے) پانچ چھے ماہ کے بعد کسی صاحب نے تکمیلِ ترجمان کے واسطے سرکار عالیہ ۔دام اقبالھا۔ (ملکہ بھوپال) سے عرض کیا تو انہی کو لکھنے کا حکم ہوا۔ پھر سرکارِ عالیہ نے صاحبِ ترجمان کے فرزند جناب میر سید علی حسن خان صاحب (زاد قدرہ) سے ذکر فرمایا تو انھوں نے میری اطلاع کے بغیر میرا نام تجویز کر دیا، پھر میرے نام یہ قرعہ نکل آیا تو مَیں سمجھا کہ یہ شیخنا المرحوم کی پیشین گوئی کا ظہور ہے، پھر میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے ۲۳/صفر ۱۳۰۸ھ سے لکھنا شروع کیا۔ اللہ پاک نے محض اپنی حول وقوت اور فضل و کرم سے ۱۵/ ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ کو یہ تکملہ آٹھ جلد میں تمام کر دیا۔" (ترجمان القرآن: ۱۴/ ۳۶۸)

مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی نے اپنے تکملے میں جن سورتوں کی تفسیر لکھی ہے، ہر سورت کی تفسیر کا الگ نام رکھا ہے، جیسا کہ تفسیر سورۃ التحریم کے آخر میں مذکور ہے۔ ان سورتوں کی تعداد ۴۸ ہے۔

بنا بریں اب آیندہ یہ تفسیر "تکملہ تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان" کے نام سے شائع ہوگی جو چار یا پانچ جلدوں میں منظرِ عام پر آئے گی اور آخری جلد دو (۲۹ و ۳۰) پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہوگی جو نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ ہی کی تحریر کردہ ہے۔ ان شاء اللہ.

اللہ تعالیٰ اس عظیم کتاب کے مولف و تکملہ نگار اور اس کی طباعت و اشاعت میں شریک تمام معاونین کو اجرِ جزیل عطا کرے اور روزِ آخرت بلندیِ درجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین.



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

محترمی ومخدومی حکیم عبدالمجید رحمہ اللہ کے ساتھ ہمارے والد محترم حافظ محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ کے بڑے گہرے اور بے تکلفانہ تعلقات تھے، اس لیے محترم حکیم صاحب میرے ساتھ بڑی محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ عموماً جب میں سعودی عرب سے سال بعد پاکستان آتا تھا ایک بار اُن کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ وفات سے تین چار سال قبل محترم حکیم صاحب رحمہ اللہ کے دل میں والا جاہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی تالیفات کو حیاتِ نو بخشنے کی سوچ پیدا ہوئی اور وہ اس کے لیے بڑے پرعزم تھے، لیکن داعیٔ اجل نے انھیں مہلت نہ دی۔ 31 جنوری 1990ء کو وہ اپنے مالک حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ اللھم اغفرله وارحمه رحمة واسعة.

محترم حکیم صاحب کی وفات کے بعد ان کی لائق فائق اور قابلِ قدر اولاد نے اپنے محترم والد صاحب رحمہ اللہ کے خواب کو عملی شکل دینے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے طویل محنتِ شاقہ کے بعد انھیں کامیابی عطا فرمائی۔ آخری مرحلہ طباعت کا تھا جس کے اسباب اور لوازمات مہیا کرنا ایک بہت کٹھن اور مشکل مرحلہ تھا۔ اس عظیم الشان اور بابرکت کارِ خیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے گوجرانوالہ کے معروف اشاعتی ادارہ ''دار ابی الطیب'' کا انتخاب فرمایا۔ ''دار ابی الطیب'' برصغیر ہند و پاک کے مشاہیر علمائے اہلِ حدیث کی 70 سے زائد تصنیفات اور نوادرات بہترین معیارِ طباعت کے ساتھ شائع کر چکا ہے جس کے لیے ادارے کے کارپردازان یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں جن میں فضیلة الشیخ فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ، محترمی ومکرمی عزت مآب مولانا عارف جاوید محمدی صاحب اور ہمارے واجب الاحترام بھائی حافظ شاہد رفیق سرفہرست ہیں۔ فجزاهم الله عن الإسلام والمسلمين أحسن الجزاء.

''دار ابی الطیب'' والا جاہ نواب صاحب کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کی پہلی چار جلدیں، جو پندرہ پاروں پر مشتمل ہیں، نہایت اعلیٰ اور معیاری طباعت کے ساتھ شائع کر چکا ہے۔ محترم حکیم عبدالمجید رحمہ اللہ کے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر مجھے جس قدر مسرت اور خوشی ہوئی، اس کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کارِ عظیم کو موصوف کے لیے اور ان تمام حضرات کے لیے جنھوں نے ابتدا سے لے کر آخر تک کسی نہ کسی طرح اس میں حصہ لیا ہے، صدقہ جاریہ بنائے اور دار ابی الطیب کی مسلک اہلِ حدیث کی خدمت میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

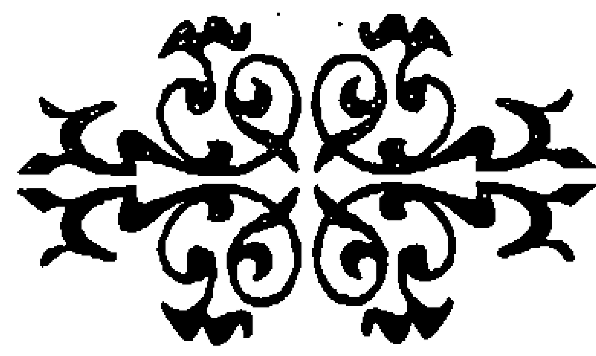
امید ہے ''دار ابی الطیب'' مستقبل قریب میں ''ترجمان القرآن کے باقی پندرہ پارے بھی زیورِ طبع سے آراستہ کر دے گا۔

''دار ابی الطیب'' کی تمام مطبوعات اسلامی تعلیمات اور دینی معلومات کا پیش بہا خزانہ ہیں، لیکن ان میں سے دو کتب ''ترجمان القرآن'' اور ''دبستانِ نذیریہ'' شائع کر کے ''دار'' نے اہلِ علم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ ''دبستانِ نذیریہ'' (دو جلدیں) میں گراں قدر مولف محترم مولانا محمد تنزیل صدیقی حسینی صاحب نے سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی 62 سالہ تعلیمی، تدریسی اور تبلیغی خدمات کا ذکرِ خیر کیا ہے اور ان کے 148 نامور تلامذہ کے حالات اور خدمات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ہمارے دینی مدارس کے طلباء کے علاوہ (معذرت کے ساتھ) واجب الاحترام اساتذہ کرام کے لیے بھی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے میری ناقص رائے میں کم از کم یہ دونوں کتب وطنِ عزیز کے تمام اہلِ حدیث مدارس کی لائبریریوں کی زینت بنی چاہییں، تاکہ طلباء اور اساتذہ کرام دونوں ان سے استفادہ کر سکیں۔

والسلام

محمد اقبال کیلانی

18 اکتوبر 2020ء



سورت مریم

سورت مریم کا نزول اور دربارِ نجاشی میں تلاوت:

اس سورت میں اٹھانوے یا ننانوے آیات ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ مکہ میں اتری ہو گی۔ عبداللہ بن الزبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔[1] تفسیر بیضاوی میں ہے کہ سوائے آیتِ سجدہ کے۔ جلالین میں ہے سوائے اس کی آیتِ سجدہ کے سو وہ مدنی ہے، یا مگر ﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ﴾ دو آیت تک۔[2]
ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نجاشی نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تیرے پاس اس چیز میں سے کچھ ہے جو وہ لائے ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ جعفر نے اس پر ﴿ كٓهٰيٰعٓصٓ ﴾ کے شروع کا حصہ پڑھا، نجاشی رو دیا، یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی اور اس کے روسائے دین، یعنی پادری لوگ بھی روئے یہاں تک کہ انھوں نے اپنے مصاحف کو تر کر دیا جب انھوں نے اس چیز کو سنا جو ان پر پڑھی گئی تھی۔ پھر نجاشی بولا کہ بے شک یہ اور وہ چیز جس کو عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں ایک ہی طاق سے نکلی ہیں۔ (أخرجه أحمد و البيهقي و ابن أبي حاتم) امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اس قصے کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[3]

اس تفسیر کی پہلی جلد میں یہ بات گزر چکی ہے کہ سورتوں کے نام اور ان کی ترتیب اور آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے، یعنی شارع علیہ السلام کے بتانے پر موقوف ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے سورتوں کا نام رکھے یا ان کی اور آیتوں کی ترتیب بدلے۔ کوئی عورت اپنے نام کے ساتھ قرآن شریف میں صریحاً ذکر نہیں کی گئی مگر مریم علیہا السلام کہ قرآن پاک میں تیس جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝۱ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝۲ اِذْ نَادٰى
رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝۳ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ
الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝۴ وَاِنِّيْ خِفْتُ

[1] الدر المنثور (٥/ ٤٧٦) فتح القدير (٣/ ٤٤٢)
[2] تفسير الجلالين (١/ ٣٩٦)
[3] مسند أحمد (١/ ٢٠١) شعب الإيمان (١/ ٩٣) اس کی سند حسن ہے۔

الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖۗ
وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

کٓھٰیٰعٓصٓ ① (یہ) آپ کے رب کی اپنے بندے زکریا پر رحمت کا ذکر ہے ② جب اس نے اپنے رب کو نہایت آہستہ آواز سے پکارا ③ اس (زکریا) نے کہا: اے میرے رب! بے شک میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں، اور میرا سر بڑھاپے (کی سفیدی) سے بھڑک اُٹھا، اور اے میرے رب! میں تجھ سے دعا کر کے کبھی محروم نہیں رہا ④ اور بے شک میں اپنے پیچھے قرابت داروں سے ڈرتا ہوں، اور میری بیوی بانجھ آرہی ہے، چناں چہ تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر ⑤ جو میرا وارث بنے اور آلِ یعقوب سے وارث بنے اور اے میرے رب! تو اسے پسندیدہ بنا ⑥

حروفِ مقطعات سے متعلق بحث:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ کٓھٰیٰعٓصٓ ﴾ کا مطلب کبیر، ہاد، امین، عزیز، صادق ہے، یعنی کاف سے مراد کبیر ہے، ہا سے ہادی، یا سے امین، عین سے عزیز، صاد سے صادق۔ یعنی اللہ تعالیٰ بڑا ہدایت کرنے والا امانت دار غالب اور سچا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ ہجاء مقطع یعنی حروفِ مقطعات ہیں۔ کاف مِلک کا ہے، ہا اللہ کا، یا اور عین عزیز کا، صاد مصور کا۔[1] اُم ہانی رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاف ہاد، عالم، صادق، یعنی کفایت کرنے والا راہ بتانے والا دانا سچا ہے۔[2] سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے: "یا کھیعص اغفرلي"[3] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما "کٓھٰیٰعٓصٓ"، "حٰمٓ"، "یٰسٓ" اور ان جیسے الفاظ کے حق میں کہا کرتے تھے کہ یہ اللہ کے اسمِ اعظم ہیں۔[4] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا تیسرا قول اس طرح مروی ہے کہ یہ ایک قسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی اور یہ اللہ کے اسماء سے ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔[5] کسی نے کہا کہ یہ سورت کا نام ہے۔

① تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۳۷، ۱۴۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳۹۶)

② الدر المنثور (۵/ ۴۷۸) اس کی سند میں "محمد بن سائب کلبی" سخت ضعیف راوی ہے۔

③ تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۴۱) اس کی سند میں "ابوبکر ہذلی" سخت ضعیف راوی ہے۔

④ فتح القدیر (۳/ ۴۴۸) ⑤ تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۴۱۔ ۱۴۲)

کلبی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ ایک ثنا ہے کہ اللہ نے اس کے ساتھ اپنی ذات پر ثنا کی ہے۔[1] ایسے کلمات میں جیسا اختلاف صحابہ رضی اللہ عنہم میں واقع ہوا ہے ویسا ہی اختلاف ان کے بعد کے لوگوں میں بھی واقع ہوا ہے۔ اس بارے میں کوئی شے مرفوعاً صحیح نہیں۔ اس بارے میں بعض صحابہ سے اگر کچھ روایت کیا گیا ہے تو ان کے علاوہ دوسروں سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔ ایک ہی صحابی سے انھیں فواتح، یعنی سورتوں کے ابتدائی کلمات کے بارے میں، متناقض تفسیریں بھی روایت کی گئی ہیں۔ پس ان میں سے کسی شے کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی، بلکہ اس بارے میں حق یہ ہے کہ توقف کریں اور اس جیسی باتوں میں علم کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹائیں۔ اسی لیے تفسیر جلالین میں یوں کہا ہے کہ ”اللّٰه أعلم بمراده بذلك“[2] یعنی اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی مراد اس سے کیا ہے۔ خطیب نے کہا ہے کہ یہ اس متشابہ سے ہے کہ جس کا علم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو ہے، وہی جانتا ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اس کی مزید تحقیق سورت بقرہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

زکریا علیہ السلام کی بیٹے کے لیے دعا:

یعنی دل میں دعا کی یا اکیلے مکان میں پکارا ہو۔ پوشیدہ پکار اس لیے کہ بوڑھی عمر میں بیٹا مانگتے تھے، اگر نہ ملے تو لوگ ہنسیں گے۔ بڑھاپے کی وجہ سے سر بھڑک اُٹھا ہے یعنی بال سفید ہو گئے ہیں۔ قرابت والوں کا ڈر، یعنی بھائی بند نیک راہ نہ بگاڑیں، یہ ڈر ہوگا۔ اللہ نے ان کو ان کا اور اگلے پیغمبروں کا قائم مقام بنایا، لیکن روبروہی قائم مقام ان کے پیچھے نہیں رہا۔

﴿ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا﴾ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعنی یہ ذکر ہے اللہ کی اپنے بندے زکریا پر رحمت کا۔ یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ نے زکریا کو مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ مد اور قصر کے ساتھ دونوں قراءتیں مشہور ہیں۔ زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک عظیم نبی تھے۔ صحیح روایت میں ہے کہ وہ نجار (بڑھئی) تھے۔[3] یعنی اپنے ہاتھ سے کام کرتے اور روزی کما کر کھاتے تھے۔ ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ خفیہ دعا کرنے کی وجہ میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ اپنی دعا کو اس لیے پوشیدہ کیا تاکہ بڑھاپے میں لڑکا مانگنے کی وجہ سے رعونت کی طرف منسوب نہ ہوں۔ اس قول کو ماوردی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ دوسروں نے کہا کہ پوشیدہ دعا اس لیے کی کہ یہ اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اسی آیت کی تفسیر میں کہا ہے: ”إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ الْقَلْبَ التَّقِيَّ وَيَسْمَعُ الصَّوْتَ الْخَفِيَّ“ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو جانتا ہے اور چھپی آواز کو سنتا ہے۔[4]

بعض سلف نے یوں کہا ہے کہ زکریا علیہ السلام رات کو کھڑے ہوئے اور اُن کے اصحاب سو گئے تھے۔ پس اپنے رب

---

[1] الكشف و البيان (٦/ ٢٠٥) [2] تفسير الجلالين (١/ ٣٩٦)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٩) [4] تفسير الطبري (١٨/ ١٤٢)

کو پوشیدہ پکارنے لگے: یا رب! یا رب! یا رب! اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: ''لبیك لبیك لبیك''، یعنی میں تیری دعا قبول کرنے کو حاضر ہوں۔ زکریا علیہ السلام بولے: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ ﴾ یعنی اے میرے پروردگار! میرے قویٰ ضعیف اور کمزور ہو گئے ہیں۔ ﴿ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا ﴾ یعنی سفید بالوں نے سفیدی میں شعلہ مارا۔ اس سے مراد کمزوری اور بڑھاپے کی اور اس کی ظاہری اور باطنی دلیلوں کی خبر دینا ہے۔ ﴿ وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴾ یعنی میں تجھ سے دعا کی قبولیت ہی کا خوگر ہوں۔ جو میں نے تجھ سے مانگا تو نے کبھی مجھ کو اس میں مایوس نہیں کیا۔

﴿ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ ﴾ اکثر نے لفظ ''موالی'' کو مفعول ہونے کی بنا پر یائے تحتانی کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی سے یا پر جزم مروی ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا کہ موالی سے مراد عصبہ ہے۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد کلالہ ہے۔ امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ''خَفَّتِ الْمَوَالِي'' فا کی تشدید سے پڑھتے تھے، یعنی میرے بعد میرے عصبات کم ہو گئے۔[1]

پہلی قراءت کے مطابق اُن کے خوف کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات سے ڈرے کہ ان کے بھائی بند اُن کے بعد لوگوں میں برا تصرف کریں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے لڑکا مانگا کہ وہ اُن کے بعد نبی ہو، تاکہ اپنی نبوت میں وحی کے ساتھ ان کی راہنمائی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اس بات سے ڈرے کہ بھائی بند اُن کے مال کے وارث بن جائیں گے، کیوں کہ نبی کا مرتبہ اس سے عظیم تر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال کا یہاں تک خوف کریں کہ اپنے عصبات کے وارث ہونے سے عار و ننگ فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ ان کا لڑکا ہو، تاکہ وہ ان کی میراث کو بغیر بھائی بندوں کے اپنے قبضے میں لائے۔ یہ تو ایک وجہ ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بات ذکر نہیں کی گئی کہ زکریا مال دار تھے، بلکہ وہ تو بڑھئی تھے اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھاتے پیتے تھے۔ ایسا شخص مال جمع نہیں کرتا، خاص کر انبیا علیہم السلام کہ وہ تو سب سے بڑھ کر دنیا میں بے رغبت ہوتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کئی روایتوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم وارث نہیں کیے جاتے اور جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہوتا ہے۔[2] سنن ترمذی کی ایک روایت میں باسناد صحیح یوں مروی ہے کہ ہم خاص گروہِ انبیا کے وارث کوئی نہیں ہوتے۔[3] اس بنا پر ان کا یہ قول: ﴿ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ ﴾ میراثِ نبوت پر محمول ہوگا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ﴾ [النمل: ١٦] ''اور داود کا وارث سلیمان بنا۔'' یعنی نبوت میں، کیوں کہ اگر میراث مال میں ہوتی تو سلیمان علیہ السلام کو اُن کے

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ١٤٤۔ ١٤٥)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٩٢٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٥٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٦١٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٦٤) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٧٥٥٩)

بھائیوں کے درمیان نبوت کے ساتھ خاص نہ کرتا اور اس کی خبر دینے میں کوئی بڑا فائدہ نہ ہوتا، کیونکہ ساری شریعتوں میں یہ بات طے شدہ ہے کہ لڑکا اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے، پس اگر وہ کوئی خصوصی وراثت نہ ہوتی تو ہرگز اس کی خبر نہ دیتا۔ اس سب کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو صحیح حدیث شریف میں گزر چکی ہے: «نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ»[1] یعنی ہم خاص گروہِ انبیا وارث نہیں کیے جاتے، یعنی ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿ يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ ان کی وراثت علم تھا اور زکریا علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ ابو صالح نے کہا کہ نبی ہو جیسے کہ اس کے آباء نبی تھے۔ قتادہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے یوں روایت کیا ہے کہ ان کی نبوت وعلم کا وارث ہو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ میری نبوت کا اور آلِ یعقوب کی نبوت کا وارث ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ کی روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ "نبوتهم"، یعنی آلِ یعقوب کی نبوت کا وارث ہو۔ دوسری روایت میں ابو صالح سے یوں مروی ہے کہ وارث ہو میرے مال کا اور وارث ہو آلِ یعقوب سے نبوت کا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «يَرْحَمُ اللّٰهُ زَكَرِيَّا وَمَا كَانَ عَلَيْهِ مِنْ وَرَاثَةِ مَالِهِ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا إِنْ كَانَ لَيَأْوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ» امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مبارک بن فضالہ کے طریق سے حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «رَحِمَ اللّٰهُ أَخِيْ زَكَرِيَّا مَا كَانَ عَلَيْهِ مِنْ وَرَاثَةِ مَالِهِ حِيْنَ قَالَ: هَبْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوْبَ»[3] اس سب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میراث سے مراد مال کی میراث ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذه مرسلات لا تعارض الصحاح"، یعنی یہ حدیثیں مرسل ہیں، صحیح حدیثوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔ واللہ أعلم.

﴿ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے میرے رب! تو اس کو اُس کے دین اور اخلاق میں میرے نزدیک اور اپنے نزدیک اور اپنی مخلوق کے نزدیک پسندیدہ کر دے، تاکہ تو اس کو دوست رکھے اور اسے اپنی مخلوق کے لیے بھی دوست کر دے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ ﴿ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور وہ لفظ

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۴۵۔ ۱۴۷)

[3] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۴۶) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔ [4] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۴۹۔ ۱۵۱)

"هذا" ہے یا لفظ "المتلو"، یعنی یہ یا جوتم پر پڑھا گیا، وہ ذکر ہے۔ یحییٰ بن زیاد کا قول ہے کہ یہ خبر ہے حروفِ مقطعات کی۔ ابو البقاء نے کہا ہے کہ اس قول میں بُعد ہے۔[1] کسی نے کہا کہ یہ خود مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی "ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا فِيمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكَ" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ یہ جو ہم تم پر پڑھتے ہیں، تمھارے رب کا اپنے بندے زکریا پر رحمت کرنے کا ذکر ہے۔[2] رحمت مصدر مضاف ہے فاعل کی طرف جو ﴿ رَبِّكَ ﴾ ہے اور اس کا مفعول ﴿ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴾ ہے۔ رحمت سے مراد یہ ہے کہ جس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا اور اس سے لڑکا مانگا تو اُن کی دعا کو قبول فرمایا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ عَبْدَهٗ ﴾ ذکر کا مفعول ہے اور ذکر رحمت کے معنی میں ہے۔ بلوغ، یعنی رحمت کا پہنچنا، جیسے عرب کے محاورہ میں بولتے ہیں: "ذكرني معروف فلان"، یعنی پہنچی مجھ کو بھلائی اور عطا فلاں کی۔ اس محاورے کی بنا پر معنی یوں ہوں گے کہ یہ پہنچنا ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندے زکریا کو۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زکریا علیہ السلام نجار تھے۔[3] (أخرجه أحمد و أبو يعلىٰ و الحاكم و صححه) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل کے آخری نبی زکریا بن آزر بن مسلم تھے اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔[4] ﴿ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴾ "إذ" رحمت کا ظرفِ مکان ہے، یعنی رحمت کرنا اللہ کا زکریا پر، جس وقت کہ اپنے رب کو چھپی پکار سے پکارا جو دعا پر مشتمل تھی۔ ندائے خفی سے یہ مراد ہے کہ آدھی رات کے وقت پوشیدہ دعا کی، اس لیے کہ آدمی کی رات کے وقت دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ اس ندا کے پوشیدہ ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ پوشیدہ دعا اس لیے کی کہ یہ ریا سے دور تر ہے اور اخلاص کے قریب تر ہے۔ کسی نے کہا کہ اس لیے کہ اس غیر وقت میں لڑکا مانگنے پر ملامت نہ کیے جائیں اور اس لیے کہ لڑکا مانگنا اُمورِ دنیا میں سے ہے۔ کسی نے کہا کہ اپنی قوم کے خوف سے پوشیدہ دعا کی۔ کسی نے اس طرح کہا کہ وہ نہایت بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے، آواز سے دعا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ پچھتر یا اَسّی برس کے تھے یہ پکارنا محراب میں تھا۔

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ ﴾ یہ جملہ ﴿ نَادٰى رَبَّهٗ ﴾ کی تفسیر ہے۔ پس پکار کا پہلا قول یہی اور آخری قول ﴿ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴾ ہے۔ پوری پکار کے آٹھ جملے ہیں، ان میں سے اصل دعا یہ قول ہے: ﴿ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴾. ﴿ وَهَنَ ﴾ بمعنی ضعف ہے۔ "يُقَالُ وَهَنَ يَهِنُ وَهْنًا مِنْ بَابِ وَعَدَ إِذَا ضَعُفَ

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٤) [2] معاني القرآن (٣/ ٣١٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٩) مسند أحمد (٢/ ٤٠٥) مسند أبي يعلىٰ (١١/ ٣١١) مستدرك الحاكم (٢/ ٦٤٥)

[4] مستدرك الحاكم (٢/ ٦٤٥)

فَهُوَ وَاهِنٌ فِي الْأَمْرِ وَالْعَمَلِ وَالْبَدَنِ" یعنی وہن اس ضعف کو کہتے ہیں، جو امر و عمل و بدن میں ہوتا ہے۔ کلمہ وہن کو ہا کے زیر و زبر و پیش تینوں حرکتوں سے پڑھا ہے۔ زکریا علیہ السلام کی اس قول سے مراد یہ ہے کہ ان کی ہڈیاں بڑھاپے کی وجہ سے سست اور باریک ہوگئیں اور اُن کی قوت ضعیف ہوگئی۔

ہڈی کا ذکر اس لیے کیا کہ ہڈی بدن کا عمود اور ستون ہے اور اسی کی وجہ سے بدن کا قوام اور نظام ہے اور ہڈی ہی بدن کی بنیاد کی اصل ہے، سو جس وقت وہ سست پڑ جاتی ہے تو بدن کی قوت ساقط و بیکار ہو جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان میں سب سے بڑھ کر وہی مضبوط اور سخت ہے۔ پھر جب وہی کمزور وضعیف ہوگئیں تو جو اُس کے علاوہ ہے وہ زیادہ کمزور ہوگا۔ ﴿ اَلْعَظْمُ ﴾ بلفظ واحد کہا، عظام، یعنی بلفظ جمع نہ کہا۔ حالانکہ بڑھاپے میں ساری ہڈیاں کمزور پڑ جاتی ہیں، اس لیے کہ قصد جنس کا کیا ہے، جو ہڈیوں میں سے ہر ایک کے واسطے وہن اور ضعف ظاہر کرتی ہے۔ کسی نے کہا کہ انھوں نے ڈاڑھیں گرنے کی شکایت کی، یعنی یہاں ہڈی سے مراد ڈاڑھ ہے۔

﴿ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا ﴾ اشتعال اصل میں آگ کی شعاع منتشر ہونے کو کہتے ہیں۔ پس اس کے ساتھ سر کے بالوں کی سفیدی کو منتشر ہونے کی تشبیہ دی ان کی سیاہی میں۔ امرِ جامع یہاں سفیدی اور روشنی ہے، یعنی جیسے آگ کی شعاع منتشر ہوتی ہے، ویسے ہی بالوں کی سفیدی سیاہی میں منتشر ہوگئی۔ پھر اس کو استعارہ بالکنایہ کے مخرج میں خارج کیا، اس طریقے سے کہ مشبہ بہ کو اور آلۂ تشبیہ کو حذف کر دیا۔ یہ استعارہ تمام استعاروں سے زیادہ بدیع اور حسین ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ جس وقت سفید بال بہت ہو جاتے ہیں تو محاورے میں یوں بولتے ہیں: "قَدِ اشْتَعَلَ رَأْسُ فُلَانٍ" یعنی فلاں کا سر شعلے مارنے لگا،[1] غرض یہ کہ انتہائی سفید ہوگیا۔

﴿ وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴾ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "شقي بكذا" یعنی اس شخص نے اس کام میں محنت اور مشقت کی اور مقصود اس کا اس سے حاصل نہیں ہوا۔ معنی یہ ہیں کہ میں کسی بھی وقت خائب اور محروم نہیں رہا، بلکہ جب بھی میں نے تجھ سے دعا کی تو تو نے میری دعا کو قبول فرمایا۔ یہ قبولیتِ سابق کے ساتھ توسل ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اگرچہ مطلوب اور مقصود معتاد نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ان کی دعا کو قبول کرنا تو معتاد ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو دعا قبول کرنے کا خوگر بنا دیا ہے اور آرزومند کر دیا ہے۔ حق کریم کی یہ بات ہے کہ اپنے آرزومند کیے ہوئے کو محروم و بے نصیب نہیں کرتا۔ علما نے فرمایا ہے کہ آدمی کے لیے مستحب ہے کہ اپنی دعا میں خضوع و انکسار وزاری کرے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جو جو نعمتیں اس پر ہیں، ان کا ذکر کرے۔

ان سب امور کو اپنی دعا میں جمع فرمائے، جیسا کہ زکریا علیہ السلام نے یہاں کیا ہے، کیوں کہ ان کے گذشتہ قول میں انتہا درجے کا خضوع تذلل و عجز و انکسار ہے اور اپنے مطالب اور حاجات کو پا لینے اور حاصل کر لینے کے لیے اپنی

[1] معاني القرآن (٣/ ٣١٩)

کمزوری اور کمی کا اظہار ہے اور اس قول میں ذکر ہے ان پر انعام کرنے کا، ان کی دعاؤں کے قبول کرنے کے ساتھ، جس کا ان کو خوگر اور عادی بنا دیا ہے۔ اور دونوں جگہ میں ربوبیت کے وصف کو اس لیے پیش کیا ہے کہ تضرع و زاری میں مبالغہ کر کے اجابت اور قبولیت کی زنجیر کو ہلائیں۔

﴿ خِفَّتُ ﴾ کو خائے معجمہ کی زیر سے پڑھا ہے اور بعض کی قراءت تا فوقیہ کی زیر کے ساتھ ہے۔ اس بنا پر اس کا فاعل الموالی ہے۔ یعنی میرے بھائی بند قلیل ہو گئے ہیں اور میرے بعد امر دین کے ساتھ قیام کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں، یا یہ معنی ہیں کہ بسبب موت کے منقطع ہو گئے ہیں۔ یہ معنی "خفت القوم إذا ارتحلوا" سے ماخوذ ہیں۔ یہ قراءت شاذ ہے اور درست نہیں ہے۔ اس جگہ موالی سے مراد وہ اقارب ہیں جو وارث ہوتے ہیں اور تمام قریبی رشتہ دار مثلاً چچا کی اولاد وغیرہ ہیں۔ عرب لوگ ان لوگوں کو موالی بولتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ موالی سے مراد زکریا علیہ السلام کے ناصر و مددگار ہیں۔ کسی نے کہا کہ سارے ورثاء مراد ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ زکریا علیہ السلام کی بیوی کا نام اشاع بنت فاقود بن میل تھا اور وہ حنہ کی بہن ہیں اور حنہ مریم علیہا السلام کی والدہ شریفہ ہیں۔ پس اشاع سے یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور حنہ سے مریم متولد ہوئی۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ اشاع بنت عمران ہیں۔ پہلے قول کی بنا پر یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی خالہ کے فرزند ہوئے اور دوسرے قول کی بنا پر یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام خالہ زاد بھائی ہوئے، جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے۔[1] عاقر وہ عورت ہے جو زیادہ عمر کی ہونے کی وجہ سے بچہ پیدا نہ کر سکے اور اس عورت کو بھی کہتے ہیں جس کے کبر سن کے بغیر بھی بچہ نہ ہوتا ہو۔ یہاں یہی مراد ہے اور جس مرد کے بچہ نہیں ہوتا اس کو بھی عاقر بولتے ہیں۔

﴿ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴾ یعنی تو مجھے اپنے فضل سے ایک ولی دے، یعنی کاروبار اُٹھانے والا، کیوں کہ اس جیسے کی اُمید نہیں کی جاتی، مگر تیرے فضل اور تیری کمال قدرت سے۔ لڑکا مانگنے کی تصریح اس لیے نہیں کی کہ وہ اپنے طور پر جان چکے تھے کہ وہ اور ان کی بیوی ایسی حالت میں پہنچ چکے ہیں کہ اس لڑکے کا پیدا ہونا یا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ بعض نے کہا کہ وہ کچھ اُوپر نوے برس کے تھے۔ کسی نے کہا کہ ولی سے، جس کو انھوں نے طلب کیا، ان کی مراد وہ لڑکا ہے اور ان جیسا شخص اگر لڑکے کا سوال کرے تو اس سے کوئی مانع نہیں ہے، اس لیے کہ وہ خارقِ عادت (معجزہ) ہوگا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ایسے امر کے ساتھ کبھی اپنے رسولوں کا اکرام فرماتا ہے، پس یہ من جملہ اِن کے معجزات کے ہوتا ہے، جو ان کی سچائی اور راستی کی دلیل ہوتے ہیں۔

﴿ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ﴾ یعنی تو مجھے ایسا ولی عطا کر کہ وہ میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٤٧) فتح القدير (٣/ ٤٤٥)

دونوں فعل مرفوع پڑھے گئے ہیں، اس بنا پر کہ وہ دونوں ولی کی صفتیں ہیں اور دعا کا جواب نہیں ہیں، البتہ دعا کا جواب ہونے کی بنا پر جزم کے ساتھ بھی پڑھے گئے ہیں۔ پہلی قراءت کو ابو عبید نے ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ معنی کے لحاظ سے یہ قراءت زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ انھوں نے ایسا ولی طلب کیا کہ جس کی یہ صفت ہے۔ پس کہا کہ تو مجھے ایسا ولی عطا کر جو میرا وارث ہو۔ اس کو نحاس نے ترجیح دی ہے۔

وراثت سے یہاں علم و نبوت کی وراثت ہے۔ راجح قول یہی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یعقوب جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں۔ بعض کا گمان یہ ہے کہ یعقوب بن ماثان برادر عمران بن ماثان ہیں۔ کلبی و مقاتل اسی کے قائل ہیں۔[1] آلِ یعقوب سے مراد یعقوب کے خاص لوگ ہیں کہ جن کا امر ان کی طرف رجوع کرتا ہے قرابت اور رشتہ داری کے سبب سے یا صحبت و مصاحبت کی وجہ سے، یا ان میں موافقت دینے کے لیے۔ ان میں انبیا اور ملوک ہوئے ہیں۔ ایک قراءت "يَرِثُنِيْ وَارِثُ آلِ يَعْقُوْبَ" ہے اور دوسری "وَأَرِثُ آلَ يَعْقُوْبَ" بصیغہ متکلم ہے اور تیسری "أَوْ يَرِثُ آلَ يَعْقُوْبَ" ہے۔ اس بنا پر کہ یہ "يَرِثُنِيْ" کا مصغر فاعل ہے۔ یہ قراءتیں لفظ اور معنی کے لحاظ سے انتہائی شاذ ہیں۔

﴿ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴾ یعنی کر تو اس کو اے میرے رب! پسندیدہ اس کے اخلاق اور افعال میں۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ تو اس کو اپنی قضا اور قدر کے ساتھ راضی کر، یا اس کو صالح اور نیک مرد کر کہ تو اس سے راضی اور خوش ہو، یا اس کو نبی کر، جیسا کہ تو نے اس کے آباء کو نبی کیا ہے۔[2]

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ
قَبْلُ سَمِيًّا ۝

(اللہ نے فرمایا:) اے زکریا! بے شک ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں، اس کا نام یحییٰ ہے، ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی ہم نام نہیں بنایا ⑦

زکریا علیہ السلام کی دعا کی قبولیت اور فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ زکریا ہمزہ کے ساتھ یا ہمزہ کے بغیر دونوں سبعیہ (ساتوں) قراءتوں میں سے ہیں۔ جمہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ ندا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ کسی نے کہا کہ فرشتوں کی طرف سے۔ اس لیے کہ آلِ عمران میں یوں فرمایا ہے: ﴿ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ [آل عمران: ٣٩] "فرشتوں نے اسے آواز دی۔" یہ بات ہو سکتی ہے کہ ان کو دوبارہ خطاب واقع ہوا ہو ایک بار فرشتوں کے ذریعے سے اور دوسری بار بغیر کسی واسطے کے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٤٤٥) [2] فتح البيان (٨/ ١٣٤۔ ١٣٧)

یہاں کلام میں حذف ہے، یعنی "فَاسْتَجَابَ لَهُ دُعَاءَهُ فَقَالَ: يَا زَكَرِيَّا" یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی۔ پھر کہا: اے زکریا! ہم تجھ کو ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں۔ اس بشارت اور لڑکے کے وجود میں آنے میں تیرہ برس کا زمانہ تھا، اس لیے کہ زکریا علیہ السلام کا لڑکا مانگنا اور اس کی خوش خبری پانا، مریم کے لڑکپن میں تھا اور وہ اُن کی کفالت اور پرورش میں تھیں اور یحییٰ علیہ السلام کا حمل عیسیٰ علیہ السلام کے حمل کے قریب ہی تھا اور مریم علیہا السلام اس وقت تیرہ برس کی تھیں اور اشاع کو چھ مہینے پہلے حمل ہوا، جس سے یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، اس کے بعد مریم علیہا السلام کو عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ہوا۔ سورت آلِ عمران میں یحییٰ علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام کے نام رکھنے کی وجہ گزر چکی ہے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یحییٰ علیہ السلام اس لیے نام رکھا کہ علم کے ساتھ زندہ ہوئے اور حکمت کے ساتھ جو اُن کو دی گئی۔[2] کلمہ یحییٰ غیر منصرف ہے بسبب علمیت و عجمہ کے، اس کا تثنیہ رفعی حالت میں یحییان اور نصبی و جری حالت میں یحیین ہے۔ اور جمع سالم حالت رفعی میں یحیون اور نصبی و جری حالت میں یحیین ہے۔ سمّی بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یعنی مسمّی یحییٰ۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اُن سے پہلے کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کے واسطے مثل اور نظیر نہیں کیا، یعنی ان کی مثل کسی کو نہیں کیا۔[3] اس معنی پر لفظ سمی مساماۃ یا سمو سے ماخوذ ہوگا۔ یہ قول رد کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ مقتضی ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ کسی بانجھ عورت نے اُن کی مثل بچہ نہیں جنا۔ پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو یہ خبر دی ہے کہ ان سے پہلے کسی کا یہ نام نہیں رکھا، سو اس میں دو طرح سے یحییٰ کی فضیلت ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی ان کا نام رکھنے کا متولی ہوا اور اس کو ماں باپ کے سپرد نہیں فرمایا اور بالخصوص ان کا نام یحییٰ علیہ السلام رکھا، اس لیے کہ ان کی ماں کا رحم ان سے زندہ ہوگیا، اس کے بعد کہ بانجھ ہونے کی وجہ سے مردہ ہو چکا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا ایسا نام رکھنا جو کسی اور کا نہیں رکھا گیا، اُن کے شرف اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ایسی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ﴾ (آیتِ باب) جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿38﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَھُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢـا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٣٨۔ ٣٩] "وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، کہا: میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا کر، بے شک تو ہی دعا

[1] رقم الآية [٣٩] [2] معاني القرآن (٣/ ٣٢٠) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٩٩) [4] فتح البيان (٨/ ١٣٨)

سننے والا ہے۔ پھر جب وہ حجرے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا تو فرشتوں نے اسے آواز دی: بے شک اللہ تجھے یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے، وہ اللہ کے ایک کلمے (عیسیٰ) کی تصدیق کرے گا اور سردار اور پارسا اور نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔'' قولہ ﴿ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴾ یعنی ہم نے اُن سے پہلے اس نام کا کوئی اور نہیں کیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''سميا أي شبيها''، یعنی سمی کے معنی شبیہ ونظیر کے ہیں۔[1] اس قول کو ﴿ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ [مریم: ٦٥] ''تو اسی کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر جم جا، کیا تیرے علم میں اس کا ہم نام ہم پلہ کوئی اور بھی ہے؟'' ''أي شبيها'' کے معنی سے لیا ہے۔

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بانجھ عورتوں نے اُن سے پہلے اُن کی مثل نہیں جنا۔[2] یہ اس بات پر دلیل ہے کہ زکریا علیہ السلام کے بچہ نہیں ہوتا تھا اور اس طرح اُن کی بیوی بھی اپنی شروع عمر سے بانجھ تھیں۔ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام کے برعکس کہ انھوں نے اسحاق علیہ السلام کی بشارت سے جو تعجب کیا تھا، سو یہ تعجب ان کے بڑھاپے کی وجہ سے تھا نہ کہ اُن کے بانجھ ہونے کے سبب سے اور اسی لیے انھوں نے یوں کہا: ﴿ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴾ [الحجر: ٥٤] ''ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے بشارت دیتے ہو جب کہ مجھ پر بڑھاپا آ چکا؟ چناں چہ (اب) کس بنا پر بشارت دیتے ہو؟'' باوجود اس کے کہ اسحاق علیہ السلام سے تیرہ برس پہلے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔ ﴿ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴾ [هود: ٧٢۔ ٧٣] ''وہ بولی: ہائے ہائے! کیا (اب) میں بچہ جنوں گی، حالاں کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے؟ بے شک یہ تو بہت ہی عجیب چیز ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تو اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہے! اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں تم پر اے اہلِ بیت! بے شک اللہ قابلِ تعریف ہے، نہایت بزرگی والا۔''[3]

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝۸ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝۹

اس (زکریا) نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، جبکہ میری بیوی بانجھ آ رہی ہے، اور میں بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچ گیا ہوں؟ ⑧ (فرشتے نے) کہا: ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے فرمایا: وہ مجھ پر نہایت آسان ہے، اور میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا، جبکہ تو کچھ بھی نہیں تھا ⑨

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٤٩۔ ١٤٨) [2] تفسير الطبري (١٨/ ١٤٨) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٥١)

دعا کی قبولیت کے بعد زکریا علیہ السلام کا تعجب:

انوکھی چیز مانگتے ہوئے تعجب نہ آیا جب سنا کہ ہوگا تو تعجب کیا۔ یہ فرشتے نے کہا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب زکریا علیہ السلام کی طرف سے اس وقت ظاہر کیا گیا، جب کہ ان کی دعا قبول ہوگئی اور لڑکے کی بشارت دے دی گئی تو حد درجہ خوش ہوئے اور جو لڑکا ان کا پیدا ہوگا، اس کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا اور جس وجہ سے وہ آئے گا، اس کو پوچھا۔ باوجود اس کے کہ ان کی بیوی بانجھ تھیں شروع عمر سے ہی، وہ جنتی نہ تھیں، پھر بڑھیا ہوگئیں اور خود بھی بوڑھے ہو چکے، ان کی ہڈیاں خشک ہوگئیں لاغر اور دُبلے ہوگئے، لقاح (منی) اور جماع ان میں باقی نہیں رہا۔ جب لکڑی سوکھ جاتی ہے تو عرب کہتے ہیں: ”عَتَا يَعْتُوْ عِتِيًّا وَعُتُوًّا وَعَسٰى يَعْسُوْا عُسُوًّا وَ عِسِيًّا“ یعنی وہ لکڑی خشک ہوگئی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”عتیا“ سے مراد ہڈی کا لاغر ہونا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا کہ مراد کبر، یعنی بڑھاپا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ عتیا کبر سے خاص تر ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ البتہ ساری مقرر کی ہوئی سنتیں میں نے جان لیں سوائے اس کے کہ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر میں کیا پڑھتے تھے اور میں نہیں جانتا کہ کس طرح پڑھتے تھے اس حرف کو ”وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا أَوْ عِسِيًّا“ (أخرجه ابن جرير) امام احمد رحمہ اللہ نے بھی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسا ہی روایت کیا ہے۔[2]

﴿ قَالَ ﴾ یعنی فرشتے نے زکریا علیہ السلام کو اس بات کا جواب دیا جس سے انھوں نے تعجب کیا تھا: ﴿ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ﴾ یعنی تجھ سے اور تیری بیوی سے لڑکے کا پیدا کرنا، جو یہ ہے نہ اس کے غیر سے، اللہ پر آسان و سہل ہے۔ پھر اُن سے وہ بات ذکر کر کے جو اُن کے سوال سے بھی زیادہ عجیب تر تھی یہ فرمایا: ﴿ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴾ یعنی تو اس سے کیا تعجب کرتا ہے، میں نے تو اس سے پہلے تجھ کو بنایا تھا اور تو کچھ چیز نہ تھا، جیسا کہ اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسٰنِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴾ [الدهر: ۱] ”یقیناً (ہر) انسان پر زمانے سے ایک ایسا وقت گزر چکا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔“[3]

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ عِتِيًّا ﴾ سے مراد جسم اور جلد کی لاغری اور ہڈی کی باریکی یا وہ مراد ہے جو جوڑوں اور ہڈیوں میں بڑھاپے کی وجہ سے اور بڑی عمر میں پہنچنے سے ہو جاتی ہے۔ جس وقت آدمی کا سن انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور ابوڑھا ہو جاتا ہے تو عرب لوگ کہتے ہیں: ”عتا الشیخ یعتو عتیا“ یعنی وہ نہایت بوڑھا ہوگیا اور ”شیخ

---

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۵۰)

[2] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۵۰) مسند أحمد (۱/ ۲۴۹) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ۷/ ۳۲۳)

[3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۵۱)

عات" اس وقت بولتے ہیں، جبکہ وہ ییس اور خشکی کو پہنچ جاتا ہے، یعنی سوکھ کر تانت بن جاتا ہے۔ "عتی" کی اصل "عتو" ہے، کیونکہ یہ واوی ہے۔ واو کو یا سے بدل دیا، اس لیے کہ واو کی نسبت یا زیادہ تر خفیف ہے۔ سمین نے "عتیا" کے اعراب میں چار وجہیں ذکر کی ہیں، اُن میں سے ظاہر تر اور وجیہ تر یہ وجہ ہے کہ یہ "بلغت" کا مفعول بہ ہے۔ "عتیا" کو عین کے زیر و پیش دونوں سے پڑھا ہے اور یہ دونوں دو لغت ہیں اور یہ دونوں جملے تاکید استبعاد اور تعجب کے ہیں جو ﴿ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ ﴾ سے ظاہر ہوتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اب ہمارے درمیان لڑکے کا وجود یا حصول کیسے ہوگا، حالانکہ میری عورت بانجھ ہے، اس کی اور میری جوانی میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہوا اور اب تو وہ بڑھیا ہے اور میں بوڑھا ہوں۔

اللہ پاک نے اس سوال کا، جو تعجب اور استبعاد کو ظاہر کرتا ہے، یوں جواب دیا: ﴿ قَالَ كَذٰلِكَ ﴾ یہ کہنے والا فرشتہ خوش خبری پہنچانے والا ہے۔ کواشی نے کہا کہ وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے کہ اس قول پر نظمِ قرآنی صحیح رہتا ہے، یعنی ٹوٹتا نہیں۔ غرضیکہ فرشتے نے یا اللہ پاک نے فرمایا کہ بات اسی طرح ہے جس طرح تو نے کہی۔ زکریا علیہ السلام کے قول کی تصدیق کی، اس کو ثابت اور مقرر رکھا، پھر اُن کے استبعاد اور تعجب کو اپنے اس قول پاک سے دور کر دیا: ﴿ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ﴾ اہتمام کے لیے اس کو مکرر ذکر کیا، یعنی فرمایا کہ بچہ ہونا باوجود اس کے کہ تیرے نزدیک بعید ہے، لیکن مجھ پر آسان ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اس کا پیدا کرنا مجھ پر سہل ہے۔[1]

بایں طور کہ میں تجھ میں جماع کی قوت پھیر لاؤں گا اور تیری عورت کے رحم کو بچہ رکھنے کے لیے پھاڑ دوں گا، حالانکہ میں نے تجھ کو یحییٰ سے پہلے پیدا کیا ہے اور تو کچھ نہ تھا، کیوں کہ معدوم شے نہیں ہوتا۔ تمام کوفیین نے ﴿ قَدْ خَلَقْتُكَ ﴾ کو "قد خلقناك" پڑھا ہے۔ جملہ ﴿ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴾ پہلے جملے کو مقرر رکھتا ہے اور ثابت رکھتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ تیرے واسطے بچہ پیدا کرنا ایسا ہے جیسا تیرا پیدا کرنا۔[2] معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو ابتداءً پیدا فرمایا اور عدمِ محض سے ان کو ایجاد کیا، پس لڑکے کا بطریق توالد معتاد (پیدایش کے معروف و مقرر طریقے سے) پیدا کرنا زیادہ سہل اور آسان ہے۔ عدمِ محض سے پیدا کرنے کی نسبت زکریا علیہ السلام کی طرف کی، آدم علیہ السلام کی طرف نہ کی، حالانکہ حقیقتاً وہ عدم سے پیدا کیے گئے تھے۔ یوں نہ کہا: "وقد خلقت أباك آدم من قبل ولم يك شيئا"، یعنی میں نے تیرے باپ آدم کو پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ نہ تھا، اس لیے کہ اس بات پر دلالت کرے کہ بشریت میں ہر فرد کا ایک حصہ ہے، آدم علیہ السلام کے عدم سے ایجاد اور پیدا کیے جانے میں۔[3]

[1] معاني القرآن للفراء (٣/ ١١٤) [2] معاني القرآن للزجاج (٣/ ٣٢١) [3] فتح البيان (٨/ ١٣٩۔ ١٤٠)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾

اس (زکریا) نے کہا: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا، فرمایا: تیری نشانی یہ ہے کہ تو تندرست ہونے کے باوجود تین دن اور تین راتیں لوگوں سے کلام نہیں کرے گا (10) چناں چہ وہ حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آیا، تو اس نے انھیں اشارہ کیا کہ تم صبح شام تسبیح بیان کرو (11)

حمل کی علامت کا بیان:

منہ سے بول نہ سکے، یہ اس بات کی نشانی تھی کہ وہ وقت آ گیا۔ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے رب! تو میرے لیے اس چیز کے وجود پر جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کوئی نشانی اور دلیل ٹھہرا دے، تاکہ میرا دل قرار حاصل کرے اور مطمئن ہو جائے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہے: ﴿ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ﴾ [البقرة: ٢٦٠] ”اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ نے کہا: کیا تو (اس پر) ایمان نہیں لایا؟ ابراہیم نے کہا: کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں) لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیری نشانی یہ ہے کہ بھلا چنگا ہونے کے باوجود تو لوگوں سے تین رات تک بات نہ کر سکے گا۔ یعنی تیری زبان بغیر کسی مرض اور تکلیف کے تین رات تک بات نہ کرے، حالانکہ تو بالکل صحیح سالم اور تندرست ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، وہب، سدی، قتادہ اور کئی ایک نے کہا ہے کہ کسی بیماری اور تکلیف کے بغیر اُن کی زبان بند ہوگئی۔ ابن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ پڑھتے اور تسبیح کرتے اور اپنی قوم سے بات نہیں کر سکتے تھے مگر اشارے سے۔ عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴾ کے معنی پے در پے نقل کیے ہیں، یعنی تین رات متواتر۔[1] ان سے اور جمہور سے پہلا قول جو مروی ہے صحیح تر وہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴾ [آل عمران: ٤١] ”زکریا نے کہا: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ اللہ نے کہا: تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے اشارے کے سوا بات چیت نہ کر سکے گا اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کر اور صبح و شام اس کی تسبیح کر۔“

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٥١ـ ١٥٣)

امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے ﴿ سَوِيًّا ﴾ کے معنی من غیر خرس نقل کیے ہیں،[1] یعنی بات نہیں کر سکتے تھے، مگر رمز، یعنی اشارے سے اور اسی لیے اس آیت کریمہ میں یوں کہا ہے: ﴿ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ ﴾ یعنی پھر نکلے اپنے لوگوں کے پاس حجرے سے، یعنی جس میں ان کو لڑکے کی خوش خبری دی گئی تھی۔ ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ ﴾ یعنی ''خفية سريعة'' ان کو اشارہ کیا کہ تم صبح وشام تسبیح کرو، یعنی جس بات کا ان تین دنوں میں اُن کو حکم ہوا ہے، ان کے اعمال سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرنے کے لیے جو اُن کو دی ہے، تم اس میں اُن کی موافقت کرو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ''اَوْحٰی'' کے معنی اشارہ کے لیے۔ یہی قول امام وہب اور قتادہ رحمہما اللہ کا بھی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُن کے لیے زمین پر لکھ دیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے بھی ایسا کہا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت سے مراد نشانی ہے، یعنی تو میرے لیے کوئی ایسی علامت اور نشانی ٹھہرا دے کہ وہ مجھ کو بتا دے کہ جس چیز کا سوال کیا تھا اور طلب کی تھی، وہ حقیقت میں واقع ہونے والی ہے، یعنی حمل کا حصول ہو گیا ہے۔ اس سوال سے مقصود یہ ہے کہ بچہ قرار پا جانے کا وقت اُن کو معلوم کرا دے، اس لیے کہ لڑکے کی بشارت بغیر کسی وقت کے مقرر کیے ہوئے دی گئی تھی۔ یعنی صرف خوش خبری دی تھی، یہ نہیں بتایا تھا کہ فلاں وقت حمل رہے گا۔ ابن الانباری رحمہ اللہ نے سوال کی وجہ یہ کہی ہے کہ ان کا جی چاہا کہ یہ کام جلدی ہو جائے، اس لیے اللہ پاک سے نشانی کا سوال کیا، تاکہ جس بات کا اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا ہے، اس کے قریب آنے کو اس نشانی سے پہچان جائیں۔ کسی نے کہا کہ انھوں نے ایسی نشانی طلب کی کہ وہ اُن کو یہ بات بتا دے کہ خوش خبری اللہ کی طرف سے ہے، شیاطین کی طرف سے نہیں ہے، کیوں کہ ابلیس نے اُن کے وہم میں یہ بات ڈال دی تھی۔ امام ضحاک اور سدی رحمہما اللہ نے ایسا ہی کہا ہے اور یہ قول نہایت بعید ہے۔[3]

﴿ سَوِيًّا ﴾ کا نصب حال کی بنا پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیری نشانی یہ ہے کہ تو بات کرنے پر قادر نہ ہوگا، حالانکہ تندرست، صحیح سالم، اور بھلا چنگا ہوگا، بغیر کسی کھٹکے کے۔ نہ تجھ میں کوئی آفت ہوگی کہ وہ تجھے بات کرنے سے روکے۔ مراد تین راتیں دنوں سمیت کے ہیں، جیسا کہ آلِ عمران میں فرمایا ہے: ﴿ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ﴾ [آل عمران: ٤١] اس سورت میں راتوں کا ذکر کیا اور آلِ عمران میں دنوں کا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور مکی پہلے ہے مدنی سے اور رات پہلے ہے دن سے۔ پس سابق (پہلی) کو سابق دیا اور موخر کو موخر عطا فرمایا۔

محراب کے کئی معنی ہیں۔ قاموس میں کہا: محراب غرفہ ہے، فارسی اس کی بروارہ ہے، یعنی بالاخانہ اور صدر خانہ ہے اور گھر کی سب سے اچھی جگہ، یعنی گھر میں جو جگہ کہ صدر کی اور عزت کی ہوتی ہے، اس کو بھی محراب کہتے

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٢) [2] تفسير الطبري (١٨/ ١٥٣۔ ١٥٤) [3] فتح القدير (٣/ ٤٤٧)

ہیں اور مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ اور وہ جگہ جس کے لیے بادشاہ متفرد ہوتا ہے، لوگوں سے دور رہتا ہے، یعنی خاص وہ جگہ جہاں بادشاہ بیٹھتا ہے، اس کو بھی محراب کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے محراب اُن کی مسجدیں ہیں، جن میں وہ بیٹھا کرتے تھے۔①

شہاب میں ہے کہ محراب جو اَب معروف ہے، یعنی مسجد کی دیوار میں جوف دار طاق، جس میں امام نماز پڑھتا ہے۔ "مُحدَث" یعنی نیا پیدا شدہ ہے۔② یہ عرب اول میں نہ تھا، بعد میں اس کا ظہور ہوا۔ عرب اس کو نہیں پہچانتے، پس اس کا نام محراب رکھنا، فقہاء کی ایک اصطلاح ہے۔ شہاب کا یہ قول ممنوع ہے، بلکہ وہ تو لغوی معنی ہیں، کیوں کہ یہ لغوی معنی کے افراد سے ہیں، جن کو قاموس میں بیان کیا ہے: "ومقام الإمام من المسجد" محراب حرب سے مشتق ہے، گویا محراب کو لازم پکڑنے والا شیطان سے محاربہ کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ "حرب" بفتحتین سے مشتق ہے، گویا محراب کو لازم پکڑنے والا حرب وتعب ونصب (تھکنا) کی ملاقات کرتا ہے۔ یہاں محراب سے مراد جائے صلاۃ ہے۔

غرضیکہ جب اللہ پاک نے حمل رہنے کی نشانی بتا دی تو وہ اپنی جائے صلاۃ سے متغیر اللون (رنگ بدلے ہوئے) عاجز الکلام نکلے، یعنی چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا اور بات کرنے سے عاجز تھے، پس لوگوں نے اس بات کو اُن کی عادت کے خلاف ایک نئی بات سمجھا تو انھوں نے ان کی طرف اشارہ کیا کہ تم صبح وشام اپنے رب کی تسبیح و پاکیزگی بیان کرو۔ کسی نے کہا کہ صبح وعصر کی نماز ہے۔ کسی نے کہا کہ مراد سبحان اللہ کہنا ہے۔ لفظ بُکرہ منصرف ہے، اس لیے کہ اس سے علمیت مقصود نہیں ہے، اگر علمیت مقصود ہوگی تو غیر منصرف ہو جائے گا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ "عشي" کا استعمال مونث ہوتا ہے اور اس کا مذکر لانا بھی جائز ہے، جب کہ مبہم لایا جائے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ "عشي" عشية کی جمع ہے۔③

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝

(اللہ نے فرمایا:) اے یحییٰ! کتاب کو قوت سے پکڑ، اور ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم عطا کیا⑫ اور اپنی طرف سے شفقت اور پاکیزگی (دی)، اور وہ نہایت متقی تھا⑬ اور اپنے والدین سے نیکی کرنے والا تھا اور

① القاموس المحيط (١/ ٩٣) ② حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ١٤٧)

③ تفسير القرطبي (١١/ ٨٦) فتح البيان (٨/ ١٤١۔ ١٤٢)

وہ سرکش، نافرمان نہیں تھا⑭ اور اس پر سلام ہے جس دن وہ پیدا ہوا، اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ (کرکے) اُٹھایا جائے گا⑮

زکریا علیہ السلام کے ہاں لڑکے کی پیدائش اور اس کی صفات:

یعنی لوگوں کو علمِ کتاب سکھانے لگے اپنے باپ کی جگہ زور سے، یعنی باپ ضعیف تھے اور یہ جوان۔ ایک لڑکے نے ان کو کھیلنے کے لیے بلایا، کہا: ہم اس واسطے نہیں بنے۔ یعنی آرزو کے لڑکے ایسے ہوتے ہیں وہ ایسا نہ تھا۔

یہ کلام محذوف کو شامل ہے، وہ یہ کہ جس لڑکے کی زکریا علیہ السلام کو بشارت دی گئی تھی، وہ لڑکا وجود میں آیا اور وہ یحییٰ علیہ السلام ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کو کتاب سکھائی، یعنی تورات جس کا وہ لوگ باہم درس دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ فیصلے کرتے تھے۔ نبی جو اسلام لائے اُن لوگوں کے واسطے کہ جو یہودی ہوئے اور درویش اور عالم۔ اس وقت وہ کم سن تھے، سو اسی لیے ان کے ذکر کے ساتھ تنویہ کی، یعنی ان کے ذکر کو بلند کیا، ان کو نیک نامی بخشی اور اس چیز کے ساتھ جس کا اُن پر اور اُن کے ماں باپ پر انعام کیا۔ پس فرمایا: اے یحییٰ! یعنی اللہ تعالیٰ نے لڑکے سے کہا: اے یحییٰ! یا یہ معنی ہیں کہ زکریا علیہ السلام کے لڑکا پیدا ہوا، پھر وہ اس عمر کو پہنچا کہ جس میں وہ مخاطب ہو سکے تو ہم نے اس سے کہا: اے یحییٰ! امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ ہم نے زکریا کو لڑکا عطا کیا اور اس سے کہا: اے یحییٰ![1] یعنی ولادت سے تین برس بعد۔ جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] یا دو برس بعد، یعنی فرشتے کی زبان پر، جیسا کہ ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] ﴿خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ یعنی تو کتاب کو جد وحرص وعزیمت و اجتہاد کے ساتھ سیکھ، یعنی اس کے سیکھنے میں خوب سعی وکوشش وعزم بجا لا۔

کتاب سے مراد تورات ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اس لیے کہ اس وقت عہد کی گئی اور معروف وہی کتاب تھی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی کوئی اور خاص کتاب ہو، گو ہم اس کو اب نہ پہچانتے ہوں۔ اخذ سے مراد یا تو محسوس طریقے سے پکڑنا ہے، یا معنی کے لحاظ سے پکڑنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے اس کے ساتھ جہاں تک ہو سکے قیام کریں۔ یا یوں ہوتا ہے کہ ایسا ملکہ حاصل کیا جائے کہ وہ اس بات کا مقتضی ہو کہ جس بات کا حکم دیا جائے، اس کی طرف آرام سے پیش قدمی کریں اور جس بات سے منع کیا جائے، اس سے بہ آسانی باز رہیں۔ حکم سے مراد حکمت ہے اور حکمت سمجھنا ہے کتاب کا، جس کو پکڑنے کا اُن کو حکم ہوا اور احکامِ دینیہ کا سمجھنا ہے۔ کسی نے کہا کہ علم اور علم کی حفاظت کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ کسی نے کہا کہ نبوت ہے۔ کسی نے کہا کہ عقل۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ فہم۔

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۳۲۱) [2] الدر المنثور (۵/ ٤٨٤) [3] تفسير البحر المحيط (٦/ ١٦٨)

امام مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا کہ لُب، یعنی خلاصہ ومغز وجد (خوب متوجہ ہونا) وعزم واقبال واکباب خیر پر اور اس میں سعی وکوشش کرنا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ فہم اور عبادت دیے گئے اور وہ سات برس کے تھے۔[1] اُن کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لڑکوں نے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام سے کہا: چلو ہم کھیلیں تو یحییٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہم کھیل کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں، چلو ہم نماز پڑھیں۔ پس وہ قول ہے اللہ تعالیٰ کا ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴾ (أخرجه الحاكم في تاريخه)[2]

ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے، اس سے پہلے کہ بالغ ہو تو وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو لڑکپن میں حکم دیے گئے۔[3] (أخرجه البيهقي و أخرجه ابن أبي حاتم موقوفاً عليه) حناناً معطوف ہے الحکم پر۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ حنان رحمت و رقت وشفقت وعطف ومحبت ہے۔ یہ سب الفاظ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں، اصل اس کی نفس کا توقان یعنی آرزومند ہونا ہے۔ یہ ماخوذ ہے: "حنين الناقة على ولدها" سے، یعنی اونٹنی کا اپنے بچے پر آرزومندی ومہربانی کرنا۔ ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ عرب بولتے ہیں: "حنانك يا رب و حنانيك يا رب" ان دونوں کے ایک معنی ہیں، یعنی اے رب! میں تیری رحمت چاہتا ہوں۔

امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا کہ حنّان مشدد اللہ تعالیٰ عزوجل کی صفات سے ہے اور حنَان مخفف عطف اور رحمت ہے اور حنان رزق و برکت ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں حنان کے یہ معنی بھی ہیں کہ جو عظیم اُمور ہوں اللہ کی ذات میں۔ اسی معنی سے زید بن عمرو بن نفیل کا یہ قول ہے: "والله لئن قتلتم هذا العبد لأتخذن قبره حنانا"، یعنی قسم ہے اللہ کی! اگر تم مار ڈالو گے اس غلام کو تو بہر آئینہ میں ٹھہراؤں گا اس کی قبر کو حنان۔ اس سے مراد بلال رضی اللہ عنہ ہیں، جس وقت زید کا گزر اُن پر ہوا اور انھیں مارا جا رہا تھا تو زید نے یہ بات کہی۔ کسی نے کہا کہ اس قول کے قائل ورقہ بن نوفل ہیں۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اس قول کے یہ معنی ہیں کہ البتہ میں اس پر رحم کروں گا، نیز اس پر شفقت اور مہربانی کروں گا، کیوں کہ وہ اہلِ جنت سے ہے۔[4] امام عطا رحمہ اللہ نے کہا کہ حناناً کے معنی تعظیماً ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: "لا والله ما أدري ما حنانا"، یعنی اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ حنان کیا ہے۔[5] امام ابن جبیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے اس کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو انھوں نے اس میں کچھ نہ پایا، یعنی اُن کو اس کے معنی معلوم نہ ہوئے۔[6]

---

(1) الدر المنثور (٥/ ٤٨٤) (2) الدر المنثور (٥/ ٤٨٥)

(3) شعب الإيمان (٢/ ٣٣٠) الدر المنثور (٥/ ٤٨٥) اس کی سند میں "حسن بن ابی جعفر" ضعیف راوی ہے۔

(4) تفسير القرطبي (١١/ ٨٧۔ ٨٨) (5) تفسير الطبري (١٨/ ١٥٧) (6) تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٣)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «يَبْقَى رَجُلٌ فِي النَّارِ يُنَادِي أَلْفَ سَنَةٍ يَا حَنَّانُ يَا مَنَّانُ قَدْ يَثْنِي»[1] یعنی ایک آدمی جہنم کی آگ میں پڑا ہوا ہزار سال تک یا حنان یا منان کہہ کر پکارتا رہے گا اور پکارتے پکارتے دوہرا ہو جائے گا۔ ﴿مِنْ لَّدُنَّا﴾ کے معنی "من عندنا و من جنابنا" ہیں۔ یعنی ہم نے یحییٰ علیہ السلام کو اپنے پاس سے اپنی درگاہ سے رحمت عطا کی، جو اس کے دل میں کائن (جاگزین) وساکن ہے، جس سے وہ لوگوں پر جو اس کے ماں باپ اور خویش و اقارب ہیں مہربانی کرتا ہے، تاکہ ان کو کفر سے چھڑائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ﴿حَنَانًا﴾ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے،[2] مگر بے شک میں اس کو گمان کرتا ہوں کہ اللہ عطف کرتا ہے، یعنی مہربانی فرماتا ہے اپنے بندے پر رحمت کے ساتھ۔ ایک جماعتِ سلف نے اس کی تفسیر رحمت کے ساتھ کی ہے، جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ اسی بارے میں کسی شاعر کا قول ہے۔ (یعنی مولوی فضل حق رحمہ اللہ کا) ؎

وعسير بلاء حاق به　　　　ويسير حنانك يدفعه

یعنی اس پر ایک مشکل بلا نازل ہوئی ہے اور تیری ذرا سی رحمت و مہربانی اس کو دور دفع کر دے گی۔

اللهم ادفع عنا البلايا كلها، وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة يا حنان يا منان يا ذا الجلال والإكرام، آمين.

﴿وَزَكٰوةً﴾ معطوف ہے ماقبل پر۔ زکات کے معنی ہیں: تطہیر و برکت و تنمیہ و برّ کے، یعنی پاک صاف کرنا اور بڑھنا اور بڑھانا اور نیکی کرنا۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے یحییٰ کو مبارک کر دیا لوگوں کے لیے کہ ان کو نیکی کی راہ بتائے۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ پاک کیا ہم نے اس کو حسنِ ثنا کے ساتھ (یعنی لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں)۔ اس پر پاکیزگی کی گواہی کی طرح۔ کسی نے کہا کہ ﴿زَكٰوةً﴾ کے معنی صدقہ ہیں، یعنی صدقہ کیا ہم نے اس کا اس کے ماں باپ پر۔ یہ قول ابن قتیبہ رحمہ اللہ کا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی "تَصَدُّقًا عَلَى النَّاسِ" ہیں۔ یعنی ہم نے اس کو لوگوں پر تصدق کرنے کی توفیق عطا کی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿زَكٰوةً﴾ سے مراد طاعت و اخلاص ہے۔ کسی نے کہا کہ عملِ صالح۔ پس یحییٰ نے گناہ کا قصد نہ کیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿زَكٰوةً﴾ میل کچیل اور گناہوں اور خطاؤں سے طہارت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کے مطابق عملِ صالح ہے اور امام ضحاک رحمہ اللہ کے مطابق ایسا عملِ صالح ہے جو پاک کر دے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿تَقِيًّا﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ پاک کر دیے گئے تھے اور انھوں نے

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۲۳۰) اس کی سند میں "ابوظلال" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۲۴۹)
[2] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۵۷)　[3] تفسير القرطبي (۱۱/ ۸۸)

گناہ نہیں کیا۔[1] یعنی وہ طبیعتاً اللہ پاک کی نافرمانیوں سے کنارہ کش اور اس کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔ مروی ہے کہ انھوں نے معصیت نہیں کی اور نہ کبھی اس کا قصد کیا۔ منجملہ اُن کے تقویٰ کے ایک یہ بات ہے کہ گھاس سے قُوت کرتے تھے (غذا حاصل کرتے تھے) اور بہت گریہ و زاری فرماتے تھے، اس لیے اُن کے رُخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے تھے۔

﴿ بَرًّا ﴾ بہ معنی فاعل ہے، یعنی اپنے ماں باپ سے لطف اور نرمی کا برتاؤ کرتے، ان پر احسان فرماتے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے بعد کوئی نیکی اور عبادت ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو۔''

﴿ جَبَّارًا ﴾ متکبر کو کہتے ہیں۔ سو وہ متکبر نہ تھے کہ کسی کو مار ڈالیں اور خفا ہو کر ماریں پیٹیں اور نہ اپنے ماں باپ کے نافرمان تھے نہ اپنے رب کے۔ یہ وصف ہے یحییٰ علیہ السلام کا لینِ جانب (نرمی) اور خفضِ جناح (نرم رفتاری) کے ساتھ۔ یعنی وہ رحیم، کریم، شفیق، نرم دل، نرم مزاج تھے، تند خو جنگ جو نہ تھے۔ ''جَبَّار'' و ''عَصِيّ'' دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ جب نفی آتی ہے تو زیادتی کی نفی ہو جاتی ہے اور اصل فعل باقی رہتا ہے۔ سو یہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ نفی اصل میں جبر و عصیان (تکبر اور نافرمانی) کی ہے۔ یعنی اُن میں جبر اور عصیان اصلاً نہ تھا، کم نہ زیادہ۔ ان دونوں خصلتوں سے بالکل پاک صاف اور منزہ و مبرا تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی اطاعت کا ذکر کیا کہ وہ اپنے رب کے مطیع اور فرماں بردار تھے اور اس نے ان کو رحمت و زکات اور تقویٰ والا پیدا کیا تھا تو اس کے ساتھ ہی والدین کی اطاعت کا بھی ذکر فرمایا کہ وہ اپنے والدین کے بھی مطیع اور فرماں بردار تھے اور اُن کے ساتھ نیکی کرتے اور اُن کی نافرمانی سے بچتے تھے قول و فعل و امر و نہی میں اور اسی لیے یوں فرمایا کہ وہ جبار اور عصی نہ تھے۔

پھر اُن کے اُن اوصافِ جمیلہ کا ذکر کرنے کے بعد اُن کے لیے یہ جزا ارشاد فرمائی: ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ... الخ ﴾ یعنی اُن کے لیے ان تینوں حالتوں میں امان ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں: ان پر اللہ کی طرف سے امان ہے۔[3] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک زیادہ واضح یہ ہے کہ سلام سے مراد یہی معروف طریقۂ سلام ہے۔[4] اس لیے کہ یہ امان سے زیادہ بزرگ تر اور بلند تر ہے، کیوں کہ جب اُن سے نافرمانی کی نفی کر دی تو امان تو اُن کو حاصل ہی ہو گیا اور یہ اُن کے درجات سے کم تر درجہ ہے۔ شرف تو اِسی میں ہے کہ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٥٩) تفسیر ابن كثير (٣/ ١٥٣) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٣)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ١٦٠) [4] تفسير القرطبي (١١/ ٨٨)

اللہ تعالیٰ ان پر سلام کرے۔ اس جگہ سلام کو نکرہ کہا اور عیسیٰ علیہ السلام کے قصے میں السلام کو معرفہ فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا سلام اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی طرف سے تھوڑا زیادہ ہوتا ہے اور دوسرا سلام عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ہے۔

ولادت کے دن سلام کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس دن شیطان وغیرہ سے امن میں رہے اور شیطان کے پہنچنے سے اس دن بچے، جیسا کہ تمام بنی آدم کو پہنچتا ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن اُن پر سلام پڑھا۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلق زیادہ تر تین جگہوں پر وحشت ناک ہوتی ہے، ایک جس دن پیدا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو اس جگہ سے باہر دیکھتا ہے، جس میں وہ تھا، دوسرے جس دن مرتا ہے تو ایک ایسی قوم کو دیکھتا ہے، جن کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور تیسرے جس دن جی کر اُٹھے گا تو اپنے آپ کو ایک محشرِ عظیم میں دیکھے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان تینوں جگہوں میں یحییٰ علیہ السلام کا اِکرام کیا اور اُن کو سلام کے ساتھ خاص کیا۔ پس فرمایا: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ... الخ﴾ [1] (رواه ابن جرير عن أحمد بن منصور المروزي عن صدقة بن الفضل عنه)

امام قتادہ رحمہ اللہ سے ﴿جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ ابن المسیب رضی اللہ عنہ ذکر کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے اور وہ گنہگار نہ ہو، سوائے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے۔ [2] امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سعید بن میسّب رحمہ اللہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ مجھے حدیث بیان کی ابن العاص رضی اللہ عنہ نے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام بنی آدم قیامت کے دن آئیں گے اور اُن کے گناہ ہوں گے، إلا ما كان من يحيىٰ بن زكريا. یعنی سوائے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے کہ ان کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن اسحاق مدلس ہے [3] اور یہ حدیث ضعیف ہے۔ واللّٰه أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اولادِ آدم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے، مگر حالت یہ ہے کہ اس نے یا تو خطا کا ارتکاب کیا ہے یا خطا کا ارادہ کیا ہے، سوائے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے اور کسی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ کہے کہ میں یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں۔ [4] (أخرجه الإمام أحمد) یہ بھی ضعیف ہے، اس لیے کہ علی بن زید بن جدعان کے منکرات بہت ہیں۔ واللّٰه أعلم. امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یحییٰ و عیسی علیہما السلام دونوں ملے تو عیسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ تو میرے لیے استغفار کر، تو میرے سے بہتر ہے تو دوسرے نے کہا کہ تو مجھ سے بہتر ہے تو عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تو مجھ سے بہتر ہے، کیونکہ میں نے اپنے آپ پر سلام کیا اور تجھ پر اللہ تعالیٰ نے سلام کیا۔ [5]

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٦٠ـ ١٦١)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ١٦٠) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسير الطبري (١٨/ ١٦٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٣)
[4] مسند أحمد (١/ ٢٥٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے تمام طرق پر بحث کرتے ہوئے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٨٤)
[5] تفسير الطبري (١٨/ ١٦١)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا
شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ
اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ ۗ لِاَهَبَ لَكِ
غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ
بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ
هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

اور اس کتاب میں مریم کا ذکر کیجیے، جب وہ اپنے خاندان والوں سے دور مشرقی جانب کی جگہ میں الگ ہوئی ⑯ پھر اس نے ان کے آگے ایک پردہ تان لیا، تب ہم نے اپنی روح (فرشتے) کو اس کے پاس بھیجا، تو وہ اس کے لیے کامل آدمی بن کر آیا ⑰ اس (مریم) نے کہا: میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو ڈرنے والا ہے ⑱ فرشتے نے کہا: یقیناً میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے (حکمِ الٰہی سے) ایک نہایت پاکیزہ لڑکا عطا کروں ⑲ اس نے کہا: میرے لیے لڑکا کیوں کر ہوگا، جب کہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہی ہوں ⑳ اس (فرشتے) نے کہا: اسی طرح ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر بہت آسان ہے، تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ امر طے شدہ ہے ㉑

وہ غسل حیض کرنے کے لیے ایک طرف ہوئیں شرم سے، یہی پہلا حیض تھا، تیرہ یا پندرہ برس کی عمر تھی، وہ مکان مشرق کی طرف تھا، اب نصاریٰ مشرق کو اپنا قبلہ کرتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام ایک خوبصورت جوان کی شکل میں آئے۔ نشانی اس لیے کہ بن باپ کے لڑکا پیدا ہو، یہ اللہ کی قدرت ہے۔

مریم علیہا السلام کا قصہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ:

جب اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کا قصہ بیان کیا کہ اس کے باجود کہ وہ بوڑھے تھے اور اُن کی بیوی بانجھ تھیں، اُن سے ایک بیٹا پاک صاف بابرکت پیدا فرمایا تو اُن کے قصے کے ساتھ ہی مریم علیہا السلام کا قصہ بھی بیان کیا کہ اُن سے بغیر باپ کے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا، اس لیے کہ دونوں قصوں کے درمیان مناسبت اور مشابہت ہے، اسی لیے سورت آلِ عمران میں اور اس سورت میں اور سورت انبیاء میں ان دونوں قصوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، کیوں کہ ان دونوں قصوں میں مناسبت اور مقاربت ہے معنی کے لحاظ سے۔ اِن قصوں کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ بندوں کو اپنی قدرت و

عظمتِ سلطان سے آگاہ کرے۔ پس فرمایا: ﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ﴾ مریم علیہا السلام بنی اسرائیل کے ایک پاک صاف ستھرے خاندان سے تھیں اور داود علیہ السلام کی نسل سے عمران کی بیٹی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورت آلِ عمران میں ان کی والدہ کے جننے کا قصہ ذکر کیا ہے کہ ان کی والدہ نے اُن کو اللہ کے لیے نذر کر دیا تھا کہ وہ مسجد بیت المقدس کی خدمت کیا کریں، وہ لوگ اس کام کو قربت اور عبادت سمجھتے تھے۔ لہٰذا اُن کے رب نے ان کو اچھے طریقے سے قبول کر لیا اور اُن کو اچھی طرح بڑھایا اور پرورش کی۔ انھوں نے بنی اسرائیل میں بڑی آؤ بھگت سے پرورش پائی۔ پس جو بیبیاں کہ عبادت اور قربانی کرتی ہیں اور اللہ کے واسطے دنیا چھوڑتی ہیں عبادت و ریاضت میں محنت و مشقت اُٹھاتی ہیں اور عظیم عبادت کے ساتھ مشہور ہوتی ہیں، مریم علیہا السلام بھی اُن میں سے ایک بی بی ہوگئیں اور یہ اپنے خالو زکریا علیہ السلام کی کفالت اور پرورش میں تھیں۔ اس وقت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی اور عظیم بزرگ سردار تھے، وہ لوگ اپنے دینی معاملات میں اُن کی طرف رجوع کرتے تھے، انھوں نے مریم علیہا السلام سے ایسی کرامتیں دیکھیں، جن سے وہ بہت حیران اور متعجب ہوئے۔ وہ جس وقت مریم علیہا السلام کے پاس محراب میں داخل ہوتے تو اُن کے پاس رزق پاتے اور کہتے: اے مریم! یہ تیرے لیے کہاں سے ہے، وہ کہتیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ ذکر کیا گیا ہے کہ زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے پاس سردیوں کا میوہ گرمیوں میں اور گرمیوں کا میوہ سردیوں میں پایا کرتے تھے، چنانچہ اس کا بیان سورت آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔[1]

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا اور اسی کے لیے حکمت اور حجتِ بالغہ ہے کہ مریم علیہا السلام سے اپنے بندے اور رسول عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمائے، جو اس کے بندے اور رسول ہیں اور پانچ بڑے اولو العزم رسولوں میں سے ہیں تو وہ اپنے لوگوں سے کنارہ کش ہوکر مسجدِ قدس کے شرقی جانب علاحدہ ہوگئیں۔ کنارہ کرنے کی وجہ میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس لیے کہ اُن کو حیض آ گیا تھا۔[2] کسی نے کوئی اور وجہ کہی۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ اپنی سبزی ترکاری کی طرف گئیں، تاکہ اسے پانی دیں۔ نوف بکالی نے کہا کہ انھوں نے اپنے لیے ایک جگہ عبادت کرنے کے لیے بنائی تھی۔[3] واللہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اہلِ کتاب پر بیت اللہ کی طرف نماز اور حج فرض کیے گئے اور اُن کو اس سے نہیں پھیرا مگر تیرے رب کے اس قول نے: ﴿ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴾ کہا کہ مریم علیہا السلام ایک شرقی مکان کی طرف نکلیں سو انھوں نے، یعنی نصاریٰ نے مطلع شمس کی طرف نماز پڑھی۔[4] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن جریر) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ بے شک میں اللہ

---

(1) رقم الآیة [۳۷]
(2) تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۶۱۔ ۱۶۲)
(3) تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۰۲) تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۶۲)
(4) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱٥٤)

کی مخلوق میں سے اس بات کو سب سے زیادہ جانتا ہوں کہ نصاریٰ نے مشرق کو قبلہ کس لیے ٹھہرایا اللہ تعالیٰ کے اس قول کے واسطے: ﴿ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴾ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش کی جگہ کو قبلہ ٹھہرایا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مکان شرقی'' سے مراد ہے لوگوں سے دور علاحدہ ایک جگہ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ''نبذ'' یہ ''طرح'' اور ''رمي'' کو کہتے ہیں، یعنی ڈالنا اور پھینکنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ [آل عمران: ۱۸۷] ''پھر انھوں نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا۔'' معنی یہ ہیں کہ مریم علیہا السلام علاحدہ اور دور ہوگئیں۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کنارہ کش ہوگئیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اپنی قوم سے تنہا ہوئیں۔ یہ تمام معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مکان شرقی سے مراد جانبِ مشرق ہے۔ اس کی زبر، اس کے ظرف مکان ہونے کی وجہ سے ہے، یا یہ مفعول بہ ہے اس بنا پر کہ ﴿ اِنْتَبَذَتْ ﴾ کے معنی ''أَتَتْ'' ہیں، یعنی وہ شرقی مکان کو آئیں، جیسا کہ سمین نے کہا ہے اور مصباح میں بھی وہ بات ہے جو اس کی تائید کرتی ہے۔ شرق رائے مہملہ کی جزم کے ساتھ وہ جگہ ہے کہ جس میں سورج نکلتا ہے۔ مکان کو شرق کے ساتھ خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ وہ لوگ مشرق کی سمت کی تعظیم کرتے تھے، کیونکہ وہ انوار کے طلوع ہونے کی جگہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کے معنی کو بیان کیا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ وہ دن سخت سردی کا تھا، اس لیے وہ مکان کے شرقی جانب بیٹھیں، اپنے سر کی جوئیں ڈھونڈتی تھیں۔

﴿ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ﴾ حجاب سے مراد آڑ یا پردہ ہے کہ ان کو لوگوں سے چھپا دے، تاکہ وہ اُن کو عبادت کی حالت میں یا غسلِ حیض میں نہ دیکھیں۔ غرضیکہ مریم علیہا السلام ان سے چھپ گئیں۔ پھر بھیجا ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو اور مراد روح سے جبریل علیہ السلام ہیں، تاکہ وہ ان کو لڑکے کی بشارت دیں اور اُن میں پھونکیں کہ ان کو لڑکے کا حمل ہو جائے۔[4] پس جبریل علیہ السلام ان کے آگے پورے آدمی بن کر آئے، یعنی ہر لحاظ سے مکمل آدمی کی صورت پر ہوگئے۔ بنی آدم کی صفتوں میں سے کوئی صفت مفقود نہ رہی۔ امام مجاہد، قتادہ، ضحاک، ابن جریج، وہب بن منبہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں[5] اور یہی قول ظاہر قرآن ہے، کیونکہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۹۳۔ ۱۹۴] ''روح الامین (جبریل) اسے لے کر نازل ہوا۔ آپ کے دل پر، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں۔''

ابو جعفر رازی نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح من جملہ ان روحوں میں سے ہے

---

① تفسير الطبري (۱۸/ ۱٦٢) ② فتح القدير (۳/ ٤٥١) ③ تفسير الطبري (۱۸/ ۱٦٢)

④ فتح البيان (۸/ ۱٤٦) ⑤ تفسير الطبري (۱۸/ ۱٦٣) تفسير ابن كثير (۳/ ۱٥٤۔ ۱٥٥)

کہ جن سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں عہد لیا گیا تھا اور وہی روح مریم علیہا السلام کے سامنے پورا آدمی بن گئی، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی روح۔ سو مریم علیہا السلام نے اسی کو اُٹھا لیا کہ جس نے ان سے خطاب کیا اور وہ اُن کے منہ میں حلول کر گیا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول انتہائی غریب اور منکر گویا اسرائیلی، یعنی منجملہ ان اقوال کے ہے، جو بنی اسرائیل سے لیے گئے ہیں۔[2]

فتح البیان میں ذکر کیا ہے کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ شاید آدمی کی پوری صورت بن جانا اس لیے ہو کہ ان کی شہوت کو اُبھارے تو ان کا نطفہ اُن کے رحم کی طرف اتر جائے۔[3] تاریخ خمیس فی احوال انفس نفیس میں ہے کہ اس قول میں نظر، یعنی اعتراض ہے۔[4] کسی نے اس صحیح اعتراض کا بیان نہیں کیا نہ انھوں نے نہ ان کے سوا اور مفسروں نے میری تلاش اور جستجو میں، مگر ایک ابو السعود نے بیان کیا ہے کہ مقام تو آثارِ قدرت، خارقۂ عادت (معجزہ) کے بیان کا ہے۔ لہٰذا یہ قول باوجود اس کی مخالفت کے اللہ پاک کا یہ فرمان اس کی تکذیب کر رہا ہے: ﴿ قَالَتْ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ﴾ اس لیے کہ یہی قول اس بات کی سچی گواہی دے رہا ہے کہ ان کی خاطرِ عاطر میں کسی طرح کے انسانی ملاپ کا شائبہ تک نہیں گزرا۔ پھر اس حالت کا کیا ذکر ہے کہ جو انسانی ملاپ اور شہوت کے بعد مرتب ہوتی ہے جس کا ذکر قاضی نے کیا ہے۔[5] ہاں جبریل علیہ السلام کا پورا آدمی بن جانا اس اعلیٰ درجے کے حسن و جمال پر مریم علیہا السلام کے امتحان اور آزمایش کے لیے اور اُن کی عفت اور پارسائی کو آزمانے کے لیے تھا اور اُن سے وہ تقویٰ اور پاک دامنی ظاہر ہوئی کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔

اللہ پاک کا ذکر رحمانیت کے عنوان سے اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے میں اور آثارِ رحمتِ خاصہ کو اپنی طرف کھینچنے میں مبالغہ ہو۔ رحمتِ خاصہ یہی ہے کہ جو کام ان پر اچانک آ پڑا ہے، اس سے ان کو بچا لے۔ جبریل علیہ السلام کے تمثل کی کیفیت میں کلام کیا گیا ہے کہ وہ فرشتہ ہونے کے باوجود اچانک ایک خوبصورت تندرست اور صحیح سالم انسان کیسے بن گئے۔ سو امام الحرمین رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو حصہ جبریل علیہ السلام کی خلقت سے زائد ہے، اللہ تعالیٰ اس کو فنا کر دیتا ہے یا اُن سے اس کا ازالہ فرماتا ہے، پھر اس کو اُن کی طرف پھیر لاتا ہے، یعنی ان کے لیے اجزائے اصلیہ ہیں، جیسے کہ انسان میں ہوتے ہیں اور اجزائے زائدہ بھی ہیں۔ ابن عبدالسلام رحمہ اللہ نے ازالے کے ساتھ جزم کیا ہے نہ کہ بالکل فنا ہونے کے ساتھ، یعنی اجزائے زائدہ کا ازالہ ہوتا ہے، پھر وہ لوٹ آتے ہیں نہ یہ کہ وہ بالکل فنا کر دیے جائیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قدرِ زائد نہ زائل ہوتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ فقط دیکھنے والے سے اس کو پوشیدہ کر دیتا ہے۔ (قاله الكرخي)

---

[1] تفسير الطبري (٩/ ٤٢١۔ ٤٢٢) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٥٣)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٥)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ٨۔ ٩)
[4] تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس (١/ ٤٠)
[5] تفسير أبي السعود (٥/ ٢٦٠)

جبریل علیہ السلام بشر کی صورت میں اس لیے ظاہر ہوئے کہ مریم ان کی بات چیت سے اُنس پکڑیں اور اُن سے نفرت نہ کریں تو اُن کی بات کو سمجھ لیں۔ اگر وہ فرشتوں کی صورت میں ان کے لیے ظاہر ہوتے تو وہ نفرت کرتیں اور اُن کی بات سننے پر قادر نہ ہوتیں۔ ان کو ہرگز اس کی طاقت نہ ہوتی کہ فرشتہ اپنی صورت پر ہو اور وہ اس کی طرف نظر کر سکیں، پھر جب انھوں نے جبریل علیہ السلام کو خوبصورت اور کامل انسان کی شکل میں دیکھا کہ وہ پردہ پھاڑ کر اُن کے سامنے آ گیا تو انھوں نے گمان کیا کہ وہ اُن سے بدی کا ارادہ رکھتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ اس سے پناہ چاہی اور بول اُٹھیں مجھ کو رحمٰن کی پناہ ہے، تو اس سے اگر ڈر رکھتا ہے، یعنی اگر تو ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں اس کا تقویٰ رکھتے ہیں اور تقویٰ اور ایمان کے تقاضے کے مطابق برتاؤ کرتے ہیں۔ رحمٰن کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ وہ خود ان کو دور کرنے سے ضعیف و عاجز ہیں تو وہ ان کے ضعف اور عاجزی پر رحم کرے۔ کسی نے کہا کہ تقی ایک مردِ صالح کا نام تھا۔ لہٰذا براہِ تعجب اس سے پناہ چاہی۔ کسی نے کہا کہ ایک بدکار مرد کا نام تھا، جو اس وقت میں مشہور و معروف تھا۔ پہلا قول زیادہ قابلِ قبول ہے۔

اس حسین صورت سے ان کا پناہ چاہنا، اُن کی کمال عفت و پاک دامنی اور انتہائی تقویٰ اور پارسائی پر دلالت کرتا ہے۔ شرط کا جواب محذوف ہے، یعنی تو پھر تو مجھ سے تعرض مت کر، مجھ کو چھوڑ دے، مجھ سے باز رہ۔ یا میرے پناہ چاہنے کے سبب سے تو مجھ سے باز رہ۔ یہ جملہ اس کہنے والے کے قول کی طرح ہے، جو یہ کہے کہ اگر تو مومن ہے تو مجھ پر ظلم نہ کر۔[1] پناہ مانگنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس وقت فرشتہ انسانی صورت میں اُن کے لیے ظاہر ہوا اور وہ اس جگہ میں اکیلی تھی اور اُن کے اور اُن کی قوم کے درمیان پردہ تھا تو وہ اس سے ڈریں اور یہ گمان کیا کہ وہ اُن کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے، لہٰذا بولیں کہ مجھ کو رحمٰن کی پناہ ہے تجھ سے اگر تو اللہ سے ڈرتا ہے۔ یہ اس کو اللہ کی یاد دلانا ہے۔ کسی کو دور کرنے کے لیے یہی طریقہ مشروع ہے کہ اسہل فالاسہل (آسان سے آسان تر طریقے) کے ساتھ ہو، اس لیے انھوں نے پہلے اللہ عزوجل سے ڈرایا۔

ابو وائل رحمہ اللہ نے قصہ مریم علیہا السلام کو ذکر کیا تو کہا کہ انھوں نے اچھی طرح جان لیا کہ تقی ذونُہیَہ، یعنی دانش مند ہوتا ہے، جبکہ وہ بولیں کہ میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تو تقی ہے۔[2] (أخرجه ابن جرير) جبریل علیہ السلام بولے کہ میں تو تیرے رب ہی کا بھیجا ہوا ہوں، جس کی تو نے پناہ چاہی اور میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جن سے ارادۂ بد کی توقع کی جاتی ہے جس کا خطرہ تیرے دل پر گزرا ہے۔ میں تو اس لیے آیا کہ تجھ کو ایک لڑکا دے جاؤں جو زکی، یعنی گناہوں سے پاک ہو، جو صفائی و عفت و پاکی اور پارسائی پر پرورش پائے گا۔ کسی نے کہا کہ زکی سے مراد نبی ہے۔

[1] فتح البيان (٨/ ١٤٧۔ ١٤٨)
[2] صحيح البخاري (٤/ ١٧٥٩) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٣)

جبریل علیہ السلام نے لڑکا دے جانے کی نسبت اپنی طرف کی، اس لیے کہ اس میں سبب وہی ہیں، اس لحاظ سے کہ مریم علیہا السلام کو انھیں کی طرف سے خبر دی گئی یا اس لحاظ سے کہ ظاہر میں نفخ (روح پھونکنا) انھیں کے ساتھ قائم ہوا۔

بعض مصاحف میں جو یوں ہے کہ "أَمَرَنِيْ أَنْ أَهَبَ لَكِ" وہ اسی بات کو تقویت دیتا ہے، یعنی اللہ نے مجھ کو امر کیا ہے کہ میں تجھے دے جاؤں۔ ایک قراءت "لِيَهَبَ لَكِ" ہے۔ اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے کہ وہ تجھ کو پاک لڑکا بخشے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے کہ فرشتے نے مریم علیہا السلام کو جواب دیا اور جو خوف ان کے دل میں پیدا ہوا تھا، اس کو زائل کیا کہ میں اس سے نہیں ہوں، جو تو گمان کرتی ہے، لیکن میں تو تیرے رب کا قاصد ہوں، یعنی مجھ کو اللہ تعالیٰ نے تیری طرف بھیجا ہے۔

کہتے ہیں کہ جس وقت مریم علیہا السلام نے رحمٰن کا ذکر کیا تو جبریل علیہ السلام خوف کے مارے کانپ اُٹھے اور اپنی اصل حالت کی طرف پھر گئے اور کہا: "إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِيَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا" یعنی میں تو تیرے رب کا رسول ہوں، تاکہ وہ تجھ کو ایک پاک لڑکا بخشے۔ ابو عمرو بن العلاء نے اسی طرح پڑھا ہے۔[1] یہ مشہور قاریوں میں سے ایک قاری ہیں۔ دوسرے قاریوں نے "أَهَبَ لكِ غلٰما زكيا" پڑھا ہے۔ دونوں قراءتوں کے لیے ایک وجہِ حسن ہے اور معنی صحیح ہیں اور ہر ایک دوسری کو مستلزم ہے، مریم علیہا السلام بولیں کہ میرے لڑکا کہاں سے ہوگا، یعنی انھوں نے اس سے تعجب کیا اور کہا کہ میرے لڑکا کیسے ہوگا، یعنی یہ لڑکا کس طرح مجھ میں پایا جائے گا، حالانکہ میں خاوند والی نہیں ہوں اور نہ ہی بدکاری کا خیال تک مجھے آیا ہے۔ اسی لیے کہا کہ مجھ کو کبھی کسی آدمی نے چھوا تک نہیں اور نہ ہی میں کبھی بدکار تھی۔ بغی زانی بدکار عورت کو کہتے ہیں، اسی لیے حدیث شریف میں مہر بغی سے نہی (ممانعت) آئی ہے۔[2]

فتح البیان میں ہے کہ "مس" کے معنی نکاحِ حلال کے ساتھ چھونا ہیں، کیونکہ وہ اس سے کنایہ ہے اور زنا ایسا نہیں ہے۔ زنا میں جو بولا جاتا ہے سو وہ "فجر بها و خبث بها" ہے یا جو اس کے مشابہ ہے۔ ان دونوں کے معنی یہ ہیں کہ مرد نے عورت سے زنا کیا۔ بغی زانیہ بدکار عورت ہے جو مردوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بغی کی اصل بغوی بر وزن فعول ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے کہ بروزن فعیل ہے۔[3] ابن انباری نے کہا کہ بغی زیادہ تر عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کے حائض اور عاقر کے لیے جاری کرنے کے واسطے۔ عرب لوگ "رجل بغی" بہت ہی کم بولتے ہیں، یعنی جیسے حائض اور عاقر بغیر تا کے خاص عورتوں کے لیے ہے، اسی طرح بغی بھی غالباً عورتوں ہی میں بولا جاتا ہے اور مردوں میں نہایت ہی کم بولتے ہیں۔

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ١٦٤)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٧) تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٥)

(3) فتح القدير (٣/ ٤٥٢)

حلال اور حرام دونوں طریقوں کے جماع کی نفی کی، تاکہ فحشاء اور زنا سے اپنی پاکیزگی پر تاکید ہو سکے، یعنی لڑکا سوائے نکاح یا سفاح وزنا کے نہیں ہوتا اور یہاں ان دونوں کاموں میں سے ایک بھی نہیں ہوا۔ پھر لڑکا ہونے کی کیا صورت؟ کسی نے کہا کہ مریم علیہا السلام نے کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں سمجھا، لیکن یہ چاہا کہ یہ لڑکا کیوں کر ہوگا، آیا خاوند کے ذریعے سے ہوگا کہ آیندہ زمانے میں اس سے نکاح کریں گی یا اللہ تعالیٰ اس لڑکے کو ابتداءً پیدا کرے گا۔

جبریل علیہ السلام بولے: بات یوں ہی ہے کہ باپ کے بغیر تجھ سے لڑکا پیدا کرنا ہے۔ تیرے رب نے فرمایا ہے کہ تیرے لڑکے کا بغیر باپ کے پیدا کرنا مجھ پر آسان ہے، یعنی میرے امر سے جبریل علیہ السلام تجھ میں پھونکیں سو تو اس سے حاملہ ہو جائے اور پیدا کیا ہم نے اس کو تاکہ اس کو، یعنی اس لڑکے کو یا اس کو بغیر باپ کے پیدا کرنے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی کریں کہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال پر استدلال کریں، یعنی اللہ تعالیٰ طرح طرح کی اور رنگا رنگ مخلوق پیدا کر سکتا ہے، کیوں کہ آدم علیہ السلام کو بغیر مرد و عورت کے بنایا اور حوا علیہا السلام کو مرد سے بغیر عورت کے پیدا کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو عورت سے بغیر مرد کے پیدا کیا اور باقی خلق کو نر اور مادہ دونوں سے بنایا۔ (قاله الكرخي)

اور تاکہ ہم اس کو اُن لوگوں کے لیے اپنی ایک رحمتِ عظیم کریں، جو اس پر ایمان لائیں گے، اس لیے کہ وہ اس سے ہدایت اور خیرِ کثیر پائیں گے، کیوں کہ ہر نبی اپنی اُمت کے لیے رحمت ہوتا ہے اور یہ کام ٹھہر چکا ہے، یعنی اس کا پیدا کرنا ایک ایسا امر ہے کہ میرے علم میں اس کی قضا و قدر جاری ہو چکی ہے، اس کا حکم ہو چکا ہے، اس سے فراغت ہو چکی ہے، نہ وہ پھیرا جا سکے، نہ اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل ہو سکے۔ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اللہ پاک اس کو مقدر کر چکا ہے اور قلم اس سے سوکھ گیا ہے۔[1]

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ فرشتے نے مریم علیہا السلام کو اس کے سوال کا جواب یوں دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے کہ وہ عن قریب تجھ سے ایک لڑکا پیدا کرے گا، گو تیرا خاوند نہ ہو اور نہ تجھ سے زنا وجود میں آئے، کیوں کہ وہ جو چاہتا ہے اس پر قادر ہے اور اسی لیے اس نے فرمایا ہے: ﴿ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾ یعنی تاکہ ہم اس کو لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل اور علامت اور نشانی بنا دیں۔ اس باری تعالیٰ اور خالق کی نشانی، جس نے ان کے پیدا کرنے میں رنگا رنگی کی ہے۔ سو اُن کے باپ کو یعنی آدم علیہ السلام کو بغیر نر و مادہ کے بنایا اور حوا کو نر سے مادہ کے بغیر پیدا کیا اور باقی اولاد کو نر و مادہ دونوں سے پیدا کیا، مگر عیسیٰ علیہ السلام کہ ان کو عورت سے بغیر مرد کے تخلیق فرمایا۔ پس چاروں طرح کی تقسیم پوری ہوگئی، جو اس کی کمال قدرت اور عظیم سلطان پر دلیل ہے۔ فلا إله غيره ولا رب سواه.

﴿ وَرَحْمَةً مِّنَّا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم اس لڑکے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کریں وہ نبیوں میں سے

---

[1] فتح البیان (٨/ ١٤٨۔ ١٤٩)

ایک نبی ہو، جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور عبادت کی طرف بلائے، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے:
﴿ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٤٥۔ ٤٦] ''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوش خبری دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا اور آخرت میں بڑے مرتبے والا اور اللہ کے قریبی بندوں میں سے ہوگا۔ اور وہ لوگوں سے ماں کی گود میں اور بڑی عمر میں بھی کلام کرے گا اور نیکو کاروں میں سے ہوگا۔'' یعنی وہ اپنے رب کی عبادت کی طرف بلائے گھوارے میں اور اُدھیڑ عمر میں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نے کہا کہ جس وقت میں تنہا ہوتی تو عیسیٰ علیہ السلام مجھ سے بات چیت کرتا اور مجھ سے کلام کرتا، حالانکہ وہ میرے شکم میں تھا اور جس وقت میں لوگوں کے ساتھ ہوتی تو میرے پیٹ میں تسبیح وتکبیر کرتا۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

﴿ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴾ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ تمام جبریل علیہ السلام کے کلام سے ہے کہ اُن کو اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اللہ پاک کے علم وقدر ومشیت میں مقرر ہو چکا ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ پاک کی خبر سے ہے کہ وہ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دیتا ہے اور اس قول سے ان کی شرم گاہ میں پھونکنے سے کنایہ کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ [التحریم: ١٢] ''(اور مثال بیان فرمائی) مریم بنتِ عمران کی، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس (کے گریبان) میں اپنی روح پھونکی۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ [الانبیاء: ٩١] ''اور اس عورت کو (یاد کریں) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔'' امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ معاملہ فیصل ہو چکا ہے کہ اللہ نے اس پر عزم کر لیا ہے، پس اس سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے، اس کے سوا اور کوئی قول بیان نہیں کیا۔[2] واللّٰه أعلم.

مریم علیہا السلام کی نبوت میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ نبی ہیں، صرف اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتہ بھیجا اور انھوں نے فرشتے سے بات چیت کی۔ کسی نے کہا کہ وہ نبی نہ تھیں اور فرشتے نے جو اُن سے کلام کیا سو وہ آدمی کی مثال پر تھا۔ متفق علیہ بات یہ ہے کہ منفی وحیِ رسالت ہے نہ کہ مطلق وحی، اور یہاں جو وحی ہے وہ بیٹے کی بشارت ہے نہ کہ رسالت کی۔ اس بات پر سورت آل عمران میں کلام گزر چکا ہے۔[3]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٢) [2] تفسیر الطبري (١٨/ ١٦٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٥٥۔ ١٥٦) [3] رقم الآیة [٤٥]

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

بالآخر وہ اس کے ساتھ حاملہ ہوگئی، تو اس (حمل) کو لے کر دور کی ایک جگہ میں الگ جا بیٹھی (22) پھر دردِ زہ اسے کھجور کے ایک تنے کی طرف لے آیا، (تو) وہ بولی: اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بھولائی ہوتی (23)

استقرارِ حمل اور ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام:

اللہ تعالیٰ مریم علیہا السلام کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ جس وقت جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو کہا جو کچھ کہ کہا تو وہ اللہ تعالیٰ کی قضا کی مطیع اور فرماں بردار ہوگئیں۔ بہت سے علمائے سلف نے ذکر کیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اس وقت ان کے کرتے کی جیب میں پھونکا تو وہ پھونک نیچے اتری، یہاں تک کہ شرم گاہ میں داخل ہوگئی، سو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کو لڑکے کا حمل ہوگیا۔ پھر جب اُن کو حمل ہوگیا تو اس کی ان کو طاقت نہ ہوئی، تنگ دل ہوئیں، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگوں سے کیا کہیں، کیوں کہ وہ نہ جانتی تھیں کہ لوگ ان کو اس معاملے میں سچا نہ جانیں گے کہ جس کی وہ اُن کو خبر دیں گی، سوا اس بات کے کہ انھوں نے اپنا بھید ظاہر کیا۔ زکریا علیہ السلام کی بیوی اُن کی خالہ تھیں، ان سے اپنا حال بیان کیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ زکریا علیہ السلام نے اللہ پاک سے لڑکا مانگا تھا، اُن کی دعا قبول ہوئی اور اُن کی بیوی حاملہ ہوگئی۔ پھر مریم علیہا السلام اپنی خالہ کے پاس آئیں تو وہ ان کے واسطے کھڑی ہوگئیں ان کو گلے لگایا اور کہا کہ مریم تو جانتی ہے کہ میں حاملہ ہوں۔ انھوں نے ان سے کہا: کیا تم کو معلوم ہے کہ میں بھی حاملہ ہوں اور اپنا حال اور قصہ، جو کچھ اوپر گزرا تھا، اُن سے ذکر کیا اور وہ لوگ ایسے خاندان سے تھے، جو ایمان لانے والا اور تصدیق کرنے والا تھا۔

پھر جب زکریا علیہ السلام کی بیوی، جس وقت مریم علیہا السلام کے سامنے ہوتیں تو جو کچھ اُن کے پیٹ میں تھا، اس کو پاتیں کہ وہ اس کو سجدہ کرتا ہے جو مریم علیہا السلام کے پیٹ میں ہے۔ یعنی اُن کے شکم والا ان کے شکم والے کی تعظیم اور خضوع کرتا ہے، اس لیے کہ ان کے دین وملت میں سلام کے وقت سجدہ کرنا مشروع تھا، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو سجدہ کیا اور جس طرح کہ اللہ پاک نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، لیکن ہماری ملتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ حرام ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اور یحییٰ بن زکریا علیہما السلام دونوں خالہ کے بیٹے ہیں اور دونوں کا حمل جمیعاً معاً ایک ساتھ تھا، سو مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کی والدہ نے مریم علیہا السلام سے کہا کہ میں دیکھتی ہوں کہ جو میرے پیٹ میں ہے، وہ اس کو سجدہ کرتا ہے، جو تیرے پیٹ میں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ

نے کہا کہ میں گمان تو کرتا ہوں کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کے لیے ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا کیا ہے کہ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو بھلا چنگا کر دیتے ہیں۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

پھر مفسرین نے عیسیٰ علیہ السلام کی مدتِ حمل میں اختلاف کیا ہے۔ لہٰذا جمہور سے مشہور قول یہ ہے کہ نو مہینے حاملہ رہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آٹھ ماہ اسی لیے آٹھ ماہ کا بچہ نہیں جیتا۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے مریم علیہا السلام کے حمل کا پوچھا تو فرمایا کہ وہ صرف اس طرح تھا کہ وہ حاملہ ہوئیں، پھر جن دیا۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول غریب ہے۔ گو ظاہری طور پر آیتِ کریمہ ﴿ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ... الخ﴾ سے ماخوذ ہے۔ پس حرفِ فا اگرچہ تعقیب (پیچھے آنا) کے واسطے ہے، لیکن ہر شے کی تعقیب اسی شے کے موافق ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا ﴾ [المؤمنون: ١٢۔ ١٤] ”پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا، پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا، پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیں۔“ سو اس آیت میں اُن میں سے ہر ایک کے موافق حرفِ فا تعقیب کے لیے ہے۔

صحیحین میں ثابت ہو چکا ہے کہ ہر دو صفتوں کے درمیان چالیس دن ہیں۔[4] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ﴾ [الحج: ٦٣] ”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے (مردہ زمین پر) پانی نازل کیا، پھر اس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔“

ظاہری طور پر مشہور قول، حالانکہ اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہے، یہ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوئیں، جیسے عورتیں اپنی اولاد کے ساتھ حاملہ ہوتی ہیں اور اسی لیے جس وقت حمل کے آثار اُن میں ظاہر ہوئے اور اُن کے ساتھ مسجد میں ان کے رشتے داروں میں سے ایک نیک مرد تھا، جو اُن کے ہمراہ بیت المقدس کی خدمت کیا کرتا تھا، اسے یوسف نجار کہتے تھے۔ پھر جب اس نے اُن کے پیٹ کی گرانی اور بڑائی دیکھی تو اس نے اس بات کو ان کی حالت سے اوپرا سمجھا۔ پھر مریم علیہا السلام کی عفت اور پاک دامنی، براءت اور نزاہت نے جس کو وہ خوب جانتا تھا، اس خیال سے اس کو پھیر دیا۔ پھر ان کی حالت پر غور کیا، جس میں وہ تھیں تو اس کے ذہن میں ان کی یہ حالت اس طرح پھرنے لگی کہ اس کو اپنے جی سے نکال نہیں سکتا تھا، اب تو اس کے دل نے اسے اس پر آمادہ کیا کہ مریم علیہا السلام سے تعریضاً اور اشارتاً اس بارے میں سوال کرے، وہ کہہ بیٹھا کہ اے مریم! میں تجھ سے ایک بات پوچھنے والا ہوں، لہٰذا تو مجھ پر جلدی نہ کرنا، یعنی خفا مت ہونا، وہ بولیں کیا بات ہے؟ اس نے کہا: کبھی کوئی درخت بغیر دانے کے پیدا ہوتا ہے اور کیا کھیتی

[1] الدر المنثور (٥/ ٤٨٨) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٩٣) [3] تفسير الطبري (١٨/ ١٧٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

بغیر بیج کے ہوتی ہے اور کیا لڑکا بغیر باپ کے ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں اور اس کی بات کو سمجھ گئیں جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ جواب دیا کہ تیری یہ بات کہ کیا کوئی درخت بغیر دانے کے ہوتا ہے اور کھیتی بغیر بیج کے ہوتی ہے۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ نے پہلے پہل درخت اور کھیتی کو بغیر دانہ اور تخم کے پیدا کیا ہے اور یہ بات کہ کیا لڑکا بغیر باپ کے پیدا ہوتا ہے، سو بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا ہے۔ جب انھوں نے یہ جواب دیا تو یوسف نے اُن کی تصدیق کی اور اُن کے حال کو ان کے واسطے تسلیم کیا اور مان لیا۔ جس وقت مریم علیہا السلام نے اپنی قوم سے اس بات کا پوشیدہ ڈر دل میں رکھا کہ وہ اُن پر زنا کی تہمت لگائیں گے تو ان سے ایک دور مکان میں کنارہ کش ہوگئیں، تاکہ وہ ان کو نہ دیکھیں اور نہ وہ لوگ ان کو دیکھیں۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پھر جب ان کو عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ہو گیا اور انھوں نے اپنا گھڑا بھر لیا اور لوٹیں تو خون اُن سے رک گیا اور اُن کو دُکھ درد پہنچا اور قے آنا اور رنگ بدلنا، جو حاملہ عورت کو بچے کے حمل پر پہنچا کرتا ہے، یہاں تک کہ ان کی زبان پھٹ گئی۔ جب اُن کا یہ حال ہوا تو جو رنج و اَلم آلِ زکریا علیہ السلام پر داخل ہوا وہ کسی اور گھر والوں پر نہ ہوا تھا اور بنی اسرائیل میں قصہ پھیل گیا تو وہ بولے کہ یہ کام کرنے والا یوسف ہی ہے جو اس کے ساتھ کنیسہ میں تھا۔ اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مریم علیہا السلام لوگوں سے چھپ گئیں اور اُن سے دور پردہ کر لیا کہ کوئی ان کو نہ دیکھے اور نہ وہ کسی کو دیکھیں۔[1]

﴿ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ﴾ یعنی دردِ زہ نے ان کو مضطر و بے قرار و بے چین کر دیا تو وہ اس مکان میں جس میں کنارہ کر گئی تھیں، کھجور کے درخت کی جڑ کے پاس چلی گئیں۔ اس مکان کے بارے میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ وہ کونسا مکان تھا اور کیسا تھا اور کہاں تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے تو یوں کہا ہے کہ وہ اُن کی محراب سے بیت المقدس میں، جس میں وہ نماز پڑھا کرتی تھیں، شرقی جانب تھا۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ بھاگتی چلی گئیں، پھر جب وہ شام اور بلادِ مصر کے درمیان پہنچیں تو اُن کو دردِ زہ نے آلیا۔ امام وہب رحمہ اللہ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ جگہ بیت المقدس سے آٹھ میل پر ہے، اس جگہ پر ایک گاؤں ہے جس کو بیتِ لحم کہا جاتا ہے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسراء کے بارے میں احادیث میں جو نسائی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی میں شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، یہ بات گزر چکی ہے کہ یہ بیتِ لحم میں ہے۔[3] فالله أعلم۔ اور یہی قول مشہور ہے۔ نصاریٰ اس بات میں شک نہیں کرتے کہ وہ بیتِ لحم میں ہے اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا اور اس کے بارے میں حدیث وارد ہو چکی ہے اگر وہ صحیح ہو۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٥٧) [2] تفسیر الطبري (١٨/ ١٦٨۔ ١٧٠) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٥٧)
[3] ان کی تخریج سورۃ الإسراء [آیت نمبر: ١] کے تحت گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ مریم علیہا السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے: ﴿ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ اس میں فتنے کے وقت موت کی آرزو کرنے کا جواز ہے۔ اس لیے کہ وہ پہچان گئی تھیں کہ وہ اس لڑکے کی وجہ سے عن قریب آزمایش اور تکلیف میں پڑیں گی، لوگ ان کے کلام کو سداد (درستی) اور راستی پر محمول نہ کریں گے اور نہ اُن کو اپنی خبر میں سچا جانیں گے، اس کے باوجود کہ وہ اُن کے نزدیک عبادت گزار اور قربانی دینے والی تھیں، اب ان کے نزدیک اُن کے گمان میں وہ زانیہ ہو جائیں گی۔ اسی لیے کہا کہ کاش میں اس حال سے پہلے مر جاتی اور نسیاً منسیاً ہو جاتی۔ یعنی نہ میں پیدا کی جاتی اور نہ کوئی شے ہوتی۔ یہ قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ مریم علیہا السلام نے کہا: اور وہ دردِ زہ کی تکلیف اُٹھا رہی تھیں، پیٹ کے بوجھ سے لوگوں سے شرم کرتے ہوئے کہا کہ کاش! اس کرب سے پہلے جس میں مَیں ہوں اور بغیر خاوند کے لڑکا جننے کے رنج سے پہلے مَیں مر جاتی اور بھولی ہوئی ہو جاتی تو میری طلب و تلاش چھوڑ دی جاتی، جیسے حیض کے لتے کہ جس وقت وہ پھینک دیے جاتے ہیں تو طلب نہیں کیے جاتے اور نہ اُن کو یاد کرتے ہیں۔ جو شے بھولی جائے اور چھوڑ دی جائے تو وہ نسی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مَیں ایسی شے ہو جاتی کہ نہ پہچانی جائے نہ ذکر کی جائے نہ معلوم کیا جائے کہ میں کون ہوں۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ ادھورا بچہ ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ ہوتی میں کوئی شے کبھی۔[1] جو حدیثیں موت کی تمنا کرنے کی ممانعت میں ہے، سوائے فتنے کے وقت کے وہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں: ﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۱] ''تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔''

فتح البیان کا بیان:

آیتِ باب کے بارے میں فتح البیان میں یہ لکھا ہے کہ ﴿ فَحَمَلَتْهُ ﴾ کی ضمیر منصوب موہوب کی طرف پھرتی ہے، یعنی وہی اللہ کا بخشا ہوا لڑکا۔ یہاں کلام مطوی یعنی مقدر و محذوف ہے، عبارت کی تقدیر یہ ہے کہ مریم علیہا السلام فرشتے کی بات کی طرف سے مطمئن ہوئیں، پھر وہ اُن سے قریب ہوا، پھر اس نے اُن کے کُرتے کی جیب میں پھونکا اور وہ ان سے بعید تھا، پھر پھونک اُن کے پیٹ کی طرف پہنچی، پھر انھوں نے اس موہوب کو پیٹ میں لیا اور اپنے شکم میں ایک مصور کا احساس کیا، اُن کی عمر اس وقت تیرہ یا دس یا بیس یا سولہ برس کی تھی۔ کسی نے کہا کہ وہ پھونک اُن کے دامن میں یا آستین میں تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کے منہ میں تھی۔ یہ مراد نہیں کہ فرشتے نے ان کی شرم گاہ میں بطورِ مباشرت کے پھونکا ہو۔

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۷۱۔ ۱۷۲)

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح بشر کی صورت میں متمثل ہو گئی، لہٰذا مریم علیہا السلام نے اس کو پیٹ میں لیا، کہا کہ جس نے اُن سے خطاب کیا، اسی کو انھوں نے پیٹ میں لیا، وہ اُن کے منہ میں داخل ہو گیا۔[1] بعض نے کہا ہے کہ جننا اُن کا اس حمل کے ساتھ متصل تھا، بغیر مدتِ حمل کے گزرنے کے بدلیل آیتِ کریمہ: ﴿ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴾ یعنی حمل کو لیے ہوئے علاحدہ ہو گئیں اور ملامت گروں کے ڈر کے مارے اپنے گھر والوں سے دور ایک مکان کی طرف کنارہ کر گئیں۔ کسی نے کہا کہ یہ مکان پہاڑ کے پرے تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد اس گھر میں ایک دور کی جگہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اقصیٰ وادی اور وہ وادی بیتِ لحم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چھے مہینے حاملہ رہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آٹھ مہینے اور یہ ایک اور نشانی ہے، کیوں کہ آٹھ مہینے کا بچہ جیتا نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ ایک ساعت حاملہ رہیں اور ایک ساعت میں اُن کی صورت بنائی گئی اور ایک ساعت میں اس کو جَن دیا، جس وقت کہ اسی دن کا سورج ڈھل گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حمل سے پہلے دو حیض اُن کو آ چکے تھے۔ صاحبِ فتح البیان فرماتے ہیں کہ اس تفصیل پر کوئی دلیل نہیں ہے نہ اس کی کوئی سند ہے سوائے اخبارِ احبار کے یا آرائے رجال کے۔ اگر یہ کسی نصِ صحیح سے ثابت ہوتے تو اس کی طرف جانا واجب ہوتا اور یہ دوسری نشانی ٹھہرتا۔

﴿ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ ﴾ "جاء" و "أجاء" دو لغت ایک ہی معنی میں ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ "ألجأها واضطرها و جاء بها"، یعنی مضطر و بے قرار کیا اور دردِ زہ ان کو لایا۔ شبل نے ﴿ فَاَجَآءَهَا ﴾ پڑھا ہے، مفاجاة سے، یعنی ناگہاں ان کو لایا اور مصحفِ ابی میں "فَلَمَّا أَجَاءَهَا" ہے، یعنی ہر گاہ کہ لایا ان کو۔[2] کشاف میں کہا ہے: "أجاءها" منقول ہے "جاء" سے، مگر اتنی بات ہے کہ نقل کے بعد اس کا استعمال "إلجاء" کی طرف بدل گیا۔[3] اس قول میں بُعد ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ہر ایک دونوں فعلوں میں بوضع مستقل موضوع ہے، یعنی ایک دوسرے سے منقول نہیں ہے۔ "مخاض" جننے کے درد کو کہتے ہیں، یہ "مخضت المرأة تمخض مخضا و مخاضا" کا مصدر ہے۔ عرب لوگ اس کو اس وقت بولتے ہیں کہ جب عورت کا جننا قریب ہو۔ جمہور کی قراءت میم کی فتح (ــَــ) کے ساتھ ہے اور بکسر میم (ــِــ) بھی پڑھا گیا ہے۔

﴿ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ﴾ جذع کہتے ہیں سوکھی کھجور کے تنے کو جس کا سر نہ ہو، گویا مریم علیہا السلام نے کوئی شے طلب کی کہ اس کے ساتھ ٹیک لگائیں اور اس پر اعتماد فرمائیں اور اس سے لٹکیں، جس طرح کہ حاملہ دردِ زہ کی شدت کے سبب سے کسی شے کے ساتھ لٹک جاتی ہے جس کو وہ اپنے پاس پاتی ہے۔ ﴿ النَّخْلَةِ ﴾ میں تعریف کا الف لام یا تو جنس کے واسطے ہے، یعنی کوئی سی کھجور یا عہد کے لیے ہے، یعنی کھجور کا کوئی معین درخت، جس سے آرام حاصل کیا جا سکے۔ مشہور بات یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بیتِ لحم میں ہوئی تھی۔ مریم علیہا السلام جس وقت بھاگیں اور عیسیٰ علیہ السلام پر ڈریں

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٣) [2] فتح القدير (٣/ ٤٥٣) [3] الكشاف (٣/ ١٢)

تو جلدی سے اُن کو بیت المقدس لے آئیں، پھران کو صخرہ پر رکھ دیا تو وہ اُن کے واسطے پست ہوگیا اور مثلِ مہد، یعنی پالنے کی طرح بن گیا جو اب تک موجود ہے۔ بیت المقدس میں اس کی زیارت کی جاتی ہے۔ پھر کئی دِنوں کے بعد اُن کو لے کر دریائے اُردن کی طرف متوجہ ہوئیں، پھر اس میں ان کو غوطہ دیا۔ یہ وہی دن ہے جس کو نصاریٰ عید ٹھہراتے ہیں اور اس کا نام یوم الغطاس رکھتے ہیں اور وہ یوں گمان کرتے ہیں کہ اس دن پانی پاک ہو گئے، سو اسی لیے ہر پانی میں غوطہ لگاتے ہیں۔ جس شخص نے یہ زعم کیا کہ ان کو مصر میں جنا ہے تو اس نے کہا کہ کورۂ اہناس (اہناس کے کونے) میں ولادت ہوئی اور یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔[1] انتھی. من البحر لأبي حیان۔ انہاس بہنسا کی جانب میں ہے۔

﴿قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا﴾ یعنی جو ایذا و تکلیف ان کو پہنچی تھی، اس سے گھبرا کر یوں کہا: کاش! میں اس وقت یا اس امر سے پہلے مر جاتی۔ حرفِ یا تنبیہ کے لیے ہے، اس لیے کہ منادیٰ غیر عاقل ہے۔ انھوں نے موت کی آرزو لوگوں کی شرم کے مارے کی یا فضیحت اور رسوائی کے خوف سے کی، کیوں کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ لوگ ان کے دین میں اُن کے ساتھ بدگمانی کریں گے یا اس لیے کہ لوگ اُن کی وجہ سے بہتان میں پڑیں گے۔ ﴿وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا﴾ یعنی ہو جاتی میں ایک شے حقیر متروک۔ "نسي" کلامِ عرب میں وہ حقیر شے ہے، جس کی شان یہ ہو کہ بھولی جائے اور اس کی یاد نہ کی جائے نہ پہچانی جائے نہ اس کے گم جانے سے رنج کیا جائے، جیسے: میخ و رسی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نسي" حیض کے لتّے ہیں، جن کو عورت ڈال دیتی ہے۔[2] لہٰذا مریم علیہا السلام فرماتی ہے کہ میں نسیا منسیا ہو جاتی، یعنی حیض کے لتوں کی طرح ڈال دی گئی۔ "نسیا" کو نون کی زبر اور زیر کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت ہیں، جیسے: حَجر و حِجر اور وَتر و وِتر۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے "نسأ" ہمزہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نوف بکالی نے ہمزہ اور نون کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔[3] نون منسی وہ شے ہے، جو ترک کر دی جائے، جس کی یاد نہ کی جائے نہ پہچانی جائے نہ کسی آدمی کے دل میں اس کا خیال آئے۔[4]

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾
وَهُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾
فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ
فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

پھر اس (فرشتے) نے اس کے نیچے (کے علاقے) سے اسے آواز دی کہ غم نہ کھا، تیرے رب نے تجھ سے نیچے (کے علاقے میں) ایک چشمہ جاری کر دیا ہے (24) اور تو کھجور کا تنا اپنی طرف ہلا، وہ تجھ پر تازہ پکی

[1] تفسیر البحر المحیط (٦/ ١٧٢) [2] معاني القرآن (٣/ ١١٦) [3] فتح القدیر (٣/ ٤٥٣) [4] فتح البیان (٨/ ١٤٩۔ ١٥١)

ہوئی کھجوریں گرائے گا25 چنانچہ تو کھا اور پی اور (اپنی) آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر تو انسانوں میں سے کسی کو دیکھے تو اس سے کہہ دینا: بے شک میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، لہٰذا آج میں کسی انسان سے ہرگز کلام نہیں کروں گی26

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد مریم علیہا السلام کو ہدایات:

ان کے دین میں یہ منت درست تھی کہ نہ بولنے کا روزہ بھی رکھتے۔ ہمارے دین میں یہ منت درست نہیں ہے۔

بعض نے ''مَنْ تَحْتَهَا'' پڑھا ہے، بمعنی ''الذي تحتها'' یعنی ''مَن'' میم موصولہ کی زبر کے ساتھ اور دوسروں نے ''مِنْ تَحْتِهَا'' پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ''مِن'' میم کی زیر کے ساتھ جو حرفِ جر ہے۔ مفسرین نے پکارنے والے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کون ہے۔ عوفی وغیرہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَا'' جبریل علیہ السلام ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام نے بات نہیں کی یہاں تک کہ مریم علیہا السلام اُن کو اپنی قوم کے پاس لائیں۔

امام سعید بن جبیر، ضحاک، عمرو بن میمون، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی ایسا ہی کہا ہے کہ وہ فرشتے جبریل علیہ السلام ہیں، یعنی انھوں نے مریم علیہا السلام کو وادی کے نیچے سے پکارا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیسیٰ بن مریم ہیں اور ایسا ہی قتادہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے، کہا ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ اُن کے فرزند ہیں، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور یہی سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت ہے کہ وہ اُن کے فرزند ہیں، کہا: کیا تو نہیں سنتا اللہ تعالیٰ کو کہ وہ فرماتا ہے: ﴿ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ﴾ اور اسی قول کو ابن زید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور اسی کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اختیار فرمایا ہے۔[1]

﴿ اَلَّا تَحْزَنِيْ ﴾ یعنی جبریل علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کو پکارا اور اُن سے کہتے تھے کہ تو غم نہ کر ﴿ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴾ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''سَرِیّ'' جدول ہے، یعنی چھوٹی نہر ایسا ہی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ''سَرِیّ'' نہر ہے۔ عمرو بن میمون بھی اسی کے قائل ہیں کہ نہر ہے، جس سے وہ پانی پییں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سَرِیّ'' سریانی زبان میں نہر ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ''سَرِیّ'' چھوٹی نہر ہے نبطی زبان میں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھوٹی نہر ہے سریانی زبان میں۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ چھوٹی نہر ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سَرِیّ'' اہلِ حجاز کی لغت میں جدول ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سَرِیّ'' ''ربیع ماء'' ہے یعنی پانی کی جدول۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سَرِیّ'' نہر ہے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے[2] اور اس میں ایک حدیث مرفوع وارد ہوئی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ کہتے تھے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

---

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۷۲۔ ۱۷٤) تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۰٤) [2] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۷۵۔ ۱۷۷)

کہ وہ فرماتے تھے: بیشک ''سَرِیّ''، جس کا اللہ نے کہا ہے واسطے مریم کے ﴿ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴾ ایک نہر ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے نکالا، تاکہ وہ اس سے پئیں۔[1] (أخرجه الطبراني)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس وجہ سے نہایت غریب ہے: ''وأيوب بن نهيك هذا هو الحبلي، قال أبو حاتم الرازي: ضعيف. وقال أبو زرعة: منكر الحديث. وقال أبو الفتح الأزدي: متروك الحديث''[2] دوسروں نے کہا کہ ''سَرِیّ'' سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ امام حسن، ربیع بن انس اور محمد بن عباد بن جعفر رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور یہی قتادہ رحمہ اللہ کی روایتوں میں سے ایک ہے اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا بھی یہی قول ہے۔[3] پہلا قول زیادہ ظاہر ہے اور اسی لیے اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ ﴾ یعنی اور لے تو اپنی طرف کھجور کی جڑ۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ سوکھی تھی، کسی نے کہا کہ میوہ دار تھی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عجوہ تھی۔ یہ کھجور کی ایک قسم ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا کہ ابو داود نُفیع اعمیٰ سے روایت کیا ہے کہ وہ صرخانہ (خرما کی ایک جنس) تھی۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ ایک درخت تھا، لیکن اپنے پھل کے وقت میں نہ تھا۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور اسی لیے اُن پر اس کی منت رکھی ہے کہ کھانا پینا اس کے نزدیک کر دیا، پس فرمایا: ﴿ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝25 فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ﴾ یعنی تو اپنا جی خوش کر۔ اسی لیے عمرو بن میمون نے کہا ہے کہ زچہ کے لیے خشک و تر کھجور سے بہتر کوئی شے نہیں، پھر یہ آیتِ کریمہ پڑھی۔[4]

عروہ بن رویم رحمہ اللہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم اکرام کرو اپنی پھوپھی کھجور کا اس لیے کہ وہ اس مٹی سے پیدا کی گئی ہے کہ جس سے آدم علیہ السلام بنے ہیں اور درختوں میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ وہ پیوند لگایا جائے سوا اس کے اور فرمایا کہ کھلاؤ تم اپنی بچے والی عورتوں کو رطب، یعنی پکی تازی کھجور، پھر اگر رطب نہ ہو تو تمر، یعنی خشک کھجور۔ (حدیث کے الفاظ ہیں: أطعموا نسائكم الولد الرطب... الخ) اور نہیں ہے درختوں سے کوئی درخت زیادہ آؤ بھگت والا اللہ پر اس درخت سے کہ جس کے نیچے مریم بنت عمران نے نزول کیا۔[5] (أخرجه ابن أبي حاتم)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''هذا حديث منكر جدا، و رواه أبو يعلىٰ عن شيبان به''[6] بعض

---

[1] المعجم الکبیر (١٢/ ٣٤٦) اس کی سند میں ''ایوب بن نہیک'' اور ''یحییٰ بن عبداللہ بابلتی'' ضعیف راوی ہیں۔

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٨) [3] تفسير الطبري (١٨/ ١٧٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٥)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ١٧٨۔ ١٨٩) تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٨)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٦) مسند أبي يعلىٰ (١/ ٣٥٣)

[6] تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٩) اس کی سند میں ''مسرور بن سعید'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٦٣)

نے ''تسّاقط'' سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے بتخفیفِ سین۔ ابونہیک نے ''تسقط عليك رطبا جنيا'' پڑھا ہے۔ امام ابو اسحاق رحمہ اللہ نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اس کو ''تساقط'' پڑھا ہے۔ ''أي الجذع والكل متقارب.''[1] ﴿فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ﴾ أي مهما رأيت من أحد'' یعنی کبھی تو دیکھے کوئی آدمی: ﴿اَحَدًا فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾، تم کہنا کہ میں نے رحمن کے لیے روزہ مانا ہے۔ اس قول سے مراد اس شخص کو اشارہ کرنا ہے۔

روزے کا قول لفظی مراد نہیں ہے۔، تاکہ ﴿فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا﴾ کے منافی نہ ہو۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے ﴿صَوْمًا﴾ کے معنی ''صمتا'' کیے ہیں، یعنی سکوت اور خاموشی اور اسی طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک نے بھی کہا ہے۔ اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ''صوماً و صمتا'' مروی ہے، یعنی روزہ اور چپ رہنا اور ایسا ہی قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جس وقت اپنی شریعت میں روزہ رکھتے تو ان پر طعام اور کلام حرام ہو جاتا تھا۔ امام سدی، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید رحمہم اللہ نے اس پر نص کی ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے حارثہ سے روایت کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس تھا کہ دو آدمی آئے، ایک نے سلام کیا، دوسرے نے سلام نہ کیا، پس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیرا کیا حال ہے؟ اُن کے اصحاب نے کہا کہ اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ آج لوگوں سے بات نہ کرے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو بات کر لوگوں سے اور سلام کر اس لیے کہ وہ ایک عورت تھی، اس نے جان لیا تھا کہ کوئی اس کی تصدیق نہ کرے گا اس بات میں کہ وہ بغیر خاوند کے حاملہ ہوگئی، اس سے ان کی مراد مریم علیہا السلام ہیں، تاکہ اُن کے واسطے عذر ہو جائے، جس وقت اُن سے سوال کیا جائے۔ (و رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير)

عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے مریم علیہا السلام سے کہا کہ تو غم نہ کھا تو وہ بولیں کہ میں کیوں کر غم نہ کھاؤں، حالانکہ تو میرے ساتھ ہے نہ میں خاوند والی ہوں نہ لونڈی ہوں میرا کیا عذر ہے لوگوں کے نزدیک، کاش! میں مر جاتی اس سے پہلے اور نسیا منسیا ہو جاتی۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ''أنا أكفيك الكلام'' یعنی میں بات کرنے کی تجھ سے کفایت کروں گا۔ ﴿فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ ... الخ﴾ عبدالرحمن نے کہا ہے کہ یہ سب کلام عیسیٰ علیہ السلام سے ہے اپنی ماں سے، اسی طرح امام وہب رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿تَحْتِهَآ﴾ کی ضمیر یا تو مریم علیہا السلام کی طرف پھرتی ہے یا نخلہ کی طرف۔ دونوں ضمیروں میں توافق کے لیے پہلا قول زیادہ قابلِ تسلیم ہے۔ مریم علیہا السلام ٹیلے پر تھیں اور جبریل علیہ السلام ٹیلے کے نیچے تھے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٥٩) [2] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٢۔ ١٨٤) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٦)

سلف سے مختلف روایتیں آئیں ہیں کہ آیا پکارنے والے جبریل علیہ السلام تھے یا عیسیٰ علیہ السلام؟ سو جس شخص نے "من" کو زبر کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جس نے زیر کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کے نزدیک جبریل علیہ السلام ہیں۔ یہ دونوں قراءتیں سات قراءتوں میں سے ہیں۔ بہرحال آواز دینے والا کوئی بھی ہو، جس وقت مریم علیہا السلام کی بات سنی تو اس سے یوں خطاب کیا: ﴿ اَلَّا تَحْزَنِيْ ﴾ یہ تفسیر ہے ندا کی، یعنی وہ پکارنا یہ تھا کہ تو غم نہ کھا، یا معنی "بأن لا تحزني" ہیں، اس بنیاد پر "أن" مصدریہ اور "لا" ناہیہ یا نافیہ ہوگا۔

﴿ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴾ تحت بمعنی قریب ہے۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ "سَرِيّ" سے مراد چھوٹی نہر ہے اس لیے کہ پانی اس میں سیر کرتا چلتا ہے اور "سَرِيّ" جدول کو بھی کہتے ہیں، اس کی جمع سریّان ہے۔ "سَرِيّ" رئیس سردار کو بھی بولتے ہیں، اس کی جمع "سراۃ" آتی ہے، یہ جمع عزیز غریب ہے، اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ فعیل کی فعلۃ پر جمع نہیں آتی۔ اور سراۃ کی جمع سروات۔ "سَرِيّ" کی وجہ اور بھی ہے، لیکن زیادہ قابلِ قبول وہی ہے جو گزر چکی ہے اور جعل بمعنی "صیّر" یا خلق ہے، یعنی کردی یا پیدا کر دی تیرے رب نے تیرے قدم کے نیچے ایک نہر۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نہر سے پانی منقطع ہو گیا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کے واسطے اس میں پانی بھیجا اور اس سے اس سوکھی جڑ کو زندہ کر دیا کہ جس پر مریم علیہا السلام نے تکیہ کیا تھا، یہاں تک کہ وہ برگ و بار لے آئی۔

کسی نے کہا کہ ﴿ تَحْتَكِ ﴾ کے معنی "تَحْتَ أَمْرِكَ" ہیں، یعنی اگر تو اس کو بہنے کا حکم دے گی، تو بہے گی اور اگر رکنے کا حکم دے گی تو رک جائے گی، لیکن پہلا قول زیادہ قابلِ قبول ہے۔ تابعین کی ایک جماعت سے اسی طرح مروی ہے کہ مراد "سَرِيّ" سے یہاں عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور "سَرِيّ" مردوں میں سے عظیم مرد ہے۔ اسی معنی میں عرب کا قول ہے کہ "فلان سري أي عظيم و من قوم سراة أي عظام"، یعنی فلاں شخص بڑا آدمی ہے اور فلاں بڑی قوم سے ہے۔

"هُزّ" حرکت دینے، ہلانے کو کہتے ہیں۔ عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "هزه فاهتز" یعنی فلاں شئے کو ہلایا تو وہ ہل گئی۔ حرفِ با تاکید کے لیے زیادہ ہوا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هزه و هز به" بولتے ہیں۔ جذع اسفلِ درخت کو بولتے ہیں۔ قطرب نے کہا ہے کہ ہر لکڑی جو کسی درخت کی جڑ میں ہو، وہ جزع ہے۔[1] ساقط کی اصل "تتساقط" ہے اور "تسقط ويسقط" دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ جس نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے تو ضمیر کو نخلہ کے لیے ٹھہرایا ہے اور جس نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس نے ضمیر کو جذع کی طرف پھیرا ہے۔ "جَنِيّ" وہ ہے جو تر و تازہ لی جائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں،[2] یعنی اس لائق ہوگئی کہ توڑی جائے۔ کھانے کو پہلے ذکر کیا، باوجود اس کے کہ نہر کا ذکر رطب پر مقدم ہے، اس لیے کہ زچہ کی حاجت کھانے کے لیے زیادہ ہوتی ہے،

[1] فتح القدير (٣/ ٤٥٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٦)

بہ نسبت پانی پینے کی حاجت سے۔ "قَرِيْ" کو جمہور نے قاف کی زبر سے پڑھا ہے اور قاف کی زیر سے بھی پڑھا گیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ نجد کی لغت ہے،[1] معنی یہ ہیں کہ تو جی خوش کر اور رنج و غم کو چھوڑ دے۔ یہ "قرّ و قرّہ" سے ماخوذ ہے، دونوں بہ معنی سردی ہیں۔ خوش آدمی کا دل ٹھنڈا اور اس کے اعضا ساکن ہوتے ہیں، یہ اس لیے ہے کہ آدمی جس وقت خوش ہوتا ہے تو اس کی آنکھ کا آنسو سرد ہوتا ہے اور جب غمگین ہوتا ہے تو آنسو گرم ہوتا ہے، اسی لیے عرب لوگ جس وقت کسی پر بد دعا کرتے ہیں تو بولتے ہیں: "أسخن الله عينه" یعنی اللہ اس کی آنکھ کو گرم کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تو اس لڑکے کے دیکھنے سے آنکھ کو ٹھنڈا کر کہ جو تجھے دیا گیا ہے۔ امام شیبانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی "قری" کے "نامي" ہیں، یعنی سو جاؤ۔

ابو عمرو نے کہا: "أقر الله عينه" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کی آنکھ کو سلائے اور اس کی بیداری کو دور کرے،[2] کسی نے کہا ہے کہ استقرار سے ماخوذ ہے، یعنی اللہ اس کو وہ چیز دے، جو اس کی آنکھ کو ساکن کر دے کہ اس کے غیر کی طرف بلند نہ کرے۔ ﴿ تَرَيِنَّ ﴾ کی اصل "تَرَايِيْنَ" ہے، مثل: "تَسْمَعِيْنَ" کے۔ ﴿ فَإِمَّا تَرَيِنَّ ... الخ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی آدمی تجھ سے بات کرنا طلب کرے تو اس سے قولِ مذکور کہہ دینا۔ اس معنی کی بنیاد پر ایک اشکال سے نجات ملتی ہے، وہ اشکال یہ ہے کہ ﴿ فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴾ خود ایک کلام ہے، پس یہ تضاد ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اس کلام کے ساتھ انسان سے کلام کیا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ فَقُوْلِيْٓ ﴾ سے مراد اشارہ ہے، یعنی تو اشارہ سے کہنا۔ یہ قول کچھ چیز نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہیں کہ میں آج کسی آدمی سے ہرگز کلام نہ کروں گی اس کلام کے بعد۔ (قاله السمين) صوم سے مراد امساک و سکوت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد روزۂ شرعی ہے اور وہ روزہ توڑنے والی چیزوں سے رُکنا ہے، لیکن پہلا قول زیادہ قابلِ قبول ہے۔ ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں صوما صمتا ہے۔[3]

دونوں لفظوں کو جمع کر لیا ہے اور ایسا ہی انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اُن کی ایک روایت میں دونوں کے درمیان حرفِ واؤ بھی مروی ہے۔ جس بات پر جمہور مفسرین ہیں وہ یہ ہے کہ اس جگہ صوم سے مراد صمت ہے،[4] یعنی چپ رہنا اور اسی پر ﴿ فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴾ دلالت کرتا ہے۔ لغت میں صوم کے معنی دونوں معنی سے وسیع تر ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ ہر وہ شخص صائم ہے، جو کھانے یا بات کرنے یا چلنے سے باز رہے۔[5] اور ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں صوم سے مراد صمت و سکوت ہے، کیوں کہ صمت صوم کی تفسیر ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کی قراءت اس پر دلالت کرتی ہے کہ صوم سے یہاں مراد غیر صمت ہے، چنانچہ واؤ اسی بات کو مفید ہے اور ﴿ فَلَنْ أُكَلِّمَ ... الخ ﴾

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٢) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٩٧) [3] الدر المنثور (٥/ ٥٠٦)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٢۔ ١٨٣) [5] فتح القدير (٣/ ٤٥٥)

کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ خبر دینے کے بعد کہ کسی آدمی سے بات نہ کریں گی، بلکہ فرشتوں سے بات چیت کریں اور اپنے رب سے مناجات فرمائیں گی۔ ①

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾
یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ
اُمُّكِ بَغِیًّا ۖۚ ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ
كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ۫ اٰتٰىنِیَ
الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ﴿۳۱﴾ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪
وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۪ۖ﴿۳۰﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫
وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ
اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

پھر وہ اس (بچے) کو اُٹھائے اپنی قوم کے پاس آئی، تو وہ کہنے لگے: اے مریم! یقیناً تو نے بہت برا کام کیا ہے (27) اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی (28) چناں چہ اس نے اس (بچے) کی طرف اشارہ کیا، تو وہ کہنے لگے: ہم اس سے کیسے کلام کریں جو گود میں بچہ ہے؟ (29) وہ (بچہ) بول اُٹھا: بلاشبہہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے (30) اور اس نے مجھے برکت والا بنایا جہاں بھی میں ہوں، اور مجھے نماز اور زکات کی پابندی کا حکم دیا ہے، جب تک میں زندہ رہوں (31) اور اپنی والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا ہے اور اس نے مجھے سرکش (اور) بدبخت نہیں بنایا (32) اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ (کر کے) اُٹھایا جاؤں گا (33)

مریم علیہا السلام مسیح علیہ السلام کے ساتھ قوم کے سامنے اور مسیح علیہ السلام کا قوم کے اعتراض کا جواب:

ہارون کی بہن یعنی نبی ہارون کی بہن۔ دادے کا نام بولتے ہیں قوم کو، جیسے: عاد و ثمود، یہ تھیں ہارون علیہ السلام کی اولاد میں۔

اللہ پاک خبر دیتا ہے مریم علیہا السلام کی طرف سے کہ جس وقت ان کو حکم ہوا کہ اس دن روزہ رکھیں اور کسی بشر سے بات نہ کریں تو وہ عن قریب ضرور اپنے کام کی کفایت کی جائیں گی اور اُن کی حجت قائم کی جائے گی، لہٰذا انھوں نے

① فتح البیان (۸/ ۱۵۱ـ ۱۵۴)

اللہ عزوجل کے حکم کو مانا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی مطیع اور فرماں بردار ہو گئیں تو انھوں نے اپنے بیٹے کو لیا، پھر اس کو اپنی گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ جب انھوں نے مریم علیہا السلام کو اس طرح دیکھا تو ان کے حال کو ایک عظیم امر سمجھا اور اس کو انتہائی برا جانا اور بولے: اے مریم! تو نے یہ کیا طوفان کیا؟

امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ اور بہت لوگوں نے کہا ہے کہ ﴿ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴾ سے مراد ایک بہت بڑا کام ہے۔[1] نوف بکالی نے کہا ہے کہ مریم علیہا السلام کے لوگ ان کو ڈھونڈنے کے لیے نکلے اور کہا کہ وہ خاندانِ نبوت و شرف سے تھیں۔ پس اُن کا کچھ اَتا پتا نہ پایا، پھر وہ گائیں چرانے والی ایک عورت سے ملے تو اس سے کہا کہ تو نے ایک جوان عورت کو دیکھا ہے جس کا ایسا ایسا حلیہ ہے۔ اس نے کہا: نہیں، لیکن آج کی رات میں نے اپنی گایوں سے وہ بات دیکھی ہے جو کبھی ان سے نہ دیکھی تھی۔ پوچھا تو نے کیا دیکھا؟ کہا: میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ اس وادی کی طرف سجدہ کرتی ہیں۔[2]

عبد اللہ بن ابی زیاد نے کہا کہ میں یاد رکھتا ہوں سیار سے کہ اس چرواہے نے کہا کہ میں نے ایک نور بلند دیکھا، پس وہ لوگ اس جگہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ جس کا چرواہے نے اُن سے کہا تھا، پس مریم علیہا السلام ان کے سامنے آ گئیں۔ پھر جس وقت مریم علیہا السلام نے ان کو دیکھا تو بیٹھ گئیں اور اپنے فرزند کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ لوگ آئے یہاں تک کہ ان کے پاس آ کھڑے ہوئے اور بولے: اے مریم! تو نے ایک بڑا کام کیا ہے، اے ہارون کی بہن! یعنی ہارون کی مشابہ عبادت میں، تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بدکار نہیں تھی، یعنی تو طیب طاہر پاک صاف خاندان سے ہے، جو اچھے اعمال، عبادت اور تقویٰ کے ساتھ مشہور ہے، پھر تجھ سے یہ کام کیسے ہو گیا؟[3]

علی بن ابی طلحہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا کہ ان کو ﴿ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ ﴾ کہا گیا، یعنی ہارون علیہ السلام برادرِ موسیٰ علیہ السلام اور وہ اُن کی نسل سے تھیں، جیسے تمیمی کو "يا أخا تميم" اور مضری کو "يا أخا مُضَر" کہتے ہیں۔[4] یعنی عرب کی عادت ہے کہ جو شخص جس قوم و قبیلے کا ہوتا ہے، اس کو اسی قوم اور قبیلے کا بھائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی مریم علیہا السلام کو ہارون علیہ السلام کی بہن کہا، اس لیے کہ وہ اُن کی نسل سے تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک نیک مرد ہارون نام ان میں تھا، اس کی طرف ان کی نسبت کی گئی اس لیے کہ زہد اور عبادت میں اس کی پیروی کیا کرتی تھیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض سے حکایت کیا ہے کہ ان لوگوں نے ایک بدکار آدمی کے ساتھ تشبیہ دی، جو اُن میں تھا، اس کو ہارون کہا جاتا تھا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[5] ان سب میں غریب تر وہ بات ہے، جس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے قرظی سے روایت کیا ہے اسی آیتِ کریمہ کی تفسیر میں، کہا ہے کہ مریم علیہا السلام ہارون علیہ السلام کی حقیقی بہن ہیں، ماں باپ دونوں کی طرف سے اور وہ موسیٰ علیہ السلام برادرِ ہارون علیہ السلام کی وہی

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٥۔ ١٨٦) [2] الدر المنثور (٥/ ٤٩٨۔ ٤٩٩) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٠)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٧) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٧)

بہن ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چلی گئیں، پھر اُن کو اجنبی ہو کر دیکھتی رہیں اور فرعون والوں کو خبر نہ ہوئی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول خطائے محض ہے۔[1] اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب، یعنی قرآن پاک میں ذکر فرمایا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبروں کے بعد لایا ہے۔ لہٰذا یہ بات اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ بعثت کے لحاظ سے آخری نبی ہیں اور اُن کے بعد نہیں ہوئے، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اسی لیے صحیح بخاری میں بروایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ابن مریم کے ساتھ اولی الناس ہوں، یعنی سب لوگوں سے بڑھ کر اُن سے قریب ہوں، اس لیے کہ میرے اور اُن کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہے۔[2] اور اگر معاملہ ویسا ہوتا، جیسا کہ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے خیال کیا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا عیسیٰ علیہ السلام سب پیغمبروں کے اَخیر میں ہوتے اور البتہ سلیمان و داود علیہما السلام سے پہلے ہوتے، کیونکہ اللہ پاک نے ذکر فرمایا ہے کہ داود علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں اس قول پاک میں: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢٤٦] ''(اے نبی!) کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت نہیں دیکھی؟ جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔''

اس قصے کو یہاں تک ذکر کیا ہے: ﴿ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ﴾ [البقرة: ٢٥١] ''اور داود نے جالوت کو قتل کیا۔'' اور جس بات نے قرظی رحمہ اللہ کو اس قول پر جراءت دلائی، وہ وہ بات ہے جو تورات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے دریا سے نکلنے اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے بعد کہا ہے کہ مریم دختر عمران، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی بہن نبیہ کھڑی ہوئیں دف بجاتی تھیں، وہ اور اُن کے ساتھ کی دوسری عورتیں اللہ پاک کی پاکی بیان کرتی اور اس کا شکریہ ادا کرتی تھیں، اس نعمت پر جس کا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر انعام کیا۔ سو قرظی نے اعتقاد کیا کہ یہ مریم وہی والدۂ عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور یہ ایک لغزش اور شدید غلطی ہے، بلکہ وہ مریم اُن مریم کی ہمنام تھیں، وہ لوگ اپنے انبیا اور صالحین کے نام رکھا کرتے تھے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کی طرف بھیجا، پس ان لوگوں نے کہا: تو ہم کو خبر دے کہ تم کیا پڑھتے ہو ﴿ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ ﴾ کو اور موسیٰ علیہ السلام تو عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی اتنی مدت پہلے ہیں۔ سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر میں واپس آیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے ان کو کیوں نہیں خبر دی کہ وہ لوگ پہلے والے انبیا اور صالحین کے نام رکھا کرتے تھے۔[3] (انفرد بإخراجه مسلم و الترمذي والنسائي من حديث عبد الله بن إدريس عن أبيه عن سماك به، و قال الترمذي: حسن صحيح غريب لا نعرفه إلامن حديث إدريس)

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٥٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٣)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ سیدنا کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "قوله يا أخت هرون" میں یہ ہارون موسیٰ علیہ السلام کے بھائی نہیں ہیں۔ کہا: اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو نے جھوٹ کہا۔ کعب نے کہا کہ اے ام المومنین! اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا ہے تو وہ زیادہ تر عالم و باخبر تھے، ورنہ میں تو اُن دونوں کے درمیان چھے سو برس پاتا ہوں۔ کہا: پس عائشہ رضی اللہ عنہا چپ ہو رہیں۔[1] یہ مدت محلِ نظر ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿ يَاُخْتَ هٰرُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ مریم علیہا السلام ایسے خاندان سے تھیں، جو نیکی کے ساتھ مشہور و معروف تھا اور فساد کے ساتھ معروف نہ تھا اور منجملہ لوگوں کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی کے ساتھ مشہور ہوتے ہیں اور نیکی کے ساتھ اُن کا توالد و تناسل ہوتا ہے اور دوسرے لوگ فساد کے ساتھ مشہور ہوتے ہیں اور فساد کے ساتھ ہی ان کا توالد اور تناسل ہوتا ہے اور ہارون اپنے خاندان میں نیک اور محبوب تھے، یعنی رشتے دار اور کنبے کے لوگ اُن کو نیک جانتے اور اُن سے محبت رکھتے تھے اور وہ ہارون موسیٰ علیہ السلام کے بھائی نہیں، لیکن وہ دوسرے ہارون ہیں۔ کہا اور ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ جس دن اُن کا انتقال ہوا تو بنی اسرائیل کے چالیس ہزار آدمی اُن کے جنازے کے پیچھے گئے سب کا نام ہارون تھا۔[2] (أخرجه ابن جرير أيضاً)

قولہ: ﴿ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت انھوں نے مریم علیہا السلام کے کام میں شک کیا اور اُن کے قضیے کو برا جانا اور اُن سے کہا جو کچھ کہ کہا، دراں حالیکہ ان کو تہمت لگا کر اور بہتان اور طوفان اُٹھا کر اُن کو تنگ کرتے تھے اور وہ اس دن صائم صامت اور ساکت (یعنی بالکل خاموش) تھیں، اس لیے بات کرنے کو عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے کیا اور اُن کو اشارہ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ہی خطاب کریں اور کلام کریں تو وہ بولے کہ ہم اس سے کیسے بات کریں جو گود میں بچہ ہے، یہ بات انھوں نے تکبر اور مذاق کے طور پر کہی اور یہ گمان کیا کہ مریم علیہا السلام ان کو حقیر سمجھتی ہیں اور اُن سے لعب (کھیل، مذاق) کرتی ہیں۔

میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ مریم علیہا السلام نے کہا کہ تم اس سے بات کرو، بولے کہ اس بلا کے علاوہ جس کو وہ لائی ہے، ہم کو حکم کرتی ہے کہ ہم اس سے بات کریں، جو گود میں بچہ ہے۔

ام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ جس وقت مریم علیہا السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا تو وہ لوگ خفا ہوئے اور بولے کہ اس کا نخرہ پن کرنا ہم سے کہ ہم کو حکم کرتی ہے کہ ہم اس بچے سے بات کریں، اس کے زنا سے بھی بہت بری بات ہے اور کہا کہ ہم اس سے کس طرح بات کریں جو گود میں ہو، یعنی جو اپنے مہد (پالنے) میں موجود ہے، اپنے بچپن اور چھوٹی عمر کے حال میں ہے، وہ کیسے بات کرے گا۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٦ـ ١٨٧) [2] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٦)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ١٨٩) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦١)

عیسیٰ علیہ السلام بول اُٹھے: ﴿ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ﴾ یعنی بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں۔ پہلی چیز جس کے ساتھ کلام کیا یہ ہے کہ اپنے رب تعالیٰ کی تنزیہ کی، یعنی تعریف کی اور اس کو اولاد سے مبرا بتایا اور اپنی ذات کے لیے رب کی عبودیت اور بندگی ثابت کی اور ﴿ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴾ کہہ کر اپنی ماں کو فاحشہ اور زنا کی تہمت سے بَری کیا، جس کی طرف اُن کی نسبت کی گئی تھی۔ نوف بکالی نے کہا کہ جس وقت لوگوں نے ان کی ماں سے کہا جو کچھ کہ کہا تو وہ انکی چھاتی سے دودھ پی رہے تھے، پس پستان کو اپنے منہ سے کھینچ لیا اور بائیں پہلو پر تکیہ کیا اور کہا: ﴿ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ...إلی قوله.. مَا دُمْتُ حَیًّا ﴾[1]۔ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ نے ثابت بنانی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے انگشتِ سبابہ اپنے دونوں مونڈھوں کے اوپر اُٹھائی اور وہ کہتے تھے: ﴿ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ﴾[2]۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ حکم کر چکا ہے کہ مجھے کتاب دے گا، اس چیز میں کہ وہ قضا کر چکا ہے۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عیسی بن مریم علیہما السلام انجیل کا درس اور اس کو خوب پختہ کر چکے تھے، حالانکہ اپنی والدہ کے پیٹ میں تھے۔ لہٰذا یہ اُن کا وہی قول ہے: ﴿ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴾[4] اس کی اسناد میں یحییٰ بن سعید عطار حمصی متروک ہے۔ امام مجاہد، ثوری اور عمرو بن قیس رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مبارکاً کے معنی "معلما للخیر" ہیں اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں "نفاعاً" ہے، یعنی بڑا سکھانے والا خیر کا اور انتہا درجے کا نفع رساں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے وہیب بن ورد رحمہ اللہ مولی بنی مخزوم سے روایت کیا ہے کہ ایک عالم نے دوسرے عالم سے ملاقات کی، وہ اس سے علم میں اوپر تھا تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے، میں اپنے عمل سے کون سا عمل ظاہر کروں؟ کہا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اس لیے کہ بے شک وہ اللہ کا دین ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بندوں کی طرف بھیجا ہے۔[5] اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴾ ویسا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے: ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰی یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ ﴾ "اور آپ اپنے رب کی عبادت کریں، حتی کہ آپ کے پاس یقین (موت) آ جائے۔" [الحجر: ۹۹]

عبدالرحمٰن بن قاسم نے مالک بن انس رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہا کہ اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس چیز کی خبر دے دی جو ہونے والی ہے، ان کے کام سے یہاں تک کہ وہ مریں۔ یہ آیت منکرینِ قدر کے لیے کیا کھلی ہوئی ہے۔[6] ﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ نے مجھ کو میری ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم

---

[1] الدر المنثور (۵/ ۴۹۸۔ ۴۹۹) [2] تفسير ابن كثير (۳/ ۱۶۱) [3] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۹۰)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۰۸) اس کی سند میں "یحییٰ بن سعید عطار" سخت ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۹۱) [6] تفسير ابن كثير (۳/ ۱۶۲)

دیا ہے۔ ''بِرّ'' کا ذکر اطاعتِ رب کے بعد اس لیے کیا ہے کہ اللہ پاک عبادت اور اطاعتِ والدین کے حکم کے درمیان اکثر قرآن فرماتا ہے، یعنی ان دونوں باتوں کا اکثر ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کرتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے اچھا سلوک کرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [لقمان: ١٤] ''(اور) یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر (بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

﴿ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے مجھ کو نہیں کیا زبردست انکار کرنے والا اپنی اطاعت اور عبادت سے اور میری ماں کی بر و نیکی سے کہ میں اس کے سبب سے بدبخت ہو جاؤں۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جبار شقی وہ ہے کہ غصے میں مار ڈالے،[1] یعنی جس پر خفا ہو تو اس کو قتل کر ڈالے۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ تو نہ پائے گا کسی کو اپنے ماں باپ کا نافرمان مگر پائے گا تو اس کو زبردست بدبخت، پھر پڑھا ﴿ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ کہا: اور نہ پائے گا تو سیئ الملکہ کسی کو، مگر پائے گا تو اس کو مختارِ فخور، پھر یہ آیت کریمہ پڑھی: ﴿ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴾ [النساء: ٣٦] ''اور اپنی زیرِ ملکیت کنیزوں اور غلاموں سے بھی نیکی کرو۔ بے شک اللہ ہر اِترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' سیئ الملکہ وہ شخص ہے جو اپنے لونڈی غلاموں سے بُرا برتاؤ کرتا ہے۔ سختی، تند خوئی، بد خلقی سے پیش آتا ہے۔ کھانے پینے پہننے میں کوتاہی کرتا ہے، سو ایسا شخص متکبر، اِترانے والا، بڑائی مارنے والا ہوتا ہے کہ اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتا۔ تابعداروں کو حقیر و خوار اور خود کو کبیر اور بزرگ جانتا ہے۔ اللہ پاک ایسے آدمی کو نہیں چاہتا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ ایک عورت نے ابن مریم علیہما السلام کو دیکھا کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو چنگا بھلا کر دیتے ہیں، من جملہ ان نشانیوں کے کہ جن پر اللہ پاک نے ان کو تسلط عطا کیا تھا اور اُن کو اُن باتوں میں اِذن دیا تھا تو وہ بولی خوشی ہو اس شکم کو جس نے تجھے اُٹھایا اور خوشی ہو اس پستان کو جس سے تو نے دودھ پیا، پس نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ اسے جواب دیتے تھے کہ خوشی ہو اس شخص کو جس نے کتاب اللہ کی تلاوت کی، پھر اتباع کیا اس چیز کا جو اس میں تھی اور نہ ہوا وہ زبردست بدبخت۔[2]

﴿ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ ﴾ اس قول سے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی عبودیت اللہ عز و جل کے لیے ثابت کی اور اس بات کا اثبات کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں، زندہ ہوں گے، مریں گے اور اٹھائے جائیں گے دوسری تمام خلائق کی طرح، لیکن ان کے لیے ایسی حالتوں میں سلامتی ہوگی، جو بندوں پر زیادہ تر شاق ہوتے ہیں۔ صلوات اللہ وسلامه عليه.

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٨) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٢) الدر المنثور (٥/ ٥٠٩) تفسیر ابن کثیر کے علاوہ سفیان ثوری رحمہ اللہ سے ''یقتل'' کے بجائے ''یقبل'' کے الفاظ مروی ہیں۔

[2] تفسير الطبري (١٨/ ١٩٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جس وقت مریم کو ان نشانیوں سے اطمینان ہوا جن کو وہ دیکھ چکیں تو عیسیٰ علیہ السلام کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں اور قوم کے پاس ان کا آنا اسی دور کی جگہ سے تھا، جس میں وہ وضع حمل کے لیے کنارہ کر گئی تھیں۔ کسی نے کہا کہ یہ آنا روزِ ولادت میں تھا۔ کسی نے کہا کہ اس کے بعد کہ پاک ہو گئیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ زچگی سے پاک ہونے کے بعد چالیس دن کے بعد۔[1] پھر جب ان کی قوم نے اُن کے ہمراہ لڑکے کو دیکھا تو غمگین ہوئے اور وہ لوگ نیک خاندان کے تھے تو اس بات کو برا سمجھے اور بولے: اے مریم! البتہ یہ بات طے ہے کہ تو نے ایک نہایت ہی عجیب اور نادر فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَرِيًّا ﴾ بمعنی عظیم ہے، یعنی ایک بڑے کام کو کہتے ہیں[3] جو خیر اور شر دونوں میں بولا جاتا ہے۔ قطرب نے کہا کہ فری جدید مشک کو کہتے ہیں، یعنی تو ایک ایسے بدیع جدید نادر اور نئے کام کو لائی ہے کہ تجھ سے پہلے کسی نے نہیں کیا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے فری قطع کرنے کو کہتے ہیں، یعنی تو ایک ایسی چیز کو لائی ہے کہ وہ عادت کو کاٹتی پھاڑتی ہے، وہ عادت یہی ہے کہ ولادت باپ کے واسطے سے ہوتی ہے۔ سعید بن مسعدہ رحمہ اللہ نے کہا: فری کے معنی مختلق مفتعل کے ہیں۔[5] فری یہ اسم ہے، یعنی یہ بات بنائی ہوئی گھڑی ہوئی ہے، واقع میں اس کی کچھ اصل نہیں ہے اور زنا کا بچہ مثلِ شئے مفتری کے ہوتا ہے۔ قال تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ ﴾ [الممتحنة: ١٢] ''اور نہ بہتان لگائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے گھڑ لیں۔''

اے ہارون کی بہن! یہ بھی من جملہ قوم کا کلام ہے۔ اس خواہری (بہن ہونے) میں اور ہارون میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ وہ کون ہارون ہیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل تفسیر ابن کثیر میں سے اوپر گزر چکی ہے،[1] اس کے دھرانے کی یہاں کچھ ضرورت نہیں ہے۔ نہ تھا باپ تیرا برا آدمی اور نہ تھی ماں تیری بدکار (یعنی عمران اور حنہ) اس قول میں ملامت اور ڈانٹ کی تقریر و تثبیت ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ صالحین کی اولاد سے بے حیائی اور زنا ہونا، من جملہ ان باتوں سے ہے، جن کا واقع ہونا ان کے لائق نہیں ہے۔ پس مریم علیہا السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا کہ تم اس سے بات کرو، اشارے پر اکتفا کیا اور بول کر عیسیٰ علیہ السلام کو حکم نہ دیا، اس لیے کہ انھوں نے

---

(1) الدر المنثور (٥/ ٥٠٦) (2) تفسیر القرطبي (١١/ ٩٩) (3) تفسیر الطبري (١٨/ ١٨٥)
(4) تفسیر القرطبي (١١/ ٩٩) (5) فتح القدير (٣/ ٤٥٧) (6) زیرِ تفسیر آیت ملاحظہ فرمائیں۔

رحمٰن کے واسطے بات نہ کرنے کا روزہ مانا تھا۔ یہ وجہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس وقت اپنی نذر کے دِنوں میں تھیں اور اس بنا پر کہ ان دنوں سے نکل چکی تھیں تو ہوسکتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ انھوں نے اشارہ کرنے پر اس لیے اکتفا کیا کہ آیتِ عظیمہ کا اظہار مبالغے کے ساتھ ہو جائے اور اس واسطے کہ یہ لڑکا اشارے کو سمجھتا ہے اور بولنے پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ بولے ہم ایسے شخص سے کیوں کر بات کریں جو ابھی پالنے میں بچہ ہو۔

یہ استفہام تعجب اور انکار کے لیے ہے۔ اس لیے کہ مریم علیہا السلام نے جس وقت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ان سے بات کریں تو وہ اس بات کا انکار کرنے لگے اور اس سے متعجب ہوئے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ کلام میں حشو زائد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم بچے سے کیوں کر بات کریں جو مہد میں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ زیادہ پکی بات یہ ہے کہ کلام مذکور شرط و جزا کے معنی میں ہو۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص مہد میں بچہ ہو، ہم اس سے کس طرح بات کریں۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔[1]

مہد ایک معروف چیز ہے جو بچے کو سلانے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ کسی نے کہا کہ یہاں ماں کی گود مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ سریر (چارپائی) مثل مہد کے ہے۔ غرضیکہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کی بات سنی تو دودھ پینا چھوڑ دیا اور ان پر متوجہ ہوئے، بولے: ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ سو پہلے پہل جو بات بولے، وہ یہی تھی کہ اللہ پاک کے لیے عبودیت اور بندگی کا اقرار کیا، تاکہ لوگ ان کو معبود نہ ٹھہرائیں اور اس قول میں اپنی ماں سے تہمت بھی دور کر دی، کیونکہ اللہ پاک زنا کے بچے کو اس مرتبۂ عظیم کے ساتھ خاص نہیں کرتا اور اپنے نفس کو آٹھ صفتوں کے ساتھ موصوف کیا۔ اول صفت تو عبودیت اور بندگی ہے اور آخر صفت اُن کو زیادہ تر دہشت ناک مقاموں میں امن دینا ہے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ اس نے مجھے نبی بنایا، یعنی ازل میں ہی میرے لیے کتاب و نبوت دینے کا حکم کر دیا، گو اس وقت ان پر نہ کتاب کا نزول ہوا، نہ وہ نبی ہوئے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس وقت اُن کو کتاب دے دی اور نبی کر دیا۔ یہ قول نہایت درجہ بعید ہے۔ اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے جو روایت گزر چکی ہے،[2] وہ اس سے بھی زیادہ تر بعید ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ وہ حکم کر چکا ہے کہ میں ایسا ہوں گا[3] اور اسی کے مثل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول پاک ہے کہ میں نبی تھا، حالانکہ آدم علیہ السلام روح اور جسد کے درمیان تھے۔[4]

چوتھی صفت یہ ہے کہ اس نے مجھے برکت والا بنایا جہاں کہیں میں رہوں۔ برکت کی اصل بروکِ بعیر سے ہے۔ بروک اونٹ کے بیٹھنے کو کہتے ہیں، اس بنیاد پر معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنے دین پر ثابت کیا، جما دیا، یعنی جس طرح اونٹ بیٹھ کر زمین پر جم جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ برکت کے معنی زیادت و علو ہیں۔ گویا یوں کہا

[1] فتح القدير (٣/ ٤٥٧) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٨)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٠٩) مسند أحمد (٥/ ٥٨٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٥٦)

کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ساری چیزوں میں زائد، عالی اور فتح مند کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ مبارک کے معنی بندوں کے لیے نفع مند ہیں، یعنی خلق کو بہت نفع پہنچانے والا ہے۔ اس لیے کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے، اندھوں کو بینائی دیتے اور کوڑھی کو چنگا بنا دیتے تھے۔ بھٹکے ہوئے کو راہ پر لاتے، گمراہ کو راستہ بتاتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ خیر کی تعلیم کرنے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نیکی کا حکم کرنے والا اور برائی سے روکنے والا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: کیا مجھ کو بہت نفع پہنچانے والا لوگوں کے لیے جہاں کہیں بھی میں متوجہ ہوں۔ (أخرجه الإسماعيلي في معجمه و أبو نعيم في الحلية)[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مُعَلِّمٌ وَّ مُؤَدِّبٌ»[2] (أخرجه ابن عدي و ابن عساكر) یعنی مبارک کے معنی معلم و مؤدب کے ہیں۔

پانچویں صفت یہ ہے کہ اس نے مجھے نماز اور زکات کی وصیت کی، جب تک کہ میں زندہ رہوں۔ زکات سے مراد مال کی زکات ہے یا نفس کو رذیل باتوں سے پاک کرنا ہے۔ یعنی اس نے مجھے نماز کا اور مال کی زکات کا حکم دیا ہے، جس وقت کہ میں مال کا مالک ہوں یا اپنے نفس کو رذائل سے پاک کروں۔ ان دونوں کے وقت معین ہیں۔ وہ بلوغ کا ہے یا اسی وقت۔ یہ مفسرین کے دو قول ہیں۔ پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ چھٹی صفت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا بنایا۔ والدہ کے ساتھ نیکی پر اس لیے اکتفا کیا کہ وہ اس وقت جان چکے تھے کہ ان کا کوئی باپ نہیں ہے۔ "بَرّ" با کی زبر کے ساتھ بمعنی بار ہے اور باء کی زیر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ یہاں سے مضاف حذف کر دیا ہے، یعنی ذو "بِرّ" یا مبالغتاً مصدر کے ساتھ وصف کیا گیا۔ ساتویں صفت یہ ہے کہ مجھ کو جبار شقی نہیں کیا۔ جبار وہ شخص ہے، جو اپنے نفس کو بڑا سمجھتا ہے خود پر کسی کا حق نہیں سمجھتا۔ شقی وہ ہے، جو اپنے رب کا نافرمان ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی غائب، یعنی محروم۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی عاق، یعنی والدین کا نافرمان۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ "شقی بہ معنی عصی"،[3] یعنی بڑا نافرمان، یعنی بلکہ میں خضوع کرنے والا منکسر المزاج خاکسار ہوں۔ ان کی تواضع میں سے یہ ہے کہ وہ درختوں کے پتے کھاتے اور خاک پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے لیے کوئی مکان نہ بنایا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: میرا دل نرم ہے اور میں اپنے جی میں صغیر ہوں، ان سب صفتوں میں فعلِ ماضی ذکر فرمایا، لہٰذا یہ اس باب سے ہے کہ غیر واقع کو بہ منزلہ واقع کے ٹھہرایا، اُن کے حقیقی طور پر واقع ہونے سے آگاہ کرنے کے لیے، کیوں کہ یہ سب باتیں قضائے مبرم میں پہلے سے طے ہو چکی ہیں۔ کسی نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ اپنی ماں سے جدا ہوئے اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کو عاقل بالغ کر دیا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول زیادہ ظاہر ہے۔[4] فتح البیان میں ہے کہ بلکہ ابعد ہے۔ مستند صحیح ثابت ہونے کا محتاج ہے۔

---

[1] المعجم- للإسماعيلي (٢/ ٦١٥) حلية الأولياء (٣/ ٢٥)
[2] الكامل- لابن عدي (٥/ ١٣٠) تاريخ دمشق (٤٧/ ٣٠)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٨)
[4] تفسير الخازن (٤/ ٢٤٥)

آٹھویں صفت یہ ہے کہ ہر تینوں مذکورہ مقامات میں مجھ پر سلامتی ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر سلام بہ معنی سلامتی ہے، یعنی مجھ پر اللہ کی طرف سے امان ہے۔ سلام میں الف اور لام عہد کے واسطے ہے، اس لیے کہ سلام کا لفظ ﴿ وَسَلَٰمٌ عَلَيْهِ ﴾ میں گزر چکا ہے۔ یعنی کہ جو سلام یحییٰ کی طرف متوجہ کیا گیا، وہی سلام میری طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ بات ہے کہ الف لام کے ساتھ جو معرفہ کیا گیا ہے۔ یہ دراصل مریم علیہا السلام پر تہمت لگانے والوں اور اُن کے دشمنوں پر لعنت کے ساتھ تعریض ہے، یہ لوگ یہود تھے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لام جنس کے واسطے ہے، یعنی خاصتاً سلام کی جنس مجھ پر ہے۔ سو اس میں تعریض یہ کی کہ سلام کی ضد تم پر ہے۔ نظیر اس کی یہ قول پاک ہے: ﴿ وَالسَّلَٰمُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ﴾ [طٰہٰ: ٤٧] یعنی جو شخص ہدایت کا اتباع کرے، اس پر سلام ہے اور جو نہ کرے اس پر سلام نہیں ہے۔[1]

پس اول مقام ولادت کا دن ہے، لہٰذا شیطان نے اس وقت ان کو ضرر نہ پہنچایا، نہ اُن کو چونکا لگایا، نہ اُن کو اغوا کر سکا۔ دوسرا روز موت ہے، تیسرا مقام جی کر اُٹھنا ہے۔ ان تینوں جگہوں کو اس لیے خاص کیا کہ یہ سب سے بڑھ کر خوفناک ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کا یہ آخر کلام ہے، اس سے لوگوں نے ان کی والدہ کی براءت معلوم کر لی۔ اس کلام کے بعد پھر انھوں نے بات نہ کی، یہاں تک کہ اس مدت کو پہنچے، جس میں بچوں کو بات کرنا آتی ہے۔[1]

ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلَّهِ أَن يَتَّخِذَ مِن وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾ وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٣٧﴾

یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، (یہی ہے) حق کی بات جس میں وہ لوگ شک کرتے ہیں (34) اللہ کے لائق ہی نہیں کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے، وہ پاک ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لیے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے (35) اور بے شک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو، یہی ہے سیدھی راہ (36) پھر (متعدد) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا، چناں چہ ان کے لیے تباہی ہے جنھوں نے یوم عظیم کی پیشی کا انکار کیا (37)

---

(1) الکشاف (٣/ ١٨) (2) فتح البیان (٨/ ١٥٤۔ ١٥٩)

عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے نہیں، اس کے بندے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے رسول رؤوف رحیم ﷺ سے فرماتا ہے کہ یہ جو ہم نے تم سے عیسیٰ علیہ السلام کی خبر بیان کی، سچی بات ہے جس میں لوگ جھگڑتے ہیں، یعنی اہلِ باطل و اہلِ حق اختلاف کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے کہ جنھوں نے ان کو مانا اور جنھوں نے اُن کو نہ مانا، اسی لیے اکثر نے ﴿قَوْلَ الْحَقِّ﴾ کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عاصم و عبداللہ بن عامر نے زبر کے ساتھ، یعنی ''قولَ''۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے یوں پڑھا ہے: ''ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَالَ الْحَقِّ''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعراب کی رُو سے رفع (پیش) ظاہر تر ہے اور اللہ تعالیٰ کا جو فرمان ہے: ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ [آل عمران: ٦٠] ''(یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔'' وہ اس رفع کی شہادت دیتا ہے ہرگاہ کہ اللہ پاک نے ذکر فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس نے عبد نبی پیدا کیا تو اس نے اپنے نفسِ مقدس کی تنزیہ کی، ارشاد فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ﴾ (آیتِ باب)۔ یعنی یہ جاہل، نادان، ظالم، ستم گر، حد سے بڑھنے والے جو کچھ کہ کہتے ہیں، وہ اس سے پاک صاف، مبرا، منزہ، بزرگ و برتر ہے، وہ تو جس وقت کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے، جیسے چاہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ [آل عمران: ٥٩۔ ٦٠] ''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہو گیا۔ (یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ (آیتِ باب)۔ یہ قول من جملہ ان باتوں کے ہے کہ جن کا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اَمر کیا ہے اور وہ حالتِ مہد میں تھے، اس وقت اُن کو اس بات کی خبر دی کہ اللہ اُن کا رب ہے اور اس قوم کا رب ہے اور اللہ پاک کی عبادت کا اُن کو حکم دیا، فرمایا کہ تم اسی کو پوجو، یہ راہ جس کو میں تمھارے پاس لایا ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھی راہ ہے، جو شخص اس کی پیروی کرے گا راہ یاب ہوگا، ہدایت پائے گا اور جو کوئی اس کی مخالفت کرے گا وہ گمراہ ہوگا، بھٹکے گا۔ پھر اُن میں سے کئی طریقے بن گئے، یعنی فرقے ہو گئے۔ یعنی اہلِ کتاب کا قول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مختلف ہو گیا، اس کے بعد کہ اُن کا معاملہ اور حال ظاہر اور واضح ہو گیا اور یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر اور اس کا کلمہ ہیں، جس کو اس

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٩٤)

نے مریم علیہا السلام کی طرف ڈالا اور ایک روح ہیں اس کی طرف سے۔ لہٰذا اُن میں سے ایک گروہ نے تو اس بات پر اصرار کیا کہ معاذ اللہ وہ ولدِ زنا ہیں، یہ گروہ جمہور یہود ہیں۔ علیهم لعائن الله تعالیٰ۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ سوا اس کے نہیں کہ اللہ نے کلام کیا۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ بلکہ وہ اللہ کے فرزند ہیں۔ چوتھے گروہ نے کہا کہ تین میں سے تیسرے ہیں۔ پانچویں نے کہا کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہ وہی قولِ حق ہے، جس کی طرف اللہ پاک نے مومنین کو ہدایت کی ہے۔ امام عمرو بن میمون، ابن جریج، قتادہ اور بہت سے سلف و خلف رحمہم اللہ سے اس کے مثل مروی ہے۔[1]

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے آیتِ کریمہ: ﴿ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل جمع ہوئے، پھر اُن میں سے چار ہزار آدمیوں کو نکالا۔ ہر قوم نے اپنے عالم کو نکالا، پھر انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا کیا، جس وقت کہ وہ آسمان کی طرف اُٹھا لیے گئے، پس بعض نے کہا کہ وہ اللہ تھا، زمین کی طرف اترا، پھر زندہ کیا جس کو زندہ کیا اور مارا جس کو مارا، پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا۔ یہ فرقہ یعقوبیہ ہے۔ پس تین عالموں نے اس سے کہا کہ تو نے جھوٹ کہا، پھر اُن میں سے دو نے تیسرے سے کہا کہ تو اس کے بارے میں اپنی رائے بتا۔ وہ بولا کہ وہ اللہ کا فرزند ہے، یہ فرقہ نسطوریہ ہے۔ پس دو نے کہا کہ تو نے جھوٹ کہا۔ پھر دو میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ تو اس بارے میں کہہ، تو وہ بولا کہ وہ تین میں کا ایک ہے، اللہ معبود ہے اور وہ معبود ہے اور اس کی ماں معبود ہے۔ یہ فرقہ اسرائیلیہ ملوکِ نصاریٰ کا ہے۔ علیهم لعائن الله۔ چوتھے نے کہا: تو نے جھوٹ بولا، بلکہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور اس کی روح اور اُس کے کلمہ ہیں، یہ لوگ مسلمان ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک شخص کے اتباع اور پیرو ہوئے۔ علیٰ ما قالوا۔

پھر باہم قتال کیا اور مسلمانوں پر ظاہر اور غالب ہوئے۔ یہ اللہ پاک کا وہی قول ہے: ﴿ وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ۲۱] ''اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ﴾ (آیتِ باب) کہا کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا، پھر وہ کئی فرقے ہو گئے۔ (وقد روى ابن أبي حاتم عن ابن عباس وعن عروة بن الزبير عن بعض أهل العلم قريبا من ذلك)[2]

اہلِ کتاب وغیرہم کے بہت سے علمائے تاریخ نے ذکر کیا ہے کہ قسطنطین نے ایک بڑی محفل میں اُن کو جمع کیا، اُن کے تین مجامع میں سے جو مشہور و معروف ہیں، پس اُن میں سے دو ہزار ایک سو ستر علماء کی جماعت تھی۔ پھر انھوں

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٩٥) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٢۔ ١٦٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٨۔ ٢٤٠٩)

نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نہایت واضح اختلاف کیا۔ ہر گروہ نے اُن کے بارے میں ایک بات کہی، پھر سو عالم تو اُن کے بارے میں کچھ کہتے ہیں اور ستر کچھ اور ہی بولتے ہیں اور پچاس کوئی اور بات کہتے ہیں اور ایک سو سات کچھ اور فرماتے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک بات پر تین سو آدمیوں سے زیادہ جمع نہیں ہوئے، ان لوگوں نے ایک قول پر اتفاق کیا اور اسی پر پکے ہوئے اور جم گئے، لہٰذا بادشاہ انھیں کی طرف مائل ہوا اور وہ فیلسوف تھا، پس اس نے اُن کو مقدم بنایا اور اُن کی نصرت کی اور اُن کے سوا اوروں کو ہٹا دیا اور رد کر دیا، پس انھوں نے بادشاہ کے لیے امانتِ کبیرہ وضع کی۔ بلکہ وہ تو خیانتِ عظیم ہے اور اس کے واسطے قوانین کی کتابیں وضع کیں اور کئی چیزیں اُن کے لیے شریعت ٹھہرائیں اور بہت سی بدعتیں اور نئی نئی باتیں نکالیں۔ مسیح علیہ السلام کے دین کی تحریف کی اور اس کو بدل ڈالا اور بگاڑ دیا۔

پھر بادشاہ نے اس وقت اپنی ساری مملکت میں بلادِ شام اور جزیرۂ روم میں اُن کے لیے بڑے بڑے کنیسے بنائے، اس کے عہد میں کنیسوں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار ہوگئی اور بادشاہ کی ماں ہیلانہ نام نے ایک قمامہ (کوڑا کرکٹ کی جگہ) بنایا، اس جگہ پر جہاں ایک شخص کو سولی دیا گیا، جس کو یہود گمان کرتے ہیں کہ وہ مسیح علیہ السلام ہیں، حالانکہ انھوں نے جھوٹ کہا، بلکہ اُن کو تو اللہ پاک نے آسمان کی طرف اُٹھا لیا۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ (آیتِ باب) یہ ایک ڈانٹ اور وعیدِ شدید ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اللہ پاک پر جھوٹ بولا، افترا کیا اور یہ زعم کیا کہ اس کے لیے بیٹا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت تک ان کو مہلت دے رکھی ہے، یہ اس کا حلم اور اس کو اپنی قدرت پر اعتماد ہے، وہ ان پر قادر ہے، جب چاہے پکڑے، کیوں کہ وہ اپنے گناہ گار پر جلدی نہیں کرتا، بلکہ وہ تو ڈھیل ہی دیتا ہے، جیسا کہ صحیحین میں مروی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ البتہ ڈھیل دیتا ہے واسطے ظالم کے، یہاں تک کہ جس وقت اس کو پکڑ لیا تو اسے نہیں چھوڑتا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ۚ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [1] [هود: ١٠٢] ''اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔''

یہ بھی صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی صبر کرنے والا نہیں ہے، جو اس تکلیف پر صبر کرے جس کو سنے۔ وہ تو اللہ کے لیے بیٹا ٹھہراتے ہیں، حالانکہ وہ ان کو رزق دیتا ہے اور عافیت دیتا ہے۔[2] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [الحج: ٤٨] ''اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٤)

پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے۔‘‘ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غٰفِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۚ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴾ [إبراهيم: ٤٢] ’’اور (اے نبی!) آپ مت خیال کریں کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔‘‘ اور اسی لیے یہاں فرمایا ہے: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾.

﴿ مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے، حدیث صحیح میں جس کی صحت پر اتفاق ہے؛ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے گواہی دی اس بات کی کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اکیلا، نہیں ہے کوئی شریک اس کا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں، جس کو اس نے مریم کی طرف ڈالا اور اس کی طرف سے روح ہیں اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے، تو داخل کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ جنت میں اس عمل پر کہ جو ہوا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا مشار الیہ وہ شخص ہے جو ان آٹھ صفات کو رکھتا ہے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہے جس نے ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ کہا، یعنی وہ شخص جس کے اوصاف مذکور ہوئے یا جس نے ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ کہا۔ عیسیٰ علیہ السلام مریم کا بیٹا ہے نہ کہ وہ جو نصاریٰ کہتے ہیں کہ اللہ کا فرزند ہے یا معبود ہے۔[2] ﴿ قَوْلَ الْحَقِّ ﴾ اس میں دو قراءتیں ہیں: ایک تو لام کے نصب، یعنی زبر کے ساتھ، اس کی دو جہیں ہیں: یا منصوب ہے مدح کی بنا پر یا "قَالَ اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ" کے لیے مصدر موکد ہے۔ یہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے۔ دوسری قراءت لام کی پیش کے ساتھ ہے، اس کی دو وجہیں ہیں یا تو یہ تعریف ہے اور صفت ہے عیسیٰ علیہ السلام کی۔

کسائی اسی کے قائل ہیں، یعنی خود عیسیٰ علیہ السلام قولِ حق ہیں، ان کا نام ﴿ قَوْلَ الْحَقِّ ﴾ رکھنا ایسا ہے، جیسا کہ "کلمة اللّٰه" ان کا نام رکھا گیا ہے اور حق اللہ عزوجل ہے۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ خبر ہے مبتداء محذوف کی، یعنی "هُوَ قَوْلُ الْحَقِّ". بعض نے کہا ہے کہ تقدیر یوں ہے: "هذا الكلام قول الحق"؛ قول کی اضافت حق کی طرف ایسے ہے جیسے موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہوتی ہے، جیسے "حق اليقين"، یعنی "القول الحق و الحق اليقين".[3] بعض نے کہا ہے کہ اضافت بیانی ہے۔ تیسری قراءت "قال الحق" ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،[4] اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ چوتھی قراءت "قَوْلُ الْحَقِّ"

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٢٩)
[3] فتح القدير (٣/ ٤٥٩) [4] تفسير الطبري (١٨/ ١٩٤)

قاف کی پیش کے ساتھ ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ''قَول وقُول'' قاف کی زبر اور پیش کے ساتھ اور قال ومقال ایک معنی ہیں۔[1]

﴿ يَمْتَرُوْنَ ﴾ یا تو مماراۃ سے ہے، مماراۃ باہم اختلاف کرنے کو کہتے ہیں۔ یا مریہ سے ماخوذ ہے؛ مریہ شک کرنے کو کہتے ہیں، یعنی وہ اختلاف کرتے ہیں یا شک کرتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام میں یہ اختلاف واقع ہوا ہے کہ یہود نے کہا کہ وہ ساحر جادوگر ہیں اور یوسف نجار کے بیٹے ہیں۔ نصاریٰ نے کہا کہ اللہ کے بیٹے ہیں یا معبود ہیں، پھر وہی قتادہ کا قول ذکر کیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، لیکن ''علیٰ ما قالوا'' کے بجائے ''علیٰ ما قال'' ہے اور اس قدر زیادہ ہے کہ پھر لوگ جھگڑے تو مرد مسلم نے کہا کہ میں تم کو قسم دیتا ہوں اللہ کی، کیا تم جانتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کھانا کھاتے تھے اور اللہ نہیں کھاتا، وہ بولے: ''اللھم نعم'' پھر کہا کیا تم جانتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام سوتے تھے اور اللہ نہیں سوتا، بولے: ''اللھم نعم'' پس مسلمان حجت میں اُن پر غالب آئے، پھر قوم نے قتال کیا۔ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ فرقہ یعقوبیہ اس دن غالب ہوئے اور مسلمانوں کو مصیبت پہنچی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ (آیتِ باب)۔ ﴿ مَا كَانَ ﴾ کے معنی ہیں: ''ما صح ولا استقام'' یعنی یہ بات راست و درست نہیں ہے کہ اللہ اولاد رکھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ موکدہ ہے، واحد اور جماعت کی نفی پر دلالت کرتا ہے،[2] معنی یہ ہیں کہ اس کی صفت سے اولاد رکھنا نہیں ہے، یعنی اس کے واسطے اولاد کا ثبوت محال ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ کریمہ کی تنزیہ فرمائی، یوں ارشاد کیا: ﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ یعنی وہ ان کے اس قول سے منزہ اور مقدس ہے۔ پھر اپنی شان اور سلطان کی صراحت کی: ﴿ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ (آیتِ باب) یہ قول پہلے قول کی علت بیان کرتا ہے، یعنی اس کی شان وشوکت تو یہ ہے کہ جب وہ کاموں میں سے کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ اسی وقت بلا تاخیر ہو جاتا ہے، مشکل نہیں ہوتا اس پر وجود میں لانا اس کا جس طرح وہ چاہتا ہے۔ اس قول کے یہاں لانے میں نصاریٰ کو بڑی سرزنش اور الزام حجت ہے، یعنی جس کی یہ شان ہے اس کے واسطے یہ وہم کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی اولاد ہے۔ سورت بقرہ میں اس بات پر پورا کلام گزر چکا ہے۔[3]

﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ﴾ (آیتِ باب) من جملہ تتمۂ کلامِ عیسیٰ علیہ السلام ہے، اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں: ﴿ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ ﴾ [المائدة: ١١٧] ''میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا سوائے اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔'' حرفِ ''أن'' کو الف کی زبر سے پڑھا ہے اس لیے کہ اس سے پہلے لام مقدر ہے، یعنی ''لِأَنَّ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٠٦) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٢٩۔ ٣٣٠) [3] رقم الآية [١١٦]

اللّٰہَ‘‘، اللہ کے واسطے لڑکا نہ ہونے کی ایک دلیل تو ﴿ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا ... الخ﴾ ہوئی، یعنی جو شخص ایسا عالی شان، عظیم السلطان ہے کہ ایک کن کہنے سے جو چاہے فوراً ہو جائے، اس کو اولاد رکھنے سے کیا واسطہ؟! دوسری دلیل یہ ٹھہری کہ اللہ میرا اور تمھارا رب اور پروردگار ہے اور میں اور تم اس کے مربوب ہیں تو پھر جو سب کا رب ہو، اس کو اولاد رکھنے سے کیا تعلق؟! امام زمخشری، خلیل و سیبویہ تبعیت کی وجہ سے اسی طرف گئے ہیں کہ اُن کی زبر بتقدیر لام ہے۔[1]

بعض نے زبر کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کا عطف صلاۃ پر ہے، یعنی ’’أَوْصَانِيْ بِالصَّلَاةِ وَبِأَنَّ اللّٰهَ‘‘ مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھ کو نماز کی وصیت کی ہے اور اس بات کی کہ اللہ میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں اور مکی نے اس کے سوا اور کوئی وجہ ذکر نہیں کی۔ دوسری قراءت حرفِ ’’إن‘‘ کی زیر کے ساتھ ہے، اس کی دو وجہیں ہیں یا تو کلمہ ’’قُل‘‘ مقدر ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عطف ہے ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ پر، یعنی ’’اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ‘‘ یہ قول انتہائی بعید ہے۔

﴿ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ یعنی یہ بات جو میں نے تم سے ذکر کی ہے کہ اللہ میرا رب اور تمھارا رب ہے، یہی سیدھی راہ ہے، جس میں نہ کسی طرح کی کجی ہے نہ اس پر چلنے والا بہکتا ہے۔ ﴿ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ﴾ احزاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ من زائدہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تبعیض کے واسطے ہے، اس لیے کہ اُن میں سے ایک اور مومن فرقہ باقی رہ گیا جو یوں کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں، چناں چہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ غرضیکہ اہلِ کتاب کے فرقوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں اختلاف کیا، لہٰذا نصاریٰ نے تو افراط، غلو اور زیادتی کی اور یہود نے تفریط، تقصیر اور کمی برتی کہ اُن کو اُن کے رتبے اور منزلت سے گھٹا دیا اور نصاریٰ نے یہاں تک بڑھایا کہ اللہ اور اللہ کا بیٹا ٹھہرا دیا۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ ’’اَلَّذِيْنَ‘‘ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ ﴿ مَشْهَدِ ﴾ مصدر میمی بہ معنی شہود و حضور ہے اور یومِ عظیم سے مراد روزِ قیامت ہے یا ظرفِ مکان ہے، یعنی وہ جگہ جہاں سب حاضر ہوں گے۔ معنی یہ ہیں کہ خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا روزِ قیامت میں حاضر ہونے سے اور جو کچھ حساب و جزا و سزا و عذاب اس میں جاری ہوگا اس سے، یا قیامت کے دن حاضر ہونے کے مکان سے۔ یا یہ معنی ہیں کہ خرابی ہے ان کے لیے ان کے مشہدِ عظیم میں حاضر ہونے کے وقت جس میں وہ باہم مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ یا مشہد شہادت اور گواہی کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ خرابی ہے ان کی اس دن کے گواہی دینے سے ان پر۔ ﴿ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ فرمایا، ’’لھم‘‘ نہ کہا، اس کا نکتہ یہ ہے کہ اس میں جتلانا ہے کہ وہ سب کافر ہو گئے اور حکم کی علت کی خبر دینا ہے۔ یعنی ویل اور خرابی کا حکم جو اُن پر لگایا گیا ہے، اس کی علت یہی ہے کہ وہ کافر ہو گئے۔[2]

---

[1] الكشاف (٣/ ١٩) تفسير القرطبي (١١/ ١٠٧)

[2] فتح البيان (٨/ ١٥٩۔ ١٦١)

أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لَكِنِ الظَّلِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلَلٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

وہ لوگ کیا ہی خوب سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہوں گے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے! لیکن آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں ⑱ اور آپ انھیں روزِ حسرت سے ڈرائیں جب ہر معاملے کا فیصلہ کیا جائے گا، جب کہ وہ غفلت میں ہیں، اور وہ ایمان نہیں لاتے ⑲ بلاشبہ ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے اور جو اس (سرزمین) پر ہے وارث ہوں گے اور ہماری ہی طرف وہ لوٹائے جائیں گے ⑳

کفار کو قیامت کے دن (یوم حسرت) سے ڈرانا:

جب تک حشر کا دن ہے دوزخ سے مسلمان نکل نکل کر بہشت میں جائیں گے، تب تک کافر بھی توقع میں ہوں گے، پھر موت کو ایک مینڈھے کی صورت میں لا کر دوزخ اور بہشت کے درمیان میں سب کو دکھا کر ذبح کر دیں گے اور اعلان کر دیا جائے گا کہ بہشتی بہشت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ وہ دن ایسا ہے کہ کافر نا اُمید ہوں گے۔

اللہ پاک قیامت کے دن کفار کی حالت کی خبر دیتا ہے، وہ سب سے بڑھ کر سنتے دیکھتے ہوں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴾ [السجدة: ١٢] ”کاش! آپ دیکھیں جب مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے (پیش) ہوں گے، (وہ کہیں گے:) اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، لہٰذا ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔“ یعنی یہ بات اس وقت کہیں گے کہ ان کو نفع نہ دے گی نہ ان سے کچھ کفایت کرے گی۔

﴿ يَوْمَ يَأْتُونَنَا ﴾ سے مراد روزِ قیامت اور ﴿ الْيَوْمَ ﴾ سے مراد دنیا ہے، یعنی دنیا میں نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ صریح بہکاوے میں پڑے ہوئے ہیں، لہٰذا جہاں اُن سے ہدایت مطلوب ہے، وہاں تو ہدایت نہیں پاتے، راہ پر نہیں آتے اور جس جگہ یہ اُن کو نفع نہ دے گی، یعنی روزِ قیامت کو اس جگہ مطیع اور فرماں بردار بن جائیں گے، سب سے بڑھ کر سنتے دیکھتے سمجھتے بوجھتے ہو جائیں گے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: اور ڈرا ان کو، یعنی خلائق کو اس پچھتاوے کے دن سے جب فیصلہ کیا جائے گا تمام کاموں کا، یعنی بہشتیوں اور دوزخیوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے گا اور ہر ایک جس طرف جا چکا، اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑے گا اور وہ آج کے دن اس حسرت و ندامت کے

دن سے غفلت میں ہیں، جن سے ان کو ڈرایا گیا ہے اور وہ اس کی تصدیق نہیں کرتے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو موت لائی جائے گی گویا چتکبرا مینڈھا ہے (حدیث کے الفاظ ہیں: «كَبْشٌ أَمْلَحُ» مجمع البحار میں ہے کہ املح وہ ہے، جس کی سفیدی سیاہی سے زیادہ ہو، بعض نے کہا: خالص سفید کو کہتے ہیں)[1] پھر وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ٹھہرائی جائے گی، پھر کہا جائے گا: اے بہشت والو! کیا تم اس کو پہچانتے ہو، پس وہ اپنے سر اُٹھائیں گے اور دیکھیں گے اور کہیں گے: ہاں یہ موت ہے۔ پھر کہا جائے گا: اے دوزخ والو! کیا تم اس کو پہچانتے ہو، پس وہ اپنے سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے اور کہیں گے: ہاں یہ موت ہے، پھر اسے حکم کیا جائے گا اور وہ ذبح کر دی جائے گی اور کہا جائے گا: اے جنت والو! خلود (ہمیشگی) ہے اور موت نہیں ہے اور اے دوزخ والو! خلود ہے اور موت نہیں ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾ (آیتِ باب)۔ اور اپنے دست مبارک سے اشارہ فرمایا، پھر فرمایا کہ دنیا والے دنیا کی غفلت میں ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث شریف کو اسی طرح روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم نے اپنی صحیحین میں اعمش سے روایت کردہ حدیث سے اس کی تخریج کی ہے اور ان کے الفاظ اسی کے لگ بھگ ہیں۔[2] (وقد روى هذا الحديث الحسن بن عرفة حدثني أسباط بن محمد عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة رضي الله عنه بنحوه وهو في الصحيحين عن ابن عمر، و رواه ابن جريج قال: قال ابن عباس رضي الله عنهما فذكر من قبله نحوه) امام ابن جریج رحمہ اللہ نے اپنے والد سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ اُن کے والد نے عبید بن عمیر کو سنا کہ وہ اپنے قصوں میں کہتے تھے کہ لائی جائے گی موت گویا وہ ایک دابہ (جانور) ہے۔ پھر وہ ذبح کی جائے گی اور لوگ دیکھتے ہوں گے۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ایک قصے میں جس کا ذکر کیا ہے، کہا کہ نہیں ہے کوئی نفس مگر حال یہ ہے کہ وہ دیکھے گا ایک گھر کو جنت میں اور ایک گھر کو دوزخ میں اور وہ حسرت کا دن ہے۔ سو دوزخ والے اس گھر کو دیکھیں گے جو جنت میں ہے اور اُن سے کہا جائے گا کہ اگر تم عمل کرتے تو تم کو یہ گھر ملتا، پس ان کو حسرت پکڑ لے گی۔ پھر بہشت والے اس گھر کو دیکھیں گے جو دوزخ میں ہے۔ پھر کہا جائے گا: "لولا أن من الله عليكم"، یعنی اگر اللہ تعالیٰ تم پر احسان نہ کرتا تو تمھارا گھر یہ ہوتا۔[3]

امام سدی رحمہ اللہ کے الفاظ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی اس آیت کی تفسیر میں یہ ہیں کہ جس وقت جنت

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٦٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٣، ٦١٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٩، ٢٨٥٠) مسند أحمد (٣/ ٩)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠١_ ٢٠٠)

والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو موت کو ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، یہاں تک کہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ٹھہرائی جائے گی، پھر ایک پکارنے والا پکارے گا: اے جنت والو! یہ وہ موت ہے جو لوگوں کو دنیا میں مارتی تھی۔ پس کوئی بھی باقی نہ رہے گا علیین والوں میں سے اور نیچے سے نیچے درجے والوں میں سے جنت میں مگر وہ اس کو دیکھے گا۔ پھر ایک پکارنے والا پکارے گا: اے دوزخ والو! یہ وہ موت ہے، جو دنیا میں لوگوں کو مارتی تھی۔ پس کوئی نہ رہے گا دوزخ کے ضحضاح (جہاں کم سے کم عذاب ہوتا ہے، یعنی ٹخنوں تک آگ ہے) میں اور نہ ہی دوزخ کے نچلے سے نچلے درجے میں، مگر وہ اس کی طرف دیکھے گا، پھر وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دی جائے گی، پھر ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے جنت والو! "هو الخلود أبد الأبدين" اور اے دوزخ والو! "هو الخلود أبد الأبدين" یعنی ہمیشہ ہمیشہ بہشت اور دوزخ میں رہنا ہے۔ سو اہلِ جنت تو ایسے خوش ہوں گے کہ اگر کوئی خوشی کے مارے مردہ ہو جاتا تو وہ مر جاتے اور اہلِ دوزخ ایک ایسی چیخ ماریں گے کہ اگر کوئی چیخ مارنے سے مردہ ہو جاتا تو وہ مر جاتے، پس یہ اللہ کا وہی قول ہے: ﴿وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس وقت موت ذبح کر دی جائے گی۔[1] (ورواه ابن أبي حاتم في تفسيره)

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾ روزِ قیامت کے ناموں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعظیم کی ہے اور اپنے بندوں کو اس سے ڈرایا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾ روزِ قیامت ہے اور یہ آیت پڑھی: ﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: ٥٦] "(ایسا نہ ہو) کہ کوئی شخص کہے: ہائے افسوس! اس پر جو میں نے اللہ کے حق (اطاعت) میں کوتاہی کی۔"[2]

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ﴾ اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ خالق مالک متصرف وہی ہے اور ساری خلق ہلاک ہو جائے گی، وہی پاک ذات باقی رہ جائے گی نہ کوئی ملک کا دعویٰ کرے گا اور نہ کسی تصرف کا، بلکہ اپنی ساری خلق کا وارث، ان کے بعد باقی رہنے والا اُن میں حکم کرنے والا وہی ہے۔ لہٰذا کوئی نفس مچھر کے پَر کے برابر یا ایک ذرے کے برابر ظلم نہ کیا جائے گا۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا کہ ہدبۃ بن خالد قیسی رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ ہم کو حزم بن ابی حزم قطعمہ نے حدیث بیان کی کہ عمر بن عبدالعزیز نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن صاحبِ کوفہ کو لکھا: "أما بعد فإن الله كتب على خلقه حين خلقهم الموت فجعل مصيرهم إليه، وقال: في ما أنزل في كتابه الصادق الذي حفظه بعلمه و أشهد ملائكته على خلقه أنه يرث الأرض و من

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٩۔ ٢٤١٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٥) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠١)

عليها وإليه يرجعون"[1] "اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرتے وقت موت کو ان کے مقدر کر دیا کہ ہر کوئی اس کا ذائقہ چکھنے والا ہے، اس نے اپنی سچی کتاب میں یہ نازل کیا اور اپنے فرشتوں کو اپنی مخلوق پر گواہ بنایا کہ وہی زمین اور اس پر موجود ہر چیز کا وارث ہوگا اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ابو العباس نے کہا ہے کہ عرب لوگ ﴿ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ﴾ کو تعجب کی جگہ پر بولتے ہیں۔ کہتے ہیں "أسمع بزيد و أبصر به" یعنی زید کیا سنتا دیکھتا ہے۔[2] سو اللہ پاک نے اپنے نبی کریم ﷺ کو ان سے تعجب دلایا ہے کہ وہ لوگ جس دن ہمارے پاس حساب و جزا کے لیے آئیں گے تو ایسے سنتے دیکھتے ہوں گے کہ تم ان کے دیکھنے سننے سے تعجب کرو گے۔ سمین نے کہا کہ یہ لفظ تو امر کا ہے اور اس کے معنی تعجب کے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ حقیقتاً امر ہے اور مامور رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی تم لوگوں کو ان کا حال دکھا دو، سنا دو کہ ان پر کیا کچھ عذاب کیا جائے گا۔ یہ قول امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے منقول ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے کہ کفار اس دن سب سے بڑھ کر سنتے اور دیکھتے ہوں گے،[4] حالانکہ آج یعنی دنیا میں نہ وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ ﴿ لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ اصل میں "لٰكِنَّهُمْ" ہے۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ اسباب میں اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں دنیا میں ظاہری طور پر واضح خطا میں پڑے ہوئے ہیں۔ تفکر و اعتبار کو چھوڑ رکھا ہے۔ آثار میں نظر کرنے اور غور کرنے کو چھوڑ رکھا ہے۔

﴿ وَاَنْذِرْهُمْ ﴾ کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، یعنی تم کفارِ مکہ کو حسرت کے دن سے ڈرا دو، یہ وہی قیامت کا دن ہے، جس میں نیک و بد سب پچھتائیں گے، حسرت کریں گے۔ گنہگار تو اپنے گناہ کرنے پر حسرت کرے گا اور نیک اس بات پر پچھتائے گا کہ اس نے بہت سی نیکیاں کیوں نہ کیں۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ کے فرزند عبدالرحمٰن کا قول ہے، جو پہلے گزر چکا ہے۔ فتح البیان میں اس کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔[5] پھر قول مذکور کو نقل کرنے کے بعد یوں کہا ہے کہ اس کی سند میں علی بن ابی طلحہ ہے اور وہ ضعیف ہے اور جس آیت سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے استدلال کیا ہے، وہ مطلوب پر دلالت نہیں کرتی نہ مطابقت کے لحاظ سے نہ شمولیت کے لحاظ سے اور نہ التزام کے اعتبار سے۔

﴿ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جب حساب کتاب ہو چکے گا، نامۂ اعمال لپیٹ دیے جائیں گے، جنت والے جنت میں، دوزخ والے دوزخ میں جا چکیں گے۔ ﴿ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ یعنی حالانکہ وہ غافل ہیں،

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠١) [2] تفسير القرطبي (١١/ ١٠٨) [3] تفسير الطبري (١٨/ ١٩٩)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٠٩) [5] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠١)

اس سے کہ جو کچھ ان کے ساتھ کیا جائے گا، یہ حال متضمن ہے تعلیل کو۔ معنی یہ ہیں کہ تم ان کو ڈراؤ اس لیے کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہیں کہ اس میں ڈرانے کی طرف محتاج ہیں، وہ حالت غفلت اور کفر کی ہے۔[1]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿41﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿42﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿43﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿44﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿45﴾

اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجیے، بے شک وہ نہایت سچا (اور) نبی تھا ﴿41﴾ جب اس نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے باپ! تو اس کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ تیرے کچھ کام آئے؟ ﴿42﴾ اے میرے باپ! بے شک میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، لہٰذا تو میری اتباع کر، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا ﴿43﴾ اے میرے باپ! تو شیطان کی عبادت نہ کر، بلاشبہ شیطان رحمان کا سخت نافرمان ہے ﴿44﴾ اے ابا جان! بے شک میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمان کی طرف سے عذاب آ پہنچے، پھر تو شیطان کا ساتھی ہو جائے ﴿45﴾

ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کو وعظ و نصیحت:

یعنی کفر کے وبال سے کچھ آفت آئے اور تو شیطان سے مدد مانگنے لگے، یعنی بتوں سے۔ اکثر لوگ ایسے ہی وقت شرک کرتے ہیں۔

اللہ پاک اپنے نبی محمد ﷺ سے فرماتا ہے کہ تم کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرو اور اسے اپنی قوم پر پڑھو، جو بتوں کو پوجتے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کی ملت اور مذہب پر ہیں اور اُن سے ابراہیم خلیل الرحمٰن کا قصہ بیان کرو، جو اُن کا اپنے باپ کے ساتھ گزر چکا ہے، وہ بے شک سچے نبی تھے۔ دیکھو! انھوں نے کس طرح اپنے باپ کو بتوں کی پوجا سے منع کیا ہے۔ پس کہا: اے میرے باپ! تو ایسی چیز کو کیوں پوجتا ہے، جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھے نفع پہنچاتی ہے نہ تجھ سے کچھ ضرر دور کر سکتی ہے؟ اے میرے باپ! اگرچہ

[1] فتح البیان (٨/ ١٦١۔ ١٦٢)

میں تیری پشت سے ہوں اور تو مجھ کو اپنے سے زیادہ تر چھوٹا دیکھتا ہے، کیونکہ میں تو تیرا بیٹا ہی ہوں، لیکن تو یہ بات خوب جان لے کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم حاصل ہوا ہے، جس کو تو نہیں جانتا، نہ تجھے اس کی کوئی اطلاع ہے نہ اب تک وہ تیرے پاس آیا ہے۔ پس تو میری راہ پر چل تو میں تجھے سیدھی راہ سمجھا دوں، جو مطلب تک لے پہنچے اور خوف سے تجھے نجات دے۔ اے میرے باپ! تو شیطان کو مت پوج، یعنی تو اِن بتوں کو پوجتا ہے، اس میں شیطان کی اطاعت مت کر، کیوں کہ اس طرف بلانے والا اور اس سے خوش ہونے والا وہی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [یٰسٓ: ٦٠] ''اے بنی آدم! کیا میں نے تمھیں (اس بات کی) تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، بلاشبہہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴾ [النساء: ١١٧] ''وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو پکارتے ہیں اور دراصل وہ سرکش شیطان ہی کو پکارتے ہیں۔''

پھر اس ممانعت کی یہ دلیل بیان کی کہ بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان و مخالف ہے۔ اپنے رب کی اطاعت سے کتراتا ہے، تکبر کرتا ہے، خود کو بڑا سمجھتا ہے۔ اس پر رب نے اس کو اپنی درگاہ سے دور کر دیا اور مردود کر دیا ہے۔ اپنی رحمت سے دور پھینک دیا ہے، لہٰذا تو اس کی راہ پر مت چل کہ اس کی مثل ہو جائے۔ اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھ کو رحمٰن سے کوئی آفت آ لگے تیرے شرک کرنے پر اور اس بات کو نہ ماننے پر جس کا میں تجھے حکم کرتا ہوں پھر تو شیطان کا ساتھی ہو جائے، یعنی پھر تیرے لیے کوئی مولیٰ (دوست) ناصر اور مددگار اور فریاد رس نہ ہوگا سوائے ابلیس کے، حالانکہ اس کو اور اس کے علاوہ کسی کو کسی طرح کا اختیار نہیں ہے۔ بلکہ تیرا اس کی پیروی کرنا عذاب کا موجب ہے کہ عذاب اور آفت ہر طرف سے تجھے گھیر لے، بلکہ جیسا اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النحل: ٦٣] ''اللہ کی قسم! البتہ تحقیق ہم نے آپ سے پہلی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے (برے) اعمال ان کے لیے خوش نما کر دیے، چناں چہ آج وہی ان کا دوست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جو کوئی شیطان کا کہا مانتا ہے تو شیطان اس کا ساتھی ہوتا ہے اور اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان واضح یہ ہے کہ نبی ﷺ کے ابراہیم علیہ السلام کا کتاب میں ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اُن کی خبر اور قصے لوگوں کو پڑھ کر سنائیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ [الشعراء: ٦٩] ''اور ان (کفار) کو ابراہیم کی خبر سنایئے۔'' پس مراد وہی بات ہے جو مذکور ہوئی، ورنہ اس کا اپنی کتاب میں ذکر کرنے والا تو

خود اللہ پاک ہے۔ ابراہیم علیہ السلام ایک سو پچھتر سال زندہ رہے۔ اُن کے اور آدم علیہ السلام کے درمیان دو ہزار برس کا فاصلہ ہے اور اُن کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ یہ قول امام سیوطی رحمہ اللہ نے تحبیر میں ذکر کیا ہے۔

﴿ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ صدیق کثیر الصدق و بلیغ الصدق کو کہتے ہیں، یعنی جو شخص بہت سچا اور انتہا درجے کا راست گو ہو اسے صدیق بولتے ہیں۔ چونکہ یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ ہر نبی کے لیے واجب ہے کہ وہ صدیق ہو اور ہر صدیق کے لیے واجب نہیں کہ وہ نبی ہو، اسی وجہ سے صدیق کے مرتبے کا قربِ نبی کے مرتبے سے ظاہر ہوگیا۔ پس اسی واسطے صدق کے ذکر کے بعد نبی کے ذکر کی طرف انتقال کیا، مطلب یہ ہے کہ تم ذکر کرو ابراہیم علیہ السلام کا جن میں یہ دونوں صفتیں موجود تھیں، یہ جملہ اس سے پہلے جملے کی وجہ بیان کرتا ہے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرنے کا حکم اس لیے کیا کہ وہ صدیقیت و نبوت دونوں مرتبوں کے حامل تھے۔

پھر یہ جملہ باوجود تعلیل کے معترضہ ہے بدل اور مبدل منہ کے درمیان، کیوں کہ کلمہ ابراہیم مبدل منہ ہے اور ﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ ﴾ بدلِ اشتمال ہے ابراہیم علیہ السلام سے، مطلب یہ ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرو، یعنی اس وقت کا جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا: الخ۔ ذکر کی تعلیق وقت کے ساتھ کی، باوجود اس کے مقصود ان حادثوں کا یاد دلانا ہے، جو اس وقت میں واقع ہوئے ہیں۔ صرف وقت کا یاد کرنا مقصود نہیں ہے، لہٰذا یہ بات مبالغے کے واسطے ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ہے، اس کی تقریر پہلے گزر چکی ہے۔[1] ﴿ يٰۤاَبَتِ ﴾ میں حرف تا حرف یا کے بدلے میں ہے، اس لیے کہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔ ﴿ لِمَ تَعْبُدُ ﴾ میں انکار و توبیخ کے لیے استفہام ہے، یعنی اے میرے باپ! تو اس کو کس شے اور کس سبب کے لیے پوجتا ہے جو تیری تعریف کرنے کو اور تیرے پکارنے کو نہیں سنتی اور نہ تیری عبادت اور افعال کو دیکھتی ہے، جن کو تو ثواب کے ارادے سے بجا لاتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز اس سے عام تر ہے، اس پر سننے دیکھنے کی نفی کو محمول کیا جائے، یعنی جو باتیں کہ سنی جاتی ہیں، ان میں سے کسی بات کو نہیں سنتی اور جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں، اُن میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھتی اور نہ تیرے کچھ کام آتی ہے۔ سو وہ تیرے لیے نہ کسی نفع کو کھینچ کر لاتی ہے، نہ تجھ سے کسی تکلیف کو دفع کرتی ہے۔ اس سے مراد وہ بت ہیں، جن کو آزر پوجا کرتا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ پر دلائل اور نصیحتیں پیش کیں اور ہر دلیل اور نصیحت کو ایسی آواز سے شروع کیا، جن میں رِفق ولین ولطف ونرمی شامل تھی، یہ اس لیے کیا کہ اپنے باپ کے دل پر اثر کریں اور اسے مائل کریں اور اپنے رب کے امر کا امتثال (تعمیل) کریں۔

پھر بتوں کے تین وصف بیان کیے، ان میں سے ہر ایک الٰہیت میں قادح (عیب لگانے والا) ہے۔ انھوں نے اس کلام کو انتہائی حسن سے ترتیب دیا، یعنی معبود کی پوجا اس لیے کی جاتی ہے کہ نفع پہنچائے، ضرر کو دور کرے،

---

[1] سورة الأنعام، رقم الآية [٧٤]

آڑے وقت پر کام آئے، معبود ایسا ہونا چاہیے۔ جن میں ان صفتوں میں سے ایک بھی نہ ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا۔ ایسے معبود کو پوجنے سے کیا حاصل؟ اگر حاصل ہے تو یہی کہ شیطان کا ساتھی بنے، عذابِ الیم اپنے سر لے۔ لہٰذا اس بات کو کوئی احمق بھی اختیار نہیں کرتا ہے عاقل کا کیا ذکر۔ پھر اپنے باپ کو حق کی طرف دوبارہ بلایا اور یوں فرمایا کہ اے میرے باپ! بے شک میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، یعنی بعض علم۔ اور وہ علمِ وحی ہے، یا علمِ توحید ہے، یا علمِ آخرت ہے۔ یہ تین قول ہیں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے۔[1] انھوں نے اس بات کی خبر دی کہ اُن کی طرف علم کا ایک حصہ پہنچا ہے، جو اُن کے باپ کی طرف نہیں پہنچا اور جس چیز سے حق کی طرف پہنچیں اور اس کے سبب سے گمراہ کو راہ بتانے پر قادر ہوں، ایسی چیز کا حصول اُن کے لیے متجدد ہوا ہے، اسی لیے باپ کو اپنی پیروی کرنے کا امر کیا۔

﴿ فَاتَّبِعْنِيٓ ﴾ یعنی ایمان و توحید میں میری راہ پر چل، میں تجھے سیدھی اور برابر راہ سمجھا دوں گا کہ وہ تجھے مطلوب کی طرف پہنچا دے گی اور مکروہ سے نجات بخشے گی۔ پھر اس نصیحت کی دوسری نصیحت سے تاکید کی کہ جس حال میں وہ ہے اس سے اس کو زجر کرے (دھمکی دے)۔ اے میرے باپ! تو شیطان کو مت پوج، یعنی تو اس کا کہنا مت مان، کیوں کہ بتوں کی پوجا من جملہ اطاعتِ شیطان ہے۔ پھر اس نہی کی وجہ بیان کی کہ بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے، جس وقت کہ اللہ پاک نے اس کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے حکم نہ مانا، سجدہ نہ کیا اور جو شخص اللہ پاک کے نافرمان کا مطیع ہے، وہ اللہ کا نافرمان ہے اور نافرمان اس لائق ہے کہ اس سے نعمتیں چھین لی جائیں اور اس پر سزا اور عذاب نازل ہو۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عصی و عاصی کے ایک معنی ہیں۔[2]

پھر جو بات ان نصیحتوں کی باعث ہوئی تھی، اس کا بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہیں آپ کو رحمٰن کی طرف سے کوئی آفت آ جائے، اگر آپ نے توبہ نہ کی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس جگہ ﴿ أَخَافُ ﴾ کے معنی "أعلم" ہیں[3] اور اِسی کے ساتھ بہت سے تھوڑے لوگوں نے اس آیت کی تفسیر کی ہے اور اس طرف تقریر میں اشارہ کیا ہے۔ اکثر لوگوں کا قول یہ ہے کہ اس جگہ خوف اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا خیال اور یقین نہ تھا کہ ان کا باپ کفر پر مرے گا، کیوں کہ اگر انھیں اس کا یقین ہوتا تو اس کو نصیحت اور وعظ کرنے میں مشغول نہ ہوتے، اس لیے خوف کا اپنے ظاہر پر جاری کرنا واجب ہے۔

غیر پر خوف کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی طرف ضرر پہنچنے کا گمان کرے۔ ولی کے معنی قرین و ساتھی کے ہیں، مطلب یہ کہ اگر تو شیطان کی اطاعت کرے گا تو آگ اور لعنت میں اس کے ساتھ، یعنی اس کا قرین ہوگا، پس اس سبب سے اس کا موالی ہو جائے گا، یا یہ معنی ہیں کہ شیطان کے ساتھ موالات اور دوستی رکھنے کی وجہ سے اس کے ساتھ عذاب میں ہوگا۔ یہاں کوئی ولایت اور دوستی حقیقی نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ

[1] تفسير البحر المحيط (٦/ ١٨٢) [2] فتح القدير (٣/ ٤٦٣) [3] معاني القرآن (٣/ ١٢٠)

﴿ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٦٧] ''اس دن متقین کے سوا تمام (جگری) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔'' یعنی دنیا میں جو لوگ باہم دوست تھے، وہ قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، مگر اس سے متقی پرہیز گار لوگوں کو نکال لیا ہے، کیوں کہ اُن کی دوستی برقرار رہے گی۔ کسی نے کہا: ولی کے معنی تالی ہیں۔ تالی وہ شے ہے کہ دوسری شے کے پیچھے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ولی بہ معنی قریب ہے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ولی ماخوذ ہے ولیٰ سے، ولیٰ قرب و نزدیکی کو کہتے ہیں۔[1] جو چیزیں ایک دوسرے کے قریب ہوں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے قریب ہے، مطلب یہ کہ تو آگ میں شیطان کے قریب ہو گا، تو اس سے قریب اور وہ تجھ سے قریب۔[2]

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

وہ (باپ آزر) کہنے لگا: اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے منہ پھیرے ہوئے ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور رجم کر دوں گا اور تو لمبا عرصہ مجھ سے دور چلا جا (46) ابراہیم نے کہا: تجھ پر سلامتی ہو، عن قریب میں تیرے لیے اپنے رب سے استغفار کروں گا، بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے (47) اور میں کنارہ کش ہوتا ہوں تم سے اور ان سے جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اور میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں، اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا (48)

ابراہیم علیہ السلام کے والد کا جواب:

تیری سلامتی رہے۔ یہ رخصت کا سلام ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر دین کی بات سے ماں باپ ناخوش ہوں اور گھر سے نکالنے لگیں اور بیٹا ماں باپ کو میٹھی بات کہہ کر نکل جائے تو وہ بیٹا عاق نہیں۔ اور گناہ بخشوانے کو انھوں نے وعدہ کیا تھا، جب اللہ کی مرضی نہ دیکھی، تب اس کو موقوف کیا (چھوڑ دیا)۔

اللہ پاک ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے جواب کی خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کی دعوت کا کیا جواب دیا۔ یوں کہا: کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے اے ابراہیم! یعنی کیا تو ان کو پوجنا نہیں چاہتا اور نہ اُن سے راضی اور خوش ہے، تو اُن کو برا بھلا کہنے اور عیب نکالنے سے باز رہ، ان کو گالی مت دے، برا مت کہہ، کیوں کہ اگر تو اس سے باز نہ

---

[1] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ١٦٠) [2] فتح البيان (٨/ ١٦٣۔١٦٥)

آئے گا تو میں تجھ سے بدلہ لوں گا اور تجھے گالی گلوچ دوں گا۔ ﴿ لَاَرْجُمَنَّكَ ﴾ جو اس کا قول ہے، وہ یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سدی، ابن جریج اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ نے کہا کہ ﴿ مَلِيًّا ﴾ سے مراد ''دَهْرًا'' ہے، یعنی ایک زمانہ تو مجھ سے دور جا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مراد زمانۂ طویل ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أبدًا''، یعنی تو ہمیشہ کو مجھ سے دور ہو جا۔ علی بن ابی طلحہ اور عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ تو مجھ سے صحیح سالم دور ہو جا اس سے پہلے کہ تجھ کو مجھ سے کوئی سزا پہنچے۔

امام ضحاک، قتادہ، عطیہ عوفی و مالک رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی ایسا ہی کہا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] غرضیکہ جس وقت کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد نے اُن کو یہ جواب دیا تو انھوں نے اپنے باپ سے کہا: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ﴾ یعنی تیری سلامتی رہے۔ یہ ویسی بات ہے جیسی کہ اللہ پاک نے مومنین کی صفت میں ارشاد فرمائی ہے: ﴿ وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ [الفرقان: ٦٣] ''اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [القصص: ٥٥] ''اور جب وہ بے ہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔''

ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے باپ سے ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ﴾ کہا، اس کے یہ معنی ہیں کہ میں جو ہوں سو میری طرف سے تجھے کوئی مکروہ چیز اور ایذا نہ پہنچے گی۔ یہ بات انھوں نے باپ کے احترام میں کہی۔ ﴿ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ﴾ یعنی میں عن قریب تیرے بارے میں اللہ سے اس بات کا سوال کروں گا کہ وہ تجھے ہدایت کرے اور تیرا گناہ بخش دے۔ ﴿ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴾ بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا ہے کہ ﴿ حَفِيًّا ﴾ کے معنی ''لطیفا'' ہیں،[2] یعنی وہ اس بات میں مجھ پر لطف کرنے والا ہے کہ اس نے مجھے اپنی عبادت کی ہدایت فرمائی اور اس کے لیے اخلاص کرنے کی راہ بتائی۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ان کو دعا قبول کرنے کا عادی بنا رکھا ہے، یعنی اللہ پاک کی مہربانی اُن پر یہی ہے کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو اس کو قبول کر لیتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''الحفي الذي يهتم بأمره''[3] یعنی فلاں شخص فلاں شخص کے ساتھ حفی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے کام کا اہتمام کرتا ہے اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے ایک مدتِ دراز اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت مانگی، یہ کام اس کے بعد بھی کیا کہ شام کی

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠٥۔ ٢٠٧) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٦)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠٧)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٦)

طرف ہجرت کی اور مسجد الحرام بنائی اور اس کے بعد کہ اُن کے لیے اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام پیدا ہو چکے تھے۔ یہ استغفار ان کے اس قول میں ہے: ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ [إبراهيم: ٤١] ''اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہوگا اس دن مجھے، میرے والدین کو اور تمام مومنوں کو معاف فرمانا۔'' ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے اپنے رشتہ داروں، گھر والوں کے لیے استغفار کی ہے، انھوں نے اس بارے میں ابراہیم خلیل جلیل علیہ السلام کی پیروی اختیار کی، یہاں تک کہ اللہ پاک نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی: ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الممتحنة: ٤] ''یقیناً تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بے شک ہم تم سے اور ان سے بَری ہیں، جن کی تم عبادت کرتے ہو سوائے اللہ کے، ہم تم سے منکر ہوئے، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہوگیا ہے، حتی کہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں ضرور تیرے لیے بخشش مانگوں گا اور میں تیرے لیے اللہ (کی طرف) سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔'' یعنی اور باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرو، مگر اس قول میں ان کی اقتدا مت کرو۔

پھر اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ ابراہیم اس بات سے باز آئے، اس سے رجوع کیا: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١١٣۔ ١١٤] ''نبی اور ایمان والوں کے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں، ان کے متعلق یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ وہ بلاشبہہ دوزخی ہیں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا، جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہوگیا کہ یقیناً وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے زار ہوگئے۔ بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے۔''

قولہ: ﴿ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی میں تم سے پرہیز کرتا ہوں، یکسو ہوتا ہوں اور بیزار ہوتا ہوں تم سے اور تمھارے معبودوں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو: ﴿ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ﴾ اور میں اپنے رب کو پوجتا ہوں جو اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ﴿ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴾ یعنی امید ہے کہ میں

اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔ یہ کلمہ ﴿ عَسٰۤی ﴾ موجبہ لا محالہ ضروری ہے، کیوں کہ ابراہیم علیہ السلام سید الانبیا ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، یعنی اُن کی دعا یقیناً قبول ہوگئی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جس وقت ان نفع بخش نصیحتوں اور مواعظِ مقبولہ نے آزر کے کانوں میں گزر کیا تو آزر نے نہایت سختی، رسوائی اور درشتی سے اُن کا مقابلہ کیا اور کہا: ﴿ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴾ ان کا نام لے کر پکارا اور ﴿ يٰۤاَبَتِ ﴾ کا "یَا بُنَیَّ" سے مقابلہ نہ کیا اور ابراہیم کے نام کو اخیر میں رکھا اور مبتدا پر خبر مقدم کی اور خبر سے پہلے ہمزۂ استفہام (سوالیہ انداز) لایا، یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ مقصد جھڑکنا، ڈانٹنا اور تعجب دلانا اور اُن کے ساتھ کسی قسم کی رغبت کا انکار کرنا ہے، گویا وہ معبود اس جنس سے ہیں کہ اس سے کوئی عقل مند منہ نہیں موڑتا۔ معنی یہ ہیں کہ کیا تو میرے معبودوں سے منہ پھیرنے والا ہے۔ اے ابراہیم! اور تو اُن کے غیر کی طرف پھرنے والا ہے۔ یعنی تعجب کی بات ہے کہ تو ہی اُن سے پھرا ہوا ہے، تجھے تو ہرگز پھرنا نہیں چاہیے، کیوں کہ اُن کی پوجا سے تو کوئی عقل والا نہیں پھرتا، پھر ان کو ڈرا دھمکا کر یوں کہا: ﴿ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ ﴾ یعنی اگر تو بتوں کے بارے میں گفتگو کرنے سے یا اُن سے بے رغبت ہونے سے باز نہیں آئے گا تو میں تجھ کو سنگسار کروں گا، یہاں تک کہ تو مر جائے گا اور ﴿ لَىِٕنْ ﴾ کا لام توطئہ (پامال کرنا) قسم کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ میں تجھے ماروں گا، یا بری بات کہہ کر تجھ کو اپنے پاس سے دور کر دوں گا، یا تیرا کام ظاہر کر دوں گا، پس تو مجھ سے ڈر۔

﴿ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴾ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "هجرته مليا و ملوة و ملاوة"[1] یعنی "الملاوة من الزمان وهوالطويل" حاصل اس سب کا یہ ہے کہ "ملیا" سے مراد زمانۂ طویل ہے۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے والد عناد پر جمے ہوئے ہیں تو بولے: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ﴾ یہ سلام ہے الوداع کرنے، قطع تعلق کرنے اور ترک کرنے کا۔ یعنی یہ ویسا سلام ہے جیسے کوئی جاہل کسی عالم دانش مند سے اُلجھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ سلام ہے میرے اور تیرے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے، میں تجھ سے الگ تھلگ ہوں۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ میری طرف سے تیرے لیے امن ہے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے۔[2] اور باوجود اپنے والد کافر ہونے کے امن اس لیے دیا کہ ان کو اپنے والد سے لڑنے کا حکم نہ تھا۔ پہلا قول زیادہ قابلِ قبول ہے اور جمہور بھی اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ باپ کو دل جوئی اور نرمی کے طور پر سلامتی کی دعا دی اور یہ بات ﴿ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ ﴾ کے مقابلے میں کہی۔ ادھر سے وہ سختی اور ادھر سے یہ نرمی، یہ بدی کا نیکی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ پھر باپ

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ١١١) [2] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٠٧)

سے وعدہ کیا کہ میں تیرے واسطے اللہ سے بخشش مانگوں گا، تاکہ اس کے دل میں اُلفت ہوجائے اور وہ نرم پڑ جائے اور سختی و درشتی جاتی رہے۔ کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

والشيخ لا يترك أخلاقه حتى يوارى في ثرى رمسه

یعنی بوڑھا آدمی اپنی عادات کو ترک نہیں کرتا یہاں تک کہ قبر کی مٹی میں دبا دیا جائے۔ غرضیکہ ایک بوڑھے درشت مزاج کا نرم پڑ جانا اور اپنی عادات کو ترک کر دینا انتہائی مشکل ہے۔ کسی نے کہا کہ استغفار سے مراد توفیق طلب کرنا ہے کہ اللہ اس کو ایمان کی توفیق دے، جو موجبِ مغفرت ہے، یعنی میں اپنے رب سے تیرے لیے توبہ کا سوال کروں گا، جس سے مغفرت ملتی ہے، یعنی اس طریقے پر کافر کے لیے استغفار کرنا جائز ہے، گویا یوں کہتے ہیں: الٰہی تو اس کو اسلام کی توفیق دے اور اس پر رجوع کر اور اس کو ہدایت دے، لیکن صحیح وہی قول ہے جو اوپر گزر چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم نہ تھا کہ باپ کفر پر مرے گا، ورنہ وہ استغفار نہ کرتے۔

پھر استغفار کرنے کی وجہ بیان کی، وہ یہ قول ہے: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴾ یعنی میں تیرے لیے اللہ پاک سے مغفرت مانگوں گا، کیونکہ وہ مجھ پر بہت زیادہ مہربان اور لطف و کرم کرنے والا ہے۔ جب کوئی شخص کسی شخص سے بھلائی اور نیکی کرتا ہے تو عرب لوگ اپنی بول چال میں یوں بولتے ہیں: ''حفى بي و تحفى'' یعنی اس نے میرے ساتھ نیکی کی۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''حفى بي حفاوة و حفوة''[1] کے یہ معنی ہیں کہ اس نے میرے ساتھ اعتنا کیا، مجھ پر توجہ کی، میری عزت اور الطاف میں مبالغہ برتا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَفِيًّا ﴾ کے معنی ہیں، عالم لطیف، یعنی وہ دانا اور لطف فرما ہے، جس وقت میں اس کو پکارتا ہوں تو مجھے جواب دیتا ہے۔[2] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں[3] اور حفی اس کو بھی کہتے جو سوال کرنے میں پرلے سرے کو پہنچ جائے۔ ﴿ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ''جیسے آپ اس (کے وقت) سے بخوبی واقف ہیں۔'' اسی معنی سے ہے۔

پھر جس وداع ہونے اور ترک کرنے کے لیے خلیل جلیل علیہ السلام کا سلام تھا، اس کی یوں صراحت فرمائی: ﴿ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی میں اپنا دین لے کر تم سے اور تمھارے معبودوں سے ہجرت کرتا ہوں، اس لیے کہ نہ تم نے میری نصیحت قبول کی اور نہ دعوت نے تم کو کوئی فائدہ دیا۔ خلیل علیہ السلام کا یہ قول ﴿ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴾ کے مقابلے میں ہے۔ ﴿ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ﴾ اور میں اپنے اکیلے رب کو پکاروں گا۔ ﴿ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴾ یعنی اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر خائب و محروم و بے نصیب نہ رہوں گا، جیسے تم بتوں کو پوج کر خائب و خاسر ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ شقی کے معنی عاصی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ خلیل کی اس دعا سے مراد یہ ہے کہ اللہ اُن کو اولاد اور گھر والی عطا فرمائے، جس سے وہ تنہائی کی حالت میں اُنس پذیر ہوں اور وحشت کے وقت ان سے چین حاصل کریں۔

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١١٣) [2] معاني القرآن (٣/ ١٢٠) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠٧)

کلام کو کلمہ ﴿ عَسٰى ﴾ سے شروع کیا، اس میں تواضع، خاکساری اور کسرِ نفسی ہے اور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ دعا قبول کرنا اور ثواب دینا، اللہ کا فضل و کرم ہے کہ یہ دونوں کام اس پر کوئی واجب اور ضروری نہیں ہیں اور ہر کام کا ملاک (دار و مدار) یعنی جس سے اس کا قیام ہوتا ہے، وہ اس کا خاتمہ ہے اور خاتمہ غیب کی بات ہے، کسی کو اس کا پتا نہیں سوائے اللہ پاک کے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی مراد اپنے باپ کے لیے ہدایت کی دعا کرنا ہے اور کلمہ ﴿ عَسٰى ﴾ شک کے لیے ہے، اس کو اس واسطے لائے ہیں کہ ان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ باپ کے حق میں ان کی دعا قبول ہوگی یا نہیں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے، وجہ یہ ہے کہ آیندہ اللہ پاک نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ دعا سے مراد اہل اور اولاد کی دعا کرنا ہے، والد کے لیے دعا کرنا مقصود نہیں ہے۔[1]

﴿ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝۴۹ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝۵۰ ﴾

پھر جب اس نے کنارہ کیا ان سے اور جنھیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، تو ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب بخشے، اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا (49) اور ہم نے انھیں اپنی رحمت بخشی، اور ان کے لیے سچائی کا بول (ذکر خیر) بلند کیا (50)

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے:

یعنی اللہ کی راہ میں ہجرت کی، اپنوں سے دور چلے گئے، اللہ نے اُن سے بہتر اپنے دیے اُنسیت کے لیے۔ یہاں اسماعیل علیہ السلام کا نام نہ فرمایا کہ وہ اُن کے پاس نہیں رہے۔ یعنی ہمیشہ لوگ اُن کی تعریف کرتے رہے اور اُن پر رحمت بھیجتے رہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے کہ پھر جب خلیل علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں اپنے باپ اور اپنی قوم سے کنارہ کیا تو اُن کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اُن سے بہتر دیے اور اسحاق اور یعقوب اُن کو بخشے، یعنی اسحاق تو خود اُن کے فرزند اور یعقوب اسحاق کے بیٹے۔ یہ خلیل جلیل علیہ السلام کے پوتے ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ﴾ [الأنبياء: ۷۲] ''اور یعقوب مزید (دیا)۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [هود: ۷۱] ''اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی۔'' اس بات میں کچھ اختلاف نہیں ہے کہ اسحاق یعقوب کے والد ہیں اور یہ سورۃ البقرہ میں قرآن شریف کی نص ہے: ﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ

[1] فتح البیان (۸/ ۱۶۵۔ ۱۶۷)

بَعۡدِیۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰـهَكَ وَاِلٰـهَ اٰبَآٮِٕكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴾ [البقرة: ١٣٣] ''کیا جب یعقوب کو موت آئی اس وقت تم موجود تھے؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔'' اور اسی لیے اس جگہ صرف اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کا ذکر کیا، یعنی ہم نے کر دیا ابراہیم علیہ السلام کے لیے نسل اور عقب کو نبی۔

اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام ہی کی زندگی میں نسل اور عقب سے اُن کی آنکھ کو ٹھنڈا کر دیا، اسی لیے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴾ یعنی اُن کے بیٹے اور پوتے دونوں کو نبی کر دیا۔ پس اگر یعقوب علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی حیات میں نبی نہ کیے گئے ہوتے تو اللہ پاک یعقوب علیہ السلام کے ذکر پر ہی اکتفا نہ کرتا، بلکہ یوسف علیہ السلام کا ذکر بھی ضرور کرتا، اس لیے کہ نبی تو وہ بھی کیے گئے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا، جس کی صحت پر اتفاق ہے، جس وقت کہ آپ سے بہترین شخص کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام نبی اللہ، فرزند یعقوب علیہ السلام نبی اللہ، فرزند اسحاق علیہ السلام نبی اللہ، فرزند ابراہیم خلیل اللہ کے ہیں۔[1]

دوسرے الفاظ یوں ہیں: ''الكريم ابن الكريم ابن الكريم ابن الكريم يوسف بن يعقوب بن إسحاق بن إبراهيم''[2] ﴿ وَوَهَبۡنَا لَهُمۡ ﴾ (آیتِ باب) میں علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد ثنائے حسن ہے، یعنی تعریف۔ امام سدی اور مالک بن انس رحمہ اللہ نے ایسا ہی کہا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ عَلِيًّا ﴾ فرمایا، اس لیے کہ ساری ملتوں اور دین والے اُن پر ثنا کرتے ہیں اور اُن کی مدح کرتے ہیں۔ صلوٰت اللہ و سلامه عليهم أجمعين.[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ ﴿ فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام بابل یا کوثیٰ سے ہجرت کر کے ارضِ مقدسہ کی طرف چلے گئے۔ ﴿ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ ﴾ یعنی ہم نے ان دونوں موہوب (عطا کیے گئے) کو ان کے لیے اہل اور اولاد کر دیا، اس اہل کے بدلے میں جن سے انھوں نے علاحدگی اختیار کی، تاکہ ان کو ان دونوں سے انس ہو۔ اس قول کا تقاضا ہے کہ انھوں نے یعقوب علیہ السلام کو دیکھا، یہ بات اسی طرح ہے، چنانچہ اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ اس قول میں ﴿ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ ﴾ [هود: ٧١] ''پھر ہم نے اسے اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی۔'' خاص کر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٠٢) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٠٨) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٧)

ان دونوں کا ذکر کیا اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہ فرمایا اس لیے کہ اسماعیل علیہ السلام کی فضیلت آیندہ مذکور ہوگی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”وهبنا له إسحاق ابنا و يعقوب ابن ابنه“[1] یعنی اسحاق علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اور یعقوب علیہ السلام ان کے بیٹے کے بیٹے ہیں۔ ﴿ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴾ کلمہ ﴿ كُلًّا ﴾ مفعول ہے ﴿ جَعَلْنَا ﴾ کا۔ تخصیص کے لیے فعل سے پہلے رکھا گیا، لیکن یہ تخصیص انھی تینوں کے لیے ہے نہ کہ ان کے ماسوائے کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبی کیا، یہ نہیں کہ بعض کو کیا اور بعض کو نہ کیا۔

﴿ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ان تینوں کو اپنی رحمت عطا فرمائی، یعنی ان کو نبی کر دیا۔ پہلے تصریح کر دی گئی کہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو نبی کیا، اس کے بعد یہ قول فرمایا، لہٰذا اس سے غرض یہ بیان کرنا ہے کہ نبوت رحمت کے باب سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد رحمت سے اس جگہ مال اور رزق کی فراخی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اولاد کی کثرت مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کتاب مراد ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ سارے امور رحمت کے زمرے میں آ جائیں۔ رہا حرف ”مِنْ“ تو وہ تبعیض کے لیے ہے، یعنی اللہ پاک نے جو ان تینوں کو عطا فرمایا، وہ من جملہ اس کی رحمت کے ہے۔

﴿ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴾ پہلے گزر چکا ہے کہ لسانِ صدق سے مراد ثنائے حسن ہے۔ لہٰذا اس کی تعبیر زبان کے ساتھ اس لیے کی کہ تعریف زبان ہی سے ہوتی ہے، جس طرح کہ عطا کرنے اور بخشش کرنے کی تعبیر ہاتھ کے ساتھ کرتے ہیں، کیوں کہ بخشش ہاتھ سے ہوتی ہے۔ لسان کی اضافت صدق کی طرف کی اور اس کی صفت ”عُلُو“ کے ساتھ کی، اس سے غرض یہ بات بتانا ہے کہ بندوں کی زبان پر اُن کے حق میں جو ثنا اور تعریف کی جائے، وہ اس کے مستحق اور لائق ہیں، پس لسان میں مجاز مرسل ہے، اس لیے کہ نام تو آلے کا لیا یعنی زبان کا ذکر کیا، جس سے تعریف ہوتی ہے اور اس سے وہ چیز مراد لی جو اس سے پیدا ہوتی ہے، یعنی تعریف۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے اُن کے لیے ثنائے صادق اور سچی تعریف کر دی کہ ان کی جو خصالِ مرضیہ اور اوصافِ پسندیدہ ہیں ساری امتیں قیامت تک ان کا ذکر کرتی رہیں گی اور ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی آل پر قیامت قائم ہونے تک درود بھیجتی رہیں گی۔ ”اللهم صل و سلم و بارك علىٰ سيدنا محمد و علىٰ آل سيدنا محمد و علىٰ سيدنا إبراهيم وعلىٰ آل سيدنا إبراهيم عدد ما علمت وزنة ما علمت وملء ما علمت صلاة وسلاما دائمين متلازمين إلىٰ يوم القيمة آمين“ اور اس میں کفارِ مکہ کو ڈرانا اور دھمکانا ہے کہ جب وہ اُن لوگوں سے راضی ہیں اور اُن پر ثنا کرتے ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ دین میں اُن کی پیروی کریں، سو انھوں نے ان کا اتباع نہ کیا، بلکہ نئی نئی باتیں اپنی طرف سے نکالیں، ملتِ ابراہیمی کو بگاڑ ڈالا اللہ وحدہ لا شریک لہ کی پوجا چھوڑ دی بتوں کو پوجنے لگے۔[2]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٠)
[2] فتح البيان (٨/ ١٦٧۔ ١٦٨)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝

اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کیجیے، بلاشبہ وہ چنا ہوا تھا اور رسول نبی تھا(51) اور ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے پکارا اور ہم نے اسے راز و نیاز کرتے ہوئے قریب کیا(52) اور اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بخشا(53)

موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر:

جس کو اللہ سے وحی آئے وہ نبی ہے اور ان میں جو خاص ہیں وہ اُمت رکھتے ہیں یا کتاب وہ رسول ہیں۔ ان سے کلام ہوا بیچ میں فرشتہ نہ تھا۔ یعنی (ہارون علیہ السلام) ان کے ساتھ مددگار ہوئے۔

جبکہ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا اور اُن کی تعریف کی تو اس پر کلیم علیہ السلام کا ذکر عطف کیا۔ پھر یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا﴾ بعض نے اس کو لام کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخلاص فی العبادۃ، یعنی وہ عبادت میں اخلاص کرنے والے تھے۔ ابوثمامہ کہتے ہیں کہ حواریوں نے کہا: یا روح اللہ! تم ہم کو خبر دو کہ مخلص للہ کون ہے، یعنی تم ہم کو وہ شخص بتاؤ جو اللہ کے لیے اخلاص کرتا ہے؟ فرمایا: وہ شخص ہے کہ اللہ کے واسطے عمل کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔[1] (قاله الثوري عن عبد العزيز بن رفيع عن أبي ثمامة)

دوسروں نے لام کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے، اس معنی میں کہ موسیٰ علیہ السلام مصطفیٰ، یعنی برگزیدہ تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ﴾ [الأعراف: ١٤٤] ''بے شک میں نے اپنے پیغامات پہنچانے اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں میں سے تجھے چن لیا ہے۔'' ﴿وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ اللہ پاک نے ان کے لیے رسالت اور نبوت دونوں وصف جمع فرمائے، کیوں کہ وہ پانچ بڑے اولوا العزم پیغمبروں میں سے تھے۔ وہ پانچ یہ ہیں نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلوٰت اللہ وسلامہ علیہم و سائر الأنبياء أجمعين۔

﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ﴾ اس سے مراد طور پہاڑ کی داہنی جانب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جس وقت اس آگ کے انگارے کا ٹکڑا ڈھونڈنے کے لیے چلے، اس کو چمکتا ہوا دیکھا تو اس کا قصد کیا، پھر اس کو خود سے طور پہاڑ کی داہنی مغربی جانب میں پایا، وادی کے کنارے کے نزدیک۔ پھر اللہ پاک نے ان سے کلام کیا اور اُن کو پکارا اور نزدیک بلایا، پھر اُن سے بھید کہا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیتِ کریمہ: ﴿وَقَرَّبْنٰهُ

---

[1] شعب الإيمان (٥/ ٣٤٦)

نَجِیًّا﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ نزدیک بلایا یہاں تک کہ قلم کی آواز کو سنا۔ امام مجاہد اور ابو العالیہ رحمہما اللہ وغیرہم نے کہا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ جو قلم تورات لکھتا تھا، اس کی آواز سنی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان میں داخل کیے گئے، پھر کلام کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[1]

عمرو بن معدیکرب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھید کہنے کے لیے طورِ سینا میں اپنے نزدیک بلایا تو فرمایا: اے موسیٰ! جب میں نے تیرے لیے شکر کرنے والا دل اور ذکر کرنے والی زبان اور بیوی جو خیر پر مدد کرے، یہ سب چیزیں پیدا کیں، میں نے تجھ سے خیر کی کوئی چیز چھپا نہیں رکھی اور جس شخص کے لیے میں نے یہ چیزیں چھپا رکھیں تو میں نے اس کے لیے خیر کی کوئی چیز نہیں کھولی۔[2]

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا﴾ یعنی ہم نے اس کے سوال اور شفاعت کو اس کے بھائی کے حق میں قبول کیا اور ہم نے اس کو نبی بنا دیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ﴾ [القصص: ٣٤] ''اور میرا بھائی ہارون زبان کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ فصیح ہے، لہٰذا تو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے کہ وہ میری تصدیق کرے، بلاشبہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ﴾ [الشعراء: ١٣۔ ١٤] ''لہٰذا تو ہارون کی طرف بھی (وحی) بھیج۔ اور ان کا میرے ذمے ایک گناہ (جرم) ہے، لہٰذا مجھے خوف آتا ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' اور اسی لیے بعض سلف نے فرمایا ہے کہ کسی نے دنیا میں کسی کے حق میں ایسی عظیم تر شفاعت نہیں کی، جیسی موسیٰ علیہ السلام کی ہارون علیہ السلام کے بارے میں تھی کہ وہ نبی ہو جائیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے چاہا کہ اپنی نبوت اُن کو بخش دیں۔[3] (وقد ذكره ابن أبي حاتم معلقا عن يعقوب وهو إبراهيم الدورقي به)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ تم قرآن سے موسیٰ کا قصہ اُن پر پڑھو، بے شک وہ مخلص تھے۔ لام کے زبر سے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اس کو مختار اور برگزیدہ کیا اور اس کو خالص کیا اور لام کی زیر سے یہ معنی ہوں گے کہ خود موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے لیے توحید اور عبادت کو خالص کیا، بندوں کی ریا نہ کی اور ﴿وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے ان کو اپنے بندوں کی طرف بھیجا تو انھوں نے بندوں کو اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٠۔ ٢١١) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٨)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١١)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢١١) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١١)

پاک کی طرف سے اس کی شریعت اور احکام کی خبر دی، جن کو اللہ نے ان کے لیے مشروع فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کا ذکر رسول کے بعد کیا، باوجود اس کے کہ رسول ہونے کے لیے نبی ہونا لازمی ہے۔ یعنی جو رسول ہے وہ نبی ہے اور ہر نبی رسول نہیں ہے۔ پس گویا رسول سے مراد اس کے لغوی معنی ہیں، یعنی بھیجا ہوا شرعی معنی مراد نہیں ہیں۔

شرع میں رسول اس کو کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے خبر دے اور اس کے ساتھ کتاب ہو۔ واللہ أعلم۔ نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول نبی وہ ہے کہ اس کے ہمراہ کتاب ہو اور نبی وہ ہے کہ اللہ عزوجل کی طرف سے خبر دے، گو اس کے ساتھ کتاب نہ ہو۔ مناسب تو یوں تھا کہ عام چیز کا خاص چیز سے پہلے ذکر ہوتا، یعنی رسول نبی سے زیادہ خاص ہے اور نبی رسول سے زیادہ عام ہے، لیکن فاصلوں کی رعایت کا تقاضا تھا کہ اُن کی ترتیب اس کے برعکس ہو، یعنی قافیہ کی رعایت سے رسول کو نبی سے پہلے رکھا ہے، جیسے کہ سورت طٰہٰ میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴾ [طٰہٰ: ۷۰] یعنی یہاں بھی صرف فاصلے کی رعایت سے ہارون کو موسیٰ سے پہلے ذکر کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی وہ شخص ہے کہ کلام کیا جائے اور اس پر کتاب اُتاری جائے اور بھیجا نہ جائے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ انبیا جو رسول نہیں ہیں، اُن میں سے ایک کی طرف وحی کی جاتی ہے اور کسی کی طرف بھیجا نہیں جاتا اور رسل وہ نبی ہیں کہ اُن کی طرف وحی کی جاتی ہے اور وہ بھیجے جاتے ہیں۔[1]

﴿ وَنَادَيْنٰهُ ﴾ کے معنی ہیں: "کلمناہ" یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، جیسا کہ سورۃ القصص میں مذکور ہے: ﴿ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [القصص: ۳۰] "پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اسے وادی کے دائیں کنارے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت سے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ، سب جہانوں کا رب ہوں۔" طور، مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ ہے، جس کا نام زبیر ہے۔ ایمن کے معنی یہ ہیں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے جانب داہنی طرف تھی، جبکہ وہ مدین سے مصر کی طرف متوجہ ہوئے، کیوں کہ وہ درخت اسی جانب تھا اور ندا اسی درخت سے واقع ہوئی تھی۔ پہاڑ کی سیدھی جانب مراد نہیں ہے، اس لیے کہ پہاڑوں کے لیے نہ سیدھی جانب ہے نہ بائیں جانب۔ کسی نے کہا: ایمن کے معنی میمون ہیں، یعنی مبارک اور ندا کے معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے واسطے طور کے اسی جانب سے کلام نمودار ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "جانب الجبل الأیمن"[2] یہ قول اس بارے میں صریح ہے کہ طور سے مراد وہ طور ہے جو بیت المقدس کے نزدیک ہے نہ کہ وہ طور جو سویس کے پاس ہے، کیوں کہ جو شخص مدین سے مصر کی طرف آتا ہے تو وہ پہاڑ اس کے بائیں جانب ہوتا ہے، چنانچہ یہ بات محسوس و مشاہد ہے۔

﴿ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴾ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو منزل کے قریب کیا، یہاں تک کہ ہم نے اس سے کلام کیا اور

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۱۱) [2] تفسير الطبري (۱۸/ ۲۱۰)

"نجي" بہ معنی مناجی ہے، جیسے جلیس وندیم، پس یہاں قریب کرنے سے مراد شرف وعزت کا قریب کرنا ہے، اُن کے حال کی تمثیل اس شخص سے دی گئی ہے جس کو بادشاہ مناجات اور سرگوشی کے لیے اور رازگوئی کے لیے اپنے نزدیک بلائے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی منزلت کی طرف قریب کیا، یہاں تک کہ اس کی مناجات کو سنا۔[1] اس سے غرض یہ ہے کہ قربِ منزلت ومرتبہ مراد ہے، قربِ مکانی مراد نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو اُٹھا لیا، یہاں تک کہ انھوں نے قلم کی آواز کو سنا۔ یہی قول بعض سلف سے مروی ہے۔ اور امام ابوالعالیہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں[2] اور اسی کے مثل تابعین کی ایک جماعت سے روایت کیا گیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں تک کہ انھوں نے قلم کی آواز کو سنا کہ لوحِ محفوظ میں لکھ رہا ہے۔ دیلمی رحمہ اللہ نے اس کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿ نَجِيًّا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے صدق اور راستی کے سبب سے نجات پائی۔[4] ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴾ رحمت سے مراد نعمت ہے اور من یا تو تعلیلیہ ہے یا تبعیضیہ۔ یعنی ہم نے اس کو اپنی رحمت ونعمت یا اپنی بعض رحمت کے سبب سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا دیا اور یہ اس وقت ہوا جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا اور کہا: ﴿ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ﴾ [طٰه: ٢٩۔ ٣٠] "اور میرے لیے میرے کنبے میں سے ایک وزیر بنا دے۔ (یعنی) میرے بھائی ہارون کو۔" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "كان هارون أكبر من موسى أي بأربع سنين ولكن إنما وهب له نبوته"[5] "ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے چار سال بڑے تھے، مگر اس کے باوجود نبوت موسیٰ علیہ السلام ہی کو دی گئی۔"

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝

اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجیے، بے شک وہ وعدے کا سچا اور رسول نبی تھا (54) اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکات کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے رب کے ہاں نہایت پسندیدہ تھا (55)

اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ:

ایک شخص سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک تو آئے گا میں اسی جگہ رہوں گا، وہ ایک برس نہ آیا یہ وہاں ہی رہے۔

(1) معاني القرآن (٣/ ٣٣٣)
(2) تفسير الطبري (١٨/ ٢١١)
(3) الدر المنثور (٥/ ٥١٥) مسند الديلمي (٤/ ٤١١)
(4) تفسير الطبري (١٨/ ٢١١)
(5) تفسير الطبري (١٨/ ٢١١) فتح البيان (٨/ ١٦٨۔ ١٦٩) البتہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "أي بأربع سنين" کے الفاظ نہیں ملے ہیں۔

اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام سارے عرب حجاز کے والد ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف اور صفت فرمائی کہ وہ وعدے کے سچے تھے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے رب سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا جس کو پورا نہ کیا ہو۔ یعنی کسی عبادت کی کبھی نذر نہیں مانی، مگر اس پر قائم رہے اور اس کا پورا حق ادا کیا۔ سہل بن عقیل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ اسماعیل نبی علیہ السلام نے ایک شخص سے کسی مکان کا وعدہ کیا کہ وہ اس کے پاس آئیں گے پھر وہ آئے اور وہ شخص بھول گیا، پس اسماعیل علیہ السلام دن بھر اس مکان میں رہے اور رات بسر کی، یہاں تک کہ صبح کو وہ شخص آیا تو کہا کہ آپ یہاں سے نہیں ٹلے۔ اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: نہیں، وہ بولا کہ میں تو بھول گیا تھا، انھوں نے کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ ٹل جاؤں یہاں تک کہ تو میرے پاس آئے، لہٰذا وہ اسی لیے صادق الوعد ہوئے۔[1] (أخرجه ابن جرير)

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ اس مکان میں سال بھر ٹھہرے اور اس کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ ان کے پاس آیا۔ ابن شوذب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ انھوں نے اس جگہ کو مسکن ٹھہرا لیا۔[1] عبد اللہ بن ابی الحمساء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے نبی ہونے سے پہلے خرید و فروخت کی، میں نے ان سے معاملہ کیا، لہٰذا اُن کا کچھ بقیہ مجھ پر باقی رہ گیا تو میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اس بقیہ کو اُن کے پاس ان کے اس مکان میں لاؤں گا، پس میں دن اور کل کا دن بھول گیا، پھر میں تیسرے دن اُن کے پاس آیا اور وہ اپنے اس مکان میں تھے۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: اے جوان! تو نے مجھ پر مشقت ڈالی، میں یہاں پر تین دن سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔[2] (رواه أبو داود في سننه و أبو بكر محمد بن جعفر الخرائطي في كتابه مكارم الأخلاق. هذا لفظ الخرائطي وساق آثاراً حسنة في ذلك، و رواه ابن منده أبو عبد الله في كتاب معرفة الصحابة له)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس روایت کو جو یہاں لائے ہیں تو اس سے غرض یہی ہے کہ جس قدر فضائل و مناقب پہلے انبیا میں رکھے گئے ہیں، وہ سب کے سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں موجود ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑھ کر اور ذاتی اور صفاتی کمالات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز فرمایا ہے۔ اسی لیے سید المرسلین خاتم النبیین شفیع المذنبین کا خطاب معلّٰی القاب آپ کو عطا ہوا ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

''آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) یوسف علیہ السلام کا حسن، عیسیٰ علیہ السلام کا دم اور موسیٰ علیہ السلام کے یدِ بیضا رکھتے ہیں، جو خوبیاں

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٢١١)

(2) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١١) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٨)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٩٦) مكارم الأخلاق (١/ ٣٨) اس کی سند میں ''عبد الکریم بن عبد اللہ'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ١٤٤)

ان تمام حسینوں (نبیوں) میں پائی جاتی ہیں، آپ اکیلے ان تمام خوبیوں کے مالک ہیں۔''

بعض نے کہا کہ اسماعیل کو جو صادق الوعد کہا گیا، پس اس لیے کہ انھوں نے اپنے والد سے کہا: ﴿ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [الصافات: ۱۰۲] ''اگر اللہ نے چاہا تو عن قریب آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔'' پھر وہ اس بات میں سچے نکلے، غرضیکہ وعدہ کی سچائی صفاتِ حمیدہ سے ہے، جیسے وعدہ خلافی من جملہ صفاتِ ذمیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ [الصف: ۲۔۳] ''اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں؟ اللہ کے ہاں بڑی ناراضی (والی بات) ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم کرتے نہیں۔'' اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ منافق کی نشانیاں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب امامت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔[1] جبکہ یہ تینوں باتیں منافقوں کی صفتیں ٹھہریں تو ان کے برعکس صفات پیدا کرنا مومنین کی صفات سے ہوا اور اسی لیے اللہ پاک نے اپنے بندے اور رسول اسماعیل علیہ السلام پر اُن کے وعدہ کے صدق پر اُن کی تعریف فرمائی۔

نبی اکرم ﷺ بھی اسی طرح صادق الوعد تھے۔ آپ کسی سے جو بھی وعدہ فرماتے تو اس کو وفا فرماتے اور خود آپ نے ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کی جو آپ کے داماد، زینب رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے، تعریف فرمائی پس فرمایا: « حَدَّثَنِيْ فَصَدَّقَنِيْ وَ وَعَدَنِيْ فَوَفٰى لِيْ » یعنی اس نے مجھ سے بات کہی تو سچ کہی اور وعدہ کیا تو وفا کیا[2] اور جس وقت نبی اکرم ﷺ نے وفات پائی تو آپ کے خلیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص کا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک کوئی وعدہ ہو یا قرض تو اسے چاہیے کہ میرے پاس آئے میں اس کے واسطے پورا کروں گا۔ پس جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور عرض کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ بحرین کا مال آئے گا تو میں تجھے دوں گا: ''هكذا وهكذا وهكذا'' یعنی اپنی دونوں ہتھیلیاں بھر کر، پھر جب بحرین کا مال آیا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جابر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، پس اُنھوں نے لپ بھر کر مال لے لیا، پھر اُن کو اس کے گننے کا حکم دیا تو وہ پانچ سو درہم نکلے تو ان کو اس کے ساتھ اس کے دوگنے اور دیے۔[3]

﴿ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴾ میں اس بات پر دلالت ہے کہ اسماعیل کو اپنے بھائی اسحاق علیہ السلام پر شرف ہے، کیوں کہ ان کا وصف صرف نبوت کے ساتھ کیا گیا ہے اور اسماعیل علیہ السلام نبوت اور رسالت دونوں کے ساتھ موصوف ہیں۔ صحیح مسلم میں ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ نے اولادِ ابراہیم علیہ السلام میں سے اسماعیل علیہ السلام

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۳) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۹)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۵۲۳) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۴۴۹)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۱۲۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۳۱۴)

کو چن لیا ہے اور پوری حدیث کو ذکر کیا۔[1] لہٰذا یہ حدیث اس بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔

﴿ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ ... الخ ﴾ بھی اسماعیل علیہ السلام کی ثنائے جمیل وصفتِ حمیدہ وخلتِ سدیدہ ہی سے ہے، اس لیے کہ وہ اپنے رب عزوجل کی اطاعت پر صابر تھے، اپنے گھر والوں کو اطاعتِ الٰہی کا حکم کرتے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو فرمایا ہے: ﴿ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ [طٰہٰ: ١٣٢] ''اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیجیے اور (خود بھی) اس پر قائم رہیے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ [التحریم: ٦] ''اے ایمان والو! تم خود کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر تند مزاج اور سخت گیر فرشتے (مقرر) ہیں، اللہ انھیں جو حکم دے، وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے۔'' یعنی تم ان کو نیک بات کا حکم دو اور برے کام سے روکو اور اُن کو مہمل مت چھوڑ دو کہ قیامت کے دن ان کو آگ کھائے۔

حدیث شریف میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ اس مرد پر رحم کرے کہ رات کو اُٹھا، پھر اس نے نماز پڑھی اور اپنی بی بی کو جگایا، اگر نہ جاگی تو اس کے منہ پر پانی چھڑک دیا اور اللہ رحم کرے اس عورت پر کہ رات کو اُٹھی، پھر اس نے نماز پڑھی اور اپنے خاوند کو جگایا، اگر وہ نہ جاگا تو اس کے منہ پر پانی چھڑک دیا۔[2] (أخرجه أبو داود و ابن ماجه) ابو سعید رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت مرد رات کو بیدار ہوا اور اپنی بیوی کو جگایا، پھر دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو وہ اُن مردوں اور بیویوں میں لکھے جائیں گے کہ جو اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں۔[3] (رواه أبو داود والنسائي و ابن ماجه و اللفظ له)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے اسماعیل علیہ السلام کا وصف صدقِ وعد کے ساتھ بیان کیا، اس کے باوجود کہ تمام انبیا علیہم السلام ایسے ہی ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ صدقِ وعد کے ساتھ مشہور تھے۔ صدقِ وعد کے ساتھ مبالغہ کرتے تھے، ان کے صدقِ وعد میں تو یہی ایک بات کافی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ ذبح ہونے پر صبر کا وعدہ کیا، پھر اس کو وفا کیا۔ یہاں اسماعیل سے مراد اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام ہیں۔ اس بات میں کسی نے خلاف نہیں کیا مگر اس شخص نے جو

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٦) البتہ اس میں ''اولادِ ابراہیم علیہ السلام میں سے اسماعیل علیہ السلام کو چن لیا'' یہ الفاظ مروی نہیں ہیں۔ نیز باقی روایت مکمل ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٤٩٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٥١) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ٤١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٥٢)

غیر معتبر ہے۔ لہٰذا اس نے کہا کہ وہ اسماعیل بن حزقیل ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا تو قوم نے ان کے سر کا چمڑا کھینچ ڈالا، پس اللہ پاک نے ان کو اس بات میں اختیار دیا کہ چاہیں تو ان کو عذاب ہو اور خود انھیں ثواب ملے تو انھوں نے اس کی معافی چاہی اور اپنے ثواب پر راضی ہوئے۔

﴿ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴾ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ رسول کے لیے ضروری نہیں ہے کہ صاحبِ شریعت ہو، کیوں کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد انہی کی شریعت پر تھی، ان کی کوئی نئی شریعت نہ تھی۔ کسی نے یوں کہا کہ اسماعیل علیہ السلام کو اس لیے رسول کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو جرہم کی طرف بھیجا تھا۔ جرہم عربِ یمن کا ایک قبیلہ ہے، وہ لوگ وادیِ مکہ میں اسماعیل کی والدہ ہاجرہ کے پاس اترے تھے اور اس جگہ ﴿ اَهْلَهٗ ﴾ سے مراد اُن کی اُمت ہے۔ کسی نے کہا کہ جرہم ہیں۔ کسی نے کہا کہ ان کے عشیرہ (عزیز و اقارب کنبہ) ہیں، جیسا کہ اس قول میں ہے: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤] ''اور آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں۔'' اور صلاۃ اور زکاۃ سے مراد یہاں دونوں شرعی عبادات ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے لغوی معنی مراد ہوں۔ نماز کے لغوی معنی دعا وغیرہ کے اور زکاۃ کے طہارت و نماز ہیں۔

﴿ مَرْضِيًّا ﴾ کے معنی ہیں: رضی، صالح، یعنی پاک، پسندیدہ، نیک، معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے واسطے اطاعت پر قائم تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی نبوت اور رسالت کے لیے پسند کرلیا تھا اور یہ انتہائی تعریف ہے، کیوں کہ جو شخص اللہ کے نزدیک مرضی اور پسندیدہ ہوگا، وہی ہر اطاعت میں اعلیٰ درجات کو پہنچے گا۔ امام فراء اور کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے مرضی کہا تو اس نے رضیت کی بنا پر کہا ہے اور حجاز والے ''مَرْضُوًّ'' بولتے ہیں۔[1]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾

اور کتاب میں ادریس کا ذکر کیجیے، بے شک وہ نہایت سچا (اور) نبی تھا (56) اور ہم نے اسے بہت بلند مقام پر اُٹھایا (57)

ادریس علیہ السلام کا ذکر:

لکھا ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے تھے۔ ستاروں کی چال کا حساب اور لکھنا اور سینا جانتے تھے۔ کہتے ہیں کہ خلق نے انہی سے سیکھا۔ ملک الموت اُن سے آشنا تھا۔ ایک دفعہ آزمانے کے لیے اپنی جان بدن سے نکلوائی، پھر ڈال دی اور بہشت کی سیر مانگی، پھر وہاں رہ گئے، اللہ کے حکم سے معراج کی رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان پر ملے

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ١١٦) فتح البیان (٨/ ١٧٠۔ ١٧١)

تھے اور بعض کہتے ہیں کہ الیاس علیہ السلام کا لقب ادریس ہے۔ یہ بنی اسرائیل میں پیغمبر تھے۔ خضر علیہ السلام کی طرح یہ بھی زندہ رہ گئے ہیں۔ اللہ پاک نے ادریس علیہ السلام کی تعریف کی کہ وہ سچے نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اونچے مکان پر اُٹھا لیا۔ صحیح میں پہلے گزر چکا ہے کہ شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن پر گزرے اور وہ چوتھے آسمان پر تھے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک عجیب وغریب اثر یہاں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہلال بن یساف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب رحمہ اللہ سے پوچھا اور میں موجود تھا، ان سے کہا کہ اللہ عزوجل کا ادریس علیہ السلام کے لیے یہ کیا قول ہے: ﴿ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ تو کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ادریس علیہ السلام جو ہیں تو اُن کو اللہ تعالیٰ نے پیغام بھیجا کہ میں تیرے لیے ہر دن تمام بنی آدم کے عمل کی طرح بلند کروں گا، لہٰذا ادریس علیہ السلام نے یہ پسند کیا کہ زیادہ عمل کریں، پھر اُن کے پاس اُن کے دوست فرشتوں میں سے ایک آیا تو انھوں نے اس سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف ایسی ایسی وحی بھیجی ہے۔ پس تو میرے لیے ملک الموت سے بات کر کہ اُسے چاہیے کہ مجھے ڈھیل دے، تاکہ میں زیادہ عمل کرلوں، پھر فرشتے نے اپنے دونوں پَروں کے درمیان اُن کو اُٹھا لیا، یہاں تک کہ ان کو آسمان کی طرف چڑھا کر لے گیا۔

پھر جب وہ چوتھے آسمان میں پہنچے تو ملک الموت اُترتے ہوئے ان کو ملے تو اس فرشتے نے ملک الموت سے اس بارے میں بات کی جس کے لیے ادریس علیہ السلام نے اس سے کہا تھا۔ ملک الموت نے کہا کہ ادریس کہاں ہے؟ اس نے کہا: وہ یہ ہے میری پشت پر، ملک الموت نے کہا: "فالعجب" یعنی تعجب ہے کہ مجھے تو بھیجا گیا اور کہا گیا کہ تو ادریس کی روح قبض کر چوتھے آسمان میں، پس میں کہنے لگا کہ چوتھے آسمان پر اس کی روح کس طرح قبض کروں، حالانکہ وہ زمین میں ہے؟! پھر اس جگہ اُن کی روح قبض کر لی اور یہی ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب: ﴿ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ کعب احبار کی بیان کردہ اسرائیلی روایات کا حصہ ہے اور بعض تو سخت ضعیف ہیں۔ واللّٰہ أعلم (وقد رواه ابن أبي حاتم من وجه أخر عن عبدالله بن عباس رضي الله عنهما أنه سأل كعبا فذكر نحو ما تقدم) لہٰذا ادریس علیہ السلام نے اس فرشتے سے کہا: کیا تیرے لیے یہ بات ممکن ہے کہ تو ملک الموت سے یہ پوچھے کہ میری اجل میں سے کتنی باقی رہ گئی ہے، تاکہ میں زیادہ عمل کروں اور باقی حدیث کو ذکر کیا، اس میں یہ ہے کہ جب اس فرشتے نے ملک الموت سے ادریس علیہ السلام کی بقیہ عمر کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ میں نہیں جانتا، یہاں تک کہ دیکھوں، لہٰذا دیکھا، پھر کہا کہ تو مجھ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ جس کی عمر میں سے فقط طرفۃ العین (پلک جھپکنے جتنا وقت) باقی ہے۔ پس اس فرشتے نے اپنے پَر کے نیچے دیکھا تو ناگاہ وہ قبض ہو چکے تھے، علیہ السلام۔ اور وہ اس بات کو نہیں جانتا تھا۔ پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بوجہ دیگر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کو روایت کیا ہے کہ ادریس علیہ السلام درزی تھے، لہٰذا وہ نہیں گڑوتے (چبھوتے) کوئی سوئی مگر سبحان اللہ کہتے، پھر وہ شام کرتے، جس وقت کہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۳۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٦۲)

شام کرتے، حالانکہ زمین میں اُن سے بڑھ کر عمل والا کوئی نہیں ہے۔ (وذكر بقية كالذي قبله أو نحوه)[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ ادریس علیہ السلام اُٹھا لیے گئے اور مرے نہیں، جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام اُٹھا لیے گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ ﴿ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ سے مراد چوتھا آسمان ہے۔ عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ادریس چھٹے آسمان کی طرف اُٹھا لیے گئے، پھر وہ اسی میں مرے۔ اسی طرح امام ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ جنت ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ادریس علیہ السلام شیث علیہ السلام کے فرزند ہیں اور شیث علیہ السلام آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے تحبیر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ادریس علیہ السلام کا نام نامی اخنوع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نوح علیہ السلام کے جدِ امجد ہیں، کیونکہ نوح بن لمک بن متوشلخ بن اخنوع ہیں۔ اس بنیاد پر ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے والد کے دادا ہوئے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو ذکر کیا ہے، کہا گیا ہے کہ یہ قول خطا ہے۔[4] ادریس آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول ہیں اور بنیِ آدم میں سے پہلے پہل جس نے ہتھیار بنائے اور کفار سے جنگ کی وہ یہی ہیں، بے شک وہ سچے نبی تھے۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کو نبوت سے مشرف فرمایا اور ان پر تیس صحیفے نازل کیے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ سو ایک قول یہ ہے کہ اللہ پاک نے چوتھے آسمان کی طرف ان کو اُٹھا لیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چھٹے آسمان کی طرف، تیسرا قول یہ ہے دوسرے آسمان کی طرف۔ صحیح بخاری میں حدیثِ معراج میں اس قول کا ذکر ہے،[5] یہ قول غلط ہے، شریک بن عبداللہ بن ابی نمر رحمہ اللہ کی روایت میں ہے: صحیح یہ ہے کہ چوتھے آسمان میں ہیں، جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ "عن النبي ﷺ" سے روایت کیا ہے۔[6] کسی نے کہا ہے کہ اُن کے اُٹھا لینے سے مراد شرفِ نبوت اور اللہ پاک کا قرب ہے، جو اُن کو عطا ہوا تھا۔ کسی نے یوں کہا کہ وہ جنت کی طرف اُٹھا لیے گئے۔ کسی نے کہا ہے رفع سے دنیا میں نبوت کی بلندی مراد ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ادریس علیہ السلام درزی تھے اور کوئی سوئی نہیں چلاتے تھے مگر سبحان اللہ کہتے۔ اور تھے شام کرتے جس وقت کہ شام کرتے، حالانکہ زمین میں اُن سے بڑھ کر زیادہ عمل کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ پھر فرشتوں میں سے ایک فرشتے نے اپنے رب سے اِذن مانگا، عرض کیا: اے رب! تو مجھے اجازت دے کہ میں ادریس علیہ السلام کی طرف اُتروں۔ اس کو اِذن دیا، پھر وہ ادریس علیہ السلام کے پاس آیا تو کہا کہ میں تیرے پاس آیا ہوں کہ

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٦٩۔ ١٧٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٣) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٠)
[4] فتح القدير (٣/ ٤٦٦) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٩) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)

تیری خدمت کروں، ادریس علیہ السلام بولے تو کیسے میری خدمت کرے گا، حالانکہ تو تو فرشتہ ہے اور میں انسان ہوں۔ پھر ادریس علیہ السلام نے کہا کہ کیا تیرے اور ملک الموت کے درمیان کچھ دوستی ہے؟ اس فرشتے نے کہا کہ وہ تو فرشتوں میں سے میرا بھائی ہے۔ ادریس علیہ السلام نے کہا کہ کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ مجھے نفع پہنچائے؟ اس نے کہا کہ یہ بات کہ ہم کسی شے کو موخر کریں یا اس کو مقدم کریں، اس میں ہمارا کچھ اختیار نہیں، لیکن ابھی میں اس سے تیرے بارے میں گفتگو کروں گا تو وہ موت کے وقت تیرے ساتھ نرمی کرے گا۔ پھر کہا تو میرے دونوں پَروں کے درمیان سوار ہو جا۔ پس ادریس علیہ السلام سوار ہو گئے۔ پھر وہ سمائے علیا (آسمان) کی طرف چڑھ گیا تو ملک الموت سے ملا اور ادریس علیہ السلام اس کے پَروں کے درمیان تھے۔ اس نے ملک الموت سے کہا کہ مجھے آپ سے ایک کام ہے، ملک الموت بولے میں نے تیرا کام جان لیا، تو مجھ سے ادریس علیہ السلام کے بارے میں بات کرے گا، حالانکہ اس کا نام صحیفے سے مٹ چکا ہے، اس کی اَجل میں سے صرف نصف طرفۃ العین باقی رہ گیا ہے۔ پس ادریس علیہ السلام فرشتے کے دونوں پَروں کے درمیان فوت ہو گئے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس کے لگ بھگ پہلے گزر چکا ہے، لیکن اس میں بعض زیادت تھی۔ اس لیے لکھ دیا گیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ادریس علیہ السلام الیاس علیہ السلام ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔[2]

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّـۧنَ مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَٱجْتَبَيْنَآ ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُ ٱلرَّحْمَٰنِ خَرُّوا۟ سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

یہ وہ (انبیاء) ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا جو اولادِ آدم میں سے ہیں اور ان لوگوں (کی نسل) میں سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا، جب ان پر رحمان کی آیات تلاوت کی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے (58)

انبیاء اللہ تعالیٰ کے ہاں برگزیدہ ہستیاں ہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "هٰؤُلَاءِ النَّبِيُّوْنَ"، یعنی "أولئك" اشارہ بعید کے

[1] الدر المنثور (٥/ ٥١٧۔ ٥١٨)
[2] الدر المنثور (٥/ ٥١٩) فتح البیان (٨/ ١٧١۔ ١٧٢)

لیے ہے اور ”ھؤلاء“ قریب کے لیے۔ لہٰذا یہاں بعید سے قریب مراد ہے اور جن نبیوں کا اس سورت میں ذکر کیا گیا ہے، فقط وہی مراد نہیں ہیں، بلکہ انبیا علیہم السلام کی جنس مراد ہے۔ اشخاص کے ذکر سے وہ جنس مراد لی ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے نبوت عطا کر کے انعام کیا ہے۔ الآیۃ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص کو آدم علیہ السلام کی ذریت سے مراد لیا ہے، وہ ادریس علیہ السلام ہیں اور جس کو ﴿ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ﴾ سے مراد لیا ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور جس کو ﴿ مِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ ﴾ سے مراد لیا ہے؛ وہ اسحاق، یعقوب اور اسماعیل علیہم السلام ہیں اور جن کو ”مِنْ ذُرِّيَّةِ إِسْرَائِيلَ“ سے مراد لیا ہے، وہ موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ بن مریم علیہم السلام ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی لیے اُن کے انساب کی تفریق کی ہے، اگرچہ سب کو آدم علیہ السلام جامع ہیں، اس لیے کہ ان میں وہ شخص ہے جو نوح علیہ السلام کی کشتی والوں کی اولاد سے نہیں ہے، وہ ادریس علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ نوح علیہ السلام کے دادا ہیں۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہی قول ظاہر تر ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے اوپر کے نسب میں سے ہیں، یہ قول بھی ہے کہ ادریس علیہ السلام من جملہ انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔

اس قول کو حدیثِ معراج سے لیا ہے، جس جگہ کہ ادریس علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنے میں یوں کہا ہے: «مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْأَخِ الصَّالِحِ»[2] یعنی مرحبا ہے نیک نبی کو اور نیک بھائی کو۔ یوں نہ کہا: ”والولد الصالح“ یعنی فرزند نیک کو، جیسا کہ آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادریس علیہ السلام من جملہ انبیائے بنی اسرائیل ہیں، جبھی تو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھائی کہا، بیٹا نہ کہا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یزید بن ابی حبیب سے، وہ عبداللہ بن محمد سے روایت کرتے ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے ہیں، اللہ پاک نے ان کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو انھوں نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ ”لا إله إلا الله“ کہیں اور عمل کریں جو چاہیں، انھوں نے نہ مانا، اس پر اللہ عزوجل نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔[3] یہ بات کہ اس آیت سے مراد جنسِ انبیا ہے، منجملہ اس کی تائید میں ایک یہ بات ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے جو سورۃ الانعام میں واقع ہوئی ہے:

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿83﴾ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿84﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿85﴾ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿86﴾ وَمِنْ آبَائِهِمْ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٤) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ٥٢٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٠)

وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿87﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿88﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿89﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ۸۳۔ ۹۰]

’’اور یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔ ہم جسے چاہیں اس کے درجے بلند کرتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب بہت حکمت والا، خوب جاننے والا ہے۔ اور ہم نے اس (ابراہیم) کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ہم نے سب کو ہدایت دی، اور اس سے پہلے ہم نے نوح کو ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں سے داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (بھی ہدایت دی) اور اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور (ہم نے) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو (بھی ہدایت دی)، وہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ اور (ہم نے) اسماعیل، الیسع، یونس، اور لوط کو (بھی ہدایت دی) اور ان سب کو ہم نے جہانوں پر فضیلت دی۔ اور کچھ کو ان کے باپ دادا، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے اور ہم نے انھیں چن لیا اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت دی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو وہ عمل کرتے تھے برباد ہوجاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کتاب، حکمت اور نبوت دی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس (ہدایت کو ماننے) سے انکار کرتے ہیں تو بے شک ہم نے اس کے لیے ایسی قوم تیار کی ہے کہ وہ ان کا انکار کرنے والی نہیں۔ یہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، لہٰذا (اے نبی) آپ بھی ان کے طریقے کی پیروی کریں۔‘‘

نیز اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ ﴾ [المؤمن: ۷۸] ’’ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان کر دیا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔‘‘ صحیح بخاری میں امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: کیا سورت صٓ میں سجدہ ہے، تو فرمایا: ہاں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ۹۰] ’’یہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، لہٰذا (اے نبی) آپ بھی ان کے طریقے کی پیروی کریں۔‘‘ قَالَ هُوَ مِنْهُمْ یعنی داود علیہ السلام۔[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٦)

یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ داود علیہ السلام انھیں میں سے ہیں اور اللہ پاک نے اسی آیت کریمہ میں فرمایا ہے: ﴿ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴾ (آیتِ باب)۔ یعنی جس وقت وہ اللہ کا کلام سنتے ہیں، جس میں اس کے حجج و دلائل و براہین شامل ہوتے ہیں تو مارے خضوع و عاجزی اور فروتنی کے اپنے رب کے لیے سجدہ کرتے ہیں، اُن بڑی بڑی نعمتوں پر شکر کرنے کے لیے جن میں وہ ہیں اور "بُكِيّ" باکی کی جمع ہے۔ باکی کے معنی ہیں رونے والا، پس اسی لیے علما نے اس جگہ سجدہ کے مشروع ہونے پر اجماع کیا ہے تاکہ انبیاے مذکورین کی اقتداء، اتباع اور پیروی ہو۔ ابو معمر کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سورت مریم پڑھی تو سجدہ کیا اور فرمایا کہ یہ تو سجود ہے، پھر کہاں ہے "بُكِيّ"، مراد ان کی بکاء ہے، یعنی رونا۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن جریر و سقط من روایتہ ذکر أبي معمر فیما رأیت واللہ أعلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور اشارہ ہے انبیائے مذکورین کی طرف اول سورت سے یہاں تک۔ اور وہ دس ہیں، پہلے زکریا علیہ السلام ہیں اور آخر ادریس علیہ السلام ہیں۔ ﴿ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ﴾ سے مراد اِدریس علیہ السلام اور نوح علیہ السلام ہیں اور ﴿ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ﴾ سے مراد ادریس علیہ السلام کے سوا ہیں، کیونکہ یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، اس لیے کہ ادریس علیہ السلام کو آدم علیہ السلام سے قرب ہے اور ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد کے ہمراہیان سے ہیں، کیوں کہ وہ سام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے کہ وہ آزر کے بیٹے ہیں اور اُن کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن ہیں، جیسا کہ تحبیر میں ذکر کیا ہے اور ﴿ مِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ سے باقی انبیاء مراد ہیں اور ذریتِ اسرائیل، یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے مراد موسیٰ، ہارون، زکریا اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں اس پر دلیل ہے کہ بیٹیوں کی اولاد ذریت سے ہوتی ہے، یعنی مریم علیہا السلام ذریتِ یعقوب علیہ السلام سے تھیں۔

ایک قول یہ ہے کہ ذریتِ آدم سے مراد تنہا ادریس علیہ السلام ہیں اور ﴿ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ﴾ سے تنہا ابراہیم علیہ السلام اور ذریت ابراہیم علیہ السلام سے اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام ہیں اور ذریتِ اسرائیل سے موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام مراد ہیں اور ﴿ مِمَّنْ هَدَيْنَا ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ جُمْلَةِ مَنْ هَدَيْنَا إِلَى الْإِسْلَامِ" یعنی منجملہ ان کے جن کو ہم نے اسلام کی طرف ہدایت کی۔ اور ﴿ وَاجْتَبَيْنَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے ایمان کے ساتھ پسند کیا یا ہم نے مخلوق پر برگزیدہ کیا۔ انبیاء مذکورین میں سے ہر نبی کی ایسی تعریف کی جو ہر ایک کے ساتھ خاص تھی۔

پھر آخر میں سب کو جمع کر کے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ ... الخ ﴾ سو اس ترتیب پر انبیائے مذکورہ کے حالات کو ترتیب

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٢١٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٧١)

دینے کا مقصد اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ جس طرح ان کو اپنے اعمال کے سبب سے فضیلت ملی ہے، اسی طرح اُن کے لیے فضیلت میں ایک مقام اور مرتبہ ہے، ان نبیوں سے اُن کی ولادت کی وجہ سے۔ پھر یہ بیان کیا کہ یہ من جملہ ان لوگوں کے ہیں، جن کو ہم نے سوجھ بوجھ دی اور پسند کیا۔ اس میں اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ ان کو یہ جو منازل و مراتب و مراقب ملے تو اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کو ہدایت کی اور رسالت کے لیے انھیں پسند فرمایا۔ ﴿ اِذَا تُتْلٰى ... الخ﴾ ''سُجَّدَ'' ساجد کی جمع قیاسی ہے اور ''بُكِيًّ بَاكِيٌ'' کی غیر قیاسی جمع ہے، اس کی قیاسی جمع ''بُكَاة'' ہے۔ جیسے قاضی کی جمع قضاۃ۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ''بكى يبكي بكاء و بكي''، خلیل رحمہ اللہ نے کہا کہ جب تو بکاء کو قصر کرے تو وہ حزن کے مثل ہے،[1] یعنی اس کے ساتھ آواز نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بکاء پیش اور آواز کے کھینچنے کے ساتھ رونے کو کہتے ہیں اور بغیر کھینچنے کے آنسو بہنے کو بولتے ہیں۔ کسی عرب شاعر نے خوب کہا ہے، دونوں لفظوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا ہے ؎

بكت عيني و حق لها بكائها   وما يغني البكاء ولا العويل

یعنی میری آنکھ روئی اور اسے لائق ہے رونا، اس کا حال یہ ہے کہ نہ آواز سے رونا نفع دیتا ہے نہ فریاد کرنا۔ پہلے بکا بقصر کے معنی بغیر آواز کے رونا اور دوسرا بکاء مد کے ساتھ آواز کے ساتھ رونا ہے اور طویل آواز برداشتن در گریہ کو کہتے ہیں، اس کا مرتبہ بکاء بمد سے بڑھا ہوا ہے، اسی لیے اس کو بکاء بمد کے بعد ذکر کیا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے بیان کیا ہے کہ انبیا علیہم السلام جس وقت اللہ کی آیات سنتے تھے تو خشوع و خضوع و فروتنی و خوف و حذر اور ڈر کے مارے روتے اور سجدے میں گر جاتے۔[2] آیات سے مراد کتابیں ہیں جو ان پر نازل ہوئیں، جن کے ساتھ وہ مخصوص ہوئے۔ کسی نے کہا: ذکر جنت و دوزخ و وعد و وعید ہے۔ اس آیت سے قرآن شریف کے سننے کے وقت رونے اور خشوعِ قلب کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ صالح مری رحمہ اللہ (صالح بن بشر المري أبو بشر البصري القاصّ الواعظ أحد قدماء الصوفية والزهاد الصالحين عن قتادة و ثابت ضعفه ابن المديني توفى ۱۷۲ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف پڑھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے صالح! یہ تو قراءت ہوئی، پھر کہاں ہے بکاء۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم قرآن کی تلاوت کرو تو روؤ، پس اگر نہ روؤ تو رونے کی صورت بنا لو۔[3]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس وقت تم سجدۂ سبحان الذی اسریٰ پڑھو تو سجدے کے ساتھ جلدی نہ

---

[1] تفسير القرطبي (۱۱/ ۱۲۰)   [2] معاني القرآن (۳/ ۳۳۵)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۳۳۷) اس کی سند میں ''عبدالرحمن بن سائب'' مجہول اور ''اسماعیل بن رافع'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۶۵۱۱)

کرو، یہاں تک کہ روؤ، پھر اگر تم میں کسی کی آنکھ نہ روئے تو چاہیے کہ اس کا دل روئے۔ اس آیتِ کریمہ سے سجدۂ تلاوت کے مشروع ہونے کی دلیل لی گئی ہے اور یہ سجدہ من جملہ عزائم سجود قرآن ہے۔ لہٰذا پڑھنے والے اور سننے والے کے لیے مسنون ہے کہ اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ کرے۔ بعض نے کہا کہ مراد نماز ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احتمال ہے کہ وہ لوگ خوف کے وقت متعبد بسجود تھے تو اس کو کیا کرتے تھے نہ اس لیے کہ آیت میں سجدے کا ذکر آیا ہے، یعنی ہم اس کے ساتھ متعبد ہیں۔[1] (عبادت کرنے والے)۔

اس آیتِ کریمہ کے اعراب اور ترکیب میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ ﴿ أُولَٰٓئِكَ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ صفت مبتدا ہے اور "من النبیین" بیان ہے موصول کا۔ مگر یہ عام کا بیان خاص کے ساتھ ہے اور ﴿ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ﴾ بدل ہے ﴿ مِنَ النَّبِيّٖنَ ﴾ کا جار کے اعادہ کے ساتھ۔ کسی نے کہا کہ یہ ﴿ مِنَ ﴾ تبعیض کے لیے ہے اور ﴿ اِذَا تُتْلٰى ﴾ "أُولَٰئِكَ" کی خبر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ أُولَٰٓئِكَ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ خبر ہے اور ﴿ اِذَا تُتْلٰى... الخ ﴾ جملہ مستانفہ ہے۔ خشوع وخشیت مذکورین کے واسطے کہ وہ اللہ پاک کے لیے عاجزی اور فروتنی کرتے اور اس سے ڈرتے تھے۔ ﴿ خَرُّوْا سُجَّدًا ﴾ کا بیان سورت سبحان میں گزر چکا ہے۔[2]

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

پھر ان کے بعد ناخلف (نالائق ان کے) جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز ضائع کی اور خواہشات کی پیروی کی، چناں چہ جلد ہی (آگے) وہ ہلاکت اور گمراہی (کے انجام) سے دوچار ہوں گے (59) مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے، تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا (60) (یعنی) ابدی باغات، جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں کے ساتھ غیب سے وعدہ کیا ہے۔ بے شک اس کا وعدہ (ہر صورت)

[1] تفسير الرازي (٢١/ ٢٠٠) فتح البيان (٨/ ١٧٢۔ ١٧٤) [2] رقم الآية [١٠٧]

آنے والا ہے (61) وہ اس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے، سوائے سلام کے، اور وہاں ان کے لیے صبح و شام رزق ہوگا (62) یہی وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بنائیں گے جو متقی ہوگا (63)

اچھے اور برے جانشینوں کا بیان:

بک بک نہ سنیں گے اور سلام علیک کی بلند آواز سنیں گے۔ آدم کی میراث اس لیے کہ پہلے ان کو بہشت ملی ہے۔ جبکہ اللہ پاک نے سعادت مند اور نیک بخت گروہوں کا ذکر کیا اور وہ انبیاء علیہم السلام ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے اُن کی پیروی کی، اللہ کی حدود اور اوامر کو قائم کیا، اس کے فرائض بجا لائے، اس کے زواجر اور نواہی کو چھوڑا۔ اب یہ ذکر کیا کہ پھر ان کی جگہ ناخلف آئے، یعنی دوسرے قرن والے، جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور جب اس کو ضائع کیا تو اس کے ماسوا واجبات کو زیادہ تر ضائع کرنے والے ہوں گے، کیوں کہ وہ دین کا عماد و قوام وستون ہے اور بندوں کے اعمال میں سے سب سے بہتر ہے اور دنیا کی خواہشوں، لذتوں اور مزوں پر جھک پڑے اور دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے اور اس سے چین پکڑا اور مطمئن ہو بیٹھے۔ پس یہ لوگ آگے گمراہی کو ملیں گے، یعنی قیامت کے دن ان کو خسارہ، ٹوٹا ہوگا۔

نماز کی اہمیت اور اضاعتِ نماز کی وضاحت:

مفسرین نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ اس جگہ نماز کے ضائع کرنے سے کیا مراد ہے۔ کئی لوگوں نے کہا کہ اضاعتِ نماز سے مراد بالکل نماز چھوڑ دینا ہے۔ امام محمد بن کعب قرظی، ابن زید بن اسلم اور سدی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] اور اسی لیے سلف و خلف اور ائمہ سے جو لوگ اس طرف گئے ہیں، وہ اسی لیے گئے ہیں کہ تارکِ صلاۃ کی تکفیر کی ہے۔ چنانچہ یہ قول امام احمد سے مشہور ہے اور امام شافعی کا ایک قول ہے اس حدیث شریف کے سبب سے کہ «بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»[2] یعنی بندے کے اور شرک کے درمیان وصلہ یعنی پیوند نماز کا ترک کرنا ہے۔ نماز پڑھے تو موحد ہے نماز چھوڑ دے تو مشرک ہوا۔ دوسری حدیث شریف میں یہ ہے: «اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»[3] یعنی جو عہد کہ ہمارے اور اُن کے درمیان ہے، وہ نماز ہے، لہٰذا جس شخص نے اس کو ترک کیا تو وہ کافر مقرر ہو گیا۔ یہ جگہ اس مسئلے کی تفصیل کرنے کی نہیں ہے۔ قاسم بن مخیمرہ رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے سوا اس کے نہیں کہ انھوں نے ضائع کیا مواقیت کو، یعنی نماز کے اوقات کو اور اگر وہ ضائع کرنا ترک ہوتا تو کفر ہوتا۔

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٢١٦) تفسير ابن كثير (٣/ ١٧١) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢)

(3) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٤٣)

امام حسن بن سعد رحمہ اللہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں نماز کا بہت ذکر کرتا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ [الماعون: ٥] ''جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔'' ﴿ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ [المعارج: ٢٣] ''جو اپنی نماز پر ہمیشہ قائم ہیں۔'' اور ﴿ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩٢، المعارج: ٣٤] ''اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔'' تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کے وقتوں پر یعنی نماز پر دوام و محافظت کرنے سے مراد نماز کے اوقات کی محافظت کرنا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم تو اس کو ترکِ نماز پر گمان کرتے تھے۔ فرمایا: وہ تو کفر ہے۔

امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص پانچوں نمازوں پر محافظت نہیں کرتا، وہ غافلین سے لکھا جاتا ہے۔ یعنی جب اس نے پانچوں نمازوں پر محافظت کی، ان کو وقت پر ادا کیا تو اس کو غافلوں میں نہ لکھیں گے اور اُن کے افراط (یعنی ان کو ان کے وقت سے ضائع کرنا) میں ہلاکت ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے ابراہیم بن یزید سے روایت کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے پڑھا: ﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ...تا... غَيًّا ﴾ پھر فرمایا کہ ان کا نماز کو ضائع کرنا، اس کا ترک کرنا نہیں تھا، بلکہ انھوں نے وقت ضائع کیا۔[1] امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے قائم ہونے کے قریب اور اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صالحین کے چلے جانے کے بعد بعض ان کا بعض پر گلی کوچوں میں کودے گا، یعنی چوپایوں کی طرح جفتی کرنے لگیں گے، حیا اور شرم بالکل جاتی رہے گی۔

اتباعِ شہوات سے یہی مراد ہے۔ ایسا ہی امام ابن جریج رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ امام جابر جعفی رحمہ اللہ نے مجاہد، عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ لوگ اس اُمت سے ہیں۔ مراد اُن کی یہ ہے کہ وہ آخر زمانے میں ہوں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس اُمت میں ہیں، ایک دوسرے پر سوار ہوں گے، راستوں میں چوپایوں اور گدھوں کی طرح سوار ہوں گے، اللہ تعالیٰ سے نہ ڈریں گے، آسمان میں اور نہ زمین میں لوگوں سے شرمائیں گے۔[2]

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ خلف ہوں گے ساٹھ برسوں کے بعد، جنھوں نے نماز گنوائی اور مزوں کے پیچھے پڑے۔ پس وہ لوگ گمراہی کو آگے ہو کر ملیں گے۔ پھر ہوں گے خلف وہ قرآن پڑھیں گے جو اُن کی ہنسلیوں سے آگے نہ جائے گا اور تین شخص قرآن کو پڑھیں گے: مومن، منافق اور فاجر۔ بشیر نے کہا کہ میں نے ولید سے کہا کہ یہ تین کون ہیں؟ ولید نے کہا کہ مومن تو قرآن کے ساتھ مومن ہے اور منافق قرآن کے ساتھ کافر ہے اور فاجر کھاتا ہے بسبب قرآن کے، یعنی قرآن کو تحصیلِ دنیا کا ذریعہ

---

① تفسیر الطبري (١٨/ ٢١٥۔ ٢١٦) ② تفسیر الطبري (١٨/ ٢١٧) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٧٢)

ٹھہراتا ہے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم بسنده وفيه حدثنا بشير بن أبي عمرو الخولاني أن الوليد بن قيس حدثه أنه سمع أبا سعيد الخدري الخ وهكذا رواه أحمد عن أبي عبد الرحمن المقري) اور ابن ابی حاتم نے ابو الرجال سے روایت کیا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کوئی شے صدقے کے طور پر اہلِ صفہ کے لیے بھیجتی تھیں اور کہتیں: مت دو اس میں سے کسی بربری مرد کو اور نہ کسی بربری عورت کو، کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ وہی خلف ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾[2] (فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں: "كانت ترسل بالصدقة لأهل الصدقة")[3] یہ حدیث غریب ہے۔

محمد بن قرظی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ وہ اہلِ غرب ہیں، مالک ہوں گے اور وہ ان لوگوں میں سے بدترین ہیں جو مالک ہوئے۔ (أخرجه ابن أبي حاتم أيضا) کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! بے شک میں اللہ عزوجل کی کتاب میں منافقوں کی صفت پاتا ہوں؛ "شرابين للقهوات، تراكين للصلوات، لعابين بالكعبات، رقادين عن العتمات، مفرطين في الغدوات، تراكين للجماعات" یعنی بہت پینے والے شرابوں کے، بہت ترک کرنے والے نمازوں کے، بہت کھیلنے والے پانسوں سے، بہت سو جانے والے عشا کی نمازوں سے، بہت کمی کرنے والے صبح کی نمازوں میں، بہت ترک کرنے والے جماعتوں کے، کہا: پھر یہ آیت پڑھی۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "عطلوا المساجد و لزموا الضيعات" یعنی مساجد کو معطل اور بے کار کر دیا اور باغوں، کھیتیوں اور گاؤں کو لازم پکڑا۔ ابو الاشہب عطاردی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے داود علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے داود! تو تحذیر و انذار کر، یعنی اپنے اصحاب کو اپنی خواہش کی چیزیں کھانے سے ڈرا، اس لیے کہ جو دل دنیا کی خواہشوں کے ساتھ لٹکے ہوئے ہیں، اُن کی عقلیں مجھ سے پردے میں ہیں، چھپی ہوئی ہیں اور بے شک میں اپنے بندے کے ساتھ سب سے سہل تر چیز جو کرتا ہوں، جب کہ وہ اپنی خواہشات میں سے کسی خواہش کو اختیار کرتا ہے، یہ ہے کہ میں اس کو اپنی اطاعت سے محروم کر دیتا ہوں۔[4] امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنِّي أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي اثْنَتَيْنِ الْقُرْآنَ وَالْكُنَى أَمَّا الْكُنَى فَيَتَّبِعُوْنَ الزَّيْفَ وَيَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ وَيَتْرُكُوْنَ الصَّلَاةَ وَ أَمَّا الْقُرْآنُ فَيَتَحَمَّلُهُ الْمُنَافِقُوْنَ فَيُجَادِلُوْنَ بِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ»[5] (و رواه عن حسن بن موسى عن أبي لهيعة حدثنا أبو قبيل عن عقبة به مرفوعا بنحوه تفرد به)

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٣٤)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٢٦٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٣) اس کی سند میں "عبید اللہ بن عبد الرحمن بن موہب" متکلم فیہ راوی ہے۔

[3] فتح البيان (٨/ ١٧٦۔ ١٧٧)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٢)

[5] مسند أحمد (٤/ ١٥٥، ١٤٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٧٨)

”غَيًّ“ میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد خسران، یعنی نقصان ہے۔[1] فتح البیان میں سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ”غَيًّ“ جہنم کی ایک وادی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شر۔[2] عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”غَيًّ“ جہنم میں ایک وادی ہے؛ ”بعيد القعر خبيث الطعم“ (فتح البیان میں اس قول کے الفاظ یوں ہیں کہ ”غَيًّ“ جہنم میں ایک نہر یا ایک وادی ہے پیپ سے بھری ہوئی ”بعيد القعر“ اور ”خبيث الطعم“[3] یعنی بہت گہری اور خبیث کھانے والی، اس میں وہ لوگ ڈالے جائیں گے، جو خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں)۔ ابو عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک وادی ہے پیپ اور لہو کی۔[4]

لقمان بن عامر خزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، میں نے کہا: تم ہم سے وہ حدیث بیان کرو جس کو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، پھر انھوں نے کھانا منگوایا۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر ایک پتھر دس اوقیہ (فتح البیان کے الفاظ: ”زنة عشر أواق“ ہے۔[5] والله أعلم۔ اوقیہ چالیس درہم۔ قال الجوهري وكذلك كان فيما مضى فأما اليوم فيما يتعارفه الناس ويقدر عليه الأطباء فالأوقية استار وثلثا استار)[6] کے وزن کا پھینکا جائے جہنم کے کنارے سے تو وہ اس کی تہہ تک پچاس خریف تک نہ پہنچے (یعنی چالیس سال تک) پھر وہ غی اور اثام کی طرف پہنچے۔ میں نے کہا: غی اور اثام کیا ہے؟ کہا کہ جہنم کے نچلے حصے میں دو کنوئیں ہیں، جن میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے اور وہ وہی ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے: ﴿ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ (آیتِ باب) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٨] ”اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔“[7] (هذا حديث غريب ورفعه منكر أخرجه ابن جرير)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس شخص نے ترکِ صلات اور اتباعِ شہوات سے رجوع کیا تو بے شک اللہ پاک اس کی توبہ قبول کرلے گا اور اس کی عاقبت اچھی کردے گا اور اس کو جنتِ نعیم کے وارثوں میں ٹھہرائے گا۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴾ یہ اس واسطے ہے کہ توبہ اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ دوسری حدیث حدیث شریف میں یوں آیا ہے کہ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٩)
[2] الدر المنثور (٥/ ٥٢٧۔ ٥٢٨) فتح البيان (٨/ ١٧٧)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٨) فتح البيان (٨/ ١٧٧)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٣)
[5] فتح البيان (٨/ ١٧٧)
[6] الصحاح للجوهري (٧/ ٣٧٨)
[7] تفسير الطبري (١٨/ ٢١٧۔ ٢١٨) المعجم الكبير (٨/ ١٧٥) اس کی سند میں ”شرقی بن قطامی“ ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب ٢/ ٢٣٣)

گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس کا کوئی گناہ نہیں ہے[1] اور اس لیے اُن توبہ کرنے والوں کے اعمال سے کچھ کم نہ کیا جائے گا، جن کو انھوں نے کیا ہے اور نہ اُن کا اس عمل کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا جس کو انھوں نے توبہ سے قبل کیا ہے کہ ان کے لیے اس عمل میں سے کم کیا جائے جس کو انھوں نے توبہ کے بعد کیا ہے۔ کیوں کہ اللہ کریم کے کرم سے اور اس حلیم کے حلم سے وہ باطل عمل تو چلا گیا اور نسیا منسیا ہو گیا، وہ مفت میں جاتا رہا۔

یہ استثناء اس جگہ ایسا ہے، جیسا کہ سورۃ الفرقان میں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿68﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿69﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٦٨۔ ٧٠] ''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔ یومِ قیامت اس کا عذاب دُگنا کر دیا جائے گا، اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل وخوار رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور وہ ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو انھی لوگوں کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دے گا، اور اللہ غفور (اور) رحیم ہے۔''

سچی توبہ کرنے والوں سے جنت کا وعدہ:

﴿ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ اللہ پاک فرماتا ہے کہ جن جنتوں میں اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والے لوگ داخل ہوں گے، وہ جناتِ عدن ہیں، یعنی رہنے بسنے کے باغ ہیں، جن کا وعدہ رحمٰن نے بندوں سے بظہر الغیب کیا ہے، یعنی وہ اس غیب سے ہیں کہ اس پر ایمان لاتے ہیں، حالانکہ اس کو دیکھا نہیں ہے اور یہ بات ان کے پختہ یقین اور ایمان کی قوت کے سبب سے ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴾ یہ اس کے حصول وثبوت اور استقرار کی تاکید ہے، یعنی وہ ضرور جنتوں میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، بسیں گے، کیونکہ اللہ پاک وعدے کا خلاف نہیں کرتا اور نہ اس کو بدلتا ہے۔ یہ قول اس قول کی طرح ہے: ﴿ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴾ [المزمل: ١٨] ''اس (اللہ) کا وعدہ ہو کے رہنا ہے۔'' اس جگہ ﴿ مَاْتِيًّا ﴾ فرمایا، یعنی بندے اس کی طرف نقل کرنے والے ہیں اور عن قریب اس کے پاس آئیں گے۔ بعض نے کہا کہ ﴿ مَاْتِيًّا ﴾ بہ معنی ''آتِیًا'' ہے، یعنی وہ وعدہ آنے والا ہے، کیونکہ ہر وہ چیز جو تیرے پاس آئی تو مقرر تو اس کے پاس آیا، جیسے عرب لوگ بولتے ہیں: ''أتت علي خمسون سنة'' یعنی مجھ پر پچاس برس آئے۔ ''وَأَتَيْتُ عَلٰى خَمْسِيْنَ سَنَةً'' یعنی میں پچاس برسوں پر آیا، دونوں کے ایک معنی ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٠٨)

جنت کے مناظر:

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا ﴾ یعنی ان جنتوں میں ساقط تافہ بے معنی بات نہ ہوگی، جس طرح کہ دنیا میں ہوتی ہے۔ ﴿ اِلَّا سَلٰمًا ﴾ استثنائے منقطع ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ [الواقعة: ٢٥۔ ٢٦] ''اور وہ اس (جنت) میں نہ لغو سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔ (ہاں!) مگر ایک بول سلام ہے سلام ہے۔'' ﴿ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ بکرات وعشیات کے وقت سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہاں رات دن ہیں، لیکن وہ ایسے اوقات میں ہوں گے کہ یکے بعد دیگرے آتے رہیں گے۔ اضواء و انوار (روشنیوں) سے ان کا جانا گزرنا پہچانیں گے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا، اس کی صورتیں چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گی نہ وہ اس میں تھوکیں گے، نہ ناک سنکیں گے (حدیث شریف میں لفظ "لا یتمخطون" ہے۔ مجمع البحار میں ہے کہ "المخاط ما يسيل من الفم"[1] یعنی مخاط منہ سے بہنے والا مواد ہے، لیکن قاموس وصراح میں یوں ہے: "ما يسيل من الأنف"[2] یعنی جو ناک سے بہتا ہے، یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم۔) نہ پاخانہ پھریں گے، ان کے برتن اور کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہیں اور بخور (اگربتی) ان کا "اُلُوَّہ" ہے (مجامرهم الألوة جمع مجمر بالكسر والضم فبالكسر موضع وضع النار للبخور وبالضم ما يتخبر به وأعد له الجمر وهو المراد هنا أي أن بخورهم بالألوة وهو العود.[3] مجمع البحار) اور پسینہ ان کا مشک ہے اور اُن میں سے ہر ایک کے لیے دو دو بیویاں ہیں، جن کی پنڈلی کا گودا گوشت کے پار سے دکھائی دیتا ہے حسن کی وجہ سے۔ اُن میں نہ کسی طرح کا اختلاف ہے نہ دشمنی، ان کے دل ایسے ہوں گے جیسے ایک آدمی کے ہیں۔ اللہ کی تسبیح صبح وشام کریں گے۔[4] (أخرجاه في الصحيحين من حديث معمر به)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہداء بارق نہر پر ہیں (بارق برق سے ماخوذ ہے، اس بنا پر اس کے معنی چمکتی نہر ہوئے۔ واللہ أعلم) دروازۂ جنت میں سبز قبے میں۔ ان پر ان کا رزق صبح وشام نکلتا ہے۔[5] (أخرجه أحمد و تفرد به من هذا الوجه) امام ضحاک نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے: "مقادير الليل والنهار" یعنی رات دن مراد نہیں ہیں، بلکہ رات دن کی مقدار کا وقت مراد ہے۔ ولید بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے زہیر بن محمد سے اس آیت کا پوچھا تو کہا: نہیں ہے جنت میں کوئی رات وہ

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٥٥١) [2] القاموس المحيط (١/ ٦٨٧) [3] مجمع بحار الأنوار (١/ ٣٨٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٤) مسند أحمد (٢/ ٣١٦)

[5] مسند أحمد (١/ ٢٦٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٤٢)

تو ہمیشہ نور میں ہیں اور اُن کے لیے رات اور دن کا اندازہ ہے۔ وہ رات کی مقدار کو پردے گرا دینے اور دروازوں کو بند کر دینے سے پہچانتے ہیں اور دن کی مقدار کو پردوں کے اٹھا دینے اور دروازوں کے کھول دینے سے۔(أخرجه ابن جرير و أخرج عن الحسن البصري و ذكر أبواب الجنة فقال أبواب يرى ظاهرها من باطنها فتكلم و تكلم فيفهمهم انفحتي انغلقي فتفعل)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جنت میں دو اوقات ہیں: بکرہ وعشی۔ وہاں نہ رات ہے نہ دن، اور وہ تو روشنی ہے اور نور۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ بکرہ ہے نہ عشی، لیکن وہ اس کو لائے جائیں گے، اس بنیاد پر کہ وہ اس کی دنیا میں خواہش کرتے تھے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ عرب لوگوں میں زیادہ ترعیش و آرام والا وہ شخص ہوتا ہے جو صبح وشام کا کھانا کھائے، لہٰذا قرآن اس عیش و آرام کے بارے میں نازل ہوا، جو اُن کی زندگی میں عیش و آرام تھا۔ امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بکور (بكرة) وارد ہوگا عشی پر اور عشی وارد ہوگا بکور پر، جنت میں رات نہیں ہے۔[1] یعنی بکور و عشی کا ایک دوسرے پر ورود ہوتا رہے گا۔ رات کا نام و نشان وہاں نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے کوئی غدات، یعنی صبح غدواتِ جنت سے، حالانکہ ساری جنت غدوات ہے، مگر اس میں ولی اللہ کی طرف ایک بیوی حورعین میں سے بھیجی جائے گی، ان میں کمتر وہ ہے، جو زعفران سے پیدا کی گئی۔ ابومحمد رحمہ اللہ نے کہا: "هذا حديث غريب منكر"[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ ... الخ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یہ جنت جس کی صفت ہم نے بیان کی ہے، ان صفاتِ عظیمہ کے ساتھ وہ جنت ہے، جس کا ہم اپنے متقی بندوں کو وارث بنائیں گے اور یہ وہی لوگ ہیں، جو آرام اور تکلیف میں اللہ عزوجل کے فرماں بردار رہتے ہیں اور غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور جیسا کہ اللہ پاک نے سورۃ المومنین کے اول میں فرمایا ہے: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۔ ۱۱] "مومن یقیناً فلاح پا گئے۔ وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو زکات ادا کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے

---

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۲۲۱) تفسیر ابن كثير (۳/ ۱۷۴)

[2] تفسیر ابن كثير (۳/ ۱۷۴) اس کی سند میں "منصور بن عمار" ضعیف راوی ہے۔

مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو شخص ان کے علاوہ (راستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب اللہ پاک نے ان نبیوں کی ان صفتوں کے ساتھ تعریف کی، تاکہ ان کے علاوہ لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ ان کی اقتدا کریں اور اُن کی راہ پر چلیں تو اُن لوگوں کا ذکر کیا جو اُن کی ضد ہیں، تاکہ لوگ اُن کے طریق سے بچیں اور اُن کی راہ سے نفرت کریں۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ ﴾ یعنی انبیائے مذکورین کے بعد ناخلف پیدا ہوئے۔ لغت والے عقبِ خیر وصدق کو "خَلَف" لام کی زبر کے ساتھ کہتے اور عقبِ شر وسوء کو لام کے سکون کے ساتھ (خَلۡف) بولتے۔ اور عقب کے معنی لغت میں فرزند اور فرزند کے فرزند کے ہیں۔ غرضیکہ لائق بیٹے پوتے کو "خَلَف" لام کی زبر کے ساتھ (خَلَف) بولتے ہیں اور نالائق کو لام کے سکون کے ساتھ (خَلۡف) بولتے ہیں، اس کا بیان سورۃ الاعراف کے آخر میں گزر چکا ہے۔[1] نماز کے ضائع کرنے میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ لہٰذا اکثر کا قول یہ ہے کہ نماز کا تاخیر کرنا اس کے وقت سے، تاخیر یہ ہے کہ ظہر نہ پڑھے، یہاں تک کہ عصر آ جائے اور عصر نہ پڑھے، یہاں تک کہ مغرب آ جائے، ایک قول تو یہ ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز کے وجوب کا کفر اور انکار کرنا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نماز کا وقتِ مشروع پر ادا نہ کرنا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح نماز کو ترک کر دینا۔

ظاہر بات یہ ہے کہ جس شخص نے نماز کے وقت سے تاخیر کی یا کسی فرض کو اس کے فرضوں سے، یعنی نماز کی شرطوں میں سے کسی شرط کو یا اس کے ارکان میں سے کسی رُکن کو ترک کر دیا تو اس نے نماز کو یقینی طور پر ضائع کر دیا اور جس شخص نے نماز کو بالکل ترک کر دیا یا اس کا انکار کیا تو وہ بدرجۂ اولیٰ اضاعت (نماز کو ضائع کرنے) کے نیچے داخل ہوگا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ نماز کا ضائع کرنا اس کا ترک کرنا نہیں ہے۔ انسان کبھی کسی شے کو ضائع کرتا ہے اور اس کو ترک نہیں کرتا، لیکن نماز کا ضائع کرنا یہ ہے کہ جس وقت اس کو اس کے وقت پر نہ پڑھے۔[2] مفسرین کا اختلاف ہے کہ یہ آیتِ کریمہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لہٰذا اس بارے میں تین اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہود کے حق میں اُتری ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ایک قوم کے بارے میں اُتری ہے، جو آخر زمانے میں ہوگی۔ پہلے دو

---

(1) رقم الآیة [١٦٩] (2) الدر المنثور (٥/ ٥٢٦)

اقوال کے امام سدی رحمہ اللہ قائل ہیں[1] اور تیسرا جو قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے،[2] ان کے الفاظ پہلے گزر چکے ہیں، اتباعِ شہوات کا مطلب یہ ہے کہ حرام چیزوں سے، جیسے: شراب پینا، زنا کرنا، جس کو اُن کا جی چاہے گا یا اُن کا نفس رغبت کرے گا، اس سے کریں گے۔

"غَيًّ" اہلِ لغت کے نزدیک شر ہے، جس طرح کہ خیر رشاد کو کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ وہ شر سے ملیں گے، خیر سے نہ ملیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ "غَيًّ" ضلال اور گمراہی ہے یا خبیث یا خسران یا نقصان یا ہلاکت یا عذاب۔ کسی نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک وادی کا نام ہے، جس کی گرمی سے اس کی وادیاں پناہ مانگتی ہیں۔ وہ حرام کاروں، شراب پینے والوں، جھوٹی گواہی دینے والوں، سودخواروں اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلام میں حذف ہے، تقدیر یوں ہے کہ "سيلقون جزاء الغي" یعنی گمراہی کی جزا کو ملیں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور اسی طرح اس قولِ الٰہی میں ہے ﴿ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ یعنی جزائے اثام۔[3]

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت سے اہلِ کتاب اور اہلِ لبن عن قریب ہلاک ہوں گے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اہلِ کتاب کیا ہیں؟ فرمایا: ایک قوم ہے کہ کتاب کو سیکھیں گے اس کے ساتھ اُن لوگوں سے جھگڑیں گے جو ایمان لائے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ اہلِ لبن کیا ہے۔ (قال الحربي أظنه يتباعدون عن الأمصار وعن صلاة الجامعة يطلبون مواضع اللبن في المرعى والبوادي،[4] مجمع البحار)۔ فرمایا: ایک قوم ہے کہ خواہشوں کی پیروی کریں گے اور نمازوں کو ضائع کریں گے۔[5] (أخرجه أحمد والحاكم وصححه)

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ ﴾ کے استثناء میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ استثناء منقطع ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[6] دوسرا یہ ہے کہ متصل ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ وغیرہ اسی پر چلے ہیں[7] اور یہی قول ظاہر آیت ہے، کیوں کہ امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت اسی اُمت کے حق میں ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تغلیظ (سختی) پر محمول ہو، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ [آل عمران: ۹۷] "جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔" اور اسی تاویل سے امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول حسین ہو جاتا ہے کہ یہ کلام اُمتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نازل ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس استثناء میں اس پر دلیل ہے کہ آیت کافروں کے بارے میں ہے نہ کہ مسلمانوں کے حق

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۱۲)
[2] تفسیر الطبري (۱۸/ ۲۱۷)
[3] معاني القرآن (۳/ ۳۳٦)
[4] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٤٦٤)
[5] مسند أحمد (٤/ ۱٥٥) مستدرك الحاكم (۲/ ٤۰٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۷۷۸)
[6] معاني القرآن (۳/ ۳۳٦)
[7] تفسير البحر المحيط (٦/ ۱۹۰)

میں۔اور ﴿ يَدْخُلُوْنَ ﴾ یائے تحتیہ کی زبر اور خائے معجمہ کی پیش کے ساتھ ہے اور یا کی پیش اور خا کی زبر سے بھی "يُدْخَلُوْنَ" پڑھا ہے۔

﴿ جَنّٰتِ عَدْنِ ﴾ اس میں دو قراء تیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ مبتدا ہے۔ دوسری قراءت زبر کے ساتھ ہے۔ زبر کی دو وجہیں ہیں: یا تو جنت سے بدلِ بعض ہے، کیوں کہ جناتِ عدن جنت میں سے بعض ہیں یا نصب (ــَـ) مدح کی بنا پر ہے۔ عدن کو دو طرح پڑھا ہے: منصرف اور غیر منصرف اس بنیاد پر کہ عدن علم ہے، بہ معنی عدن کے کہ وہ اقامت ہے، یعنی بساتین اقامت کے (رہنے والے باغات)۔ ان جنات کو ہمیشگی کے ساتھ موصوف کیا دنیا کے باغات کے برعکس، کیوں کہ وہ ہمیشہ قائم نہیں رہتے، یا عدن علم ہے جنت کی زمین کا، کیوں کہ جنت مقام ہے اقامت کا۔ اور ﴿ بِالْغَيْبِ ﴾ متلبسہ یا متلبسین کے ساتھ متعلق ہے، پہلی صورت میں ضمیر محذوف کے ساتھ حال ہوگا، جو ﴿ اَلَّتِيْ ﴾ کی طرف پھرتی ہے اور دوسری صورت میں حال ﴿ عِبَادَهٗ ﴾ سے ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ ان جنتوں کو نہیں دیکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان سے غائب ہیں۔ ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر رحمٰن کی طرف راجع ہے یا ضمیر شان و امر ہے، کیوں کہ یہ مقام تعظیم و تفخیم (بڑائی) کا ہے۔

﴿ وَعْدُهٗ ﴾ کے معنی ہیں: "موعوده على العموم" یعنی اللہ نے جس چیز کا بالعموم وعدہ کیا ہے، وہ مراد ہے، پس جنات بدرجۂ اول اس میں داخل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وعد مصدر ہے اپنے باب پر۔ لغو کے معنی ہیں: فضول بات، یعنی بے ہودہ کلام جس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لغو کا نہ سننا کنایہ ہے لغو کے صادر نہ ہونے سے۔ کسی نے کہا ہے کہ لغو ہر وہ چیز ہے کہ جس میں اللہ کا ذکر نہ ہو۔ ﴿ اِلَّا سَلٰمًا ﴾ استثناء منقطع ہے، معنی یہ ہیں کہ سلام بعض کا بعض پر ہوگا یا اللہ کا یا فرشتوں کا ان پر سلام ہوگا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلام اسم جامع ہے واسطے خیر کے، اس لیے کہ سلام سلامتی کو شامل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت والے وہ بات نہ سنیں گے جو اُن کو درد دے یا رنج پہنچائے اور وہ نہ سنیں گے مگر وہ بات جو اُن کو صحیح و سالم رکھے۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس میں تین وجہ نکالی ہیں،[2] سلیمان جمل نے ان کو ذکر کیا ہے۔ "بُكْرَه و عَشِيًّ" کے رزق کا ذکر اس لیے کیا کہ اُن دونوں وقتوں میں رزق ملنا بہترین عیش ہے عرب کے نزدیک۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ہمیشگی کا رزق ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ اور ابو قلابہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا کوئی جنت میں رات ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تجھ کو کس چیز نے اس بات پر اُبھارا۔ اس نے عرض کی: میں نے اللہ تعالیٰ کو سنا، وہ کتاب میں ذکر کرتا ہے: ﴿ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ (آیتِ باب) تو میں نے کہا: یعنی اپنے جی میں کہ رات تو "بُكْرَه و عَشِيًّ" (عشي وعشية و عشاء بالمد و الكسر وهي ما بين المغرب و العتمة و زعم

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۳۳۷) [2] الكشاف (۳/ ۳۹)

قوم إن العشاء من زوال الشمس إلى طلوع الفجر۔ صراح) سے ہوتی ہے۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں ہے وہاں کوئی رات اور وہ تو روشنی اور نور ہے، وارد ہوگا: غَدُوٌّ رَوَاح پر اور رواح غدو پر آئیں گے، ان کو نئے نئے ہدایا (ہدیے) اللہ کی طرف سے اُن اوقات میں ملیں گے جن میں دنیا میں نماز پڑھا کرتے تھے اور سلام کریں گے ان پر فرشتے۔[1] (أخرجه الحكيم الترمذي في نوادر الأصول)

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ ... الخ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یہ جنت جس کے احوال ہم نے بیان کیے، اس کا ہم انھیں وارث کر دیں گے اور اُنھیں وہ دے دیں گے۔ ہم اس میں اس شخص کو اُتاریں گے جو اہلِ تقویٰ سے ہے، جس طرح کہ وارث پر اس کے مورث کا مال بچایا جاتا ہے اور پھیر نہیں لیا جاتا، جس کو اس میراث میں سے وارث لے لیتا ہے، پھر اس میں مورث رجوع نہیں کرتا، یعنی اُن کے تقویٰ کے ثمر سے ہم اس کو اُن پر باقی رکھیں گے۔ وراثت قوی تر لفظ ہے، جو ملکیت اور استحقاق کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس جہت سے کہ اس کے بعد نہ فسخ ہوتا ہے نہ کوئی رجوع کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ نہ وہ رد کرنے اور ساقط ہونے سے باطل ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ متقیوں کو جنت کی میراث میں سے وہ مکانات ملیں گے، جو دوزخ والوں کے واسطے تھے، اگر وہ اطاعت کرتے۔ یہ میراث ان کو ان کی کرامت (عزت) کی زیادتی کی وجہ سے ملے گی۔

﴿نُوْرِثُ﴾ میں تین قراءتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ واو کی زبر اور را کی شد کے ساتھ ہے۔ دوسری واو کی تخفیف باب "إيراث" سے۔ تیسری یہ ہے کہ اعمش رحمہ اللہ نے "نورثها" پڑھا ہے باظہارِ عائد موصول۔ کسی نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی "نورث من كان تقيا من عبادنا" آیتِ کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ متقی جنت میں داخل ہوگا اور اس امر پر اس میں دلالت نہیں ہے کہ غیر متقی اس میں داخل نہ ہوگا اور نیز کبیرہ گناہ کا مرتکب کفر سے بچنے والا ہے۔[2]

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

اور ہم (فرشتے) آپ کے رب ہی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں، اسی کے لیے ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، اور آپ کا رب کبھی بھولنے والا نہیں (64)

---

[1] نوادر الأصول (١/ ٢٤٩) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] فتح البيان (٨/ ١٧٤۔ ١٨٠)

(وہی) رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (سب کا)، چناں چہ آپ اس کی عبادت کریں اور اس کی عبادت پر قائم رہیں، کیا آپ اس کا کوئی ہم نام جانتے ہیں؟ (65)

فرشتے اپنے رب تعالیٰ ہی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں:

ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام کئی روز نہ آئے، جب آئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تم ہر روز کیوں نہیں آتے، اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سکھایا کہ جواب میں یہ کہو۔ کلام اللہ کا ہے جبریل کی طرف سے۔ جیسے: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٤] ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔'' ہم کو سکھایا۔ ہمارے آگے پیچھے کہا آسمان اور زمین کو، یعنی اترتے ہوئے زمین آگے آسمان پیچھے، چڑھتے ہوئے وہ پیچھے اور یہ آگے۔ اللہ کے نام سب اس کی صفت ہیں، یعنی کوئی ہے اس صفت کا؟

[1] سعید بن جبیر رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ تجھے کیا چیز منع کرتی ہے کہ تو ہماری زیارت، اس سے زیادہ کرے جتنی تو کرتا ہے؟ کہا: پس یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ [1] (أخرجه الإمام أحمد بسنده و انفرد بإخراجه البخاري فرواه عند تفسير هذه الآية عن أبي نعيم عن عمر بن ذر به و رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير من حديث عمر بن ذر به) اور ان دونوں کے نزدیک آخر حدیث میں اتنا زیادہ ہے، پس یہ جواب ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے۔

[2] عوفی کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رک رہے تو آپ کو اس بات سے بہت غم اور حزن ہوا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام آئے تو کہا: اے محمد! ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ﴾

[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ جبریل علیہ السلام نے بارہ رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے میں دیر کی اور کہتے ہیں کہ اس سے کم، پھر جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے جبریل! تو نے مجھ پر بہت دیر کی، یہاں تک کہ مشرکوں نے اس پر طرح طرح کا گمان کیا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے جو سورۃ الضحیٰ میں ہے۔ امام ضحاک بن مزاحم، قتادہ، سدی اور غیر واحد رحمہم اللہ نے اس طرح کہا ہے کہ یہ آیت جبریل علیہ السلام کے رُک رہنے میں نازل ہوئی ہے۔[2]

[4] امام عکرمہ رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترنے میں چالیس دن تک دیر

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٣١) مسند أحمد (١/ ٢٣١) تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٢)

(2) تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٢۔ ٢٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٤)

لگائی، پھر آئے تو نبی اکرم ﷺ نے اُن سے فرمایا تو نہیں اترا، یہاں تک کہ میں تیری طرف مشتاق ہوا، پس جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا، بلکہ میں بھی تیری طرف زیادہ تر مشتاق تھا، لیکن میں مامور ہوں، پھر اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ تو ان سے کہہ: ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ﴾ (رواه ابن أبي حاتم و هو غريب)

5 امام مجاہد رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ رسولوں، یعنی قاصدوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس آنے میں دیر کی، پھر آپ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے تو آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا: اے جبریل! تجھے کس چیز نے روک رکھا تھا؟ تو آپ ﷺ سے جبریل علیہ السلام نے کہا: ہم کیوں کر آئیں تمھارے پاس، حالانکہ تم نہ تراشتے ہو اپنے ناخنوں کو اور نہ پاک صاف کرتے ہو اپنے براجم کو (مجمع البحار میں کہا ہے کہ براجم با کی زیر اور جیم کی زیر کے ساتھ برجم، با اور جیم کی پیش کے ساتھ، کی جمع ہے، انگلیوں کے جوڑوں اور درمیان کی جگہ کو کہتے ہیں جن میں میل جمع ہو جاتا ہے)[1] اور نہیں تراشتے ہو اپنی مونچھوں کو اور نہ مسواک کرتے ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ﴾[2] (أخرجه ابن أبي حاتم)

6 عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے آپ کے پاس آنے میں دیر کی تو آپ ﷺ نے اُن سے اس کا ذکر کیا تو جبریل علیہ السلام نے کہا اور کیونکر، حالانکہ نہ تم مسواک کرتے ہو اور نہ اپنے ناخنوں کو تراشتے ہو اور نہ اپنی مونچھوں کو کتراتے ہو اور نہ اپنے براجم کو صاف پاک کرتے ہو۔[3] (أخرجه الطبراني عن أبي كعب مولى ابن عباس رضی اللہ عنہما وهكذا رواه الإمام أحمد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما بنحوه)

7 ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو ہمارے لیے مجلس کو درست کر، اس لیے کہ بے شک ایک فرشتہ زمین کی طرف اُترے گا، جو پہلے کبھی نہیں اترا۔[4] (أخرجه الإمام أحمد)

﴿ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا ﴾ سے مراد امرِ دنیا ہے اور ﴿ مَا خَلْفَنَا ﴾ سے مراد آخرت ہے۔ ﴿ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾ سے مراد وہ زمانہ ہے، جو دونوں نفخوں (صور پھونکے جانے) کے درمیان ہے۔ یہ قول امام ابو العالیہ، عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے ان دونوں کی ایک روایت میں اور امام سدی اور ربیع بن انس رحمہما اللہ کا۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا ﴾ وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان ہے۔ اسی کے مثل ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، ابن جریج اور ثوری رحمہم اللہ سے مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[5] واللہ أعلم.

---

1 مجمع بحار الأنوار (١/ ١٥٦) 2 تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٤)

3 المعجم الكبير (١١/ ٤٣١) مسند أحمد (١/ ٢٤٣) اس کی سند میں ''ثعلبہ بن مسلم'' مجہول راوی ہے۔

4 مسند أحمد (٦/ ٢٩٦) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٠٨١)

5 تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٤۔ ٢٢٥)

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہیں بھولا تجھ کو تیرا رب۔[1] پہلے امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول گزر چکا ہے کہ یہ آیت اللہ پاک کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ﴾[2] [الضحیٰ: ۲۔ ۳] ''اور رات کی جب وہ چھا جائے۔ (اے نبی!) آپ کے رب نے آپ کو نہ چھوڑا اور نہ ناراض ہوا۔'' سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ وہ چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا، پس وہ حلال ہے اور جس چیز کو اس نے حرام کیا، پس وہ حرام ہے اور جس چیز سے اس نے سکوت کیا، پس وہ عافیت (اس میں درگزر) ہے۔ لہٰذا تم قبول کرو اللہ سے اس کی عافیت کو۔ پس بے شک اللہ ایسا نہیں ہے کہ بھول جائے کسی چیز کو۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ یعنی اللہ پاک پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اور ان کا تدبیر کرنے والا ہے اور اُن میں حاکم ہے اور ایسا متصرف ہے کہ اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں۔ ﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ کیا جانتا ہے تو رب کے لیے کوئی مثل یا شبیہ؟ اور اسی طرح امام مجاہد، سعید بن جبیر، قتادہ اور ابن جریج رحمہم اللہ وغیرھم نے کہا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کیا ہے کہ نہیں کوئی جس کا نام رحمٰن رکھا جائے سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ وتقدس اسمہ کے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے جبریل! تو کہہ کہ ہم نہیں اترتے کسی وقت میں کسی وقت کے بعد مگر اللہ کے حکم سے، حکمتِ الٰہی کے تقاضے کے مطابق۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اترنے میں دیر ہوئی، جب کہ لوگوں نے آپ سے روح کے بارے میں سوال کیا اور اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں، تو جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر دیں کہ فرشتے نہیں اترتے مگر اللہ کے حکم سے۔ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے سے چالیس دن تک یا پندرہ دن یا بارہ دن یا تین دن تک رک گئے۔ اس آیت کے معنی میں دو وجہ کا احتمال ہے: ایک یہ ہے کہ ہم تجھ پر نہیں اُترتے، مگر جب تیرے رب کا اترنے کے لیے حکم ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم تجھ پر نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم سے جو تجھ کو اس چیز کا حکم کرتا ہے جس کو تیرے لیے اور تیری امت کے لیے مشروع کیا ہے۔ ''تنزل'' کا معنی ''نزول علی مھل'' (ٹھہر ٹھہر کر اترنا) یعنی بہ درنگ فرود آمدن، کیونکہ تنزل مطاوع (فرمانبرداری کرنا) ''نزّل'' بتشدید کا اور کبھی صرف

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٤)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٣)
[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٠٦) السلسلة الصحيحة (٢٢٥٦)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٦) تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٦)

نزول پر بولا جاتا ہے، جس طرح کہ "نَزَّلَ"،مشدد کا اطلاق "أَنْزَلَ" کے معنی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

نزول کے معنی فرود آمدن اور انزال کے معنی فرود آوردن اور تنزیل کے معنی فرود فرستادن ہیں۔ غرضیکہ پھر جبریل علیہ السلام نے جس بات کی نبی اکرم ﷺ کو خبر دی اس کی یوں تاکید کی کہ ﴿ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا ... الخ﴾۔ یعنی جو جہتیں اور جگہیں اور گذشتہ اور آیندہ کے زمانے ہمارے آگے پیچھے ہیں اور جو زمانہ کہ ان دونوں کے درمیان ہے یا وہ مکان جس میں ہم ہیں، لہٰذا قدرت نہیں رکھتے ہم کہ کسی طرف سے کسی دوسری طرف، یا کسی مکان سے کسی دوسرے مکان کی طرف یا کسی زمانے سے کسی دوسرے زمانے کی طرف منتقل ہوں، مگر تیرے رب کے حکم اور مشیت سے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا ﴾ وہ ہے جو گزر چکا امرِ دنیا سے اور ﴿ وَمَا خَلْفَنَا ﴾ سے مراد وہ ہے جو امرِ آخرت سے آگے آئے گا۔[1] کسی نے کہا یہ معنی ہیں کہ جو امورِ آخرت میں سے ہمارے آگے ہے اور امورِ دنیا میں سے جو ہمارے پیچھے ہے اور ﴿ وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ﴾ وہ ہے جو اس وقت سے لے کر قیامت قائم ہونے تک ہوگا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ زمین جو ہمارے آگے ہے جس وقت کہ ہم اُترتے ہیں اور آسمان جو ہمارے پیچھے ہے اور وہ چیز جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہماری عمروں میں جو گزر گئیں اور جو اُن میں سے باقی ہے اور وہ حالت جس میں ہم ہیں۔ ان سارے اقوال کی بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ بے شک اللہ پاک ہر شے کو محیط ہے، کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز بھی اس پر نہیں چھپتی اور نہ ذرہ بھر اس کے علم سے غائب ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کسی معاملے میں پیش قدمی نہیں کرتے، مگر اس کے حکم سے۔

نکتہ:

اللہ پاک نے ﴿ مَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ﴾ فرمایا اور "ما بين ذينك" نہ کہا، یعنی پہلے دو چیزوں کا ذکر ہوا ہے پھر "ذلك" لفظ مفرد سے ان کی طرف اشارہ کیا ہے، چاہیے یوں تھا کہ مفرد کے بجائے تثنیہ ہوتا۔ پس اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ﴾ سے مراد "مَا بَيْنَ مَا ذَكَرْنَا" ہے جیسے اللہ سبحانہ کے فرمان میں ہے: ﴿ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ﴾ [البقرة: ٦٨] "درمیانی عمر کی نوجوان ہو۔" ﴿ نَسِيًّا ﴾ سے مراد "ناسیا" ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب صیغۂ مبالغہ پر نفی آتی ہے تو زیادتی کی نفی ہو جاتی ہے اور اصل فعل باقی رہ جاتا ہے، لہٰذا اگر یہاں مبالغہ مراد لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ بہت بھولنے والا نہیں ہے، یعنی بھولتا ہے، مگر بہت نہیں بھولتا، حالانکہ اس کی ذات پاک تو نسیان سے بالکل مبرا و منزہ ہے، اس پر بھول چوک ہرگز روا نہیں ہے، اس لیے یہاں ﴿ نَسِيًّا ﴾ کے معنی "ناسیا" کے ہیں، یعنی وہ تم کو بھولا نہیں ہے اور نہ اس نے تم کو چھوڑ دیا ہے، گو تم سے وحی پیچھے رہ گئی ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تیرا رب ایسا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٤)

نہیں ہے کہ بھول جائے تیری طرف بھیجنے کو اس وقت میں جس میں وہ قاصدوں کو بھیجا کرتا ہے۔

﴿ رَبُّ ﴾ سے مراد خالق و مالک ہے، پس جس کی یہ شان ہے کہ وہ آسمان و زمین کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، اس کا خالق و مالک ہے تو اس پر بھولنا چوکنا محال ہے اور اس بات کا تصور ہی کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے آس پاس غفلت اور بھول چوک کا گزر بھی ہوگا۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ بندے کا فعل بھی اللہ پاک کی مخلوق ہے، کیوں کہ بندے کا فعل آسمان و زمین کے درمیان حاصل اور موجود ہے۔

پھر اللہ پاک نے نبی کریم ﷺ کو اپنی عبادت کا اور عبادت پر صبر کرنے کا حکم فرمایا: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ﴾ حرفِ فا سببیت کے واسطے ہے، یعنی تو اس کی عبادت کر اور اس پر ثابت رہ، اس لیے کہ اللہ پاک کی یہ صفت کہ وہ تم کو بھولتا نہیں ہے اور رب العالمین ہے، اس بات کا موجب اور سبب ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ یہاں فعل صبر کو لام کے ساتھ متعدی کیا علیٰ سے متعدی نہ کیا، جس کے ساتھ وہ متعدی ہوا کرتا ہے، اس لیے کہ صبر میں ثابت قدمی شامل ہے اور ثبات لام کے ساتھ متعدی آتا ہے۔

﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ میں سوالیہ انداز انکار کے لیے ہے، یعنی اللہ پاک کا نہ کوئی مثل ہے نہ کوئی نظیر کہ عبادت میں اس کا شریک ہو۔ تو اس سے یہ بات لازم آئی کہ اللہ پاک کے لیے عبادت خالص ہو، پھر جب اس کا شریک نیست و نابود ہونے والا ہے تو اللہ پاک ہی اس کا مستحق ہے کہ تنہا اس کی پوجا کی جائے اور عبادت اس کے لیے خالص ہو۔ اس معنی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ''سمي'' سے مراد شریک فی المسمی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''سمي'' سے مراد شریک فی الاسم ہے، چنانچہ لغتِ عرب سے یہی بات ظاہر ہے، یعنی ''سمي'' کے معنی ہیں: ہم نام۔ مطلب یہ کہ اللہ کا کوئی ہم نام نہیں ہے۔ اس قول پر معنی یہ ہوں گے کہ کبھی کسی بت وغیرہ کا نام اللہ نہیں رکھا گیا (بعد دخول الف واللام التي عوضت عن الهمزة ولزمت) یا یہ کہ ﴿ اَلسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کبھی کسی کا نام نہیں ہوا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ کا میلان اسی طرف ہے۔ حرفِ فا نے اس بات کا فائدہ دیا تھا کہ اللہ پاک کی عام ربوبیت اس بات کی وجہ ہے کہ عبادت کو خاص اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا واجب ہے۔[1]

لہٰذا اس جملے نے اس علت کی تاکید کی۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ پاک سارے عالم اور عالم والوں کا رب اور پرورش کرنے والا ہے اور اس کا کوئی ہم نام نہیں ہے تو ایسی ہی ذات پاک اس لائق ہے کہ خاص اسی کی پوجا کی جائے، اس کی عبادت میں کسی طرح کی شرکت کا شائبہ نہ ہو، خالص اسی پروردگار کی ذات پاک مقصود ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ، واللہ اعلم، اس کی تاویل یہ ہے کہ کیا تو اس کے لیے کوئی ہمنام جانتا ہے کہ وہ اس بات کا مستحق ہو کہ اس کو خالق و قادر اور ماضی اور آیندہ کا عالم کہا جائے،[2] اس بنیاد پر اللہ کے لیے اس کے سارے ناموں

---

(1) تفسير أبي السعود (٥/ ٢٧٤) (2) معاني القرآن (٣/ ٣٣٨)

میں سے کوئی ہم نام نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ پاک کے سوا اگرچہ کسی غیر کا نام اس کے ناموں میں سے کسی شے جیسا رکھا جاتا ہے تو اس وصف کی حقیقت خاص اللہ پاک کے واسطے ہے۔ اس جگہ انکار سے، جو علم کی نفی حاصل ہوئی ہے، اس سے مراد ابلغ و اکمل وجہ پر معلوم ہی کی نفی ہے، کیونکہ جب اللہ پاک کے ''سمی'' کا علم نہیں ہے تو معلوم، یعنی مسمی کا کیا اَتا پتا ہوگا۔ ''سمي'' کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ بھی ہے کہ کیا تو جانتا ہے اپنے معبود کے لیے کوئی فرزند؟[1]

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾

اور انسان کہتا ہے: کیا جب میں مر جاؤں گا، البتہ یقیناً مجھے زندہ نکالا جائے گا؟ (66) اور کیا انسان (اتنا ہی) یاد نہیں کرتا کہ یقیناً ہم نے اس سے پہلے اسے تخلیق کیا، جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا (67) پس آپ کے رب کی قسم! ہم ضرور اُن (کفار) کو شیطانوں کے ہمراہ اکٹھا کریں گے، پھر ہم ضرور اُنھیں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے جہنم کے گرد حاضر کریں گے (68) پھر ہم ضرور ہر گروہ سے (اسے) کھینچ کر الگ کریں گے جو ان میں سے رحمٰن کے خلاف سرکشی میں سخت تر تھا (69) پھر ہمیں بلاشبہہ ان کا خوب علم ہے جو اس (جہنم) میں جانے کے زیادہ لائق ہیں (70)

انسان کا موت کے بعد کی زندگی پر اظہارِ تعجب:

مارے دہشت کے کھڑے سے گر پڑیں گے اور چین سے بیٹھ بھی نہ سکیں گے، یہی گھٹنوں پر گرنا ہوا۔ اللہ پاک انسان کے حال کی خبر دیتا ہے کہ وہ تعجب کرتا ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کو بعید جانتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِن تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ﴾ [الرعد: ٥] ''اور اگر آپ تعجب کریں تو ان کا یہ کہنا عجیب تر ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم البتہ نئی پیدائش میں ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَوَلَمْ يَرَ

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٥٣١) فتح البيان (٨/ ١٨٠۔ ١٨٣)

الْاِنْسٰنُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴾ [يٰسٓ: ۷۷۔ ۷۹] ''کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکا یک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا۔ اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گے؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔''

اس جگہ اللہ پاک نے ﴿ وَيَقُوْلُ الْاِنْسٰنُ ... الخ﴾ فرمایا، لہٰذا یہ اس لیے ہے کہ اللہ پہلی بار پیدا کرنے سے دوسری بار پیدا کرنے پر استدلال فرماتا ہے۔ یعنی اللہ پاک نے آدمی کو با قاعدہ پیدا کیا اور وہ کچھ چیز نہ تھا، پس کیا اب وہ اس کو دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا، حالانکہ اب تو وہ کچھ چیز ہو چکا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ۲۷] ''اور وہی (اللہ) ہے جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے گا، اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔''

صحیح میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھ کو آدم کے بیٹے نے جھٹلایا اور اس کو یہ زیبا نہ تھا کہ مجھے جھٹلائے، اور ایذا دی مجھ کو آدم کے بیٹے نے اور اسے زیب نہیں دیتا تھا کہ مجھے ایذا دے۔ اس کا مجھ کو جھٹلانا یہ کہنا ہے کہ ہرگز مجھے دوبارہ پیدا نہ کرے گا، جیسا کہ پہلی بار اس نے مجھے پیدا کیا، حالانکہ میرے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ کے پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے اور اس کا مجھ کو ایذا دینا، یہ کہنا ہے کہ میرے واسطے بیٹا ہے، حالانکہ میں ایک ہوں، اکیلا ہوں، نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا گیا اور نہ ہی اس کے جوڑ کا کوئی اور ہے۔[1]

﴿ فَوَرَبِّكَ ... الخ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ رب تبارک و تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریمہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ وہ ضرور اُن سب کو اور اُن کے شیطانوں کو جمع کرے گا کہ جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے۔ عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ جِثِيًّا ﴾ سے مراد ''قعودا'' ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ﴾ [الجاثية: ۲۸] ''اور آپ ہر امت گھٹنوں کے بل (گری) دیکھیں گے۔''[2] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ''قِيَامًا'' ہے، اسی کے مثل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[3]

﴿ شِيْعَةٍ ﴾ سے مراد اُمت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں[4] اور اُمت ہر جنس جاندار کے ایک گروہ کو کہتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیتِ کریمہ ﴿ لَنَنْزِعَنَّ ... الخ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ ان کو آخر پر روکے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٧۔ ٢٢٨)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٦) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٨)

گا (ابن کثیر کا لفظ "يحبس" اور فتح البیان کا لفظ "يحشر" ہے) یہاں تک کہ جب گنتی پوری ہو جائے گی تو ان سب کے پاس آئے گا (ابن کثیر کا لفظ "أتاهم" اور فتح البیان کا لفظ "آثارهم" ہے۔ واللہ أعلم) پھر شروع کر کے جرم کے لحاظ سے اکابر فالاکابر کے ساتھ، یعنی جرم میں جو لوگ بہت بڑے ہیں، ترتیب وار اُن سے شروع کرے گا، سب سے بڑھ کر جو مجرم ہوگا اول وہ، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم، اسی طرح آخر تک۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے اسی آیت کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ البتہ ہم جدا کریں گے ہر دین والوں سے ان کے سرداروں اور رئیسوں کو (اصل کا لفظ "قادتهم و رؤساءهم" ہے) جو شر میں اُن کے حاکم تھے اور اسی طرح ابن جریر رحمہ اللہ نے اور سلف میں سے بہت لوگوں نے کہا ہے اور یہ اللہ پاک کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿38﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴾[2] [الأعراف: ٣٨۔ ٣٩] "یہاں تک کہ جب اس میں وہ سب اکٹھے ہوں گے تو ان کی دوسری جماعت ان کی پہلی جماعت کے بارے میں کہے گی: اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، لہٰذا تو انھیں آگ کا دوگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا: (تم میں سے) ہر ایک کے لیے دوگنا (عذاب) ہے، مگر تم نہیں جانتے۔ اور ان کی پہلی جماعت ان کی دوسری جماعت سے کہے گی: تمھیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، چناں چہ تم اس کے بدلے میں عذاب (کا مزہ) چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے تھے۔"

قولہ تعالیٰ ﴿ ثُمَّ لَنَحْنُ... الخ﴾ میں ﴿ ثُمَّ ﴾ خبر پر عطف کے لیے ہے۔ خبر پر مراد یہ ہے کہ اللہ پاک خوب جانتا ہے اس شخص کو جو بندوں میں سے اس بات کا مستحق ہے کہ جہنم کی آگ میں جلے اور ہمیشہ اس میں رہے اور اس شخص کو جو دگنے عذاب کا مستحق ہے، جیسا کہ گذشتہ آیت میں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ انسان سے مراد کافر ہے اس لیے کہ یہاں سوالیہ انداز بعض کے انکار، استہزاء اور تکذیب کرنے کے واسطے ہے، یعنی جو آدمی مر کر جینے کا انکار کرے اور اس کو جھٹلائے اور اُس سے مسخرا پن کرے، پس ایسا آدمی کافر ہی ہوتا ہے نہ کہ مومن۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان سے مراد عاص بن وائل ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ابی بن خلف یا ولید بن مغیرہ، جس کے حق میں آیت نازل ہوئی ہے اور یہ من جملہ اس عام کے لیے ہے جس سے خاص مراد ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْاِنْسَانُ ﴾ میں الف و لام ساری جنس کے لیے ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٧٦) الدر المنثور (٥/ ٥٣٣) فتح البیان (٨/ ١٨٥)

[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٧٦۔ ١٧٧) الدر المنثور (٥/ ٥٣٣) [3] الدر المنثور (٥/ ٥٣٢)

گو اس بات کو نہیں کہا مگر اُن میں سے بعض نے اور وہ بعض کفار ہیں، اس لیے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو فعل ایک جماعت میں سے کسی ایک کے ساتھ قائم ہوتا ہے اس کی نسبت جماعت کی طرف کر دیتے ہیں، غرضیکہ کچھ بھی ہو، انسان کا لفظ مومنین کو شامل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کافر کہتا ہے: کیا جب میں مر گیا تو پھر جی کر قبر سے نکلوں گا، جیسے کہ محمد ﷺ کہتے ہیں، یعنی میں مرنے کے بعد زندہ نہ ہوں گا، کیوں کہ استفہام بہ معنی نفی ہے۔ کلمہ ﴿حَيًّا﴾ حالِ موکدہ ہے، اس لیے کہ اس کے قبر سے نکلنے کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ وہ زندہ ہو۔ لہٰذا جب قبر سے نکلنے سے زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پھر "حیًّا" ذکر کیا تو یہ اس کی تاکید ٹھہری۔ اور یہ اس آیت کے مثل ہے:
﴿وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا﴾ [مریم: ٣٣] "اور جس دن میں زندہ (کر کے) اُٹھایا جاؤں گا۔"

آیتِ کریمہ: ﴿أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ ... الخ﴾ میں ہمزہ انکار توبیخی کے لیے ہے اور حرفِ واؤ جملے کے عطف کے لیے ہے۔ دوسرے جملۂ مقدر پر عبارت یہ ہے: "أَيَقُوْلُ ذلك ولا يذكر" اور "من قبل" کے معنی ہیں "من قبل بعثه" یعنی اس کے بعث سے پہلے اور امام زمخشری رحمہ اللہ نے یوں تقدیر کی ہے کہ پہلے اس حالت کے جس پر کہ وہ اب ہے اور وہ اس کے بقا کی حالت ہے؟[1] اور یہاں ذکر سے مراد اِعمالِ فکر ہے، یعنی فکر سے کام لینا ہوگا کہ کافر انسان نے دوبارہ جی کر اُٹھنے کا انکار کیا اور اس کو جھٹلایا اور اس سے مسخرا پن کیا تو اللہ پاک نے اس کے مقابلے میں ڈانٹنے، دھمکانے اور گھڑکنے کے بعد، انکارِ توبیخی ذکر فرما کر یوں ارشاد فرمایا: کیا یہ بعث کا منکر یہ بات کہتا ہے اور اپنی اول پیدایش میں غور وفکر نہیں کرتا، کہ ہم نے اس سے پہلے اس کو بنایا، حالانکہ وہ اس وقت ہرگز کوئی شے نہ تھا من جملہ اشیا کے۔ لہٰذا استدلال کرے پہلی دفعہ پیدا ہونے سے دوبارہ پیدا کیے جانے پر، حال یہ ہے کہ پہلی دفعہ کا پیدا کرنا زیادہ عجیب وغریب ہے دوبارہ پیدا کرنے سے، کیونکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا تو اس مخلوق کا عدم سے نکالنا تھا وجود کی طرف بغیر کسی سابق مثال اور مادہ اور مدت کے۔ رہا دوسری دفعہ پیدا کرنا سو اس پر پہلی دفعہ پیدا کرنا واقع ہو چکا اور وہ اس کے لیے ایک مثال بن چکا ہے، پس جو شے کہ موجود ہو چکی، پھر اس کا دوبارہ پیدا کرنا زیادہ تر آسان اور سہل تر ہے۔

﴿ءَإِذَا﴾ کو دو طرح پڑھا ہے ہمزۂ استفہام کے ساتھ اور ہمزۂ استفہام کے بغیر خبر کی بنا پر۔ اور ﴿يَذْكُرُ﴾ کو تین طرح پڑھا ہے، پہلے "يَذْكُرُ" ذال معجمہ کی تخفیف کے ساتھ، دوسرے "يَذَّكَّر" ذال معجمہ اور کاف کی شد کے ساتھ، تیسری "يَتَذَكَّر" یہ دوسری قراءت کی اصل ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے یہ حجت بیان فرمائی جس پر دانش مندوں کا اجماع اور اتفاق ہے کہ بعث کی دلیلوں میں اس سے زیادہ مضبوط کوئی دلیل نہیں تو اپنے پاک نام کی قسم کھا کر اس کی تاکید کی، پھر اپنے نام کو اپنے رسول کی طرف مضاف کیا اس کی تعظیم اور تشریف کے لیے۔ قسم کے ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ اس سے حجت مذکورہ کی تاکید کرنا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک جاری عادت

[1] الکشاف (٣/ ٣٤)

ہے کہ خبر کی تاکید قسم سے کیا کرتے ہیں۔

﴿ وَالشَّيٰطِيْنَ ﴾ میں حرفِ واو عطف کے لیے ہے یا بمعنی مع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پس قسم ہے تیرے رب کی البتہ ہم کھینچ لائیں گے بعث کا انکار کرنے والوں کو محشر کی طرف ان کو قبروں سے زندہ کرکے نکالنے کے بعد جیسے وہ تھے اور شیطانوں کو یا اُن کو اُن کے شیطانوں کے ساتھ جنھوں نے ان کو بہکایا اور گمراہ کیا تھا ایک زنجیر میں۔ یہ معنی اس بنیاد پر ظاہر ہیں کہ ﴿ الْاِنْسٰنُ ﴾ میں الف اور لام عہد کا ہے اور وہ انسان کافر ہے اور اس بنا پر کہ الف اور لام کو جنس کے طور پر ٹھہرائیں تو بھی معنی ظاہر ہیں، اس لیے کہ جنس انسان میں وہ لوگ پائے گئے ہیں جو اپنے شیطانوں کے ساتھ حشر کیے جائیں گے۔

﴿ جِثِيًّا ﴾ جمع ہے جاثی کی۔ جاثی کہتے ہیں گھٹنوں پر بیٹھنے والے کو۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ جِثِيًّا ﴾ سے مراد جماعتیں ہیں۔ اصل میں یہ "جثوہ" کی جمع ہے۔ "جثوہ" مٹی اور پتھر جمع کیے ہوئے کو کہتے ہیں۔ یعنی پھر حاضر کریں گے ہم ان کو دوزخ کے گرد، اس کے باہر دوزخ میں داخل ہونے سے قبل یا اس کے اندر سے، اس حال میں کہ وہ اپنے گھٹنوں پر گرے ہوں گے، اس لیے کہ موقف اور حشر کی ہولناکیوں اور دہشت اور حساب کا ڈر اُن کو پہنچے گا یا اس لیے کہ گھٹنوں پر بیٹھنا اہلِ موقف کی شان اور اُن کا حال ہوگا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ﴾ [الجاثية: ٢٨] "اور آپ ہر امت گھٹنوں کے بل (گری) دیکھیں گے۔" یا اس حال میں کہ وہ گروہ گروہ ہوں گے۔

﴿ شِيْعَةٍ ﴾ سے مراد امت اور فرقہ اہلِ دین و ملت ہے کافروں سے۔ اور شیعہ وہ گروہ ہے جو دینوں میں سے کسی دین کی پیروی کرے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے شیعہ کو خاص کیا ہے کہ شیعہ وہ گروہ ہے جو گمراہوں میں سے کسی گمراہ کی پیروی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ﴾[1] [الأنعام: ١٥٩] "بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ بازی کی، اور وہ گروہوں میں بٹ گئے۔" اور "عِتِيّ" اس جگہ مصدر ہے "عُتُوّ" کی طرح۔ "عُتُوّ" عصیان اور نافرمانی میں تمرد اور سرکشی کرنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ "عِتِيّ" سے مراد نافرمانی اور جرأت ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "عِتِيّ" سے مراد معصیت و عصیان ہے،[2] کیوں کہ اللہ تعالیٰ غیّ اور فساد کے گروہوں سے اس شخص کو کھینچے گا جو اُن میں سے زیادہ تر عاصی اور نافرمان اور سرکش ہوگا، پھر جب وہ جمع ہو جائیں گے تو اُن کو جہنم میں پھینک دے گا۔

لفظ ﴿ اَشَدُّ ﴾ کا ذکر کرنے سے مقصد آگاہ کرنا ہے اس بات پر کہ اللہ پاک بہت سے گناہ گاروں سے عفو اور درگزر فرمائے گا۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ آیت سے مومنوں اور کافروں کے فرقے مراد ہیں اور اگر کفار کے ساتھ خاص ہے تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ پاک کفار کے گروہوں میں سے جدا کرے گا، اُن میں سے سب سے زیادہ سرکش کو،

[1] الكشاف (٣/ ٣٥) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢٨)

پھر اس سے کم سرکش کو اور اُن کو ترتیب وار آگ میں ڈال دے گا یا اُن میں سے ہر ایک کو اس طبقے میں داخل کرے گا، جس کا وہ مستحق ہے۔ ﴿ اَيُّهُمْ ﴾ کے اعراب میں نحویوں کا بہت طویل کلام ہے اور بہت سے قول ہیں۔ ان میں سے جمہور معربین کے نزدیک اور وہ سیبویہ کا مذہب ہے، سب سے ظاہر قول یہ ہے کہ ﴿ اَيُّهُمْ ﴾ موصولہ ہے بمعنی "اَلَّذِيْ" اور حرکت اس کی حرکتِ بنا ہے اور ﴿ اَشَدُّ ﴾ خبر ہے مبتداء مضمر کی اور جملہ صلہ ہے "أيّ" کے واسطے اور ﴿ اَيُّهُمْ ﴾ اپنے صلہ کے ساتھ محلِ نصب میں ہے اور مفعول بہ ہے ﴿ لَنَنْزِعَنَّ ﴾ کا اور ﴿ عِتِيًّا ﴾ تمیز محول ہے مبتداء محذوف سے جو "هُوَ أَشَدُّ" ہے۔ "أَيّ عُتُوُّهُ أَشَدُّ مِنْ عُتُوِّ غَيْرِهٖ"۔

﴿ صِلِيًّا ﴾ کو ص کی زیر اور پیش کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور دونوں قراءتِ سبعیہ میں سے ہیں۔ صراح میں کہا ہے: "صلی بالکسر والضم سوختن بآتش" (آگ سے جلانا)۔ ابن جریج نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ کون سا ان میں سے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا زیادہ ترحق دار اور لائق ہے۔[1] آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ گویا از روئے سرکشی رحمن پر زیادہ ترسخت ہیں اور زیادہ تر لائق ہیں ساتھ "صلی"، جہنم کے، یا وہ آگ میں ڈالے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔[2]

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿71﴾
ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿72﴾

اور تم میں سے جو بھی ہے، وہ اس (جہنم) پر وارد ہونے والا ہے، یہ آپ کے رب کے ذمے حتمی (اور) طے شدہ بات ہے (71) پھر ہم متقی لوگوں کو نجات دیں گے، اور ہم ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے (72)

جہنم کے اوپر سے ہر شخص کا گزر اور پرہیزگاروں کا نجات پانا:

بہشت کا راستہ دوزخ کے منہ میں سے ہو کر جاتا ہے، دوزخ تنور کی شکل ہے، منہ اس کا دنیا سے بڑا، کنارے سے کنارے تک راستہ بنا ہے، بال کی طرح باریک اور تلوار کی طرح تیز اور کانپتا ہوا۔ ایمان والے اس پر سے بہ سلامت گزر جائیں گے اور گنہگار گر پڑیں گے، پھر عمل کے موافق کئی روز کے بعد نکلیں گے سفارش سے، اور اللہ ارحم الرحمین کی مہربانی سے۔ آخر جس نے کلمہ سچے دل سے کہا ہے، وہ سب نکلیں گے اور کافر رہ جائیں گے، پھر اس کا منہ بند ہو جائے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ مِنْكُمْ ﴾ کا خطاب لوگوں کو ہے، اس صورت میں التفات نہ ہوگا یا خطاب انسان منکر کو ہے، اس بنیاد پر التفات ہوگا، کیوں کہ اس سے پہلے سب ضمیریں غائب کی ہیں اور اب اس انسان کو مخاطب کیا

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٢٩) [2] فتح البیان (٨/ ١٨٣۔ ١٨٦)

تو غائب سے حاضر کی طرف التفات ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ خطاب کفار کو ہے، یہ تین قول ہوئے۔ ﴿ مِنْكُمْ ﴾ کے بجائے "منھم" بھی پڑھا گیا ہے، ان آیتوں کی مناسبت سے جو اس سے پہلے ہیں، اس لیے کہ وہ کفار کے بارے میں ہیں اور وہ آیتیں یہ ہیں: ﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ﴾ [مریم: ٦٨] "پس آپ کے رب کی قسم! ہم ضرور اُن (کفار) کو شیطانوں کے ہمراہ اکٹھا کریں گے۔"

امام عکرمہ رحمہ اللہ اور ایک جماعت نے اسی طرح پڑھا ہے،[1] لیکن اکثر لوگ اس پر ہیں کہ مخاطب سارے عالم کے لوگ ہیں، معنی یہ ہوئے کہ تم میں سے کوئی مسلم یا کافر ایسا نہیں ہے جو اس پر وارد نہ ہو، یعنی واصل و داخل نہ ہو۔ ﴿ وَارِدُهَا ﴾ کی ضمیر دوزخ کی طرف پھرتی ہے یا روزِ قیامت کی طرف، پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ورود کے معنی فارسی میں در آمدن و بہ آب آمدن (مطلق آنا اور گھاٹ پر آنا) ہیں۔ اس ورود میں مفسرین کا اختلاف ہے، لہٰذا بعض کا قول تو یہ ہے کہ ورود کے معنی داخل ہونا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی رو سے: ﴿ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ﴾ [الأنبياء: ٩٩] "اگر یہ (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے۔" کیونکہ یہاں ورود کے معنی دخول کے ہیں، لیکن یہ دخول کافروں کے ساتھ خاص ہے۔ اس لیے کہ ایک قراءت میں "وَاِنَّ مِنْهُمْ" اور مشہور قراءت ﴿ وَاِنْ مِنْكُمْ ﴾ التفات پر محمول ہوگی، یعنی خطاب کی صورت میں بھی وہی کفار مراد ہوں گے، جن کا ذکر اس سے پہلے ہے اور انبیاء و مرسلین علیہم السلام مستثنیٰ ٹھہریں گے اور ایمانداروں پر وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی جس طرح ابراہیم علیہ السلام پر ہوگئی تھی۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَارِدُهَا ﴾ کے بجائے "دَاخِلُهَا" پڑھا ہے۔ اور اُن سے یہ بھی مروی ہے کہ ان کا ورود پلِ صراط پر ہے۔[2] ایک فرقے نے یوں کہا کہ ورود سے مراد پلِ صراط پر سے گزرنا ہے، کیونکہ وہ جہنم پر کھینچا اور بچھایا گیا ہے۔ لہٰذا اہلِ جنت تو صحیح سلامت رہیں گے اور دوزخ والے دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔ اس بنا پر انبیا اور مرسلین مستثنیٰ نہ ہوں گے، بلکہ ساری خلق اس پر سے گزرے گی۔ یہ قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام کعب احبار اور سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ مومن کا آگ پر ورود تپ (بخار) کا اس کے جسم کو دنیا میں چھونا ہے۔[3] اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تپ ہر مومن کا آگ میں سے حصہ ہے،[4] اس قول میں بُعد ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ ورود سے مراد دخول نہیں ہے وہ تو ایسا ہے، جیسے تو کہے: "وردت البصرة ولم أدخلها"، یعنی میں بصرے میں وارد ہوا اور اس میں داخل نہیں ہوا۔ اور بہت سے علما نے اس ورود کی تحقیق سے توقف فرمایا ہے اور اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی دلیل سے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٣٨) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣١۔ ٢٣٢) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٣)
[4] كشف الأستار عن زوائد البزار (١/ ٣٦٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٢١)

لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۱] ''بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی اور بھلائی مقدر ہو چکی ہے، وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔'' کہا: پس وہ شخص آگ میں داخل نہ ہوگا جس کو آگ سے دور رکھنے کا اللہ ضامن ہوا ہے۔ اور لوگوں نے اس کا یوں جواب دیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ آگ میں عذاب ہونے اور اس کے ساتھ جلنے سے دور رہیں گے۔ لہٰذا جو شخص کہ آگ میں داخل ہوا اس حال میں کہ وہ آگ کا شعور نہیں رکھتا نہ اس سے کسی طرح غم دُکھ درد کا احساس رکھتا ہے تو وہ اس سے دور ہی ہے۔ ایک فرقے کا قول یہ ہے کہ وارد ہونے سے مراد اشراف واطلاع وقرب ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ لوگ حساب کی جگہ میں حاضر ہوں گے اور وہ جہنم کے قریب ہوگی، پس حساب کی حالت میں اس کو دیکھیں گے اور اس کی طرف نظر کریں گے، پھر اللہ پاک نجات دے گا ان لوگوں کو جو اس چیز سے ڈرے جس کو انھوں نے دیکھا، یعنی دوزخ سے ان کو بچا لے گا اور جنت کی طرف ان کو لے جائیں گے، چنانچہ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اس بات کی دلیلوں میں سے ایک دلیل کہ وارد ہونے سے داخل ہونا لازم نہیں ہوتا، اللہ پاک کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ﴾ [القصص: ۲۳] ''اور جب وہ مدین کے پانی (کنویں) پر پہنچا'' کیونکہ مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ماء مدین پر مطلع ہوئے نہ یہ کہ اس میں داخل ہوئے۔ یہ کہنا کہ ورود سے مراد پل صراط پر سے گزرنا یا جہنم پر وارد ہونا ہے اس حال میں کہ وہ خامد ہوگی، یعنی شعلہ زن نہ ہوگی، لہٰذا ضروری ہے کہ اس قول میں کتاب وسنت کے دلائل کو جمع کیا جائے۔ پس لائق یہی ہے کہ اس آیتِ کریمہ کو اسی پر محمول کریں، کیوں کہ ان دونوں باتوں کا جمع ہونا حاصل ہوگیا، یعنی وارد ہونے کو داخل ہونے پر محمول کرنا، باوجود اس کے کہ اس میں داخل ہونے والے مومن اس کے عذاب سے دور رہیں گے یا ورود کو اس پل پر سے گزرنے پر محمول کرنا، جو آگ پر نصب کیا ہوا ہے اور وہ پل صراط ہے اور اس پر سے بہ سلامت گزر جانا جہنم سے دور رہنا ہی ہے۔ اس کے بعد فتح البیان میں چند احادیث وآثار نقل کیے ہیں، جن کا ذکر ابن کثیر میں سے اور چیزوں کے ساتھ بعد میں آئے گا۔

پھر جبکہ عذاب نہ ہوا تو مومنین کے دوزخ میں داخل ہونے کا کیا فائدہ ہے، اس کی کئی وجہیں ذکر کی ہیں، ایک یہ ہے کہ آگ میں داخل ہونا ان کے سرور کو زیادہ کرے گا، جب کہ وہ آگ سے اپنی خلاصی جان لیں گے۔ دوسری یہ وجہ ہے کہ ان کا گزر دوزخ والوں پر سے ہوگا، وہ دیکھیں گے کہ مومنین تو اس سے خلاصی پا رہے ہیں اور وہ اس میں باقی ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جس وقت کفار پر وہ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو ایک سبب ہو جائے گا جنت کی نعمتوں کے ساتھ مزید لذت اُٹھانے کا۔ پھر صریحاً برائے اَدب یہ نہیں کہتے کہ انبیا آگ میں داخل ہوں گے، لیکن یہ کہتے ہیں کہ ساری خلق نار میں داخل ہوگی، جیسے کہ احادیثِ باب اس پر دلالت کرتی ہیں۔ سو گناہ گار اپنے گناہوں کے سبب سے آگ میں داخل ہوں گے اور اولیا وسعدا (نیک بخت) اُن کی شفاعت کرنے کے لیے اس میں داخل

ہوں گے، پس دونوں کے داخل ہونے میں بڑا فرق ہے۔

﴿ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کا وارد ہونا ایک حتمی اور لازمی امر ہے۔ اللہ پاک حکم کر چکا ہے کہ وہ ضرور بالیقین واقع ہوگا۔ یہ لزوم اور وجوب حکمتِ الٰہی کے تقاضا کے طور پر ہے نہ یہ کہ کسی اور نے اس کو واجب کیا ہے۔ امام مجاہد نے کہا: ﴿ مَّقْضِيًّا ﴾ کے معنی "قضاء من الله" ہیں۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "قسما واجبا"[2] اشاعرہ نے کہا ہے کہ ورود کو واجب کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اس لیے کہ اس کے وعدے کا خلاف ہونا محال ہے، یعنی جب وعدے کا خلاف کرنا محال ٹھہرا تو بمنزلہ واجب کے ہوا۔

فرقہ معتزلہ نے اس آیتِ کریمہ سے یہ دلیل لی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر عذاب کرنا واجب ہے اور اس امر پر کہ کبیرہ گناہ کرنے والا اور فاسق ہمیشہ کے لیے آگ میں رہے گا، اس سے کبھی نہ نکلے گا، اس دلیل سے کہ اللہ پاک نے بیان کر دیا کہ سب کے سب نار میں وارد ہوں گے، پھر اُن لوگوں کی صفت بیان کی جو نجات پائیں گے اور وہ متقی لوگ ہیں اور فاسق متقی نہیں ہے تو وہ ہمیشہ آگ میں باقی رہے گا۔ اس کا یوں جواب دیا ہے کہ متقی وہی ہے جو شرک سے بچے، سو کبیرہ گناہ والا متقی ہے، یعنی شرک سے بچنے والا ہے۔ پس وہ آگ سے نکلے گا، اس فرمان کی عمومیت کے سبب سے: ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾۔

ڈوب مرنے کی بات ہے کہ جس آیت کو انھوں نے اپنے وہم کی دلیل بنایا تھا وہی آیت اُن کے قول کے غلط ہونے پر قوی تر دلیل ہوگئی۔ "فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ"۔ یہ بات تو بحث کے طور پر تھی۔ رہی نص کی حقیقت تو کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن موحد آگ سے نکالا جائے گا، یہ حدیثیں معروف و مشہور ہیں۔ ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾ یعنی پھر ہم نکالیں گے آگ سے اُن لوگوں کو جو ان باتوں سے بچے جو آگ کو واجب کرتی ہیں اور وہ اللہ پاک کے ساتھ کفر کرنا ہے، یعنی اس کا منکر ہونا اور اس کی نافرمانیاں ہیں اور اس چیز کو چھوڑ دینا ہے جس کو اس نے مشروع کیا ہے اور اس پر عمل کرنا واجب فرمایا، لہٰذا ایسے لوگ آگ میں داخل ہونے کے بعد ہمیشہ کو اس میں نہ رہیں گے، بلکہ اپنے کیے کی سزا پا کر اس میں سے نکلیں گے اور خلدِ بریں میں داخل کیے جائیں گے۔

﴿ نُنَجِّي ﴾ کی جیم کو تخفیف اور تشدید کے ساتھ دونوں طرح پڑھا ہے اور دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ ﴿ وَنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾ یعنی چھوڑ دیں گے ہم ظالموں کو آگ میں گھٹنوں پر گرے ہوئے، جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، ایسا کام کر کے جو آگ کو واجب کرتا ہے یا اپنے غیر پر اس کی جان یا مال میں یا آبرو میں کسی طرح کا ظلم کیا۔ ﴿ جِثِيًّا ﴾ کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔[3]

1 ابو سمیہ کہتے ہیں کہ ہم نے ورود میں اختلاف کیا تو ہم میں سے بعض نے تو کہا کہ مومن آگ میں داخل نہ ہوگا

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٧) [2] فتح القدير (٣/ ٤٧٧) [3] فتح البيان (٨/ ١٨٦۔ ١٩٠)

اور بعض نے کہا کہ سب اس میں داخل ہوں گے، پھر اللہ اُن لوگوں کو نجات دے گا جو ڈرے۔ پھر میں جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے ملا تو میں نے اُن سے کہا کہ ہم نے ورود میں اختلاف کیا ہے۔ پس انھوں نے کہا کہ سب اس پر وارد ہوں گے اور ایک بار سلیمان (یہ سلیمان بن حرب امام احمد کے استاد ہیں) نے کہا ہے کہ سب اس میں داخل ہوں گے اور اپنی دونوں انگلیاں دونوں کانوں کی طرف دراز کیں۔ یعنی جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بہرے ہو جائیں اگر میں نے نہ سنا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ فرماتے تھے کہ نہ باقی رہے گا کوئی نیک اور نہ کوئی بد مگر وہ اس میں داخل ہوگا، لہٰذا وہ مومن پر برد اور سلام ہو جائے گی، جیسے ابراہیم علیہ السلام پر ہوگئی تھی، یہاں تک کہ آگ اُن کی ٹھنڈک سے ایک آواز نکالے گی اور فریاد کرے گی؛ "ثم ينجي الله الذين اتقوا ويذر الظلمين فيها جثيا"[1] (أخرجه الإمام أحمد، غريب ولم يخرجوه)

2 خالد بن معدان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جنت والے کہیں گے اس کے بعد کہ جنت میں داخل ہو گئے: کیا ہم سے ہمارے رب نے آگ پر وارد ہونے کا وعدہ نہ کیا تھا، فرمایا کہ تم تو اس پر سے گزر چکے اس حال میں کہ وہ خامد تھی، یعنی اس کا شعلہ ساکن تھا۔[2] (قاله الحسن بن عرفة)

3 قیس بن ابی حازم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اپنے سر کو اپنی بیوی کی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ پھر وہ روئے تو اُن کی بیوی بھی روئیں، کہا: تجھے کس بات نے رُلایا، بیوی نے کہا: میں نے تجھے روتا دیکھا تو میں بھی روئی، وہ بولے کہ میں نے تو اللہ عزوجل کا یہ قول یاد کیا: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ پس میں نہیں جانتا ہوں کہ کیا انھوں نے آگ سے نجات پائی یا نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔
(قاله عبد الرزاق)

4 امام ابو اسحٰق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابو میسرہ رحمہ اللہ جس وقت اپنے بچھونے کی طرف پناہ لیتے، یعنی آرام کے لیے بستر پر لیٹتے تو کہتے: اے کاش! مجھے میری ماں نہ جنتی، پھر روتے تو اُن سے کہا گیا کہ اے ابو میسرہ! تجھے کون سی بات رُلاتی ہے؟ وہ بولے کہ ہم کو خبر دی گئی ہے کہ ہم وارد ہونے والے ہیں آگ پر اور یہ خبر نہیں دیے گئے کہ ہم اس سے پھرنے والے ہیں۔[3] (أخرجه ابن جرير)

5 عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنے بھائی سے کہا: کیا تجھ کو یہ خبر آئی ہے کہ تو آگ پر وارد ہونے والا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: کیا تجھ کو یہ خبر آئی ہے کہ تو اس سے پھرنے والا ہے؟ کہا: نہیں، کہا: پھر کس بات میں ہنستا ہے؟ کہا: پھر ہنستا ہوا نہ دیکھا گیا، یہاں تک کہ اللہ سے جا ملا۔[4]

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٢٨) اس کی سند میں "ابو سمیہ" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٧٦١)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٠۔ ٢٣١) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٢۔ ٢٣١) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٤)

6 امام ابن عیینہ رحمہ اللہ عمرو سے روایت کرتے ہیں۔ عمرو کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے خبر دی جس نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا کہ وہ نافع بن ازرق سے جھگڑ رہے تھے۔ لہٰذا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ورود دخول ہے تو نافع بولے نہیں، پس عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۹۸] ''بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں، تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔'' وہ لوگ وارد ہوئے یا نہیں؟ نیز اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ﴾ [هود: ۹۸] ''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر انھیں آگ میں جا داخل کرے گا۔'' فرعون وارد ہوا یا نہیں؟ رہا میں اور تو سو ہم آگ میں داخل ہوں گے، پس تو دیکھ، کیا ہم اس سے خارج ہوں گے یا نہیں؟ اور میں نہیں دیکھتا ہوں اللہ کو کہ وہ تجھ کو اس سے نکالے بہ سبب تیرے جھٹلانے کے، اس پر نافع ہنس پڑے۔

7 ابو راشد حروری یعنی نافع بن ازرق نے کہا: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ﴾ [الأنبياء: ۱۰۲] ''وہ اس کی آہٹ (بھی) نہ سنیں گے۔'' اس پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تیری خرابی ہو کیا تو مجنون ہے؟ کہاں گیا اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ﴾ [هود: ۹۸] ''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر انھیں آگ میں جا داخل کرے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴾ [مريم: ۸۶] ''اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے (ہی) ہانک لے جائیں گے۔'' ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ﴾ (آیتِ باب)۔ ''والله إن كان دعاء من مضى، اللهم أخرجني من النار سالما و أدخلني الجنة غانما'' یعنی قسم ہے اللہ کی! بے شک گزرے ہوئے شخص کی یہ دعا تھی کہ الٰہی! تو مجھے آگ سے صحیح سالم نکال اور مجھے جنت میں غنیمت لیے ہوئے داخل کر۔[1] (رواه ابن جرير)

8 امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا کہ ان کے نزدیک ایک شخص آیا، جس کو ابو راشد کہتے ہیں اور وہ نافع بن ازرق ہے، سو اس نے ان سے کہا: اے عبداللہ بن عباس! تو مجھے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں خبر دے: ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴾ (آیتِ باب)۔ فرمایا رہا میں اور تو اے ابو راشد! سو ہم اس پر وارد ہوں گے، پس تو دیکھ کیا ہم اس سے پھریں گے یا نہیں۔ (أخرجه ابن جرير)

9 عبداللہ بن سائب اس شخص سے روایت کرتے ہیں، جس نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا کہ وہ اس آیت کو پڑھتے تھے: ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ﴾ یعنی کفار۔ (قاله أبو داود الطيالسي) اور اسی طرح عمر بن ولید بستی نے

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۲۳۰)

روایت کیا کہ انھوں نے امام عکرمہ رحمہ اللہ کو سنا کہ وہ اس کو اس طرح پڑھتے تھے: "وإن منهم إلا واردها"
کہا کہ وہ لوگ ظالم ہیں، ہم اس کو اسی طرح پڑھتے تھے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن جریر)

10 عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیتِ کریمہ: ﴿ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، یعنی بر و فاجر، یعنی نیک اور بد سب نار میں وارد ہوں گے کیا تو فرعون کے واسطے اللہ تعالیٰ کے اس قول کو نہیں سنتا: ﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ﴾ [هود: ٩٨] "وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر انھیں آگ میں جا داخل کرے گا۔" نیز فرمایا: ﴿ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ إِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴾ [مريم: ٨٦] "اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے (ہی) ہانک لے جائیں گے۔"[2]

11 مرہ رحمہ اللہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: ﴿ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آگ میں سب کے سب وارد ہوں گے، پھر اپنے اعمال کے سبب اس سے رجوع کریں گے۔[3] (أخرجه الإمام أحمد قال ثنا عبد الرحمن عن إسرائيل عن السدي عن مرة عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه و رواه الترمذي عن عبد بن حميد عن عبيد الله عن إسرائيل عن السدي به و رواه من طريق شعبة عن السدي عن مرة عن ابن مسعود مرفوعاً هكذا وقع هذا الحديث ههنا مرفوعا)

12 عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب کے سب لوگ پل صراط پر وارد ہوں گے اور اُن کا ورود آگ کے اردگرد کھڑا ہونا ہے۔ "ثم يصدرون على الصراط بأعمالهم" یعنی پھر وہ اپنے اعمال کے سبب سے پل صراط پر صادر (نکل جانے والے) ہوں گے، لہٰذا اُن میں کوئی تو ایسا ہے کہ بجلی کی طرح گزر جائے گا اور کوئی اُن میں سے ہوا کی طرح گزر جائے گا اور کوئی پرندوں کی طرح گزر جائے گا، کوئی تیز تر گھوڑے کی طرح گزر جائے گا اور کوئی تیز تر اونٹ کی طرح گزر جائے گا، کوئی دوڑتے ہوئے آدمی کی طرح گزرے گا، یہاں تک کہ آخر گزرنے والا وہ شخص ہوگا کہ جس کا نور اس کے دونوں پاؤں کے انگوٹھوں کی جگہ پر ہوگا، وہ گزرے گا تو پل اس کے ساتھ مائل ہوگا۔ "وَالصِّرَاط دَحْضٌ مَزِلَّةٌ" یعنی اور پل پاؤں پھسلنے کی جگہ ہے، اس پر کانٹے ہیں، جیسے قتاد (ایک خار دار درخت، جس کے کانٹے بہت سخت ہوتے ہیں) کے کانٹے، اس کے دونوں جانب فرشتے ہیں، ان کے پاس آگ کے آنکڑے ہیں، وہ ان سے لوگوں کو جھپٹ لیں گے۔[4] (رواه أسباط عن السدي عن مرة عن ابن مسعود رضي الله عنه و ذكر تمام الحديث رواه ابن أبي حاتم)

13 عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پل صراط جہنم پر ہے تلوار کے باڑھ کی طرح۔ پس پہلا طبقہ بجلی کی طرح گزرے گا،

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٢۔ ٢٣٣) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٧)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٠)
[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦٠) مسند أحمد (١/ ٤٣٤) السلسلة الصحيحة (٣١١)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ١٧٨)

دوسرا ہوا کی طرح، تیسرا تیز تر گھوڑے کی طرح، چوتھا تیز تر چوپائے کی طرح، پھر وہ گزریں گے اور فرشتے کہیں گے: ''اللهم سلم سلم'' ''اے اللہ سلامت رکھ، اے اللہ سلامت رکھ۔''[1] (رواه ابن جرير و لهذا شواهد في الصحيحين وغيرهما من رواية أنس و أبي سعيد و أبي هريرة و جابر وغيرهم عن الصحابة رضی اللہ عنہم)

14 غنیم بن قیس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ورودِ نار کا ذکر کیا تو کعب نے کہا: ''تمسك النار للناس كأنها متن إهالة'' یعنی لوگوں کو آگ پکڑ لے گی، گویا وہ گلائی ہوئی چربی کی پیٹھ ہے، یہاں تک کہ اس پر خلائق کے پاؤں برابر ہو جائیں گے نیک ان کے اور بد اُن کے، پھر اس کو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ تو اپنے یاروں کو پکڑ لے اور میرے یاروں کو چھوڑ دے، کہا: پھر وہ دھنسا لے گی اپنے ہر یار کو، وہ ان کو اچھی طرح جانتی ہے، یہاں تک کہ جیسے باپ اپنے بچے کو جانتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور مومنین نکل آئیں گے، اس حال میں کہ ان کے کپڑے تر ہوں گے۔ کعب نے کہا کہ جہنم کے داروغے کے دونوں مونڈھوں کے درمیان جو مسافت ہے، وہ اس کے خازنوں سے سال بھر کی راہ ہے، ان میں سے ہر ایک کے ہمراہ ایک دوشاخہ ستون ہے، وہ اس سے ایک دھکا دے گا تو اس سے سات لاکھ لوگوں کو آگ میں پچھاڑ دے گا۔[2] (أخرجه ابن جرير)

15 حفصہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک میں البتہ اُمید کرتا ہوں کہ آگ میں ان شاء اللہ ان لوگوں میں سے کوئی داخل نہ ہوگا جو بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوا۔ حفصہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ﴾ کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾[3] (أخرجه الإمام أحمد)

16 اُم مبشر زوجہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ پس فرمایا کہ جو شخص بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوا، وہ آگ میں داخل نہ ہوگا۔ حفصہ رضی اللہ عنہا بولیں: کیا اللہ نہیں فرماتا: ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾[4]

(أخرجه الإمام أحمد أيضا)

17 صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی ایک مسلمان کے تین بچے اگر فوت ہو جائیں تو اس کو آگ صرف حلال کرنے، یعنی قسم کھولنے کی حد تک ہی چھوئے گی۔[5]

---

1 تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٢) صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠١، ٧٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣، ١٨٢، ١٩١)
2 تفسير الطبري (١٨/ ٢٣١) 3 سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٨١) مسند أحمد (٦/ ٢٨٥) السلسلة الصحيحة (٢١٦٠)
4 مسند أحمد (٦/ ٣٦٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٦٠)
5 صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٢)

18 عبدالرزاق نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کے تین بچے مرے اس کو آگ صرف تحلۂ قسم کے لیے چھوئے گی،[1] یعنی ورود۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: « إِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ » تا کی زبر اور حا کی زیر اور لام کی تشدید اور قسم پر دو زبریں۔ یہ ایک مثل ہے جو نہایت قلیل درجے میں بولی جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس کام پر قسم کھائی ہے، اس میں سے اس قدر کرے جس سے قسم سچی ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو آگ نہ چھوئے گی مگر ادنیٰ سا چھونا مثل تحلۂ قسم حالف کے اور تحلۂ قسم سے مراد آگ پر وارد ہونا ہے اور اس پر سے گزرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا اندازہ "ولا تحلة القسم" ہے، یعنی اس کو ہرگز آگ نہ چھوئے گی اور نہ بقدر یسیر واسطے تحلۂ قسم کے۔

19 ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت کی ہے کہ سنا میں نے رسول اللہ ﷺ کو، فرماتے تھے کہ نہیں مرتے کسی مسلمان کے تین بچے مگر چھوئے گی اس کو آگ صرف تحلۂ قسم کے واسطے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویا آپ ﷺ کی مراد یہ آیت ہے: ﴿ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾[2]

20 ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نکلے کہ اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کی عیادت فرمائیں، جس کو تپ (بخار) آ گیا تھا اور میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وہ میری آگ ہے میں اسے اپنے بندے پر مسلط کرتا ہوں، تا کہ ہو جائے وہ حصہ اس کا آخرت کی آگ میں سے۔[3] (غريب ولم يخرجوه من هذا الوجه)

21 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ تپ ہر مومن کا آگ میں سے حصہ ہے، پھر پڑھا: ﴿ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾[4]

22 سیدنا معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص پڑھے: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص: ۱] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: وہ اللہ ایک ہے۔'' یہاں تک کہ اس کو دس بار ختم کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک محل بنائے گا۔ عمر رضی اللہ عنہ بولے: اب تو ہم بہت محل حاصل کر لیں گے اے اللہ کے رسول! تو آپ ﷺ نے فرمایا: « اَللّٰهُ أَكْثَرُ وَأَطْيَبُ » یعنی اللہ پاک بڑا عطا کرنے والا ہے، اس کے ہاں کسی طرح کی کمی نہیں ہے۔[5] نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں ہزار

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٢) مصنف عبدالرزاق (١١/ ١٣٩) (2) مسند الطيالسي (١/ ٣٠٤)

(3) تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٨٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٧٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٥٧)

(4) تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٣) (5) مسند أحمد (٣/ ٤٣٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٨٩)

آیتیں پڑھے تو وہ قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ہمراہ لکھا جائے گا؛ "وحسن أولئك رفيقا إن شاء الله" یعنی یہ کیا اچھا ساتھ ہے۔[1] اور جو شخص مسلمانوں کی اللہ کی راہ میں حراست کرے؛ "مُتَطَوِّعًا لَا بِأَجْرِ سُلْطَان" یعنی اپنی خوشی خاطر سے نہ بادشاہ کی اُجرت سے، تو وہ نہ دیکھے گا آگ کو اپنی آنکھوں سے مگر واسطے کھولنے قسم کے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾[2] اور بے شک اللہ کی راہ میں ذکر کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ خرچ کرنے پر سات سو گنا اور ایک روایت میں ہے: سات لاکھ گنا۔[3]

(أخرجه الإمام أحمد عن سهل بن معاذ)

23 ابو داود رحمہ اللہ کے الفاظ سہل عن ابیہ سے یہ ہیں کہ نماز اور روزہ اور ذکر، مضاعف (کئی گنا) کیا جاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ سات سو گنا تک کیا جاتا ہے۔[4]

24 امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ ممر، یعنی گزرنا ہے اس پر۔[5] (قاله عبد الرزاق عن معمر عن قتادة)

25 عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ مسلمانوں کا ورود پل پر سے گزرنا ہے، جو اس کے درمیان ہے اور مشرکوں کا ورود یہ ہے کہ اس میں داخل ہوں اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس دن پھسلنے والے مرد اور پھسلنے والی عورتیں بہت ہیں اور اس دن فرشتوں کی دو صفوں نے اس کا باقاعدہ احاطہ کیا ہوگا ان کی دعا ہوگی: "يا الله سلم سلم" "الٰہی! سلامت رکھ، الٰہی! سلامت رکھ۔"[6]

امام سدی رحمہ اللہ نے مرہ سے اور مرہ رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیتِ کریمہ: ﴿كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ "قسماً واجباً" اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "حتماً قضاء" اور اسی طرح ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[7] ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت ساری خلائق آگ پر گزرے گی اور اس میں کفار و گناہ گاروں میں سے اپنے گناہوں کے مطابق گریں گے جو گریں گے تو اللہ پاک مومنین اور متقین کو اس سے نجات دے گا، ان کے اعمال کے موافق۔ لہٰذا ان کا پل صراط پر گزرنا اور اُن کی سرعت اُن کے اعمال کے مطابق ہوگی، جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔

پھر وہ مومنین کے کبیرہ گناہوں والوں کے حق میں شفاعت کریں گے، پس فرشتے اور انبیا علیہم السلام اور مومنین

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٣٧) اس کی سند میں "زبان بن فائد" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٢٠٧)

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٣٧) اس کی سند میں "زبان بن فائد" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ١٩٧)

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٣٨) اس کی سند میں "زبان بن فائد" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٥٨٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٩٨) اس کی سند میں "زبان بن فائد" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٤٩٣)

[5] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٢) [6] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٣) [7] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٧)

شفاعت کریں گے، لہٰذا ایک کثیر تعداد خلق کو نکالیں گے کہ آگ نے ان کو کھا لیا ہوگا، مگر ان کے چہروں کی دارات کو، وہ دارات ان کے سجدہ کرنے کی جگہیں ہیں اور فرشتوں وغیرہم کا ان کو آگ سے نکالنا اس ایمان کے مطابق ہوگا جو اُن کے دلوں میں تھا، لہٰذا پہلے پہل اس شخص کو نکالیں گے جس کے دل میں دینار برابر ایمان تھا، پھر اس کو جو اس سے قریب ہے، پھر اس کو جو اس کے لگ بھگ ہے، پھر اس کو جو اس سے متصل ہے، یہاں تک کہ اس شخص کو نکالیں گے جس کے دل میں ادنیٰ، ادنیٰ، ادنیٰ سے ذرے کے برابر ایمان تھا، پھر اللہ تعالیٰ اس شخص کو آگ سے نکالے گا جس نے پوری عمر میں ایک دن لا الہ الا اللہ کہا ہوگا، گو اس نے کبھی کوئی خیر نہ کی اور آگ میں صرف وہی شخص باقی رہ جائے گا جس پر آگ میں ہمیشہ رہنا واجب ہوا، جیسے کہ اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾ [1]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾

اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں: فریقین میں سے کس کا مقام بہتر اور کس کی مجلس زیادہ اچھی ہے؟ (73) اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، وہ ان سے اثاثوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ میں کہیں بڑھ کر تھیں (74)

کافروں کا دنیاوی خوش حالی پر اترانا:

یعنی دنیا کی رونق میں مقابلہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ پاک کفار کے حال کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت اُن پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں جو ظاہری دلائل کی حامل ہوتی ہیں، واضح حجتیں اور براہین رکھتی ہیں اور کھلی نشانیاں ہیں تو اُن سے روگردانی کرتے ہیں، منہ موڑتے ہیں اور مومنین کی طرف سے اُن پر فخر کر کے اور اپنے دینِ باطل کی صحت پر حجت لا کر کہتے ہیں کہ ان کا مکان بہتر ہے اور اُن کی مجلس اچھی لگتی ہے، یعنی ان کے مکان بہتر سے بہتر ہیں اور اُن کے گھر اونچے اونچے ہیں اور اُن کی مجلس جہاں لوگوں کا مجمع ہوتا ہے، بات چیت کے لیے جمع ہوتے

---

[1] خلاصہ یہ ہے: جس کی تائید صحیح روایات سے ہوتی ہے کہ ورود سب کا ہوگا، کافر ہوں یا مسلمان، مسلمانوں میں سے اہلِ تقویٰ بہ سلامت گزر جائیں گے اور کافر جہنم میں گرا دیے جائیں گے۔ البتہ مسلمانوں میں جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب رہے ہوں گے اور ان سے توبہ کیے بغیر مر گئے ہوں گے، ان کا معاملہ اللہ کی مشیت پر ہوگا، اللہ تعالیٰ اگر بطور سزا کچھ عرصہ جہنم میں رکھنے کا فیصلہ فرمائے گا تو یہ بھی عارضی طور پر جہنم میں گرا دیے جائیں گے، پھر شفاعت کے ذریعے سے یا اللہ کی خصوصی رحمت و مغفرت سے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ [ص۔ ی]

ہیں، بہت آباد رہتی ہے، بہت سے آنے جانے والے آتے جاتے رہتے ہیں، دیکھنے میں نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

مطلب یہ کہ پھر ہم کیوں کر باطل پر ہونے لگے، حالانکہ ہم اس مرتبے میں ہیں، اس ٹھاٹھ سے ہماری زندگی گزرتی ہے اور وہ لوگ جو ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں اور اس کی مانند اور گھروں میں چھپے چھپائے گمنام بے قدر پڑے ہوئے ہیں، وہ کیسے حق پر ہو سکتے ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے ان کے حال کی خبر دی ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ [الأحقاف: ١١] ''اور کفر کرنے والوں نے ایمان لانے والوں سے کہا: اگر وہ (دین) بہتر ہوتا تو وہ (عام لوگ) اس (کو قبول کرنے) میں ہم سے پہل نہ کرتے۔'' اور قومِ نوح علیہ السلام نے کہا: ﴿ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ١١١] ''انھوں نے کہا: کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں، حالاں کہ تیری پیروی تو رذیل لوگوں نے کی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٥٣] ''اور ہم نے اسی طرح لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے، تاکہ وہ (انھیں دیکھ کر) کہیں: کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ (ہاں) کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے) زیادہ نہیں جانتا؟''

اور اسی لیے اللہ پاک نے اُن کے شبہے کو ان پر رد فرما کر یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ﴾ (آیتِ باب) یعنی وہ اسی قدر دنیا کی ظاہری رونق پر فخر کرتے ہیں اور ایمان والوں کو حقیر سمجھتے ہیں، ہم تو ان سے پہلی بہت سی امتوں، قرنوں اور سنگتوں کو ہلاک کر چکے ہیں ان کے کفر انکار اور تکذیب کے سبب سے کہ وہ ان سے مال و متاع اور شکل وصورت اور رنگ روپ اور رونق میں کہیں بڑھے ہوئے تھے اور خاص خاص محل، اٹاریاں، باغ، کھیتی باڑی، شان وشوکت، قوت، عزت وآبرو سب کچھ رکھتے تھے، مگر جب رسولوں کا کہا نہ مانا، کفر وعناد پر جمے رہے تو اُن کو ہلاک ہی کر ڈالا، سب ٹھاٹھ باٹھ پڑا رہ گیا، اُن کا اَتا پتا نہ رہا۔ اسی طرح اگر یہ لوگ بھی کفر وانکار سے باز نہ آئے اور اپنی حالت سے نہ بدلے تو ان کا حال بھی ویسا ہی ہونے والا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''مقام'' منزل ہے اور ''نَدِیّ'' مجلس، اثاث اور متاع اور ''رِئْیًا'' منظر ہے۔ یہ الفاظ ابوظبیان کے ہیں۔ عوفی رحمہ اللہ نے اُن کی روایت اُن الفاظ میں بیان کی ہے کہ مقام مسکن ہے۔ اور ''نَدِیّ'' مجلس ونعمت و رونق جس میں وہ تھے اور یہ ویسا قول ہے، جیسا اللہ پاک نے قومِ فرعون کے بارے میں کہا کہ جب ان کو ہلاک کیا اور اُن کا حال قرآن شریف میں بیان فرمایا: ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴾ [الدخان: ٢٥۔ ٢٦] ''وہ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔ اور کھیتیاں اور شاندار محل۔''

لہٰذا مقام تو مسکن ونعیم ہے، یعنی مکان وعیش وآرام اور ''نَدِیّ'' مجلس ومجمع ہے، جس میں وہ جمع ہوا کرتے تھے اور اللہ پاک نے قومِ لوط علیہ السلام کے قصے میں فرمایا ہے: ﴿ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ﴾ [العنكبوت: ٢٩]

''اور تم اپنی مجلسوں میں برے کام (بے حیائی) کرتے ہو؟'' عرب لوگ مجلس کو نادی کہتے ہیں۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب مشرکین نے نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کو دیکھا کہ ان کے عیش و گزران میں تنگی ہے، ان کے چہروں پر فلاکت اور مفلسی ہے تو انھوں نے تعریضاً (چھیڑنے کے طور پر) کہا: جو تم سنتے ہو کہ ﴿ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴾ (آیتِ باب) اسی طرح امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے۔[1]

بعض نے اثاث کے بارے میں کہا ہے کہ وہ مال ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کپڑے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ متاع ہے اور ''رِئْيًا'' منظر ہے۔[2] (كما قاله ابن عباس رضي الله عنهما و مجاهد و غير واحد) منظر کہتے ہیں: جائے نگریستن کو، لہٰذا جس جگہ لوگوں کی نظر پڑتی ہے، وہ منظر ہوا، اسی لیے خوبصورت شے کو خوش منظر بولتے ہیں۔ یعنی دیکھنے میں اچھی معلوم ہوتی ہے اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مراد صورتیں ہیں اور اسی طرح امام مالک نے فرمایا: ''أثاثا ورئيا'' یعنی اکثر مال میں اور احسن صورتوں میں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''والكل متقارب صحيح'' یعنی سب معانی ایک دوسرے کے قریب اور صحیح ہیں۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بینات کے یہ معنی ہیں کہ آیتیں واضح اور روشن ہیں، ان کے معانی خلط ملط نہیں ہوتے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''ظاهرات الإعجاز'' یعنی ان کا اعجاز کھلا ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حجج اور براہین ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کلمہ بینات حالِ مؤکدہ ہے ﴿ اٰيٰتُنَا ﴾ کا، اس لیے کہ اللہ کی آیتیں بالکل واضح اور ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر ﴿ بَيِّنٰتٍ ﴾ فرمایا تو یہ اس کی تاکید ٹھہری۔ ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف پھرتی ہے جن کا ذکر اس قول میں ہو چکا ہے: ﴿ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴾ [مريم: ٦٦] یعنی جس وقت اُن لوگوں پر قرآن شریف پڑھا جاتا ہے تو دنیا کا عذر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم حق پر ہوتے اور ہم باطل پر تو دنیا میں تمھارے حالات کا ہر پہلو اطیب، احسن اور اچھے سے اچھا ہوتا ہمارے حال سے اور اس کے برعکس نہ ہوتا، کیوں کہ حکیم کو لائق نہیں ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو ذلیل و خوار کرے اور اپنے دشمنوں کی عزت و آبرو فرمائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ کی ضمیر مومنین کی طرف راجع ہے، مگر پہلا قول ظاہر تر ہے۔

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ میں ظاہر کو مضمر کے بجائے رکھا، یعنی چاہیے اس طرح تھا کہ کفار کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو یہاں ''قالوا'' فرمایا جاتا، لہٰذا اس کا نکتہ یہ ہے، پس منظور یہ معلوم کرانا ہے کہ ان کا کفر ہی اس کا سبب ہوا ہے کہ ان سے یہ قول صادر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ ان سے مراد منجملہ کفار کے وہ لوگ ہیں جو سرکش ضدی اور ہٹ

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٩۔ ٢٤١) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٤١۔ ٢٤٢) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٠۔ ١٨١)

دھرمی کرنے والے ہیں اور مالدار لوگ جو کپڑے وغیرہ سے تجمل کرتے ہیں اور بنتے ٹھنتے ہیں۔ ﴿ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کفار نے مومنین سے کہا، یعنی یہ لام لاجل کے معنی، یعنی برائے کے معنی کے لیے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لام تبلیغ کا ہے۔ کما في قوله: ﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ ﴾ [البقرة: ٢٤٨] ''اور ان کے نبی نے ان سے کہا۔'' مطلب یہ کہ کفار مومنین سے مخاطب ہوئے اور دو بدو بالمشافہ یہ بات کہی اور اُن کی طرف یہ بات پہنچائی۔

مومنین سے مراد یہاں فقرائے اصحابِ نبی ﷺ ہیں، ان کے چہرے فلاکت اور فقیری کی وجہ سے متغیر تھے، ان کی گزران میں سختی اور تنگی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے، تنگ مکان تھے اور مشرک بالوں میں کنگھی کرتے، سر میں تیل ڈالتے، قیمتی سے قیمتی لباس پہنتے، بناؤ سنگھار کیے رہتے تھے، اسی لیے یوں کہا کہ ﴿ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا ﴾ ان سے مراد مومنین اور کافرین ہیں۔ گویا یوں کہا کہ ہمارا فریق بہتر ہے مقام میں یا تمھارا؟ مقام میم کی پیش کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اس کے معنی ہیں جائے اقامت یا اقامت کے معنی میں مصدر ہے اور میم کی زبر سے بھی پڑھا ہے، اس کے معنی ہیں؛ منزل اور مسکن، یعنی رہنے بسنے کی جگہ پس نادی اس کے علاوہ ہے، کیوں کہ نادی وہ جگہ ہے جس میں لوگ بات چیت کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ جگہ ہے جس میں اہم امور اور معاملات کے ساتھ قیام اور گفت وشنید کریں، معنی یہ کہ جاہ وجلال اور مرتبے میں کون سا فریق بڑھ کر ہے اور اپنے مددگاروں اور حمایت کرنے والوں اور اعانت کرنے والوں میں بڑھ کر ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''نَدِيّ'' مجالس ہیں[1] اور ''نَدِيّ'' و ''نَادِيْ'' مجلس ومتحدث ومجمعِ قوم ہے، یعنی جس جگہ لوگ بیٹھتے ہیں بات چیت کرتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں۔

اس بارے میں یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴾ [العلق: ١٧] ''چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ اپنی مجلس والوں کو بلا لے۔'' کسی نے کہا ہے کہ ندی مشتق ہے ندیٰ سے۔ ندی کہتے ہیں کرم اور سخاوت کو، اس لیے کہ کریم اور سخی لوگ مجلس میں جمع ہوتے ہیں۔ ﴿ قَرْنٍ ﴾ سے مراد گزری ہوئی جماعت یا اُمت ہے۔ یہ کلمہ لفظ میں مفرد اور معنی میں متعدد ہے۔ اثاث تمام قسموں کے مال کو کہتے ہیں، یعنی اونٹ، بکری، گائے، غلام اور متاع۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ خاصا متاع خانہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جدید فرش ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خاصتاً لباس ہے۔

﴿ رِءْيًا ﴾ بمعنی مرئی ہے، یعنی دیکھی ہوئی شے۔ یہ لفظ مثل ذبح وطحن کے ہے اور اُن دونوں کے معنی مذبوح ومطحون ہیں، یعنی ذبح کردہ شدہ وآرد کردہ شدہ، یعنی ذبح کیا ہوا اور پیسا ہوا۔ اس کلمے میں دو قراءتیں ہیں: ایک تو ہمزہ کے ساتھ ہے، یعنی ﴿ رِءْيًا ﴾ دوسری یائے مشددہ کے ساتھ یعنی ''رِيًّا''۔ یہ ''رَأَيْتُ'' سے ماخوذ ہے، یعنی وہ منظر میں خوبصورت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھنے میں خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

جمہور مفسرین اسی کے قائل ہیں اور حسنِ منظر ہوتا ہے حسنِ لباس اور حسنِ ابدان اور اُن دونوں کے تنعم

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٣٨)

(خوشحالی) کی طرف سے، یا دونوں باتوں کے اکٹھا ہونے سے۔ پہلی قراءت کے معنی وہی ہیں جو دوسری کے ہیں۔
امام لغویین جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ﴿رِءْيًا﴾ کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کو حسنِ منظر ٹھہرایا ہے، جو رویئت سے ہے اور حسنِ منظر وہ ہے کہ جس حال میں ظاہری حسن اور لباس کو آنکھ نے دیکھا۔ اور جس شخص نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں یا تخفیف ہمزہ کے باب سے ہے یا رویت "ألوانهم و جلودهم" ریا سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں کہ ان کے رنگ اور چمڑے تر و تازہ اور حسین ہوں۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کے معنی ذکر کیے ہیں، ایک قراءت میں "زیّا" ہے، زی، ہیئت و حسن و صورت کو کہتے ہیں۔[2] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "رویت" بہ معنی "جمعت" سے ہو اور "زی" تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے۔[3]

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى إِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾

کہہ دیجیے: جو شخص گمراہی میں ہے، (لازم ہے کہ) اسے رحمٰن لمبی ڈھیل دے دے، حتی کہ جب وہ دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے یا عذاب یا قیامت تو وہ ضرور جان لیں گے کہ کون درجے میں بدتر اور لشکر کے لحاظ سے کمزور تر ہے (75)

گمراہ اور سرکش کو دی جانے والی مہلت کا ذکر:

یعنی بہکاوے میں جانے دے، کیونکہ دنیا جانچنے کی جگہ ہے، بھلا برا پائیں گے آخرت میں، یہاں نیک و بد بھلائی برائی میں شامل ہیں۔ فوج، یعنی مددگار۔ کافر اپنا مددگار بتوں کو سمجھتے ہیں اور ایمان والے اللہ کو۔

اللہ پاک فرماتا ہے: اے پیغمبر! تو ان لوگوں سے کہہ دے جو اپنے رب کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں اور تم باطل پر ہو اپنے مقام اور مجلس کی خوبی اور رونق کی وجہ سے، جس کے ساتھ انھوں نے حجت کی ہے کہ جو کوئی بھٹکتا رہا، یعنی ہم میں سے اور تم میں سے، تو چاہیے کہ رحمٰن اس کو لمبا کھینچ لے جائے، یعنی رحمٰن نے اس کو مہلت دی، جس حال میں کہ وہ ہے یہاں تک کہ اپنے رب سے جا ملے اور اس کی اجل پوری ہو جائے۔ یا عذاب کی وجہ سے جو اس کو پہنچے، اس کی زندگی ختم ہو جائے، یا اس کو قیامت اچانک آ جائے۔ لہٰذا وہ اس وقت جان لیں گے کہ کس کا درجہ برا ہے اور کس کی فوج یا جتھا کمزور ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے آیتِ کریمہ: ﴿فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ سو چاہیے اللہ اس کو اس

[1] الصحاح للجوهري (٧/ ١٩٩) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٤٢) [3] فتح البيان (٨/ ١٩٠۔ ١٩٢)

کے طغیان اور سرکشی میں چھوڑ دے۔ ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ نے اسی طرح تقریر کی ہے۔[1] یہ مباہلہ ہے (ایک دوسرے پر لعنت کرنا) مشرکوں کے لیے جو یہ زعم کرتے ہیں کہ وہ جس حال میں ہیں ہدایت پر ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں یہود کے مباہلہ کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ قُلْ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴾ [الجمعة: ٦] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے لوگو جو یہودی ہوئے! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ بے شک تم اللہ کے دوست ہو سب لوگوں کے سوا، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔''

یعنی تم مبطل کے لیے موت کی دعا کرو، وہ ہم میں سے ہو یا تم میں سے، اگر تم اس بات کا دعویٰ کرتے ہو کہ تم حق پر ہو، کیوں کہ دعا تم کو ضرر نہ پہنچائے گی۔ پھر وہ اس سے رُک گئے۔ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان تفصیل سے گزر چکا ہے۔[2] وللہ الحمد۔ اور جس طرح کہ اللہ پاک نے نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کا ذکر سورت آلِ عمران میں کیا ہے، جس وقت کہ وہ کفر پر ڈٹ گئے اور سرکشی اور غلو پر جمے رہے اپنے اس دعویٰ میں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے فرزند ہیں اور اللہ پاک نے اپنے حجج اور براہین عیسیٰ علیہ السلام کے عبد ہونے پر ذکر فرمائے اور اس بات پر کہ وہ آدم علیہ السلام کی طرح پیدا کیے گئے ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴾ [آل عمران: ٦١] ''پھر علم آ جانے کے بعد جو کوئی عیسیٰ کے متعلق آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو بلا لیں اور خود بھی (حاضر ہوں) پھر گڑگڑا کر اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔'' لہٰذا نصاریٰ بھی مباہلے سے رُک گئے، یہ تو ابن کثیر رحمہ اللہ کی تقریر تھی۔[3]

فتح البیان کا بیان:

اب فتح البیان کا فاتح بیان سنو، جس سے سینہ کشادہ ہو جائے۔ دل کو سرور ملے اور آنکھ میں نور آ جائے۔ اللہ پاک نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا ہے کہ یہ لوگ جو اپنے دنیاوی مال و متاع اور نصیب اور قسمت پر فخر کرتے ہیں اور بڑائی جتاتے ہیں اور یہ کفار جو مومنین سے کہتے ہیں کہ کونسا فریق اپنی رہایش گاہوں اور مجلسوں کے لحاظ سے خوب تر ہے، ان کو یوں جواب دیں کہ جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے اور پختہ ہے، یعنی کفر و جہالت اور انکار اور نادانی میں قرار پکڑے ہوئے ہے اور اپنی عاقبت اور انجام کار سے بالکل غافل ہے، سو چاہیے کہ رحمن اس کو مہلت دے اور درجہ بہ درجہ دنیا میں اسے اتارے۔

﴿ فَلْيَمْدُدْ ﴾ اگرچہ امر کا صیغہ ہے، لیکن اس سے مراد خبر ہے اور امر کے انداز میں جو یہ خبر دی گئی، یعنی اصل

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٤٣) [2] رقم الآیة [٩٤] [3] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٨١)

میں تو خبر ہے، مگر امر کے پیرایہ میں جو ادا ہوئی تو یہ اللہ پاک کی طرف سے گناہگاروں کو مہلت دینے کا بیان ہے اور اس امر کا بیان کیا گیا ہے کہ یہ مہلت لامحالہ ضرور ہونے والی ہے تاکہ گمراہوں کے پاس کوئی عذر نہ رہے اور قیامت کے دن ان سے یوں کہا جائے: ﴿ اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ ﴾ [الفاطر: ٣٧] ''(اللہ فرمائے گا:) کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا؟'' یا یہ امر استدراج اور امہال کے لیے ہے، یعنی مہلت دینے کے لیے۔جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ﴾ [آل عمران: ١٧٨] ''ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔''

اللہ پاک نے اپنی ذات پاک کو رحمانیت کے عنوان سے ذکر فرمایا، اس لیے کہ مہلت دینا اور لمبا کھینچنا منجملہ دنیاوی رحمت کے احکام ہیں۔ رحمٰن کا نام نامی اس سورت میں سولہ جگہ مذکور ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت سے مراد مہلت اور تنفیس کے ساتھ دعا ہے۔ تنفیس سے مراد مہلت دینا ہے۔ یہ کہنے والے کی مراد یہ ہو کہ جو شخص گمراہی میں ہے اس کو چاہیے کہ رحمٰن سے مہلت کی دعا مانگے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تاویل اس کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی گمراہی کی یہ جزا ٹھہرائی کہ اسے چھوڑ دے اور اس کو اس میں مہلت دے،[1] اس لیے کہ لفظ امر کا معنی خبر کی تاکید کرتا ہے۔ گویا متکلم کہتا ہے کہ میں اس کام کو کرتا ہوں اور اس کا اپنے نفس کو امر کرتا ہوں۔

سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: "من كان في الضللة فإنه يزيده الله ضلالة و طغيانا و استدراجا"[2] والله أعلم. ان کی قراءت میں یہ تینوں الفاظ ہیں یا ایک یا دو الفاظ ہیں۔ نیز بہ ظاہر قراءت کے یہ الفاظ بطور تفسیر ہیں۔ والله أعلم۔ "بأن يطيل عمره و يكثر ماله ويمكنه من التصرف فيه" یعنی جو شخص کہ گمراہی میں ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتا ہے گمراہی اور سرکشی میں۔ اور مہلت دینا اس طرح ہے کہ اس کی عمر کو دراز کرتا ہے اور اس کے مال کو زیادہ کرتا ہے اور اس میں تصرف کرنے کی اس کو قدرت دیتا ہے۔ اور ﴿ فَلۡيَمۡدُدۡ لَهُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا ﴾ جزا ہے، حتی حرف ابتدا ہے، حرفِ جار یا حرفِ عطف نہیں ہے۔ کازرونی اور شہاب رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3]

یہ حتیٰ حرفِ جار ہے، یعنی وہ لوگ طغیانی اور سرکشی میں ہمیشہ رہیں گے اور چلتے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ لوگ جن کے لیے گمراہی میں مہلت دی گئی ہے، اس وقت کو دیکھیں گے جس کا وعدہ پاتے ہیں یا عذاب کو یا قیامت کو۔ یہ تفصیل ﴿ مَا يُوۡعَدُوۡنَ ﴾ کی ہے، یعنی جس چیز کا وہ وعدہ پاتے ہیں، وہ دو امر سے ہے، ایک تو دنیا کا عذاب قتل اور قید کی صورت میں، جس طرح کہ بدر کے دن اُن کے لیے واقع ہوا اور دوسرے قیامت کا دن اور جو کچھ اُخروی عذاب اس وقت ان پر نازل ہوگا۔ پس ﴿ اِمَّا ﴾ حرفِ تفصیل ہے اور مانعۃ الخلو ہی جمع کو جائز رکھتا ہے،

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٣٤٣) [2] فتح القدير (٣/ ٤٨٠) البتہ اس میں "طغيانا و استدراجا" کے الفاظ مروی نہیں ہیں۔
[3] حاشية الشهاب (٦/ ١٧٧)

یعنی ان دونوں باتوں سے خالی ہونا منع ہے اور اگر دونوں جمع ہو جائیں تو ہو سکتا ہے عذاب و ساعۃ دونوں بدل ہیں کلمہ ﴿ مَا ﴾ سے۔

کلمہ ﴿ كَانَ ﴾ اور ﴿ لَهُ ﴾ میں لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کا اعتبار کیا کہ مفرد ہے اور ﴿ رَاَوْا ﴾ اور ﴿ يُوْعَدُوْنَ ﴾ اور ﴿ فَسَيَعْلَمُوْنَ ﴾ میں ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کا لحاظ کیا کہ جمع ہے۔ ﴿ حَتّٰى ﴾ انتہا ہے سرکشی پر جمے رہنے کی، یا انتہا ہے مہلت کی، یعنی وہ سرکشی میں جمے رہیں گے، یہاں تک کہ اس عذاب کا مشاہدہ کریں گے، جس کا وعدہ کیا گیا ہے یا اللہ نے اُن کو مہلت دی، یہاں تک کہ موعود کو دیکھیں گے اور مفتخرین کے قول کی انتہا نہیں ہے، کیونکہ اس میں امتداد (کھینچنا، مہلت دینا) نہیں ہے اور انتہا حقیقت میں ﴿ فَسَيَعْلَمُوْنَ ﴾ ہے اور یہ جواب ﴿ اِذَا ﴾ کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کہنے والے کہ ﴿ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ... الخ ﴾ جس وقت اس چیز کا معائنہ کریں گے جس کا وعدہ پاتے ہیں، یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں سے دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب تو جان لیں گے کہ کس کا مکان برا ہے دونوں فریق میں سے اور کس کی فوج کمزور ہے۔

اللہ پاک نے ﴿ خَيْرٌ مَّقَامًا ﴾ کا مقابلہ ﴿ شَرٌّ مَّكَانًا ﴾ سے کیا اور ﴿ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴾ کا مقابلہ ﴿ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴾ سے فرمایا، اس لیے کہ مجلس کا حسن وخوبی قوم کے اعیان اور اشراف کے جمع ہونے سے ہوتی ہے اور اُن کی شوکت اور غلبے کے ظہور سے، یعنی وہ جان لیں گے، کیا وہ بہتر ہیں حالانکہ وہ اور اُن کا لشکر شیاطین آگ میں ہوں گے، یا مومنین حالانکہ وہ جنت میں ہوں گے اور اُن کے پاس رحمٰن کے فرشتے ہوں گے، اس بنیاد پر کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ استفہامیہ ہے اور یہ دو وجہوں میں سے ایک وجہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ موصولہ ہو ﴿ اَلَّذِيْ ﴾ کے معنی میں۔

﴿ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ فخر کرنے والوں کے لیے وہاں کوئی کمزور فوج ہوگی، لہٰذا یہ مراد نہیں ہے، بلکہ ہرگز اُن کی کوئی فوج نہیں ہے، نہ زور آور اور نہ کمزور، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴾ [الكهف: ٤٣] ”اور اس کے لیے کوئی ایسا گروہ نہیں تھا جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتے اور نہ وہ (خود ہم سے) بدلہ لینے والا تھا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ کفار اور مشرکین کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔[1]

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ
عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾

اور راہِ ہدایت پر چلنے والوں کو اللہ مزید ہدایت عطا کرتا ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں ہی آپ کے رب کے ہاں ثواب اور انجام کے اعتبار سے بہت بہتر ہیں (76)

[1] فتح البيان (٨/ ١٩٢۔ ١٩٤)

ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت میں اضافہ:

یعنی دنیا کی رونق رب کے پاس کسی کام کی نہیں۔ نیکیاں رہیں گی اور دنیا نہ رہے گی۔

جب کہ اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی کہ جو شخص گمراہی میں ہے اس کو مہلت دیتا ہے اس حال میں جس میں وہ ہے اور جس حالت پر وہ ہے اس پر اور زیادہ کرتا ہے تو یہ خبر دی کہ جو لوگ راہ پائے ہوئے ہیں ان کو ہدایت میں اور بڑھاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ﴾ [التوبة: ١٢٤۔ ١٢٥] ''اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو (طنزاً) کہتے ہیں: تم میں سے کس کو اس (سورت) نے ایمان میں زیادہ کیا ہے؟ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) پلیدی پر مزید پلیدی کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے۔''

﴿ ٱلْبَٰقِيَٰتُ ٱلصَّٰلِحَٰتُ ﴾ کی تفسیر اور اس پر کلام اور اس کے متعلق حدیثیں سورۃ الکہف کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔[1] ﴿ ثَوَابًا ﴾ کے معنی ہیں جزاء، یعنی بدلہ باقیات صالحات کا بہتر ہے۔ اور ﴿ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴾ کے معنی ہیں ''خَيْرٌ عَاقِبَةً وَمَرَدًّا عَلٰى صَاحِبِهَا'' یعنی باقیات صالحات کا انجام اور اُن کا اُن کے صاحب پر پھر کر جانا بہتر ہے۔ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن بیٹھے، آپ ﷺ نے ایک سوکھی لکڑی لی، اس کے پتے جھاڑے، پھر فرمایا کہ ''لا إله إلا الله، والله أكبر، و سبحان الله، والحمد لله'' کہنا خطاؤں کو اس طرح گرا دیتا ہے جس طرح اس ٹہنی کے پتوں کو ہوا گرا دیتی ہے۔ اے ابو الدرداء! تو ان (باقیات صالحات) کو لے اس سے پہلے کہ تیرے اور اُن کے درمیان کوئی چیز حائل ہو جائے۔ وہ جنت کے خزانوں میں سے ہیں۔

ابو سلمہ کہتے ہیں کہ پھر جب ابو الدرداء رضی اللہ عنہ اس حدیث کا ذکر کرتے تو کہتے کہ میں ہر وقت ''لا إله إلا الله'' کہوں گا اور ''والله أكبر'' کہوں گا اور ''سبحان الله'' کہوں گا، یہاں تک کہ جس وقت مجھے جاہل نادان دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ میں مجنون ہوں۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وهذا ظاهره أنه مرسل ولكن قد يكون من رواية أبي سلمة عن أبي الدرداء'' والله أعلم (وهكذا وقع في سنن ابن ماجه من حديث أبي معاوية عن عمر بن راشد عن يحيى عن أبي سلمة عن أبي الدرداء فذكر نحوه)[3]

---

[1] رقم الآية [٤٦] [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٤٥) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''عمر بن راشد'' ضعیف راوی ہے۔

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨١٣) اس کی سند میں ''عمر بن راشد'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٧٥٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب اللہ پاک نے اہلِ ضلالت کے حال سے خبر دی تو چاہا کہ اہلِ ہدایت کا حال بیان کرے۔ لہٰذا فرمایا کہ اور زیادہ کرتا ہے اللہ ان لوگوں کو جنھوں نے ہدایت پائی ایمان کی ہدایت ان آیتوں کے ساتھ جن کو اُتارتا ہے۔ اس لیے کہ بعض ہدایت بعض کی طرف کھینچتی ہے اور خیر خیر کی طرف بلاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ زیادتِ ہدایت سے مراد عبادت کی ہدایت ہے۔ یعنی مومنین ایمان تو لا ہی چکے، اب ان کو کثرتِ عبادت کی توفیق دیتا ہے کہ اللہ پاک کی بہت سی عبادت کرتے رہیں۔ یہ جملہ مہتدین کا حال بیان کرنے کے لیے جملۂ مستانفہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ واوَ عطف کے لیے ہے جملۂ شرط پر، جس کے قول کے ساتھ حکایت کی گئی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک مومنین کی جزا یہ ٹھہراتا ہے کہ اُن کے یقین کو بڑھاتا ہے، جس طرح کہ کافروں کی یہ جزا ٹھہرائی کہ ان کو اُن کی گمراہی میں مہلت دیتا ہے۔[1]

باقیات صالحات سے مراد وہ طاعات ہیں جو ابدی سعادت کی طرف پہنچاتی ہیں، اپنے صاحب کے واسطے باقی رہتی ہیں، لہٰذا یہ طاعات اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیاوی نعمتوں سے زیادہ بہتر ہیں، جن کے ساتھ کافر لوگ نفع اُٹھاتے ہیں اور اُن پر فخر کرتے ہیں۔ کلمۂ ''مَرَدًّا'' اس جگہ مصدر ہے مثل ردّ کے، یعنی وہی طاعات ثواب کو اُن کے کرنے والے کی طرف پھیرنے میں بہتر ہیں۔ وہ اعمالِ کفار کی طرح نہیں ہیں جن میں انھوں نے خسارہ اُٹھایا، یا ''مَرَدًّا'' سے مراد لوٹ جانا اور انجام ہے، یعنی وہ چیز جس کی طرف اُن کا فعل پھیرا جائے گا اور رجوع کرے گا اور وہ بہشت ہے۔ صیغہ افعل تفضیل کا بطور مشاکلت کے اُن سے ٹھٹھا کرنے کے واسطے لایا گیا ہے، کیوں کہ یہ بات قطعی یقینی ہے کہ کفار کے اعمال میں ہرگز کسی طرح کی خیر و خوبی نہیں ہے، زیادتی کمی کا کیا ذکر ہے۔[2]

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ۭ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

پھر آپ اس شخص کے بارے میں بتلایئے جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: مجھے ضرور مال اور اولاد دی جائے گی (77) کیا اس نے غیب کی اطلاع پالی یا رحمٰن کے ہاں کوئی عہد لے لیا ہے؟ (78) ہرگز نہیں! ہم

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۳٤٤) [2] فتح البیان (۸/ ۱۹٤)

ضرور لکھیں گے جو کچھ وہ کہتا ہے اور ہم اس کے لیے عذاب بہت بڑھا دیں گے (79) اور ان چیزوں کے ہم وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے اور وہ ہمارے پاس اکیلا آئے گا (80)

کافروں کے اس خیال کی تردید کہ ان کو آخرت میں مال و اولاد ملے گا:

ایک مالدار کافر ایک لوہار مسلمان کو کہنے لگا تو مسلمانی سے منکر ہو تو تیری مزدوری دوں، اس نے کہا: اگر تو مرے اور پھر جیے تو بھی میں منکر نہ ہوؤں۔ اس نے کہا کہ اگر پھر جیوں گا تو یہی مال و اولاد وہاں بھی ہوگا، تجھ کو مزدوری وہاں دے دوں گا، اسی پر یہ فرمایا کہ وہاں تو دولت ایمان کی بدولت ملتی ہے، اگر چاہے کہ یہاں کی دولت ملے، سو ممکن نہیں۔ جو بتاتا ہے یعنی مال اور اولاد۔ اس کافر کے دونوں بیٹے مسلمان ہوئے۔

یہ ہمزہ استفہام تعجب کے اظہار کے لیے ہے۔ "أَرَءَيْتَ" کے معنی ہیں "أَخْبِرْنِي"، یعنی تو مجھے خبر دے۔ "أَرَءَيْتَ" کا استعمال بمعنی "أَخْبِرْنِي" اس لیے آتا ہے کہ شے کا دیکھ لینا اس شے کی سچی خبر دینے کا سبب ہے، یعنی جب اس شے کو پہلے دیکھ لے گا تو اس کی پکی سچی خبر دے گا۔ آیات کا لفظ ہر آیت کو عام ہے اور آیتِ بعث ونشر (دوبارہ زندہ ہونے اور اکٹھے ہونے کی) منجملہ اس کے ہے۔ حرف "فا" عطف کے واسطے ہے مقدر پر۔ وہ مقدر یہ ہے: "أنظرت فرأيت"، یعنی کیا تو نے نظر کیا ہے، پس دیکھا ہے اور ﴿ لَأُوتَيَنَّ ﴾ میں حرفِ لام توطئہ (تمہید) قسم کا ہے۔ یہ لام مفتوح اس بات کی تمہید کرتا ہے کہ یہاں قسم مقدر ہے، گویا یوں کہا: "وَاللّٰهِ لَأُوتَيَنَّ"

کلمہ ﴿ وَلَدًا ﴾ واؤ کی پیش اور زبر دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دونوں دو لغت ہیں، معنی اُن کے ایک ہیں، یعنی فرزند اور بیٹا۔ وَلَد و وُلْد دونوں بولتے ہیں، جس طرح کہ عَدَم و عُدم کہتے ہیں۔ کسی نے فرق کیا ہے، کہا کہ پیش سے تو جمع ہے اور زبر سے مفرد ہے اور اس منکرِ آیات سے مراد عاص بن وائل ہے، چنانچہ آیندہ حدیثوں میں اس کا ذکر آئے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اول کفار کے قول کا ذکر کیا جو دنیا کی ظاہری رونق اور زینت کے ساتھ فخر کرتے تھے، مال و دولت وقوت وشوکت وکثرتِ اعوان وانصار وخوبی خانہ ومسکن ومجلس سے بڑائی جتاتے تھے۔

پھر اس کا جواب مسکت ذکر فرمایا، اس کے بعد ان کا ایک اور ویسا ہی قول تعجب کے طور پر نقل کیا اور اپنے رسول رؤف رحیم کو مخاطب کر کے یوں ارشاد فرمایا: بھلا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ہماری نشانیوں کا منکر ہوا، وہ قول یہ ہے کہ قسم ہے اللہ کی! البتہ میں ضرور دیا جاؤں گا آخرت میں مال و اولاد، یعنی تو مجھے اس کافر کے قصے کی خبر دے اور اس کی حکایت ذکر کر۔ قصۂ سابقین کے بعد اس کافر کے حال کو تو دیکھ اور اس کے کلام اور اللہ پاک پر قسم کھانے سے تعجب کر باوجود اس کے کہ وہ اللہ کا منکر ہے اور اس کی آیتوں کو جھٹلاتا ہے۔ یہ بات جو اس نے کہی اس کی سخت سرکشی سے ہے اپنے کفر میں۔ کیونکہ وہ نہ اللہ پاک کو مانے نہ اس کی آیتوں کو سچا جانے، پھر اسی کی قسم کھا کر کہے کہ مجھے

ضرور آخرت میں مال اور اولاد ملے گی۔

جمہور مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ اس کافر کے قول سے کہ مجھے مال اور اولاد ملے گی یہ مراد ہے کہ وہ اس کو دنیا میں دیا جائے گا اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ جنت میں۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ اگر میں اپنے آبا کے دین پر رہوں گا تو دیا جاؤں گا۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ اگر میں باطل پر ہوتا تو مال اور اولاد نہ دیا جاتا، غرضیکہ کچھ بھی ہو، اللہ پاک نے اس کافر کی بات کا وہ جواب دیا جو اس کی بات کو دفع کرتا ہے اور اس کے قول کو باطل ٹھہراتا ہے۔ پس فرمایا کہ کیا غیب کو جھانک آیا ہے یا رحمٰن کے، یہاں کوئی قول وقرار لے رکھا ہے، یعنی کیا اس نے وہ بات جان لی ہے جو اُن سے غائب ہے، یعنی اس نے یہاں تک معلوم کر لیا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا، یا وہ جس شے کے ملنے کی اطلاع دیتا ہے اس کے ملنے کا اللہ پاک سے عہد و پیمان لے رکھا ہے، کیونکہ یہ علم حاصل نہیں ہوتا مگر انہی دو طریقوں میں سے ایک طریقے سے۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ کیا لوحِ محفوظ کو جا کر دیکھ آیا ہے، یا اللہ سے کوئی عہد لیا ہے۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ کیا ''لا إله إلا الله'' کہا ہے کہ میں اس کے سبب سے اس پر رحم کروں اور وہ اس کے سبب سے اُمید رکھے۔[1] (قاله ابن عباس)

یا یہ معنی ہیں کہ کیا اس نے کوئی عملِ صالح آگے بھیجا ہے کہ وہ اس کی اُمید رکھتا ہے ﴿ أَطَّلَعَ ﴾ زبر کے ساتھ ہمزہ استفہامیہ ہے اور ''اطلع'' بنفسہٖ متعدی ہے، جس طرح یہ قول ہے: ''اطلع الجبل'' یعنی پہاڑ کو چڑھا۔ مُغرب میں کہا ہے کہ ''علی'' کے ساتھ متعدی نہیں ہوتا، جس طرح کہ بعض نے وہم کیا ہے، یہاں تک کہ حذف اور ایصال کے باب سے ہو۔ (حذف اور ایصال یہی ہے کہ جس حرف کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، اس کو حذف کر دیا اور فعل کو مفعول سے ملا دیا)۔ لیکن قاموس میں ''اطلع علیه'' ہے۔[2] سو گویا متعدی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ عرب کے محاورے میں بولتے ہیں۔ ''اطلع الجبل'' جس وقت کہ اس کی چوٹی پر چڑھ جائے۔

﴿ كَلَّا ﴾ حرفِ ردع و زجر ہے، یعنی کسی کا جھڑکنا، ڈانٹنا، یا اس کی بات کو رد کرنا منظور ہوتا ہے تو اس کلمے کو بولتے ہیں۔ ﴿ سَنَكْتُبُ ﴾ کے معنی ''سَنَحْفَظُ عَلَيْهِ'' ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو یہ کافر کہتا ہے کہ اس کو مال اور اولاد ملے گی، بات یوں نہیں ہے۔ ہم نگاہ رکھیں گے اس پر جو وہ بات کہتا ہے، پھر ہم آخرت میں اس کو اس بات کی جزا دیں گے یا ہم اس کے لیے وہ ظاہر کریں گے جو وہ کہتا ہے اور اس کو خبر دیں گے۔ یا اس سے ہم انتقام لیں گے، اس شخص کے انتقام کی مانند جس کی معصیت لکھی گئی اور اس بات کے بدلے میں ہم اس کے عذاب کے اوپر اور زیادہ عذاب کریں گے، جس کا وہ اپنے نفس کے لیے دعویٰ کرتا ہے کہ مال و اولاد کے ساتھ اس کی امداد ہوگی۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم اس کے واسطے وہ عذاب دراز کریں گے جس کا وہ مستحق ہے اور وہ عذاب اس شخص کا ہے جس نے کفر اور

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٥٣٦) [2] القاموس المحيط (١/ ٧٤٤)

استہزاء کو جمع کیا ہے۔

﴿ وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس کو ماریں گے، پھر ہم اس کے مال اور اولاد کے وارث ہوں گے، جس کا وہ کہتا ہے کہ اس کو دیا جائے گا۔ یہاں مضاف مقدر ہے، یعنی "مسمی ما یقول و مصداقه" یہ قول ابو السعود رحمہ اللہ کا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ہم اس کو اس چیز سے محروم کریں گے جس کی وہ تمنا کرتا ہے آخرت میں اور وہ چیزیں اس کے غیر کو، یعنی من جملہ مسلمین کو دیں گے۔[2] (قاله القرطبي) ﴿ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن وہ تنہا ہمارے پاس آئے گا، نہ اس کا مال ہوگا نہ اولاد نہ خاندان، بلکہ یہ سب چیزیں اس سے سلب کر لیں گے، پھر وہ اس کا طمع کیوں کر کرتا ہے کہ ہم اس کو دیں گے۔ بعض نے کہا کہ ﴿ مَا يَقُوْلُ ﴾ سے مراد صرف قول ہے نہ کہ مسمی قول کا، یعنی وہ جو یہ بات کہتا ہے پس اس وقت ہے جب تک وہ زندہ ہے، پھر جب ہم اس کو مار ڈالیں گے تو ہم اس کے اور اس کی بات کے درمیان حائل ہو جائیں گے اور وہ ہمارے پاس ان تمام باتوں اور خواہشات کو چھوڑے ہوئے اور ان سے تنہا ہو کر آئے گا۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

کلمہ ﴿ كَلَّا ﴾ میں نحویوں کے چھے مذہب ہیں: پہلا مذہب یہ ہے کہ یہ حرف ردع و زجر ہے۔ یہ معنی اس کے لائق ہیں، اس انداز سے قرآن شریف میں واقع ہوا ہے اور اس آیتِ کریمہ میں کیا خوب آیا ہے کہ اس قائل کو ڈانٹا ہے اور ہٹایا ہے، یہ جمہور بصریین، جیسے خلیل و سیبویہ و ابو الحسن اخفش و ابو العباس مبرد رحمہم اللہ ہیں، کا مذہب ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ حرفِ تصدیق ہے، بمعنی "نعم" کے۔ تو جواب ہوگا، اس صورت میں ضروری ہوگا کہ اس سے پہلے لفظاً یا تقریراً کوئی شے ہو اور کبھی قسم میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہ مذہب نضر بن شمیل کا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ بمعنی "حقا" ہے یہ مذہب ہے کسائی و ابو بکر بن انباری و نضر بن یوسف کا۔ چوتھا یہ ہے کہ جو چیز اس کے پہلے ہوتی ہے اس کو رد کرتا ہے، یہ معنی ردع کے معنی کے لگ بھگ ہیں، یہ ابو عبد اللہ باہلی کا مذہب ہے۔ پانچواں یہ ہے کہ صلہ ہے کلام میں بمعنی اِی کے، اسی طرح کہا گیا ہے۔ اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ اِی حرفِ جواب ہے، لیکن قسم کے ساتھ خاص ہے۔ چھٹا یہ ہے کہ یہ حرفِ استفتاح ہے، یہ ابو حاتم کا قول ہے۔[3] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان مذاہب کی تقریر کے لیے اور جگہ ہے، جو اس کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ بحمد اللہ میں نے اس میں ان کی تحقیق کی ہے۔

﴿ كَلَّا ﴾ کا ذکر فقط قرآن شریف کے دوسرے نصف میں ہے اور پندرہ سورتوں میں مذکور ہے، وہ سب مکی ہیں اور جملہ ۳۳ بار اس کا ذکر کیا گیا ہے، یہ مجموعہ تین قسم کی طرف رجوع کرتا ہے: ایک وہ قسم ہے کہ اس پر اور اس کے ماقبل پر وقف جائز ہے تو ابتدا اس سے کی جاتی ہے یہ بہ اتفاق ہے۔ دوسری قسم میں اختلاف ہے کہ آیا اس پر

[1] تفسير أبي السعود (٥/ ٢٨٠) [2] تفسير القرطبي (١١/ ١٤٨) [3] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ١٣٤۔ ١٣٦)

وقف جائز ہے یا اس کے ماقبل پر متعین ہے۔ تیسری قسم وہ ہے کہ بہ اتفاق اس پر وقف جائز نہیں ہے۔ پس پہلی قسم کے پانچ مقامات ہیں، دو اس سورت میں اور دو سورۃ الشعراء میں اور ایک سورت سبا میں۔ دوسری قسم کے نو مقامات ہیں: ایک سورۃ المومنین میں اور دو سورت ﴿ سَاَلَ سَآىِٕلٌ ﴾ میں اور دو سورۃ المدثر میں پہلا اور تیسرا اور پہلا سورۃ القیامہ میں اور دوسرا سورت ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴾ میں اور پہلا سورۃ الفجر میں اور وہ کلا جو سورت ﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ ﴾ میں ہے، قسم سوم کے ۱۹۔ باقی میں اس کا ذکر عز بن جماعہ نے کیا ہے، یہ تو بیان تھا فتح البیان کا۔[1] اب ابن کثیر کی تقریر سنو۔

امام احمد رحمہ اللہ نے خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ میں ایک لوہار آدمی تھا اور عاص بن وائل پر میرا قرض تھا تو میں اس کے پاس آیا، اس سے قرض کا تقاضا کرتا تھا، پس اس نے کہا: قسم ہے اللہ کی میں تیرا قرض ادا نہ کروں گا، یہاں تک کہ تو محمد ﷺ کا انکار کرے۔ میں نے کہا: قسم ہے اللہ کی! میں محمد ﷺ کا انکار نہ کروں گا، یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر اُٹھایا جائے۔ وہ بولا کہ جس وقت مر جاؤں گا، پھر اٹھایا جاؤں گا تو تُو میرے پاس آئے گا اور میرے لیے وہاں مال و اولاد ہوگا تو میں تجھ کو دے دوں گا۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿77﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿78﴾ كَلَّا ۭ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿79﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴾[2] (أخرجه صاحبا الصحيح وغيرهما من غير وجه عن الأعمش به)

صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ ہے کہ میں ایک لوہار تھا مکہ میں، پس میں نے عاص بن وائل کے لیے ایک تلوار بنائی، پھر میں اس کے پاس آیا، اس سے تقاضا کرتا تھا، پھر حدیث کا ذکر کیا اور کہا: ''أم اتخذ عند الرحمن عهدا قال موثقا''، یعنی عہد کی تفسیر موثق کے ساتھ کی۔[3] میثاق و موثق عہد و استواری کو کہتے ہیں، اس سے غرض محکم و مضبوط عہد و پیمان ہے۔ عبد الرزاق رحمہ اللہ کے الفاظ مسروق کی روایت سے یہ ہیں کہ خباب نے کہا ہے کہ میں مکے میں ایک لوہار تھا۔ میں نے عاص بن وائل کی مزدوری کی، اس پر میرے کئی درہم جمع ہوگئے تو میں اس کے پاس آیا کہ اس سے تقاضا کروں، اس نے مجھ سے کہا کہ میں تیرا قرض اس وقت تک ادا نہیں کروں گا جب تک کہ تو محمد ﷺ کا انکار نہ کرے۔ میں نے کہا کہ میں محمد ﷺ کا انکار نہیں کروں گا، یہاں تک کہ تو مرے اور پھر اُٹھایا جائے۔ وہ بولا: پھر جب میں اُٹھایا جاؤں گا تو میرے لیے مال و اولاد ہوگی۔ سیدنا خباب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[4]

---

[1] فتح البيان (٨/ ١٩٥۔ ١٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٥) مسند أحمد (٥/ ١١٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٦) [4] تفسير الصنعاني (٣/ ١٣) اس کی سند صحیح ہے۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کئی آدمی عاص بن وائل سہمی سے قرض کا مطالبہ کرتے تھے، لہٰذا وہ اس کے پاس آئے اور اس سے تقاضا کرنے لگے، وہ بولا کہ کیا تم گمان نہیں کرتے ہو کہ جنت میں سونا چاندی ریشم ہے اور ہر قسم کے میوے ہیں، وہ بولے ہاں۔ کہا تو پھر تمھاری جائے وعدہ آخرت ہے، پس قسم ہے اللہ کی! البتہ میں ضرور مال و اولاد دیا جاؤں گا اور البتہ میں دیا جاؤں گا تمھاری کتاب کی مثل، جس کو تم لائے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی مثل بیان کی، پس فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٧٧﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴾ اسی طرح امام مجاہد و قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ یہ آیت عاص بن وائل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[1] بعض نے ﴿ وَلَدًا ﴾ کو واو کی زبر سے پڑھا ہے اور دوسروں نے واو کی پیش سے، اور یہ اس کے ہم معنی ہے رؤبہ شاعر عربی نے کہا ہے ؎

الحمد لله العزيز فردا　　　لم يتخذ من ولد شيء ولدا

یعنی ساری حمد ہے اللہ کو جو غالب تنہا یکتا ہے، نہیں لی اس نے کسی شے کی اولاد سے اولاد۔

حارث بن حلزہ نے کہا: ؎

ولقد رأيت معاشرا　　　قد ثمروا مالا و ولدا

یعنی البتہ مقرر میں نے کئی گروہ دیکھے ہیں کہ ان کو مال و اولاد بکثرت ملی۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے، کسی کی ہجو کرتا ہے ؎

فليت فلانا كان في بطن أمه　　　وليت فلانا كان ولد حمار

یعنی کاش فلاں اپنی ماں کے پیٹ میں رہتا اور کاش فلاں اپنے گدھے کا بچہ ہوتا۔

کسی نے کہا کہ "وُلد" پیش کے ساتھ جمع اور زبر کے ساتھ واحد ہے اور یہ قیس کی لغت ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو اس نے جمع کیا دنیا سے اور جو اس میں عمل کیا اور ﴿ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اس سے تنہا آئے گا اور اس کے ساتھ نہ قلیل جائے گا نہ کثیر۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "ونرثه ما عنده" ہے۔[2]

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٤٦)　[2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٤٩) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٢۔ ١٨٣)

أَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾

اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں (81) ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے (82) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے کافروں پر شیطان چھوڑ رکھے ہیں، وہ جو انھیں خوب خوب (گناہوں پر) اُبھارتے ہیں؟ (83) چناں چہ آپ ان کی بابت جلدی نہ کریں، ہم تو بس ان کے دن گن رہے ہیں (84)

مشرکوں کے معبود قیامت کے دن ان کی بندگی کے منکر ہو جائیں گے:

اللہ پاک مشرکین کے حال کی خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود ٹھہرائے ہیں جن کی وہ پوجا کرتے ہیں، تاکہ وہ باطل معبود اُن کے مددگار ہو جائیں کہ اُن سے قوت پا کر قوی ہو جائیں اور اُن سے مدد چاہیں۔ پھر یہ خبر دی کہ بات ویسی نہیں ہے جیسی انھوں نے اپنے زعم میں سمجھی ہے اور جس امر کا انھوں نے طمع کیا ہے وہ نہ ہوگا، پس فرمایا: یوں نہیں وہ قیامت کے دن ان کی بندگی کے منکر ہو جائیں گے اور اُن پر ضد، یعنی ان کے برخلاف ہو جائیں گے، یعنی اس کے خلاف جو انھوں نے اُن کے بارے میں گمان کیا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ أَعْدَآءً وَكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف:٥۔ ٦] ”اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔“

امام ابونہیک رحمہ اللہ نے یوں پڑھا ہے: ”كُلٌّ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ“ یعنی ہر ایک ان کی عبادت سے منکر ہوگا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بِعِبَادَتِهِمْ ﴾ کے معنی ”بعبادة الأوثان“ ہیں، یعنی ضمیر مضاف الیہ بتوں کی طرف پھرتی ہے۔ اور ﴿ ضِدًّا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ ہو جائیں گے ان کے بخلاف اس بات کے جس کی اُمید اُن سے وابستہ کی ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ”ضد“ سے مراد اعوان، یعنی مددگار ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اُن پر عون، یعنی مددگار ہو جائیں گے، ان سے جھگڑیں گے اور اُن کو جھٹلائیں گے، یعنی ان کا گمان تو یہ تھا کہ وہ ان کے نفع کے لیے مدد و معاون ہوں گے اور وہ اُلٹا اُن کے ضرر اور نقصان پر معاون ہو جائیں گے۔ عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ضد سے مراد قرناء ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ قرناء آگ میں بعض ان کا بعض کو لعنت کرے گا اور بعض بعض کا منکر ہوگا۔ یعنی عابد و معبود دونوں

دوزخ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے۔ ایک رسی میں بندھے اور جکڑیں رہیں گے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ ضِدًّا ﴾ سے مراد "الخصماء الأشداء في الخصومة" ہے، یعنی یہ تو باطل معبودوں کو اپنا معین و مددگار سمجھے تھے، حالانکہ وہ بڑے جھگڑنے والے خصومت کرنے والے ہوگئے، جن کو دوست سمجھتے تھے وہی دشمن بن گئے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ضد" کے معنی اعداء ہیں، یعنی دشمن۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضد کے معنی بلا ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضد حسرت ہے،[1] یعنی جن کو دافع بلا سمجھا تھا، وہی خود بلا ہو کر پیچھے پڑ گئے۔ حسرت یہ ہوگی کہ جن کو نافع سمجھا تھا وہی ضرر کا باعث ہوگئے۔ وہ تو ان کو پوج پوج کر مرے کہ ان کو ان کی پوجا سے نفع ہوگا، نفع کہاں وہ ضرر دینے کو تیار ہوگئے، افسوس ساری پوجا پتری برباد ہوگئی۔ عمرِ عزیز خاک میں مل گئی، لینے کے دینے پڑ گئے۔

﴿ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴾ کی تفسیر میں علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ "تغويهم إغواء"، یعنی شیاطین کافروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ عوفی کے الفاظ ان سے یوں ہیں کہ "تحضونهم على محمد ﷺ و أصحابه"، یعنی شیطان کفار کو نبی کریم ﷺ پر اور آپ ﷺ کے اصحاب پر برانگیختہ اور آمادہ کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: "تشليهم إشلاء"، قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: "تزعجهم ازعاجا"[2] اشلاء بلانے کو کہتے ہیں یا شکاری کتے وغیرہ کو بلانا، تاکہ اس کو شکار پر آمادہ کریں اور ازعاج برانگیختہ کرنے کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ شیاطین کفار کو بلاتے ہیں اور برانگیختہ کرتے ہیں اور اللہ کی نافرمانیوں کی طرف اُبھارتے ہیں۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "تغريهم إغراءً و تستعجلهم استعجالًا"، یعنی کفار کو آمادہ اور مستعد کرتے ہیں اور جلدی کراتے ہیں ان سے جلدی کرانا۔ غرض یہ کہ اُن کو اُبھار کر جلدی سے اُن سے معاصی کرا دیتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تطغيهم طغيانا"، یعنی معصیت میں اُن کو حد سے بڑھا دیتے ہیں۔[3]

حاصل یہ ہے کہ ﴿ تَؤُزُّ ﴾ کے معنی برانگیختہ کرنے کے ہیں اور الفاظ مذکورہ اس کے ہم معنی ہیں۔ فی الجملہ بعض میں تعلق کے لحاظ سے کچھ فرق ہے، مگر حاصل اور مراد میں ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴾[4] [الزخرف: ٣٦] "اور جو رحمٰن کے ذکر سے اندھا (غافل) ہو جائے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔" ع

---

1. تفسیر الطبري (١٨/ ٢٥٠۔ ٢٥١)
2. تفسیر الطبري (١٨۔ ٢٥١۔ ٢٥٢) الدر المنثور (٥/ ٥٣٧۔ ٥٣٨)
3. تفسیر ابن كثير (٣/ ١٨٣)
4. تفسیر الطبري (١٨/ ٢٥٢)

خانۂ دیو شود خانہ کہ خالی باشد

''خالی گھر شیطان کی رہایش گاہ ہوتا ہے۔''

﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ... الخ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے محمد! تم جلدی مت کرو اُن لوگوں پر عذاب کے واقع ہونے میں۔ ہم تو اُن کو ایک مدت کے لیے تاخیر دے رہے ہیں، جو گنی ہوئی مقرر کی ہوئی ہے اور وہ لامحالہ ضرور اللہ کے عذاب وعقوبت کی طرف جانے والے ہیں۔ اللہ پاک نے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غٰفِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۚ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ﴾ [إبراهيم: ٤٢] ''اور (اے نبی!) آپ مت خیال کریں کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔'' نیز فرمایا: ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ [الطارق: ١٧] ''تو (اے نبی!) آپ ان کافروں کو (ان کے حال پر) چھوڑ دیں، انھیں تھوڑی سی مہلت دیں۔''

نیز فرمایا: ﴿اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ [آل عمران: ١٧٨] ''ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ [لقمان: ٢٤] ''ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں، پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف مجبور کر دیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾ [إبراهيم: ٣٠] ''کہہ دیجیے: تم فائدہ اُٹھاؤ (دنیا میں) پھر یقیناً تمھاری واپسی آگ کی طرف ہے۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم تو ان کے واسطے برسوں، مہینوں، دِنوں اور گھڑیوں کو گنتے ہیں۔ علی بن ابی طلحہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ ہم تو دنیا میں ان کی سانسوں کو گنتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس حالت کو بیان فرمایا جس میں یہ کافر تھے، جنھوں نے ایسی بات کی تمنا کی جس کے مستحق نہیں ہیں اور اللہ پاک کی ہر قسم کھا بیٹھے ہیں، وہ یہی حالت ہے کہ اللہ پاک کے سوا اور معبود ٹھہرا لیے، اس لیے کہ اُن سے عزت اور قوت حاصل کریں۔ مفتی ابو السعود نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ یہ ایک گناہ کا بیان ہے جس کا ارتکاب سب کرتے ہیں۔ اس چیز کی ضد کو جس کے ترتب (صحیح ہونے) کی اس جنایت (گناہ) پر اُمید رکھتے ہیں، کافر معہود کے قول کو بیان کرنے کے بعد اور اس کو تسلیم کر لینے اور اس کے مضمون کی وضاحت کر دینے کے بعد۔[2] امام فراء رحمہ اللہ نے ﴿عِزًّا﴾ کی تفسیر یہ کی ہے، تاکہ ہو جائیں وہ معبود اللہ کے نزدیک آخر میں ان کی شفاعت کرنے والے۔[3] کسی نے کہا: تاکہ ان معبودوں کے سبب سے اللہ پاک کے عذاب سے متعزز

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٣) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٤) [2] تفسير أبي السعود (٥/ ٢٨٠) [3] معاني القرآن (٣/ ١٢٤)

اور ممتنع ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے بہ سبب ان کے بچ جائیں، وہ ان کے لیے پشت پناہ اور حصنِ حصین ہو جائیں کہ ان کو عذاب نہ پہنچے۔

﴿ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ ﴾ میں فعل کی ضمیر یا تو ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی طرف پھرتی ہے، یعنی کفار نے جن بتوں کو پوجا ہے سو وہ بت اس پوجا کا انکار کریں گے جس دن کہ اللہ پاک ان کو زبان دے گا، اس لیے کہ جس وقت کفار نے ان کو پوجا تھا، اس وقت وہ جمادات تھے، اس کو سمجھتے نہ تھے۔ یا ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہے، یعنی مشرکین اس بات کا انکار کریں گے کہ انھوں نے بتوں کو پوجا ہے۔ پہلی وجہ پر دو آیتیں دلالت کرتی ہیں پہلی یہ ہے: ﴿ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴾ [القصص: ٦٣] ''وہ ہماری عبادت کیا ہی نہیں کرتے تھے۔'' دوسری آیت یہ ہے: ﴿ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [النحل: ٨٦] ''تب وہ (شریک) ان کی بات ان کی طرف پھینک ماریں گے (اور کہیں گے:) بلاشبہہ تم تو یقیناً جھوٹے ہو۔'' اور دوسری وجہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''اللہ، ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔''

کلمہ ﴿ كَلَّا ﴾ کو تین طرح پڑھا گیا ہے، ایک تو ''كُلًّا'' کاف کی پیش سے اور تنوین بہ معنی ''جَمِيْعًا''. دوسرے ﴿ كَلًّا ﴾ کاف کی زبر کے ساتھ، یہ مصدر ہے، یعنی ''كل هذا الرأي كلا'' یعنی یہ رائے سست اور ضعیف ہے۔ تیسرے ﴿ كَلَّا ﴾ حرفِ ردع و زجر ہے، یہ قراءت زیادہ صحیح ہے۔ معنی یہ ہیں کہ امر یوں نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان اور وہم کیا ہے۔ وہ معبود تو اُن کی عبادت کے منکر ہوں گے۔ ﴿ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ یعنی جن معبودوں کو انھوں نے اپنے لیے عزت گمان کیا تھا، وہی ان پر ضد ہو جائیں گے۔ یعنی عزت کی ضد۔ عز کی ضد ذل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو موجبِ عزت سمجھا تھا، وہی موجبِ ذلت ہو گئے۔ اس معنی کی بنیاد پہلی وجہ پر ہے۔ رہی دوسری وجہ سو اس کی بنا پر یہ معنی ہوں گے کہ مشرکین معبودوں کی ضد اور دشمن ہو جائیں گے۔ ان کا انکار کریں گے، مگر اس کے بعد کہ ان کو پوجتے تھے، ان کو چاہتے اور اُن پر ایمان لاتے تھے۔

باقی رہی یہ بات کہ کلمہ ﴿ ضِدًّا ﴾ جمع کی خبر واقع ہوا ہے، حالانکہ یہ واحد ہے، پس اس کے واحد لانے کی دو وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ ضد اصل میں مصدر ہے اور مصادر موحد مذکر ہوا کرتے ہیں، یا اس لیے کہ مفرد ہے جمع کے معنی میں: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کے معنی میں دو وجہیں ذکر کی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے کافروں اور شیطانوں کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے کافروں کو شیطان سے نہیں بچایا نہ ان کو پناہ دی بخلاف مومنوں کے، جن کے حق میں یہ کہا گیا ہے: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٥] ''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں۔'' دوسری وجہ یہ ہے کہ شیاطین ان پر چھوڑ

دیے گئے ہیں اور اُن کے واسطے مقرر کیے گئے ہیں۔ بسبب اُن کے کفر کے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ ﴿ وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا ﴾[1] [الزخرف: ٣٦] ''اور جو رحمٰن کے ذکر سے اندھا (غافل) ہو جائے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں۔'' پس اس جگہ ارسال کے معنی تسلیط (مسلط کرنا) ہیں۔ اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا ابلیس کو یہ کہنا ہے: ﴿ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٤] ''اور ان میں سے جن پر بھی تیرا بس چل سکے انھیں اپنی آواز سے بہکا لے۔''

دوسری وجہ کی تتمۂ آیت تائید کرتا ہے، یعنی ﴿ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴾، اس لیے کہ از و ازیز وھز وھزیز واستفزاز ایک دوسرے کے برادر ہیں، ان سب کے معنی بے قراری اور بے چینی کو مزید حرکت دینا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ شیاطین کافروں کو حرکت دیتے ہیں اور اُن کو معاصی پر اُبھارتے ہیں اور برانگیختہ کرتے ہیں اور گمراہ کرتے ہیں، ان کی خواہشوں کو زینت دے کر اور اُن کی نظروں پر محبوب بنا کر۔ یہی شیاطین کا کفار پر مسلط کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أز" کے معنی استعجال ہیں، یہ اسی معنی کے لگ بھگ ہیں جو ہم ذکر کر چکے ہیں، کیونکہ تحریک و تہییج (ابھارنا) و استفزاز (بہکانا) و ازعاج (بے چین و بے قرار کرنا) ہی استعجال ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا سیاق رسول اللہ ﷺ کو ان کے حال پر تعجب دلانے اور آپ ﷺ کو اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ یہ سب شیاطین کے گمراہ کرنے اور اغواء کرنے کے سبب سے ہے اور یہ جملہ شیاطین یا کفار یا دونوں کے حالات کی عکاسی کرتا ہے یا جملۂ مستانفہ ہے۔ مستأنفہ وہ ہے جو سوال مقدر کے جواب میں واقع ہو۔ گویا کہا گیا کہ شیاطین کفار کے ساتھ کیا کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا کہ ﴿ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴾۔ اس آیتِ کریمہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ پاک ساری کائنات کا مدبر ہے۔

﴿ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ﴾ سو تو جلدی مت کر ان پر کہ اللہ سے ان کا ہلاک کرنا طلب کرے اُن کی سرکشی کے سبب سے، یا ان کے کفر پر جمے رہنے اور حق کے ساتھ عناد کی وجہ سے۔ ان کو اُن کے حال پر چھوڑ دے یہاں تک کہ تو اور مومنین اُن کے شر سے نجات پائیں اور ان کے فساد سے زمین پاک صاف ہو جائے۔ پھر اللہ پاک نے اس ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴾ یعنی ہم تو اُن کی عمروں میں سے دنوں اور راتوں اور مہینوں اور سالوں کا شمار کرتے ہیں، تاکہ ان کی اجلیں پوری ہو جائیں، لہٰذا جو کچھ اُن سے واقع ہوتا ہے اس کو مہمل نہ چھوڑیں گے، بلکہ اس کو ان پر ضبط (تحریر) کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم ان سے اس کا مؤاخذہ کریں گے۔ یا ہم ان کے قدموں کو یا لحظات کو، یعنی نظروں اور گھڑیوں کو شمار کرتے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے اعمال کو۔[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو اُن پر جلدی مت کر، ہم تو

---

[1] معانی القرآن (٣/ ٣٤٥) فتح القدير (٣/ ٤٨٢) [2] تفسير القرطبی (١١/ ١٥٠)

اُن کو تاخیر دیتے ہیں، تاکہ وہ اور زیادہ گناہ کریں۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عد" قلت سے کنایہ ہے۔[1] اور یہ اس کے منافی نہیں ہے، جو گزر چکا ہے کہ اللہ پاک درازی کرتا ہے، اس شخص کے لیے جو گمراہی میں ہے، اس لیے کہ یہ درازی ان کے نزدیک ظاہر حال کی نسبت سے ہے اور وہ انجام کار کے اعتبار سے اور وقت کو شمار کرنے کے لحاظ سے بہت قلیل مدت ہے۔[2]

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف (بطور) مہمان اکٹھا کر لائیں گے (85) اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے (ہی) ہانک لے جائیں گے (86) (اس روز) وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھیں گے، سوائے اس کے جس نے رحمٰن سے عہد لیا (87)

روزِ قیامت پرہیزگاروں اور مجرموں کا انجام:

یعنی جس کو اللہ نے وعدہ دیا وہی سفارش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اولیائے متقین کے حال کی خبر دیتا ہے، جو دارِ دنیا میں اس سے ڈرے اور انھوں نے اس کے رسولوں کی پیروی کی اور جس بات کی رسولوں نے ان کو خبر دی اس میں ان کو سچا جانا اور جس امر کا اُن کو حکم دیا، اس میں اُن کی اطاعت کی اور جس بات سے ان کو منع و زجر کیا، اس سے باز رہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ اللہ پاک اُن کو اکٹھا کر کے ایسے لائے گا کہ وہ اس کی طرف سوار ہو کر آئیں گے۔

"وفد" اس جماعت کو کہتے ہیں جو سوار ہو کر آئے، اسی سے وفود ہے۔ وفود وہ لوگ ہیں جو قاصد بن کر آتے ہیں۔ ان کا آخرت کی سواریوں پر سوار ہونا نور کے منتخب و برگزیدہ اونٹوں پر ہوگا اور وہ اسی شے پر وفود کریں گے، یعنی آئیں گے جو سب سے بہتر و برتر ہوگی، یعنی اللہ کے دارِ کرامت و رضوان کی طرف کہ وہ بہشتِ عنبر سرشت ہے۔ غرضیکہ متقی، پرہیزگار، فرماں بردار لوگوں کو اللہ پاک بڑی آؤ بھگت و تعظیم و تکریم کے ساتھ عمدہ عمدہ نور کے اونٹوں پر سوار کر کے مہمانانِ عزیز کی طرح جنت کی طرف بلائے گا۔ رہے مجرمین مکذبین جنھوں نے رسولوں کی تکذیب اور مخالفت کی، پس وہ سختی اور درشتی سے دوزخ کی طرف پیاسے کھینچے جائیں گے۔ امام عطا، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن، قتادہ رحمہم اللہ اور بہت لوگوں نے یہی کہا ہے[3] اور اسی جگہ کہا جائے گا: ﴿ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴾

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ١٨١) [2] فتح البيان (٨/ ١٩٨۔ ٢٠٠)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٥) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٤)

یعنی کون سا فریق بہتر ہے مقام میں اور خوب تر مجلس میں۔ ﴿ وَفْدًا ﴾ کی تفسیر میں کئی روایتیں وارد ہوئی ہیں:

① امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام ابن مرزوق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ مومن کے اپنی قبر سے نکلنے کے وقت ایک نہایت ہی حسین صورت والا، اس کا استقبال کرے گا، روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں: «أَحْسَنُ صُوْرَةً رَآهَا وَأَطْيَبُهَا رِيْحًا» ایسی صورت اس نے کبھی نہ دیکھی ہوگی اور نہایت خوشبو دار۔ مومن اس سے کہے گا تو کون ہے؟ وہ کہے گا: کیا تو مجھے نہیں پہچانتا؟ مومن کہے گا: نہیں، مگر بے شک اللہ نے تیری بو کو خوشبو کیا ہے اور تیرے چہرے کو حسین اور خوبصورت بنایا ہے، وہ کہے گا: میں تیرا عملِ صالح ہوں اور تو اسی طرح دنیا میں تھا، حسن العمل وطیب العمل، یعنی تیرے اعمال دنیا میں خوبصورت وخوش بو تھے، لہٰذا میں اس زمانۂ دراز تک دنیا میں تجھ پر سوار ہوا، اب آ تو مجھ پر سوار ہو جا۔ پس مومن اس پر سوار ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ اللہ پاک کا وہی قول ہے: ﴿ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴾[1]

② علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ وَفْدًا ﴾ سے مراد ”رُكْبَانًا“ ہے، یعنی سوار ہو کر آئیں گے۔

③ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ”وفدا“ ”قال علی الابل“ یعنی اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں گے۔

④ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نجائب سوار ہو کر آئیں گے۔ یہ جمع ہے نجیب کی، نجیب شتر گزیدہ کو کہتے ہیں، یعنی عمدہ منتخب اونٹ۔

⑤ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: ”على الإبل النوق“. یعنی اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے۔

⑥ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”وفدا“. ”قال إلى الجنة“ یعنی جنت کی طرف آئیں گے۔[2]

⑦ عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے والد ماجد کی مسند میں نعمان بن سعد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ہم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، پس انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴾ فرمایا: ”لا واللہ“ یعنی قسم ہے اللہ کی! وہ اپنے پاؤں پر حشر نہیں کیے جائیں گے اور وفد اپنے پاؤں پر حشر نہیں کیے جاتے ہیں، یعنی جو لوگ بادشاہوں کی زیارت کے لیے یا طلب وعطا کے لیے جمع کیے جاتے ہیں، وہ پیادہ پا نہیں بلائے جاتے ہیں، لیکن اونٹنیاں ہیں کہ خلائق نے ان کا مثل نہیں دیکھا، اُن پر سونے کے کجاوے ہیں، پس وہ ان پر سوار ہوں گے، یہاں تک کہ جنت کے دروازوں کو کھٹکھٹائیں گے۔ (وهكذا رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير من حديث عبد الرحمن بن إسحق مدني به) (یہ شخص نعمان سے راوی ہیں) اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ ان پر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٨٤) الدر المنثور (٣/ ٢٦٣)
[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٥٤۔ ٢٥٥)

سونے کے کجاوے ہوں گے اور اُن کی باگیں زبر جد کی ہوں گی اور باقی روایت اسی کے مثل ہے۔[1]

(8) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک نہایت غریب مرفوع حدیث علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، وہ یہ کہ ابو معاذ بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، پس یہ آیت پڑھی: ﴿ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴾ تو علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں نہیں گمان کرتا ہوں وفد کو، مگر سوار۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، بے شک وہ جس وقت اپنی قبروں سے نکلیں گے تو استقبال کیے جائیں گے یا لائی جائیں گے سفید اونٹنیاں، ان کے پَر ہوں گے اور اُن پر سونے کے کجاوے ہوں گے، اُن کی جوتیوں کے تسمے ایک نور ہوگا کہ ان سے ہر قدم حدِ نگاہ تک چمکے گا۔ پھر وہ ایک درخت کے پاس پہنچیں گے، اس کی جڑ سے دو چشمے بہہ رہے ہوں گے، لہٰذا ان میں سے ایک سے پییں گے تو وہ اُن کے پیٹوں کے اندر کا سب میل کچیل دھو ڈالے گا اور دوسرے چشمے سے نہائیں گے، اس کے بعد کبھی نہ اُن کے چمڑے گرد آلود ہوں گے اور نہ بال، اور اُن پر نعیم کی تازگی جاری ہوگی، یعنی عیش و آرام کی ترو تازگی اُن کے بدنوں اور چہروں پر ظاہر ہوگی، پھر وہ جنت کے دروازے پر پہنچیں گے یا آئیں گے تو ناگاہ ایک سرخ یاقوت کا حلقہ ہوگا، جو سونے کے تختوں پر ہوگا، وہ اس حلقے سے تختے پر ماریں گے تو اس کی ایک طنین یا جھنکار سنائی دے گی۔ اے علی! پس ہر حور کو یہ بات پہنچ جائے گی کہ اس کا خاوند آ گیا تو وہ اپنے قیم، یعنی کارکن کاروباری کا مدار کو بھیجے گی تو وہ اس کے لیے دروازہ کھول دے گا، وہ جب اس قیم کو دیکھے گا تو اس کے واسطے گر پڑے گا۔

مسلمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اس کو، یعنی ابو معاذ رحمہ اللہ کو گمان کرتا ہوں کہ اس نے کہا: "سَاجِدًا" یعنی وہ قیم کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑے گا۔ قیم کہے گا: تو اپنا سر اُٹھا پس میں جو ہوں سو تیرا قیم ہوں "وُكِّلْتُ بِأَمْرِكَ" یعنی میں تیرے کام کاج کے لیے مقرر کیا گیا ہوں، پھر وہ اس کے پیچھے ہولے گا اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرے گا، پس جلدی حور کو خفت اور سبکی پر آمادہ کرے گی تو وہ موتی اور یاقوت کے خیموں سے نکل آئے گی، یہاں تک کہ اس سے معانقہ کرے گی، پھر کہے گی: "أنت حبي و أنا حبك، وأنا الخالدة التي لا أموت، و أنا الناعمة التي لا أباس، و أنا الراضية التي لا أسخط، و أنا المقيمة التي لا أظعن" "تو میرا دوست ہے اور میں تیری دوست ہوں اور میں وہ ہمیشہ رہنے والی ہوں کہ نہ مروں گی اور میں وہ نرم و نازک ہوں کہ سخت نہ ہوں گی اور میں وہ خوش رہنے والی ہوں کہ خفا نہ ہوں گی اور میں وہ رہنے بسنے والی ہوں کہ کوچ نہ کروں گی۔"

پھر وہ ایک گھر میں داخل ہوگا، جس کی بنیاد سے اس کی چھت تک ایک لاکھ گز کا فاصلہ ہے، اس کی بنیاد موتی

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٥٥) تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه عبد الرحمن بن إسحاق الواسطي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٥١)

کے پتھر پر ہے۔ ''طرائق أصفر و أحمر و أخضر لیس منها طریقة تشاکل صاحبتها'' طرائق جمع طریقہ کی ہے، اس کے معنی راہ اور حال کے ہیں اور گھر میں ستر تخت ہیں، ہر تخت پر ستر شیہ (گدے) ہیں اور ہر گدے پر ستر بیبیاں ہیں، ہر بی بی پر ستر حلے ہیں اور اس کی پنڈلی کا گودا حلّے میں سے دکھائی دیتا ہے۔ ان کے جماع کو ایک رات کے مقدار میں پورا کرے گا، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، کئی نہریں پانی کی جو متغیر نہیں ہوا کہا کہ صاف ستھرا، اسے کسی طرح کا میل نہیں اور کئی نہریں دودھ کی کہ اس کا مزہ نہیں بدلا اور نہ وہ ماشیہ (چوپایہ) کے تھنوں سے نکلا اور کئی نہریں شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذت ہیں، جس کو آدمیوں نے اپنے قدموں سے نہیں نچوڑا اور کئی نہریں شہد کی جو نہیں نکلا شہد کی مکھی کے پیٹ سے۔

پھر میوہ چننا چاہے گا، لہٰذا اگر چاہے گا تو کھڑے ہو کر کھائے گا، چاہے بیٹھ کر، چاہے تکیہ لگا کر، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴾ [الدھر: ١٤] ''اور اس (جنت) کے سائے ان پر جھکے ہوں گے، اور اس کے (پھلوں کے) گچھے ان کے تابع فرمان بنا دیے جائیں گے۔'' پھر کھانے کی خواہش کرے گا تو اس کے پاس سفید پرندے آجائیں گے اور کئی بار راوی نے کہا: سبز پرندے، پس اپنے پَر اوپر اُٹھائیں گے تو وہ ان کے پھلوں سے جس قسم کا کھانا چاہے گا، کھائے گا، پھر وہ اُڑ جائیں گے۔ اتنے میں ایک فرشتہ آ کر کہے گا: تم پر سلامتی ہو اور یہ فرمانِ باری تلاوت کرے گا: ﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٢] اگر حور کے بالوں میں سے ایک بال اہلِ زمین پر گر جائے تو وہ۔ هكذا وقع في هذه الرواية مرفوعاً، وقد رويناه في المقدمات من كلام علي بنحوه وهو أشبه بالصحة والله أعلم.[1]

﴿ وِرْدًا ﴾ کے معنی ''عَطَاشًا'' ہیں، یعنی مجرم لوگ دوزخ کی طرف پیاسے کھینچے جائیں گے۔ ﴿ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے واسطے وہ شخص نہ ہوگا جو اُن کی شفاعت کرے۔ جس طرح کہ مومنین میں بعض بعض کی شفاعت کرے گا، جیسے کہ اللہ پاک نے مجرمین کی طرف سے خبر دی: ﴿ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴾ [الشعراء: ١٠٠۔ ١٠١] ''تو (اب) ہمارے لیے کوئی سفارشی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی مخلص دوست۔'' اور ﴿ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ (آیتِ باب)۔ استثنائے منقطع ہے بمعنی لیکن۔ یعنی لیکن وہ شخص کہ اس نے اللہ رحمٰن کے نزدیک کوئی عہد لیا ہے۔ ''عہد'' سے مراد گواہی دینا ہے لا الہ الا اللہ کی اور اس کے حق کے ساتھ قائم ہو جانا ہے، یعنی لا الہ الا اللہ زبان سے کہنا، دل سے سچا جاننا اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی کو بجالانا، حکموں کو ادا کرنا، نواہی سے بچنا، یہی لا الہ الا اللہ کا حق قائم کرنا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٨٤۔ ١٨٥) اس کی سند میں ضعف اور انقطاع ہے۔ ''ابو معاذ سلیمان بن ارقم'' سخت ضعیف راوی ہے۔ نیز اسی راوی کی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات بھی ثابت نہیں ہے۔

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ عہد گواہی دینا ہے اس بات کی کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور اللہ کی طرف حول وقوت سے بَری ہو اور نہ اُمید رکھے مگر اللہ عزوجل سے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اسود بن یزید رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ، یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی، پھر فرمایا: تم اللہ کے نزدیک عہد لو، کیونکہ اللہ قیامت کے دن کہے گا کہ جس شخص کے لیے اللہ کے نزدیک کوئی عہد ہے تو اسے چاہیے کہ کھڑا ہو۔ لوگوں نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! پس تم ہم کو تعلیم کرو۔ فرمایا: کہو: "اللهم فاطر السموت والأرض، عالم الغيب و الشهادة! فإني أعهد إليك في هذه الحياة الدنيا أنك إن تكلني عملي يقربني من الشر و يباعدني من الخير و إني لا أثق إلا برحمتك فاجعل لي عندك عهد تؤديه إلى يوم القيامة إنك لا تخلف الميعاد" یعنی اے پیدا کرنے والے آسمانوں کے اور زمین کے، جاننے والے غائب اور حاضر کے! پس بے شک میں عہد کرتا ہوں تیری طرف اس دنیا کی زندگی میں اس بات کا کہ بے شک تو اگر مجھے سونپ دے گا میرے عمل کی طرف، تو وہ نزدیک کر دے گا مجھے برائی سے اور دور ڈال دے گا مجھے بھلائی سے اور مقرر میں بھروسا نہیں کرتا ہوں، مگر تیری رحمت کے ساتھ پس تو کر میرے واسطے اپنے نزدیک ایک عہد کہ تو اس کو ادا کرے میری طرف قیامت کے دن، بے شک تو وعدہ خلاف نہیں کرتا ہے۔[2] (قال المسعودي فحدثني زكريا عن القاسم بن عبد الرحمن، أخبرنا ابن مسعود كان يلحق بهن خائفا مستجيرا مستغفرا راهبا راغبا إليك ثم رواه من وجه آخر عن المسعودي بنحوه كذا في ابن كثير)[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے امرِ حشر کو ثابت فرمایا اور منکرینِ حشر کے شبہے کا جواب دیا تو چاہا کہ مکلفین کے حال کی تشریح کرے، جو اس وقت ہوگا۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ... الخ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم اس دن کو یاد کرو، جس دن ہم حشر کریں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کی طرف مہمان کے طور پر۔ حشر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کو جنت کی طرف اور دارِ کرامت رحمان کی طرف بلائیں گے یہ ویسا قول ہے کہ ﴿ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ ﴾ [الصافات: ٩٩] "بے شک میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں۔" "وفد" "وافد" کی جمع ہے، جیسے "رکب" "راکب" کی جمع ہے اور "صحب" "صاحب" کی جمع ہے۔ محاورے میں "وَفَدَ يَفِدُ وَفْدًا" بولتے ہیں، جس وقت کوئی شخص بادشاہ کی طرف نکلے یا امرِ خطیر وعظیم الشان کام کی طرف جائے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے "وفد" کے متعلق اسی طرح کہا ہے۔[4] باقی اقوال و روایات پہلے گزر چکے ہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٥)
[2] المعجم الكبير (٩/ ١٨٦)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٥-١٨٦)
[4] الصحاح للجوهري (٣/ ١١٥)

ایک حدیث صحیحین وغیرہما کی بروایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن لوگ تین طریقوں پر حشر کیے جائیں گے، اس حال میں کہ وہ ہوں گے رغبت کرنے والے اور ڈرنے والے، دو آدمی ایک اونٹ پر اور تین ایک اونٹ پر اور چار ایک اونٹ پر اور دس ایک اونٹ پر اور باقیوں کو آگ حشر کرے گی۔ وہ قیلولہ کرے گی ان کے ساتھ، جس جگہ وہ قیلولہ کریں گے اور رات بسر کرے گی ان کے ساتھ، جہاں وہ رات بسر کریں گے اور صبح کرے گی ہمراہ ان کے، جہاں وہ صبح کریں گے اور شام کرے گی ان کے ساتھ، جہاں وہ شام کریں گے۔[1]

اس بارے میں حدیثیں بہت ہیں۔ اس حدیث شریف میں جو لفظ طرائق ذکر فرمایا ہے، پس اس سے مراد تین فرقے ہیں۔ دس آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ باری باری سے سوار ہوں گے۔ پہلا فرقہ راغبین کا ہے، یہ لوگ سابقین ہیں۔ دوسرا فرقہ راہبین کا ہے، یہ لوگ عام مومنین ہیں۔ تیسرا فرقہ کفار اہلِ نار کا ہے، یہ لوگ اپنے پاؤں پر چلیں گے اور دو آدمی ایک اونٹ پر ہوں گے، یہ راغبین کے واسطے ہے اور دس ایک اونٹ پر ہوں گے، یہ راہبین کے لیے ہے یا سوار ہونا راغبین کے لیے ہے اور راہبین پیدل ہوں گے یا تینوں فرقے وہی ہیں جو آگ میں، یعنی کفار۔ اور سوار سابقین مخلصین ہیں اور جو لوگ آگ میں داخل ہونے سے خائف ہیں اور آگ سے خلاصی پانے کی اُمید رکھتے ہیں، وہ راہبین اور راغبین ہیں۔[2] (كذا في مجمع البحار)

آیتِ باب کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ قبروں سے نکلتے ہی سوار ہو جائیں گے، آیت کا ظاہر یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ موقف سے پھریں گے جب سوار ہوں گے، دونوں قولوں کی بنیاد پر اُن کے سوار ہونے کا وقت اس وقت تک ہوگا کہ وہ جنت کے دروازے کو ٹھونکیں گے۔ ﴿ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ... الخ﴾ میں ''سوق'' کے معنی راندن ہیں، یعنی ہنکانا، اس سے مراد چلنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور مجرمین سے مراد کفار ہیں۔ ''وِرْد'' سے عطاش مراد ہے، یعنی پیاسے۔ اخفش وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی کہا ہے۔ امام فراء اور ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشاۃ، یعنی ورد سے مراد پیدل ہے۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشاۃ عطاشاً، یعنی پیادہ پا اور پیاسے، جیسے اونٹ پانی پر وارد ہوتے ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وِرْدًا ﴾ مفعول لہ ہے، یعنی ہم ان کو دوزخ کی طرف کھینچ لائیں گے ورد کے واسطے، یعنی پانی پر آنے کے واسطے۔ کیونکہ ورد کے معنی ہیں پانی پر آنا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وِرْدًا ﴾ سے مراد ''أفراداً'' ہے۔ کہا ہے کہ ان اقوال کے درمیان کوئی تناقض (تضاد) نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ کھینچے جائیں گے پا پیادہ اور پیاسے ایک ایک کر کے۔ ''وِرد'' کی اصل وہ جماعت ہے جو پانی پر وارد ہوتی ہے، خواہ وہ جماعت پرندوں کی ہو یا اونٹوں کی یا لوگوں کی یا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦١)

[2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٥١٩) [3] تفسير القرطبي (١١/ ١٥٢۔ ١٥٣)

اس کے سوا۔ "وِرد" اس پانی کو بھی کہتے ہیں جس پر وارد ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ وہ کھینچے جائیں گے آگ کی طرف توہین اور ذلت اور خواری کے ساتھ۔ گویا وہ پیاسے چوپائے ہیں کہ پانی کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔

آیتِ کریمہ ﴿ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفٰعَةَ ﴾ جملۂ مستأنفہ ہے، بعض امور کے بیان کے لیے جو اس دن ہوں گے۔ فعل کی ضمیر فریقین کی طرف پھرتی ہے یا خاص متقین کی طرف یا خاص مجرمین کی طرف، یہ تین قول ہوئے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات کا اختیار نہیں رکھتے کہ اپنے غیر کے واسطے سفارش کریں۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ ان کا غیر یہ اختیار نہیں رکھتا کہ اُن کے لیے سفارش کرے۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔ استثنائے ﴿ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ میں دو قول ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ پہلی وجہ کی بنا پر یہ استثناء متصل ہے، یعنی دونوں فریق مذکور یہ اختیار نہیں رکھتے کہ سفارش کریں، مگر وہ شخص کہ وہ سفارش کے لائق اور قابل ہو گیا ہے اس چیز کے ساتھ جس کے سبب سے وہ اُن لوگوں میں سے ہو جائے کہ وہ اپنے غیر کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ مومن متقی ہو۔ پس اللہ پاک کے نزدیک عہد لینے کے یہی معنی ہیں۔ بعض نے عہد لینے کے یہ معنی کیے ہیں کہ اللہ پاک نے شفاعت کرنے کا اس کو امر کیا ہے۔ یہ قول عرب کے قول کی طرح ہے کہ "عهد الأمير إلى فلان بكذا"، یعنی عہد کیا امیر نے فلاں کی طرف فلاں بات کا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب امیر نے اس کو اس بات کا امر کیا ہو۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں۔

دوسرا قول ہے کہ استثناء منقطع ہے۔ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ ﴿ يَمْلِكُونَ ﴾ کی ضمیر خاص طور پر مجرمین کی طرف راجع ہو، کیونکہ اصل عبارت یوں ہوگی کہ اختیار نہیں رکھتے مجرمین سفارش کا، مگر وہ شخص جس نے رحمٰن کے نزدیک کوئی عہد لیا ہے اور وہ مسلمان ہیں، پہلا قول اوجہ (زیادہ واضح) ہے اور اسی کے ساتھ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے جزم کیا ہے صاحبِ کشاف کی طرح۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس وجہ پر بھی متصل ہو سکتا ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی کہ اختیار نہیں رکھتے مجرمین سفارش کا، مگر وہ شخص جو ان میں سے مسلمان ہے اور آیت اہلِ کبائر کے لیے حصولِ شفاعت پر دلالت کرتی ہے۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی مومن پر کسی طرح کا سرور داخل کیا تو اس نے مجھے یقیناً خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا تو یقیناً اس نے رحمٰن کے نزدیک عہد لیا، لہٰذا اس کو نہ چھوئے گی آگ، بیشک اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔[2] امام طبرانی رحمہ اللہ نے اوسط میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص آیا پانچوں نمازیں لے کر قیامت کے دن، اس نے ان کی یقیناً حفاظت کی۔ ان کے وضو پر اور اُن کے مقرر وقتوں پر اور اُن کے رکوع پر اور اُن کے سجود پر کم نہ کیا ان میں سے کسی چیز کو، تو آیا وہ اس حال میں کہ اس کے لیے اللہ کے نزدیک عہد ہے اس بات کا

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٤) الكشاف (٣/ ٤٥) [2] الدر المنثور (٥/ ٥٤٢)

کہ اس کو عذاب نہ کرے اور جو شخص آیا کہ اس نے یقیناً اُن میں سے کسی چیز کو کم کیا تو اس کے لیے اللہ کے نزدیک کوئی عہد نہیں، وہ اگر چاہے تو اس پر رحم فرمائے اور اگر چاہے تو اس کو عذاب کرے۔①

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ
السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾
اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ
وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ
عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

اور انھوں نے کہا: رحمٰن اولاد رکھتا ہے 88 البتہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات (گناہ) تک آ پہنچے ہو 89 قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں 90 اس (بات) پر کہ انھوں نے رحمٰن کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا 91 اور رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے 92 آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گے 93 بلاشبہ یقیناً اس (رحمٰن) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے 94 اور وہ سب یومِ قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے 95

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کی سخت تردید:

ہر گاہ کے اللہ تعالیٰ نے اس سورت شریف میں عیسیٰ علیہ السلام کی عبودیت ثابت فرمائی اور اُن کے پیدا کرنے کا ذکر کیا کہ مریم علیہا السلام سے باپ کے بغیر اُن کو پیدا کیا ہے تو شروع فرمایا مقامِ انکار میں اس شخص پر جس نے یہ زعم کیا کہ اللہ پاک کے لیے اولاد ہے، اس کی ذات پاک اس سے کہیں مقدس و منزہ و برتر ہے۔ پس ارشاد کیا اور لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔ البتہ تم یعنی یہ بات کہنے سے ایک بڑی بری چیز پر یقینی طور پر آئے ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِدًّا ﴾ سے مراد "عظیما" ہے۔② کہتے ہیں کہ ﴿ اِدًّا ﴾ ہمزہ کی زیر کے ساتھ اور زبر کے ساتھ اور ہمزہ کی مد کے ساتھ بھی (آدًا) تین لغت مشہور تر

---

① المعجم الأوسط (٤/ ٢١٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٢٢٤) فتح البيان (٨/ ٢٠٠۔ ٢٠٢)

② تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٦) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٦)

ہیں۔ ان میں سے پہلی لغت ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ ... الخ﴾ ہے۔ قریب ہے، لگتا ہے کہ یہ امر ہو جائے کہ بنی آدم کے ان فاجروں کے اس قول کو سن کر اپنے رب اور پروردگار کی عظمت اور جلال کے بارے میں آسمان پھٹ پڑے اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں، کیونکہ یہ سب پیدا کیے گئے ہیں اور بنیاد رکھے گئے ہیں رب کی توحید پر اور اس بات پر کہ نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر وہ، اور اس پر کہ اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی نظیر اور مثل و ہمتا ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی جورو ہے اور نہ کوئی اس کے جوڑ کا ہے، بلکہ وہ تو ایک تنہا، یکتا، اکیلا ہے۔

وفي كل شيء له آية　　　تدل على أنه واحد

یعنی ہر چیز میں اس کے واسطے ایک ایسی نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ بے شک یکتا ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　　ہر ورقے دفترے ست معرفت کردگار

''عقلمند کی نظر میں درختوں کی سبز پتیوں کا ہر ورق اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دفتر کا ورق ہے۔''

ابو نواس رحمہ اللہ نے چند شعر کیا خوب نظم کیے ہیں کہ تعریف تو نرگس کی کی ہے اور اس کا توڑ توحیدِ پروردگارِ عالم پر فرمایا ہے۔ ابن عساکر رحمہ اللہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اشعار کی بدولت ان کی مغفرت فرمائی گئی اور کیوں مغفرت نہ ہو، توحید ہی تو مومن کا راس المال اور مومن مسلم کا سرمایہ ہے اور سرِ دفترِ حسنات اور دیباچۂ کتاب اعمالِ صالحات ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو توحید پر زندہ رکھے اور توحید پر مارے۔ آمین ثم آمین۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

تأمل في نبات الأرض وانظر　　　إلى آثار ما صنع المليك
عيون فى لجين شاخصات　　　و أحداق كما الذهب السبيك
على قصب الزبرجد شاهدات　　　بأن الله ليس له شريك

''تو زمین کی روئیدگی میں غور و تامل کر اور بادشاہِ حقیقی نے جو کچھ صنعت و کاری گری کی ہے، اس کے آثار کی طرف نظر کر، کئی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں چاندی میں اور کئی حدقے ہیں، جیسے: سونا گلایا ہوا زبرجد کی نلکیوں پر، یہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ پاک کا کوئی شریک نہیں، غرضیکہ توحید عجیب عظیم نعمت ہے، جس طرح کہ شرک ایک بڑا عذاب ہے۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر آیۂ کریمہ مذکورہ میں روایت کیا ہے کہ بیشک شرک وہ ہے کہ ڈرے اس سے آسمان و زمین اور پہاڑ اور ساری خلائق مگر ثقلین، یعنی جن اور انسان اور قریب تھے کہ اس سے اللہ کی عظمت کے واسطے زائل ہو جائیں۔ جس طرح مشرک کو شرک کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی اسی طرح ہم اُمید رکھتے ہیں کہ اللہ موحدین کے گناہوں کو بخش دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے مردوں (قریب المرگ)

کو لا الہ الا اللہ کی شہادت کی تلقین کرو، پس جس شخص نے اس کو موت کے وقت کہا تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی، اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! پھر جو شخص اس کو اپنی صحت میں کہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «تِلْكَ أَوْجَبُ وَ أَوْجَبُ» یعنی صحت میں لا الہ الا اللہ کی گواہی دینا زیادہ تر واجب کرنے والا ہے جنت کو۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر لائے جائیں آسمان اور زمینیں اور جو کچھ اُن میں ہے اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے اور جو کچھ کہ ان کے نیچے ہے، پھر وہ ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ کی گواہی رکھی جائے تو وہ اُن پر راجح ہو جائے گی، یعنی ان پر شہادت کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اسی طرح روایت کیا ہے[1] اور حدیثِ بطاقہ اس کی شہادت دیتی ہے۔ واللہ أعلم۔ حدیثِ بطاقہ وہ مشہور حدیث ہے کہ قیامت میں ایک شخص کو لائیں گے، اس کے گناہوں کے دفتر ہوں گے، وہ اپنی ہلاکت کا یقین کرے گا، پھر ایک پرچہ لائیں گے، اس میں لا الہ الا اللہ لکھا ہوگا۔ پھر اس کو میزان میں رکھ دیں گے تو وہ اس کلمۂ طیبہ کی برکت سے بھاری ہو جائے گا۔[2] زہے برکت وعظمت وگرانی اس کلمۂ پاک کی۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يَتَفَطَّرْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ پھٹ جائیں اللہ کی عظمت کے خوف کے سبب سے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ زمین اللہ عزوجل کے لیے غصے کے مارے پھٹ جائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ هَدًّا ﴾ سے مراد ہدم (گر پڑنا) ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بعض پہاڑ بعض پر پے بہ پے ٹوٹ جائے۔[3] یعنی پیہم بعض پہاڑ بعض پر ٹوٹ کر گر پڑیں۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عون بن عبداللہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک پہاڑ البتہ پکارتا ہے پہاڑ کو اس کا نام لے کر: اے فلاں! کیا گزرا ہے تجھ پر آج کے دن کوئی اللہ عزوجل کا ذکر کرنے والا؟ تو وہ کہتا ہے: ہاں اور خوش ہوتا ہے۔ عون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ البتہ پہاڑ خیر کو زیادہ ترستے ہیں، پس وہ سنتے ہیں زُور اور باطل، یعنی جھوٹ اور خلافِ حق کو اور نہ سنیں اس کے غیر کو۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝٩٠ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝٩١ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴾ عوف رحمہ اللہ غالب بن عجرد سے روایت کرتے ہیں۔ غالب نے کہا کہ مجھے منیٰ کی مسجد میں ایک اہلِ شام کے آدمی نے بیان کیا کہ اس نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین اور درخت پیدا کیے، بنی آدم کے لیے ان درختوں میں کوئی نہ کوئی

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٨۔ ٢٥٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٥)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٩) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٦)

فائدہ ضرور تھا، زمین اور درخت ایسی حالت پر تھے کہ بنی آدم میں سے نافرمانوں نے یہ بات کہی کہ ﴿ اِتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴾ پھر جب انھوں نے اس کلمے کے ساتھ کلام کیا تو زمین کانپ اُٹھی اور درخت خاردار ہو گئے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم أيضا) کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتوں نے غصہ کیا اور جہنم برافروختہ ہوئی جب انھوں نے کہا جو کچھ کہ کہا۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ایذا پر صبر کرنے والا کوئی نہیں جسے وہ سنے۔ اللہ کے ساتھ شرک کیا جاتا ہے اور اس کے لیے اولاد ٹھہرائی جاتی ہے اور وہ ان کو عافیت دیتا ہے اور ان سے تکالیف رفع کرتا ہے اور ان کو روزی دیتا ہے۔ (أخرجاه في الصحيحين) ایک روایت میں یوں ہے کہ بے شک وہ ٹھہراتے ہیں اس کے لیے اولاد اور وہ اُن کو روزی دیتا ہے اور اُن کو عافیت دیتا ہے۔[3]

﴿ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یہ بات اس کے لیے درست نہیں ہے نہ اس کے جلال اور عظمت کی وجہ سے یہ اس کے لائق ہے، کیوں کہ اس کی خلق میں سے اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے، اس لیے کہ ساری مخلوق اس کی غلام ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے کہ آسمان اور زمین میں کوئی نہیں ہے جو رحمٰن کا بندہ ہو کر نہ آئے۔ اس کے پاس اُن کا شمار ہے اور اُن کی گنتی گن رکھی ہے۔ یعنی اللہ پاک اُن کی گنتی کو جان چکا ہے، جب سے کہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے، روزِ قیامت تک۔ ان کے نر کو اور مادہ کو اور چھوٹے اور بڑے کو اور اُن میں کا ہر ایک اس کے پاس قیامت کے دن اکیلا آئے گا۔ یعنی اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ نہ کوئی پناہ دینے والا مگر اللہ وحدہ لا شریک لہ، پھر وہ اپنی خلق میں حکم کرے گا جو چاہے گا اور وہ ایسا عادل ہے کہ ذرہ برابر ظلم نہ کرے گا اور نہ کسی پر ظلم فرمائے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴾ مستانفہ ہے، یہود و نصاریٰ کے قول کے بیان کے لیے اور عرب میں سے اس شخص کے قول کے لیے جو یہ زعم کرتا ہے کہ فرشتے اللہ پاک کی بیٹیاں ہیں۔ کلمہ ﴿ وَلَدًا ﴾ واو کی زبر اور پیش کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ جملہ ﴿ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴾ میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ شاید التفات کا نکتہ یہ ہے کہ اس قولِ منحوس کے قائل اس لائق نہیں ہیں کہ ان کو مخاطب کر کے یہ قول نقل کیا جائے، پھر ان کو رد کرنے کے لیے تنبیہ اور تقریع (دھمکی) کے انداز سے مخاطب کیا ہے۔ اس میں قولِ زِشت (بدصورت قول) کا رد ہے۔

"اِدّ" کہتے ہیں داہیہ اور امرِ فظیع کو اور اسی طرح "اِدّہ" جیسا کہ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[4] مطلب یہ

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٦۔ ١٨٧) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٥٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٤) مسند أحمد (٤/ ٤٠٥)

[4] الصحاح للجوهري (٣/ ٢)

ہے کہ یہ قول ایک بڑی ہولناک بلا اور امرِ زشت اور حد سے بڑا ہوا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِدًّا" سے مراد "عظیما" ہے سب کے خیال میں۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] معنی یہ ہیں کہ تم نے ایک بڑی اوپری بات کہی۔ کسی نے کہا ہے کہ "اِدًّ" کے معنی عجب ہیں۔ کلمہ ﴿ تَكَادُ ﴾ یائے تحتانی اور تائے فوقانی دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور ﴿ يَتَفَطَّرْنَ ﴾ کو "ینفطرن" بھی "انفطار" سے پڑھا ہے۔

ابو عبیدہ نے اسی قراءت کو پسند کیا ہے، اس لیے کہ قرآن شریف میں دو جگہ آسمان کے لیے یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے: ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴾ [الانفطار: ۱] "جب آسمان پھٹ جائے گا۔" دوسری جگہ یہ ہے۔ ﴿ اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ﴾ [المزمل: ۱۸] "جس (کی شدت) سے آسمان پھٹ جائے گا۔" اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "یتصدعن" پڑھا ہے۔[3] "انفطار و تفطر" کے معنی "تشقق" ہیں، یعنی پھٹ جانا، ﴿ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ ﴾ میں فعل دوسری دفع تاکید کے واسطے لایا گیا، کیونکہ ﴿ يَتَفَطَّرْنَ ﴾ اور ﴿ تَنْشَقُّ ﴾ کے ایک ہی معنی ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ زمین اس قول کے کہنے والوں کو لے کر دھنس جائے۔

﴿ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑ گر پڑیں اور منہدم ہو جائیں۔ ﴿ هَدًّا ﴾ کے نصب (زبر) کی چار وجہیں ہیں: ایک یہ کہ مصدر مؤکد ہے، یعنی مفعول مطلق واسطے تاکید کے، کیونکہ ﴿ هَدًّا ﴾ کا معنی ضرور ہدم (گر پڑنا) ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مفعول مطلق ہے فعل مقدر کا۔ یعنی "وَتَنْهَدُّ هَدًّا"۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جبال کا حال ہے بہ معنی "مهدودة"۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ﴿ تَخِرُّ ﴾ کا مفعول لہ ہے، یعنی "لأنها تنهد أن دعوا للرحمن ولدا"۔ "أن" کے پہلے لام مقدر ہے یا "مِنْ أَجْلِ". اور "دعوا" بمعنی "جعلوا" ہے۔ یعنی آسمانوں کا پھٹ جانا اور زمین کا دھنس جانا اور پہاڑوں کا گر پڑنا اس لیے ہے کہ انھوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ٹھہرائی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ محلِ رفع میں ہے اس بنیاد پر کہ فاعل ہے۔

﴿ تَخِرُّ ﴾ کا معنی یہ ہیں کہ گرا دیا پہاڑوں کو اولاد کے پکارنے نے۔ دعا کے معنی تسمیہ ہیں، یعنی نام رکھا انھوں نے واسطے رحمان کے بیٹا۔ یا دعا کے معنی نسبت کے ہیں، یعنی انھوں نے رحمان کی طرف اولاد کی نسبت کی، حالانکہ رحمٰن کے واسطے لائق نہیں کہ اولاد رکھے، کیوں کہ یہ اس پر محال ہے، اس لیے کہ اولاد جنسیت و حدوث (نیا پیدا ہونا) کی مقتضی ہے۔ آتِي أتىٰ سے صیغۂ اسم فاعل ہے اور اس سے مراد آیندہ کا زمانہ ہے۔ بلحاظ لفظ "کل" کے، اس کو اور آیت کو مفرد لائے ہیں اور ایک قراءت "آتٍ" اصل کی بنا پر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے کوئی آسمان و زمین میں، مگر وہ آئے گا رحمٰن کے پاس قیامت کے دن بندہ ہو کر، یعنی خاضع و ذلیل، بندگی کا اقرار کرتا ہوا حاضر

---

[1] فتح القدير (۳/ ۴۸۳) [2] تفسير الطبري (۱۸/ ۲۵۷) [3] فتح القدير (۳/ ۴۸۳)

ہوگا۔ عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اس میں داخل ہیں۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴾ [النمل: ۸۷] ''اور (یہ) سب عاجز ہو کر اللہ کے حضور جائیں گے۔'' مطلب یہ ہے کہ ساری خلق اس کی غلام ہے، پھر یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ اُن میں سے ایک اس کا بیٹا ہو۔'' ﴿ فَرْدًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ تنہا آئے گا، اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا، نہ اس کے ہمراہ کچھ مال ہوگا جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ [الشعرآء: ۸۸] ''جس دن نہ مال کوئی نفع دے گا اور نہ اولاد۔''[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً رحمٰن ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا (96) یقیناً ہم نے تو اس (قرآن) کو آپ کی زبان (عربی) میں خوب آسان کر دیا ہے، تاکہ آپ اس سے متقین کو بشارت دیں اور اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو ڈرائیں (97) اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، کیا آپ ان میں سے کسی ایک کو محسوس کرتے ہیں یا ان کی کوئی بھنک (آہٹ) بھی سنتے ہیں؟ (98)

اللہ تعالیٰ نیک لوگوں سے خود بھی محبت کرتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی محبت پیدا کرتا ہے:

یعنی ان سے محبت کرے گا، یا اُن کے دل میں اپنی محبت پیدا کرے گا، یا خلق کے دل میں اُن کی محبت ڈال دے گا۔

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ جو بندے نیک کام کرتے ہیں، یعنی وہ اعمال جو اللہ عزوجل کو راضی اور خوش کرتے ہیں، شریعتِ محمدیہ کی پیروی کی وجہ سے تو اللہ پاک اُن کی محبت اور اُلفت اپنے صالح بندوں کے دلوں میں جما دیتا ہے۔ یہ ایک ضرری امر ہے، اس سے کسی طرح کا مفر نہیں ہے۔ اس بارے میں نبی مکرم ﷺ سے صحیح حدیثیں کثیر تعداد میں وارد ہوئی ہیں:

(1) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: **بیشک اللہ تعالیٰ جس وقت کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلاتا ہے، پھر فرماتا ہے: اے جبریل! بے شک میں فلاں کو دوست رکھتا ہوں، لہٰذا تو اس کو دوست رکھ۔ کہا: پس دوست رکھتے ہیں اس کو جبریل علیہ السلام۔ کہا: پھر وہ پکار دیتے ہیں آسمان والوں میں کہ بے شک اللہ دوست رکھتا ہے فلاں کو، لہٰذا تم اس کو دوست رکھو۔ کہا: پس اس کو آسمان**

[1] فتح البیان (۸/ ۲۰۳۔ ۲۰۴)

والے دوست رکھتے ہیں۔ پھر اس بندے کے واسطے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ اور بے شک اللہ جس وقت کسی بندے سے بغض رکھتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو بلاتا ہے، پھر فرماتا ہے: اے جبریل! بے شک میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں، لہٰذا تو اس سے بغض رکھ، پس جبریل علیہ السلام اس سے بغض رکھتے ہیں۔ پھر آسمان والوں میں اعلان کر دیتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ فلاں سے بغض رکھتا ہے، لہٰذا تم اس سے بغض رکھو۔ کہا: پس اس سے آسمان والے بغض رکھتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں بغض رکھ دیا جاتا ہے۔[1] (و رواه مسلم من حديث سهيل و رواه أحمد و البخاري من حديث ابن جريج بنحوه)

(2) امام احمد رحمہ اللہ نے ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک بندہ البتہ طلب کرتا ہے اللہ عزوجل کی رضا کو، پھر ہمیشہ اسی طرح رہتا ہے، یعنی اللہ پاک کی خوشی کو ڈھونڈھتا ہے طرح طرح کی طاعتیں بجا لا کر۔ اور ہمیشہ اسی جستجو میں لگا رہتا ہے، پس اللہ عزوجل جبریل علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ بے شک فلاں بندہ میرا اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے راضی کرے، خبردار اور بے شک میری رحمت اس پر ہے۔ تو جبریل علیہ السلام کہتے ہیں کہ فلاں پر اللہ کی رحمت ہے اور اس کو حاملانِ عرش کہتے ہیں اور جو لوگ ان کے اِردگرد ہیں وہ کہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو ساتوں آسمان والے کہتے ہیں، پھر وہ زمین کی طرف اترتی ہے، یعنی رحمت اترتی ہے اس کے لیے زمین کی طرف اور اس رحمت سے مراد اللہ کی محبت ہے۔[2] (غريب، ولم يخرجوه من هذا الوجه)

(3) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک مِقت اللہ کی طرف سے ہے آسمان سے۔ شریک نے کہا ہے کہ مِقت محبت وصیت ہے (صیت کہتے ہیں ذکر، شہرت اور عرفان کو اور یہ خیر و شر دونوں میں ہوتی ہے، كذا في المجمع)۔[3] پس جس وقت اللہ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے کہ بے شک میں فلاں کو دوست رکھتا ہوں، پس جبریل علیہ السلام اعلان کر دیتے ہیں کہ بے شک تمھارا رب فلاں کو دوست رکھتا ہے، لہٰذا تم اس کو دوست رکھو۔ اسود بن عامر کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں شریک کو مقرر، اس نے کہا: پس اترتی ہے اس کے واسطے زمین میں محبت اور جس وقت اللہ کسی بندے کو مبغوض رکھتا ہے تو جبریل سے فرماتا ہے کہ بے شک میں مبغوض رکھتا ہوں فلاں کو، لہٰذا تو بھی اس کو مبغوض رکھ، کہا: پس اعلان کر دیتے ہیں جبریل علیہ السلام کہ بے شک تمھارا رب فلاں کو مبغوض رکھتا ہے، لہٰذا تم اس کو مبغوض رکھو۔ میں گمان کرتا ہوں شریک کو کہ اس نے کہا: پس جاری ہو جاتا ہے اس کے لیے بغض زمین میں۔[4] (غريب ولم يخرجوه)

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٧) مسند أحمد (٢/ ٤١٣)

(2) مسند أحمد (٥/ ٢٧٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح غير ميمون بن عجلان وهو ثقة" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٣٥)

(3) مجمع بحار الأنوار (٣/ ٣٧٤)

(4) مسند أحمد (٥/ ٢٦٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله وثقوا" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٤٧٩)

4 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت اللہ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو پکارتا ہے کہ میں نے فلاں کو اپنا دوست ٹھہرا لیا ہے، سو تم اس کو دوست رکھو، پس وہ آسمان میں اعلان کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے زمین والوں میں محبت اترتی ہے۔ لہٰذا یہ اللہ عزوجل کا وہی قول ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴾ (آیتِ باب)۔[1]

(و رواه مسلم والترمذي، وقال الترمذي حسن صحيح)

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "ودّ" کے معنی "حُب" ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ محبت دنیا کے اندر لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ دوست رکھتا ہے ان کو اللہ اور اُن کو اپنے مومن بندوں کی طرف محبوب کر دیتا ہے، جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے اور امام ضحاک رحمہ اللہ وغیرہم نے بھی۔ امام عوفی رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ "ود" مسلمانوں کی طرف سے دنیا میں اور رزقِ حسن اور لسانِ صادق۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے، ہاں قسم ہے اللہ کی! اہلِ ایمان کے دلوں میں۔ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ ہرم بن حیان رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ نہیں متوجہ ہوا کوئی بندہ اللہ کی طرف اپنے دل سے، مگر متوجہ کر دیتا ہے اللہ مومنوں کے دلوں کو اس کی طرف، یہاں تک کہ عطا کرتا ہے اس کو ان کی دوستی اور اُن کی رحمت۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ نہیں ہے کوئی بندہ کہ وہ کرے خیر یا شر مگر پہنا تا ہے اس کو اللہ عزوجل چادر اس کے عمل کی۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا: واللہ! البتہ میں اللہ کی ایسی عبادت کروں گا کہ اس کے ساتھ ذکر کیا جاؤں گا، پھر وہ دکھائی نہیں دیتا نماز کے وقت میں، مگر کھڑا ہوا نماز پڑھتے ہوئے۔ اور تھا وہ پہلا داخل ہونے والا مسجد کی طرف اور سب سے پیچھے اس سے نکلنے والا۔ اس پر وہ تعظیم نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر اسی حال پر سات مہینے تک ٹھہرا رہا اور وہ نہیں گزرتا تھا کسی قوم پر، مگر وہ کہتے کہ اس مرائی، یعنی ریا کار کی طرف دیکھو۔ پھر وہ اپنے نفس پر متوجہ ہوا تو کہا کہ میں نہیں دیکھتا ہوں اپنے آپ کو کہ میرا ذکر ہر آئینہ برائی کے ساتھ ہی ہو، البتہ کروں گا میں اپنے سارے عمل کو اللہ عزوجل کے واسطے، لہٰذا اس نے اس سے زیادہ نہ کیا کہ اپنی نیت کو قلب کر دیا اور زیادہ نہ کیا اس عمل سے جو وہ کیا کرتا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ قوم پر گزرتا تھا تو وہ کہتے کہ رحم کرے اللہ فلاں پر الآن الآن، یعنی اب وہ ٹھیک ہو گیا ہے اور حسن رحمہ اللہ نے یہی آیت پڑھی: "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا... وُدًّا"[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک اثر ذکر کیا ہے کہ یہ آیت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے بارے میں نازل ہوئی،[4]

---

1 صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٣٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦١)

2 تفسير الطبري (١٨/ ٢٦٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٨) 3 تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٨ـ ١٨٩) 4 تفسير الطبري (١٨/ ٢٦٣)

حالانکہ یہ قول خطا ہے، کیوں کہ یہ پوری سورت مکیہ ہے، اس میں سے ہجرت کے بعد کچھ نازل نہیں ہوا اور نہ اس کی سند صحیح ہے۔ واللہ أعلم.

﴿ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ ﴾ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف پھرتی ہے اور زبان سے مراد زبان عربی مبین فصیح کامل ہے اور خطاب نبی ﷺ کو ہے۔ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ پاک کے حکم کو مانتے ہیں، اس کے رسول کی تصدیق کرتے ہیں۔ ﴿ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق سے کج روی کرتے ہیں، باطل کی طرف جھکتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ استقامت نہیں کرتے، یعنی راست اور درست نہیں رہتے، سیدھی راہ پر نہیں چلتے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ "عوجا عن الحق" یعنی حق سے کج رو ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "اَلْأَلَدُّ الْخَصِمُ" یعنی بڑے بڑے جھگڑالو۔ امام قرظی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے: "اَلْأَلَدُّ الْكَذَّابُ" یعنی بڑے جھوٹے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حق سے بہرے ہیں۔ ان کے غیر نے کہا کہ اُن کے دل کے کان بہرے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قومِ لُدّ سے مراد قریش ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا لفظ یہ ہے کہ فجار ہیں، اسی طرح لیث بن ابی سلیم نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ ابن زید کے الفاظ یہ ہیں: "اَلْأَلَدُّ الظَّلُوْم" یعنی بڑے ظالم ہیں اور یہ آیت پڑھی ﴿ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴾ [البقرہ: ۲۰۴] "حالاں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔"[1]

﴿ مِنْ قَرْنٍ ﴾ سے وہ اُمت مراد ہے جس نے اللہ پاک کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا۔ ﴿ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴾ یعنی کیا تو دیکھتا ہے ان میں سے کسی کو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام ابو العالیہ، عکرمہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "رکز" سے مراد صوت ہے، یعنی آواز۔ امام حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ نے یہ معنی کیے ہیں کہ کیا تو دیکھتا ہے کسی آنکھ کو یا سنتا ہے کسی آواز کو۔ "رکز" اصل لغت میں صوتِ خفی کو کہتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "آخر سورة مريم ولله الحمد والمنة يتلوه إن شاء الله تعالى تفسير سورة طه، ولله الحمد"[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کلمہ "ود" کو جمہور قراء سبعہ وغیرہم نے واو کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے اور واؤ کی زیر اور زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس کے معنی حب، محبت اور دوستی کے ہیں، یعنی اللہ پاک اُن کی محبت اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دے گا بدوں اس کے کہ وہ اس کو ان اسباب سے حاصل کریں جو اس کا باعث ہوتے ہیں، جس طرح کہ ان کے دشمنوں کے دلوں میں رُعب ڈال دے گا اور یہ محبت اور رُعب کا ڈال دینا دنیا میں ہوگا۔ حرفِ سین

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٦٣۔ ٢٦٤) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٨٩)
[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٦٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٨٩)

جو استقبال کے لیے آتا ہے، یہ بات بتاتا ہے کہ محبت و رُعب کا ڈال دینا اس سے پہلے نہیں ہوا ہے اور وہ اس آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد کیا جائے گا، کیوں کہ اس آیت کے نزول کے وقت مومنین مکے میں تھے اور اس وقت وہ کفار کے درمیان ممقوت ومبغوض (دشمنی کی حالت میں) رہتے تھے، اس لیے اللہ پاک نے ان کو اس کا وعدہ دیا، جس وقت کہ اسلام ظاہر اور غالب ہوگا۔

پھر اللہ پاک نے مومنین کے دلوں کے درمیان اُلفت ڈال دی اور اُن کے دلوں میں محبت اور مودّت رکھ دی، یا یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک قیامت میں اُن کو محبت دے گا، جس وقت کہ ان کی نیکیاں سب گواہوں کے سامنے کھلم کھلا پیش کی جائیں گی تو اُن کے سینوں میں جو کچھ کینہ اور بغض ہوگا، اس سب کو دور کر دے گا، پس سب کے سب باہم ایک دوسرے کے محبّ ہو جائیں گے، کینہ اور دشمنی کا اَتا پتا نہ رہے گا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، معنی یہ ہیں کہ اُن کی محبت مومنین کے دلوں میں رکھ دے گا۔[1]

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تو کہہ: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِيْ عِنْدَكَ عَهْدًا وَّاجْعَلْ لِيْ عِنْدَكَ وُدًّا وَّاجْعَلْ لِيْ فِيْ صُدُوْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ مُوَدَّةً» یعنی اے اللہ! تو کر دے میرے لیے اپنے نزدیک ایک عہد اور کر دے میرے واسطے اپنے نزدیک دوستی اور کر دے میرے لیے مومنین کے سینوں میں محبت۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل فرمائی۔[2] سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا: سچی محبت ہے مومنین کے سینوں میں۔[3] اس بارے میں بہت سی احادیث اور آثار وارد ہوئے ہیں، چنانچہ بعض پہلے گزر چکے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے قرآن شریف کی خصوصاً اس سورت مبارک کی تعظیم کا ذکر فرمایا، اس لیے کہ یہ سورت توحید و نبوت پر اور معاندین کا حال بیان کرنے پر مشتمل ہے۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ ﴾

''تیسیر'' سے مراد تفصیل اور تسہیل ہے اور حرفِ با ''علیٰ'' کے معنی میں ہے اور حرفِ فا تعلیلِ کلام کے لیے ہے، جس کی طرف نظرِ کریم کھچ رہی ہے، گویا یوں کہا گیا کہ یہ کلام جو تم پر نازل کیا گیا ہے، تم اس کو پہنچاؤ، یا اس کی خوشی سناؤ اور اس سے ڈراؤ، اس لیے کہ ہم نے تو اس کو، یعنی قرآن پاک کو آسان کر دیا ہے، اس کو تمھاری لغت اور زبانِ عربی پر نازل کر کے اور ہم نے اس کی تفصیل کی ہے اور اس کو سہل کر دیا، پھر اس آسان کرنے کی وجہ بیان فرمائی، سو یوں ارشاد کیا: ﴿ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی تاکہ تم اس کے ساتھ ان لوگوں کو خوش خبری سنا دو جو تقویٰ کی

[1] المعجم الکبیر (۱۲/ ۱۲۲) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] الکشف والبیان (۶/ ۲۳۳) اس کی سند میں ''اسحاق بن بشر کوفی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] الدر المنثور (۵/ ۵٤٤) فتح القدیر (۳/ ٤٨٧)

صفت کے حامل ہیں، یعنی بڑے پرہیز گار اور اللہ ترس ہیں اور تا کہ تم اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو ڈراؤ۔ اگر ہم اس کو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں نازل کرتے تو خوش خبری دینا اور ڈرانا آسان نہ ہوتا، کیوں کہ مخاطب لوگ غیر عربی کو نہ سمجھتے۔ "لُدّ"، "أَلَد" کی جمع ہے، "أَلَد" سخت جھگڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴾ [البقرہ: ۲۰٤] ''حالاں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔'' اسی وادی سے ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ سے کفار کے ہلاک کرنے کا وعدہ کیا اور کفار کو وعید سنائی اور ان کو ڈرایا دھمکایا، پس یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ﴾ یعنی ہم ان سے پہلے کتنی امتیں، جماعتیں اور سنگتیں نیست و نابود کر چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر تمھارے وقت کے کفار راہِ راست اختیار نہ کریں اور کفر و انکار سے باز نہ آئیں تو اُن کا حال بھی اگلوں کا سا حال ہوگا۔

پھر اس جملے کے مضمون کی تقریر و تثبیت فرمائی، یوں ارشاد کیا: ﴿ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ ﴾ یعنی کیا تو شعور رکھتا ہے ان قرنوں میں سے کسی کا یا تو اس کو دیکھتا ہے یا پاتا ہے یا جانتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ وہ سب کے سب کھپ گئے، مر مٹ چکے، کسی کا ان میں سے اَتا پتا نہ رہا۔ احساس حاسہ سے، دریافت کو کہتے ہیں اور حواس پانچ ہیں اور حِس اور حسیس آوازِ خفی کو کہتے ہیں۔ "رِکز" خفا وصوتِ خفی کو بولتے ہیں۔ یزیدی و ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رِکز" وہ ہے کہ سمجھ میں نہ آئے کہ آواز ہے یا حرکت۔[1] معنی یہ ہیں کہ جس وقت اُن پر ہمارا عذاب آیا تو کوئی شخص باقی نہ رہا کہ دکھائی دے نہ کوئی آواز کہ سنی جائے، یعنی سب کے سب ہلاک ہوگئے۔ حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "بادوا جميعا فلم يبق منهم عين ولا أثر"[2] یعنی سب ہلاک ہوگئے ان سے کوئی عین و اثر باقی نہ رہا، لہٰذا اسی طرح یہ لوگ ہیں، جو کچھ تم پر اترا ہے، اگر اس کے تدبر و تأمل سے منہ موڑیں گے تو انجام ان کا ہلاک ہے، پس چاہیے کہ تم پر ان کا امر و حال سہل و آسان ہو۔[3] والله أعلم بالصواب و إليه المرجع والمآب.

الحمد للہ اس سورہ مبارکہ کی تفسیر ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ روز سہ شنبہ وقت عشاء کے ختم ہوئی، آخر ماہِ صفر میں لکھنا شروع ہوا تھا، درمیان میں بسببِ بعض امراض و مسہل کے تحریر میں حرج ہوا۔ ختم الله لنا بالحسنىٰ و أذاقنا حلاوته و رضوانه الأسنى آمين. و الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات والصلاة والسلام علىٰ خير البريات وعلىٰ آله و صحبه والصحابيات.

[1] فتح القدير (۳/ ٤٨٦) [2] تفسير البغوي (٥/ ٢٥٨) [3] فتح البيان (٨/ ٢٠٤۔ ٢٠٦)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورت طٰہٰ

اس سورت کی ایک سو پینتالیس یا بیالیس آیات ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے سب کے قول میں،[1] اور اسی کے عبداللہ بن عباس و عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم قائل ہیں۔[2] امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''الإتقان'' میں فرمایا ہے کہ ﴿ فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴾ اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔[3] امام ابن مردویہ نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا قرآن رکھا جائے گا اہلِ جنت کے سامنے، پس وہ اس میں سے کچھ نہ پڑھیں گے سوائے سورت طٰہٰ اور یٰسین کے، کیوں کہ وہ ان کو پڑھیں گے جنت میں۔[4]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قصہ ذکر کیا، جو اُن کی بہن اور خباب کے ہمراہ ہوا اور اُن دونوں کا سورت طٰہٰ کو پڑھنا، اور یہی سبب ہوا عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا۔ یہ قصہ کتبِ سیر میں مشہور ہے، جیسا کہ فتح البیان میں ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام الائمہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے کتاب التوحید میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے پڑھا طٰہٰ و یٰسین کو خلقِ آدم سے ہزار برس پہلے، پس جس وقت فرشتوں نے سنا تو کہا: خوشی ہو اس اُمت کو جس پر یہ نازل ہوگا اور خوشی ہو اُن زبانوں کو جو اس کے ساتھ بولیں گی۔ یہ حدیث غریب ہے، اس میں نکارت ہے۔ ابراہیم بن مہاجر (بن مسمار عن عمر بن حفص بن ذکوان) اور اُن کے شیخ میں کلام کیا گیا ہے۔[6]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰهٰ ۚ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۙ﴿۲﴾ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ۙ﴿۳﴾
تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ؕ﴿۴﴾ اَلرَّحۡمٰنُ
عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ﴿۵﴾ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٦٣) [2] الدر المنثور (٥/ ٥٤٨) [3] الإتقان في علوم القرآن (١/ ٥٠)

[4] الدر المنثور (٥/ ٥٤٨) [5] فتح البيان (٨/ ٢٠٧)

[6] كتاب التوحيد (١/ ٢٥٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨٩) اس کی سند میں ''ابراہیم بن مہاجر اور عمر بن حفص'' ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٢٤٨)

وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۤءُ الْحُسْنٰى ۝

طٰهٰ ① ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑیں ② مگر (یہ تو) اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے ③ اس ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے جس نے زمین اور اونچے آسمان تخلیق کیے ④ وہ رحمٰن ہے، عرش پر مستوی ہے ⑤ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے ⑥ اور اگر آپ بلند آواز سے بات کریں تو بلاشبہ وہ ہر راز اور (اس سے بھی) پوشیدہ تر بات کو جانتا ہے ⑦ (وہی) اللہ ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، سب اچھے نام اسی کے ہیں ⑧

اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قرآن متقیوں کے لیے کتابِ نصیحت ہے:

"سِرّ" یعنی چھپا جو آہستہ بولے اور اس سے چھپا جو دل میں ہو، یعنی ﴿ اَخْفٰى ﴾۔ کافر جب رحمٰن (نام) سنتے تو کہتے کہ تم ایک کو ٹھہراؤ کبھی کسی کو پکارتے ہو کبھی کسی کو۔

فتح البیان سے کلمہ ﴿طٰهٰ﴾ کے بارے میں اہلِ علم کے مختلف اقوال کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ کلمہ ﴿طٰهٰ﴾ کے معنی میں اہلِ علم نے کئی اقوال پر اختلاف کیا ہے:

① ایک قول یہ ہے کہ من جملہ اس متشابہ کے ہے جس کی مراد سمجھ میں نہیں آتی۔ ② یہ معنی "یَا رَجُل" ہے، قبیلہ عکل میں اور زبانِ قبیلہ عک میں (عرب کے قبیلے)۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو عک کے کسی آدمی سے "یَا رَجُل" کہے گا تو وہ جواب نہ دے گا یہاں تک کہ تو طٰہٰ کہے۔ کسی نے کہا ہے کہ طٰہٰ لغتِ عک میں "یَا حَبِیْبِي" ہے، یعنی اے میرے دوست۔ امام قُطرب نے کہا ہے کہ طٰہٰ لغتِ طی میں بھی اسی طرح ہے، یعنی بمعنی "یَا رَجُل" اور اسی طرح امام حسن اور عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لغتِ سریانی میں بھی اسی طرح ہے، اس قول کو مہدوی نے بیان کیا ہے اور ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ طٰہٰ اسی طرح لغتِ نبطی میں ہے۔ امام سدی اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اسی طرح وہ لغتِ حبشہ میں ہے۔[1] کوئی مانع نہیں ہے اس سے کہ یہ کلمہ اس معنی کے لیے اُن سب زبانوں میں موضوع ہو، بشرطیکہ نقل صحیح ہو۔

③ ایک نام ہے اللہ پاک کے ناموں سے۔ ④ نبی کریم ﷺ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ⑤ اس

① تفسير القرطبي (١١/ ١٦٥۔ ١٦٦) فتح القدير (٣/ ٤٨٩)

سورت کا نام ہے۔ ⑥ حروفِ مقطعہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک معنی پر دلالت کرتا ہے۔ پھر کئی قول پر ان معانی میں اختلاف کیا ہے، جن پر یہ حروف دلالت کرتے ہیں، وہ سب قول تکلف اور تعسف (بے جا سختی) سے خالی نہیں۔ ⑦ اس کے معنی یہ ہیں کہ "طُوبیٰ لِمَنِ اهْتَدٰی"یعنی خوشی ہو جس نے ہدایت پائی۔ ⑧ اس کے معنی ہیں: "طَإِ الْأَرْضَ يَا مُحَمَّد" یعنی زمین کو روندو اپنے دونوں پاؤں سے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں قدموں کو برابر زمین پر رکھو۔ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہوا، جب آپ ﷺ تہجد کی نماز میں شدتِ تکان اور طولِ قیام کی وجہ سے ایک پاؤں پر کھڑے رہتے اور دوسرے کو راحت دیتے تھے۔ امام محمد بن انباری ؒ نے کہا ہے کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نماز کی مشقت کا تحمل فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک ورم کر آئیں اور تروّح اور آسایش کی طرف حاجت مند ہوں، اس پر آپ ﷺ سے فرمایا گیا: "طَإِ الْأَرْضَ" یعنی تم اتنی تکلیف اور مشقت نہ اٹھاؤ کہ آپ تروح اور آسایش کے حاجت مند ہوں۔ قاضی عیاض نے شفا میں ربیع بن انس سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ جس وقت نماز پڑھتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرے کو اُٹھا لیتے، اس پر اللہ پاک نے طٰہٰ نازل فرمائی، یعنی "طَإِ الْأَرْضَ يَا مُحَمَّد"۔ امام حسن بصری ؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے ﴿طٰهٰ﴾ پڑھا، "دَعْ" کے وزن پر، یہ امر ہے ساتھ "وَطْءَ" کے، اس کے معنی ہیں زمین کو روندنا۔[1] ﴿طٰهٰ﴾ کی اصل "طأْ" ہے، ہمزہ کو حرفِ ہا سے بدل دیا ہے۔ ⑨ ایک قسم ہے کہ اللہ پاک نے اپنے طَول و ہدایت کی قسم کھائی ہے۔

اکثر مفسرین سے یہی مروی ہے کہ ﴿طٰهٰ﴾ کے معنی "يَا رَجُل" ہیں، یعنی اے مرد۔ اس سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ امام حسن، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، مجاہد ؒ اور عبداللہ بن عباس ؓ کا یہی قول ہے۔[1] سوائے اس کے کہ بعض کہتے ہیں کہ طٰہٰ بمعنی "يَا رَجُل" حبشہ و نبطی و سریانی زبان میں ہے اور امام کلبی ؒ کہتے ہیں کہ زبان عک میں، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ابن انباری ؒ کہتے ہیں کہ اس معنی میں قریش کی لغت اس لغت کے موافق ہوگئی ہے، کیونکہ اللہ پاک نے اپنے نبی کریم ﷺ کو غیرِ قریش کی زبان کے ساتھ مخاطب نہیں فرمایا۔[2]

جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ طٰہٰ بمعنی "يَا رَجُل" لغاتِ عرب میں سے کسی لغت سے ہے تو وہ ظاہر المعنی اور واضح الدلالت ہوگا اور ان فواتح سور سے خارج ٹھہرے گا جن کے بارے میں سورۃ البقرہ کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ متشابہ سے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب طٰہٰ کے معنی "يَا رَجُل" کسی لغتِ عرب میں ثابت ہو چکے تو اب اس کے معنی ظاہر ہو گئے متشابہ میں سے نہ رہا اور اسی طرح جس وقت اس کے معنی لغاتِ عجم میں سے کسی لغت کے مطابق ہوں گے اور عرب نے اپنے کلام میں اسی معنی میں اس کا استعمال کیا ہوگا، جس طرح کہ باقی عجمی کلمے جن کو عرب نے استعمال

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٦٧) فتح القدير (٣/ ٤٨٩) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٦٦۔ ٢٦٨) [3] فتح القدير (٣/ ٤٨٩)

کیا ہے اور جو کتابِ عزیز میں موجود ہیں تو بھی کلمہ طہ اس استعمال کے سبب سے عرب کی لغت سے ہو گیا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ جو روایت کیا گیا ہے کہ طٰہٰ کے معنی "یَا رَجُل" ہیں۔ لہٰذا اگر یہ صحیح ہو جائے تو ظاہر ہے، ورنہ پھر وہی حق ہے جو سورۃ البقرہ میں مذکور ہو چکا ہے۔[1] اسی لیے علامہ محلی رحمہ اللہ نے یوں فرمایا ہے کہ "الله أعلم بمراده بذلك"۔[2] یعنی انھوں نے اس کے معنی کچھ بیان نہیں کیے، صرف یہ کہہ دیا کہ اللہ ہی اس سے اپنی مراد کو خوب جانتا ہے۔

جملہ ﴿ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ﴾ مستانفہ ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور تسکینِ خاطر کے لیے لایا گیا ہے، تاکہ جو آپ کو مشرکوں کی طرف سے تکلیف و کوفت، یعنی ماندگی و تکان اور محنت و مشقت پیش آیا کرتی تھی، اس سے آپ کے دل فیض منزل کو چین ملے۔ کلمہ "شقا" تکلیف کے معنی میں آتا ہے اور اس میں مشہور و معروف ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت میں "شقا" کی اصل "تعب وعنا" ہے۔[3] "تعب" ماندہ شدن کو کہتے ہیں، یعنی تھکنے عاجز ہونے کو اور عنا محنت و مشقت کھینچنے کو بولتے ہیں، پھر جب "شقا" کی اصل تعب وعنا ٹھہری تو اس کو چھوڑ کر کلمہ "شقا" ذکر فرمایا، شاید اس میں یہ بات بتانا منظور ہو کہ آپ پر قرآن شریف اس لیے اُتارا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سعید ہوں۔

"شقا" سعادت کی ضد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر! ہم نے قرآن کو تم پر اس لیے نہیں اُتارا کہ ان کے کفر پر تاسف کر کے اور اُن کے ایمان نہ لانے پر حسرت و افسوس کر کے تکلیف اور مشقت میں پڑو، کیونکہ تم پر صرف یہی ذمہ داری ہے کہ تم پہنچا دو۔ پس یہ ویسا قول ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ ﴾ [الكهف: ٦] "پھر شاید آپ تو خود کو ان کے پیچھے غم سے ہلاک کرنے والے ہیں۔" امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض نحوی کہتے ہیں کہ ﴿ لِتَشۡقٰٓى ﴾ کا لام لامِ نفی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لامِ جحود ہے۔ ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لامِ خفض ہے۔[4]

آیتِ کریمہ کی یہ تفسیر اس شخص کے قول کی بنیاد پر ہے جو یہ کہتا ہے کہ طہ باقی سورتوں کے فواتح کی مثل ہے، جو اسمائے حروف کے شمار کرنے کے لیے ذکر کیے گئے ہیں اور اگر طہ سورت کا نام ٹھہرایا جائے تو اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ مَآ اَنۡزَلۡنَا... الخ﴾ اس کی خبر ہوگا اور جب کہ بمعنی "یَا رَجُل" یا "طَإِ الْأَرْضَ" کے ٹھہرے گا تو بھی ﴿ مَآ اَنۡزَلۡنَا ... الخ﴾ جملہ مستانفہ ہوگا۔ اس جملے کے لانے سے غرض یہ ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو عبادت میں مبالغہ فرمایا کرتے تھے، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مصروف فرمایا جائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ پہلے پہل جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صدرِ قدمین (پاؤں کے پنجے) پر کھڑے ہوا کرتے تھے، جس وقت نماز پڑھتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے "طٰہٰ" الآیہ نازل فرمائی۔[5]

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٥٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٠٦) [3] تفسير القرطبي (١١/ ١٦٨)
[4] تفسير القرطبي (١١/ ١٦٨) [5] الدر المنثور (٥/ ٥٤٩)

اُن کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کفار نے کہا کہ یہ مرد اپنے رب کے ساتھ شقی ٹھہرایا گیا، اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔[1] ان کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ جس وقت رات کو نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو خود کو ایک رسی سے باندھ دیتے، تاکہ سو نہ جائیں، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ مراوحت فرمایا کرتے تھے اپنے دونوں قدموں کے درمیان، یعنی کبھی ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور کبھی دوسرے پاؤں پر، یہاں تک کہ یہ آیت اتری۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی اسناد کی تحسین کی ہے۔[2]

﴿ اِلَّا تَذْكِرَةً ﴾ کے نصب، یعنی زبر میں تین قول ہیں: ایک یہ کہ مفعول لہ ہے ﴿ اَنْزَلْنَا ﴾ کا اس قول کی طرح: "ما ضربتك للتاديب إلا إشفاقا عليك"، یعنی میں نے تجھے ادب دینے کے واسطے نہیں، بلکہ شفقت کے واسطے مارا ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ نہیں اُتارا ہم نے تم پر قرآن مشقت میں پڑنے کے لیے مگر نصیحت کے واسطے، دوسرا قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے کہ بدل ہے ﴿ لِتَشْقٰٓى ﴾ سے۔ یعنی "ما أنزلنا إلا تذكرة" معنی یہ ہیں کہ نہیں اُتارا ہم نے قرآن کو مگر نصیحت کے واسطے۔ ابو علی فارسی نے اس قول کا انکار کیا ہے، اس جہت سے کہ "تذكرة" اور "شقا" ایک ہوں گے، حالاں کہ "شقا" اور ہے اور "تذكره" دوسری چیز ہے۔ تیسرا قول ابو علی کا ہے کہ اس کا نصب مفعول مطلق ہونے کی بنا پر ہے، یعنی اتارا ہمارا ہم نے قرآن کو مگر اس لیے کہ نصیحت کرو تم اس کے ساتھ، یا مفعول لہ کی بنیاد پر منصوب ہے، یعنی نہیں اُتارا ہم نے تم پر قرآن، تاکہ تم مشقت میں پڑو بسبب اس کے، نہیں اُتارا ہم نے اس کو مگر واسطے نصیحت کے۔[3]

رہا استثناء سو جلال محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ منقطع ہے، اس لیے کہ تذکرہ جنسِ شقا سے نہیں ہے، جس کی نفی کی گئی ہے اور ﴿ اِلَّا ﴾ بمعنی لیکن ہے۔[4] یعنی لیکن اتارا ہم نے قرآن کو واسطے نصیحت کے۔ ﴿ لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾ یعنی واسطے نصیحت اس شخص کے جو اللہ سے ڈرا، یا اُس شخص کے لیے جس کا امر آیندہ خشیت کی طرف رجوع کرے گا، یا اس شخص کے لیے جس کے دل میں خشیت اور رقت ہے، وہی قرآن پاک کے اتارنے کے سبب سے اثر پذیر ہوگا، یا اس شخص کے واسطے ہے کہ اللہ پاک نے جان لیا ہے کہ وہ قرآن پاک کے ڈرانے سے ڈرے گا، کیوں کہ فائدہ پانے والا وہی ہے، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ ﴿ لِّمَنْ ﴾ میں لام واسطے عاقبت کے ہے، یعنی انجام کار کو قرآن شریف اس آدمی کے واسطے نصیحت و موعظت ہے، جس کو اللہ پاک جان چکا ہے کہ وہ خوف و خشیت کرے گا، ورنہ پڑھنے والے اور سننے والے تو بے حد و حساب ہیں اور ڈرنے والے ان کی نسبت بہت کم۔

﴿ تَنْزِيْلًا ... الخ ﴾ کے نصب میں کئی وجہ ہیں یا تو مفعول مطلق ہے فعل مقدر کا، یعنی "نزلناه تنزيلا" یا

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٦٦) [2] الدر المنثور (٥/ ٥٤٩) [3] فتح القدير (٣/ ٤٩٠) [4] تفسير الجلالين (١/ ٤٠٦)

بدل ہے "تذکرۃ" سے، یا مفعول ہے "یخشی" کا، یا منصوب ہے بنا بر مدح، یا بنا بر حال اور اس کو مرفوع بھی پڑھا ہے، اس صورت میں خبر ہوگی، مبتدا محذوف کی، یعنی "ھذا تنزیل" یعنی یہ اُتارا ہے اس شخص کی طرف سے جس نے پیدا کیا زمین کو اور اونچے آسمانوں کو۔ ﴿ اَلْعُلٰی ﴾ "علیا" کی جمع ہے، بمعنی مرتفع و بلند جس طرح کہ کبریٰ و صغریٰ کی جمع کبر وصغر کے وزن پر آتی ہے۔ خاص کر زمین و آسمان کی پیدایش کا ذکر اس لیے کیا کہ اللہ کی ان تمام مخلوقات میں سے جن کو بندے مشاہدہ کرتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ بڑے یہی زمین و آسمان ہیں۔ اس آیت میں اللہ پاک اپنے کمالِ عظمت اور عظیم جلال کی بندوں کو خبر دیتا ہے کہ جس شے کو تم ساری مخلوقات سے زیادہ ترعظیم دیکھتے ہو، اس کا پیدا کرنے والا وہی وحدہ لا شریک لہ ہے، اس کی عظمت و جلال و کمالِ سلطان کا کیا ٹھکانا ہے۔ لا إله إلا هو ولا رب سواه.

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴾ یہ نعت ماقبل سے مقطوع ہے، مقصد مدح کرنا ہے اور لغت میں عرش سریر کو کہتے ہیں اور سریر تخت کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عرش وہ ہے جو بلند ہو، پھر سایہ کرے۔ اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کا نام بھی عرش رکھا ہے اس کی بلندی کے اعتبار سے۔ ثعلب نے کہا ہے کہ "استواء" "إقبال علی الشيئ" کو کہتے ہیں، یعنی کسی چیز پر متوجہ ہونے کو بولتے ہیں۔ امام زجاج و فراء رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ استواء کنایہ ہے عز و ملک و سلطان سے۔

رہا ﴿ اِسْتَوٰی ﴾ بمعنی استقر کے سوا امام بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب "الأسماء والصفات" میں بروایت کثیرہ سلف کی ایک جماعت سے اس کو روایت کیا ہے اور ساری روایتوں کو ضعیف کر ڈالا ہے۔[2] امام مالک رحمہ اللہ سے استواء کے بارے میں یوں مروی ہے کہ استواء غیر مجہول ہے اور کیف غیر معقول ہے اور اس کے ساتھ ایمان واجب ہے اور اس سے سوال بدعت ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اہلِ سنت کہتے ہیں کہ "استواء علی العرش" اللہ پاک کی صفت ہے، بلاکیف۔ آدمی پر ایمان لانا واجب ہے اس کے ساتھ اور اس کے علم کو اللہ عزوجل کی طرف سپرد کرنا چاہیے۔

امام ثوری، اوزاعی، لیث، ابن عیینہ اور ابن مبارک رحمہم اللہ وغیرہم سے ان جیسی آیتوں میں جو صفات کے بارے میں آئی ہیں، اس طرح مروی ہے کہ "أَقِرُّوْهَا كَمَا جَاءَتْ بِلَا كَيْفٍ"[3] یعنی تم ان کو برقرار رکھو، جس طرح کہ وہ آئی ہیں، بلاکیفیت، یعنی ان پر ایمان لاؤ اور اُن کی کیفیت میں خوض مت کرو، بلاکیف اُن کو مان لو۔ اس میں دو مذہب ہیں: پہلا مذہب یہ ہے کہ اس بات پر قطعی یقین کرنا ہے کہ اللہ پاک مکان اور جہت (سمت) سے بلند تر اور برتر ہے اور اُن کی تاویل میں غور وخوض نہ کرنا ہے۔

امام خازن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور انھوں نے اسی کو پسند کیا ہے۔ دوسرا مذہب استواء میں تفصیل کے

---

(1) فتح القدير (٣/ ٤٩١) (2) الأسماء و الصفات (٢/ ٣٠٣_ ٣١٤) (3) تفسير البغوي (٣/ ٢٣٥_ ٢٣٦)

ساتھ غور وخوض کرنا ہے۔ اس میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ عرش کلامِ عرب میں سریر (تخت) کو کہتے ہیں، جس پر بادشاہ بیٹھتا ہے۔ پھر جس وقت اس کے لیے اس کا ملک مستقیم اور صحیح اور درست ہوتا ہے اور اس کا امر جاری اور اس کا حکم نافذ ہوتا ہے، تو "استوی علی عرشه و استوی علی سریره" کہتے ہیں، مَلک یعنی بادشاہ اپنے تختِ ملک پر مستوی ہوا۔ قفال اسی کے قائل ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو قفال نے کہا ہے وہ سچ اور درست ہے۔ اس سے مراد نفاذِ قدرت اور مشیت کا جاری ہونا ہے۔ اس کی صحت پر سورت یونس میں اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ﴾ [یونس: ۳] "پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا، وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔" دلالت کرتا ہے۔ سو "یدبر الأمر" قائم مقام تفسیر کے ہے واسطے ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ کے۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ اِسْتَوٰى ﴾ بمعنی "اِسْتَوْلٰی" اور "اِسْتَوْلٰی" کے معنی "غَلَبَ وَ ظَهَرَ" ہیں، یعنی غالب آیا۔ یہ معتزلہ کا مذہب ہے اور متکلمین کی ایک جماعت کا اور اس پر قولِ شاعر سے حجت پکڑی ہے ؎

قد استوی بشر علی العراق من غیر سیف و دم مهراق

یعنی بشر عراق پر غالب ہوا بغیر تلوار کے اور بغیر خون بہانے کے۔

اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ عرب لوگ استوی بمعنی استولی کو جانتے پہچانتے نہیں تھے۔ ان کے محاورے میں جو بولا جاتا ہے لہٰذا وہ یہ ہے کہ "استویٰ فلان علی کذا"یعنی فلاں شخص فلاں شے پر مستوی ہوا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں کہ وہ شے اس کی ملک میں نہ تھی، پھر وہ اس کا مالک ہوا، اس پر مستولی ہوگیا اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ساری اشیا کا مالک ہے اور اُن پر مستولی ہے، پس اس جگہ سوائے اور مخلوقات کے عرش کے لیے کون مخصوص ہے۔ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ مستوی اپنے عرش پر ہے اور فوق الاشیاء ہے، ان سے علاحدہ اور الگ تھلگ ہے۔ نہ اشیا اس میں حلول کرتی ہیں اور نہ وہ اُن میں حلول کرتا ہے، نہ وہ اشیا سے لگتا ہے نہ اُن کے مشابہ ہوتا ہے۔

امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا، پوچھا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا کہ اللہ اپنے عرش پر مستوی ہے جیسے کہ اس نے خبر دی ہے۔ وہ آدمی بولا کہ استویٰ کے معنی تو استولیٰ ہیں۔ ابن الاعرابی نے اس سے کہا کہ تو کیا جانے کہ عرب لوگ "استویٰ فلان علی الشيء"نہیں بولتے یہاں تک کہ اس کا اس شے میں کوئی مضاد اور مخالف ہو، پھر ان میں سے جونسا غالب آگیا تو اس غالب کے لیے یوں کہتے ہیں کہ "قد استولی علیه" یعنی وہ شخص اس شے پر غالب ہوگیا اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مضاد اور مخالف نہیں ہے، پس وہ اپنے عرش پر ہے، جس طرح کہ اس نے خبر دی، نہ اس طرح کہ بشر اس کو گمان کرتے ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۲۳۸۔ ۲۳۹) [2] تفسیر الخازن (۲/ ۲۳۹)

اس آیتِ کریمہ پر سورۃ الاعراف میں کلام گزر چکا ہے۔[1] اس بارے میں حفاظ و محدثین کے مستقل رسالے اور علاحدہ کتابیں ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کے درمیان ایک پرانا اختلاف چلا آتا ہے۔ حق بات وہی ہے جس طرف سلفِ امت و ائمۂ ملت گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو اُن کے ظاہر پر جاری کرنا چاہیے اور تکییف و تعطیل و تمثیل و تحریف و تشبیہ و تاویل نہیں کرنی چاہیے اور جس طرف امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ گئے ہیں وہ یہی ہے کہ اللہ سبحانہ مستوی ہے اپنے عرش پر بغیر حد و بغیر کیفیت کے۔ اسی قول کی طرف ان سے پہلے بہت سے لوگ سلف صالح میں سے جا چکے ہیں، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، مجتہدینِ اربعہ و اہلِ حدیث و اثر سے جو صفات کو جاری کرتے ہیں، جس طرح کہ وہ وارد ہوئے ہیں بغیر تحریف و تعطیل و تاویل کے۔ اس کی تحقیق میں بحث انتہائی طویل ہوتی ہے، یہ اس کی تحریر کی جگہ نہیں ہے۔

صاحب فتح البیان نے اپنے رسائل میں اس بحث کی تسلی بخش بحث کی ہے جیسے "انتقاد الرجیح" و "هداية السائل" و "بغية الرائد وغيره" فليرجع إليها۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ اس کی تفسیر میں صرف اس قدر کہا ہے کہ سورت اعراف میں اس پر کلام گزر چکا ہے، جو اس کے اعادے سے بے نیاز ہے اور اس بارے میں صحیح مسلک سلف کا طریقہ ہے، یعنی "امرار (اپنے ظاہری معنی پر جاری کرنا) یا اس چیز کا جاری کرنا جو اس بارے میں کتاب و سنت میں آئی ہے بغیر تکییف و تحریف و تشبیہ و تعطیل و تمثیل کے۔[3]

﴿ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو موجودات آسمانوں اور زمین میں اور اُن کے درمیان میں ہیں وہ اسی کی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا بَيْنَهُمَا ﴾ سے مراد "هَوَاء" ہے۔ "ثری" لغت میں خاک نمناک کو کہتے ہیں، پھر اگر وہ نمناک نہ ہو تو وہ تراب، یعنی خاک ہے، اس وقت اس کو "ثری" نہ کہیں گے۔ معنی یہ ہیں کہ خاکِ نمناک کے نیچے جو کچھ ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ مراد اس سے ساتوں زمینیں ہیں، کیوں کہ وہ ان کے نیچے ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مفسرین کہتے ہیں کہ "ثری" سے اللہ کی مراد وہ "ثری" ہے جو صخرہ کے نیچے ہے، وہ صخرہ جس پر بیل ہے، وہ بیل جو زمین کے نیچے ہے اور جو "ثری" کے نیچے ہے اس کو نہیں جانتا مگر اللہ پاک۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ثری" ہر شے مبتل ہے، یعنی ہر تر اور بھیگی ہوئی شے۔[5]

"جهر بالقول" کے معنی بات کے ساتھ آواز کو بلند کرنا کے ہیں۔ "سِرّ" وہ ہے جس کو آدمی اپنے غیر سے بیان کرے اور اس سے علاحدگی میں کہے۔ "اخفی" سرّ میں سے وہ بات ہے جس کو آدمی اپنے جی میں کہے اور اپنے دل میں اس کا خطرہ کرے۔ معنی یہ ہیں کہ اگر تم اللہ پاک کا ذکر کرو گے اور اس سے بآواز بلند دعا کرو گے تو

---

[1] رقم الآية [٥٤]
[2] فتح البيان (٨/ ٢٠٩۔ ٢١٤)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٩١)
[4] فتح القدير (٣/ ٤٩١)
[5] تفسير الطبري (١٨/ ٢٧١)

جان رکھو کہ وہ اس سے بے نیاز ہے، کیوں کہ وہ تو سِرّ کو جانتا ہے اور اس کو جو سِرّ سے بھی زیادہ تر خفی (پوشیدہ) ہے، پھر تم کو کچھ حاجت نہیں کہ بآوازِ بلند بات کرو۔ اس میں معناً "جھر" سے نہی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً ﴾ [الأعراف: ٢٠٥] "اور (اے نبی!) اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کیجیے، عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے۔" کسی نے کہا ہے کہ "سِرّ" وہ ہے جس کو انسان اپنے جی میں پوشیدہ رکھتا ہے اور "اَخْفٰی" سِرّ میں سے وہ ہے جو ابن آدم پر پوشیدہ ہے اس چیز سے جس کو وہ کرنے والا ہے اور وہ اسے جانتا نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔ اتنا اور زیادہ کیا ہے: پس بے شک اللہ اس سب کو جانتا ہے جو اس سے گزر چکا ہے اور جو باقی ہے، اس کے نزدیک ایک کا علم اور ساری خلائق کا علم اس بارے میں نفسِ واحد کی طرح ہے، جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [لقمان: ٢٨] "تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا۔"[1] کسی نے کہا ہے کہ "سِرّ" وہ ہے جس کو انسان اپنے جی میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ "اخفی" وہ ہے جو نہ ہوا اور نہ اس کو کسی نے پوشیدہ رکھا۔ کسی نے کہا کہ "سِرّ" تو مخلوق کا "سِرّ" ہے، اور "اَخْفٰی" اللہ عزوجل کا "سِرّ" ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کا انکار کیا ہے اور یوں کہا ہے کہ "اَخْفٰی" وہ چیز ہے جو انسان کے "سِرّ" میں نہیں ہے اور آیندہ اس کے جی میں ہوگی۔[2]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ "سِرّ" وہ شے ہے جس کو تو ہی جانے اور "اَخْفٰی" وہ ہے جس کو اللہ تیرے دل میں ڈال دے۔ اس چیز میں سے جس کو تو جانتا نہیں ہے۔ ایک لفظ میں یوں ہے کہ اللہ جانتا ہے اس شے کو جس کو تو اپنے جی میں چھپاتا ہے اور جانتا ہے اس شے کو جس کو تو کل کرے گا۔[3] اس آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ ذکر و دعا کی مشروعیت اور ان کو اونچی آواز سے ادا کرنا اللہ پاک کو خبر دینے اور سنانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ ایک اور ہی غرض کے لیے ہے، جیسے ذکر کے ساتھ اپنے نفس میں تصور کرنا اور اپنے نفس میں ذکر کا اثر و رسوخ پیدا کرنا اور دوسرے مشاغل اور وسوسوں کو دور کرنا اور نفس کو غیر اللہ کے لیے مشغول ہونے سے روکنا اور عاجزی اور زاری سے اپنے نفس کو توڑنا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب امور اونچی آواز کے ذکر کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ذکر فرمایا کہ جو ذات مذکورہ صفات کی مالک ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہے اور جملہ لا الہ الا اللہ مستأنفہ ہے، اللہ کے ساتھ الٰہیت کو خاص کرنے کے بیان کے لیے۔ یعنی کوئی معبود نہیں ہے وجود میں، مگر وہی ذات جو شریک سے منزہ اور بَری ہے اور اسی طرح جملہ ﴿ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ اس بات کو بیان کرتا ہے کہ اللہ پاک اسمائے حسنیٰ کا مستحق ہے۔ "حُسنیٰ" احسن کی تانیث ہے، یہ اسمِ تفضیل ہے، واحد مؤنث و جمع دونوں کی صفت ہو سکتا

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٧٢) [2] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٧٤) [3] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٧٢_ ٢٧٣)

ہے۔ اسمائے حسنیٰ ننانوے ہیں، حدیثِ صحیح میں وارد ہوئے ہیں۔[1] ان کا بیان سورت اعراف میں گزر چکا ہے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ طٰہٰ بمعنی "یَا رَجُل" ہے۔ اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطا، محمد بن کعب، ابو مالک، عطیہ عوفی، حسن، قتادہ، ضحاک، سدی اور ابن ابزی رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ ان سب نے کہا ہے کہ طٰہٰ بمعنی "یَا رَجُل" ہے۔ ایک روایت میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر اور ثوری سے یوں مروی ہے کہ طٰہٰ نبطی زبان میں ایک کلمہ ہے، جس کے معنی "یَا رَجُل" ہیں۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طٰہٰ" معرب ہے،[3] یعنی اصل میں عربی نہیں ہے، لیکن عرب نے اس کو مستعمل کر لیا ہے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت نماز پڑھتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے، دوسرے کو اُٹھا لیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے طٰہٰ نازل فرمائی۔ یعنی "طإ الأرض یا محمد"

﴿ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴾ (اس کے قائل قاضی عیاض رحمہ اللہ ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے ان کی کتاب شفا سے یہ روایت نقل کی ہے۔ واللہ أعلم۔ ظاہراً اسی طرح معلوم ہوتا ہے) پھر کہا کہ جو اکرام اور حسنِ معاملہ اس میں ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔[4] امام جویبر رحمہ اللہ نے امام ضحاک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف نازل فرمایا تو وہ اور ان کے اصحاب اس کے ساتھ قائم ہونے، یعنی کھڑے ہو کر رات کی نماز میں اس کو پڑھنے لگے تو قریش کے مشرک بولے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے اُتارا کہ وہ مشقت میں پڑیں۔ اس پر اللہ پاک نے ﴿ طٰهٰ ﴾ سے لے کر ﴿ يَّخْشٰى ﴾ تک آیت نازل فرمائی۔[5] لہٰذا بات وہ نہیں جیسے کہ جھٹلانے والے لوگوں نے گمان کیا، بلکہ جس شخص کو اللہ نے علم دیا تو باقاعدہ اس کے ساتھ خیرِ کثیر کا ارادہ فرمایا، جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔[6] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک نہایت عمدہ حدیث شریف لکھی ہے جس کے ہر کلمے سے علما کے لیے مغفرت کا مینہ برس رہا ہے۔ باوجود عجز و بجز و فسق و فجور کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور عفو و درگزر اور رحمت کی پکی سچی اُمید بندھ رہی ہے۔ اس لیے وہ حدیث مع الفاظ و اسناد کے یہاں لکھی جاتی ہے:

وما أحسن الحديث رواه الحافظ أبو القاسم الطبراني في ذلك حيث قال: حدثنا أحمد بن زهير، حدثنا العلاء بن مسلمة أبو سالم، حدثنا إبراهيم الطالقاني، حدثنا ابن المبارك عن

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٧)

[2] رقم الآية [١٨٠]

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٦٦۔ ٢٦٨) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٠)

[4] الشفا بتعريف حقوق المطفىٰ (١/ ٤٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٠) یہ روایت مرسل ہے۔

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٥)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٧)

سفيان عن سماك بن حرب عن ثعلبة بن الحكم قال: قال رسول اللهﷺ: « يقول الله تعالىٰ للعلماء يوم القيامة إذا قعد على كرسيه لقضاء عباده: أَنِّيْ لَمْ أَجْعَلْ عِلْمِيْ وَ حِكْمَتِيْ فِيْكُمْ إِلَّا وَأَنَا أُرِيْدُ أَنْ أَغْفِرَلَكُمْ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكُمْ وَلَا أُبَالِيْ ». إسناده جيد و ثعلبة بن الحكم هذا هو الذي ذكره أبو عمر في استيعابه و قال: نزل البصرة، ثم تحول إلى الكوفة و روى عنه سماك بن حرب. یعنی سیدنا ثعلبہ بن حکم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن علما سے فرمائے گا، جس وقت کہ اپنی کرسی پر اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھے گا کہ بے شک میں نے نہیں رکھا اپنا علم اور اپنی حکمت تم میں مگر اس ارادے سے کہ میں بخش دوں تمھارے لیے جو کچھ تم سے اس پر ہوا اور میں پروا نہیں کرتا ہوں۔[1] اس حدیث شریف کی اسناد جید ہے۔ یہ سیدنا ثعلبہ بن حکم رضی اللہ عنہ وہی ہیں جن کا ذکر ابو عمر، یعنی ابن عبد البر نے اپنی کتاب استیعاب میں کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ بصرہ میں نازل ہوئے، پھر کوفے کی طرف نقل مکانی کر گئے اور سماک بن حرب نے ان سے روایت کی ہے۔[2]

اے علمائے دین متین! اے فضلائے سنت و کتابِ مبین! کہاں ہو، کدھر ہو؟ ذرا اس نویدِ جاں پرور روح افزا کو تو کان رکھ کر سنو، گوشۂ خاطرِ عاطر میں اس کو جگہ دو کہ سید المرسلین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین، ارحم الراحمین، رب العالمین سے تم کو کیا کچھ بشارت رحمت و کرم کی دے رہے ہیں، یہ سب رحم و فضل نبی کریم ﷺ کے ذریعے سے تم کو نصیب ہوا۔ پہلا انعام تو اس کا یہی ہے کہ تم کو اُن کی اُمتِ مرحومہ میں پیدا کیا، پھر اپنا علم و حکمت اُن کے واسطے سے عطا کیا، جس کے طفیل میں باوجود معاصی کے مغفرت و عفو کا وعدہ کیا، یہ ایسا وعدہ ہے کہ دنیا و ما فیہا کی اس کے روبرو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں ہے۔

﴿ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ﴾ کی تفسیر میں امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ [المزمل: ٢٠] ''پھر قرآن میں سے جتنا آسان ہو تم پڑھو'' وہ لوگ نماز میں اپنے سینوں سے رسیاں لٹکا لیا کرتے تھے، یعنی اس لیے کہ نیند نہ آجائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: لا واللہ! یعنی قسم ہے اللہ کی! نہیں کیا اس نے قرآن کو مشقت والا، لیکن کیا اس کو رحمت و نور و دلیل طرف جنت کے۔[3]

﴿ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بے شک اللہ نے اُتارا اپنی کتابوں کو اور بھیجا اپنے رسولوں کو واسطے رحمت کے جس سے اپنے بندوں پر رحمت فرمائی، تاکہ یاد رکھنے والا نصیحت پذیر ہو اور آدمی نفع پائے، اس چیز سے جس کو اس نے کتاب اللہ سے سنا۔ قرآن شریف ایک ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حلال و حرام کو اس

---

[1] المعجم الكبير (٢/ ٨٤) اس کی سند میں ''علاء بن مسلمۃ'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٨٦٧)
[2] الاستيعاب (١/ ٦٣) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٠)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٦٩)

میں نازل فرمایا ہے۔

﴿ تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلَى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یہ قرآن جو تمھارے پاس آیا ہے، اے پیغمبر! وہ تمھارے رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے، جو رب ومليک و بادشاہ ہے، ہر شے پر قادر وتوانا ہے جس نے زمین کو اس کی پستی اور سطبری کے ساتھ پیدا کیا اور بلند آسمانوں کو اُن کی اونچائی اور لطافت میں پیدا کیا۔ حدیث شریف میں آیا ہے، جس کی ترمذی رحمہ اللہ وغیرہ نے تصحیح کی ہے۔ آسمان کی موٹائی پانچ سو برس کی راہ ہے اور اس کے اور اس کے ساتھ والے آسمان کے درمیان فاصلہ پانچ سو برس کی راہ ہے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے "أوعال" کی حدیث عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس جگہ وارد کی ہے۔[2] عباس رضی اللہ عنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں۔ ("أو عال" جمع ہے "وعل" کی، یہ وہی فرشتے ہیں جو عرشِ عظیم کو اٹھائے ہوئے ہیں)۔

﴿ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ... الخ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یہ سب اللہ پاک کی ملک ہیں، اس کے قبضے میں ہیں، اس کے زیرِ تصرف ہیں، اس کی مشیت اور ارادہ اور حکم میں ہیں، وہ ان سب کا خالق، مالک و الٰہ ومعبود ہے۔ لا اله سواہ ولا رب غیرہ۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ "ثری" سے مراد ساتویں زمین ہے۔[3] امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا کہ یحییٰ بن کثیر نے ان کو حدیث کی کہ کعب پوچھے گئے: (1) ان سے کہا گیا کہ اس زمین کے نیچے کیا ہے؟ کہا: پانی۔ (2) کہا گیا پانی کے نیچے کیا ہے؟ کہا: زمین۔ (3) کہا گیا: زمین کے نیچے کیا ہے؟ کہا: پانی۔ (4) پوچھا: پانی کے نیچے کیا ہے؟ کہا: زمین۔ (5) زمین کے نیچے کیا ہے؟ کہا: پانی۔ (6) پانی کے نیچے کیا ہے؟ کہا: زمین۔ (7) پوچھا: زمین کے نیچے کیا ہے؟ کہا: پانی۔ (8) پوچھا پانی کے نیچے کیا ہے؟ کہا: زمین۔ (9) پوچھا: زمین کے نیچے کیا ہے؟ کہا: ایک پتھر۔ (10) پوچھا: پتھر کے نیچے کیا ہے؟ کہا: ایک فرشتہ ہے۔ پوچھا: فرشتے کے نیچے کیا ہے؟ کہا: ایک مچھلی ہے، جس کی دونوں طرفین عرش کے نیچے لٹکی ہوئی ہیں۔ پوچھا: مچھلی کے نیچے کیا ہے؟ کہا: ہوا اور تاریکی ہے اور علم منقطع ہو چکا۔[4]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک زمینیں اس طرح ہیں کہ ہر زمین کے اور اس زمین کے درمیان جو اس سے متصل ہے، پانچ سو برس کی راہ ہے اور اُن میں سے اوپر والی زمین ایک مچھلی کی پیٹھ پر ہے، جس کی دونوں طرفیں آسمان میں ملی ہوئی ہیں اور وہ مچھلی ایک پتھر پر ہے اور وہ پتھر فرشتے کے ہاتھ میں ہے اور دوسری زمین سجنِ ریح ہے، یعنی ہوا کا قید خانہ ہے۔ یعنی اس میں ہوا قید

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٠٩٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٢٤٧)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٧١) [4] تفسير ابن كثير (٣/ ١٩١)

ہے، تیسری میں جہنم کے پتھر ہیں، چوتھی میں جہنم کی گندھک ہے، پانچویں میں جہنم کے سانپ ہیں، چھٹی میں جہنم کے بچھو ہیں، ساتویں میں سقر ہے اور اسی میں ابلیس لوہے سے جکڑا ہوا ہے، ایک ہاتھ اس کے آگے ہے اور ایک ہاتھ اس کے پیچھے، پھر جس وقت اللہ تعالیٰ ارادہ کرے گا کہ اس کو چھوڑے، جس واسطے کہ چاہے گا تو اس کو چھوڑ دے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''هذا حديث غريب جدا و رفعه فيه نظر''[1]

حافظ ابو یعلی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا تبوک کی چڑھائی میں، پھر ہم لوٹ کر آ رہے تھے، سخت گرمی تھی، پس ہم متفرق و منتشر تھے ایک اور دو کے درمیان، یعنی ہم الگ الگ چلتے تھے کوئی ایک تنہا جا رہا تھا، کہیں دو جا رہے تھے۔ کہا اور میں اول لشکر میں تھا کہ ایک مرد ہمارے سامنے آیا، سلام کیا، پھر کہا کہ تم میں سے محمد کون ہے؟ اور میرے ساتھی چل دیے اور میں اس کے ہمراہ ٹھہر گیا کہ ناگاہ رسول اللہ ﷺ آ گئے لشکر کے وسط میں ایک سرخ اونٹ پر، دھوپ کی وجہ سے آپ ﷺ اپنے سر پر اپنے کپڑے سے مقنع ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے کہا: اے سائل! یہ ہیں رسول اللہ ﷺ جو تیرے پاس آ گئے، وہ بولا کہ ان میں سے وہ کون ہیں؟ میں نے کہا: سرخ اونٹ والے، وہ آپ ﷺ سے قریب ہوا، پھر اس نے آپ ﷺ کی سواری کی نکیل پکڑی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر سواری روک دی۔ پھر اس نے کہا کہ تم محمد ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، کہا میں چاہتا ہوں کہ تم سے کئی خصلتوں کا پوچھوں، جن کو زمین والوں میں سے کوئی نہیں جانتا، مگر ایک یا دو مرد۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پوچھ، جس چیز میں سے تو چاہے۔ اس نے کہا: اے محمد! کیا نبی سوتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی دونوں آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔ وہ بولا: تم نے سچ کہا۔ پھر کہا: اے محمد! بچہ اپنے باپ اور ماں سے کیسے مشابہ ہوتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مرد کا پانی سفید غلیظ ہوتا ہے اور عورت کا پانی رقیق، لہٰذا دونوں پانیوں سے جونسا پانی دوسرے پر غالب ہوا، وہی بچے پر غالب ہوتا ہے۔ وہ بولا: تم نے سچ کہا۔ پھر بولا: بچے سے مرد کے لیے کیا ہے اور عورت کے لیے کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مرد کے لیے ہڈیاں، رگیں اور پٹھے ہیں اور عورت کے لیے خون، گوشت اور بال ہیں۔ بولا: تم نے سچ کہا۔ پھر کہا: اے محمد! اس کے نیچے کیا ہے؟ یعنی زمین کے نیچے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک خلق ہے۔ اس نے کہا: پھر اُن کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: ایک زمین ہے۔ کہا: پھر اس زمین کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: پانی ہے۔ کہا: پھر اس پانی کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: ظلمت یعنی تاریکی۔ کہا: ظلمت، کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: ہوا۔ کہا: ہوا کے نیچے کیا ہے؟ کہا: ثریٰ۔ کہا: پھر ثریٰ کے نیچے کیا ہے؟ « فَفَاضَتْ عَيْنَا رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِالْبُكَاءِ » یعنی اس کہنے پر آپ ﷺ کی چشم مبارک بہہ نکلیں، آپ ﷺ رونے لگے اور فرمایا: « اِنْقَطَعَ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٦) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٩١) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی متکلم فیہ ہیں۔ (ضعیف الترغيب والترهيب (٢/ ٢٣٤)

عِلْمُ الْخَلْقِ عِنْدَ عِلْمِ الْخَالِقِ أَيُّهَا السَّائِلُ، مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ » یعنی خلق کا علم منقطع ہوگیا نزدیک علم خالق کے۔ اے سائل! جس شخص سے پوچھا جاتا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس شخص نے کہا: تم نے سچ کہا، میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک تم اللہ کے رسول ہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ یہ شخص کون ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: یہ جبریل علیہ السلام ہیں۔[1] (هذا حديث غريب جدا، و سياق عجيب، تفرد به القاسم بن عبد الرحمن هذا، وقد قال فيه يحيىٰ بن معين: ليس يساوي شيئا، وضعفه أبو حاتم الرازي، وقال ابن عدي: لا يعرف. قلت: وقد خلط في هذ الحديث ودخل عليه شيء في شيء و حديث في حديث، و قد يحتمل أنه تعمد ذلك و أدخل عليه فيه) والله أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ﴾ یعنی اس قرآن کو اس ذات پاک نے نازل فرمایا جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا ہے، جو سرّ و اخفٰی کو جانتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٦] ”کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہ وہ غفور (اور) رحیم ہے۔“ علی بن ابی طلحہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ ”السر ما أسره ابن آدم في نفسه، و أخفى ما أخفى علي بن آدم مما هو فاعله قبل أن يعلمه، فالله يعلم ذلك كله، فعلمه في ما مضى من ذلك وما بقي علم واحد، وجميع الخلائق في ذلك عنده كنفس واحد“ ”﴿ اَلسِّرَّ ﴾ سے مراد وہ بات ہے جسے انسان اپنے دل میں چھپا لے اور ﴿ اَخْفٰى ﴾ سے مراد وہ بات ہے جسے انسان سے مخفی رکھا جائے اور کرنے سے پہلے اسے علم نہ ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب باتوں کا علم ہے۔ ماضی و مستقبل کے تمام حالات اس کے نزدیک یکساں ہیں، اسے ان سب کا علم ہے، اس کے نزدیک تمام مخلوقات اس طرح ہیں جیسے ایک جاندار چیز ہو۔“ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [لقمان: ٢٨] ”تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا۔“ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”سِرّ“ وہ ہے جس کے ساتھ تیرا جی بات کرتا ہے۔

”اَخْفٰی“ وہ ہے جس کے ساتھ تیرے جی نے بات نہ کی اب تک۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا تو جانتا ہے اس چیز کو جس کو تو آج پوشیدہ رکھتا ہے اور نہیں جانتا اس کو جو تو کل پوشیدہ رکھے گا اور اللہ جانتا ہے اس کو جو تو آج پوشیدہ رکھتا ہے اور اس کو جو تو کل پوشیدہ رکھے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ”اَخْفٰی“ سے مراد وسوسہ ہے۔ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ”اَخْفٰی“ وہ شے ہے جس کو وہ کرنے والا ہے، من جملہ اس

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۹۱۔ ۱۹۲) اس کی سند میں ”قاسم بن عبدالرحمٰن“ اور ”عباس بن فضل انصاری“ ضعیف راوی ہیں۔

چیز کے جس کے ساتھ اس کے جی نے بات نہیں کی ہے۔[1]

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جس ذات پاک نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے، وہ اللہ ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر وہی، صاحبِ اسمائے حسنیٰ و صفاتِ علیٰ۔ اسمائے حسنیٰ میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان کا بیان سورۃ الاعراف کے آخر میں گزر چکا ہے۔[2] ولله الحمد و المنة.

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝

اور کیا آپ تک موسیٰ کی خبر پہنچی ہے؟ (9) جب اس نے (طور پر) آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا: (یہاں) ٹھہرو، بے شک میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمھارے لیے کوئی انگارا لے آؤں یا آگ کے پاس کوئی راہبر پاؤں (10)

رسالتِ موسیٰ علیہ السلام کا بیان:

یہ قصہ سورۃ القصص اور سورت طٰہٰ اور سورۃ الاعراف سے پورا معلوم ہوتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کو آنے لگے بیوی اور بکریاں ساتھ لے کر، جنگل میں رات کی سردی میں راہ بھولے اور عورت کو جننے کا درد ہوا۔ دور سے آگ نظر آئی، وہ آگ نہ تھی اللہ کا نور تھا، اللہ نے ان سے کلام کیا اور نبی بنا کر فرعون کی طرف بھیجا۔ پیچھے عورت اپنے باپ کے گھر جا کر رہی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں سے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ شروع فرمایا اور اس بات کا ذکر کیا کہ اُن کی طرف وحی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اللہ پاک نے ان سے کس طرح باتیں کیں۔ یہ قصہ اس کے بعد ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام وہ مدت پوری کر چکے، جو اُن کے اور اُن کے خسر کے درمیان بکریاں چرانے کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کو لے کر چلے۔ کہا گیا کہ بلادِ مصر کے ارادے سے چلے تھے، اس کے بعد کہ دس سال سے زیادہ عرصہ وہاں سے غائب رہے تھے۔ ان کے ساتھ اُن کی بی بی تھیں۔ راستہ بھول گئے۔ رات سرد تھی ایک منزل میں اترے، وہ منزل شعاب و جبال کے درمیان تھی، یعنی پہاڑوں اور پہاڑوں کے راستوں میں تھی۔ سردی کا موسم تھا اور بادل و تاریکی تھی، چقماق ان کے ساتھ تھی، اس سے آگ نکالنے لگے، تاکہ آگ جلائیں، جس طرح کہ حسبِ عادت اس سے آگ نکالتے تھے۔ لہٰذا اس نے کچھ کام نہ دیا، نہ اس سے کچھ شرر نکلا، وہ اس حال میں تھے کہ طور پہاڑ کی جانب سے ایک آگ دیکھی،

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٧٢_ ٢٧٣) [2] رقم الآية [١٨٠]

یعنی جو پہاڑ وہاں اُن کی سیدھی طرف تھا، اس کی طرف سے اُن کے لیے ایک آگ نمودار ہوئی تو انھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا، ان کو خوش خبری دیتے تھے کہ بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے ایک قبس (انگارہ) تمھارے پاس لے آؤں۔ "قبس" آگ کے شعلے کو کہتے ہیں۔

دوسری آیت میں ﴿ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ ﴾ [القصص: ۲۹] "یا آگ کا انگارا لے آؤں۔" ہے، "جَذْوَة" اس انگارے کو کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ لہب ہو، یعنی شعلہ زن انگارے کو "جَذْوَة" بولتے ہیں۔ شاید تم گرمی حاصل کرو۔ یہ قول سردی کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور "قبس" تاریکی کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ ﴿ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴾ کے معنی یہ ہیں یا پاؤں میں آگ پر اس شخص کو کہ وہ مجھے راہ کی طرف ہدایت کرے۔ یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ راہ سے بہک گئے تھے جس طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ کون مجھے راستے کی راہنمائی کرے۔ رات سرد ہو رہی تھی اور وہ راہ گم کیے ہوئے تھے۔ پھر جب آگ دیکھی تو کہا کہ اگر میں کسی کو نہ پاؤں گا کہ مجھے راہ بتائے تو میں تمھارے پاس آگ لے آؤں گا، جس کو تم جلاؤ گے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امرِ توحید کی تقریر فرمائی جس کی طرف مساق یعنی حدیث کا بیان ختم ہوتا ہے قصہ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ کہ جو قدرتِ باہرہ اور عجیب و غریب خبر پر مشتمل ہے۔ پس یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴾ یہ سوالیہ انداز تقریر کے واسطے ہے، معنی یہ ہیں: "أليس قد أتاك" یعنی کیا نہیں آئی تمھارے پاس؟ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ مقرر آئی تمھارے پاس حدیثِ موسیٰ علیہ السلام۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی حدیث نہیں آئی تھی۔[2] اس قصے کے بیان کرنے میں تین باتیں ہیں: ایک تو تسلی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو احکامِ نبوت کی مشقتیں پیش آیا کرتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے اثقال اور بوجھ برداشت فرماتے تھے اور نبوت کے خطوب اور مہمات (مشکلات اور اہم کام) کی محنت اُٹھاتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ سے پہلے اور انبیائے کرام کی بھی یہی حالت رہی۔ تیسری یہ کہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اُن کے درمیان کا براً عن کابرٍ چلا آتا ہے۔

حدیث سے مراد وہ قصہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ واقع ہوا۔ ﴿ اِذْ رَاٰ نَارًا ﴾ کلمہ "اذ" ظرف ہے حدیث کا، یعنی موسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا قصہ کب ہوا، جب کہ انھوں نے ایک آگ دیکھی، یا مفعول ہے عامل مقدر مقدم کا، یعنی "اذكر وقت رؤيته نارا" تم یاد کرو ان کے آگ دیکھنے کے وقت کو، یا ظرف ہے واسطے عامل مقدر موخر کے، یعنی "حين رأىٰ ناراً كان كيت كيت" جس وقت انھوں نے آگ دیکھی ایسا ایسا قصہ ہوا۔ یہ موسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا آگ دیکھنا

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٧٧) [2] فتح القدير (٣/ ٤٩٢)

اندھیری برف والی سخت سرد رات میں تھا، جبکہ مدین سے مصر کو اپنی ماں بھائی کی طرف مسافر ہو کر نکلے، بعد اس کے کہ شعیب علیہ السلام سے اجازت لے چکے تھے اور اس مدت کو پورا کر دیا تھا جس کو شعیب علیہ السلام نے ان پر ٹھہرایا تھا اور وہ رات شبِ جمعہ تھی۔ مصر اور مدین کے درمیان آٹھ منزل کی مسافت ہے، غرضیکہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اس آگ کو دیکھا تو اپنے اہل سے کہا: تم اس جگہ ٹھہرو۔

اہل سے مراد اُن کی بیوی ہیں جو شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں، ان کا نام نامی صفورا یا صفوریا یا صفورہ ہے اور اُن بی بی کی بہن کا نام لَیّا یا شرقا یا عبدا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جن بی بی سے موسیٰ علیہ السلام نے بیاہ کیا، وہ چھوٹی بہن ہے یا بڑی۔ جب کہ خطاب ﴿ اِمْكُثُوْٓا ﴾ کا ان کی بی بی کو ہوا تو وہ ایک ہیں، پھر صیغہ جمع کی کیا وجہ ہے؟ پس ایک وجہ تو یہ ہے کہ جمع ظاہری طور پر اہل کے لیے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گو وہ ایک ہیں، مگر ان کی بڑائی اور تعظیم کے لیے ان کو صیغۂ جمع سے خطاب کیا۔ کسی نے یوں کہا ہے کہ مراد بی بی اور بچہ اور خادم ہیں، اب تو بے کھٹکے جمع کا صیغہ درست ہو گیا۔ معنی یہ ہیں کہ تم اپنی جگہ پر ٹھہرو، اس ٹھہرنے کی تعبیر مکث سے کی، اقامت سے نہ کی، یعنی ﴿ اِمْكُثُوْٓا ﴾ کہا، ''اقیموا'' نہ فرمایا، اس لیے کہ اقامت دوام و ہمیشگی کی مقتضی ہے اور مکث ایسا نہیں ہے۔

پھر اس مکث کی وجہ فرمائی کہ ﴿ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ﴾ یعنی تم یہاں اس لیے ٹھہرو کہ بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ ''اِیْنَاسُ'' کہتے ہیں ''اِبْصار'' یعنی دیکھنے کو۔ عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: ''آنَسْتُ الصَّوْتَ'' یعنی میں نے آواز سنی۔ ''وَآنَسْتُ الرجل'' یعنی میں نے مرد کو دیکھا۔ کسی نے کہا کہ ''ایناس'' ابصارِ بین کو کہتے ہیں، یعنی ظاہر ظہور دیکھنے کو بولتے ہیں، جس میں کسی طرح کا شبہہ دھوکا نہ ہو، اسی سے انسان العین ماخوذ ہے، یعنی مردمک چشم آنکھ کی پتلی، کیونکہ اس سے اشیا دیکھی جاتی ہیں۔ کسی نے کہا کہ ''ایناس'' بمعنی احساس ہے، پس وہ ابصار سے عام تر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''ایناس'' دیکھنے کے ساتھ خاص ہے اس شے کو جو اُنس دیتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''ایناس'' وجدان کو کہتے ہیں۔ ہر گاہ کہ آگ کا دیکھنا حقیقی طور پر تھا، اس لیے اپنے گھر والوں کے لیے حرف ''اِنَّ'' سے، جو تحقیق کے لیے ہے، اس کا اثبات کیا، تاکہ وہ اپنے آپ کو اس پر جمائے رہیں اور شعلے کا لانا اور راہ کا پتا ملنا، یہ دونوں کام متوقع تھے اور وعدہ پورے ہونے کا یقین نہ تھا، اس لیے رجاء و اُمید پر بات کی بنیاد رکھ کر یوں ارشاد فرمایا: ﴿ لَعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ ... الخ﴾ یعنی شاید میں اس آگ سے تمھارے پاس شعلہ لے آؤں یا آگ کے پاس جا کر راہ کا پتا معلوم کر لوں۔ توقع ہوتی ہے کہ ان دو کاموں میں سے ایک حاصل ہو جائے۔ ''أو'' کا کلمہ واسطے منعِ خُلُو کے ہے اور یہی ظاہر ہے، جمع کے لیے نہیں ہے۔ ''قبس'' آگ کے جذوہ اور شعلہ کو کہتے ہیں، جو کسی لکڑی یا نے یا بتی کے سر میں ہو اور یہ بروزن فعل بمعنی مفعول ہے، جیسے قبض و نفض بمعنی مقبوض و منفوض ہے اور اسی طرح مقیاس ہے۔

کلمہ "علیٰ" حرفِ استعلاء ہے، یہ اس امر کو بتاتا ہے کہ آگ والے ایسے مکان پر مستعلی ہیں جو آگ کی طرف قریب تر ہے جیسا کہ سیبویہ نے "مَرَرْتُ بِزَيْدٍ" میں کہا ہے کہ وہ مرور لصوق ہے ایسے مکان کے ساتھ جس سے زید قریب ہے، یعنی اگر یہ معنی نہ لیے جائیں تو استعلاء حقیقی یہاں نہیں بن سکتا۔ یا "علیٰ" بمعنی "عند" ٹھہرایا جائے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هُدًى ﴾ سے مراد ہادی ہے۔[1] پس ہادی کو مصدر کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے یا مصدر کے ساتھ تعبیر کی ہے مبالغہ کے طور پر حذفِ مضاف کی بنیاد پر، یعنی "وأهدي"۔ کشاف میں ﴿ هُدًى ﴾ کی یوں تفسیر کی ہے کہ "قوما يهدونني"[2] اور مفسروں نے اس کے بجائے "هاديا" کہا ہے۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ ایک سے زیادہ پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ مفرد کہہ دینا کافی ہے، جمع کی کیا ضرورت ہے۔[3]

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝١١ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٢ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝١٣ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝١٤ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝١٥ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝١٦

چناں چہ جب وہ (موسیٰ) آگ کے پاس پہنچا تو آواز دی گئی: اے موسیٰ! (11) بے شک میں تیرا رب ہوں، لہٰذا تو اپنے جوتے اتار دے، بلاشبہہ تو مقدس وادیِ طویٰ میں ہے (12) اور میں نے تجھے چن لیا ہے، لہٰذا جو وحی کی جاتی ہے اسے غور سے سن (13) بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، چناں چہ تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر (14) بے شک قیامت آنے والی ہے، میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے (15) لہٰذا اس (فکرِ آخرت) سے تجھے وہ شخص روکنے نہ پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی، ورنہ تو (بھی) ہلاک ہو جائے گا (16)

وادیِ طویٰ میں موسیٰ علیہ السلام پر پہلی وحی:

میدانِ طویٰ شاید پہلے سے مقدس تھا یا اب ہوگیا۔ ان کی پاپوشیں ناپاک تھیں۔ یہود یہ نہیں سمجھے، پاک موزہ پاپوش بھی نماز میں اتارتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نماز پڑھو موزے اور پاپوش کے ساتھ اگر پاک

[1] معاني القرآن (٣/ ١٢٧) [2] الكشاف (٣/ ٥٥) [3] فتح البيان (٨/ ٢١٦۔ ٢١٧)

ہوں۔ موسیٰ ﷺ کو بھی پہلی وحی میں نماز کا حکم ہے اور ہمارے پیغمبر کو بھی۔ ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ [المدثر: ٣] ''اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے۔'' قیامت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں، یعنی اس کا وقت کسی کو نہیں بتاتا۔ روک نہ دے اس سے، یعنی قیامت کے یقین لانے سے یا نماز سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو برے کی صحبت سے منع کیا تو اور کوئی کیا ہے۔

﴿ اَتٰىهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ آگ کے پاس آئے اور اس سے قریب ہوئے، آواز آئی: ﴿ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ ﴾۔ دوسری آیت میں اس طرح آیا ہے: ﴿ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ ﴾ [القصص: ٣٠] ''پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اسے وادی کے دائیں کنارے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت سے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ ہوں۔'' اور اس جگہ فرمایا: ﴿ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ ﴾ یعنی میں ہوں تیرا رب جو تجھ سے کلام کرتا ہے اور تجھ سے خطاب کرتا ہے۔ ﴿ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ﴾ سوتو اپنی پاپوشیں اُتار ڈال۔ اس میں کئی قول ہیں؛ علی بن ابی طالب، ابو ذر اور ابو ایوب رضی اللہ عنہم اور بہت سے سلف کا یہ قول ہے کہ ''كانتا من جلد حمار غير ذكي''[1] یعنی وہ دونوں مردار گدھے کے چمڑے کی تھیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تعظیمِ بُقعہ، یعنی اس جگہ کی عظمت کے لیے جوتا اُتارنے کا ان کو حکم دیا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس طرح آدمی کو حکم ہے کہ جب کعبے میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو اپنی پاپوشیں اُتار ڈالے۔[2] تیسرا قول یہ ہے کہ زمین مقدس کو برہنہ پا ہو کر اپنے دونوں پاؤں سے روندیں۔ اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔ واللہ أعلم.

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ طویٰ وادی کا نام ہے۔[3] اسی طرح بہت لوگوں نے کہا ہے۔ اس بنیاد پر یہ وادیِ مقدس کا عطف بیان ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دونوں قدموں سے روندنا ہے، یعنی تم برہنہ پا ہو کر اس پاک میدان میں چلو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس وادی کو طویٰ اس لیے کہا کہ اسے دوبار پاک کیا گیا اور اس کے لیے برکت مقرر کی گئی، قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔ صراح میں ہے کہ بعض کا قول ہے کہ طویٰ شے مثنیٰ کو کہتے ہیں، قولِ مذکور اس معنی کی بنا پر ہے، فی الجملہ فتح البیان سے اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ اس آیت کی مثل اور جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾ [النازعات: ١٦] ''جب اس کے رب نے مقدس وادیِ طویٰ میں اسے پکارا تھا۔'' یہاں ﴿ اَنَا اخْتَرْتُكَ ﴾ کہا۔ دوسری جگہ یہ فرمایا: ﴿ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ﴾ [الأعراف: ١٤٤] ''بے شک میں نے اپنے پیغامات پہنچانے اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں میں سے تجھے چن لیا ہے۔'' کہا گیا کہ اللہ پاک نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے لوگوں میں سے کلام کرنے کے لیے کس واسطے خاص کیا؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اس لیے کہ میری طرف کسی اور نے تیری طرح انکساری اور فروتنی نہ کی۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٧٨) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٣) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٨١۔ ٢٨٢) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٨١)

﴿ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴾ یعنی اب تو سن، جو کچھ میں تجھ سے کہتا ہوں اور تیری طرف وحی کرتا ہوں۔

﴿ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ﴾ یعنی میں جو ہوں اللہ ہوں، سوائے میرے کسی کی بندگی نہیں۔ تمام مکلفین پر سب سے پہلے یہ واجب ہے کہ وہ یہ بات جان لیں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اکیلا۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ ﴿ فَاعْبُدْنِيْ ﴾ یعنی میری توحید اختیار کر، مجھے یکتا جان، میری عبادت اور بندگی پر بغیر کسی کو شریک کیے ہوئے ہمیشہ قائم رہ۔ ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ بعض نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ تو نماز پڑھ، تاکہ تو مجھے یاد کرے۔ کسی نے کہا یہ معنی ہیں کہ تو قائم کر نماز کو مجھے یاد کرنے کے وقت۔ اس دوسرے قول کی شہادت وہ حدیث دیتی ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس وقت تم میں سے کوئی نماز کے وقت سوتا رہ جائے، یا غافل ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کو اس وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾[1]

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی نماز کے وقت سو رہا، یا اس کو بھول گیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے پڑھ لے جس وقت کہ اس کو یاد کرے، اس کے لیے کوئی کفارہ نہیں[2] مگر یہ۔ ﴿ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ ﴾ یعنی قیامت لامحالہ ضرور قائم ہونے والی ہے اور اس سے کوئی چارہ نہیں۔ ﴿ اَكَادُ اُخْفِيْهَا ﴾ امام ضحاک رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے: ''أَكَادُ أُخْفِيهَا مِنْ نَّفْسِي'' فرماتے اس لیے کہ قیامت اللہ کے نفس سے کبھی مخفی نہ رہے گی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ''مِنْ نَفْسِهٖ'' ہیں۔ اسی طرح امام مجاہد، ابو صالح اور یحییٰ بن رافع نے کہا ہے۔ سیدنا علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں روایت کیا ہے کہ میں اس پر سوائے اپنے کسی کو مطلع نہیں کرتا ہوں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمانوں اور زمین والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے علم کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: ''إِنِّي أَكَادُ أُخْفِيهَا مِنْ نَّفْسِي'' یعنی میں نے اس کو خلائق سے چھپایا ہے، یہاں تک کہ اگر میں اس بات کی طاقت رکھتا کہ اس کو اپنے نفس سے چھپاؤں تو البتہ ایسا کرتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَكَادُ اُخْفِيْهَا ﴾ اور یہ بعض قراءت میں یوں ہے: ''أُخْفِيهَا مِنْ نَّفْسِي'' قسم ہے میری عمر کے خالق کی! البتہ بالکل پوشیدہ رکھا ہے اس کو اللہ نے ملائکہ مقربین سے اور انبیا و مرسلین سے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤) مسند أحمد (٣/ ١٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٨٥۔ ٢٨٦) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٤)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [النمل: ٦٥] ''کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب (کی بات) نہیں جانتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ''وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری (حادثہ) ہوگی۔ وہ (قیامت) تمھارے پاس بس اچانک ہی آئے گی۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ورقاء رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اس کو مجھے یوں پڑھایا ہے: ''أَكَادُ أَخْفِيهَا'' یعنی الف کی زبر اور فا کی زیر کے ساتھ۔[1] کہتے تھے کہ اس کے معنی ''أظهرها'' ہیں۔

﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴾ یعنی میں قیامت کو لامحالہ بالضرور قائم کروں گا، تاکہ ہر عمل والے کو اس کے عمل کا بدلہ دوں۔ ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ٧۔ ٨] ''لہٰذا جس نے ذرہ بھر بھلائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الطور: ١٦ و التحريم: ٧] ''تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی، جو تم عمل کیا کرتے تھے۔''

قولہ: ﴿ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا ﴾ (آیتِ باب)۔ اس آیت سے مراد آحاد مکلفین ہیں، یعنی تم پیروی مت کرو اس شخص کے راستے کی جو قیامت کی تکذیب کرتا ہے اور دنیا میں اپنے مزوں پر متوجہ ہے، اپنے مولیٰ کا نافرمان ہے اور اپنے دل کی خواہشات کا پیرو ہے، کیوں کہ جس شخص نے اس بات پر اس کی موافقت کی، وہ بے شک خائب و خاسر ہوا۔ ''تَرَدّٰى'' کے معنی ''تهلك و تعطب'' ہیں، یعنی تو ہلاک و تباہ ہو جائے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ﴾ [الليل: ١١] ''اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہ دے گا۔''[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ پھر موسیٰ علیہ السلام اس آگ پر آئے جس کو انھوں نے دیکھا تھا تو اُن کو آواز آئی، یعنی درخت کی طرف سے، چنانچہ سورۃ القصص میں درخت سے ندا ہونے کی تصریح آئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ درخت سبز ببول کا تھا۔ کسی نے کہا ہے عوسج کا درخت تھا۔ کسی نے کہا کہ علیق کا۔ کسی نے کہا کہ عناب کا۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کونسا درخت تھا۔ بعض نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس روشنی کو دیکھا تھا وہ آگ نہ تھی، بلکہ وہ نور تھا۔ اس کو نار کے لفظ سے اس لیے ذکر کیا کہ موسیٰ علیہ السلام اُسے آگ سمجھتے تھے۔ کسی نے کہا کہ وہ بعینہٖ آگ ہی تھی۔ اللہ پاک کے حجابوں

[1] الدر المنثور (٥/ ٥٦٣) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٩٤)

سے آگ بھی ایک حجاب ہے۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا ہے کہ اس کا حجاب، یعنی اللہ پاک کا حجاب آگ ہے، اگر وہ اس کو کھول دے تو البتہ اس کے چہرے کے سبحات ہر اس چیز کو جلا دے اس کی مخلوق میں سے جس کی نظر اس کی طرف پہنچے۔[1] (أخرجه مسلم) سبحات سین کی پیش اور بائے موحدہ کے ساتھ نور و جلال وعظمت کے معنی میں ہے۔

وجہ سے مراد ذات پاک ہے، یعنی اللہ پاک کے دیکھنے سے جو مانع ہے، جس کا نام نور و نار ہے، اگر وہ اس کو ہٹا دے تو اس کا جلال ساری مخلوق کو جلا دے، اس دارِ ناپائیدار میں اُن کی ترکیب کی کمزوری کی وجہ سے۔ غرضیکہ درخت کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو آواز آئی، لہٰذا یوں کہا گیا: ﴿ يٰمُوْسٰى ﴾ یہ ان کے اور اللہ پاک کے درمیان پہلا کلمہ ہے اور آخری کلمہ آیندہ آئے گا۔ وہ یہ ہے: ﴿ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾ [طٰه: ٤٨] ''یقیناً اس پر عذاب ہے جو (حق کی) تکذیب کرے اور پھر جائے۔'' اور یہ بہ نسبت اس واقع کے اور اس حالت کے ہے ورنہ ان کے لیے تو اور مکالمات بھی ہیں۔ سلیمان جمل اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام کو ندا ہوئی تو بولے: کون ہے کلام کرنے والا؟ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ ﴾ شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ شاید تو شیطان کا کلام سنتا ہو، تو انھوں نے کہا: میں نے پہچان لیا کہ بے شک وہ اللہ کا کلام ہے، کیوں کہ میں اس کو تمام طرفوں سے اور تمام اعضاء سے سنتا ہوں۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نداء و خطاب وہ نہیں ہے جس میں بے ہوشی ہوئی اور پہاڑ چکنا چور ہو گیا، اس لیے کہ یہ ندا تو ان کی ابتدائے رسالت میں ہوئی اور وہ قصہ جو ہوا تو وہ فرعون کے غرق ہونے کے واقع کے بعد ہوا، جبکہ اللہ پاک نے ان کو تورات عطا فرمائی۔

﴿ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ﴾ یعنی تو اپنی جوتیاں اُتار دے، اللہ پاک نے تعظیم کے لیے ان کو یہ حکم دیا، کیوں کہ برہنہ پا ہونا انکساری اور فروتنی کو زیادہ ظاہر کرتا ہے اور تشریف وتکریم اور حسنِ ادب کے قریب تر ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو جوتیاں اُتار دے، تاکہ تیرے پاؤں کو وادیِ مقدس کی برکت پہنچے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسی لیے سلف نے کعبے کا طواف برہنہ پا ہو کر کیا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جوتا اُتارنا بقعہ، یعنی زمینِ مقدس کا احترام اور تعظیم ہے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے جوتیوں کو اُتارا اور وادی کے پیچھے ان کو ڈال دیا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس لیے اُن کو اُتارا کہ وہ دونوں مردہ گدھے کے چمڑے کی تھیں، یا بغیر پکے ہوئے چمڑے کی تھیں۔ علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں اور یہی قول امام سدی اور قتادہ رحمہما اللہ سے مروی ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ جوتیاں اُتارنے کے معنی دل کا اہل و مال سے فارغ اور خالی کرنا ہے، یہ تفسیر من جملہ بدع تفاسیر کے ہے۔

پھر اللہ پاک نے جوتیاں اُتارنے کی وجہ بیان فرمائی کہ ﴿ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾ یعنی اس لیے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ٥١) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢٧٨)

جوتا اُتارو کہ تم تو پاک اور مبارک میدان میں ہو۔ "قدس" طہارت اور پاکی کو کہتے ہیں اور ارضِ مقدس پاک زمین ہوئی۔ اس زمین کا نام مقدس اس لیے رکھا کہ اللہ پاک نے کافروں کو اس سے نکالا اور مومنوں سے اس کو آباد کیا۔ طویٰ نام ہے اس میدان کا۔ امام جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ طویٰ شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اس کا حرفِ طا زیر و پیش دونوں طرح سے پڑھا جاتا ہے اور یہ کلمہ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح سے آتا ہے، لہٰذا جس شخص نے اس کو منصرف کیا ہے تو اس نے اس کو میدان و مکان کا نام ٹھہرایا ہے اور نکرہ قرار دیا ہے اور جس نے اس کو غیر منصرف ٹھہرایا ہے تو اس کو بلدہ و بقعہ اور معرفہ قرار دیا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "طویٰ" مثل "ثنیٰ" کے "طي" سے مشتق ہے، مصدر ہے ﴿ نُوْدِيَ ﴾ کا، یا مقدس کا۔ "أَيْ نُوْدِيَ نِدَائَيْنِ أَوْ قُدِّسَ مَرَّةً بَعْدَ أُخْرىٰ" مطلب یہ ہے کہ طویٰ شی مثنیٰ کو کہتے ہیں۔ اس بنیاد پر براہِ ترکیب یہ لفظ "نُوْدِيَ" کا، یا "مقدس" کا مفعول مطلق واقع ہوا ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ ندا ہوئی، یا وہ وادی دو بار پاک کی گئی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مراد ارضِ مقدس ہے،[2] یہ اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام نے رات کو اس وادی پر گزر فرمایا، سو اس کو طے کیا۔ محاورہ عرب میں بولتے ہیں: "طويت وادي كذا وكذا" یعنی میں نے فلاں فلاں وادی کو طے کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ طُوًى ﴾ گول گہری وادی کو کہتے ہیں، یعنی گول میدان گہرا مثل "المطوي في استدارته"۔

﴿ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ ﴾ بصیغۂ واحد ہے۔ "اِنَّا أَخْتَرْنَاكَ" بصیغۂ جمع بھی پڑھا گیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی قراءت اولیٰ ہے، اس لیے کہ مشابہ تر ہے ساتھ خط کے اور اولیٰ و مناسب تر ہے ساتھ طرزِ کلام کے، کیونکہ اللہ پاک نے پہلے یوں فرمایا ہے: ﴿ يٰمُوْسٰى ﴿١١﴾ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ ﴾ یعنی بصیغۂ مفرد، تو یہاں بھی زیادہ مناسب یہی ہے کہ خطاب بصیغۂ مفرد ہو، تاکہ طرزِ کلام ایک ہی طور پر ہو جائے،[3] معنی یہ ہیں کہ میں نے تجھ کو نبوت اور رسالت کے ساتھ برگزیدہ اور پسند کیا۔ پس ان کو اسی وقت اور اسی مکان میں نبی بنایا اور فرعون کی طرف رسول اور پیغمبر بنا کر بھیجا، اس وقت اُن کی عمر چالیس برس کی تھی۔

﴿ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴾ میں حرفِ فا ترتیب ما بعد کے لیے ہے قبل پر۔ اور کلمۂ ما موصولہ ہے یا مصدریہ ہے، یعنی جبکہ میں نے نبوت اور رسالت کے واسطے تجھ کو منتخب کیا تو تو اس چیز کو سن، جو میری طرف سے تجھے وحی کی جائے یا تو وحی کو سن، اس میں نہایت درجے کی ہیبت اور جلال ہے موسیٰ علیہ السلام کے لیے۔ گویا اللہ پاک نے یوں فرمایا کہ البتہ یقینی طور پر تیری طرف وحی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ میں جو ہوں میں اِلٰہ ہوں، کسی کی بندگی نہیں سوا میرے۔ پھر اللہ پاک نے ان کو اپنی عبادت کا حکم دیا کہ ﴿ فَاعْبُدْنِيْ ﴾۔ یہ حرفِ فا بھی ترتیب ما بعد کے لیے ہے ماقبل پر، کیوں کہ جب

---

[1] الصحاح للجوهري (٧/ ٢٦٦) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٢٨٠) [3] تفسير القرطبي (١١/ ١٧٦)

الٰہیت اور معبودیت کی تخصیص اللہ پاک کے لیے ہوئی تو یہ اس بات کو واجب کرتا ہے کہ خاص اسی کی عبادت کی جائے۔

پھر اقامتِ نماز کا حکم فرمایا: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ خاص کر نماز کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ سب اطاعتوں سے اشرف اور سب عبادتوں سے افضل ہے۔ باوجود اس کے کہ نماز عبادت کے حکم کے تحت شامل تھی، مگر اشرف اور افضل ہونے کی وجہ سے علاحدہ کر کے ذکر فرمایا۔ پھر اقامتِ نماز کے حکم کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ ﴿ لِذِكْرِيْ ﴾ یعنی تو نماز کو قائم کر، تا کہ تو مجھے یاد کرے، کیوں کہ کامل یاد اور عبادت نماز ہی سے حقیقی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ یا یہ معنی ہیں تا کہ تو مجھے نماز میں یاد کرے، اس لیے کہ یہ اذکار پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ یا میرے یاد کرنے کے لیے، یا خاص میری یاد کے لیے کہ تو اس میں میرے غیر کی یاد کو شامل نہ کرے، یا میرے حکم کرنے کے لیے نماز کا کتاب میں، یعنی قرآن شریف میں، یا نماز کو میرے ذکر کرنے کے لیے قائم کر۔ یا یہ معنی ہیں کہ تا کہ تو میرا یاد کرنے والا ہو اور مجھے بھول نہ جائے۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ میرے ذکر کے اوقات کے واسطے، یہ ذکر کے اوقات وہی نماز کے اوقات مقرر ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ قائم کر تو نماز کو جس وقت تو یاد کرے کہ تجھ پر کوئی نماز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ میری نماز کے ذکر کے واسطے۔

امام ترمذی و ابن ماجہ اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص بھول جائے کسی نماز کو تو چاہیے کہ اس کو پڑھ لے جس وقت کہ اس کو یاد کرے، کیوں کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾۔[1] امام ابن شہاب رحمہ اللہ نے اس کو ''للذکری'' پڑھا ہے۔ بعض نے کہا ہے معنی یہ ہیں تا کہ میں علیین میں مدح اور تعریف کے ساتھ تیرا ذکر کروں۔ اس معنی کی بنیاد پر ﴿ لِذِكْرِيْ ﴾ میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ قائم کر تو نماز کو خالص میری یاد کے لیے اور صرف میری ذات کو طلب کرنے کے واسطے کہ تو اس میں ریا نہ کرے اور نہ اس سے کسی اور غرض کا قصد کرے۔ پھر اللہ پاک نے عبادت اور نماز کے حکم کی وجہ بیان فرمائی کہ ﴿ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ ﴾ یعنی تو خاص اللہ پاک کی عبادت کر اور نماز کو قائم و دائم رکھ، اس لیے کہ جو ساعت کہ حساب و کتاب کا وقت ہے وہ ضرور آنے والی ہے، اس کا وجود وحصول بالیقین ہونے والا ہے۔ پس تو عملِ خیر کر، یعنی خاص اللہ کو پوج اور اس کے واسطے نماز پڑھ، تا کہ قیامت کے دن تجھے اس کا اجر و ثواب ملے۔

﴿ اَكَادُ اُخْفِيْهَا ﴾ کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے: ''أخفيها من نفسي'' امام سعید بن جبیر، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ مبرد و قطرب نے کہا ہے کہ یہ عرب کے طریقۂ خطاب پر ہے، عرب کے لوگ جب کسی شے کو چھپانے میں مبالغہ کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩٧) صحيح ابن حبان (٥/ ٤٢٢)

[2] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ١٩٣)

"كتمته حتى من نفسي" یعنی میں نے فلاں شے کو چھپایا، یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی۔ مطلب یہ کہ میں نے اس پر کسی کو مطلع نہیں کیا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے قیامت کے پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کیا تو جس عبارت کو عرب لوگ زیادہ مبالغہ کرنے کے لیے جانتے پہچانتے ہیں، اس کے ساتھ اخفائے قیامت کا ذکر فرمایا۔[1] قیامت کے چھپانے میں مقصود خوف اور ڈر دلانا ہے اور اسی طرح موت کے وقت کو پوشیدہ رکھنے میں بھی انسان کو خوف دلانا مقصود ہے، تاکہ وہ ہر وقت اس ڈر اور خوف میں مبتلا رہے اور اسے مقدم رکھے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اس کو ہمزہ کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زبر کی بنیاد پر "أَخْفِيهَا" کے معنی "أكاد أظهرها" ہیں۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "خفيت الشيء إذا أظهرته"۔ "أخفيه" یعنی خفا کے معنی اظہار کے ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض لغت والوں نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ "أخفيها" ہمزہ کی پیش کے ساتھ "أظهرها" کے معنی میں ہو، اس لیے کہتے ہیں: "خفيت الشيئ و أخفيته" منجملہ حروفِ اضداد کے ہے، چھپانے اور ظاہر کرنے دونوں پر واقع ہوتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ "خفيت" اور "أخفيت" ایک معنی میں ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول حسن ہے اور یہ قول کہ اخفا و خفاء بمعنی اظہار ہے، اس کو غیر جید ٹھہرایا ہے اور کہا کہ معنی "أظهرها" کی بنیاد پر نہیں ہیں۔ خاص کر "أخفيها" قراءتِ شاذہ ہے، پھر صحیح شائع قراءت کو کیوں کر رد کرے گی۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں ایک اور تفسیر ہے، وہ یہ ہے کہ کلام "أكاد" پر منقطع ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک کلام مقدر ہے، یعنی "أكاد آتي بها" یعنی قیامت ضرور آنے والی ہے، قریب ہے کہ میں اس کو لے آؤں اور ابتدا "أخفيها" سے واقع ہوئی۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

امام ابوعلی فارسی نے کہا ہے کہ یہ بابِ سلب سے، یعنی بابِ افعال اس جگہ سلبِ ماخذ کے لیے ہے، اضداد سے نہیں ہے، معنی "أخفيها" کے یہ ہیں کہ "أزيل عنها خفاءها و هو سترها" یعنی قیامت سے اس کی ستر و پوشیدگی کو دور کردوں۔ اسی باب سے عرب کا یہ قول ہے: "أشكيته أي أزلت شكواه" یعنی میں نے اس کی شکایت دور کر دی۔ اخفش سے مروی ہے کہ "كاد" تاکید کے لیے زاید ہے۔ کہا کہ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ﴾ [النور: ٤٠] "جب وہ اپنا ہاتھ نکالے تو لگتا نہیں کہ اسے دیکھ سکے۔"[2]

﴿ اَكَادُ اُخْفِيْهَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ "أقارب ذلك" یعنی میں قریب ہوں کہ قیامت کو چھپاؤں، اس لیے کہ جس وقت تو نے کہا کہ "كاد زيد يقوم" یعنی قریب ہے کہ زید کھڑا ہو، تو یہ قول دو امر کا محتمل ہے: جائز ہے کہ

[1] فتح القدير (٣/ ٤٩٣) [2] تفسير القرطبي (١١/ ١٨٢۔ ١٨٤)

زید کھڑا ہو اور جائز ہے کہ نہ کھڑا ہو۔ جب یہ بات ٹھہری تو آیت بھی دو امر کی محتمل ہوگی، حالانکہ یہاں ایک ہی امر متعین ہے۔ لہٰذا اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کو مخفی کیا ہے، اس آیت کے سوا اور آیت دلالت کرتی ہے۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کے تین معنے ذکر کیے ہیں: ایک یہ ہے کہ میں ارادہ کرتا ہوں قیامت کے وقت کو چھپانے کا، یعنی اس کے وقت کو چھپانا چاہتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی کہ قیامت بالیقین عن قریب آئے گی تو فی الجملہ اس کا اظہار ہوا اور یہ اس کے اخفا کے منافی ہے، اس لیے یوں تاویل کی کہ مراد قیامت کے معین وقت کا اخفا ہے اور چونکہ قیامت کا ہونا من جملہ مغیبات کے تھا تو مناسب یوں تھا کہ ''أخفیھا'' بغیر ''أکاد'' کے کہا جاتا، اس لیے ﴿ اَكَادُ ﴾ کی تفسیر ''أرید'' سے کی ہے۔

﴿ اَكَادُ ﴾ کے معنی کی بابت کسی نے یہ بھی کہا کہ ﴿ اَكَادُ ﴾ زائد ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ میں قریب ہوں اس کے کہ اس کو مخفی کروں، یعنی قیامت کے اجمالِ ذکر کو چھپاؤں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ قریب تھا اس کے کہ اس کا ذکر نہ کرے، گو اجمالاً ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ وہ مخفی ترین مغیبات ہے۔ لیکن اللہ پاک نے اجمالاً اس کا ذکر کر دیا، جیسا کہ اس قول میں فرما دیا ہے: ﴿ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ ﴾. یہ اجمالی ذکر ایک حکمت کے لیے ہے، وہ حکمت یہی مومنین پر لطف و کرم ہے، اس لیے کہ اعمالِ صالح پر ان کو مستعد کرنا ہے۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ میں قریب ہوں اس کے کہ قیامت کو ظاہر کر دوں،[2] یعنی اس کا وقت معین کر دوں، پس ظاہر کرنا اور پوشیدہ رکھنا، جس چیز کے متعلق ہوتے ہیں وہ ایک نہیں ہے یہاں تک کہ تعارض حاصل ہو۔

نکتہ:

﴿ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ ﴾ یعنی قیامت لا محالہ آنے والی ہے، یہ بات کلمۂ ﴿ اِنَّ ﴾ اور جملے کا اسمیہ ہونا بتاتا ہے، کیوں کہ یہ دونوں تاکید کے لیے ہوتے ہیں۔ یہاں اور سورۃ الحج میں صرف ﴿ اٰتِيَةٌ ﴾ [الحج: ۷] بغیر لام تاکید کے فرمایا ہے اور سورت غافر میں ﴿ لَاٰتِيَةٌ ﴾ [المؤمن: ۵۹] لام تاکید کے ساتھ کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لام کو تاکید خبر کے لیے زیادہ کرتے ہیں اور تاکید کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے کہ جس کو خبر دی جاتی ہے وہ خبر میں شک کرتا ہے۔ لہٰذا سورت غافر میں مخاطب لوگ کافر ہیں، اس لیے وہاں لام سے خبر کی تاکید کی گئی، بخلاف ان دونوں مقامات کے کہ یہاں کفار مخاطب نہیں ہیں۔

اس تقریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ''کاد'' اللہ پاک کی طرف سے واجب ہوتا ہے، یعنی جس شے پر ''کاد'' آتا ہے وہ شے ضرور ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴾ [بني إسرائيل: ۵۱] ''کہہ

[1] فتح البیان (۸/ ۲۱۸۔ ۲۲۲) [2] تفسیر البیضاوی (٤/ ٤٤)

دیکھیے: اُمید ہے کہ وہ قریب ہو۔'' گو اس کو ﴿ عَسٰی ﴾ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیونکہ ﴿ عَسٰی ﴾ اللہ پاک کی طرف سے واجب ہوتا ہے۔ قیامت اور موت کا وقت چھپانے میں یہ حکمت ہے کہ ان کا وقت قریب ہونے پر اللہ پاک نے توبہ قبول نہ ہونے کی خبر دی، لہٰذا اگر انسان موت کا وقت پہچان لے تو اس وقت کے قریب تک معصیت میں مشغول ہوگا، پھر توبہ کر لے گا تو معصیت کے عذاب سے چھوٹ جائے گا، پس موت کا وقت بتا دینا ایسا ہے جیسا معصیت کرنے پر آمادہ کرنا۔ حالانکہ یہ بات جائز نہیں ہے۔

﴿ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی ﴾ کا لام ﴿ اٰتِيَةٌ ﴾ سے یا ﴿ اُخْفِيْهَا ﴾ سے متعلق ہے اور کلمہ ''ما'' مصدریہ ہے، یعنی قیامت آنے والی ہے، یا میں اس کو مخفی کرتا ہوں اس لیے کہ ہر نفس اپنی سعی و کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لفظ ''سعی'' کا اگرچہ افعال میں ظاہر ہے، یعنی ظاہر یہی ہے کہ اچھے برے کام کرنے کو سعی کہتے ہیں۔ کسی شے کے ترک کرنے کو سعی نہیں بولتے، لیکن یہاں ''سعی'' کا لفظ کرنے اور ترک کرنے دونوں کے لیے عام ہے، کیونکہ یہ بات قطعی ہے کہ جو شے جس شخص پر واجب ہے، اگر وہ اس کو ترک کرے گا تو اس کے ترک کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوگا اور پکڑا جائے گا۔

﴿ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی ﴾. ﴿ عَنْهَا ﴾ اور ﴿ بِهَا ﴾ کی ضمیر ساعت کی طرف پھرتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صلاۃ کی طرف پھرتی ہے، یہ قول بعید ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ عَنْهَا ﴾ کی ضمیر صلاۃ کی طرف اور ﴿ بِهَا ﴾ کی ساعت کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی ہرگز نہ روکے، باز نہ رکھے، نہ پھیرے تجھ کو قیامت پر ایمان لانے سے اور اس کی تصدیق کرنے سے، یا قیامت کے ذکر و مراقبے سے وہ شخص جو قیامت کو نہیں مانتا اور اپنے ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے، لذاتِ فانیہ اور انکارِ قیامت میں اپنے انہماک کے سبب سے۔ معنی اخیر موسیٰ علیہ السلام کی شان سے اولیٰ و اَلیق ہیں۔ اگرچہ نہی بطورِ تہییج و الہاب (برانگیختہ کرنا، بھڑکانا) کے ہے، کیونکہ کون ان کو قیامت کے ایمان اور تصدیق سے روک سکتا ہے، ہاں اگر اُن کو قیامت کے ذکر اور مراقبہ (انتظار کرنا) سے ان کو روکیں تو روکیں، اس لیے ان کو منع کیا ہے کہ منکرینِ قیامت ذکر اور مراقبۂ قیامت سے تم کو باز نہ رکھیں۔ یہ نہی اگرچہ ظاہر طور پر کافر کو ہے، لیکن حقیقت میں موسیٰ علیہ السلام کو روکنے سے یا کفار سے نرمی ظاہر کرنے سے نہی ہے۔ لہٰذا یہ نہی ''لأرينك ههنا'' کے باب سے ہے، یعنی ظاہر میں تو یہ نہی خود متکلم کو ہے کہ میں ہرگز تجھے یہاں نہ دیکھوں اور حقیقت میں نہی مخاطب کو ہے کہ تو یہاں مت آ۔ اسی طرح اس جگہ ہے کہ کفار تم کو نہ روکیں، یعنی تم اُن کے رکنے سے مت رکو۔ ﴿ فَتَرْدٰی ﴾ میں حرفِ فا سببیت کے واسطے ہے اور ''ردی'' بمعنی ہلاک ہے، یعنی تم ان کے باز رکھنے سے باز مت رہو۔ اس لیے کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے، یعنی تمھارا باز رہنا قیامت کے ایمان و تصدیق سے یا اس کی یاد اور مراقبے سے کفار کے روکنے کے سبب سے تم کو ہلاک ہونے کو مستلزم اور مستتبع ہے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا
وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾
قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ
خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾

اور اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟⑰ اس نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، اور اس میں میرے لیے اور بھی مقاصد ہیں⑱ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! اسے پھینک دے⑲ پھر جب اس نے اسے پھینکا تب وہ دوڑتا ہوا سانپ (بن گیا) تھا⑳ فرمایا: اسے پکڑ لے اور مت ڈر، ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے㉑

عصائے موسیٰ علیہ السلام کا بیان:

پہلے حال پر، یعنی پھر لاٹھی ہو جائے گی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک برہان اور ایک معجزۂ عظیم ہے اور ایک روشن خرقِ عادت ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس جیسی بات پر سوائے اللہ کے اور کوئی قدرت نہیں رکھتا اور اس کو سوائے نبی مرسل کے اور کوئی نہیں لا سکتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے جو یہ فرمایا: ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى﴾ تو یہ بطورِ اُنس دینے کے کہا ہے، یعنی جب کسی سے پہلے پہل ملاقات ہوتی ہے تو پہلے اس سے اِدھر اُدھر کی بات کرتے ہیں، پھر جب کچھ اُنس ہوتا ہے، وحشت دور ہو جاتی ہے تو اصل مطلب کی گفتگو کرتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بات اُن سے بطورِ تقریر کے فرمائی، یعنی یہ جو تمھارے داہنے ہاتھ میں تمھاری لاٹھی ہے، جس کو تم جانتے پہچانتے ہو، اب تم دیکھو گے کہ ہم اس کے ساتھ کیا کچھ کریں گے۔

غرضیکہ جب اللہ پاک نے ان سے بطورِ استفہام تقریری کے پوچھا کہ اے موسیٰ! تمھارے داہنے ہاتھ میں یہ کیا چیز ہے؟ تو وہ بولے کہ یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیکتا ہوں، یعنی چلنے کی حالت میں۔ ﴿وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ﴾ اور میں ہلاتا ہوں اس سے درخت کو اس لیے کہ اس کے پتے گر پڑیں، تاکہ میری بکریاں ان کو چریں۔ عبد الرحمن بن قاسم نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿اَهُشُّ﴾ یہ ہے کہ آدمی مجن (لاٹھی کے سر) کو درخت کی شاخ میں رکھے، پھر اس کو ہلائے یہاں تک کہ اس کے پتے اور پھل گر پڑیں اور لکڑی کو نہ توڑے اور نہ پتے جھڑائے۔ اسی طرح میمون بن مہران رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1]

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٠)

﴿ وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس کے سوا میرے اس میں اور کام، فائدے اور ضروریات بھی ہیں۔ یہ منافع وغیرہ جو مبہم رکھے گئے ہیں بعض لوگوں نے ان میں سے بعض کاموں کے ذکر کے لیے تکلف کیا ہے۔ پس کسی نے کہا ہے کہ وہ عصا رات کو ان کے لیے روشن ہو جاتا اور جب وہ سو رہتے تو اُن کی بکریوں کی نگہبانی کرتا اور وہ اس کو گاڑ دیتے تو درخت ہو کر اُن پر سایہ کرتا تھا، ان کے علاوہ اور خارقِ عادت امور ذکر کیے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ ایسا نہ تھا، اگر وہ ایسا ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام اس کے اژدہا بن جانے کو اوپرا نہ سمجھتے اور اس سے بھاگ نہ جاتے، لیکن یہ سب باتیں اسرائیلی قصوں کی ہیں۔ اسی طرح بعض کا یہ قول ہے کہ یہ عصا وہی دابہ ہے جو قیامت سے پہلے نکلے گا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عصا کا نام ماشا تھا۔[1] واللہ أعلم بالصواب.

﴿ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴾ یعنی اللہ پاک نے فرمایا: اے موسیٰ! تم اس عصا کو جو تمھارے ہاتھ میں ہے، ڈال دو۔ ﴿ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴾ انھوں نے اس کو ڈالا تو فی الحال اسی دم ایک بڑا سانپ، یعنی اژدہا دراز بن گیا، تیز حرکت کرنے لگا۔ پھنپھناتا ہوا جیسے سانپ کی سٹک۔ ''جَانٌّ''سفید سانپ کو کہتے ہیں یہ دوسرے سانپوں سے زیادہ تیز حرکت والا ہوتا ہے، لیکن چھوٹا ہوتا ہے۔ سو یہ سانپ جو عصا کا بن گیا تھا، نہایت بڑا اور انتہائی سریع الحرکت (تیز حرکت والا) تھا، اس میں یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی تھیں، بڑائی میں تو بڑا اژدہا تھا اور سرعتِ حرکت میں سفید سانپ، جو سب سے زیادہ حرکت والا ہوتا ہے۔

﴿ تَسْعٰى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ چلتا اور مضطرب ہوتا تھا۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بطریقِ عکرمہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ڈالنے سے پہلے سانپ نہ تھا، پھر وہ ایک درخت پر گزرا تو اس کو کھا گیا اور ایک پتھر پر گزرا تو اس کو نگل گیا۔ موسیٰ علیہ السلام پتھر کے واقع ہونے کی آواز اس کے پیٹ میں سننے لگے تو منہ موڑ کر اُلٹے پھرے، ندا ہوئی کہ اے موسیٰ! تو اس کو پکڑ لے، لہٰذا اس کو انھوں نے نہ پکڑا، پھر دوبارہ ندا ہوئی کہ تو اس کو پکڑ لے اور مت ڈر۔ تیسری بار اُن سے کہا گیا کہ ﴿ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴾ [القصص: ۳۱] ''بلاشبہہ تو امن والوں میں سے ہے۔'' یعنی تجھ کو خطرہ نہیں ہے، تب اس کو پکڑ لیا۔[2]

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو روئے زمین پر ڈال دیا۔ ''ثم حانت منه نظرة''، یعنی پھر اُن کی نظر پڑی، تب ہی وہ ایک نہایت بڑا اژدہا ہے کہ دیکھا اس کو دیکھنے والوں نے، یعنی دیکھنے والوں نے جو اژدہا دیکھے ہیں، وہ ان سب سے بڑا اژدہا تھا، چلتا ہے، جستجو کرتا ہے، گویا سونڈتا ہے کسی شے کو، جس کو پکڑنا چاہتا ہے، حاملہ اونٹنی کی طرح پتھر پر گزرتا ہے تو اس کو لقمہ کر لیتا ہے، اپنے دانتوں میں سے کسی دانت کے ساتھ بڑے درخت کی جڑ میں نیزے کی طرح مارتا ہے تو اس کو جڑ سے اُکھیڑ ڈالتا ہے، آنکھیں

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۸٤۸)
[2] تفسیر ابن أبی حاتم (۷/ ۲٤۲۰)

اس کی آگ کی طرح چمکتی ہیں۔ مجن اس کا عرف ہوگیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عرف بال ہیں چھوٹے نیزوں کی طرح، یعنی عصا میں جو جگہ کہ ٹیڑھی تھی، وہ ایسے بال بن گئے جیسے چھوٹے نیزے اور اس کی دونوں شاخیں چاہِ فراخ (کھلے کنوئیں) کی طرح منہ ہوگئیں، اس میں ڈاڑھیں اور دانت ہیں، ان کے لیے آواز ہے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ سب کچھ معائنہ کیا تو منہ موڑ کر اُلٹے پھرے اور پیچھے نہ دیکھا، پس چلے یہاں تک کہ غور کیا اور سوچا اور دیکھا کہ سانپ نے ان کو عاجز کر دیا، پھر اپنے رب کو یاد کیا تو اس سے شرما کر ٹھہر گئے، پھر ان کو ندا ہوئی، اے موسیٰ! تو وہاں لوٹ جا جہاں پر تو تھا۔ پس وہ لوٹ آئے اس حال میں کہ سخت خوف زدہ تھے۔ اس پر اللہ پاک نے فرمایا تو اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑ لے اور مت ڈر، ہم اس کو پہلے حال پر کر دیں گے۔[1]

اس وقت موسیٰ علیہ السلام پر درعِ صوف تھا، یعنی اُون کا کُرتا، اس سے کئی سیخیں خرما بن کے چھا دی تھیں، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو سانپ کے پکڑنے کا حکم دیا تو انھوں نے کُرتے کا پلو اپنے ہاتھ میں لپیٹ لیا، اس پر ایک فرشتے نے کہا: اے موسیٰ! تو مجھے بتا اگر اللہ اس چیز کا اذن دے دے، جس سے تو ڈرتا ہے تو کیا کرتا کوئی شے تجھ سے ہٹا لے گا؟ بولے: نہیں، لیکن میں ضعیف ہوں اور ضعف سے پیدا کیا گیا ہوں، اس پر انھوں نے اپنا ہاتھ کھول دیا، پھر اس کو سانپ کے منہ پر رکھا، یہاں تک کہ ڈاڑھی اور دانتوں کی حس (آہٹ) سنی، پھر انھوں نے قبضہ کیا، یعنی اس کو پکڑ لیا، تب ہی وہ اُن کی وہی لاٹھی جس کو جانتے پہچانتے تھے اور اُن کا ہاتھ اسی جگہ میں تھا، جس میں رکھا کرتے تھے، جس وقت کہ دونوں شاخوں کے درمیان ٹیکتے تھے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴾ یعنی ہم اس کو اسی حال کی طرف لوٹا دیں گے، جس کو تو اس سے پہلے پہچانتا ہے۔

﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے۔ ﴿ تِلْكَ ﴾ میں دو قول ہیں، یا تو اسم اشارہ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تِلْكَ ﴾ بمعنی ''هذه'' ہے۔ اگر ''ما ذلك'' کہتا تو بھی صحیح تھا، یعنی یہ کیا شے ہے؟ یا ﴿ تِلْكَ ﴾ اسم موصول ہے۔ یہ قول امام زجاج اور فراء رحمہما اللہ کا ہے۔ کوفی اسی کے قائل ہیں۔[2] پہلے قول کے مطابق ﴿ مَا ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ تِلْكَ ﴾ خبر اور ﴿ بِيَمِيْنِكَ ﴾ حال ہے۔ یعنی کیا ہے یہ دراں حال کہ تیرے داہنے ہاتھ میں ہے اور قولِ ثانی کی بنیاد پر یہ معنی ہیں: ''ما التي بيمينك''، یعنی کیا ہے وہ شے جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے۔ اس صورت میں ﴿ مَا ﴾ مبتداء، ﴿ تِلْكَ ﴾ بمعنی ''التي'' اسم موصول اور ﴿ بِيَمِيْنِكَ ﴾ صلہ موصول کا، پھر خبر مبتدا کی۔ اللہ پاک نے جو موسیٰ علیہ السلام سے عصا کا سوال کیا، اس میں کئی قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ سوال کرنے سے غرض موسیٰ علیہ السلام کو عصا سے آگاہ کرنا ہے، تاکہ تثبیت اور تأمل کے بعد اس سے معجزہ واقع ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۹٤_ ۱۹٦) [2] فتح القدير (۳/ ٤۹۷) [3] معاني القرآن (۳/ ۳۵۳_ ۳۵٤)

دوسرا یہ ہے کہ پوچھنے سے مقصد تقریر امر ہے، یعنی بات کو اچھی طرح سے ثابت کرنا ہے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کہہ دیں کہ یہ میری لاٹھی ہے، تاکہ اقرار کے بعد اُن پر حجت ثابت کی جائے، ورنہ اللہ پاک تو اَزل میں جان چکا ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے۔[1] تیسرا یہ ہے کہ سوال واسطے اطمینان کے ہے، تاکہ عصا کا سانپ بن جانا ان کو ہولناک نہ کر دے۔ یعنی اس وقت وہ ثابت قدم رہیں گھبرا نہ جائیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ سوال ان کو اُنس دینے اور ہیبت دور کرنے کے لیے ہے مکالمت کی خاطر۔ یعنی بات چیت کرنے میں ان کو اُنس ہو، ہیبت نہ آجائے، یہ قول گزر چکا ہے۔

﴿ عَصَایَ ﴾ کو "عَصَيَّ" بھی پڑھا ہے یہ قراءت ہزیل کی لغت پر ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے "عَصَايِ" یا کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے، دو ساکن حروف کے اکٹھا آنے کی وجہ سے۔[2] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ عصا موسیٰ علیہ السلام کو ایک فرشتے نے دیا تھا، جبکہ وہ مدین کی طرف متوجہ ہوئے تھے، رات کو اُن کے لیے روشن ہو جاتا، زمین کو اس سے مارتے تو ان کے واسطے روئیدگی نکل آتی، بکریوں پر اس سے پتے جھڑاتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات کو اُن کے لیے روشن ہو جاتا، یہ عصا آدم علیہ السلام کا تھا۔[2] شعیب علیہ السلام اس کے وارث ہوئے انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا اپنی بیٹی کا ان سے بیاہ کرنے کے بعد۔ کسی نے کہا ہے کہ عصا کی دو شاخیں تھیں، اس کے نیچے ایک بھال تھی اور اس کی مجن تھی، یعنی اس کا سر ٹیڑھا تھا، نبعہ اس کا نام ہے۔

﴿ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ چلنے میں اس پر بوجھ دیتا ہوں اور جب تھکتا ہوں بکریوں کے گلے پر کھڑا ہوتا ہوں، پھاندتا ہوں، کھڑے ہونے کے لیے اُٹھتا ہوں تو اس پر تکیہ کرتا ہوں۔ "هَشَّ بِالْعَصَا يهش هشا" جب بولتے ہیں کہ آدمی لاٹھی سے درخت کو مارے، تاکہ اس سے پتے گریں، یعنی میں اس سے درخت کو مارتا ہوں تو میری بکریوں پر اس سے پتے گر پڑتے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں[4] اور اسی کے مثل سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے "أهس" سین مہملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ "هس" بکریوں کے زجر کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے پڑھا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے "هش" و "هس" ایک ہی معنی کی دو لغت ہیں۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا کہ ﴿ مَاٰرِبُ ﴾ سے مراد حوائج ہیں۔[6] واحد اس کا "مأربه" رائے مہملہ کی پیش، زیر اور زبر کے ساتھ۔ ابن اعرابی اور قطرب نے اسی طرح کہا ہے۔[7]

یہاں ﴿ اُخْرٰی ﴾ فرمایا، حالانکہ قیاس یہ تھا کہ اخیر ہوتا، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جماعت کی رِف رد کیا، دوسری یہ کہ فواصل کی رعایت کے لیے ﴿ اُخْرٰی ﴾ فرمایا، کیونکہ اس سورت کے فاصلے مقصور (چھوٹے)

---

[1] فتح القدير (٣/ ٤٩٧) [2] تفسير القرطبي (١١/ ١٨٦) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤١٩۔ ٢٤٢٠)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٢٩٣) [5] فتح القدير (٣/ ٤٩٧) [6] تفسير الطبري (١٨/ ٢٩٤) [7] فتح القدير (٣/ ٤٩٧)

واقع ہوئے ہیں، جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے عصا کے بعض منافع شکر کے طور پر ذکر کیے تو باقی مصالح کا اجمال کیا، یہ اجمال اس لیے کیا کہ کلام کو لمبا کرنے سے شرمائے، یا اس واسطے کہ اللہ پاک خود اُن سے اُن مصالح کا سوال کرے جو اُن کی تعظیم و اکرام میں زیادتی فرمائے اور اُن کو مالک الملک اور علام الغیوب کے خطاب سے لذت حاصل ہو۔ ایک گروہ نے عصا کے اس منافع کی تعداد سے تعرض کیا تو بہت سے منافع ذکر کیے۔ منجملہ اُن کے بعض عرب کا یہ قول ہے، جو انتہائی فصیح و بلیغ ہے۔ اس لیے اس کو بلفظہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوا: "عصاي أركزها لصلاتي وأعدها لعداتي و أسوق بها دابتي و أقوى بها على سفري و اعتمد بها في مشيتي ليتسع خطوي وأثب بها النهر و تومنني العثر وألقي عليها كسائي فتقيني من الحر وتدفيني من القر، وتدني إلي ما بعد مني، وهي تحمل سفرتي، و علاقة ادواتي، أعصي بها عند الضراب وأقرع بها الأبواب وأقي بها عقور الكلاب وتنوب عن الرمح في الطعان و عن السيف عند منازلة الأقران ورثتها عن أبي و أورثها بعدي بُنيّ" یعنی میرا عصا، گاڑتا ہوں میں اس کو اپنی نماز کے لیے۔ تیار رکھتا ہوں اس کو اپنے دشمنوں کے لیے۔ ہنکاتا ہوں اس سے اپنی سواری کو، قوی ہوتا ہوں اس سے، سفر پر ٹیکتا ہوں اس پر چلنے میں، تاکہ قدم فراخ ہو، پھاندتا ہوں اس سے نہر کو، امن دیتا ہے مجھ کو ٹھوکر سے، ڈالتا ہوں اس پر چادر تو بچاتا ہے مجھ کو گرمی سے، گرم کرتا ہے سردی سے، قریب کرتا ہے میری طرف اس شے کو جو مجھ سے دور ہے، اٹھاتا ہے میرے دسترخوان کو اور میری چھاگل کی رسی کو۔ مارتا ہوں میں اس سے مارنے کے وقت، ٹھونکتا ہوں، اس سے دروازوں کو کھٹکھٹاتا ہوں، اس کے سبب سے کٹ کھنے کتوں سے نیزہ مارنے کے وقت یہ نیزہ کا قائم مقام ہوتا ہے، نائب ہوتا ہے تلوار کا ہمسروں کے اترنے کے وقت، یعنی جس وقت ہمسر لوگ لڑنے کے لیے سواریوں سے اترتے ہیں تو تلوار کا کام دیتا ہے، وارث ہوا میں اس کا اپنے باپ سے اور وارث کروں گا اس کے بعد اپنے بیٹوں کو۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض متاخرین نے منافعِ عصا میں ایک مجلد لطیف تصنیف کیا ہے۔ میں اس پر واقف ہوا، اس میں اخبار و اشعار و فوائدِ لطیفہ و نکاتِ رشیق ذکر کیے ہیں۔ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ان کے عصا میں وہ عظیم براہین اور آیات جمع فرمائے تھے جن کے سبب سے جادوگروں کے مکر و فریب اور دشمنوں کی ایذا رسانی اور مکروہ حرکتوں سے امن میں رہے۔ یہ عصا وہ شے ہے جس کو سلیمان علیہ السلام نے خطبہ و وعظ وطولِ صلاۃ کے لیے رکھا ہے اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عصا رکھا کرتے تھے۔[1] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عصا وعنزہ (برچھی) بردار تھے۔[2] یہ اس لیے تھی کہ نماز کے وقت سترہ ہو جائے اور (قضائے حاجت کے لیے) ڈھیلے کی ضرورت ہو تو اس سے کھود لیے جائیں۔ یہ خدمت ان کے سپرد تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھا کرتے تھے قضیب کے ساتھ۔[3]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧٢) (2) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٣/ ١٥٣)
(3) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (١/ ٣٧٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٣٧)

قضیب سے مراد سیف لطیف دقیق ہے یا درخت کی شاخ۔ مطلب یہ کہ خطبہ کے وقت دست مبارک میں عصا ہوتا تھا، اسی طرح آپ ﷺ کے بعد خلفا کیا کرتے تھے۔ عرب عربا کی عادت تھی کہ کلام کے وقت اور محفلوں اور خطبوں میں عصا لیتے اور اس پر ٹیک لگاتے تھے۔ بعض نے کہا: "إمساك العصا سنة الأنبياء و زينة الصلحاء و سلاح على الأعداء و عون الضعفاء و غم المنافقين و زيادة في الطاعات" یعنی عصا ہاتھ میں رکھنا انبیا علیہم السلام کا طریقہ ہے، صلحا کی زینت ہے، دشمنوں پر ہتھیار ہے، کمزور لوگوں کی مدد ہے، منافقوں کا غم ہے، عبادتوں میں زیادتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس وقت مومن کے ہمراہ عصا ہوتا ہے تو شیطان اس سے بھاگتا ہے اور منافق و فاجر اس سے خشوع اور فروتنی کرتا ہے اور جب نماز پڑھتا ہے تو اس کا قبلہ ہو جاتا ہے جس وقت تھک جاتا ہے تو اس کی قوت ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ موسیٰ علیہ السلام جب عصا کے منافع تفصیل اور اجمال کے ساتھ بیان کر چکے تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے، سوال مقدر کا جواب ہے، یعنی ان کو عصا کے ڈالنے کا حکم دیا، تاکہ جو معجزہ ظاہر اس میں رکھا ہے، وہ ان کو دکھائے۔ پس انھوں نے عصا کو زمین پر ڈالا تو وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ ہوگیا۔ یہ یوں ہوا کہ اللہ پاک نے عصا کے اوصاف و اعراض کو قلب کر ڈالا، یہاں تک کہ وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا، یعنی اپنے پیٹ پر بسرعت وخفت چلتا تھا، کہتے ہیں کہ اس کی دو شاخیں تھیں، سو وہ دونوں تو منہ بن گئیں اور باقی سانپ کا جسم ہوگیا، ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرتا اور پتھروں کو لقمہ کر لیتا، باوجود اس کے کہ اس کا جسم بڑا اور صورت ہولناک تھی۔

دوسری جگہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ كَاَنَّهَا جَآنٌّ ﴾۔ ﴿ جَآنٌّ ﴾ کہتے ہیں اس سانپ کو جس کا جسم صغیر وخفیف ہو، اس لیے شاہ عبد القادر ﷺ نے اس کا ترجمہ سٹک کیا ہے۔ اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ ﴾ [الأعراف: ١٠٧، الشعراء: ٣٢] "تو وہ اسی وقت اژدہا (بن کر) ظاہر ہوا۔" ثعبان کہتے ہیں، بڑے سے بڑے سانپ کو۔ اور اس سورت میں ﴿ حَيَّةٌ ﴾ فرمایا ہے۔ ان تین قولوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ حیۃ ایک اسم جامع ہے، بڑے چھوٹے نر و مادہ سب کو ﴿ حَيَّةٌ ﴾ بولتے ہیں۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ بڑائی میں تو ﴿ ثُعْبَانٌ ﴾ تھا اور سرعت میں ﴿ جَآنٌّ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کو ڈالا تو وہ ایک زرد سانپ ہوگیا، عصا کی موٹائی کی طرح، پھر اس پر ورم چڑھا اور بڑا ہوا، سو اسی لیے کبھی تو اس کو بنظر مبدا ﴿ جَآنٌّ ﴾ کہا اور کبھی باعتبار منتہی کے اس کا نام ﴿ ثُعْبَانٌ ﴾ رکھا اور کبھی اس کو ﴿ حَيَّةٌ ﴾ کہا، باعتبار اس اسم کے جو دونوں حال کو عام ہے۔

مصباح میں کہا ہے کہ ثعبان حیۂ عظیمہ کو کہتے ہیں، اس کا وزن فعلان ہے، نر و مادہ پر واقع ہوتا ہے، اس کی جمع ثعابین ہے۔[1] قاموس میں ہے کہ ثعبان حیہ ضخمہ طویلہ (موٹا اور لمبا) یا خاص نر کو کہتے ہیں یا عام ہے، یعنی نر و مادہ کو۔[2]

---

(1) المصباح المنير (١/ ٨١) (2) القاموس المحيط (١/ ٨٠)

امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیرت بہ معنی حالت ہے،[1] یعنی وہ حالت جس پر انسان ہوتا ہے۔ غریزی طبعی ہو یا کسب سے حاصل ہوئی ہو۔ سیرت اصل میں فعلہ کا وزن ہے۔ ''سیر'' سے جیسے رکبہ ہے رکوب سے، پھر بہ معنی حالت وطریقہ وہیئت اس کا استعمال کیا گیا ہے۔

امام اخفش اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سِيْرَتَهَا ﴾ تھا کہ زبر بہ نزع خافض ہے، یعنی اصل میں ''إلیٰ سیرتها'' تھا، ''إلیٰ'' کو حذف کر کے زبر دے دیا، جس طرح کہ ﴿ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ﴾[2] [الأعراف: ١٥٥] ''اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقرر وقت (پر کوہِ طور پر توبہ واستغفار) کے لیے چنے۔'' میں ہوا ہے، یعنی اصل میں ''من قومه'' تھا ''من'' کو حذف کر کے میم کو زبر دے دیا۔ کہا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیرت مصدر ہو، کیونکہ معنی ﴿ سَنُعِيْدُهَا ﴾ کے ''سَنُسِيْرُهَا'' ہیں، یعنی ہم چلائیں گے اس کو پہلی چال، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصدر بہ معنی اسم فاعل ہو ''أي سائرة'' یا بہ معنی مفعول ہو ''أي مسیرة''، یعنی ہم چلائیں گے اس کو دراں حالیکہ وہ چلنے والا یا چلایا گیا ہوگا اپنی اگلی چال پر۔ معنی یہ ہیں کہ ہم اس کو تمھارے پکڑنے کے بعد اس کی پہلی حالت کی طرف لوٹا دیں گے، جو عصا ہونا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس وقت ان سے ﴿ لَا تَخَفْ ﴾ فرمایا گیا تو ان کا جی خوش ہوا، یہاں تک کہ بے خوفی سے اس درجے کو پہنچے کہ اپنا ہاتھ اس کے منہ میں گھساتے اور اس کے دونوں جبڑے پکڑ لیتے تھے۔ علامہ محلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معجزہ اس وقت ان کو اس لیے دکھایا گیا، تا کہ وہ گھبرا نہ جائیں، جبکہ وہ فرعون کے روبرو سانپ بن جائے،[3] یعنی اس واسطے ان کو پہلے بتا دیا، تا کہ مانوس ہو رہیں، دل کا خوف نکل جائے، ڈھیٹ ہو جائیں، ہوش وحواس بجا رہیں۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾

اور تو اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا، وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا سفید نکلے گا، (یہ) دوسری نشانی ہے (22) تا کہ

[1] الدر المنثور (٥/ ٥٦٥) [2] فتح القدير (٣/ ٤٩٨) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٠٧)

ہم تجھے اپنی کچھ بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں (23) تو فرعون کی طرف جا، بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے (24) اس (موسیٰ) نے کہا: میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے (25) اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے (26) اور میری زبان کی گرہ کھول دے (27) (تاکہ) وہ میری بات سمجھ سکیں (28) اور میرے لیے میرے کنبے میں سے ایک وزیر بنا دے (29) (یعنی) میرے بھائی ہارون کو (30) اس کے ساتھ میری کمر مضبوط کر دے (31) اور اسے میرے کام (نبوت) میں شریک کر دے (32) تاکہ ہم تیری بکثرت تسبیح کریں (33) اور ہم تجھے بکثرت یاد کریں (34) بے شک تو ہمیں خوب دیکھنے والا ہے (35)

یدِ بیضا کا تذکرہ:

ہاتھ برے طریقے سے، یعنی کسی آزار سے سفید نہیں ہوگا۔ سینہ کشادہ کر، یعنی میں جلدی خفا نہ ہوں۔ زبان لڑکپن میں جل گئی تھی،[1] صاف بول نہ سکتے تھے۔ میرے کام میں شریک کر، کیوں کہ ایسے بڑے پیغمبروں کو خلق کی طرف بہت خیال نہیں ہوتا، ایک پیش کار چاہیے کہ خلق کو آرام سے سمجھائے، ہمارے پیغمبر ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ پیغمبر کے ابتدائی ایام میں بہت سے لوگ ان کے سمجھانے سے ایمان لائے۔

یہ ایک دوسری نشانی ہے موسیٰ علیہ السلام کے لیے کہ اللہ پاک نے ان کو حکم دیا کہ اپنا ہاتھ اپنی جیب میں داخل کریں، جس طرح کہ دوسری آیت میں اس کی تصریح ہے، یہاں اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے: ﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ ﴾ اور دوسری جگہ یوں فرمایا: ﴿ وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ۖ فَذَٰنِكَ بُرْهَانَانِ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ﴾ [القصص: ۳۲] ''اور خوف سے (بچنے کے لیے) اپنا بازو اپنی طرف ملا لے، چناں چہ تیرے رب کی طرف سے یہ دونوں معجزے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف (بھیجنے کے لیے) ہیں۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے آیتِ مذکور کی تفسیر میں کہا ہے کہ اپنی ہتھیلیاں اپنے بازو کے نیچے ملا۔[2] اس کی یہ صورت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب اپنے ہاتھ کو جیب میں داخل کرتے، پھر اس کو نکالتے تو وہ چمکتا دمکتا نکلتا۔ گویا چاند کا ایک ٹکڑا ہے۔

﴿ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ برص اور اذیت کے بغیر اور بغیر عیب کے، یعنی اس کی سفیدی برص وغیرہ کی وجہ سے نہ تھی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔[3] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ واللہ! اس کو نکالا، گویا وہ چراغ تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے جان لیا کہ انھوں نے اپنے رب عزوجل سے ملاقات کی اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ﴿ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ﴾[4]۔ امام وہب رحمہ اللہ نے

---

[1] یہ بات گو مشہور ہے، لیکن مستند ذریعے سے ثابت نہیں۔ [ص ۔ ی]
[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٩٧)
[3] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٩٧ ـ ٢٩٨)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢١)

کہا ہے کہ ان کے رب نے ان سے کہا ہے کہ قریب ہو، پھر اُن کو قریب بلاتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی پشت درخت کے تنے میں ٹکا دی، پھر انھوں نے قرار پکڑا اور اُن سے لرزہ، یعنی خوف جاتا رہا اور اپنے ہاتھ کو عصا پر مضبوط کیا اور سر اور گردن جھکا دی۔[1]

فرعون کو دعوت دینے کا حکم:

﴿ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تو فرعون بادشاہِ مصر کی طرف جا، جس سے تو فرار ہو کر بھاگ نکلا ہے، لہٰذا تو اس کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی طرف بلا اور اس کو حکم دے کہ وہ بنی اسرائیل سے احسان کرے، ان سے اچھا برتاؤ رکھے، ان کو عذاب نہ کرے، تکلیف نہ دے، ایذا نہ پہنچائے، کیوں کہ وہ طاغی، باغی، سرکش اور متمرد ہو گیا ہے، دنیا کی زندگی کو اختیار کر بیٹھا ہے، ربِ اعلیٰ کو بھول گیا ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ تو میری رسالت لے جا، "فإنك بسمعي وعيني" یعنی تو تو میرے روبرو ہے اور تیرے ہمراہ میری قوت و مدد ہے، بے شک یہ ٹھہر چکا ہے کہ میں نے تجھ کو اپنے سلطان اور دبدبہ سے ایک زرہ پہنا دی ہے، تاکہ تو اس سے میرے کام میں پوری قوت حاصل کرے، تو میرے لشکروں میں سے خود ایک لشکرِ عظیم ہے، میں نے تجھ کو اپنی خلق میں سے ایک کمزور خلق کی طرف بھیجا ہے۔

فرعون نے میری نعمت کا بطر کیا ہے، یعنی اس کو حقیر اور اپنے آپ کو کبیر سمجھا ہے۔ میری تدبیر سے بے خوف ہو گیا ہے، اس کو دنیا نے مجھ سے مغرور کر دیا ہے، یہاں تک کہ اس نے میرے حق کا انکار کیا ہے، میری ربوبیت کا منکر ہو گیا ہے اور یہ زعم کیا ہے، کہ وہ مجھے جانتا پہچانتا ہی نہیں۔ لہٰذا میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر وہ قدر نہ ہوتی (یعنی تقدیر) جو میں نے اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان رکھی ہے تو ضرور میں اس پر دباؤ ڈالتا، جبار کا دباؤ، جس سے آسمان و زمین و پہاڑ و دریا خوف کھاتے ہیں، پس اگر میں آسمان کو حکم دیتا تو وہ اس پر پتھر برسا دیتا، زمین کو حکم دیتا تو اسے نگل لیتی، پہاڑوں سے کہتا تو وہ اسے ہلاک کر ڈالتے، دریاؤں کو حکم کرتا تو اس کو ڈبو دیتے، لیکن وہ مجھ پر سہل اور آسان ہے، یعنی میرے نزدیک بالکل بے حقیقت ہے۔ میری نظروں سے گر گیا ہے، میرے حلم نے اس کو سما لیا ہے۔ اور میں اس چیز سے جو میرے نزدیک ہے، مستغنی ہوں اور یہ بات سچی پکی ہے کہ بے شک غنی میں ہوں کوئی غنی نہیں ہے سوائے میرے، تو تُو اس کو میری رسالت پہنچا دے اور میری عبادت و توحید و اخلاص کی طرف اس کو بلا اور میرے ایام اس کو یاد دلا اور میرے انتقام اور عذاب سے اس کو ڈرا اور اس کو خبر دے کہ میرے غضب کے آگے کوئی شے ٹھہر نہیں سکتی اور یہ گفتگو کرتے ہوئے اس سے نرم بات کر، شاید وہ نصیحت پکڑے یا ڈر جائے اور اسے خبر دے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۹۶)

میں جتنا عفو اور مغفرت کی طرف جلدی سے جاتا ہوں اتنا غضب اور عذاب کی طرف جلدی نہیں جاتا۔ تجھے ہرگز اس بات سے خوف نہیں کھانا چاہیے کہ جو کچھ میں نے اس کو دنیا کا لباس پہنایا ہے، یعنی سلطنت، بادشاہت اور دولت کی بہتات سے، تو ہرگز مت ڈرنا، کیونکہ اس کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے، وہ میرے ہی اذن سے بولتا، پلک جھپکتا اور سانس لیتا ہے۔

تو اس سے کہہ ''أَجِبْ رَبَّكَ'' یعنی تو اپنے پروردگار و پالنہار کی دعوت قبول کر، اس کا کہا مان، کیوں کہ وہ تو بہت وسیع مغفرت والا ہے، چار سو برس کی اس نے تجھے مہلت دی، تو اس ساری مدت میں اس سے کھلم کھلا لڑائی کرتا رہا، اس کو گالی دیتا رہا، اس کے ساتھ تمثل کرتا رہا، یعنی اس کی مثل خود کو الٰہ بتاتا رہا، اس کے بندوں کو اس کی راہ سے روکتا رہا اور وہ تجھ پر پانی برساتا، تیرے لیے زمین کو اُگاتا رہا اور تو نہ بیمار ہوا نہ بڑھاپا آیا نہ تو فقیر و محتاج ہوا نہ تو مغلوب ہوا۔ اگر اللہ چاہتا کہ تجھ پر جلد عذاب بھیجے تو بھیج دیتا، لیکن وہ تو صاحبِ اَناۃ، یعنی برداشت اور بہت بڑے حوصلے والا ہے۔ اور تو اس سے جہاد کر اپنی ذات اور اپنے بھائی کے ساتھ، حالانکہ اس کے جہاد کرنے میں تم دونوں ثواب طلب کرو، کیونکہ اگر میں چاہتا کہ اس کے پاس ایسے لشکر لے آؤں، جن کے مقابلے کی اسے طاقت نہ ہو تو میں لا سکتا تھا، لیکن میں نہیں لاتا تا کہ یہ کمزور بندہ جس کو اس کے نفس نے اور جماعتوں نے عجب اور تکبر میں ڈال دیا ہے، یہ بات جان لے کہ قلیل گروہ، حالانکہ میری طرف سے کوئی قلیل نہیں ہے، میرے اذن سے کثیر گروہ پر غالب ہو جاتا ہے۔ اس کی ذہنیت ہرگز تجھے تعجب میں نہ ڈالے، نہ وہ ساز و سامان جو برتنے کو اُسے دیا ہے، تمھیں مرعوب کریں۔ تم دونوں اپنی آنکھیں اس کی طرف دراز مت کرو، کیونکہ وہ زندگی دنیا کی تازگی اور رونق ہے اور زینت ہے ان کے لیے جو ناز و نعمت میں پلے ہوئے ہوں۔ اگر میں چاہتا کہ دنیا کی زینت سے تمھیں مزین کروں، تا کہ فرعون اس کی طرف دیکھے اور جان لے کہ جو کچھ تم کو ملا ہے، ویسا مال و متاع اور زینت حاصل کرنے سے فرعون کی قدرت عاجز ہے، تو البتہ میں ایسا کر سکتا تھا، لیکن میں تو تم کو اس سے بے رغبت کرتا ہوں اور اس کو تم سے کھینچتا ہوں، اسی طرح اپنے اولیا کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ وقديما ما جرت في ذلك، (لعل العبارة هكذا و كذلك أفعل بأوليائي قديما و حسرت في ذلك ـ والله أعلم)

کیونکہ میں تو ان کو دنیا کی نعمتوں و عیش و آرام و زیب و زینت سے ہنکالتا ہوں، جس طرح مہربان اور شفیق چرواہا اپنے اونٹوں کو، جو جگہ کہ سختی اور مشقت کی ہوتی ہے، وہاں ان کو نہیں بٹھاتا، ہانک کر راحت اور آرام کی جگہ لے جاتا ہے، تا کہ ان کو آسایش ملے۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ پر ذلیل و بے قدر و حیثیت ہیں، لیکن اس لیے کہ وہ میرے دارِ کرامت میں اپنے حصے کو صحیح سالم بھرپور اور کامل حاصل کریں، جس کو دنیا نے زخمی نہ کیا ہو، یعنی دنیا میں آسایش پانے سے آخرت میں کمی ہو جاتی ہے، لہٰذا میں یہ چاہتا ہوں کہ اُن کے حصے میں کمی نہ ہو، بلکہ پورا پورا حصہ

جنت میں اُن کے ہاتھ آئے۔ تو جان رکھ یہ بات کہ بندے کو جو چیز زینت دینے والی نہیں ہے، میرے نزدیک (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) دنیا میں بے رغبتی کرنے سے زیادہ بالغ تر یا زیادہ زینت دینے والی نہیں ہے۔ یعنی جن اعمالِ صالحہ سے بندہ اپنی زینت وآرائش کرتا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک کے ہاں کی نعمتیں پائے، پس ان میں زہد سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں ہے، کیوں کہ زہد فی الدنیا متقی اور پرہیز گار لوگوں کی زینت ہے، اُن پر اس کا ایک لباس ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں، وہ لباس یہی سکینت اور خشوع ہے اور اُن کی علامت اور نشانی اُن کے چہروں میں سجدے کا نشان ہے۔ "أولئك أوليائي حقا حقا" یعنی وہی لوگ میرے ولی اور دوست ہیں سچے پکے۔

پس جس وقت تو اُن سے ملے تو جھکا اُن کے لیے اپنا بازو اور اپنے دل اور زبان کو ذلیل کر، یعنی ملاقات کے وقت اُن سے انکساری اور فروتنی کر، دل میں اُن کی عظمت سمجھ، زبان سے نرم نرم باتیں کر اور یہ بات جان رکھ کہ جس شخص نے ذلیل کیا میرے کسی ولی کو یا اس کو ڈرایا تو یقیناً وہ مجھ سے لڑنے کے لیے صف سے باہر آگیا اور اس نے کھلم کھلا مجھ سے لڑائی کی اور پیش کیا اس نے میرے واسطے اپنے نفس کو اور مجھ کو اس کی طرف بلایا۔ "وأنا أسرع شيء إلى نصرة أوليائي" یعنی سب سے بڑھ کر، جلد میں اپنے اولیا کی مدد کرتا ہوں۔ لہٰذا کیا گمان کرتا ہے وہ شخص جو مجھ سے مبارزہ کرتا ہے، یعنی لڑنے کے لیے صف سے باہر آتا ہے کہ وہ مجھ سے سبقت کر جائے گا، یا مجھ سے فوت ہو جائے گا۔ "وكيف و أنا الثائر لهم في الدنيا والآخرة" یعنی یہ کیونکر ہوسکتا ہے، حالانکہ میں تو اُن کا بدلہ لینے والا ہوں دنیا اور آخرت میں۔ میں اُن کی نصرت و مدد کو اپنے غیر کے سپرد نہیں کرتا ہوں۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

یہاں سے اولیائے کرام کی قدر و منزلت سمجھنی چاہیے کہ اُن سے دشمنی کرنا اللہ پاک سے بیر کرنا ہے، یا ان کو ذلیل کرنا، ڈرانا اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے لڑنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رفیع الشان پیغمبر کو اللہ پاک نے وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے اولیا سے انکساری کے ساتھ پیش آئیں، پھر اور کسی کی کیا ہستی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کو چاہے اور اس کے دوستوں سے بغض رکھے یا اُن کو ذلیل و خوار سمجھے یا اُن کو ایذا پہنچائے۔ ان کو برا کہے، ان کی بارگاہِ عالی جاہ میں بے ادبی کرے، جو ایسا کرے گا وہ دنیا و آخرت کی فلاح سے محروم رہے گا۔ ہاں اتنی بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اللہ اور رسول کے فرمان کے مطابق ان کی تعظیم و تکریم بجا لائے، حد سے نہ بڑھے کہ شرک ہو جائے۔ اللہ اللہ ہے اور بندہ بندہ۔

الرب رب وإن تنزل　　　　والعبد عبد وإن ترقی

لیکن مردان خدا خدا نہ باشد　　　　لیکن ز خدا جدا نہ باشد

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۹۶۔ ۱۹۷) الدر المنثور (۵/ ۵۵٤۔ ۵۵۸)

رضي الله عنهم أجمعين، اللهم ارزقنا حبك وحب أنبياءك عليهم السلام وحب أولياءك الكرام و انفعنا بحبهم في الدنيا والآخرة آمين.

موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے چند دعائیں:

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل سے سوال کیا کہ ان کا سینہ کھول دے، یعنی اس کام میں جس کے واسطے اُن کو بھیجا، کیوں کہ ایک امرِ عظیم اور خطبِ جسیم (بہت ہی مشکل کام) کا ان کو حکم دیا، ان کو ایک ایسے بادشاہ کی طرف بھیجا جو اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑا تھا اور سب سے بڑھ کر ظالم، جابر، ستم گار، کفر میں سخت تر، لاؤ لشکر میں سب سے زیادہ، اپنے زیرِ تسلط ممالک کی آبادی میں سب سے زیادہ اور طغیان اور سرکشی میں سب سے بڑھا ہوا۔ ان تمام امور میں یہاں تک پہنچا کہ دعویٰ کر بیٹھا کہ وہ اللہ پاک کو جانتا پہچانتا نہیں ہے، نہ اپنی رعایا کے لیے اپنے سوا کوئی معبود جانتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام ایک مدت اس کے گھر میں بچپن میں اس کے گھر والوں کے پاس رہے بسے۔ فرعون کی گود میں، اس کے بچھونے پر پرورش پائی۔ پھر اُن میں سے ایک آدمی مار ڈالا تو اُن سے ڈرے کہ اُن کو مار ڈالیں گے، لہٰذا اس ساری مدت میں اُن سے بھاگے رہے۔ پھر اس کے بعد رب عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی طرف ڈرانے والا بنا کر بھیجا کہ اللہ پاک کی طرف اُن کو بلائیں، اسی وحدہ لا شریک لہ کو پوجیں، اسی لیے انھوں نے اس طرح دعا کی: الٰہی! تو میرے سینے کو کشادہ کر دے اور میرے کام کو آسان فرما دے، یعنی اگر تو میرا عون، مددگار، بازو، ساتھی اور مددگار نہ ہوگا تو مجھ میں اس کام کی کسی طرح طاقت نہیں۔ دوسرا یہ سوال کیا کہ الٰہی! تو میری زبان کی گرہ کھول دے، تاکہ وہ میری بات سمجھیں۔ زبان میں گرہ اس طرح پڑ گئی تھی کہ اس کو لثغ پہنچ گیا تھا جس وقت کہ فرعون نے کھجور (موتی) اور انگارا ان کو پیش کیا تو انھوں نے انگارا لے لیا، پھر اس کو زبان پر رکھا،[1] چنانچہ اس کا بیان آیندہ آئے گا۔

لُثغہ لام کی پیش کے ساتھ زبان کی شکستگی کو کہتے ہیں، یعنی حرفِ را کو لام، یا غین وسین کو حرفِ ثا کہنا۔ حاصل یہ ہے کہ زبان جل جانے سے صاف تقریر نہیں کر سکتے تھے۔ را کی جگہ لام یا غین اور سین کی جگہ ثا نکل جاتی تھی۔ اللہ پاک سے یہ سوال نہ کیا کہ وہ شکستگی بالکل زائل ہو جائے، بلکہ زبان کی بستگی اتنی زائل ہو جائے کہ بات کرنے میں درماندگی جاتی رہے، وہ لوگ اُن کی مراد کو سمجھ لیں اور یہ بقدرِ ضرورت ہے۔ اگر ساری بستگی کا سوال کرتے تو وہ سب دور ہو جاتی، لیکن انبیا علیہم السلام سوال صرف حاجت کے موافق کرتے ہیں، اس لیے کچھ بقیہ رہ گیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے فرعون کا قول نقل کیا ہے کہ اس نے یوں کہا: ﴿ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ

---

[1] یہ بات کسی مستند ذریعے سے ثابت نہیں۔ اس دعا کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے آپ کو زیادہ فصیح اللسان نہیں سمجھتے تھے تو فصاحتِ لسانی کی دعا کی جس کی ضرورت ہر داعیِ حق سمجھتا ہے۔ بنا بریں دعوت و تبلیغ کا فریضہ مؤثر انداز سے ادا کرنے کی دعا کی۔ والله أعلم بالصواب. [ص۔ ي]

يُبِيْنُ ﴾ [الزخرف: ٥٢] ''بلکہ میں تو اس (موسیٰ) سے کہیں بہتر ہوں جو حقیر ہے اور صاف بول بھی نہیں سکتا۔''

''أي لا يفصح بالكلام''، یعنی وہ صاف بات نہیں کر سکتے۔ غرض یہ ہے کہ اگر گرہ بالکل جاتی رہتی تو وہ یہ کیوں کہتا، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ بقیہ رہ گیا تھا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تو ایک گرہ کھول دے، اگر وہ اس سے زیادہ کا سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو عطا کرتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام جو آلِ فرعون سے قتل کی وجہ سے اور زبان کی گرہ کے بارے میں ڈرتے تھے، اس کی شکایت انھوں نے اپنے رب سے کی، کیوں کہ اُن کی زبان میں گرہ تھی، بہت سی باتیں کرنے میں اُن کو روکتی تھی اور اس بات کا اپنے رب سے سوال کیا کہ اُن کے بھائی ہارون سے اُن کی اعانت کرے کہ وہ اُن کے مددگار ہو جائیں اور بہت سی باتیں جن کو اُن کی زبانِ صاف ادا نہیں کر سکتی، وہ ان کی طرف سے ادا کریں۔ لہٰذا اللہ پاک نے ان کا سوال اُن کو دے دیا، اُن کی زبان سے گرہ کھول دی۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بعض اصحابِ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ محمد بن کعب رحمہ اللہ کا کوئی رشتے دار شخص اُن کے پاس آیا تو اُن سے کہا کہ تجھ میں کوئی برائی نہیں ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تو اپنی زبان میں لحن کرتا ہے، یعنی اعراب میں غلطی کرتا ہے اور تو اپنی قراءت میں اعراب نہیں کرتا، یعنی اعراب میں خطا کرتا ہے تو وہ بولے: اے بھتیجے! کیا میں تجھ کو سمجھا تا نہیں ہوں، جس وقت کہ تجھ سے باتیں کرتا ہوں، یعنی کیا میری بات تیری سمجھ میں نہیں آتی، وہ بولا: ہاں، یعنی سمجھ میں تو آجاتی ہے تو محمد بن کعب نے کہا: پھر موسیٰ علیہ السلام نے بھی تو اپنے رب سے یہی سوال کیا تھا کہ ان کی زبان سے ایک گرہ کھول دے، تا کہ بنی اسرائیل ان کی بات کو سمجھ لیں اور اس پر اور کچھ زیادہ نہ کیا۔[2] هذا لفظه.

مطلب یہ کہ جب بات سمجھ میں آجاتی ہے تو کافی ہے، گو اعراب میں خطا ہوا کرے۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام نے اس قدر درخواست کی کہ بات سمجھی جائے، گو زبان پوری طرح صاف نہ ہو۔ دوسری درخواست موسیٰ علیہ السلام کی یہ تھی کہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو میرا وزیر کر دے، لہٰذا یہ ایک خارجی امر میں تھے، وہ یہی ہے کہ اُن کے بھائی ہارون اُن کے مساعد و مدد و معاون و مددگار رہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہارون علیہ السلام اس گھڑی نبی بنائے گئے، جس میں موسیٰ علیہ السلام نبی ہوئے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ عروہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں کہ وہ اس زمانے میں نکلیں جس میں عمرہ کیا کرتی تھیں تو بعض اعراب پر نزول فرمایا، یعنی کسی بدوی کے گھر اُتریں تو انھوں نے ایک شخص کو یہ بات کہتے ہوئے سنا کہ کیا کوئی بھائی ایسا تھا، جو اپنے بھائی کو دنیا میں زیادہ تر نفع پہنچانے والا تھا؟ لوگوں نے کہا: ہم نہیں جانتے تو وہی شخص بولا: واللہ! میں جانتا ہوں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے اپنے جی میں کہا کہ وہ اپنی قسم میں استثناء نہیں کرتا، یعنی ان شاء اللہ نہیں کہتا، بے شک وہ جانتا ہے کہ دنیا میں کونسا بھائی اپنے

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢١)

بھائی کو زیادہ تر نفع پہنچانے والا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، جبکہ انھوں نے اپنے بھائی کے لیے نبوت کا سوال کیا، تو میں بولی کہ اس نے سچ کہا، قسم ہے اللہ کی!۔ میں نے کہا اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴾ [الأحزاب: ٦٩] "اور وہ اللہ کے نزدیک بڑے رتبے والا تھا۔" جبھی تو اُن کی سفارش سے اُن کے بھائی کو نبی کر دیا۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَزْرِیْ ﴾ کے معنی "ظَهْرِيْ" (میری پشت) ہیں اور ﴿ اَمْرِیْ ﴾ سے مراد مشاورتی، یعنی تو اس سے میری پشت کو مضبوط کر اور میرے مشورے میں اس کو شریک فرما۔[2] ﴿ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ﴿33﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ﴾۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہوتا، جو اللہ تعالیٰ کا بہت سا ذکر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ذکر کرے اللہ کا کھڑے بیٹھے اور لیٹ کر۔[3] ﴿ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تو تو ہم کو خوب دیکھتا ہے، یعنی اس بات میں کہ تو نے ہم کو برگزیدہ کیا، ہم کو نبوت عطا فرمائی، اپنے دشمن فرعون کی طرف ہم کو بھیجا، لہٰذا اس پر تیرے لیے حمد ہے۔

فتح البیان کا بیان:

"ضَمَّ" کے معنی جمع کرنا کسی چیز کا کسی چیز سے ہیں۔ فتح البیان میں ہے کہ مراد "یَدٌ" سے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی ہے، ہاتھ کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں، ہاتھ کے حقیقی معنی انگلیوں سے لے کر مونڈھے تک ہیں۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان کا "جَنَاح" اس کا بازو ہے۔[4] یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے اور کہا کہ "إلیٰ" بہ معنی "تحت" ہے۔[5] امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جناح جنب سے، یعنی پہلو۔ جنب کی تعبیر جناح کے ساتھ اس لیے کی کہ جنب جناح کی جگہ ہے۔[6] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِلٰی ﴾ بہ معنی "مع" ہے،[7] یعنی تو اپنی سیدھی ہتھیلی کو اپنے بائیں بازو کے نیچے یا اپنے بائیں پہلو کے ساتھ ملا۔ بازو کہنی سے لے کر بغل تک کو کہتے ہیں اور پہلو سے مراد خاص طور پر بازو کے نیچے والی جگہ ہے۔ ﴿ تَخْرُجْ ﴾ امر کا جواب ہے۔ ﴿ بَیْضَآءَ ﴾ حال ہے ضمیر "تخرج" سے۔ اسی طرح ﴿ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ﴾ بھی حال ہے۔ ﴿ بَیْضَآءَ ﴾ کے معنی نیِّر، مُشْرِق، روشن ہیں۔

﴿ سُوْٓءٍ ﴾ عیب کو کہتے ہیں۔ یہ کنایہ ہے برص سے۔ برص ایک مرض ہے جس سے بدن پر سفید داغ پڑ جاتے ہیں۔ علمِ بیان والے اس صنعت کو احتراس بولتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایسی شے لائی جائے جو غیر مراد کے توہم کو دور کر دے، چونکہ کبھی سفیدی سے مراد برص و بہق ہوتا ہے، اس لیے اس وہم کے دور کرنے کو ﴿ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ﴾ فرمایا، یعنی یہ کہ تو اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں بازو کے نیچے پہلو سے ملا اور اس کو نکال تو وہ روشن چمکتا دمکتا نکلے گا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٢) [2] صحیح البخاري (٤/ ١٧٦٢) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٤٢)
[4] فتح القدیر (٣/ ٤٩٨) [5] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٩٧) [6] فتح القدیر (٣/ ٤٩٨) [7] تفسیر القرطبي (١١/ ١٩١)

بدوں کسی عیب و بیماری کے، برخلاف گندمی رنگ کے، جس پر وہ اس سے پہلے تھا۔ یعنی وہ نکلے گا اس حال میں کہ سفید ہوگا۔ نور اس کا ساطع (چمکتا ہوا) ہوگا۔ رات اور دن میں روشن ہوگا سورج کی طرح، بینائی کو ڈھانک دے گا، یعنی مارے روشنی اور تابانی کے آنکھ اس کا ادراک نہ کر سکے گی۔ ﴿اٰيَةً اُخْرٰى﴾ بھی حال ہے، یعنی وہ نکلے گا اس حال میں کہ یہ ایک دوسرا معجزہ ہوگا عصا کے علاوہ۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿بَيْضَآءَ﴾ سے بدل ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول حسن ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: "آتَيْنٰكَ أَوْ نُؤْتِيْكَ آيَةً أُخْرىٰ"[1] یعنی فعل محذوف کا مفعول ہے۔ ہم نے دی تجھ کو یا دیں گے تجھ کو ایک اور نشانی، کیونکہ جب ﴿تَخْرُجْ بَيْضَآءَ﴾ فرمایا تو اس قول نے اس پر دلالت کی کہ مقرر ایک اور نشانی اُن کو دے۔

پھر اللہ پاک نے اس سب کی وجہ ذکر فرمائی: ﴿لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى﴾ بعض نے کہا ہے کہ مقدر عبارت یہ ہے: "فعلنا ذلك لنريك" ہم نے یہ اس لیے کیا کہ تجھ کو دکھائیں۔ ﴿مِنْ اٰيٰتِنَا﴾ محذوف سے متعلق ہے وہ حال واقع ہوا ہے۔ کبریٰ کے معنی ہیں عظمیٰ، یہ صفت ہے موصوف محذوف کی۔ تقدیر یہ ہے: "لنريك من آياتنا الآية الكبرىٰ" یعنی تا کہ ہم تجھ کو دکھائیں ان دو نشانیوں، یعنی ید بیضاء و عصا سے بھی ہماری بعض بڑی نشانیاں تیری رسالت پر۔ اس معنی کی بنیاد پر یہ بات لازم نہ آئے گی کہ اکیلی نشانی یدِ بیضا والی ہی آیت کبریٰ ہو، یہاں تک کہ وہ عصا سے بھی بڑی ٹھہرے تو اس پر یہ بات کہی جائے کہ یدِ بیضا میں تو صرف رنگ کی تبدیلی تھی بخلاف عصا کے کہ اس میں رنگ کے تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ حجم میں زیادتی اور اس میں زندگی کا ہونا اور خارقِ عادت امور پر قدرت کا ہونا تھا۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ آیتِ کبریٰ یدِ بیضا ہے تو اس نے کبریٰ (بڑی) ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ ید بیضاء کا اصلاً کسی نے معارضہ نہ کیا۔ رہا عصا سو جادوگروں نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن قولِ اول زیادہ صحیح ہے، یعنی یہ بات عمدہ ہے کہ یدِ بیضا و عصا دونوں اللہ پاک کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں، پھر جو اُن معجزوں سے غرض مقصود تھی، اس کی تصریح فرمائی کہ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ یعنی تو فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی طرف پیغمبر ہو کر یہ دو نشانیاں عصا اور یدِ بیضا لے کر جا۔

یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے رسول ہیں۔ کہاں سے نکلتی ہے، بعض نے کہا ہے کہ اللہ پاک کے اس قول سے ﴿وَاَنَا اخْتَرْتُكَ﴾ یعنی میں نے تجھ کو نبوت اور رسالت کے واسطے پسند کر لیا ہے۔ فرعون کا ذکر خاص کر اس لیے کیا ہے کہ اس کی قوم اس کے تابع ہے۔ پھر فرعون کی طرف بھیجنے کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ ﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ تو اس کی طرف اس لیے جا کہ وہ سرکش، نافرمان، متمرد، سرکش، متکبر، منکر و متجبر ہو گیا ہے اپنے کفر اور انکار میں، یہاں تک کہ

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٩١)

حد سے بڑھ گیا ہے کہ الٰہیت کا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ ﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا یوں کہا گیا کہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کیا کہا۔ شرح صدر کہتے ہیں کہ سینے کے فراخ اور کشادہ کرنے کو۔ انھوں نے اپنے رب سے تضرع اور زاری کی اور اپنی عاجزی کا یوں اظہار کیا۔ ﴿ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ ﴾ [الشعراء: ١٣] ''اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔'' اس لیے اللہ پاک سے یہ دعا کی کہ اے میرے رب! تو میرا سینہ کشادہ کر۔

﴿ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ ﴾ تیسیر سہل و آسان کرنے کو کہتے ہیں، یعنی تو نے جو مجھے فرعون کی طرف رسالت پہنچانے کا حکم دیا ہے پس تو اس کام کو مجھ پر آسان کر دے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو کہے کہ کلمہ ﴿ لِيْ ﴾ کا دونوں جگہ کیا فائدہ ہے، حالانکہ اُن کے بغیر کلام منتظم ہے تو میں یہ جواب دوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اول کلام کو مبہم کیا، یوں کہا: ''اِشْرَحْ لِيْ وَيَسِّرْ لِي'' تو تو جانے گا کہ کوئی یہاں مشروح و میسّر ہے۔ پھر انھوں نے بیان کیا اور ﴿ صَدْرِيْ ﴾ و ﴿ اَمْرِيْ ﴾ کا ذکر کر کے ابہام کو دور کر دیا۔ لہٰذا اس نے شرح صدر اور تیسیرِ امر کی زیادہ تر تاکید کر دی۔[1] محاورے میں بولتے ہیں: ''يسرت له كذا'' یہ آیت اسی باب سے ہے اور ''تيسرته لكذا'' اس باب سے یہ آیت ہے:
﴿ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴾ [الليل: ٧] ''تو یقیناً اسے عن قریب ہم آسان (راہ) کی توفیق دیں گے۔''

زبان کی گرہ کھولنے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ پاک نے ساری گرہ دور کر دی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴾ [طه: ٣٦] ''اس (اللہ) نے فرمایا: اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا تجھے دیا جاتا ہے۔'' دوسرا قول یہ ہے کہ وہ بالکل دور نہیں ہوئی، کیونکہ انھوں نے بالکل گرہ دور ہو جانے کا سوال نہیں کیا، بلکہ اس گرہ کے کھولنے کا سوال کیا تھا جو اپنی بات سمجھانے کو مانع ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ مِنْ لِّسَانِيْ ﴾ ''أي كائنة من عقد لساني'' یعنی تو میری زبان کی گرہوں میں سے ایک گرہ کھول دے، اسی کی تائید اُن کا یہ قول کرتا ہے: ﴿ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا ﴾ [القصص: ٣٤] ''اور میرا بھائی ہارون زبان کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔'' اور یہ قول جو اللہ پاک نے فرعون کی طرف سے اُن کے حق میں نقل کیا ہے: ﴿ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴾ [الزخرف: ٥٢] ''اور صاف بول بھی نہیں سکتا۔''

﴿ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴾ امر کا جواب ہے، یعنی تو میری زبان کی گرہ اس لیے کھول دے کہ جب میں اُن کو رسالت پہنچاؤں تو وہ میری بات کو سمجھ لیں۔ فقہ کلامِ عرب میں فہم کو کہتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ شریعت کا علم خاص کر دیا گیا ہے اور اس کا عالم فقیہ کہلاتا ہے۔ (قاله الجوهري)[2] ''وَزِيْر'' سے مراد معین و ظہیر و مددگار ہے۔ ''وزیر'' بمعنی

[1] الكشاف (٣/ ٦٢) [2] الصحاح (٧/ ٩٣)

"موازر" ہے، جس طرح "أکیل" بمعنی "مواکل"۔ وزیر کو وزیر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ سے اس کے بوجھ کو اٹھاتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَزِیْر" لغت میں "وزر" سے مشتق ہے۔ "وزر" ملجا و پناہ کو کہتے ہیں۔ جس کے ساتھ آدمی چنگل مارتا ہے، تاکہ ہلاکت سے نجات پائے۔ اسی باب سے یہ قول ہے اللہ پاک کا: ﴿ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴾ [القیامۃ: ۱۱] "نہیں نہیں کوئی پناہ گاہ نہیں۔" اور وزیر وہ شخص ہے جس کی رائے پر بادشاہ اعتماد و تکیہ کرتا ہے، تمام معاملات میں اور اس کی طرف ملتجی اور مضطر ہوتا ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَزِیْر" مشتق ہے "موازرۃ" سے اور موازرت معاونت کو کہتے ہیں۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس قول کو امام اصمعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔[2]

موسیٰ علیہ السلام کے وزیر ہارون علیہ السلام تھے۔ یہ ان سے عمر میں بڑے اور زیادہ فصیح و جمیل و وسیم اور زیادہ خوبصورت تھے۔ موسیٰ علیہ السلام گندم گوں، دراز بنی مرغول موئے تھے، یعنی ان کے بال گھونگریالے تھے۔ ﴿ اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝۳۱ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴾ میں دو قراءتیں ہیں۔ ایک تو بصیغہ دعا، یعنی اے رب! تو اس سے میری قوت کو محکم و مضبوط کر اور رسالت کے کاروبار میں اس کو میرا شریک فرما دے۔ "أزر" قوت کو کہتے ہیں۔ محاورے میں "آزرہ" بولتے ہیں، یعنی فلاں نے فلاں کو قوت دی۔ دوسری قراءت ہمزہ قطعی کے ساتھ اور صیغۂ متکلم کے ساتھ ہے اور "اُشْرِكْهُ" ہمزہ کی پیش کے ساتھ ہے، یعنی میں اس سے اپنی قوت کو مضبوط کروں گا اور اپنے کام میں اس کو شریک کروں گا۔[3]

پہلی قراءت جمہور کی ہے اور دوسری ابن عامر و یحییٰ بن حارث و ابوحیوہ و حسن و عبداللہ بن اسحق رحمہم اللہ کی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں فعلوں کو موضع جزم میں رکھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اِجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا ﴾ کا جواب ہے۔[4] اور لفظ ہارون اور وزیر دونوں ﴿ اِجْعَلْ ﴾ کے مفعول ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے دونوں مفعول ﴿ لِيْ ﴾ اور ﴿ وَزِيْرًا ﴾ ہیں اور ہارون عطفِ بیان ہے ﴿ وَزِيْرًا ﴾ کا۔

قولِ اول ظاہر تر ہے اور ﴿ لِيْ ﴾ محذوف سے متعلق ہوگا۔ یعنی کائنا ﴿ لِيْ ﴾ اور ﴿ مِنْ اَهْلِيْ ﴾ صفت ہے وزیر کی اور ﴿ اَخِي ﴾ بدل ہے ہارون کا۔

﴿ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝۳۳ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴾ یہ تسبیح و ذکر دونوں پیش کی جانے والی دعا کی غرض و غایت ہیں۔ اس جگہ تسبیح سے مراد تسبیح بزبان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نماز ہے اور ﴿ كَثِيْرًا ﴾ دونوں جگہ منصوب ہے، اس بنیاد پر کہ صفت ہے مصدرِ محذوف یا زمانِ محذوف کی، یعنی ہم نے جو تجھ سے امورِ مذکورہ کی دعا کی ہے، اس کی غرض یہ ہے کہ ہم تیری بہت سی تسبیح کریں اور بہت سا تیرا ذکر کریں، یا بہت سے وقت میں تیری پاکی بولیں اور بہت سے وقت میں تیری یاد کریں۔ "بصیر" مبصر کو اور پوشیدہ باتوں کے جاننے والے کو کہتے ہیں، یہاں یہی مراد ہے، یعنی بے شک تو ہم کو جاننے والا تھا ہمارے لڑکپن میں، لہٰذا تو نے ہم پر احسان کیا تو اب بھی تو اسی طرح احسان کر۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٤٩٩) [2] الكشاف (٣/ ٦٣) [3] فتح البيان (٨/ ٢٢٥۔ ٢٢٨) [4] تفسير القرطبي (١١/ ١٩٤)

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی ۞ ۳۶ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً
اُخْرٰۤی ۞ ۳۷ اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤی ۞ ۳۸ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی
التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ
عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ
عَلٰی عَیْنِیْ ۞ ۳۹ اِذْ تَمْشِیْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَنْ
یَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤی اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬
وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫۬

اس (اللہ) نے فرمایا: اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا تجھے دیا جاتا ہے 36 ہم تجھ پر ایک اور بار بھی احسان کر چکے ہیں 37 جب ہم نے تیری ماں کی طرف وہ الہام کیا تھا جو (اب) وحی کی جاتی ہے 38 یہ کہ تو اس (موسیٰ) کو صندوق میں ڈال، پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دے، پھر دریا اسے ساحل پر لا ڈالے گا، جسے میرا اور اس کا دشمن اُٹھائے گا، اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی اور یہ (اس لیے) کہ میری آنکھوں کے سامنے تیری پرورش کی جائے 39 جب تیری بہن چل رہی تھی اور کہہ رہی تھی: کیا میں تمھیں اس کا بتاؤں جو اس کی کفالت کرے؟ پھر ہم نے تجھے تیری ماں کے پاس لوٹا دیا، تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کھائے، اور تو نے ایک شخص کو قتل کیا تو ہم نے تجھے اس غم سے نجات دی۔ اور ہم نے تجھے خوب آزمایا۔

دعائے موسیٰ علیہ السلام کی قبولت اور گذشتہ احسانات کا تذکرہ:

ان کی ماں کو یہ بات خواب میں کہی، اس سے وہ پیغمبر نہیں ہوگئیں۔ فرعون اس سال بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا، جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی ماں ڈری کہ فرعون کے پیادے خبر پائیں تو مار ڈالیں اور ماں باپ کو ستائیں کہ ظاہر کیوں نہ کیا۔ تب خواب میں یہ دیکھا۔ صندوق نہر میں ڈال دیا، وہ فرعون کے باغ میں پہنچا اس کی بی بی نے اُٹھایا، ان کا نام آسیہ تھا، وہ بنی اسرائیل میں سے تھیں۔ فرعون کو بھی دیکھ کر محبت آئی۔ بیٹا بنا کر پالا۔ یہ سارا قصہ سورۃ القصص میں ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے اس بات کا سوال کیا کہ ان کا سینہ کھول دے، ان کے کام کو آسان کر دے، زبان کی گرہ کھول دے، اور بھائی کو ان کا وزیر بنا دے تو اللہ پاک نے ان کو یہ خبر دی کہ ﴿قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ

﴿ یٰمُوْسٰی ﴾ یعنی ہم نے تمھاری دعا قبول کی۔ جن باتوں کا تو نے ہم سے سوال کیا تھا وہ تم کو دی گئیں۔ ہماری طرف سے یہ دینا تم پر احسان اور فضل و کرم ہے۔ ”سؤل“ سے مراد ”مسئول“ ہے، یعنی مطلوب (جو کچھ طلب کیا گیا)۔ جس طرح کہ ”خُبز“ بمعنی ”مخبوز“ ہے، یعنی ”خَبز“ زبر کے ساتھ روٹی پکانے کو کہتے ہیں اور جو پکائی گئی وہ ”خُبز“ ہوئی، اسی طرح ”سؤل“ و ”سؤال“ مصدر ہیں، ان کے معنی مانگنا ہیں، لیکن یہاں مراد وہ شے ہے جس کو مانگا۔ ﴿ یٰمُوْسٰی ﴾ کے زیادہ کرنے میں دو فائدے ہیں: ایک تو ان کو مشرف بخطاب کیا۔ دوسرا یہ فائدہ ہے کہ فواصل و قوافی کی رعایت فرمائی گئی۔

پھر اللہ پاک نے وہ احسانات اور انعامات ذکر فرمائے جو اس سے پہلے ان پر بغیر سوال کے کر چکا ہے۔ ﴿ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس لیے لایا گیا ہے کہ اللہ پاک نے جو انعام اُن پر کیے ہیں ان کو یاد دلا کر اُن کے دل کو تقویت دی جائے۔ ”مَنّ“ احسان و افضال و مہربانی کرنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ اُخْرٰٓى ﴾ تانیث ہے آخر کی، جس کے معنی غیر ہیں۔ مہربانی کے طور پر کلام کے شروع میں قسم ذکر فرمائی، معنی یہ ہیں کہ قسم ہے اللہ کی! البتہ مقرر احسان کیا ہے ہم نے تجھ پر اس بار کے احسان سے پہلے۔ وہ احسان یہی ہے کہ اللہ پاک نے دشمنوں کے شر سے ان کو محفوظ رکھا، جس طرح کہ اس جگہ اس کا بیان فرمایا ہے۔ وہ احسان جو بغیر پوچھے ذکر فرمائے ہیں، ان کا حاصل آٹھ احسان ہیں۔ پہلا احسان یہ ہے ﴿ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴾۔ ﴿ اِذْ ﴾ وجہ بتانے کے لیے یا ﴿ مَنَنَّا ﴾ کا ظرف ہے، یعنی احسان کیا ہم نے اس لیے کہ وحی کی ہم نے، یا احسان کیا ہم نے تجھ پر اس وقت کہ وحی کی ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں۔

ان کی ماں کا نام یوحانذ تھا، جیسا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے شرح نقایہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ نبی نہ تھیں، اس لیے اس وحی سے مراد صرف الہام ہے کہ اس بات کو ان کے دل میں ڈال دیا، یا خواب میں اُن کو دکھایا، یا کسی نبی کی زبان پر، یا کسی فرشتے کی زبان پر کہلا دیا، نہ کہ بطورِ نبوت کے۔ جس طرح کہ مریم علیہا السلام کی طرف وحی کی گئی، یا اگلے نبیوں نے اس بات کی خبر دی اور یہ خبر اُن کی والدہ کو پہنچ گئی۔ ﴿ مَا يُوْحٰٓى ﴾ سے مراد وہ حکم ہے جو ان کی والدہ کو دیا، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اُولاً: اس کو مبہم کہا۔ ثانیاً: اس کی تفسیر کے لیے اس حکم کی عظمت ظاہر کی۔ بلاغت کا قاعدہ یہی ہے کہ جس شے کی تعظیم منظور ہوتی ہے تو پہلے اس کو مبہم کہتے ہیں، پھر اس کو بیان کرتے ہیں، تاکہ سننے والے کے ذہن میں اس بات کی عظمت آجائے، وہ حکم یہ ہے: ﴿ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ ﴾۔

”اَنْ“ کی تفسیر یہ ہے، اس لیے کہ وحی میں معنی قول ہیں۔ یا مصدریہ ہے: ”أَيْ بِأَنِ اقْذِفِيْهِ“. قذف کے معنی سنگ انداختن ہیں اور طرح کے معنی انداختن ہیں، اس لیے اس جگہ قذف سے مراد طرح ہے۔ تابوت

صندوق کو کہتے ہیں۔ اس کی تفسیر سورۃ البقرہ میں قصہ طالوت میں گزر چکی ہے۔[1] "یَمّ" کے معنی ہیں دریا یا بڑی نہر۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دریائے نیل ہے۔ اس قول کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[2] ﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾۔ ساحل دریا کے کنارے کو کہتے ہیں۔ ساحل کا نام ساحل اس لیے ہوا کہ پانی نے اس کو کشادہ کر دیا۔ ابن دُرَید اسی کے قائل ہیں۔[3] (صراح میں ابن دُرَید کا قول یوں ہے: "هو مقلوب وإنما الماء سحله" یعنی اس میں قلب ہوا ہے، حقیقت میں ساحل پانی ہے کہ اس نے کنارے کو کھول دیا ہے تو کنارہ مسحول ہوا)

یہاں ساحل سے مراد وہ دریا ہے جو ساحل سے ملا ہوا ہے، اس سے ساحل بنفسہٖ مراد نہیں ہے اور یہ ساری ضمیریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہیں نہ کہ تابوت کی طرف، اگرچہ وہ اُن کے ساتھ ڈالا گیا۔ لیکن مقصود موسیٰ علیہ السلام ہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات ہے کہ آگے پیچھے کی ضمیریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں، چونکہ دریا کا موسیٰ علیہ السلام کو ساحل پر یا کنارے پر ڈالنا ایک واجب الوقوع امر تھا (جس نے ضرور ہونا تھا)۔ اس کو ایک ذی فہم و تمیز شخص کے برابر ٹھہرا کر امر فرمایا۔ اس امر کے معنی خبر ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس خبر کو پیرایۂ امر میں کیوں ادا کیا، لہٰذا اس کی یہ وجہ ہے کہ منظور مبالغہ ہے، کیونکہ امر سب فعلوں سے زیادہ تر قطعی اور مؤکد ہوتا ہے۔ حرفِ با محذوف سے متعلق ہے، اس بنا پر کہ بائے حالیہ ہے۔ "ای مُلْتَبِسًا بِالسَّاحِلِ" یا نفسِ فعل سے متعلق ہے، اس بنا پر کہ بائے ظرفیہ بمعنی "فِيْ" ہے۔

﴿يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ﴾ یہ جواب ہے امرِ لفظی کا کہ وہ ﴿فَلْيُلْقِهِ﴾ ہے یا امرِ حقیقی کا کہ ﴿اَنِ اقْذِفِيْهِ﴾ ہے۔ ﴿عَدُوٌّ﴾ سے مراد فرعون ہے، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جس وقت ان کو دریا میں ڈالا، یعنی دریائے نیل میں، اس سے ایک نہر فرعون کے گھر کی طرف نکلتی تھی۔ لہٰذا اللہ پاک نے اس کو اس نہر میں فرعون کے گھر کی طرف چلا دیا، پھر وہ صندوق پکڑا گیا تو اس میں سے موسیٰ علیہ السلام ملے۔ کسی نے کہا کہ دریا نے اس کو کنارے پر ڈال دیا۔ فرعون نے اس کو دیکھا تو اس شخص کو حکم دیا جو اس کو لے لے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرعون کی بیٹی نے اس کو پایا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

دوسرا احسان یہ ہے ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾ یعنی اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام پر ایک عظیم محبت ڈال دی، وہ محبت جو اللہ پاک کی طرف سے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کوئی ان کو دیکھتا ہے، ان سے محبت کرتا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان پر ایک سبحہ (فتح القدیر میں ہے کہ مسحۃ)[4] یعنی جمال کا نور ڈال دیا، لوگوں میں سے جو کوئی اُن کو دیکھتا اُن سے محبت رکھتا۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: "وألقيت عليك رحمتي" یعنی محبت سے مراد رحمت ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کلمہ "من" "ألقيت" سے متعلق ہے، معنی یہ ہیں کہ "ألقيت مني

---

[1] رقم الآية [٢٤٨] [2] تفسير الطبري (٨/ ٣٠٣) [3] فتح االقدير (٣/ ٥٠١)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٠١) [5] تفسير الطبري (١٨/ ٣٠٣)

علیك محبة“ یعنی میں نے تجھ کو دوست رکھا اور جس شخص کو اللہ دوست رکھتا ہے تو لوگ اس کو ضرور ہی دوست رکھتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر ایک شخص جو اُن کو دیکھتا تو اُن پر اس کی طرف سے محبت مل جاتی۔ سلمہ بن کہیل کہتے ہیں کہ میں نے تجھ کو اپنے بندوں کی طرف محبوب کر دیا۔[1]

تیسرا احسان یہ ہے کہ ﴿ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴾ یہ قراءت ہے عامہ کی، اس کی بنا پر یہ علت معطوف ہے علت محذوف پر جو ﴿ اَلْقَيْتُ ﴾ سے متعلق ہے۔ ”أَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً لِّيُعْطَفَ عَلَيْكَ وَلِتُصْنَعَ“ یعنی میں نے تجھ پر محبت ڈالی، اس لیے کہ تجھ پر مہربانی کی جائے اور اس لیے کہ تو پالا جائے، یا یہ لام محذوف سے متعلق ہے جو اس سے پہلے یا اس کے بعد مقدر ہے۔ جیسے ”و فعلت ذلك لتصنع“ یا ”ولتصنع علی عیني فعلت ذلك“ یا ”ولتصنع علی عینی قدرنا مشي أختك“ ﴿ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴾ کے معنی یہ ہیں، تا کہ تو پالا جائے، غذا دیا جائے۔ ”بمرأی مني“ یعنی ایسی جگہ کہ میں تجھے دیکھوں اور تجھ پر احسان کیا جائے اس حال میں کہ میں تیرا مراعی و مراقب و نگہبان ہوں، جس طرح کہ آدمی جس وقت کسی شے کے ساتھ اعتناء کرتا ہے تو اپنی آنکھ سے اس کی نگہبانی کرتا ہے۔[2] (قاله الزمخشري)

”العین“ اس جگہ حفاظت و رعایت کے معنی میں ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے کہ سبب کا مسبب پر اطلاق کیا ہے۔ سبب تو آنکھ، یعنی اس کا دیکھنا ہے اور مسبب حفاظت اور رعایت ہے۔ محاورے میں کہتے ہیں: ”صنع الرجل جاریته“ جبکہ وہ اپنی لونڈی کی پرورش کرتا اور اسے پالتا ہے۔ ”یا صنع الرجل فرسه“ کہتے جبکہ اپنے گھوڑے کے چارے اور خدمت پر لگا رہتا ہے۔

﴿ عَلٰى عَيْنِيْ ﴾ کی تفسیر ”مرأی مني“ کے ساتھ صحیح ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول لغت میں مشہور و معروف ہے، لیکن اس میں موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی تخصیص نہیں ہے، کیونکہ ساری اشیاء ”بمرأی من اللہ“ ہوئیں، یعنی سب چیزیں اللہ پاک کے روبرو ہیں کوئی شے اس سے غائب نہیں ہے۔ امام ابو عبیدہ و ابن انباری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں تا کہ تو غذا دیا جائے میری محبت و ارادے پر۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”اتخذ الأشیاء علیٰ عیني أي علیٰ محبتي“ یعنی میں چیزوں کو رکھتا ہوں اپنی آنکھ پر، یعنی محبت پر۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں عین سے مقصود قصد و ارادہ و اختیار ہے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ ”غدا فلان علی عیني أي علی المحبة مني“[3] یعنی فلاں میری آنکھ پر ہوگیا، یعنی میری محبت پر۔ صاحب فتح البیان فرماتے ہیں کہ عین بھی من جملہ الفاظِ صفات ہے تو اس کی تاویل نہ کی جائے اور زیادہ بہتر یہی ہے کہ اسے اپنے ظاہر پر جاری

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲٤۲۲) [2] الکشاف (۳/ ٦٥) [3] فتح القدیر (۳/ ٥٠١)

کیا جائے۔ ابن القعقاع رحمہ اللہ نے "ولتصنع" لام کے سکون کے ساتھ بصیغہ امر پڑھا ہے اور امام ابونہیک رحمہ اللہ نے تائے فوقانیہ کی زبر کے ساتھ۔ اس کے معنی یہ ہیں: تاکہ تیری حرکت اور تیرا تصرف میری مشیت سے ہو اور میری آنکھ پر۔[1] (قالہ ثعلب) اور امام زمخشری رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ کہا ہے۔[2]

﴿ اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ ﴾ کلمہ ﴿ اِذْ ﴾ یا تو ظرف ہے ﴿ اَلْقَیْتُ ﴾ کا، یا ﴿ وَلِتُصْنَعَ ﴾ کا، یا "اذکر" محذوف کا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ اِذْ اَوْحَیْنَآ ﴾ سے بدل ہو۔ یہ بہن موسیٰ علیہ السلام کی سگی بہن تھی، ان کا نام مریم تھا۔ مضارع کا صیغہ ماضی کی حکایت کے لیے ہے۔ ﴿ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَنْ یَّكْفُلُهٗ ﴾ یہ یوں ہوا کہ اُن کی بہن خبر دریافت کرنے کو نکلی تو فرعون کو اور اس کی بیوی کو پایا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی دودھ پلانے والی تلاش کرتے تھے تو انھوں نے ان سے یہ بات کہی، یعنی کیا میں تم کو وہ شخص بتلاؤں جو اس کو اپنی جان کی طرف ملائے، اس کی پرورش کرے اور اس کے دودھ پینے کی مدت کو پورا کرے۔ دریا میں ڈالنے سے پہلے اُن کی ماں نے تین یا چار مہینے دودھ پلایا تھا تو فرعون اور اُس کی بیوی بولے وہ کون ہے، یہ بولیں کہ میری ماں۔ انھوں نے کہا: کیا اس کے پاس دودھ ہے، وہ بولیں میرے بھائی ہارون کا دودھ ہے، جو موسیٰ سے ایک سال بڑا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے زیادہ۔ پھر اُن کی ماں آئیں تو اُن کی چھاتی قبول کی، حالانکہ اُن کے سوا کسی اور دایہ کی چھاتی قبول نہیں کرتے تھے۔ یہی معنی ہیں اس قول کے: ﴿ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓی اُمِّكَ ﴾ مصحفِ اُبی رضی اللہ عنہ میں "فَرَدَدْنٰكَ" ہے اور حرفِ فا فصیحہ ہے، یعنی پہنچایا ہم نے تجھ کو تیری ماں کے پاس۔

﴿ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا ﴾ یعنی تاکہ ٹھنڈی رہے اس کی آنکھ تیرے ملنے سے۔ ابن عامر نے اس کو قاف کی زیر سے پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے قاف کی زبر سے پڑھا ہے۔[3] امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قررت به عينا قرة و قرورا و رجل قرير العين و قد قرت عينه تقرو تقر نقيض سنحنت".[4] آنکھ کی ٹھنڈک سے مراد اس بات کی خوشی ہے کہ ان کا بچہ اُن کے پاس لوٹ آیا، اس کے بعد کہ اسے دریا میں ڈال دیا تھا اور اس کی جدائی ان پر نہایت گراں گزری تھی۔

﴿ وَلَا تَحْزَنَ ﴾ یعنی اور تاکہ وہ غم نہ کھائے اس وقت، یعنی کسی سبب سے ان کو غم حاصل نہ ہو کہ وہ اس سرور اور خوشی کو مکدر کر دے۔ اگر حزن (غم کھانا) اس سبب سے مراد ہوتا، جس کے دور ہونے سے اُن کی آنکھ ٹھنڈی ہو تو حزن کی نفی کا ذکر آنکھوں کے ٹھنڈا ہونے کے ذکر سے پہلے ہوتا، اس لیے حزن کی یہ نفی اس حزن پر محمول ہوگی، جو آنکھوں کے ٹھنڈا ہونے کے بعد کسی وجہ سے حاصل ہو اور ہوسکتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ واو ہر لحاظ سے مطلق جمع کے لیے ہے تو یہ محمول کیا جانا متعین نہ ہوگا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ﴿ تَقَرَّ عَیْنُهَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس کی آنکھ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٩٧) [2] الكشاف (٣/ ٦٥) [3] تفسير القرطبي (١١/ ١٩٧) [4] الصحاح (٣/ ٣٥٤)

ٹھنڈی ہو، اس وجہ سے کہ تو اس کے پاس پہنچا اور غم اس سے دور ہوا، اس وجہ سے کہ کسی غیر کا دودھ تیرے پیٹ میں نہ پہنچا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ وَلَا تَحْزَنَ ﴾ میں موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے، یعنی تا کہ تو اس کی جدائی اور اس کی شفقت سے محروم ہونے کا غم نہ کھائے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو نقل کیا ہے۔[1] فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ یہ تعسف (بے جا تکلف) ہے۔[2] یہ چوتھا احسان ہے۔

پانچواں احسان یہ ہے: ﴿ وَقَتَلْتَ نَفْسًا ﴾ یہاں نفس سے مراد قبطی ہے، جس کو موسیٰ علیہ السلام نے مُکا مارا، پھر وہ مر گیا، اس کا نام قاب قان تھا، فرعون کا باورچی تھا، انھوں نے اس کو دھوکے سے مار ڈالا تھا، اس وقت اُن کی عمر بارہ یا تیرہ برس کی تھی۔ ﴿ فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ ﴾ پھر ہم نے تجھ کو اس غم سے نجات دی۔ اس غم سے مراد وہ غم ہے جو اُن کو اس کے قتل سے حاصل ہوا، آخرت کے خوف اور دنیا کی سزا سے یا دونوں سے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرعون کی طرف سے نہ کہ اس کے قتل کی وجہ سے، کیونکہ وہ تو کافر تھا اور نیز اس کا قتل خطاً واقع ہوا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ لغتِ قریش میں غم کو قتل کہتے ہیں، یہ قول انتہائی بعید ہے۔

چھٹا احسان یہ ہے کہ ﴿ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ﴾ فتنہ کے تین معنے ہیں: ایک تو محنت، یعنی آزمایش۔ دوسرا امرِ شاق۔ تیسرا ہر وہ چیز جس کے ساتھ آدمی مبتلا ہوتا ہے۔ اور فتون مصدر ہے جس طرح ثبور وسکون وکفور، یعنی آزمایا ہم نے تجھ کو آزمانا اور مبتلا کیا ہم نے تجھ کو مبتلا کرنا، یا کئی طرح سے مبتلا کرنا۔ یہ آخری معنی اس بنیاد پر ہیں کہ "فتون" "فتن" کی جمع ہے یا فتنہ کی جمع ہے اس بنا پر کہ تانیث کی تا کا اعتبار ترک کیا، جیسے "حُجُوْز" "حجزہ" کی جمع ہے اور "بدور" "بدرہ" کی جمع ہے۔ یعنی خلاصی دی تم کو ہم نے ایک بار بعد ایک بار کے ان محنتوں سے جن میں تو واقع ہوا، جن کا ذکر گزر چکا ہے اس سے پہلے کہ ہم تجھے اپنی رسالت کے واسطے برگزیدہ کریں۔ اللہ پاک نے جو یہ ذکر فرمایا کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اس غم سے نجات دی جو اُن کو اس وجہ سے حاصل ہوا تھا اور آزمایشوں سے ان کو خلاصی بخشی تو شاید اس سے مقصد اُن پر احسان رکھنا ہے اللہ پاک کے احسان کا اور اُن کے دل کو مضبوط کرنا ہے، ان امور کے پیش آنے کے وقت جو انھیں عن قریب فرعون اور بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آئیں گے۔ كذا في فتح البيان مع شيء زايد.[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کی اس بات کو قبول کرنا ہے جس کا انھوں نے اپنے رب عزوجل سے سوال کیا اور اُن کو اپنی پہلی نعمتوں کا یاد دلانا ہے۔ ان پر اُن کی والدہ کے کام میں سے جو ہوا، جبکہ وہ اُن کو دودھ پلاتی تھیں اور فرعون اور اس کے لشکریوں سے ڈرتی تھیں کہ کہیں اُن کو مار نہ ڈالیں، کیونکہ وہ اس سال میں پیدا ہوئے جس میں لڑکوں کو قتل کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایک صندوق بنایا، وہ

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٥٠) [2] فتح القدير (٣/ ٥٠٢) [3] فتح البيان (٣/ ٢٢٨_ ٢٣٢)

ان کو دودھ پلاتیں، پھر اُن کو اس میں رکھ دیتیں اور اس کو دریائے نیل میں چھوڑ دیتیں اور ایک رسی سے اس کو پکڑ کر اپنے گھر کی طرف کھینچ کر رکھتیں۔ پس ایک بار گئیں کہ وہ رسی کو باندھیں، مگر وہ اُن سے چھوٹ گئی اور صندوق کو دریا لے گیا۔ اس پر اُن کو وہ غم اور ہم حاصل ہوا جس کا ذکر اللہ پاک نے ان کی طرف سے اپنے اس قول میں فرمایا ہے: ﴿ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا ﴾ [القصص: ١٠] ”اور موسیٰ کی ماں کا دل (صبر و قرار سے) خالی ہوگیا، بے شک قریب تھا کہ وہ اسے ظاہر کر دیتی، اگر ہم نے اس کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا۔“

غرضیکہ دریا موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر کی طرف لے گیا تو آلِ فرعون نے اُن کو اُٹھا لیا، تاکہ آخر کار وہ ان کے دشمن و حزن و رنج ہوں۔ یعنی اللہ پاک کی طرف سے یہ ایک قدر مقدور تھی، اس لیے کہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے سے ڈر کر بنی اسرائیل کے لڑکے قتل کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ پاک نے یہ حکم کیا اور اسی کے لیے ہے سلطانِ عظیم اور ہر طرح کی قدرت کہ اُن کی پرورش فرعون ہی کے بستر پر ہو اور اسی کے کھانے پینے سے انھیں غذا دی جائے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ فرعون اور اس کی بیوی اُن سے محبت کریں، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ﴾ یعنی میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی تیرے دشمن کے نزدیک، میں نے اس کو ایسا کر دیا کہ تجھے دوست رکھے۔ ﴿ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ﴾ ابو عمران جونی نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ”تربی بعین اللہ“ یعنی تو پرورش کیا جائے اللہ کے روبرو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو غذا دیا جائے میری آنکھوں کے سامنے۔ معمر بن مثنی نے کہا ہے کہ ایسی جگہ کہ میں دیکھوں۔[1] عبد الرحمن بن زید بن اسلم نے کہا ہے کہ یعنی میں اس کو بادشاہ کے گھر میں رکھوں گا، عیش و آرام اور ناز و نعم میں رہے گا۔ غذا اس کے نزدیک وہی ہوگی جو بادشاہ کی غذا ہوگی۔ لہٰذا صنعت و احسان یہی ہے۔[2]

﴿ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا ﴾ یہ اس طرح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت آلِ فرعون کے پاس قرار پکڑا تو انھوں نے ان پر دودھ پلانے والیاں پیش کیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قبول نہ کیا، اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ ﴾ [القصص: ١٢] ”اور ہم نے موسیٰ پر دائیوں (کے دودھ) کو پہلے ہی سے حرام کر دیا تھا۔“ پھر ان کی بہن آئیں تو کہا: ﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓي اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴾ [القصص: ١٢] یعنی کیا میں بتاؤں تم کو وہ شخص جو اُجرت لے کر اس کو تمھارے لیے دودھ پلائے، پھر وہ موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی ماں کی طرف لے گئیں اور فرعون والے اُن کے ہمراہ تھے، اُن کی ماں نے اپنا پستان اس کو پیش کیا تو اس کو قبول کر لیا۔ فرعون والے اس سے بہت خوش ہوئے اور اُن کی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٨)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٠٤)

ماں کو اُن کو دودھ پلانے کے لیے اُجرت پر رکھ لیا، لہٰذا ان کو اُن کے سبب سے دنیا میں سعادت ونعمت و راحت پہنچی اور آخرت کی اُجرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور زیادہ ہے۔

اسی لیے حدیث شریف میں مروی ہے کہ اس کاریگر کی مثال جو خیر کی کاریگری میں اُجرت طلب کرتا ہے والدۂ موسیٰ کی مثال کی طرح ہے کہ دودھ پلاتی ہے اپنے بچے کو اور اس پر اُجرت لیتی ہے۔[1] ﴿ وَلَا تَحْزَنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ غم نہ کھائے وہ تجھ پر۔ ”نَفْس“ سے مراد قبطی ہے، غم سے مراد وہ غم ہے، جو اُن کو اس وجہ سے ملا تھا کہ آلِ فرعون نے ان کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا، اس پر وہ اُن سے بھاگتے چلے گئے، یہاں تک کہ آپ مدین کے پاس وارد ہوئے اور اس نیک مرد نے اُن سے یہ کہا: ﴿ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [القصص: ٢٥] ”تو مت ڈر، تو نے ظالم قوم سے نجات پالی ہے۔“

حدیثِ فتون:

اس حدیث شریف کو امام ابو عبدالرحمٰن نسائی رحمہ اللہ نے اپنی سنن کی کتاب تفسیر میں روایت کیا ہے: ”حدثنا عبد الله بن محمد، حدثنا يزيد بن هارون، أنبانا أصبغ بن زيد، حدثنا القاسم بن أبي أيوب، أخبرني سعيد بن جبير، قال: سألت عبد الله بن عباس رضی اللہ عنہما عن قول الله عز وجل لموسى علیہ السلام و فتناك فتونا فسألته عن الفتون ما هو“ یعنی سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں سوال کیا، جو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ﴾ لہٰذا میں نے ان فتنوں کا پوچھا کہ وہ کیا ہیں تو انھوں نے کہا: اے سعید بن جبیر! تو دن کے شروع میں آ، کیوں کہ اس کا تو ایک لمبا قصہ ہے، پھر جب میں نے صبح کی تو میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف صبح سویرے چلا گیا، تاکہ میں ان سے وہ وعدہ پورا کروں، جو انھوں نے مجھ سے حدیث الفتون کا کیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے فرمایا کہ فرعون نے اور اس کے ہم نشین لوگوں نے باہم اس وعدے کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا کہ اُن کی اولاد میں نبی اور بادشاہ کرے گا تو بعض نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل اس کا انتظار کر رہے ہیں، اس میں شک نہیں کرتے، وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ یوسف بن یعقوب علیہما السلام ہیں۔ پھر جب انھوں نے وفات پائی تو کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کا ایسا وعدہ نہ تھا، اس پر فرعون بولا کہ تمھاری کیا رائے ہے تو انھوں نے مشورہ کیا اور اس بات پر اتفاق کیا کہ کئی آدمیوں کو بھیجے کہ اُن کے پاس چھریاں ہوں، وہ بنی اسرائیل میں گشت کریں اور جس مولود مذکر کو پائیں، اسے قتل کر ڈالیں۔ لہٰذا انھوں نے یہ کام کیا، پھر جب دیکھا کہ بنی اسرائیل میں سے بڑے بوڑھے تو اپنی اجل سے مرتے ہیں اور چھوٹے ذبح کیے جاتے ہیں تو بولے

[1] مصنف ابن أبي شيبة، رقم الحديث (١٩٥٣٢) مگر یہ ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤٥٠٠)

کہ یہ بات قریب ہے کہ بنی اسرائیل کو تم فنا کر ڈالو گے، پھر تم ایسے ہو جاؤ گے کہ جو کام اور خدمت اُن لوگوں کے ذمے ہے، وہ تمھیں خود کرنے پڑیں گے، اس لیے ایک سال میں تو تم ہر پیدا ہونے والے لڑکے کو قتل کرو اور اُن کی بیٹیوں کو چھوڑ دو اور ایک سال کو چھوڑ دو، اس میں کسی کو قتل نہ کرو تو بڑے مرنے والوں کی جگہ چھوٹے جوان ہو جائیں گے، پھر وہ اُن کی وجہ سے جن کو تم زندہ چھوڑو گے، ہرگز نہ بڑھیں گے کہ تمھیں یہ ڈر ہو کہ وہ تم سے بڑھ جائیں گے اور نہ ہی وہ بالکل فنا ہوں گے، اُن کی وجہ سے، جن کو تم قتل کرو گے اور اُن کی طرف محتاج ہو گے، پس انھوں نے اپنے کام کے لیے اس رائے سے اتفاق کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو ہارون علیہ السلام کا حمل رہا، اس سال جس میں لڑکے ذبح نہیں ہوتے تھے تو ہارون علیہ السلام کو انھوں نے کھلم کھلا اور بے خوف ہو کر جنا، پھر جب اگلا سال آیا تو ان کو موسیٰ علیہ السلام کا حمل رہا، اب اُن کے دل میں ڈر اور خوف واقع ہوا۔ وذلك من الفتون يا ابن جبير ما دخل عليه و هو في بطن أمه مما يراد به. ''اے ابن جبیر! یہ ہے وہ فتون جو ان پر داخل ہوا، درآنحالیکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھے۔''

پھر اللہ پاک نے اُن کی والدہ کی طرف یہ وحی کی: ﴿ لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [القصص: ۷] ''بے شک ہم اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں اور اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔'' اللہ پاک نے اُن کو حکم دیا کہ جس وقت جنیں تو اُن کو ایک صندوق میں رکھیں، پھر اُن کو دریا میں ڈال دیں، لہٰذا جس وقت انھوں نے جنا تو یہی کیا، پھر جب اُن کا بیٹا اُن سے چھپ گیا تو اُن کے پاس شیطان آیا، لہٰذا انھوں نے اپنے جی میں کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کیا۔ اگر وہ میرے پاس ذبح کیا جاتا، پھر میں اس کو زمین میں دفن کرتی اور اسے کفن پہناتی تو میرے لیے یہ زیادہ بہتر تھا، اس سے کہ میں اس کو دریا کے جانوروں اور مچھلیوں کی طرف ڈالوں۔ پھر پانی اُن کو لے گیا، یہاں تک کہ اُن کو مرفعہ (ایک بلند جگہ) پر لایا، جو فرعون کی بیوی کی لونڈیوں کی پانی بھرنے کی جگہ تھی، جب انھوں نے صندوق دیکھا تو اسے لے لیا، پھر چاہا کہ اس کو کھولیں تو ان میں سے بعض نے کہا کہ اس میں مال ہے، ہم اگر اس کو کھولیں گے اور جو کچھ ہم اس میں سے پائیں گی، بادشاہ کی بیوی اس میں ہم کو سچا نہ جانے گی، پھر انھوں نے جوں کا توں اُسے اٹھایا، اس میں سے کچھ نہ نکالا، یہاں تک کہ اسے بادشاہ کی بیوی کو لا کر دے دیا۔ پھر جب اس نے کھولا تو اس میں ایک لڑکا پایا۔ اللہ پاک نے فرعون کی بیوی کے دل میں اس کی ایسی محبت ڈال دی کہ کبھی کسی پر ایسی محبت نہ پڑی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل ہر چیز کے خیال سے فارغ اور خالی ہو گیا، سوائے موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے۔ پھر جب ذبح کرنے والوں نے موسیٰ علیہ السلام کا حال سنا تو اپنی چھریاں لے کر فرعون کی بیوی کے پاس آئے، تاکہ ان کو ذبح کر ڈالیں۔

''وذلك من الفتون يا ابن جبير'' یعنی اے ابن جبیر! یہ قصہ بھی منجملہ فتون ہے۔ پس فرعون کی بیوی نے

ان سے کہا کہ تم اس کو برقرار رکھو، یعنی ذبح نہ کرو، کیونکہ اس ایک سے بنی اسرائیل میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اس وقت تک جب تک کہ میں فرعون کے پاس جاؤں اور اس سے اس کی جان بخشی چاہوں اور اگر اس نے اس کو مجھے بخش دیا تو تم نے باقاعدہ نیکی اور بھلائی کی اور اگر اس کے ذبح کرنے کا اس نے حکم دیا تو میں تم کو ملامت نہ کروں گی۔ پھر وہ فرعون کے پاس آئی اور کہا: یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس پر فرعون بولا: ٹھنڈک تیرے لیے ہوگی، مجھے اس کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کی قسم کھائی جاتی ہے، اگر فرعون اقرار کرتا کہ اس کے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہو، جیسا کہ اس کی بیوی نے اقرار کیا تو البتہ اللہ اس کو ہدایت کرتا، جس طرح کہ اس کی بیوی کو ہدایت کی، لیکن اس کو اس سے محروم کیا، پھر اس نے اپنے اردگرد کے لوگوں کی طرف آدمی بھیجا، تاکہ اس کے لیے کوئی دایہ پسند کرے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام یہ کرنے لگے کہ جس وقت کوئی عورت اُن کو لیتی کہ اسے دودھ پلائے تو وہ اس کے پستان کی طرف متوجہ نہ ہوتے، یہاں تک کہ فرعون کی بیوی ڈری کہ یہ دودھ نہ پیے گا تو مر جائے گا، اس بات نے اس کو غم میں ڈالا۔ اس پر اس نے حکم دیا تو موسیٰ علیہ السلام کو بازار میں اور لوگوں کے مجمع کی طرف بھیجا گیا، اس اُمید پر کہ اُن کے لیے کوئی دایہ مل جائے، جس کا دودھ وہ پی لیں۔ لہٰذا انھوں نے کسی کا دودھ قبول نہ کیا۔ ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور ادھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا یہ حال ہوا کہ وہ والہ اور بے خود ہو گئیں تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا کہ تو اس کا کھوج لگا اور اس کو تلاش کر، کیا تو اس کا کوئی ذکر سنتی ہے کہ کیا میرا بیٹا زندہ ہے یا اس کو جانوروں نے کھا لیا ہے۔ اور اللہ نے جو اُن کے بارے میں وعدہ کیا تھا، اس کو بھول گئیں۔ ﴿ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [القصص: ۱۱] ”پھر وہ (گئی تو) اسے دور سے دیکھتی رہی، جبکہ وہ (فرعونی) بے خبر تھے۔“ ﴿ جُنُبٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ آدمی کی نگاہ کسی دور کی شے کی طرف بلند ہو، حالانکہ وہ شے اس کے پہلو کی طرف ہو، اسے اس کی خبر نہ ہو۔ سو جس وقت دائیوں نے فرعون والوں کو تھکا دیا تو وہ خوشی کے مارے بول اُٹھیں، میں تم کو ایسے گھر والے بتاؤں، جو اس کی کفالت کریں تمھارے لیے اور وہ اس کے لیے خیر خواہ ہیں، پھر اس کو پکڑ لیں۔

پھر کہا: تجھے کس چیز نے بتایا کہ تو نے اُن کی خیر خواہی کے لیے کیا۔ کیا تو اس کو پہچانتی ہے، یہاں تک کہ اس بات میں انھوں نے شک کیا۔ ”و ذلك من الفتون یا ابن جبیر“ تو وہ بولیں کہ اُن کی خیر خواہی اس کے لیے کی اور اُن پر شفقت اس لیے کی کہ اُن کے بادشاہ کی رشتے داری کا خیال ہے اور بادشاہ کے فائدے کا خیال ہے۔ اس پر اُن کو چھوڑ دیا تو وہ اپنی ماں کی طرف گئیں، اُن کو یہ خبر دی۔ پھر ان کی ماں آئیں تو جس وقت انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی گود میں رکھا تو اُن کے پستان کی طرف مائل ہوئے، پھر اس کو چوسا، یہاں تک کہ اُن کی دونوں کوکھیں سیراب ہو کر بھر گئیں اور خوش خبری دینے والا فرعون کی بیوی کی طرف چلا، اس کو یہ خوشخبری دی کہ ہم نے تیرے بیٹے کے لیے

دایہ تلاش کر لی۔ پھر فرعون کی عورت نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو بلوا بھیجا تو وہ اپنی ماں کو اور موسیٰ علیہ السلام کو لے آئیں، پس جس وقت فرعون کی بیوی نے وہ معاملہ دیکھا، جو موسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے ساتھ کرتے تھے، یعنی طیب خاطر ان کا دودھ پیتے تھے تو اُن کی ماں سے کہا کہ تو ٹھہر جا، میرے اس فرزند کو دودھ پلاتی رہ، کیونکہ میں نے کبھی کسی شے سے اتنی محبت نہیں رکھی، جتنی اس بچے سے محبت ہے، موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بولیں، مجھے اس کی طاقت نہیں ہے کہ میں اپنا گھر بار اور بچے چھوڑوں کہ وہ ضائع ہو جائیں، اگر تیرا دل مانے کہ تو اُسے مجھ کو دے دے کہ میں اسے اپنے گھر لے جاؤں، وہ میرے پاس رہے اور میں اس کے ساتھ بھلائی کرنے میں کوئی کمی نہ کروں تو میں یہ کام کرلوں گی، کیوں کہ میں اپنے گھر بار اور بچوں کو چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ پاک نے جو وعدہ ان سے کیا تھا، اس کو یاد کیا۔ اس لیے فرعون کی بیوی پر انھوں نے تنگی کی اور یقین کر لیا کہ اللہ پاک اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے، پھر وہ اس دن موسیٰ علیہ السلام کو لے کر اپنے گھر لوٹ آئیں۔

اللہ پاک نے اُن کو اچھا اُگانا اُگایا، یعنی اچھی طرح سے اُن کی پرورش فرمائی اور اُن کو اس بات کے لیے محفوظ رکھا جس کا اُن کے بارے میں حکم کر چکا تھا۔ اب تو بنی اسرائیل پر جو بے گار اور ظلم ہوتا تھا وہ اس سے مستقل طور پر محفوظ اور بچے رہے۔ حالانکہ اُن کے گاؤں کے کنارے پر رہتے تھے۔ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام بادشاہ کی بیوی کے بیٹے ہوئے تو اب کس کی مجال کہ اُن کی قوم پر کوئی ظلم کرے یا اُن کو بیگار میں پکڑے، پھر موسیٰ علیہ السلام بڑے ہوئے نشو ونما پائی۔ فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں سے کہا کہ تو مجھے میرے بیٹے کی زیارت کرا دے تو انھوں نے اس سے ایک دن کا وعدہ کیا کہ اس میں وہ ان کی زیارت کرے۔ فرعون کی بیوی نے اپنے خزانچیوں، داروغوں اور کام داروں سے کہا کہ آج تم سب کے سب عزت وتکریم اور تحائف کے ساتھ میرے بیٹے کا استقبال کرو، تا کہ میں اس کو دیکھوں اور میں ایک امین بھیجنے والی ہوں کہ تم میں سے ہر آدمی جو کچھ رکھے گا، وہ اس کا شمار کرے گا۔ پھر تحفے، عزت وتکریم اور عطایا اس وقت سے ان کا استقبال کرتے رہے، جب وہ اپنی ماں کے گھر سے نکلے، یہاں تک کہ فرعون کی بیوی کے پاس پہنچے۔ لہٰذا جس وقت وہ اس پر داخل ہوئے تو اس نے اُن کو عطیہ دیا، اُن کی عزت کی اور اُن سے خوش ہوئی اور اس کی ماں کو عطیہ دیا، اس لیے کہ اُن کا اثر اُن پر اچھا پڑا، یعنی ان کے حسنِ خدمت کا انعام دیا۔

پھر بولی کہ میں ضرور اس کو فرعون کے پاس لے جاؤں گی تو وہ ضرور اس کو عطیہ دے گا، اس کا اکرام کرے گا۔ پھر جس وقت وہ اُن کو لے کر فرعون پر داخل ہوئی تو اس نے ان کو اپنی گود میں لیا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس کی ڈاڑھی پکڑی۔ پھر اس کو زمین کی طرف کھینچا، اس پر گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ، جو اللہ کے دشمنوں میں سے تھے، انھوں نے فرعون سے کہا: کیا تو نہیں دیکھتا ہے اس بات کو جس کا وعدہ اللہ نے اپنے نبی ابراہیم علیہ السلام سے کیا ہے، اس نے یہ زعم کیا ہے کہ وہ تیرا وارث ہوگا اور تجھ پر چڑھے گا اور تجھے پچھاڑے گا، اس پر اس نے ذباحوں (ذبح کرنے والوں) کو بھیجا،

تا کہ ان کو ذبح کر ڈالیں۔ وذلك من الفتون یا ابن جبیر بعد كل بلاء ابتلى به وأريد به فتونا۔ پھر فرعون کی بیوی آئی تو کہا کہ تجھے کیا بات ظاہر ہوئی اس لڑکے کے بارے میں، جس کو تو نے مجھے بخش دیا ہے تو وہ بولا: کیا تو اس کو نہیں دیکھتی کہ وہ زعم کرتا ہے کہ مجھے پچھاڑے گا، مجھ پر چڑھے گا۔ اس پر وہ بولی کہ میں تیرے اور اپنے درمیان ایک ایسا امر ٹھہراتی ہوں، جس سے حق پہچانا جائے گا، تو لے آ دو انگارے اور دو موتی، پھر اُن کو اس کی طرف پیش کر، اگر وہ موتیوں کو پکڑے گا اور انگاروں سے بچے گا تو تو پہچان لے گا کہ وہ عقل رکھتا ہے اور اگر اس نے انگاروں کو لے لیا اور موتیوں کا ارادہ نہ کیا تو تو جان لے گا کہ کوئی شخص انگاروں کو موتیوں پر اختیار نہیں کرتا، حالانکہ وہ عقل رکھتا ہو۔ پھر فرعون نے دو انگارے اور دو موتی موسیٰ علیہ السلام کی طرف قریب کیے تو انھوں نے انگارے لے لیے، لہٰذا فرعون نے اُن کو موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے کھینچ لیا اس خوف سے کہ وہ اُن کے ہاتھ کو جلا دیں۔ اس پر فرعون کی بیوی نے کہا: کیا تو نہیں دیکھتا ہے۔ پس اللہ پاک نے فرعون کو موسیٰ علیہ السلام سے پھیر دیا، اس کے بعد کہ وہ اُن کو قتل کرنے کا قصد کر چکا تھا اور اللہ اُن کے بارے میں اپنے امر کا اختیار رکھتا ہے۔

پھر جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنے زور پر پہنچے، یعنی مردوں میں سے ہوگئے، جو بنی اسرائیل اُن کے ہمراہ تھے، ان میں سے کسی شخص تک فرعون کا کوئی آدمی ظلم کرنے اور بیگار لینے نہیں پہنچ سکتا تھا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل خوب محفوظ ہوگئے اور زیادتیوں سے بچ گئے۔ ایک وقت موسیٰ علیہ السلام شہر کے کنارے میں جا رہے تھے کہ اچانک ان کو دو آدمی ملے، جو لڑ رہے تھے، ان میں سے ایک فرعونی اور دوسرا اسرائیلی تھا۔ اسرائیلی نے ان سے فریاد رسی چاہی، یعنی فرعونی پر مدد چاہی۔ موسیٰ علیہ السلام سخت غضبناک ہوئے اس لیے کہ فرعونی نے اسرائیلی کو پکڑ لیا تھا اور وہ بنی اسرائیل میں سے اپنی منزلت اور رُتبے کو اور اُن کے لیے اپنے حفظ کو جانتے تھے، مگر لوگ اسی قدر جانتے تھے کہ یہ جو بنی اسرائیل کی حفاظت اور حمایت کرتے ہیں تو وہ صرف ایک بنی اسرائیلی عورت کا دودھ پینے کی وجہ سے کرتے ہیں، مگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اس بات کو خوب جانتی تھیں، مگر یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس بات سے مطلع کر دیا ہو، جو دوسروں کو نہ بتائی ہو۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی کو مُکا مارا تو اس کو قتل کر ڈالا اور اُن دونوں کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور اس اسرائیلی کے کسی نے نہیں دیکھا۔ پھر جب اس شخص کو مار ڈالا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [القصص: ۱۵] ”یہ (قتل) شیطان کے عمل سے ہے، بلاشبہ وہ گمراہ کرنے والا کھلم کھلا دشمن ہے۔“

پھر کہا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [القصص: ۱۶] ”اے میرے رب! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، لہٰذا تو میری مغفرت فرما، چناں چہ اللہ نے اسے بخش دیا، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ پھر وہ صبح کو اُٹھے شہر میں ڈرتے ہوئے خبروں کی راہ دیکھتے ہوئے۔ پھر کوئی شخص فرعون کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ بنی اسرائیل نے آلِ فرعون کے ایک شخص کو مار ڈالا ہے،

لہٰذا تو ہمارے واسطے ہمارا حق لے اور ان کو رُخصت مت دے، یعنی اُن پر نرمی نہ کر کہ اُن سے حق نہ لے اور وہ جری ہو جائیں۔ اس پر فرعون نے کہا: تم مجھ کو اس کا قاتل تلاش کر دو اور وہ شخص جو اس پر گواہی دے۔ اس لیے کہ بادشاہ اگرچہ اپنی قوم کے ساتھ خالص اور صاف طور پر ہے، پھر بھی اس کے لیے یہ بات درست نہیں کہ بغیر حجت اور گواہ کے قصاص لے۔ لہٰذا تم میرے لیے یہ بات معلوم کرو، میں تمھارے لیے تمھارا حق لوں گا۔ پھر اسی دوران کہ وہ گشت کر رہے تھے۔ کسی کو گواہ اور حجت کے طور پر نہ پاتے تھے کہ اچانک موسیٰ علیہ السلام نے دوسرے دن اسی اسرائیلی کو دیکھا کہ فرعون کی قوم کے ایک اور آدمی سے لڑ رہا ہے اور اس نے پھر موسیٰ علیہ السلام سے فرعونی پر مدد چاہی اور اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو اس حال میں پایا کہ جو بات اُن سے پہلے ہوگئی تھی، اس پر نادم ہیں اور جو بات انھوں نے دیکھی، اس سے ناخوش ہیں، اس پر اسرائیلی ناخوش ہوا اور وہ چاہتا تھا کہ فرعونی پر حملہ کرے تو موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلی سے اس کے کل کے فعل کی وجہ سے اور جو اس نے آج کیا، کہا: ﴿ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [القصص: ۱۸] ”بلاشبہ تو تو کھلا گمراہ شخص ہے۔“

پھر اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھا، اس کے بعد کہ انھوں نے اس سے کہا، جو کچھ کہ کہا، تو ناگاہ وہ ویسے ہی غضبناک ہیں، جیسے کل غضبناک ہوئے تھے، جس میں فرعونی کو مار ڈالا تھا، لہٰذا اسرائیلی اس بات سے ڈرا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی کا ارادہ کیا ہے، اس کے بعد کہ انھوں نے اسے ﴿ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ کہا ہے، یعنی اس کو یہ ڈر ہوا کہ زبان پر تو مجھ سے غصے ہوئے ہیں، ہاتھ بھی مجھ پر ڈالیں گے، حالانکہ انھوں نے اس کا ارادہ نہیں کیا تھا، انھوں نے تو فرعونی کا ارادہ کیا تھا۔ اس پر اسرائیلی ڈرا اور بول اُٹھا: ﴿ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ﴾ [القصص: ۱۹] ”اے موسیٰ! کیا تو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے، جیسے تو نے کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔“ اس نے جو یہ کہا تو اس ڈر سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسی کا ارادہ کیا ہے، تاکہ اس کو مار ڈالیں، پھر ایک نے دوسرے کو چھوڑ دیا اور فرعونی چلا گیا اور اسرائیلی سے جو خبر اس نے سنی تھی، وہ فرعون والوں سے کہہ دی، جبکہ وہ یوں کہہ رہا تھا: ﴿ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ﴾۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام کو مارنے کے لیے فرعون نے ذباحوں کو بھیجا۔ پس فرعون کے قاصدوں نے شاہراہ کا راستہ لیا، آہستہ آہستہ چلتے اور موسیٰ علیہ السلام کو تلاش کرتے تھے اور اس بات سے نہیں ڈرتے تھے کہ وہ اُن سے فوت ہو جائیں گے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے رفیقوں میں سے ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے آیا، اس نے راستے کو مختصر کیا، یہاں تک کہ فرعون والوں سے سبقت کر کے موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان کو اس کی خبر دی۔ و ذلك من الفتون یا ابن جبیر.

پھر موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف منہ کر کے نکلے، اس سے پہلے وہ کسی آزمائش سے نہ گزرے تھے اور نہ ہی ان کو راستے کا علم تھا، مگر اپنے رب عزوجل سے ان کا حسنِ ظن تھا، اس لیے کہ انھوں نے کہا: ﴿ عَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾ [القصص: ۲۲] ''امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ کی ہدایت دے گا۔'' اور جب مدین کے پانی پر پہنچے تو وہاں پر لوگوں کو جمع ہوتے ہوئے پایا، ان کے علاوہ وہاں دو عورتیں تھیں، جو اپنی بکریوں کو روکے ہوئے کھڑی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ کیا بات ہے کہ تم کنارے ہو کر کھڑی ہوئی ہو اور لوگوں کے ساتھ اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں، وہ بولیں ہم کو قوت نہیں ہے کہ ہم لوگوں سے مزاحمت کریں، ہم تو اُن کے حوضوں سے بچے ہوئے پانی سے پلاتی ہیں۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے اُن کے جانوروں کو پانی پلا دیا، اس لیے کہ وہ ڈول میں بہت سا پانی بھرتے تھے، یہاں تک کہ چرواہوں میں سب سے پہلے نمبر پر ہوگئے۔ وہ دونوں بکریاں لے کر اپنے باپ کی طرف لوٹ گئیں اور موسیٰ علیہ السلام لوٹے تو ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے اور کہا: اے رب! تو جو اُتارے میری طرف اچھی چیز، میں اس کا محتاج ہوں۔ ان کے باپ نے اس بات کو اوپرا سمجھا کہ اپنی بکریوں کے تھن اور پیٹ بھرے ہوئے لے کر جلدی لوٹ آئیں تو اُن کے باپ بولے کہ بے شک آج تمھارا البتہ کوئی قصہ و شان عجیب ہے۔ اس پر جو کام موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا، اس کے بارے میں اپنے باپ کو بتایا تو اُن کے باپ نے ان میں سے ایک کو حکم دیا کہ اس کو بلا لائے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی اور اُن کو بلا کر لے گئی، پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کے باپ سے بات چیت کی تو انھوں نے کہا: ﴿ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [القصص: ۲۵] ''تو مت ڈر، تو نے ظالم قوم سے نجات پالی ہے۔''

فرعون اور اس کی قوم کا نہ ہم پر کچھ اقتدار اور قبضہ ہے اور نہ ہم اس کی مملکت میں ہیں۔ اس پر اُن میں سے ایک بولی: اے ابا جان! آپ اس کو نوکر رکھ لیں، البتہ اگر اس کو آپ رکھنا چاہیں تو وہ زور آور اور امانت دار ہے، یہ جو کہا تو اس کے باپ کی غیرت نے اس بات پر آمادہ کیا کہ اس سے کہا تجھے کیا خبر کہ اس کی قوت کیا ہے اور اس کی امانت کیا ہے۔ وہ بولی: اس کی قوت تو وہ ہے، جو میں نے اس کے ڈول کھینچنے میں دیکھی، جس وقت اس نے ہمارے لیے پانی پلایا، میں نے کبھی کسی آدمی کو نہیں دیکھا کہ وہ پانی پلانے میں اس سے زیادہ قوی ہو، رہی امانت تو وہ یہ ہے کہ اس نے میری طرف اس وقت نظر کی، جب میں اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے لیے ایک شخص (مرد) بنی بلند ہوئی۔

پھر جب اس نے جانا کہ میں عورت ہوں تو اس نے اپنے سر کو نیچے کر لیا، پھر اس کو نہ اُٹھایا، یہاں تک کہ میں نے آپ کا پیغام اس کو پہنچایا، پھر اس نے مجھ سے کہا کہ تو میرے پیچھے چل اور مجھے راہ بتا، لہٰذا یہ بات اس نے کی، اسی لیے تو وہ امین ہے۔ اس پر اس کے باپ کا خیال دور ہوا اور اس کی تصدیق کی اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وہی گمان کیا، جو اس نے کہا۔ پھر اس کے باپ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ﴿ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ

شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [القصص: ۲۷] ''اس نے (موسیٰ سے) کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے اس شرط پر کر دوں کہ تو آٹھ سال میری نوکری کرے، پھر اگر تو دس سال پورے کرے تو تیری طرف سے ہوگا، اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر مشقت ڈالوں، ان شاء اللہ یقیناً تو مجھے نیک لوگوں میں سے پائے گا۔'' موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کو قبول کیا، پس آٹھ سال تو موسیٰ علیہ السلام پر واجب تھے اور دو برس ان کی طرف سے وعدہ تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف سے اُن کے وعدے کو پورا کر دیا تو انھوں نے دس سال پورے کیے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ مجھے ایک نصرانی عالم ملا، کہا کیا تو جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت پوری کی؟ میں نے کہا: نہیں اور میں اس وقت نہیں جانتا تھا۔ پھر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ملا تو میں نے اُن سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے: کیا تجھے معلوم نہیں کہ آٹھ برس تو نبی اللہ پر واجب تھے۔ اللہ کے نبی ایسے نہیں ہیں کہ اُن میں سے کچھ کم کریں اور جان لیں اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے اس وعدے کو جو انھوں نے کیا تھا پورا کرنے والا ہے، پس بے شک انھوں نے دس سال کی مدت پوری کی۔ پھر میں اس نصرانی سے ملا تو میں نے اسے خبر دی، وہ بولا کہ جس شخص سے تو نے پوچھا، پھر اس نے تمھیں بتایا تو وہ اس بات کو تجھ سے زیادہ جاننے والا ہے؟ میں نے کہا کہ اجل و اولیٰ ہیں، یعنی وہ بزرگ تر اور لائق تر ہیں۔

پھر جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر چلے تو آگ اور عصا اور اُن کے ہاتھ کا معاملہ ہوا، جن کا قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تجھ کو سنایا ہے۔ پھر جو وہ آلِ فرعون سے اس قتل اور عقدۂ زبان کے بارے میں ڈرتے تھے، اس کا شکوہ اللہ تعالیٰ سے کیا، کیونکہ اُن کی زبان میں گرہ تھی، جو اُن کو بہت سی باتیں کرنے سے روکتی تھی۔ اپنے رب سے اس بات کا سوال کیا کہ اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام سے اُن کی اعانت کرائے کہ وہ اُن کے مددگار ہو جائیں اور بہت سی باتیں جن کو اُن کی زبان صاف ادا نہیں کر سکتی تو وہ اُن کو اُن کی طرف سے ادا کریں۔ لہٰذا اللہ پاک نے اُن کو اُن کا سوال عطا فرمایا اور اُن کی زبان سے گرہ کھول دی اور اللہ نے ہارون علیہ السلام کو وحی کی اور اُن کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے ملیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا لے کر چلے، یہاں تک کہ ہارون علیہ السلام سے ملے۔ پھر وہ دونوں مل کر فرعون کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر وہ ایک مدت تک فرعون کے دروازے پر ٹھہرے رہے، ان کو اذن نہیں ملتا تھا، پھر سخت حجاب کے بعد اُن کو اِذن ملا تو انھوں نے کہا کہ بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ وہ بولا: پھر تم دونوں کا رب کون ہے؟ انھوں نے اس کو اس بات کی خبر دی، جس کا قصہ اللہ پاک نے قرآن میں تجھ کو سنایا ہے۔ وہ بولا کہ تم کیا چاہتے ہو اور ان کو مقتول کی یاد دلائی تو انھوں نے وہ عذر کیا جو تو سن چکا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اللہ پر ایمان لائے اور ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے تو اس نے انکار کیا اور بولا کہ اگر تو سچوں میں سے ہے تو کوئی نشانی لا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈال دیا، تب ہی وہ ایک

بڑا سانپ بن گیا کہ اپنا منہ پھاڑے ہوئے دوڑتا ہے، فرعون کی طرف جا رہا ہے۔ پھر جب فرعون نے اس کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو اس سے ڈر گیا اور بے سوچے سمجھے خود کو تخت سے گرا دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ سانپ کو اس سے روکیں تو انھوں نے روک لیا۔ پھر انھوں نے اپنا ہاتھ جیب سے نکالا تو اس کو چمکتا دمکتا ہوا دیکھا، جس میں برص کے داغ نہیں تھے۔ پھر اس کو جیب میں لے گئے تو وہ اپنی پہلی رنگت پر ہوگیا۔ اب فرعون نے اپنے اردگرد کی جماعت سے مشورہ چاہا، اس بات میں جس کو دیکھ لیا تھا تو انھوں نے اس سے کہا ہے کہ یہ دونوں دو جادوگر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے سبب سے تم کو تمھاری زمین سے نکال دیں اور تمھارے طریقہ مثلیٰ کو لے جائیں، اس سے مراد اُن کا ملک اور عیش ہے کہ جس میں وہ تھے اور موسیٰ علیہ السلام پر اس بات کا انکار کیا کہ جو کچھ انھوں نے طلب کیا ہے اس میں سے کچھ بھی اُن کو دیں اور فرعون سے کہا کہ تو اُن کے واسطے جادوگروں کو جمع کر، کیوں کہ وہ تیری زمین میں بہت ہیں۔ یہاں تک کہ تو اپنے جادو سے اُن کے جادو پر غالب ہو جائے۔ پھر اس نے شہروں کی طرف آدمی بھیجے اور اس کے لیے ہر جادوگر متعالم جمع کیا گیا۔ پھر جس وقت وہ فرعون کے پاس آئے تو کہا کہ یہ جادوگر کس چیز کے ساتھ جادو کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا: سانپوں کے ساتھ کرتا ہے۔ جادوگر بولے: پھر تو قسم ہے اللہ کی کہ زمین میں کوئی نہیں ہے، جو سانپوں رسیوں اور لاٹھیوں سے سحر کا وہ عمل کرے، جو ہم کرتے ہیں۔ پھر ہماری مزدوری کیا ہے اگر ہم غالب آجائیں؟ فرعون نے ان سے کہا کہ تم میرے اقارب و رشتہ دار اور خاص لوگ ہوگے اور میں تم پر ہر شے کا احسان کرنے والا ہوں، جس کو تم دوست رکھو۔ پھر انھوں نے جشن کے دن کا باہم وعدہ کیا، یعنی فرعون کی سالگرہ کا دن اور یہ کہ لوگ دن چڑھے جمع کیے جائیں۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حدیث بیان کی کہ "یوم الزینة" وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور جادوگروں پر غالب کیا، وہ دن عاشورہ کا دن ہے۔ پھر جس وقت وہ صعید (مصر میں ایک جگہ) میں جمع ہوئے تو بعض لوگوں نے بعض سے کہا: چلو تو ہم اس کام میں حاضر ہوں، شاید ہم جادوگروں کی پیروی کریں، اگر وہی غالب رہیں۔ ان کی مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں۔ یہ بات انھوں نے استہزاء کے طور پر کہی۔ پھر انھوں نے کہا: "یموسی تعذرھم بسحرھم" (اصل کا لفظ "صارت جرزا إلى الثعبان" ہے۔ جرز کے معنی یہاں بن نہیں سکتے۔ شاید حرز ہو، یعنی جمع ہوگئیں، ثعبان سے آلگیں، اس کے منہ میں گھسنے لگیں، واللہ أعلم) تو ڈالے یا ہم ہوں ڈالنے والے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: بلکہ تم ہی ڈالو، جس وقت انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ قسم ہے فرعون کی عزت کی! ہم ہی ہیں غالب ہونے والے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جادو سے وہ شے دیکھی جس سے انھوں نے اپنے جی میں پوشیدہ خوف محسوس کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ تو اپنی لاٹھی کو ڈال دے۔ پھر جب اس کو ڈالا تو وہ ایک بڑا اژدہا ہوگیا، منہ پھاڑے ہوئے، پھر

لاٹھیاں رسیوں سے ملنے لگیں، یہاں تک کہ اژدہا کی طرف جمع ہوگئیں، اس میں داخل ہونے لگیں، یہاں تک کہ اس نے کسی لاٹھی اور رسی کو نہ چھوڑا، سب کو نگل گیا، پھر جب جادوگروں نے اس بات کو پہچان لیا تو بولے کہ اگر یہ جادو ہوتا تو ہمارے جادو سے اس سارے معاملے کو نہ پہنچتا، لیکن یہ تو اللہ عزوجل کی طرف سے ایک امر ہے۔ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جس کو موسیٰ علیہ السلام اللہ کے پاس سے لائے اور جس بات پر ہم تھے، اس سے ہم اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، یعنی تائب ہوتے ہیں، پس اللہ پاک نے فرعون اور اس کے رفیقوں کی پیٹھ توڑ ڈالی اس موقع پر اور حق غالب ہوگیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے، وہ سب باطل ہوگیا۔ پھر وہ اس جگہ مغلوب ہوئے اور ذلیل وخوار ہو کر لوٹے۔

فرعون کی بیوی ظاہری طور پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی، اللہ سے دعا کرتی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے ساتھیوں پر فتح دے۔ لہٰذا فرعون والوں میں سے جس شخص نے اسے دیکھا تو یہ گمان کیا کہ اس نے زینت کو جو ترک کیا ہے تو وہ فرعون اور اس کے رفیقوں پر شفقت کی خاطر ہے، حالانکہ اس کا حزن وغم اور رنج صرف موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے جھوٹے وعدوں کے سبب سے ٹھہرنا اور توقف کرنا دراز ہوا تو جس وقت کوئی نشانی لاتے تو اس وقت ان سے وعدہ کرتا کہ بنی اسرائیل کو اُن کے ہمراہ بھیجے دیتا ہے، پھر جب وہ معجزہ ہو چکتا تو اپنے وعدہ کے خلاف کرتا اور کہتا کہ کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ کرے۔ پھر اللہ نے اس کی قوم پر طوفان (غرقِ آب) وجراد (ٹڈی) وقمل (چچڑی یا گھُن کا کیڑا) وضفادع (مینڈک) ودم (خون) اپنی کھلی نشانیاں بھیجیں۔ ہر نشانی کے وقت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرتا اور درخواست کرتا کہ اس نشانی کو دور کرا دیں اور پکے اور مضبوط وعدے کرتا کہ بنی اسرائیل کو اُن کے ہمراہ بھیج دے گا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام اس نشانی کو اس سے روک لیتے تو اپنے وعدے کا خلاف کرتا اور اپنے عہد کو توڑ ڈالتا، یہاں تک کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کو ساتھ لے کر نکلنے کا حکم دیا تو وہ انھیں لے کر رات کو نکلے، پھر جب فرعون صبح کو اُٹھا اور دیکھا کہ وہ چل دیے تو شہروں میں جمع کرنے والے لوگ بھیجے۔ پھر بڑے بڑے بہت سے لشکر لے کر خود اُن کے پیچھے گیا اور اللہ پاک نے دریا کو وحی کی، جس وقت میرا بندہ موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا سے تجھ کو مارے تو تو بارہ ٹکڑے سے پھٹ جانا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام اور اس کے ساتھ والے گزر جائیں، پھر جو اُن کے بعد فرعون اور اس کی قوم باقی رہ جائیں ان پر مل جانا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام بھول گئے کہ عصا سے دریا کو ماریں اور دریا تک پہنچ گئے اور وہ ایک ہولناک آواز کر رہا تھا، جیسے بادل کی آواز اس خوف سے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کو اپنے عصا سے ماریں اور وہ غافل ہو تو اللہ کا نافرمان بن جائے۔ پھر جس وقت دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا اور ایک دوسرے کے قریب ہوگئے تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ بے شک ہم پا لیے گئے، تیرے رب نے جو تجھے حکم دیا ہے وہ کر، کیونکہ نہ اس نے جھوٹ کہا ہے اور نہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام بولے:

میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس وقت میں دریا پر آؤں تو وہ بارہ ٹکڑے پھٹ جائے، یہاں تک کہ میں اس کے پار ہو جاؤں، پھر اس کے بعد عصا کو یاد کیا تو اپنے عصا سے دریا کو مارا۔ جس وقت کہ فرعون کے لشکر کا اگلا حصہ قریب ہوا موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کے آخری حصہ کے تو دریا پھٹ گیا، جس طرح کہ اس کے رب نے اسے حکم دیا تھا اور جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے سارے ہمراہی دریا کے پار ہو گئے اور فرعون اور اس کے ساتھی دریا میں گھسے تو دریا اُن پر مل گیا، جیسا کہ اس کو حکم تھا۔ پھر جس وقت موسیٰ علیہ السلام دریا کے پار گئے تو اُن کے اصحاب نے کہا کہ ہم تو اس سے ڈرتے ہیں کہ فرعون ڈوبا نہ ہو اور نہ ہی ہمیں اس کے ہلاک ہونے کا یقین ہے۔ اس پر اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرعون کا بدن دریا سے نکال دیا، یہاں تک کہ ان کے اصحاب نے اس کی ہلاکت کا یقین کر لیا۔

پھر اُس کے بعد اُن کا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جو اپنے بتوں کی پرستش میں لگے ہوئے تھے تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی بولے کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک بت بنا دیں، جس طرح اُن لوگوں کے بت ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم لوگ جہالت کرتے ہو۔ اُن لوگوں نے تو تباہ ہو جانا ہے اور جس کام میں یہ لوگ لگے ہوئے ہیں، وہ غلط ہے۔ الآیہ۔ تم تو وہ نشانیاں دیکھ اور سن چکے ہو جو تم کو کافی ہیں اور وہاں سے چل دیے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو ایک منزل پر اُتارا اور کہا کہ تم ہارون کی اطاعت کرو، اس لیے کہ میں نے اس کو تم پر خلیفہ کر دیا ہے، کیوں کہ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں اور اُن کو تیس دن کی مدت ٹھہرا دی کہ اس میں وہ واپس آجائیں گے۔ پھر جب اپنے رب کے پاس آئے اور چاہا کہ تیس دن میں اس سے کلام کریں اور اُن تیس دنوں میں رات دن کا روزہ رکھا تھا اور اس بات کو مکروہ جانا کہ اپنے رب سے باتیں کریں، حالانکہ اُن کے منہ کی بو روزہ دار کے منہ کی بو ہو، اس لیے زمین کی روئیدگی سے کچھ لیا، پھر اس کو چبایا تو اُن سے اُن کے رب نے فرمایا، جب وہ اس کے پاس آئے تو نے کیوں افطار کیا، حالانکہ جو بات ہوئی تھی، وہ اس کو خوب جانتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام بولے: اے رب! میں نے مکروہ جانا کہ تجھ سے باتیں اس حال میں کروں کہ میرا منہ بدبودار ہو۔ رب نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تو نے نہیں جانا کہ روزہ دار کے منہ کی بو میرے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ تر خوشبودار ہے۔ تو لوٹ جا، پھر دس دن روزہ رکھ، پھر میرے پاس آ۔ موسیٰ علیہ السلام نے، جو حکم ملا اس کے مطابق کیا، پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے دیکھا کہ وہ اس مدت میں ان کے پاس لوٹ کر نہیں آئے تو انھیں برا لگا۔ ہارون علیہ السلام نے ان کو خطبہ سنایا اور کہا کہ تم تو مصر سے نکل آئے، حالانکہ قومِ فرعون کی عاریتیں اور امانتیں تمھارے پاس ہیں اور اسی طرح تمھاری امانتیں اُن میں ہیں، لہٰذا میری رائے تو یہ ہے کہ تمھارا مال جو اُن کے پاس ہے، اس کا اجر تم طلب کرو اور تمھارے لیے میں کسی امانت اور عاریت کو حلال نہیں کرتا ہوں، جو تم نے رکھ چھوڑی ہے اور ہم اس

میں سے نہ کچھ اُن کو لوٹا سکتے ہیں اور نہ اس کو اپنی ذات کے لیے روک سکتے ہیں، اس لیے ایک گڑھا کھودا اور جس کسی کے پاس اس میں سے کوئی برتنے کی چیز یا زیور تھا، اس کو حکم دیا کہ اسے گڑھے میں ڈال دیں، پھر اس پر آگ جلا دی، سو آگ نے اس کو جلا ڈالا۔ پھر کہا کہ وہ نہ ہمارے لیے ہو نہ ان کے لیے۔

قصۂ سامری:

سامری ایک قوم سے تھا جو گائے کو پوجتے تھے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے پڑوسی تھے۔ سامری بنی اسرائیل میں سے نہ تھا۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے کوچ کیا تو سامری نے بھی اُن کے ہمراہ کوچ کیا۔ پس اس کے لیے یہ بات جاری ہو چکی تھی، یعنی قضائے الٰہی میں کہ اس نے رسول (جبریل علیہ السلام) کا نقشِ قدم دیکھ لیا، اس سے ایک مٹھی بھر لی تھی۔ پھر اس کا گزر ہارون علیہ السلام پر ہوا تو انھوں نے اس سے فرمایا: اے سامری! تو اس کو جو کچھ تیری مٹھی میں ہے، کیوں نہیں ڈال دیتا۔ وہ اس کی مٹھی باندھے ہوئے تھا۔ اس مدت کے دوران اس کو کسی نے نہیں دیکھا تو وہ بولا کہ یہ تو نقشِ قدمِ رسول سے ایک مٹھی ہے، جس نے تم کو دریا سے پار کیا اور میں اس کو کسی شے کے واسطے نہ ڈالوں گا، مگر یہ کہ تم اللہ سے دعا کرو تو جس وقت میں اس کو ڈالوں تو اس کو وہ شے کر دے جو میں چاہتا ہوں، پھر اس نے اس کو ڈال دیا اور ہارون علیہ السلام نے اس کے لیے دعا کی تو وہ بولا میں چاہتا ہوں کہ بچھڑا ہو جائے، اس گڑھے میں جو کچھ متاع یا زیور تھا یا تانبا یا لوہا تھا، وہ سب مجتمع ہو گیا، پھر وہ ایک بچھڑا بن گیا، جس کا پیٹ خالی تھا، اس میں روح نہ تھی اور اس میں گائے کی آواز تھی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قسم ہے اللہ کی! ہرگز اس کے لیے کوئی آواز نہ تھی، صرف یہ بات تھی کہ ہوا اس کی پیٹھ میں گھستی اور منہ سے نکل جاتی تھی اور اسی سے آواز پیدا ہوتی تھی۔

پھر بنی اسرائیل کئی فرقے ہو گئے، ایک فرقے نے کہا: اے سامری! یہ کیا ہے؟ اور تو اس کو خوب جانتا ہے؟ سامری بولا کہ یہ تمھارا رب ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام راہ بھول گئے ہیں۔ تو ایک فرقے نے کہا کہ ہم اس کی تکذیب نہیں کرتے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس لوٹ آئیں۔ لہٰذا اگر وہ ہمارا رب ہے تو ہم ایسے نہ ہوں گے کہ ہم نے اسے ضائع کر ڈالا، اس میں عاجز رہ گئے، جبکہ ہم نے دیکھ لیا اور اگر وہ ہمارا رب نہیں ہے تو ہم موسیٰ علیہ السلام کے قول کی پیروی کریں گے۔ ایک فرقے نے کہا کہ یہ شیطان کے کام سے ہے اور وہ نہ ہمارا رب ہے نہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں نہ تصدیق کرتے ہیں اور اس کی تکذیب کا اعلان کیا۔ ایک فرقہ ایسا ہوا کہ سامری نے جو کچھ بچھڑے کے بارے میں کہا: ں کی سچائی اُن کے دلوں میں پلا دی گئی تو ہارون علیہ السلام نے اُن سے کہا: اے میری قوم! تم تو اس سے فتنے میں پڑ گئے ہو اور بے شک تمھارا رب رحمٰن ہے، لہٰذا تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو۔ وہ بولے: پھر موسیٰ علیہ السلام کا کیا حال ہے کہ انھوں نے ہم سے تیس دن کا وعدہ کیا۔ پھر ہم سے خلاف کیا، یہ تو چالیس دن گزر چکے۔ ان کے

بیوقوف لوگوں نے یوں کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو چوک گئے، لہٰذا وہ اس کو طلب کرتے ہیں اور اس کے پیچھے جاتے ہیں۔

پھر جس وقت اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور اُن سے کہا جو کچھ کہ کہا تو اُن کو اس بات کی خبر دی، جس میں اُن کی قوم اُن کے پیچھے مبتلا ہوگئی تھی تو موسیٰ علیہ السلام غصے سے بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے۔ لہٰذا اُن سے وہ بات کہی جو تم نے قرآن میں سنی ہے اور اپنے بھائی کا سر پکڑا، ان کو اپنی طرف کھینچنے لگے اور وہ تختیاں ڈال دیں۔ پھر اپنے بھائی کا عذر قبول کیا اور اُن کے واسطے بخشش مانگی اور سامری کی طرف چلے تو اس سے فرمایا کہ تجھے کس چیز نے اس کام پر آمادہ کیا جو تو نے کیا؟ وہ بولا: میں نے رسول (جبریل علیہ السلام) کے پاؤں کے نیچے سے ایک مٹھی بھر لی تھی اور میں نے اس کو پہچان لیا اور تم پر مستور رہا۔ پھر میں نے وہی ڈال دی اور مجھ کو میرے نفس نے یہی سمجھایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: چل تجھ کو زندگی میں اتنا ہے کہ تو کہتا پھرے ''نہ چھیڑو مجھ کو'' اور تیرے لیے ایک وعدہ ہے، وہ تجھ سے خلاف نہ ہوگا اور دیکھ اپنے معبود کو جس پر تو سارے دن لگا بیٹھا تھا، ہم اس کو جلا دیں گے، پھر اس کو اُڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے اور اگر وہ معبود ہوتا تو کوئی اس کے ساتھ یہ نہ کر سکتا۔ اب بنی اسرائیل نے فتنے کا یقین کر لیا اور بچھڑے کے بارے میں جن لوگوں کی رائے ہارون علیہ السلام کی رائے کی طرح تھی، ان کو اچھا سمجھا گیا اور اُن پر رشک کیا گیا تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کے لیے کہا کہ اے موسیٰ! اپنے رب سے ہمارے لیے سوال کریں کہ ہمارے لیے توبہ کا دروازہ کھول دے کہ ہم توبہ کریں تو جو کچھ ہم نے کیا ہے اس کا ہم سے کفارہ کر دے۔

اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اس کام کے لیے اپنی قوم سے ستر آدمی پسند کیے، یہ لوگ بھلائی کرنے میں کمی نہیں کرتے تھے، بہترین بنی اسرائیل تھے اور اُن لوگوں کو پسند کیا، جو بچھڑے کے بارے میں سامری کے شریک نہیں ہوئے تھے۔ پھر اُن کو لے کر چلے، اُن کے لیے توبہ کا سوال کرتے تھے۔ لہٰذا زمین ان کو لیے ہوئے کانپ اُٹھی۔ اس پر اللہ کے نبی اپنی قوم اور اپنے وفد سے شرمائے، جبکہ اُن کے لیے کیا گیا جو کچھ کیا گیا۔ پھر کہا: اے اللہ! اگر تو اُن کو اور مجھ کو اس سے پہلے ہلاک کرنا چاہتا تو ہلاک کر ڈالتا اس فعل کی وجہ سے جس کو ہمارے بیوقوفوں نے کیا اور اُن لوگوں میں وہ شخص تھا جس کا دل بچھڑے کی محبت اور اس پر ایمان لانا پلایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر مطلع ہو چکا تھا، اسی لیے زمین اُن کو لے کر کانپی، اس پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الأعراف: ١٥٦۔ ١٥٧] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، چناں چہ جلد ہی میں اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیز گار ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے

ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔'' پس موسیٰ علیہ السلام بولے: اے رب! میں نے تو تجھ سے اپنی قوم کے لیے توبہ کا سوال کیا، پس تو نے یہ فرمایا کہ میں نے اپنی رحمت ایک قوم کے لیے لکھی ہے، جو میری قوم کے سوا ہے، تو نے مجھے کیوں نہ مؤخر کیا، یہاں تک کہ اس مرد کی اُمت مرحومہ میں مجھے نکالے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اُن کی توبہ یہ ہے کہ اُن میں ہر آدمی جس سے ملے، باپ ہو یا بیٹا ہو، اس کو تلوار سے قتل کر دے اور جو کوئی اس جگہ مارا جائے اس کی کچھ پروا نہ کرے اور جو لوگ کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر مخفی رہ گئے اور اللہ اُن کے گناہوں پر مطلع تھا تو انھوں نے توبہ کی، اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور اللہ نے اُن کو جو حکم دیا تھا، اسے بجا لائے اور اللہ پاک نے قاتل اور مقتول دونوں کی بخشش فرمائی۔

پھر موسیٰ علیہ السلام اُن کو لے کر ارضِ مقدس کی طرف متوجہ ہوئے اور غصہ دور ہونے کے بعد وہ تختیاں لے لیں، پھر ان کو ان وظائف کا حکم دیا جن کا انھیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اُن کو پہنچائیں تو وہ ان پر گراں ہوئے اور ان کا اقرار کرنے سے انکار کیا، پس اللہ نے اُن پر پہاڑ اُٹھایا، جیسے سائبان، اور وہ ان سے قریب ہوا، یہاں تک کہ ڈرے کہیں اُن پر گر پڑے، تب انھوں نے اپنے سیدھے ہاتھوں میں کتاب لی، اس حال میں کہ وہ جھکنے والے تھے، پہاڑ کی طرف دیکھتے جاتے تھے اور کتاب اُن کے سیدھے ہاتھوں میں تھی اور وہ پہاڑ سے پرے تھے، اس خوف سے کہ پہاڑ اُن پر گر جائے۔ پھر چل دیے، یہاں تک کہ ارضِ مقدسہ میں آئے تو ایک شہر پایا، اس میں ایک زبردست مخلوق تھی، اُن کی شکل وصورت نہایت خوفناک تھی، اُن کے میووں کی بڑائی کا ایک عجیب حال بیان کیا ہے تو بولے کہ اے موسیٰ! اس میں تو ایک بڑی زبردست قوم ہے، ہم کو اُن سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے اور ہم اس میں داخل نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اس میں ہیں۔ پھر اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو بے شک ہم داخل ہونے والے ہیں۔ ان لوگوں میں سے دو آدمیوں نے کہا جو ڈر رکھتے تھے۔ یزید سے کہا گیا تو نے اسی طرح پڑھا ہے؟ کہا: ہاں، ''مِنَ الْجَبَّارِیْنَ''، یعنی وہ دونوں جبارین میں سے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور اُن کی طرف نکلے، وہ بولے کہ ہم تو اپنی قوم کو خوب جانتے ہیں، اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ تم نے اُن کے جسم اور اُن کی گنتی دیکھی ہے، یعنی ان کے جسم بڑے بڑے ہیں اور گنتی بہت ہے تو اُن کے نہ دل ہیں اور نہ اُن کے پاس طاقت اور شان وشوکت ہے، یعنی وہ بزدل ہیں، گو جسم میں بڑے ہیں اور اُن کے پاس لڑنے کے لیے کوئی ہتھیار اور سامان نہیں ہے تو تم اُن پر دروازے سے داخل ہو۔ پھر جس وقت تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ وہ آدمی موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھے تو کہا کہ ''الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ'' بنی اسرائیل ہیں۔ وہ بولے: اے موسیٰ! ہم تو ہرگز کبھی اس میں داخل نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اس میں ہیں، لہٰذا تو جا اور تیرا رب، پھر تم لڑو، ہم تو اسی جگہ بیٹھے ہیں۔ اس پر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو خفا کر دیا

تو انھوں نے اُن پر بددعا کی اور اُن کا نام فاسقین رکھا۔ اس سے پہلے جس وقت انھوں نے ان سے معصیت اور بے ادبی دیکھی تھی تو ان پر بددعا نہ کی تھی، یہاں تک کہ وہ دن ہوا، اللہ پاک نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور اُن کا نام فاسقین رکھا، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فاسقین کہا اور زمینِ مقدس کو چالیس برس تک اُن پر حرام کر دیا کہ زمین میں حیران پھرتے رہیں، ہر دن صبح کو اٹھیں تو چلیں اُن کے لیے کوئی قرار نہ ہو۔

تیہ (جنگل) میں ان پر ابر کا سایہ کیا، من وسلویٰ ان پر نازل فرمایا، ان کے کپڑے ایسے کر دیے کہ نہ پرانے پڑیں نہ میلے کچیلے ہوں اور اُن کے درمیان میں ایک مربع پتھر رکھ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تو انھوں نے اپنے عصا سے اس کو مارا تو اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر کنارے میں تین چشمے، ہر سبط (قبیلے، خاندان) کو ان کا چشمہ بتا دیا، جس سے وہ پانی پییں۔ پھر وہ جس منزل سے کوچ کرتے تو اس پتھر کو اپنے درمیان اسی جگہ پر پاتے، جس میں وہ کل تھا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کیا ہے اور یہ بات میرے نزدیک سچی ہے، اس لیے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا تو اُن پر اس بات کا انکار کیا کہ جس شخص نے موسیٰ علیہ السلام پر قتل کرنے کے امر کو ظاہر کیا کہ جس کو انھوں نے مار ڈالا تھا، وہ شخص فرعونی ہو۔

پھر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ فرعونی کیونکر ظاہر کرے گا، حالانکہ اس کو نہ اس کا علم تھا اور نہ اس پر ظاہر ہوا تھا۔ وہ تو اسرائیلی ہے، جو اس پر حاضر تھا۔ اس پر عبداللہ بن عباس خفا ہوئے، پھر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور اُن کو سعد بن مالک زہری رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے تو ان سے کہا: اے ابو اسحاق! کیا تم یاد رکھتے ہو، جس دن ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ کے قتیل کی حدیث بیان کی تھی، جس کو انھوں نے آلِ فرعون میں سے مار ڈالا تھا، جس شخص نے اُن پر یہ راز افشا کیا تھا، وہ اسرائیلی ہے یا فرعونی؟ سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: جبکہ افشا کیا موسیٰ علیہ السلام پر فرعونی نے اس بات کو جو اسرائیلی سے سنی تھی، کون اسرائیلی جو اس وقت حاضر تھا۔ (هكذا رواه النسائي في السنن الكبرىٰ و أخرجه أبو جعفر بن جرير و ابن أبي حاتم في تفسيريهما كلهم من حديث يزيد بن هارون به وهو موقوف من كلام ابن عباس رضي الله عنهما وليس فيه مرفوع إلا قليل منه وكانه تلقاه ابن عباس رضي الله عنهما مما أبيح نقله من الإسرائيليات عن كعب الأحبار أو غيره والله أعلم وسمعت شيخنا الحافظ أبا الحجاج المزي يقول ذلك أيضاً)[1]

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦۔ ٤٠٥) تفسير الطبري (١٨/ ٣٠٥۔ ٣١٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٩٨۔ ٢٠٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (فتح الباري: ٦/ ٤٢٧)

لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

پھر تو اہلِ مدین میں کئی سال ٹھہرا رہا، پھر اے موسیٰ! تو تقدیرِ الٰہی کے مطابق (یہاں) آیا﴿40﴾ اور میں نے تجھے اپنی ذات کے لیے خاص طور پر بنایا﴿41﴾ تو اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر جاؤ اور تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا﴿42﴾ تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ، بلاشبہ وہ سرکش ہوگیا ہے﴿43﴾ چناں چہ تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا ڈرے﴿44﴾

موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اور انھیں تبلیغ کے لیے فرعون کے پاس جانے کا حکم:

اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ وہ فرعون اور اس کی جماعت سے بھاگ کر مدین والوں میں مقیم ہو کر ٹھہرے رہے، اپنے سسر کی بکریاں چرایا کیے۔ یہاں تک کہ وہ مدت پوری ہوئی اور اَجل گزر گئی۔ پھر اللہ پاک کی قدر اور ارادے کے مطابق بغیر میعاد وعدے کے آئے، حالانکہ سارا امر اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کے واسطے ہے اور وہی اپنے بندوں اور خلق کو چلانے والا ہے، جس چیز میں چاہتا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى﴾۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''علیٰ موعدۃ''. امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''علی قدر الرسالۃ والنبوۃ'' یعنی تو آیا وعدے پر یا اندازۂ رسالت و نبوت پر۔

﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ میں نے تجھ کو منتخب و برگزیدہ کیا، چن لیا، پسند کیا، خاص بنایا رسول اپنے واسطے، یعنی جیسا میں ارادہ کرتا ہوں، چاہتا ہوں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام ملے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تو وہی ہے کہ تو نے لوگوں کو مشقت میں ڈالا اور اُن کو جنت سے نکالا تو آدم علیہ السلام نے کہا: تو وہی ہے کہ تجھ کو برگزیدہ کیا اللہ نے اپنی رسالت سے اور تجھ کو پسند کیا اپنے واسطے اور تجھ پر تورات نازل کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا: پھر تو نے اس کو لکھا ہوا پایا مجھ پر پہلے اس سے کہ وہ مجھے پیدا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں، پھر غالب آئے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر۔[1] (أخرجاه)

آیات سے مراد حجج، براہین اور معجزات ہیں۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿لَا تَنِيَا﴾ کے معنی ہیں ''لَا تَبْطِئَا'' یعنی دیر مت کرنا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے ان سے یوں روایت کیا ہے کہ ''لَا تَضْعُفَا'' یعنی کمزور مت ہونا۔[2] مراد یہ ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم دیا کہ اللہ کے ذکر میں

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٢)

(2) تفسير الطبري (١٨/ ٣١٢_ ٣١٣)

سستی نہ کریں، بلکہ فرعون کے ساتھ آمنا سامنا ہونے میں اللہ پاک کو یاد کرتے رہیں، تاکہ اللہ پاک کا ذکر اُن کے لیے اعانت و مدد وقوت ہو جائے فرعون پر اور ایک سلطان وغلبہ اس کا توڑنے والا بن جائے، جس طرح کہ حدیث شریف میں مروی ہے: «إِنَّ عَبْدِيْ كُلَّ عَبْدِيَ الَّذِيْ يَذْكُرُنِيْ وَهُوَ مُنَاجِزٌ قِرْنَهُ»[1] یعنی میرا پورا بندہ وہی ہے، جو اس حال میں میری یاد کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمن سے جنگ اور مقابلہ کرنے والا ہے۔ ﴿ طَغٰى ﴾ سے مراد ہے: ''تمرد وعتى و تجبر على الله و عصاه'' یعنی فرعون نے سرکشی وتجبر وتکبر کیا ہے اللہ پر اور اس کی نافرمانی کی ہے۔

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ میں ایک بڑی نصیحت ہے، وہ یہ کہ فرعون تو انتہائی عتو اور سرکشی اور تکبر میں تھا اور موسیٰ علیہ السلام اس وقت میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور خالص اور خاص اور اللہ کی مخلوق سے چنے ہوئے تھے، اس کے باوجود ان کو حکم ہوا کہ فرعون سے ملاطفت اور نرمی سے خطاب کریں، جس طرح کہ یزید رقاشی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''يا من يتحبب إلى من يعاديه فكيف بمن يتولاه ويناديه'' یعنی اے وہ ذات کہ بتکلف دوست ہوتا ہے اس شخص کی طرف جو اس سے دشمنی رکھتا ہے، پھر کیوں کر اس شخص کا دوست نہ ہوگا، جو اس سے دوستی رکھتا ہے اور اس کو پکارتا ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ تم دونوں اس سے یوں کہو کہ جتنا میں عفو اور مغفرت کی طرف قریب تر ہوں اتنا غضب اور سزا کی طرف نہیں ہوں، یعنی اس کا رحم وکرم اس کے غضب وقہر پر غالب ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''قول لَيِّنْ'' سے مراد لا الٰہ الا اللہ ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تم اس کی طرف عذر کرو، اس سے کہو کہ تیرے لیے ایک رب ہے اور تیرے واسطے معاد اور تیرے آگے جنت و نار ہے۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''قول لَيِّنْ'' سے یہ مراد ہے کہ تو اس کو کنیت کہہ کر پکارنا، اسی طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ تو اس کو ابو مرہ کنیت سے پکارنا۔[2]

ان سب حضرات کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا فرعون سے سامنا نرم اور سہل کلام کے ساتھ اور رفق اور نرمی کے ساتھ ہو، تاکہ نفوس میں زیادہ موثر وانجع ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل: ١٢٥] ''(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ شاید وہ جس ضلال وگمراہی وہلاکت میں ہے، اس سے رجوع کرے۔ ﴿ اَوْ يَخْشٰى ﴾ یعنی اس شخص کی طرح اطاعت کرے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے، پس ''تَذَكَّر'' تو اس چیز سے رجوع کرنا ہے، جس سے ڈرایا جائے اور خوف دلایا جائے اور خشیتِ طاعت کا حاصل کرنا

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٨٠) اس کی سند میں ''عفير بن معدان'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة: ٣١٣٥)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٦) الدر المنثور (٥/ ٥٨٠)

ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اے موسیٰ! تم اور تمھارے بھائی یوں مت کہنا کہ تو اس کو ہلاک کر دے، اس سے قبل کہ میں اس کی طرف عذر کروں، یعنی قطع عذر سے پہلے اس کے لیے بددعا مت کرنا۔ اس جگہ زید بن عمرو بن نفیل کے یہ شعر ذکر کیے جاتے ہیں۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے جو ذکر کیا ہے، اس میں یوں ہے کہ یہ شعر اُمیہ بن ابی الصلت کے ہیں۔ ؎

وأنت الذي من فضل مَنّ و رحمة — بعثت إلى موسى رسولا مناديا
فقلت له فاذهب و هارون فادعوا — إلى الله فرعون الذي كان باغيا
وقولا له أأنت سويت هذه — بلا وتد حتى أستقلت كما هيا
وقولا له أأنت رفعت هذه — بلا عمد ارفق إذن بك بانيا
وقولا له أأنت سويت وسطها — منيرا إذا ما جنه الليل هاديا
وقولا له من يخرج الشمس بكرة — فيصبح ما مست من الارض ضاحيا
وقولا له من ينبت الحب في الثرىٰ — فيصبح منه البقل يهتز رابيا
ويخرج منه حبه في رؤوسه — ففي ذاك آيات لمن كان واعيا[1]

(كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ساتواں احسان یہ ہے: ﴿ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ﴾۔ یہاں ایک عبارت محذوف ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلام کی تقدیر یہ ہے کہ ہم نے تجھ کو جانچا، ذرا جانچنا۔ پھر تو مدین والوں کی طرف نکلا، پھر تو اُن کے پاس کئی برس ٹھہرا، ایسا حذف قرآن شریف میں بہت ہے اور اسی طرح کلامِ عرب میں بھی ہے، کیونکہ وہ بہت سے کلام کو حذف کر دیا کرتے ہیں، جبکہ معنی معروف و معلوم ہوتے ہیں۔[2]

مدین شعیب علیہ السلام کے شہر کا نام ہے، مصر سے آٹھ منزل پر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف بھاگ گئے، وہاں بیس برس ٹھہرے رہے۔ اتم الاجلین یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شعیب علیہ السلام کے پاس اٹھائیس برس اقامت کی، اُن میں سے دس برس تو ان کی بیوی کے، جو شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھی، مہر کے ہوئے، باقی اَٹھارہ برس مدین میں شعیب علیہ السلام کے پاس رہے، یہاں تک کہ اُن کی اولاد ہوئی۔ مصر سے جس وقت نکلے تو بارہ برس کی عمر تھی، جبکہ قبطی کو قتل کیا۔ محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدین میں دس برس ٹھہرے، اس کے بعد کہ وہاں مصر سے آئے اور شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔[3] امام حفناوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو راجح کیا ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٧) [2] فتح القدير (٣/ ٥٠٢) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٠٨)

﴿ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ ﴾ کلمہ ﴿ ثُمَّ ﴾ جو تراخی اور دیر کے معنی میں آتا ہے۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا آنا بعد مدت کے ہوا۔ دیر کا سبب یہ ہے کہ راہ بھول گئے۔ بکریاں متفرق ہوگئیں اور اسی طرح کے اور امور پیش آئے۔ ﴿ عَلٰى قَدَرٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تو ایسے وقت میں آیا جو میرے قضا و علم اور قدر میں سابق ہو چکا تھا کہ میں تجھ سے باتیں کروں اور تجھ کو نبی بناؤں۔ یا یہ معنی ہیں کہ زمانے اور عمر کے اس مقررہ وقت پر آیا جس میں نبیوں پر وحی آتی ہے۔ یہ قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] وہ وقت چالیس برس کی عمر کا ہے۔ کلمہ ﴿ عَلٰى ﴾ بمعنی "مع" ہے: "أي مع زمن مقدر لإرسالك في علمي" یعنی تو اس عمر کو آیا جو تیرے بھیجنے کے لیے میرے علم میں ٹھہر چکا تھا، یا یہ معنی ہیں کہ تو اس وعدے پر آیا جس کو تو پہچان چکا تھا۔ اس لیے کہ شعیب علیہ السلام نے تجھ کو اس کی خبر دی تھی۔ یہ قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ کسی شاعر نے کہا:

نال الخلافة إذا كانت له قدرا   كما أتى ربه موسى على قدر[2]

﴿ عَلٰى قَدَرٍ ﴾ اس بنا پر محذوف سے متعلق ہے کہ فاعل ﴿ جِئْتَ ﴾ سے حال ہے۔ "أي جئت موافقا لقدرك" امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اسی طرح تقدیر کی ہے۔ یہ تفسیر تو براہِ معنی ہے اور تفسیر صناعی یہ ہے کہ "مستقرا أو كائنا على مقدار معين". ﴿ يٰمُوْسٰى ﴾ جو فرمایا تو اس میں موسیٰ علیہ السلام کی عزت افزائی اور عظمت ہے اور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ وہ حکایت پوری ہوئی، جو ﴿ مَرَّةً اُخْرٰى ﴾ کی تفصیل تھی۔ یہ ﴿ مَرَّةً اُخْرٰى ﴾ اس سے پہلے واقع ہو چکا ہے، جس کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ ﴿ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴾ میں دو باتیں ہیں: ایک تو یاد دلانا ہے اس قول کا "وإذا اخترتك"، دوسری یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے کی تمہید ہے، بھائی کی تائید کے ساتھ۔ یہ قول امام ابو السعود رحمہ اللہ کا ہے۔[3]

اصطناع، اتخاذِ صنعت کو کہتے ہیں۔ صنعت وہ خیر اور نیکی ہے جو تو کسی آدمی کی طرف پہنچائے۔ معنی یہ ہیں کہ میں نے تجھ کو اپنی رحمت اور رسالت کے واسطے بنایا، تاکہ تو میرے ارادے کے تحت رہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تاویل اس کی یہ ہے کہ میں نے تجھ کو اپنی حجت قائم کرنے کے لیے اختیار کیا اور میں نے تجھ کو اپنے اور اپنی خلق کے درمیان کیا اور میری طرف سے رسالت پہنچانے کے سبب سے تو اس درجے پر ہوگا جس میں میں ہوتا، اگر میں اُن سے خطاب کرتا اور اُن پر حجت پکڑتا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے جو کرامتِ عظمیٰ اُن کو عطا فرمائی تھی، اس کی تمثیل اس طرح دی ہے جس طرح کوئی بادشاہ اپنے بعض خواص کو قریب کرتا ہے۔

امام قفال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِصْطَنَعْتُكَ ﴾ کی اصل عرب کے اس قول سے ہے کہ "اصطنع فلان

[1] تفسير القرطبي (١١/ ١٩٨)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٣١١)
[3] تفسير أبي السعود (٦/ ١٦-١٧)
[4] معاني القرآن (٣/ ٣٦٥)

فلانا" یہ اس وقت بولتے ہیں کہ فلاں فلاں پر احسان کرے، اس کو خیر و نیکی پہنچائے، یہاں تک کہ جس پر احسان کیا ہے، وہ احسان کرنے والے کی طرف نسبت کیا جائے۔ پھر یوں کہا جائے کہ "هذا صنيع فلان" یعنی یہ شخص فلاں کا احسان کیا ہوا ہے۔[1] ﴿ لِنَفْسِیْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ میں نے تجھ کو بنایا، اختیار کیا، اس لیے کہ میں تجھ کو اپنے اوامر و احکام میں گردش دوں کہ تو اس کام کے سوا جس کا میں نے تجھ کو حکم دیا ہے کسی اور کام میں مشغول نہ ہو۔ وہ یہی کام ہے کہ میری حجت کو قائم کرے، میری رسالت کو پہنچائے اور اپنے حرکات و سکنات میرے ہی لیے ہو نہ اپنے نفس کے لیے نہ اپنے غیر کے لیے۔ حاصل یہ کہ میرا ہی ہو رہے۔ میرے ہی کاروبار میں مصروف ہو۔

میرے حکم کی بجا آوری کے سوا اور کوئی ذکر و فکر نہ ہو۔ پھر جو امر اصطناع و اختیار سے مقصود تھا اس کو جملۂ مستأنفہ سے بیان فرمایا کہ ﴿ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ ﴾ یعنی جبکہ میں نے تجھ کو اپنے واسطے بنایا تو اب تو میرے معجزات لے کر جا جن کو میں نے تیرے لیے نشانی ٹھہرایا ہے اور چاہیے کہ تیری درخواست کے مطابق تیرا بھائی جائے۔ چونکہ ہارون علیہ السلام اس وقت حاضر نہ تھے، اس لیے ﴿ اَخُوْكَ ﴾ کے لیے امرِ غائب کی ضرورت ہوئی۔

آیات سے مراد فقط یدِ بیضاء اور عصا ہے۔ اکثر مفسرین اسی قول پر ہیں۔ جلال محلی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مراد نو مشہور معجزے ہیں۔[2] یہ قول غور طلب ہے، کیونکہ اس خطاب میں اور اس مجلس میں اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کے واسطے یدِ بیضاء اور عصا یہی دو نشانیاں بیان فرمائی تھیں۔ ان کے سوا نو میں سے باقی نشانیاں بیان نہیں کیں، پھر اُن سے کیوں کر فرمائے گا کہ تو میری نو نشانیاں لے کر جا۔ اگرچہ اس کا جواب یوں ہو سکتا ہے کہ نو میں سے بعض تو حاصل ہو گئیں، یعنی یدِ بیضاء و عصا اور بعض آیندہ حاصل ہو جائیں گی، لیکن اس میں پھر اتنی بات ہے کہ جو نشانیاں اس مجلس میں حاصل نہیں ہوئیں، ان کو موسیٰ علیہ السلام یہ کہنے کے وقت: ﴿ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ ﴾ جانتے پہچانتے نہ تھے۔

اسی لیے اکثر مفسرین نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے، مگر اس قول میں یہ بات ہے کہ آیات تو جمع ہے اور یدِ بیضاء و عصا دو ہیں۔ لہٰذا یہ یوں ٹھیک ہو سکتا ہے کہ ادنیٰ جمع کا دو ہیں تو جمع درست ہوگئی یا وہ تاویل ہے جو ابو السعود رحمہ اللہ نے بیان کی ہے کہ یدِ بیضاء و عصا اگرچہ دو نشانیاں ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک میں کئی کئی نشانیاں ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک کے اس قول میں ہے: ﴿ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ [آل عمران: ٩٧] "اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقامِ ابراہیم ہے۔" کیونکہ لاٹھی کا ایک جاندار چیز بن جانا ایک نشانی ہے اور اس کا بہت بڑا اژدہا بن جانا، ایک اور آیت ہے اور اس کی سرعت اور حرکت باوجود بڑا جسم ہونے کے ایک اور نشانی ہے، اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کے لیے اس کا ایسا مسخر ہو جانا کہ وہ اپنے ہاتھ کو اس کے منہ میں ڈالتے تو اُن کو کوئی ضرر نہ پہنچاتا اور آیت

[1] روح المعاني (١٦/ ١٩٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٠٩)

ہے۔ پھر اس کا لاٹھی ہو جانا ایک اور نشانی ہے، اسی طرح یدِ بیضاء کا حال ہے۔ اس کی سفیدی فی نفسہٖ ایک آیت ہے اور اس کی شعاع ایک اور نشانی۔[1] پھر اس کا پہلی حالت پر ہو جانا ایک اور نشانی۔

رہا حرفِ با، پس وہ مصاحبت کے واسطے ہے، یعنی احکامِ رسالت کے جاری کرنے میں اور امرِ دعوت کے کامل کرنے میں ان آیتوں کو لیے ہوئے، ان سے تمسک کرتے ہوئے جاؤ، متعدی بنانے کے لیے نہیں ہے کہ یہ معنی ہوں کہ تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کو لے کر جاؤ، کیونکہ صرف ان کا جانا اور نشانیوں کا فرعون کو پہنچا دینا مراد نہیں ہے۔

﴿ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴾ "ونی" سستی و ماندگی کو کہتے ہیں، جب کوئی شخص ضعیف و کمزور وسست و ماندہ ہو جاتا ہے تو عرب کی بول چال میں بولتے ہیں، "ونى يني ونيا" کو "وَعَدَ يَعِدُ وَعَدًا" یعنی وہ ضعیف وسست ہو گیا، تھک گیا اور جب کوئی شخص کسی کام کے ضبط و حفاظت کی طرف مبادرت و جلدی نہیں کرتا نہ اس کا اہتمام کرتا ہے تو یوں بولتے ہیں: "توانىٰ في الأمر توانيا فهو متوان" یعنی اس نے اس کام کا اہتمام نہ کیا نہ وہ اس کا اہتمام کرنے والا ہے نہ اس کی پروا رکھنے والا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "في ذكري وعن ذكري" دونوں برابر ہیں،[2] یعنی ایک کی جگہ دوسرا آتا ہے۔ شاید ﴿ فِيْ ﴾ بمعنی "عن" ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں نے جو تم پر احسان اور انعام کیا ہے، اس کا ذکر کرنے سے قاصر مت ہونا۔ جس شخص نے نعمت کا ذکر کیا تو اس کا شکر کیا، یا یہ معنی ہیں کہ میری تسبیح وغیرہ میں سستی مت کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ میری رسالت میں دیر مت لگانا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "لا تهنا في ذكري"[3] ہے۔ وہن کہتے ہیں ہے کہ ضعف وسستی کو، معنی مثل اول کے ہیں، صرف لفظ کا فرق ہے۔

﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ ﴾ میں موسیٰ و ہارون علیہما السلام دونوں کو جانے کا حکم دیا، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام تو حاضر تھے اور ہارون علیہ السلام غائب، بلکہ وہ تو اس وقت مصر میں تھے۔ لہٰذا یہ تغلیباً ہے، یعنی حاضر کو غائب پر غلبہ دے کر غائب کو بھی مخاطب بہ خطاب حاضر فرمایا، اس لیے کہ ادائے رسالت میں اصل موسیٰ علیہ السلام ہی تھے۔ یہی حال صیغۂ نہی مذکور میں بھی ہے۔ اب ایک اور بات رہی اور وہ یہ ہے کہ ﴿ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ ﴾ میں جس شخص کی طرف اُن کو بھیجا ہے، اس کا ذکر نہ کیا اور ﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ ﴾ میں اس کا ذکر فرمایا، لہٰذا اس کی دو وجہیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اختصار کے لیے ایسا کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اول تو اُن کو عام لوگوں کی طرف جانے کا حکم دیا، یعنی فرعون وقوم فرعون و بنی اسرائیل۔ پھر دوبارہ خاص فرعون کی طرف جانے کا حکم فرمایا۔ اس وجہ میں بُعد ہے، بلکہ دونوں امر ایک ہی شے کی طرف متوجہ ہیں، یعنی فرعون۔ جانے کے ہر ایک حکم سے وہ شے حذف کی، جس کو دوسرے جانے کے حکم کو ثابت رکھا ہے، یعنی اول ذہاب میں تو جس شخص کی طرف بھیجا ہے اس کا ذکر نہ کیا اور دوسرے ذہاب میں اس کو ثابت رکھا اور جس شے کے ساتھ بھیجا ہے، یعنی آیات، اس کو اول میں ثابت رکھا۔ دوسرے میں حذف کر دیا۔

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ١٧) [2] فتح القدير (٣/ ٥٠٣) [3] تفسير القرطبي (١١/ ١٩٩)

غرضیکہ پھر اللہ پاک نے جانے کی علت یہ بیان فرمائی کہ ﴿ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾ یعنی تم فرعون کے پاس اس لیے جاؤ کہ وہ کفر اور سرکشی میں یہاں تک حد سے بڑھ گیا ہے کہ رب ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ پھر اُن کو نرم بات کرنے کا حکم فرمایا۔ اس لیے کہ نرم بات کرنا موثر ہوتا ہے بات کے قبول کرنے میں، کیوں کہ پہلے پہل درشتی وسختی کرنا نفرت کا اور کفر میں زیادہ پختگی کا بہت بڑا سبب ہوتا ہے، یعنی جو اسباب آدمی کے بدکنے، بھڑکنے، کفر میں پختہ ہونے کے ہیں، ان میں سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ شروع میں سخت بات کہی جائے۔ اسی لیے اللہ پاک نے اُن کو یہ تعلیم دی کہ ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ یعنی تم اس کی مدارات کرو اس سے لطافت، رفق اور نرمی سے پیش آؤ۔ کفر سے رجوع کرنے میں جو گفتگو کرو، اس میں درشتی اور سختی کا برتاؤ مت کرو۔ قول لین وہی ہے جس میں کسی طرح کی سختی نہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سختی ترک کریں، جس طرح کہ انھوں نے فرعون سے یوں کہا: ﴿ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۝۱۸ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴾ [النازعات: ١٨۔ ١٩] ”پھر (اسے) کہو: کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے؟ اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہنمائی کروں کہ تو ڈر جائے۔“

کیونکہ یہ عرض اور مشورے کی صورت میں دعوت ہے، یعنی حقیقت میں تو یہ دعوت ہے، لیکن عرضداشت اور مشورے کے پیرائے میں اسے ادا کیا ہے، تاکہ اس پر گراں نہ گزرے اور وہ قبول کر لے، مان جائے، یعنی کیا تجھے یہ حاجت ہے کہ تو پاک ہو جائے سنور جائے۔ میں تجھے تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں کہ تو اس سے ڈرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ”قول لَيِّن“ سے مراد فرعون کی کنیت ہے، یعنی تم اس سے کہو: اے ابو الولید! یا ابو العباس! یا ابو مرہ!۔ کسی نے کہا یہ مراد ہے کہ وہ اس کو دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا وعدہ دیں، اگر وہ مان جائے یا اس کو وعدہ دیں، ایسی جوانی کا کہ جس کے بعد بوڑھا نہ ہو اور ایسے ملک کا کہ زائل نہ ہو، مگر موت سے۔[1] (كذا قاله البيضاوي)

پھر جو اللہ پاک نے فرعون سے نرم بات کرنے کا حکم فرمایا، اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿ لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ یعنی تم اس سے نرم بات کرو، اس لیے کہ شاید وہ سوچے یا ڈرے۔ ”لَعَلَّ“ میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں ”تَرَجِّيْ“. ”تَرَجِّيْ“ امید رکھنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ اپنے معنی پر ہے، یعنی تم گفتگو کرنے کا نرم انداز اختیار کرو، اس شخص کی طرح جو رجاء وطمع و اُمید رکھتا ہو۔ پس رجا راجع ہے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی طرف، جیسا کہ نحویین کی ایک جماعت سیبویہ وغیرہ نے کہا ہے۔ اس کی تحقیق کئی جگہ گزر چکی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”لَعَلَّ“ طمع و ترجی کا لفظ ہے۔[2] لہٰذا ایسی شے کے ساتھ اُن کو مخاطب کیا ہے جس کو وہ سمجھتے بوجھتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم تو فرعون کے ایمان میں رجاء وطمع و اُمید رکھتے ہوئے جاؤ۔ اللہ پاک کے حق میں رجا و طمع درست نہیں، کیوں کہ وہ تو انجام کار کو خوب جانتا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ ہر ”لَعَلَّ“ و ”عَسٰى“ جو قرآن شریف میں وارد ہوا

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٥٢) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٥٧)

ہے، پس وہ اللہ پاک کی طرف سے واجب ہے، یعنی اللہ پاک کے حق میں اس کے معنی کا باقی رہنا محال ہے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ بمعنی "کَیْ" ہے تو علّیت کا فائدہ دے گا، یہ قول امام فراء کا ہے۔[1] یعنی تم اس سے نرم بات کرو، تا کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بمعنی استفہام ہے، معنی یہ ہیں: تم دیکھو، آیا وہ نصیحت حاصل کرتا ہے، ڈرتا ہے۔ یہ قول ساقط ہے اس لیے کہ اللہ پاک کے حق میں استفہام محال ہے، جس طرح کہ ترجی محال ہے۔ پھر جب تاویل کرنا ضروری ٹھہرا تو لفظ کو اس کے مدلول پر باقی رکھنا، اس سے اولیٰ ہے کہ اس کو اپنے مدلول سے نکالیں۔ "تَذَکَّر" یہ ہے کہ وعظ و نصیحت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اس کو پہنچائی، اس میں خوب غور و فکر کرے، یہاں تک کہ یہ دعوت قبول کرنے کا سبب ہو جائے۔ خشیت یہ ہے کہ اللہ کا عذاب جو اُن کی زبان پر وعدہ دیا گیا ہے اس سے ڈر۔ کلمہ "أَوْ" "منع خلو" کے واسطے ہے نہ کہ جمع کے لیے، جب یہ بات ٹھہری کہ اللہ پاک کو معلوم تھا کہ وہ ایمان نہ لائے گا تو پھر موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بھیجنا اور اُن کو مبالغہ اور تاکید کرنا کہ تم اس کو خوب سمجھائیو، اس کی وجہ کیا ہے؟ پس اس کی تین وجوہات ہیں: ایک الزامِ حجت، دوسرا قطعِ معذرت اور تیسرا معجزات کا ظاہر کرنا، جو اس کے درمیان میں واقع ہوئے۔[2]

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾

ان دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! بے شک ہم تو ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا سرکشی کرے (45) اس (اللہ) نے فرمایا: تم دونوں مت ڈرو، بلاشبہہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں (46) لہٰذا تم دونوں اس کے پاس جاؤ اور کہو: بے شک ہم تیرے رب کے رسول ہیں، چناں چہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج اور انھیں مت ستا، یقیناً ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشانی لائے ہیں، اور جو ہدایت کی اتباع کرے اس پر سلامتی ہے (47) بلاشبہہ ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ یقیناً اس پر عذاب ہے جو (حق کی) تکذیب کرے اور پھر جائے (48)

[1] روح المعاني (١٦/ ١٩٥) [2] فتح البيان (٨/ ٢٣٢_ ٢٣٦)

موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا فرعون سے خوف اور اللہ تعالیٰ کا ان کو ثابت قدم رکھنا:

اللہ پاک موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہتے، اس سے شکوہ کرتے ہوئے بولے کہ ﴿ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴾ یعنی وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ فرعون اُن کی طرف سزا دینے میں جلدی کرے یا اُن پر زیادتی کرے، پھر اُن پر عقاب کرے اور وہ اس سے اس عذاب اور عقاب کے مستحق نہ ہوں۔

عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَفْرُطَ ﴾ کے معنی "يعجل" (جلدی کرے) ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يَبْسُطَ"، یعنی وہ ہم پر جلدی کرے یا ہم کو مارے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ يَطْغٰى ﴾ کے معنی "يعتدي"، یعنی ظلم کرے، ہیں۔[1] اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ یعنی تم اس سے مت ڈرو، کیوں کہ میں تمھارے ساتھ ہوں تمھارا اور اس کا کلام سنتا ہوں اور تمھاری جگہ اور اس کی جگہ کو دیکھتا ہوں، تمھارے کام میں سے مجھ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اور یہ بات جان رکھو کہ اس کی چوٹی میرے ہاتھ میں ہے، لہٰذا وہ نہ بولتا ہے، نہ سانس لیتا ہے، نہ حملہ کرتا ہے مگر میرے اذن سے اور میرے حکم کے بعد اور میں اپنی حفاظت اور مدد اور تائید کے ساتھ تمھارے ساتھ ہوں۔ امام ابن ابی حاتم نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو کہا: اے رب! میں کیا چیز کہوں، فرمایا: کہہ "هيا شرا هيا" امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا: (تفسیر فتح البیان میں اس جگہ بجائے اعمش کے اعشی واقع ہوا ہے)[2] اس کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ میں زندہ ہوں قبل ہر شے کے اور زندہ ہوں بعد ہر شے کے۔[3] (إسناده جيد و شيء غريب)

﴿ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ﴾ حدیث الفتون میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے دروازے پر ایک مدت ٹھہرے رہے، ان کو اذن نہیں ہوتا تھا، پھر شدید کوشش کے بعد اُن کو اِذن ملا۔[4] محمد بن اسحق بن یسار رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام نکلے تو فرعون کے دروازے پر ٹھہرے، اس سے اذن کرتے اور کہتے تھے کہ ہم دونوں رب العالمین کے بھیجے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تم اس مرد کو ہماری خبر دو، جو بات مجھے پہنچی ہے، اس میں یوں ہے کہ پھر وہ دو برس ٹھہرے رہے، صبح و شام جاتے تھے، فرعون کو اُن کی خبر نہ ہوتی تھی، نہ کوئی اس بات پر جرأت کرتا تھا کہ اس کو اُن کے بارے میں خبر دے، یہاں تک کہ فرعون پر اس کا بطال داخل ہوا۔ یہ ایک مسخرا تھا، اس سے ملاعبت و بازی گری کرتا، اس کو ہنساتا تھا تو اس نے فرعون سے کہا: اے بادشاہ

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٣١٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٧) (2) فتح البيان (٨/ ٢٣٧)
(3) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٧) (4) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦)

تیرے دروازے پر ایک آدمی ہے، وہ ایک عجیب بات کہتا ہے، وہ یہ زعم کرتا ہے کہ تیرے سوا اس کا ایک معبود ہے، جس نے اس کو تیری طرف بھیجا ہے۔ فرعون بولا: میرے دروازے پر؟ اس نے کہا: ہاں، کہا: اس کو اندر لاؤ۔ پھر موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام اور اُن کے ہاتھ میں اُن کا عصا تھا، پھر جس وقت فرعون کے پاس آ کھڑے ہوئے تو کہا: ﴿ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٠٤] یعنی میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں، پس فرعون نے ان کو پہچان لیا۔

امام سدی رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام بلادِ مصر میں تشریف لائے تو اپنی ماں اور بھائی کے مہمان ہوئے اور وہ اُن کو پہچانتے نہ تھے، اس رات اُن کا کھانا طفشیل، یعنی لِفت تھا۔ لِفت شلغم کو کہتے ہیں۔ پھر ماں بھائی نے ان کو پہچان لیا اور اُن کو سلام کیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے بھائی سے کہا: اے ہارون! میرے رب نے تو مجھے اس بات کا حکم کیا ہے کہ میں اس مرد کے پاس آؤں، یعنی فرعون۔ لہٰذا میں اسے اللہ کی طرف بلاؤں اور تجھے یہ حکم دیا ہے کہ تو میری معاونت کرے۔ ہارون علیہ السلام بولے تو کر جو تیرے رب نے حکم دیا ہے۔ پھر دونوں چلے اور یہ اُن کا جانا رات کو تھا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے محل کے دروازے کو اپنے عصا سے مارا تو فرعون نے سن لیا، اس پر خفا ہوا اور بولا کہ اس سخت کام پر کون جرأت کرتا ہے تو اس کے خادموں اور دربانوں نے اسے خبر دی کہ یہاں ایک دیوانہ آدمی ہے، جو کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ اس پر کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ، پھر جس وقت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اس کے روبرو کھڑے ہوئے تو انھوں نے اس سے وہ بات کہی[1] جس کا ذکر اللہ پاک نے اپنی کتاب میں کیا ہے: ﴿ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ یعنی ہم تیرے پاس ایک دلالت اور معجزہ لائے ہیں، تیرے رب کی طرف سے۔ ﴿ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴾ یعنی سلامتی ہو تیری اگر تو ہدایت کی بات مان جائے۔

اسی لیے جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل عظیم روم کی طرف خط تحریر کیا تو اس کی ابتدا یہ تھی: « بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ وَسَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى أَمَّا بَعْدُ! فَأَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ »[2] یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہرقل عظیم روم کی طرف سلامتی ہو اس کو جو مانے ہدایت کی بات۔ اما بعد! تو مسلمان ہو جا، سلامت رہے گا، اللہ تعالیٰ تجھ کو دوہرا اَجر دے گا، یعنی ایک اَجر تو اس کا کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا۔ دوسرا اجر اس کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

اسی طرح جب مسیلمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھا، جس کی صورت یہ ہے کہ "من مسيلمة رسول الله إلى محمد رسول الله سلام عليك أما بعد! فإني قد أشركتك في الأمر فلك المدر ولي الوبر ولكن قريش قوم يعتدون"، "مسیلمہ اللہ کے رسول کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سلامتی ہو تم پر، اما بعد مقرر

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٧۔ ٢٠٨)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٣)

میں نے تم کو حکومت میں شریک کیا، لہٰذا قریوں اور شہروں کی حکومت تمھارے لیے ہے اور بوادی کی حکومت میرے لیے ہے، لیکن قریش ایک قوم ہے کہ ظلم کرتے ہیں۔'' تو نبی اکرم ﷺ نے اس کے جواب میں اس کو یہ خط لکھا: ﴿ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى مُسَيْلَمَةَ الْكَذَّابِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾[1] ''محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جھوٹے مسیلمہ کی طرف، سلامتی ہے اس کی جو مانے ہدایت کی بات، اما بعد! بے شک زمین اللہ کی مِلک ہے، وہ وارث کرتا ہے اس کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور عاقبت کی خوبیاں پرہیز گاروں کے واسطے ہیں۔''

اسی لیے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون سے یوں فرمایا: ﴿ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ إِنَّا قَدْ أُوْحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾ یعنی جن باتوں کی اللہ پاک نے ہماری طرف وحی معصوم و محفوظ کی ہے، ان میں ہم کو اس بات کی خبر دی ہے کہ عذابِ خالص اس شخص کے لیے ہے جو اللہ پاک کی نشانیوں کو جھٹلاتا ہے اور اس کی اطاعت سے منہ پھیرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَأَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴾ [النازعات: ٣٧۔ ٣٩] ''لیکن پھر جس نے سرکشی کی۔ اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ تو بے شک دوزخ ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝ لَا يَصْلٰهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾ [اللیل: ١٤۔ ١٦] ''بالآخر میں نے تمھیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے۔ اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہوگا۔ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾ [القیامۃ: ٣١۔ ٣٢] ''نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ اس نے (حق کو) جھٹلایا اور منہ موڑا۔''[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ ﴿ قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ ﴾ موسیٰ و ہارون علیہما السلام دونوں کی طرف قول کی نسبت کے باوجود اس کے حقیقت میں کہنے والے موسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، یہ براہِ تغلیب یہ بات بتانے کے لیے کیا کہ ہر قول و فعل میں اصل وہی ہیں۔ یا ہارون علیہ السلام نے یہ بات کہی اس کے بعد کہ دونوں کی ملاقات ہوئی اور اللہ پاک نے آیت کے نزول کے وقت اس بات کو موسیٰ علیہ السلام کے قول کے ہمراہ نقل فرمایا، جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ [المؤمنون: ٥١] ''(فرمایا:) اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ۔'' کیونکہ یہ خطاب جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے، اس کے باوجود کہ مخاطبین میں سے ہر ایک کو بطریق انفراد علاحدہ علاحدہ خطاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٦/ ٤)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٨)

یہ امر ضروری ہے کہ اُن سب کا حقیقت میں جمع ہونا محال ہے تو پھر خطاب میں اُن کا اجتماع کیونکر ہوسکتا ہے، غرضیکہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے کہا: اے ہمارے رب! ہم ڈرتے ہیں، ﴿ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ ﴾ یعنی اس بات سے کہ وہ ہم پر عذاب کرنے میں عجلت اور جلد بازی کرے۔ جمہور نے اس کو را کی زبر یا پیش کے ساتھ پڑھا ہے، معنی مذکور اسی کی بنیاد پر ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "فرط منه أمر، أي بدر" یعنی فلاں سے کوئی کام جلد ہو پڑا۔ بدور کے معنی: شتافتن سوی چیزے ہیں، یعنی کسی شے کی طرف دوڑ پڑنا۔ اسی معنی سے فارط ہے۔ فارط وہ ہے جو قوم سے آگے بڑھتا ہے پانی کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم کو عذاب کرے مثل عذاب گناہ میں پیش دستی کرنے والے کے۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابن محیصن رحمہ اللہ نے یا کی پیش اور را کی زبر کے ساتھ بطورِ صیغہ مجہول پڑھا ہے۔ یعنی کوئی چیز اس کو ہماری طرف جلدی کرنے پر آمادہ کرے۔[1] ایک گروہ نے اس کو افراط سے پڑھا ہے۔ افراط کے معنی ہیں از حد گزشتن درکارے، یعنی کسی کام میں حد سے بڑھ جانا۔ "أي يشتط في أذيتنا" اشتطاط حکم میں ظلم کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ ہماری اذیت میں جور و ظلم کا حکم دے، یہاں تک صبر نہ کرے کہ دعوت پوری ہو، معجزہ ظاہر کیا جائے۔ اس قراءت کے قاریوں میں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور عکرمہ رحمہم اللہ ہیں۔[2]

﴿ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴾ اس کے معنی پہلے گزر چکے ہیں، یعنی وہ طغیان اور سرکشی میں بڑھ جائے۔ کلمہ ﴿ اَنْ ﴾ کا اظہار کیا، باوجود اس کے کہ اس کے بغیر معنی چوکس ہیں، سو اس کی دو وجہیں ہیں: ایک تو کمال اعتنا کا ظاہر کرنا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس بات کی خبر دینا کہ اس کے فرط اور طغیان ہر ایک سے حقیقی طور پر خوف آتا ہے، یعنی ﴿ يَطْغٰى ﴾ پر "اَن" لانے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ عطف کی وجہ سے وہی "اَن" اس پر بھی آ گیا، لیکن مقصود یہ بات بتانا ہے کہ جتنا خوف فرط کا ہے اتنا ہی خوف طغیان کا ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا مستقل خوف ہے۔ یا ﴿ يَطْغٰى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر تکبر کرے، یہاں تک کہ تیری شان میں اپنی کمال جرأت اور بے باکی سے ایسی بات کہہ بیٹھے جو تیری بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہ ہو۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَا تَخَافَآ ﴾ یہ جملۂ مستأنفہ ہے، جو جواب ہے سوال مقدر کا، یعنی کوئی کہے کہ جب انھوں نے اُن دو باتوں کی شکایت کی تو اللہ نے کیا کہا؟ لہٰذا اس نے یہ جواب دیا کہ تم نے جو اِن باتوں کا وہم کیا ہے، اس سے مت ڈرو۔ پھر اس نہی کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ ﴾ یعنی تم اس لیے خوف مت کرو کہ میں آنکھ اور کان کے ساتھ تمھارے ساتھ ہوں، تم کو فرعون پر غالب کروں گا۔ ﴿ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو بات تمھارے اور اس کے درمیان جاری ہوگی، میں اس کا ادراک کرتا ہوں، اس کو جانتا ہوں، اس لیے کہ کوئی مخفی شے مجھ

[1] فتح القدير (٣/ ٥٠٥) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٠١)

پر مخفی نہیں ہے اور میں تم سے غافل اور بے خبر نہیں ہوں، لہٰذا جو بات تمھارے لائق ہوگی، وہی ہر حال میں کروں گا، یعنی ضرر کا دور کرنا اور نفع کا کھینچ لانا۔ امام ابن جریج نے کہا یہ معنی ہیں کہ جو بات وہ کہے گا، اس کو میں سنتا ہوں اور جو وہ تم کو جواب دے گا، اس کو دیکھتا ہوں۔ تو میں تم کو وحی کر دوں گا، تم اسے جواب دے دو گے۔[1]

﴿ فَاْتِيٰهُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم اس تک پہنچو۔ اول اس کی طرف جانے کا حکم دیا تھا، بعد اس کے اب اس کے پاس پہنچنے کا حکم فرمایا۔ پس "ذَهَاب" و "إِتْيَان" میں کسی طرح کی تکرار نہیں ہے، پھر اُن کو حکم دیا کہ تم اس سے چھے جملے کہو: پہلا جملہ یہ ہے کہ ﴿ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ﴾ یعنی ہم دونوں تیرے رب کے پیغمبر ہیں، اس نے ہم کو تیری طرف بھیجا ہے۔ دوسرا جملہ یہ ہے کہ ﴿ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ یعنی تو ان کو چھوڑ دے قید و بیگار سے ان کو رہا کر دے۔ تیسرا جملہ یہ ہے کہ ﴿ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ﴾ یعنی تو اُن کو عذاب مت کر، یعنی جس حالت پر وہ ہیں، اس پر اُن کو باقی مت رکھ۔ فرعون کے پاس وہ سخت عذاب میں تھے، ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا اور اُن کو ایسے کاموں کی تکلیف دیتا تھا جن کی وہ طاقت نہ رکھتے تھے، جیسے کھودنا، مکان بنانا، بوجھ اُٹھانا۔ چوتھا جملہ یہ ہے: ﴿ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ یعنی ہم تیرے رب سے نشانی لے کر آئے ہیں، کہا گیا ہے کہ وہ نشانی عصا و یدِ بیضا تھے۔ کہتے ہیں کہ فرعون نے اُن سے کہا کہ وہ کیا نشانی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ کرتے کی جیب میں گھسایا، پھر اس کو نکالا تو اس کے لیے شعاع تھا آفتاب کی شعاع کی طرح، پس فرعون نے اس سے تعجب کیا۔

رہا عصا، لہٰذا اس کو نہیں دکھایا، مگر جشن کے دن (بظاہر یہ مضمون کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو عصا صرف زینت کے روز دکھایا، خلافِ واقع ہے، اس لیے کہ قرآنِ مجید میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا ڈالنا دو بار صراحتاً مذکور ہے)۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے سے قائم مقام ہے، بیان اور تفسیر میں۔ اس لیے کہ رسالت کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا، مگر اس کی نشانی اور حجت سے جو نشانی کا لانا ہے۔[2] رہی یہ بات کہ آیت کو واحد ذکر کیا، تثنیہ نہ کہا، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس دو نشانیاں تھیں۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ مراد صرف دعوے کو ثابت کرنا ہے، اس کی برہان اور دلیل سے۔ لہٰذا گویا یوں کہا گیا کہ ہم نے دعویٰ کیا ہے۔

پانچواں جملہ یہ ہے: ﴿ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ہدایت کی پیروی کی، وہ اللہ عزوجل کے غصے، خفگی اور عذاب سے سلامت رہا۔ یہ سلام تحیت کا نہیں ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ نہ ابتدائے ملاقات ہے نہ شروع خطاب۔[3] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: "السلام علی من اتبع ولمن اتبع" برابر ہے، یعنی کلمہ "علی"، و "لام" ایک کے بجائے دوسرا آتا ہے۔[4] چھٹا جملہ یہ ہے: ﴿ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾ یعنی ہم کو اللہ کی طرف سے وحی ہوئی ہے کہ اس شخص پر عذاب ہے جس نے اس

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٥٨٠) [2] الكشاف (٣/ ٦٨) [3] معاني القرآن (٣/ ٣٥٨) [4] تفسير القرطبي (١١/ ٢٠٤)

بات کی تکذیب کی، جس کو ہم لائے ہیں اور اس سے منہ پھیرا۔ عذاب سے مراد دنیا میں ہلاکت اور بربادی ہے اور آخرت میں ہمیشگی ہے آگ میں۔ تکذیب سے مراد اللہ کی آیتوں اور اس کے رسولوں کی تکذیب ہے۔ ﴿ تَوَلّٰى ﴾ ان کے کرنے اور اُن پر ایمان لانے سے منہ پھیرنا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ تکذیب کی کتاب اللہ کی اور اس کی اطاعت سے منہ پھیرا۔[1]

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

اس (فرعون) نے کہا: اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ (49) اس (موسیٰ) نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی شکل و صورت دی، پھر ہدایت دی (50) اس (فرعون) نے کہا: اگلی امتوں کا کیا حال ہے؟ (51) اس (موسیٰ) نے کہا: ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں ہے، میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے (52)

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مابین گفتگو کا بیان:

راہ سمجھا دی یعنی کھانے پینے کا ہوش دیا۔ بچے کو دودھ پینا وہ نہ سکھائے تو کوئی نہ سکھائے۔ فرعون شاید دہری مزاج تھا، آدمیوں کی پیدائش سمجھتا تھا، جیسے: برسات کا سبزہ نہ اول کسی نے پیدا کیا، آپ ہی آپ پیدا ہو گیا نہ آخر باقی رہا، گل کر مٹی ہو گیا۔ جب سنا کہ سب کے سر پر ایک رب ہے، تب یہ پوچھا: اگلی خلق کہاں گئی؟ بتایا کہ اُن کا حساب لکھا ہوا موجود ہے، ایک ایک آدمی پھر حاضر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرعون کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس نے صانع و خالق و معبود و رب و ملیک ہر شے کے وجود کا انکار کر کے کہا: پھر اے موسیٰ! تم دونوں کا صاحب کون ہے، جس نے تجھے بھیجا ہے، کیوں کہ میں تو اس کو پہچانتا نہیں ہوں اور نہ میں اپنے سوا تمھارا کوئی معبود جانتا ہوں، موسیٰ علیہ السلام بولے: ﴿ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جس نے پیدا کیا ہر شے کے لیے جوڑا اس کا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے اُن سے یوں روایت کیا ہے کہ جس نے انسان کو انسان کیا، گدھے کو گدھا، بکری کو بکری بنایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جس نے ہر شے کو اس کی صورت دی۔ ابن ابی نجیح نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے یوں روایت کیا ہے کہ برابر کی اس نے خلق ہر دابہ کی، یعنی جاندار کی، یعنی اس کو ٹھیک اور چوکس بنایا۔

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣١٦) فتح البيان (٨/ ٢٣٦۔ ٢٣٨)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ہر ذی خلق کو وہ شے دی، جو اس کی خلق کے لائق ہے اور نہیں کی انسان کے لیے دابہ کی خلق، اور دابہ کے لیے کتے کی خلق اور نہ کتے کے لیے بکری کی خلق اور ہر شے کو وہ چیز دی جو اس کے لائق ہے، نکاح و جماع اور جفتی سے، اور مہیا کر دیا ہر شے کو اس کے لیے۔ اس میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے جو کسی دوسری شے کے مشابہ ہو، اس کے افعال، رزق اور جماع میں، یعنی ہر شے کی علاحدہ علاحدہ صورت بنائی، یہ نہیں کیا کہ آدمی میں جانور کی صورت ہو یا کتے میں بکری کی صورت اور سب کے افعال و خواص و رزق و روزی و نکاح میں فرق رکھا، ہر شے کی صورت و شکل ایسی بنائی جس کے وہ لائق تھا۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴾ [الأعلىٰ: ٣] ”جس نے ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا اور پھر راہ دکھائی۔“ ”أي قدر قدرا وهدى الخلائق إليه“ یعنی اس نے ایک قدر ٹھہرائی اور خلق کو اس کی طرف راہ بتائی، یعنی اعمال اور اجلیں اور رزق لکھ رکھے۔ پھر خلائق اس پر چلنے والی ہے، اس سے انحراف نہیں کرتی، نہ اِدھر اُدھر ہوتی ہے نہ کوئی اس سے نکلنے پر قدرت رکھتا ہے، یعنی ہمارا رب وہ ہے جس نے خلق پیدا کی اور تقدیر مقرر فرمائی اور خلق کو پیدا کیا اس طریقے پر جس کا ارادہ فرمایا۔ فرعون بولا: ﴿ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ﴾ اس کے معنی میں سب قولوں سے زیادہ صحیح یہ قول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو جب یہ خبر دی کہ ان کا رب جس نے ان کو بھیجا ہے، وہ ہے جس نے پیدا کیا، رزق دیا، قدر مقرر کی۔ پھر راہ بتائی تو وہ پہلے زمانے کے لوگوں کے ساتھ محبت پکڑنے لگا، جو اللہ کو نہیں پوجتے تھے۔ یعنی جب بات یہ ٹھہری تو اُن کا کیا حال ہے، انھوں نے تو تیرے رب کو پوجا ہی نہیں، بلکہ اس کے غیر کو پوجا، تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں اس سے یوں کہا کہ اگرچہ انھوں نے اس کو نہیں پوجا، اُن کا علم تو اللہ کے پاس مضبوط و محفوظ ہے اور وہ عن قریب اُن کو اُن کے عمل کا بدلہ دے گا۔ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ اور نامۂ اعمال ہے۔

﴿ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ ﴾ یعنی اس سے کوئی شے شاذ و منفرد و تنہا نہیں رہتی نہ اس سے کوئی چھوٹی بڑی چیز فوت ہوتی ہے: ﴿ وَلَا یَنْسَی ﴾ اور نہ ہی وہ کسی شے کو بھولتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے علم کا وصف بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر شے کو احاطہ کیے ہوئے گھیرے ہوئے ہے اور وہ کسی شے کو بھولتا نہیں ہے۔ تبارك و تعالىٰ و تقدس و تنزه، کیونکہ مخلوق کے علم کو دو نقصان پیش آتے ہیں: ایک نقصان تو یہ ہے کہ مخلوق کا علم شے کا احاطہ نہیں کر سکتا، دوسرا یہ ہے کہ علم کے بعد اس کو بھول جاتا ہے، اس لیے اللہ پاک کی ذات مقدس کو اس سے منزہ کیا۔[2] (كذا في ابن كثير)

یہاں اتنی عبارت محذوف ہے کہ پھر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس آئے اور وہی چھے جملے جن کا ذکر ہو چکا ہے کہے، یعنی فوراً ہی بغیر توقف کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی اور فرعون کو اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائے تو فرعون

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣١٦۔ ٣١٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٤۔ ٢٤٢٥) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٠٨۔ ٢٠٩)

نے ان سے کہا: ﴿ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴾ یعنی پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟! رب کی اضافت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی طرف کی، اس لیے کہ مُرسِل، یعنی بھیجنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کا رب ہو یا اس لیے کہ اُن دونوں نے تصریح کر دی تھی کہ اللہ پاک کل کا رب ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نے رب کی اضافت اپنی طرف کیوں نہ کی، یعنی یوں نہ کہا کہ "فَمَنْ رَّبِّيْ"سو اس کی تین وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ اُن کی تصدیق نہیں کرتا تھا، دوسرے یہ کہ ربوبیت کا منکر تھا۔ تیسرے یہ ہے کہ انتہا درجے کا سرکش اور باغی تھا، یہاں تک کہ خود ربوبیت اور معبودیت کا مدعی تھا، اپنے جبر و استبداد اور تکبر و سرکشی کی وجہ سے اعتقاداً تو کیا کہتا، حکایتاً بھی نہ کہا۔ موسیٰ علیہ السلام کو خاص طور پر نام لے کر پکارا، اس لیے کہ رسالت میں اصل وہی تھے۔ یا تمام آیات کی مطابقت کے واسطے اُن کا نام لیا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ فرعون جانتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں رکاوٹ ہے، جو بات کرنے سے روکتی ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کے بھائی اُن سے زیادہ فصیح ہیں۔ اس لیے اپنی خباثت کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو بلوانا چاہا نہ کہ اُن کے بھائی کو۔ چوتھی یہ وجہ ہے کہ معطوف کا علم تھا، یعنی ہارون علیہ السلام کے ساتھ ہونے کا، اس لیے ہارون علیہ السلام کا ذکر نہ کیا، اصل یوں ہے: "یا موسیٰ و ھارون"۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ فرعون نے اس بات کی تعریض کی، یعنی اشارے سے بات کی کہ اس نے اُن کی پرورش کی تھی تو گویا یوں کہا کہ میرے سوا تیرا کوئی رب نہیں ہے، یعنی پھر تو اور کون سا رب بتاتا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو جواب دیا کہ ﴿ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ﴾۔

﴿ رَبُّنَا ﴾ مبتدا ہے اور موصول مع صلہ خبر یا ﴿ رَبُّنَا ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی، یعنی "ھو" اور موصول صفت ہے ﴿ رَبُّنَا ﴾ کی۔ جمہور نے ﴿ خَلْقَهٗ ﴾ کو لام کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ زائدہ نے اعمش رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اعمش نے اس کو لام کی زبر سے پڑھا ہے، اس بنا پر کہ وہ فعل ہے۔ امام ابن ابی اسحق رحمہ اللہ کی یہی قراءت ہے اور اسی کو نصیر نے کسائی سے روایت کیا ہے۔ پس پہلی قراءت کی بنیاد پر ﴿ خَلْقَهٗ ﴾ "أعطی" کا دوسرا مفعول ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے دی ہر شے کو اس کی صورت جس پر وہ ہے اور اس کی وجہ سے اپنے غیر سے متمیز ہوتی ہے اور ہر چیز کو اس کی شکل عطا کی، جو اس شے کے فائدے اور ضرورت کے مطابق ہے، جیسے ہاتھ پکڑنے اور حملہ کرنے کے واسطے ہیں اور پاؤں چلنے کے واسطے۔ زبان بولنے کے لیے، آنکھ دیکھنے کے لیے اور کان سننے کے لیے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے فرمایا ہے کہ ہر شے کو اس کی صلاح (خوبی) عطا کی اور اس کو اس شے کی طرف راہ بتائی، جو اس کی اصلاح اور درستی کرے۔[3] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہر مرد کے لیے عورت پیدا کی اور ہر نر

[1] فتح القدير (٣/ ٥٠٦) [2] تفسير البغوي (٥/ ٢٧٦) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٣١٧۔ ٣١٨) الدر المنثور (٥/ ٥٨١)

کے لیے اس کے موافق مادہ پیدا کی۔[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلی قراءت کی بنا پر ﴿ خَلْقَهٗ ﴾ مفعول اول ہو ﴿ اَعْطٰى ﴾ کا، یعنی اس نے اپنی خلق کو دی، ہر چیز جس کی اس کو حاجت ہوتی ہے اور جس سے نفع وہ پاتی ہے۔ ﴿ ثُمَّ هَدٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اُن کو دیا اس سے فائدہ اُٹھانے کا طریقہ ان کو بتایا۔ لہٰذا جو شے جس واسطے بنائی گئی ہے، اسی میں ہر شے سے انھوں نے نفع لیا۔

رہی دوسری قراءت تو اس کی بنا پر ﴿ خَلَقَهٗ ﴾ صفت ہوگی، مضاف یعنی لفظِ ﴿ كُلَّ ﴾ کی یا مضاف الیہ، یعنی شے کی۔ معنی یہ ہیں کہ دی ہر شے کو جس کو اللہ پاک نے پیدا فرمایا اور نہ محروم کیا اس کو اپنی عطا سے۔ اس قراءت کی بنا پر ﴿ اَعْطٰى ﴾ کا دوسرا مفعول محذوف ہوگا۔ ''أي أعطى كل شيئ خلقه ما يحتاج إليه'' یعنی ہر شے جو اللہ پاک نے پیدا فرمائی اس کو وہ چیز دی، جس کی طرف اس کو حاجت ہوتی ہے۔ پس اس کے معنی پہلی قراءت کے معنی کے موافق ہو جاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ہدایت کی اس کو، ہدایت کی منکح و مطعم و مشرب و مسکن کی،[2] یعنی اس کو جماع کرنے، کھانے، پینے، رہنے، بسنے کا طریقہ بتایا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس تقریر کے ضمن میں اثباتِ ربوبیت پر جو حجت قائم کی اور جو روشن دلیل استدلال کی ڈوری کے ساتھ منسلک فرمائی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ پیدایش اور ہدایت بغیر کسی خلاف کے ثابت ہیں اور اُن کے لیے پیدا کرنے والا اور ہدایت دینے والا ہونا ضروری ہے اور وہ خالق اور ہادی اللہ پاک ہے جس کے سوا اور کوئی رب نہیں۔

جس وقت فرعون نے اس کو سنا اور مشاہدہ کیا تو اس بات سے ڈرا کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اس کی حقیقت اور اس کی اپنی خرافات کا بطلان لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا، اس نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس راہ سے پھیر کر لایعنی قصوں اور کہانیوں کی طرف پھیرے، جن کو رسالت سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے، تاکہ اپنی قوم کو یہ بات دکھائے کہ اس کے پاس معرفت اور علم ہے۔ اس لیے یہ کہا کہ ﴿ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴾۔

﴿ بَالُ ﴾ حال و شان کو کہتے ہیں اور قرونِ اولیٰ، جیسے: نوح، ہود، لوط اور صالح علیہم السلام کی اقوام ہیں۔ یعنی اے موسیٰ! جب بات یہ ٹھہری تو پھر تم اُن لوگوں کا حال تو بتاؤ کہ یہ اس رب کو نہیں مانتے تھے، جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو، بلکہ انھوں نے بتوں وغیرہ مخلوقات کو پوجا ہے، ان کا کیا حال ہوا، اُن پر کیا کیا حوادث مفصل گزرے۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اس کو یہ جواب دیا کہ ﴿ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ﴾ یعنی یہ بات جس کا تو نے سوال کیا ہے، اس بات میں سے نہیں ہے جس کے ہم درپے ہیں، بلکہ یہ تو منجملہ علمِ غیب ہے، جو اللہ پاک کے ساتھ خاص ہے، اس کو نہ تو جانتا ہے نہ میں جانتا ہوں اور اُن کے احوال جاننے کا منصبِ رسالت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٠٥) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٣١٦)

﴿ فِیْ كِتٰبٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اُن کے اعمال اللہ پاک کے پاس محفوظ ہیں، وہ قیامت کے دن اُن کا بدلا دے گا۔[1] تقدیر یہ ہے کہ ”علم أعمالها عند ربي في كتاب“. امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ فرعون نے جس وقت موسیٰ علیہ السلام سے الٰہ و معبود کا سوال کیا اور یہ سوال اس قسم سے تھا جس کا طریقہ استدلال سے ہے تو انھوں نے مختصر ترین عبارت اور بہترین معنی میں اس کو جواب دے دیا اور جب اس نے قرونِ اولیٰ کا سوال کیا اور یہ سوال اس قسم سے تھا جس کا طریقہ اخبار ہے اور اُن کے پاس اس بارے میں کوئی خبر نہیں آئی تھی تو اس کا علم علام الغیوب کے سپرد کیا۔

﴿ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ﴾ کے معنی میں کئی قول پر اختلاف کیا گیا ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ کلامِ مستأنف کی ابتدا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا منزہ و پاک کرنا ہے ان دونوں صفتوں سے اور کلام ﴿ فِیْ كِتٰبٍ ﴾ پر تمام ہو چکا۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور کہا کہ معنی ﴿ لَا یَضِلُّ ﴾ کے ”لا يهلك“ ہیں،[2] یہ معنی اس آیتِ کریمہ سے ماخوذ ہیں: ﴿ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ﴾ [السجدة: ١٠] ”کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے۔“

اور نہیں بھولتا وہ اشیا میں سے کسی شے کو۔ پس اللہ پاک کو ہلاکت اور بھول جانے سے منزہ کیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ لَا یَضِلُّ ﴾ کے ”لا يخطئ“ معنی ہیں، یعنی خطا نہیں کرتا۔ یہ قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[3] تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ”لا يغيب“ ہیں، یعنی وہ غائب نہیں ہوتا۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا کہ ضلال کی اصل غیبوبت، یعنی غائب ہونا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ وہ کتاب کی طرف محتاج نہیں ہوتا اور نہ اس سے اشیا میں سے کسی شے کا علم غائب ہوتا ہے اور جو کچھ وہ اشیا سے جان چکا ہے، اسے بھولتا نہیں ہے۔ یہ معنی بھی امام زجاج رحمہ اللہ سے منقول ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام اقوال سے زیادہ یہ قول معنی کے زیادہ مشابہ ہے اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ قول ابن اعرابی رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے۔[4]

پانچواں قول یہ ہے کہ اس کے علم سے کوئی شے جاتی نہیں ہے اور نہ وہ بھولتا ہے، یعنی اس کے بعد کہ وہ اس شے کو جان چکا۔ یہ قول چوتھے قول کی طرح ہے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ پہلا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ پاک تمام معلومات کو جاننے والا ہے۔ اور دوسرا لفظ اس علم کے باقی رہنے کی دلیل ہے اور ابد الآباد تک کے لیے اور یہ اشارہ ہے کہ اس میں کوئی تغیر نہیں۔ ساتواں قول یہ ہے کہ یہ دونوں جملے کتاب کی صفت ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ کتاب، اللہ پاک سے جانے والی نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کو بھولنے والا ہے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٠٦) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٠٨) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٣١٩) [4] تفسير القرطبي (١١/ ٢٠٨)

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾

وہ ذات جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور تمھارے چلنے کے لیے اس میں راستے بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے کئی اقسام کی مختلف نباتات نکالیں (53) تم کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ، بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں (54) ہم نے تمھیں اسی (زمین) سے پیدا کیا اور اسی میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی میں سے تمھیں ایک بار پھر نکالیں گے (55) اور بلاشبہ ہم نے اس (فرعون) کو اپنی سب نشانیاں دکھا دیں، پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار کیا (56)

کلامِ موسیٰ علیہ السلام کا تتمہ:

اللہ تعالیٰ یہ کلام دہریوں کی آنکھ کھولنے کے لیے فرماتا ہے کہ اس کی قدرتیں اور تدبیریں دیکھ، اگر عقل ہے تو سمجھ لوگے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے، جس میں انھوں نے اپنے رب عزوجل کی صفتیں بیان کی ہیں، جس وقت فرعون نے اُن سے اُن کے رب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: ﴿ رَبُّنَا الَّذِيْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾۔ پھر اس کے درمیان میں اور کلام لے آئے پھر کہا: ﴿ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ﴾ بعض کی قراءت میں ﴿ مَهْدًا ﴾ ہے، یعنی ﴿ قَرَارًا ﴾۔ قرار کہتے ہیں جائے آرام کو، یعنی جس نے تمھارے لیے زمین کو آرام کی جگہ بنا دیا، جس پر تم قرار پکڑتے ہو، کھڑے ہوتے ہو، سوتے ہو، اس کی پشت پر سفر کرتے ہو۔

﴿ وَسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا ﴾ یعنی کر دیے تمھارے واسطے راستے کہ تم اس کے اطراف میں چلتے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۳۱] ''اور ہم نے اس میں کھلی راہیں رکھیں، تاکہ وہ (لوگ) راہ پائیں۔'' اور اُتارا آسمان سے پانی، پھر نکالی ہم نے اس سے طرح طرح کی نباتات، یعنی رنگ برنگ طرح طرح کے انواع و اقسام کے سبزے، کھیتیاں اور میوے کھٹے، میٹھے اور کڑوے اور باقی قسمیں، خود بھی کھاؤ اور اپنے چوپائیوں کو بھی چراؤ۔ کئی قسمیں تو تمھارے کھانے کے لیے ہیں اور تمھارے لیے میوے ہیں اور کئی قسمیں تمھارے چوپائیوں کے لیے ہیں، ان کو طاقت دیتی ہیں، اُن میں ہری بھی ہیں اور سوکھی ہوئی بھی۔

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴾ یعنی بے شک اس میں البتہ دلیلیں، حجتیں اور براہین ہیں، ان لوگوں کے لیے جو سلیم الطبع ہیں اور مستقیم و درست وسیدھی عقلیں رکھتے ہیں اس بات پر کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور نہ ہی اس کے سوا کوئی پالنے والا اور پرورش کرنے والا ہے۔ ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ... الخ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تمھارا مبدا، یعنی ابتدا زمین سے ہے، کیوں کہ تمھارے باپ آدم علیہ السلام روئے زمین کی خاک سے پیدا ہوئے اور تم اسی کی طرف پھر جاؤ گے جب مرو گے اور رل مل جاؤ گے اور اسی سے تم کو دوسری بار نکالیں گے۔ ﴿ یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ [بني إسرائیل: ٥٢] ''جس دن وہ (اللہ) تمھیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور تم خیال کرو گے کہ بس تھوڑا عرصہ ٹھہرے ہو۔''

یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ قَالَ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٥] ''فرمایا: تم اسی (زمین) میں زندہ رہو گے، اور اسی میں تم مرو گے اور (قیامت کے دن) اسی سے تم نکالے جاؤ گے۔''

اس حدیث شریف میں مروی ہے جو سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازے میں حاضر ہوئے، پھر جس وقت میت کو دفن کیا گیا تو آپ ﷺ نے ایک مٹھی مٹی لی، پھر اس کو قبر میں ڈالا اور فرمایا: ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ﴾ پھر دوسری مٹھی لی اور فرمایا: ﴿ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ ﴾ پھر اور مٹی لی، پھر اس کی قبر میں ڈالا اور فرمایا: ﴿ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی ﴾۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ لَقَدْ اَرَیْنٰهُ ...الخ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ فرعون پر حجتیں اور نشانیاں اور دلائل قائم ہوئے اور اس نے ان کا معائنہ کیا، ان کو دیکھا اور کفر وعناد، بغاوت اور سرکشی کے بارے میں اُن کو جھٹلایا، اُن کا انکار کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ﴾ [النمل: ١٤] ''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، جب کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔''[1] (کذا فی ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ﴾ موصول محلِ رفع میں ہے اس بنا پر کہ ﴿ رَبُّنَا ﴾ کی صفت ہے۔ زیادتِ بیان کو شامل ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ یعنی ''ھو''. یا محلِ نصب میں ہے مدح کی بنا پر۔ کوفیوں نے ''مهدا'' پڑھا ہے اس بنا پر کہ فعل مقدر کا مصدر ہے۔ ''أي مهدها مهدا''، یعنی بچھایا اس کو بچھانا۔ یا مضاف محذوف ہے، ''أي ذَاتَ مَهْدٍ''، یعنی اس نے کیا تمھارے لیے زمین کو صاحب مہد، یعنی جب مہد بمعنی گستردن مصدر ٹھہرے گا تو وہی دو صورتیں ہوں گی جو مذکور ہوئیں۔ مہد نام ہے اس چیز کا جو بچھائی جاتی ہے، جیسے: فراش نام ہے اس چیز کا جو بچھائی جاتی ہے۔ باقی قاریوں نے ''مهادا'' پڑھا ہے۔ امام ابو عبید و ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس قراءت کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٠٩۔ ٢١٠)

پسند کیا ہے۔ وجہ پسند کرنے کی یہ کہی ہے کہ قراء قراءت ﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴾ [النباء: ٦] ''کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟'' پر متفق ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمع مصدر سے اولیٰ ہے، کیونکہ یہ جگہ مصدر کی جگہ نہیں ہے، مگر مضاف کے خلاف ہونے پر۔[1] کسی نے کہا جائز ہے کہ ''مہاد'' مفرد ہو، جیسے فراش اور یہ بھی جائز ہے کہ جمع ہو۔ معنی ''مہاد'' کے فراش ہیں، یعنی بستر۔ پس ''مہاد'' جمع ہے ''مہد'' کی، یعنی تم میں سے ہر ایک کے لیے زمین کی جگہ کو بستر بنا دیا۔

﴿ وَسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا ﴾۔ ﴿ سَلَكَ ﴾ کے معنی ہیں کسی شے کا کسی شے میں داخل کرنا، یعنی داخل کر دیے تمھارے لیے زمین میں تمھارے راستے کہ تم اُن پر چلتے رہو اور اُن کو تمھارے لیے سہل و آسان کر دیا۔ دوسری آیت میں ہے: ﴿ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ١٠] ''وہ (اللہ) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے بنائے، تاکہ تم راہ پاؤ۔'' اور راہوں کو پہاڑوں، وادیوں اور جنگلوں کے درمیان میں بنایا، جن پر تم چلتے ہو ایک قطر سے دوسرے قطر کی طرف، تاکہ ان سے تم اپنی حاجتیں پوری کرو اور اُن کے منافع اور مرافق سے نفع پاؤ۔ یہ سب موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں سے ہے، جو انھوں نے فرعون کے پہلے سوال کے جواب میں فرمایا تھا۔ لہٰذا یہ ﴿ ثُمَّ هَدٰى ﴾ سے مربوط ہے، لیکن اپنے کلام کے درمیان میں فرعون کا دوسرا سوال اور اس کا جواب بطورِ جملہ معترضہ ذکر کیا۔ پھر اللہ پاک نے اس بات کا تتمہ ذکر فرمایا، جس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک کی صفت بیان کی۔

﴿ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ یعنی جس نے آسمان سے پانی اُتارا۔ اس پانی سے مراد بارش کا پانی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں تک موسیٰ علیہ السلام کا کلام مکمل ہو چکا اور اس کا ما بعد، یعنی ﴿ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴾ اللہ پاک کے کلام سے ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور محلی رحمہ اللہ نے ان کی پیروی کی ہے۔[2] اس قول میں بعد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بھی منجملہ اسی کلام کے ہے جو موسیٰ علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ غائب سے متکلم کی طرف التفات کیا تو اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس میں کمال قدرت و حکمت پر جو دلالت ہے، اس کے ظہور پر آگاہ کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ اللہ پاک مطاع ہے اور مختلف اشیا اس کی مشیت کی مطیع و تابعدار و فرماں بردار ہیں۔ لیکن اس قول کی یوں مخالفت کی گئی ہے کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، باوجود اس کے کہ متکلم کے متحد نہ ہونے کے سبب سے توجہ کا فوت ہو جانا لازمی ہے، یعنی خلافِ ظاہر اس لیے ہے کہ پہلے تو ﴿ اَنْزَلَ ﴾ کہا، پھر ﴿ فَاَخْرَجْنَا ﴾ ذکر کیا، ظاہر یہ تھا کہ ''فَاَخْرَجَ'' کہتے۔

رہا فوت ہونا توجہ کا، تو وہ اس واسطے ہوا کہ ﴿ اَنْزَلَ ﴾ کے متکلم موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ﴿ فَاَخْرَجْنَا ﴾ کا متکلم اللہ

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٠٩) [2] تفسیر الجلالین (١/ ٤١٠)

پاک ہے، التفات اسی جگہ ہوتا ہے کہ دونوں کا متکلم ایک ہو۔ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ سارا کلام ایک سے حکایت کیا گیا ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں اور حکایت کرنے والا سب کا اللہ پاک ہے، معنی یہ ہیں کہ پھر نکالے ہم نے اس پانی سے کشاورزی اور محنت اور مشقت کرنے کے سبب سے ازواج، یعنی نبات کی مختلف قسمیں، یعنی اس پانی سے رنگ برنگ انواع واقسام کی روئیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، طرح طرح کی سبزی نکلتی ہے، جو رنگ، مزہ، بو اور فائدے میں مختلف ہوتی ہے، پھر اُن میں سے بعض تو آدمیوں کے لیے ہیں اور بعض جانوروں کا چارہ ہوتا ہے۔ اصناف کا نام ازواج اس لیے کہا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، بعض بعض سے مقرن ہوتا ہے، جس طرح کہ زوج زوجہ سے اور زوجہ زوج سے قرین ہوتا ہے۔ نبات مصدر ہے، بمعنی رستن یعنی اُگنا، اس کے ساتھ نابت کا نام رکھا گیا، یعنی اُگنے والا وہ گھاس ہوئی، اسی لیے اس میں واحد اور جمع برابر ہیں۔

﴿ شَتّٰى ﴾ "شَتیت" کی جمع ہے، اس کا وزن "فَعْلٰی" ہے، اس کا الف تانیث کے لیے ہیں۔ ﴿ مِنْ نَّبَاتٍ ﴾ صفت ہے ﴿ اَزْوَاجًا ﴾ کی، یا اس کا بیان ہے۔ اسی طرح "شَتّٰی" "أزوَاجاً" کی دوسری صفت ہے۔ امام اخفش نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے کہ "أَزوَاجاً شَتّٰى من نبات" کہا اور کبھی نبات شتی ہوتی ہے، پس ہوسکتا ہے کہ "شَتّٰی"، "أَزوَاجاً" کی صفت ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبات کی صفت ہو۔[1] محاورے میں بولتے ہیں: "أَمرٌ شَتٌّ أي متفرق. و شت الأمر يشت شتا و شتاتاً تفرق اشتت مثله" اور "شتیت" بمعنی متفرق ہے اور "شتان" اسم فعل ماضی بمعنی "افترق" ہے اور اسی لیے مکتفی بواحد نہیں ہوتا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ شَتّٰى ﴾ بمعنی مختلف ہے۔[2]

﴿ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ﴾ "رَعي" زبر کے ساتھ بمعنی چریدن و چرانیدن ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "رعت الماشية الكلأ ورعاها صاحبها رعاية أي أسامها و سرحها" یعنی ماشیہ نے گھاس چری اور اس کے مالک نے اس کو چرایا اور چرنے کے بعد چھوڑا۔ لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ "أَنْعَام" "نعم" کی جمع ہے۔ "نعم" بالتحریک چارپایہ، اس کا اطلاق اونٹ پر، گائے پر اور بکری پر ہوتا ہے۔ یہ جملہ محلِ نصب میں بنا بر حال بتقدیر قول ہے، اور امر واسطے اباحت اور نعمت یاد کرنے کے لیے ہے۔ یعنی پھر نکالی ہم نے اس پانی سے سبزی کی مختلف قسمیں درآنحالیکہ ہم تم سے کہنے والے ہیں کہ تم اس میں سے کھاؤ اور اپنے جانوروں کو چراؤ اور اسے تمھارے فائدے کے لیے تیار کرنے والے ہیں کہ تم اپنے کھانے اور جانوروں کے چرانے سے فائدہ اٹھاؤ، ہم اس میں اذن دینے والے ہیں۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴾ یہ جمع ہے: "نُهيَة" کی جیسے: "غُرفَة و غُرَف" ہے۔ عقل کا نام

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٠٩)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٢٠)

''نُھٰی'' اس لیے رکھا کہ عقل اپنے صاحب کو قبیح باتوں کا مرتکب ہونے سے روکتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''نُھٰی'' اسم مفرد ہے اور مصدر ہے ''ھُدٰی و سُرٰی'' کی طرح۔ ابو علی اسی کے قائل ہیں۔[1] آیات سے مراد عبرتیں ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''أولي النُّھٰی أولي الحِجٰی والعقل''[2] دوسری روایت میں فرمایا ہے: ''أولي التُّقٰی''[3] یعنی یہ جو ان آیتوں میں گزر چکا ہے، بے شک اس میں البتہ عبرتیں ہیں عقل والوں کے لیے۔ ان کو ذکر کے ساتھ اس لیے مخصوص فرمایا کہ اُن کے ''رأی'' کی طرف اختتام ہوتا ہے، یا اس لیے کہ وہ نفس کو قبیح حرکتوں سے روکتے ہیں۔ یہ سب موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون پر حجت قائم کی گئی ہے، پیدا کرنے والے کے وجود کے لیے۔ یہ اس کے اس قول کے جواب میں کہا گیا: ﴿ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴾

﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ﴾ میں ضمیر ''أرض'' کی طرف راجع ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے، یعنی آدم علیہ السلام زمین سے پیدا کیے گئے اور اُن کی اولاد اُن سے پیدا کی گئی،[4] تو اس بنیاد پر ہر انسان کی پیدائش سوائے آدم علیہ السلام کے زمین سے ہوگی بوسائط عدیدہ بقدر اس بعد کے جو اس شخص اور آدم علیہ السلام کے درمیان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ہر نطفہ خلقِ آدم کے ضمن میں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، کیوں کہ بشریت کے لحاظ سے ہر فرد کو اُن کی خلق سے ایک حصہ ہے اور قرآنِ کریم کا ظاہر بھی اسی کی دلالت کرتا ہے۔ یعنی ہم نے تم کو اسی زمین سے بنایا اور موت کے بعد پھر اسی میں لے جائیں گے۔ سو تم اس میں دفن ہو گے۔ تمھارے جوڑ، پھوند، پارچے، ٹکڑے متفرق ہوں گے، یہاں تک کہ زمین کی جنس میں سے ہو جائیں گے۔

کلمہ ''فِيْ'' آیا ''إلٰی'' نہ آیا، حالانکہ اعادہ کا صلہ ''إلٰی'' آتا ہے، اس لیے کہ استقرار پر دلالت کرے، یعنی تم زمین میں قرار پکڑو گے اور اسی سے ہم تم کو نکالیں گے، جس طرح کہ تمھاری پیدائش کی ابتدا کے وقت تم کو نکالا تھا۔ دوبارہ اُٹھا کر اکٹھا کر کے جسموں کو جوڑ کر روحوں کو جسموں کی طرف پھیر کر تم کو اس حالت پر لا کر جس میں مرنے سے پہلے تھے، نکالیں۔ امام عطا خراسانی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ فرشتہ جاتا ہے، پھر اس جگہ سے مٹی لیتا ہے، جس میں وہ دفن ہوگا، پھر اس کو نطفے پر بُر براتا ہے تو وہ مٹی اور نطفے پر پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ وہی قول ہے اللہ پاک کا ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ ﴾[5]۔ امام احمد اور حاکم رحمہما اللہ نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب ام کلثوم رضی اللہ عنہا قبر میں رکھی گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴾ بِسْمِ اللّٰهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ »[6]

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٢٧٨) [2] الدر المنثور (٥/ ٥٨٣)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٣٩٨) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٦) [4] معاني القرآن (٣/ ٣٥٩) [5] الدر المنثور (٥/ ٥٨٤)

[6] مسند أحمد (٥/ ٢٥٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٤١١) اس کی سند میں ''علی بن یزید'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ میت کو قبر میں اتارتے وقت ''بسم اللہ... رسول اللہ'' کے الفاظ کہنا دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

﴿وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا﴾ رویتِ بصری ہے، یعنی آنکھ سے دیکھنا۔ آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو اس قول میں مذکور ہیں۔ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۱] ''اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں۔'' اس بنیاد پر کہ اضافت عہد کے واسطے ہے، وہ نشانیاں یہ ہیں: عصا، یدِ بیضا، سنین، یعنی سالہائے قحط، نقص الثمرات، یعنی پھلوں کی کمی، طوفان، ٹڈی، چیچڑی، مینڈک اور خون۔ وطمس الأموال والشد على القلوب۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عصا و یدِ بیضا ہے۔ جمع کا صیغہ اس کے باوجود کہ وہ دو نشانیاں ہیں، ان امور کے ابتدا کے اعتبار سے ہے، جو ان دونوں کی لپیٹ میں تھے، جس میں سے ہر ایک امر اُن لوگوں کے لیے ایک روشن نشانی تھا، جو عقل رکھتے ہیں۔[1] یہ قول اس بات پر مبنی ہے کہ جو معاملہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ساتھ پہلی دعوت میں واقع ہوا یہ اس کا بیان ہے، حالانکہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ بیس برس کی دعوت کے دوران جو کچھ اُن کو واقع ہوا، یہ اس سب کا بیان ہے اور منجملہ اس کلام کے لیے جو اثنائے قصہ میں معترض ہوگیا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ مراد وہ ساری نشانیاں ہیں جن کو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے سوا اور انبیا علیہم السلام لائے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے تمام معجزات اور تمام انبیا کے معجزات اس کو بتا چکے تھے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آیات سے مراد اللہ پاک کی حجتیں ہیں، جو اس کی توحید پر دلالت کرتی ہیں، یعنی البتہ مقرر ہم نے اپنی ساری نشانیاں فرعون کو دکھا دیں اور اسے پہنچوا دیں۔ ﴿فَكَذَّبَ﴾ لہٰذا فرعون نے اُن کی یا موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور زعم کیا کہ وہ سحر ہے اور ایمان اور توحید سے انکار کیا۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ فرعون کا کفر عناد کا کفر تھا، کیوں کہ اس نے نشانیاں دیکھ لیں اور اُن کی تکذیب کی۔[2] كذا في فتح البيان.

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

کہنے لگا: اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اسی لیے آیا ہے کہ اپنے جادو سے ہمیں ہماری سرزمین سے نکال دے؟ (57) چناں چہ ہم تیرے پاس (مقابل) اس جیسا ہی جادو لائیں گے، لہٰذا تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ ٹھہرا، نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں اور نہ تو، ایک ہموار جگہ میں (58) اس (موسیٰ) نے کہا: تمھارا وعدہ زینت (جشن) کا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے اکٹھے کیے جائیں (59)

---

(1) تفسير أبي السعود (٦/ ٢٢) (2) فتح البيان (٨/ ٢٤١۔ ٢٤٤)

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزات کو جادو قرار دیا:

میدان میں مقابلہ کرنے سے دونوں کو غرض تھی، وہ چاہے کہ سب کے سامنے اُن کو ہرائے اور یہ چاہیں کہ وہ ہارے، جشن کا دن سارے مصر میں فرعون کی سالگرہ کا دن مقرر تھا۔

اللہ پاک فرعون کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بڑی نشانی دکھائی، یعنی عصا ڈال دیا، لہٰذا وہ ایک بڑا اژدہا بن گیا اور اپنا ہاتھ بازو کے نیچے سے کھینچا، لہٰذا وہ برص کے سوا سفید اور روشن ہو کر نکل آیا تو فرعون نے اُن سے کہا کہ یہ جادو ہے، جس کو تو لایا ہے، تاکہ ہم پر جادو کرے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر غالب ہو جائے تو وہ تیرے پیرو ہو جائیں اور تو اُن کی کثرت اور زیادتی کے سبب سے ہم پر فخر کرے۔ یہ سب تیرا ارادہ پورا نہ ہوگا، کیوں کہ تیرے جادو کی طرح کا جادو ہمارے پاس بھی ہے۔ جس بات میں تو ہے وہ تجھے مغرور نہ کرے، دھوکے میں نہ ڈال دے، لہٰذا تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک موعد ٹھہرا، یعنی ایک دن مقرر کر، جس میں ہم اور تو جمع ہوں۔ پھر ہم معین جگہ میں معین وقت پر تیرے جادو کا اپنے جادو کے ساتھ مقابلہ کریں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تمھارا وعدہ یوم الزینہ ہے، یہ دن اُن کی عید کا اور نو روز کا دن تھا، جس میں سب لوگ کاروبار سے فارغ ہوتے اور اکٹھے ہوتے تھے۔

اس دن کو اس لیے مقرر کیا کہ لوگ اللہ پاک کی قدرت کا مشاہدہ کریں کہ جو وہ چاہتا ہے اس پر قادر ہے اور انبیا علیہم السلام کے معجزوں اور خوارقِ عاداتِ نبویہ کو دیکھ لیں اور جان لیں کہ جادو کا اُن سے مقابلہ کرنا باطل ہے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴾ یعنی سارے لوگ دن چڑھے جمع کیے جائیں، تاکہ مقابلہ بالکل ظاہر، جلی اور کھلا اور واضح ہو۔ انبیا علیہم السلام کی یہی شان ہے کہ اُن کا ہر کام بین، ظاہر اور واضح اور کھلم کھلا ہوتا ہے، اس میں نہ کسی طرح کی پوشیدگی ہوتی ہے نہ ترویج کہ کھوٹی چیز کو دھوکا دے کر رواج دے دیں اور چلا دیں۔ اسی لیے ''لَيْلًا'' یعنی رات کے وقت نہ کہا، لیکن ''نهاراً ضحى'' کہا، یعنی لوگوں کا جمع ہونا دن میں ہو رات میں نہ ہو۔ پھر دن میں بھی چاشت کے وقت کہ سب وقتوں سے زیادہ تر روشن ہوتا ہے۔ ''ضحى'' سے مراد ''ضحوة من النهار''. ''ضحوة'' نیم چاشت اور ''ضحى'' پیش کے ساتھ والقصر چاشتگاہ۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ یومِ عاشورا ہے۔[1] امام سدی، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اُن کی عید کا دن ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے بازار کا روز۔[2] ان سب قولوں میں کچھ تضاد نہیں ہے، یعنی اس لیے کہ مراد لوگوں کے جمع ہونے کا دن ہے۔ خواہ عید کا ہو یا جشن کا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے اسی جیسے دن میں فرعون اور اس کے لشکروں کو ہلاک کیا، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہو چکا ہے۔[3]

---

(1) الدر المنثور (٥/ ٥٨٤) (2) تفسير الطبري (١٨/ ٣٢٤)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٠)

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک مدت مقرر کر کہ ہم اس میں غور کریں۔ موسیٰ علیہ السلام بولے کہ مجھے اس کا حکم نہیں ہے، مجھے جو حکم ہے وہ ہے تیرے مقابلے کا، اگر تو نہ نکلے گا تو میں تیری طرف گھس آؤں گا۔ اس پر اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ تو اپنے اور اس کے درمیان ایک مدت مقرر کر لے اور اس سے کہہ کہ وہ خود ٹھہرا دے۔ فرعون نے کہا کہ میں چالیس دن تک اس کی مدت مقرر کرتا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے مان لیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَكَانًا سُوًى ﴾ سے مراد مکان منصف ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مکان عدل۔'' عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَكَانًا سُوًى ﴾ مستو بين الناس و ما فيه لا يكون صوت و لا شيئ يتغيب بعض ذلك عن بعض مستو حتى يرى'' [1] (كذا في ابن كثير)

جملہ ﴿ قَالَ اَجِئْتَنَا ... الخ﴾ مستأنفہ ہے، موسیٰ علیہ السلام کے جواب پر ترتیب دیا گیا ہے اور جواب ہے سوال مقدر کا، گویا یوں کہا گیا کہ اس کے بعد پھر فرعون نے کہا اور ہمزہ ان آیات کے انکار کے لیے ہے جن کو موسیٰ علیہ السلام لائے۔ یعنی اے موسیٰ! کیا تو اسی لیے آیا ہے کہ لوگوں کو اس وہم میں ڈالے کہ تو نبی ہے اور اُن پر تیرا اتباع اور جو تو لایا ہے اس پر ایمان واجب ہے، یہاں تک کہ اس وہم کے ڈالنے کے سبب سے جو جادو کا ایک شعبہ ہے تیرا یہ مقصد ہو کہ ہماری زمین، یعنی مصر پر غالب ہو جائے اور ہم کو اس سے نکال دے، اس میں بادشاہت اور غلبہ تیرا ہو جائے۔ اس ملعون نے زمین سے نکالنے کا جو ذکر کیا تو اس لیے کہ اپنی قوم کو موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے سے نفرت دلائی، کیونکہ جب اُن کے ذہن میں یہ بات آجائے گی اور اُن کی سمجھ میں یہ بات جم جائے گی کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے کا انجام اپنے گھر بار اور وطن سے نکلنا ہے تو وہ اُن کی بات قبول نہ کریں گے اور اُن کے معجزوں میں غور و تدبر کریں گے نہ ہی وہ اس خیر اور نیکی کی طرف توجہ کریں گے جس کی وہ دعوت دیتے ہیں۔

﴿ بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴾ میں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ فرعون موسیٰ علیہ السلام سے نہایت درجہ خائف ہوا ورنہ کون ساحر اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ کسی بادشاہ کو اس کی زمین سے نکال دے۔ ﴿ فَلَنَاْتِيَنَّكَ ﴾ میں حرفِ فا مابعد کی ترتیب کے لیے ہے ماقبل پر۔ اور لام توطیہ قسم کا ہے، یعنی قسم ہے اللہ کی! البتہ ضرور ہم بھی ایسے جادو کے ساتھ تیرا سامنا اور مقابلہ کریں گے، جو عجیب و غریب ہونے میں تیرے جادو کی طرح ہوگا، یہاں تک کہ لوگوں پر یہ بات کھل جائے کہ جس کو تو لایا ہے، وہ جادو ہے اور جادوگر اس قسم کے کرتب دکھانے کی قدرت رکھتا ہے۔

﴿ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا ﴾ موعد مصدر ہے بمعنی وعدے کے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسم مکان ہے، ''أي مَكَانًا مَعْلُوْمًا'' کسی نے کہا ہے کہ اسمِ زمان ہے ''أي يَوْمًا مَعْلُوْمًا أَوْ أَجَلًا مَّعْلُوْمًا أَوْ مِيقَاتًا''. پہلے

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٢٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٢١٠)

قول کی تائید یہ جملہ کرتا ہے: ﴿ لَا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ ﴾ کیونکہ مواعد میں خلاف اور عدمِ خلاف کی صفت ہوتی ہے۔ دوسرے قول کی تائید ﴿ مَكَانًا سُوًى ﴾ سے ہوتی ہے۔ تیسرے قول کی تائید ﴿ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ سے ہوتی ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ ظاہر اس جگہ مصدر ہی ہے۔ اسی لیے ﴿ لَا نُخْلِفُهٗ ﴾ کہا ہے، یعنی ہم اس وعدے کا خلاف نہ کریں۔ ابو البقاء نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ "إِخْلَاف" یہ ہے کہ تو کسی شے کا وعدہ کرے اور اس کو پورا نہ کرے۔

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میعاد، مواعدہ و وقت و موضع ہے اور اسی طرح "مَوْعِد" ہے۔ ابو جعفر بن القعقاع وشعبہ اور اعرج رحمہم اللہ نے ﴿ لَا نُخْلِفْهُ ﴾ کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ ﴿ فَاجْعَلْ ﴾ کا جواب ہے۔ باقی قاریوں نے پیش کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ "مَوْعِد" کی صفت ہے،[1] یعنی ایسا وعدہ ٹھہرا کہ ہم اور تو اس کے خلاف نہ کریں اور نہ اس سے آگے بڑھیں۔ "جعل" اس جگہ "تَصْيِيْر" کے معنی میں ہے۔ اس کا مفعول اول ﴿ مَوْعِدًا ﴾ ہے اور دوسرا مفعول ظرف ہے اور جملہ ﴿ لَا نُخْلِفُهٗ ﴾ صفت ہے "مَوْعِد" کی۔ ﴿ نَحْنُ ﴾ تاکید ہے ضمیر مرفوع کی، جو ﴿ نُخْلِفُهٗ ﴾ میں پوشیدہ ہے، اس پر ﴿ وَلَآ اَنْتَ ﴾ کا عطف کرنے کو درست کرتی ہے، کیونکہ ضمیر مرفوع مستتر پر بغیر تاکید کے عطف درست نہیں ہے۔

﴿ مَكَانًا سُوًى ﴾ منصوب ہے ساتھ فعل مقدر کے، جس پر مصدر دال ہے، یا بدل ہے "مَوْعِد" سے، یا مفعول فیہ ہے "اِجْعَلْ" کا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس کے نصب ہونے کے بیان میں طول کیا ہے۔ ﴿ سُوًى ﴾ کو امام ابن عامر، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ نے سین کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر تمام قراء نے سین کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں اور دونوں قراءتِ سبعہ ہیں۔ امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے سین کی زیر کو پسند کیا ہے، اس لیے کہ وہ عالیہ فصیحہ لغت ہے۔[2] اس سے مراد "مکانا مستوی" برابر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "مکان منصف" عدل ہمارے اور تیرے درمیان ہو۔

امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سِوٰی" یا "سُوٰی" یعنی عدل، مطلب یہ ہے کہ دو مکانوں کے درمیان نصف راہ پر ہو۔ امام ابو عبیدہ اور قتیبی رحمہما اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ دو فریق کے درمیان مکان وسط ہو،[3] اس لیے کہ وسط سے طرفین کی جانب فاصلہ برابر ہوتا ہے، یعنی ایسا مکان ہو کہ دونوں طرف سے آنے والے کا فاصلہ اس کی طرف برابر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ ﴿ سُوًى ﴾ اس مکان کے، اس قول میں بُعد ہے۔ فرعون نے جو موعد کا تعین موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا، پس اس لیے کہ اپنا کمال اقتدار ظاہر کرے اس بات پر کہ جو معجزہ موسیٰ علیہ السلام لائے ہیں، وہ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢١٢) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢١٢) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٢١٢)

بھی اس کے مثل لا سکتا ہے۔

﴿ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ امام حسن، اعمش، عیسیٰ ثقفی، سلمی اور ہبیرہ نے حفص سے ﴿ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] "أي في يوم الزينة إنجاز موعدنا" یعنی زینت کے دن میں ہمارے وعدے کا وفا کرنا ہے۔ باقی قاریوں نے "یوم" کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ ﴿ مَوْعِدُكُمْ ﴾ کی خبر ہے۔ "موعد" کو اگر اسمِ زمان ٹھہرایا جائے تو مضاف حذف کرنے کی حاجت نہ ہوگی، اس لیے کہ تقدیر یہ ہے "زمان الوعد يوم الزنية" اور اگر موعد مصدر قرار دیا جائے تو حذف مضاف کی ضرورت پڑے گی، تقدیر یہ ہوگی: "وعدكم وعد يوم الزينة" اور جب اسمِ مکان ٹھہرے گا تو بھی حذف مضاف کی حاجت ہوگی، یعنی "موعدكم مكان يوم الزينة" کیونکہ زینت کے دن لوگ ایک مشہور و معروف مکان میں جمع ہوتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ ﴿ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ کونسا دن ہے، سو امام مجاہد، قتادہ، مقاتل اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ عید کا دن تھا، اس میں وہ زینت کرتے تھے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عاشورے کا دن تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس کے قائل ہیں اور اسی کے مثل عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شنبے کا دن تھا۔[2] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اتفاقاً اس موقع پر عاشورے کا دن شنبہ کے دن آپڑا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ نوروز کا دن تھا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ کسرِ خلیج کا دن تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ دن قرار دیا اور اس کام کے لیے اس کو مخصوص فرمایا، وجہ اس کی یہ ہے کہ علی رؤس الاشہاد مشہور و معروف دن میں سب کے سامنے مجمعِ عام میں حق ظاہر ہو جائے اور باطل مٹ جائے اور یہ امر ہر دیہاتی اور شہری کے درمیان خوب شائع ہو جائے۔ دوسری وجہ اپنی کمالِ قوت کا اظہار ہے اور اس بات کا کہ انھیں اپنے کام میں پورا بھروسا اور اعتماد ہے اور وہ فرعون والوں کی کچھ پروا نہیں کرتے، کیونکہ وہ دن اُن کی شان و شوکت اور اُبہّت کے ظہور کا وقت تھا۔

﴿ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴾ اس کا عطف یا تو ﴿ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ پر ہے۔ اس بنا پر محلِ رفع پر ہوگا، یعنی "موعد كم أن يحشر... الخ" یا ﴿ الزِّيْنَةِ ﴾ پر معطوف ہے۔ اس بنا پر محلِ جر میں ہوگا، یعنی "يوم الزنية و يوم يحشر... الخ". "ناس" سے مراد اہلِ مصر ہیں اور "ضحی" سے مراد اسی دن کا وقتِ چاشت ہے۔ معنی یہ ہے کہ وعدہ تمھارا عید کا دن ہے اور وعدہ تمھارا یہ ہے کہ مصر والے عید کی طرف اسی دن چاشت کے وقت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے کام میں خوب غور کریں اور دیکھیں، تاکہ کسی قسم کا شک و شبہہ نہ رہے اور حق کو اچھی طرح سے دیکھ لیں اور شہروں اور گاؤں کے لوگوں میں یہ بات پھیل جائے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ چاشت کے

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢١٣) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٢٤) تفسير القرطبي (١١/ ٢١٣) الدر المنثور (٥/ ٥٨٤ـ ٥٨٥)

[3] تفسير أبي السعود (٦/ ٢٤)

وقت ہر کنارے اور طرف سے جمع کیے جاتے ہیں تو وہی موعد ہے۔ کہا: اس دن لوگوں کو جمع کرنے کا دستور جاری تھا۔[1]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جحدری نے ﴿يُحْشَرَ﴾ کو بصیغہ معروف پڑھا ہے، یعنی "أَنْ يَّحْشُرَ النَّاسُ ضُحًى" اور جحدری سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے بصیغۂ متکلم پڑھا ہے[2] اور بعض قاریوں نے تائے خوقانیہ کے ساتھ صیغۂ خطاب سے پڑھا ہے، یعنی اے فرعون! تو جمع کرے لوگوں کو۔ باقی قاریوں کی قراءت یائے تحتیہ کے ساتھ مجہول کے صیغہ سے ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ضحوة النهار بعد طلوع الشمس ثم بعده الضحىٰ وهو حين تشرق الشمس"[3] یعنی سورج نکلنے کے بعد کے وقت کو "ضحوة النهار" کہتے ہیں، یعنی نیم چاشت۔ پھر اس کے بعد چاشت کا وقت ہے، جبکہ سورج خوب روشن ہو جاتا ہے۔ ضحیٰ کے وقت کو اس لیے خاص کیا کہ دن کا شروع ہے، پس اگر اُن کا آپس کا معاملہ درازی پذیر ہوگا تو دن میں وسعت اور گنجایش رہے گی۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

چناں چہ فرعون (محل میں) واپس آیا اور اپنی ساری چالیں جمع کیں، پھر (میدان میں) آ گیا ﴿60﴾ موسیٰ نے ان سے کہا: تمھارے لیے ہلاکت ہو! تم اللہ پر جھوٹ نہ گھڑو، ورنہ وہ عذاب سے تمھیں تباہ کر دے گا اور جس نے جھوٹ گھڑا یقیناً وہ ناکام رہا ﴿61﴾ پھر انھوں نے آپس میں اپنے معاملے میں باہم اختلاف کیا اور رازداری سے مشورہ کیا ﴿62﴾ وہ بولے: بلاشبہ یہ دونوں جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو (کے زور) سے تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دیں اور تمھارا عمدہ نظام لے جائیں (تباہ و برباد کر دیں) ﴿63﴾ لہٰذا اپنی تدبیریں پختہ کرلو، پھر صف باندھ کر آ جاؤ اور بلاشبہ جو (آج) غالب رہا، وہ کامیاب ٹھہرا ﴿64﴾

دونوں گروہوں کا ایک میدان میں اکٹھ:

جب فرعون نے جادوگر جمع کیے اور سب امیروں کو اسی بات پر اُٹھایا، تب موسیٰ علیہ السلام نے ہر شخص کو فرداً فرداً نصیحت کر دی۔ اللہ پاک فرعون کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ جس وقت اس نے اور موسیٰ علیہ السلام نے باہم وقتِ معلوم اور

[1] فتح القدير (٣/ ٥٠٩) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢١٤) [3] الصحاح للجوهري (٧/ ٢٥٦)

مکانِ معلوم کا معاہدہ کر لیا تو فرعون نے اپنی مملکت کے شہروں سے ساحروں کا جمع کرنا شروع کیا، ہر شخص کو جو اس وقت جادو کے ساتھ منسوب تھا، اس کو بلوا بھیجا۔ ان میں جادو کثرت سے تھا اور خوب رائج تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴾ [یونس: ۷۹] ''اور فرعون نے کہا: تم میرے پاس ہر ماہر جادوگر کو لے آؤ۔''

﴿ ثُمَّ اَتٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ مقررہ دن کے مقررہ وقت میں لوگ جمع ہو گئے، اس روز سے مراد وہی ﴿ يَوْمُ الزِّيْنَةِ ﴾ ہے، اور فرعون اپنے تختِ شاہی پر بیٹھا اور مملکت کے بڑے لوگوں نے اس کے لیے صف باندھی۔ دائیں بائیں رعایا کھڑی ہوئی، موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا پر تکیہ لگائے ہوئے تشریف لائے، اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام اُن کے ہمراہ تھے اور جادوگر فرعون کے سامنے صف باندھ کر کھڑے ہوئے اور وہ اُن کو آمادہ اور برانگیختہ کرتا، رغبت دلاتا اور اُبھارتا تھا کہ آج تم اپنا عمل اچھی طرح کرنا اور جادوگر اس سے تمنا رکھتے تھے اور وہ اُن کو وعدہ دیتا تھا اور اُمید دلاتا تھا۔ وہ اس طرح کہتے تھے: ﴿ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴾ [الشعرآء: ۴۱۔ ۴۲] ''اگر ہم ہی غالب آئے تو کیا ہمارے لیے کوئی صِلہ ہوگا؟ فرعون نے کہا: ہاں! اور بے شک تب تم (میرے) مقربین میں سے ہوگے۔''

پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تم اپنے اعمال سے لوگوں کے خیال میں اشیا کا وجود میں لانا مت لاؤ، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اُن کے خیال میں یہ بات مت ڈالو کہ وہ اشیا مخلوق ہیں، حالانکہ وہ مخلوق نہیں ہیں، صرف خیال بندی اور نظر بندی ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ پر جھوٹ بولو گے، پھر وہ تم کو کسی عذاب اور آفت سے ایسا ہلاک کر دے گا کہ کچھ باقی نہ رہے گا، یعنی بالکل نیست و نابود کر دے گا اور جس نے جھوٹ بولا، وہ مراد کو نہ پہنچا۔ ﴿ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے باہم اختلاف کیا۔ لہٰذا کسی نے تو یوں کہا ہے کہ یہ کلام ساحر کا نہیں ہے، یہ تو نبی کا کلام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ وہ ساحر ہے۔ کسی نے کچھ اور کہا۔ واللہ أعلم۔

﴿ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے آپس میں سرگوشی کی، بولے: ﴿ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ﴾ یعنی یہ بات طے ہے کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔ یہ لغت بعض عرب کی ہے۔ یہ قراءت اسی کے اعراب پر آئی ہے، یعنی یہ لوگ ''إِنَّ'' کے اسم و خبر دونوں کو مرفوع بولتے ہیں، ان میں سے بعض نے یوں پڑھا ہے: ''إِنْ هٰذَيْنِ لَسَاحِرَانِ'' یہ مشہور لغت ہے۔ قراءتِ اول کے جواب میں نحویوں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے، ان جوابوں کے ذکر کرنے کی یہ جگہ نہیں ہے۔ غرضیکہ ساحروں نے آپس میں کہا کہ تم جانتے ہو کہ یہ شخص اور اُس کا بھائی، یعنی موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام ساحر، عالم ہیں اور سحر کے پیشے کو خوب جانتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ آج تم پر اور تمھاری قوم پر غلبہ پائیں اور لوگوں پر حاکم اور غالب ہو جائیں اور عام لوگ اُن کی پیروی کریں، فرعون اور اس کے لشکروں سے لڑ پڑیں،

پھر اُس پر ان کی مدد کی جائے اور تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں۔

﴿ وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴾ یعنی اس طریقۂ سحر سے خود مستقل ہو جائیں، یعنی ریاستِ سحر کے مالک ہو جائیں۔ ساحروں نے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ سحر کے سب سے معظم اور مکرم تھے، لوگ ان کی تعظیم وتکریم کیا کرتے تھے۔ اسی سحر کی وجہ سے اُن کے لیے مال و رزق اور وظیفے مقرر تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ دونوں غالب ہو جائیں گے تو تم کو ہلاک کر ڈالیں گے اور ملک سے تم کو نکال دیں گے اور پھر سحر کے میدان میں اکیلے رہ جائیں گے اور سحر کی ریاست خالص انہی کی ہو جائے گی۔ حدیث الفتون میں گزر چکا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ طریقۂ مثلی سے مراد اُن کا ملک اور عیش ہے، جس میں وہ تھے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کے منہ کو اپنی طرف پھیریں، یعنی ان کو متوجہ کریں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ صاحبِ شرف و عقل ہیں۔ ابو صالح نے کہا: "أشرافكم و سرواتكم". امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "بخيركم". امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے طریقۂ مثلی اس وقت بنی اسرائیل تھے، یہ لوگ تعداد اور مال و دولت میں سب سے زیادہ تھے، اس لیے اللہ کے دشمن نے یوں کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اپنی ذات کے واسطے لے جائیں۔ عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے یہ مراد ہے کہ جس طریقے پر تم ہو، اس کو لے جائیں۔[2]

﴿ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم سب ایک صف ہو کر جمع ہو جاؤ اور جو کچھ تمھارے ہاتھوں میں ہے، اس کو ایک ہی بار ڈال دو، تاکہ نظروں کو مبہوت کر دو اور اس پر اور اس کے بھائی پر غالب آجاؤ۔ ﴿ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴾ یعنی ہم میں سے اور اُن میں سے جو غالب آیا، وہ جیت گیا۔ ہم جو ہیں سو ہم کو تو بادشاہ نے عطائے کثیر کا وعدہ کر دیا ہے، رہا وہ سو وہ ریاستِ عظیم کو پہنچے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: ﴿ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ ﴾ یعنی فرعون اس مقام ومجلس سے چلا، تاکہ جس بات کا باہم وعدہ کیا ہے اس کی ضروری چیزوں کو مہیا کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ "تولّٰی" کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حق سے اعراض کیا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ﴾ یعنی اپنے سحر اور حیلہ کو جمع کیا کہ جس سے کید اور مکر کرے گا۔ مراد یہ ہے کہ اس نے جادوگروں کو جمع کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ جادوگر قبط کے دو، اور بنی اسرائیل کے ستر آدمی تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ چار سو۔ کسی نے کہا ہے کہ بارہ ہزار۔ کسی نے کہا ہے کہ چودہ ہزار۔ ابن منذر نے کہا

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٧) تفسير الطبري (١٨/ ٣٣١۔ ٣٣٢)

ہے کہ اسّی ہزار تھے۔[1] اُن کے سوا اور قول بھی ہیں۔ غرضیکہ کتنے ہی ہوں، ہر ایک کے پاس ایک ایک رسی اور ایک ایک عصا تھا۔ ﴿ ثُمَّ اَتٰى ﴾ یعنی پھر فرعون اس موعد پر آیا، جس کی طرف آنے کا باہم وعدہ کیا تھا، اپنی جماعت کے ساتھ جنھیں جمع کر چکا تھا اور موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔

﴿ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى ... الخ ﴾ یہ جملۂ مستانفہ سوال مقدر کا جواب ہے، گویا یوں کہا، جس وقت وہ سب حاضر ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا کہ تمھاری کم بختی، تم اللہ پر جھوٹ مت باندھو۔ انھوں نے فرعون والوں پر ویل اور کم بختی کی بددعا کی اور اللہ پاک پر جھوٹ باندھنے سے ان کو منع کیا، یعنی کسی کو اس کے ساتھ شریک مت کر، یا یہ معنی ہیں کہ جو کچھ میرے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، اس کے سحر ہونے کے مدعی مت بنو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَيْلَكُمْ ﴾ فعل محذوف سے منصوب ہے، تقدیر یہ ہے: "أَلْزَمَهُمُ اللّٰهُ وَيْلًا"[2] یعنی اللہ اُن پر ویل اور خرابی کو لازم کر دے۔ کہا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ندا ہو، جیسے قول ہے: ﴿ يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ﴾ [يٰسٓ: ٥٢] "وہ کہیں گے: ہائے ہماری بربادی! کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھا دیا؟"

"سَحت" جڑ سے اکھیڑ ڈالنے کو کہتے ہیں۔ "سَحت" و "أَسْحَت" کے ایک معنی ہیں۔ اصل میں "سَحْت" بالوں کو جڑ سے اُکھیڑنے کو کہتے ہیں۔ کوفیوں نے سوائے شعبہ کے ﴿ فَيُسْحِتَكُمْ ﴾ حرفِ مضارع کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ "أسحت" سے، یہ بنی تمیم کی لغت ہے۔ باقی قاریوں نے حرفِ مضارع کی زبر سے پڑھا ہے: "سحت" سے، یہ لغت حجاز کی ہے۔ اس کی زبر اس بنیاد پر ہے کہ جواب حرفِ فا کے ساتھ ہے، اس قسم کا جواب نہی منصوب ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "يهلككم". امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "يستأصلكم"[3] امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: "فيذبحكم"[4] مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ پر جھوٹ باندھو گے تو وہ تم کو ہلاک کر دے گا۔ جڑ سے اُکھاڑ ڈالے گا، جس کسی نے اللہ پر جھوٹ باندھا، کوئی سا جھوٹ کیوں نہ ہو، وہ خاسر و ہلاک ہوا۔

﴿ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی جس وقت انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کا کلام سنا تو اُن کے اور اُن کے بھائی کے حق میں باہم مناظرہ و مشورہ کیا اور اس باب میں بات چیت میں خوب کھینچا تانی کی، یعنی کیا یہ دونوں جادوگر ہیں یا رسول ہیں؟ ﴿ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴾ "نجویٰ" بمعنی مناجات ہے۔ "نجویٰ" اسم اور مصدر ہوتا ہے۔ مناجات کے معنی ہیں: باہم راز گفتن، یعنی انھوں نے "نجویٰ" کو موسیٰ علیہ السلام سے چھپایا۔ رہی یہ بات کہ نجویٰ کیا تھا، لہٰذا اس میں کئی قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ "نجویٰ" ان کا یہی قول تھا: ﴿ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ﴾ دوسرا یہ ہے کہ انھوں نے باہم سرگوشی کی تو کہا کہ جو موسیٰ علیہ السلام لائے ہیں، اگر یہ سحر ہے تو ہم ابھی اُن پر غالب ہوں گے اور اگر وہ اللہ کی

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥١١) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٦٠) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٣٢٦) [4] فتح القدير (٣/ ٥١٤)

طرف سے ہے تو انھیں کو غلبہ ہو جائے گا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جو بات انھوں نے چھپائی تھی، وہ یہ ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام ان پر غالب ہو جائیں گے تو وہ اُن کی پیروی کریں گے۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] چوتھا قول یہ ہے کہ وہ یہ بات تھی کہ جس وقت انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول سنا: ﴿ وَيْلَكُمْ ...الخ ﴾ تو کہا کہ یہ قول جادوگر کا نہیں ہے۔

﴿ قَالُوْٓا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بعض نے بعض سے پوشیدہ کہا اور جو کچھ کہا حاصل اس کا چھ جملے ہیں۔ پہلا جملہ یہ ہے: ﴿ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ﴾ اور آخر ان کا ﴿ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴾ ہے۔ ابو عمرو نے اس کو بتشدید "إِنَّ" پڑھا ہے اور اسم اشارہ میں حرف یا لائے ہیں، یعنی "إِنَّ هٰذَيْنِ" اس بنا پر کہ "إِنَّ" کو عامل بہ عمل معروف ٹھہرایا ہے، یعنی اسم کو نصب خبر کو رفع دیتا ہے۔ یہ قراءت عثمان رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہما صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی قراءت حسن و سعید بن جبیر و نخعی وغیرہم تابعین کی ہے اور اسی کو عاصم حجدری و عیسیٰ بن عمر نے پڑھا ہے، جیسا کہ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کو بیان کیا ہے اور یہی قراءت ظاہر اعراب کے موافق اور رسم مصحف کے مخالف ہے۔ اس لیے کہ مصحف میں الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری قراءت ﴿ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ﴾ ہے، "إِنْ" کی تخفیف کے ساتھ اس بنا پر کہ "إِن" نافیہ سے تقدیر یہ ہوگی کہ "مَا هٰذَانِ إِلَّا سَاحِرَانِ" امام زہری، خلیل بن احمد، مفضل، ابان، بن محیصن اور عاصم نے روایتِ حفص میں عاصم سے اسی طرح پڑھا ہے۔ یہ قراءت رسمِ مصحف و اعراب دونوں کے مطابق ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے انھیں کی قراءت کی طرح پڑھا ہے، مگر "هٰذٰنّ" کے نون کو مشدد کیا ہے، یہ تیسری ہوئی۔ چوتھی قراءت یہ ہے: "إِنَّ هٰذٰنِ" نون کی تشدید اور الف کے ساتھ یہ قراءت مدینہ والوں کی اور کوفہ والوں کی اور ابن عامر کی ہے۔ انہوں نے رسم کی موافقت اور اعراب ظاہر کی مخالفت کی ہے۔ اس قراءت کی توجیہ میں اہلِ علم کی ایک جماعت نے کلام کیا ہے۔ امام ابن انباری و نحاس رحمہما اللہ نے اس کا استیفا فرمایا ہے۔[2] توجیہ وجہ بیان کرنے کو کہتے ہیں، جس سے بات ٹھیک ہو جائے۔ لہٰذا ایک مرتبہ توجیہ تو یہ بیان کی ہے کہ یہ بنی الحارث بن کعب و مراد و خثعم و کنانہ کی لغت ہے۔ یہ لوگ تثنیہ کی حالتِ رفعی و نصبی و جری الف سے کرتے ہیں، یعنی تینوں حالتوں میں الف ہی بولتے ہیں۔

امام سیبویہ، اخفش، ابو زید، کسائی اور فراء رحمہم اللہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ قراءت بنی الحارث بن کعب کی لغت پر ہے۔ ابو عبیدہ نے ابو الخطاب سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ لغت بنی کنانہ کی ہے، ان کے غیر نے کہا ہے کہ یہ خثعم کی لغت ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس جگہ "إِنَّ" بمعنی "نَعَم" ہے۔ عاصم اسی کے قائل ہیں، جیسا کہ امام کسائی رحمہ اللہ نے عاصم سے حکایت کیا ہے۔ اسی طرح سیبویہ نے بھی نقل کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں

[1] فتح القدير (٣/ ٥١١)
[2] تفسير القرطبي (١١/ ٢١٦) فتح القدير (٣/ ٥١١۔ ٥١٢)

نے زجاج اور اخفش کو دیکھا کہ وہ اسی طرف جاتے ہیں۔ تقدیر یہ ہوگی: "نعم هذان لساحران" یعنی ہاں یہ دونوں البتہ جادوگر ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: آیت میں معنی یہ ہیں: "إن هذان لهما ساحران" پھر مبتدا، یعنی "هما" حذف کر دیا گیا۔ ابو علی فارسی و ابو الفتح جنی نے اس کا انکار کیا ہے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ الف اس میں اس الف کے ساتھ تشبیہ دیا گیا ہے، جو "یفعلان" میں ہے، اس لیے تغیر نہیں دیا گیا۔ چوتھی یہ ہے کہ حرف "ها" مقدر ہے، یعنی "إنه هذان لساحران" امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کو قدماء نحویین سے حکایت کیا ہے، اسی طرح ابن انباری نے بھی نقل کیا ہے۔ پانچویں یہ ہے کہ جب "هذا" رفع ونصب وجر میں ایک حالت پر الف کے ساتھ کہا جاتا تھا اور تثنیہ واحد کو تغیر نہیں دیتا تھا تو تثنیہ واحد کے قائم مقام کیا گیا، اس لیے رفع ونصب وجر میں الف ثابت رہا۔ یہ قول امام ابن کیسان رحمہ اللہ کا ہے۔

پس یہ پانچ قول اس قراءت کی توجیہ کو متضمن ہیں، اسی وجہ سے کہ بسبب اس کے وہ صحیح ہو جاتی ہے اور خطا سے نکل جاتی ہے اور اسی سے وہ بات بھی دفع ہو جاتی ہے جو عثمان رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ کاتبِ مصحف سے غلطی ہوگئی ہے۔ سبعہ قراءتیں جو یہاں مذکور ہوئیں، ان کا حاصل چار قراءتیں ہیں: ایک تو "إِنَّ هٰذَيْنِ". دوسری: "إِنْ هٰذَانِّ" پہلا نون مخفف دوسرا مشدد۔ تیسری: "إِنَّ هٰذَانِ" اول نون مشدد، دوسرا مخفف۔ چوتھی: "إِنْ هٰذَانِ" دونوں نون مخفف۔

تنبیہ:

اول جو تقریر لکھی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسمِ مصحف ﴿هٰذٰنِ﴾ بہ الف ہے۔ یہ سب تقریر فتح البیان و فتح القدیر کی تھی،[1] مگر جمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسمِ مصحف بدون یا و بغیر الف ہے، اس شکل میں ﴿هٰذٰنِ﴾ جمل کی تقریر یہ ہے کہ بولنے میں اگرچہ ہر ایک کا یاء والف میں قراءتِ سبعیہ صحیحہ متواترہ میں ثابت ہے، لیکن اس جہت سے مشکل ہے، کیونکہ خطِ مصحف امام کے مخالف ہے، اس لیے کہ مصحف میں نہ یا ہے نہ الف، کیوں کہ مصحف کے رسم الخط میں جس طرح کہ سمین میں ہے ﴿هٰذٰنِ﴾ بغیر الف اور یا کے ہے۔ پھر کہا ہے کہ کئی چیزیں خارج از قیاس رسم الخط میں آ گئی ہیں اور اس بات کی تصریح کی ہے کہ ان کے ساتھ قراءت جائز نہیں، یعنی جو اشیائے مرسومہ نطق منقول کے مخالف ہیں، پس اس جگہ جائز نہیں کہ ﴿اِنْ هٰذٰنِ﴾ پڑھیں۔ پس چاہیے کہ یہ جگہ اس قسم سے ہو جو قیاس سے خارج ہو۔ یہ عبارت فتح البیان میں بھی نقل کی ہے۔[2]

غرضیکہ ساحروں نے جو چھے جملے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے حق میں کہے، ان میں سے پہلا جملہ تو یہی تھا کہ بے شک یہ دونوں جادوگر ہیں۔ دوسرا جملہ یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم کو اپنے سحر کے سبب سے، جس کو انھوں نے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥١١۔ ٥١٢) فتح البيان (٨/ ٢٤٨۔ ٢٤٩) [2] فتح السان (٨/ ٢٤٩)

ظاہر کیا ہے، تم کو زمینِ مصر سے نکال دیں۔ تیسرا جملہ یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم کو لے جائیں۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ "طریقة" سے مراد سنت ہے اور "مثلی"، صفت ہے، جس طرح کے "امراۃ کبری" بولتے ہیں۔

عرب کہتے ہیں کہ فلاں " طریقة مثلیٰ" پر ہے، ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ کہتے ہیں: "هولاء طريقة قومهم و طرائق قومهم" یعنی یہ لوگ قوم کے اشراف ہیں۔[1] اسی کے مثل قاموس میں بھی ہے۔[2] "مثلیٰ" "أمثل" کی تانیث ہے۔ "أمثل" افضل کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں کہ فلاں اپنی قوم کا "أمثل" ہے۔ یعنی ان میں سے افضل ہے اور جمع کے لیے "أماثل" کہتے ہیں۔ "مثلیٰ" کو مؤنث ذکر کیا، اس لیے کہ اشراف کی تعبیر "طریقة" سے کی ہے ورنہ معنی کے لحاظ سے "أماثل" کہا جاتا۔ معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے سحر سے غالب ہوگئے تو تمھارے سردار اور اَشراف اُن کی طرف مائل ہو جائیں گے، یا یہ معنی ہیں کہ تمھارے مذہب کو لے جائیں گے، جو امثل یعنی افضل المذاہب ہے۔

چوتھا جملہ یہ ہے: ﴿ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ﴾ اجماع کے معنی احکام وعزم علی الشئی کے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أجمعت على الخروج مثل أزمعت" یعنی میں نے نکلنے پر قصد وعزم کیا۔ حرفِ فا فصیحہ ہے، یعنی جب بات یہ ٹھہری کہ وہ جادوگر ہیں تو تم اپنی تدبیر کو پختہ کرو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: چاہیے کہ تم سب کا عزم مثل "کید" کے جمع ہو اس طریقے سے کہ تم میں سے ایک بھی اس سے پیچھے نہ رہے۔ سارے قاریوں نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ ﴿ فَاَجْمِعُوْا ﴾ کا ہمزہ قطعی ہے، مگر ابوعمرو نے ہمزہ کے وصل اور میم کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے جمع سے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے لیے جو بات محمد بن یزید مبرد سے نقل کی گئی ہے، اس میں یہ ہے کہ مبرد نے کہا: ابوعمرو پر واجب ہے کہ وہ اس قراءت کے خلاف پڑھیں اور وہ وہی قراءت ہے کہ جس پر اکثر لوگ ہیں۔ پانچواں جملہ یہ ہے ﴿ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ﴾ یعنی پھر تم آؤ صف باندھ کر، مجتمع ہو کر تا کہ تمھارے کام کے لیے منظّم ہو اور اس سے تمھاری سخت ہیبت ظاہر ہو اور اس سے خوف طاری ہو۔ یہ قول جمہور مفسرین کا ہے، یعنی جس وقت تم سب جمع ہو کر صف باندھے ہوئے ایک دم آجاؤ گے تو تمھارے کام کا خوب نظم وضبط ہوگا۔ تمھاری سخت ہیبت اُن کے دل میں پڑے گی اور تمھارا خوف اچھی طرح جم جائے گا۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صف کے معنی ہیں مجمع اور مصلیٰ، یعنی جائے نماز کو بھی اور عیدگاہ کو بھی صف کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ تم پھر اس جگہ آؤ جس میں تم اپنی عید اور نماز کے واسطے جمع ہوتے ہو۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَتَيْتُ الصَّفَّ"، بمعنی "أَتَيْتُ الْمُصَلّٰى" صف میں آیا، یعنی عیدگاہ میں آیا۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥١٢) [2] القاموس المحيط (١/ ١٠٥٦)

پس پہلی تفسیر پر ''صَفًّا'' پر زبر حال کی بنا پر ہوگا اور امام ابوعبیدہ کی تفسیر پر مفعولیت کی بنا پر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ہوسکتا ہے کہ یہ معنی ہوں: پھر تم آؤ اس حال میں کہ لوگ صف باندھے ہوئے ہوں۔ اس صورت میں ''صفا'' مصدر ہوگا موضع حال میں، اسی لیے اس کو جمع نہیں کیا۔ ''ثُمَّ اِئْتُوا'' کو ہمزہ کی زیر سے پڑھا ہے۔ اس کے بعد یائے تحتیہ ہے، اور جس نے ہمزہ کو ترک کیا ہے تو اس نے الف کو اس سے بدل لیا ہے۔[1] چھٹا جملہ یہ ہے: ﴿وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾ یعنی فلاح کو پہنچا جو غالب ہوا۔ جس وقت کوئی شخص کسی پر غالب ہو جاتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ''استعلی علیه'' یعنی فلاں فلاں پر غالب ہوگیا۔ یہ سب من جملہ قول ساحرین ہے، جو بعض نے بعض سے کہا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ من جملہ اس قول کے ہے جو فرعون نے ساحروں سے کہا اور یہ جملہ معترضہ ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝٦٥ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝٦٦ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝٦٧ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝٦٨ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝٦٩ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝٧٠

(ان جادوگروں نے) کہا: اے موسیٰ! یا تو تو ڈال یا ہم ہی ہوں پہلے ڈالنے والے؟ (65) اس (موسیٰ) نے کہا: بلکہ تمھی ڈالو، پھر ناگہاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں بلاشبہہ دوڑ رہی ہیں (66) پھر موسیٰ نے اپنے نفس میں خوف محسوس کیا (67) ہم نے کہا: خوف نہ کھا، بے شک تو ہی غالب رہے گا (68) اور جو (لاٹھی) تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اسے ڈال دے، وہ اس کو نگل جائے گی، جو کچھ انھوں نے بنایا ہے، بس انھوں نے تو جادوگر کا فریب بنایا ہے، اور جادوگر جہاں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا (69) چناں چہ جادوگر بے اختیار سجدے میں گر گئے، اور کہنے لگے: ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے (70)

جادوگروں کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی:

اللہ پاک ساحروں کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ جس وقت انھوں نے اور موسیٰ علیہ السلام نے توافق کیا، یعنی مقابلے

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٢٠۔ ٢٢١) فتح القدير (٣/ ٥١٣)

پر آئے تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا یا تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالنے والے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم ہی پہلے ڈالو، یہ اس لیے کہا، تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ وہ کیا سحر کرتے ہیں اور کھلم کھلا اُن کا حال لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ پھر تب ہی اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کے خیال میں آئیں کہ وہ اُن کے جادو سے دوڑتی ہیں۔ دوسری آیت میں اس طرح ہے: ﴿ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٤٤] ''تب انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہنے لگے: عزتِ فرعون کی قسم! بلاشبہ ہم ہی غالب ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴾ [الأعراف: ١١٦] ''پھر جب انھوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں) ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں (لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپوں سے) ڈرایا، اور وہ بہت بڑا جادو لائے تھے۔'' اور اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمْ ... الخ ﴾ اس کی یہ وجہ تھی کہ انھوں نے رسیوں لاٹھیوں میں پارہ رکھ دیا تھا، جس کے سبب سے وہ حرکت کرتی اور مضطرب ہوتی تھیں، ہلتی نہیں تھیں، اس طرح پر دیکھنے والے کے خیال میں اپنے اختیار سے دوڑتی ہوئی معلوم ہونے لگیں، حالانکہ وہ ایک حیلہ اور شعبدہ تھا اور وہ لوگ ایک جمِ غفیر اور جماعتِ کثیر تھی۔ لہٰذا اُن میں سے ہر ایک نے ایک ایک رسی اور ایک ایک لاٹھی ڈال دی، یہاں تک کہ سارا میدان سانپوں سے بھر گیا، ایک دوسرے پر سوار ہونے لگا۔

﴿ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو لوگوں پر اس بات کا خوف ہوا کہ وہ اُن کے جادو کے سبب سے فتنے میں پڑ جائیں گے اور اُن سے دھوکا کھا جائیں گے، اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ سے عصا کو ڈالیں۔ اس پر اللہ پاک نے اسی وقت اُن کو وحی بھیجی کہ تو اس شے کو ڈال دے جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے، یعنی اپنی لاٹھی کو ڈال دے۔ ''فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا صَنَعُوْا'' یعنی پھر اسی وقت وہ نگلنے لگا جو انھوں نے بنایا تھا۔ یہ یوں ہوا کہ وہ عصا ایک بڑا اژدہا بن گیا، جس کے پاؤں گردن اور سر پر ڈاڑھیں ہوں۔ پھر وہ اُن رسیوں اور لاٹھیوں کو ڈھونڈنے لگا، یہاں تک کہ اُن میں سے کچھ نہ چھوڑا سب کو نگل گیا اور جادوگر اور دوسرے لوگ اس واقع کو روشن دن میں چاشت کے وقت دیکھ رہے تھے۔ پس معجزہ قائم ہوا، برہان واضح ہوگئی، حق واقع ہوگیا اور سحر باطل ہوگیا، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا جندب بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت تم کسی ساحر کو پکڑو، تو اس کو مار ڈالو، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ فرمایا کہ وہ امن نہ دیا جائے، جہاں کہیں پایا جائے۔[1] (وقد روى أصله الترمذي موقوفاً و مرفوعاً)

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٦٠) اس کی سند میں ''اسماعیل بن مسلم مکی'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٤٤٦)

جادوگر حق کا مشاہدہ کر کے اس پر ایمان لے آئے:

پھر جب ساحروں نے اس کا معائنہ و مشاہدہ کیا اور وہ سحر کے فنون اور طریقوں اور وجوہ کو سمجھتے تھے تو انھوں نے یقینی طور پر جان لیا کہ یہ جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا ہے، یہ سحر اور حیلوں کے قبیل سے نہیں ہے اور بے شک وہ حق ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، اس پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا، مگر صرف وہی جو کسی شے سے کہہ دے کہ ہو تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس اس وقت وہ اللہ کے لیے سجدے میں گر پڑے اور بولے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے، جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔ اسی لیے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "كَانُوْا أَوَّلَ النَّهَارِ سَحَرَةً وَفِيْ آخِرِ النَّهَارِ شُهَدَآءَ بَرَرَةً" یعنی وہ اول دن میں تو جادوگر تھے اور آخر دن میں شہدائے نیکوکار ہو گئے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اسی ہزار تھے۔ قاسم بن ابی بزہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ستر ہزار تھے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ اوپر تیس ہزار۔ ابوثمامہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ساحرینِ فرعون انیس ہزار تھے۔ امام محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پندرہ ہزار تھے۔ سیدنا کعب احبار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بارہ ہزار تھے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بطریق عکرمہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جادوگر ستر آدمی تھے۔ صبح کو اُٹھے اور شام کو شہداء ہو گئے۔ نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام اوزاعی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت جادوگر سجدے میں گرے تو جنت اُن کے لیے ظاہر کی گئی، یہاں تک کہ انھوں نے اس کی طرف نظر کی۔ نیز سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اپنی منازل کو دیکھ لیا، وہ ان کے لیے ظاہر ہو گئیں، اس حالت میں کہ وہ اپنے سجدے میں تھے۔ اسی طرح امام عکرمہ و قاسم بن ابی بزہ رحمہما اللہ نے کہا ہے۔ كذا في ابن كثير.[1]

﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴾ یہ جملۂ مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا یوں کہا گیا کہ ساحروں نے جو آپس میں بات چیت کی تو اُس کے بعد انھوں نے کیا کیا؟ پس اس کا یہ جواب ہے کہ انھوں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالیں۔ ﴿ اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ ﴾ میں تین وجہ ہیں:[2] ایک یہ ہے کہ منصوب بہ فعلِ مضمر ہے۔ یعنی "اِخْتَرْ أَحَدَ الْأَمْرَيْنِ"۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے یہی تقدیر کی ہے، یہ تفسیر معنی کی ہے اعراب کی نہیں ہے۔ اعراب کی تفسیر یہ ہے: "أما تختار الإلقاء" مطلب یہ ہے کہ ان دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کر لو، پہلے تم ڈالو یا ہم پہلے ڈالیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یہ مرفوع ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "الأمر إما إلقاءك أول أو إلقاءنا"۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے یہی تقدیر کی ہے۔ یعنی امر پہلے یا تمھارا ڈالنا ہے یا ہمارا ڈالنا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِلْقَاءُكَ أَوَّلُ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۴۲۸) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۱۲)
[2] الكشاف (۳/ ۷۴)

أَوْ إِلْقَاءُنَا أَوَّلُ". اس وجہ پر دلیل یہ قول ہے: ﴿ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى ﴾ شیخ نے اسی وجہ کو پسند کیا ہے۔

﴿ تُلۡقِىَ ﴾ کا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إما أن تلقي ما تلقيه أولا و إما أن نكون نحن أول من ألقىٰ ما يلقيه أو أول ما يفعل الإلقاء". "القاء" سے مراد عصا کا زمین پر ڈالنا ہے۔ ساحروں کے پاس بھی لاٹھیاں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اس دن ڈالا تھا جس دن وہ فرعون پر داخل ہوئے تھے۔ پھر جب ساحروں نے ان سے مقابلہ کرنا چاہا تو اُن سے یہ بات کہی۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے حسنِ ادب کا برتاؤ کیا، گویا اللہ پاک نے اُن کو اس بات کا الہام فرمایا اور اُس کی برکت اُن کو پہنچی۔ موسیٰ علیہ السلام اس بات کو جان گئے تھے کہ وہ پہلے ڈالنے کو اختیار کریں گے۔ اس پر انھوں نے اُن سے کہا کہ تم ہی پہلے ڈالو۔ یا اُن کو پہلے ڈالنے کا حکم، اس لیے کیا کہ ان کا معجزہ زیادہ تر ظاہر ہو، جبکہ ساحر لوگ اپنی رسیاں لاٹھیاں ڈال دیں، پھر یہ اپنے عصا کو ڈالیں اور وہ اُن سب کو نگل جائے اور اُن کا سلطان اور غلبہ ظاہر ہو۔ یا اس لیے اُن کو پہلے ڈالنے کا حکم دیا کہ اُن کے حسنِ ادب کا جواب احسنِ ادب کے ساتھ دیں۔ یہ بات ظاہر کرنے کو کہ اُن کے سحر کی کچھ پروا نہیں ہے، لو تم ہی پہلے ڈالو۔

﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ ﴾ یہاں کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَأَلْقَوْا فَإِذَا حِبَالُهُمْ" حرفِ فا فصیحہ ہے۔ اور "إذا" مفاجاۃ کے لیے ہے یا ظرفیہ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پھر ساحروں نے اپنی رسیاں لاٹھیاں ڈالیں تو اچانک موسیٰ علیہ السلام پر وہ وقت آیا کہ وہ خیال کریں کہ اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں۔ جمل میں ہے کہ "إذا" مفاجاۃ کے لیے ہے، یعنی اچانک ہونے کے لیے اور ﴿ حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ ﴾ مبتدا ہے اور اس کی خبر جملہ ﴿ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ... الخ ﴾ ہے، رابطہ ضمیر ﴿ اَنَّهَا ﴾ ہے ﴿ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ ﴾ کا۔ ﴿ مِنۡ ﴾ واسطے تعلیل کے ہے، یعنی بسبب ان کے جادو کے۔ ﴿ اَنَّهَا تَسۡعٰى ﴾ نائب فاعل ہے ﴿ يُخَيَّلُ ﴾ کا۔ سمین کی عبارت یہ ہے کہ حرف فا ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ ﴾ کا عاطفہ ہے جملہ محذوف پر، جس پر سیاقِ کلام دلیل ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فألقوا فإذا" اور یہ "إذا" وہی ہے جو مفاجاۃ کے لیے ہوتا ہے اور اس میں تین قول ہیں، جو گزر چکے ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ "إذا" ظرفیتِ زمان پر باقی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ظرفِ مکان ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ حرف ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحقیق اس میں یہ ہے کہ یہ "إذا" وہی ہے جو وقت کے معنی میں ہوتا ہے، اپنے لیے ناصب کا طالب ہے اور ایک جملہ چاہتا ہے جس کی طرف مضاف ہو۔ بعض جگہ میں یہ "إذا" اس بات کے ساتھ مخصوص ہے کہ اس کا ناصب ایک قول مخصوص ہو اور وہ فعل ہے مفاجاۃ کا اور یہ جملہ ابتدائیہ ہے نہ کچھ اور۔

پس ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ ﴾ کی تقدیر یہ ہے: "ففاجأ موسى وقت تخييل سعي حبالهم و عصيهم" اور یہ ایک تمثیل ہے: "والمعنى على مفاجأته حبالهم و عصيهم مخيلة إليه السعي".[1]

[1] الکشاف (۳/ ۷۵)

امام حسن رحمہ اللہ نے ”عُصیھم“ عین کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن ذکوان رحمہ اللہ نے ”تخیل“ تائے فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس لیے کہ عصی وحبال مونث ہیں اور روح نے بھی یعقوب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ”نخیل“ نون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اس بنا پر کہ اللہ پاک اس کا ”مُخَيِّل“ ہے اور ﴿ يُخَيَّلُ ﴾ یائے تحتیہ کے ساتھ معروف کے صیغہ سے بھی پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ”مُخَيِّل“ کید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ”مخيل أنها تسعى“ ہے۔ اس صورت میں ”أَنَّ“ موضع رفع میں ہوگا۔ یعنی ”يخيل إليه سعيها، ذكر معناه الزجاج“۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موضع نصب میں ہے۔ ”أي بأنها“ پھر حرفِ با حذف کر دیا گیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے تائے فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے ان کو موضع نصب میں ٹھہرایا ہے۔ ”أي تخيل إليه ذات سعي“ کہا، اور یہ بھی جائز ہے کہ موضع رفع میں ہو اس بنا پر کہ بدلِ اشتمال ٹھہرے ضمیر ”تخیل“ سے جو حبال اور عصی کی طرف راجع ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”خيل إليه إذا شبه له و أدخل عليه التهمة والشبهة“۔[1] رسیوں لاٹھیوں کا دوڑنا اس لیے خیال میں آیا کہ انھوں نے اُن پر پارا لتھیڑ دیا تھا، پھر جس وقت اُن کو سورج کی گرمی پہنچی تو وہ کانپنے ہلنے لگیں، موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آیا کہ وہ ہل رہی ہیں۔

﴿ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴾. ”أوجس“ کے معنی ہیں: ”أحس“ یا ”وجد“ یا ”أضمر“ یا ”خاف“۔ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو ہلتے دیکھا تو ڈرے، اس لیے کہ جو شے خوف کی ہوتی ہے تو طبیعتِ بشری کو اس کے مشاہدہ کے وقت خوف محسوس ہوتا ہے، یا اس بات سے ڈرے کہ اُن کے عصا ڈالنے سے پہلے لوگ فتنے میں پڑ جائیں یا اس واسطے کہ شاید اُن کو اس بات کا حکم تھا کہ بغیر وحی کے کوئی شے نہ کریں۔ پھر جب اسی محفل میں وحی اترنے میں دیر ہوئی تو شرمندہ رہ گئے۔ ابن عادل رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ خوف کا سبب یہ ہے کہ ان کا سحر اسی جنس سے تھا، جو موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو عصا میں دکھایا تھا۔ اس لیے ڈرے کہ اُن کا کام لوگوں پر ملتبس (پوشیدہ) ہو جائے تو وہ ایمان نہ لائیں۔ اس پر اللہ پاک نے یہ خوش خبری دی اور ان کے خوف کو دور کر دیا۔

﴿ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴾ یعنی ہم نے کہا: خوف مت کر۔ یہ بات طے ہے کہ تو ہی اُن پر مستعلی اور غالب ہے۔ کامیابی اور غلبہ تجھے ہی حاصل ہوگا۔ جملہ ﴿ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴾ نہی کی تعلیل ہے، یعنی تو اس لیے مت ڈر کہ فتح مند تو ہی ہوگا۔ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ ساحروں کو ایک طرح کی برتری اور غلبہ تھا، اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جی میں خوف محسوس کیا، پس اللہ پاک نے کئی قسم کے مبالغے سے اس کو رد فرمایا، ایک یہ ہے کہ

[1] فتح القدير (٣/ ٥١٣۔ ٥١٤) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٣١٤)

﴿ اِنَّ ﴾ کلمہ تاکید کو ذکر کیا، دوسرے ضمیر کی تکرار فرمائی۔ تیسرے لامِ تعریف کا ذکر فرمایا۔ چوتھے لفظِ علو کا استعمال کیا۔ علو کہتے ہیں ظاہری غلبے کو۔ وهذا يكفي فيه ظن العلو في أمرهم لا أن الأعلى لمجرد الزيادة لأنه لم يكن للسحرة علو حتى يكون هو أعلى منهم كما قيل. قاله الكرخي.

﴿ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ ﴾ سے مراد عصا ہے۔ یوں نہ کہا کہ "ألق عصاك". بلکہ اس کو مبہم کر کے یوں فرمایا کہ جو شے تیرے داہنے ہاتھ میں ہے، اس کو ڈال دے۔ اس ابہام کی دو وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ اس سے تعظیم اور بڑائی مراد ہے، یعنی تو ان رسیوں اور لاٹھیوں کی کچھ پروا نہ کر، کیوں کہ تیرے داہنے ہاتھ میں ایک ایسی شے ہے، جو اُن سب سے زیادہ بڑی ہے اور یہ باوجود کثرت کے اس کے مقابلے میں کم تر ہیں۔ تو تُو اس کو ڈال دے اور اُن کی رسیوں اور لاٹھیوں کے بہت ہونے کی کچھ پروا نہ کر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابہام ان کی تصغیر اور تحقیر کے لیے ہے، یعنی یہ چھوٹی لکڑی تنہا، چھوٹی سی جو تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کو ڈال دے، کیونکہ یہ باوجود اکیلی ہونے کے اور چھوٹی ہونے کے اور اُن کی کثرت اور بڑائی کے اللہ پاک کی قدرت سے اُن کو نگل جائے گی۔

﴿ تَلْقَفْ ﴾ کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ جواب ہے امر کا اور "تَلَقَّفْ" لام کی شد سے بھی پڑھا ہے۔ اصل میں "تتلقف" تھا، ایک تا کو حذف کر دیا اور لام کے سکون سے بھی پڑھا گیا ہے، جب کوئی شخص کسی شے کو سرعت کے ساتھ نگل جاتا ہے تو کہتے ہیں: "لقفه" یعنی وہ اس شے کو ہڑپ کر گیا۔ اس کو زبر سے بھی پڑھا ہے۔ اس تقدیر پر کہ "فإنها تلقف". امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جزم کی قراءت میں تو امر کا جواب ہے اور رفع حال کے معنی کی بنا پر جائز ہے، گویا یوں کہا: "ألقها متلقفة ما صنعوا"[1] یعنی تو اس کو ڈال دے۔ درآنحالیکہ وہ نگلنے والا ہے ان رسیوں اور لاٹھیوں کو جو انھوں نے بنائی ہیں، جملہ ﴿ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ﴾ تعلیل ہے۔ "تلقف" کی اور "کید" پر پیش اس لیے ہے کہ وہ "إنَّ" کی خبر ہے۔

کوفیوں کی قراءت سوائے امام عاصم رحمہ اللہ کے یہی ہے۔ انھوں نے "سحر" سین کی زیر کے ساتھ اور حائے مہملہ کے سکون سے پڑھا ہے۔ "کید" کی اضافت "سحر" کی طرف اتساع کی بنا پر ہے بغیر تقدیر کے، یا "ذي سحر" کی تقدیر کے ساتھ۔ باقی قاریوں نے "کید ساحر" پڑھا ہے،[2] یعنی عصا اُن کی رسیوں وغیرہ کو اس لیے نگل جائے گا کہ انھوں نے جو بنایا ہے، وہ "کید ساحر" کی جنس سے ہے، یعنی جو شے انھوں نے بنائی ہے، وہ "کید" ہے "ساحر" کا، یا ان کا کیا دھرا اور کام "ساحر" کا "کید" ہے۔

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ یہ قول تتمہ تعلیل سے ہے، یعنی کامیاب نہیں ہوتا جادوگر جہاں کہیں بھی ہو اور جس طرف توجہ کرے۔ "ساحر" سے مراد جنس "ساحر" ہے، اسی لیے جمع کے صیغے سے نہیں فرمایا۔ امام زمخشری رحمہ اللہ

---

[1] معانی القرآن (۳/ ۳۶۷) [2] تفسیر القرطبي (۱۱/ ۲۲۳_ ۲۲۴)

نے کہا ہے کہ اس کلام میں جنسیت کے معنی چاہے گئے ہیں، عدد کے معنی نہیں۔ پس اگر جمع کا صیغہ لایا جاتا تو یہ خیال پیدا ہوتا کہ مقصود عدد ہی ہے۔[1]

﴿ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا ﴾ یعنی پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ اُن کی ساری بنائی ہوئی چیزوں کو نگل گیا، لہٰذا اس بات نے جو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام اور عصا سے مشاہدہ کی، ان کو سجدے میں ڈالا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساحر لوگ سجدے میں اس لیے گرے کہ وہ سحر کے اعلیٰ درجے میں تھے، پھر جب انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے کام کو اپنی استعداد اور کاریگری سے خارج دیکھا تو پہچان گئے کہ وہ سحر کی چیزوں میں سے نہیں ہے۔ اس کی تحقیق سورۃ الاعرف میں گزر چکی ہے۔[2] صاحبِ کشاف نے کہا: سبحان اللہ! ان کا کام کیا عجیب ہوا کہ انھوں نے تو اپنی رسیاں کفر اور انکار کے واسطے ڈالی تھیں، پھر گھڑی بھر کے بعد اپنے سر شکر اور سجدے کے لیے ڈال دیے۔ لہٰذا دونوں کے ڈالنے میں کتنا بڑا فرق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنے سر نہیں اُٹھائے، یہاں تک کہ جنت، نار، ثواب اور عذاب کو نہ دیکھ لیا۔[3]

﴿ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴾ اس جگہ ساحروں کا کلام نقل کرنے میں ہارون علیہ السلام کا نام موسیٰ علیہ السلام کے نام سے پہلے لیا اور سورۃ الشعراء میں بعد میں لیا۔[4] لہٰذا اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ فواصل آیات کی رعایت فرمائی اور توافق رؤسِ آیات کا لحاظ رکھا۔ دوسری یہ ہے کہ حرفِ واؤ ترتیب کو ظاہر نہیں کرتا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون کے ساحر نو سو تھے۔ انھوں نے فرعون سے کہا: اگر یہ دونوں ساحر ہیں تو ہم ہی ان پر غالب ہوں گے، کیونکہ ہم سے بڑھ کر کوئی ساحر نہیں ہے۔ اگر وہ دونوں رب العالمین کی طرف سے ہیں تو ہم کو رب العالمین کے مقابلے کی کسی طرح طاقت نہیں ہے۔

پھر جب اُن کی یہ حالت ہوئی کہ وہ سجدے میں گر پڑے تو اللہ پاک نے اُن کو اُن کے سجدے ہی میں اُن کے منازل دکھا دیے، جن کی طرف وہ جنت میں جائیں گے۔ اس وقت انھوں نے یہ بات کہی اور یہ بھی کہا: ﴿ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؀ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [طٰهٰ: ٧٢۔ ٧٣] ''وہ کہنے لگے: ہم تجھے کبھی ترجیح نہیں دیں گے اُن واضح دلائل پر جو ہمارے پاس آچکے اور نہ اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا، لہٰذا تو جو کر سکتا ہے کر گزر، بس تو تو اس دنیاوی زندگی ہی کا فیصلہ کرے گا۔ بے شک ہم اپنے رب پر ایمان لائے ہیں، تاکہ وہ ہمیں بخش دے ہماری خطائیں اور وہ جادو بھی جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا، اور اللہ بہت بہتر اور وہی باقی رہنے والا ہے۔''[5]

---

[1] الکشاف (٣/ ٧٦) [2] رقم الآیة [١٢٠] [3] الکشاف (٣/ ٧٧) [4] رقم الآیة [٤٨] [5] الدر المنثور (٥/ ٥٨٦۔ ٥٨٧)

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ
عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ
عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿٧١﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ
وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا ﴿٧٢﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَلَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ
مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿٧٣﴾

فرعون نے کہا: کیا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لائے ہو؟ یقیناً یہ تمھارا بڑا ہی تو ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا، لہٰذا میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں ایک دوسرے کی مخالف سمتوں سے ضرور کٹواؤں گا، اور تمھیں کھجور کے تنوں پر ضرور سولی دوں گا، اور تمھیں ضرور معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے (71) وہ کہنے لگے: ہم تجھے کبھی ترجیح نہیں دیں گے اُن واضح دلائل پر جو ہمارے پاس آچکے اور نہ اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا، لہٰذا تو جو کرسکتا ہے کر گزر، بس تو تو اس دنیاوی زندگی ہی کا فیصلہ کرے گا (72) بے شک ہم اپنے رب پر ایمان لائے ہیں، تاکہ وہ ہمیں بخش دے ہماری خطائیں اور وہ جادو بھی جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا، اور اللہ بہت بہتر اور وہی باقی رہنے والا ہے (73)

فرعون کی طرف سے جادوگروں کی سرزنش:

تمھارا بڑا جس نے جادو سکھایا، یہ شاید سب کو کہنے لگا۔ جادو پر مجبور کیا۔ کہتے ہیں جادوگر موسیٰ علیہ السلام کی نشانی دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ یہ جادو نہیں ہے، وہ مقابلہ نہ کرتے، مگر فرعون کی خاطر کیا۔ شاید فرعون جو ڈراتا تھا اس کا اثر نہ ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کی نشانی سے دل ڈر گئے۔

اللہ پاک فرعون کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس نے کفر وعناد اور بغاوت اور سرکشی کی اور حق کا باطل کے ساتھ مقابلہ کیا، جس وقت اس نے معجزۂ باہرہ وآیتِ عظیمہ سے دیکھا جو کچھ دیکھا اور اُن لوگوں کو دیکھا جن سے اس نے مدد چاہی کہ وہ سب لوگوں کے روبرو ایمان لے آئے اور ہر طرح سے مغلوب ومقہور ہوا تو پھر مناظرہ اور بہتان طرازی شروع کر دی اور ساحروں میں اپنی شان اور غلبہ استعمال کرنے کی طرف مائل ہوا تو اُن کو دھمکایا، ڈانٹا اور ڈرایا ور کہا: ﴿ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ﴾ یعنی تم نے موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کر لی، حالانکہ میں نے تم کو اس کا حکم

نہیں دیا اور مجھ پر تم نے اس بارے میں اتفاق کر لیا۔ اس نے ایسی بات کہی جس کا بہتان اور جھوٹ ہونا وہ خود اور ساحر اور ساری خلق جانتی ہے۔

﴿ إِنَّهُ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾ یعنی تم جو ہو سو تم نے جادو کو موسیٰ علیہ السلام سے لیا ہے اور تم اور وہ میری رعیت کے خلاف متحد ہو گئے ہو، تا کہ تم غلبہ حاصل کرو، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ إِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٣] ''بے شک یہ مکر ہے، تم نے اس شہر میں (مل کر) یہ مکر کیا ہے، تا کہ یہاں رہنے والوں کو اس (شہر) سے نکال دو، پھر جلد ہی (اس کا نتیجہ) تم جان لو گے۔'' پھر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور دھمکی دینے لگا تو یہ کہا: ﴿ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ یعنی میں تمھارا مثلہ کر دوں گا، البتہ تم کو قتل کروں گا اور تمھاری تشہیر کروں گا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس فرعون پہلا وہ شخص ہوا جس نے ایسا کیا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

﴿ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴾ یعنی تم تو کہتے ہو کہ میں اور میری قوم گمراہی پر ہے اور تم موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کے ساتھ ہدایت پر ہو۔ لہٰذا اب تم جان لو گے کہ کس کے لیے عذاب ہوتا ہے اور اس میں کون باقی رہتا ہے۔ پھر جب فرعون نے اس بات کے ساتھ اُن پر حملہ کیا اور اُن کو وعید سنائی تو اُن کی جانیں اُن پر سہل ہو گئیں اللہ عزوجل کی راہ میں۔ اور وہ بولے: ﴿ لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ ﴾ یعنی ہم ہرگز تجھ کو اختیار نہ کریں گے، اس ہدایت اور یقین پر جو ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔ ﴿ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا ﴾ احتمال ہے کہ یہ قسم ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ بینات پر معطوف ہو، یعنی ہم تجھ کو اختیار نہ کریں گے اپنے فاطر اور خالق پر، جس نے ہم کو ایجاد کیا عدم سے، جو ابتدا کرنے والا ہے ہماری خلق کا مٹی سے، لہٰذا عبادت وخضوع وزاری کا مستحق اور لائق وہی ہے تو نہیں۔ ﴿ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ﴾ یعنی جو تو چاہے پس کر ڈال اور جہاں تک تیرا ہاتھ پہنچے وہ کر لے۔ ﴿ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾ یعنی تیرا تسلط تو اس دارِ دنیا میں ہے اور وہ دار الزوال ہے اور ہم دار القرار کی طرف راغب ہو چکے ہیں۔ ﴿ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا ﴾ یعنی ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے، تا کہ جو گناہ ہم سے ہوئے ہیں، وہ اُن کو بخش دے، خاص کر وہ جادو جو تو نے ہم سے زبردستی کرایا ہے، تا کہ تو اس سے اللہ پاک کی نشانی کا مقابلہ کرے اور اس کے نبی کے معجزے کا مقابلہ کرے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بطریق امام عکرمہ رحمہ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے چالیس لڑکے پکڑے۔ پھر حکم دیا کہ ان کو فرما (ایک مقام کا نام) میں سحر سکھایا جائے اور کہا کہ اُن کو ایسی

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢١٣)

تعلیم دو جس کو زمین میں کوئی نہ جانے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس وہ لڑکے انھیں لوگوں میں سے ہیں، جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور وہ انھیں میں سے ہیں جنھوں نے کہا: ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ﴾۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ یعنی اللہ پاک ہمارے واسطے تجھ سے بہتر ہے اور زیادہ تر دائم ہے برائے ثواب اس چیز کی نسبت جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا اور ہم کو آرزو مند کیا تھا۔ (وهو رواية عن ابن إسحق رحمه الله) محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ اللہ ہمارے واسطے بہتر ہے تجھ سے، اگر اس کی اطاعت کی جائے۔ ﴿ وَاَبْقٰى ﴾ یعنی باقی تر ہے تجھ سے برائے عذاب اگر اس کی نافرمانی کی جائے۔ (وروى نحوه موقوفاً عن ابن إسحق أيضًا)۔[1] ظاہر یہ ہے کہ فرعون ملعون نے اس بات پر عزمِ مصمم کیا اور اُن کے ساتھ کر گزرا، یہ ایک رحمت تھی ان کے واسطے اللہ پاک کی طرف سے اور اسی لیے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سلف نے فرمایا ہے کہ "أصبحوا سحرة و أمسوا شهداء"[2] یعنی صبح کو تو جادوگر اُٹھے اور شام کو شہید ہو گئے۔ اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون ملعون نے ان کو شہید کر ڈالا۔

ایمان کا صلہ حرفِ لام اور حرفِ با دونوں طرح آتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "آمن له و آمن به" اول کی مثال یہ ہے: ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ [العنكبوت: ٢٦] "پھر ابراہیم پر لوط ایمان لایا۔" دوسرے کی مثال یہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ﴾ [الأعراف: ١٢٣] "تم میرے اجازت دینے سے پہلے اس پر ایمان لے آئے ہو؟" کسی نے کہا ہے کہ یہاں حرفِ لام سے صلہ اس لیے آتا ہے کہ فعل میں اتباع کے معنی شامل ہیں، یعنی "اِتَّبَعْتُمْ لَهٗ". ﴿ اٰمَنْتُمْ ﴾ میں تین قراءتیں ہیں: ایک تو بہ تحقیق ہر دو ہمزہ؛ پہلا ہمزہ استفہام کا، دوسرا وہ ہمزہ جو فعل میں زاید ہے۔ تیسرا ہمزہ جو فائے فعل تھا، وہ الف سے بدلا گیا۔ اصل یہ تھی "أَ أَ أمنتم" بدلنے کے بعد یہ شکل ہوئی: "أَ آمنتم". دوسری قراءت پہلے ہمزہ کے حذف سے، یعنی ﴿ اٰمَنْتُمْ ﴾ تیسرے بتسہیل ہمزۂ ثانیہ۔ رہی چوتھی قراءت جو سورۃ الاعراف میں ہے، یعنی پہلے ہمزہ کا واو سے بدلنا، لہٰذا وہ یہاں نہیں آ سکتی، اس لیے کہ یہاں پہلے ہمزہ کے شروع میں ضمہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ہمزہ کو واو سے بدل لیں۔ بخلاف سورۃ الاعراف کے کہ وہاں ہمزۂ اولیٰ کے پہلے ضمہ ہے۔ لہٰذا فاعل کی تصریح کے لیے ہمزہ کو واو سے بدل لیا ہے۔ نظمِ قرآنی کی صورت وہاں یوں ہے: "قال فرعون أَ أٰ مَنتُم له" یہ شکل ہے "فرعونو آمنتم" اور تینوں قراءتیں مذکورہ سبعیہ ہیں۔ استفہام یہاں پر ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، یعنی اے جادوگرو! بغیر میرے اذن کے اس پر ایمان کیوں کر لے آئے۔

﴿ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾ یعنی البتہ وہ تم سے بڑا جادوگر ہے اور جادوگری میں تم سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ پس جو ایمان تم نے ظاہر کیا ہے، اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے، اس لیے کہ تم اس کے اتباع اور

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٤١۔ ٣٤٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٨) [2] تفسير الطبري (١٣/ ٣٥۔ ٣٦)

فرمانبرداروں سے ہو، تم نے اس کے ساتھ موافقت کر لی ہے۔ یا کبیر کے معنی معلم و استاذ کے ہیں، چنانچہ اس پر ﴿ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾ دلیل ہے، یعنی تم اس کے شاگرد ہو سحر میں۔ لہٰذا تم نے اس کے ساتھ صلح و موافقت کر لی ہے، اس بات پر کہ اس کے کام کو رواج دیں اور اُس کی شان بڑھا کر اپنی طرف سے عاجزی ظاہر کریں۔

"کبیر" بمعنی "معلم" حجاز کا لغت ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حجاز میں جس وقت لڑکا اپنے معلم کے پاس آتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ "جئت من عند کبیري" یعنی میں اپنے استاد کے پاس سے آیا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ ﴾ کے معنی: "إنه لعظیم السحر" یعنی وہ بڑا جادوگر ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت میں کبیر رئیس کو کہتے ہیں اور اسی لیے معلم کو کبیر بولتے ہیں۔[1] فرعون نے اس قول سے یہ چاہا کہ لوگوں پر شبہہ داخل کرے، تاکہ وہ ایمان نہ لائیں، ورنہ وہ تو خوب جانتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سے انھوں نے سحر نہیں سیکھا اور نہ ہی وہ اُن کے رئیس تھے، نہ ہی اُن کے اور جادوگروں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ اور ملاقات تھی۔

﴿ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ﴾ یعنی واللہ! میں ضرور تمھارے ہاتھ پاؤں اس طریقے سے کاٹوں گا کہ سیدھا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے، یعنی اُن دونوں اعضا سے جو ایک دوسرے کے مخالف ہے کہ یہ ہاتھ ہے، وہ پاؤں ہے، یہ سیدھا ہے اور وہ بایاں ہے، یعنی ان کو مختلف کاٹوں گا۔ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے، گویا کاٹنا مخالفت عضو للعضو سے شروع ہوگا۔ ﴿ وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ "صلب" کے معنی ہیں بردار کردن۔ تصلیب بروزن تفعیل مبالغہ کے لیے ہے۔ "جِذع" زیر کے ساتھ درخت کا تنا، "جذوع" اس کی جمع ہے۔ "نخل" درخت کھجور کا۔ ﴿ فِيْ ﴾ بہ معنی "علی" ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ﴾ [الطور: ٣٨] "أي علیه" "کیا ان کے لیے کوئی سیڑھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے (چڑھ کر آسمان کی باتیں) سن لیتے ہیں؟" یعنی تم کو سولی دوں گا کھجور کے تنوں پر۔

رہی یہ بات کہ کلمہ ﴿ فِيْ ﴾ کو اختیار کیا، جو بہ معنی "علیٰ" ہے، کلمہ "علیٰ" نہ کہا؟ لہٰذا یہ بات بتانے کو کہ وہ اس پر مستقر ہوں گے، قرار پکڑیں گے، جس طرح برتن میں ڈالی ہوئی چیز برتن میں قرار پکڑتی ہے۔ وھذا ھو المشھور. یعنی یہ بات نہ ہوگی کہ سولی دے کر اُتار لیے جائیں، بلکہ تشہیر کے لیے رسی پر لٹکے رہیں گے۔ کھجور کی تخصیص اس لیے کی کہ اس کے تنے لمبے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ فرعون نے کھجور کے تنوں کو کھلوایا، یہاں تک کہ ان کو جوف دار کیا اور ساحروں کو ان میں رکھ دیا، پھر وہ بھوک اور پیاس کے مارے مر گئے۔ یہ معنی حقیقت کی بنا پر ہیں، جس طرح کہ پہلے معنی مجاز کی بنیاد پر تھے۔ اولیٰ معنی اول ہیں، یعنی اس معنی پر ظرفیت حقیقی ٹھہرے گی اور معنی

[1] فتح القدیر (٣/ ٥١٥)

اول پر مجازی ہوگی۔

﴿ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰی ﴾ یعنی البتہ تم ضرور جان لو گے کہ تم جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے ہو، آیا اس پر میرا عذاب تمھارے واسطے سخت تر ہے یا موسیٰ علیہ السلام کا۔ ﴿ اَبۡقٰی ﴾ کے معنی ہیں زیادہ تر دائم رہنے والا۔ ملعون کی مراد اس کلام سے ٹھٹھا کرنا ہے موسیٰ علیہ السلام سے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو عذاب کرنے کی کچھ قدرت نہ تھی۔ یا عذاب سے مراد وہ عذاب ہے، جس کی موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو دھمکی دی تھی، جبکہ وہ ایمان نہ لائیں یا اُن کی مراد موسیٰ علیہ السلام کے عذاب سے اُن کے رب کا عذاب ہے بحذفِ مضاف، یا اس طرف اشارہ کیا کہ اُن کا ایمان معجزے کے مشاہدے سے پیدا نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام کے خوف سے ہے، جبکہ انھوں نے وہ بات دیکھی، جو اُن کے عصا سے واقع ہوئی۔ غرضیکہ کچھ بھی ہو ساحر لوگ فرعون کی وعید اور دھمکی کی کچھ پروا نہ کر کے بولے:

﴿ لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ ﴾ یعنی ہم ہرگز تجھ کو اختیار نہ کریں گے، اس بات پر جس کو موسیٰ علیہ السلام لائے یا ان واضح معجزوں پر جو اُن کے ہاتھ پر اللہ پاک کے پاس سے ہمارے نزدیک آئے، جیسے: عصا اور یدِ بیضا۔ کسی نے کہا: "بینات" سے مراد وہ منازل ہیں جو اُن کے واسطے جنت میں مہیا کیے گئے، جن کو انھوں نے اپنے سجدے میں دیکھ لیا تھا۔ رہی یہ بات کہ بینات کے آنے کو انھوں نے اپنی طرف منسوب کیا، حالانکہ وہ اُن کے لیے اور دوسروں کے لیے آئے ہیں، لہٰذا اس کے دو وجوہ ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ سحر کو اپنے غیر سے زیادہ جانتے تھے اور وہ جان چکے تھے کہ جو موسیٰ علیہ السلام لائے ہیں وہ سحر نہیں ہے تو اُن کو معجز اور غیر معجز کا بہ خوبی علم ہوگیا اور اُن کے سوا اور لوگ مثل مقلد کے ہوئے۔ پس حقیقت میں وہ نشانیاں انھیں کے واسطے آئیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن سے نفع لینے والے وہی ہیں نہ کہ ان کے علاوہ دوسرے۔

﴿ وَالَّذِیۡ فَطَرَنَا ﴾ معطوف ہے ﴿ مَا جَآءَنَا ﴾ پر۔ ﴿ فَطَرَنَا ﴾ کے معنی "خلقنا" ہیں، یعنی ہم ہرگز تجھ کو اختیار نہ کریں گے ان نشانیوں پر جن کو موسیٰ علیہ السلام لائے اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا۔ رہی یہ بات کہ باری تعالیٰ کے ذکر کو بعد میں کیا، لہٰذا یہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ واو قسم کا ہے اور موصول مقسم بہ ہے اور جواب قسم کا محذوف ہے، یعنی قسم ہے اس ذات کی، یعنی حق تعالیٰ کی، جس نے ہم کو پیدا کیا یا قسم ہے اس اللہ کی جس نے ہم کو بنایا! ہم ہرگز تجھ کو حق پر اختیار نہ کریں گے۔ امام فراء، زجاج اور سمین رحمہم اللہ نے یہی دو وجہ آیت کی تفسیر میں ذکر کی ہیں۔[1]

﴿ فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ﴾ ساحروں کی طرف سے فرعون کے اس قول کا جواب ہے: ﴿ فَلَاُقَطِّعَنَّ

[1] فتح القدیر (۳/ ۵۱۶)

﴿ اَيْدِيَكُمْ ... الخ﴾ یعنی تو جو مار ڈالنا، سولی دینا وغیرہ کرنے والا ہے، اس کو کر گزر اور جس بات کا تو حکم دینے والا ہے، وہ دے دے۔ تقدیر یہ ہے: ''فاصنع ما أنت صانعه'' قرآن شریف میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ فرعون نے ساحروں کو جس امر کی دھمکی دی تھی، وہ اُن کے ساتھ کیا ہو اور اخبار میں بھی یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] بعض تفاسیر میں ذکر کیا ہے کہ وہ کام اُن سے کر گزرا۔ چنانچہ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾ یہ وجہ ہے اس بے پروائی کی جو ﴿ لَنْ نُّؤْثِرَكَ ﴾ اور ﴿ فَاقْضِ ﴾ سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ہم کو تیرے ڈرانے دھمکانے کی کچھ پروا نہیں ہے۔ اس لیے کہ تو جو چاہے گا کرے گا یا جو تیری رائے ہوگی، اس کا حکم کرے گا۔ لہٰذا یہ صرف اس دنیا میں ہے اور ہم کو نہ دنیا میں کوئی رغبت ہے نہ اس کے عذاب سے کسی طرح کا خوف، یعنی تیرا سلطان و غلبہ ہم پر، اور تیرے حکم کا نفوذ ہم میں فقط اس دنیا کی زندگی میں ہے، اس کے مابعد میں ہم پر تیری کوئی راہ نہیں۔ لہٰذا اس کا کیا ڈر، یہ تو عن قریب زائل ہو جائے گا۔ اسمِ اشارہ، یعنی ﴿ هٰذِهِ ﴾ محلِ نصب میں ہے ظرفیت کی بنا پر، یا مقبولیت کی بنا پر اور ''ما'' کافّہ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع جائز ہے، اس بنیاد پر کہ ''ما'' بمعنی ''الذي'' ٹھہرایا جائے[2]، یعنی ''إن الذي تقضيه هو هذه الحيوة الدنيا فقضاءك و حكمك منحصر في ذلك''

﴿ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ﴾ یہ معطوف ہے ﴿ خَطٰيٰنَا ﴾ پر اور کلمہ ''ما'' محلِ نصب میں ہے بنا بر مفعولیت، یا محلِ رفع میں ہے بنا بر ابتدا، اور خبر محذوف ہے۔ تقریر یہ ہے: ''وما أكرهتنا عليه من السحر موضوع محطوط عنا أو لا يؤاخذنا به ربنا'' اور ﴿ مِنَ السِّحْرِ ﴾ حال ہے ''ما'' سے یا ''عليه'' کی ضمیر سے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''ما'' نافیہ ہے۔ کلام میں تقدیم ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''ليغفرلنا خطايانا من السحر ولم تكرهنا عليه'' امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قول اول زیادہ صحیح ہے، یعنی ''ما'' موصولہ ہے، بہتر ہے۔[3]

﴿ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ یہ جواب ہے اور ردّ ہے فرعون کے قول ﴿ وَلَتَعْلَمُنَّ ... الخ﴾ کا، کیونکہ اس کی مراد خود اس کا نفس تھا، یعنی میرا عذاب سخت تر اور زیادہ تر دوام پذیر ہے۔ لہٰذا ساحروں نے اس کے قول کا رد کیا کہ تیری کیا حقیقت ہے اور تو کیا چیز ہے، اللہ ہی کا ثواب تجھ سے بہتر ہے اور اسی کا عذاب تجھ سے زیادہ تر باقی رہنے والا ہے۔

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٣١) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٢٦) [3] فتح القدير (٣/ ٥١٦)

إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ ۖ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا
يَحْيَىٰ ﴿٧٤﴾ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ
الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ ﴿٧٥﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ ﴿٧٦﴾

بے شک جو شخص اپنے رب کے پاس مجرم بن کر حاضر ہوگا تو یقیناً اس کے لیے جہنم ہے جس میں نہ تو وہ مرے گا اور نہ جیے گا⑭ اور جو اس کے حضور مومن (بن کر) حاضر ہوگا، جب کہ اس نے نیک عمل کیے ہوں، تو انھی (لوگوں) کے درجے بلند ہیں⑮ (یعنی) سدا رہنے والے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی اس کی جزا ہے جو (گناہوں سے) پاک ہوا⑯

فرعون کے سامنے جادوگروں کا وعظ و نصیحت:

ظاہر سیاق سے یہی ہے کہ یہ قول تتمۂ وعظ سے ہے جو ساحروں نے فرعون کو کیا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے انتقام اور عذابِ دائمی اور سرمدی سے ڈراتے ہیں اور اس کے ثواب کی اس کو رغبت دیتے ہیں جو اَبدی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ پس کہا: ﴿ إِنَّهُ مَنْ يَأْتِ رَبَّهُ مُجْرِمًا ﴾ یعنی جو شخص مجرم و گناہ گار ہو کر اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔ ﴿ فَإِنَّ لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴾ تو اس کے لیے جہنم ہے نہ وہ اس میں مرے گا نہ جیے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی طرح: ﴿ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ﴾ [الفاطر: ٣٦] ''ان کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس (جہنم) کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، ہم ہر ناشکرے کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ﴿١١﴾ الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ﴿١٢﴾ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ﴾ [الأعلی: ١١۔ ١٣] ''اور انتہائی بدبخت ہی اس سے دور رہے گا۔ جو بہت بڑی آگ میں جائے گا۔ پھر اس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ إِنَّكُمْ مَاكِثُونَ ﴾ [الزخرف: ٧٧] ''اور وہ (داروغۂ جہنم کو) پکاریں گے: اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ کہے گا: بے شک تم تو ہمیشہ (اسی عذاب میں) رہو گے۔'' امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أما أَهلُ النَّارِ... الخ» یعنی لیکن دوزخ والے وہ لوگ ہیں، جو دوزخ کے اہل ہیں۔ لہٰذا وہ نہ اس میں مریں گے نہ جئیں گے، لیکن کئی لوگ ہیں کہ اُن کو آگ لگے گی اُن کے گناہوں کے سبب سے جو ان کو ایک بار مار ڈالے گی، یہاں تک کہ جس وقت وہ کوئلے ہو جائیں گے تو شفاعت کا اذن دیا جائے گا، وہ متفرق جماعتوں کی شکل

میں لائے جائیں گے، پھر جنت کی نہروں پر پھسلا دیے جائیں گے۔

پھر کہا جائے گا: اے جنت والو! تم اُن پر پانی ڈالو، پس وہ اُگیں گے اس دانے کے اُگنے کی طرح جو حمیلِ سیل میں ہوتا ہے۔ حمیلِ سیل وہ کچرا کوڑا ہے جس کو سیلاب اپنے بہاؤ میں اُٹھا لاتا ہے، اس میں کوئی دانہ پٹ جاتا ہے تو ایک دن رات میں جلد اُگ آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بہت جلد تر و تازہ ہو جائیں گے، گوشت پوست والا بدن درست ہو جائے گا۔ لوگوں میں سے ایک آدمی نے کہا کہ گویا رسول اللہ ﷺ صحرائی آبادی میں رہے ہیں۔[1] (وهكذا أخرجه مسلم في كتاب الصحيح من رواية شعبة و بشر بن المفضل كلاهما عن أبي سلمة عن أبي نضرة عن أبي سعيد الخدري)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ پڑھا تو اس آیت پر آئے: ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو اس کے اہل ہیں، پس وہ نہ اس میں مریں گے اور نہ جئیں گے، لیکن وہ لوگ جو اس کے اہل نہیں ہیں، پس آگ ان کو چھوئے گی، پھر شفاعت کرنے والے کھڑے ہو جائیں گے تو وہ شفاعت کریں گے۔ پھر وہ متفرق جماعتیں کی جائیں گی، پھر اُن کو ایک نہر پر لائیں گے جس کو حیات یا حیوان کہتے ہیں۔ پھر وہ اُگیں گے، جس طرح گھاس حمیلِ سیل میں اُگتا ہے۔[2]

﴿ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو شخص قیامت کے دن مومن القلب ہو کر اپنے رب سے ملا، اپنے ضمیر کی تصدیق اپنے قول و عمل سے کر چکا تھا۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴾ تو وہی لوگ ہے جن کے لیے بلند درجے ہیں۔ یعنی اُن کے لیے جنت ہے جس کے درجے بلند اور غرفے بالا خانے امن والے اور بے خوف اور مسکن اور مکان پاکیزہ اور عمدہ ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: جنت سو درجے ہے، یعنی اس کے سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے، جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے اور فردوس اُن سب سے بلند درجہ ہے اور اس سے چار نہریں نکلتی ہیں اور عرش اس کے اوپر ہے، لہٰذا جس وقت تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔[3] (رواه الترمذي من حديث يزيد بن هارون عن همام به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے خالد بن یزید بن ابی مالک عن ابیہ سے روایت کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ جنت کے سو درجے ہیں، ہر درجے میں سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ہے، ان میں یاقوت اور زیور ہیں۔ ہر درجے میں ایک امیر ہے جس کے لیے فضیلت اور سرداری دیکھتے ہیں، یعنی اس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥) مسند أحمد (٣/ ١١)   [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٨ـ ٢٤٢٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٣١) مسند أحمد (٥/ ٣١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢٤٤)

کو سردار سمجھتے ہیں۔[1] صحیحین میں ہے: «إِنَّ أَهْلَمَ عِلِّيِّيْنَ لَيَرَوْنَ مِنْ فَوْقِهِمْ كَمَا تَرَوْنَ الْكَوْكَبَ الْغَابِرَ فِيْ أُفُقِ السَّمَاءِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ، قَالَ: بَلٰى! وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ رِجَالٌ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَصَدَّقُوْا الْمُرْسَلِيْنَ»[2] (و في السنن أن أبا بكر و عمر لمنهم و أنعما)[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ ﴾ یعنی باغ ہیں اقامت اور رہنے بسنے کے لیے۔ یہ بدل ہے: ﴿ الدَّرَجٰتُ ﴾ سے۔ ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ یعنی وہ ہمیشہ اُن میں رہنے والے ہیں۔ ﴿ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴾ یعنی یہ بدلہ ہے اس شخص کا جس نے اپنے نفس کو میل کچیل اور خبث اور شرک سے پاک صاف رکھا اور اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی اور رسولوں کی پیروی کی اس خبر اور طلب میں جس کو وہ لائے۔[4] (كذا في ابن كثير)

آیتِ کریمہ ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ ... الخ ﴾ منجملہ قولِ ساحرین ہے جس کو اللہ پاک نے نقل کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ابتدائے کلام ہے، ظاہر تر یہی ہے۔ امام نسفی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[5] اس بنیاد پر ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر شان کے واسطے ہوگی اور جملہ شرطیہ خبر "إنّ" کی۔ ﴿ و ﴾ حال ہے فاعل "يأتِ" سے۔ ﴿ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ یا تو حال ہے ضمیر لہ سے یا حال ہے جہنم سے، کیونکہ جملے میں ان میں سے ہر ایک کی ضمیر ہے۔ مجرم سے مراد وہ شخص ہے جو کفر اور معاصی کے ساتھ متلبس رہا ہو اور اسی پر مرگیا۔ ﴿ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نہ اس میں ایسا مرنا مرے گا کہ آسایش پائے نہ ایسا جینا جیے گا کہ اس کو نفع پہنچائے۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "لا يموت ميتة مريحة ولا يحيى حيوة ممتعة" یعنی نہ راحت دینے والا مرنا مرے گا نہ نفع دینے والا جینا جیے گا، پس وہ الم و درد پائے گا، جس طرح کہ زندہ درد پاتا ہے مکروہ و ناخوشی میں۔ اس کو موت کی حالت پہنچے گی، مگر اس میں الم و درد کے محسوس کرنے سے بے کار نہ ہوگا۔ عرب لوگ کہتے ہیں: "فلان لاحي ولا ميت" یعنی فلاں شخص نہ زندہ ہے نہ مردہ، جس وقت کہ وہ اپنی زندگی سے منتفع نہیں ہوتا۔ یہ اس کی تحقیق ہے کہ اللہ پاک کا عذاب زیادہ تر باقی رہنے والا ہے۔ ابن الانباری نے اس بارے میں شعر پڑھا ؎

إلا من لنفس لا تموت فينقضي شقاها ولا يحيى حيوة لها طعم[6]

یعنی خبردار سنتے ہو کون مددگار ہے ایسے نفس کا جو نہ مرتا ہے کہ اس کی بدبختی پوری ہو جائے، نہ ایسا جینا جیتا ہے کہ اس کے لیے کچھ لذت ہو۔

---

[1] الدر المنثور (٢/ ٦٤٥) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٨٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٦) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠٠٧)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢١٤۔ ٢١٥) [5] تفسير النسفي (٣/ ٦٢) [6] فتح القدير (٣/ ٥١٦)

وہ وصل کے وعدے وہ شبِ ہجر کے صدمے   مرنے نہیں دیتے مجھے جینے نہیں دیتے

اس کے لگ بھگ سید آزاد رحمہ اللہ نے عربی میں کہا ہے

شان المحب عجيب في صبابته   الهجر يقتله و الوصل يحييه

''عاشق اپنے عشق میں عجیب حالت میں مبتلا ہوتا ہے، (محبوب سے) وچھوڑا اسے قتل کرتا ہے اور (اس سے) ملاقات اسے زندہ رتی ہے۔''

﴿ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا... الخ﴾ مومن پر زبر حال کی بنا پر ہے اور اس کے معنی صدق ہیں۔ ﴿ قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ ﴾ محلِ نصب میں ہے، بنا بر حال اور موصوف محذوف ہے۔ "أي الأعمال الصالحات". مراد اس سے طاعات اور عبادات، فرض ونفل ہیں۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ ﴾ کا اشارہ ہے ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف باعتبار معنی کے۔ ﴿ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴾ سے مراد وہ منازل و بلند رہایش گاہیں ہیں جن کا وصف بیان نہیں ہوسکتا۔ "عُلٰی" "علیا" کی جمع ہے، جو مؤنث ہے "أعلٰی" کا۔ "أعلٰی" اسمِ تفضیل ہے، یعنی بلند تر۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنے رب کے پاس اس حال میں آیا کہ وہ مومن اور مصدق ہے، نیک کام کر چکا ہے تو انھیں لوگوں کے لیے اونچے اونچے مکانات ہیں۔

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ ﴾ بیان اور بدل ہے درجات کا۔ ﴿ عَدْنٍ ﴾ کے معنی ہیں اقامت، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ حال ہے جنات سے، اس لیے کہ یہ مضاف ہے عدن کی طرف اور عدن علم ہے اقامت کا۔ ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ حال ہے، "لھم" کی ضمیر جمع سے۔ اس کے معنی ہیں: "ماكثين دائمين" یعنی وہ بلند مکان ہیں باغ میں رہنے بسنے کے لیے درآنحالیکہ اُن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں، درآں حالیکہ وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ ﴿ وَذٰلِكَ ﴾ مبتدا ہے اشارہ ہے اجرِ مذکور کی طرف۔

﴿ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴾ اس کی خبر ہے۔ یعنی یہ اجر و ثواب جس کا ذکر ہوا، یہ اس شخص کا بدلہ ہے جو کفر و معاصی سے پاک صاف ہوا، کون سے معاصی جو دوزخ کو واجب کرنے والے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ﴿ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ ﴾ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو ایمان اعمالِ صالح سے بالکل عاری اور خالی ہے استتباعِ ثواب میں اس کا اعتبار نہیں ہے، یعنی نرا ایمان بغیر عملِ صالح کے موجبِ ثواب نہیں ہوتا ہے تو اس کو یوں جواب دیں گے کہ اس آیت میں امر مذکور کی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ جو شے اعمالِ صالح سے وابستہ ہے وہ فوز ہے درجاتِ علٰی کے ساتھ۔ مطلقاً ثواب اعمالِ صالحہ سے وابستہ نہیں ہے۔ یعنی یہ آیتِ شریفہ جو بات بتاتی ہے، وہ یہی ہے کہ جو شخص مصدق اور مومن ہے اور اس نے اعمالِ صالحہ کیے ہیں، اس کے لیے بلند درجے ہیں۔ اس سے یہ نہیں

نکلتا کہ جو صرف مومن ہے اور اعمالِ صالحہ سے خالی ہے۔ اس کے لیے مطلق ثواب ہی نہیں ہے، کیونکہ جو لوگ توحید پر مرے ہیں اور انھوں نے اعمال نہیں کیے تو یہ توحید اُن کو نفع دے گی، سزا اور جزا کے بعد ایک نہ ایک دن دوزخ سے نکل کر جنت میں بسیں گے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿٧٧﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿٧٩﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ رات کو میرے بندے نکال لے چل، پھر ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا، جبکہ تجھے نہ تو پکڑے جانے کا خوف ہوگا اور نہ (ڈوبنے کا) ڈر (77) پھر فرعون نے اپنے لشکروں سمیت ان کا پیچھا کیا تو انھیں سمندر (کے پانی) نے ڈھانپ لیا، جیسے ڈھانپنے کا حق تھا (78) اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ نہ دکھائی (79)

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ جس وقت فرعون نے بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ بھیجنے سے انکار کیا تو اُن کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات میں لے کر نکلیں، فرعون کے قبضے سے اُن کو نکال کر لے جائیں۔ اللہ پاک نے اس سورت کے علاوہ اس قصے کو اور جگہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ یہ قصہ یوں ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو فرعون والے صبح کو اُٹھے تو دیکھا کہ مصر کے اندر بنی اسرائیل میں سے کوئی پکارنے والا اور جواب دینے والا نہیں تھا۔ یعنی سب کے سب غائب تھے، ان میں سے کسی کا اَتا پتا نہ تھا۔ اس پر فرعون سخت غضبناک ہوا۔ ﴿ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٥٣] ''پھر فرعون نے شہروں میں اکٹھا کرنے والے بھیجے۔'' کہنے لگا: ﴿ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿54﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٥٤۔ ٥٥] ''(یہ پیغام دے کر کہ) بے شک یہ (بنی اسرائیل) تھوڑی سی جماعت ہے۔ اور بلاشبہ وہ ہمیں غصہ دلانے والے ہیں۔''

پھر جب اپنے لیے لشکر کو جمع کر لیا تو بنی اسرائیل کی طلب میں روانہ ہوا۔ ﴿ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٦٠] ''چناں چہ سورج نکلتے ہی انھوں (فرعونیوں) نے ان کا پیچھا کیا۔'' ﴿ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ ﴾ [الشعراء: ٦١] ''پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔'' ﴿ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿61﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴾ [الشعراء: ٦١۔ ٦٢] ''تو اصحابِ موسیٰ کہنے لگے: یقیناً ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ نے کہا: ہرگز نہیں! بلاشبہ

میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا۔‘‘

موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر دریا پر ٹھہر گئے۔ دریا اُن کے آگے اور فرعون اُن کے پیچھے، اس وقت اللہ پاک نے اُن کی طرف یہ وحی بھیجی: ﴿ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ﴾ تو انھوں نے اپنے عصا سے دریا کو مارا اور کہا تو مجھ پر پھٹ جا اللہ کے اذن سے، سو وہ پھٹ گیا، ﴿ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴾ [الشعراء: ٦٣] ’’پھر (سمندر کا) ہر ٹکڑا بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہوگیا۔‘‘ پھر اللہ پاک نے دریا کی زمین پر ہوا بھیجی تو اس کو گرم کر دیا، یہاں تک کہ روئے زمین کی طرح خشک ہوگیا۔ اس لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا ﴾ یعنی نہ تجھے فرعون کے پکڑنے کا ڈر ہو اور ﴿ وَلَا تَخْشٰی ﴾ نہ ہی اس بات کا ڈر ہو کہ دریا تیری قوم کو ڈبو دے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ﴾ ’’یم‘‘ سے مراد دریا ہے، یعنی پھر گھیر لیا ان کو دریا سے اس شے نے جو معروف و مشہور ہے۔ یہ لفظ معروف و مشہور امر کے وقت بولتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰی ۝ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰی ﴾ [النجم: ٥٣۔ ٥٤] ’’اور اس نے اُلٹی ہوئی بستیوں کو (زمین پر) دے مارا۔ پھر اس بستی کو ڈھانپ لیا جس (سنگ باری) نے ڈھانپ لیا۔‘‘ شاعر نے کہا ہے: ع

أنا أبو النجم و شعري و شعري

میں ابو النجم ہوں اور میرا شعر وہ ہے جو مشہور و معروف ہے۔ اور جس طرح کہ فرعون اپنی قوم کے آگے ہوا، پھر ان کو دریا میں گھسایا، پھر اُن کو گمراہ کیا اور ہدایت کی راہ نہ بتائی۔ اسی طرح قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا، پھر اُن کو دوزخ پر وارد کرے گا۔ ﴿ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴾ [هود: ٩٨] ’’اور برا ہے وہ گھاٹ جس پر (پینے کے لیے) آیا جائے۔‘‘[1] (كذا في ابن كثير)

یہاں سے اللہ پاک نے بنی اسرائیل کو نجات دینے اور ان کے دشمن کو ہلاک کرنے کا بیان شروع فرمایا۔ یہ حال سورت بقرہ و اعراف و یونس میں گزر چکا ہے۔ ﴿ لَقَدْ ﴾ میں لام توطیہ قسم کا ہے اور اس میں جو تاکید ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ یعنی اس میں تین تاکیدیں جمع ہوئی ہیں: ایک تو قسم، دوسرے لام تاکید کا، تیسرے قد تحقیق کا، وحی کے معنی ہیں پیغام۔ ایحاء کہتے ہیں پیغام بھیجنے کو۔ ’’أن‘‘ مفسرہ ہے، اس لیے کہ وحی میں معنی قول کے ہیں یا مصدر یہ ہے، یعنی ’’بِاَنْ أَسْرِ‘‘. ’’سُریٰ‘‘ پیش کے ساتھ و مسری رات میں چلنے کو کہتے ہیں۔ اس میں دو قراءتیں ہیں: ایک تو ہمزہ قطعی ’’أَسریٰ‘‘ سے، یعنی ’’أَنْ أَسْرِ‘‘ دوسرے ہمزہ اور نون کی زیر سے، یعنی ’’أَنِ اسْرِ‘‘ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں،

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢١٥)

معنے یہ ہیں قسم ہے اللہ کی! البتہ مقرر وحی بھیجی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ میرے بندوں کو اول رات میں مصر سے دریا کی طرف لے چل۔ اس کا بیان بھی پورے طور پر گزر چکا ہے۔

﴿ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ﴾ "ضرب" کہتے ہیں مارنے کو، چونکہ یہاں مارنے کی نسبت راستے کی طرف ٹھیک نہیں ہوسکتی، اس لیے مفسرین نے کہا ہے کہ "اضرب" کے معنی "اِجْعَلْ وَاشْرَع" کے ہیں، یعنی تو اُن کے واسطے دریا میں خشک راستہ کر دے۔ بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ ﴿ طَرِيْقًا ﴾ بطرزِ مجاز مفعول بہ ہے، وہ مجاز یہی ہے کہ راستہ دریا کو لاٹھی مارنے سے پیدا ہوا، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ تو دریا کو مار، تاکہ وہ ان کے لیے پھٹ جائے، پھر وہ اُن کے لیے راستہ ہو جائے اس بنیاد پر مارنے کی نسبت دریا کی طرف درست ہو جاتی ہے اور طریق سے مراد جنسِ طریق ہے، ایک ہو یا زیادہ، کیونکہ راستے بنی اسرائیل کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ تھے۔ ﴿ يَبَسًا ﴾ بالتحریک بہ معنی یابس صفت ہے طریق کی۔ طریق کو جو اس کے ساتھ موصوف کیا، سو بہ اعتبار مایؤل کے یعنی آیندہ خشک ہو جائے گا، کیوں کہ وہ ابھی تک خشک نہیں ہوا تھا، پھر اللہ پاک نے اس راستے کو خشک کر دیا۔ بادِ صبا نے اس پر گزر کیا تو اس کو سکھا دیا، یہاں تک کہ اس میں نہ پانی تھا نہ کیچڑ۔ امام محمد بن کعب اور مجاہد رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1]

کسی نے کہا ہے کہ "يَبَس" اصل میں مصدر ہے، طریق کی صفت میں مصدر لائے مبالغے کے واسطے یا اس بنا پر کہ مضاف محذوف ہے۔ یعنی "طَرِيْقًا إِذَا يَبَسَ" یا "يبَبَس" "یابس" کی جمع ہے، جس طرح کہ "خدم" "خادم" کی جمع ہے، اس بنیاد پر مفرد کی صفت جمع سے کی گئی۔ لہٰذا یہ بھی مبالغے کے لیے ہے، یا اس لیے کہ طریق سے مراد جنسِ طریق ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے اس کو "يَبْس" بہ سکون با پڑھا ہے۔ اس کی چند وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ بھی مصدر ہے۔ دوسرے یہ کہ "یبس" بہ سکون با مخفف ہے "یبس" محرک سے۔ تیسرے یہ ہے کہ یہ "یابس" کی جمع ہے، جیسے کہ "صحب" "صاحب" کی جمع ہے۔ ابوحیوہ نے "یابسا" بصیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے۔[2]

﴿ لَا تَخٰفُ دَرَكًا ﴾ یہ قراءت جمہور کی ہے اس میں کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ کلام مستانف ہے، اس کے لیے کوئی محل اعراب کا نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہے۔ اس بنا پر کہ فاعل اضرب سے حال ہے، یعنی تو اُن کے لیے دریا میں خشک راستہ کر دے درآنحالیکہ تو امن میں ہو، بے خوف ہو، اس بات سے کہ دشمن تمھارے پیچھے سے آ کر تم کو پالے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ صفت ہے ﴿ طَرِيْقًا ﴾ کی اور طریق کی طرف جو ضمیر پھرتی ہے وہ محذوف ہے، "أي لا تخاف فيه" یعنی ایسا راستہ کر دے کہ نہ ڈرے تو اس راستے میں دشمن کے آ پہنچنے سے۔ ساتوں قاریوں میں سے صرف حمزہ کی قراءت "لا تخف" ہے جزم کے ساتھ، اس میں بھی تین وجہیں ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ نہی مستانف ہے، یعنی اعراب میں جو کچھ کہا گیا، اس سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ

[1] تفسیر ابن أبی حاتم (٧/ ٢٤٢٩) [2] روح المعانی (١٦/ ٢٣٦)

محلِ نصب میں سے اس بنا پر کہ حال ہے فاعل "اضرب" سے، یا صفت ہے "طریقا" کی جس طرح کہ جمہور کی قراءت میں گزر چکا ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ یہاں اضمارِ قول کی حاجت ہوگی: "اي مقولا لك" اور "طريقا مقولا فيها لا تخف" یعنی تو ان کے لیے دریا میں سوکھا راستہ بنا دے، درآنحالیکہ اس راستے کے حق میں کہا جاتا ہے کہ تو اس میں مت ڈر۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مجزوم ہے اس بنیاد پر کہ جواب ہے امر کا "أي أَنْ تَضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا يَبَسًا لَّا تَخَفْ" یعنی اگر تو خشک راستہ بنا دے گا تو نہ ڈرے گا۔ امام ابوحیوہ رحمہ اللہ نے "دَرْكًا" کو بسکون را پڑھا ہے۔ "درك" را کی زبر اور جزم کے ساتھ، دونوں اسم مصدر ہیں "إدراك" سے۔[1] یعنی تجھ کو فرعون اور اس کا لشکر نہ پائے گا۔ سورۃ النساء میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[2]

کوفیوں نے "درکا" کو وہاں را کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جس طرح کے ابوحیوہ نے یہاں را کے سکون سے پڑھا ہے۔ اس میں جمہور نے جو "لا تخافُ" کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے، وہی قراءت زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ ﴿ وَلَا تَخْشٰى ﴾ میں جزم نہیں ہے۔ اس کو باثبات الف پڑھا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جس شخص نے "لا تخف" جزم کے ساتھ پڑھا ہے، اس کو ضروری ہے کہ وہ "لا تخش" کو بحذفِ الف پڑھے۔ لیکن یہ قول کچھ معتبر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک سنتِ متبعہ ہے، یعنی اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہ کرنا چاہیے، جس طرح چلی آتی ہے، اسی طرح اس کو رکھیں، اس میں چار وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ حال ہو، اس میں یہ اشکال ہے کہ مضارع منفی بلا عدمِ مباشرت واو میں مثل مثبت کے ہے، یعنی جس طرح مضارع مثبت بغیر واو کے حال واقع ہوتا ہے، اسی طرح مضارع منفی جو "لَا" کے ساتھ ہو، وہ بھی واو کے بغیر حال پڑتا ہے اور یہاں واو ہے، پھر کیونکر حال ہوسکتا ہے، اسی لیے اس کی یوں تاویل کی ہے کہ یہاں مبتدا کو محذوف مانا ہے۔ یعنی دوسری وجہ یہ ہے کہ کلام مستانف ہے۔

اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو اِس بات کی خبر دی کہ تجھ کو خوف نہ ہوگا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مجزوم ہے بحذفِ حرکت تقدیراً، اسی کے مثل "فلا تنسیٰ" ہے۔ احد القولین میں حرفِ علت کو قائم مقام حرفِ صحیح کے کہا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بحذفِ حرف علت مجزوم ہے۔ اور یہ الف وہ الف نہیں ہے جو لام کلمہ ہے۔ یہ الف تو اشباع کا ہے، اس کو واسطے موافقت فواصل اور رؤس آیات کے لائے ہیں، سو یہ ویسا الف ہے، جو "الرسلا"، "السبيلا" اور "الظنونا" میں ہے۔ یہ ساری وجہیں اس صورت میں ہیں کہ "لا تخف" کو مجزوم پڑھیں۔ رہی قراءت جمہور کی "لا تخاف" پیش کے ساتھ، لہٰذا اس میں کچھ دقت نہیں ہے۔ ﴿ وَلَا تَخْشٰى ﴾ بلا تکلف اس پر معطوف ہو جائے گا۔ كذا في السمين.

﴿ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ ﴾ یعنی فرعون موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کے پیچھے گیا، اس حال میں کہ اس کے

---

[1] روح المعاني (١٦/ ٢٣٦) [2] رقم الآية [١٤٥]

ہمراہ اس کا لشکر تھا۔ محل "بجنوده" کا نصب بنا بر حال ہے۔ "أي سائقا جنوده معه" اس حرفِ با میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ واسطے حال کے ہے اس بنیاد پر کہ "اتبع" متعدی ہے طرف دو مفعول کے اور اُن میں سے دوسرا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فأتبعهم فرعون عقابه" دوسری وجہ یہ ہے کہ حرفِ با زائد ہے مفعول ثانی میں، تقدیر یہ ہے: "ولا تبعهم فرعون جنوده" جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرة: ١٩٥] یعنی فرعون نے اپنے لشکروں کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے پیچھے جائیں۔

"اتبع" کے دونوں مفعول کبھی صراحتاً بھی آتے ہیں، جیسے اس قول میں ﴿ وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ ﴾۔ تیسری یہ ہے کہ حرفِ با تعدیت کے واسطے ہے، اس بنا پر کہ "اتبع" کبھی ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے بمعنی "تبع"۔ اس وجہ پر بھی ہوسکتا ہے کہ حرفِ با واسطے حال کے ہو، بلکہ ظاہر تر یہی ہے۔ ابوعمرو نے ایک روایت میں اور امام حسن رحمہ اللہ نے "فاتبعهم" کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن رحمہ اللہ نے سارے قرآن شریف میں اسی طرح پڑھا ہے، مگر ایک جگہ "فَأَتْبَعَهُمْ شِهَابٌ ثَاقِبٌ" (كذا في السمين) اس قراءت میں یہ معنی ہیں کہ "لحقهم بجنوده وهو معهم" یعنی فرعون جب موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم سے جا ملا اپنے لشکر کے ساتھ، اس حال میں کہ وہ اُن کے ہمراہ تھا، جس طرح کہتے ہیں کہ "ركب الأمير بسيفه" یعنی امیر سوار ہوا اس حال میں کہ اس کی تلوار اس کے ہمراہ تھی۔

﴿ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ امر ہولناک اُن پر چڑھا اور اُن کو پہنچا، جس نے ان کو پکڑ لیا، ڈبو دیا، جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا نہ اس کی حقیقت تک رسائی ہوسکتی ہے۔ یہ قول اختصار اور جوامع الکلم میں سے ہے، یعنی جس میں لفظ کم ہوں اور معنی بہت۔ ﴿ غَشِيَهُمْ ﴾ کو جو دہرایا ہے تو یہ واقعے کی عظمت اور ہولنا کی کے اظہار کے لیے ہے، جس طرح کے ﴿ اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ﴾ [الحاقة: ١۔ ٢] "ثابت ہونے والی۔ کیا ہے ثابت ہونے والی؟" کسی نے کہا یہ معنی ہیں کہ ڈھانکا اُن کو اس شے جس کا قصہ تو نے سنا ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا: "غشيهم البعض الذي غشيهم"[1] یعنی ان کو ڈھانکا دریا کے بعض حصے نے جس نے ان کو ڈھانکا، اس لیے کہ دریا کے کل پانی نے اُن کو نہیں ڈھانکا تھا، بلکہ جس نے ان کو ڈھانکا وہ دریا کا ایک جزو تھا۔ پس یہ عبارت یہ بات بتانے کے لیے ہے کہ جس پانی نے ان کو ڈبویا، وہ پانی کا ایک جزو ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ وہ دلالت کرتا ہے تعظیم اور ہولنا کی پر۔

امام اعمش رحمہ اللہ نے "فَغَشَّاهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشَّاهُمْ" پڑھا ہے،[2] یعنی ڈھانک لیا اُن کو اس غرق نے جس نے ان کو ڈھانک لیا اور چھپا دیا اُن کو اس شے سے جس کی حقیقت کو سوائے اللہ پاک کے اور کوئی نہیں جانتا۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥١٨) [2] روح المعاني (١٦/ ٢٣٨)

پس فرعون اور اس کے لشکر ڈوب گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم نے نجات پائی۔ "فغشاهم" کے فاعل میں تین وجہ ہیں: ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلی قراءت میں گزر چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فاعل اللہ پاک ہے: "أي فغشا هم الله". تیسری وجہ یہ ہے کہ فاعل فرعون ہے، اس لیے کہ ان کو ہلاک کرنے میں وہی سبب ہے۔ ان دونوں وجہوں کی بنا پر "ما غشاهم" محل نصب میں ہوگا "فغشاهم" کا دوسرا مفعول ٹھہرے گا۔

﴿ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ ﴾ یعنی بے راہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو راہ پر ہونے سے اور نجات کا راستہ ان کو نہ بتایا، کیونکہ اس نے تو یہ بات ٹھہرائی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم اس سے فوت نہ ہوں، اس لیے کہ اس کے آگے سوکھے راستے میں جا رہے ہیں اور اُن کے آگے دریا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ غرق ہونے سے پہلے کی حالت کی خبر ہے۔

﴿ وَمَا هَدٰى ﴾ اس میں تاکید و تقریر ہے اس کے گمراہ کرنے کی، کیونکہ گمراہ کرنے والا جس شخص کو گمراہ کرتا ہے تو کبھی بعض امور میں اس کو راہِ راست بھی بتا دیتا ہے، لیکن فرعون نے اپنی قوم کو خوب ہی گمراہ کیا، کبھی کسی امر میں بھی اُن کو راہ نہ بتائی، حالانکہ اس نے یوں کہا تھا: ﴿ وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴾ [المؤمن: ۲۹] "اور میں خیر و بھلائی ہی کے راستے کی طرف تمھاری راہنمائی کرتا ہوں۔" لہٰذا اللہ پاک نے اس قول میں اس کی تکذیب فرمائی کہ ہرگز اس نے ہدایت کی راہ نہ بتائی، بلکہ ایسے کرتوت کیے جن کے طفیل میں سب کو لے ڈوبا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝۸۰ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝۸۱ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝۸۲

اے بنی اسرائیل! ہم نے تمھیں تمھارے دشمن سے نجات دی، اور ہم نے تم سے طور کی دائیں جانب (تورات دینے) کا وعدہ کیا، اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ نازل کیا (80) ہم نے تمھیں جن پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا ہے ان سے کھاؤ، اور تم اس میں سرکشی نہ کرو کہ تم پر میرا غضب اُترے، اور جس پر میرا غضب اُترا تو یقیناً وہ تباہ ہوگیا (81) اور بے شک میں بہت بخشنے والا ہوں اس کے لیے جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر ہدایت پر رہے (82)

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد دہانی:

حد سے نہ بڑھو، یعنی رکھ نہ چھوڑو۔ اللہ پاک اپنی بڑی بڑی نعمتوں اور احسانات کا ذکر فرماتا ہے، جو اس نے

بنی اسرائیل پر کیے، اس لیے کہ اُن کے دشمن فرعون سے اُن کو بچایا اور اس سے اُن کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا اور وہ اس کی طرف اور اس کی قوم کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ سب کے سب ایک ہی صبح میں ڈوب گئے، اُن میں سے ایک بھی نہ بچا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ [البقرة: ٥٠] ''ہم نے آلِ فرعون کو غرق کر دیا، جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو پایا کہ وہ عاشورا کا روز رکھتے تھے، لہٰذا آپ نے اُن سے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر فتح مند کیا، پس فرمایا کہ ہم اولیٰ ہیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، لہٰذا تم اس کا روزہ رکھو، یعنی ہم قریب تر ہیں ان سے، پھر صحابہ کو روزے کا حکم دیا۔[1] (ورواه مسلم أيضا في صحيحه)

پھر فرعون کے ہلاک کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے وعدہ کیا بنی اسرائیل کے واسطے کوہِ طور کے داہنی جانب، یعنی تم وہاں آؤ تو ہم تم کو تورات دیں، یہ طور وہی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں اور انھوں نے اس میں اللہ کے دیدار کا سوال کیا اور اسی جگہ اُن کو تورات عطا فرمائی، اسی اثنا میں بنی اسرائیل نے بچھڑا پوج لیا، چنانچہ عن قریب اللہ پاک اس کا قصہ بیان فرمائے گا۔ رہا منّ وسلویٰ تو سورۃ البقرہ وغیرہ میں اس پر گفتگو گزر چکی ہے۔ منّ تو ایک حلوا تھا جو آسمان سے ان پر اترتا تھا اور سلویٰ ایک پرندہ تھا جو اُن پر گر پڑتا تھا تو وہ منّ وسلویٰ میں سے کل تک کی ضرورت کے لیے لے لیا کرتے تھے، یہ ایک لطف وعنایت تھا اللہ پاک کی طرف سے اور اُن پر ایک رحمت اور احسان تھا، اس لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ یعنی اس رزق سے کھاؤ، جو ہم نے تم کو دیا۔ ﴿ وَلَا تَطْغَوْا ﴾ اور زیادتی نہ کرو میرے رزق میں کہ تم اس کو اس کے غیر حلال سے لو اور جو میں نے تم کو حکم دیا ہے اس کے خلاف کرو۔

﴿ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ﴾ یعنی پھر میں تم پر خفا ہو جاؤں گا۔ ﴿ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴾ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ فَقَدْ هَوٰى ﴾ کے معنی ہیں: ''فقد شقی'' یعنی جس پر میرا غصہ ہوا تو پکا بد بخت ہوا۔ شفی بن ماتع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک محل ہے کہ کافر اس کی بلندی سے پھینکا جائے گا تو چالیس خریف تک جہنم میں گرتا رہے گا، اس سے پہلے کہ صلصال پہنچے، یہ وہی اللہ پاک کا قول ہے: ﴿ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴾[2] (رواه ابن أبي حاتم) خریف سے مراد برس ہے۔ صلصال خشک گارے کو کہتے ہیں۔ واللہ أعلم۔ شاید اس سے مراد جہنم کی تہہ ہے۔ نعوذ باللہ من جهنم.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٠)

﴿ وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا ﴾ یعنی ہر وہ شخص جو میری طرف رجوع ہوا تو میں اس پر رجوع ہوتا ہوں، یعنی اس کی توبہ قبول کر لیتا ہوں کسی گناہ سے کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ اللہ پاک نے تو اُن لوگوں کی توبہ قبول فرمائی جنھوں نے بنی اسرائیل میں سے بچھڑا پوج لیا تھا۔ ﴿ تَابَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس کفر یا شرک یا معصیت یا نفاق میں وہ تھا، اس سے رجوع ہوا۔ ﴿ اٰمَنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اپنے دل سے یقین کیا، ﴿ وَعَمِلَ صٰلِحًا ﴾ سے یہ غرض ہے کہ اپنے اعضا سے بھلا کام کیا۔ ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ''ثُمَّ لَمْ يُشَكِّكْ'' یعنی پھر اس نے شک نہ کیا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سنت و جماعت پر قائم رہا۔ اسی کے مثل امام مجاہد وضحاک رحمہما اللہ اور کئی ایک اہلِ علم سے مروی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لازم پکڑے اسلام کو، یہاں تک کہ مر جائے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ثم اهتدى'' یعنی اس بات کو جاننا کہ اس کے لیے ثواب ہے۔[1] ''ثم'' اس جگہ ترتیبِ خبر کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ [البلد: ١٧] ''پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور انھوں نے باہم صبر کی وصیت کی اور باہم رحم کرنے کی وصیت کی۔''

اللہ پاک نے بنی اسرائیل کو نجات دینے کے بعد اُن پر جو انعام کیا اس کا ذکر فرمایا۔ تقدیر یہ ہے کہ ہم نے نجات دینے کے بعد ان سے یوں کہا: اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمھارے دشمن سے چھڑا لیا۔ یہ نعمتیں جو یہاں یاد دلائیں اُن کی ترتیب میں انتہا درجے کا حسن ہے، کیوں کہ نعمتِ انجاء (نجات دلانے کی نعمت) کے یاد دلانے کو سب سے پہلے رکھا، اس کے بعد نعمتِ دینیہ کا ذکر کیا، پھر نعمتِ دنیویہ کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خطاب ان یہودیوں کو ہو جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ اس لیے کہ جو نعمت آبا پر ہوتی ہے وہ ان نعمتوں میں شمار کی جاتی ہے جو ابنا پر ہوتی ہیں۔ ''عدو'' سے مراد اس جگہ فرعون اور اس کے لشکر ہیں، ان سے یوں نجات دی کہ بنی اسرائیل کے روبرو فرعون کو اور اس کی قوم کو ڈبو دیا۔ نعمتِ دینیہ یہ ہے:

﴿ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ ﴾. ''جانب'' کا زبر اس بنیاد پر ہے کہ مفعول بہ ہے، ظرفیت کی بنا پر نہیں ہے، اس لیے کہ جانب ایک معین غیر مبہم جگہ ہے اور ظروفِ مکان ظرفیت کی بنا پر اس وقت منصوب ہوتے ہیں کہ مبہم ہوں۔ امام مکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک اصول و قاعدہ ہے، اس میں کسی طرح کا خلاف نہیں ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا معنی یہ ہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ تم کو اپنے ہمراہ نکلنے کا امر کرے، تاکہ ہم تمھاری موجودگی میں اس سے باتیں کریں تو تم کلام کو سنو۔ کسی نے کہا یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے فرعون کو ڈبونے کے بعد

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٤٧۔ ٣٤٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٢١٦)

موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ جانبِ طور میں آئیں۔ پس وعدہ موسیٰ علیہ السلام سے تھا اور بنی اسرائیل کو جو اس کا خطاب کیا گیا تو اس لیے کہ وعدہ اُن کے واسطے تھا، اس بنا پر یہ قول مجازِ عقلی سے ہے۔ ابو عمرو و ابو جعفر و یعقوب نے "وعدناکم" بغیر الف پڑھا ہے اور ابو عبید نے اسی کو پسند کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ پاک کی طرف سے وعدہ خاص موسیٰ علیہ السلام کو تھا اور مواعدہ صرف دو کے درمیان ہی ہوتا ہے۔[1] یہ بات سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔[2]

﴿ الْاَيْمَنَ ﴾ پر زبر اس لیے ہے کہ یہ ﴿ جَانِبَ ﴾ کی صفت ہے۔ داہنے سے مراد شخص کے داہنے جانب ہے، کیونکہ پہاڑ کے لیے نہ داہنی جانب ہے نہ بائیں۔ پھر جب یوں کہا جائے: "خذ عن يمين الجبل" یعنی تو پہاڑ کے داہنی جانب سے لے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تیرے داہنی جانب جو پہاڑ سے ہے اس کو لے۔ کسی نے کہا: "الأيمن" کو زیر سے بھی پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مضاف الیہ، یعنی طور کی صفت ہے۔ نعمتِ دنیویہ یہ ہے: ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴾ تفسیر "مَنّ" کی ترنجبین کے ساتھ اور "سلویٰ" کی سمانی کے ساتھ گزر چکی ہے اور اُن کا بیان نہایت واضح طور پر پہلے ہو چکا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ "مَنّ" ایک میٹھی چیز سفید مانند برف کے تھی، فجر سے سورج نکلنے تک اترا کرتی تھی، ہر آدمی کے لیے ایک صاع ہوتا اور جنوبی ہوا اُن پر سمانی بھیجتی تو ہر آدمی ان میں سے اس قدر ذبح کر لیتا، جس قدر اس کو کافی ہوتا۔ من وسلویٰ کا یہ اُتارنا تیہ (جگہ کا نام) میں تھا۔[3]

﴿ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ یعنی ہم نے ان سے کہا: تم کھاؤ ستھری چیزیں جو ہم نے تم کو دیں، یعنی جس کا تم پر انعام کیا گیا۔ مراد طیبات سے مستلذات اور لذائذ ہیں یا حلال چیزیں۔ یہ اس اختلاف کی بنا پر ہے جو اس میں مشہور و معروف ہے۔ امام حمزہ، کسائی اور اعمش رحمہم اللہ نے "أنجيتكم و وعدتكم و رزقتكم" تائے متکلم کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے ان تینوں کو نونِ عظمت کے ساتھ پڑھا ہے۔[4] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَنَزَّلْنَا ﴾ پر سب متفق ہیں اور حمید رحمہ اللہ نے "وَنَجَّيْنٰكُمْ" بتشدید پڑھا ہے۔[5]

﴿ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ ﴾ طغیان تجاوز کو کہتے ہیں، یعنی جائز سے غیر جائز کی طرف تجاوز مت کرو۔ غیر جائز جیسے بے جا خرچ کرنا، اِترانا، مستحق سے روکنا۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کی نعمت کا انکار مت کرو کہ طاغی ہو جاؤ۔ کسی نے کہا: کفرانِ نعمت مت کرو اور اس کے شکر کو مت بھولو۔ کسی نے کہا کہ منعم کی نافرمانی مت کرو۔ یعنی فراخی و عافیت تم کو معصیت پر آمادہ نہ کرے۔ ان سب معانی پر طغیان کو محمول کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے، اس لیے کہ اُن میں سے ہر معنی پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ طغیان ہے۔

﴿ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ﴾ نہی کا جواب ہے۔ اعمش و یحییٰ بن وثاب و کسائی نے "فَيَحُلَّ" کو حائے

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٣٠) فتح القدير (٣/ ٥١٩) [2] رقم الآية [٥١] [3] تفسير أبي السعود (٦/ ٣٣)
[4] فتح القدير (٣/ ٥١٩) [5] روح المعاني (١٦/ ٢٣٩)

مہملہ کی پیش سے اور اسی طرح "یَحْلُلُ" کو لام اول کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قرّاء نے دونوں میں حا کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں دولغت ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو پیش سے زیادہ زیر محبوب ہے۔ اس لیے کہ پیش کی صورت میں حلول وقوع کے معنی سے ماخوذ ہوگا اور زیر کی صورت میں وجوب کے معنی میں ٹھہرے گا اور تفسیر وجوب کے ساتھ آئی ہے نہ وقوع کے ساتھ۔ اس کے مثل ابوعبیدہ وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔[1] پس حا کی زیر کی بنا پر یہ معنی ہوں گے کہ پھر تم پر لازم اور واجب ہو جائے گا میرا غصہ اور حا کی پیش کی بنیاد پر یہ معنی ٹھہریں گے کہ پھر تم پر اُترے گا میرا غصہ، یہ ماخوذ ہے حلولِ دَین سے۔ حلولِ دَین ادائے قرض کے وقت حاضر ہونے کو کہتے ہیں۔

﴿ هَوٰى ﴾ کے معنی "هلك"۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَقَدْ هَوٰى ﴾ یعنی وہ ھاویہ کی طرف چلا گیا۔ ھاویہ دوزخ کی تہہ کو کہتے ہیں۔[2] ماخوذ ہے: "هوى يهوىٰ هويا" سے، یعنی فلاں بلندی سے پستی کی طرف گر پڑا اور "هوى فلان" کے یہ معنی ہیں کہ فلاں مرگیا۔ امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ ... الخ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ توبہ کی اس نے شرک سے ﴿ وَاٰمَنَ ﴾ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی ﴿ وَعَمِلَ صٰلِحًا ﴾ فرمایا۔ فرائض کو ادا کیا۔ (ظاہر لفظ فرائض ونوافل دونوں کو شامل ہے، چنانچہ محلی رحمہ اللہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے)[3] ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ فرمایا کہ شک نہ کیا۔ دوسرے الفاظ اُن کے یہ ہیں کہ جس نے گناہ سے توبہ کی اور شرک سے ایمان لایا اور عملِ صالح کیا اپنے اور اپنے رب کے درمیان۔ ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ اس بات کو جانا کہ اس کے عمل کے لیے ثواب ہے، جس پر وہ جزا دیا جائے گا۔[4] (أخرجه سعيد بن منصور و الفريابي)

ایک معنی یہ ہیں کہ جس نے توبہ کی گناہوں سے جن کا بڑے سے بڑا شرک ما بعد ہے اور ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور عملِ صالح کیا، اُن اعمال میں سے جن کی شریعت نے رغبت دلائی ہے اور اُن کو اچھا کہا ہے۔ پھر اس پر مستقیم رہا، یہاں تک کہ مرگیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[5] کسی نے کہا کہ ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ یعنی اپنے ایمان میں شک نہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ علم سیکھا، تاکہ اس سے ہدایت پائے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس بات کو جانا کہ اس کے لیے ثواب ہے اور اس کے چھوڑ دینے پر عذاب ہے۔ پہلا قول اپنے سے بعد والے اقوال سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

کلمہ ﴿ ثُمَّ ﴾ یا تو تراخی (مابعد کی کیفیت بیان کرنے) کے واسطے باعتبار انتہا کے، اس لیے کہ یہ اہتداء اول اہتداء سے بعید ہے۔ یا اس واسطے کہ دلالت کرے یا دونوں مرتبوں کے درمیان بُعد پر دلالت کرے، یعنی اول اہتدا

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٣٠۔ ٢٣١) فتح القدير (٣/ ٥١٩۔ ٥٢٠) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٧٠) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤١٣)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٠) الدر المنثور (٥/ ٥٩١) [5] فتح القدير (٣/ ٥٢٠)

اور آخر اہتداء کے مرتبوں میں بُعد ہے۔ اس لیے کہ کسی کام پر مداومت و ہمیشگی کرنا، اس کام کے شروع کرنے سے بہت بہتر اور برتر ہے۔[1] (قالہ الشہاب)

اسی لیے محلی رحمہ اللہ نے ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "باستمراره علىٰ ما ذكر إلىٰ موته"[2]

امام کرخی رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں یہ کہا ہے کہ یہ سوال مقدر کا جواب ہے، وہ سوال یہ ہے کہ ﴿ لِمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ کے بعد ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ کہنے کا کیا فائدہ ہے، حالانکہ اہتداء تو اس سے پہلے ہے، یعنی پہلے اس نے ہدایت پائی، جبھی تو اس نے شرک وغیرہ سے توبہ کی، موحد بنا، نیک کام کیے؟ لہٰذا اس سوال کے جواب کا بیان واضح یہ ہے کہ ﴿ ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ سے مراد ہمیشگی ہے اس طریقے پر، کیوں کہ جو شخص فی الحال ہدایت پائے ہوئے ہے، اس کو نجات کا فائدہ اُٹھانے کے لیے یہ کافی نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ اس پر ہمیشہ قائم رہے، آیندہ کے زمانے میں اور اسی پر مرجائے۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۙ ﴿٨٧﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ۭ ﴿٨٨﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۬ ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

اور اے موسیٰ! کون سی چیز تجھے تیری قوم سے جلدی لے آئی؟ (83) اس نے کہا: وہ لوگ میرے پیچھے ہیں، اور اے میرے رب! میں نے تیری طرف جلدی کی، تاکہ تو راضی ہو جائے (84) اللہ نے فرمایا: چناں چہ بے شک ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا، اور انھیں سامری نے گمراہ کر دیا (85) تو موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضب ناک (اور) غمگین لوٹا (اور) کہنے لگا: اے میری قوم! کیا تمھارے رب نے تم سے

[1] حاشية الشهاب (٦/ ٢١٨) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤١٣)

اچھا وعدہ نہ کیا تھا؟ کیا پھر تم پر عہد طویل ہو گیا تھا یا تم نے چاہا کہ تم پر تمھارے رب کا غضب اُترے، لہٰذا تم نے میرے وعدے کی خلاف ورزی کی (86) وہ کہنے لگے: ہم نے تیرے وعدے کی اپنے اختیار سے خلاف ورزی نہیں کی، لیکن ہم پر قوم (فرعون) کے زیب و زینت کے بوجھ لاد دیے گئے تھے تو ہم نے وہ (آگ میں) پھینک دیے اور اسی طرح سامری نے بھی (زیور) پھینکے (87) پھر اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا نکالا (بنایا) جو محض جسم تھا، جس کی آواز گائے کی سی تھی، پھر وہ (لوگ) کہنے لگے: یہی ہے تمھارا اللہ اور موسیٰ کا الٰہ۔ وہ تو بھول گیا (88) بھلا وہ دیکھتے نہیں تھے کہ بلاشبہ وہ (بچھڑا) ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے کسی نفع و نقصان کا مالک ہے (89)

موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق جانا:

جس وعدے کا ذکر ہے وہ وعدہ تورات دینے کا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام قوم سے تیس دن کا وعدہ کر کے گئے تھے پہاڑ پر، وہاں چالیس دن لگ گئے۔ بعد میں قوم بچھڑا بنا کر پوجنے لگی۔ زیور فرعون والوں سے عاریتاً مانگ کر لیا تھا، تاکہ انھیں یقین آجائے کہ وہ شادی کے لیے نکل رہے ہیں، اس کے بغیر فرعون نکلنے نہ دیتا۔ موسیٰ علیہ السلام بھول گئے، یعنی کسی اور جگہ چلے گئے۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو ایک قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کو پوجنے میں لگے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا: ﴿ يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۳۸۔ ۱۳۹] ''اے موسیٰ! تو ہمارے لیے ایک معبود بنا دے، جس طرح کہ ان کے معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا: بے شک تم لوگ تو (نرے) جاہل ہو۔ یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یقیناً وہ تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ باطل ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے رب نے تیس رات کا وعدہ ٹھہرایا تھا۔ پھر اس کے بعد دس رات کا اور وعدہ کیا تو چالیس راتیں پوری ہو گئیں، یعنی وہ اس مدت میں رات دن روزہ رکھتے رہے۔ حدیث الفتون میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔[1] پھر موسیٰ علیہ السلام جلدی کر کے طور کی طرف چلے گئے اور بنی اسرائیل پر اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنا گئے، اس لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ ﴾ یعنی وہ آنے والے ہیں، طور کے قریب اُتریں گے: ﴿ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴾ یعنی اے رب! میں تیری طرف جلد آ گیا، تاکہ تو مجھ سے زیادہ راضی ہو۔

---

(1) اس کی تخریج سورت طٰہٰ (آیت نمبر: ۴۰) کی تفسیر کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پوجا کر کے گمراہ ہونا:

﴿ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴾ اللہ پاک نے اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کو اس حادثے کی خبر دی، جو اُن کے بعد بنی اسرائیل میں واقع ہوا اور انھوں نے بچھڑا پوج لیا، جس کو سامری نے ان کے لیے بنا دیا تھا۔ اسرائیلی کتابوں میں ہے کہ سامری کا نام بھی ہارون تھا۔ اللہ پاک نے اس مدت میں موسیٰ علیہ السلام کے لیے تختیاں لکھیں، جن میں تورات شامل تھی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ﴾ [الأعراف: ١٤٥] ''اور ہم نے اس (موسیٰ) کے لیے (تورات کی) تختیوں میں (زندگی کے) ہر معاملے کے بارے میں نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق تفصیل لکھ کر دے دی ہے، چناں چہ تو ان (ہدایات) کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کی اچھی اچھی باتوں پر کاربند رہیں۔ جلد ہی میں تمھیں نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔'' یعنی جو لوگ میری طاعت سے نکلنے والے اور میرے حکم کی مخالفت کرنے والے ہیں، میں تم کو اُن کا انجام دکھاؤں گا۔

﴿ فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ﴾ یعنی پھر موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پاس لوٹے اُن پر بہت غیظ و غضب کرتے ہوئے، کیوں کہ وہ تو قوم کے کام کے اہتمام میں تھے اور تورات کو حاصل کرنے کے لیے گئے تھے، جس میں اُن کی شریعت اور اُن کا شرف تھا اور وہ ایسی قوم تھی کہ انھوں نے غیر اللہ کو پوج لیا۔ ہر عقل مند، جو ذرا سی عقل اور دور اندیشی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ جس حالت پر وہ ہیں، وہ باطل ہے اور اُن کی عقل اور ذہن کی سُبکی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف خفا ہوتے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے لوٹ آئے۔ ''أسف'' شدتِ غضب کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ أَسِفًا ﴾ کے معنی ''جزعا'' یعنی گھبراتے ہوئے۔[1] امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''حزيناً على صنع قومه من بعده''[2] یعنی اُن کی قوم نے اُن کے بعد جو کام کیا، اس پر رنجیدہ ہوتے ہوئے لوٹے۔

﴿ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ﴾ یعنی کیا تمھارے رب نے میری زبان پر دنیا اور آخرت میں ہر خیر کا اور حسنِ عاقبت کا تم سے وعدہ نہیں کیا، جیسا کہ تم مشاہدہ کر چکے کہ اس نے تم کو تمھارے دشمن پر منصور اور کامیاب کیا اور اس پر تمھیں غالب کیا، اس کے سوا اور اللہ پاک کی تمھارے پاس نعمتیں ہیں۔ ﴿ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو وعدہ تم سے کیا، اس کے انتظار میں اور جو نعمتیں تم کو مل چکیں، ان کو بھول جانے کے لیے یہ چالیس دن کی مدت تم پر لمبی ہوگئی، حالانکہ ابھی عہدِ جدید ہے۔ ﴿ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِنْ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٢١٦) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٥٠)

رَّبِّكُمۡ ﴾ اس جگہ ''اَمْ'' بہ معنی ''بَل'' ہے اور ''بَل'' کلام اول سے اضراب و اعراض کے لیے اور کلامِ ثانی کی طرف رجوع کرنے کے لیے ہے۔ گویا یوں کہتے ہیں، بلکہ تم نے اپنے اس کام سے اس بات کا ارادہ کیا کہ تم پر تمھارے رب کا غصہ اترے۔ ﴿ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِىۡ ﴾ اس سے تم نے میرے وعدے کا خلاف کیا۔

﴿ قَالُوۡا مَاۤ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا ﴾ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے جس بات کی بنی اسرائیل کو خبر دی اور اُن کو ڈانٹا دھمکایا تو انھوں نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ ہم نے اپنی قدرت و اختیار سے تمھارے وعدے کا خلاف نہیں کیا، پھر عذر بارد کرنے لگے، مصر سے جس وقت نکلے تو قبطیوں سے زیور عاریتاً لیا تھا، وہ زیور اُن کے پاس تھا، اس زیور سے اپنی پرہیزگاری اور احتیاط کی خبر موسیٰ علیہ السلام کو دینے لگے۔

﴿ فَقَذَفۡنٰهَا ﴾ یعنی پھر ہم نے اس زیور کو پھینک دیا۔ حدیث الفتون میں گزر چکا ہے کہ ہارون علیہ السلام ہی نے اُن کو ایک گڑھے میں زیور ڈالنے کا حکم دیا تھا، جس میں آگ تھی۔[1] امام سدی رحمہ اللہ کی روایت میں ''عن أبي مالك عن ابن عباس'' اس طرح سے ہے: ''إنما أراد هارون أن يجتمع الحلي كله في تلك الحفيرة ويجعل مجرى واحداً''، یعنی ہارون علیہ السلام نے صرف یہ چاہا کہ سارا زیور اس گڑھے میں مجتمع رہے، یہاں تک کہ جب موسیٰ علیہ السلام لوٹ کر آئیں تو جو کچھ وہ چاہیں گے، اس کے بارے میں حکم دیں گے۔ پھر وہی سامری آیا تو اس نے اس زیور پر وہ مٹھی ڈال دی جو اس نے اثرِ رسول سے لی تھی اور ہارون علیہ السلام سے اس بات کی درخواست کی کہ وہ اللہ سے دعا کریں کہ اس کی ایک دعا قبول کرلے۔ لہٰذا ہارون علیہ السلام نے اس کے لیے دعا کی اور انھیں خبر نہیں تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ پس اس کے لیے دعا قبول ہوگئی۔

سامری نے اس وقت یوں کہا کہ میں اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ بچھڑا ہو جائے، لہٰذا وہ بچھڑا بن گیا، جس میں سے گائے کی آواز نکلتی تھی۔ یہ بات اس قوم کے استدراج، امہال، محنت، اختیار اور امتحان کے لیے ہوئی اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ فَكَذٰلِكَ اَلۡقَى السَّامِرِىُّ ۝87 فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہارون علیہ السلام سامری کے پاس سے گزرے اور وہ بچھڑے کو گھڑ رہا تھا تو ہارون علیہ السلام نے اس سے پوچھا تو کیا بنا رہا ہے؟ وہ بولا: میں وہ شے بنا رہا ہوں جو نفع یا نقصان نہ دے۔ تو ہارون علیہ السلام نے فرمایا: ''اللّٰهم أعطه ما سأل علىٰ ما في نفسه'' اور چل دیے۔ سامری نے کہا: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ گائے کی آواز کرے۔ سو اس نے گائے کی آواز کی۔ پھر جس وقت وہ آواز کرتا تو اس کو سجدہ کرتے اور جس وقت آواز کرتا تو اپنے سر اٹھا لیتے۔

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢١٧)

پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس اثر کو دوسری وجہ سے حماد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، اس میں یوں ہے کہ سامری نے کہا: میں وہ شے بناتا ہوں جو نفع دے ضرر نہ دے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بچھڑا آواز کرتا اور چلتا تھا۔ ﴿ فَقَالُوْا ﴾ یعنی بنی اسرائیل میں سے جو لوگ گمراہ ہوگئے تھے اور بچھڑے کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے تھے۔ انھوں نے کہا: "هذا إلٰهكم وإلٰه موسٰى" یعنی یہ تمھارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود ہے، وہ اس کو اس جگہ بھول گیا ہے اور اس کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ حدیثِ فتون میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح گزر چکا ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام سماک رحمہ اللہ نے "عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" ﴿ فَنَسِيَ ﴾ کے یہ معنی روایت کیے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس بات کو بھول گئے کہ تم سے ذکر کریں کہ یہ تمھارا معبود ہے۔[1]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے یہ الفاظ مروی ہیں کہ پھر وہ بچھڑے پر لگ بیٹھے اور اس کو ایسا دوست رکھا کہ کبھی کسی چیز کو اس کی طرح دوست نہیں رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَنَسِيَ ﴾ یعنی سامری نے اسلام کو ترک کیا، جس پر وہ تھا۔[1] (قاله محمد بن إسحق عن حكيم بن جبير عن سعيد بن جبير) اللہ پاک نے اُن کی تردید کرنے کے لیے اور اُن کے ڈانٹنے، دھمکانے، جھڑکنے، گھڑکنے کے لیے اور جس طرف وہ گئے ہیں، اس میں ان کی فضیحت و رسوائی اور عقل کی سبکی بیان کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ﴾ یعنی کیا پھر وہ نہیں دیکھتے کہ جس وقت بچھڑے سے سوال اور خطاب کرتے ہیں تو وہ اُن کو کچھ جواب نہیں دیتا۔

﴿ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾ نہ دنیا میں ان کے برے اور بھلے کا اختیار رکھتا ہے نہ آخرت میں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: لا واللہ نہیں تھی آواز اس کی، مگر یہی کہ ہوا اس کی دُبر میں گھستی اور منہ سے نکل جاتی تھی تو اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔[1] متونِ حدیث میں حسن بصری رحمہ اللہ سے گزر چکا ہے کہ اس بچھڑے کا نام بَہموت تھا۔ ان جاہلوں نے جس بات کے ساتھ عذر کیا، حاصل اس کا یہی ہے کہ قبطیوں کے زیوروں سے انھوں نے تقویٰ کیا اور پرہیز کیا، لہٰذا اس کو اپنے پاس سے پھینک دیا اور بچھڑے کو پوج لیا۔ پس حقیر شے سے تو پرہیز کیا اور بڑا کام کر بیٹھے۔

حکایت:

جیسا کہ صحیح حدیث میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اہلِ عراق کے ایک آدمی نے ان سے مچھر کے خون کے بارے میں پوچھا کہ جب وہ کپڑے کو لگ جائے، یعنی کیا اس میں نماز پڑھے یا نہیں؟ تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اہلِ عراق کو تو دیکھو کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو قتل کر ڈالا اور وہ مچھر کے خون کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔[4] (كذا في ابن كثير)

---

① تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۱۷۔ ۲۱۸) ② تفسیر الطبري (۲/ ٦٦) ③ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦)

④ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٦٤٨) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۱٦۔ ۲۱۸)

یہ حکایت ہے اس ماجرے کی جو اللہ پاک اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان واقع ہوا، جب کہ وہ مقررہ وقت پر پہنچے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ وعدہ یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کے سرداروں اور اشراف کی ایک جماعت آئے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام اُن کو لے کر چلے، پھر شوقِ رب میں اُن کے درمیان سے جلد چلے گئے۔ اس پر اللہ پاک نے اُن سے پوچھا کہ کون سی چیز نے تجھے جلدی کرنے پر اُبھارا، یہاں تک کہ تو نے اپنی قوم کو چھوڑا اور اُن کے درمیان سے نکل آیا؟ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض نے کہا کہ قوم سے مراد سارے بنی اسرائیل ہیں، اس قول کی بنیاد پر یوں کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر خلیفہ کیا اور خود اُن میں سے ستر آدمی لے کر میقات کے واسطے نکلے۔

پس ﴿ هُمْ أُولَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِى ﴾ سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ اُن کے پیچھے آئیں اور اُن سے آملیں، بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ مجھ سے قریب ہیں، میرے لوٹنے کا اپنی طرف انتظار کر رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو اس بات کا حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لائیں اور پیچھے آتے ہوئے ان سے آملیں۔[1] ایک گروہ نے کہا ہے کہ قوم سے مراد ہی ستر آدمی ہیں، جن کو پسند کیا تھا اور جس وقت طور کے قریب پہنچے تو اللہ پاک کا کلام سننے کے شوق میں ان سے آگے بڑھ گئے۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک کے سوال کا یہ جواب دیا کہ ﴿ هُمْ أُولَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِى ﴾ یعنی وہ مجھ سے قریب ہیں، میرے نقشِ قدم کے تابع ہیں، میرے بعد پہنچنے والے ہیں، میرے اور اُن کے درمیان میں صرف ذرا سی مسافت ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے کہا ہے کہ بنی تمیم اولیٰ کو "بقصر" کہتے ہیں اور اہلِ حجاز "أولآ" مد کے ساتھ بولتے ہیں۔ (قاله أبو حاتم)

امام ابن ابی اسحاق، نصر اور رویس رحمہم اللہ نے یعقوب سے "اِثْری" ہمزہ کی زیر اور ثائے مثلثہ کے سکون کے ساتھ اور باقی قاریوں نے دونوں کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں۔[2] "ھم" مبتدا ہے اور "اولاء" خبر ہے۔ ﴿ عَلَىٰٓ أَثَرِى ﴾ میں دو احتمال ہیں یا تو خبرِ ثانی یا حال ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اس کا متعلق مقدر نکالا ہے، یعنی "یأتون علی أثري"[3] لہٰذا اس مقدر میں وہی دونوں احتمال درست ہو سکتے ہیں۔ ابو البقاء نے کہا کہ "ما" استفہامیہ مبتدا، "أعجلك" خبر ہم مبتدا، "أولاء" بہ معنی "الذین" ہے، ﴿ عَلَىٰٓ أَثَرِى ﴾ اس کا صلہ ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کا سبب تصریحاً عرض کیا، جس کا اللہ پاک نے اُن سے سوال کیا تھا: ﴿ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ﴾ یعنی میں نے اس جگہ کی طرف جلدی کی، جس کی طرف جانے کا تو نے مجھے حکم دیا تھا، تاکہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ اس وجہ سے کہ میں نے تیرے حکم کے امتثال (فرماں برداری) کی طرف تیزی کی یا اس لیے کہ اس وجہ سے تو مجھ سے راضی ہو۔ اس قول میں اجتہاد کے جواز پر دلیل ہے۔ عجلت شتابی کرنے کو کہتے ہیں، جس طرح "بطء" دیر کرنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "رَجُل عَجِلٌ وَعَجُولٌ وَعَجْلَانَ بَيِّنُ الْعَجلة"، یعنی

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٣٢) [2] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٣٣) فتح القدیر (٣/ ٥٢٠) [3] تفسیر الجلالین (١/ ٤١٣)

جو شخص بڑا جلد باز شتابی کرنے والا ہوتا ہے اس کی صفت میں یہ تینوں الفاظ بولتے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اللہ پاک تو ہر شے کو خوب جانتا ہے، اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، اسے کیا ضرورت کہ کسی بات کا سوال کرے، لہٰذا اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک کی طرف سے سوال واقع ہوتا ہے، وہ سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے، لیکن یہ پوچھنا کچھ معرفت حاصل کرنے کو نہیں ہوتا، بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اپنے غیر کو معلوم کرائے یا اس کو ڈانٹے دھمکائے یا اس کو تنبیہ کرے، آگاہی بخشے، جس طرح کہ امام راغب رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔[1] ظاہر اس کا یہ ہے کہ یہ مجاز نہیں ہے، جیسے شاگرد کہتا ہے کہ استاد نے مجھ سے فلاں بات کا سوال کیا، تاکہ میرے فہم کو معلوم کرے اور اس کی مثل۔ پھر یہاں ایک اور امر رہا، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے اُن سے عجلت کا سبب پوچھا تو وہ جواب اس سوال پر منطبق ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام یوں کہتے کہ تیری زیادہ رضا کی طلب، تیرا کلام سننے کا شوق اور تیرے وعدے کا پورا کرنا، یعنی یہ تین باتیں میری عجلت کے اسباب ہیں۔

رہا ان کا جواب کہ ﴿ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِیْ ﴾ لہٰذا اس سوال کے مطابق نہیں ہے۔ اس کا یوں جواب دیا کہ رب العزت نے اُن سے جو سوال کیا، وہ دو شے کو متضمن (شامل) ہے۔ ایک تو فی نفسہٖ عجلت کا انکار، دوسرے عجلت کے سبب کا سوال، جو عجلت پر باعث ہوا۔ لہٰذا ان دونوں امر سے زیادہ اہم اور موسیٰ علیہ السلام کو مقصود تھا، وہ یہی ہے کہ نفسِ عجلت کے بارے میں جس کا ان پر انکار کیا گیا، عذر بیان کریں۔ علت کی تمہید ذکر کریں اس پر انھوں نے یہ وجہ بیان کی کہ اُن سے کوئی شے ایسی نہیں ہوئی، مگر ذرا سا آگے بڑھ آنا کہ اس جیسے آگے بڑھ آنے کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا، نہ اس کی کچھ پروا کی جاتی ہے۔ میرے درمیان میں اور اُن لوگوں کے درمیان میں جن سے میں آگے بڑھ آیا ہوں، صرف قریب کا فاصلہ ہے کہ اس جیسی مسافت میں ایلچی لوگ ایک دوسرے سے آگے ہو جایا کرتے ہیں۔

پھر اس کے بعد عجلت کے سبب کے بارے میں سوال کا یہ جواب دیا کہ ﴿ وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴾۔ یہ امام زمخشری رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل ہے،[2] جو امام سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف جلدی گئے تو سایۂ عرش میں ایک شخص کو دیکھا، اُن کو اس سے تعجب ہوا تو عرض کیا: یا رب! یہ کون شخص ہے؟ فرمایا: میں تجھے نہ بتاؤں گا کہ وہ کون ہے، لیکن تجھے تین خصلتیں بتائے دیتا ہوں، جو اس میں ہیں۔ حسد نہ کرتا تھا لوگوں پر اس چیز کے بارے میں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی اور اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہیں کرتا تھا اور نہ چغل خوری کرتا تھا۔[3] (أخرجه سعيد بن منصور و ابن أبي شيبة والبيهقي في الشعب من طريق عمرو بن ميمون عن رجل من أصحاب النبي ﷺ)

﴿ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ ﴾ یہ جملۂ مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا یوں کہا گیا

---

[1] حاشية الشهاب (٦/ ٢١٨ـ ٢١٩) [2] الكشاف (٣/ ٨٢) [3] شعب الإيمان (٧/ ٤٩٦) الدر المنثور (٥/ ٥٩١)

کہ پھر اللہ پاک نے کیا کہا تو یہ اس کا جواب ہے کہ اللہ پاک نے یہ فرمایا کہ ہم نے تیرے قدم کی آزمائش اور امتحان کیا ان کو فتنہ و محنت میں ڈال دیا۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ان کو فتنے میں مبتلا کر دیا اور بدبخت کر دیا، کیونکہ تیرے آنے کے بعد انھوں نے بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کے ہمراہ چھوڑ آئے تھے۔[1] یہ لوگ چھے لاکھ آدمی تھے۔ سوائے بارہ ہزار کے سب کے سب فتنے میں پڑ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو ان کے پاس سے نکلے ہوئے بیس دن ہوئے، جب یہ فتنہ واقع ہوا۔

اللہ پاک نے جو اس فتنے کی خبر موسیٰ علیہ السلام کو دی اس میں اختلاف ہے کہ کس وقت خبر دی۔ مفسرین کے اس میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ خبر دینا اس وقت تھا جس وقت اللہ پاک نے اُن سے یہ سوال کیا: ﴿ وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ ﴾ پس یہ سوال ان کے اللہ کے پاس حاضر ہونے کے اول وقت میں تھا اور اس وقت اُن کی قوم ابھی فتنے میں واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس قول کی بنیاد پر اس خبر دینے میں مجاز ہوگا کہ مستقبل پر ماضی کا اطلاق کیا، جس طرح کہ ﴿ اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ ﴾ [النحل: ۱] ''اللہ کا حکم آپہنچا'' میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ خبر چالیس دن پورے ہونے کے بعد دی تھی، یا ان چالیس دِنوں کے آخری دس دنوں میں دی۔ شہاب نے کہا ہے کہ جمہور اس قول پر ہیں۔[2] پس اس قول کی بنا پر یہ خبر دینا حقیقی ہوگا، اس میں کسی طرح کا مجاز نہ ہوگا۔

﴿ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو گمراہی کی طرف بلایا۔ یہ شخص اس قوم میں سے تھا، جو گائے کو پوجتے تھے، پھر بظاہر بنی اسرائیل کے دین میں داخل ہوگیا اور اس کے دل میں وہی گائے کو پوجنا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کا پڑوسی تھا، ان پر ایمان لایا تھا اور منافق تھا۔ بنی اِسرائیل کا ایک قبیلہ سامرہ ہے، سامری اس کی طرف منسوب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قبط سے تھا۔ کسی نے کہا: ایک علج تھا کرمان کے علوج میں سے، اس کو مصر کی طرف لے آئے تھے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا۔[3]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اس کو پرورش کیا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کیا تو بنی اسرائیل کی عورت اپنے بچے کو لیتی اور اس کو کسی گڑھے میں یا کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی اور جگہ ڈال دیا کرتی تھی، فرشتے اُن بچوں کی خبر گیری کرتے اور اُن کی پرورش کیا کرتے، یہاں تک کہ وہ بڑے ہو جاتے، پھر لوگوں کے درمیان میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہ موسیٰ سامری ان بچوں میں سے تھا جن کی خبر گیری جبریل علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ پس وہ اپنی تین انگلیوں سے اس کو غذا دیتے تھے، لہٰذا اس کے واسطے ان کی ایک انگلی سے دودھ نکلتا، دوسری سے گھی اور تیسری سے شہد۔ غرضیکہ اس سامری نے ان لوگوں سے کہا کہ جو بنی اسرائیل میں سے اس کے ہمراہ تھے کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس میعاد سے پیچھے رہ گئے جو تمھارے اور اُن کے درمیان مقرر ہوئی

(1) فتح القدير (۳/ ۵۲۰) (2) حاشية الشهاب (٦/ ٢١٩) (3) تفسير الخازن (١/ ٦٠)

تھی، لہٰذا اس لیے کہ تمھارے ہمراہ زیور چلا آیا ہے، حالانکہ وہ تم پر حرام ہے اور اُن لوگوں کو حکم دیا کہ اس زیور کو آگ میں ڈال دیں، پھر بچھڑے کا قصہ ہوا جو ہوا۔

جب اللہ پاک نے ان کو اس فتنے کی خبر دی تو وہ خفا ہوتے، پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے۔ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا قوم کی طرف لوٹ کر آنا اس کے بعد تھا کہ وہ چالیس دن پورے کر چکے تھے۔ ذی قعدہ کا پورا مہینا اور دس دن ذی حجہ کے، اور تورات لے لی تھی۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ مروی ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام لوٹ کر آئے تو چیخنا چلانا سنا اور وہ لوگ بچھڑے کے گرداگرد ناچ رہے تھے تو اُن ستر آدمیوں سے کہا، جو اُن کے ہمراہ تھے کہ یہ آواز فتنے کی ہے۔[1] تفسیر قرطبی میں ہے کہ امام ابو بکر طرطوشی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا: ہمارے سید فقیہ اس گروہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جو جمع ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت سا ذکر کرتے ہیں۔

پھر طبل، یعنی ڈھول پر چوب (چھڑی) مارتے ہیں اور اُن میں سے بعض لوگ ناچتے ہیں اور وجد کرتے ہیں، یہاں تک کہ غش کھا کر گر پڑتے ہیں اور کوئی شے حاضر کرتے ہیں، اس کو کھاتے ہیں۔ پس آیا اُن کے ساتھ حاضر ہونا جائز ہے یا نہیں؟ آپ ہمیں فتویٰ دیں اللہ آپ پر رحم کرے! انھوں نے اس مسئلے کا یہ جواب دیا کہ اللہ تجھ پر رحم کرے، صوفیہ کا مذہب باطل کا پلندہ، جہالت اور گمراہی ہے۔ اسلام صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ رہا ناچنا اور وجد کرنا، تو اول جس نے اس کو نکالا، وہ سامری کے ساتھی ہیں، جب کہ اس نے ان کے لیے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جس میں سے گائے کی آواز نکلتی تھی تو وہ کھڑے ہوئے اور اُس کے گرداگرد ناچنے اور وجد کرنے لگے۔ لہٰذا یہ دین ہے کفار کا اور بچھڑا پوجنے والوں کا۔

رہا طبل تو پہلے پہل جس نے اس کو بنایا وہ زندیق لوگ ہیں، تاکہ اس کے سبب سے مسلمانوں کو اللہ کی کتاب سے مشغول (غافل) کر دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں جو آپ کے ساتھی تھے، وہ ایسے بیٹھے ہوتے تھے، گویا بسببِ وقار کے اُن کے سروں پر پرندے ہیں۔ پس بادشاہ اور اس کے نائبین کو چاہیے کہ مساجد وغیرہ میں حاضر ہونے سے ان کو منع کریں۔ کسی شخص کو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا ہے، حلال نہیں ہے کہ وہ اُن کے ہمراہ حاضر ہو، یا اُن کے باطل پر اُن کی اعانت کرے۔ یہ مذہب امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا اور ان کے سوا اور ائمۂ مسلمین کا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کی عبارت تمام ہوئی۔[2]

غرضیکہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام خفا ہوتے ہوئے لوٹ کر تشریف لائے تو فرمایا: ﴿ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ﴾ استفہام واسطے انکار توبیخ کے ہے۔ وعدۂ حسن یہی ہے کہ اُن سے جنت کا وعدہ کیا، جب کہ اس کی اطاعت پر قائم رہیں۔ کسی نے کہا ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر تورات میں اپنا کلام اُن کو سنائے گا،

---

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ٣٧) [2] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٣٧۔ ٢٣٨)

تا کہ جو کچھ اس میں ہے، اس پر عمل کریں تو ثوابِ عمل کے مستحق ہوں۔ تورات میں ہزار سورتیں تھیں، ہر سورت میں ہزار آیتیں تھیں، اس کی کتابوں کو ستر اونٹ اُٹھاتے تھے، اس سے خوب تر کوئی وعدہ نہیں ہے۔[1] (قاله النسفي) کسی نے کہا ہے کہ ان سے نصر و ظفر کا وعدہ کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ وعدہ یہ قول ہے: ﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ [طٰہٰ: ۸۲] ''اور بے شک میں بہت بخشنے والا ہوں اس کے لیے جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر ہدایت پر رہے۔''

﴿ اَلَمْ يَعِدْكُمْ ﴾ کا اول مفعول ''کم'' ہے اور دوسرا مقدر ہے، یعنی ''إنه يعطيكم التوراة'' اور ﴿ وَعْدًا حَسَنًا ﴾ مصدر موکد ہے۔ ابو البقاء نے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مفعول بہ ہو بمعنی موعود۔ ﴿ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ ﴾ حرفِ فا واسطے عطف کے ہے مقدر پر ''أي أوعدكم ذلك فطال عليكم الزمان فنسيتم'' یعنی کیا تم سے اس کا وعدہ پھر دراز ہو گیا میری مفارقت کا زمانہ تم پر تو بھول گئے۔ ﴿ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ سے مراد عذاب اور سزا ہے۔ ﴿ يَحِلَّ ﴾ کے معنی ''يلزم'' یا ''ينزل'' ہیں، یعنی یا تم نے اس بات کا ارادہ کیا ہے کہ ایک ایسا فعل کرو اپنے ارادے اور اختیار سے، جو اللہ پاک کے غصے کے تم پر اترنے کا سبب ہو۔

﴿ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴾ اس پر تم نے میرے وعدے کا خلاف کیا۔ یہ ترتیب ہے دونوں شقوں میں سے ہر ایک شق کی تردید کی بطورِ بدل کے اور موعد مصدر مضاف ہے طرف مفعول کے، یعنی تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اللہ عزوجل کی اطاعت پر قائم رہیں گے، یہاں تک کہ طور سے ان کی طرف لوٹ آئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کے پیچھے میقات کی طرف آئیں گے۔ لہٰذا انھوں نے توقف کیا اور اُن کے بعد آنے کو چھوڑ دیا۔ پھر یہ جواب دیا: ﴿ مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا ﴾ یعنی ہم نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اپنے اختیار سے اس کا خلاف نہیں کیا۔

﴿ بِمَلْكِنَا ﴾ میم کی زبر سے قراءت ہے امام نافع، ابو جعفر، عاصم اور عیسی بن عمر رحمہم اللہ کی، اور ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے میم کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم نے اسی قراءت کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے کہ لغت عالیہ فصیحہ پر ہے۔[2] ملک مصدر ہے ''ملكت الشيء أملكه ملكا'' کا۔ یہ مصدر مضاف ہے طرف فاعل کے اور مفعول محذوف ہے: ''أي بملكنا أمورنا أو بملكنا الصواب'' یعنی ہم نے جو تم سے وعدہ کیا تھا، اس کا خلاف نہیں کیا اپنے کاموں کے مالک ہونے کی اور اپنے پسند میں اچھائی کا اختیار رکھتے ہوئے اگر خلاف کرتے تو قصور وار ہوتے، بلکہ ہمیں تو اپنی جانوں پر اختیار نہیں تھا، ہم سے خطا ہوئی، کیوں کہ ہم خطا کی طرف مضطر اور مجبور تھے۔ سامری نے جو کچھ کیا اسے ہم کو اچھا کر دکھایا اور وہ ہماری عقلوں پر غالب ہو گیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''أي بأمرنا'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''بطاقتنا'' امام سدی رحمہ اللہ سے

[1] تفسير النسفي (٣/ ٦٤) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٣٤)

اسی طرح مروی ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "باختیارنا"۔ وجہ یہ ہے کہ آدمی جس وقت فتنے میں پڑ جاتا ہے تو اپنے جی کا مالک نہیں رہتا، یعنی اس کا جی اس کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ بے اختیار ہو جاتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے میم کی پیش سے پڑھا ہے، اس کے معنی ہیں: "بسلطاننا"۔[2] امام حسن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3] یعنی ہمارے لیے ملک وسلطان وغلبہ نہ تھا کہ تمھارے وعدے کا خلاف کریں۔ کسی نے کہا: "بملکنا" میں زبر، پیش اور زیر سب کے سب لغات ہیں۔ "ملکت الشيء" کے مصدر میں امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراآتِ سبعیہ ہیں اور مصدر ہیں "مَلَكَ" بہ تخفیف کے۔ سب کے معنی ایک ہیں یا ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

﴿ وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ ﴾ امام نافع، ابن کثیر، ابن عامر، حفص اور رویس رحمہم اللہ نے "حُمِّلْنَا" کو حائے مہملہ کی پیش اور میم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے زیور کے اٹھانے کی ہم کو تکلیف دی، کیونکہ اس کا اُٹھانا اُن کے حکم اور اشارے سے تھا۔ باقی قاریوں نے حائے مہملہ کی زبر اور میم کی تخفیف سے پڑھا ہے۔ امام ابوعبیدہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اسی قراءت کو پسند کیا ہے،[2] اس لیے کہ بنی اسرائیل نے فرعون والوں کا زیور اپنے اختیار سے اپنے ہمراہ اُٹھایا تھا، کچھ زبردستی اُن پر لدوایا نہیں گیا تھا، کیونکہ جس وقت انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنا چاہا تو فرعون والوں سے عاریتاً مانگ لیا تھا اور اُن کے وہم میں یہ بات ڈالی تھی کہ اپنی عید یا شادی میں جمع ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ زیور تھا کہ جس وقت دریا نے فرعون والوں کو کنارے پر ڈال دیا تو بنی اسرائیل نے اس کو اُن سے لے لیا تھا۔ اس زیور کے بوجھ کا نام "أوزار" بہ معنی "أثام" اس لیے رکھا کہ بنی اسرائیل کو اس کا لینا حلال نہ تھا اور نہ اُن کی شریعت میں اُن کے لیے غنیمتیں حلال تھیں۔ "أوزار" اصل میں "أثقال" کو کہتے ہیں، جیسے کہ اہلِ لغت نے اس کی تصریح کی ہے، یہ "وزر" کی جمع ہے۔ "وزر" ثقل، یعنی بوجھ کو اور گناہ کو کہتے ہیں۔

زینت سے مراد اس جگہ زیور ہے۔ ﴿ فَقَذَفْنٰهَا ﴾ یعنی سامری نے اس زیور کے بوجھ کو آگ میں ڈال دیا، تاکہ اس کے گناہ سے نجات ملے۔ مدارک شریف کی عبارت یہ ہے: "فقذفنها في نار السامري التي أوقدها في الحفرة و أمرنا أن نطرح فيها الحلي فكذلك ألقى السامري ما معه من التراب الذي أخذه من أثر حافر فرس جبريل عليه السلام فاخرج لهم عجلا خلقه الله تعالىٰ من الحلي الذي سبكتها النار ابتلاء جسدا مجسدا له خوار صوت وكان يخور كما تخور العجاجيل"۔[6] کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کو سامری کی طرف ڈال دیا، تاکہ وہ اس کے پاس باقی رہے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام لوٹ کر آئیں

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٥١۔ ٣٥٢) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٣٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٢)
[4] تفسير القرطبي (١١/ ٢٣٤) [5] تفسير القرطبي (١١/ ٢٣٤) [6] تفسير النسفي (٣/ ٦٥)

تو اس میں اپنی رائے دیں۔

﴿ فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴾ یعنی پھر اس کو سامری نے اس کے ڈالنے کی طرح ڈالا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے لوٹ کر آنے میں دیر سمجھی تو سامری نے اُن سے کہا کہ موسیٰ جو تم سے رُک گئے ہیں، وہ اس زیور کے سبب سے ہے جو تمھارے پاس ہے، اس پر انھوں نے زیور کو جمع کیا اور سامری کو دے دیا۔ سامری نے اس کو آگ میں ڈالا اور اس سے اُن کے واسطے ایک بچھڑا ڈھال دیا، پھر اس پر ایک مٹھی اثرِ رسول کی ڈال دی، رسول سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

﴿ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتنۂ سامری کے بارے میں تفصیلی بیان ہے۔ یہ اس کو مقتضی ہے کہ یہ قول اللہ پاک کی طرف سے ہے تو اب معطوف ہوگا ﴿ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴾ پر اور بنی اسرائیل کے کلام سے نہیں ہوگا۔ اگر اُن کے کلام سے ہوتا تو "فَأَخْرَجَ لَنَا" فرمایا جاتا، یعنی پھر نکالا سامری نے ان کے لیے گھڑے میں سے ایک بچھڑا، جس کو زیور سے تین دن میں ڈھالا تھا۔

﴿ جَسَدًا ﴾ حال ہے ﴿ عِجْلًا ﴾ سے، یعنی اُن کے لیے بچھڑے کی صورت نکالی، درآنحالیکہ وہ جسد ہونے والے تھے، یعنی خون اور گوشت جس کی آواز سنائی دیتی تھی، یعنی وہ اس مٹی کے سبب سے، جس کا اثر زندگی ہے، جس شے میں وہ رکھی جاتی ہے، ایسا بن گیا۔ سامری نے اسے ڈھالنے کے بعد وہ مٹی اس کے منہ میں رکھ دی تھی۔ "جسد" کی جمع "أجساد" آتی ہے۔ بارع میں کہا ہے کہ "جسد" نہیں کہتے مگر حیوانِ عاقل کو اور حیوانِ عاقل یہی انسان اور فرشتے اور جن ہیں، اُن کے علاوہ کسی کو "جسد" نہیں کہتے مگر زعفران اور خون جب خشک ہوجاتے تو اُن کو بھی "جسد" و "جاسد" کہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہاں عجل کو جسد کہا ہے، حالانکہ حیوان عاقل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اس بنا پر ہے کہ اس کو عاقل سے تشبیہ دی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ "أخرج لهم عجلا ذا جثة"۔ ﴿ خُوَارٌ ﴾ گائے کی آواز کو کہتے ہیں، یعنی وہ ایسی آواز کرتا تھا، جیسے زندہ بچھڑے آواز کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی آواز ہوا کے سبب سے تھی۔ سامری نے اس میں ایک سوراخ بنایا تھا، تو جس وقت ہوا اس کے پیٹ میں گھستی تو وہ آواز کرتا، اس میں زندگی نہیں تھی۔

﴿ فَقَالُوْا ﴾ یعنی سامری نے اور اُن لوگوں نے جو بادی الرائ میں اس کے موافق ہوگئے تھے یہ کہا کہ ﴿ هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ﴾ یعنی یہ بچھڑا تمھارا معبود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی معبود ہے۔ ﴿ فَنَسِيَ ﴾ سو وہ بھول گیا اور اپنے اس معبود کا مکان نہ جانا، اس کو ڈھونڈنے کے لیے طور میں گیا۔ یہ قول اس بات کا مقتضی ہے کہ انھوں نے بچھڑے کو معبود ٹھیرا لیا تھا، اسی کی لذاتہ پوجا کرتے تھے، نہ اس لیے کہ وہ ان کو اللہ پاک کے قریب کر دے گا۔ کسی نے کہا کہ "نَاسِي" سامری ہے۔ یعنی سامری نے ایمان چھوڑ دیا جس کا موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تھا اور گمراہ ہوگیا۔

امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

﴿ اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ﴾ میں استفہام ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکی کے لیے ہے۔ یعنی کیا پھر عبرت نہیں پکڑتے اور غور وفکر نہیں کرتے اس بات میں کہ یہ بچھڑا نہ اُن کی بات کا کچھ جواب دیتا ہے، نہ اُن سے باتیں کرتا ہے، جس وقت وہ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ پھر کس طرح دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ معبود ہے۔ حالانکہ باہم کلام کرنے سے عاجز ہے؟! "إن" مخففہ ہے ثقیلہ سے، اس میں ضمیر مقدر ہے جو عجل کی طرف پھرتی ہے، یعنی "إِنَّهٗ" اس لیے "یرجع" مرفوع ہے۔ عام قراءت یہی ہے۔ اس کو منصوب بھی پڑھا ہے اس بنا پر کہ "أن" ناصبہ ہے اور اس میں ضعف ہے، اس لیے کہ "أن" ناصبہ افعالِ یقین کے بعد واقع نہیں ہوتا۔ رویتِ اول کی بنا پر علمی ہے اور دوسرے پر بصری ہے۔ جملہ ﴿ وَلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾ معطوف ہے، جملہ "لا یرجع" پر، یعنی وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ کسی ضرر کو اُن سے دور کرے اور نہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی طرح کا نفع اُن کی طرف کھینچ لائے۔[2] (کذا فی فتح البیان وغیرہ)

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۹۱﴾

اور بلاشبہ اس سے پہلے ہارون نے ان سے کہا تھا: اے میری قوم! یقیناً اس (بچھڑے) کے ساتھ تم آزمائے گئے ہو، اور یقیناً تمھارا رب رحمٰن ہے، لہٰذا تم میری اتباع کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو (90) وہ کہنے لگے: ہم تو ہمیشہ اس پر مجاور (بن کر بیٹھ) رہیں گے، حتی کہ موسیٰ ہمارے پاس لوٹ آئے (91)

ہارون علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا سے منع کرنا:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے بچھڑے کے پوجنے سے اُن کو منع کر دیا تھا اور اُن کو خبر دے چکے تھے کہ یہ تمھارے لیے فتنہ ہے اور تمھارا رب تو رحمٰن ہے، جس نے ہر شے کو پیدا کیا، پھر ایک انداز پر اس کو رکھا ہے، عرش کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، لہٰذا تم میری راہ پر چلو، میری بات مانو، یعنی جس بات کا میں تم کو حکم دوں، اس میں میری اطاعت کرو اور جس بات سے میں تم کو منع کروں، اس کو چھوڑ دو۔ وہ بولے ہم تو اسی پر لگے بیٹھے رہیں گے، جب تک موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس واپس نہیں آجاتے، یعنی ہم بچھڑے کی پوجا نہ چھوڑیں گے، یہاں تک کہ اس کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام کی بات سنیں۔ انھوں نے اس بارے میں ہارون علیہ السلام کی مخالفت کی اور اُن سے رُکے، قریب تھا کہ اُن کو قتل کر ڈالیں۔[3] (کذا في ابن کثیر)

---

[1] فتح القدیر (۳/ ۵۲۲) [2] فتح البیان (۸/ ۲۶۲۔ ۲۶۷) [3] تفسیر ابن کثیر (۳۰/ ۲۱۸)

﴿ لَقَدْ ﴾ میں لام توطیہ قسم کا ہے اور جملہ اس انکار اور توبیخ کی تاکید کرتا ہے، جو پہلے جملے میں شامل ہے۔ یعنی اللہ کی قسم! البتہ مقرر ہارون علیہ السلام نے اُن کو کہا تھا اور اُن کو نصیحت کی تھی، اس سے پہلے کہ موسیٰ علیہ السلام اُن کی طرف لوٹ کر آئیں۔ یہ کہا تھا کہ اے میری قوم! تم فتنے میں پڑ گئے ہو بچھڑے کے سبب سے، اس سے تمھاری جانچ کی گئی ہے اور اس کی وجہ سے تم سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہو۔ "حصر" کے معنے جو "إنما" سے سمجھے جاتے ہیں، وہ یہی ہیں کہ بچھڑا اُن کے فتنے اور آزمایش کا سبب ہوگیا ہے نہ کہ ان کی رشد و ہدایت کا، یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بچھڑے کے سبب سے فتنے میں پڑے ہیں، نہ بچھڑے کے علاوہ کسی کے سبب سے۔ تمھارا رب تو رحمٰن ہے، بچھڑا نہیں ہے۔ رحمٰن کا نام نامی خاص کر اس لیے ذکر کیا ہے کہ اُن کو اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ جس وقت وہ توبہ کریں گے تو اللہ پاک اُن کی توبہ قبول کر لے گا، کیوں کہ وہ رحمان ہے، بڑے رحم والا ہے۔ من جملہ اس کی رحمت کے ایک یہ بھی ہے کہ فرعون کی آفتوں سے ان کو رہائی بخشی۔

﴿ فَاتَّبِعُوْنِيْ ﴾ یعنی اللہ پاک کی عبادت کا حکم جو میں تم کو دیتا ہوں، اس میں میری پیروی کرو۔ سامری، جو تم کو بچھڑے کی پوجا کا حکم دیتا ہے، اس میں اس کی بات نہ مانو، میرا حکم مانو، اس کا حکم مت مانو، لہٰذا انھوں نے اس بات کا ایسا جواب دیا کہ جو ہارون علیہ السلام کی نافرمانی کو متضمن ہے اور انھوں نے جو اُن کو خیر کی طرف بلایا اور شر سے ڈرایا، اس کے نہ ماننے کو شامل ہے۔ یعنی ہم تو اس بچھڑے کی پوجا پر ہمیشہ قائم و دائم رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس لوٹ آئیں، پھر ہم دیکھیں گے کہ آیا، وہ ہم کو اس کی پوجا پر ثابت رکھتے ہیں یا اس سے ہم کو منع کرتے ہیں۔ اس وقت ہارون علیہ السلام بارہ ہزار آدمیوں کے ساتھ اُن سے علاحدہ ہوگئے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے سامری کے فعل کا انکار کیا تھا اور اس کو برا سمجھا تھا۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے رب کی طرف جلدی کی تو سامری نے بنی سرائیل کے زیور میں سے جس قدر حاصل کر سکا اس کو جمع کیا، پھر اس کا بچھڑا گھڑا، پھر وہی مٹی اس کے پیٹ میں ڈال دی، تب وہ ایک بچھڑا ایک دھڑ والا ہوگیا، جس کی آواز تھی۔

پھر سامری نے اُن سے کہا ہے کہ یہ تمھارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود ہے۔ اس لیے ہارون علیہ السلام نے ان سے کہا: اے میری قوم! کیا تم سے تمھارے رب نے وعدۂ حسن نہیں کیا ہے؟ پھر جس وقت موسیٰ علیہ السلام لوٹ کر آئے تو اپنے بھائی کا سر پکڑا۔ ہارون علیہ السلام نے اُن سے کہا جو کچھ کہا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا: تیری کیا حقیقت ہے؟ وہ بولا کہ میں نے اس رسول کے پاؤں کے نیچے سے ایک مٹھی بھر لی، پھر میں نے وہی مٹی ڈال دی اور مجھ کو میرے دل نے یہی مصلحت دی، پھر موسیٰ علیہ السلام بچھڑے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس پر ریتیاں رکھیں، پھر ان سے اس کو ریتا اور وہ نہر کے کنارے پر تھے۔ پھر جو لوگ بچھڑے کی پوجا کرتے تھے، ان میں سے جو کوئی وہ پانی پیتا تو اس کا منہ سونے کی طرح زرد ہو جاتا، اس پر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہماری توبہ کیسے ہوگی، فرمایا کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل

کرے، پس انھوں نے چھریاں لیں اور آدمی اپنے بھائی، باپ، بیٹے کو قتل کرنے لگا اور پروا نہ کرتا تھا کہ کون قتل ہوا، یہاں تک کہ اُن میں سے ستر ہزار لوگ قتل ہوگئے، پھر اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ تو اُن کو حکم دے کہ وہ اپنے ہاتھ اُٹھالیں۔ مقررمیں نے اس کو بخش دیا جو مارا گیا اور اس کی توبہ قبول کی جو باقی رہا۔[1] (أخرجه الفريابي و عبد بن حميد و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و الحاكم و صححه) اس کے سوا اس قصے کی بہت سی حکایات ہیں۔[2] (كذا في فتح البيان)

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

اس (موسیٰ) نے کہا: اے ہارون! تجھے کس چیز نے روکے رکھا، جب تو نے انھیں دیکھا کہ وہ بھٹک گئے ہیں (92) کہ تو نے میری اتباع نہ کی؟ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ (93) اس (ہارون) نے کہا: اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑ، یقیناً میں ڈرا کہ تو کہے گا: تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا انتظار نہ کیا (94)

بنی اسرائیل کی صورتِ حال پر موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا باہم تبادلۂ خیال:

چلتے وقت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کو نصیحت کر گئے کہ سب کو متفق رکھنا اس واسطے انھوں نے بچھڑا پوجنے والوں کا مقابلہ نہ کیا، زبان سے سمجھایا، وہ نہ سمجھے۔

اللہ پاک موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ جس وقت وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آئے تو جو امرِ عظیم اُن میں پیدا ہوا تھا، اس کو دیکھا، پس اس وقت غصے سے بھر گئے، تورات کی تختیاں جو اُن کے ہاتھوں میں تھیں، اُن کو ڈال دیا اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔ سورۃ الاعراف میں اس قصے کی تفصیل گزر چکی ہے[3] اور حدیث «لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ»[4] وہاں ذکر ہو چکی ہے اور اپنے بھائی کو ملامت کرنا شروع کیا، پس کہا کہ تجھے کس بات نے منع کیا، جب تو نے اُن کو دیکھا کہ گمراہ ہوگئے اس بات سے کہ تو میرے پیچھے آئے، یعنی پھر تو مجھے اس امر کی خبر دے جیسے ہی یہ واقع ہوا۔ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی، یعنی اس بات میں جو میں نے تجھ سے پہلے کہہ دی تھی، وہ بات یہ ہے: ﴿ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٤٢] ”تو میری قوم میں

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٠ـ ٢٤٣١) مستدرك الحاكم (٢/ ٤١١) [2] فتح البيان (٨/ ٢٦٧ـ ٢٦٩)
[3] رقم الآية [١٥٠] [4] مسند أحمد (١/ ٢٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٧٤)

میرے پیچھے جانشین بن جا اور (ان کی) اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کے راستے کی پیروی نہ کرنا۔‘‘

ہارون علیہ السلام نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! ماں کے ذکر سے مقصود موسیٰ علیہ السلام کے لیے رقت اور نرمی کا اظہار تھا، باوجود اس کے کہ وہ اُن کے سگے بھائی تھے، اس لیے کہ اس جگہ ماں کا ذکر شفقت اور مہربانی سے زیادہ رقت آمیز اور موثر ہے اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ﴾ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے عذر کرتے ہیں کہ میں جو تم سے آ نہ ملا کہ تم کو اس حادثۂ عظیم کی خبر دیتا، لہٰذا میرے پیچھے رہنے کا سبب یہ ہے کہ میں اس بات سے ڈرا کہ اگر تمھارے پیچھے آؤں اور تم کو اس واقعے کی خبر دوں تو تم مجھ سے کہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو تنہا کیوں چھوڑ دیا اور اُن کے درمیان میں پھوٹ ڈال دی، یعنی تو نے اس بات کی رعایت نہ کی، جس کا میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ میں نے تجھ کو اُن میں خلیفہ کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ’’وكان هرون هائبا مطيعاً له‘‘[1] یعنی ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے خائف اور اُن کے فرماں بردار تھے۔

جملہ ﴿ يَهْرُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ﴿٩٢﴾ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ﴾ مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا۔ یعنی اگر کوئی کہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام طور سے واپس آئے تو انھوں نے ہارون علیہ السلام سے کیا کہا؟ اس کا یہ جواب ہے کہ جس وقت وہ بنی اسرائیل کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑے اور اُن کی ڈاڑھی پکڑی اور کہا کہ تجھے کس چیز نے منع کیا اس بات سے کہ تو میرے پیچھے آئے، مجھ سے آ ملے، جب کہ وہ اس گمراہی میں پڑے اور فتنے میں داخل ہوئے۔ کسی نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ تجھے میری پیروی کرنے سے اور اُن پر انکار کرنے سے کس بات نے منع کیا؟ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو نے اُن سے لڑائی کیوں نہ کی، جب کہ تو ہماری یہ بات جان چکا تھا کہ اگر میں اُن کے درمیان میں ہوتا تو اُن سے جنگ کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ تو نے ان سے علاحدگی کیوں نہ اختیار کی۔

﴿ أَلَّا ﴾ میں کلمہ ’’لا‘‘ زاید ہے تاکید کے لیے اور ’’أن‘‘ ناصبہ مصدریہ ہے اور ﴿ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ﴾ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ منع کا دوسرا مفعول ہے، یعنی کون سی شے نے تجھ کو منع کیا تیرے اُن کی گمراہی کو دیکھنے کے وقت کہ تو میری پیروی کرے۔ یہ حرف یائے تحتیہ یا آت زوائد سے ہے، لہٰذا حق اس کا یہ ہے کہ رسم (لکھنے) میں حذف کیا جائے۔ چنانچہ مصحف امام میں اسی طرح ہے۔ ﴿ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ﴾ ہمزہ واسطے انکار و ڈانٹ کے ہے اور حرفِ فا عطف کے لیے ہے مقدر پر، جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہوا کرتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ تو اللہ کے واسطے قیام کرنا اور جو شخص اس کے دین کی مخالفت کرے اس کو چھوڑ دینا، لہٰذا تو نے اس حکم کی کیوں مخالفت کی اور اُن لوگوں کے درمیان میں ٹھہرا رہا، جنھوں نے بچھڑے کو معبود ٹھہرایا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ أَمْرِي ﴾

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٥٩)

سے مراد موسیٰ علیہ السلام کا وہ قول ہے جس کو اللہ پاک نے اُن سے نقل فرمایا ہے: ﴿ وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴾ [الأعراف: ١٤٢] ''اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: تو میری قوم میں میرے پیچھے جانشین بن جا اور (ان کی) اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کے راستے کی پیروی نہ کرنا۔'' لہٰذا اس وقت ہارون علیہ السلام جو اُن کے ہمراہ ٹھہرے رہے اور اُن پر انکار کرنے میں مبالغہ نہ کیا، اس لیے اُن کو اپنی نافرمانی اور مخالفتِ امر کی طرف منسوب کیا۔ امام ابن جریر اور قرطبی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1]

﴿ یَبْنَؤُمَّ ﴾ کو میم کی زبر اور زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان دونوں میں سے ہر قراءت کی بنا پر مراد ''اُمِّيْ'' ہے، لیکن زبر کی بنیاد پر جو الف کہ حرفِ یا سے بدلا ہے، اس کو حذف کر دیا ہے، اس لیے کہ زبر سے اس کی کفایت ہوگئی اور کسر کی بنا پر کسرے کی کفایت سے یا حذف کر دی گئی۔ رہی یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام کو ماں کی طرف منسوب کیا، باوجود اس کے کہ جمہور کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کے سگے بھائی ہیں، لہٰذا اُن کی شفقت حاصل کرنے کے لیے اور اُن کا دل نرم کرنے کے لیے ایسا کیا۔ ماں کا ذکر اس واسطے نہیں ہے کہ فقط ماں کی طرف سے وہ ان کے بھائی تھے، جس طرح کہ بعض نے کہا ہے، کیوں کہ حق بات یہی ہے کہ وہ اُن کے حقیقی بھائی تھے۔

﴿ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ ﴾ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ''لا تأخذني بلحیتي'' اسی لیے حرفِ با داخل ہوا ہے۔ لام کا زبر ایک لغت ہے اور اس کو زبر و زیر دونوں سے پڑھا ہے، یعنی مجھ کو تو میری ڈاڑھی سے مت پکڑ۔ ﴿ وَلَا بِرَاْسِیْ ﴾ کے معنی ہیں: ''وَلَا بِشَعْرِ رَاْسِيْ'' یعنی تو میرے سر کے بال نہ پکڑ۔ موسیٰ علیہ السلام نے غصے کے مارے ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی بائیں ہاتھ میں اور اُن کے دو گیسو سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔ یعنی تم یہ کام سزا کے طور پر میرے ساتھ نہ کرو، کیونکہ میرا ایک عذر ہے اور وہ یہ ہے: ﴿ اِنِّیْ خَشِیْتُ ... الخ ﴾ یعنی میں ڈرا کہ اگر میں اُن کے پاس سے نکل جاؤں گا اور اُن کو چھوڑ دوں گا تو اس بات سے وہ متفرق ہو جائیں گے تو تم مجھ سے کہو گے کہ تو نے اُن کی جماعت کو متفرق کر دیا اور تم مجھ پر خفا ہو گے۔ یہ اس لیے کہ اگر ہارون علیہ السلام نکل جاتے تو جن لوگوں نے بچھڑا نہیں پوجا تھا، اُن میں سے ایک گروہ اُن کے ساتھ ہو جاتا اور بچھڑے کے پاس سامری کے ہمراہ دوسرا گروہ رہ جاتا اور نوبت اُن کی باہمی لڑائی تک پہنچ جاتی۔

﴿ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ﴾ کے یہ معنی ہیں تم کہو گے کہ میری وصیت پر تو نے عمل نہ کیا، جو اُن کے بارے میں تجھے کی تھی اور نہ اس پر نگاہ رکھی۔ وصیت سے مراد موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ ''اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَأَصْلِحْ''، امام ابو عبیدہ نے کہا معنی یہ ہیں کہ تو نے میرے عہد اور میرے آنے کا انتظار نہ کیا،[2] کیونکہ تم نے مجھے اس بات کا حکم دیا تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ''لم تنتظر قولي ما أنا صانع'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٣٦٠) تفسیر القرطبي (١١/ ٢٣٧) [2] تفسیر القرطبی (١١/ ٢٣٩)

نے فرمایا: ﴿ لَمْ تَرْقُبْ ﴾ کے معنی ہیں: ''لم تحفظ'' یعنی تو نے میرے قول کو یاد نہ رکھا۔[1]

﴿ قَوْلِیْ ﴾ کی یائے متکلم میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں، اس بنیاد پر ﴿ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ﴾ کا عطف ہوگا ﴿ فَرَّقْتَ ﴾ پر، معنی اس کے پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام مراد ہیں ،اس بنا پر اس کا عطف ہوگا ﴿ اَنْ تَقُوْلَ ﴾ پر، یعنی میں ڈرا اس بات سے کہ تم قولِ مذکور کہو اور میں ڈرا اس بات سے کہ تم میری بات میں غور و تامل نہ کرو، یہاں تک کہ میرا عذر سمجھو، لیکن مفسرین احتمالِ اول پر ہیں، جیسے سمین، بیضاوی، خازن اور خطیب ان سب نے اسی پر قصر کیا ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ بھی اسی پر ہیں۔ ''ولم ترقب قولي، ولم تحفظ قولي، اخلفني في قومي و أصلح، وفيه دليل علىٰ جواز الاجتهاد''[3] محلی رحمہ اللہ احتمال ثانی کے قائل ہیں۔[4] غرض یہ کہ ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے اس جگہ وہی عذر کیا جس کا ذکر ہو چکا ہے اور سوۃ الاعراف میں اللہ پاک نے جو عذر اُن کی طرف سے نقل فرمایا ہے وہ یہ ہے: ﴿ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ﴾ [الأعراف: ١٥٠] ''ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں۔''[5] (كذا في فتح البيان وغيره)

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝٩٥ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ
فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ
سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝٩٦ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ
تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى
اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي
الْيَمِّ نَسْفًا ۝٩٧ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ
كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝٩٨

اس (موسیٰ) نے کہا: اے سامری! تیرا کیا معاملہ ہے؟ (95) اس (سامری) نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہ دیکھی، چناں چہ میں نے (مٹی کی) ایک مٹھی رسول (جبریل کے گھوڑے) کے نقشِ قدم سے بھر لی اور وہ اس میں ڈال دی، اور اسی طرح میرے نفس نے (اسے) میرے لیے خوش نما بنا دیا (96) اس (موسیٰ) نے کہا: تو چلا جا، اب یقیناً تیرے لیے زندگی بھر یہی ہے کہ تو کہتا رہے: (مجھے) نہ چھونا، اور بے شک تیرے لیے ایک وعدہ ہے، جس کی خلاف ورزی تجھ سے ہرگز نہیں کی جائے گی۔ اور تو اپنے معبود

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٦٠) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٦٧) تفسير الخازن (٤/ ٢٧٨) [3] تفسير النسفي (٣/ ٦٦)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤١٤) [5] فتح البيان (٨/ ٢٦٩۔ ٢٧٠)

کی طرف دیکھ جس پر تو مجاور بنا رہا، البتہ ہم اسے ضرور جلا دیں گے، پھر یقیناً (اس کی راکھ) اُڑا کر سمندر میں بکھیر دیں گے (97) بس تمھارا معبود تو اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے ہر چیز کو اپنے علم سے گھیر رکھا ہے (98)

سامری کے بچھڑا بنانے، اسے اس کی سزا ملنے اور بچھڑے کو جلانے کا بیان:

جس وقت بنی اسرائیل بہتے دریا میں داخل ہوگئے، ان کے پیچھے فرعون اپنی فوج کے ساتھ داخل ہوگیا تو جبریل علیہ السلام درمیان میں ہوگئے کہ ان کو ان تک نہ ملنے دیں۔ سامری نے پہچانا کہ یہ جبریل ہیں، ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اُٹھالی، وہی اب اس سونے کے بچھڑے میں ڈال دی۔ سونا تھا کافروں کا، مال لیا فریب سے، اس میں برکت والی مٹی پڑی۔ حق اور باطل مل کر ایک کرشمہ پیدا ہوا کہ جاندار کی روح اور آواز اس میں ہوگئی۔ ایسی چیزوں سے بہت بچنا چاہیے، اس سے بت پرستی بڑھتی ہے۔

دنیا میں اس کو یہی سزا ملی کہ وہ بنی اسرائیل کے لشکر سے باہر الگ تھلگ رہتا، اگر وہ کسی سے ملتا یا کوئی اس سے ملتا تو دونوں کو تپ چڑھ جاتا، اس لیے لوگوں کو اپنے سے دور دور کرتا۔ اور ایک وعدہ ہے کہ خلاف نہ ہوگا، شاید عذابِ آخرت ہے اور شاید دجال کا نکلنا، وہ بھی یہود میں اسی کا فساد پورا کرے گا، جیسے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مال بانٹتے تھے، ایک شخص نے کہا: انصاف سے بانٹو! فرمایا: اس کے جنس کے لوگ نکلیں گے، وہ خارجی نکلے کہ اپنے پیشواؤں پر اعتراض کریں گے، جو کوئی دین کے پیشواؤں پر طعن کرے، وہ ایسا ہی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سامری سے فرماتے ہیں کہ تجھے کس چیز نے اس کام پر آمادہ کیا جو تو نے کیا اور تجھے کونسی چیز پیش آئی کہ تو وہ کر بیٹھا جو تو نے کیا۔ بطریق سعید بن جبیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سامری ایک مرد تھا باجرما (جگہ کا نام) والوں میں سے اور اس قوم سے جو گائے کو پوجتے ہیں۔ گائے کو پوجنے کی محبت اس کے جی میں پہلے سے موجود تھی۔ بنی اسرائیل کے ساتھ اس نے اسلام ظاہر کیا تھا۔ اس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا۔[1] ایک روایت میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ وہ کرمان کا تھا۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک گاؤں سے تھا، جس کا نام سامرہ ہے۔[3] یہ اقوال پہلے بیان ہوچکے ہیں۔

﴿ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھ لیا، جب وہ فرعون کو ہلاک کرنے کے لیے آئے۔ ﴿ مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾ کے معنی ہیں: "من أثر فرس الرسول"، یعنی جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے میں نے ایک مٹھی مٹی لے لی۔ بہت سے مفسرین یا اکثر کے نزدیک یہی قول مشہور

---

[1] تفسير الطبري (٢/ ٦٦۔ ٦٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٢) [3] الدر المنثور (٥/ ٥٩٦)

ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت جبریل علیہ السلام اُترے تو موسیٰ کو آسمان کی طرف چڑھا لے گئے لوگوں میں سے۔ سامری نے اس کو دیکھ لیا تو گھوڑے کی ٹاپ کے نیچے سے ایک مٹھی مٹی کی بھر لی۔ فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے پیچھے سوار کر لیا، یہاں تک کہ جس وقت آسمان کے دروازے کے قریب ہوئے تو چڑھ گئے۔ اللہ پاک نے تختیاں لکھیں اور وہ تختیوں پر قلموں کی آواز کو سن رہے تھے۔ پھر جب اللہ پاک نے ان کو خبر دی کہ اُن کی قوم اُن کے بعد فتنے میں پڑ گئی تو موسیٰ علیہ السلام اترے، پھر بچھڑے کو پکڑا، اس کو جلا ڈالا۔[1] یہ حدیث غریب ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾ کے معنی ہیں: "من تحت حافر فرس جبریل"، یعنی جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے ٹاپ کے نیچے سے۔

کہا کہ ﴿ قَبْضَةً ﴾ "مِلْءُ الْكَف" کو کہتے ہیں، یعنی ہتھیلی بھر جو شے ہو اس کو قبضہ بولتے ہیں اور قبصہ صاد مہملہ کے ساتھ وہ شے ہے جو انگلیوں کے کناروں سے لے جاتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شے سامری کے ہاتھ میں تھی اس کو اس نے بنی اسرائیل کے زیور میں ڈال دیا تو وہ ایک بچھڑا ایک دھڑ کی صورت میں ڈھل گیا، جس کی آواز تھی۔ یعنی اس میں ہوا کی آواز تھی، لہٰذا یہی اس کا ﴿ خُوَارٌ ﴾ تھا۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سامری نے رسول کو دیکھا تو اس کے جی میں یہ بات ڈال دی گئی کہ اگر تو اس گھوڑے کے اثر سے ایک مٹھی لے لے گا، پھر اس کو کسی شے میں ڈالے گا، پھر اس کو کن کہے گا، یعنی ہو جا تو وہ ہو جائے گا۔ اس پر اس نے اثرِ رسول سے ایک مٹھی بھر لی تو اس کی انگلیاں اس مٹی پر خشک ہو گئیں۔

پھر جس وقت موسیٰ علیہ السلام میقات کے واسطے گئے، یعنی تورات لینے کے لیے طور کی طرف تشریف لے گئے اور بنی اسرائیل فرعون والوں سے زیور عاریت لے چکے تھے تو سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم کو جو کچھ پہنچا ہے، وہ اسی زیور کی وجہ سے ہے، لہٰذا تم اس کو جمع کرو تو انھوں نے اس کو جمع کیا، پھر اس پر آگ جلائی تو وہ پگھل گیا، پھر سامری نے اس کو دیکھا تو اس کے قلب میں یہ بات القا ہوئی کہ اگر تو اس مٹی کو اس میں ڈال دے گا، پھر تو "کُن" کہے گا تو وہ ہو جائے گا، اس پر اس نے وہ مٹی ڈال دی، پھر کہا: "کُن"، تو وہ بچھڑا ہو گیا ﴿ جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾۔ پھر اس نے کہا: ﴿ هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ﴾[3]

اسی لیے سامری نے یوں کہا: ﴿ فَنَبَذْتُهَا ﴾ یعنی میں نے اس کو ڈال دیا ہمراہ ان لوگوں کے جنھوں نے ڈالا۔ ﴿ وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴾ "أي حسنته وأعجبها إذ ذاك"، یعنی اس وقت میرے جی نے اس کام کو مجھے اچھا کر دکھایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ﴾ یعنی جس طرح تو نے

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢١٩) الدر المنثور (٥/ ٥٨٨) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٦٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٣)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣١)

وہ شے لی اور چھوئی، جو تیرے لائق نہیں تھا، یعنی اثرِ رسول کا، اسی طرح اب دنیا میں یہ سزا ہے کہ تو کہے: ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ یعنی نہ تو لوگوں کو چھوئے نہ وہ تجھے چھوئیں۔ ﴿ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا ﴾ یعنی تیرے لیے ایک وعدہ ہے روزِ قیامت کو۔ ﴿ لَنْ تُخْلَفَهٗ ﴾ یعنی اس وعدے سے تیرے لیے کوئی مفر (بچاؤ) نہ ہوگا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک سزا ہے ان کے لیے اور اُن میں سے جو اس زمانے میں باقی ہیں، وہ کہتے ہیں: ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ یعنی تم ہم کو مت چھوؤ۔ امام حسن رحمہ اللہ، امام قتادہ اور ابونہیک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَنْ تُخْلَفَهٗ ﴾ کے معنی ہیں: "لن تغیب عنه" یعنی تو اس وعدے سے ہرگز غائب نہ ہوگا۔[1]

﴿ وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ﴾ "إله" سے مراد معبود ہے، یعنی تو اپنے معبود کی طرف دیکھ، جس کی پوجا پر تو نے اقامت کی۔ مراد اس سے بچھڑا ہے۔ ﴿ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ﴾ کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور امام سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو ریتیوں سے رِیتا اور اس کو آگ پر ڈال دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سونے کا بچھڑا گوشت اور خون ہوگیا تھا۔ لٰہذا اس کو آگ سے جلا ڈالا، پھر اس کی راکھ دریا میں ڈال دی۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴾۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ موسیٰ علیہ السلام ان سے فرماتے ہیں کہ یہ بچھڑا تمھارا معبود نہیں ہے۔ تمھارا معبود تو اللہ ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی۔ یعنی عبادت کا مستحق بندوں میں سے نہیں ہے مگر وہ، اور نہ عبادت لائق ہے مگر اسی کے واسطے، کیونکہ ہر شے اس کی طرف محتاج ہے اور اس کی غلام ہے۔ ﴿ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ نصب اس کا بنا بر تمیز ہے۔ یعنی اللہ پاک ہر شے کا عالم ہے اور ہر شے کو اس کے علم نے احاطہ کر لیا ہے اور ہر شے کو گن کر شمار کر رکھا ہے، سو اس سے ایک ذرہ بھی غائب نہیں ہوتا۔ اور جگہ فرمایا ہے ﴿ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] "اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟" نیز فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ﴾ [هود: ٦] "اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔" اس بارے میں اُن کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی سے گفتگو ترک کی اور سامری کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴾ یعنی اے سامری! اب تیری کیا شان ہے، کیا کیفیت ہے، تجھے کس بات نے اس کام پر آمادہ کیا جو تو نے کیا؟ اس

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٣٦٣۔ ٣٦٤)
[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٣٦٦۔ ٣٦٧)
[3] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢١٩۔ ٢٢٠)

نے یہ جواب دیا کہ ﴿ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ ﴾ یعنی میں نے وہ شے دیکھی اور جانی جو انھوں نے نہ دیکھی اور نہ جانی۔ اس کی اس قول سے مراد یہ ہے کہ اس نے جبریل علیہ السلام کو فرسِ حیات پر دیکھا تو اس کے ذہن میں اس بات کا القا ہوا کہ اُن کے اثر سے ایک مٹھی بھر لی اور یہ اثر جس بے جان پر پڑے گا وہ زندہ ہوجائے گا۔

امام حمزہ، کسائی، اعمش اور خلف رحمہم اللہ نے "تبصروا" تائے فوقانیہ کے ساتھ صیغۂ خطاب سے پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے یائے تحتیہ صیغۂ غائب سے پڑھا ہے۔ یہی قراءت زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ یہ بات انتہائی بعید ہے کہ سامری موسیٰ علیہ السلام سے اس بات کا خطاب کرے اور اپنے لیے یہ دعویٰ کرے کہ اس نے وہ بات جان لی، جو موسیٰ علیہ السلام نے نہ جانی۔[1] محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "بصر بالشيء" یعنی جانا شے کو "و أبصره" یعنی نظر کی اس شے کی طرف۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] غیر زجاج کے کہا کہ دونوں کے معنی "علمه" ہیں۔ عامہ، یعنی جمہور نے "بصرت" اور "یبصروا" کو صاد کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمش و ابو السماک کی قراءت "بصرت" صاد کی زیر کے ساتھ اور "یبصروا" صاد کی زبر سے ہے۔ یہ ایک لغت ہے عمرو بن عبید نے دونوں فعلوں کو مجہول کے صیغہ سے پڑھا ہے۔[3] اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ میں معلوم کروایا گیا، وہ جس کو وہ لوگ معلوم نہیں کروائے گئے۔

سیدنا ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، امام حسن اور امام قتادہ رحمہما اللہ نے "فقبصت قبصة" دونوں کو صاد مہملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے دونوں کو ضاد معجمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ قبض ضاد معجمہ کے ساتھ ساری ہتھیلی سے لینے کو کہتے ہیں اور قبص صاد مہملہ کے ساتھ انگلیوں کے کنارے سے لینے کو بولتے ہیں۔ "قُبضة" قاف کے پیش کے ساتھ قدرِ مقبوض کو کہتے ہیں۔[4] امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قُبضة" وہ چیز ہے، جس پر تو پنجہ مارے کسی شے سے، کہا اور کبھی یہ زبر کے ساتھ آیا ہے۔[5] "قُبضه" کو قاف کی پیش اور زبر سے پڑھا ہے۔ "قَبضه" جو زبر کے ساتھ ہے، اس کے معنی ہیں، ایک بار نیچے سے لینا، پھر اس کا اطلاق اس شے پر کیا گیا جو پنجے میں لی جاتی ہے اور "قُبضه" قاف کی پیش کے ساتھ کے یہی معنی ہیں۔ غرضیکہ "قُبضه" اور "قَبضه" مٹھی بھر چیز کو بولتے ہیں۔

﴿ مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ میں نے مٹھی بھر مٹی لی، اس جگہ سے کہ جس پر جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کا سم پڑ گیا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ سامری نے جبریل علیہ السلام کو کس طرح پہچانا۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو بچپن میں جبریل علیہ السلام نے پالا تھا، تین انگلیاں اس کے منہ میں دیتے تھے تو ایک سے دودھ نکلتا، دوسرے سے گھی تیسرے سے شہد۔ پھر جب جبریل علیہ السلام تشریف لائے، تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو جبلِ طور کی طرف طلب کریں، اس لیے کہ وہ

---

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٤٠) فتح القدیر (٣/ ٥٢٥) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٧٤) [3] روح المعاني (١٦/ ٢٥٣)
[4] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٤٠) [5] الصحاح (٤/ ٢٣٧)

تورات لیں اور وہ ایک گھوڑے پر سوار تھے، جب وہ اپنے سم کو کسی شے پر رکھتے تو وہ شے سبز ہوجاتی، لہٰذا جس وقت سامری نے اُن کو دیکھا تو پرانی اُلفت کے سبب سے پہچان لیا اور یہ بات بھی جان گیا کہ جس مٹی پر وہ گھوڑے اپنا سم رکھتے تو اس کی ایک حالت ہوجاتی ہے، یعنی وہاں سبزہ اُگ اٹھتا ہے۔ جبریل علیہ السلام کے پالنے کا یہ سبب ہوا کہ سامری اس سال پیدا ہوا جس میں فرعون لڑکوں کو قتل کرتا تھا، اس لیے سامری کی ماں نے قتل کے خوف سے اس کو ایک غار میں رکھ دیا۔ پھر اللہ پاک نے جبریل علیہ السلام کو اس کی طرف بھیجا، تاکہ اس کی خبر گیری کریں۔ یہ قصہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سامری نے مٹی اس وقت لی، جس وقت جبریل علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے آئے، تاکہ اُن کو کوہِ طور پر لے جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دریا عبور کرتے وقت لی تھی۔ لیکن یہ قول یہاں ظاہر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس وقت جبریل علیہ السلام رسول ہو کر نہیں آئے تھے، حالانکہ سامری نے یوں کہا ہے: ﴿ مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾

دوسری یہ بات ہے کہ دریا عبور کرتے وقت سامری بنی اسرائیل کے ہمراہ تھا اور بنی اسرائیل دریا کے عبور کرنے میں قبطیوں سے آگے بڑھ چکے تھے اور جبریل علیہ السلام قبطیوں کے آگے تھے، اُن کو دریا میں گھسانے کے لیے حیلہ گری فرماتے تھے۔ حفناوی نے اسی طرح کہا ہے اور اس کی اصل خازن و رازی اور بیضاوی کے بعض حاشیوں میں ہے۔ ابو السعود نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾ یعنی وہ فرشتہ جو تمھاری طرف بھیجا گیا، تاکہ تم کو مناجات کے لیے اور تورات لینے کے لیے کوہِ طور کی طرف لے جائے۔ شاید فرشتے کا ذکر رسالت کے طور پر اس لیے کیا کہ وہ، یعنی سامری اس بات سے واقف ہو، جس کا قوم کو پتا نہ چلا اور اسے مٹھی لینے کے وقت آگاہ کرنے کے لیے یہ ذکر کیا۔[1]

﴿ فَنَبَذْتُهَا ﴾ کے یہ معنی کہ پھر میں نے وہ مٹھی اس زیور میں ڈال دی جو گھلایا گیا اور بچھڑے کی صورت میں ڈھالا گیا تھا۔ ﴿ وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴾ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَوَّلَتْ ﴾ کے معنی "زَيَّنَتْ" ہیں،[2] یعنی میرے نفس نے زینت دی زینت دینے کے مثل۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "حدثتني نفسي"، یعنی مجھ سے میرے جی نے کہا ہے کہ میں اس کام کو کروں۔ لہٰذا میں نے اس کام کو کیا اپنی خواہش کی پیروی کے لیے۔ یہ اپنی خطا کا اقرار ہے اور اپنا عذر پیش کرنا ہے۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے یہ بات سنی تو فرمایا: ﴿ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ﴾۔ "مساس" لیا گیا ہے "مماسة" سے، "مماسة" کہتے ہیں باہم چھونے کو، یعنی نہ تجھے کوئی چھوئے نہ تو کسی کو چھوئے، لیکن اپنے اختیار سے نہیں، بلکہ تو اس طرف مضطر اور مجبور کر دیا جائے۔ یہ اس طرح ہوا کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامری کو اپنی قوم سے نکال دیں اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اس سے میل جول نہ رکھیں نہ اس کے قریب ہوں نہ اس سے بات چیت کریں۔ یہ سب اس کی سزا کے لیے کیا گیا، دنیا میں اس سے زیادہ وحشت ناک اور گراں تر کوئی اور شے نہیں۔

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٣٩) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤٠)

کہتے ہیں کہ اس کی قوم باقی ہے، اس میں اب تک یہی حالت ہے۔ کہا ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے یہ بات کہی تو وہ بھاگ گیا، پھر وہ جنگل میں درندوں اور وحشیوں کے ساتھ سرگشتہ اور حیران و پریشان پھرنے لگا، آدمیوں سے کسی کو نہیں پاتا تھا کہ اسے چھوئے، یہاں تک کہ وہ ایسا ہوگیا جیسا کوئی ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ کہے، اس لیے کہ وہ لوگوں سے دور اور لوگ اس سے دور۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ کسرے پر مبنی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا سین کو اس لیے کسرہ دیا کہ کسرہ تانیث کی علامتوں میں سے ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے صحاح میں کہا ہے کہ عرب کا قول ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ مثل قطام کے ہے۔ لہٰذا وہ مبنی کیا گیا ہے کسرے پر، اس لیے کہ وہ معدول ہے مصدر سے اور مصدر ''مس'' ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے علی بن سلیمان سے سنا، علی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن یزید مبرد کو کہتے سنا کہ جس وقت شے تین جہت سے معتل ہو جائے تو واجب ہے کہ وہ مبنی کی جائے، یعنی جس شے میں تین علتیں جمع ہو جائیں تو اس کا مبنی کرنا ضروری ہے اور جب دو جہت سے معتل ہو تو واجب ہے کہ غیر منصرف ہو، اس لیے کہ غیر منصرف ہونے کے بعد کچھ نہیں ہے مگر مبنی ہونا۔ لہٰذا مساس اور دراک تین جہت سے معتل ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ معدول ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ مونث ہے۔ تیسرے یہ ہے کہ معرفہ ہے۔ پھر جب اس میں مبنی ہونا واجب ہوگیا اور سین سے پہلے الف ساکن تھا تو سین کو بسبب التقائے ساکنین کے کسرہ دیا گیا۔

امام نحاس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو اسحاق، یعنی زجاج رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ قول خطا ہے اور ابو العباس مبرد کو یہ الزام دیا کہ جس وقت فرعون کسی عورت کا نام رکھا جائے تو وہ اس کو مبنی کریں، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِسَاسَ ﴾ ماس کا مصدر ہے، جیسے قتال مصدر ہے ''قَاتَلَ'' کا اور یہ لائے نفی جنس کے ساتھ مبنی ہے۔ مراد اس سے نہی ہے، یعنی تو مجھ کو مت چھو اور میں تجھ کو نہ چھوؤں۔ ابوحیوہ نے ''مَساس'' کو میم کی زبر کے ساتھ اور باقی قراء نے میم کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ کے معنی میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا حاصل تین وجوہ ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ سامری پر لوگوں کی مماسّت حرام کی گئی، جس وقت کوئی اس کو چھوتا تو چھونے والا اور جس کو چھوا دونوں کو تپ چڑھ آتا تھا۔ اسی لیے جب وہ کسی کو دیکھتا تو ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ چیختا چلاتا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مراد لوگوں کو اس کے ملنے جلنے سے منع کرنا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جس وقت کوئی شخص مہجور اور متروک ہوجاتا ہے تو وہ خود ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ نہیں کہتا ہے، اور لوگ اس کو کہتے ہیں۔ اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اس سے حکایت مراد ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے سامری! میں تجھے ایسا کر دوں گا، جس وقت تو اپنے حال کی خبر دے گا تو ﴿ لَا مِسَاسَ ﴾ کہے گا۔ تیسرا قول یہ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤١۔ ٢٤٢) فتح القدير (٣/ ٥٢٥۔ ٥٢٦)

ہے کہ مراد اس کی نسل کا انقطاع ہے اور وہ اس بات کی خبر دے گا کہ عورت کے چھونے پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ ابو مسلم اسی کے قائل ہیں۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔[1]

کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے قتل کا ارادہ کیا تھا تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تو اس کو قتل مت کر اس لیے کہ وہ سخی ہے۔ اس قول کو قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ بدعت و معاصی کو نکال دینے اور اُن سے بات چیت ترک کرنے اور اُن سے میل جول نہ رکھنے میں اصل ہے۔ غرضیکہ یہ سزا تو دنیا میں ملی، پھر جو حال اس کا آخرت میں ہوگا اس کا ذکر فرمایا:

﴿ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ﴾ یعنی ہرگز اللہ خلاف نہ کرے گا اس موعد کو تجھ سے، اور وہ روزِ قیامت ہے۔ موعد مصدر بھی ہے، اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ تیرے واسطے ایک وعدہ ہے تیرے عذاب کے لیے وہ ضرور ہونے والا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو فعل تو نے کیا ہے، اس پر اللہ تیری مکافات کرے گا قیامت میں اور اللہ خلافِ وعدہ نہیں کرتا۔[3] ابو عمرو، یعقوب، ابن محیصن، یزیدی اور حسن رحمہ اللہ نے "تخلفه" کو لام کی زیر سے پڑھا ہے۔ اس قراءت کی بنا پر اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ ہیں کہ عن قریب تو اس وعدے کو آئے گا، ہرگز اس سے غائب نہ ہوگا اور ہرگز اس کو خلاف کیا ہوا نہ پائے گا، جس طرح تو کہتا ہے: "أحمدته أي وجدته محموداً"، یعنی میں نے اس کو محمود پایا۔ دوسرے معنی تہدید کی بنا پر ہیں، یعنی تجھ کو ضرور ہے کہ تو اس کی طرف جائے، اللہ نے تجھ سے جو وعدہ کیا ہے ہرگز وہ اس کے خلاف نہ کرے گا، بلکہ تو اس کو پائے گا اور عن قریب تجھے پہنچے گا تو ہرگز اس سے بھاگ نہ سکے گا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "نخلفه" نون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ پاک ہرگز اس وعدے کے خلاف نہ کرے گا۔ باقی قاریوں نے لام کی زبر اور تائے فوقیہ کے ساتھ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے، اس کے معنی وہی ہیں جو مذکور ہوئے۔[4]

﴿ ظَلْتَ ﴾ کی اصل "ظللت" ہے، پہلے لام کو تخفیف کے واسطے حذف کر دیا ہے، عرب لوگ یہ کام بہت کیا کرتے ہیں۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے دو لام کے ساتھ بنا بر اصل پڑھا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "ظلت" ظاء معجمہ کی زیر کے ساتھ ہے۔ "عاكف" کے معنی ملازم ہیں، یعنی تو اپنے معبود کو دیکھ جس کی عبادت پر تو دائم قائم ہو رہا ہے۔ ﴿ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ﴾ جمہور نے نون کی پیش اور رائے مہملہ کی شد "حَرَّقه يحرقه" سے پڑھا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ کی قراءت نون کی پیش کے ساتھ حائے مہملہ اور را کی تخفیف سے ہے۔ "أَحْرَقَهٗ يحرقه" سے۔ سیدنا علی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام ابو جعفر، ابن محیصن، اشہب عقیلی نے "لَنَحْرُقنه" نون کی زبر اور رائے مخففہ کی پیش سے پڑھا ہے۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "حرقت الشيء أحرقه حرقا إذا بردته و حككت بعضه ببعض"، یعنی یہ جب بولتے ہیں کہ تو کسی شے کو ریتی سے ریتے، یعنی ہم اس کو ریتیوں سے ریتیں گے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٢٦) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤١) [3] معاني القرآن (٣/ ٣٧٥) [4] فتح القدير (٣/ ٥٢٦)

ریتی کو مبرد و مبرق بولتے ہیں۔ پہلی قراءت زیادہ صحیح ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ ہم اس کو جلا دیں گے۔ اسی طرح دوسری قراءت کے معنی ہیں۔ ان تینوں قراءتوں میں یوں جمع کی گئی ہے کہ وہ بچھڑا جلایا گیا، پھر ریتی سے ریتا گیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: "لنذبحنه ثم لنحرقنه" اس میں حرفِ لام توطیہ قسم کے لیے ہے۔

﴿ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴾ "نسف" شے کے جھاڑنے جھٹکنے کو کہتے ہیں، تاکہ اس کو ہوا لے جائے۔ ابو رجاء رحمہ اللہ نے سین مہملہ کی پیش سے پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے سین کی زیر سے پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں۔ منسف سوپ کو کہتے ہیں جس سے غلے کو پھٹکتے ہیں۔ نسافہ پھٹکن ہے جو پھٹکنے سے گر پڑتی ہے۔[1] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ہم اس کو دریا کی ہوا سے ایسا اُڑا دیں گے کہ اس کا نہ عین باقی رہے گا نہ اثر۔ اس سے مقصود اس کی سزا کا ذکر کرنا ہے اور جو لوگ اس کے سبب سے فتنے میں پڑے اُن کی غباوت (کند ذہنی) کو ظاہر کرنا ہے اس شخص پر، جس کو ادنیٰ سی نظر اور غور وفکر ہے۔ "یم" سے مراد بحر ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد نہر ہے۔[2] جملہ ﴿ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ ... الخ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، جو ابطال باطل کے بعد حق کو ظاہر کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

﴿ وَسِعَ ﴾ کو جمہور نے سین کی زیر سے مخفف پڑھا ہے، ایک مفعول کی طرف متعدی ہے، وہ مفعول ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ ہے، ﴿ عِلْمًا ﴾ کا نصب بنابر تمیز ہے، جو فاعل سے نقل کیا گیا ہے، یعنی "وَسِعَ عِلْمُهٗ كُلَّ شَيْءٍ" امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے "وسع" سین کی شد اور زبر سے پڑھا ہے۔ اس بنا پر دو مفعول کی طرف متعدی ہوگا۔ ﴿ عِلْمًا ﴾ کا نصب اس بنیاد پر ہوگا کہ مفعول اول ٹھہرے گا گو متاخر ہے، اس لیے کہ اصل میں فاعل ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَسَّعَ عِلْمَهٗ كُلَّ شَيْءٍ"[3] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ "وسع" کے معنی "ملأ" ہیں، یعنی اس کے علم نے ہر شے کو بھر دیا ہے،[4] اس کے مثل سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔[5] موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جو اس سورت میں ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ... الخ ﴾ سے شروع ہوا تھا، یہ اس کا آخر ہے، یہاں وہ قصہ تمام ہو چکا۔[6] (كذا في فتح البيان وغيره)

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۖ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۙ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۙ﴿۱۰۱﴾

اسی طرح ہم آپ کو وہ احوال سناتے ہیں جو (پہلے) گزر چکے، اور یقیناً ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ذکر

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤٢_ ٢٤٣) فتح القدير (٣/ ٥٢٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٣)
[3] فتح القدير (٣/ ٥٢٧) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٣٦٧) [5] رقم الآية [٨٩] [6] فتح البيان (٨/ ٢٧٠_ ٢٧٤)

(قرآن) دیا⁽⁹⁹⁾ جس نے اس سے اعراض کیا تو یقیناً وہ یومِ قیامت ایک بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوگا⁽¹⁰⁰⁾ وہ اس (تکلیف) میں ہمیشہ رہیں گے اور یومِ قیامت ان کے لیے بوجھ اُٹھانا برا ہوگا⁽¹⁰¹⁾

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا ذکرِ عظیم ہے اور نبی کریم ﷺ کے لیے تسلی کا باعث:

اللہ پاک اپنے نبی ﷺ سے فرماتا ہے کہ جس طرح یہ قصہ جو ظہور پذیر ہو چکا ہے، ہم نے تم کو سنایا، یعنی موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور جو ماجرا اُن کو فرعون اور اس کے لشکروں کے ساتھ پیش آیا، اسی طرح ہم تم کو گزری ہوئی خبریں سناتے ہیں، جیسی وہ واقع ہوئیں، اُن میں سے کوئی کمی اور زیادتی نہیں کرتے تم اُن کو یاد رکھو اور ہم نے تم کو اپنے پاس سے ایک ذکر، یعنی قرآنِ عظیم دیا، جس کے ساتھ باطل نہ آگے سے شامل ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ حکمت والے اور تعریفوں کے لائق ربِ کریم کی طرف سے اُتارا گیا ہے۔ جب سے انبیا علیہم السلام مبعوث ہوئے، یہاں تک کہ سلسلۂ نبوت نبی اکرم ﷺ پر ختم ہو گیا، اُن میں سے کسی نبی کو ایسی مکمل اور زیادہ جامع کتاب نہیں ملی، جس میں ماضی حال اور مستقبل کی خبریں ہیں اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کن احکام ہیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ﴾ یعنی جس شخص نے اس کو جھٹلایا اور اس کے امر وطلب کے اتباع سے منہ موڑا اور اس کے غیر سے ہدایت کا طالب ہوا تو بے شک اللہ اس کو گمراہ کر دے گا اور وسطِ جہنم کی اس کو راہ بتائے گا اور اسی لیے یوں فرمایا:

﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا﴾

”وزر“ سے مراد اثم و گناہ ہے، یعنی جو کوئی اس سے منہ پھیرے گا تو وہ قیامت کے دن گناہ اُٹھائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ [هود: ١٧] ”اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔“ یہ عام ہے ہر اس شخص کے لیے جس کو قرآن پہنچ چکا، وہ عرب کا ہو یا عجم کا، اہلِ کتاب ہو یا غیر اہلِ کتاب، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ [الأنعام: ١٩] ”تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔“ پس جس شخص کو قرآن پہنچ گیا تو وہ اس کے واسطے ڈرانے والا اور بلانے والا ہے، پھر جس شخص نے اس کی پیروی کی تو راہ پائی اور جس نے اس کی مخالفت کی اور اس سے منہ پھیرا تو وہ دنیا میں گمراہ اور بدبخت ہوا اور روزِ قیامت کو آگ اس کا جائے وعدہ ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ﴾ یعنی اس سے اُن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے نہ چھٹکارا۔ ﴿وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا﴾ یعنی برا بوجھ ہے بوجھ ان کا۔[1] (كذا في ابن كثير)

یہ ایک کلامِ مستانف ہے، نبی کریم ﷺ کو اس سے مخاطب فرمایا ہے، اس لیے کہ آپ کو تسلی ہو اور گزرے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٢٠۔ ٢٢١)

ہوئے لوگوں کے حالات کی بصیرت ہو اور آپ کے معجزات کی کثرت ہو اور آپ کی اُمت تک جو لوگ دانا اور بینا ہیں، ان کے لیے نصیحت ہو جائے۔ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ میں حرفِ کاف کا محل نصب ہے، اس بنا پر کہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور ﴿ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ﴾ صفت ہے مفعول محذوف "نَقُصُّ" کی۔ تقدیر یہ ہے: "نقص عليك كائنا من أنباء ما قد سبق قصصا مثل ما قصصنا هذا النباء الغريب نباء موسى و هارون" اور حرف ﴿ مِنْ ﴾ واسطے تبعیض کے ہے، یعنی جس طرح ہم نے تم کو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا قصہ سنایا، اسی طرح گذشتہ حوادث کے بعض اخبار سناتے ہیں، جو اگلی اُمتوں میں گزر چکے ہیں، تاکہ وہ تمھارے لیے تسلی اور تمھارے صدق اور راستی پر دلیل ہو جائیں۔

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴾ "ذکر" سے مراد قرآن شریف ہے، ابن زید رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] قرآن کو ذکر اس لیے کہا کہ اس میں وہ باتیں مذکور ہیں جو تذکر و عبرت کی موجب ہیں، یعنی ہم نے تم کو اپنے پاس سے ایک ایسا ذکر عطا کیا ہے جو ان قصوں اور خبروں پر مشتمل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "ذکر" سے مراد شرف و بزرگی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] "اور یقیناً یہ (قرآن) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے اور جلد تم لوگوں سے پوچھ گچھ ہوگی۔" جس طرح اس آیتِ شریفہ میں "ذکر" سے مراد شرف ہے، اسی طرح یہاں بھی "ذکر" سے مراد شرف ہے، یعنی ہم نے تم کو اپنے پاس سے شرف دیا۔

پھر جو لوگ اس ذکر سے اعراض کرتے ہیں، منہ پھیرتے ہیں، اللہ پاک نے ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ... الخ ﴾ یعنی جو شخص ذکر سے منہ پھیرے، پھر اس پر ایمان نہ لائے، نہ اس پر عمل کرے جو اس میں مذکور ہے، یا اللہ پاک سے منہ پھیرے تو بے شک "ذکر" سے، یا اللہ پاک سے منہ پھیرنے والا، اپنے منہ پھیرنے کی وجہ سے قیامت کے دن ایک بڑا گناہ اور بھاری سزا اُٹھائے گا۔ ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ﴾ حال ہے "يحمل" کی ضمیر سے جو ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف پھرتی ہے، یعنی منہ پھیرنے والے قیامت کے دن اپنے گناہ کا اور اس عقوبت کا بوجھ اُٹھائیں گے، درآنحالیکہ اس کے عذاب اور عقوبت میں اور اس کی جزاء میں ہمیشہ ہمیشہ قائم دائم رہیں گے۔ اس سے کبھی نہ نکلیں گے۔

پس ضمیر "فيه" کی "وِزر" کی طرف راجع ہے اور "وِزر" سے مراد عذاب ہے۔ چونکہ "وِزر" عذاب کا سبب ہے، اس لیے یوں کہہ دیا کہ "وِزر" میں ہمیشہ رہیں گے، سبب کو قائم مقام مسبب کے کیا، لیکن مراد یہی ہے کہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٤)

گناہ کے عذاب اور عقوبت میں ہمیشہ پڑے رہیں گے، کبھی اس سے چھٹکارا نہ ہوگا۔ ﴿وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا﴾ "سَاءَ" فعل ذم ہے "حِمْلًا" تمیز ہے، "ساء" میں جو ضمیر فاعل کی ہے یہ تمیز اس کی تفسیر کرتا ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "ساء لهم حملا وزرهم" یعنی برا ہے ان کا گناہ بوجھ کی رو سے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا گناہ بہت ہی برا بوجھ ہے۔ "لهم" میں حرفِ لام بیان کے واسطے ہے، جیسا کہ ﴿هَيْتَ لَكَ﴾ [یوسف: ۲۳] "لو آجاؤ" میں ہے۔ "قول" مقدر سے متعلق ہے "ساء" سے متعلق نہیں ہے، یعنی یہ بات ان سے اور ان کے حق میں کہی جائے گی، معنی یہ ہیں کہ برا ہے وہ گناہ جس کو انھوں نے اپنی جانوں پر لادا کہ قرآن کا انکار کیا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: "بئسما حملوا" یعنی برا ہے وہ جو انھوں نے اٹھایا۔[1] (كذا في فتح البيان وغيره)

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝١٠٢ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝١٠٣ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝١٠٤

جس دن صور میں پھونکا جائے گا، اور ہم اس دن مجرم اکٹھے کریں گے اس حال میں کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے (102) وہ باہم چپکے چپکے کہتے ہوں گے: تم (دنیا میں) نہیں ٹھہرے، مگر صرف دس دن (103) ہم کو خوب معلوم ہے جو وہ کہیں گے، جب کہ ان میں بہترین رائے والا کہے گا: تم تو صرف ایک دن ٹھہرے تھے (104)

صور میں پھونکا جانے اور قیامت کے مناظر کا بیان:

نیلی پیلی آنکھیں، یعنی اندھے اور شاید یوں ہی نیلی ہوں بدنمائی کے لیے۔ دنیا میں اُن کو رہنا اتنا نظر آئے گا، جیسے دس دن رہے ہوں یا قبر میں رہنا بھی اتنا ہی معلوم ہوگا۔ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، ان کی حقیقت سے ہم باخبر ہیں، یعنی چھپ کر کہنا ہم سے نہیں چھپتا۔

حدیث شریف سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے صور کا پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔[2] حدیثِ صور میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے کہ صور ایک عظیم قرن ہے، اس کا دائرہ آسمانوں اور زمین کے مطابق ہے۔ اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونکیں گے۔ حدیث شریف میں مروی ہے، میں

[1] فتح البيان (٨/ ٢٧٤۔ ٢٧٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٦٣)

کیوں کر عیش و آرام کروں، حالانکہ صاحبِ قرن نے تو قرن کو منہ میں لے لیا ہے اور اپنی پیشانی جھکا لی ہے اور اس بات کا منتظر ہے کہ اس کو اذن ہو۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم کس طرح کہیں؟ فرمایا: کہو «حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا»[1] بعض نے کہا: ﴿ زُرْقًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ گناہ گار لوگ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔ ان ہولناکیوں کی شدت کی وجہ سے جن میں وہ ہوں گے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ يَتَخَافَتُونَ ﴾ کے معنی ہیں: ''يتسارون''، یعنی بعض ان کا بعض سے کہے گا کہ نہیں ٹھہرے تم مگر دس دن، یعنی دارِ دنیا میں تمھارا ٹھہرنا تو اتنا قلیل تھا، گویا دس دن یا اس کے مثل۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی باہم سرگوشی کرنے کے حال میں ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں ﴿ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً ﴾ جب ان میں سے عاقل کامل کہے گا کہ ﴿ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴾ یعنی نہیں ٹھہرے تم مگر ایک دن، اس لیے کہ قیامت کے دن اُن کے دل میں دنیا کی مدت بہت تھوڑی معلوم ہوگی، اس لیے کہ ساری دنیا میں اس کے اوقات بار بار آتے رہتے ہیں اور اس کی رات دن کی گھڑیاں یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں، گویا وہ ایک ہی دن ہے اور اسی لیے کافر لوگ قیامت کے دن دنیا کی زندگی کی مدت کو تھوڑا جانیں گے، گویا اس قول سے اُن کی غرض خود پر رجعت قائم ہونے کو رد کرنا ہے، مدت کے کم ہونے کے سبب سے اور اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٥۔ ٥٦] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی، مجرم قسمیں کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر کے سوا نہیں ٹھہرے، اسی طرح وہ (دنیا میں) بہکے رہے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا وہ کہیں گے: یقیناً تم تو، جیسا کہ اللہ کی کتاب (لوحِ محفوظ) میں ہے، دوبارہ اُٹھانے کے دن (قیامت) تک ٹھہرے رہے، چناں چہ یہی دوبارہ اُٹھنے کا دن ہے اور لیکن تم تو (اسے حق) نہیں جانتے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ [الفاطر: ٣٧] ''(اللہ فرمائے گا:) کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا؟ اور تمھارے پاس ڈرانے والا بھی آیا۔''

نیز فرمایا: ﴿ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١١٢۔ ١١٤] ''اللہ فرمائے گا: زمین میں تم کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ہم ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ رہے، گنتی کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔ اللہ فرمائے گا: واقعی تم

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٩٢)

(وہاں) تھوڑا سا وقت ہی رہے، کاش! تم (یہ بات دنیا میں) جانتے ہوتے۔'' یعنی تمھارا اس میں ٹھہرنا تو کم تھا، اگر تم جانتے تو ضرور باقی رہنے والی زندگی کو فانی پر اختیار کرتے، لیکن تم نے تصرف کیا تو برا تصرف کیا کہ حاضر فانی کو دائم باقی پر ترجیح دی۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ یَوْمَ یُنْفَخُ ﴾ متعلق ہے ''اذکر'' مقدر سے یا بدل ہے ﴿ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ﴾ سے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ جمہور نے ﴿ یُنْفَخُ ﴾ کو یائے تحتانی کی پیش کے ساتھ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے، ابو عمرو و ابن ابی اسحق رحمہما اللہ نے ''نَنْفُخُ'' نون کے ساتھ بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے اپنی اس قراءت پر ﴿ نَحْشُرُ ﴾ سے استدلال کیا ہے، کیونکہ یہ نون سے ہے تو وہ بھی نون سے چاہیے۔ ابن ہرمز کی قراءت ''یَنْفُخُ'' یائے تحتانی کی زبر کے ساتھ بصیغۂ معروف ہے۔ اس بنا پر کہ اس کا فاعل اللہ پاک ہے یا اسرافیل علیہ السلام۔ ابو عیاض نے ''فِي الصُّوَرِ'' واو کی زبر کے ساتھ ''صورۃ'' کی جمع کے ساتھ اور باقی قاریوں نے واو کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

صور سے مراد قرن ہے جس میں پھونکیں گے، لوگوں کو محشر کے واسطے اس سے بلائیں گے۔ اس نفخِ صور سے مراد دوسری دفعہ کا پھونکنا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نفخہ حشر کے واسطے ہے، جبھی تو نفخِ صور کے بعد حشر کا ذکر ہے۔ طلحہ بن مصرف اور حسن رحمہما اللہ نے ''یُحْشَرُ'' یائے تحتانی کے ساتھ بصیغۂ مجہول اور ''مجرمین'' کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ مصحف کی لکھائی کے خلاف ہے۔ باقی قاریوں نے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔[2] مجرمین سے مراد مشرکین اور کافر ہیں اور وہ گناہ گار جو اپنے گناہوں سے ماخوذ ہوئے ہیں، وہ گناہ جو اللہ پاک نے اُن کے واسطے بخشے نہیں ہیں۔

﴿ یَوْمَئِذٍ ﴾ سے مراد نفخِ صور کا دن ہے۔ ﴿ یَوْمَئِذٍ ﴾ حال ہے مجرمین سے، جمع ہے ''أزرق'' کی، ''أزرق'' گربہ چشم (بلی جیسی آنکھ) کو کہتے ہیں۔ ''زرقت'' وہ سبزی ہے جو آنکھ میں ہوتی ہے، جیسے: بلی کی آنکھ۔ عرب لوگ گربہ چشمی کو شوم (نحوست) جانتے ہیں، اس لیے کہ روم کے لوگ سب دشمنوں سے بڑھ کر عرب کے دشمن تھے اور وہ گربہ چشم تھے۔ عرب کے نزدیک گربہ چشمی آنکھ کے رنگوں میں سب سے بڑھ کر برا اور مبغوض تر ہے، اس لیے کہ انھوں نے دشمن کی صفت میں یوں لکھا ہے: ''أسود الكبد، أصهب السبال، أزرق العين'' یعنی سیاہ جگر، سرخ ریش، گربہ چشم، یعنی ہم گھیر لائیں گے مجرموں کو صور پھونکنے کے دن اس حال میں کہ چہروں کی سیاہی کے ساتھ ساتھ گربہ چشم ہوں گے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ زُرْقًا ﴾ سے مراد ''عمیا'' ہے، یعنی اندھے۔ امام

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۲۱) [2] فتح القدیر (۳/ ۵۲۸)

ازہری ﷫ نے کہا: ”عطاشا“ یعنی پیاسے۔ یہی قول امام زجاج ﷫ کا بھی ہے۔ اس لیے کہ آنکھ کی سیاہی پیاس کے سبب سے نیلاہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے طمعِ کاذب سے، جب کہ اس کے پیچھے نومیدی ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے آنکھ کے کھلے رہنے سے شدتِ حرص کے مارے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں تو یہ فرمایا ہے کہ نیلی آنکھوں والے اٹھائے جائیں گے۔ دوسری آیتِ شریفہ میں یہ ارشاد کیا: ﴿ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] ”ہم انھیں یومِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے۔“ لہٰذا ان دونوں آیتوں میں جمع یوں کی گئی ہے کہ روزِ قیامت کے واسطے مختلف حالات اور مقامات ہیں کہ اُن میں مجرمین کی صفتیں مختلف ہوں گی اور اُن کا عذاب رنگ برنگ کا ہوگا۔ عبداللہ بن عباس ﷠ نے فرمایا ہے کہ روزِ قیامت میں مختف حالات ہوں گے، کسی حال میں وہ گربہ چشم ہوں گے اور کسی حال میں وہ اندھے ہوں گے۔[2]

جملہ ﴿ يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ ﴾ حالیہ ہے۔ یا مستأنفہ ہے، اس حالت کے بیان کے لیے جس میں وہ اس دن ہوں گے۔ ”خَفت“ لغت میں سکون کو کہتے ہیں اور مخافتت وتخافت وخفت بر وزن سبت پوشیدہ بات کرنے کو بولتے ہیں، پھر جو شخص اپنی آواز کو پست کرتا ہے تو کہتے ہیں: ”خفته“ یعنی اس نے اپنی آواز پست کی، معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی آوازوں کو پست اور پوشیدہ کریں گے اور بعض اُن کا بعض سے پوشیدہ کہے گا کہ نہیں ٹھہرے تم دنیا میں یا قبروں میں یا دونفخوں کے درمیان، جس کی مقدار چالیس برس ہے، مگر دس رات مع دن کے، یہ اس واسطے کہیں گے کہ اس دن کا ہول اور رُعب اُن کو لاحق ہوگا۔

﴿ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا ﴾ حال ہے۔ اس کا عامل محذوف ہے: ”أي حال كونهم قائلين في السر إن لبثتم الخ“ یعنی باہم پوشیدہ گفتگو کریں گے، درآنحالیکہ وہ یہ بات کہیں گے۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ عَشْرًا ﴾ فرمایا، ”عشرة“ نہ فرمایا، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ مراد لیالی ہیں، اس لیے کہ مہینوں کا غرہ راتوں سے ہوتا ہے دن تو تبعاً ان میں داخل ہوگئے۔[3] (قاله في الكشاف) کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَشْرًا ﴾ سے مراد ساعتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اپنے اپنے بسنے کو قیامت کی شدتِ اہوال کے مارے انتہائی کم اور قلیل سمجھیں گے۔

پھر جس وقت انھوں نے یہ بات کہی تو اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾۔ یعنی ہم کو خوب معلوم ہے، جو وہ آپس میں کہتے ہیں، یعنی ایسا نہیں جیسا وہ کہتے ہیں۔ ﴿ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴾ ”إذ“ ظرف ہے ”أعلم“ کا اور ”طريقة“ کا نصب تمیز کی بنا پر ہے، یعنی ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں، جب کہ وہ شخص، جو ان سب سے عادل تر ہے بات میں اور کامل تر ہے رائے میں اور اپنے نفس

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٤) [3] الكشاف (١/ ٣١٠)

کے نزدیک سب سے زیادہ جاننے والا ہے، کہے گا کہ نہیں ٹھہرے تم مگر ایک دن۔ اس قول کی نسبت جو اُن میں سے افضل شخص کی طرف کی تو اس لیے کہ یہ سخت ہولنا کی کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ اس لیے کہ وہ سچائی کے زیادہ قریب ہے۔ یعنی اس دن کا ہول اس قدر سخت ہے کہ جو شخص اُن میں سے سب سے زیادہ دانش مند، زیرک اور ہوشیار ہے مارے شدت و دہشت کے یہ بات کہے گا، حالانکہ نفس الامر میں یہ بات نہیں ہے۔ پھر اس کا کیا ذکر جو عقل مند نہیں۔[1] (كذا في فتح البيان وغيره)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾

اور وہ آپ سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے: میرا رب انھیں اُڑا کر بکھیر دے گا (105) پھر وہ اس (زمین) کو چٹیل میدان (بنا) چھوڑے گا (106) آپ اس میں نہ کوئی کجی دیکھیں گے اور نہ اُبھری جگہ (107) اس دن سب لوگ پکارنے والے کے پیچھے چلیں گے، اس (کی اتباع) سے کوئی کجی نہیں ہوگی اور سب آوازیں رحمٰن کے سامنے پست ہو جائیں گی، پھر آپ آہٹ (اور خفی آواز) کے سوا کچھ نہ سنیں گے (108)

قیامت کے دن پہاڑ بکھر جائیں گے اور زمین برابر ہو جائے گی:

تجھ سے پہاڑوں کا حال پوچھتے ہیں، یعنی کیا وہ باقی رہیں گے یا اپنی جگہ سے زائل ہو جائیں گے؟ سائلین سے مراد کفارِ مکہ ہیں۔ ابن المنذر رحمہ اللہ نے ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ قریش نے کہا کہ تیرا رب قیامت کے دن ان پہاڑوں کو کیا کرے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سوال انھوں نے بطورِ استہزاء کے کیا تھا کہ تم تو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ دنیا فنا ہوگی اور ہم موت کے بعد اُٹھائے جائیں گے، پس یہ پہاڑ کہاں ہوں گے؟ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ثقیف کے ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کے دن پہاڑ کس طرح ہوں گے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم اس سوال کا یہ جواب دو کہ ﴿يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا﴾ ''نسف'' بنا و بنیاد کے اُکھیڑنے کو کہتے ہیں۔[3]

امام ابن اعرابی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ پہاڑوں کو اُن کی جڑوں سے اُکھیڑے گا، پھر اُن کو ریت کر دے گا کہ ریگِ رواں کی طرح رواں ہوں گے، پھر کر دے گا ان کو دُھنی ہوئی اُون کی طرح کہ ہوائیں اُن کو اِدھر اُدھر اڑاتی

---

[1] فتح البيان (٨/ ٢٧٥۔ ٢٧٦) [2] الدر المنثور (٥/ ٥٩٨) [3] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٠) تفسير البغوي (٥/ ٢٩٤)

پھریں گی، پھر اُن کو ''هَبَاءً مَّنْثُوراً'' کی طرح کر دے گا۔[1] مصباح میں ہے: ''يقال نسفت الريح التراب نسفا من باب ضرب اقتلعته و فرقته ونسفتُ البناء نسفا قلعته من أصله و نسفت الحب نسفا و اسم الآلة منسف بكسر الميم''[2] یعنی نسف کے معنی محاورۂ عرب میں تین ہیں: ایک تو اُکھیڑنا۔ دوسرے متفرق کر دینا۔ تیسرے اُڑانا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ترجمہ میں دو معنی کی رعایت فرمائی ہے۔

﴿ يَنْسِفُهَا ﴾ کا ترجمہ بکھیر دے گا اور ﴿ نَسْفًا ﴾ کا اڑا کر۔ ایک ہی جملے میں دونوں معنی کر دیے۔ حرفِ فا ﴿ فَقُلْ ﴾ میں، سوال کرنے والوں کا جلد از جلد جواب دینے کے لیے ہے، یہ اس بنا پر کہ واقعی لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے جبال (پہاڑوں) کے بارے میں سوال کیا۔ اس پر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ تم ان کو جلد الزامی جواب دو اور ایک قول یہ ہے کہ آپ سے کسی نے سوال کیا نہیں تھا، (لیکن یہ قول نصِ قرانی کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ ﴾ سوال کیے جانے کے متعلق بالکل واضح ہے۔ رہا حرفِ فا تو ضروری نہیں کہ اس کی تصحیح کے لیے ایسے واضح امرِ عظیم کا انکار کیا جائے۔ مناسب ہے کہ جملہ ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ ﴾ کے بعد سیاق مناسب کی شرط محذوف ہو، جس کی جزا میں یہ حرفِ فا آیا ہو، بلکہ یہی متعین ہے: ''كما هو ظاهر غير خفي'') تقدیر یہ ہے کہ ''إِنْ سَأَلُوكَ فَقُلْ'' کہ اگر وہ تم سے سوال کریں تو تم یہ جواب دے دو۔ اس بنیاد پر ﴿ فَقُلْ ﴾ شرطِ مقدر کا جواب ہوگا اور اسی لیے یہ جواب مقرون بحرفِ فا آیا ہے بخلاف اور سوالات کے، جو کلامِ مجید میں وارد ہوئے ہیں کہ اُن کے جواب میں حرفِ فا نہیں آیا ہے۔

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ﴾ [البقرة: ٢٢٢] ''اور (اے نبی!) لوگ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: وہ تو گندگی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ ﴾ [البقرة: ٢١٩] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیجیے: دونوں میں بڑا گناہ ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ''(اے نبی!) وہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس کے واقع ہونے کا وقت کون سا ہے؟ کہہ دیجیے: اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ﴾ [الإسراء: ٨٥] ''اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے۔'' ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴾ [الكهف: ٨٣] ''اور (یہ لوگ) آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے: عن قریب میں اس کا کچھ ذکر تمھارے

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤٥) [2] المصباح المنير (١/ ٣١١)

سامنے تلاوت کروں گا۔'' یہ چھے سوال ہیں کہ ان کے جواب میں حرفِ فا نہیں آیا، اس لیے کہ یہ سوال پہلے ہوئے اس پر اُن کا جواب وارد ہوا اور اُن میں معنی شرط نہ تھے، اس واسطے جوابوں میں حرفِ فا مذکور نہ ہوا۔

﴿ فَيَذَرُهَا ﴾ میں ضمیر جبال کی طرف پھرتی ہے، جبال کی جگہوں کے اعتبار سے، یعنی جن جگہوں میں پہاڑ رکھے ہوئے، جمے ہوئے، گڑے ہوئے تھے اور اُن کے نیچے کے اجزا جو اُکھیڑنے کے بعد اور اُڑانے کے بعد باقی رہ گئے، ان کو ہموار زمین کر دے گا اور اس سطح اور زمین کی سطح کو جو بلند پہاڑوں کے اُڑا دینے کے بعد باقی رہیں گی، ان دونوں سطحوں کو برابر کر دے گا۔ یا ضمیر زمین کی طرف راجع ہے، گو اس کا ذکر نہیں ہوا، لیکن قرینۂ حال اس پر دال ہے، کیونکہ پہاڑوں کے اُڑا دینے کے بعد وہی باقی رہے گی۔

امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قاعِ صفصف زمین ملساء بلا نبات و بلا بنا ہے، یعنی خشک زمین جس سے نہ روئیدگی ہو، نہ بناء و مکان، اس کو قاعِ صفصف کہتے ہیں۔ صراح میں دونوں کا ترجمہ ہموار زمین کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قاع مستنقعِ ماء ہے، یعنی جس جگہ میں پانی جمع ہوتا ہے اس کو قاع بولتے ہیں۔ صفصف قرعاء ملساء ہے کہ جس میں نبات نہ ہو، یعنی خشک زمین جس میں روئیدگی نہ ہو، وہ صفصف ہے، گویا اس کے اجزاء ہر جہت سے صفِ واحد ہیں۔ لہٰذا صفصف معنی میں قاع کے لگ بھگ ہے، پس مثل تاکید کے ہوگا واسطے قاع کے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قاع برابر سخت زمین کو کہتے ہیں اور صفصف برابر خشک زمین کو بولتے ہیں۔[1]

﴿ لَا تَرٰى فِيْهَا ﴾ میں ضمیر راجع ہے جبال کی طرف باعتبار مذکور، یا زمین کی طرف جس طرح کہ گزر چکا ہے۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''عِوَج'' عین کی زیر کے ساتھ ''تَعوج'' کو کہتے ہیں، یعنی ٹیڑھا ہونا اور ''اَمت'' چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو بولتے ہیں[2] اور ''اَمت'' لغت میں بلند مکان کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عِوَج'' مائل ہونا ہے اور ''اَمت'' اثر ہے مثل شراک کے، یعنی جوتے کا تسمہ۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عِوَج'' وادی ہے اور ''اَمت'' رابیہ ہے، یعنی ٹیلا۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اَمت'' نتوء یسیر کو کہتے ہیں، یعنی ذرا سی بلندی کو۔

محاورے میں بولتے ہیں: ''مد حبله حتى ما فيه أمت'' یعنی فلاں نے اپنی رسی کو دراز کیا یہاں تک کہ اس میں ذرا سی بلندی نہیں ہے، یعنی برابر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عوج'' انخفاض ہے، یعنی پستی اور ''اَمت'' ارتفاع، یعنی بلندی۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عوج'' صدوع ہیں، یعنی شگاف اور دراڑیں اور ''اَمت'' اکمہ ہے، یعنی ٹیلا۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اَمت'' شقوق ہیں زمین میں، یعنی شگاف۔ کسی نے کہا ''اَمت'' آکام ہیں یعنی ٹیلے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اَمت'' یہ ہے کہ زمین کسی جگہ میں سخت ہو اور کسی جگہ میں نرم۔ صراح میں ہے کہ ''عوج'' دو زبروں کے ساتھ کثر شدن مع کافہ و کثری در بالاے چیزے ایستادہ چون درخت و دیوار مانند آں، عوج بالکسر کثری در

[1] فتح القدير (٣/ ٥٢٩) [2] فتح القدير (٣/ ٥٢٩)

دین و در معیشت و رائے قال ابن السکیت یقال في دینه عوج بالکسر وفي عوده و حائطه عوج بالفتح. انتھیٰ.

یعنی کلمہ ''عوج'' عین کی زیر کے ساتھ معانی میں استعمال ہوتا ہے اور زبر کے ساتھ اعیان ومحسوسات میں بولا جاتا ہے۔ یہاں ''عوج'' عین کی زیر کے ساتھ اس قاعدے کے برخلاف محسوسات کے لیے استعمال ہوا ہے، یعنی جبال کی جگہوں یا زمین کو اس کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ اس لیے مفسرین نے اس کے ٹھیک کرنے میں تکلف کیا ہے۔ چنانچہ ابو السعود رحمہ اللہ نے یوں فرمایا ہے کہ ''عَوج'' عین کی زبر کے ساتھ محسوسات میں اور عین کی زیر کے ساتھ معانی میں ہوتا ہے اور یہاں جو ہے تو قبیلِ اول سے ہے، لیکن اس میں عین کی زیر کے ساتھ ''عوج'' کی تعبیر اس لیے کی گئی ہے کہ ''عوج'' شدتِ خفا کے ساتھ گویا قبیلِ معانی سے ہوگیا ہے۔ یعنی تو ''عوج'' کا ادراک زمین میں نہ کر سکے گا، اگرچہ مقیاس ہندسی سے تامل وغور کر کے اس کو دیکھے، تب بھی اس میں کجی کا اتا پتا نہ پائے۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ ''عوج'' عین کی زیر کے ساتھ اگرچہ معانی میں ہے، جس طرح کہ عین کی زبر کے ساتھ اعیان میں ہوتا ہے اور زمین عین ہے، لیکن جب کہ زمین ایسی برابر ہوگئی کہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں کسی طرح سے کوئی کجی پائی جائے، گو اس کے لیے کوئی باریک سے باریک ذریعہ ہی کیوں نہ اختیار کیا جائے تو وہ جاری مجرائے معانی ہوگئے۔ یعنی اس لیے کہ جو لفظ معانی کے واسطے خاص تھا، وہ اس کے واسطے بولا گیا۔[2]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مواضع جبال کا ''عوج'' عین کی زیر کے ساتھ یہاں وصف کرنا اس بات کو رد کرتا ہے جو کہی جاتی ہے کہ عوج عین کی زیر کے ساتھ معانی میں اور عین کی زبر کے ساتھ اعیان میں ہوتا ہے۔ اس جگہ صاحبِ کشاف نے اس کے لیے ایسی بات کا تکلف کیا ہے جس سے بے نیازی ہے اور اس کے غیر میں گنجایش ہے۔[3] ان کی تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جب کلام پاک میں ''عوج'' عین کی زیر کے ساتھ کا استعمال اعیان میں آ گیا تو معلوم ہوا کہ اعیان و معانی دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ اس قاعدے کے ثابت رکھنے میں آیتِ کریمہ کی بہ تکلف تاویل کر کے اس کو اسی قاعدے پر اتاریں۔ امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿ قَاعًا صَفْصَفًا ﴾ فرمایا، جس میں نبات نہ ہو۔

﴿ لَا تَرٰى فِيهَا عِوَجًا ﴾ فرمایا ''وادیا ولا أمتا''۔ فرمایا: ''رابية''. امام عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ وہ زمین ملساء، یعنی خشک ہے کہ جس میں رابیہ، مرتفعہ نہ ہو اور نہ پستی ہو۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''قاع'' برابر زمین ہے اور ''صفصف''

---

(1) تفسير أبي السعود (٦/ ٤٢) (2) تفسير النسفي (٣/ ٦٨) (3) فتح القدير (٣/ ٥٢٩)

(4) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٥) الدر المنثور (٥/ ٥٩٨_ ٥٩٩)

اس کے معنی کی تاکید ہے۔ کسی نے کہا: وہ ہے جس میں نبات نہ ہو۔ معنی اول اولیٰ ہیں، اگرچہ معنی آخر بھی لازمی طور پر مراد ہیں اور اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴾ یعنی نہ دیکھے تو اس دن زمین میں کوئی وادی نہ کوئی رابیہ نہ کوئی جگہ پست نہ اونچی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، مجاہد، حسن بصری، ضحاک، قتادہ اور غیر واحد سلف نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

﴿ قَاعًا ﴾ مفعول ثانی ہے ﴿ فَيَذَرُهَا ﴾ کا، اس بنا پر کہ "یَذَرُ" متضمن ہے "تصییر" کے معنی کو، اس لیے شاہ صاحب مرحوم نے اس کا یوں ترجمہ کیا ہے کہ چھوڑے گا زمین کو چٹیل میدان، یا حال ہے ضمیر منصوب سے اور ﴿ صَفْصَفًا ﴾ حال ثانی ہے، یا صفت ہے ﴿ قَاعًا ﴾ کی، یا بدل ہے مفعول ثانی سے۔ ﴿ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴾ کا محل نصب ہے۔ اس بنیاد پر کہ صفتِ ثانی ہے ﴿ قَاعًا ﴾ کی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تینوں احوال مترتبہ ہیں، لہٰذا پہلا اور دوسرا، یعنی ﴿ قَاعًا صَفْصَفًا ﴾ باعتبار احساس کے ہیں اور تیسرا یعنی ﴿ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴾ باعتبار مقیاس کے ہے اور اسی لیے "عوج" عین کی زیر کے ساتھ کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ معانی کے ساتھ خاص ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ لَا تَرٰى ﴾ استینافِ مبین ہے واسطے حالین کے۔[2] ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾ ظرف ہے۔

روزِ قیامت لوگوں کا پکارنے والے کی طرف دوڑنا:

﴿ يَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ ﴾ یعنی پہاڑ اُڑانے کے دن پیچھے دوڑیں گے پکارنے والے کے۔ "دَاعِي" سے مراد اللہ پاک کا پکارنے والا ہے محشر کی طرف۔ لہٰذا لوگ ہر کنارے سے اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "دَاعِي" سے مراد حشر کی آواز ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ داعی اسرافیل علیہ السلام ہیں، جب کہ وہ صور میں پھونکیں گے۔ راجح قول یہ ہے کہ داعی جبریل علیہ السلام ہیں اور پھونکنے والے اسرافیل علیہ السلام ہیں۔

﴿ لَا عِوَجَ لَهٗ ﴾ جملۂ مستانفہ ہے، یا حال ہے داعی سے، یا صفت ہے مصدر محذوف کی۔ تقدیر یہ ہے: "يتبعونه اتباعا لا عوج له" اس کی ضمیر میں تین وجہیں ہیں: ان میں سے ظاہر تر وجہ یہ ہے کہ داعی کی طرف پھرتی ہے، یعنی اس کے پکارنے کے واسطے کسی طرح کی کجی نہ ہوگی، بلکہ وہ سب کو سنائے گا، پس وہ میل نہ کرے گا کسی ایک طرف کے لوگوں کی طرف، یا دوسری طرف کے لوگوں کی طرف۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصدر محذوف کی طرف راجع ہے، یعنی کسی طرح کجی نہیں ہے داعی کے پیچھے جانے کے لیے، یعنی اس میں دائیں بائیں نہ جھکیں گے، سیدھے برابر اس طرف چلے جائیں گے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کلام میں قلب ہے۔ تقدیر یہ ہے: "لا عوج لهم عنه" یعنی اُن لوگوں کے لیے اس داعی کی طرف جانے کے لیے کسی طرح کی کجی نہ ہوگی یعنی انھیں اس بات کی قدرت

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٧٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢١۔ ٢٢٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٠۔ ٧١) [3] فتح القدير (٣/ ٥٢٩)

نہ ہوگی کہ اس سے دوسری طرف مائل ہو جائیں یا منحرف ہو جائیں، بلکہ جلد از جلد اس کے پیچھے دوڑیں گے اور اس کے پاس آ جائیں گے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ ایک تاریکی میں حشر کیے جائیں گے، آسمان لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے جھڑ پڑیں گے اور سورج چاند جاتے رہیں گے اور ایک منادی پکارے گا تو لوگ اس آواز کا قصد کرتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑیں گے، سو یہ وہی اللہ پاک کا قول ہے: ﴿ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ﴾۔ نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام ابو صالح رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ”لا عوج عنه“[1] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسرافیل علیہ السلام صور کو اپنے منہ میں رکھیں گے اور صخرۂ بیت المقدس پر کھڑے ہوں گے اور پکاریں گے: ”أيتها العظام البالية والجلود المتمزقة و اللحوم المتفرقة والأوصال المتقطعة هلموا إلى عرض الرحمن“[2] شیخ زادہ نے کہا ہے کہ ایک روایت میں یوں مروی ہے کہ وہ یہ کہیں گے: ”يا أيتها العظام البالية والأوصال المتقطعة واللحوم المتمزقة إن الله يأمركن أن تجتمعن لفصل القضاء“ پس وہ لوگ متوجہ ہوں گے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے معنی میں فرمایا ہے کہ جس دن وہ یہ احوال و اہوال دیکھیں گے تو پکارنے والے کی طرف جلدی کرتے ہوئے اس کی دعوت کو قبول کریں گے، جس جگہ کا ان کو حکم ہوگا اس کی طرف دوڑیں گے۔ اگر ایسا وہ دنیا میں کرتے تو اُن کے لیے نفع مند ہوتا۔ لیکن یہ ایسی جگہ ہے کہ اُن کو نفع نہ دے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا ﴾ [مريم: ٣٨] ”وہ لوگ کیا ہی خوب سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہوں گے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ﴾ [القمر: ٨] ”درآں حالیکہ وہ بلانے والے کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴾ یعنی اللہ پاک کے ہیبت اور جلال کے واسطے آوازیں پست ہوجائیں گی یا اس کی عظمت کے واسطے ضعیف ہو جائیں گی۔ یا شدتِ گھبراہٹ سے ذلیل ہوجائیں گے۔ مراد آواز والے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ساکت ہو جائیں گے۔ کسی اور نے کہا کہ ساکن ہو جائیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے ﴿ اِلَّا هَمْسًا ﴾ کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ”همس“، صوتِ خفی ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اُن سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ وطیِ اقدام ہے اور امام عکرمہ، مجاہد، ضحاک، ربیع بن انس، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٥) الدر المنثور (٥/ ٥٩٩) [2] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٠)

کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صوتِ وطیِ اقدام ہے۔ امام عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہما اللہ کا لفظ امام ضحاک، عکرمہ، سعید بن جبیر اور حسن رحمہم اللہ سے مثل اس کے ہے۔ امام عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہما اللہ کے الفاظ مجاہد سے صوتِ خفی ہیں۔ اسی کے مثل علی بن ابی طلحہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہیں اور یہی امام عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ سے ایک روایت میں ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے سر الحدیث وصوت الاقدام ہے۔ امام سعید رحمہ اللہ نے دونوں قولوں کو جمع کر دیا ہے۔[1] اور یہ محتمل ہے۔ رہا روندنا قدموں کا سو اس سے مراد لوگوں کا محشر کی طرف دوڑنا ہے اور یہ دوڑنا ان کا سکون اور خضوع میں چلنا ہے۔ رہا کلامِ خفی سو کبھی ایک حال میں ہوگا دوسرے حال میں نہ ہوگا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴾ [ھود: ۱۰۵] ''(جب) وہ دن آ جائے گا تو کوئی نفس اللہ کے اِذن کے بغیر کلام نہیں کر سکے گا، پھر ان میں سے کوئی تو بد بخت ہوگا اور کوئی نیک بخت۔''

غرض یہ کہ ان حضرات کے اقوال سے ''ھمس'' کے دو معنی معلوم ہوئے، ایک تو کلامِ خفی و آوازِ خفی، دوسرے چلنے کی آواز۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ''ھمس'' قدموں کے اُٹھانے کی آواز ہے محشر کی طرف اور قدموں کے روندنے کی آواز۔ اسی معنی سے عرب کا یہ قول ہے: ''همست الإبل''۔ جس وقت اونٹوں کے سم زمین پر پڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے، اس وقت قولِ مذکور کہتے ہیں اور شیر کو ''مھموس'' بولتے ہیں، اس لیے کہ وہ اندھیرے میں وطیِ خفی کرتا ہے، یعنی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ ''ھمس'' سے مراد ہر خفی آواز ہے، خواہ قدم سے ہو یا منہ سے، ہونٹ ہلانے کے سبب سے ہو یا اس کے علاوہ۔

سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت: ''فلا ینطقون إلا همسا''[2] اس کی تائید کرتی ہے اور یہ مصدر ہے ''همست الکلام'' کا ضرب کے باب سے، یہ جب کہے گا کہ تو کلامِ خفی کرے۔ امام زمخشری نے کہا کہ ''ھمس'' ذکرِ خفی ہے، اسی سے حروفِ مہموسہ ہیں۔[3] حروفِ مہموسہ دس ہیں، ان کا مجموعہ ان تین کلموں میں ہے: ''حثه شخص فسكت''۔ صراح۔ ﴿ هَمْسًا ﴾ مفعول بہ ہے ﴿ فَلَا تَسْمَعُ ﴾ کا اور استثنا مفرغ ہے، یعنی پھر نہ سنے گا تو کسی آواز کو، مگر آوازِ خفی کو۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ
وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٣٧٤۔ ٣٧٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٢٢) الدر المنثور (٥/ ٥٩٩۔ ٦٠٠)

[2] تفسیر القرطبی (١١/ ٢٤٧) [3] الکشاف (٣/ ٨٩)

وَلَا يُحِيطُونَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ
خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

اس دن سفارش کوئی نفع نہ دے گی، مگر صرف اس کی جسے رحمٰن اجازت دے گا اور اس کی بات پسند کرے گا (109) جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے، اسے اللہ ہی جانتا ہے، اور وہ (لوگ) اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے (110) اور سب چہرے حَی قیوم (اللہ) کے آگے جھک جائیں گے اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے ظلم (شرک) کا بوجھ اُٹھایا (111) اور جو شخص نیک عمل کرے، جب کہ وہ مومن ہو تو وہ نہ ظلم وزیادتی (بے انصافی) کا خوف کھائے گا اور نہ حق تلفی کا (112)

قیامت کے دن کی شفاعت اور جزا کا بیان:

جس کی بات کو پسند فرمائے، یعنی اس کی سفارش چلے گی۔ نہ اسے بے انصافی کا کھٹکا ہوگا نہ حق تلفی کا، یعنی اس پر زبردستی نہ ہوگی اللہ کے یہاں انصاف ہے۔

اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾، یعنی قیامت کے دن ﴿ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ ﴾ یعنی نفع نہ دے گی سفارش اس کے نزدیک۔ ﴿ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ”کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟“ نیز فرمایا: ﴿ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضٰى ﴾ [النجم: ٢٦] ”اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں، جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی، مگر بعد ازاں کہ اللہ اجازت دے، جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُونَ ﴾ [الأنبياء: ٢٨] ”اور وہ صرف اس کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ پسند کرے گا اور وہ اس کے خوف سے ڈرنے والے ہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهٗ ﴾ [سبا: ٢٣] ”اور اس کے ہاں صرف اس شخص کی سفارش نفع دے گی جسے اللہ اجازت دے گا۔“ نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰئِكَةُ صَفًّا ۖ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبا: ٣٨] ”جس دن جبریل اور (سب) فرشتے اس کے حضور صف بستہ کھڑے ہوں گے، اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔“

صحیحین میں بہ چند وجود نبی کریم ﷺ سے آیا ہے اور آپ سید ولدِ آدم ہیں، اکرم خلائق ہیں اللہ تعالیٰ کے

نزدیک۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں آؤں گا عرش کے نیچے اور اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑوں گا اور وہ مجھ پر محامد کو کھول دے گا، یعنی ان تعریفوں کو جن کو میں اب یاد نہیں رکھتا، پھر وہ مجھے چھوڑ دے گا جس قدر چاہے گا کہ مجھے چھوڑے رکھے۔ پھر فرمائے گا: اے محمد! تو اپنے سر کو اُٹھا اور کہہ تیری بات سنی جائے گی اور تو شفاعت کر، تیری شفاعت قبول ہوگی، فرمایا: پھر وہ میرے واسطے ایک حد مقرر کر دے گا تو میں اُن کو جنت میں داخل کروں گا، پھر میں لوٹ کر آؤں گا، پھر آپ نے چار بار کا ذکر فرمایا۔[1] صلوات اللہ وسلامه علیه و علیٰ سائر النبیین۔ یہ بھی حدیث شریف میں مروی ہے کہ اللہ پاک فرمائے گا: نکالو آگ سے اس شخص کو جس کے دل میں ایک مثقال ایمان تھا تو ایک خلقِ کثیر کو نکالیں گے۔ پھر فرمائے گا: نکالو آگ سے اس شخص کو جس کے دل میں آدھا مثقال ایمان تھا۔ نکالو اس شخص کو جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان تھا۔[2] الحدیث

﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ یعنی ساری خلائق کا علم سے احاطہ کرتا ہے۔ ﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ [البقرة: ۲۵۵] ''اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کو اپنے احاطے میں نہیں لا سکتے، سوائے اس بات کے جو وہ چاہے۔'' ﴿ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ﴾ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور غیر واحد نے فرمایا ہے کہ خاضع و ذلیل وفرمانبردار،[3] یعنی مطیع اور تابعدار ہوئی خلائق اپنے جبار کے واسطے، جو زندہ ہے مرتا نہیں ہے، قیوم ہے سوتا نہیں ہے اور وہ قیم ہے ہر شے پر اس کی تدبیر کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے، وہ اپنے آپ میں کامل ہے، جس کی طرف ہر شے فقیر اور محتاج ہے، اس کے واسطے کسی طرح کا قوام نہیں ہے مگر اس سے۔

﴿ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴾ یعنی خراب ہوا وہ شخص جس نے قیامت کے دن ظلم کا بوجھ اُٹھایا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ادا کر دے گا، یعنی ہر حق کو صاحبِ حق کی طرف پہنچا دے گا، یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کے لیے سینگ والی بکری سے قصاص لے گا۔ حدیث شریف میں مروی ہے کہ اللہ عزوجل فرمائے گا: قسم ہے میری عزت و جلال کی! کہ آج مجھ سے کسی ظالم کا ظلم تجاوز نہیں کرے گا۔[4] صحیح میں مروی ہے کہ تم ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیاں ہیں:[5] « وَالْخَيْبَةُ كُلُّ الْخَيْبَةِ » یعنی بڑا نقصان ومحرومی اس شخص کو ہے، جس نے اللہ سے ملاقات کی، حالانکہ وہ اس کے ساتھ شریک کرنے والا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٣٧٧_ ٣٧٨)

[4] المعجم الكبير (٢/ ٩٥) اس کی سند میں ''یزید بن ربیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٩٧٥)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٨)

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ... الخ﴾ جب کہ اللہ پاک نے ظالموں کا اور اُن کی وعید کا ذکر کیا تو اس کے بعد متقین کا اور اُن کے حکم کا ذکر فرمایا، وہ حکم یہ ہے کہ ''لا یظلمون و لا یھضمون'' یعنی نہ اُن کے گناہوں میں زیادتی کی جائے گی نہ اُن کی نیکیوں میں کمی ہوگی۔ عبداللہ بن عباس، حسن رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ اور غیر واحد رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں،[1] پس ''ظلم'' زیادتی ہے، اس طرح کہ غیر کا گناہ اس پر لاد دیا جائے اور ''ھضم'' نقصان ہے۔[2] (کذا في ابن کثیر)

﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾ ظرف معمول ہے ﴿ لَا تَنْفَعُ ﴾ کا، یعنی جس دن واقع ہوگا، جو ہم نے ذکر کیا، یعنی جس دن پکارنے والے کے پیچھے دوڑیں گے تو اس دن سفارش نفع نہ دے گی۔ ﴿ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴾ کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ منصوب ہے، اس بنیاد پر کہ مفعول بہ ہے اور ناصب اس کا ''تنفع'' ہے، اس صورت میں ﴿ مَنْ ﴾ سے مراد ''مشفوع لہ'' ہوگا۔ یعنی وہ شخص جس کے واسطے شفاعت کی گئی، معنی یہ ہیں کہ نفع نہ دے گی سفارش کسی کو، مگر نفع دے گی اس شخص کو جس کے واسطے رحمٰن نے اذن دیا اور پسند کی اس کی کوئی بات۔ اس بات سے مراد لا الہ الا اللہ ہے کہ اس نے دنیا میں اس کو کہا اور اسی پر مر گیا اگرچہ گناہ کیے۔ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے، اس کا یوں ترجمہ فرمایا ہے نہ فائدہ دے گی شفاعت، مگر اس کو کہ اذن دیا ہے، اس کے لیے رحمٰن نے اور پسند کیا ہے اس کے واسطے کہنا۔ محلی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔[3]

دوسری وجہ یہ ہے کہ کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ محل رفع میں ہے ﴿ اَلشَّفَاعَةُ ﴾ سے بدل ہے۔ اس صورت میں تقدیر مضاف کی ضرور ہے یعنی ''إِلَّا شَفَاعَةُ مَنْ أَذِنَ لَهُ'' اور ﴿ مَنْ ﴾ سے مراد شافع ٹھہرے گا۔ معنی یہ کہ نفع نہ دے گی شفاعت کسی شفاعت کرنے والے سے کیوں نہ ہو، مگر نفع دے گی اس شخص کی شفاعت جس کو رحمٰن نے حکم دیا ہے کہ وہ شفاعت کرے اور شفاعت میں اس کی بات پسند کی یا شفاعت کرنے والے کی بات پسند کی، اس شخص کے حق میں جس کی شفاعت کی گئی۔

قاضی بیضاوی نے صاحب کشاف کی طرح اسی وجہ کو اول بیان کیا ہے۔[4] اس لیے کہ اس میں شفاعت کرنے والے کی تعظیم ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی بات سے ابتداء فرمائی ہے۔[5] صاحب فتح القدیر و فتح البیان رحمہما اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔[6] امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔[7] تیسری وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے اس بنا پر کہ استثنا ہے شفاعت سے، بہ تقدیر مضاف محذوف کے، اس بنیاد پر یہ استثناء متصل ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ منقطع ہو، جب

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٧٩ـ ٣٨٠)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٢ـ ٢٢٣)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٤١٦)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ٧١) الكشاف (٣/ ٤٦)
[5] تفسير النسفي (٣/ ٦٨)
[6] فتح القدير (٣/ ٥٣٠) فتح السان (٨/ ٢٧٩)
[7] تفسير الخازن (٤/ ٢٨١)

کہ کسی شے کی تقدیر نہ کی جائے اور اس وقت جائز ہے کہ منصوب ہو، یہ حجاز کی لغت ہے یا مرفوع ہو، یہ تمیم کی لغت ہے۔

کلمہ ﴿ لَهٗ ﴾ دونوں جگہ واسطے تعلیل کے ہے: "أي لأجله" جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ﴾ [یٰس: ٤٧] ''وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان لوگوں سے جو ایمان لائے، کہتے ہیں۔'' "أي لأجلهم" یہ آیتِ کریمہ اس پر دال ہے کہ غیر مومن نہ تو شافع ہوگا نہ اس کی شفاعت کی جائے گی۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔[1] اس آیت کے مثل یہ آیتیں ہیں: ﴿ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ [الأنبياء: ٢٨] ''وہ صرف اس کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ پسند کرے گا۔'' ﴿ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ [مريم: ٨٧] ''(اس روز) وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھیں گے، سوائے اس کے جس نے رحمٰن سے عہد لیا۔'' ﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴾ [المدثر: ٤٨] ''پھر سفارشیوں کی سفارش انھیں نفع نہ دے گی۔''

یہ آیت سب دلیلوں سے زیادہ قوی دلیل ہے فاسقوں کے حق میں شفاعت کے ثبوت میں، اس لیے کہ ﴿ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴾ کے صدق میں اس قدر کافی ہے کہ اللہ پاک نے اس کے اقوال میں سے ایک قول کو پسند کر لیا اور فاسق کے اقوال میں سے اللہ پاک نے لا الہ الا اللہ کی گواہی کو پسند فرما لیا ہے تو یہ بات واجب ہوئی کہ شفاعت اس کے واسطے نافع ہو، کیونکہ استثنا نفی سے اثبات ہوتا ہے۔ ﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ اس سے مراد امورِ ساعت و آخرت ہیں۔ ﴿ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ سے مراد اُمورِ دنیا ہیں اور ''ھم'' سے مراد ساری خلق ہے، یعنی اللہ پاک جانتا ہے امورِ قیامت و آخرت کو، جو تمام خلق کے آگے ہیں اور اُمورِ دنیا کو جانتا ہے، جو اُن کے پیچھے ہیں، یا مراد وہ لوگ ہیں جو داعی کے پیچھے دوڑیں گے، یعنی اللہ پاک اُن کے اعمال کو جانتا ہے، جو انھوں نے آگے بھیجے اور دنیا کو جانتا ہے، جس کو انھوں نے پیچھے چھوڑا ہے، یا مراد شفاعت کرنے والے ہیں، یعنی جو کچھ اُن کے آگے پیچھے ہے، اس کو جانتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ملائکہ ہیں، یعنی اللہ پاک فرشتوں کے آگے پیچھے کو جانتا ہے ان کے پوجنے والوں کو، یہ بات بتائی کہ وہ اپنے آگے پیچھے کے امور کو نہیں جانتے۔[2] یہاں عمومیت زیادہ مناسب ہے۔

﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴾ ضمیر مجرور اللہ پاک کی طرف پھرتی ہے، یعنی بندے اللہ پاک کو اپنے علم سے احاطہ نہیں کر سکتے، یعنی بندوں کے علوم، اللہ سبحانہ کی ذات و صفات و معلومات کے محیط نہیں ہو سکتے۔ کسی نے کہا کہ ''ما'' کی طرف راجع ہے، یعنی جو کچھ بندوں کے آگے پیچھے ہیں، اس کو اللہ ہی جانتا ہے، بندے اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ابن اعرابی نے کہا ہے کہ ﴿ عَنَتِ ﴾ کے معنی ''ذلت و خضعت'' ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''خشعت''[4] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ

[1] تفسير البغوي (٥/ ٢٩٦)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٧٦)
[3] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤٨)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٣٧٧۔ ٣٧٨)

نے کہا ہے کہ "خضعت"[1]

"ذلت" خوار ہونے کو کہتے ہیں اور خضوع وخشوع عاجزی وفروتنی کرنے کو بولتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿عَنَت﴾ کے معنی لغت میں "خضعت" ہیں،[2] جب کوئی شخص ذلیل ہو اور فروتنی کرے تو محاورے میں بولتے ہیں: "عنا يعنو عنوا" اور جس وقت دوسرے کو ذلیل وخوار کرے تو "أعناه" بولتے ہیں، یعنی اس کو خوار کیا۔ اس معنی سے قیدی کو "عَانِي" کہتے ہیں۔ اس کی جمع "عُنَاة" آتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "عنت عناء" بمعنی تعب سے ہے۔ تعب ماندہ شدن کو کہتے ہیں، یعنی تھکنا عاجز ہونا۔ امام ابن منذر و ابن ابی حاتم رحمہما اللہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ "عنت الوجوه الركوع والسجود"[3] یعنی بندوں کو وجوہ (منہ) رکوع وسجود میں ذلیل ہوتے ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا کہ "وُجُوْہُ" کا ذکر کیا اور اس سے مراد مکلفین کو رکھا، اس لیے کہ ﴿عَنَتِ﴾ صفاتِ مکلفین سے ہے، وجوہ کے صفات سے نہیں ہے اور خاص کر وجوہ کا ذکر اس لیے کیا کہ خضوع وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے اور اسی میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔[4]

"حَیَّ" اس کو کہتے ہیں جو نہ مرے اور جس حیات کے بعد موت ہو تو وہ گویا حیات نہیں ہے۔ "قیوم" کے معنی ہیں: دائم قائم ہر نفس پر ساتھ اس شے کے جس کو اس نفس نے کمایا، قائم ہے ساتھ تدبیرِ خلق کے۔ پھر وجوہ کی دو قسمیں ذکر فرمائیں: ایک یہ ہے کہ ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا﴾ یعنی خائب وخاسر ہوا وہ شخص جس نے کچھ بھی ظلم اُٹھایا۔ کسی نے کہا ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ امام ابن جریج اور قتادہ رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔[5] دوسری قسم یہ ہے ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ﴾۔ ﴿مِنْ﴾ تبعیضیہ ہے، یعنی اور جو شخص کچھ نیک کام کرے۔

﴿وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ جملہ حالیہ ہے اور حال یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والا ہے اللہ پر، کیوں کہ عمل بغیر ایمان کے قبول نہیں ہوتا، بلکہ ایمان قبولِ اعمال میں شرط ہے: ﴿فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا﴾ تو وہ نہ ڈرے ظلم سے کہ اس کو پہنچایا جائے، یعنی آخرت میں ثواب کم کر دینے سے۔ "هَضْم" نقص وکسر کو کہتے ہیں، یعنی کم کرنے کو اور توڑنے کو، محاورے میں بولتے ہیں: "هضمت لك من حقي" یعنی میں نے اپنے حق سے تیرے واسطے ترک کیا اور کم کیا اور فلاں شے طعام کو ہضم کرتی ہے، یعنی اس کے ثقل کو کم کرتی ہے۔ دبلے پیٹ والی عورت کو "هضيم الكشح" کہتے ہیں، اسی سے ﴿طَلْعُهَا هَضِيْمٌ﴾ [الشعراء: ١٤٨] "جن کے خوشے نرم و نازک ہیں۔" بھی ہے۔ "طلع" کھجور کے درخت کے پہلے شگوفے کو کہتے ہیں۔

اس کو "هضيم" اس لیے کہا کہ وہ دقیق نازک متراکب (ایک پر ایک چڑھا ہوا) ہوتا ہے۔ گویا بعض اس کا

[1] الدر المنثور (٥/ ٦٠١) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٧٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٦)
[4] تفسير الخازن (٤/ ٢٨١) [5] الدر المنثور (٥/ ٦٠١)

بعض پر ظلم کرتا ہے تو اس سے اس کے حق کو کم کرتا ہے اور "رجل ھضیم و متھضم" مرد مظلوم کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ظلم و ہضم متقارب ہیں، یعنی ان کے معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ قاضی ماوردی نے ان میں فرق کیا ہے کہ ظلم تو منع کرنا ہے پورے حق کا اور ہضم منع کرنا ہے بعض حق کا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ هَضْمًا ﴾ سے مراد "غصبا" ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس گناہ میں نہ پکڑا جائے گا جس کو نہیں کیا ہے اور جس نیکی کو کیا ہے، وہ اس سے باطل نہ ہوگی۔ حافظ ابن کثیر اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿ فَلَا يَخَافْ ﴾ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ... الخ﴾ کا جواب ہے۔ باقی قاریوں نے "فَلَا يَخَافُ" پڑھا ہے۔ بنا بر خبر منفی واستيناف أي فهو لا يخاف.[2]

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾

اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن نازل کیا اور ہم نے اس میں پھیر پھیر کر کئی پہلوؤں سے (اپنی) وعید بیان کی، تاکہ وہ تقویٰ اپنائیں یا یہ (قرآن) ان کے لیے نصیحت پیدا کرے ﴿113﴾ پس ثابت وسچا بادشاہ اللہ بلند و بالا ہے، اور (اے نبی!) آپ قرآن (پڑھنے) میں جلدی نہ کریں قبل اس کے کہ آپ کی طرف اس کی وحی پوری کی جائے اور کہیے: اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر ﴿114﴾

نزولِ قرآن کا مقصد:

جبریل علیہ السلام جب قرآن لاتے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پڑھنے کے ساتھ خود بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جائیں، اس سے پہلے منع فرمایا تھا سورت قیامت میں اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچانا ہمارا ذمہ ہے، لیکن بندہ بشر ہے، شاید بھول گئے ہوں، پھر تقید کیا اور بھولنے پر آدم کی مثال بیان فرمائی۔

اللہ پاک فرماتا ہے کہ ہر گاہ قیامت اور جزائے خیر اور شر کا دن ضرور واقع ہونے والا ہے، اس لیے ہم نے قرآن کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا عربی زبان میں، جو فصیح اور مبین ہے، نازل کیا، جس میں نہ کسی طرح کا شبہہ ہے نہ عی (عاجز آنا) اور درماندگی ہے اور پھیر پھیر کر ہم نے اس میں وعید سنائی، شاید وہ تقویٰ اختیار کریں، یعنی گناہ کے کاموں اور حرام کاموں اور بے حیائی کے کاموں کو چھوڑ دیں۔ ﴿ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴾۔

احداثِ ذکر سے مراد ایجادِ طاعت اور فعلِ قربات ہے، یعنی قرآن پاک میں بار بار وعیدیں اس لیے سنائی ہیں

---

[1] فتح البيان (٨/ ٢٨١) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٤٩)

کہ طاعات اور عبادات کرنے پر اُن کو آمادہ کریں۔ پس پاک اور مقدس ہے ملکِ حق، یعنی وہ خود بادشاہِ حق ہے اور اس کا وعدہ وعید حق ہے اور اس کے رسول حق ہیں اور جنت حق ہے، دوزخ حق ہے اور ہر شے جو اس کی طرف سے ہے، حق وعدل ہے۔ وہ اس بات سے بلند و برتر ہے کہ ڈرانے سے پہلے اور خلق کی طرف رسول اور ڈرانے والے بھیجنے سے پہلے کسی کو عذاب کرے۔ رسول اس لیے بھیجے کہ کسی کو کوئی حجت اور شبہہ باقی نہ رہے۔

رسول اللہ ﷺ کو نزولِ قرآن کے وقت جلدی کرنے سے ممانعت:

﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ ﴾ یہ سورۃ القیامہ کی اس آیت کی طرح ہے: ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ [القیمة: ١٦۔ ١٩] ''(اے نبی!) آپ اس (قرآن) کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ یقیناً اس کا (آپ کے سینے میں) جمع کرنا اور (آپ سے) اس کا پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھوا چکیں تو آپ اس کے پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر یقیناً اس کی وضاحت ہمارے ذمے ہے۔''

صحیح میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ وحی سے سختی کھینچتے تھے، آپ اپنی زبان مبارک کو قرآن شریف کے ساتھ ہلاتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] یعنی جس وقت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آپ علیہ السلام کے پاس آتے تو جب جبریل علیہ السلام کوئی آیت کہتے تو آپ ﷺ اس کو اُن کے ہمراہ کہتے، یہ اس لیے کہ آپ ﷺ کو قرآن شریف کے یاد رکھنے کی بہت حرص تھی۔ اس پر اللہ پاک نے آپ کو وہ بات بتائی جو آپ کے حق میں بہت آسان اور خفیف تھی، تاکہ آپ پر شاق نہ گزرے۔ لہٰذا یوں فرمایا: ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴾ یعنی نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو کہ جلدی جلدی سیکھ لے وہ تو ہمارا ذمہ ہے، اس کو سمیٹ رکھنا اور پڑھنا، یعنی یہ ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اس کو تمھارے سینے میں جمع کر دیں، تم اس کو لوگوں پر پڑھو علاوہ اس کے کہ اس سے کچھ بھولو۔

﴿ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴾ پھر ہم جب پڑھنے لگیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔ ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ پھر اس کا واضح کر دینا ہمارا ذمہ ہے اور اس آیت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ﴾ یعنی بلکہ تم چپ رہو، پھر جس وقت فرشتہ تم پر پڑھنے سے فارغ ہو جائے تو اس کے بعد تم پڑھو۔ ﴿ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴾ یعنی اور کہو: اے رب! تو اپنی طرف سے مجھے زیادہ علم دے۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ علم کی زیادتی میں رہے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے آپ کو وفات دی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٤٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٨)

اور اسی لیے حدیث شریف میں مروی ہے کہ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ پر پے در پے وحی بھیجی، یہاں تک کہ جس دن آپ نے وفات پائی، اس دن سب وقت سے زیادہ وحی کا نزول ہوا۔[1]

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِيْ بِمَا عَلَّمْتَنِيْ وَعَلِّمْنِيْ مَا يَنْفَعُنِيْ وَزِدْنِيْ عِلْمًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ» یعنی اے اللہ! تو مجھے نفع دے اس شے سے جو تو نے مجھے سکھائی اور سکھا مجھ کو وہ چیز جو مجھے نفع دے اور زیادہ دے مجھ کو علم اور ساری حمد اللہ کے واسطے ہے ہر حال پر۔ (وأخرجه الترمذي عن أبي كريب عن عبد الله بن نمير به وقال غريب من هذا الوجه و رواه البزار عن عمرو بن علي الفلاس عن أبي عاصم عن موسى بن عبيدٌ به وزاد في آخره و أعوذ بالله من حال أهل النار.[2] كذا في ابن كثير.

﴿ وَكَذٰلِكَ ﴾ معطوف ہے ﴿ كَذٰلِكَ نَقُصُّ ﴾ پر اور "ذلك" اشارہ ہے ان آیتوں کی طرف جن میں وعید تھی اور قیامت کے احوال اور ہولناکیوں کی خبر دیتی تھیں، یعنی جس طرح ہم نے آیاتِ مذکورہ کو نازل کیا ہے، اسی طرح ہم نے سارے قرآن کو نازل کیا ہے، درآں حالیکہ وہ قرآن عربی ہے، یعنی عرب کی زبان میں نازل ہوا ہے، تاکہ وہ اس کو سمجھیں اور اس کے نظمِ معجز پر واقف ہوں، وہ نظم جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قرآن بشر کی طاقت سے باہر ہے اور یہ خالقِ قوی و قادر کے پاس سے اترا ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ کہا، "أَنْزَلْنَا الْقُرْآنَ" نہ فرمایا، حالانکہ پہلے قرآن شریف کا ذکر نہیں ہوا کہ یہ ضمیر اس کی طرف پھرے۔ اس کا نکتہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی بلند شان کا بتانا ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ قرآن عقلوں میں مرکوز اور ذہنوں میں حاضر ہے۔

﴿ صَرَّفْنَا ﴾ کے معنی "بیّنّا" ہیں اور ﴿ مِنَ الْوَعِيْدِ ﴾ صفت ہے مفعول محذوف کی۔ "أَيْ صَرَّفْنَا فِيْ الْقُرْآنِ أَنْوَاعًا مِّنَ الْوَعِيْدِ" اور اس سے مراد جنس ہے، یعنی ہم نے قرآن میں ڈرانے اور دھمکانے کے لیے طرح طرح کی وعیدیں بیان کی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہو مفعول بہ میں امام اخفش رحمہ اللہ کی رائے کے مطابق، کیونکہ اور نحویوں کے نزدیک اثبات میں ﴿ مِنْ ﴾ زائدہ نہیں آتا۔ تقدیر یہ ہے: "وَصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ"[3] یعنی ہم نے قرآن میں وعید کو بیان کیا ہے یا ﴿ صَرَّفْنَا ﴾ کے معنی "كَرَّرْنَا" ہیں اور کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے۔ "أي كررنا فيه بعضا من الوعيد"، یعنی ہم نے قرآن میں بعض وعید کو مکرر ذکر کیا ہے۔

﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی یہ سب کچھ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ شاید وہ شرک سے بچیں، یا اللہ پاک سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠١٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٣٣) مسند البزار (١٦/ ٢٤٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٣۔ ٢٢٤) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ٣١٥١) میں اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے جملہ "والحمد لله... حال" کے علاوہ روایت کو صحیح کہا ہے۔

[3] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٣٩٧)

ڈریں تو اس کے معاصی سے پرہیز کریں اور اس کے عذاب و قضا سے ڈریں یا شرک اور حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کریں اور واجبات کو ترک نہ کریں۔ ﴿ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴾ یعنی ہم نے وعید کا بیان یا تکرار اس لیے کی ہے کہ وہی وعید اُن کے لیے عبرت اور نصیحت کا باعث ہو اور اُن میں تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا کرے، یا یہ معنی ہیں کہ قرآن اُن کے لیے شرف و بزرگی پیدا کرے، اس پر ایمان لانے کی وجہ سے، یا اطاعت اور عبادت اختیار کرنے کی وجہ سے، کیوں کہ اُن پر ذکر کا اطلاق ہوتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے قرآن صرف اس لیے نازل کیا کہ وہ متقی ہو جائیں اور نا لائق باتوں سے بچیں اور قرآن اُن کے لیے ذکر پیدا کرے، جو اطاعت گزاری اور اچھے کام کرنے میں ان کو رغبت دلائے۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ قرآن ان کے واسطے عبرت اور نصیحت کی تجدید کرے کہ وہ عبرت پکڑیں اور اللہ پاک نے جو گذشتہ اُمتوں کے عذاب اور سزا کا ذکر کیا ہے، اس سے نصیحت حاصل کریں۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کی طرف ذکر کی نسبت کی گئی تقویٰ کی نسبت نہیں کی گئی، وجہ اس کی یہ ہے کہ تقویٰ اس بات سے عبارت ہے کہ برے کام نہ کرے اور یہ استمرار ہے عدمِ اصلی پر، اس لیے تقویٰ کی نسبت قرآن کی طرف بہتر نہیں ہے۔ رہا حدوثِ ذکر تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ نہ ہونے کے بعد حادث ہوتی ہے، اس لیے اس کی نسبت اس کی طرف جائز ہوئی۔[1] سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے "نُحْدِثُ" نون کے ساتھ پڑھا ہے۔[2]

﴿ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے بندوں کے لیے اپنی بڑی نعمت بیان فرمائی ہے، وہ نعمت یہی ہے کہ ان پر قرآن اُتارا تو اپنی ذاتِ مقدس کی پاکی بیان فرمائی مخلوقات کی مماثلت سے کہ وہ کسی شے میں اپنی مخلوقات کے مشابہ نہیں ہے۔ یعنی اللہ پاک ملحدوں کے الحاد سے بلند و برتر ہے اور مشرک و معطل لوگ اس کی صفات میں جو کچھ کہتے ہیں اس سے وہ مبرا اور پاک ہے، کیونکہ وہ تو ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاتھ میں ثواب دینا اور سزا دینا ہے اور اس کا امر و نہی نافذ اور جاری ہے۔

حق سے مراد ذوالحق ہے، یعنی وہ اپنی ملکوت و بادشاہت و اُلوہیت میں حق والا ہے، یا وہ اس لائق ہے کہ اس کے وعدے کی اُمید رکھی جائے اور اس کی وعید سے خوف کیا جائے۔ یا اپنی ذات اور صفات میں ثابت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے نفسِ مقدس کا وصف ملکِ حق بیان فرمایا، اس لیے کہ اس کا ملک زائل نہیں ہوتا، نہ تغیر قبول کرتا ہے، نہ غیر کی طرف سے حاصل ہوا ہے، نہ اس کا غیر اس سے اولیٰ ہے۔ جب کہ اللہ پاک نے قرآن شریف کا اور اُس کے نازل کرنے کا ذکر کیا تو استطراداً یہ بات بھی فرما دی کہ جس وقت جبریل تم کو قرآن کی تلقین کرے، جو تمھاری طرف وحی کیا جاتا ہے تو تم اتنی دیر کرو کہ وہ تم کو سنا دے اور سمجھا دے اور تم قرآن کی قراءت میں اس کی وحی پوری ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو، یعنی اس سے پہلے کہ جبریل اس کے ابلاغ سے فارغ ہو جائیں۔

---

[1] فتح البیان (٨/ ٢٨١) [2] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٥٠)

مفسرین نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جبریل علیہ السلام سے مبادرت فرماتے (جلدی کرتے) آپ ﷺ جبریل علیہ السلام کے وحی سے فارغ ہونے سے پہلے پڑھنے لگتے، یہ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کو حرص تھی اس پر جو قرآن میں سے نازل ہوتا تھا۔ پس اللہ پاک نے آپ کو اس بات سے منع فرمایا۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ تم لوگوں کی طرف اس کا القامت کرو، اس سے پہلے کہ اس کی تاویل کا بیان تمھارے پاس آ جائے۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ تم جلدی مت کرو، یہاں تک کہ ہم اس کو تمھارے لیے بیان کر دیں۔[1] امام عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ تم اس کی کسی پر تلاوت نہ کرو، جب تک ہم اس کو تمھارے لیے تمام نہ کر دیں۔[2] سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کو طمانچہ مارا، وہ عورت قصاص طلب کرتی ہوئی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، آپ ﷺ نے ان کے درمیان قصاص ٹھہرایا، اس پر اللہ پاک نے ﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ ... الخ﴾ نازل فرمائی۔ یہاں تک کہ یہ آیت بھی نازل ہوئی: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ [النساء: ٣٤] ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔'' (أخرجه الفريابي و ابن جرير و ابن المنذر وابن أبي حاتم و ابن مردويه) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام یعقوب، حسن اور اعمش رحمہم اللہ نے ''نقضي'' نون کے ساتھ اور ''وَحْيَه'' کی زبر سے پڑھا ہے۔[3]

﴿ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴾ یعنی تم اپنے جی میں اپنے رب سے علم کے بڑھنے کا سوال کرو کہ الٰہی تو مجھے اپنی کتاب اور اس کے معنی کا علم زیادہ دے، کیونکہ تم کو تمھارے مطلوب کی طرف پہنچانے والا یہی ہے، کچھ جلدی کرنا موصل نہیں ہے، پھر جس وقت قرآن سے کوئی شے آپ پر نازل ہوتی تو اس سے آپ کا علم زیادہ ہوتا۔ اللہ پاک نے اپنے رسول کریم ﷺ کو کسی شے کی زیادتی طلب کرنے کا حکم نہیں دیا ہے مگر علم کی۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ پاک کے لیے تواضع اور شکر ہے اور علم کی عظمت، رتبہ اور فضیلت سے آگاہ کرنا ہے، معنی یہ ہیں کہ الٰہی تو اس شے پر جس کو میں جان چکا ہوں میرا علم زیادہ کر، کیونکہ ہر شے میں تیرا ایک علم اور ایک حکمت ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب اس آیت شریفہ کو پڑھتے تو کہتے: ''اللهم زدني علما و إيمانا و يقينا''[4] یعنی اے اللہ! تو میرا علم و ایمان و یقین زیادہ کر۔ اس قول کو خطیب و خازن نے نقل کیا ہے۔[5]

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے اس کے بعد یہ دعا کی ہے: ''رب زدني علما نافعا و عملا صالحا و إيمانا كاملا و يقينا تاما و عاقبة محمودة، اللهم آمين''[6] کاتبِ حروف، عفا اللہ عنہ، اللہ پاک سے اس سب کا سوال کرتا ہے اور اس قدر اور زیادہ مانگتا ہے: ''واجعلني من المقربين لديك و الواصلين إليك، آمين''

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٦٠٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٧) الدر المنثور (٥/ ٦٠٢) [3] فتح القدير (٣/ ٥٣٢)
[4] الدر المنثور (٥/ ٦٠٢) [5] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٢) [6] فتح البيان (٨/ ٢٨٣)

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾
فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ
الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾
وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ
يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾
فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ
وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ
عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

اور البتہ ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزمِ صمیم نہ پایا (115) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا (116) پھر ہم نے کہا: اے آدم! بے شک یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے، کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے کہ تو مشقت میں پڑ جائے (117) بے شک تیرے لیے (یہاں اہتمام) ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے گا اور نہ ننگا ہوگا (118) اور بے شک تجھے نہ پیاس لگے گی اور نہ تجھے دھوپ لگے گی (119) پھر شیطان نے اس کی طرف وسوسہ ڈالا، اس نے کہا: اے آدم! کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور بادشاہی نہ بتاؤں جو پرانی نہ ہو؟ (120) چناں چہ ان دونوں نے اس میں سے (پھل) کھایا تو ان کی شرم گاہیں ان پر ظاہر ہوگئیں، اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ بھٹک گیا (121) پھر اسے اس کے رب نے برگزیدہ کیا، اس کی توبہ قبول کی اور (اسے) ہدایت دی (122)

قصۂ آدم و ابلیس:

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انسان نام اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی طرف عہد کیا گیا اور وہ بھول گیا، اسی طرح علی بن ابی طلحہ نے بھی اُن سے روایت کیا ہے۔ امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ نے فرمایا: "ترك"، یعنی "نسي" کے معنی ترک ہیں۔[1] اللہ پاک آدم علیہ السلام کی بزرگی اور عزت کا ذکر کرتا ہے اور جس

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٧) تفسير الطبري (١٨/ ٣٨٣)

شے سے اُن کو بہت سی خلق پر فضیلت دی ہے، اس کا بیان فرماتا ہے۔ سورۃ البقرہ،[1] اعراف،[2] حجر[3] اور کہف[4] میں اس قصے پر کلام گزر چکا ہے اور آیندہ سورت صٓ[5] کے آخر میں آئے گا۔ اللہ پاک اس آیت میں ذکر فرماتا ہے کہ اس نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اُن کی تشریف اور تکریم کے لیے فرشتوں کو اُن کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور بیان فرماتا ہے کہ ابلیس کی بنی آدم اور اُن کے باپ سے پرانی دشمنی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا، یعنی سجدے سے باز رہا اور تکبر کیا۔ زوج سے مراد حوا علیہا السلام ہیں۔

﴿ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تو اس بات سے بچنا کہ وہ تجھ کو جنت سے نکالنے کی کوشش کرے تو تُو تکلیف اور سختی میں پڑ جائے گا اور اپنے رزق کی طلب میں مشقت اُٹھائے گا، کیونکہ یہاں پر تو تُو عیش کی فراخی اور خوش گواری میں ہے بغیر کسی تکلیف اور محنت کے۔ بھوک اور برہنگی کو ایک دوسرے کا ساتھی اس لیے ذکر کیا کہ بھوک باطن کی ذلت ہے اور برہنگی ظاہر کی ذلت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں نہ باطن کی ذلت ہوگی نہ ظاہر کی۔ "ظَمَا و ضحی" بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، لہٰذا "ظما" تو باطن کی گرمی ہے، یعنی پیاس اور "ضحی" ظاہر کی گرمی ہے۔ یعنی جنت میں نہ ظاہر کی گرمی ہوگی نہ باطن کی حرارت۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ ﴾ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے کہ شیطان نے آدم و حوا علیہما السلام کے پاس قسم کھائی کہ میں تمھارا دوست ہوں، پھر ان کو فریب سے پھسلایا اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی سے عہد لیا تھا کہ سب پھلوں سے کھائیں اور جنت میں جو یہ درخت معین ہے، اس کے قریب نہ جائیں۔ لہٰذا ابلیس اُن کے پیچھے پڑا، یہاں تک کہ انھوں نے اس سے کھا لیا اور وہ شجرۃ الخلد تھا، یعنی جو شخص اس سے کھالے تو وہ ہمیشہ زندہ رہے اور اس کا رہنا اور بسنا ہمیشہ کے لیے ہو۔ شجرۃ الخلد کا ذکر حدیث شریف میں مروی ہے۔ امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک جنت میں ایک درخت ہے کہ سوار سو برس اس کے سائے میں چلے تو بھی اس کو قطع نہ کر سکے اور وہ شجرۃ الخلد ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔[6]

﴿ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾ کی تفسیر میں امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ایک مردِ دراز قد کثیر شعر الراس، یعنی سر کے بال بہت تھے، گویا وہ ایک لمبا درخت تھے کھجور کے۔ پھر جس وقت انھوں نے اس درخت کو چکھ لیا تو اُن سے اُن

[1] رقم الآية [٣٠] [2] رقم الآية [١١] [3] رقم الآية [٢٨] [4] رقم الآية [٥٠] [5] رقم الآية [٧١]

[6] مسند الطيالسي (١/ ٣٣٢) مسند أحمد (٢/ ٤٥٥) اس کی سند میں "ابو الضحاک" مجہول راوی ہے۔ البتہ "شجرة الخلد" کے الفاظ کے علاوہ باقی روایت "صحيح بخاري" (٤٥٩٩)، "صحيح مسلم" (٢٨٢٦) اور دیگر کتب میں مروی ہے۔

کا لباس گر پڑا، لہٰذا پہلے پہل جو شے اُن سے کھلی وہ اُن کی شرم گاہ تھی، پس جب اپنی شرمگاہ کی طرف نظر کی تو وہ جنت میں دوڑنے لگے، پس ایک درخت نے اُن کے بال پکڑ لیے تو انھوں نے اس سے کھینچے، اس پر رحمٰن نے اُن کو پکارا کہ اے آدم! تو مجھ سے بھاگتا ہے۔ پھر جب رحمٰن کا کلام سنا تو کہا: اے رب! نہیں، لیکن شرم کے واسطے، تو مجھے بتا کہ اگر میں توبہ کروں اور رجوع ہوؤں، کیا تو مجھے پھر جنت کی طرف لے جانے والا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ لہٰذا یہ وہی قول ہے اللہ کا: ﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة: ٣٧] ”پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمے سیکھ لیے تو (اللہ نے مہربانی کرتے ہوئے) اس پر توجہ دی۔“[1] (وهذا منقطع بين الحسن و أبي بن كعب فلم يسمعه منه وفي رفعه نظر أيضا)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”یرقعان كهيئة الثوب“ یعنی کپڑے کی طرح پیوند لگاتے تھے۔ اسی طرح امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایت سعید بن جبیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے: ”ينزعان ورق التين فيجعلانه على سوآتهما“ یعنی انجیر کے پتے کھینچتے تھے، پھر اُن کو اپنی شرمگاہ پر رکھتے تھے۔[3]

﴿ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ ﴾ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تو اُن سے کہا: تُو وہی ہے، تُو نے لوگوں کو جنت سے نکالا اپنے گناہ کے سبب سے اور اُن کو مشقت میں ڈالا۔ آدم بولے: اے موسیٰ! تُو وہی ہے کہ اللہ نے تجھ کو اپنی رسالتوں اور کلام کے ساتھ برگزیدہ کیا۔ کیا تو مجھ کو ملامت کرتا ہے اس امر پر جس کو اللہ نے مجھ پر میرے پیدا کرنے سے پہلے لکھ دیا، یا اللہ نے اس کو مجھ پر مقدر کیا اس سے پہلے کہ مجھے پیدا کرے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: پس غالب آئے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر۔[4]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس جھگڑے تو آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تو وہی ہے کہ پیدا کیا تجھ کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے اور پھونکا تجھ میں اپنی روح سے اور فرشتوں سے تجھ کو سجدہ کروایا اور بسایا تجھ کو اپنی جنت میں، پھر تو نے لوگوں کو اپنے گناہ کے سبب سے زمین پر اُتارا۔ آدم علیہ السلام بولے: تو وہی موسیٰ ہے کہ برگزیدہ کیا تجھ کو اللہ نے اپنی رسالت اور کلام کے ساتھ اور عطا کیں تجھ کو وہ تختیاں جن میں ہر شے کا کھلا بیان تھا۔ ”وقربك نجيا“ یعنی تجھ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٥١۔ ١٤٥٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥٣) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٢٥) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٨)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٢٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٢)

کو مقرب بنایا سرگوشی کرنے والا۔ "فبکم و جدت اللہ کتب التوراۃ قبل أن أخلق؟ قال موسی: بأربعین عاما" یعنی تو نے کس قدر مدت پہلے پایا ہے اللہ کو کہ اس نے تورات کو لکھا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: چالیس برس۔ آدم علیہ السلام بولے: پس کیا تو نے اس میں پایا ہے: ﴿ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾؟ موسیٰ علیہ السلام بولے: ہاں۔ آدم علیہ السلام نے کہا: پھر کیا تو مجھ کو اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ میں نے ایسا عمل کیا جس کو اللہ نے مجھ پر لکھا کہ میں اس کو کروں گا، مجھے پیدا کرنے سے چالیس برس پہلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آئے۔[1] (قال الحارث وحدثني عبدالرحمن بن هرمز بذلك عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم۔ كذا في ابن كثير)

﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطیہ قسم کے واسطے ہے اور جملہ مستانفہ ہے تصریفِ وعید کا اثبات کرتا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ﴿ عَهِدْنَاۤ ﴾ کے معنی "أمرنا و وصینا" ہیں اور معہود، یعنی جس شے کا عہد کیا ہے، وہ محذوف ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے، وہ یہی ہے کہ اس درخت کے کھانے سے منع کیا تھا۔ ﴿ مِنْ قَبْلُ ﴾ کے معنی "من قبل هذا الزمان أو قبل أكله منها" ہیں۔ بادشاہوں کے احکامات اور وصیتوں میں یہ الفاظ بولتے ہیں کہ "تقدم الملك إلى فلان، و أوصى إليه و عزم عليه و عهد إليه" ان سب کے یہ معنی ہیں کہ بادشاہ نے فلاں شخص کو حکم دیا۔ "فَنَسِيْ" کو امام اعمش رحمہ اللہ نے یائے تحتانی کے سکون سے پڑھا ہے۔

اس جگہ نسیان سے مراد ترک ہے، یعنی جس بات پر اللہ پاک نے آدم علیہ السلام سے عہد کیا تھا، لہٰذا انھوں نے اس پر عمل کرنے کو ترک کیا۔ اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں، جس طرح یہاں نسیان بمعنی ترک ہے، اسی طرح اس قولِ الٰہی میں واقع ہوا ہے: ﴿ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ [السجدۃ: ۱۴] یعنی ہم نے تم کو عذاب میں چھوڑ دیا ہے۔ جب کہ نسیان کے معنی ترک کے ٹھہرے تو آیندہ جو اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو عصیان اور غوی کے ساتھ موصوف کیا ہے، اس میں کچھ اشکال نہ ہوگا۔ اشکال جب ہوتا کہ نسیان اپنے اصلی معنی پر رہتا، کیوں کہ اگر کوئی بھول چوک سے کوئی کام کر لے تو اس کو عاصی اور غاوی نہیں کہتے۔ عاصی غاوی اسی وقت کہلاتا ہے کہ حاکم کے حکم کو جان بوجھ کر ترک کرے اور اس کی مخالفت کرے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نسیان اپنے حقیقی معنی پر ہے، یعنی بھولنا چوکنا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام سے جو عہد کیا تھا، اس کو وہ بھول گئے، ان کو اس سے سہو ہو گیا۔ اس صورت میں وہی اشکالِ مذکور وارد ہوگا، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام اس وقت نسیان کے سبب سے ماخوذ تھے، گو اس اُمت سے نسیان مرفوع کر دیا گیا ہے، اس کو بھول چوک معاف ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "الأنبياء عليهم السلام يؤاخذون بالنسيان الذي

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٧_ ٢٤٣٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٥)

لو تکلفوا لحفظوه"[1] یعنی انبیا سے اس نسیان کا مواخذہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ تکلف کریں تو اس پر نگاہ رکھیں۔ پہلے قول کی بنیاد پر اس آیت سے مراد نبی کریم ﷺ کو تسلی ہے، یعنی بنی آدم کا مطیع ہونا شیطان کے واسطے ایک پرانی بات ہے، یہ لوگ جو آپ کے ہم عصر ہیں، اگر انھوں نے عہد کو توڑ ڈالا تو اُن کے باپ آدم علیہ السلام پہلے عہد توڑ چکے ہیں۔ امام ابن جریر و قشیری رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] علامہ نسفی اور خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ فرمایا ہے۔[3] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے جو اس پر اعتراض کیا ہے کہ اس صورت میں آدم علیہ السلام ان کافروں کے مماثل ہوتے ہیں، جو اللہ پاک کے منکر ہیں۔ لہٰذا فتح القدیر میں اور فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ اعتراض کچھ چیز نہیں ہے۔[4]

"فَنَسِيَ" کو نون کی پیش اور سین مکسورہ کی شد کے ساتھ بصیغۂ مجہول بھی پڑھا ہے۔ یعنی ابلیس نے آدم علیہ السلام کو عہدِ مذکور بھلا دیا۔ اس جملے کا عطف "و صرفنا فيه من الوعيد" پر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پھیر پھیر کر سنائی ہم نے اس میں وعید اور میں قسم کھاتا ہوں کہ البتہ مقرر ہم نے آدم علیہ السلام کو حکم دیا اور اس بات کی وصیت کی کہ اس درخت سے نہ کھائے، پہلے اس زمانے سے، یا پہلے اس کے کھانے سے، یا اُن لوگوں کے وجود سے پہلے جنھوں نے میرا عہد توڑ ڈالا اور مجھ پر ایمان لانا ترک کیا، لہٰذا آدم نے ہمارے عہد کو ترک کیا اور اس کی مخالفت کی، یا اس کو بھول گیا اور اس درخت سے کھا لیا۔

﴿وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ عزم کے معنی لغت میں یہ ہیں "توطين النفس على الفعل والتصميم عليه و المضي على المعتقد في أي شيء كان" یعنی عزم جمانا ہے نفس کا فعل پر اور پختگی کرنا ہے اس پر اور گزرنا اور چلنا ہے معتقد پر، کسی چیز میں ہو۔ آدم علیہ السلام نے اپنے نفس کو اس بات پر جمایا تھا کہ اس درخت سے نہ کھائیں اور اس پر پختگی کی تھی۔ پھر جب ابلیس نے اُن کی طرف وسوسہ پہنچایا تو اُن کی طبیعت نرم پڑ گئی اور اُن کا عزم سست پڑ گیا۔ ضعفِ بشر نے اُن کو آ لیا۔ کسی نے کہا عزم سے مراد صبر ہے، یہ معنی مدح کی طرف زیادہ قریب ہیں۔ یعنی نہ پایا ہم نے آدم علیہ السلام کے واسطے صبر درخت کے کھانے سے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اسی طرح لغت میں ہے۔

محاورے میں بولتے ہیں: "لفلان عزم" یعنی فلاں کو صبر و ثبات ہے معاصی سے بچنے پر، یہاں تک کہ معاصی سے صحیح سلامت رہے۔ اسی معنی میں یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ٣٥] "جس طرح عزم و ہمت والے رسولوں نے صبر کیا۔"[5] کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ ہم نے آدم علیہ السلام کے واسطے گناہ پر عزم نہ پایا۔ ابن کیسان اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ پائی ہم نے آدم علیہ السلام کے لیے رائے معزوم علیہ،[6] یعنی ایسی رائے جس پر عزم کیا گیا ہو، اس لیے کہ اپنے دشمن ابلیس کی اطاعت کی، کون ابلیس

[1] تفسير النسفي (٣/ ٦٩)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٨٣) تفسير القرطبي (١١/ ٢٥١)
[3] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٢) تفسير النسفي (٣/ ٦٩)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٣٣) فتح البيان (٨/ ٢٨٣۔ ٢٨٤)
[5] تفسير القرطبي (١١/ ٢٥٢)
[6] فتح القدير (٣/ ٥٣٣)

جس نے اُن پر حسد کیا اور اُن کو سجدہ کرنے سے باز رہا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے دو معنی ذکر کیے ہیں: ایک یہ کہ "قصد إلى الخلاف لأمره" دوسرے یہ ہیں کہ آدم علیہ السلام اولو العزم سے نہ تھے۔[1]

﴿ نَجِدْ ﴾ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ وجدان بمعنی علم سے ہے، اس بنا پر دو مفعول کا ناصب ہوگا، ایک ﴿ لَهٗ ﴾، دوسرا ﴿ عَزْمًا ﴾۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ وجود عدم کی ضد ہے، ایک مفعول کا ناصب ہوگا اور وہ ﴿ عَزْمًا ﴾ ہے، رہا لہ، سو یا تو حال ہوگا ﴿ عَزْمًا ﴾ سے یا ﴿ نَجِدْ ﴾ کے متعلق ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ظہورِ نسیان و فقدانِ عزم کی کیفیت بیان فرمائی اور جس بات کا اُن سے عہد کیا تھا اس کا بیان شروع فرمایا: ﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا... الخ ﴾ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قصہ قرآن شریف کی سات سورتوں میں بار بار لایا گیا، ایک راز کی وجہ سے، جس کو اللہ جانتا ہے اور بعض خلق اس کی عامل۔

﴿ اِذْ ﴾ سے پہلے "اذکر" مقدر ہے، یعنی اللہ پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرماتا ہے کہ تم اس وقت کو یاد کرو جس میں ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت میں ہم سے اور آدم علیہ السلام سے جو بات واقع ہوئی اس کو یاد کرو، تاکہ آدم علیہ السلام کا نسیان و فقدانِ عزم تم پر کھل جائے۔ رہی یہ بات کہ ذکر کو وقت کے ساتھ متعلق کیا باوجود اس کے کہ مقصود اُن حادثوں کا ذکر کرنا ہے جو اس وقت میں واقع ہوئے، لہٰذا یہ مبالغے کے لیے ہے، کیونکہ جب وقت کے ذکر کرنے کا امر فرمایا تو جو حوادث اس وقت میں ظہور پذیر ہوئے ان کا ذکر کرنا تو بطریقِ اولیٰ لازم ہوگا۔ اس قصے کا بیان سورۃ البقرہ میں پورے طور پر گزر چکا ہے۔ سجود سے مراد یا تو سجودِ لغوی ہے، یعنی خضوع اور تذلل اور فروتنی و عاجزی، یا آدم علیہ السلام مثل قبلے کے تھے اس لیے کہ اس میں ان کے لیے ایک قسم کی تعظیم ہے۔

﴿ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ﴾ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ ابلیس ایک فرشتہ تھا، جنس مستثنیٰ منہم، یعنی فرشتوں میں سے۔ دوسرا قول امام حسن رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے کہ فرشتے لبابِ خلیقہ ہیں ارواح سے اور باہم ان کے تناسل نہیں ہوتا اور ابلیس نارِ سموم سے ہے اور ابلیس کا ملائکہ سے استثنیٰ جو صحیح ہوا تو اس بنا پر کہ وہ فرشتوں کے ہمراہ رہتا اور اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا،[2] ان دونوں قولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ استثنیٰ متصل ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا کہ ابلیس ابو الجن ہے۔ فرشتوں کے ہمراہ رہتا، اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتا تھا۔[3] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا کہ گویا محلی کی اس عبارت سے غرض استثنیٰ کی توجیہ ہے، اس دلیل سے کہ ﴿ اِلَّآ ﴾ کی تفسیر لیکن سے نہیں کی، جس طرح ان کی عادت ہے کہ مستثنیٰ منقطع کے بیان میں ﴿ اِلَّآ ﴾ کی تفسیر لیکن کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ جمل نے کہا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ توجیہ انقطاع کی ہو، کیونکہ مستثنیٰ منقطع میں یہ بات ضرور ہے کہ مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے درمیان ایک قسم کا ارتباط اور اتصال ہو۔ اسی لیے فتح البیان میں ہے کہ استثنیٰ منقطع ہے اور بعض نے

[1] تفسير النسفي (٣/ ٦٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ٦٩۔ ٧٠) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤١٧)

کہا متصل ہے۔ قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔[1]

جملہ ﴿ اَبٰى ﴾ مستأنفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی نے کہا ہے کہ ابلیس نے سجدہ کیوں نہ کیا تو یہ اس کا جواب ہوا کہ اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ ﴿ اَبٰى ﴾ کا مفعول محذوف اور مراد ہے۔ دوسری آیت میں اس کی تصریح آئی ہے: ﴿ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴾ [الحجر: ٣١] ''اس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔'' دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مفعول بالکل مراد ہی نہیں ہے، معنی یہ ہیں کہ ابلیس اہلِ اِباء وعصیان سے ہے، قطع نظر اس سے کہ متعلق اِباء (انکار کرنا) کا کیا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو پسند کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اِباء ظاہر کیا اور توقف کیا۔[2]

﴿ فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ ﴾ یعنی ہم نے کہا: اے آدم! بے شک یہ ابلیس تیرا دشمن ہے اور تیری بیوی حوا کا، اس لیے کہ اس نے نہ تجھ کو سجدہ کیا نہ تیرا افضل دیکھا۔ عداوت کا سبب یہی ہے کہ آدم علیہ السلام پر اللہ پاک کی نعمت کے آثار دیکھے تو ان پر حسد کیا، پھر ان کا دشمن ہوگیا۔ ﴿ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴾ یعنی کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے پھر تو تکلیف میں پڑے گا۔ نکالنے کی نسبت ابلیس کی طرف کی اگرچہ نکالنے والا اللہ پاک ہے، اس لیے کہ جب ابلیس آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالتا تھا اور انھوں نے وہ کام کیا جس پر نکلنا لازم آتا ہے تو نکالنے کی نسبت ابلیس کی طرف درست ہوگئی، کیونکہ وہ نکالنے کا سبب ٹھہرا۔ سمین نے یوں کہا ہے کہ نہی صورت میں تو ابلیس کو ہے اور مراد آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام ہیں، یعنی تم دونوں نکلنے کے اسباب میں خوض مت کرنا کہ تم کو شقاء حاصل ہو۔ شقاء سے مراد خاص دنیوی تکلیف ہے۔

﴿ فَتَشْقٰى ﴾ باضمار ''أَن'' منصوب ہے، اس لیے کہ نہی کے جواب میں واقع ہوا ہے، کلمہ شقا مقصور ہے۔ اسی لیے مختار میں باب مقصور کے ذیل میں اس کو ذکر کیا ہے۔ قاموس میں یوں کہا ہے کہ شقا بالقصر ہے اور اس کا مد بھی جائز ہے۔ قاموس کی عبارت یہ ہے کہ ''الشقاء الشدة والعسر ويمد ويقال شقي كرضي شقاوة''[3] یعنی شقا شدت وعُسر کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم ایسا کام مت کرنا جس کے سبب سے جنت سے نکالے جاؤ تو معاش کی ضروریات حاصل کرنے میں تکلیف اٹھاؤ، محنت ومشقت میں پڑو۔ تمھارا عیش وگزران ہاتھ کی مشقت اور پیشانی کے پسینے سے ہو، وہ یہی زمین کا جوتنا، بونا، کاشتکاری کرنا، پیسنا، روٹی پکانا ہے۔ رہی یہ بات کہ شقا کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف کی، لہٰذا اس میں کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ شروع قصے سے کلام تنہا آدم علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ فتح القدیر میں یہی قول نقل کیا ہے۔[4]

دوسرا یہ ہے کہ شقا سے مرد کے ضمن میں اس کی بیوی کی شقا ہے، جس طرح کہ مرد کی سعادت میں اس کے گھر

---

[1] فتح البيان (٨/ ٢٨٤) [2] تفسير النسفي (٣/ ٧٠) [3] القاموس المحيط (١/ ١٦٧٧) [4] فتح القدير (٣/ ٥٣٣)

والوں کی سعادت ہے، کیونکہ وہ اُن کا قیم اور بندوبست کرنے والا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ شقا سے مراد تعب ہے طلبِ قوت میں، لہٰذا یہ مرد پر ہے، عورت پر نہیں ہے، کیونکہ محنت، مشقت اور کام کاج کرنے والا مرد ہی ہوتا ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ رؤسِ آیات کی مراعات کے واسطے صیغۂ واحد کہہ دیا ہے یا عورت بالتبع اس میں داخل ہے۔ آخری قول کو علامہ نسفی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[1]

مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کی طرف ایک سرخ بیل اُتارا گیا تھا، اس پر کاشتکاری کرتے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے، لہٰذا ان کی شقا یہی تھی۔ پھر اللہ پاک نے نہی کی وجہ بیان فرمائی، یعنی ہم نے تم کو جو درخت کے کھانے سے منع کیا ہے تو اس لیے کہ تم کو تعب اور قوت کا اہتمام کرنے سے پوری پوری راحت ملے، ہمیشہ آسایش و آرام میں بسر کرو۔ وہ علت یہ ہے کہ ﴿ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴾ یعنی تیرے واسطے یہ ہے کہ تو نہ بھوکا ہو جنت میں اور نہ ننگا۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے لیے اس میں انواع و اقسام کی معایش کے فائدے ہیں اور طرح طرح کی نعمتیں ہیں، من مانے کھانے اور عمدہ عمدہ لباس، کیوں کہ جب بھوک اور برہنگی کی ان سے نفی کر دی تو معلوم ہوا کہ وہاں پر پیٹ بھرنے کے لیے خوراک اور جسم ڈھانپنے کے لیے کپڑے ہوں۔

اسی طرح ﴿ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴾ کیوں کہ پیاس کی نفی سے لازم آتا ہے کہ وہاں سیرابی کا انتظام ہوگا اور دھوپ کی نفی سے لازم آتا ہے کہ وہاں رہایش گاہ ہوگی، جس سے دھوپ کی مشقت سے بچا جاتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "ضحی الرجل یضحی ضحوا" جس وقت کہ سورج کے واسطے ظاہر ہو، پھر اس کو سورج کی گرمی پہنچے۔ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ نہ پہنچے گی تجھ کو اس میں پیاس اور نہ گرمی۔[2] اس لیے کہ جنت میں سورج نہیں ہے۔ جنت والے ایک سایۂ دراز میں ہیں۔ اللہ پاک نے یہاں ذکر فرمایا کہ امرِ معاش کے شغل اور اس کو حاصل کرنے میں جو مشقت اور تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، اس سے ان کو بے نیاز کر دیا، بلاشبہہ دنیا میں جتنی تکلیفیں اور مشقتیں ہیں، جن کے گرد انسانی زندگی گھومتی ہے، وہ یہی سامانِ خور و نوش اور رہایش کو حاصل کرنا ہے، ان کے علاوہ جو اور چیزیں ہیں وہ سب فالتو اور زائد ہیں، اُن کے بغیر زندگی کی بقا ممکن ہے۔

اللہ پاک کی طرف سے آدم علیہ السلام کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے تو اُن کے لیے جنت میں یہ سب کچھ ہے اور اگر اس کی وصیت کو ضائع کیا اور اس کے عہد پر نگاہ نہ رکھی تو اُن کو جنت کی طرف سے دنیا کی طرف نکال دے گا۔ پھر ان پر مشقتیں اور مصیبتیں نازل ہوں گی، جن کے ساتھ بھوک، پیاس، برہنگی، پیاس اور گرمی کو دور کریں گے، پس اس بنیاد پر شقائے متقدم سے شقائے دنیا ہوگی، جیسا کہ بہت سے مفسروں نے کہا ہے

[1] تفسير النسفي (٣/ ٧٠)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٣٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٨)

شقائے آخرت مراد نہ ہوگی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شقا یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے کھائے۔[1] امام صفوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے مقابلہ کیا، بھوک اور برہنگی کے درمیان اور پیاس اور دھوپ کے درمیان، اگرچہ بھوک پیاس کے مقابل آتی ہے اور برہنگی دھوپ کے مقابل آتی ہے، اس لیے کہ دھوپ باطن کی ذلت ہے اور برہنگی ظاہر کی ذلت ہے اور پیاس باطن کی گرمی ہے اور دھوپ ظاہر کی گرمی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے لیے ظاہر و باطن کی ذلت اور گرمی کو دور کیا، اس قول کو ابن لقیمہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2]

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ اللہ پاک نے تشنگی کو بھوک سے جدا کیا، باوجود اس کے کہ دونوں ایک ہی جنس سے ہیں اور ذکر کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ آتے ہیں، یعنی اکثر بول چال میں بھوک پیاس کو ایک ساتھ بولتے ہیں، اسی طرح برہنگی اور دھوپ کا حال ہے کہ یہ دونوں ایک ہی جنس سے ہیں، لہٰذا اُن کو جدا کر کے اس لیے بیان کیا ہے کہ اللہ کے احسان و منت کے مقام کو پورا حق دیا جائے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان چاروں اُمور سے ہر ایک کی نفی ایک علاحدہ نعمت ہے اور اگر بھوک اور پیاس کو اکٹھا کیا جاتا تو بسا اوقات اس بات کا وہم ہوتا کہ اُن دونوں کی نفی ایک نعمت ہے اس طرح برہنگی اور دھوپ کو اکٹھا ذکر کرنے کا حال ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غرض زیادتِ تقریر ہے اس بات کے آگاہ کرنے کے لیے کہ ان امور میں سے ہر ایک علاحدہ علاحدہ مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ ان میں بعض کی نفی دوسرے کی تبعیت اور استطراد کے طور پر ہے، جس طرح اس صورت میں وہم کیا جاتا، اگر ایک جنس والوں کو اکٹھا ذکر کیا جاتا۔[3]

نافع و ابو بکر نے "وَ إِنَّكَ" کو ہمزہ کی زیر سے پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے ہمزہ کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔[4] زیر ہونے کی صورت سے دو امر جائز ہیں: ایک یہ ہے کہ جملۂ مستأنفہ ہو، دوسرا یہ کہ عطف ہو پہلے "إِنَّ" پر اور خبر "لك" مقدم ہو۔ تقدیر یہ ہے: "إن لك عدم الجوع و عدم العری وعدم الظمأ و عدم الضحو" اور فتح کی صورت میں جائز ہے کہ "أَنَّ" زبر کے ساتھ اسم ہو "إِنَّ" زیر کے ساتھ کا۔ یہ اس واسطے جائز ہوا کہ اُن کے درمیان فصل آ گئی ہے، اگر فصل نہ ہوتی تو جائز نہ ہوتا، اگر تو یوں کہے کہ "إِنَّ أَنَّ زَيْدًا قَائِمٌ"، تو جائز نہیں ہے، پھر جب اُن کے درمیان میں فصل آ جائے گی تو جائز ہو جائے گا۔ اب تو یوں کہے گا: "إِنَّ عِنْدِيْ أَنَّ زَيْدًا قَائِمٌ". پس "عندي"، خبر مقدم ہے اسم پر اور اسم "ان" مع اسم و خبر کے ہے، خبر مقدم اس لیے ہوگی کہ ظرف ہے اور آیت اسی قبیل سے ہے، کیونکہ تقدیر یہ ہے: "وإن لك أن لا تظمأ" (كذا في السمين) فتح القدیر میں کہا ہے: "وَأَنَّكَ" زبر کے ساتھ ابو عمرو اور کوفیوں کی قراءت ہے سوائے عاصم کے۔[5]

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٥٣) [2] فتح البيان (٨/ ٢٨٦) [3] تفسير أبي السعود (٦/ ٤٦)
[4] تفسير البغوي (٥/ ٢٩٩) [5] فتح القدير (٣/ ٥٣٤)

﴿ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ ﴾ وسوسہ و وسواس زیر کے ساتھ دل میں ڈالنے کو کہتے ہیں۔ وسواس کے معنی ہیں: ''أَنْهٰى إِلَيْهِ وَسْوَسَته'' اسی لیے اس کے صلہ میں حرفِ ''إلیٰ'' آیا ہے، یعنی شیطان نے اپنے وسوسہ کو آدم علیہ السلام کی طرف پہنچایا۔ رہی یہ بات کہ سورۃ الاعراف میں ﴿ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ ﴾ [الأعراف: ۲۰] ''پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکانے کے لیے (ان کے دل میں) وسوسہ ڈالا'' فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کے معنے ''وسوس لأجله'' ہیں، حرفِ ''لا'' تعلیل کے لیے ہے، یعنی شیطان نے واسطے ان کے وسوسہ ڈالا۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''وسوس'' بحرف ''إلی'' متعدی کیا گیا، اس لیے کہ بمعنی ''أسر'' ہے اور دوسری جگہ متعدی بہ حرفِ لام آیا، اس واسطے کہ ''ذکر له'' کے معنی میں ہے اور ''له'' کے معنے ''لأجله'' ہوں گے۔[1] اس کی اور اس کے ما بعد کی تفسیر سورت اعراف میں گزر چکی ہے۔[2]

﴿ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴾ یہ جملہ وسوسے کی صورت کا بیان ہے اور ﴿ هَلْ اَدُلُّكَ ﴾ عرض کے واسطے ہے۔ فتح القدیر میں کہا ہے کہ بدل ہے ''وَسْوَسَ'' سے، یا جملہ متانفہ جواب ہے سوالِ مقدر کا، گویا کسی نے کہا ہے کہ پھر شیطان نے اپنے وسوسے میں آدم علیہ السلام سے کیا کہا، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان نے کہا: اے آدم! میں تجھے ہمیشہ جینے کا درخت اور وہ بادشاہی جو پرانی نہ ہو بتاؤں گا۔ ﴿ شَجَرَةِ الْخُلْدِ ﴾ سے وہ درخت مراد ہے کہ جو شخص اس سے کھالے تو کبھی نہ مرے اور ہمیشہ باقی رہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شجرہ کی اضافت خلد کی طرف کی ہے اور وہ خلود ہے، اس لیے کہ جو شخص اس میں سے کھالے، وہ اس کے زعم میں ہمیشہ رہے اور نہ مرے۔[4]

﴿ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴾ سے مراد تصرف اور بادشاہی ہے، جو زائل نہ ہو، ختم نہ ہو، ہلاک اور فنا ہونے والی نہ ہو اور یہ خلود کے لیے لازمی ہے۔ ابلیس نے یہ بات ہمیشہ کی راحت کے لیے رغبت دلانے کے لیے کہی۔ پس جس شے میں اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو رغبت دلائی، اسی میں ابلیس نے بھی اُن کو راغب کیا، مگر اللہ پاک نے تو اس بات کو اس درخت سے بچنے پر موقوف کیا اور ابلیس نے اس کو اس درخت کی طرف پیش قدمی پر موقوف کیا اور آدم علیہ السلام نے باوجود اُن کے کمال علم کے کہ اللہ تعالیٰ اُن کا خالق، رب، ولی اور ناصر ہے اور ابلیس ان کا دشمن ہے، اللہ پاک کے قول سے اعراض کیا اور مخالفت کا ارادہ نہیں کیا۔ جو شخص اس بھید میں غور وفکر کرے گا تو وہ جان لے گا کہ اللہ پاک کی قضا کو کوئی نہ دور کرنے والا ہے اور نہ اس سے کوئی روکنے والا ہے۔[5] (کذا في الخازن)

﴿ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾۔ ''سوأت'' ''سوأة'' کی جمع ہے۔ ''سوأة'' شرم گاہ کو کہتے

[1] فتح البیان (۸/ ۲۸٦) [2] رقم الآیة [۲۰] [3] فتح القدیر (۳/ ۵۳٤)
[4] تفسیر النسفي (۳/ ۷۰) [5] تفسیر الخازن (٤/ ۲۸۳)

ہیں، آگے کی طرف ہو یا پیچھے کی طرف، اس لیے کہ اس کا کھلنا اس کے صاحب کو برا لگتا ہے، اس کو غمگین کرتا ہے۔ یعنی جس وقت آدم اور حوا علیہما السلام نے اس درخت سے کھا لیا تو جنت کے حُلے ان سے گر پڑے، برہنہ ہوگئے، شرمگاہیں کھل گئیں، یہاں تک کہ اُن میں سے ہر ایک کے لیے اپنی قبل اور دوسرے کی قبل اور دبر ظاہر ہوگئی۔

﴿ وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ﴾ "طفق يفعل كذا مثل جعل يفعل" کے ہے اور یہ مثل "کاد" کے ہے، اس بات میں کہ "طفق" اور "کاد" دونوں کی خبر فعلِ مضارع واقع ہوتی ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ "طفق" شروع کے واسطے آتا اور اول امر میں اور "کاد" قربِ امر کے لیے ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عربی زبان میں "طفقا" کے معنی "أقبلا" ہیں۔[1] کسی نے کہا: "أخذا وجعلا"۔

"خصف" جوتا گانٹھنے کو کہتے ہیں، یہاں مراد الصاق و الزاق ہے، یعنی چپکانا۔ "عليهما أي لأجل سوآتهما" حرفِ "علیٰ" واسطے تعلیل کے ہے۔ "ورقِ جنت" سے مراد انجیر کے پتے ہیں، یعنی آدم اور حوا علیہما السلام نے شروع کیا کہ اپنی شرمگاہوں کو چھپانے کے لیے انجیر کے پتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ چپکانے لگے، تاکہ لمبے چوڑے ہو جائیں اور اُن سے ستر پوشی ہو سکے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ "يلزقان الورق بسوأتهما للتستر وهو ورق التين"[2] امام خازن رحمہ اللہ کا لفظ یہ ہے: "يلزقان بسواتهما من ورق التين"[3] یعنی ستر پوشی کرنے کے لیے انجیر کے پتوں کو اپنی شرم گاہوں پر چپکاتے تھے۔

﴿ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾ عصیان زیر کے ساتھ نافرمانی کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ طاعت کی ضد ہے۔ "غي" گمراہی کو بولتے ہیں۔ اس کی ضد رشاد ہے، یعنی آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو صواب سے گم ہوگئے، یا اپنے مطلوب سے بے راہ ہوگئے، وہ مطلوب یہی تھا کہ اس درخت کے کھانے سے خلود حاصل ہوگا، لہٰذا نہ ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ فاسد ہوگیا اُن پر اُن کا عیش اُن کے دنیا کی طرف اُتر جانے کے سبب سے۔ کسی نے کہا ہے کہ "جهل موضع رشده"، یعنی انھوں نے اپنے جائے رشد کا جہل کیا، اس کو نہ جانا۔ کسی نے کہا ہے کہ "بشم من كثرة الأكل" یعنی زیادہ کھانے سے اُن کو تخمہ ہوگیا۔

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فعل ما لم يكن له فعله"[4] یعنی ایسا کام کیا، جس کا کرنا اُن کو زیبا نہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ راہِ حق کو چوک گئے اور بے راہ ہوگئے، اس جہت سے کہ اس شے کے کھانے سے خلد طلب کیا، جس سے منع کیے گئے، پس خائب اور نا اُمید ہوئے اور اپنی مراد کو نہ پہنچے اور عزت سے ذلت کی طرف اور راحت سے تکلیف کی طرف ہوگئے۔ حفناوی نے کہا کہ یعنی آدم علیہ السلام نے رب کی مخالفت اس کی نہی میں کی۔ پس عصیان وہی

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٥٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ٧٠) [3] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٣) [4] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٣)

مخالفت ہے۔ لیکن انھوں نے تاویل کے سبب سے مخالفت کی، اس لیے کہ انھوں نے یہ اعتقاد کیا کہ کوئی شخص جھوٹا ہو کر اللہ کی قسم نہیں کھاتا، یا اس لیے کہ انھوں نے یہ اعتقاد کیا کہ نہی منسوخ ہوگئی، جب ابلیس نے اُن کے لیے قسم کھائی، یا اس لیے کہ انھوں نے یہ اعتقاد کیا کہ نہی ایک معین درخت سے ہے اور اس کے سوا باقی اس جنس کے درختوں سے منع نہیں کیے گئے۔

﴿ فَغَوٰى ﴾ یعنی اپنے مطلوب سے بے راہ ہوگئے اور وہ مطلوب جنت میں خلود ہے، یعنی وہ اس سے مائل ہوگئے اور اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس مقام کی تقریر میں حق یہی ہے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس درخت سے کھا لیا، جس سے وہ منع کیے گئے تھے; اس سبب سے کہ ابلیس نے ان کو لغزش دی اور اُن کو فریب دیا اور ان کے لیے قسم کھائی کہ بے شک وہ اُن کے لیے خیر خواہوں میں سے ہے، یہاں تک کہ اُن کو پھسلا دیا دھوکے سے اور اُن کا گناہ عقیدے اور صحیح نیت سے نہ تھا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ﴿ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾. قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی کو جائز نہیں ہے کہ وہ آج اس بات کی آدم علیہ السلام سے خبر دے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے کوئی مانع نہیں، اس کے بعد کہ اللہ پاک اپنی کتاب میں ہم کو خبر دے چکا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس کی نافرمانی کی اور جس طرح یہ قول کہا جاتا ہے کہ "حسنات الأبرار سيئات المقربين" و مما قلته في هذا المعنى:

عصى أبو العالم وهو الذي   من طينة صورة الله
وأسجد الأملاك من أجله   وصير الجنة ماواه
أغواه إبليس فمن ذا أنا   المسكين إن إبليس أغواه[1]

ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کہ ﴿ عَصٰۤى اٰدَمُ ﴾ کہا جائے اور یہ جائز نہیں ہے کہ "آدم عاص" کہیں، کیوں کہ یہ اسی شخص کے واسطے کہا جاتا ہے، جس نے فعلِ معصیت کی عادت کر لی ہے جس طرح وہ شخص جو اپنے کپڑے کو سیتا ہے اس کو کہیں گے کہ "خاط ثوبه"، یعنی اس نے اپنے کپڑے کو سیا اور یوں نہ کہیں گے کہ وہ خیاط ہے، یہاں تک کہ بار بار سیے اور اس کی عادت کر لے۔[2] انتہیٰ۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیا جائز ہے کہ اس آیت سے اَخذ کر کے یوں کہا جائے کہ "كان آدم عاصيا غاويا"، یعنی آدم نافرمان گمراہ تھے تو اس کا یہ جواب ہے کہ نہ کہا جائے اس لیے کہ اطلاقِ فعل کے جواز سے اطلاقِ اسمِ فاعل کا جواز لازم نہیں آتا ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں ہے کہ تبارک اللہ جائز ہے یا نہیں جائز ہے کہ اللہ متبارک کہا جائے اور جائز ہے کہ "تاب الله علىٰ آدم" کہیں، یہ جائز نہیں ہے کہ "الله تائب" بولیں، جس طرح کہ بجائے خود اس کا بیان کیا گیا ہے۔[3] (قاله الرازي)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ "غوىٰ" کے معنی ہیں: "ضل عن الرأى"، یعنی

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٣٤) [2] تفسير البغوي (٥/ ٢٩٩) [3] تفسير الرازی (٢٢/ ١١١)

آدم علیہ السلام بے راہ ہوئے رائے سے۔ ابن عیسی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ خائب ہوئے، یعنی نا اُمید۔ حاصل یہ ہے کہ عصیان امر اور نہی کے خلاف فعل کا واقع ہونا ہے، یہ فعل کبھی عمداً ہوتا ہے تو گناہ ہوگا اور کبھی عمداً نہیں ہوتا ہے تو زلت (لغزش) ہوگا اور جب کہ آدم علیہ السلام کا فعل موصوف بہ عصیان ہوا تو اُن کا فعل اس سے نکل گیا کہ رشد ہو، پس غی ہوگا، اس لیے کہ غی رشد کے خلاف ہے۔ اللہ نے جو ﴿عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ فرمایا اور "زَلَّ آدَمُ" نہ کہا، لہٰذا پہلے کی تصریح کرنے میں اور دوسرے سے عدول (منہ پھیرنے) فرمانے میں ایک مزجرۂ بلیغہ اور موعظۂ کافہ (مکمل نصیحت) ہے مکلفین کے لیے، گویا اُن سے کہا گیا کہ تم نظر و غور کرو اور عبرت پکڑو کہ میں نے نبیِ معصوم حبیب اللہ پر اس زِلت (پھسلنا) کی اس سختی سے نعی کی (اطلاع دی)۔ پس صغائر تم سے ہو پڑتے ہیں تم ان کو ہلکا مت سمجھو، کبائر کا کیا ذکر ہے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے اس جگہ انبیا کی عصمت کے بارے میں طول طویل کلام کیا ہے۔ بیانِ اختلاف میں طول دیا ہے۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں اُن کی چال اختیار کی ہے،[3] یہاں اس کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى﴾ "اجتباء" کے معنی برگزیدن وفراہم آوردن ہیں، اس محاورے سے ماخوذ ہے: "جُبي إلي كذا فاجتبيته" یعنی فلاں شے میری طرف جمع کی گئی، پس میں نے اس کو جمع کر لیا، جس طرح یہ بولتے ہیں: "جليت على العروس فاجتليتها" یعنی دُلہن مجھ پر جلوہ کی گئی، پس میں نے اس کی طرف نظر کی۔ اصل کلمہ جمع ہے، جہاں کہیں یہ مادہ ہوگا اس میں جمع کے معنی ہوں گے، اس بنیاد پر مجتبیٰ گویا وہ شخص ہے جس میں محاسن اور خوبیاں جمع کی گئی ہیں، یہاں تک کہ اس کے غیر نے اس کو برگزیدہ کیا۔ "اجتبا و اصطفا و اختیار" ہم معنی ہیں۔

اس لیے مفسرین نے ﴿اِجْتَبٰهُ﴾ کے معنی "اصطفاه واختاره و قربه إليه" لکھے ہیں، یعنی اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو برگزیدہ کیا، پسند کیا اور اپنا مقرب بنایا اس طرح سے کہ انھیں توبہ پر آمادہ کیا اور اس کی توفیق عطا فرمائی، پھر رجوع ہوا اُن پر اُن کی معصیت سے اور اُن کی توبہ قبول کی اور توبہ پر مداومت کرنے کی اُن کو راہ بتائی۔ پھر انھوں نے توبہ نہ توڑی۔ یا یہ معنی ہیں کہ اعتذار و استغفار کی طرف راہنمائی فرمائی۔ کہا ہے کہ اللہ پاک کا اُن سے رجوع ہونا اس سے پہلے تھا کہ وہ اور حوا علیہما السلام اپنے اس قول کے ساتھ توبہ کریں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الأعراف: ٢٣] "اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

امام ابن فورک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات آدم علیہ السلام سے نبوت سے قبل ہوئی تھی، جس طرح کہ ﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى﴾ اس پر دال ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے اس قول کو اسی قدر نقل کیا ہے۔ فتح القدیر اور

[1] تفسير النسفي (٣/ ٧٠) [2] تفسير الرازي (٣/ ٧) [3] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٩)

فتح البیان میں اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی دلیل ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے معصیت کے ذکر کے بعد اجتباء و ہدایت کا ذکر کیا ہے اور جب معصیت نبوت سے پہلے ہوئی تو ایک وجہ سے گناہ اُن پر جائز ہے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا نہ صغیرہ نہ کبیرہ اس وقت سے کہ اُن کو نبوت عطا ہوئی، پھر اس کے وجوہ ذکر کیے ہیں۔[2]

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴿١٢٦﴾

اس (اللہ) نے فرمایا: تم دونوں یہاں سے اکٹھے اتر جاؤ، تمھارے بعض، بعض کے دشمن ہیں، پھر جب تمھارے پاس میری ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مشقت میں پڑے گا (123) اور جس نے میری یاد سے اعراض کیا تو بلاشبہ اس کے لیے گزران تنگ ہوگا، اور روزِ قیامت ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے (124) وہ کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ جبکہ میں تو (دنیا میں) دیکھنے والا تھا (125) ارشاد ہوگا: اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تُو نے وہ بھلا دیں، اور اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا (126)

آدم علیہ السلام کو زمین پر اتار دیا گیا:

ایک دوسرے ان کی اولاد، جیسا کہ آپس میں رفاقت کر کے گناہ کیا، اس رفاقت کا بدلہ یہ ملا کہ اولاد آپس میں دشمن ہوئی۔ آیتوں کو بھلا دیا، یعنی عمل نہ کیا اور یقین نہ لایا اور پیغمبر نے کہا: میری اُمت کے سارے گناہ مجھ کو دکھائے گئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہ دیکھا کہ قرآن کی آیت کسی شخص کو یاد ہوئی، پھر اس نے بھلا دی۔

﴿ اِهْبِطَا ﴾ کا خطاب دو کو ہے یا زیادہ کو۔ اگر دو کو ہے تو اس کے بعد ﴿ بَعْضُكُمْ ﴾ اور ﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ ﴾ کیوں کہا، حالانکہ یہ خطاب جمع کو ہے؟ اگر خطاب زیادہ کو ہے تو ﴿ اِهْبِطَا ﴾ بصیغۂ تثنیہ کیوں فرمایا؟ اس کی توجیہ میں

[1] فتح القدیر (٣/ ٥٣٤) فتح البیان (٨/ ٢٨٩) [2] تفسیر الرازی (٣/ ٧)

کئی اقوال ہیں: اول یہ ہے کہ ﴿ اِهْبِطَا ﴾ کا خطاب آدم اور حوا علیہما السلام کو ہے اور ﴿ بَعْضُكُمْ ﴾ کا خطاب ان کی اولاد کو ہے، یعنی اے آدم و حوا تم دونوں جنت سے اکٹھے اترو۔ اے آدم کی اولاد! بعض تمھارا بعض کا دشمن ہے، دنیا میں باہم حسد کرنے کی وجہ سے اور دین میں اختلاف کرنے کی وجہ سے۔[1] (قاله النسفي) دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ اِهْبِطَا ﴾ کا خطاب آدم و حوا علیہما السلام کو ہے۔ مع ان کی اولاد کے جس پر وہ مشتمل تھے۔[2] (قاله المحلي) یعنی یہ خطاب اگرچہ الفاظ میں دو کو ہے، لیکن معنی میں جمع کے لیے ہے، اس بنیاد پر اس آیت اور سورۃ الاعراف کی آیت کے درمیان موافقت ہو جائے گی، کیوں کہ وہاں ﴿ اِهْبِطُوْا ﴾ [البقرة: ٦١] بصیغۂ جمع فرمایا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ پہلے خاص آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو خطاب کیا، اس لیے کہ وہ بشر کی اصل ہیں، پھر اُن کو اور اُن کی ذریت کو خطابِ عام کیا۔ چوتھا یہ ہے کہ ﴿ اِهْبِطَا ﴾ کا خطاب آدم علیہ السلام کو ہے اور اُن کے ساتھ اُن کی ذریت تھی اور ابلیس کو اور اُس کے ساتھ اس کی ذریت تھی، پس چونکہ ان دونوں جنسوں سے ہر جنس کثرت پر مشتمل تھی، اس لیے ﴿ بَعْضُكُمْ ﴾ میں دونوں جنسوں کو بصیغۂ جمع مخاطب کیا۔ پانچواں یہ ہے کہ خطاب آدم اور حوا علیہما السلام کو ہے، اس لیے کہ وہ اصلِ بشر ہیں۔ پھر وہ دونوں گویا بشر ٹھہرائے گئے اس لیے ان کو بلفظِ جمع خطاب فرمایا۔ ایک دوسرے کے دشمن ہونے سے یہ مراد ہے کہ امرِ معاش وغیرہ میں باہم دشمنی کریں گے، پھر اس کے سبب سے لڑائی اور جھگڑا پیدا ہوگا۔ جملہ ﴿ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے، یعنی تم دونوں جنت سے اترو دراں حال کہ بعض تمھارا بعض کا دشمن ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام اور ابلیس سے فرمایا: ﴿ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ﴾ [البقرة: ٣٨] ''تم یہاں سے اکٹھے اترو۔'' سورۃ البقرہ میں ہم نے اس کا تفصیلی بیان کیا ہے۔[3]

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ﴾ ''إِمَّا'' اصل میں ''إِنْ مَا'' ہے۔ ان شرطیہ کا مائے زائدہ میں ادغام ہوا ہے اور فعلِ شرط ﴿ يَاْتِيَنَّكُمْ ﴾ ہے اور اس کا جواب دونوں شرطیہ جملے ہیں: پہلا جملہ ﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ ... الخ ﴾ ہے دوسرا ﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ ... الخ ﴾ ہے۔ ﴿ هُدًى ﴾ سے مراد کتاب و شریعت ہے۔[4] (قاله النسفي)۔ امام بیضاوی، خازن اور ابو السعود رحمہم اللہ کے الفاظ کتاب و رسول ہے۔[5] محلی کا لفظ قرآن ہے۔[6] جمل نے کہا کہ اس میں قصر ہے، جس کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ خطاب ذریتِ آدم علیہ السلام کو ہے اور ذریت کا راہ پر لانا اور اُن کو وعظ و نصیحت کرنا، اس سے عام تر ہے کہ قرآن سے ہو یا قرآن شریف کے سوا اور کتابوں سے جو پیغمبروں پر نازل ہوئی ہیں، یعنی صرف قرآن شریف پر قصر کرنا صحیح نہیں ہے، مطلق کتاب و رسول کہنا، زیادہ صحیح ہے۔ جیسا کہ اور مفسرین نے کہا ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هُدًى ﴾ سے مراد انبیاء، رسل اور بیان ہے۔[7]

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ٧٠_ ٧١) (2) تفسير الجلالين (١/ ٤١٨) (3) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٥)

(4) تفسير النسفي (٣/ ٧١) (5) تفسير البيضاوي (٤/ ٧٥) تفسير الخازن (٤/ ٢٨٥) تفسير أبي السعود (٦/ ٤٧)

(6) تفسير الجلالين (١/ ٤١٨) (7) تفسير الطبري (١/ ٥٤٩)

﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴾ یعنی اے ذریتِ آدم! پھر جب آئے تمھارے پاس میری طرف سے کتاب و رسول، لہٰذا جس شخص نے میری کتاب اور رسول کی پیروی کی تو وہ دنیا میں گمراہ نہ ہوگا اور نہ آخرت میں شقی ہوگا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس شخص نے کتاب اللہ کی پیروی کی تو اللہ اس کو دنیا میں گمراہی سے ہدایت کرتا ہے اور آخرت میں بُرے حساب سے بچاتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴾۔[1] (أخرجه ابن أبي شيبة و الطبراني و أبو نعيم في الحلية و ابن مردويه) نیز چند طریق سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ نے تابع قرآن کو دنیا میں اس بات سے پناہ دی کہ وہ دنیا میں گمراہ ہو اور آخرت میں اس بات سے شقی ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴾[2] (أخرجه الفريابي و سعيد بن منصور و ابن أبي شيبة و عبد بن حميد و محمد بن نصر و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و الحاكم وصححه والبيهقي في الشعب)

اللہ پاک نے یہاں ﴿ هُدًى ﴾ فرمایا، یعنی ضمیر کے بجائے اسم ظاہر رکھا ہے۔ پھر اس کو اپنی ذاتِ مقدس کی طرف مضاف کیا، لہٰذا یہ ﴿ هُدًى ﴾ کی تشریف کے لیے ہے اور ''ھدی'' اتباع کے ضروری ہونے کے مبالغے کے لیے ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ اللہ اس شخص کے لیے کہ جس نے قرآن کی پیروی کی، اس بات کا ضامن ہوا ہے کہ وہ گمراہ نہیں ہوتا دنیا میں، اور نہ آخرت میں شقی ہوتا ہے۔ آخرت میں ''شقا'' سے مراد عقاب ہے، اس شخص کے لیے جو دنیا میں دین کی راہ سے گمراہ ہوا۔ پھر جس شخص نے کتاب اللہ کی پیروی کی، اس کے اوامر کو بجالایا، اس کے نواہی سے باز رہا تو اس نے گمراہی سے اور اس کے عقاب سے نجات پائی۔

وحیِ الٰہی سے اعراض کی دنیا و آخرت میں سزا:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ ذکر سے مراد قرآن شریف ہے۔[3] (قاله النسفي والمحلي والخازن) یا مراد دین اور تلاوتِ کتاب و عمل بما فی الکتب ہے۔[4] (ذكره الشوكاني) یا مراد ''الهدىٰ الذاكر لي والداعي إلي'' ہے۔[5] (قاله أبو السعود و البيضاوي) ﴿ ضَنْكًا ﴾ تنوین کے ساتھ مصدر ہے۔ بمعنی ''ضيقة''، اس

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ١٢٠) المعجم الكبير (١٢/ ٤٨) حلية الأولياء (٩/ ٣٤) اس کی سند میں ''عمران بن ابی عمران'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٥٣١)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ١٢٠) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٨۔ ٢٤٣٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٤١٣) شعب الإيمان (٢/ ٣٥٦) الدر المنثور (٥/ ٦٠٧)

[3] تفسير النسفي (٣/ ٧١) تفسير الجلالين (١/ ٤١٨) تفسير الخازن (٤/ ٢٨٥)

[4] فتح القدير (٣/ ٥٣٦) [5] تفسير أبي السعود (٦/ ٤٨) تفسير البيضاوي (٤/ ٧٥)

لیے ”ضنكة“ تائے تانیث کے ساتھ نہیں کہا، کیونکہ مصدر کی تانیث نہیں ہوتی۔ قاموس میں کہا ہے کہ ”ضنك“ ہر شے میں تنگی ہے۔ یہ مذکر اور مونث کے واسطے آتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”ضنك ككرم ضنكا و ضناكة و ضنوكة ضاق“ یعنی ”ضنك“ کے معنی تنگ کے ہیں۔[1]

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا کہ ”ضنكا“ ”معيشة“ کی صفت ہے، اصل میں مصدر ہے، اس لیے مؤنث نہیں لایا گیا، مفرد و مثنیٰ اور جمع کے لیے واحد لفظ کے ساتھ آتا ہے۔ جمہور نے وصل کی حالت میں ”ضنكا“ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور وقف کی حالت میں تنوین کی الف کے ساتھ بدلا ہے، جس طرح کہ سارے معربات کا حال ہے۔ ایک فرقے نے ”ضنكىٰ“ الف کے ساتھ پڑھا ہے ”سكرىٰ“ کے وزن پر۔ اس الف میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ تنوین سے بدل ہے اور وصل کو قائم مقام وقف کے کیا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ الف تانیث ہے۔ مصدر بروزن فعلیٰ آتا ہے، جیسے دعویٰ۔ ”ضنك“ تنگی اور شدت کو کہتے ہیں۔ اسی معنی سے بولتے ہیں: ”ضنك عيشه“ یعنی اس کی روزی تنگ ہوئی۔ جس عورت کے بدن کا گوشت بہ کثرت ہوتا ہے، اس کو ”ضناك“ کہتے ہیں، گویا یہ خیال کیا کہ مارے گوشت کے اس کے بدن کی جلد تنگ ہوگئی۔ فتح القدیر میں کہا ہے کہ ”ضُنكى“ ضاد کی پیش کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔[2]

آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے اللہ پاک کی ہدایت کی پیروی کی، اس کے دین کو پکڑا تو اللہ عزوجل نے اس کے لیے یہ بات ٹھہرائی ہے کہ وہ دنیا میں خوش گوار زندگی گزارے، نہ اسے کوئی غم ہو نہ افسوس نہ اپنی جان کو تھکائے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ [النحل: ٩٧] ”ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔“ اور جس شخص نے اس کی راہ کی پیروی نہ کی اور اس کے قرآن اور دین سے منہ موڑا، نہ اس پر ایمان لایا، نہ اس پر عمل کیا، نہ اس کی تلاوت کی تو اس کے لیے یہ بات ٹھہرائی ہے کہ وہ تنگ زندگی بسر کرے، تھکاوٹ و تکلیف اور رنج و غم میں رہے اور بہت زیادہ تکلیف اور تنگی اور زیادہ تر رنج اس کو پہنچے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یعنی جس شخص نے میرے امر کی مخالفت کی اور جو کچھ میں نے اپنے رسول پر اُتارا، اس سے اعراض کیا، اس کو بہ تکلف بھولا اور اس کے علاوہ کسی اور دین سے راہ پکڑی تو بے شک اس کے لیے زندگی، یعنی دنیا میں تنگی ہے، پس اس کے لیے نہ کسی طرح کا اطمینان ہے، نہ اس کا کسی طرح سے سینہ کھلا ہے، بلکہ اس کی گمراہی کے سبب سے اس کا سینہ تنگ ہے، اگرچہ ظاہر اس کا عیش و آرام میں ہے، جو چاہتا ہے پہنتا ہے، جو چاہتا ہے کھاتا ہے، جہاں چاہتا ہے رہتا بستا ہے، کیونکہ جب تک اس کا دل یقین و ہدایت کی طرف نہ پہنچے گا، تب تک وہ قلق اور بے چینی و حیرت و شک ہی میں رہے گا۔ پھر شک ہی میں تردد کرتا رہے گا۔ لہٰذا یہ منجملہ معیشتِ ضنک کے ہے۔[3]

---

[1] القاموس المحيط (١/ ١٢٢٣) [2] فتح القدير (٣/ ٥٣٦) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٥_ ٢٢٦)

علی بن ابی طلحہ کا لفظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں شقا ہے،[1] اسی کے مثل امام ابن ابی حاتم، طبرانی اور بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب عذابِ قبر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[2] عوفی کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ ہر وہ چیز جو میں نے اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو دی، تھوڑی ہو یا بہت، پھر وہ اس میں میرا تقویٰ اختیار نہیں کرتا تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے اور وہی معیشت میں ضنک ہے۔ یہ بھی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایک قوم گمراہ تھی، انھوں نے حق سے اعراض کیا تھا اور وہ دنیا کی فراخی میں متکبر تھے، پس اُن کی معیشت ضنک تھی، یہ اس لیے کہ وہ اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ اُن کے معایش کا ان کے واسطے خلیفہ اور بدل کرنے والا نہیں ہے، یہ ان کی اللہ پاک کے ساتھ بدگمانی کے سبب سے تھا اور دین اللہ کی تکذیب کے سبب سے تھا۔ پھر جب بندہ اللہ کی تکذیب کرے اور اس کے ساتھ بدگمانی رکھے اور اس پر اعتماد نہ رکھے تو اس کی معیشت اس پر تنگ ہوئی، پس ''ضنك'' یہی ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معیشتِ ضنک بدعملی اور رزقِ خبیث ہے۔[3] امام عکرمہ اور مالک بن دینار رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[4] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ اس کی قبر اس پر تنگ کی جائے گی، یہاں تک کہ اس کی پسلیاں قبر میں اِدھر سے اُدھر ہو جائیں گی۔ (قاله سفيان بن عيينة عن أبي حازم عن أبي سلمة عن أبي سعيد، قال أبو حاتم الرازي: نعمان بن أبي عياش يكنى أبا سلمة)۔[5]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس آیت کی تفسیر میں کہ قبر کا دباؤ ہے اس کے واسطے، یعنی میت کے واسطے۔ حدیث موقوف اصح ہے۔[6] (في سنده ابن لهيعة و فيه مقال معروف)۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن اپنی قبر میں ایک سبز باغ میں ہے اور اس کے لیے اس کی قبر میں فراخی کی جاتی ہے ستر گز کی اور روشن کی جاتی ہے اس کے لیے اس کی قبر چودھویں رات کے چاند کی طرح۔ کیا تم جانتے ہو، کس کے بارے میں یہ آیت اتری ہے: ﴿ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ کیا تم جانتے ہو کہ ﴿ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ کافر کا عذاب ہے اس کی قبر میں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک حالت یہ ہے کہ اس پر مسلط کیے جاتے ہیں ننانوے اژدھے۔ کیا تم جانتے ہو کہ تنّین کیا ہے؟ یہ ننانوے سانپ ہیں، ہر سانپ کے سات سر ہیں۔ ''يسبحون في جسمه ويلسعونه ويخدشونه''، یعنی وہ

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٣٩٠) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٩) المعجم الكبير (٩/ ٢٣٣) شعب الإيمان (١/ ٣٥٤)

(3) تفسير الطبري (١٨/ ٣٩٢) (4) تفسير الطبري (١٨/ ٣٩١۔ ٣٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٠)

(5) تفسير الطبري (١٨/ ٣٩٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٦)

(6) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٠) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ اور دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہیں۔

سانپ اس کو ڈستے نوچتے رہیں گے، اس دن تک کہ جس میں مبعوث ہوں گے۔[1] (رفعه منكر جدا)

امام بزار رحمہ اللہ کے الفاظ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل کے قول: ﴿ فَإِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةً ضَنكًا ﴾ کے بارے میں فرمایا ہے کہ معیشتِ ضنک جو اللہ نے فرمائی ہے، یہ ہے کہ اس پر ننانوے سانپ مسلط کیے جاتے ہیں، وہ اس کے گوشت کو کاٹتے رہیں گے، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔[2] نیز امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ﴿ فَإِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةً ضَنكًا ﴾ عذاب قبر ہے۔[3] (إسناد جيد، في سنده ابن لهيعة و فيه مقال معروف) اسی کے مثل ہناد، عبد بن حمید، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی رحمہم اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[4]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے احادیث اور آثار کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: "ومجموع ما ذكرنا هنا يرجح تفسير المعيشة الضنك بعذاب القبر"[5] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَعِيشَةً ضَنكًا ﴾ سے مراد ضریع اور زقوم کا کھانا اور غسلین کا پینا ہے۔ کسی نے کہا کہ حرام اور ناپاک کمائی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قناعت کو اس سے سلب کرے گا، یہاں تک کہ وہ سیر نہ ہوگا۔[6] (قاله النسفي) تفسیر خازن میں اس قول کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔[7] امام نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین کے ہمراہ تسلیم و قناعت و توکل ہے، پس اس کی حیات طیب ہوگی اور اعراض کے ہمراہ حرص اور طمع ہے، پس اس کا عیش تنگ ہوگا اور اس کا حال اندھیرا اور تاریک ہوگا۔ جیسا کہ بعض متصوفہ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے رب سے اعراض کرتا ہے تو اس پر اس کا وقت تاریک ہو جاتا ہے اور اس پر اس کا رزق مشوش (پریشان کرنے والا) ہو جاتا ہے۔[8] کسی نے کہا ہے کہ معصیت میں جینا ہے، اگرچہ فراخی اور نعمت میں ہو۔[9] (قاله الرازي)۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے اس قول کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ یا مراد اس کی گزران ہے جہنم میں۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ یہ اعتراض وارد نہ ہوگا کہ ہم تو ایمان سے اعراض کرنے والوں کو معیشت کی فراخی میں دیکھتے ہیں۔

﴿ وَنَحْشُرُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَعْمَىٰ ﴾ ﴿ نَحْشُرُهُۥ ﴾ میں "ھا" کے سکون کو وقف کی طرح پڑھا ہے۔ ﴿ فَإِنَّ لَهُۥ ضَنكًا ﴾ کے محل پر عطف کیا، اس کا محل جزم ہے، اس لیے کہ شرط کا جواب ہے۔ ﴿ أَعْمَىٰ ﴾ حال ہے ﴿ نَحْشُرُهُۥ ﴾ کی ضمیر سے۔ ﴿ أَعْمَىٰ ﴾ سے مراد آنکھ کا اندھا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے اور نسفی رحمہ اللہ نے اسی قول

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٣٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٦)

[2] مسند البزار (١٦/ ٢٣٨) اس کی سند میں "محمد بن عمر واقدی" سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] مستدرك الحاكم (١/ ٥٣٧) الدر المنثور (٥/ ٦٠٨) [4] الدر المنثور (٥/ ٦٠٩) [5] فتح القدير (٣/ ٥٣٧)

[6] تفسير النسفي (٣/ ٧١) [7] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٦) [8] تفسير النسفي (٣/ ٧١) [9] فتح البيان (٨/ ٢٩١)

کو "هو الوجه" کہا ہے۔[1] یا دل کا اندھا، یا حجت سے اندھا، یا خیر کی طرف سے اندھا کہ اُن میں سے کسی بھلائی کی طرف راہ نہ پائے گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر ہر شے اندھی ہوگی سوائے جہنم کے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ وہ نہ دیکھے گا مگر آگ کو۔ امام مجاہد، ابو صالح اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس کے لیے کوئی حجت نہ ہوگی،[2] یہ بھی احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ وہ آگ کی طرف مبعوث ہوگا یا حشر کیا جائے گا اس حال میں کہ بصر اور بصیرت کا اندھا ہوگا، یعنی اس کے سر اور دل کی آنکھیں اندھی ہوں گی، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] "اور ہم انھیں یومِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے۔"

اسی لیے وہ یوں کہے گا: ﴿ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ﴾ یعنی دنیا میں اور وقت بعث کے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ قبر سے بصیر (دیکھنے والا) نکلے گا، پھر حشر میں اندھا ہو جائے گا۔[3] امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے دونوں جگہ ﴿ أَعْمَىٰ ﴾ کا امالہ کیا ہے، اس لیے کہ الف یاء سے بدل دیا گیا ہے۔ ابو عمرو رحمہ اللہ نے اول کا امالہ کیا ہے۔ اس لیے کہ راسِ آیت ہے، یعنی آیت کا اخیر ہے اور وقف کی جگہ ہے، پس وہ تغیر کے لائق ہے، دوسرے کا امالہ نہیں کیا ہے۔

﴿ قَالَ كَذَٰلِكَ ﴾ موضع رفع میں ہے، اس بنا پر کہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ "أي الأمر كذلك"، یعنی بات ایسی ہی ہے۔ اکثر کے نزدیک موضع نصب میں ہے: "أي حشر أمثل ذلك"، یعنی مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے۔ یا مفعول بہ ہے فعل محذوف کا۔ "أي مثل ذلك فعلت أنت"، یعنی تو نے ایسا ہی کیا ہے۔ پھر اس کی اس قول سے تفسیر کی: ﴿ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ﴾ یعنی تیرے پاس ہماری کھلی آیتیں آئیں تو تو نے اُن سے اعراض کیا، اُن کو چھوڑ دیا، اُن میں نظر نہ کی۔

﴿ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴾ یعنی اس نسیان کی مثل جو تو نے دنیا میں کیا ہے تو بھی اندھاپے میں یا دوزخ میں چھوڑا جائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ خیر و برکت اور رحمت سے بھلا دیے گئے اور آگ میں عذاب کرنے سے نہیں بھلائے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، یعنی جب کہ تو نے اللہ کی آیتوں سے اعراض کیا اور اُن سے اس شخص کا سا معاملہ کیا جس نے ان کو یاد نہ رکھا۔ تو نے بھی آیات کے پہنچنے کے بعد اُن کو بھلا دیا اور اُن سے منہ پھیرا اور اُن کو بے خبری میں چھوڑا، اسی طرح آج ہم تجھ سے اس شخص کا سا معاملہ کریں گے جو تجھ کو بھول جائے۔

﴿ فَالْيَوْمَ نَنسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا ﴾ [الأعراف: ٥١] یعنی آج ہم ان کو بھول جائیں گے، جیسے وہ اپنے اس دن کے ملنے کو بھولے رہے، کیوں کہ جزا جنس عمل سے ہوتی ہے، یعنی جس طرح کا عمل، اسی طرح کا

[1] تفسير النسفي (٣/ ٧١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٦) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٥)

بدلہ۔ رہا لفظ قرآن شریف کا بھولنا باوجود قرآن کے معنی سمجھنے کے اور اس کے مقتضا پر قائم رہنے کے، لہٰذا وہ اس خاص وعید میں داخل نہیں ہے۔ اگرچہ اور وجہ سے اس پر وعید آئی ہے، اس لیے اس بارے میں حدیث شریف میں سخت قسم کی نہی اور وعید وارد ہوئی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے کوئی شخص کہ اس نے قرآن پڑھا، پھر اس کو بھول گیا، مگر ملے گا اللہ تعالیٰ سے جس دن کہ اس سے ملے گا اور وہ اجذم ہوگا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسی کے مثل سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔[1] "مجمع البحار" میں ہے کہ اجذم کے معنی ہیں: "مقطوع الید" یا "مقطوع الحجة" یعنی اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا یا اس کے پاس کوئی حجت و دلیل نہ ہوگی، یا یہ معنی ہیں کہ اس کے سارے اعضا گر گئے ہوں گے، یا خیر و بھلائی سے خالی ہاتھ ہوگا۔[2]

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ۝۱۲۷

اور جو حد سے بڑھ گیا اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لایا، ہم اس کو اسی طرح سزا دیں گے۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب شدید تر اور بہت باقی رہنے والا ہے (127)

حد سے تجاوز کرنے والوں کی سزا:

یہ اندھا ہونے کا عذاب حشر میں ہے اور دوزخ میں اور زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اسی طرح ہم جزا دیں گے ان مسرفین اور مکذبین کو جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں دنیا اور آخرت میں اُن کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور البتہ آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہوگا اور اللہ سے اُن کو بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴾ یعنی آخرت کا عذاب اَلم اور درد میں دنیا کے عذاب سے سخت تر ہے اور اُن پر ہمیشہ رہنے والا ہے۔ لہٰذا وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہے گیں۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متلاعنین (ایک دوسرے پر لِعان کرنے والوں) سے فرمایا: «إِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ»[3] یعنی بے شک دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت سہل (نرم) ہے۔[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اسراف سے مراد شہوات میں انہماک ہے، یا اللہ کے ساتھ شرک۔ اس قول کو امام ابن ابی

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٧٤) مسند أحمد (٥/ ٢٨٥۔ ٣٢٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٦۔ ٢٢٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٥٤)

(2) مجمع بحار الأنوار (١/ ٣٣٦۔ ٣٣٧) (3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٣) (4) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٧)

حاتم رحمہ اللہ نے سفیان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[1] یعنی اس بدلے کے مثل بدلا دیں گے ہم اس شخص کو جس نے اپنی خواہشات میں انہماک کیا، اپنے دل کی خواہشات میں ڈوبا رہا، یا اللہ پاک کے ساتھ شرک کیا اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لایا، بلکہ ان کو جھٹلایا اور البتہ عذابِ آخرت معیشتِ ضنک سے زیادہ سخت ہے اور زیادہ تر دائم اور ثابت رہنے والا ہے، کیوں کہ وہ منقطع نہ ہوگا۔[2]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذابِ آخرت سے مراد کورے (اندھے پن) پر حشر ہونا ہے، یا مراد آگ کا عذاب ہے، یعنی کورے (اندھاپے) پر حشر ہونے کے بعد زندگی کی تنگی سے زیادہ سخت اور ابقی ہے۔ یا زندگی کی تنگی اور کورے سے اور شاید جس وقت آگ میں داخل ہوگا تو اس کی کوری دور ہوجائے گی، تاکہ اپنے محل اور حال کو دیکھے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ﴿ اَشَدُّ وَاَبْقٰی ﴾ ہے آیات سے اعراض اور اُن کا انکار کرنے سے، جس کو اس نے کیا۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر سے منہ موڑنے والے کو دو سزاؤں کی وعید سنائی: ایک تو دنیا میں تنگیِ معیشت، دوسری اس کو اندھا حشر کرنا آخرت میں۔ وعید کی آیتوں کو اس قول سے ختم کیا: ﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی ﴾[4] یعنی کوری پر حشر کرنا، جو کبھی زائل نہ ہوگی، تنگیِ عیش سے سخت تر ہے، جو گزر جانے والی ہے۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾

کیا پھر (اس چیز نے) ان کی راہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں جن کے مساکن (بستیوں) میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں، بے شک اس میں البتہ عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں ﴿128﴾

گذشتہ امتوں کی تباہی باعثِ عبرت ہے:

اللہ پاک فرماتا ہے: پس کیا اُن لوگوں کے لیے جو اس بات کی تکذیب کرتے ہیں، جس کو اے محمد! تم اُن کے پاس لائے ہو، یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان سے پہلے رسولوں کو جھٹلانے والی کتنی اُمتیں ہم نے ہلاک کر ڈالی ہیں، لہٰذا وہ تباہ ہوگئیں، ان کا کوئی باقی نہ رہا۔ نہ اصل نہ اس کا کوئی نشان، جیسا کہ یہ لوگ اُن کے خالی گھروں سے مشاہدہ کرتے ہیں، جن کو وہ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ لوگ اُن میں چلتے پھرتے ہیں، البتہ اُن میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جن کی عقلیں صحیح اور درست، مستقیم اور سچی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤١)
[2] فتح البيان (٨/ ٢٩٢)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٧١)

الصُّدُوْرِ ﴾ [الحج: ٤٦] ''کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے، یا کان (ہوتے) جن سے وہ سنتے، پس بے شک قصہ یہ ہے کہ (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔'' سورت الم سجدہ میں یوں فرمایا ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ [السجدة: ٢٦] ''کیا ان پر واضح نہیں ہوا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی اُمتیں ہلاک کر دیں، جن کے گھروں میں (اب) وہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک اس میں عظیم نشانیاں ہیں، کیا پھر وہ سنتے نہیں؟''[1] (كذا في ابن كثير)

ہمزۂ استفہام تقریع وتوبیخ کے لیے ہے اور جو مستأنفہ ہے تقریر ماقبل کے واسطے۔ حرفِ فا عطف کا ہے، اس کا معطوف علیہ محذوف ہے، یعنی ''اغفلوا فلم يهدلهم''۔ ''يهد'' اصل میں ''يهدي'' ہے، ''لم'' کے سبب سے حرفِ یا گر گیا ہے، ''يهدي'' یہاں لازم بمعنی ''يتبيّن'' ہے۔ اس کا فاعل مصدر ہے جو ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ سے لیا گیا ہے۔ یعنی ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ اگرچہ فعل میں یہاں کوئی حرفِ مصدری نہیں ہے جس سے مصدر بن جائے، لیکن رعایتِ معنوی کی وجہ سے حرفِ مصدری کے بغیر فعل سے مصدر لے لیا گیا ہے، اس سے کوئی مانع نہیں۔ ''کم''، خبریہ بہ معنی ''كثيرا'' ہے، یہ مفعول بہ ہے ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ کا اور اس کی تمییز محذوف ہے، یعنی ''قرنا'' اور ''من القرون'' اس محذوف کی صفت ہے، یعنی ''قرنا كائنا من القرون''۔ ضمیر ''لهم'' سے مراد کفارِ مکہ ہیں۔ ﴿ يَمْشُوْنَ ﴾ اس ضمیر سے حال ہے۔

﴿ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ﴾ کی ضمیر اُممِ ماضیہ (گذشتہ امتوں) کی طرف پھرتی ہے۔ ان سے مراد اصحابِ حجر، یعنی ثمود وقومِ لوط ہیں۔ اہلِ مکہ شام وغیرہ کی طرف تجارت کے واسطے سفر کرتے تو اقوامِ مذکورہ کے مقامات ان کی راہ میں پڑتے تھے۔ معنی یہ ہیں کیا اہلِ مکہ غافل ہوگئے ہیں سو ان کے لیے ظاہر نہ ہوا کہ ہم نے ان سے پہلے گذشتہ امتوں کے بہت سے قرنوں کو ہلاک کیا، حالانکہ یہ لوگ شام اور دوسرے مقامات کے سفر کے دوران میں اُن کے گھروں میں چلتے پھرتے ہیں تو اُن سے عبرت حاصل کریں، یعنی انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ پاک نے ان کو تباہ کر دیا، اُن کے مکانات خالی پڑے ہوئے ہیں، کسی کا اُن میں سے اَتا پتا نہیں رہا، سب کے سب برباد ہوگئے۔ اُن کو چاہیے کہ ان کا حال دیکھ کر رسول کی تکذیب سے باز آئیں، تاکہ جو بلا اُن پر نازل ہوئی، وہ اِن پر نازل نہ ہو کہ یہ بھی اُن کی طرح ہلاک ہو جائیں۔

یا ﴿ يَمْشُوْنَ ﴾ حال ہے مفعول ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ سے، یعنی کیا ظاہر نہ ہوئی مکے والوں کے لیے خبر ان قرنوں کی، جن کو ہم نے ہلاک کیا، اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں چلتے پھرتے تھے کہ اچانک اُن پر عذاب آیا اور اُن

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٧)

کو ہلاک کر ڈالا۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں اس معنی کو ظاہر کیا ہے۔[1] یا فاعل ﴿ يَهْدِ ﴾ کا اللہ پاک ہے بدلیل قراءت نون کے۔ اس کو زید نے یعقوب سے روایت کیا ہے۔ امام نسفی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سلمیٰ نے بھی نون کے ساتھ پڑھا ہے۔[3] یا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا قرآن شریف ہے۔ اس قول کو امام خازن رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[4]

ان وجوہ کی بنیاد پر ﴿ يَهْدِ ﴾ متعدی ٹھہرے گا بہ معنی "یبین" اور مابعد کا جملہ یعنی ﴿ كَمْ اَهْلَكْنَا... الخ ﴾ اس کی تفسیر کرے گا، یعنی کیا نہیں بیان کر دیا اللہ پاک نے، یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یا قرآن شریف نے اہلِ مکہ کے لیے کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنے قرن ہلاک کر ڈالے۔ یا فاعل ﴿ يَهْدِ ﴾ کا وہی جملہ ہے جو اس کے بعد مذکور ہے، یعنی ﴿ كَمْ اَهْلَكْنَا... الخ ﴾ اور مفعول محذوف ہے، یعنی کیا نہیں بیان کیا مکہ والوں کے لیے اس بات نے کہ ہم نے اُن سے پہلے بہت سے قرن ہلاک کر ڈالے، تاکہ دوسروں کو عبرت اور نصیحت ہو۔ بصریوں نے اس بات کا انکار کیا ہے، کیوں کہ جملے فاعل نہیں پڑتے ہیں۔ غیر بصری اس کو جائز بتاتے ہیں۔ قفال نے کہا ہے کہ ہلاک شدہ قرون کی اکثریت کو مکہ والوں کے واسطے مبین ٹھہرایا۔ اس قول کا حاصل بھی وہی ہے کہ ﴿ يَهْدِ ﴾ کا فاعل جملہ مذکورہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول خطا ہے، اس لیے کہ "کم" استفہام ہے تو اس کا ماقبل اس میں عمل نہ کرے گا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کیا ظاہر نہ ہوا ان کے واسطے اُن لوگوں کو ہلاک کرنے کا معاملہ، جن کو ہم نے ہلاک کیا۔ حقیقت اس کی "ھدی" پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا "ھدی" وہی فاعل ہے اور کہا کہ "کم" موضع نصب میں ہے ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ اس کا ناصب ہے۔[5]

بیضاوی شریف کی عبارت یہ ہے: "﴿ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ ﴾ مسند إلى الله تعالىٰ أو الرسول أو ما دل عليه ﴿ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ ﴾ أي أهلكنا إياهم، أو الجملة بمضمونها والفعل على الأولين معلق يجري مجرى أعلم ويدل عليه القراءة بالنون"[6] یعنی ﴿ يَهْدِ ﴾ کا فاعل اللہ پاک ہے، یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یا ﴿ يَهْدِ ﴾ کا فاعل وہ شے ہے جس پر ﴿ كَمْ اَهْلَكْنَا ﴾ دلالت کرتا ہے، یعنی "إهلاكنا إياهم" اس صورت میں جملہ مثل جملہ مفسرہ کے ہوگا واسطے اس کے اور مفعول محذوف ہوگا، یعنی سبیل الاعتبار والاتعاظ۔ یا فاعل جملہ ہے مع اپنے مضمون کے، یعنی لفظ جملہ جو اس کے معنی پر دال ہے۔ یہ قول کوفیوں کے مذہب کی بنا پر ہے۔ بصری جملے کے فاعل ہونے کو جائز نہیں رکھتے۔ یہ چار قول ہوئے اور فعل، یعنی ﴿ يَهْدِ ﴾ دو پہلے اقوال کی بنا پر معلق ہوگا قائم مقام اعلم کے، یعنی کلمہ "هداية" اگرچہ افعالِ قلوب سے نہیں ہے، مگر ہدایت کو متضمن ہونے کے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٣٨) فتح البيان (٨/ ٢٩٢) [2] تفسير النسفي (٣/ ٧١) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٢٦٠)
[4] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٦) [5] تفسير القرطبي (١١/ ٢٦٠) فتح القدير (٣/ ٥٣٨) [6] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦)

سبب سے اعلام وتبیین کے معنی کو افعالِ قلوب کے قائم مقام کیا گیا ہے۔تعلیق افعالِ قلوب کی خصوصیات سے ہے۔ تعلیق وجوبِ ابطالِ عملِ افعالِ قلوب کو کہتے ہیں، لفظاً نہ معنی بسببِ وقوعِ افعالِ قلوب کے معنی استفہام سے پہلے اور قبل نفی کے جو اُن کے معمول پر داخل ہے اور قبل لام ابتدا کے جو اُن کے معمول پر داخل ہے۔قراءتِ نون اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فعل معلق ہے، پس جملہ نہ فاعل ہے نہ فاعل پر دال ہے۔ انتھی.

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی ﴾ یہ قول تعلیل ہے انکار کی اور تقریر ہے ہدایت کی اور ﴿ ذٰلِکَ ﴾ کا مضمون ﴿ اَھْلَکْنَا ﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ "نھی" "نھیة" کی جمع ہے۔ "نھیة" عقل کو کہتے ہیں، اس لیے کہ عقل اپنے صاحب کو بُری باتوں سے منع کرتی ہے۔آیات سے مراد عبرتیں ہیں، یعنی بے شک قرنوں کے بہ کثرت ہلاک کرنے میں البتہ عبرتیں ہیں عقل والوں کے لیے۔کون عقل جو تغافل، بے خبری اور کور پنے سے روکتی ہے، یا وہ عقل والے کہ جس وقت تامل وتفکر کریں گے، سوچیں گے، سمجھیں گے تو جان لیں گے کہ ان کا جڑ سے اُکھاڑ ڈالنا ہلاک و تباہ کر دینا، اُن کے کفر کے سبب سے تھا۔تو ان کو چاہیے کو وہ ایسا نہ کریں جیسا انھوں نے کیا۔

﴿ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ۝١٢٩ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝١٣٠ ﴾

اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی سے (طے) نہ ہو چکی ہوتی اور میعاد مقرر بھی (نہ ہوتی) تو (انھیں عذاب) چمٹ کے رہتا (129) لہٰذا جو کچھ وہ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کیجیے اور طلوعِ شمس سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی تسبیح کیجیے، اور دن کے (دونوں) حصوں میں بھی، تاکہ آپ راضی ہو جائیں (130)

صبر اور نمازِ پنج گانہ کا حکم:

آخرت کے وعدے پر مسلمانوں اور کافروں میں ایک بات مقرر ہوئی۔نمازوں کے اوقات پھر پھر کے آتے ہیں سوائے پہلے پہر کے اور تو راضی ہوگا، یعنی اُمت کو دنیا میں مدد ہوگی اور آخرت میں تیری سفارش سے گناہوں کی بخشش ہوگی۔

کلمہ سابقہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ پاک کسی کو عذاب نہیں کرتا مگر حجت قائم ہونے کے بعد۔ ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد وہ مدتِ معین ہے جو اللہ پاک نے ان جھٹلانے والوں کے لیے مقرر فرمائی ہے، یعنی اگر اللہ پاک کی طرف

سے یہ دو باتیں نہ ہوتیں تو ناگہاں اُن پر عذاب آجاتا اور اسی لیے اپنے نبی کریم ﷺ کو تسلی دینے کے لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ جو تم کو جھٹلاتے ہیں، لہٰذا تم اس پر صبر کرو۔ قبل طلوعِ شمس سے مراد نمازِ فجر اور قبل غروبِ شمس سے مراد نمازِ عصر ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ نے چودھویں کے چاند کی طرف نظر فرمائی۔ پھر فرمایا: بے شک تم عن قریب اپنے رب کو دیکھو گے، جس طرح تم اس چاند کو دیکھتے ہو۔ «لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهِ» یعنی اس حال میں کہ تم اس کے دیکھنے میں ازدحام نہیں کرتے ہو، یعنی بلا تکلف دیکھتے ہو، اس کے دیکھنے میں تم کو کسی طرح کی کلفت و مشقت نہیں ہوتی، پھر اگر تم اس بات کی طاقت رکھو کہ سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے نماز پر مغلوب نہ ہو جاؤ تو تم کرو، یعنی نماز ادا کرو۔ پھر یہ آیت پڑھی۔[1]

عمارہ بن رویبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، فرماتے تھے کہ ہرگز داخل نہ ہوگا آگ میں کوئی شخص جس نے سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے نماز پڑھی۔[2] (رواہ الإمام أحمد و رواہ مسلم من حدیث عبد الملك بن عمیر به) مسند وسنن میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اہلِ جنت کا ادنیٰ اپنی منزلت کے اعتبار سے وہ شخص ہے جو اپنی ملکیت کو دو ہزار سال کی مسافت دیکھے گا، جس طرح قریب کے کنارے کو دیکھے گا، بے شک اپنی منزلت کے لحاظ سے اُن کا اعلیٰ شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف دن میں دو بار نظر کرے گا۔[3]

﴿ اٰنَآئِ الَّیْلِ ﴾ سے مراد شب کی گھڑیاں ہیں۔ ﴿ فَسَبِّحْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان میں تہجد پڑھو۔ بعض نے اس کو مغرب اور عشا کی نماز پر محمول کیا ہے اور "آناء النھار"، "آناء الیل" کے مقابلے میں ہے۔ ﴿ لَعَلَّكَ تَرْضٰی ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ﴾ [الضحیٰ: ٥] ''اور جلد آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' صحیح میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے جنت والو! وہ کہیں گے: "لبیك ربنا و سعدیك"، یعنی ہم حاضر ہیں۔ پھر فرمائے گا: کیا تم راضی ہوئے؟ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں کیا ہے کہ ہم راضی نہ ہوں، حالانکہ تو نے تو ہم کو وہ عطا کیا ہے جو تو نے اپنی خلق میں سے کسی کو نہیں دیا۔ پھر فرمائے گا کہ میں تو تم کو اس سے افضل دوں گا۔ وہ کہیں گے: اس سے افضل اور کیا ہے؟ پس فرمائے گا کہ میں تم پر

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٢٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٣٣)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٣٤) مسند أحمد (٤/ ١٣٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٥٥٣) مسند أحمد (٢/ ١٣) اس کی سند میں ''ثویر بن ابی فاختہ'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ١٣٨١)

اپنی رضا اتاروں گا۔ لہٰذا میں اس کے بعد تم پر کبھی خفا نہ ہوں گا۔[1]

دوسری حدیث میں یوں ہے: اے جنت والو! بے شک تمھارے واسطے اللہ کے پاس ایک موعد ہے، وہ چاہتا ہے کہ وہ اس وعدے کو تمھارے واسطے پورا کرے، وہ کہیں گے: وہ کیا ہے؟ کیا اس نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کر دیا اور ہمارے موازین (اعمال کے وزن) کو بھاری نہیں کیا اور آگ سے ہم کو دور نہیں کیا اور جنت میں داخل نہیں کیا؟ پھر وہ پردہ کھول دے گا تو وہ اس کی طرف نظر کریں گے۔ پس قسم ہے اللہ کی! کہ اُن کو کوئی شے عطا نہیں کی جو اس کی طرف نظر کرنے سے بہتر ہو اور یہی نظر زیادت ہے، یعنی ''حسنیٰ و زیادۃ'' میں جو زیادہ ہے، اس سے مراد یہی اللہ کا دیدار فائض الانوار ہے۔[2] اللهم ارزقنا. (كذا في ابن كثير)

کلمۂ سابقہ سے مراد اللہ پاک کا یہ وعدہ ہے کہ اس اُمت کو یومِ آخرت تک عذاب نہیں کرے گا۔[3] (قاله المحلي والشوكاني و البيضاوي والنسفي)۔ لزام مصدر ہے ''لازم يلازم ملازمة'' کا۔ صراح میں ہے: ''يقال لزمت الشيء ولزمت به ولازمته لزاما و ملازمة لزاما أيضاً ملازم'' مختار الصحاح میں ہے: ''لزمت الشيء بالكسر لزوما و لزاما و لزمت به لازمته و اللزام الملازم''[4] انتهی. لزوم کے معنی لازم بودن چیزے ہیں۔ غرض یہ کہ ''لزام'' کا فعل ''لازم'' و ''لزم'' دونوں طرح آتا ہے، اسی لیے امام نسفی رحمہ اللہ نے مصدر ''لزم'' کہا ہے اور شوکانی اور حفناوی رحمہما اللہ نے مصدر ''لازم'' بتایا ہے، یہاں بمعنی لازم ہے ''وأجل مسمى'' معطوف کلمۃ پر۔ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابو البقاء بھی اسی کے قائل ہیں۔ مختارِ خازن بھی یہی ہے۔[5] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اول اسی کو لکھا ہے، مراد اس سے روزِ قیامت ہے یا روزِ بدر۔[6]

﴿لَكَانَ﴾ کی ضمیر اہلاک و اخذِ عاجل کی طرف پھرتی ہے، سیاقِ کلام اس پر دال ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کا وعدہ اس امت کی تاخیرِ عذاب کا دورِ آخرت تک نہ ہوتا اور روزِ قیامت اور روزِ بدر نہ ہوتا تو البتہ اُن کے گناہوں کی سزا اور عذاب دنیا ہی میں اُن کو لازم ہو جاتا، جس طرح کہ گذشتہ قرنوں کو لازم ہو چکا ہے، وہ عذاب ان سے کسی حال میں دور نہ ہوتا، ان کے ہلاک کر ڈالنے میں کچھ دیر نہ ہوتی، فی الفور ہلاک کر دیے جاتے، جیسا عذاب عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا ویسا ہی ان کافروں کو بھی لازم ہو جاتا۔ رہی یہ بات کہ جب ﴿وَاَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ کا عطف

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٩)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٥٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٨)

(3) تفسير الجلالين (١/ ٤١٨) فتح القدير (٣/ ٥٣٨) تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦) تفسير النسفي (٣/ ٧١)

(4) مختار الصحاح (١/ ٦١٢)

(5) تفسير النسفي (٣/ ٧١۔ ٧٢) فتح القدير (٣/ ٥٣٨) معاني القرآن (٣/ ٣٨٠) تفسير الخازن (٤/ ٢٨٦)

(6) تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦)

﴿ كَلِمَةٌ ﴾ پر ہوا تو یوں چاہیے تھا کہ "لكان لزاما" "لولا" کی جزا اس کے بعد ہوتی۔ لہٰذا اس کا نکتہ یہ ہے کہ منظور اس بات کا بتانا ہے کہ نفی لزومِ عذاب میں ﴿ كَلِمَةٌ ﴾ اور ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ ہر ایک ان میں سے مستقل ہے۔

یہ استقلال اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ موخر ہو، اگر یہ مقدم ہوتا اور جزا موخر ہوتی تو اس بات کا وہم ہوتا کہ نفیِ لزومِ عذاب میں کلمۂ سابقہ تو مستقل ہے اور ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ بالتبع ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ کا عطف ضمیر مستقر پر ہے، جو ﴿ لَكَانَ ﴾ میں ہے اور اخذ و عاجل کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی اگر نہ ہوتا کلمہ جو تیرے رب سے سابق ہو چکا ہے تو البتہ اخذِ عاجل اور اجلِ مسمی، یعنی مدتِ مقرر دونوں کفارِ مکہ کو لازم ہو جاتے، جیسے یہ دونوں عاد و ثمود کو لازم ہو چکے ہیں۔ اس قول کو امام زمخشری رحمہ اللہ نے جائز کہا ہے اور محلی نے اختیار کیا ہے۔[1]

فتح القدیر و فتح البیان میں اس کو تعسف ظاہر کیا ہے، یعنی اس میں تکلف ہے۔[2] ظاہر تر قول اول ہے۔ رہی یہ بات کہ ضمیر مستتر پر بدون تاکید کے عطف درست نہیں ہے، پس اس کا جواب یوں دیا ہے کہ ﴿ لَكَانَ لِزَامًا ﴾ کی فصل قائم مقام تاکید کے ہے، اس لیے عطف جائز ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قول کی بنیاد پر اہلاکِ عاجل اور اجلِ مسمی دونوں کی خبر میں ﴿ لِزَامًا ﴾ واقع ہوا ہے، حالانکہ "لزام" لفظ مفرد ہے۔ لہٰذا اس کی یہ وجہ ہے کہ "لزام" مصدر ہے۔ مصدر میں واحد و تثنیہ و جمع و مذکر و مؤنث برابر ہوتا ہے۔ اب ایک امر اور رہا، وہ یہ ہے کہ "لزام" مصدر ٹھہرا اور عقاب کا وصف واقع ہوا، اسی لیے اس کو بہ معنی لازم کہا ہے۔ پس لازم ہی کہہ دیا ہوتا، اس چکر کی کیا وجہ ہے؟ نکتہ اس کا یہ ہے کہ جو مبالغہ اس میں ہے وہ لازم میں نہیں ہے۔ یعنی وہ عذاب ان کو ایسا لازم ہو جاتا کہ مارے لزوم کے خود لزوم بن جاتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس میں ایک اور قول نقل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ لزام اسمِ آلہ ہے۔[3]

کشاف میں کہا ہے: "أي كأنه آلة للزوم لفرط لزومه"۔ بسبب فرطِ لزومِ لازم کے لازم کا نام لزام رکھ دیا، جس طرح کہ عرب کا قول ہے: "لزاز خصم"[4] یعنی جس طرح کہ "لزاز" اسمِ آلہ ہے، اس کے ساتھ "ملزم" کا نام رکھ دیا ہے۔ قاموس میں ہے کہ "لزاز" بروزن کتاب ایک لکڑی ہے، جس سے دروازہ ملایا جاتا ہے۔ صراح میں اس کا ترجمہ پشتی بان کیا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ "لزاز" سریش کو کہتے ہیں، غرضیکہ "لزاز" اصل میں اسمِ آلہ ہے، کیونکہ پشتی بان دروازہ ملانے کا آلہ ہے اور سریش چپکانے کا آلہ ہے۔ اب اس شخص کا نام رکھ دیا جو اپنے خصم سے چپکا رہتا ہے، بغایت اس سے جھگڑتا ہے، گویا اپنے خصم کا سریش بن گیا ہے، اسی طرح لزوم آلۂ لزوم ہے واسطے فرطِ لزوم کے، لازم کا نام لزام رکھ دیا ہے، اب بتاؤ جو حُسن و خوبی لزام میں ہے، وہ لازم میں کہاں ہے؟! ابو البقاء

[1] الكشاف (٣/ ٩٦) تفسير الجلالين (١/ ٤١٨)
[2] فتح القدير (٣/ ٥٣٨) فتح البيان (٨/ ٢٩٣)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦)
[4] الكشاف (٣/ ٩٦)

نے کہا ہے: جائز ہے کہ لزام لازم کی جمع ہو، جیسے قیام قائم کی جمع ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے جو لزام کا ترجمہ بھینٹا فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ نے ابو البقاء کے قول کو پسند کیا ہے، کیونکہ بھینٹے کو جمعیت لازم ہے۔ بھینٹا یہی ہے کہ دو گروہ کی اتفاقاً بھینٹ ہو جائے، باہم مل جائیں، آپس میں لڑیں بھڑیں اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد روزِ بدر رکھا ہے، کیونکہ آپ کا فرمان اس کی شہادت دیتا ہے کہ آخر وعدے پر بھینٹا ہوا مکانوں میں اور کافروں میں۔ الخ یعنی اگر علمِ الٰہی میں اُن کی ہلاکت کے لیے بدر کا دن معین نہ ہوتا تو جو بھینٹا اس دن ہوا، وہ ابھی ہو جاتا۔ واللّٰه أعلم.

امام ابن ابی حاتم و ابن منذر رحمہما اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے: ”هذا من مقاديم الكلام، يقول: لولا كلمة و أجل مسمى لكان لزاما“[1] یعنی اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے۔ ”أجل مسمى“ پہلے ہے اور ”لكان لزاما“ بعد میں۔ اس قول سے معلوم ہوا کہ ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ کا عطف ﴿ كَلِمَةٌ ﴾ پر ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام سدی رحمہ اللہ سے بھی قولِ مذکور کی طرح روایت کیا ہے۔[2] امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ لِزَامًا ﴾ کی تفسیر میں یہ ہیں: ”لكان لزاما، قال: موتا“[3] یعنی لزام کے معنی موت ہیں۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: ”الأجل المسمّٰى الكلمة التي سبقت من ربك“[4] یعنی ﴿ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ سے مراد کلمۂ سابقہ ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ ان کو عذاب کے ساتھ اس طرح ہلاک نہ کرے گا کہ ان کا استیصال ہو جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی کافر لوگ جو تم کو ساحر، کذاب، شاعر اور کاہن کہتے ہیں اور اس کی طرح کے اور باطل طعنے دیتے ہیں تو اس پر صبر کرو، یعنی ان کی کچھ پروا مت کرو، کیونکہ ان کے لیے ایک وقت مقرر ہے، اس میں کسی طرح کا تقدم اور تاخر نہ ہوگا، ان کو ضرور عتاب کیا جائے گا، اس لیے تم تسلی رکھو اور صبر کرو۔ اس آیتِ کریمہ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ آیتِ قتال سے یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ امام محلی و خازن رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔[5]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس قول کو بصیغۂ ”قیل“ ذکر فرمایا ہے۔[6] امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا۔[7] دوسرا قول یہ ہے کہ محکم ہے، یعنی منسوخ نہیں ہوئی۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا معنی یہ ہیں کہ جب ہم اُن کو

[1] یہ الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔ دیکھیں: تفسير الطبري (١٨/ ٣٩٩) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤١) الدر المنثور (٥/ ٦١٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤١)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٤٠٠) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤١)

[4] الدر المنثور (٥/ ٦١١)

[5] تفسير الجلالين (١/ ٤١٩) تفسير الخازن (٤/ ٢٨٦)

[6] فتح القدير (٣/ ٥٣٩)

[7] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦۔ ٧٧) تفسير النسفي (٣/ ٧٢)

جلدی عذاب نہ کریں گے تو تم صبر کرو۔ حرفِ فا سببیہ ہے اور صبر سے مراد عدمِ اضطراب ہے بسبب اس اذیت کے جو اُن سے صادر ہوئی۔ ترکِ قتال مراد نہیں ہے کہ آیت منسوخ ہو جائے۔[1]

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ صراح میں ہے کہ تسبیح پاکی و بہ پاکی یاد کردن وصفت کردن خدا را۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر تسبیح قرآن میں صلات کے معنی میں ہے، یعنی قرآن شریف میں جہاں کہیں تسبیح کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد نماز ہے۔ اسی لیے محلی، بیضاوی اور نسفی رحمہم اللہ اور دیگر مفسرین نے "سبح" کی تفسیر "صل" کے ساتھ کی ہے۔[2] ﴿ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ حال ہے، یعنی تم اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ ملتبس ہو کر نماز پڑھو۔ حمد اس بات پر کرو کہ اس نے تم کو ہدایت کی راہ بتائی، توفیق دی، یعنی تسبیح کی توفیق دی اور اس پر تمھاری اعانت فرمائی۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تم پاکی بیان کرو اپنے رب کی شرک سے اور اُن ناقص باتوں سے جن کو کافر اور مشرک اللہ پاک کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس حال میں کہ تم اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے ہو اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت کے ساتھ ممتاز فرمایا اور اس بات کا اقرار اور اعتراف کرتے ہوئے کہ ساری نعمتوں کا عطا کرنے والا وہی ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیتِ کریمہ سے مراد پانچوں نمازیں ہیں، اس لیے کہ ﴿ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ ﴾ اشارہ ہے نمازِ فجر کی طرف اور ﴿ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ﴾ اشارہ ہے عصر کی نماز کی طرف اور ﴿ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ ﴾ سے مراد نمازِ عشا ہے۔ ﴿ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ سے مراد ظہر و مغرب کی نمازیں ہیں۔ مغرب کا دن کی طرف میں ہونا تو ظاہر ہے۔ ظہر کا دن کی طرف میں ہونا اس لیے ہے کہ ظہر اول دن کی طرف کے آخر میں اور آخر دن کی طرف کے شروع میں ہے۔ کسی نے کہا کہ نمازِ ظہر کی طرف اشارہ ﴿ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ﴾ سے ہے، کیونکہ ظہر و عصر کی نمازیں سورج ڈوبنے سے پہلے ہیں۔ یہ استنباط پانچوں نمازوں کا اس طریقے سے صاحبِ فتح القدیر نے کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد نفل نماز ہے، اس لیے کہ تسبیح اور سبحہ کا اطلاق حدیث شریف میں کئی جگہ نفل نماز پر آیا ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ اس آیتِ کریمہ میں نماز کی طرف اشارہ نہیں ہے، بلکہ مراد تسبیح سے ان وقتوں میں سبحان اللہ کہنا ہے تو یہ قول صواب سے دور نہ ہوگا۔ تسبیح کا اطلاق اگرچہ نماز پر ہوتا ہے، لیکن یہ اطلاق مجاز ہے اور حقیقت اولیٰ ہے مگر بسبب کسی قرینے کے جو اس کو مجازی معنی کی طرف پھیر دے۔[3]

محلی نے پانچوں نمازوں کا یوں استنباط کیا ہے کہ ﴿ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ ﴾ سے مراد نمازِ صبح اور ﴿ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ﴾ سے نمازِ عصر اور ﴿ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ سے نمازِ مغرب و عشا اور ﴿ اَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ سے نمازِ ظہر، اس لیے کہ

---

[1] حاشية الشهاب (٦/ ٢٣٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤١٩) تفسير البيضاوي (٤/ ٧٦) تفسير النسفي (٣/ ٧٢)

[3] فتح القدير (٣/ ٥٣٩)

ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے داخل ہوتا ہے، لہٰذا وہ دن کے نصف اول کا طرف ہے اور نصفِ ثانی کا طرف ہے۔[1]

اس قول کی بنا پر جمع سے مراد ما فوق الواحد ہوگا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں تقریر کی ہے کہ ﴿ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ ﴾ سے مراد نمازِ فجر ﴿ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ﴾ سے نمازِ ظہر وعصر، کیونکہ یہ دونوں آخر دن میں ہیں یا اس سے مراد اکیلی نمازِ عصر ہے۔

﴿ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ سے مغرب وعشا مراد ہیں۔ رہی یہ بات کہ اول میں ''سبح'' مقدم ہے اور ظرف مؤخر ہے اور یہاں ظرف، یعنی ﴿ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ کو مقدم کیا اور ﴿ فَسَبِّحْ ﴾ کو مؤخر تو اس کا نکتہ یہ ہے کہ رات کی ساعتیں مزید فضیلت کے ساتھ مختص ہیں، کیوں کہ اس وقت میں دل جمعی زیادہ تر ہوتی ہے اور نفس زیادہ تر استراحت کی طرف مائل ہوتا ہے، پس اس وقت میں عبادت زیادہ تر سخت ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ﴾[2] [المزمل: ٦] ''بلاشبہہ رات کا اُٹھنا (نفس کے) کچلنے میں زیادہ سخت اور دعا و ذکر کے لیے مناسب تر ہے۔''

غرض یہ کہ پانچ نمازیں تو پوری ہوگئیں اب ﴿ اَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ سے مراد صبح اور مغرب کی نماز ہے، ان کو خصوصی اہمیت دینے کے ارادے سے دوبارہ ذکر کیا ہے، جس طرح بعض کے نزدیک ﴿ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ میں نمازِ فجر کی خصوصیت کے لیے دوبارہ ذکر کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ دن کی دو طرفیں ہیں، جمع کا لفظ کیوں ذکر کیا؟ پس یہ اس لیے ہے کہ یہاں التباس (شک وشبہہ) سے امن ہے، جس طرح کسی شاعر کے قول میں ظہور الترسین واقع ہوا ہے۔ ظہر بہ معنی پشت اور ترس ڈھال کو کہتے ہیں۔ دو ڈھالوں کی دو پشت ہوں گی نہ کہ کئی پشت، لیکن بہ سبب عدمِ التباس کے جمع کو تثنیہ کی طرف مضاف کر دیا۔ یا مراد اطراف النہار سے امر ہے نمازِ ظہر کا، اس لیے کہ ظہر کا وقت دن کے نصف اول کا آخری حصہ اور نصف آخر کا ابتدائی حصہ ہے۔ اس قول کی بنا پر جمع کا صیغہ باعتبار دو نصف کے ہوگا مثل ظہور الترسین کے، یا اس لیے کہ نہار جنس ہے، یا مراد اس سے دن کے اجزاء میں نفل پڑھنے کا حکم ہے۔ ﴿ اٰنَآئِ ﴾ جمع ہے ''إنا'' ہمزہ کی زیر اور قصر کے ساتھ ہے، یا جمع ہے ''أناء'' کی زبر و مد کے ساتھ، جیسا کہ تفسیر بیضاوی میں ہے۔[3]

جیسے ''مِعٰی'' میم کی زیر کے ساتھ بہ معنی آنت اس کی جمع ''أمعاء'' آتی ہے۔ ''مِعٰی'' محذوف اللام ہے، اس کا وزن ''فِعا'' فا کی زیر کے ساتھ ہے۔ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ بہ معنی ''فِيْ'' ہے۔ جار مجرور ﴿ فَسَبِّحْ ﴾ سے متعلق ہے اور حرفِ فا زاید ہے۔ (قاله الحفناوي) مختار میں کہا ہے کہ ﴿ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ کے معنی ساعاتِ لیل ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا واحد ''إنا'' مثل ''معی'' ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا واحد ''أنی'' و ''أنو'' ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''مضی من اللیل أنوان و أنیان''[4] یعنی رات کی دو گھڑیاں گزر گئیں۔ امام شہاب رحمہ اللہ

---

[1] تفسیر الجلالین (١٠/ ٤١٩)
[2] تفسیر البیضاوي (٤/ ٧٧)
[3] تفسیر البیضاوي (٤/ ٧٧)
[4] مختار الصحاح (١/ ٢٠)

نے کہا ہے کہ ﴿ فَسَبِّحْ ﴾ کے حرفِ فا میں تین وجہیں ہیں: یا عاطفہ ہے مقدر پر، یا جواب شرطِ مقدر میں واقع ہے، یا زائد ہے۔[1] اور ﴿ اَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ معطوف ہے ﴿ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ کے محل پر اس کا محل نصب ہے، ناصب اس کا ﴿ فَسَبِّحْ ﴾ ہے، جس میں فائے زائدہ ہے، یعنی "صَلِّ فِي أطراف النهار" (قاله الحفناوي)

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عام لوگ اس کے نصب پر ہیں، یعنی جمہور کی قراءت نصب ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ معطوف ہے ﴿ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ کے محل پر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ معطوف ہے ﴿ قَبْلَ ﴾ پر۔ "وسبح في أطراف النهار لعلك ترضى" جمہور کی قراءت بصیغۂ معروف ہے۔ یہ حال ہے "سبح" کی ضمیر سے، یعنی تو نماز پڑھ، یا تسبیح کر اس حال میں کہ اس چیز کی اُمید اور طمع رکھنے والا ہو کہ اللہ پاک تجھ کو اس ثواب سے جو تجھے دے گا، راضی کرے گا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو تسبیح کر ان وقتوں میں اس بات کی اُمید پر کہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس وہ چیز پائے، جس سے تیرا جی راضی ہو۔ اس کو بصیغۂ مجہول بھی پڑھا ہے "أرضى" سے، یعنی تجھے تیرا رب راضی کرے گا۔[2] یہ قراءت کسائی و ابوبکر کی ہے عاصم سے۔[3] چوں کہ "لعل" واسطے ترجی کے ہے اور ترجی اللہ پاک پر محال ہے، اس لیے علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لعل" مخاطب کے لیے ہے۔[4] یعنی یہاں ترجی بہ نسبت مخاطب کے ہے، متکلم کی جانب سے نہیں ہے۔

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۳۱ ﴾

اور (اے نبی!) ان چیزوں کی طرف آپ اپنی نگاہیں نہ اُٹھائیں جو چیزیں زندگانیِ دنیا کی آرایش کی ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں، تاکہ ہم انھیں ان کے ذریعے سے آزمائیں، اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے (131)

مالداروں کے عیش و آرام کو مت دیکھو:

اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد ﷺ سے فرماتا ہے کہ جس عیش و آرام میں یہ مترفین اور اُن جیسے اور لوگ ہیں تم اس کی طرف نظر مت کرو، کیوں کہ وہ تو ایک ایسی رونق ہے جو زائل ہونے والی ہے اور ایسی نعمت ہے جو جاتی رہنے والی ہے، یہ جو کچھ اُن کو دیا گیا ہے اُن کے جانچنے کو عطا کیا ہے، یعنی یہ اُن کو اس لیے نہیں ملا ہے کہ اللہ کے نزدیک اُن کی کچھ قدر و منزلت ہے، بلکہ یہ ان کو آزمانے کے لیے دیا ہے کہ دیکھیں وہ اس میں کیا کرتے ہیں، شکر بجا لاتے ہیں یا ناشکری۔ طاعات میں خرچ کرتے ہیں یا معاصی میں، ہدایت پاتے ہیں یا گمراہ ہوتے ہیں، فخر و تکبر کرتے ہیں یا

[1] حاشية الشهاب (٦/ ٢٣٣) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٥٠) [3] فتح القدير (٣/ ٥٣٩) [4] تفسير النسفي (٣/ ٧٢)

تواضع اور فروتنی سے پیش آتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [سبا: ١٣] ''اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔'' یہ اس لیے ہے کہ کوئی بندہ اللہ پاک کی نعمتوں سے خالی نہیں ہے۔ دن رات بارانِ رحمت ونعمت بندوں پر برستا رہتا ہے، ہر لحظہ ولحہ نعمتوں کے دریا میں غوطے مارتے ہیں۔ اوپر نیچے دائیں بائیں سب طرف سے رحم وکرم گھیرے ہوئے ہے، اگر غور سے دیکھو تو خود بندہ فی نفسہٖ اللہ پاک کی ایک نعمت ہے اور نعمتوں کا کیا ذکر ہے۔ پھر کسی پر کثرت کے ساتھ نعمت ہے، کسی پر ذرا کم۔ کسی پر نعمت کا موسلا دھار مینہ پڑ رہا ہے، کسی پر شبنم کی طرح نعمت کے قطرے پڑ رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق منعمِ حقیقی کے خوان سے طرح طرح کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔

نعمتوں کی یہ زیادتی وکمی ایک حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، مگر باوجود اس بات کے کہ نعمتیں متواتر اور یکے بعد دیگرے مل رہی ہیں، ان نعمتوں کے شکر گزار انتہائی کم تعداد میں ہیں، کیوں کہ شکر اس کا نام نہیں ہے کہ زبان سے کر لیا، بلکہ حقیقی شکر یہ ہے کہ جو نعمت جس واسطے دی گئی ہے اسی واسطے صَرف ہو، منعم کی مرضی کے مطابق استعمال کی جائے، اس کے حکم کے مطابق برتی جائے، اس کے برتنے میں دل کی چاہت کا دخل نہ ہو، پس حقیقت میں ایسے شکر کرنے والے نہایت کم ہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ سے مراد مالدار لوگ ہیں،[1] یعنی تو اُن کی طرف مت دیکھ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو اس سے بہتر دیا ہے کہ جو ان کو دیا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿87﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الحجر: ٨٧۔ ٨٨] ''بے شک ہم نے آپ کو بار بار دوہرائی جانے والی سات آیات اور قرآنِ عظیم دیا ہے۔ اور ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو جو مال ومتاع دیا ہے اس کی طرف آپ اپنی نظریں نہ اُٹھائیں اور نہ ان (کی حالت) پر غم کھائیں اور اپنے (پُرشفقت) بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں۔'' اور اسی طرح جو کچھ اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے آخرت میں ذخیرہ کر رکھا ہے، وہ ایک ایسا امرِ عظیم ہے کہ اس کی نہ حد ہو سکتی ہے نہ ہی اس کا وصف ہو سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴾ [الضحیٰ: ٥] ''اور جلد آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾

صحیح میں مروی ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بالا خانے میں داخل ہوئے کہ جس میں آپ اپنی بیویوں سے عزلت گزیں ہو گئے تھے، جب اُن سے ایلا کیا تھا تو عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا کہ آپ

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٤١)

تکیہ لگائے ہوئے بوریے کی بناوٹ پر لیٹے ہوئے ہیں اور گھر میں کچھ نہیں مگر ببول کے پتوں کا ایک ڈھیر اور لٹکے ہوئے کئی چمڑے، اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا: اے ابن خطاب! تجھے کس چیز سے رونا آ رہا ہے؟ وہ بولے: یا رسول اللہ! مقرر کسریٰ و قیصر اس شے میں ہیں کہ جس میں وہ ہیں، یعنی وہ خوب عیش و آرام میں ہیں۔ ''وأنت صفوة الله من خلقه'' یعنی اور آپ اللہ پاک کے برگزیدہ ہیں اس کی مخلوق میں سے، یعنی آپ کو تو اللہ نے اپنی رسالت و نبوت سے ممتاز فرمایا ہے اور ساری خلق پر آپ کو شرف بخشا ہے، آپ کا یہ حال ہے کہ دنیا کے ساز و سامان کا اَتا پتا نہیں اور اُن کا وہ حال کہ ناز و نعم میں ڈوبے ہوئے ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَوَ فِي شَكٍّ أَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ!» یعنی اے ابن خطاب! کیا تو شک میں ہے؟ وہ لوگ تو ایک ایسی قوم ہیں کہ ان کے لیے طیبات اُن کی زندگی میں جلدی سے دے دی گئی ہیں،[1] یعنی اُن کی عمدہ چیزیں اسی دنیا میں جلد اُن کو دے دی گئی ہیں، آخرت میں اُن کے لیے کچھ نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے بڑھ کر دنیا میں بے رغبت تھے، باوجود یہ کہ اس پر آپ قادر تھے۔ جس وقت دنیا آپ کو حاصل ہوتی تو اس کو اِدھر اُدھر اللہ کے بندوں میں خرچ کر ڈالتے تھے۔ آپ اپنی ذات کے لیے کل کے واسطے کوئی شے ذخیرہ نہیں کر رکھتے تھے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لَكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا قَالُوْا: وَمَا زَهْرَةُ الدُّنْيَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: بَرَكَاتُ الْأَرْضِ»[2] یعنی جن چیزوں کا مجھ کو تم پر خوف ہے، ان میں سے زیادہ تر خوف ناک وہ چیز ہے، جس کو اللہ تعالیٰ زہرۃ الدنیا سے تمھارے لیے کھول دے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! زہرۃ دنیا کیا ہے؟ فرمایا: زمین کے برکات۔ اس سے مراد زمین کی خوبیاں، تازگیاں اور زینت ہے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''زهرة'' سے مراد زینت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لِنَفْتِنَهُمْ ﴾ کے معنی ہیں: ''لِنَبْتَلِيَهُمْ''، یعنی تاکہ ہم اُن کو آزمائیں اور جانچیں۔[3] (كذا في ابن كثير)

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ ﴾ یہ معطوف ہے ''فاصبر'' پر۔ مد کہتے ہیں کھینچنے اور دراز کرنے کو۔ یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی نظر۔ ﴿ عَيْنَيْكَ ﴾ یعنی تم ہرگز اپنی دونوں آنکھوں کی نظر کو دراز مت کرو، تاکہ رغبت اور میل کرو۔ ﴿ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ ﴾ اس چیز کی طرف کہ لذت میں ڈال دیا ہم نے اس کے ساتھ کفار میں سے کئی قسم کے لوگوں کو۔ یہ قول امام حفناوی رحمہ اللہ کا ہے کہ ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ بمعنی ''لذذنا'' ہے اس بنیاد پر امتاع و تمتیع کے معنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٥٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٨)

ایقاع فی اللذۃ ہوں گے، یعنی لذت میں ڈال دینا۔ صراح میں کہا ہے: امتاع برخورداری دادن۔ ابو البقاء نے کہا ہے کہ وہ چیز جس سے تمتع یا انتفاع حاصل ہو کسی وجہ پر تو وہ متاع ہے اور متاع اور متعہ کی اصل وہ شے ہے جس سے انتفاعِ قلیل لیا جائے، باقی رہنے والی نہ ہو، بلکہ عن قریب ختم ہو جائے۔ زہرۃ الدنیا کے معنی نبات وغیرہ سے زینت، بہجت وحسن وخوبی اور تازگی دینا ہے۔

﴿ اَزْوٰجًا ﴾ کے نصب میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ کا مفعول بہ ہے۔ یہ وجہ واضح اور ظاہر ہے۔ ازواج کے معنی اصناف ہیں اور ﴿ مِنْهُمْ ﴾ میں حرف "من" تبیین کے لیے ہے، یعنی جس چیز کے ساتھ ہم نے اوصافِ کفار کو نفع قلیل دیا ہے، تم اس کی طرف نظر مت کرو، کیونکہ وہ فانی ہے، جلد فنا ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ضمیر "بِہٖ" سے حال ہے اور ﴿ مِنْهُمْ ﴾ مفعول بہ ہے۔ حرفِ "من" تبعیض کے لیے ہے، یعنی جس شے سے ہم نے نفع دیا ہے، حالانکہ وہ شے بعض کفار کو بطور آزمایش بعض اصناف وانواع واقسام سے ہے۔ تم اس کی طرف نظر مت کرو۔

رہی یہ بات کہ ضمیر "بہ" کی مفرد ہے اور ﴿ اَزْوٰجًا ﴾ جمع ہے۔ حال اور ذوالحال میں مطابقت نہ ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ "بہ" میں لفظ "ما" کا لحاظ کیا اور ﴿ اَزْوٰجًا ﴾ میں معنی "ما" کی رعایت کی، اس لیے اس کو بلفظ جمع ذکر کیا۔ ﴿ زَهْرَةَ ﴾ کے نصب میں نو وجہیں ہیں: اول یہ کہ ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ کا مفعول ثانی ہے، اس لیے کہ ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ میں "اَعْطَيْنَا" کے معنی شامل ہیں، لہٰذا اول مفعول تو ﴿ اَزْوٰجًا ﴾ ہے اور دوسرا مفعول ﴿ زَهْرَةَ ﴾ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ زَهْرَةَ ﴾ بدل ہے ﴿ اَزْوٰجًا ﴾ سے، اس کی بنا پر ہے کہ یا تو مضاف محذوف ہے: "أي ذوي زهرة" یا مبالغہ کی بنا پر ہے کہ اصنافِ کفار نفسِ ﴿ زَهْرَةَ ﴾ ٹھہرائے گے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کا ناصب فعل مضمر ہے، جس پر ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "جعلنا لهم زهرة". چوتھی وجہ یہ ہے کہ منصوب علی الذم ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا اور وہ نصب علی الاختصاص ہے۔[1]

پانچویں وجہ یہ ہے کہ موضع موصول سے بدل ہے۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے بنا بر بدل محل بہ سے، محل اس کا نصب ہے اور لفظ مجرور ہے، لہٰذا یہ بدل ضمیر بہ کے محل سے ہے، جس طرح یہ قول ہے: "مررت به أخاك". ساتویں وجہ یہ ہے کہ مائے موصولہ سے حال ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ آٹھویں وجہ یہ ہے کہ حال ہے "بہ" کی ضمیر سے، یہ ضمیر موصول کی طرف پھرتی ہے، معنی میں یہ وجہ مثل وجہ ماقبل کے ہے۔ نویں وجہ یہ ہے کہ تمییز ہے "ما" کی یا "بہ" کی ضمیر کی۔[2] (قاله الفراء)۔ یہ سب وجوہ سمین نے ذکر کی ہیں۔ فتح القدیر میں ایک اور وجہ لکھی ہے: جائز ہے کہ منصوب بنا پر مصدریت ہو۔ مثل "صِبْغَةَ اللّٰهِ، وَ وَعْدَ اللّٰهِ" کے۔ یعنی مفعول مطلق ہے محذوف کا: "أي زهرهم الله زهرة"

---

[1] الكشاف (٣/ ٩٨) [2] روح المعاني (١٦/ ٢٨٣۔ ٢٨٤)

عیسیٰ بن عمر اور یعقوب رحمہ اللہ نے ”زَهَرَةً“ کو ہا کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] یہ ایک لغت ہے، جس طرح کہ ”جَهْرَةً“ میں ”جَهَرَةً“ ایک لغت ہے۔ یا جمع ہے ”زاهر“ کی۔ اس قول کی بنیاد پر یہ وصف ہوگا کفار کا اس بات کے ساتھ کہ انھوں نے اپنے تنعم اور عیش و آرام اور حالات کے حسن و خوبی کے سبب سے دنیا کو زینت دی بخلاف اس حالت وشکل کے کہ جس پر مومنین زاہدین ہیں۔ فتح القدیر میں کہا کہ ”زَهَرَةً“ زبر کے ساتھ کے معنی ہیں: شگوفۂ نبات۔

﴿ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ﴾، ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ سے متعلق ہے، یعنی ہم نے کفار کو جو کچھ برتنے کو دیا ہے، لہٰذا اس لیے کہ ہم اس کو ان کے لیے فتنہ اور گمراہی ٹھہرائیں، تا کہ ہماری طرف سے ان کی آزمایش اور امتحان ہو، جیسا کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾[1] [الكهف: ٧] ”بلاشبہہ ہم نے جو کچھ روئے زمین پر ہے، اسے اس کی زینت بنایا ہے، تا کہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون زیادہ اچھا ہے۔“ یا یہ معنی ہیں، تا کہ ہم اُن سے اس شخص کا سا معاملہ کریں کہ جو اُن کو آزمائے، اُن کا امتحان لے۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں تا کہ ہم اُن کو اس کے سبب سے آخرت میں عذاب کریں۔ اس بنا پر حرفِ ”فِيْ“ سببیہ ہوگا۔ یا یہ معنی ہیں، تا کہ ہم اُن پر سختی کریں تکلیف دینے میں۔ یا یہ معنی ہیں: تا کہ ہم اس کو اُن کے لیے فتنہ کریں اس طرح سے کہ اُن کو نعمت زیادہ دیں، پھر وہ اس کے سبب سے کفرانِ نعمت کریں اور زیادہ سرکشی کریں۔

﴿ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ یعنی اللہ پاک کا جنت میں ثواب اور وہ چیز جو اس نے اپنے نیک بندوں کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر رکھی ہے، بہر حال اس سے بہتر ہے کہ وہ یعنی دنیا کی نعمتیں تو منقطع ہو جائیں گی اور یہ یعنی آخرت کی نعمتیں منقطع نہ ہوں گی اور یہی معنی ﴿ اَبْقٰى ﴾ کے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس رزق سے مراد غنیمتیں اور اس جیسی اور چیزیں ہیں جن کو اللہ پاک مومنوں پر کھول دے گا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ حقیقی خیریت اور ایسی ہیشگی جو غیر منقطع ہو، دونوں آخرت کے رزق ہی میں متحقق ہوتے ہیں۔ دنیوی رزق میں ان کا تحقق نہیں ہوتا، گو وہ حلال طیب ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ [النحل: ٩٦] ”جو کچھ تمھارے پاس ہے، وہ فنا ہو جائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ (ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے۔“ غرض یہ کہ دنیا میں حلال وحرام جو کچھ ہے، وہ فانی ہے اور اللہ کے ہاں کا سب کچھ باقی ہے۔ ؎

ساغر فانی و بزم و ساقی فانی — با ہر کہ شدی درد ملاقی فانی
بردار دل از ہستی بے بود جہاں — اللہ بود باقی و باقی فانی

”مجلس و پیالہ فانی ہیں اور پلانے والا بھی فنا ہو جانے والا ہے، جس کسی کے ساتھ تو نے محبت سے ملاقات کی، وہ بھی فنا ہو جانے والا ہے۔ دنیا کی بے بنیاد زندگی سے دل اُٹھا لے۔ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ بقا

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٦٢) تفسير البغوي (٥/ ٣٠٣) [2] فتح القدير (٣/ ٥٣٩)

ہے۔ باقی سب فنا ہو جانے والے ہیں۔''

اس آیتِ کریمہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک مہمان کو مہمان کیا اور آپ کے پاس وہ شے نہ تھی جو اس کے لائق ہو۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھ کو یہود کے ایک آدمی کی طرف بھیجا کہ تو ہم کو آٹا بیچ کر، یا رجب کے چاند تک قرض دے، وہ بولا: نہیں، مگر رہن کے عوض میں۔ پس میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ کو اس کی خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار! اللہ کی قسم! بے شک میں البتہ آسمان میں امین ہو، اور زمین میں امین ہوں، اور البتہ اگر وہ مجھے قرض دیتا یا مجھ سے بیع کرتا تو البتہ میں اس کی طرف پہنچا دیتا، تو میری لوہے کی زرہ لے جا، پھر میں آپ کے پاس سے ابھی نکلا نہ تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی، گویا اللہ پاک دنیا سے آپ کی تعزیت و تسلی کرتا ہے۔ (أخرجه ابن أبي شيبة و ابن راهويه و البزار و أبو يعلى و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و ابن مردويه و الخرائطي و أبو نعيم عن أبي رافع) یہ الفاظ فتح القدیر اور فتح البیان کے ہیں۔[1] تفسیر خازن میں بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ مروی ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ جو شے تمھارے واسطے آخرت میں ذخیرہ کر رکھی ہے، یا ھُدیٰ و نبوت جو تم کو دی ہے، وہ اس سے بہتر ہے، جو اُن کو دنیا میں عطا کیا ہے اور باقی رہنے والی ہے، اس لیے کہ وہ منقطع نہ ہوگی۔[3]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ مدّ نظر، دراز کرنا ہے نظر کا اور وہ یہ ہے کہ جس شے کی طرف نظر کرتا ہے اس کے اچھا جاننے اور اس سے تعجب کرنے کی وجہ سے، ایسا لگتا ہے کہ اس شے سے نظر کو نہیں پھیرے گا۔ اس میں یہ بات ہے کہ نظرِ غیر ممدود سے درگزر کیا گیا ہے۔ غیر ممدود نظر یہ ہے کہ جلدی سے کسی شے کی طرف نظر کرے، پھر آنکھ کو نیچا کر لے، یعنی کسی شے پر اچانک نظر پڑ گئی تو نظر کو اس پر جمائے نہیں، جلد ہی نگاہ نیچی کر لے، ایسی نظر معاف ہے۔ متقی لوگوں نے غضِ بصر (نگاہ نیچی کرنا) میں تشدد کیا ہے کہ ظالموں اور فاسقوں کے مکانات اور ساز و سامان سے اُن کے لباس اور سواریوں میں نظر کو نیچا کرے، یعنی نگاہ اُٹھا کر اُن کی طرف نہ دیکھے، یہاں تک کہ امام حسن رحمہ اللہ نے یوں فرمایا ہے: "لا تنظروا إلى دقدقة هماليج الفسقة ولكن انظروا كيف يلوح ذل المعصية من تلك الرقاب" دقدقہ گھوڑے وغیرہ کی ٹاپوں کی آواز کو کہتے ہیں اور "هماليج" "هملاج" کی جمع ہے۔ "هملاج" تیز چلنے والے گھوڑے کو کہتے ہیں، یعنی تم فاسقین کی سواری کے گھوڑوں کے سموں کی آواز کی طرف نظر مت کرو، لیکن دیکھو کہ کس طرح معصیت کی ذلت اُن کی گردنوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ

---

[1] مسند البزار (۹/ ۳۱۵) الدر المنثور (۵/ ۶۱۲) فتح القدير (۳/ ۵۴۱۔ ۵۴۲) فتح البيان (۸/ ۲۹۶) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه موسىٰ بن عبيدة الزبدي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٤/ ۲۲۵)

[2] تفسير الخازن (٤/ ۲۸۷) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ۷۸)

نظر نہ کرنا، اس واسطے ہے کہ فاسق نے یہ چیزیں نظر کرنے والوں کی آنکھوں کے لیے بنائی ہیں۔ لہٰذا اُن کی طرف نظر کرنے والا اس کی غرض کا حاصل کرنے والا ہے اور اُن چیزوں کے بنانے پر اُن کو برانگیختہ کرنے والا ہے اور ﴿ رِزْقُ رَبِّكَ ﴾ سے مراد ثوابِ رب ہے اور وہ جنت ہے، یا حلال کفایت کرنے والا۔[1]

امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا کیا نفیس قول نقل کیا ہے کہ جو شخص اللہ کی عزت کے ساتھ عزیز اور اَرجمند نہ ہوا تو اس کا نفس حسرتوں کے مارے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور جس شخص نے اپنی نگاہ کو اس شے کے پیچھے کیا، جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے تو اس کا غم اور رنج دراز ہوتا ہے اور جس شخص نے یہ گمان کیا کہ اللہ کی نعمت اس پر اس کے کھانے پینے پہننے میں ہے تو یقیناً اس کا عمل قلیل ہوا اور اس کا عذاب حاضر ہوا۔[2] اللهم تب علينا ووفقنا لما تحب وترضىٰ۔ آمين.

ملک علام کے کلام فصاحت لزام کی بلاغتِ تام کو ذرا غور سے دیکھنا چاہیے کہ کیسی مختصر عبارت میں کس حسن و خوبی سے اپنے حبیب کریم کی تسلی تشفی فرمائی کہ تم کفار کے ساز و سامان کو مت دیکھو۔ اس مضمون کو کیسے حسن و خوبی سے ادا کیا، یوں نہ کہا کہ "لا تنظروا إلىٰ ما أعطيناهم" بلکہ پہلے آپ کو نہی کے صیغہ سے مخاطب کیا، کلمہ مد ذکر فرمایا، جس کے معنی دراز کرنے کے ہیں۔ پھر اس کو نون تاکید سے موکد کیا، پھر اس کی نسبت عینین کی طرف کی، ایک آنکھ پر کفایت نہ کی اور مضاف کو حذف کیا، یعنی نظر، مطلب یہ ہے کہ تم ہرگز اپنی دونوں آنکھوں کی نظر کو دراز مت کرو، پھر جو مال و منال کفار کو دیا اس کی تعبیر ﴿ مَتَّعْنَا ﴾ سے فرمائی۔ متاع یہی قلیل اور فانی شے ہوتی ہے کہ چند روز برت لی، پھر فنا ہو گئی، اس سے اُن کے ساز و سامان کی حقارت ثابت ہوئی۔

پھر ﴿ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ فرما کر اور حقارت ثابت کی، یعنی اول تو جو کچھ اُن کے پاس ہے، وہ صرف برتنے کی شے ہے، جو جلد فنا ہو جائے گی، پھر وہ بھی سب کو نہیں دی، بلکہ اُن میں سے بعض کو دی، اس کے بعد ﴿ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ فرما کر اور حقارت ذکر فرمائی کہ وہ جو کچھ اُن کے پاس ہے صرف دنیا کی زندگی و رونق ہے، پھر کچھ اس کا اُتا پتا نہ رہے گا۔ پھر یہ بات بیان فرمائی کہ جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ﴿ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ﴾ تاکہ ان کو جانچا جائے، کچھ اس لیے نہیں دیا ہے کہ ہمارے نزدیک اُن کی قدر و منزلت ہے، بلکہ اُن کو اس واسطے دیا ہے کہ ہم تو اُن کو نعمت دیں اور وہ اس کا کفران کریں تو عذاب کے مستحق ہو جائیں۔ پھر اُن کو کفران اور طغیان کی سزا دیں۔

غرض یہ کہ اُن کا مال و منال حیاتِ دنیا کی رونق ہے، پھر آخر کو وہی اُن کے عذاب کا ساز و سامان ہو جائے گا۔ جب کفار کے پاس کا سامان اس قسم کا ٹھہرا کہ متاعِ فانی، ذلیل وحقیر ہے اور انجام کے لحاظ سے عذاب اور سزا کا موجب ہے تو تُو ہرگز اس کی طرف نگاہ جما کر مت دیکھ، تجھ کو جو اللہ پاک نے نبوت اور رسالت کا شرف بخشا ہے اور

---

[1] تفسير النسفى (٣/ ٧٢) [2] تفسير الخازن (٤/ ٢٨٧)

جنت میں تیرے واسطے عیش و آرام کے سامان مہیا کر رکھے ہیں، وہ اس سے کہیں بہتر و برتر ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ قائم دائم رہیں گے، فنا کی ہوا تک ان کو نہ لگے گی۔ فیا له من كلام لا تنقضي عجائبه ولا تفنى غرائبه، سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم.

وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیجیے اور (خود بھی) اس پر قائم رہیے، ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے، ہم ہی آپ کو رزق دیتے ہیں، اور (بہترین) انجام تو (اہل) تقویٰ کے لیے ہے (132)

اپنے اہل و عیال کو نماز پڑھنے کا اور خود بھی اس کی پابندی کرنے کا حکم:

مالک غلام سے روزی کماتے ہیں اور وہ مالک بندگی چاہتا ہے روزی آپ دیتا ہے، یعنی تو چھڑا اپنے گھر والوں کو اللہ کے عذاب سے، نماز کو قائم رکھنے کے سبب سے اور تو خود بھی اس کے کرنے پر قائم رہ، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ [التحريم: ٦] ”اے ایمان والو! تم خود کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔“ اسلم قرشی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اور یرفا (عمر رضی اللہ عنہ کے حاجب) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس رات کو رہا کرتے تھے، رات کو اُن کی ایک گھڑی مقرر تھی کہ وہ اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ پھر اگر کبھی نہ اُٹھتے تو ہم کہتے کہ آج کی رات نہ اُٹھیں گے، جیسے کہ اُٹھا کرتے تھے اور جس وقت بیدار ہوتے تو اُٹھاتے، یعنی اپنے گھر والوں کو اور فرماتے: ﴿ وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ [1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

﴿ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ﴾ یعنی جس وقت تو نماز قائم کرے گا تو تیرے پاس روزی آئے گی، ایسی جگہ سے کہ تجھے گمان نہ ہوگا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [الطلاق: ٢۔ ٣] ”اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔ اور وہ اسے رزق دیتا ہے، جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ [الذاريات: ٥٦۔ ٥٨] ”اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلاشبہ اللہ تو خود رزق دینے والا ہے، بڑی قوت والا، نہایت طاقت ور ہے۔“ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ﴾

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٢)

امام ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ ہم تجھ کو طلب کی تکلیف نہیں دیتے۔

ہشام اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جس وقت وہ اہلِ دنیا پر داخل ہوتے، پس اُن کی دنیا سے نادر چیزیں دیکھتے، پھر جب لوٹ کر اپنے گھر میں داخل ہوتے تو یہ آیت پڑھتے: ﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ﴾ [طٰہٰ: ١٣١۔ ١٣٢] پھر کہتے: "الصلاة رحمكم الله" یعنی گھر والوں کو کہتے کہ آؤ نماز پڑھو، اللہ تم پر رحم کرے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

ثابت رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت نبی اکرم ﷺ کو خصاصت، یعنی بھوک اور ضعف پہنچتا تو اپنے گھر والوں کو پکارتے: "یا أهلاه صلوا صلوا" یعنی اے گھر والو! نماز پڑھو، نماز پڑھو۔ ثابت رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انبیا علیہم السلام پر جس وقت کوئی امر نازل ہوتا تو نماز کی طرف مضطر ہوتے، یعنی امرِ حادث کو دور کرنے کے لیے نماز سے استغاثہ کرتے۔ (أخرجه ابن أبي حاتم) اس قول کو امام احمد رحمہ اللہ نے زہد میں اور بیہقی نے شعب میں بھی روایت کیا ہے۔[2]

امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو میری عبادت کے واسطے فارغ ہوجا، میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیری فقر کو بند کر دوں گا اور اگر تو نہ کرے گا تو میں تیرے سینے کو شغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند نہ کروں گا۔[3] امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے تمھارے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ہموم (غموں کو) کو ایک ہم، یعنی فکرِ معاد (آخرت) کر لیا تو اللہ اس کو اس کے ہمِّ دنیا سے کفایت کرے گا اور جس شخص کے ہمومِ دنیا متشعب، یعنی متفرق و مختلف ہوگئے تو اللہ پروا نہیں کرتا کہ وہ اپنی وادیوں میں سے کسی وادی میں ہلاک ہوجائے۔[4]

نیز امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے یزید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا، فرماتے ہیں کہ جس شخص کا ہمّ دنیا ہوگئی تو اللہ اس پر اس کے کام کو متفرق کر دیتا ہے اور اس کے فقر کو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کر دیتا ہے اور دنیا سے اس کے پاس صرف وہی شے آئے گی، جو اس کے لیے لکھی گئی ہے۔ اور وہ شخص کہ اس کی نیت آخرت ہی ہوگئی تو اللہ اس کے واسطے اس کے کام کو جمع کرتا ہے اور اس کے غنا کو اس کے دل میں کر دیتا

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٠٥۔ ٤٠٦) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٣)

[2] شعب الإيمان (٣/ ١٥٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٣) الدر المنثور (٥/ ٦١٣) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩١٤)،

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٨٩)

ہے اور دنیا اس کے پاس عاجز اور ذلیل ہو کر آتی ہے۔[1]

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ یعنی حسنِ عاقبت دنیا اور آخرت میں اس شخص کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرا اور حسنِ عاقبت جنت ہے۔ صحیح میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے آج کی رات دیکھا کہ گویا ہم عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ہمارے پاس ابن طاب کی رُطب (پکی کھجوروں) میں سے رُطب (پکی کھجوروں) لائے، لہٰذا میں نے اس کی یہ تاویل کی کہ ہمارے واسطے دنیا میں اچھا انجام ہے اور بلندی ہے۔ "وإن ديننا قد طاب"[2] یعنی ہمارا دین مقرر کامل ہو گیا اور اس کے احکام پختہ ہو گئے۔ رطب کہتے ہیں پکی کھجور کو اور ابن طاب مدینہ منورہ کی کھجوروں میں سے ایک قسم ہے۔ ابن طاب مدینہ میں ایک شخص تھا یہ کھجور اس کی طرف منسوب ہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ میں آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے اہل کو نماز کا حکم دیں۔ اہل سے مراد آپ کے اہلِ بیت ہیں۔ امام ابن نجار، ابن عساکر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت آیتِ کریمہ: ﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ ﴾ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دروازے کی طرف صبح کی نماز کے وقت آیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: "الصلاة رحمكم الله" ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ٣٣] "بس اللہ تو چاہتا ہے کہ وہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمھیں بالکل پاک صاف کر دے۔" آپ کا یہ تشریف لانا آٹھ مہینے تک تھا۔[4] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ابو الحمراء رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[5] عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس وقت نبی مکرم ﷺ کے اہل پر کوئی شدت یا تنگی نازل ہوتی تو آپ اُن کو نماز کا حکم فرمایا کرتے تھے اور پڑھتے: ﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ ﴾[6] (أخرجه أبو عبيد و سعيد بن منصور و ابن المنذر والطبراني في الأوسط و أبو نعيم في الحلية والبيهقي بالشعب بإسناد قال السيوطي صحيح)

سیدنا عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جس وقت اس شے کو دیکھتے جو بادشاہوں کے پاس ہے تو اس آیت کو پڑھتے، پھر ندا کرتے: "الصلاة الصلاة يرحمكم الله"[7] بکر بن عبداللہ مزنی رحمہ اللہ کے گھر والوں کو جب خصاصت پہنچتی، یعنی

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٥٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٠) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٢٨۔ ٢٢٩) [4] الدر المنثور (٥/ ٦١٣)

[5] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٤) اس کی سند میں "ابو داود نفیع بن حارث" ضعیف راوی ہے۔

[6] المعجم الأوسط (٨٨٦) شعب الإيمان (٣/ ١٥٣) الدر المنثور (٥/ ٦١٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ "محمد بن حمزہ" کا سماع سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ پریشانی اور تنگی میں نماز پڑھنا دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

[7] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٣)

بھوک اور ضعف تو کہتے کھڑے ہو جاؤ، پس نماز پڑھو، اللہ نے اپنے رسول کو اسی کا امر فرمایا ہے۔ مالک بن دینار رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اہل سے مراد آپ ﷺ کی ساری امت ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آپ ﷺ کی اُمت ہے، یا آپ ﷺ کے اہلِ بیت۔[1]

رہی یہ بات کہ اللہ پاک نے اس جگہ آپ ﷺ کو نماز کا حکم نہیں فرمایا، بلکہ آپ ﷺ کے اہل کو حکم کرنے پر اکتفا کیا، لہٰذا اس کی تین وجہیں ہیں: یا تو اس لیے کہ آپ ﷺ کا نماز کو قائم کرنا ایک جانی پہچانی بات تھی، یا اس واسطے کہ ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۰] ''اور طلوعِ شمس سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی تسبیح کیجیے، اور دن کے (دونوں) حصوں میں بھی، تا کہ آپ راضی ہو جائیں۔'' میں آپ کو نماز کا حکم ہو چکا ہے، یا اس لیے کہ آپ کو امر کرنا اس بات کا کہ تم اپنے اہل کو حکم کرو، یہ حکم ہے آپ کے لیے اور اسی لیے یوں ارشاد فرمایا کہ ﴿ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ یعنی اور تم نماز کی محافظت پر صبر کرو، کیونکہ وہ فحشاء منکر سے روکتی ہے اور امورِ دنیا میں سے کسی شے کی وجہ سے نماز سے مشغول مت ہو۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ تم نماز پر اپنے فعل کے ذریعے سے صبر کرو، کیونکہ اپنے فعل کے ذریعے سے وعظ کرنا اس وعظ سے زیادہ موثر ہے، جو زبان سے ہوتا ہے۔

﴿ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم تم کو اس بات کی تکلیف نہیں دیتے کہ تم اپنے نفس کو روزی دو نہ اس کی کہ اپنے گھر والوں کو رزق دو اور اس کی وجہ سے نماز سے مشغول ہو جاؤ۔ ﴿ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ﴾ یعنی ہم تم کو روزی دیتے ہیں، پس تم امرِ رزق کا اہتمام نہ کرو اور اپنے دل کو امرِ آخرت کے واسطے فارغ کرلو۔ کیونکہ جو شخص اللہ کے کام میں ہوتا ہے تو اللہ اس کے کام میں ہوتا ہے۔ ﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ یہاں مضاف حذف ہے، جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی عاقبتِ محمودہ اہلِ تقویٰ کے لیے ہے اور عاقبتِ محمودہ سے مراد جنت ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ملاک (دار و مدار) امرِ تقویٰ ہی ہے اور اسی پر خیر کے دائرے گھومتے ہیں۔[2] جس شے کا قیام ہو وہی شے اس شے کا ملاک ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہاں دو مضاف محذوف ہیں، یعنی حسنِ عاقبت اہلِ تقویٰ کے واسطے ہے۔[3]

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ
مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ
قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

[1] تفسیر النسفي (۳/ ۷۲۔ ۷۳) [2] فتح القدير (۳/ ٥٤٠) [3] تفسير النسفي (۳/ ۷۳)

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰی ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰی ﴿۱۳۵﴾

اور انھوں نے کہا: وہ ہمارے پاس اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا؟ کیا ان کے پاس پہلے صحیفوں میں واضح دلیل نہیں آ چکی؟ (133) اور اگر بلاشبہہ ہم انھیں اس (رسول) سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ لوگ کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی کرتے (134) آپ کہہ دیجیے: ہر ایک (انجام کار کا) منتظر ہے، لہٰذا تم بھی انتظار کرو، تم جلد ہی جان لو گے کہ راہِ راست والے کون ہیں اور ہدایت یافتہ کون ہیں (135)

قرآنِ مجید ایک نشانی ہے:

یعنی اگلی کتابوں میں آخر زمانے کے رسول کی خبر ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ پہلے پیغمبروں کی نشانی کافی ہے، یہ پیغمبر بھی انھی باتوں کا تقید (بندش) کرتا ہے، کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ یا یہ نشانی کہ اگلی کتابوں کے موافق قصے بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار کے اس قول کی خبر دیتا ہے کہ محمد ﷺ ہمارے پاس اپنے رب سے کوئی آیت کیوں نہیں لے آتے یعنی ایسی نشانی اور علامت جو اُن کی سچائی پر دلالت کرے اس بات میں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴾ یعنی قرآنِ عظیم جس کو اللہ نے اُن پر نازل کیا ہے اور وہ اُمی اَن پڑھ ہیں، لکھنا نہیں جانتے اور نہ ہی انھوں نے اہلِ کتاب سے درس لیا ہے، نہ اس سے سبق لیا ہے، حالانکہ پہلے زمانے میں اگلے لوگوں سے جو کچھ ہوا اس کی خبریں اس قرآن میں آ گئی ہیں اور یہ ایسی خبریں ہیں کہ اگلی کتابوں میں سے جو صحیح کتابیں ہیں وہ اُن کی موافقت کرتی ہیں، کیونکہ قرآن اُن میں مُہیمن (نگہبان) اور امین ہے، صحیح خبر کی تصدیق کرتا ہے اور اُن کتابوں میں جو جھوٹ ہے، اس کی خطا بیان کرتا ہے۔

یہ آیت اس آیت کی مثل ہے، جو سورۃ العنکبوت میں آئی ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ۵۰۔ ۵۱] ''انھوں نے کہا: اس پر اس کے رب کی طرف سے معجزے کیوں نہیں اُتارے گئے؟ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: بس معجزے تو اللہ کے پاس ہیں، اور میں تو محض ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ کیا انھیں (یہ نشانی) کافی نہیں کہ بے شک ہم نے آپ پر (یہ) کتاب نازل کی جو اُن پر پڑھی جاتی ہے۔ بلاشبہہ اس میں ان لوگوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔''

صحیحین میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: «مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَقَدْ أُوتِيَ مِنَ الْآيَاتِ مَا

آمَنَ عَلَى مِثْلِهِ الْبَشَرُ وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَيَّ فَأَرْجُوا أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ »[1] یعنی ہر نبی کو ایسا معجزہ ملا کہ خلق جب اس کو دیکھ کو دیکھ لے تو مغلوب اور مضطر ہو کر ایمان لے آئے، یعنی ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے کے مناسب ہوتا تھا، پھر جب اس کا زمانہ منقطع ہو جاتا تو وہ معجزہ بھی منقطع ہو جاتا تھا بخلاف معجزاتِ نبی ﷺ کے کہ آپ ﷺ کے معجزات میں سے قرآنِ کریم ایک ایسا عظیم الشان معجزہ ہے کہ قیامت تک باقی رہے گا اور خلق ایمان لاتی رہے گی، اس لیے آپ ﷺ کی اُمت ساری اُمتوں سے زیادہ تر ہوگی، آپ ﷺ کو جو معجزات عطا ہوئے ہیں، اُن میں سے آپ ﷺ نے اس جگہ سب سے بڑے معجزے کا ذکر فرمایا، وہ قرآنِ کریم ہے، ورنہ آپ کے معجزات تو بے حد و حساب ہیں اور کتبِ معجزات میں لکھے ہوئے ہیں۔

مجمع البحار میں یوں ہے: «ما مثله آمن عليه البشر يعني ليس نبي إلا قد أعطي من المعجزات شيئا صفته أنه إذا شوهد اضطر إلى الإيمان به يعني اختص كل نبي بمعجزة تلائم زمانه فإذا انقطع زمانه انقطعت كقلب العصا زمان غلبة السحر وإحياء الموتى وإبراء الأكمه زمان غلبة الطب، وإنما كان الذي أوتيت أي معظم ما أوتيت و أفيده وحيا إذ كان له سواه من المعجزات مالا يحصى وحيا أي قرآنا أعجز فصحاء تباهوا بالأشعار و الخطب وهو أعم و أدوم يستمر على مر الدهور ينفع الشاهد والغائب ولذا أكون أكثرهم تبعا»[2]

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ ... الخ﴾ یعنی اگر ہم ان جھٹلانے والوں کو ہلاک کر ڈالتے اس سے پہلے کہ اُن کی طرف اس رسول کریم کو بھیجیں اور اس کتابِ عظیم کو اُن پر نازل کریں تو وہ کہتے کہ اے ہمارے رب! تو نے کیوں نہیں ہماری طرف کوئی رسول بھیجا، اس سے پہلے کہ تو ہم کو ہلاک کرے، تاکہ ہم اس پر ایمان لاتے اور اس کی پیروی کرتے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴾ اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ یہ جھٹلانے والے باغی سرکش اور معاند ہیں، یہ ایمان نہیں لاتے، اگرچہ اُن کے پاس ہر قسم کی نشانی آجائے، یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥٥۔ ١٥٧] ”اور یہ (قرآن) ایک عظیم کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا ہے، (یہ) برکت والی ہے، پھر تم اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٢)
[2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٩٨)

صرف ہم سے پہلے دو گروہوں (یہود و نصاریٰ) پر کتاب نازل کی گئی تھی اور بے شک ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ یا تم (یہ نہ) کہو کہ اگر بے شک ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ضرور ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، چنانچہ یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے، پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور ان سے منہ موڑا؟ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں جلد ہم سخت عذاب کی شکل میں سزا دیں گے، اس لیے کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ﴾ [الفاطر: ٤٢] ''اور انھوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ضرور ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے، پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو اس (کی آمد) نے ان کو (حق سے) نفرت ہی میں زیادہ کیا۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٠٩۔ ١١٠] ''اور انھوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس (مخصوص) نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں، اور تمھیں یہ بات کون سمجھائے کہ بے شک جب وہ نشانی آجائے گی تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم اس سے کہہ دو جس نے تم کو جھٹلایا یا تمھاری مخالفت کی اور اپنے کفر و عناد پر جما رہا کہ ہر ایک ہم میں سے اور تم میں سے انتظار کرنے والا ہے، لہٰذا تم انتظار کرو، پس تم جان لو گے کہ سیدھی راہ والے کون ہیں اور کس نے حق کی طرف راہ پائی اور ہدایت پائی۔ یہ آیت اس آیت کی مثل ہے: ﴿ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٤٢] ''اور جلد وہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں گے کہ سب سے زیادہ بے راہ کون ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴾ [القمر: ٢٦] ''کل ہی وہ جان لیں گے کون کذاب اور شیخی باز ہے؟''[1] (آخر تفسیر سورة طٰهٰ و لله الحمد و المنة، كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے کہا کہ کیوں نہیں لے آتے محمد ﷺ ہمارے پاس اپنے رب کی

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٠)

نشانیوں میں سے کوئی نشانی، جس طرح کہ اُن سے پہلے اور نبی لایا کرتے تھے، جیسے کہ صالح علیہ السلام اونٹنی لائے، موسیٰ علیہ السلام عصا لے کر تشریف لائے، یا یہ معنی ہیں کہ ہمارے پاس ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے، جن کی ہم نے ان سے فرمایش کی ہے۔ لہٰذا اللہ پاک نے اُن کے قول کا یہ جواب دیا کہ ﴿ اَوَ لَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴾۔ صحف سے مراد تورات و انجیل و زبور و باقی کتبِ منزلہ ہیں اور اُن میں آپ کی نبوت کی تصریح اور آپ کی بشارت ہے۔ یہ بات کافی ہے اس لیے کہ وہ لوگ ان کتبِ منزلہ کے صدق وصحت کا اقرار کرتے ہیں اور ان میں وہ بات موجود ہے جو آپ کی نبوت کے انکار کو رد کر دے اور ان کے تعنتات (عیب جوئی) وتعسفات (بے راہ روی) اور سرکشیوں کو مٹادے اور باطل کر ڈالے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا ان کے پاس خبر نہیں آئی ہمارے ان امتوں کو ہلاک کرنے کی، جنھوں نے کفر اور انکار کیا اور نشانیوں کی فرمایش کی۔ پس اگر ان کے پاس وہ نشانیاں آ جائیں جن کی انھوں نے فرمایش کی ہے تو کون سی چیز اُن کو اس بات سے بے خوف کرتی ہے کہ اُن کا حال بھی ان کے حال کی طرح ہو جائے، یعنی جس طرح وہ نشانیاں آ جانے کے بعد اپنے کفر اور تکذیب کے سبب سے ہلاک کر دیے گئے تھے، اسی طرح یہ بھی ہلاک کر دیے جائیں، جو گت ان کی ہوئی وہی گت ان کی بھی ہو جائے۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ کیا اُن کے لیے قرآن کے معجزہ ہونے کے لیے یہ کافی نہ ہوا کہ قرآن بھی اس شے پر مشتمل ہے، جو اگلے صحیفوں میں ہے، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے سوا کوئی اور معجزہ طلب کیا۔ پس حرفِ واو عاطفہ ہے کلام مقدر پر جس کا مقام مقتضی ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "أَلَمْ تَأْتِهِمْ سَائِرَ الآيَاتِ وَلَمْ تَأْتِهِمْ خَاصَّةً بَيِّنَةً مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولٰى"، یعنی کیا ان کے پاس ساری نشانیاں نہیں آ گئیں اور نہیں آیا ان کے پاس اس شے کا بیان جو اگلے صحیفوں میں ہے۔ اس عطف کا فائدہ تقریر ہے قرآن شریف کے آنے کے لیے اور اس امر کی خبر دینا کہ وہ ایسا واضح اور ظاہر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی طرح کا انکار نہیں ہو سکتا۔[1]

یعنی جب قرآن شریف آ چکا اور اگلی کتابوں میں گزشتہ اُمتوں کے جو حالات اور رسولوں کی تکذیب کے سبب میں اُن کا ہلاک کیا جانا لکھا ہے، اس کا کھلا کھلا بیان قرآن پاک میں موجود ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے سوا اور معجزے کی فرمایش کی جاتی ہے۔ یہ کچھ نہیں ہے، مگر تعنت (عیب جوئی) وسرکشی وہٹ دھرمی و بے شرمی۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ کیا نہیں آئی اُن کے پاس ایک ایسی نشانی جو نشانیوں کی اصل ہے اور معجزوں کے باب میں اُن سب سے زیادہ عظیم تر ہے، یعنی قرآنِ پاک، کیوں کہ وہ اس شے کے لیے برہان اور دلیل ہے، جو باقی کتبِ منزلہ میں موجود ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو مفصل ذکر کیا ہے۔[2]

امام ابوجعفر، شیبہ، نافع، ابوعمرو، یعقوب، ابن ابی اسحق اور حفص نے ﴿ اَوَ لَمْ تَاْتِهِمْ ﴾ کو بتائے فوقانی پڑھا

---

[1] فتح البيان (٨/ ٢٩٧ـ ٢٩٨) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٧٩)

ہے، باقی قاریوں کی قراءت بیائے تحتانی ہے، اس لیے کہ ﴿ بَیِّنَةُ ﴾ کے معنی بیان و برہان کے ہیں، اس بنا پر فعل کو باعتبار معنی ﴿ بَیِّنَةُ ﴾ کے مذکر کیا ہے۔ امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس قراءت کو اختیار فرمایا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بَیِّنَةُ ﴾ تنوین کے ساتھ بھی جائز ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ﴿ بَیِّنَةُ ﴾ منون و مرفوع کیا جائے گا تو کلمہ ''ما'' اس سے بدل ٹھہرایا جائے گا اور جس وقت اس کو نصب دیں گے تو بنا بر حال منصوب ہوگا، معنی یہ ہوں گے: ''أولم یأتھم ما في الصحف الأولی مبینا''[1] یعنی کیا نہیں آئی اُن کے پاس وہ شے جو اگلے صحیفوں میں ہے، درآں حالیکہ وہ مبین ہے۔ یہ قول بنا بر مقتضائے جواز نحوی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ قراءت کا وقوع نہیں ہوا۔ ''صحف'' کو حائے مہملہ کے سکون سے بھی پڑھا ہے، جملہ ﴿ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ ... الخ ﴾ مستأنفہ ہے ماقبل کی تقریر و تاکید کے واسطے لایا گیا ہے۔

﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف پھرتی ہے، یا قرآن پاک کی طرف، یا ﴿ بَیِّنَةُ ﴾ کی طرف، اس لیے کہ برہان کے معنی میں ہے، یا اس لیے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ یعنی اگر ہم ان کو نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے یا بینہ آنے سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر ڈالتے تو قیامت کے دن ان کو گنجایش ہوتی کہ وہ حجت کرتے اور یہ کہہ کر بہانہ جوئی کرتے کہ اے رب ہمارے! تو نے ہم تک دنیا میں کسی کو پیغام دے کر کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی جن کو رسول لے کر آتا پیروی کرتے اس سے پہلے کہ ہم دنیا میں عذاب اور خواری کے سبب سے ذلیل ہوتے اور آگ میں داخل ہو کر آخرت میں رسوا ہوں۔ اللہ پاک نے ان کافروں کے عذر کو ان سے ہلاک کرنے سے پہلے رسول بھیج کر قطع فرما دیا اور اسی لیے اُن کی طرف سے یہ بات نقل فرمائی: ﴿ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الملك: ٩] ''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! یقیناً ڈرانے والا ہمارے پاس آیا تھا، چناں چہ ہم نے (اس ڈرانے والے کی) تکذیب کی اور ہم نے کہا کہ اللہ نے (کسی پر) کچھ بھی نہیں اُتارا۔''

﴿ نَذِلَّ وَنَخْزٰى ﴾ کو بصیغۂ مجہول بھی پڑھا ہے۔ ﴿ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ ... الخ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کو ہر ایک ہم میں سے اور تم میں سے اس بات کا انتظار کرنے والا ہے، جس کی طرف ہمارا اور تمھارا کام رجوع کرے گا، لہٰذا تم انتظار کرو، تم عن قریب جان لو گے کہ کون سیدھے راستے والے ہیں اور کس نے گمراہی سے راہ پائی اور غوایت (کج روی) سے باز رہا۔ ہم یا تم۔ امام نحاس و فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ ﴿ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ ﴾ کے معنی ''مَنْ لَّمْ يَضِلَّ'' ہیں، یعنی سیدھی راہ والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو گمراہ نہیں ہوئے اور ﴿ مَنِ اهْتَدٰى ﴾ کے معنی ہیں: ''من ضل ثم اھتدی'' یعنی جو شخص کہ گمراہ ہوا، پھر راہ پر آیا۔[2]

کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ دونوں جگہ استفہامی ہے۔ جائے رفع میں واقع ہے، بسبب ابتدا کے اور ما بعد اس کا خبر ہے

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٦٤) [2] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٦٦)

اور جملہ قائم مقام دو مفعول علم کے ہے۔ ''من'' کے اول میں مضاف محذوف ہے، یعنی ﴿ فَسَتَعْلَمُوْنَ ﴾ جواب: ﴿ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ ... الخ ﴾ یعنی عن قریب تم اس سوال کا جواب جان لو گے، وہ جواب یہی ہے کہ سیدھی راہ والے مومنین ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا ''من'' موصولہ ہو بخلاف پہلے کے کہ وہ موصولہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ عائد نہیں ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہوسکتا ہے کہ اول میں بھی موصولہ ہو بمعنی ''الذي'' اور اصحاب خبر ہو متبدائے مضمر کی، یعنی ''هم أصحاب الصراط'' یہ بات اُن کے مذہب کی بنا پر ہے کہ وہ ایسے عائد کو حذف کر دیتے ہیں، گو صلہ دراز نہ ہو اور جائز ہے کہ علم عرفانی ہو، یعنی ''تعلمون'' کے معنی ''تعرفون'' ہوں تو یہی مفعول اس کو کافی ہو جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علم اپنے باب پر ہو تو اپنے دوسرے مفعول کی تقدیر ضروری ہوگی۔

رہا ﴿ مَنِ اهْتَدٰى ﴾ تو اس میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ استفہامیہ ہو اور اس کا حکم مثل اول کے ہو، مگر حذف عائد ہیں، کیوں کہ اس میں عائد موجود ہے اور اول میں محذوف۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جائے رفع میں ہے، اس بات کی بنا پر جو استفہامیہ میں گزر چکی ہے۔ تیسری یہ ہے کہ محلِ جر میں ہے، اس لیے کہ ﴿ اَلصِّرَاطِ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی ''وأصحاب من اهتدى'' ان دونوں وجہوں کی بنا پر موصولہ ٹھہرے گا۔ ابو البقاء نے دوسری وجہ میں کہا ہے کہ اس میں خبر کا عطف استفہام میں لازم آئے گا۔ انتھی.

امام ابو رافع رحمہ اللہ نے ''فسوف تعلمون'' پڑھا ہے اور ''السوی'' میں چار قراء تیں اور ہیں: اول ''اَلسَّوَآء'' بمعنی وسط، یعنی جید۔ دوسری ''اَلسُّوْأٰی'' بروزن فُعلی، یحییٰ بن عاصم وجحدری نے اسی طرح پڑھا ہے، اس قراءت کو یوں رد کیا ہے کہ صراط کی تانیث شاذ ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا کہ تانیث اس کی صراط کے معنی پر مبنی ہے، یعنی طریقہ کقولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّوِاسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ ﴾۔ تیسری ''السَّوْءِ'' بمعنی شر۔ چوتھی ''اَلسُّوِيِّ''، تصغیر سوء۔ ہمزہ کو یا سے بدلا، پھر یا کو یا میں ادغام کیا۔ یہ جائز ہے۔

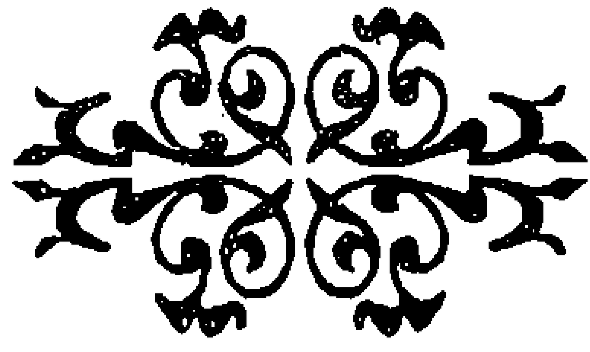
انموذج میں ہے کہ ﴿ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ ﴾ اور مہتدین ایک ہیں، پھر تکرار کا کیا فائدہ، لہٰذا اس کے تین جواب ہیں: اول یہ ہے کہ اصحابِ صراطِ سوی سے مراد سالکینِ صراطِ مستقیم ہیں اور مہتدین سے مراد منزل پر پہنچ جانے والے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ اصحابِ صراطِ سوی وہ لوگ ہیں، جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر رہے۔ اور مہتدین وہ ہیں کہ طریقِ مستقیم پر نہ تھے پھر اس پر ہوگئے، یہ قول اول گزر چکا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ اصحابِ صراطِ سوی سے مراد اہلِ دینِ حق ہیں دنیا میں اور ﴿ مَنِ اهْتَدٰى ﴾ سے مراد آخرت میں جنت کی راہ پانے والے ہیں۔ پس گویا یوں کہا: ''فستعلمون من المحق في الدنيا والفائز في الآخرة'' یعنی تم عن قریب جان لوں گے کہ دنیا میں حق پر کون ہے اور آخرت

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ٥٢)

میں مراد پانے والا کون ہے۔ هذا آخر تفسير سورة طه و الحمد لله الذي بنعمته تتم الصّالحات والصلاة والسلام على سيدنا و مولٰنا محمدﷺ خير البريات وعلى آله و صحبه أولي الدرجات الرفيعات. آمين

شبِ ہشتم ماہِ شوال ۱۳۰۸ء ہجری ۱۲ بج کر تیس منٹ پر محلّہ امیر پورہ شاہجہان آباد میں اس تفسیر مبارک کی تحریر تمام ہوئی۔ پانزدہم شعبان سے بعض امراض کی وجہ سے لکھنا موقوف ہوگیا، پھر رمضان شریف تشریف لائے، اس میں بھی بالکل لکھنا نہ ہوا، اب اللہ پاک پر توکل کر کے لکھنا شروع کیا ہے۔ اے میرے مولیٰ! اے میرے سید! مجھ گنہگار کو نفسِ امارہ و اعدائے دین و دنیا سے پناہ دے اور عافیتِ دارین عطا فرما اور حسنِ خاتمہ عطا فرما اور اس کام کی اپنی مرضی کے مطابق تکمیل فرما اور حسنِ اعمال کی توفیق دے اور ہم سب کو اس سے نفع عنایت کر تو ہر شے پر قادر ہے، تجھ پر سب آسان تر ہے۔ آمین!

وما من كاتب إلا سيُبلٰى — و يبقى الدهر ما كتبت يداه
فلا تكتب بخطك غير شيء — يسرك في القيامة أن تراه



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورة الأنبياء

یہ سورت مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق یعنی باتفاق مکے میں نازل ہوئی ہے۔[1] اس کا نام سورت انبیا اس لیے رکھا گیا کہ اس میں انبیا علیہم السلام کے قصے مذکور ہیں۔ اس کی ایک سو گیارہ یا بارہ آیتیں ہیں۔ تعداد میں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کوفیوں وغیرہ نے قول: ﴿ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿66﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ کو دو آیات شمار کرتے ہیں اور غیر کوفی ایک آیت گنتے ہیں۔ کوفیوں کے مطابق ﴿ وَلَا يَضُرُّكُمْ ﴾ تک ایک آیت ہے اور اس کے بعد ﴿ اُفٍّ لَّكُمْ ﴾ سے لے کر ﴿ تَعْقِلُوْنَ ﴾ تک دوسری آیت ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ « بنو إسرائيل والكهف ومريم والأنبياء من العتاق الأول وهن من تلادي »[2] عتیق انتہائی عمدہ شے کو کہتے ہیں۔ اس قول سے اُن کی مراد اُن سورتوں کی فضیلت بیان کرنا ہے، اس لیے کہ اُن میں ایسے امور شامل ہیں، جو خارقِ عادت ہیں، جیسے قصۂ معراج شریف و قصہ اصحابِ کہف و مریم علیہا السلام اور اس لیے کہ جلیل القدر انبیا کی خبریں اور اُن کی اُمتوں کے قصے اس میں مذکور ہیں۔ یعنی یہ چار سورتیں من جملہ ان سورتوں کے ہیں، جن کو میں (عبداللہ بن مسعود) نے قرآن شریف میں سے سب سے پہلے سیکھا ہے۔

سیدنا عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُن کے پاس عرب کا ایک شخص مہمان آیا تو عامر نے اس کو عزت سے رکھا اور اس کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔ پھر وہی شخص سیدنا عامر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی وادی جاگیر مانگی ہے کہ اس سے بہتر عرب میں کوئی وادی نہیں ہے اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تیرے لیے اس میں سے ایک قطعہ مختص کر دوں کہ وہ تیرے لیے اور تیرے بعد تیری اولاد کے لیے ہو۔ اس پر سیدنا عامر رضی اللہ عنہ بولے کہ مجھے تیرے قطعۂ زمین کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ آج کے دن تو ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے کہ اس نے ہم کو دنیا سے ذاہل اور غافل کر دیا ہے، یعنی ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٦٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٢)

مُّعْرِضُوْنَ ﴾ (أخرجه ابن مردويه و أبو نعيم في الحلية) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ”و رواه ابن عساكر في ترجمة عامر بن ربيعة“[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے، جبکہ وہ غفلت میں پڑے اعراض کر رہے ہیں ① ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس جو بھی نئی نصیحت آتی ہے، اسے وہ کھیلتے کودتے (ہنسی مذاق ہی میں) سنتے ہیں ② ان کے دل غافل ہیں اور ان ظالموں نے چپکے چپکے مشورہ کیا کہ یہ (رسول) تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے، کیا پھر تم دیکھتے بھالتے (اس کے) جادو میں پھنستے ہو؟ ③

قیامت کے قریب ہونے کے باوجود لوگوں کی غفلت:

یہ اللہ عزوجل کی طرف سے قیامت کے قرب اور نزدیکی کے بارے میں تنبیہ ہے، حالانکہ لوگ اس کے بارے میں غفلت میں ہیں۔ یعنی نہ اس کے لیے عمل کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فِي الدُّنْيَا)) [2] یعنی غفلت سے مراد دنیا ہے۔ امام ابن مردویہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ((مِنْ أَمْرِ الدُّنْيَا)) روایت کیا ہے۔[3] كذا في فتح البيان۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل: ۱] ”اللہ کا حکم آ پہنچا، لہٰذا تم اسے عجلت سے نہ مانگو۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ [القمر: ۱۔ ۲] ”قیامت

---

① حلية الأولياء (۱/ ۱۷۹) تاريخ دمشق (۲۵/ ۳۲۷) تفسير ابن كثير (۳/ ۲۳۱) اس کی سند میں ”موسیٰ بن عبیدہ اور عبدالرحمٰن بن زید“ ضعیف راوی ہیں۔

② سنن النسائي الكبرىٰ (۶/ ۴۰۷) اس کی سند صحیح ہے۔ ③ الدر المنثور (۵/ ۶۱۶) فتح البيان (۸/ ۳۰۱)

بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔ اور اگر وہ (مشرک) کوئی معجزہ دیکھیں تو منہ موڑتے اور کہتے ہیں کہ (یہ) ہمیشہ سے چلا آتا ہوا جادو ہے۔‘‘

حکایت:

حسن بن ہانی ابونواس شاعر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب لوگوں سے بڑھ کر شاعر شیخ طاہر ابو العتاہیہ ہے، اس لیے کہ وہ یوں کہتا ہے: ؎

الناس في غفلاتهم . ورحا المنية تطحن

یعنی لوگ تو اپنی غفلتوں میں پڑے ہیں، حالانکہ موت کی چکی پیس رہی ہے۔ اس پر کسی نے امام ابونواس رحمہ اللہ سے کہا: شیخ طاہر نے یہ مضمون کہاں سے لیا ہے؟ تو ابونواس رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے لیا ہے: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾[1] (رواه الحافظ ابن عساكر في ترجمة حسن بن هاني)۔

پھر اللہ پاک نے خبر دی کہ وہ اس وحی کو غور سے کان لگا کر نہیں سنتے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ کریم پر نازل فرمایا ہے۔ یہ خطاب قریش کو ہے اور اُن کفار کو جو اُن کے مشابہ ہیں۔ فرمایا: ﴿ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ ﴾ یعنی نہیں آتی ہے اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت جو نئی نئی نازل ہوئی ہے، مگر وہ اس کو کھیل میں لگے ہوئے سنتے ہیں۔ جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اہلِ کتاب سے اس چیز کے بارے میں پوچھتے ہو جو اُن کے ہاتھوں میں ہے، حالانکہ انھوں نے تو اس میں تحریف کر ڈالی ہے اور اس کو بدل دیا ہے، یعنی اس میں کچھ زیادہ کیا ہے اور کچھ کم کر دیا ہے۔ ’’وكتابكم أحدث الكتب بالله تقرؤنه محضا لم يشب‘‘[2] (رواه البخاري بنحوه) یعنی حالانکہ تمھاری کتاب سب کتابوں سے زیادہ تر نئی ہے، ابھی اللہ کے پاس سے تازہ بہ تازہ نو بہ نو آئی ہے۔ تم اس کو خالص پڑھتے ہو، اس میں کسی طرح کی کمی بیشی اور ملاوٹ نہیں ہوئی ہے، جو تم دوسروں سے پوچھتے پھرتے ہو۔

باغِ مرا چہ حاجت سرو وصنوبر ست — شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمتر ست

’’میرے باغ کو سرو وصنوبر کے درخت کی کیا ضرورت ہے گھر کو آباد کرنے والا سیدھا، بلند و بالا شمشاد (درخت) زیبائش میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔‘‘

غرض اس سے یہ ہے کہ ﴿ مُحْدَثٍ ﴾ کے معنی نئی نازل کی ہوئی ہیں۔ ﴿ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ یعنی چپکے چپکے ظالموں نے سرگوشی کی، درآں حالیکہ آپس میں پوشیدہ طور پر یہ کہتے تھے کہ نہیں ہے یہ شخص مگر

[1] تاريخ دمشق (١٣/ ٤١٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢٩)

تم جیسا ایک بشر ہے، اس سے ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ نبی اکرم ﷺ کا نبی ہونا بعید ہے، اس لیے کہ وہ اُن کی طرح کے ایک بشر ہیں، پھر آپ وحی کے لیے کس طرح مختص ہو سکتے ہیں، وہ نبی نہیں ہیں، اسی لیے اس طرح کہا: ﴿ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی پھر کیوں اُن کی پیروی کرتے ہو کہ تم ایسے ہو جاؤ کہ کوئی جادو میں پڑے، حالانکہ جانتے ہو کہ وہ جادو ہے۔[1] كذا في ابن كثير.

"قرب و اقتراب و دنو" نزدیک آ لگنے کو، لگ بھگ ہونے کو کہتے ہیں۔ ان سب کے ایک معنی ہیں، اسی لیے محلی نے ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ کی تفسیر کلمہ "قَرُبَ" کے ساتھ کی ہے[2] اور علامہ نسفی ؒ نے لفظ "دَنَا" کے ساتھ کی ہے۔[3] لیکن "قَرُبَ" کی نسبت ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ میں زیادہ قرب ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ ہی کو اختیار فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں قرب میں مبالغہ کرنا مقصود ہے، وہاں اقتراب ہی کو ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ فرمایا ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ [القمر۔ ۱] "قیامت بہت قریب آ گئی۔" نیز فرمایا: ﴿ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ ﴾ [الأنبياء: ۹۷] "اور سچا وعدہ (یومِ قیامت) قریب آ پہنچے گا۔" یہاں پر بھی ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ کہا ہے، کیونکہ قرب میں مبالغہ مقصود ہے۔ "حساب" حا کی زیر اور پیش کے ساتھ بہ معنی شمردن و شمار ہے۔ "ناس" کی اصل "اناس" ہے۔ تخفیف کے لیے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے، یہ اسم جنس ہے اس کا ترجمہ مردمان ہے۔

رہی یہ بات کہ یہاں "ناس" سے کیا مراد ہے تو اس میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد عموم ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مراد صرف مشرکین ہیں۔ تیسرا یہ ہے کہ مراد کفارِ مکہ ہیں، جو بعث بعد الممات کے منکرین ہیں۔ امام محلی و بیضاوی و نسفی ؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[4] امام نسفی ؒ نے سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ سے نقل کیا ہے کہ ناس سے مراد مشرکین ہیں اس لیے کہ اس کے بعد جس چیز کا ذکر ہے وہ مشرکین کی صفات ہیں۔[5] حاصل یہ ہے کہ ناس عام ہے اور جن لوگوں کی طرف اس وقت اشارہ کیا گیا وہ کفارِ قریش تھے، کیونکہ یہ بات انھوں نے کہی تھی کہ محمد ﷺ تو ہم کو مرنے کے بعد جی اُٹھنے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے ڈراتے اور دھمکاتے ہیں کہ اعمال پر جزا ملے گی، حالانکہ یہ بات بعید ہے، اس پر اللہ پاک نے ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ اُتاری۔ اس قول کی بنیاد پر حساب سے مراد بدر کے دن اُن کا عذاب ہوگا۔

اقترابِ حساب کی تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ زمانۂ گذشتہ کی نسبت حساب کا زمانہ زیادہ قریب ہے، یعنی اگرچہ حساب بعید ہے، مگر گزرے ہوئے زمانے کی نسبت تو قریب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے نزدیک قریب

---

[1] تفسير ابن كثير (۳/ ۲۳۱) [2] تفسير الجلالين (۱/ ٤۲۰) [3] تفسير النسفي (۳/ ۷۳)

[4] تفسير الجلالين (۱/ ٤۲۰) تفسير البيضاوي (٤/ ۸۱) تفسير النسفي (۳/ ۷۳) [5] تفسير النسفي (۳/ ۷۳)

ہے، گو اُن کے نزدیک بعید ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴾ [المعارج: ٦۔ ٧] ”بے شک وہ (لوگ) اس کو دور دیکھتے ہیں۔ اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں۔“ نیز فرماتا ہے: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [الحج: ٤٧] ”اور وہ آپ سے جلد عذاب مانگتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا اور بلاشبہ آپ کے رب کے ہاں ایک دن تمھاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس کی طرح ہے۔“ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہر چیز جو آنے والی ہے، وہ قریب ہے اور بعید وہی ہے، جو تمام ہوگئی اور گزر چکی ہے۔

رہی یہ بات کہ اقتراب کی نسبت حساب کی طرف کی، قیامت کی طرف نہ فرمائی جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ [القمر۔ ١] حالانکہ حساب تو قیامت قائم ہونے کے بعد ہوگا کہ قیامت میں حساب بھی ہوگا اور اس کے سوا اور سارے حالات اور ہولناکیاں بھی ہوں گی، لہٰذا وجہ اس کی یہ ہے کہ کلام کا سیاق اسی طرف ہے کہ حساب سے اُن کی غفلت بیان کی جائے اور اُن کا اس چیز سے منہ پھیرنا بیان کیا جائے، جو کہ ان کو حساب کی یاد دلائے، یعنی قیامت میں اگرچہ حساب وغیرہ بھی ہو گا، لیکن یہاں پر گفتگو اسی میں ہے کہ حساب تو نزدیک آ لگا ہے اور وہ اس سے غافل اور منہ موڑے ہوئے ہیں، پس اس جگہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ اقتراب کی نسبت حساب کی طرف کی جائے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے حساب کا وقت قریب آ پہنچا، یعنی قیامت جس طرح کہ اس قول میں ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾[1] [القمر۔ ١] اور خوف کو داخل کرنے کے لیے ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ کو حساب سے پہلے ذکر کیا۔ اور اقترابِ وقتِ حساب کے معنی یہ ہیں کہ حساب کا وقت اُن کے قریب ہے، کیوں کہ وہ ہر گھڑی اُن سے قریب تر ہے اس گھڑی کی نسبت جو اس سے پہلے ہے، یا اس لیے کہ ہر آنے والی شے قریب ہے اور بعید وہی شے ہے جو منقرض ہو، یعنی جو وقت کٹ گیا اور گزرا ہوا ہو گیا اور ہر انسان کی موت اس کی قیامت کا قائم ہونا ہے اور قیامت بھی قریب ہے بہ نسبت اس زمانے کے جو گزر چکا ہے، پس جو زمانہ دنیا سے باقی رہا، وہ کمتر ہے گزرے ہوئے زمانے سے۔ غرضیکہ حساب قریب آ لگا ہے یا حساب کا وقت لگ بھگ آ گیا ہے، حاصل ایک ہی ہے۔

اب ذرا کلام پاک کی بلاغت پر تو غور کرو کہ اس ایک جملے میں کیا کیا حسن بھرا ہوا ہے۔ تقدیم و تاخیر نے کیا کچھ رنگ دکھایا ہے۔ مضمون صرف اس بات کی خبر دینا ہے کہ لوگوں کا حساب نزدیک ہو گیا ہے تو یوں چاہیے تھا کہ عبارت اس معنی کی ترتیب پر ہوتی، مگر ایسا نہ کیا، بلکہ عبارت کو یوں تغیر دیا کہ مضاف الیہ یعنی "الناس" کو پہلے رکھا اظہارِ لام کے ساتھ، وہ لام جس پر اضافت کے ساتھ دلالت کی گئی تھی اور مضاف، یعنی حساب کو معرف بلام کیا، اس

[1] معاني القرآن (٣/ ٣٨٣)

لیے کہ تعریف باضافت کی عوض ہو جائے، یہ اس واسطے کیا کہ تفصیل بعد الاجمال کا فائدہ دے۔ جس طرح کہ ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴾ [طٰہٰ: ۲۵] میں کیا ہے۔ اس طرح کرنے کے بعد عبارت یوں ہوئی: ''اقترب للناس الحساب'' پھر اس عبارت کو یوں بدلا کہ لام کی تعریف کو اضافت کی تعریف سے بدلا کہ ڈانٹ ڈپٹ کے لیے حساب کو ضمیر ناس کی طرف مضاف کیا، یعنی حساب انہی لوگوں کا ہے۔ اب عبارت کا اسلوب یہ ہوا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ ﴾ حرفِ لام اقترب سے متعلق ہے، یعنی جن کا حساب نزدیک آ لگا ہے وہ وہی لوگ ہیں، یا تاکید اضافت کے واسطے ہے، یعنی حساب جو ضمیر کی طرف مضاف ہے، یہ لام اس کی تاکید کرتا ہے۔

﴿ لِلنَّاسِ ﴾ کا ﴿ حِسَابُهُمْ ﴾ پر مقدم ہو جانا مضر نہیں ہے، کیونکہ وہ حال ہے حساب سے، غرضیکہ اللہ پاک نے فرمایا کہ اُن لوگوں کا حساب نزدیک آ لگا ہے اور حالت یہ ہے کہ ﴿ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی وہ حساب سے غفلت میں ہیں اور اس میں غور و فکر کرنے سے منہ موڑتے ہیں۔ ﴿ هُمْ ﴾ مبتدا ہے ﴿ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ خبر ہے دوسری خبر ﴿ مُعْرِضُوْنَ ﴾ ہے اور جملہ بنا برحال محلِ نصب میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ حال ہو ضمیر ﴿ مُعْرِضُوْنَ ﴾ سے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ غفلت میں ہیں اپنے حساب سے اور اس معاملے سے جو اُن کے ساتھ دنیا میں کیا جائے گا۔ آخرت سے منہ موڑتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانا اور اس کے فرائض پر قائم رہنا اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنا جو اُن پر واجب تھا، اس کے لیے آمادہ اور تیار نہیں ہوتے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے جو یہاں لکھا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حساب کا اول وقت مقدر ہے اور حساب بہ معنی محاسبہ ہے اور ضمیر کی طرف حساب کی اضافت، مصدر کی مفعول کی طرف اضافت ہے، یعنی اللہ پاک کا اُن سے حساب لینے اور جزا دینے کا وقت نزدیک آ لگا ہے۔ اس وقت سے مراد روزِ قیامت ہے۔ اس کو قریب ہونے کے ساتھ اس لیے موصوف کیا ہے کہ باقی زمانہ گزرے ہوئے زمانہ کی نسبت تھوڑا ہے اور ہر آنے والی شے قریب ہوتی ہے اور حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے حساب سے اور اس معاملے سے جو اُن کے ساتھ کیا جائے گا غافل ہیں اور اس دن کے لیے تیاری کرنے سے روگرداں ہیں۔ پس اقتراب تو عام ہے اور غفلت اور منہ موڑنا لوگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف انداز پر ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ تو اپنے حساب سے اس لیے غافل ہیں کہ اپنی دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے مولیٰ اور مالک سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور بہت سے اپنے حساب سے اس لیے غافل ہیں کہ اپنے مولیٰ میں فانی ہو رہے ہیں اور دنیا سے منہ پھیرے ہوئے ہیں، یہ لوگ اس وقت تک ہوش میں نہیں آئیں گے، جب تک اپنے مولیٰ کا دیدار فائض الانوار نہ کرلیں اور پہلی قسم کے لوگ ہوشیار نہ ہوں گے مگر مردوں کے لشکر میں۔ پس تجھ پر یہ بات واجب ہے کہ تو خود اپنے نفس کا محاسبہ کر اس سے پہلے کہ تجھ سے حساب لیا جائے اور اللہ کے سامنے پیش ہونے

کے لیے ہوشیار ہو جا، اس سے پہلے کہ تجھے ہوشیار کریں اور غافل لوگوں سے منہ موڑ لے اور ساری مخلوق کے خالق کی یاد میں مشغول ہو جا، تاکہ رب العالمین کی ملاقات سے بہرہ مند ہو۔[1]

کلام پاک کی بلاغت میں ذرا غور کرو کہ ﴿ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ جملہ حالیہ ہے۔ مضمونِ حال غافلین یا معرضین کہہ کر بھی ادا ہو سکتا تھا، مگر باوجود اختصار کے یوں نہ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کے منکرین حساب کتاب کو بعید سمجھتے تھے، پس حال کا تقاضا تھا کہ حساب کے قریب ہونے کا ذکر کیا جائے۔ لہٰذا اللہ پاک نے اس کے قرب کو کس قدر خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا کہ "قَرُبَ" کے بجائے ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ ذکر فرمایا، جس میں قرب کی نسبت زیادہ قریب ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ پھر اہتمامِ مدعا کے لیے اس کو مقدم کیا، یعنی پہلے رکھا۔ پھر عبارت کو دو چکر دیے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، مقصد یہ ہے کہ جس قدر وہ اس کو دور جانتے ہیں اتنا ہی وہ نزدیک آ لگا ہے۔

پھر یہ مطلب بیان کرنا چاہا کہ جس قدر وہ نزدیک آ لگا ہے، اسی قدر اُن کو اس سے غفلت اور بے پروائی ہے۔ لہٰذا یہ مضمون اس طرح ادا کیا کہ جملہ اسمیہ ذکر فرمایا، جو کہ ثبات و استمرار اور ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے، یعنی ادھر تو حساب انتہائی قریب اور ادھر اس سے غفلت پر استمرار و ثبات و دوام۔ پھر "وَهُمْ غٰفِلُوْنَ" نہ کہا، بلکہ ﴿ فِيْ غَفْلَةٍ ﴾ فرمایا، یعنی اُن کی غفلت اس درجے کو پہنچی ہے کہ وہ ظرف بن گئی ہے اور وہ مظروف ہو گئے ہیں، جس طرح کہ ظرف اپنے مظروف کو گھیر لیتا ہے، اسی طرح غفلت نے سب طرف سے اُن کو گھیر لیا ہے۔ ان میں عقل و ہوش کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ مجسم بہ غفلت ہو گئے ہیں۔ اللہ پاک کے کلام پاک کی بلاغت ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ بشر کی کیا طاقت کہ اس کو بیان کر سکے۔ یہ تو ایک بات تھی، جو اس وقت خیال میں آئی۔ مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، تفاسیر میں، وہ تو اس کے بحرِ اعظم میں سے ایک ذرہ ہے اور اس کے گہرے اور وسیع سمندر سے ایک قطرہ ہے۔ اس کے ہر کلمے اور جملے میں ایک ایسی دل رُبائی اور دل کشی ہے، جس کو علما و عرفا کے قلوب جانتے پہچانتے ہیں، کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

محذرات سرا پردہ ہائے قرآنی   چہ دلبرند کہ دل برند پنہائی

"قرآنی تقویٰ کے شامیانے روح کو اس انداز سے قابو کرتے ہیں کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔"

ہر آدمی اپنی استعداد کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتا ہے، مزہ لیتا ہے، لذت اٹھاتا ہے: ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد   برنگ اصحابِ صورت را بہ بو اربابِ معنی را

"اس کے حسن کی کیفیت کی بہار دل و جان کو ہمیشہ تازہ رکھتی ہے۔ ظاہر پرستوں کو رنگ سے اور اہلِ باطن کو خوشبو سے۔"

پھر اللہ پاک نے اُن کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ بیان فرمائی۔ وہ وجہ یہ ہے: ﴿ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ

[1] تفسیر النسفي (٣/ ٧٣۔ ٧٤)

﴿ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ۝۲ لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ ﴾ (آیت باب) یعنی اُن کے پاس اُن کے رب سے جب بھی کوئی نئی نصیحت آتی ہے کہ اُن کو خوابِ غفلت و جہالت سے بیدار کرے تو وہ اس کو کھیل کود میں لگے ہوئے ہی سنتے ہیں۔ یعنی اس سے استہزاء کرتے ہیں، اس کا تمسخر اُڑاتے ہیں، اس کو کان لگا کر مان لینے کی غرض سے نہیں سنتے اور اس میں غور وفکر کرنے سے غفلت برتتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی غفلت انتہا درجے کو پہنچ گئی ہے اور امور میں غور کرنے اور انجام میں غور وفکر کرنے سے پَرلے درجے کی بے پروائی کرتے ہیں، کیونکہ اگر کم درجے کی غفلت ہوتی تو ہوشیار کرنے سے ہوشیار ہو جاتے، حساب کے لیے تیار و آمادہ ہو کر اس کا ساز و سامان درست کر لیتے۔

پہلا کلمہ ﴿ مِنۡ ﴾ زاید ہے جو استغراق کے لیے لایا گیا ہے۔ ذکر فاعل ہے ﴿ يَاۡتِيۡهِمۡ ﴾ کا۔ اس سے مراد قرآن شریف ہے۔ دوسرے ﴿ مِنۡ ﴾ میں تین وجہیں ہیں: ان میں سے بہترین وجہ یہ ہے کہ ﴿ يَاۡتِيۡهِمۡ ﴾ سے متعلق ہو اور مجازاً ابتدائے غایت کے لیے ٹھہرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محذوف سے متعلق ہو، اس بنیاد پر کہ ﴿ مُّحۡدَثٍ ﴾ کی ضمیر مستقر سے حال ٹھہرے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ نفس ﴿ ذِكۡرٍ ﴾ سے حال ہو، اگرچہ ﴿ ذِكۡرٍ ﴾ نکرہ ہے، مگر ﴿ مُحۡدَثٍ ﴾ کی صفت پڑ جانے سے اس کو تخصیص ہو گئی، اس لیے وہ ذوالحال ہو سکتا ہے۔ سمین نے اسی طرح کہا ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے صرف دو وجہیں ذکر کی ہیں: ایک یہ کہ ﴿ ذِكۡرٍ ﴾ کی صفت ہے، دوسری یہ کہ ﴿ يَاۡتِيۡهِمۡ ﴾ سے متعلق ہے۔[1] ﴿ مُحۡدَثٍ ﴾ کو عام لوگوں نے زیر سے پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ذکر کی صفت ہے۔ ان الفاظ کی بنا پر امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر مرفوع ہو ﴿ مِنۡ ذِكۡرٍ ﴾ کی جگہ پر تو جائز ہے،[2] یعنی لفظاً تو ذکر مجرور ہے اور محلاً مرفوع ہے، کیونکہ فاعل ہے۔ حدیث و محدث کے معنی ہیں نیا، یعنی قدیم کی ضد۔ اگر کوئی کہے کہ ﴿ ذِكۡرٍ ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے اور ﴿ مُحۡدَثٍ ﴾ اس کی صفت واقع ہوئی ہے، حالانکہ قرآن شریف قدیم ہے، اس لیے کہ قدیم کی صفت ہے، یعنی اللہ پاک کی تو اُس کے تین جواب ہیں: اول یہ ہے کہ قرآن محدث سے مراد قرآن کا انزال محدث ہے، یعنی قرآن کے الفاظ ﴿ مُحۡدَثٍ ﴾ ہیں نزول میں، جبریل علیہ السلام سورت سورت اور آیت آیت لا کر تلاوت کرتے تھے حسبِ موقع و محل۔ جس وقت جو حادثہ واقع ہوتا اس کے مطابق آیت یا سورت لے کر اترتے، یہ معنی ہیں محدث کے نہ یہ کہ قرآن کے معنی محدث ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ﴿ ذِكۡرٍ ﴾ سے مراد قرآن شریف نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد قرآن کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ ہیں اور آپ کے سوا اور لوگوں کی نصیحتیں ہیں، چونکہ ہر واعظ کی نصیحت اللہ پاک کے الہام اور ہدایت سے

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ٨١۔ ٨٢) [2] التبیان فی أعراب القرآن (٢/ ٩١١)

ہوتی ہے، اس لیے اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ﴿ ذِکْرٍ ﴾ سے مراد ذاکر ہے اور وہ نبی اکرم ﷺ ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (آیتِ باب) اس آیت کے سیاق میں اس قول کی تائید کرتا ہے۔ اس بنیاد پر ﴿ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ ﴾ کے معنی یہ ہوں گے کہ مگر وہ آپ کے ذکر و موعظت کو سنتے ہیں۔ انموذج میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

قرآن شریف کے حدوث وقدیم ہونے کا مسئلہ:

فتح البیان و فتح القدیر میں ہے کہ ذکر کا وصف جو محدث کے ساتھ کیا، اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ قرآن شریف محدث ہے، کیونکہ اس جگہ ذکر، قرآن شریف ہے۔ اس کا جواب یوں دیا ہے کہ جو اصوات (آوازوں) اور حروف سے مرکب ہے، اس کے حدوث ہونے میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے، کیونکہ وہ نزول میں جدید ہے۔ پس معنی یہ ہیں کہ اس کی تنزیل محدث ہے۔ جھگڑا جو ہے، تو وہ کلامِ نفسی میں ہے۔ اسی مسئلہ حدوث و قِدَمِ قرآن کی وجہ سے بہت سے اہلِ علم وفضل جو مامونیہ و معتصمیہ و واثقیہ کے دورِ حکومت میں تھے، آزمایش میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پر جو تکلیف گزری وہ گزری کہ اُن کو سخت مار پڑی، بہت طویل مدت تک قید میں رہے اور اسی کے سبب سے محمد بن نصر خزاعی کی گردن ماری گئی، اس وقت اور اس کے بعد ایک عظیم فتنہ برپا ہوا۔ یہ قصہ اس سے زیادہ تر مشہور ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے، جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کی حقیقت سے متعلق واقف ہو تو وہ امام احمد رحمہ اللہ کے ترجمہ (حالاتِ زندگی) کا مطالعہ کرے، جو مورخِ اسلام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب "النبلاء" میں دیا گیا ہے۔ ائمہ سنت نے صحیح بات کو اختیار کیا، یعنی اس سے باز رہے کہ خلق وحدوثِ قرآن کے قائل ہوں اور اس کو مانیں۔

اللہ پاک نے اُن کے سبب سے اپنے نبی کی اُمت کو بدعت سے بچا لیا، لیکن اللہ تعالیٰ اُن پر رحم فرمائے، اس سے جزمِ قدمِ قرآن کی طرف تجاوز کر گئے اور اس پر اقتصار نہ کیا، بلکہ جو شخص حدوث کا قائل ہوا، اس کی تکفیر کر ڈالی، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے کہ جس شخص نے یوں کہا کہ "لَفْظِي بالقرآن مَخْلُوْقٌ" (میری زبان سے نکلے ہوئے قرآن کے الفاظ مخلوق ہیں) اس کی بھی تکفیر کر دی، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے کہ جس شخص نے وقوف کیا، اس کو بھی کافر کہہ دیا۔ کاش وہ وقف کی حد سے آگے نہ بڑھتے اور علم کو علام الغیوب کی طرف رجوع کرنے سے تجاوز نہ کرتے، کیوں کہ سلف صالحین صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ ومن بعدہم سے اس محنت کے قائم ہونے اور اس مسئلے میں گفتگو ظاہر ہونے تک سے کچھ کلام نہیں سنا گیا۔ نہ اُن سے اس بارے میں کوئی کلمہ منقول ہوا۔ اس لیے بہتر سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ جس بات کی طرف اُن کو بلایا گیا تھا، اس سے باز رہتے اور وقف کے دامن کو خوب مضبوطی سے پکڑتے اور اس کے علم کو اس کے عالم کی طرف لوٹاتے، اسی میں سلامتی اور خلوص تھا، اللہ کے بندوں کے مختلف

گروہوں کی تکفیر سے۔ و الأمر لله سبحانه۔[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ ﴾ استثنائے مفرغ ہے، محل اس کا نصب ہے، اس بنا پر کہ حال ہے ﴿ يَاْتِيْهِمْ ﴾ کے مفعول سے اور "قد" مقدر ہے۔ ﴿ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ حال ہے ﴿ اِسْتَمَعُوْهُ ﴾ کے فاعل سے۔ ﴿ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ﴾ ﴿ يَلْعَبُوْنَ ﴾ کی واؤ سے حال ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے یوں کہا کہ ہوسکتا ہے کہ ﴿ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ﴾ اس شخص کے نزدیک جو حال کے تعدد کو جائز سمجھتا ہے، ﴿ اِسْتَمَعُوْهُ ﴾ کے فاعل سے حال ہو۔ تو اب یہ اور ﴿ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ دو حالِ مترادف، یعنی ہم معنی ہوں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حال ہو ﴿ يَلْعَبُوْنَ ﴾ کے فاعل سے۔ تو اب دو حالِ متداخل ہوں گے، یعنی حال در حال۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ ﴿ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ اور ﴿ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ﴾ دو حال مترادف یا متداخل ہیں[3] اور جس وقت یہ دونوں دو حال مترادف ٹھہرائے جائیں گے تو اس میں حال صریح کی غیر صریح پر تقدیم ہوگی اور اس میں وہی بحث ہے، جو بابِ نعت میں ہے۔ ﴿ قُلُوْبُهُمْ ﴾ مرفوع ہے ﴿ لَاهِيَةً ﴾ سے، یعنی اس کا فاعل ہے۔ عامہ کی قراءت ﴿ لَاهِيَةً ﴾ کے نصب سے ہے اور ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے پیش کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ وَهُمْ ﴾ کی دوسری خبر ہے۔[4] یہ اس شخص کے نزدیک ہے جو اس کو جائز بتاتا ہے اور جو اس کو جائز نہیں رکھتا اس کے نزدیک مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔

لہو و لعب کھیل کو کہتے ہیں۔ لہو کے معنے کھیلنا ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَاهِيَةً ﴾ ماخوذ ہے: "لهٰى عنه إذا غفل و ذهل" سے، یعنی جب کوئی شخص کسی شے سے غافل و ذاہل ہو جاتا ہے تو عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "لهٰى عنه" یعنی وہ اس سے غافل ہوگیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دل اس شے سے غافل ہیں، جو ان سے مراد اور مطلوب ہے۔ ابوبکر وراق رحمہ اللہ نے کہا کہ "قلب لاهي" وہ ہے جو کہ دنیا کی زیب و زینت و رونق میں مشغول ہو اور آخرت اور اس کی ہولناکیوں سے غافل ہو۔[5] معنی یہ ہیں کہ نہیں آتی اُن کے پاس قرآن شریف سے کوئی شے اور اُن کے رب کی طرف سے کوئی آیت جس کا نزول تازہ بہ تازہ ہوا ہے، تاکہ اُن کے کانوں پر بار بار تنبیہ کرے کہ وہ نصیحت پکڑیں کسی بھی حال میں، مگر اس حال میں کہ وہ اس کو باقاعدہ نبی کریم ﷺ سے یا آپ کے سوا کسی اور شخص سے سنتے ہیں، جو اس کو پڑھتا ہے تو اس سے استہزا کرتے ہیں اور عبرت نہیں پکڑتے نہ نصیحت پذیر ہوتے ہیں، اس حال میں کہ اُن کے دل اس کے معنی سے غافل ہیں۔

رہی یہ بات کہ اس جگہ کلمہ ﴿ ذِكْرٍ ﴾ اختیار فرمایا۔ یہ شاید ۔ والله أعلم۔ اس لیے فرمایا ہو کہ یہ شامل ہے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٤٤) فتح البيان (٨/ ٣٠١-٣٠٢) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٥٤) [3] الكشاف (٣/ ١٠٢)
[4] روح المعاني (١٧/ ٧) [5] تفسير النسفي (٣/ ٧٤)

قرآن شریف و آیت و سورت اور نبی کریم ﷺ کے فرمان اور نصیحت کو۔ یہ سب امور ذکر میں داخل ہیں۔ یا قرآن شریف کو پیرایۂ ذکر میں اس لیے ذکر کیا کہ سارا قرآن وعظ و نصیحت و خیر خواہی ہے۔ انسانیت اسی بات کو چاہتی ہے کہ جو بات خیر خواہی کی سنے، اس کو جلد مان لے اور اس پر عمل کرے، نہ یہ کہ اس کو رد کر دے، اس پر کان نہ رکھے، ہنسی اور ٹھٹھے میں اس کو اُڑا دے۔ ﴿ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ﴾ فرمایا: "مِنَ اللّٰهِ" نہ کہا۔ اس لیے کہ اول تو وہ بات خیر خواہی کی ہے، پھر اس پر طرہ یہ کہ ایسی ذات پاک سے آئی جو کہ پالنے والا، رزق دینے والا، پرورش کرنے والا ہے۔ ہر لحظہ اس کی نعمتوں میں لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں، اس کے پاس سے جو نصیحت آئے گی، وہ تو سراسر خیر و برکت ہوگی، اس کو ضرور سنتے ہی قبول کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے نہ یہ کہ لہو و لعب اور دل کی غفلت سے سن کر اُڑا دی جائے۔ "مِنۡ رَّبِّهِمۡ وَ مُحۡدَثٍ" دونوں ذکر کی صفتیں ہیں۔

﴿ مُحۡدَثٍ ﴾ کو بعد میں رکھنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اگر محدث پہلے ہوتا تو شبہہ پڑتا کہ ﴿ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ﴾ اس سے متعلق ہے۔ بعد میں رکھنے سے وہ شبہہ دور ہو گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مدعا کا اہتمام اسی کا مقتضی ہے کہ ﴿ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ﴾ ذکر سے ملا ہوا ہو۔ واللہ أعلم. یہ بیان تو اُن کی خباثتوں، گناہوں کا تھا، جن کے وہ عادی اور خوگر ہو رہے تھے کہ جب کوئی آیت و سورت تازہ بہ تازہ اُن کی تنبیہ و توبیخ کے لیے نازل ہوتی تو اس کو لہو و لعب میں ٹال دیتے تھے۔

اللہ پاک نے اس کے بعد ان کی ایک خاص جنایت (گناہ، قصور) کا ذکر فرمایا اور اس کو کلامِ مستأنف کے پیرائے میں ادا کیا، وہ یہ ہے کہ ﴿ وَاَسَرُّوا النَّجۡوَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ﴾۔ اسرار پوشیدہ بات کرنے کو کہتے ہیں۔ نجویٰ اسم مصدر ہے تناجی سے۔ تناجی کے معنی ہیں باہم راز گفتن (ایک دوسرے سے راز کی بات کرنا) اور نجویٰ کلامِ پوشیدہ کو کہتے ہیں۔ پس جب نجویٰ خود کلامِ پوشیدہ ٹھہرا تو اس کے پوشیدہ کرنے کے کیا معنی ہوئے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کے دو مطلب ذکر کیے ہیں: ایک یہ کہ نجویٰ کے اخفاء میں مبالغہ کیا، دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس نجویٰ کو ایسی جگہ کیا کہ اُن کا اس کے ساتھ سرگوشی کرنا پوشیدہ رہا۔[1]

ان دونوں معنوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے معنی کے مطابق نجویٰ پوشیدہ کلام ہے اور دوسرے معنی میں مصدر ہے بمعنی مسارت۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اول معنی بدون معنی ثانی کے پائے جائیں گے، اس صورت میں کہ جس وقت لوگوں کے روبرو پوشیدہ بات کریں اور پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کریں تو اب مسارت معلوم ہوگی اور جس بات کو باہم پوشیدہ کیا، وہ غیر معلوم ٹھہرے گی۔ یعنی حاضرین کو اتنا معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے کوئی پوشیدہ بات کہی، مگر اس بات کا علم نہ ہوگا کہ کیا تھی اور دوسرے معنی بدون معنی اول کے اس صورت میں پائے جائیں گے کہ جس وقت ایسی

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٤٥)

جگہ میں پوشیدہ باتیں کریں، جو دوسروں سے خالی ہو اور پوشیدہ کرنے میں مبالغہ نہ کریں تو اب غیر کو پوشیدہ بات کرنا بھی معلوم نہ ہوگا، کیونکہ وہاں سوا اُن کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ اس صورت میں اُن کی سرگوشی کا علم کسی کو نہ ہوگا نہ اجمالاً نہ تفصیلاً۔ غرضیکہ انھوں نے اپنی سرگوشی کو چھپانے میں خوب مبالغہ کیا۔ اس بات کو جو پوشیدہ کہا تو اس لیے کہ وہ لوگ شر و عناد و تمہید مقدمات کے ابتدا کرنے میں مکر اور فساد میں تھے۔ اس سرگوشی سے اُن کی مراد ایسی شے کو طے کرنے کے لیے مشورہ کرنا تھا کہ جس سے نبی کریم ﷺ اور قرآن شریف کے کام کو گرا دیں اور عامۃً سب لوگوں پر اس کا فساد ظاہر کر دیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ اَسَرُّوا ﴾ اضداد سے ہے، یعنی انھوں نے اپنے کلام کو چھپایا یا اس کا اظہار اور اعلان کیا۔ ﴿ اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ﴾ کے محل میں سات قول ہیں۔ اول یہ ہے کہ محلِ رفع میں ہے، بدل ہے ﴿ اَسَرُّوا ﴾ کے واوَ سے۔ كذا في فتح القدير.

مبرد وغیرہ اسی کے قائل ہیں، یعنی جنھوں نے سرگوشی کے چھپانے میں مبالغہ کیا، یہی وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے ظلم کیا۔ اس بدل کا فائدہ اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جس بات کو انھوں نے پوشیدہ کہا ہے، وہ اس میں ظالم ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ محلِ رفع میں ہے بنا بر ذمّ۔ تیسرا یہ ہے کہ فاعل ہے فعل محذوف کا۔ تقدیر یہ ہے: "يقول الذين ظلموا" امام نحاس رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہے: "بتقدير أعني"۔ پانچواں محلِ جر میں ہے، اس بنیاد پر کہ بدل ہے ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ سے۔ اس کو مبرد نے ذکر کیا ہے۔ چھٹا محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَسَرُّوا ﴾ کا فاعل ہے، اس شخص کی لغت کے مطابق جو دو فاعل کے درمیان جمع کرنا جائز کہتا ہے، جیسے یہ قول ہے: "أكلوني البراغيث" اس قول کو امام اخفش رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ واو علامت جمع کا ہے، یعنی ضمیر کا واو نہیں ہے[1] اور اسی کے مثل اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ﴾ [المائدة: ۷۱] "مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ پھر اندھے اور بہرے ہوگئے۔" ساتواں قول یہ ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی "وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا أَسَرُّوا النَّجْوٰی" امام کسائی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں،[2] یعنی موصول تو مبتدا ہے اور جملہ متقدم اس کی خبر ہے۔ اصل اس کی یوں تھی: "وَهٰؤُلَاءِ أَسَرُّوا النَّجْوٰی" پھر اُن کے فعل پر اس بات کی تسجیل و پختگی کرنے کے واسطے کہ وہ ظلم ہے۔ موصول کو بجائے "هٰؤُلَاءِ" کے رکھ دیا۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اُن میں سے چار قول ذکر کیے ہیں: اول اور دوسرا لیکن بجائے رفع کے منصوب علی الذم کہا ہے اور چھٹا اور ساتواں۔[3] اور امام نسفی رحمہ اللہ نے پانچ قول لکھے ہیں: اول اور دوسرا، لیکن بجائے رفع کے منصوب

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٢) [2] فتح القدير (٣/ ٥٤٤۔ ٥٤٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٢)

المحل علی الذم کہا ہے اور پانچواں، لیکن صفت یا بدل کہا ہے اور چھٹا اور ساتواں۔[1] محلی نے قولِ اول کو اختیار کیا ہے۔[2]
غرضیکہ مشرکوں ظالموں نے جس سرگوشی کو چھپانے میں مبالغہ کیا، وہ یہ ہے: ﴿ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ یہ دونوں جملے موضع نصب میں ہیں، نجویٰ سے بدل ہیں، یعنی پوشیدہ کہا انھوں نے اس بات کو، یا مفعول ہیں قولِ مقدر کے۔ یہ قول جواب ہے سوال کا جو ماقبل سے پیدا ہوا ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنی سرگوشی میں کیا کہا تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے یہ بات کہی۔

کلمہ ﴿ هَلْ ﴾ واسطے نفی کے ہے، یعنی نہیں ہے یہ، یعنی نبی ﷺ مگر ایک بشر ہے تم جیسا۔ گویا انھوں نے آپ کے بشر ہونے سے اس بات پر استدلال کیا کہ آپ رسالت کا دعویٰ کرنے میں جھوٹے ہیں، کیونکہ اُن کا اعتقاد تھا کہ رسول سوائے فرشتے کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ اور اس سے اس امر کا استلزام کیا کہ آپ جو کچھ خارقِ عادت اشیاء لائے ہیں، جیسے: قرآنِ مجید، وہ جادو ہے، اس لیے بہ ہمزۂ انکار یوں کہا: ﴿ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ ﴾ پھر کیا تم جادو میں پڑتے ہو: ﴿ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ حال ہے "تَأْتُوْنَ" کے فاعل سے انکار کی تقریر اور استبعاد کی تاکید کرتا ہے۔ یعنی جبکہ وہ تمھاری مثل بشر ٹھہرے اور تم سے کسی شے میں ممتاز نہیں ہیں اور جو کچھ وہ لائے ہیں، وہ جادو ٹھہرا تو پھر تم کیوں اُن کے پاس حاضر ہوتے ہو اور کس واسطے اُن کی پیروی کرتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے اور جانتے بوجھتے ہو کہ وہ بشر ہیں اور اُن کا لایا ہوا جادو ہے۔ پس اللہ پاک نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اُن کی سرگوشی پر مطلع کیا اور حکم دیا کہ ان کو یہ جواب دیں:

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴

اس (رسول) نے کہا: میرا رب آسمان اور زمین میں ہر بات جانتا ہے، اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (4)

کفار کے کذب و افتراء کا جواب:

امام حمزہ، علی، کسائی اور حفص رحمہم اللہ نے بصیغۂ ماضی بنا بر لفظ خبر پڑھا ہے اور ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف پھرتی ہے[3] اور اہلِ کوفہ کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے۔ باقی قاریوں نے بصیغۂ امر پڑھا ہے، کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہی قراءت ہے، کیوں کہ انھوں نے قولِ مذکور کو چھپایا تھا۔ پس اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو اس پر مطلع کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ اُن سے اس کے جواب میں یوں کہیں: ﴿ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ... الخ ﴾۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں قراءتیں صحیح ہیں اور بمنزلہ دو آیتوں کے ہیں۔[4] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فِي السَّمَآءِ... الخ ﴾ میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ محذوف سے متعلق ہے، اس بنا پر کہ قول سے حال ہے، یعنی "كائنا في السماء"

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ٧٤) (2) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٠) (3) تفسير البغوي (٥/ ٣١٠) (4) تفسير القرطبي (١١/ ٢٧٠)

امام محلی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] دوسری یہ ہے کہ ﴿ يَعْلَمُ ﴾ کے فاعل سے حال ہے۔ اس کو ابو البقاء نے ضعیف کہا ہے۔[2] یہ وجہ اسی لائق ہے کہ ممتنع ہو۔ تیسری یہ ہے کہ ﴿ يَعْلَمُ ﴾ سے متعلق ہے۔ یہ وجہ ماقبل کی وجہ سے قریب ہے، معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین میں جو بات کہی جاتی ہے، وہ اللہ پاک سے مخفی نہیں ہے، پس تم نے جس بات کے ساتھ سرگوشی کی ہے، وہ اس کو خوب جانتا ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ وہ ہر قائل کے قول کو جانتا ہے، وہ آسمان میں ہو یا زمین میں ہو، خفیہ آواز سے ہو یا اونچی آواز سے اور وہ اُن کے اقوال کا سننے والا ہے اور اس بات کو جاننے والا ہے، جو اُن کے دلوں میں ہے۔[3] جب اس کا علم اس درجہ پر محیط ہے تو جو بات انھوں نے پوشیدہ کہی وہ تو بہ دخول اولیٰ اس میں داخل ہوگی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے جو قول فرمایا، وہ اس آیت سے زیادہ موکد ہے، جس میں یوں فرمایا ہے: ﴿ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الفرقان: ٦] ''کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے۔''

کیونکہ قول میں ''سِرّ'' اور ''جَهر'' دونوں آ جاتے ہیں اور اس لیے کہ اُن کی سرگوشی بطریق برہانی اس کے علم میں شامل ہے۔ اسی لیے یہاں قول کو اختیار فرمایا ہے، کیونکہ اُن کا اپنی سرگوشی کو چھپانے میں مبالغہ کرنا اس بات کا مقتضی ہے کہ اللہ پاک کے اثباتِ علم میں مبالغہ کیا جائے، یعنی جیسا انھوں نے سرگوشی کو چھپانے میں مبالغہ کیا، ویسا ہی اللہ پاک نے اپنے علم کے اثبات میں مبالغہ فرمایا کہ اُن کی سرگوشی کو خوب جانتا ہے، کیونکہ وہ تو آسمان و زمین کی ہر چھپی اور کھلی بات کو خوب جانتا ہے۔ اس پر ان کا خفیہ رکھنا اور دل میں رکھنا مخفی نہیں ہے۔ قول اختیار کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ''أَسَرُّوا النَّجْوٰى'' کے مطابق ہو جائے۔ اس لیے کہ نجویٰ من جملہ قول ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ ان لوگوں نے جو افترا کیا، جھوٹ بنایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ جواب دیا: ﴿ قَالَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی جو ذات پاک اس کو جانتی ہے، اس پر کوئی پوشیدہ بات مخفی نہیں رہ سکتی اور اسی نے اس قرآن کو نازل فرمایا ہے، جو کہ اگلے پچھلے لوگوں کی خبروں پر مشتمل ہے، جس کا مثل کوئی نہیں لا سکتا، مگر وہی ذات ہو جو آسمانوں اور زمین میں ہر پوشیدہ بات کو جانتا ہے اور تمھارے اقوال کو سننے والا اور تمھارے احوال کو جاننے والا ہے۔ اس میں ان کے لیے تہدید اور وعید ہے، یعنی جب وہ تمھارے قول و حال کو سنتا اور جانتا ہے تو تم کو اس کی جزا اور سزا دے گا۔[4]

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٠) [2] التبيان في أعراب القرآن (٢/ ٩١٢)

[3] تفسير النسفي (٣/ ٧٤) [4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣١)

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝

بلکہ انھوں نے کہا: یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ اس نے جھوٹ گھڑ لیا ہے، بلکہ وہ شاعر ہے، لہٰذا اسے ہمارے پاس کوئی (ایسی) نشانی لانی چاہیے جیسے پہلے رسول بھیجے گئے تھے (5) ان سے پہلے کوئی بستی بھی جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہیں لائی تھی، کیا پھر یہ ایمان لائیں گے؟ (6)

کافروں کے قرآن اور صاحبِ قرآن کے بارے میں خیالات:

اللہ پاک کفار کی عیب جوئی و سرکشی و الحاد کی خبر دیتا ہے اور اس شے میں اختلاف کے بارے میں بتاتا ہے، جس کے ساتھ وہ قرآن شریف کا وصف کرتے تھے اور اس سے اُن کی حیرت کے متعلق بتاتا ہے۔ اس سے ان کے گمراہ ہونے کا بیان فرماتا ہے کہ کبھی تو وہ اس کو جادو ٹھہراتے ہیں، کبھی اس کو پریشان خواب بتاتے ہیں، کبھی جھوٹ باندھا ہوا بتاتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں: شعر ہے۔ غرضیکہ سرکشی اور عناد کے مارے اس کی شان میں کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ اور بکتے ہیں، حیران ہو رہے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے اور جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٨] ”دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کس طرح مثالیں بیان کیں؟ وہ گمراہ ہوگئے، لہٰذا وہ راستہ نہیں پا سکتے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلْيَاْتِنَا ﴾ سے اُن کی مراد یہ ہے کہ جس طرح صالح علیہ السلام اونٹنی لائے اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام آیات اور معجزات لے کر آئے، اسی طرح تم بھی کوئی نشانی لاؤ تو ہم ایمان لائیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ”اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا۔“ اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ ... الخ﴾ یعنی نہیں دی ہم نے کسی بستی والوں کو ان بستیوں میں سے جن میں رسول بھیجے گئے تھے کوئی نشانی اُن کے نبی کے ہاتھوں پر، پھر وہ اس پر ایمان لائے ہوں، بلکہ انھوں نے اس کی تکذیب کی، پھر تکذیب کی وجہ سے ہم نے اُن کو ہلاک کر ڈالا، پس کیا یہ لوگ ان لوگوں کے برعکس نشانیوں کو دیکھ کر ایمان لے آئیں گے، یعنی وہ تو ایمان نہ لائے، پھر کیا یہ ایمان لائیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٩٦- ٩٧] ”بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں، حتی کہ وہ دردناک

عذاب (بھی) دیکھ لیں۔'' یہ سب تو ہوا اور حال یہ ہے کہ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں پر آیاتِ باہرہ وحججِ قاطعہ و دلائلِ بینہ سے وہ نشانیاں دیکھ چکے ہیں جو ظاہر تر، واضح تر اور روشن تر اور قطعی اور زبردست ہیں، ان نشانیوں سے جو کہ آپ کے سوا اور انبیا علیہم السلام کے ہمراہ مشاہدہ کی گئیں، یعنی جب اُن نشانیوں کو دیکھ کر ایمان نہ لائے تو اب کیا اُمید ہے کہ اور کوئی نشانی آئے گی تو ایمان لے آئیں گے، درحقیقت اُن کا یہ مطالبہ اور فرمایش کچھ ایمان لانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف عیب جوئی اور سرکشی اور عناد ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے علی بن رباح لخمی سے روایت کیا ہے کہ مجھے اس شخص نے حدیث بیان کی جو سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا۔ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم مسجد میں تھے اور ہمارے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، وہ کچھ قرآن پڑھ رہے تھے کہ عبداللہ ابن سلول آیا اور اس کے ساتھ ایک گدیلہ اور چھوٹا تکیہ تھا، پس رکھا اور تکیہ لگایا، یہ عبداللہ ایک خوبصورت آدمی تھا، جو فصیح اور جھگڑالو تھا۔ اس نے کہا: اے ابوبکر! تم محمد ﷺ سے کہو کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائیں، جیسے اگلے لائے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام تختیاں لائے، یعنی تورات، داود علیہ السلام زبور لائے، صالح علیہ السلام اونٹنی لائے، عیسیٰ علیہ السلام انجیل اور دستر خوان لائے، پس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رو دیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نکلے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کھڑے ہو جاؤ رسول اللہ ﷺ کی طرف کہ ہم آپ سے اس منافق کی شکایت کریں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّهُ لَا يُقَامُ لِيْ إِنَّمَا يُقَامُ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ » یعنی میرا بدلا لینے کے لیے کھڑا ہونا نہ چاہیے کھڑا ہونا تو اللہ عزوجل ہی کے واسطے چاہیے۔ ہم نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! إنا لقينا من هذا المنافق" یعنی ہم کو تو اس منافق سے ایذا پہنچی ہے۔ پس فرمایا کہ بے شک جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا کہ تو نکل، پس خبر دے اللہ کی نعمتوں کی، جن کا تجھ پر انعام کیا گیا ہے اور اس کی فضیلت کی، جس کی تو فضیلت دیا گیا ہے، پس جبریل علیہ السلام نے مجھے بشارت دی کہ میں مبعوث ہوا ہوں ہر لال اور کالے کی طرف اور مجھے حکم دیا کہ میں جن کو ڈراؤں اور مجھے اپنی کتاب دی ہے، حالانکہ میں اُمی ہوں اور بخش دیے گئے میرے اگلے پچھلے گناہ اور ذکر کیا میرا نام اذان میں اور مجھے فرشتوں کے ساتھ مدد دی اور مجھے نصرت دی، یعنی فتح مندی اور میرے آگے رُعب کر دیا اور مجھے کوثر دیا اور قیامت کے دن میرے حوض کو تمام حوضوں سے زیادہ باعزت کیا اور مجھ سے مقامِ محمود کا وعدہ کیا: "والناس مهطعون مقنعون رؤوسهم" یعنی اور حال یہ ہے کہ لوگ اپنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے اور مجھے اُن لوگوں میں جو نکلیں گے زمرۂ اول میں کیا اور میری شفاعت سے میری اُمت کے ستر ہزار لوگوں کو بغیر حساب کے جنت میں داخل کیا اور مجھ کو غلبہ اور ملک دیا اور مجھ کو جنت کے اعلیٰ ظرف میں کیا جو جناتِ نعیم میں سب سے بلند ہے۔ پس نہیں ہے میرے اوپر کوئی بھی سوائے اُن فرشتوں کے جو عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں اور حلال کیا میرے لیے اور میری اُمت کے لیے غنیمتوں کو، حالانکہ ہم

سے پہلے وہ اور کسی کے لیے حلال نہیں ہوئیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "هذا حديث غريب جدا"[1]

﴿ اَضْغٰثُ ﴾ "ضغث" کی جمع ہے۔ "ضغث" کے معنی دستۂ گیاہ درآمیختہ خشک و تر ہے، یعنی سوکھی گیلی گھاس کا ملا ہوا پولا۔ اور ﴿ اَضْغٰثُ اَحْلَامٍ ﴾ پریشان خواب کو بولتے ہیں۔ صراح میں اسی طرح ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أخلاط رآها في النوم" یعنی غلط ملط باتیں ہیں جن کو خواب میں دیکھا ہے۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جھوٹا خواب۔ یزیدی نے کہا ہے کہ ﴿ اَضْغٰثُ ﴾ وہ خواب ہیں جن کی تاویل نہ ہو۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دقل الاحلام صرف وہ ایک خواب ہے کہ اس کو دیکھ لیا ہے،[3] یعنی اباطیل و اہاویل (ڈراؤنی چیزیں) جن کو خواب میں دیکھ لیا ہے، یعنی ردی خواب، بے کار ہولناک باتیں جن کو خواب میں دیکھ لیا ہے، ان کی کچھ اصلیت نہیں ہے۔ افتراء شعر سے جھوٹ باندھنے کو کہتے ہیں۔ اس جگہ مراد یہ ہے کہ ایک ایسا خواب ہے جو سننے والے کے خیال میں ایسے معانی ڈالتا ہے، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کو اُن میں رغبت دیتا ہے۔ کلمۂ بل اضراب کے واسطے آتا ہے اضراب اعراض (منہ پھیرنا) کی پھر یہ دو قسم ہے: ایک ابطالی، دوسرا انتقالی۔

ابطالی یہ ہے کہ اگر کلام مثبت ہے تو ماقبل کو باطل اور مابعد کو ثابت کر دے گا، مثلاً: زید آیا، بلکہ عمرو آیا، یعنی زید نہیں آیا عمرو آیا۔ انتقالی یہ ہے کہ ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف انتقال کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی جہاں ایک مطلب کو تمام کر کے دوسرا مطلب شروع کرنا مطلوب ہوتا ہے، وہاں اس بل کو لاتے ہیں، مطلب یہ کہ ایک بات تمام ہوگئی، دوسری شروع ہوئی، اب یہ جاننا چاہیے کہ یہاں اللہ پاک نے تین ﴿ بَلْ ﴾ ذکر فرمائے ہیں، اُن سے کیا مراد ہے۔ علامہ محلی نے یوں کہا ہے کہ تینوں جگہ میں انتقال کے واسطے ہے ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف۔[4] ابن مالک نے اپنی کافیہ کی شرح میں اسی طرح ذکر کیا ہے کہ قرآن شریف میں کلمہ ﴿ بَلْ ﴾ اسی طرز پر واقع ہوتا ہے۔ ابن مالک سے پہلے صاحبِ وسیط نے اس قول کو ذکر کیا ہے اور ابن حاجب نے وسیط والے کی موافقت کی ہے۔[5] لہٰذا مفصل کی شرح میں یہ کہا ہے کہ اول کا ابطال اور ثانی کا اثبات، اگر اثبات میں ہے تو بابِ غلط سے ہے، اس لیے قرآن شریف میں واقع نہیں ہوتا۔ ابن حاجب کا قول تمام ہوا۔ یہ قولِ کلام امام زمخشری رحمہ اللہ کے مخالف نہیں ہے،[6] کیونکہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اضراب سے تعبیر کیا ہے اور اضراب ابطالی اور انتقالی سے عام تر ہے، جس طرح کہ مغنی میں اس کی تصریح کی ہے۔ پس جو اضراب کہ یہاں ہے، وہ انتقالی پر محمول ہوگا، اب حق بات وہی ہے، جو ابن مالک نے کہی ہے اور جس شخص نے ابن مالک کو منسوب بہ وہم کیا، اسی نے وہم کیا۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٤۔ ٢٤٤٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ نیز "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[2] فتح القدیر (٣/ ٥٤٥) [3] تفسیر الطبري (١٨/ ٤١٢) [4] تفسیر الجلالین (١/ ٤٢٠)

[5] شرح الكافية (٣/ ١٢٣٣) المعجم الأوسط (١/ ٦٧۔ ٦٨) [6] الكشاف (٣/ ١٠٤)

اب اگر کوئی یہ کہے کہ مغنی میں دو آیتوں سے استدلال کیا ہے کہ اُن میں ﴿ بَلْ ﴾ ماقبل کے ابطال کے لیے ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٦] ''اور انھوں نے کہا: رحمٰن نے اولاد بنائی ہے۔ وہ (اس سے) پاک ہے، بلکہ وہ (فرشتے) تو (اللہ کے) معزز و مکرم بندے ہیں۔'' دوسری یہ ہے: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ [المؤمنون: ٧٠] ''یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے؟ (نہیں نہیں) بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا ہے۔'' تو کہیں گے، اُن میں کوئی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ ﴿ بَلْ ﴾ ان دونوں میں واسطے انتقال کے ہے۔ اللہ پاک نے اول کفار کے قول کی خبر دی کہ وہ کہتے ہیں رحمٰن نے اولاد رکھی۔

پھر اس خبر سے انتقال کر کے واقع کی خبر دی کہ جن کو کفار اولاد بتاتے ہیں وہ تو عزت والے بندے ہیں۔ دوسری آیت میں اللہ پاک نے کفار کے قول کی خبر دی کہ وہ تو اُن کے پاس سچی بات لایا ہے، اس کو جنون نہیں ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ بَلْ ﴾ یہاں ابطال کے واسطے صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں، تو ہاں ابطال کے لیے بن سکتا ہے، بہ نسبت مقول کفار کے اور اُن کا مقول جملے کا جزء ہے، پس واسطے ابطال معنی جملہ کے نہ ہوا، کون جملہ، جو کہ ﴿ بَلْ ﴾ کے پہلے ہے۔ انھیں آیتوں کی مثل یہ آیت ہے۔ یہ حاصل ہے امام کرخی رحمہ اللہ کی تقریر کا۔ مطلب یہ ہے کہ جو ﴿ بَلْ ﴾ ابطال کے واسطے ہوتا ہے، وہ جملہ ماقبل کے معنی کو باطل کر دیتا ہے اور جملہ مابعد کو ثابت کرتا ہے۔ مثلاً: ''جاءني زيد بل عمرو'' لہٰذا اول جملے کے معنی ہیں: زید کا آنا۔ ﴿ بَلْ ﴾ نے اس معنی کو باطل کر ڈالا اور اس کو عمرو کے واسطے ثابت کر دیا۔ پس مثلاً: پہلی آیت میں جملہ کے معنی یہ ہیں، کہنا اُن کا کہ ٹھہرائی رحمٰن نے اولاد۔ لہٰذا ﴿ بَلْ ﴾ نے ان کے اس مقول کو باطل کر دیا، ان کے قول کو باطل نہیں کیا، کیوں کہ انھوں نے تو بالیقین یہ بات کہی ہے اور اگر قول مقول پورے جملے کے معنی کو باطل کرے تو معنی یہ ہوں گے کہ انھوں نے یہ بات نہیں کہی، بلکہ ﴿ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ کہا۔ حالانکہ یہ بالکل خلافِ واقع ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی ہے۔ غرضیکہ حق بات یہی ٹھہری، کہ کلمۂ ﴿ بَلْ ﴾ قرآن شریف میں انتقال کے واسطے آتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس آیتِ کریمہ میں تینوں ﴿ بَلْ ﴾ کفار کی طرف سے ہیں، یا اللہ پاک کی جانب سے۔ لہٰذا اس میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ کفار کی طرف سے ہیں، اول تو انھوں نے قرآن شریف کو سحر ٹھہرایا، پھر اس کو چھوڑ کر پریشان خواب بتایا، پھر اس سے اضراب کر کے جھوٹ باندھا ہوا کہا۔ پھر اس سے اعراض کر کے شاعر کا قول قرار دیا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔[1] طیبی وغیرہ نے اس کو مشکل ٹھہرایا ہے۔ اشکال کی وجہ یہ ہے

[1] تفسير النسفي (٣/ ٧٤)

کہ اگر کفار کی طرف سے اضراب مراد ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: "قَالُوْا بَلْ أَضْغَاثُ أَحْلَام" پھر خود ہی یوں جواب دیا ہے کہ کلمۂ "قالوا أسروا النجوى" کی تاکید کے لیے مکرر کیا گیا ہے، کیونکہ وہ متضمن ہے معنی کلام کو۔ کبھی یہ جواب دیا کہ بابِ قلب سے ہے، یعنی اصل میں "قَالُوْا بَلْ" تھا، قلب کر کے ﴿ بَلْ قَالُوْٓا ﴾ کہہ دیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ پہلا ﴿ بَلْ ﴾ اس واسطے ہے کہ کفار نے جو نبی اکرم ﷺ کی شان میں اور جو آیات اور نشانیاں کہ آپ پر ظاہر ہوئیں، اُن کے حق میں تجاوز کیا، حد سے بڑھے کہ آپ کو دعوائے رسالت میں کاذب ٹھہرایا، قرآن شریف کو سحر بتایا، اللہ پاک نے اُن کے اُن کے اس تجاوز سے اضراب فرمایا طرف اس بات کے کہ وہ امرِ قرآن میں متفاوت ہیں، یعنی اول سحر کہا، پھر پریشان خواب بتایا اور دوسرا تیسرا ﴿ بَلْ ﴾ اس واسطے ہے کہ قرآن کو جو انھوں نے اباطیل ٹھہرایا، یعنی واہیات باتیں جو اُن کے خیال میں ڈال دی گئیں اور اُن پر خلط ملط ہوگئیں اس سے اس بات کی طرف اضراب کیا کہ وہ اباطیل بنائی ہوئی باتیں ہیں، جن کو اپنے جی سے بنا لیا ہے، پھر اس طرف اضراب کیا کہ وہ ایک کلام شعری ہے، جو سننے والے کے ذہن میں ایسے معانی ڈالتا ہے، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اُن میں سننے والے کو رغبت دیتا ہے، چونکہ پہلے قول میں بسبب تقدیم کلمہ ﴿ بَلْ ﴾ کے ایک طرح کا خفا تھا، اس لیے امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس دوسرے قول کو ظاہر کہا ہے۔[1] اس قول میں پہلا ﴿ بَلْ ﴾ تو اللہ پاک کی طرف سے ہے اور دوسرا تیسرا کفار کی طرف سے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ تینوں ﴿ بَلْ ﴾ اللہ پاک کی طرف سے ہیں، تاکہ اُن کے قول درجات فساد میں اُتارے جاسکیں۔ یعنی اُن کا دوسرا قول فاسد تر ہے پہلے سے اور تیسرا فاسد تر ہے دوسرے سے اور اسی طرح چوتھا تیسرے سے فاسد تر ہے، اس لیے کہ قرآن شریف کا شعر ہونا دور تر ہے اس کے مفتریٰ ہونے سے، کیونکہ وہ تو حقائق وحکم سے پُر اور مشحون ہے، اس میں وہ بات نہیں، جو شعرا کے قول کے مناسب ومشابہ ہو اور اس کا مفتریٰ ہونا دور تر ہے، اس کے پریشان خواب ہونے سے، کیونکہ وہ تو بہت سی غیب کی باتوں پر مشتمل ہے کہ واقع کے مطابق ہوئیں اور جو شے جی سے بنائی ہوئی ہوتی ہے، وہ ایسی نہیں ہوتی، بخلاف احلام کے۔ اور اس لیے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کا چالیس سے اوپر کئی برس تجربہ کیا، حالانکہ کبھی آپ سے کوئی جھوٹ نہیں سنا اور یہ بعید تر ہے، اس سے کہ قرآن سحر ہو، کیوں کہ سحر قرآن کا مجانس (ہم جنس) ہے، اس لحاظ سے کہ دونوں من جملہ خارقِ عادت ہیں۔ اس قول کو امام بیضاوی رحمہ اللہ نے "یجوز" کر کے بیان کیا ہے،[2] یعنی یہ قول بھی بن سکتا ہے، گو ظاہر وہی دوسرا قول ہے۔

غرضیکہ کفار نے قرآن کی شان میں جو یہ اضراب اور انتقال کیا، رنگ برنگ کی باتیں بنائیں متردد ہوئے، اس میں اس بات پر بڑی سے بڑی دلیل ہے کہ جو کچھ نبی اکرم ﷺ لائے، انھوں نے اس کی حقیقت کو نہ سمجھا، اس سے

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٣) [2] تفسير البيضاوی (٤/ ٨٣)

جاہل رہے نہ جانا کہ وہ کیا ہے نہ اس کی حقیقت کو پہچانا۔ یا انھوں نے جان لیا تھا کہ وہ حق ہے اور بلا شک اللہ کے پاس سے ہے، لیکن یہ چاہا کہ سینہ زوری سے اس کو دفع کریں اور ہر حجر و مدر سے اس کو ماریں۔ جس شخص پر حجت غالب ہو جاتی ہے اور دلیل اس کو مقہور و مجبور کر دیتی ہے، اس کی یہی حالت ہوتی ہے کہ حجت میں غالب نہیں ہو سکتا تو اِدھر اُدھر کی واہی تباہی باتیں بنا کر حق کو دفع کرنا چاہتا ہے، لیکن حق کب دفع ہو سکتا ہے، گو اس کے دفع کرنے میں کتنی ہی کوشش کی جائے، پھر اس سب کے بعد یہ بولے: ﴿ فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ ﴾ یہ جواب ہے شرطِ محذوف کا۔ سیاقِ کلام اس کو ظاہر کرتا ہے، گویا یوں کہا گیا کہ اگر وہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں بلکہ اللہ کے پاس سے رسول ہو کر آیا ہے تو چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لے کر آئے۔

﴿ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾۔ یہ صفت ہے آیت کی، یعنی ایسی نشانی کہ جو اس نشانی کی طرح ہو، جس کے ساتھ اگلے رسول بھیجے گئے ہیں، جیسے صالح علیہ السلام اونٹنی لائے اور موسیٰ علیہ السلام عصا و یدِ بیضا وغیرہ نشانیاں لے کر آئے اور عیسیٰ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو صحیح کر دیتے، مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے، اسی طرح تم بھی ہمارے پاس کوئی نشانی لاؤ۔ اس معنی کی بنیاد پر کاف کا محل جر ہے اور ''ما'' موصولہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''ما'' مصدریہ ہو، اس صورت میں کاف منصوب ہوگا، اس بنا پر کہ وہ مصدر تشبیہی ٹھہرے گا: "أي فليأتنا بآية إتيانا كائنا مثل إرسال الأولين" صحت تشبیہ کی اس جہت سے ہے کہ ﴿ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ معنی میں "كما أتى الأولون بالآيات" کے ہے۔ اس لیے کہ رسولوں کا بھیجا جانا معجزات کے لانے کو ظاہر کرتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ "أرسل محمد" اور "أتى محمد بمعجزة" کے درمیان کسی طرح کا فرق نہیں ہے تو اب تشبیہ ٹھیک ہوگئی۔ اُن کا یہ سوال گویا عیب اور سرکشی کا سوال تھا۔

یہ درخواست کچھ اس لیے نہیں کی تھی کہ اگر اُن کے حسبِ فرمایش نشانی آجائے تو ایمان لے آئیں گے، کیوں کہ اللہ پاک تو نشانیوں میں اُن کو وہ نشانیاں دے چکا تھا، جو کہ کافی وافی تھیں اور اگر اللہ پاک اس بات کو جان لیتا کہ جس وقت اُن کی طلب کردہ نشانی اُن کو دے گا تو وہ ایمان لے آئیں گے تو ضرور وہ نشانی اُن کو عطا فرما دیتا، جیسا کہ خود اس نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢٣] ''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنا دیتا، اور اگر وہ انھیں سنا دیتا تو بھی وہ ضرور پھرتے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں۔''

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے ایسی نشانیوں کی فرمایش کی تھی کہ اُن کے آنے کے بعد مہلت نہیں دی جا سکتی، یعنی اگر وہ نشانیاں آجائیں اور ایمان نہ لائیں تو فی الفور ہلاک کر دیے جائیں، ذرا بھی مہلت نہ ملے، پس اللہ پاک نے اُن کے اس سوال کا جواب یہ دیا: ﴿ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ

يُؤْمِنُوْنَ ﴾[1] (آیتِ باب) ﴿ قَبْلَهُمْ ﴾ کی ضمیر مشرکینِ مکہ کی طرف پھرتی ہے، قریہ سے مراد اہلِ قریہ ہیں، حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ فاعل میں تاکید کے لیے زیادہ کیا گیا ہے۔ ﴿ اَهْلَكْنٰهَآ ﴾ قریہ کی صفت ہے، یعنی نہیں ایمان لایا مکہ والوں سے پہلے کوئی قریہ ایسا قریہ کہ ہم نے اس کے رہنے بسنے والوں کو ہلاک کر دیا یا ہم نے اس قریے کو اس کے رہنے والوں کے ساتھ ہلاک کر دیا، ان کے فرمایش کرنے کے سبب سے۔ تو پھر ہم اُن کو وہ نشانی کیوں دیں، جس کی انھوں نے فرمایش کی ہے، حالانکہ یہ اپنے اگلوں کے مقتدی ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ تر سرکش ہیں۔ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ پاک کا یہ طریقہ اگلی اُمتوں میں جاری رہا ہے کہ اگر فرمایش کرنے والے اپنی فرمایش پا لینے کے بعد ایمان نہ لائے تو ضرور ان پر ایسا عذاب اُتر آیا، جس سے وہ سب کے سب یکبارگی ہلاک کر دیے گئے اور نیست و نابود کر دیے گئے، کوئی نہ بچا۔

﴿ اَفَهُمْ ﴾ میں ہمزہ تقریع (ملامت) و توبیخ (سرزنش) و انکار کے لیے ہے، یعنی ہلاک کردہ اُمتوں میں سے کوئی اُمت اُن کی فرمایش پوری کر دینے کے بعد ایمان نہ لائی تو پھر یہ لوگ کیوں کر ایمان لائیں گے، جب کہ اُن کو اُن کی فرمایش ملے گی۔ ہرگز نہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ مکہ والوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ جو بات تم کہتے ہو، جبکہ وہ حق ہے اور تم کو ہمارا ایمان لانا اچھا لگتا ہے تو تم ہمارے واسطے کوہِ صفا سونے کا کر دو، اس پر جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے۔ پھر عرض کیا کہ اگر تم چاہو تو جو تمھاری قوم نے تم سے سوال کیا ہے، وہ ہو جائے، لیکن اگر وہ ہو جائے گا، پھر وہ ایمان نہ لائیں گے تو اُن کو مہلت نہ ملے گی اور اگر تم چاہو تو اپنی قوم کا انتظار کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ میں اپنی قوم کا انتظار کروں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ ... الآية ﴾ نازل فرمائی۔[2] سبحان اللہ اس رحم و کرم کا کیا ٹھکانا ہے کہ ادھر سے تو وہ سختی اور درشتی اور ادھر سے یہ لطف اور نرمی۔ کیوں نہ ہو اِدھر ارحم الراحمین اُدھر رحمۃ للعالمین۔ المنۃ للہ کہ اس نے ہم گنہگاروں کو دو رحمتوں کے درمیان میں رکھا ہے۔ اللهم ارحمنا مرحمة تغنينا بها عن رحمة من سواك في الدنيا والآخرة و أجرنا من خزي الدنيا و عذاب البرزخ و يوم القيامة وصل وسلم و بارك على سيدنا محمد رحمة للعالمين شفيع المذنبين وعلى آله وصحبه آمين.

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۷

(اے نبی!) آپ سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ سب مرد ہی تھے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے، چنانچہ اگر تم خود نہیں جانتے تو اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو ⑦

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٣٨٤) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧٧)

تمام رسول بشر تھے:

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی تردید فرماتا ہے، جنھوں نے رسولوں کے بشر ہونے سے انکار کیا ہے۔ یعنی سارے رسول جو گزر چکے ہیں، یہی مرد تھے۔ ان میں فرشتوں سے کوئی نہ تھا، جیسا کہ دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [یوسف: ١٠٩] ''اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ [الأحقاف: ٩] ''کہہ دیجیے: میں رسولوں سے انوکھا نہیں۔'' اور پہلی اُمتوں سے نقل فرمایا ہے، اس لیے کہ انھوں نے اس کا انکار کیا تھا: ﴿ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ﴾ [التغابن: ٦] ''انھوں نے کہا: کیا بشر ہمیں راہ دکھائیں گے؟'' اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ فَسْـَٔلُوْٓا... الخ ﴾ یعنی اُمتوں میں سے جو اہلِ علم ہیں، اُن سے پوچھو، جیسے یہود و نصاریٰ اور باقی گروہ کہ آیا جو رسول اُن کے پاس آئے تھے، وہ بشر تھے یا فرشتے، حالانکہ وہ بشر ہی تھے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پر ایک نعمت ہے کہ اس نے اُن میں سے ایسے رسول بھیجے جو انھیں میں سے تھے کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کے احکام اور اُس کے پیغام لینے پر قادر ہوں۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان وغیرہ میں ذکر کیا ہے کہ کفار نے جو کہا تھا: ﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ سو اللہ پاک نے اس کا یہ جواب دیا کہ نہیں بھیجے ہم نے تم سے پہلے اگلی اُمتوں کی طرف مگر مرد من جملہ بشر کے، مخصوص تمھاری جنس کے افراد سے جو چنے جانے، انتخاب کیے جانے اور بھیجے جانے کے لائق اور قابل تھے اور ہم نے اُن کی طرف فرشتے نہیں بھیجے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٥] ''کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہو کر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے۔'' جملہ ﴿ نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾ مستأنفہ ہے ارسال کی کیفیت کے بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ﴿ رِجَالًا ﴾ کی صفت ہو، یعنی ہم نے اُن کی طرف ایسے مرد بھیجے، جو اس صفت کے ساتھ متصف تھے کہ اُن کی طرف وحی کی جائے۔ مضارع کا صیغہ حالِ ماضی بیان کرنے کے لیے ہے۔[2] امام حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے ﴿ نُوْحِيْٓ ﴾ نون کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قاریوں کی قراءت یائے تحتیہ کے ساتھ بصیغۂ مضارع مجہول ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے کفار کو حکم کیا کہ تم اہلِ ذکر، یعنی یہود و نصاریٰ سے یہ بات پوچھ لو، یعنی اگر تم اس بات کو نہیں جانتے ہو کہ اللہ کے رسول بشر سے ہوتے ہیں تو تم اہلِ کتاب سے پوچھ لو، کیوں کہ وہ نہ اس سے جاہل ہیں نہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٢) [2] فتح البیان (٨/ ٣٠٥۔ ٣٠٦) [3] فتح القدیر (٣/ ٥٤٦)

اس کا انکار کرتے ہیں۔علم کے دو مفعول چاہییں۔ لہٰذا یہاں ہوسکتا ہے کہ دونوں مراد ہوں، یعنی "لا تعلمون إن ذلك كذلك" اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں مراد نہ ہوں، یعنی "إن كنتم من غير ذوي الحلم" اور شرط کا جواب بہ سببِ دلالتِ ماقبل کے حذف ہوگیا ہے، یعنی "فاسئلوهم"۔ یہاں جو کفار کی طرف خطاب کو متوجہ فرمایا ہے، تو وہ سرزنش کرنے کے واسطے ہے اور اس لیے ہے کہ رُتبۂ تکبر سے اُن کو اُتارا ہے، یعنی اے جاہلو! نادانو! بے وقوفو! تم اہلِ کتاب سے پوچھو: کون اہلِ کتاب جو کہ اگلے رسولوں کے احوال سے واقف ہیں، وہ تم کو حقیقتِ حال کی خبر دے دیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ اللہ پاک نے مشرکینِ مکہ کو اس بات کا کیوں امر فرمایا کہ وہ اہلِ کتاب سے اگلے رسولوں کا حال پوچھیں کہ وہ بشر تھے یا فرشتے باوجود اس کے کہ مشرکین نے تو یوں کہا ہے: ﴿ لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ [سبا: ٣١] ''ہم اس (قرآن) پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ان (کتابوں) پر جو اس سے پہلے آئیں۔'' لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین گو اہلِ کتاب کی کتاب پر ایمان نہیں لائے ہیں، لیکن کسی معاملے میں متواتر اہلِ کتاب سے نقل کرنا سب کے علم کے لیے مفید ہے، یعنی اس کے لیے بھی جو ان کی کتاب پر ایمان لاتا ہے اور اس کے لیے بھی جو اس پر ایمان نہیں لاتا۔ یا مشرکین کو اہلِ کتاب کے حوالے اس لیے کیا کہ اہلِ کتاب نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں مشرکین کی پیروی کرتے تھے تو مشرکین اہلِ کتاب کی تکذیب نہ کریں گے، اس بات میں جس میں وہ ہیں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے رازی رحمہ اللہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ اہلِ کتاب کی طرف یا تو الزام کے واسطے حوالہ کیا ہے، کیونکہ مشرکین نبی کریم ﷺ کے کام میں اُن سے مشورہ کیا کرتے تھے اور اُن کی بات پر اعتماد کیا کرتے تھے یا اس لیے کہ جمِ غفیر کا خبر دینا علم کا موجب ہوتا ہے، گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ مکہ ان کے قول پر اعتماد کیا کرتے تھے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ تقلید جائز ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اگر مان بھی لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ سوال اُن کا کتاب و سنت کی نصوص سے ہے نہ کہ خالص رائے سے اور تقلید صرف کسی غیر کے قول کو قبول کر لینا ہے بغیر اس کی حجت کے۔ مقلد جب اہلِ ذکر سے کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ﷺ کا سوال کرے گا تو وہ مقلد نہ ہوگا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اہلِ ذکر سے مراد اہلِ قرآن ہیں، حالانکہ یہ قول بعید ہے۔ کیوں کہ وہ تو قرآن شریف میں اور رسول اللہ ﷺ پر طاعن اور معترض تھے، پس بہت سے فقہا کا اس آیت سے اس بات میں تعلق رکھنا کہ ایک عامی کے لیے جائز ہے کہ علما کے فتویٰ کی

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٤) [2] تفسير النسفي (٣/ ٧٥)

طرف رجوع کرے اور اس بات میں کہ مجتہد کو جائز ہے کہ دوسرے مجتہد کے قول کو لے، بعید ہے۔ کیوں کہ یہ آیت خطاب مشافہہ (روبرو) ہے اور اس مخصوص واقعہ میں وارد ہے اور خاص کر یہود و نصاریٰ سے متعلق ہے۔[1]

ہم سورۃ النحل میں پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ کا سیاق اس بات کو مفید ہے کہ اس سے مراد خالص سوال ہے اور اس سے تجھے یہ امر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ آیت اتباع کی دلیل ہے نہ کہ تقلید کی۔ پس اس کی طرف رجوع کر۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بات کو رسائلِ بسیطہ میں واضح کر کے بیان کیا ہے۔ من جملہ ان کے "القول المفيد في حكم التقليد" و "أدب الطلب و منتهى الأرب" وغيره في غيرها میں۔ غرضیکہ پھر جب اللہ پاک مشرکین کے شبہے کے جواب سے فارغ ہوا تو رسولوں کے جنسِ بشر ہونے کی تاکید فرمائی، پس ارشاد فرمایا:[2]

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

اور ہم نے ان (نبیوں) کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے ⑧ پھر ہم نے ان (رسولوں) سے وعدہ سچا کر دکھایا، چناں چہ ہم نے ان کو اور جسے ہم نے چاہا نجات دی اور ہم نے حد سے گزرنے والوں کو ہلاک کر دیا ⑨ بلاشبہہ ہم نے تمھاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے، اس میں تمھارا ہی ذکر ہے، کیا پھر تم نہیں سمجھتے؟ ⑩

تمام رسول بشر تھے:

یعنی اللہ پاک نے جو اگلی اُمتوں میں رسول بھیجے تھے، وہ ایسے بدن نہ تھے کہ کھانا نہ کھائیں، بلکہ وہ تو ایسے بدن تھے کہ کھانا کھاتے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ٢٠] "اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔" یعنی دوسرے انسانوں کی طرح بشر تھے، لوگوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور کمانے اور تجارت کرنے کے لیے بازاروں میں داخل ہوتے تھے، یہ بات اُن کو کسی طرح کا ضرر نہیں پہنچاتی تھی، نہ اُن میں سے کچھ کم کرتی تھی، جس طرح کہ مشرکین نے اپنے قول میں وہم کیا ہے: ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝۷

[1] تفسير الرازي (٢٢/ ١٢٥) [2] فتح البيان (٨/ ٣٠٦)

اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ﴾ [الفرقان: ٧۔ ٨] ''اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا۔'' اور نہ تھے وہ رہ جانے والے دنیا میں بلکہ جیتے، پھر مر جاتے تھے: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ﴾ [الأنبياء: ٣٤] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی۔'' خاصا اُن کا یہ تھا کہ اللہ عزوجل کی طرف سے اُن کو وحی آتی تھی۔ اللہ کی طرف سے اُن پر فرشتے اُترتے، وہ بات لے کر جس کا وہ اپنی مخلوق کو حکم کرتا ہے، من جملہ ان باتوں کے کہ جن کا امر کرتا ہے اور جن سے منع کرتا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ ﴾ یعنی جس بات کا ان سے اُن کے رب نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور ظالموں کو ہلاک کر دے گا تو اللہ نے اُن سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اس کو کر دیا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ ﴾ یعنی پھر ہم نے اُن کو بچا دیا اور مومنین میں سے اُن کی اتباع اور پیروی کرنے والوں کو بچا دیا۔ ﴿ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے اُن لوگوں کو جو جھٹلاتے تھے، اس شے کو جس کو رسول لائے، ہلاک کر ڈالا۔ ﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ﴾ اللہ تعالیٰ قرآن شریف کے شرف پر آگاہ کرتا ہے اور اُن کو اس کی قدر پہچاننے پر برانگیختہ کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ ذِكْرُكُمْ ﴾ سے مراد ''شرفكم'' ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''حديثكم''. امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ''دينكم''[1] یعنی تمھاری طرف ایسی کتاب اُتاری ہے کہ جس میں تمھارا شرف ہے، یا تمھارا قصہ، یا تمھارا دین ہے۔ ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ پس کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں ہو اس نعمت کو اور اس کے پیش آنے پر اسے قبول نہیں کرتے ہو۔[2] كذا في ابن كثير.

''جعل'' میں دو احتمال ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بمعنی ''صَيَّر'' ہو، اس صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوگا، ایک ﴿ هُمْ ﴾ دوسرا ﴿ جَسَدًا ﴾۔ اور ہوسکتا ہے کہ بمعنی ''خلق و انشا'' ہو۔ اس بنیاد پر ایک مفعول کی طرف متعدی ہوگا اور ﴿ جَسَدًا ﴾ بتاویلِ مشتق کے ہوکر حال ٹھہرے گا، یعنی متغذین، کیوں کہ جسد کے لیے غذا ضروری ہے۔ ''جسد'' انسان و جن و ملائکہ کے جسم کو کہتے ہیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''جسد''، جسمِ ذولون ہے اور اس لیے آب و ہوا پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، اسی معنی سے زعفران کو جساد کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''جسد''، جسمِ ذو ترکیب ہے، اس لیے کہ اصل ''جسد'' کی جمع و اشتدادِ شے کے لیے ہے، یعنی جس مادے میں جیم، سین دال پایا جائے گا تو اس میں جمع و اشتداد ہوگا۔[4] اب رہی یہ بات کہ یہ دوسرا مفعول

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٦)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٢۔ ٢٣٣)
[3] تفسیر أبي السعود (٦/ ٥٧)
[4] تفسیر البیضاوي (٤/ ٨٤)

یا حال ٹھہرے، اس کا جمع ہونا ضروری ہے، کیونکہ ﴿ هُمْ ﴾ ضمیر جمع ہے، لہٰذا اس کے واحد لانے کی کئی وجہیں ہیں، ایک یہ ہے کہ مراد اس سے جنس ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اصل میں مصدر ہے اور مصدر میں واحد و تثنیہ و جمع برابر ہوتے ہیں۔ تیسری یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی ذوی جسد۔ اس قول میں بحث ہے۔

چوتھی یہ ہے کہ ضمیر ﴿ هُمْ ﴾ کی تاویل کل واحد کے ساتھ کریں گے اور جملہ ﴿ لَا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ ﴾ محلِ نصب میں ہے۔ صفت ہے جسد کی، گو جسد مفرد ہے، لیکن مراد اس سے جمع ہے۔ یا مضاف محذوف ہے، چنانچہ مذکور ہو چکا ہے، یہی وجہ ظاہر تر ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو ایسے اجساد بنائے ہیں کہ وہ غذا کھاتے ہیں اور آخر کو موت کی طرف منتقل ہوں گے نہ ایسے جسم کہ غذاؤں سے بے نیاز ہوں۔ یہ جملہ اگلے جملے کے مضمون کی تقریر و تائید کرتا ہے، کیونکہ اس کا مضمون یہی تھا کہ اگلے رسول بشر تھے، فرشتے نہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے اس قول کا رد بھی کرتا ہے کہ ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ۷] یعنی اللہ کے رسول حکمِ طبیعت میں سارے افراد بنی آدم کے پیرو ہیں، جس طرح وہ کھاتے پیتے ہیں، اسی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں، کسب و تجارت کے واسطے بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ ﴿ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴾ یعنی وہ ہمیشہ رہنے والے نہ تھے، بلکہ وہ مرتے ہیں جس طرح دنیا میں ان کے سوا اور بشر مرتے رہتے ہیں۔ یہ جملہ اول کی تقریر و تاکید کرتا ہے، کیونکہ کھانے کے سبب سے زندہ رہنا تحلیل کے تابع اشیا سے ہے، کون تحلیل، جو فنا کی طرف پہنچا دیتی ہے۔

گویا کفار نے یوں کہا تھا کہ رسول فرشتہ کیوں نہ ہوا کہ نہ کھانا کھاتا اور ہمیشہ رہتا، نہ مرتا۔ یہ بات انھوں نے یا تو اس اعتقاد سے کہی تھی کہ فرشتے مرتے نہیں ہیں، یا اُن کی بقائے ممتد اور حیاتِ دراز کا نام خلود رکھا، لہٰذا اللہ پاک نے اس کا یہ جواب دیا۔ ﴿ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ ﴾ معطوف ہے، اس جملے پر کہ جس پر ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا... الخ﴾ دلالت کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ "أوحينا إليهم ما أوحينا ثم صدقنهم الوعد". صدق دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اُن میں سے دوسرے کی طرف حرفِ جر سے متعدی ہوتا ہے اور کبھی حرفِ جر محذوف ہوتا ہے۔ "صدقتك الحديث" اور "صدقتك في الحديث" دونوں طرح بولتے ہیں، یعنی وحی کی ہم نے طرف ان کے جو وحی کی، پھر سچ کیا ہم نے اُن سے اس بات میں کہ جس کا ان سے وعدہ کیا تھا اثنائے وحی میں۔ وہ وعدہ یہی تھا کہ ان کو بچا لیں گے اور اُن کے دشمنوں کو ہلاک کر دیں گے، جنھوں نے اُن کو جھٹلایا ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُمْ ﴾ یعنی پس ہم نے ان کو بچا لیا۔ ﴿ وَمَنْ نَّشَآءُ ﴾ اور اس شخص کو کہ جس کو ہم نے اپنے مومن بندوں میں سے چاہا، جنھوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔ ﴿ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ اور ہلاک کر ڈالا ہم نے ان لوگوں کو جو کہ کفر و معاصی میں حد سے بڑھنے والے تھے۔ وہ لوگ مشرکین ہیں۔ اُن کے بچانے سے مراد

یہ ہے کہ ان کو اس عذاب سے بچا لیا جو اُن کی قوم پر نازل ہوا اور کافروں کو دنیوی عذاب سے ہلاک کر ڈالا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مَنْ نَّشَآءُ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو رسولوں پر ایمان لائے اور وہ شخص کہ اس کے باقی رکھنے میں حکمت ہے، جیسے وہ آدمی کہ آیندہ ایمان لے آئے گا، وہ خود یا اس کی اولاد میں سے کوئی مومن ہو گا، اسی لیے نیست و نابود کرنے والے عذاب سے عرب لوگ محفوظ رکھے گئے۔[1]

قرآن کی فضیلت کا بیان:

پھر اللہ پاک نے اپنی ایک بڑی نعمت پر آگاہی بخشی، جس کا اس نے بندوں پر انعام فرمایا، یعنی قرآنِ کریم اُتارا، جس میں اُن کے دین و دنیا کا نفع ہے، لیکن چونکہ قریش نے اس کی کچھ قدر نہ کی اور بجائے شکر کے کفر و انکار کیا اور جب کوئی آیت یا قرآن کی سورت نازل ہوئی تو اس سے منہ موڑا جس کا ذکر شروع سورت میں ہو چکا ہے، اس لیے اللہ پاک نے تحقیق و اثباتِ حقیقتِ قرآن کو بہ کلامِ مستانف و مستقل ذکر فرمایا اور اہتمامِ مدعا کے طور پر عرب محاورہ کے مطابق مصدر بہ قسم کیا اور یوں ارشاد فرمایا: ﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی قسم ہے اللہ کی! البتہ مقرر اُتاری ہم نے تمھاری طرف اے گروہِ قریش! ایک عظیم الشان کتاب نیر البرہان، واضح البیان، بین السلطان کہ جس میں شرف و صیت و مشہوری ہے، جیسا کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] ''اور یقیناً یہ (قرآن) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے۔'' شرف کے یہ معنی ہیں کہ قرآن شریف تمھاری عزت، بزرگی اور برتری کا سبب ہے عرب کے لوگوں میں سے، کیوں کہ تمھاری لغت و زبان و محاورے میں اترا ہے۔ صیت کے معنی ذکرِ جمیل ہیں، یعنی نیک نام جو لوگوں میں منتشر و مشہور ہوتا ہے، یعنی قرآن پاک میں وہ شے ہے، جو کہ تمھاری ثنا و صفت کرنے کی موجب ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ تمھاری زبان میں نازل ہوا ہے، تمھارے درمیان میں، تمھیں میں سے رسول پر اترا ہے اور اس کی مشہوری تمھاری مشہوری کا سبب ہے۔ چونکہ قرآن شریف اس سب کا سبب ہے، لہٰذا اس کی سببیت میں مبالغہ کرنے کے لیے یہ سب اُمور قرآن میں ٹھہرائے گئے۔

کسی نے کہا ہے کہ ذکر سے مراد وہ شے ہے کہ جس کی طرف تم اپنے دین و دنیا میں محتاج ہوتے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ذکر سے مراد مکارمِ اخلاق ہیں کہ جن سے تم حسنِ ذکر اور نیک نامی طلب کرتے ہو۔ کسی نے کہا مراد یہ ہے کہ اس میں تمھارے اُمورِ دین و احکامِ شرع کا ذکر ہے اور ثواب و عذاب کا ذکر ہے، جس کی طرف تم منتقل ہو ے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں تمھارے لیے نصیحت ہے، تا کہ تم ڈرو۔ اس بنا پر ذکر بمعنی وعد و وعید ٹھہرے گا۔ امام السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذکر کے معنی نصیحت ہیں قرآن کریم کے نظم اور سیاق کے لحاظ سے، یہی زیادہ مناسب

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٤)

ہیں، کیوں کہ ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ انکارِ توبیخی ہے، اس میں ان کو اس بات پر آمادہ اور برانگیختہ کرنا ہے کہ امرِ کتاب میں غور و تدبر کریں اور اس کے اندر جو طرح طرح کی نصیحتیں اور عبرتیں اور ڈراوے ہیں، ان میں تأمل اور غور کریں۔ انھیں زواجر کے وہ قوارع (کھڑکھڑاہٹ) ہیں، جو پہلے مذکور ہو چکے ہیں اور آیندہ آئیں گے۔ حرف فا عطف کے لیے ہے مقدر پر، کون مقدر کہ جس کی طرف کلام کا کھچاؤ ہو رہا ہے، یعنی کیا تم فکر نہیں کرتے ہو، پھر تم بوجھتے نہیں ہو کہ بات اس طرح ہے، یا یہ معنی ہیں کہ تم ان اشیا میں سے جن کا ذکر کیا گیا ہے، کسی شے کو نہیں سمجھتے بوجھتے، یا یہ معنی ہیں کہ تم اس بات کو سمجھتے نہیں ہو جس کے ساتھ میں نے تم کو دوسروں پر فضیلت دی ہے، تا کہ تم ایمان لے آؤ۔ پھر اللہ پاک نے ان کو وعید سنائی اور جھٹلانے والی اُمتوں پر جو ماجرا گزر چکا ہے، اس سے ان کو ڈرایا،[1] پس یوں ارشاد فرمایا:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ ۱۱ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ ۱۲ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ ۱۳ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ ۱۴ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝ ۱۵

اور ہم نے کتنی ہی بستیاں تہس نہس کر دیں جو ظالم تھیں، اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اُٹھا کھڑی (پیدا) کیں (11) پھر جب انھوں نے ہمارے عذاب (کی آہٹ) کو محسوس کیا تو وہ لوگ وہاں سے بھاگنے لگے (12) (ان سے کہا گیا:) مت بھاگو، اور لوٹ جاؤ جہاں تمھیں سامانِ عیش و عشرت دیا گیا تھا اور اپنے مکانات و محلات کی طرف، تا کہ تم سے سوال کیا جائے (13) وہ کہنے لگے: ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم ہی ظالم تھے (14) پھر یہی رہی ان کی پکار، حتی کہ ہم نے انھیں کٹے ہوئے اور بجھے ہوئے بنا دیا (15)

ظالموں کی ہلاکت کا تذکرہ:

کلمہ ﴿ كَمْ ﴾ خبر یہ ہے جو تکثیر کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ﴾ [بني إسرائيل: ١٧] ''اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴾ [الحج: ٤٥] ''چناں چہ کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جبکہ وہ ظالم تھیں، تو وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر، اور (کتنے ہی) کنویں بے کار، اور (کتنے ہی) مضبوط محل (ویران پڑے ہوئے ہیں!)۔'' کم مفعول مقدم ہے

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٥٨)

﴿قَصَمْنَا﴾ کا۔

﴿مِنْ قَرْيَةٍ﴾ اس کی تمیز ہے، یعنی "قصمنا قری كثيرة"۔ "قصم" قاف وصاد مہملہ، کسی شے کے توڑنے کوٹنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی شخص کی پشت توڑ ڈالے تو عرب کی بول چال میں یوں کہتے ہیں کہ "قصمت ظهره" اور جب کسی کا دانت ٹوٹ جائے تو بولتے ہیں: "اقتصمت سنه" لیکن "قصم" توڑ کر علاحدہ کر دینے کو کہتے ہیں، یعنی "قصم" وہ توڑنا ہے کہ شے کے اجزاء کے باہمی اتصال کو جدا کر دے۔ رہا فصم فاوصاد مہملہ کے ساتھ، لہٰذا یہ کسی شے میں جدائی کے بغیر چیرنا پھاڑنا ہے اور کسر مطلق توڑنے کو کہتے ہیں۔ یہاں قصم سے مراد ہلاک کرنا اور عذاب ہے۔

﴿قَرْيَةٍ﴾ کے معنی گاؤں اور بستی ہیں، اس کے اول میں مضاف ہے، یعنی اہلِ قریہ۔ اس کے حذف پر ﴿كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ قرینہ ہے۔ یہ محلِ جر میں ہے بنا برصفتِ قریہ۔ لہٰذا ظلم اہلِ قریہ کی صفت ہے۔ نہ کہ نفسِ قریہ کی، کیونکہ قریہ تو زمین کا ایک ٹکڑا ہے، زمین کیا ظلم کرے گی۔ یہاں ظلم سے مراد کفر ہے۔ اصل میں ظلم کسی شے کو اس کی غیر جگہ میں رکھنے کو کہتے ہیں۔ اور انھوں نے کفر کو ایمان کی جگہ میں رکھا، اس لیے وہ ظالم ہوئے، بلکہ بڑے ظالم ٹھہرے کہ اپنے مالک اور خالق کو نہ پہچانا اور اس کے منکر ہوئے، اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی بعض تصانیف میں کیا نکتہ لکھا ہے، وہ یہ کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں قریہ کا ذکر آتا ہے تو وہاں مفسرین "أهل" کا کلمہ مقدر نکالتے ہیں، حالانکہ مقدر نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ قریہ بستی کو اور بستی والوں کو بولتے ہیں، اس کے دونوں معنی ہیں۔ عرفِ قرآن شریف یہی ٹھہرا ہے کہ قریہ بغیر اہل کے مذکور ہو۔ جب خود قریہ بمعنی اہلِ قریہ ٹھہرا تو اب کیا ضرورت ہے کہ کلمۂ "أهل" مقدر نکالا جائے۔

"انشا" کے معنی ایجاد و احداث ہیں، غرضیکہ اللہ پاک قریش کو بڑی دھوم دھام سے ڈراتا دھمکاتا ہے، اس لیے کہ انھوں نے کتاب و رسول کی قدر نہ سمجھی، اُن کو تو بہت زیادہ قدر کرنی چاہیے تھی، کیونکہ قرآن اُنھیں کی زبان میں اُترا، انھیں کی قوم کے آدمی پر نازل ہوا، کون سا قرآن جو سراپائے معجزہ ہے، اولین اور آخرین کے اخبار پر مشتمل ہے، دین و دنیا کی خیر وخوبی اس میں موجود ہے۔ انھوں نے اس کی یہ قدر کی کہ اس سے کفر اور انکار کے ساتھ پیش آئے۔ اس کو جادو، قولِ شاعر، افترا، جھوٹ اور پریشان خواب کہا۔ رسول کو ساحر، شاعر اور مفتری ٹھہرایا، اس واسطے اللہ پاک نے بہت غیظ وغضب اور غصے سے اس آیتِ کریمہ کو نازل کیا اور اگلی اُمتوں کے ہلاک کرنے کا قصہ لفظِ قصم کے ساتھ ذکر کیا۔ "أهلكنا كسرنا فصمنا" چھوڑ کر ﴿قَصَمْنَا﴾ فرمایا، جو کہ اعلیٰ درجے کے توڑنے پر دلالت کرتا ہے، یعنی تمھاری کیا ہستی ہے، تمھاری کیا حقیقت ہے، ہم نے تم سے پہلے بہت سی بستیوں کو توڑ مارا ہے، جبکہ انھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور اُن رہنے بسنے والوں کو ہلاک کرنے کے بعد ایک اور ہی قوم

کو ایجاد اور احداث کر دیا، جو اُن میں سے نہ تھی۔ یعنی اگر تم ایمان نہ لاؤ گے اور کفر وانکار سے باز نہ آؤ گے تو تمھاری بھی وہی گت ہوگی، جو اُن کی ہوئی، اللہ پاک کے نزدیک یہ کوئی کام مشکل نہیں ہے، اس کے لیے سب کچھ آسان ہے، کیوں کہ یہ غیظ وغضب کا مقام ہے اور تہدید وتوبیخ اور قدرتِ کاملہ کے اظہار کا موقع ہے، اسی لیے شاید ﴿ وَاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾ کو ﴿ كَمْ قَصَمْنَا ﴾ کے ساتھ ہی ذکر فرمایا، ورنہ یہ جملہ ﴿ خٰمِدِيْنَ ﴾ کے بعد ہوتا۔ اور جملہ ﴿ كَانَتْ ظَالِمَةً ﴾ جو قریہ کی صفت واقع ہوا ہے۔ ایک تو اس سے ان لوگوں کا حال معلوم ہوا کہ وہ ظالم کافر تھے، دوسری یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اُن کو ہلاک کرنے کی وجہ یہی ظلم وکفر تھا۔

کلمہ "لَمَّا"، ظرفیہ نہیں ہے، بلکہ حرفِ وجوب ہے واسطے وجوب کے، اس لیے کہ ظرف کے لیے عامل ضروری ہے اور یہاں کوئی عامل نہیں ہے، کیونکہ ﴿ اِذَا ﴾ کا مابعد ﴿ اِذَا ﴾ کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا ہے۔ اس کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ "لَمَّا" میں معنی مفاجات نے عمل کیا ہے، جس کو کلمہ ﴿ اِذَا ﴾ بتا رہا ہے۔ احساس کہتے ہیں ادراک و شعور و یقین جاننے کو یا حاسۂ بصر سے دیکھنے کو۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَحَسُّوْا ﴾ کے معنی ہیں: "خافوا و توقعوا"۔[1] "بأس" عذاب وسختی کو کہتے ہیں، یہاں مراد عذابِ شدید ہے۔ ﴿ اِذَا ﴾ واسطے مفاجات کے ہے، بہ معنی ناگاہ۔ ﴿ هُمْ ﴾ مبتدا ہے۔ ﴿ يَرْكُضُوْنَ ﴾ خبر۔ ضمیر ﴿ اَحَسُّوْا ﴾ کی اہلِ قریہ کی طرف پھرتی ہے ﴿ قَوْمًا ﴾ کی طرف راجع ہونا جائز نہیں، کیوں کہ قوم کے واسطے وہ شے مذکور نہیں ہوئی ہے، جو اس کی مقتضی ہو۔ ﴿ مِنْهَا ﴾ کی ضمیر ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ کی طرف راجع ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "بأس" کی طرف راجع ہو، کیونکہ "بأس" معنی میں عذاب اور تنگی کے ہے، اس لیے باعتبار معنی کے مؤنث ضمیر "بأس" کی طرف پھر سکتی ہے۔ اول کی بنیاد پر حرف "من" واسطے ابتدائے غایت کے ہوگا اور ثانی کی بنا پر واسطے تعلیل کے۔ اصل "رکض" کی اس محاورے سے ہے کہ "ركض الرجل الدابة برجليه" یعنی آدمی نے سواری کو اپنے دونوں پاؤں سے مارا۔ "ركض الفرس" یعنی گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ یہ جب بولتے ہیں کہ اپنی دونوں پنڈلیوں سے اس کو رنج دے، ایذا پہنچائے۔ پھر اس کا استعمال بہ کثرت ہوا، یہاں تک کہ جس وقت گھوڑا دوڑا تو کہا گیا: "ركض الفرس"، "ومنه اركض برجلك". آیتِ کریمہ میں کنایہ ہے فرار و ہرب (بھاگنا) و انہزام سے، یعنی یہاں "رکض" سے مراد بھاگنا ہے، کیونکہ جب بھاگنے میں جلدی منظور ہوتی ہے تو گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہیں، تاکہ وہ دوڑے، جلدی چلے، بھاگے۔ "إتراف" ابطارِ نعمت کو کہتے ہیں، یعنی نعمت کا کسی کو بے راہ و گمراہ و طاغی و سرکش بنا دینا۔ "مترف" کے معنی "مُنَعَّم"۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أترف فلان"، یعنی

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٧٤)

فلاں پر وسعت یا فراخی کی گئی اس کے معاش و گزران میں اور اس کا ہم و غم ہلاکت سے کم ہوا۔ یعنی اے ہمارے ہلاکی! تو کہاں ہے؟ حاضر ہو یہ تو تیرے حاضر ہونے کا وقت ہے۔ ﴿ تِلْكَ ﴾ کا محل رفع ہے بنا بر اسم ﴿ زَالَتْ ﴾، اور مشار الیہ اس کا ﴿ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ ہے، دعویٰ کے معنی دعا ہیں۔ اس کا نام دعویٰ اس لیے رکھا کہ ویل کہنے والا گویا ویل کو پکارتا ہے اور کہتا ہے: اے ویل! تو آ، یہ تیرا وقت ہے اور ﴿ دَعْوٰىهُمْ ﴾ خبر ہے ﴿ زَالَتْ ﴾ کی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ تِلْكَ ﴾ خبر ہو اور ﴿ دَعْوٰىهُمْ ﴾ اسم۔

"حصد" کھیتی کاٹنے کو کہتے ہیں، "حصید" بمعنی "محصود" ہے، اسی لیے اس کو جمع کے صیغے کے ساتھ نہ کہا، کیونکہ فعیل بمعنی مفعول واحد و تثنیہ و جمع برابر ہوتا ہے۔ "خمد و خمود" فرو مردن آتش کو کہتے ہیں، جس وقت آگ بجھ جاتی ہے تو بولتے ہیں: "خمدت النار و همدت" لہٰذا یہاں حیات کے بجھنے کو تشبیہ آگ کے بجھنے سے دی، جس طرح کہ کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کو کہتے ہیں: "قد طفئ" یعنی بجھ گیا ہے، مراد یہ ہے کہ مر گیا۔ خمود عبارت ہے، اس سے کہ اس کا شعلہ ساکن ہو جائے اور انگارا باقی رہے اور ہمود عبارت ہے اس سے کہ آگ بالکل جاتی رہے، یہاں تک کہ راکھ ہو جائے، اس لیے اس جگہ بہتر ہے کہ خمود سے مراد ہمود ہو، کیونکہ اس کے معنی میں زیادہ مبالغہ ہے۔

﴿ خٰمِدِيْنَ ﴾ مع ﴿ حَصِيْدًا ﴾ کے بمنزلہ مفعول ثانی کے ہے، جس طرح کہ یہ قول ہے: "جعلته حلوا حامضا" یعنی میں نے فلاں شے کو کر دیا درمیان شیرینی و ترشی کے، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ کر دیا ہم نے ان کو جمع کرنے والی حصید و خمود کی مماثلت میں جمع کرنے والی۔ یا ﴿ خٰمِدِيْنَ ﴾ صفت ہے ﴿ حَصِيْدًا ﴾ کی، یا حال ہے اس کی ضمیر سے۔ معنی یہ ہیں: پھر جب انھوں نے ادراک کیا اور یقین کر لیا اور ہمارے سخت عذاب کو آنکھ سے دیکھ لیا، یا اس طرح سے ادراک کر لیا، جس طرح کوئی مشاہدہ کرنے والا کسی محسوس شے کا ادراک کرتا ہے، اچانک وہ اس گاؤں سے، یا اس عذاب کی وجہ سے بھاگنے لگے، جلدی جلدی کر کے اپنی سواریوں کو ایڑیاں مارتے ہوئے یا پیدل بھاگنے لگے جلدی کرتے ہوئے۔ تیز دوڑنے میں اُن کو اُن لوگوں سے تشبیہ دی جو اپنی سواریوں کو ایڑیاں مارتے ہیں۔

جس وقت انھوں نے عذاب کے اگلے حصے کو دیکھ لیا تو اُن سے استہزا اور مذاق کے طور پر کہا گیا: ﴿ لَا تَرْكُضُوْا ﴾ یعنی مت بھاگو، یہ کہنا یا تو بزبانِ حال تھا، یا واقعی زبان سے، اس صورت میں یہ کہنے والے فرشتے تھے، یا جو مومنین اس جگہ تھے انھوں نے یہ بات کہی اور پھر جاؤ دنیائے عیش و عشرت کی طرف کہ جس میں تم نے عیش اور نعمتیں اور لذتیں چکھیں تھیں، یعنی ان نعمتوں کی طرف لوٹ جاؤ جن کی وجہ سے تم نے کفر کیا اور غرور کیا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے ﴿ اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ لوٹ جاؤ تم اپنے مالوں اور اپنے گھروں کی طرف،[1] جن میں تم رہتے بستے اور فخر کیا کرتے تھے۔

[1] الدر المنثور (٥/ ٦١٨)

﴿ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴾ شاید تم پوچھے جاؤ، شاید لوگ بات پوچھنے کو تمھارا قصد کریں، اہم معاملات اور حادثات میں تم سے مشورہ لیں اور تمھاری تدبیر اور رائے دریافت کریں۔ یہ بات ان سے تمسخر اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر کہی گئی۔ یا یہ معنی ہیں کہ شاید کوئی تم سے اس بلا اور عقوبت کا حال پوچھے جو تم پر گزری تو تم پوچھنے والے کو اپنے علم اور مشاہدہ کی بنا پر بتاؤ گے، یعنی اس لیے تم لوٹ جاؤ۔ فتح الرحمان میں یوں کہا ہے، یعنی بہ غمخوارگی قوم احوالِ شما پرسند۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم سے سوال کریں کہ تم ایمان لاؤ، جس طرح کہ تم پر اس عذاب کے اُترنے سے پہلے تم سے اس کا سوال کیا کرتے تھے، یا یہ معنی ہیں کہ شاید تمھاری دنیا سے کوئی شخص حسبِ عادت کچھ مانگے، پھر تم جس کو چاہو گے دو گے، جس کو چاہو گے نہ دو گے، کیوں کہ تم لوگ تو نعمت اور دولت والے ہو۔ یہ سب باتیں اُن سے تمسخر اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر کہی گئیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم لوٹ جاؤ اور بیٹھو، جس طرح تم اپنی مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے، تاکہ تمھارے غلام اور جن لوگوں میں تمھارا حکم چلتا ہے، وہ تم سے پوچھیں اور کہیں کہ کیا حکم دیتے ہو اور کیونکر کام کریں اور نہ کریں جس طرح کہ عیش و آرام والے لوگوں کی عادت ہوتی ہے، جن کے غلام و خادم خدمت کیا کرتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ شاید لوگ تمھاری مجلسوں میں تم سے معاون و مددگار کا سوال کریں کہ وہ سخت سخت حوادث میں مدد کرے، یعنی تم تو بڑے دولت مند اور وجاہت والے ہو کہ جب کسی پر کوئی حادثہ آ پڑتا ہے تو وہ تم سے معاون و مددگار طلب کرتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ انھیں لوگوں میں سے بعض نے بعض سے کہا کہ مت بھاگو، اپنے گھروں اور مالوں کی طرف لوٹ چلو، شاید تم سے مال وخراج مانگیں تو تم قتل نہ کیے جاؤ گے، آخر کے تین معنی علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ذکر فرمائے ہیں۔[1]

تفسیر بیضاوی میں کہا ہے کہ شاید تم پوچھے جاؤ کل، یعنی قیامت کو تمھارے اعمال کے متعلق۔ یا عذاب کیے جاؤ، کیونکہ سوال اور پوچھ پاچھ عذاب کے مقدمات (شروع کا مرحلہ) سے ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "﴿ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴾ أي عما كنتم فيه من أداء شكر النعم"[3] امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ شاید تم اپنے نبی کے قتل کے بارے میں پوچھے جاؤ۔[4] پھر جب انھوں نے عذاب کو دیکھ لیا اور نجات کا کوئی طریقہ نہ پایا، جس وقت فرشتوں نے اُن سے کہا: ﴿ لَا تَرْكُضُوْا ﴾ تو وہ بولے: ﴿ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی اے خرابی ہماری! ہم بے شک ظلم کرنے والے تھے اپنی جانوں پر اس گناہ کے سبب سے، جس کو ہم کر چکے۔ اب اپنی جانوں پر ظلم کرنے کا اقرار کیا، جو موجبِ عذاب ہوا اور یہ بات بطورِ ندامت کہی اور اُن کو اس کا کچھ فائدہ نہ ہوا، کیونکہ عذاب کے نازل ہونے کے بعد کہی، اگر پہلے کہتے تو نفع دیتی، پھر وہ یہی بات کہتے رہے اور اسی کو دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے اُن کو تلواروں سے حصید (کٹا ہوا) کر ڈالا، جس طرح کھیتی ہنسیوں سے کاٹی جاتی ہے۔

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٧٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٥) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣٣)
[4] تفسير الخازن (٤/ ٢٩٠)

جاننا چاہیے کہ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ كَمْ قَصَمْنَا ... الخ ﴾ سے کوئی مخصوص قریہ مراد نہیں ہے، کیونکہ ﴿ كَمْ ﴾ خبریہ ہے، تکثیر پر دلالت کرتا ہے، لیکن مفسرین و اہلِ اخبار نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد یمن کے اہلِ حضور (ایک بستی کا نام) ہیں۔ اللہ پاک نے اُن کی طرف شعیب بن مہدم علیہ السلام نام کے نبی کو بھیجا تھا، اُن کی قبر یمن کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ میں ہے، اس پہاڑ کو ضین کہتے ہیں، اس کے اور حضور کے درمیان تقریباً ایک برید کا فاصلہ ہے، برید بارہ میل کا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ شعیب مدین والے شعیب علیہ السلام ہیں۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قبر کے آثار جبلِ ضین میں موجود ہیں، اس طرف کے عام لوگوں کا زعم یہ ہے کہ وہ قبر قدم بن قادم کی ہے۔[1] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بطریقِ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اللہ پاک نے حمیر سے ایک نبی بھیجا، اس کو شعیب علیہ السلام کہتے تھے۔ ان کی طرف ایک غلام دوڑا تو اُن کو عصا سے مارا، پھر اس قوم کی طرف بخت نصر چلا، اس سے قتال کیا، پھر اس قوم کو قتل کر ڈالا، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ باقی نہ رہا۔ انھیں کے بارے میں اللہ پاک نے ﴿ وَكَمْ قَصَمْنَا ﴾ تا قولہ ﴿ خٰمِدِيْنَ ﴾ نازل فرمایا۔ عبدالرزاق و عبد بن حمید و ابن منذر نے کلبی سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ قریہ سے مراد حضور بنی ازد ہیں۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے ﴿ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ اہلِ حضور ہیں، انھوں نے اپنے نبی کو قتل کر ڈالا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن پر بخت نصر کو بھیجا تو اس نے ان کو قتل کر ڈالا اور ﴿ جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں یوں کہا کہ تلوار سے فرشتوں نے انُ کے مونہوں کو مارا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھروں کی طرف لوٹ آئے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام ابن وہب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ مجھے جزربین کے ایک شخص نے حدیث بیان کی، کہا کہ یمن میں دو گاؤں تھے: ایک کو حضور دوسرے کو قلابہ کہتے تھے، پس انھوں نے بطر و اتراف کیا، یعنی عیش و عشرت اور نعمتوں کے مارے اترا گئے، بے راہ روی اختیار کی، یہاں تک کہ وہ اپنے دروازوں کو بند نہیں کیا کرتے تھے۔ پھر جب انھوں نے اتراف کیا (نعمتوں کی زیادتی میں مست ہو گئے) تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف ایک نبی بھیجا، اس نبی کا نام موسیٰ بن ملیشا بن یوسف بن یعقوب تھے، یہ نبی موسیٰ بن عمران سے پہلے تھے۔ کشاف میں اسی طرح ہے۔ لہٰذا نبی نے ان کو اللہ پاک کی طرف دعوت دی تو انھوں نے نبی کو قتل کر ڈالا، پس اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کے جی میں یہ بات ڈالی کہ اُن پر چڑھائی کرے، پس اس نے اُن کے لیے ایک لشکر تیار کیا، پھر اُن سے لڑائی کی تو انھوں نے اس کے لشکر کو ہزیمت دی، وہ لشکر بھاگا ہوا بختِ نصر کی طرف گیا تو اس نے ایک اور لشکر پہلے سے زیادہ اور بھاری تیار کر کے اُن کی طرف روانہ کیا تو انھوں نے اس لشکر کو بھی ہزیمت دے دی، پھر جب بختِ نصر نے یہ دیکھا تو بذاتِ خود اُن پر چڑھائی کی، پھر ان سے لڑا، یہاں تک کہ وہ

[1] فتح القدير (٣/ ٥٤٩) [2] الدر المنثور (٥/ ٦١٧۔ ٦١٨)

اس گاؤں سے بھاگتے ہوئے نکلے تو ایک منادی کو یہ کہتے ہوئے سنا: ﴿لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ﴾

پس وہ لوٹے تو ایک آواز پکارتی ہوئی سنی کہ کہتی ہے: "يا لثارات النبي" یعنی یہ بدلہ ہے نبی کے خون کا، پھر وہ تلوار سے قتل کیے گئے۔ پس یہ وہی قریہ ہے جس کے حق میں اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَكَمْ قَصَمْنَا﴾ الٰی قولہ ﴿خٰمِدِيْنَ﴾[1] علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور نامی بستیاں اب تک معروف ہیں، اس کے اور صنعا کے درمیان میں تقریباً ایک برید کا فاصلہ ہے، صنعا کے مغرب کی طرف ہیں۔[2] غرضیکہ ان آثار سے معلوم ہوا کہ آیتِ کریمہ مذکور ایک خاص بستی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ تلوار کے عذاب سے تباہ و برباد کرنا، اس بستی والوں کے سوا اور کسی کے لیے نہیں ہوا۔ بخلاف قومِ لوط وغیرہ کی بستیوں کے کہ وہ بغیر تلوار کے ہلاک کی گئیں۔ کوئی بستی چنگھاڑ سے ہلاک ہوئی، کوئی زلزلے سے، اس بنیاد پر تکثیر جو ﴿كَمْ﴾ سے سمجھی جاتی باعتبار افراد اس قریہ کے ہوگی۔ والله أعلم.

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿16﴾ لَوْ اَرَدْنَاۤ
اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿17﴾
بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ
وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿18﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ
وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿19﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿20﴾

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے، کھیل تماشا کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا (16) اگر ہم (یوں ہی) کھیل بنانا چاہتے تو اپنے پاس ہی سے اسے بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہوتے (17) بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے، پھر یکا یک وہ (باطل) ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور تمھارے لیے ان باتوں کی وجہ سے ہلاکت ہے جو تم (اللہ کے بارے میں) بیان کرتے ہو (18) اور اسی کے لیے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت کرنے سے تکبر نہیں کرتے اور نہ وہ تھکتے (اُکتاتے) ہیں (19) وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں، سست نہیں پڑتے (20)

کائنات کی تخلیق عدل و حکمت کے ساتھ:

یعنی اللہ تعالیٰ غیب سے ایک قدرت کا نمونہ بھیجتا ہے جھوٹ کے مٹانے کے لیے، اُن کاملوں کو تم اللہ کا بیٹا

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٧) (2) فتح القدير (٣/ ٥٥٢)

کہتے ہو۔ اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق سے پیدا کیا ہے، یعنی عدل و قسط و انصاف سے اُن کو بنایا ہے، تا کہ جن لوگوں نے برا کیا ہے، اُن کو اُن کے عمل کا بدلہ دے اور جنھوں نے اچھا کیا ہے ان کو اُن کی نیکی کی جزا عطا فرمائے اور اُن کو بے فائدہ کھیل کے لیے نہیں بنایا، جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴾ [صٓ: ٢٧] ”اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بیکار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا، تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔“

امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے آیتِ باب کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ﴿ مِنْ لَّدُنَّآ ﴾ سے مراد ”مِنْ عِنْدِنَا“ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے جنت و نار و موت و بعث و حساب کو عبث اور بے فائدہ نہیں بنایا ہے۔ حسن اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ اہلِ یمن کی زبان میں لہو عورت کو کہتے ہیں۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ”لا تخذناه من الحور العين“ یعنی اگر ہم کو کچھ کھلونا بنانا ہوتا تو ہم حور عین سے بنا لیتے۔ امام عکرمہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا کہ اس جگہ لہو سے مراد ولد ہے،[1] یعنی بیٹا، یہ قول اور وہ قول جو اس سے پہلے ہے، باہم متلازم ہیں اور یہ قول اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [الزمر: ٤] ”اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے ان میں سے جنھیں وہ پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا چن لیتا، لیکن وہ تو (ان باتوں سے) پاک ہے، وہ اللہ واحد ہے، بڑا زبردست۔“ پس اللہ پاک نے اپنے نفسِ مقدس کو بیٹا رکھنے سے مطلقاً منزہ فرمایا، خصوصا اس اِفک اور بہتانِ باطل سے، جو وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام یا عزیز علیہ السلام یا ملائکہ کو بیٹا بیٹیاں بنایا ہے۔ سبحان الله عما يقولون علواً كبيرا.

اللہ تعالیٰ ان کی باتوں سے پاک و برتر و بزرگ تر ہے۔ امام قتادہ، سدی، ابراہیم نخعی اور مغیرہ بن مقسم رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ بہ معنی ”مَا كُنَّا فٰعِلِيْنَ“ ہے۔[2] یعنی کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ یہاں بمعنی ما نفی ہے۔ شاید اس قول سے یہ مراد ہو کہ قرآن شریف میں ایسے موقع میں جس جگہ ﴿ اِنْ ﴾ ہے، وہ نفی کے معنی میں ہے، ورنہ ﴿ اِنْ ﴾ اور معنوں میں بھی بہت آیا ہے۔ والله أعلم۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں ﴿ اِنْ ﴾ واقع ہوا ہے، اس سے مراد نفی ہے۔[3]

﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ ہم حق کو بیان کرتے ہیں تو وہ باطل کو پھسلا دیتا ہے، مٹا دیتا ہے نیست و نابود کر دیتا ہے، اس لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ ﴾ یعنی حق باطل کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٧_ ٢٤٤٨) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٢٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٨)

سر پھوڑتا ہے تو وہ ذاہب و مضمحل ہو جاتا ہے، یعنی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ﴿ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اے لوگو! جو اللہ کے لیے بیٹا کہتے ہو، تمھارے واسطے خرابی ہے اس شے سے جو تم کہتے ہو اور افترا کرتے ہو، جھوٹ بناتے ہو۔

پھر اللہ پاک نے فرشتوں کی عبودیت و داب (محنت) کی خبر دی کہ وہ اس کی طاعت اور بندگی میں دن رات لگے ہوئے ہیں۔ پس فرمایا: ﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ ﴾ یعنی فرشتے۔ ﴿ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ ﴾ یعنی وہ اس کی عبادت سے کنیاتے نہیں ہیں، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴾ [النساء: ١٧٢] ''مسیح (عیسیٰ ابن مریم) کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہے، اور جو کوئی اللہ کی عبادت کو عار خیال کرے اور تکبر کرے، تو اللہ جلد ان سب کو اپنی طرف جمع کرے گا۔'' ﴿ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ تھکتے نہیں ہیں، نہ ملول ہوتے ہیں۔

﴿ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴾ پس وہ رات دن کام میں لگے ہوئے ہیں، اس کے خوگر و عادی ہو رہے، قصداً و عملاً مطیع و فرماں بردار ہیں، عمل پر قدرت رکھنے والے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ [التحريم: ٦] ''اللہ انھیں جو حکم دے، وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے درمیان تھے کہ آپ نے اُن سے فرمایا کہ کیا تم سنتے ہو، جو میں سنتا ہوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ہم کچھ نہیں سنتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں آسمان کا چرچرانا سنتا ہوں اور وہ اس پر ملامت نہیں کیا جاتا کہ چرچرائے اور اس میں ایک بالشت کی جگہ نہیں ہے کہ اس پر ایک فرشتہ ہے، سجدے کی حالت میں یا قیام میں۔[1] (غريب ولم يخرجوه ثم رواه أعني ابن أبي حاتم من طريق يزيد بن أبي زريع عن سعيد عن قتادة مرسلا وقال محمد بن إسحاق عن حسان بن مخارق عن عبد الله بن الحارث بن نوفل)

عبداللہ نے کہا کہ میں کعب احبار کی طرف بیٹھا اور میں لڑکا تھا، سو میں نے اُن سے کہا کہ تم مجھے خبر دو اللہ تعالیٰ کے اس قول کی، جو وہ فرشتوں کے حق میں فرماتا ہے: ﴿ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴾ کیا باز نہیں رکھتا ان کو تسبیح سے کلام و رسالت و عمل؟ تو کعب رحمہ اللہ نے کہا: یہ کون لڑکا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بنی عبدالمطلب سے ہے۔ عبداللہ نے کہا کہ کعب نے میرا سر چوما، پھر کہا: اے میرے بیٹے! اُن کے لیے تو تسبیح اس طرح مقرر کی گئی ہے کہ جس طرح تمھارے واسطے سانس ٹھہرایا گیا ہے۔ کیا تو بات نہیں کرتا اس حال میں کہ تو سانس لیتا ہے اور تو چلتا

[1] المعجم الكبير (٣/ ٣٠١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٥٢)

ہے، حالانکہ تو سانس لیتا ہے، یعنی فرشتوں کو تسبیح میں کچھ تکلف نہیں ہوتا، تسبیح تو خود اُن کی عادت وطبیعت ہے، کوئی کام اُن کو اس سے نہیں روکتا۔[1] كذا في ابن كثير.

"لعب" (عین مہملہ کی جزم اور زبر کے ساتھ) کے معنی بازی وکھیل ہیں اور لعب وہ فعل ہے جس کا اول اچھا معلوم ہو اور اس کے لیے کسی طرح کا ثبات نہ ہو۔ ﴿لٰعِبِيْنَ﴾ حال ہے ﴿خَلَقْنَا﴾ کی ضمیر سے اور یہی لعب نفی کا محط ہے، یعنی نفی کا اُتارا اسی پر ہے۔ ﴿مَا بَيْنَهُمَا﴾ سے مراد وہ مخلوق مختلف قسم اور جنس کی ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان رہتی بستی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ نہیں بنایا ہم نے یہ اونچا چھت اور یہ پست فرش، یعنی آسمان و زمین اور یہ عجیب وغریب چیزیں، جو اُن کے درمیان ہیں لہو ولعب کے لیے، یعنی اُن کو عبث و باطل و بے فائدہ و بے کار نہیں بنایا ہے، بلکہ ہم نے تو اُن کو انواع و اقسام کی صنعتوں اور کارسازیوں سے پُر اور بھرا ہوا پیدا کیا ہے، تاکہ نظر کرنے والوں کے لیے تبصرہ اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت ہو جائیں اور جس شے سے بندوں کے کام معیشت اور معاد میں منتظم ہوں، اس کے لیے سبب بن جائیں اور اس بات پر آگاہ کرنے کو بنایا ہے کہ ان کا ایک ایسا خالق قادر ہے، جس کے حکم کی بجا آوری ضروری ہے اور اُن کے بہت سے فائدوں کے لیے بنایا ہے، ان فوائد میں سے اُن کی خلق میں فکر کرنے اور اُن کے بے حد وحساب منافع میں جو اُن کے اندر رکھے گئے ہیں، غور کرنا ہے اور اس لیے کہ اُن سب کاموں کی تدبیر کرنے والے کی قدرت پر استدلال کریں اور اس واسطے کہ ہم نیک و بد کو اپنی حکمت کے تقاضا کے تحت جزا اور سزا دیں۔ جب یہ بات ٹھہری کہ آسمان و زمین کی پیدایش عبث و بے فائدہ نہیں ہوئی ہے، بلکہ قادر مطلق کی قدرت بتانے کے لیے اور بندوں کے منافع کے لیے ہوئی ہے، جو مذکور ہو چکے تو بندوں کو چاہیے کہ اُن سے تحصیلِ کمال کی طرف چڑھیں، اُن کو کمال کے حاصل کرنے کا زینہ بنائیں اور ان کی آرایش و رونق سے دھوکا نہ کھائیں، کیونکہ وہ جلد زائل ہونے والی چیزیں ہیں، بلکہ اُن میں غور وفکر کر کے اُن کے خالق کی قدرت کو پہچانیں اور اسی کو پوجیں، اس کے احکامات کو دل کی خوشی سے بجا لائیں اور اس میں دین و دنیا کی سعادت سمجھیں اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچیں اور ان میں انہماک کرنے کو دین و دنیا کی بدبختی جانیں۔ اس آیت میں تکوینِ عالم کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کو نشانِ نقصان سے منزہ کیا۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا﴾ لہو وہ شے ہے، جس کے ساتھ لہو ولعب کیا جاتا ہے، یعنی اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھلونا بنا لیں۔ "لَا تَّخَذْنٰهُ مِنْ عِنْدِنَا" تو ہم اس کو اپنی قدرت سے یا اپنے پاس سے بنا لیتے، من جملہ اس شے کے جو کہ ہماری بارگاہِ عالی جاہ کے لائق ہے، یعنی مجردات سے اس کو بنا لیتے نہ کہ اجسامِ مرفوع و اجرامِ مبسوط سے، جس طرح تمھاری عادت ہے کہ تم چھتوں کو بلند کرتے ہو اور اُن کی تزئین وتحسین کرتے ہو اور بچھونوں کو برابر بچھاتے ہو اور اُن کو مزین و آراستہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣٤)

کرتے ہو، یہ جملہ مستانفہ ہے مضمون ماقبل کی تقریر و تاکید کے لیے لایا گیا ہے، کیونکہ ماقبل کا مضمون یہی تھا کہ آسمان و زمین ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ کی پیدائش لہو ولعب کے لیے نہیں ہے، بلکہ اظہارِ قدرت اور لوگوں کے فائدے کے لیے ہے اور اس جملے نے یہ بات بتائی کہ اگر ہم ارادہ کرتے لہو بنانے کا تو اپنی ہی طرف سے بنا لیتے یا مجردات سے بنا لیتے۔ ﴿ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ اگر ہم کو کرنا ہوتا۔ لیکن ہم نے اس کو نہیں کیا تو ہم نے اس کو نہ چاہا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کی ذات تقدسِ آیات ارادۂ لہو ولعب سے مبرّا ومنزّہ ہے تو پھر لہو کے بنانے کا کیا ذکر۔

بیان واضح اس کا یہ ہے کہ حرف ﴿ لَوْ ﴾ واسطے امتناعِ ثانی کے ہے بسببِ امتناعِ اول کے، اس کی مثال یہ ہے: ''لو جئتني لأكرمتك'' یعنی اگر تو میرے پاس آتا تو میں تیرا اکرام کرتا۔ اول شرط اور مقدم ہے اور ثانی جزا اور تالی (مؤخر) ہے، تالی کی نقیض کا استثنا کیا جاتا ہے، تاکہ مقدم کی نقیض کو منتج ہو۔ یعنی لیکن میں نے تیرا اکرام نہ کیا، اس لیے کہ تو میرے پاس نہ آیا۔ اسی طرح آیتِ باب میں سمجھنا چاہیے، کیونکہ ﴿ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا ﴾ مقدم ہے اور ﴿ لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ﴾ تالی ہے، ﴿ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ جملہ شرطیہ ہے، اس کا جواب محذوف ہے، یعنی ''أَرَدْنَاه''، شرطیہ مقدم ہے اور جواب اس کا تالی ہے، یعنی اگر ہم ارادہ کرتے لہو بنانے کا تو اس کو اپنے ہی پاس سے بنا لیتے، اگر ہم کو اس کا کرنا ہوتا، لیکن ہم نے اس کو نہیں کیا، اس لیے کہ ہمارے حق میں یہ محال ہے، کیونکہ ربوبیت کے لائق نہیں ہے پس ہم نے لہو بنانے کا ارادہ نہیں کیا۔ مصباح میں کہا ہے کہ نجد والے ''لهوت عنه ألهو لهيا'' بولتے ہیں، اصل ''لهو'' کی ''لهويٌ'' بروزن فعولٌ ہے باب قعد سے۔ اور عالیہ والے ''لهيت عنه ألهى'' باب تعب سے کہتے ہیں معنی اس کے سلوان وترک کے ہیں، یعنی جب اس کے صلے میں حرفِ ''عن'' آتا ہے تو اس کے معنی بے غمی وترک کے ہوتے ہیں،[1] جس طرح کہتے ہیں کہ ''اِلْهَ عَنْهُ''، یعنی تو اس کو چھوڑ دے، اس سے بے غم ہو جا اور لهوت بہ لهواً باب قتل سے اس کے معنی ہیں: ''أولعت به'' یعنی جب اس کے صلے میں حرف با آتا ہے تو اس کے معنی حرص کے ہوتے ہیں اور ''تلهيت به'' بھی بولتے ہیں۔

امام طرطوشی نے کہا ہے کہ لہو کی اصل یہ ہے: ''الترويح عن النفس بما لا تقتضيه الحكمة''[2] یعنی نفس سے رنج وکلفت کا دور کرنا ایسی شے کے ساتھ کہ حکمت جس کی مقتضی نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ لہو سے مراد جورو ہے اور بیٹا۔ کسی نے کہا ہے کہ فقط جورو۔ کسی نے کہا ہے کہ فقط بیٹا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کبھی کنایہ کیا جاتا ہے ساتھ لہو کے جماع سے بدلیل قول امرئ القیس ؎

الا زعمت بسباسة اليوم أنني   كبرت وأن لا يحسن اللهو أمثالي

''کیا بسباسہ (عورت کا نام) نے یہ زعم نہیں کیا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور یہ کہ مجھ جیسے آدمیوں کو جماع

[1] المصباح المنير (۲/ ۵۵۹) [2] فتح البيان (۸/ ۳۱۱)

کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔"

اسی باب سے دوسرے شاعر کا قول ہے۔ ع

و فیھن ملھی للصدیق و منظر[1]

یعنی عورتوں میں یار دوست کے لیے جماع کرنا اور نظر کرنا ہے، یعنی عورت میں مرد کا یہی کام ہے کہ اس سے جماع کرے، اس کو دیکھے، نظر بازی سے لذت لے۔

محلی وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ لَّدُنَّآ ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ عِنْدِنَا"[2] ہم لہو بنا لیتے اپنے پاس سے نہ تمھارے پاس سے من جملہ اہلِ زمین کے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ مراد ولدان ہیں یا حورِعین یا فرشتے۔ اس میں اس شخص کی تردید ہے جو کہتا ہے کہ اصنام یا فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تعالیٰ اللہ عن ذلك علواً کبیراً۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت رد ہے نصاریٰ پر۔

امام فراء، مبرد اور زجاج رحمہم اللہ نے کہا ہے: ہوسکتا ہے کہ حرف ﴿ اِنْ ﴾ واسطے نفی کے ہو، جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ مثل نتیجے کے ہوگا واسطے جملہ شرطیہ کے، یعنی ہم نے یہ نہ کیا، نہ جورو رکھی نہ اولاد، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حرفِ ﴿ اِنْ ﴾ واسطے شرط کے ہو، یعنی اگر ہم ان لوگوں میں سے ہوتے، جو یہ کرتے ہیں تو البتہ ہم بنا لیتے لہو کو اپنے پاس سے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وجہ دونوں وجہوں سے زیادہ تر مشابہ ہے مذہبِ عربیت کے ساتھ۔[3]

غرضیکہ پھر اللہ پاک نے "اتخاذ لھو" بلکہ ارادۂ "اتخاذ لھو" سے اضراب و اعراض کیا اور اپنی ذاتِ مقدس کی اس سے تنزیہ فرمائی اور یوں ارشاد کیا کہ ﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ ﴾ یعنی تو اس بات کو چھوڑ جو انھوں نے کہی، کیوں کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے، گویا یوں کہا کہ ہم پاک ہیں، اس سے کہ لہو بنائیں، بلکہ ہماری شان واضح البرہان یہ ہے کہ غالب کریں حق کو، جس کے من جملہ جد ہے باطل پر، جس کے من جملہ لہو ہے۔ یا حق سے مراد ایمان اور باطل سے شرک یا اول سے مراد جد، ضد لعب، ثانی سے مراد لعب، یا حق سے مراد لا الہ الا اللہ کا کہنا ہے اور اس بات کا کہنا کہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے اور باطل سے مراد اُن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، یا حق سے مراد حجت، اور باطل سے مراد شبہہ یا حق مواعظ اور نصیحتیں ہیں اور باطل معاصی یا گناہ، یا اُن کا جھوٹ اور اللہ پاک کی ایسی صفتیں کرنا جو اس کے لائق نہیں۔ ﴿ فَيَدْمَغُهٗ ﴾ یعنی پھر حق باطل کو مقہور و ہلاک و مغلوب کر ڈالتا ہے، اس کو دبا دیتا ہے۔

﴿ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ﴾ یعنی پھر اچانک باطل زائل یا تلف یا ہلاک ہو جاتا ہے۔ ان کے معنی ایک دوسرے کے

---

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٧٦) [2] تفسیر الجلالین (١/ ٤٢١) [3] فتح القدیر (٣/ ٥٤٩)

قریب ہیں، یعنی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اصل لغت میں قذف کے معنی ہیں: سنگ انداختن۔ صلہ اس کا بحرفِ با آتا ہے اور دمغ کی اصل سر کا چیرنا پھاڑنا ہے، یہاں تک کہ دماغ کو پہنچ جائے۔ صراح میں کہا ہے: دمغ سر شکستن، چونکہ دمغ کی اصل سر توڑنا ہے، یہاں تک کہ ضرب دماغ کو پہنچ جائے۔ اسی لیے امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "یدمغه" کے یہ معنی ہیں کہ حق باطل کو لے جاتا ہے، جیسے صغار اور اذلال (کمینے اور ذلیل) کو لے جاتے ہیں۔[1] یعنی باطل پر جب حق آتا ہے تو اس کو ذلیل و خوار کر کے دور کر دیتا ہے، جس وقت کسی کو ذلیل و خوار کرنا منظور ہوتا ہے تو اس کا سر توڑ ڈالتے ہیں، سر توڑنے سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہوگی۔ ہندی کے محاورے میں بھی سر توڑنا استعارتاً ذلیل کرنے کے معنی میں بولتے ہیں، مثلاً: فلاں نے فلاں کا سر توڑ دیا، یعنی اس کو ذلیل و خوار کیا۔ کلام پاک کا اصل مضمون صرف اتنا ہے کہ حق کو باطل پر وارد کرنا، پھر حق کا باطل کو مٹا دینا، پھر فوراً باطل کا مٹ جانا، لہٰذا اللہ پاک نے اس مضمون کو کس حسن و خوبی و مبالغے سے تین لفظوں میں ادا فرمایا ہے، وہ لفظ یہی قذف، دمغ اور زہوق ہیں، انھیں تین لفظوں میں تین مضمون پورے کیسی خوبی سے ادا ہو گئے کہ اس سے بڑھ کر تصور نہیں کیا جا سکتا، سوائے اس ذات کے جو تمام فصیح و بلیغ ہستیوں کی خالق ہے، کس کی مجال ہے کہ ایسے حسن و جمال و ایجاز و اختصار و استعارے و مبالغے سے ادا کر سکے۔

اب ذرا حق بات سننے والے کانوں کو جھکائیے اور دلِ دانا کو متوجہ کیجیے اور اپنے پروردگار کے کلامِ پاک کی حسنِ ادائی کو ملاحظہ فرمائیے، دیکھیے اس میں کیا ایک استعارۂ لطیف ادا فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ قذف و دمغ کا اصل استعمال جسموں میں ہوتا ہے، چنانچہ اُن کے لغوی معنی پہلے گزر چکے ہیں، پھر قذف کا حق کو باطل پر وارد کرنے کا استعارہ کیا گیا ہے اور دمغ کا استعارہ باطل کو لے جانے کے لیے کیا ہے، پس مستعار منہ، یعنی قذف حسی ہے اور مستعار لہ، یعنی وارد کرنا حق کا باطل پر عقلی ہے تو گویا یوں کہا کہ بلکہ ہم وارد کرتے ہیں حق کو جو جسمِ قوی سے مشابہ ہے، اس باطل پر جو جسمِ ضعیف کے مشابہ ہے، پس وہ حق اس باطل کو ایسا باطل کر دیتا ہے، جیسا کہ قوی جسم ضعیف جسم کو باطل کر ڈالتا ہے۔ یہ بیان تو علامہ نسفی رحمہ اللہ کا ہے۔[2]

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ﴿نَقْذِفُ﴾ کے معنی ہیں: "نغلب" اور ﴿فَيَدْمَغُهٗ﴾ کے معنی ہیں: "فیمحقه" یعنی ہم غالب کرتے ہیں حق کو باطل پر تو وہ باطل کو مٹا دیتا ہے، لہٰذا اللہ پاک نے اس مضمون کے لیے استعارہ فرمایا قذف کا اور قذف رمی بعید ہے، جو مستلزم ہے صلابتِ مرمی کو اور دمغ کا جو توڑنا ہے دماغ کا اس طریقے سے کہ دماغ کے پردے کو پھاڑ دے، زہوق روح کو مؤدی ہو جائے، یہ استعارہ صرف دو امر کے لیے کیا گیا ہے، ایک تو حق سے باطل کو مٹا دینے کی تصویر، دوسرے اس میں مبالغہ،[3] یعنی حق کو باطل پر غالب کرنا، یہ

[1] معاني القرآن (٣/ ٣٨٧) [2] تفسير النسفي (٣/ ٧٧) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٦)

ایک امرِ معقول تھا۔ اس معقول کو پیرایہ محسوس و مجسم میں یوں ادا کیا کہ ہم حق کو باطل پر اس طرح غالب کرتے ہیں کہ جس طرح کوئی شخص کسی شخص کو دور سے تاک کر ایک پتھر زور سے مارے، کیونکہ پاس سے سخت چوٹ نہیں لگتی، دور کی چوٹ زیادہ لگتی ہے، پھر وہ پتھر اس کے دماغ کو توڑ کر پردۂ دماغ تک پہنچ جائے، یہ چوٹ کاری ہوتی ہے، اس سے آدمی جانبر نہیں ہوتا، پھر چوٹ کے لگتے ہی، اس کی جان نکل جائے، اسی لیے کلمہ ﴿ إِذَا ﴾ مفاجاتی ذکر کیا ہے، جو موت کی سرعت پر دلالت کرتا ہے اور اس مجاز کی ترشیح و تزیین کے واسطے کلمۂ زہوق ذکر فرمایا ہے، جس کے معنی روح نکلنے کے ہیں۔ لہٰذا جس طرح یہ شخص فی الفور ہلاک ہو جاتا ہے، اسی طرح جس وقت حق کا پتھر باطل شخص کے دماغ کو پھوڑ ڈالتا ہے تو وہ بھی فوراً نیست و نابود ہو جاتا ہے، اس کا کچھ اَتا پتا باقی نہیں رہتا۔

بعض نے "فَيَدْمَغَهٗ" کو زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ "قال أبو البقاء قرئ شاذا بالنصب وهو بعيد والحمل فيه على المعنى أي بالحق فالدمغ"[1] جس طرح کہ اس شعر میں ہے: ؎

سأترك منزلي لبني تميم والحق بالحجاز فاستريحا

"عن قریب میں اپنا مکان بنی تمیم کے لیے چھوڑ دوں گا اور حجاز میں جا ملوں گا تو میں راحت و آرام پاؤں گا۔"

اس قراءت کی توجیہ باوجود اس کے بُعد کے یا تو اس کو ایسے معنی پر محمول کریں گے، جس سے اگلا کلام من جملہ ان چھے چیزوں کے ہو جائے (یعنی امر و نہی و نفی و استفہام و تمنی و ترجی، ان کے جواب میں مضارع جب حرفِ فا کے ساتھ آتا ہے تو حرفِ فا کے بعد "أن" ناصبہ مقدر ہوتا ہے) کہ جن کے بعد حرفِ فا کے بعد کا حرف منصوب ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "لِنَقْذِفَ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغَهٗ" (اس صورت میں گویا مضارع مع حرفِ فا جوابِ امر میں واقع ہوا، اب حسبِ قاعدہ منصوب ہوگا) یا اس کو معطوف کریں گے حق مفرد پر تو اس کا نصب واجب ہوگا، تاکہ جملے کا عطف مفرد پر لازم نہ آئے۔

﴿ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴾ ﴿ لَكُمُ ﴾ خبر مقدم ہے "استقر" محذوف سے متعلق ہے، ﴿ اَلْوَيْلُ ﴾ مبتدائے موخر ہے۔ کلمہ "من" واسطے تعلیل کے ہے اور اسی "استقر" سے متعلق ہے، یہی وجہ وجیہ ہے۔ ﴿ اَلْوَيْلُ ﴾ سے مراد عذابِ شدید ہے، یا دوزخ میں ایک وادی ہے۔ کلمۂ ما یا مصدریہ ہے، اس صورت میں جمہور کے نزدیک اس کے لیے کوئی عائد نہیں ہے، یا موصولہ بمعنی "الذي" ہے یا نکرۂ موصوفہ ہے، اس صورت میں سب کے نزدیک عائد کا ہونا ضرور ہے، استکمالِ شروط کی وجہ سے محذوف ہو گئی ہے، یعنی اے کفارِ مکہ! اے گروہِ قریش! ثابت و مستقر ہے تمھارے لیے آخرت میں سخت عذاب اس بات کی وجہ سے جس کے ساتھ تم اللہ پاک کا وصف کرتے ہو، من جملہ ان باتوں کے جو کہ اس کی عزت و جلال کے لائق نہیں ہیں، یعنی یہ بات کہ اس کے جورو اور اولاد ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ

[1] التبيان في أعراب القرآن (٢/ ٩١٣)

نے کہا کہ ''من'' متعلق ہے واقعاً محذوف سے وہ حال ہے، یعنی ثابت ہے تمھارے لیے ویل دراں حالیکہ وہ واقع ہے اس شے سے جس کے ساتھ تم اللہ پاک کا وصف کرتے ہو۔[1] فتح البیان و فتح القدیر میں کہا ہے کہ یہ قریش کو اس بات کی وعید ہے کہ اُن کے واسطے بھی عذاب ہے، ان لوگوں کی طرح جو اللہ پاک کے لیے جورو اور اولاد بتاتے ہیں۔[2]

ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت میں ہے:

﴿ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ جملۂ مستانفہ ہے ماقبل کی تقریر و تاکید کرتا ہے، کیوں کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ اللہ پاک آسمان اور زمین اور ﴿ مَا بَيْنَهُمَا ﴾ کا خالق ہے اور یہاں یہ ارشاد کیا کہ اسی کا ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور زمین میں، یعنی آسمان و زمین کی سب خلق اسی کے بندے ہیں، اسی کے ملک ہیں اور وہ اُن سب کا خالق و مالک و رازق ہے۔ اُن پر طرح طرح کی نعمتوں کا انعام فرماتا ہے، پھر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اس کی بعض مخلوق اس کی شریک ہو کہ پوجی جائے، جس طرح وہ پوجا جاتا ہے، اس میں اُن لوگوں کی تردید ہے، جو کہتے ہیں کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تعالیٰ الله عن ذلك علوا كبيرا۔

﴿ وَمَنْ عِنْدَهُ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں، اس کا عطف ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ پر ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کا ذکر مستقل علاحدہ کر کے کیوں کیا، حالانکہ ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ ان کو بھی شامل ہے، لہٰذا اس کی چار وجہیں ہیں، یا تو عزت اور تعظیم کے لیے ہے کہ وہ اللہ پاک کے نزدیک معظم و مکرم ہیں اور اس کو اُن کے ساتھ مزید اعتناء (مہربانی) ہے اور وہ اس کی بارگاہِ عالی جاہ میں ایسے ہیں، جیسے بادشاہوں کے دربار میں مقرب لوگ ہوتے ہیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عندیت بطورِ تمثیل کے ہے۔[3] صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بلکہ بطریقِ تحقیق ہے، جس طرح کہ ظاہری نظمِ قرآنی ہے۔[4] شاید اس تحقیق سے یہ مراد ہو کہ اس کی تاویل نہ کی جائے، بلکہ بلا کیف مثل اور صفات کے بغیر تاویل مان لی جائے۔

مستقل ذکر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ''من عنده من وجه'' عام تر ہے ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ سے یعنی اُن کے آپس میں عام خاص ''من وجه'' کی نسبت ہے۔ اس نسبت میں ایک مادہ اجتماعی ہوتا ہے اور دو افتراقی، لہٰذا مادۂ اجتماعی تو یہ ہے کہ ﴿ مَنْ عِنْدَهُ ﴾ اور ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ ملائکۂ زمین و آسمان میں مجتمع ہیں اور جو قسم فرشتوں کی کہ سکون و نزولِ مکان سے بَری ہے، اس میں ﴿ مَنْ عِنْدَهُ ﴾ منفرد ہیں اور ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ اس سے خارج اور ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ غیر ملائکہ میں منفرد ہیں اور ﴿ مَنْ عِنْدَهُ ﴾ اس سے خارج، یہ دو مادے افتراقی ہوئے، ان میں ہر ایک کے ساتھ اُن میں کا ہر ایک منفرد ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٤)
[2] فتح القدير (٣/ ٥٥٠) فتح البيان (٨/ ٣١٢)
[3] تفسير أبي السعود (٦/ ٦٠)
[4] فتح البيان (٨/ ٣١٣)

﴿ مَنْ عِنْدَهٗ ﴾ سے مراد فرشتوں کی ایک قسم ہے، جو کہ آسمان و زمین میں رہنے بسنے سے پاک ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَنْ عِنْدَهٗ ﴾ مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴾ ہے۔ امام محلی اور نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ ﴿ اَلْاَرْضِ ﴾ پر وقف کیا جائے، کیونکہ عندیت منزلت و مکانیت کی ہے نہ کہ نزول و مکان کی۔

﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ مبتدا ہے، بعد اس کا خبر ہے۔ موضح قرآن و ترجمہ لفظی شاہ رفیع الدین و فتح الرحمٰن شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی بھی یہی وجہ مختار ہے۔ فتح الرحمٰن کے الفاظ یہ ہیں: ''واو راست ہر کہ در آسمانہا و زمین ست و آنانکہ نزدیک اویند یعنی ملأ اعلی سرکشی نمی کنند از عبادت او و ماندہ نمی شوند'' یعنی فرشتے اللہ پاک کی عبادت سے اور اس کے واسطے ذلیل ہونے سے کبر و عظمت و انفت (انکار) نہیں کرتے ہیں اور ہمیشہ اس کی عبادت میں لگے رہتے ہیں، تھکتے نہیں۔ ﴿ يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴾ ''حسیر'' سے ماخوذ ہے۔ ''حسیر'' اس اونٹ کو کہتے ہیں جو تھکنے کی وجہ سے منقطع ہو جاتا ہے، چل نہیں سکتا۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ''حسر البعير يحسر حسورا أعي و كل و استحسر و تحسر مثله وحسرته أنا حسرا يتعدى ولا يتعدى'' یعنی حسر لازم و متعدی دونوں طرح ہوتا ہے۔ ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہیں: ''لا يكلون''. امام ابن اعرابی نے کہا: ''لا يفشلون''.[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''لا يرجعون''.[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جن کا تم نے ذکر کیا کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں، وہ تو اللہ کے بندے ہیں، اس کی عبادت سے انفت (انکار) نہیں کرتے نہ اس سے بڑائی کرتے ہیں، جیسا کہ اور جگہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ ﴾[4] [الأعراف: ٢٠٦] ''بے شک جو (فرشتے) آپ کے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔'' کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی عبادت سے منقطع نہیں ہوتے۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

اس جگہ اللہ پاک نے ''یحسرون'' کے بجائے ﴿ يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴾ فرمایا، اس لیے کہ استحسار ابلغ ہے حسور سے، کیوں کہ ثانی میں بہ نسبت اول کے زیادتِ حروف ہے اور بقدر زیادتی حروف کے معنی میں بھی زیادتی ہوتی ہے، اگرچہ کتبِ لغت میں دونوں کو ہم معنی لکھا ہے۔ چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ صراح میں ہے کہ حسور و استحسار ماندہ شدن اور بہ حسب ظاہرِ حال مناسب یوں تھا کہ ''یحسرون'' ہوتا، کیونکہ ابلغ کی نفی سے اصل کی نفی لازم نہیں آتی، بخلاف عکس کے، یعنی جب ابلغ پر نفی آتی ہے تو صرف زیادتی کی نفی کرتی ہے اور اصل باقی رہ جاتی ہے تو فرشتوں سے

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٢١) تفسير النسفي (٣/ ٧٧) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٧٨)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٤٢٢) [4] فتح القدير (٣/ ٥٥٠)

ماندگی کی نفی کرنے میں زیادہ تر مبالغہ یوں ہوتا کہ ان سے ادنیٰ ماندگی کی یا مطلق ماندگی کی نفی کی جاتی نہ یہ کہ انتہا درجے کی ماندگی کی ان سے نفی کی جائے۔ پس ذکرِ استحسار کا نکتہ یہ ہے کہ منظور اس بات کا بتانا ہے کہ فرشتوں کی عبادت باوجود اس کے ثقل و دوام و اتصال کے اس لائق ہے کہ اس سے انتہا درجے کی ماندگی ہو اور بہت زیادہ تکان حاصل ہو، حالانکہ وہ اس سے نہیں تھکتے نہ اُن کو کچھ ماندگی ہوتی ہے، بلکہ علی الاتصال بہ تواتر وتوالی اس کو کیے جاتے ہیں۔

﴿ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴾ یہ جملہ مستانفہ جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی نے کہا ہے کہ فرشتے اللہ پاک کی عبادت کس طرح کرتے ہیں تو اس کا یہ جواب ہوا کہ وہ رات دن، یعنی ہمیشہ اللہ پاک کی تنزیہ و تقدیس و تعظیم کیا کرتے ہیں یا یہ جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ رات دن نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ ﴿ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴾ حال ہے ﴿ يُسَبِّحُوْنَ ﴾ کی ضمیر سے، یعنی تسبیح کرتے ہیں، حالانکہ اس سے ضعیف و سست نہیں ہوتے ہیں نہ اُن کو اس سے ملال ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ بعض فرشتے تو قاصد و پیامبر ہو کر آتے ہیں، زمین پر اترتے ہیں، احکام و رسالت پہنچاتے ہیں، چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ﴾ [الفاطر: ۱] ''فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے۔'' بعض فرشتے بعض کفار پر لعنت کرنے میں مشغول ہوتے ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۶۱] ''تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔'' لہٰذا رسالت کا پہنچانا، لعنتِ کفار میں مشغول ہونا، اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ کام اُن کو تسبیح سے مانع ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ تسبیح اُن کے حق میں ایسی ہے، جیسے ہمارے حق میں سانس لینا، چنانچہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مجرى التسبيح منهم كمجرى النفس منا لا يشغلنا عن النفس شيئ فكذلك تسبيحهم دائم''[1] یعنی تسبیح اُن کی طبیعت ہو گئی ہے، لہٰذا جس طرح ہم سانس لیتے ہیں اور وہ ہم کو بات چیت کرنے سے نہیں روکتی، اسی طرح وہ بھی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں اور اُن کو سارے کاموں سے مانع نہیں ہوتی۔

پھر اگر کوئی کہے کہ یہ قیاس ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ سانس لینے میں مشغول ہونا بات چیت کرنے سے نہیں روکتا، اس لیے کہ تنفس کا آلہ اور ہے اور بات کرنے کا آلہ اور ہے، بخلاف تسبیح و لعنت کے کہ دونوں کلام کی جنس سے ہیں، لہٰذا اُن کا جمع ہونا محال ہے تو اس کا جواب یوں دیں گے کہ اس بات میں کچھ استبعاد نہیں ہے کہ اللہ پاک اُن کے لیے بہت سی زبانیں پیدا فرما دے تو بعض زبانوں سے تو وہ اللہ پاک کی تسبیح کریں اور بعض سے اس کے دشمنوں پر لعنت کریں۔ حقیقت میں اس اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کا آدمیوں پر قیاس کیا، ورنہ اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آدمی اور فرشتے میں کیا مناسبت۔ یہ ویسی ہی بات ہے، جو کہ ملائکہ سوال میں ذکر کی گئی ہے کہ وہ دو ہیں یا زیادہ

[1] معاني القرآن (۳/ ۳۸۷۔ ۳۸۸)

اور دو ساری زمین والوں سے ایک وقت میں کیسے سوال کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی قیاس سے مفت کی دردسری پیش آتی ہے، اگر ہر شے اپنے موقع ومحل میں رکھی جائے اور خلطِ مبحث نہ ہو تو اس قسم کے تکلفات سے راحت ملتی ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

کیا انھوں نے زمین میں سے ایسے معبود بنا لیے ہیں جو (مردوں کو) زندہ کر دیں گے؟ (21) اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ضرور یہ دونوں تباہ ہو جاتے، چناں چہ اللہ، عرش کا رب ان باتوں سے پاک ہے، جو وہ (مشرک) بیان کرتے ہیں (22) وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی (23)

معبودانِ باطلہ کی تردید:

اللہ تعالیٰ اُن لوگوں پر انکار کرتا ہے جنھوں نے اس کے سوا اور معبود ٹھہرائے ہیں، پس فرمایا: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴾ یعنی کیا وہ مردوں کو زندہ کر دیں گے اور اُن کو اُٹھا کھڑا کریں گے زمین سے، یعنی وہ اس میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتے ہیں، پھر انھوں نے کیونکر اُن کو اللہ کا ہمسر ٹھہرایا ہے اور اس کے ساتھ اُن کو پوجا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اگر اس کے سوا اور معبود موجود ہوتے تو آسمان و زمین خراب ہو جاتے، یعنی اگر آسمانوں اور زمین میں اور معبود کہے جاتے تو وہ خراب ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۹۱] ''اللہ نے اپنی کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ اس کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے (اگر ہوتا) تو ہر معبود اس چیز کو، جو اس نے پیدا کی، لے جاتا، اور بلاشبہ ان میں سے ہر ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا، اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔'' اور اس جگہ فرمایا: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو وہ کہتے ہیں کہ اس کے واسطے بیٹا ہے یا شریک ہے، وہ اس بات سے جو وہ افترا کرتے ہیں اور جھوٹ بناتے ہیں، اللہ پاک و برتر و مقدس و منزہ ہے۔

﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی وہ ایسا حاکم ہے کہ اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ اس کی عظمت و جلال و کبریا و علم و حکمت و عدل و لطف کے بارے اس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ ﴿ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ اور وہ اپنی خلق سے اس کام کے بارے میں جو وہ کرتے ہیں، پوچھنے والا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ فَوَرَبِّكَ

لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿92﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹۲۔ ۹۳] ''چنانچہ آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔ ان عملوں کی جو وہ کرتے تھے۔'' اور یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ [المؤمنون: ۸۸] ''جبکہ وہی پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی۔'' کذا في ابن کثیر.[1]

کلمہ ﴿ اَمْ ﴾ بمعنی بل اور ہمزۂ استفہام انکاری کے ہے اور ﴿ بَلْ ﴾ واسطے انتقال کے ہے ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف "من الأرض" "کائنۃ" سے متعلق ہو کر ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی صفت ہے، لیکن یہ صفت تخصیص کے واسطے نہیں ہے، کیونکہ مشرکوں نے تو فرشتوں کو بھی آسمان میں معبود ٹھہرایا ہے، بلکہ یہ صفت تحقیر کے واسطے ہے، یعنی بلکہ کیا ٹھہرائے ہیں مشرکوں نے اور معبود زمین میں سے جن کا وجود زمین کی چیزوں سے ہے، جیسے: پتھر، سونا، چاندی وغیرہ۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنَ الْاَرْضِ ﴾ متعلق ہے ﴿ اِتَّخَذُوْا ﴾ سے بنا بر معنی ابتدائے جملہ۔

﴿ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴾ مستانفہ ہے یا صفت ہے ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی اور "إِنشار" مردے کے زندہ کرنے کو کہتے ہیں، یعنی ایسے معبود کہ وہی اُٹھا کھڑا کریں گے مردوں کو۔ حقیقت میں انکار و تشنیع اسی جملے کی طرف راجع ہے، گو ہمزۂ انکار اتخاذ پر داخل ہے، کیونکہ یہ امر تو اُن سے واقع ہوا ہے کہ انھوں نے اور معبود ٹھہرائے، پھر اس پر انکار کیا۔ انکار اسی بات پر ہے کہ جن کو انھوں نے معبود ٹھہرایا ہے، کیا وہی مُردوں کو زندہ کریں گے، یعنی اُن کو ہرگز اس بات پر قدرت نہیں، بھلا پتھر اور جمادات کو کیا خاک قدرت ہو سکتی ہے کہ مردے کو زندہ کر دے۔ اللہ پاک ان پر انکار فرماتا ہے اور ان سے ٹھٹھا کرتا ہے کہ مشرک لوگ سخت جاہل و بے وقوف ہیں کہ خالق و قادر کو چھوڑ کر جمادات بے حس و حرکت کو پوجتے ہیں اور اُن کی جہالت اور مذاق میں مبالغہ کرنے کے لیے ضمیر ﴿ هُمْ ﴾ کو زیادہ کیا ہے جو کہ موہمِ اختصاصِ انشار ہے ساتھ اُن کے، یعنی بلکہ کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے معبود زمین میں سے جو کہ خاص اپنی حقارت اور ذلت کے باوجود مُردوں کو زندہ کریں گے، حالانکہ بات یوں نہیں ہے، کیوں کہ جن کو معبود ٹھہرایا ہے، وہ اس بات سے دور پڑے ہوئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ مشرک اس کے مدعی نہ تھے کہ ہمارے معبود مردے کو زندہ کرتے ہیں، تا آنکہ اس کا رد اُن پر کیا جائے، لہٰذا وجہ اس کی یہ ہے کہ گو وہ اس کے مدعی نہیں ہے، لیکن ان کو معبود تو بالیقین ٹھہرایا ہے، پس معبود ایسا چاہیے، جو ساری ممکنات کی ایجاد (وجود میں لانے) اور اعدام (عدم کرنے) پر قدرت رکھتا ہو۔ مردوں کو قبروں سے اٹھا کر کھڑا کرے، گویا جبکہ الوہیت کے مدعی ہوئے تو ضمناً و التزاماً لوازمِ اُلوہیت کے بھی مدعی ٹھہرے، اس لیے اس بات کا اُن پر انکار کیا گیا۔ مفضل نے کہا ہے کہ اس استفہام سے مقصود جحد ہے یعنی انکار۔ معنی یہ ہیں کہ نہیں ٹھہرائے انھوں نے ایسے معبود کہ زندہ کرنے پر قادر ہوں اور ﴿ اَمِ ﴾ منقطعہ ہے اور ہمزہ وقوع کے انکار کے لیے

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۳۵)

ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَمِ ﴾ اس جگہ بمعنی "ھل" ہے، یعنی کیا ان مشرکوں نے زمین میں معبود ٹھہرائے ہیں، جو زندہ کریں گے مردوں کو اور یہاں ﴿ اَمِ ﴾ بمعنی ﴿ بَلْ ﴾ نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ معنی یہ ہوں گے: بلکہ ٹھہرائے انھوں نے ایسے معبود جو کہ زندہ کرتے ہیں مُردوں کو، حالانکہ یہ مقصود نہیں ہے۔ ہاں اگر ﴿ اَمِ ﴾ مع استفہام کے مانا جائے تو ﴿ اَمِ ﴾ منقطعہ بمعنی ﴿ بَلْ ﴾ اور ہمزہ واسطے انکار کے ہوگا۔ اس صورت میں معنی درست ہوں گے،[1] جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

جمہور نے "یُنْشِرُوْن" کو یائے تحتیہ کی پیش اور شین کی زیر سے پڑھا ہے بابِ افعال سے۔ حسن رحمہ اللہ نے یا کی زبر سے پڑھا ہے، یعنی زندہ رہیں گے، مریں گے نہیں۔[2] مصباح میں ہے کہ "نشر ینشر" باب قعد سے متعدی و لازم دونوں طرح آتا ہے اور ہمزہ کے ساتھ متعدی بھی ہوتا ہے،[3] غرضیکہ آیتِ کریمہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مشرکوں نے جن کو معبود ٹھہرایا ہے، ان کو ہرگز معبودیت کی لیاقت نہیں، کیوں کہ معبود وہ ہوتا ہے جو ایجاد کرنے اور احیا کرنے پر قادر ہو اور اُن کے معبود اُن سے عاجز ہیں، یہ کیا خاک کریں گے، اُن کو تو حس و حرکت پر بھی قدرت نہیں ہے، بلکہ اُن سے اُن کے عابد کہیں بڑھ کر ہیں کہ کھاتے، پیتے، چلتے، پھرتے، ہر قسم کے کام کرتے ہیں، اسی لیے اللہ پاک نے اُن پر انکار کیا، اُن کو ڈانٹا اور اُن کی جہالت اور بے وقوفی بیان فرمائی۔

پھر متعدد معبود ہونے کے بطلان پر برہان قائم کی کہ ﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ یعنی اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو وہ خراب ہو جاتے، یعنی اگر اُن میں اور آلہ معبودین ہوتے اور اُن کے کام کی تدبیر کرتے سوائے ایک اللہ کے جو اُن کا پیدا کرنے والا ہے تو وہ خراب ہو جاتے، بگڑ جاتے اور جو نظام و انتظام دکھائی دیتا ہے، اس سے نکل جاتے اور اُن میں جو مخلوقات ہے، وہ ہلاک ہو جاتی اور سارا کاروبار درہم برہم ہو جاتا، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آسمان و زمین قائم ہیں، سورج چاند ستارے نکلتے ہیں اور ڈوبتے ہیں رات اور دن آتے جاتے ہیں، پانی برستا ہے روئیدگی اُگتی ہے۔ خلق کے اسبابِ راحت پورے پورے مہیا اور موجود ہیں، ہر قسم کا نظم کامل طور پر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ان کا فاطر و خالق ایک ہی ذات پاک وحدہ لاشریک لہ ہے اور اسی ایک کا حکم چلتا ہے، جبھی تو ایسے اچھے انتظام سے سارے کارخانے برابر چل رہے ہیں، اگر اس کے سوا اور معبود ہوتے تو کارخانہ بگڑ جاتا، کیونکہ عادت یوں جاری ہے کہ جس وقت حاکم متعدد ہوتے ہیں تو باہم ان کے ملک میں تمانع (فساد) ہوتا ہے اور اس پر اتفاق نہیں ہوتا، وجہ اس کی یہ ہے کہ جو حکم دو یا زیادہ سے جاری ہوتا ہے، وہ نظام پر جاری نہیں ہوتا، عقل بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ اگر ہم دو معبود فرض کریں تو اُن میں سے ایک جس وقت منفرد ہوتا ہے تو اس سے ایک جسم کو حرکت دینا ہو سکتا ہے اور جب دوسرا منفرد ہوتا ہے تو اس سے اس جسم کا ساکن کرنا ہو سکتا

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٢٧٨) فتح القدير (٣/ ٥٥٠) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٧٨) [3] المصباح المنير (٢/ ٦٠٥)

ہے، پھر جس وقت وہ دونوں جمع ہو جائیں تو ضروری ہے کہ جس بات پر وہ اکیلے میں تھے، اسی پر باقی رہیں، پس اجتماع کے وقت ہوسکتا ہے کہ ایک تو اس جسم کے حرکت دینے کا قصد کرے اور دوسرا ساکن کرنے کا، پھر یا تو دونوں مرادیں حاصل ہوں، حالانکہ یہ محال ہے یا دونوں باز رہیں، جب کہ یہ بھی محال ہے، کیونکہ ہر ایک اُن میں سے عاجز ہوگا تو یہ بات ثابت ہوئی کہ دو معبود کے وجود کا قائل ہونا باعثِ فساد ہے، پس اس کا قائل ہونا باطل ٹھہرا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ امام کسائی، سیبویہ، اخفش، زجاج اور جمہور نحویین نے کہا ہے کہ کلمہ ﴿ اِلَّا ﴾ اس جگہ استثنا کے لیے نہیں ہے، بلکہ بمعنی غیر ہے، صفت ہے ﴿ اٰلِهَةٌ ﴾ کی اور اسی لیے جو اسم کہ اس کے بعد واقع ہوا ہے، مرفوع ہے اور اس میں اعراب غیر کا ظاہر ہوا ہے، جس کے معنی میں ﴿ اِلَّا ﴾ آیا ہے۔ اسی باب میں کسی شاعر کا یہ قول ہے ؎

وكل أخ مفارقه أخوه لعمر و أبيك إلا الفرقدان

یعنی قسم ہے تیرے باپ کے خالقِ عمر کی کہ ہر بھائی سوائے فرقدان کے اپنے بھائی سے جدا ہونے والا ہے۔ فرقدان دو ستاروں کا نام ہے، قریب قطب کے۔ دیکھو یہاں ﴿ اِلَّا ﴾ بمعنی غیر صفت ہے "كل أخ" کی، اسی واسطے فرقدان مرفوع ہے، ورنہ فرقدین ہوتا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِلَّا ﴾ یہاں بمعنی "سویٰ" ہے۔ وجہ فساد کی یہ ہے کہ اللہ پاک کے ساتھ اور معبود کا ہونا اس بات کو لازم کرتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک مستقل تصرف کرنے پر قادر ہو۔ پس اس صورت میں تنازع و اختلاف واقع ہوگا اور اس کے سبب سے فساد واقع ہوگا۔[1]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اٰلِهَةٌ ﴾ کا بصیغۂ جمع لانا کچھ قید نہیں ہے۔ صرف ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً ﴾ کی مشاکلت کے لیے جمع کے ساتھ تعبیر کی گئی ہے، یعنی یہ غرض نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ متعدد معبود ہوں تو فساد ہو اور اگر ایک یا دو ہوں تو فساد نہ ہو، اسی طرح ﴿ فِيْهِمَآ ﴾ بھی قید نہیں ہے۔ اس کے ساتھ صرف اس لیے تعبیر کی گئی ہے کہ یہ ایک دلیل اقناعی ہے موافق اس بات کے جس کو مخاطب سمجھتا ہے اور موافق اس امر کے جو کہ مشرکوں سے واقع ہوا ہے، انھوں نے صرف زمین و آسمان میں معبود ٹھہرائے تھے نہ ماورائے زمین و آسمان میں، جیسے کہ وہ فرشتے جو کہ گرداگرد عرش کو گھیرے ہوئے ہیں۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے "إعراب القرآن" میں لکھا ہے کہ ﴿ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ مرفوع ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اِلَّا ﴾ صفت ہے ﴿ اٰلِهَةٌ ﴾ کی، بمعنی غیر، یہ جائز نہیں ہے کہ ﴿ اٰلِهَةٌ ﴾ سے بدل ہو، کیونکہ پھر یہ معنی ہو جائیں گے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ ہوتا تو وہ خراب ہو جاتے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اگر تو یوں کہے: "ما جاءني قومك إلا زيد" بنابر بدل، تو معنی یہ ہوں گے کہ "جاءني زيد وحده" یعنی تنہا زید میرے پاس آیا۔ کسی نے کہا بدل ہے اس لیے کہ ممتنع ہے کہ ماقبل ﴿ اِلَّا ﴾ کا کلام موجب ہے اور نصب بنا بر استثنا، بہ سبب دو وجہ کے جائز نہیں ہے: ایک وجہ یہ ہے کہ معنی میں فاسد ہے، یہ اس لیے کہ جس وقت تو نے یوں کہا: "لو جاءني

[1] فتح القدير (٣/ ٥٥١)

القوم إلا زيدا لقتلتهم" تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قتل اس لیے ممتنع ہوا کہ زید قوم کے ہمراہ تھا۔ آیتِ کریمہ میں اگر اللہ پاک کا اسم مبارک منصوب ہوتو یہ معنی ہوں گے کہ فساد آسمانوں اور زمین کا ممتنع ہوا، بہ سبب وجود اللہ تعالیٰ کے ہمراہ ﴿ اٰلِهَةٌ ﴾ کے، حالانکہ اس معنی میں اللہ کے ہمراہ معبود کا ثبوت ہے اور جس وقت بنا پر صفت مرفوع ہوگا تو ایسی بات لازم نہ آئے گی، کیوں کہ معنی یہ ہوں گے کہ اگر اُن میں غیر اللہ ہوتا تو وہ فاسد ہو جاتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اٰلِهَةٌ ﴾ اس جگہ نکرہ ہے اور جمع جس وقت نکرہ ہوتی ہے تو محققین کی ایک جماعت کے نزدیک اس سے استثنا نہیں کیا جاتا، اس لیے کہ اس جمع میں ایسا عموم نہیں ہوتا کہ اگر استثنا نہ ہوتو مستثنیٰ اس میں داخل ہو جائے۔[1]

فتح البیان وغیرہ کا بیان:

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت حجتِ قطعی الدلالت ہے اور یہ قول حجتِ اقناعی ہے، ایک قول انتہائی منکر وشنیع ہے۔ ادلہ قرآنیہ وحجج فرقانیہ، جو کہ باری تعالیٰ کی توحید پر دال ہیں، وہ اس بارے میں براہینِ کلامیہ و مسائلِ عقلیہ وفلسفیہ سے بے نیاز ہیں۔ اللہ پاک کے بیان کے بعد اور کوئی بیان نہیں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دو الٰہ کے وجود کا قائل ہونا مفضی بہ محال ہے، پھر اس کے دلائل کا ذکر کیا ہے،[2] مسئلہ توحید میں یہ حجت تام و کامل ہے۔ فساد کل تقدیرات پر لازم ہے، جن کی تقدیر کی ہے۔ جس وقت تو اُن پر واقف ہوگا تو پہچان لے گا کہ عالمِ بالا اور عالمِ سفلی میں سارے محدثات ومخلوقات جو ہیں، وہ اللہ پاک کی وحدانیت پر دلیل ہیں۔ رہے دلائلِ سمعی ونقلی تو وہ قرآن شریف میں بہت ہیں اور جس کسی نے دلالتِ تمانع میں طعن کیا ہے، اس نے اس آیت کی یوں تفسیر کی ہے کہ مراد یہ ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اور معبود ہوتے، جن کی معبودیت کے بت پرست قائل ہیں تو عالم کا فساد لازم آتا، کیونکہ وہ جمادات ہیں، تدبیرِ عالم پر قدرت نہیں رکھتے، تو اب عالم کا فاسد کرنا لازم آیا۔ کہا ہے کہ یہ قولِ اولیٰ ہے، کیونکہ اللہ پاک نے اپنے قول پاک میں مشرکین سے یوں حکایت کیا ہے: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴾

پھر اس کے فساد پر دلیل ذکر کی ہے، پس واجب ہوا کہ دلیل اسی کے ساتھ خاص ہو۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ آیت حجتِ اقناعی ہے۔ لہٰذا محققین، جیسے: امام غزالی اور ابن ہمام رحمہما اللہ نے اقناعی ہونے پر قناعت نہیں کی، بلکہ اس کو منِ جملہ حقائقِ قطعیہ ٹھہرایا۔ "بل قيل بكفر قائلها"۔ غرضیکہ جب اللہ تعالیٰ نے برہانِ عقلی سے وحدانیت کا ثبوت فرمایا تو مابعد کو بحرفِ فا اس پر مرتب کر کے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اللہ عزوجل منزہ ومبرا ہے اس شے سے جو کہ اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٥) [2] تفسير الرازي (٢٢/ ١٣٠)

سزاوار نہیں ہے اور اس کی توحید و تفرید کا دامن ثبوتِ شرک کے لوث (ملاوٹ) سے پاک صاف ہے۔ اس میں بندوں کو اس بات کا ارشاد ہے کہ جو شے اس کی ذاتِ فیض مآب کے لائق نہیں ہے، اس سے اپنے رب سبحان کی تنزیہ کریں۔[1] علامہ محلی رحمہ اللہ نے اس جگہ عرش کی تفسیر کرسی سے کی ہے۔[2]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی کوئی حاجت نہیں ہے، بلکہ عرش کو اپنے معنی پر رکھنا چاہیے، کیونکہ یہ تحقیق شدہ بات ہے کہ عرش کرسی کے علاوہ ایک جسم ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ کا یہ قول بہت خوب ہے، اسی لیے قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے عرش کو اپنے معنی پر رکھا ہے اور یوں تفسیر فرمائی ہے: "المحیط بجمیع الأجسام الذي هو محل التدابیر و منشأ التقادیر"[3] یعنی اللہ پاک رب و پروردگار ہے عرش کا، کون سا عرش، جو کہ سارے اجسام کو محیط ہے اور محلِ تدابیر و منشا مقادیر ہے۔ یہاں رب العرش کہنے میں ایک لطیف نکتہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ مشرکین نے زمین و آسمان میں اللہ پاک کے سوا اور معبود ٹھہرائے اور عرش ایک ایسی بڑی شے ہے کہ آسمان و زمین سب کو گھیرے ہوئے ہے، اس کے روبرو زمین و آسمان کی کیا ہستی ہے، پس گویا اس میں رد ہے اُن پر کہ تم نے جن کو معبود ٹھہرایا، وہ سب عرش کے ضمن میں ہیں، وہ معبودیت کے لائق نہیں ہیں، معبودیت کے لائق وہی ذات ہے، جو کہ رب و خالقِ عرش ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی قوتِ سلطان اور عظیم جلال کو بہ جملہ مستانفہ بیان فرمایا کہ ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ ﴾ یعنی اس ذات پاک کا ایسا جلال ہے کہ خلق میں سے کوئی اس سے نہیں پوچھ سکتا اور اس کی قضا و قدر میں سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا۔ وہ جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلیل کرے، جس کو چاہے سعید و بختاور بنائے، جسے چاہے شقی و بدبخت کر دے، کیا مجال کہ کوئی کچھ بھی اس سے پوچھ سکے، کیونکہ وہ رب اور گردنوں کا مالک اور قوی السلطان، قاہر البرہان، متفرد بہ اُلوہیت و سلطنت ذاتی ہے۔ اگر بادشاہ کے غلاموں میں سے کوئی غلام اس پر اعتراض کرے، اس کے باوجود کہ دونوں ہم جنس ہیں اور اس سے خطا ہو سکتی ہے اور مالکِ حقیقی نہیں ہے تو یہ بات قبیح سمجھی جائے گی اور بے وقوفی اور حماقت شمار کی جائے گی۔ پس جو ذات پاک کہ مالک الملوک و رب الارباب ہے، اس کا فعل بالکل درست اور صحیح ہے، وہ تو اس بات کا بہت ہی حق دار ہے کہ اس پر اعتراض نہ کیا جائے۔

﴿ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ یعنی بندے جو کچھ کرتے ہیں اُن سے ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا جائے گا، اُن سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ تم نے ایسا ویسا کیوں کیا، کیونکہ وہ مملوک اور غلام ہیں، اُن پر اپنے مالک اور مولیٰ کے حکم کی بجا آوری واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کے اوپر کوئی نہیں ہے کہ اس سے کسی شے کا کہے، جس کو اس نے کیا ہے کہ تو نے یہ کیوں کیا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کا اس کے اعمال پر مؤاخذہ نہیں کیا جاتا ہے اور بندے مواخذہ کیے

---

[1] فتح البیان (٨/ ٣١٤۔ ٣١٦) [2] تفسیر الجلالین (١/ ٤٢٢) [3] تفسیر البیضاوي (٤/ ٨٩)

جائیں گے۔ کسی نے کہا کہ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں سے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ جو شخص اپنے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے، جیسے: مسیح علیہ السلام اور فرشتے تو وہ اس لائق نہیں کہ معبود ہو، حالانکہ اُلوہیت اس بات کے منافی ہے کہ اس میں جنسیت ہو یا اس سے اس کے کام کے بارے میں پوچھا جائے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ کی ضمیر آلہہ کی طرف راجع ہے یا عباد کی طرف۔[1] امام سعید بن منصور اور ابن منذر رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: نہیں ہے زمین میں کوئی قوم کہ مبغوض تر ہو مجھ کو قدریہ سے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی قدرت کو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾[2]

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۴ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵

کیا انھوں نے اس (اللہ) کے سوا اور معبود بنا لیے ہیں؟ کہہ دیجیے: تم اپنی دلیل لاؤ، یہ (توحید ہی) میرے ساتھیوں کا ذکر ہے اور مجھ سے پہلوں کا بھی ذکر تھا، بلکہ ان میں سے اکثر حق کا علم نہیں رکھتے، لہٰذا وہ (اس سے) اعراض کر رہے ہیں (24) اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو (25)

اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہے:

پہلے ان معبودوں کا فرمایا، جن کو کوئی اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھے، اگر دو حاکم ہوتے تو جہان خراب ہو جاتا۔ اب ان کا ذکر فرمایا، جو اللہ کے نائب ٹھہراتے ہیں، اس کو مالک کی سند چاہیے، اس کے بغیر کیونکر نائب ہو۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کیا پکڑے انھوں نے اس کے سوا اور معبود۔ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ لاؤ اپنی دلیل اس بات پر جو تم کہتے ہو۔ ﴿ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ ﴾ یعنی قرآن اور ﴿ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ﴾ یعنی اگلی کتابیں اس بات کے برخلاف ہیں، جو تم کہتے ہو اور اس کا زعم کرتے ہو، کیونکہ ہر کتاب جو اُتاری گئی، ہر نبیِ مرسل پر، وہ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ لا الہ الا اللہ، یعنی نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔ لیکن اے مشرکو! تم نہیں جانتے ہو سچی بات، پس تم اس سے اعراض کرتے ہو اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ ... الخ ﴾

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٩) [2] الدر المنثور (٥/ ٦٢٢)

جس طرح کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥] ''اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کوئی اور معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔'' پس جس نبی کو اللہ پاک نے بھیجا، وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہے اور اصل فطرت بھی اسی بات کی شاہد ہے اور مشرکوں کے واسطے کوئی برہان نہیں ہے اور اُن کی حجت اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے اور اُن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔[1]

کلمہ ﴿ اَمِ ﴾ بمعنی ﴿ بَلْ ﴾ اور ہمزۂ استفہام توبیخی ہے، مشرکین نے جن کو اپنا معبود ٹھہرایا تھا، اللہ پاک نے ان کے معبود ہونے کا بطلان دلیلِ سابق سے ظاہر کیا، اب اس سے اضراب و انتقال فرما کر یہ بات ظاہر کی کہ اُن کا معبود قرار دینا باطل ہے، اس کے ساتھ ہی اُن سے دلیل طلب کر کے اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کی، اس لیے یوں ارشاد فرمایا کہ ﴿ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم ان سے کہو کہ تم اس دعویٰ پر کہ وہ معبود ہیں، اپنی دلیل پیش کرو اور اس بات پر بھی کہ اللہ پاک کے سوا اور معبود ٹھہرانا جائز ہے، حالانکہ ان باتوں میں سے کسی طرف اُن کے لیے راہ نہیں ہے، نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، کیوں کہ دلیلِ عقلی کا بیان تو پہلے گزر چکا۔

رہی نقلی دلیل تو اس کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا ہے: ﴿ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ﴾ یعنی یہ وحی جو کہ شانِ توحید میں وارد ہے اور برہانِ قاطع رکھتی ہے، ذکر ہے میری اُمت کا اور ذکر ہے اگلی اُمتوں کا، حالانکہ میں اس کو تم پر قائم کر چکا اور تمھارے واسطے اس کو خوب واضح کر دیا، اب تم اپنی دلیل قائم کرو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن اور یہ کتابیں جو مجھ سے پہلے نازل ہوئیں، پس تم غور کر کے دیکھو، آیا اُن میں سے کسی کتاب میں یہ بات ہے کہ اللہ نے اپنے سوا کوئی اور معبود ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن سے کہا گیا: تم اپنی دلیل لاؤ، اس بات پر کہ من جملہ رسل کے کسی رسول نے اپنی اُمت کو خبر دی کہ اس کے واسطے سوائے اللہ کے کوئی معبود ہے، کیونکہ ﴿ ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ﴾ میں نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی توحید۔[2] اس میں اُن کے لیے تبکیت ہے، یعنی ڈانٹنا ہے اور عاجز کرنا ہے، جس سے مدعا کے اثبات کے لیے اُن کی بے بسی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کلام کے معنی وعید و تہدید ہیں، یعنی تم کرو جو چاہو، پس عن قریب پردہ کھل جائے گا۔

﴿ هٰذَا ﴾ اسم اشارہ ہے۔ ﴿ ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ ﴾ سے مراد نبی اکرم ﷺ کی اُمت ہے، اس بنا پر اس کا مشار الیہ قرآن شریف ہے اور ﴿ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ﴾ سے مراد سابقہ اُمتیں ہیں، اس بنیاد پر مشار الیہ تورات و انجیل

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٥) [2] معاني القرآن (٣/ ٣٨٩)

وغیرہ سابقہ کتب ہیں۔ جمہور نے باضافت ﴿ ذِكْرُ ﴾ طرف ﴿ مَنْ ﴾ کے پڑھا ہے، اس بنا پر اضافت مصدر کی مفعول کی طرف ہوگی، کیونکہ قرآن اور کتبِ سابقہ نصیحت و وعظ ہیں اُمتوں کے لیے۔

دوسری قراءت یہ ہے کہ امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ یحیٰی بن یعمر اور طلحہ بن مصرف نے ﴿ هٰذَا ذِكْرٌ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرٌ مَنْ قَبْلِيْ ﴾ بہ تنوین "ذکرٌ" وبکسر میم "مِن" پڑھا اور زعم کیا کہ اس قراءت کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس قراءت کی توجیہ میں کہا ہے، معنی یہ ہیں: "هٰذَا ذِكْرٌ مِمَّا أُنْزِلَ إِلَيَّ وَمِمَّا هُوَ مَعِيَ و ذكر من قبلي" کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "ذکر كائن من قبل" یعنی میں لایا ہوں اس شے کو کہ جس کو انبیا لائے ہیں مجھ سے پہلے۔[1] كذا في فتح القدير۔ امام ابوالبقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "هذا ذكر من كتاب معي ومن كتاب قبلي" اس صورت میں موصوف محذوف ہوگا۔[2]

تیسری قراءت یہ ہے: "ذِكْرٌ مَنْ مَّعِي" اس صورت میں "مَنْ" موضع نصب میں ہوگا بہ سبب مصدر کے اور ہوسکتا ہے کہ موضع رفع میں ہو بنا بر اقامتِ مصدر مقام "مالم يسم فاعله"۔ تفسیر بیضاوی میں چوتھی قراءت یہ لکھی ہے کہ "ذكرٌ معي" یعنی بہ تنوین ذکر وحذف "من" جارہ۔[3] غرض کہ پھر جب مشرکین پہ حجت متوجہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی کہ وہ مواضع حق سے جاہل ہیں۔ پس یہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ ﴾ یہ اللہ پاک کی طرف سے اضراب ہے، اس کلام میں داخل نہیں ہے، جس کی تلقین نبی اکرم ﷺ کو فرمائی تھی۔ برہان و دلیل کا اُن سے مطالبہ کر کے ان کو ڈانٹا اور زجر و توبیخ کی تھی اب اس سے انتقال کر کے یہ بیان فرمایا کہ جھگڑنا اور برہان قائم کرنا ان میں کچھ اثر نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق سے جاہل ہیں، حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے۔

پھر بیان فرمایا کہ یہ مشرک لوگ جو حق کو سمجھتے بوجھتے نہیں ہیں، اس کی وجہ کیا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ ﴿ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی اس جہالت نے اکثر مشرکوں کو ایسا قابو کر لیا ہے کہ اس کے سبب سے حق قبول کرنے سے منہ موڑتے ہیں اور جس غور و نظر کا حق مستحق ہے، اس سے منہ موڑتے ہیں۔ توحید و اتباعِ رسول سے روگردانی پر جمے ہوئے ہیں۔ پس نہ کسی حجت میں تأمل کرتے ہیں، نہ کسی دلیل میں غور و فکر کرتے ہیں، سوائے خواہشات کی پیروی، ہٹ دھرمی اور بے شرمی کے اور کچھ کام نہیں۔

جمہور نے ﴿ اَلْحَقَّ ﴾ کو منصوب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ کا مفعول ہے۔ ابن محیصن و حسن رحمہما اللہ نے برفع پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "هذا الحق أو هو الحق"[4] یہ جملہ اسمیہ سبب اور مسبب کے درمیان تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ سبب ﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ اور مسبب ﴿ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ ہے،

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٥١) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٥)

[3] تفسير البيضاوي (٤/ ٨٩) [4] فتح القدير (٣/ ٥٥٢)

یعنی جہالت کا سبب منہ موڑنا ہے، اگر ادنیٰ توجہ کرتے تو حق و باطل میں تمیز ہو جاتی، معلوم کر لیتے کہ توحید حق ہے، شرک باطل ہے، چونکہ اللہ پاک نے پہلے اجمالاً ذکر فرمایا کہ توحید ایسی شے ہے، جس پر ساری کتبِ الٰہیہ گواہی دیتی ہیں اور اسی پر تمام انبیا اور رسل مجتمع ہیں تو اب جملہ مستانفہ سے اس اجمال کی تقریر و تاکید فرمائی پس یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ﴾ اور اپنی عبادت کا بندوں کو امر کر کے آیت کو ختم کیا: ﴿ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ یعنی اب تو تمھارے واسطے عقلی اور نقلی دلیل واضح و ظاہر ہوگئی اور اللہ پاک کی حجت تم پر قائم ہو چکی، پس تم سب کو چھوڑ کر میری ہی بندگی کرو، مجھی کو پوجو۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے، کیونکہ ﴿ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ﴾ اس لحاظ سے کہ اسم اشارے کی خبر واقع ہوا ہے، انھیں تین کتابوں کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو اُن کے درمیان میں موجود تھیں (لیکن قاضی صاحب کا یہ قول اس بات پر مبنی ہے کہ رسول کے واسطے کتاب کا ہونا شرط کیا جائے)۔ امام حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے ﴿ نُوْحِيْٓ ﴾ بنون و کسر حائے مہملہ پڑھا ہے، باقی قاریوں کی قراءت بیائے تحتیہ و فتح حائے مہملہ ہے۔[1]

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿26﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿27﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿28﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿29﴾

اور انھوں نے کہا: رحمٰن نے اولاد بنائی ہے۔ وہ (اس سے) پاک ہے، بلکہ وہ (فرشتے) تو (اللہ کے) معزز و مکرم بندے ہیں ﴿26﴾ وہ بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے، اور وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں ﴿27﴾ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے، اور وہ صرف اس کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ پسند کرے گا اور وہ اس کے خوف سے ڈرنے والے ہیں ﴿28﴾ اور ان میں سے جو یہ کہے کہ بے شک اللہ کے سوا میں بھی معبود ہوں تو اسے ہم اس (بات) کا بدلہ جہنم دیں گے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ﴿29﴾

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہنے والوں کا رد:

اللہ تعالیٰ اس شخص کی تردید فرماتا ہے، جس کا یہ زعم ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے واسطے کوئی بیٹا ہے فرشتوں میں سے، جس طرح کہ عرب میں سے جس شخص نے یہ کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس پر اللہ پاک نے فرمایا:

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٠)

﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ یعنی فرشتے اللہ کے عزت والے بندے ہیں، وہ اس کے پاس مقاماتِ سامیہ ومنازلِ عالیہ میں ہیں اور وہ اس کے لیے اپنے قول سے اور فعل سے حد درجہ کے مطیع ہیں: ﴿ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی وہ اس کے روبرو کسی کام میں پیش قدمی نہیں کرتے اور نہ ہی اس کام میں اس کی مخالفت کرتے ہیں، جس کا ان کو حکم دیا ہے۔ بلکہ اس کے کرنے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اللہ پاک کا علم ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے، لہٰذا اُن کی کوئی پوشیدہ بات اس سے مخفی نہیں، وہ جانتا ہے، جو اُن کے آگے اور جو اُن کے پیچھے ہے۔

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ یہ آیت مثل اس آیت کے ہے: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥] ''کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟'' اور اس آیت کے مثل: ﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [سبا: ٢٣] ''اور اس کے ہاں صرف اس شخص کی سفارش نفع دے گی جسے اللہ اجازت دے گا۔'' اس بارے میں اُن کے سوا اور بہت آیتیں ہیں۔ ﴿ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ ﴾ یعنی جو کوئی اُن میں سے دعویٰ کرے اس بات کا کہ وہ معبود ہے: ''من دون اللّٰہ''، یعنی اللہ کے ساتھ، ﴿ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی ہر وہ شخص جو یہ بات کہے اور یہ شرط ہے اور شرط کا وقوع ضروری نہیں، جس طرح کہ یہ آیت ہے: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٨١] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔'' اور جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ''اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال ضرور ضائع ہو جائیں گے اور آپ ضرور خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ اس قول کے قائل خزاعہ، جہینہ، بنوسلمہ اور بنوملیح ہیں، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہود ہیں۔ آیتِ کریمہ کو اس شخص پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ جس نے اللہ پاک کے لیے اولاد ٹھہرائی۔ یہودیوں نے کہا ہے کہ عزیز علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ نصاریٰ نے کہا: مسیح علیہ السلام اللہ پاک کے فرزند ہیں۔ عرب کے ایک گروہ نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کی تنزیہ کی، پس ارشاد فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ یعنی اللہ پاک کے لیے اس قول سے تنزیہ وتقدیس ہے، اس کی ذات پاک زن وفرزند سے منزہ ومبرا ہے، یہ تنزیہ بندوں کی زبان سے فرمائی، یعنی بندوں کو چاہیے کہ اپنے رب کو کل نقائص

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٥۔ ٢٣٦)

سے پاک جانیں، پھر مشرکین کے قول سے اضراب کیا اور فرمایا: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ یعنی فرشتے وہ نہیں ہیں، جس طرح کہ مشرکین کہتے ہیں، بلکہ وہ اللہ پاک کے بندے ہیں، اللہ نے اپنی کرامت وعزت سے اُن کو مکرم ومعزز کیا ہے، ان کو اپنے پاس مقرب بنایا ہے اور عبودیت منافیِ ولادت ہے، یہ منافات یا تو اس امرِ عادی کے موافق ہے، جو کہ عرب کے نزدیک غلط نہیں ہوتا، وہ یہ کہ آدمی کا غلام اس کا بیٹا نہیں ہوتا، یا شرعی قواعد کے مطابق ہے، وہ یہ کہ انسان جس وقت اپنے بیٹے کا مالک ہو جاتا ہے تو وہ اس پر آزاد ہو جاتا ہے۔ پہلا قول تقریرِ منافات میں ظاہر تر ہے، کیونکہ گفتگو عرب کے جاہلوں کے ساتھ ہے، وہ لوگ شرع کے قواعد کو جانتے پہچانتے نہیں ہیں۔[1]

امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں سے مصاہرت (رشتے داری قائم) کی ہے پس درمیان اُن کے فرشتے ہوئے، اس پر اللہ پاک نے اُن کی تکذیب کرکے فرمایا: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ یعنی اللہ نے فرشتوں کا اپنی عبادت کے ساتھ اکرام کیا اور اُن کو برگزیدہ فرمایا۔[2] ﴿ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ اکرام سے ہے اور را کی شد کے ساتھ تکریم سے بھی پڑھا ہے۔ امام زجاج اور فراء رحمہ اللہ نے "عبادا" کا نصب جائز رکھا ہے، اس معنی پر کہ "بل اتخذ عبادا"۔ اللہ پاک نے فرشتوں کو سات صفتوں کے ساتھ موصوف کیا اول صفت تو یہ ہے: ﴿ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ دوسری صفت یہ بیان فرمائی: ﴿ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ ﴾ یعنی وہ کوئی بات نہیں کہتے، یہاں تک کہ اللہ پاک اس کو کہے یا اس کا اُن کو حکم دے۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ فرشتے اپنے رب کے کامل مطیع اور فرماں بردار ہیں۔[3] اصل اس قول کی یہ ہے: "لا یسبق قولھم قولہ" یعنی فرشتوں کی بات اللہ پاک کی بات پر سبقت نہیں کرتی، کیوں کہ وہ اس کے بندے ہیں اور باادب غلاموں کی یہی عادت ہوتی ہے، پس اس اصل کو چھوڑ کر سبق کی نسبت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف کی اور قول کو محلّ وآلہ سبق کا ٹھہرایا۔ اس میں فائدہ اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ سبقت کرنا بہت قبیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بات پر سبقت کرنا، گویا اللہ پاک پر سبقت کرنا ہے، فرشتوں سے اس کی نفی کی کہ وہ ایسے باادب بندے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں کرتے، اس میں مشرکین کے لیے اس بات کا اشارہ ہے، کیوں کہ وہ اپنی بات کو اللہ کی بات پر سبقت دیتے ہیں، اللہ پاک پر ایسی باتیں کہتے ہیں، جن کو اس نے نہیں کہا، اس کے لیے زن وفرزند ودختر ثابت کرتے ہیں، حالانکہ وہ ایسی باتوں سے منزہ ومبرا ہے۔

"بقولھم" کے بجائے ﴿ بِالْقَوْلِ ﴾ فرمایا۔ الف ولام کو مضاف الیہ کے بدلے کیا، لہٰذا اس میں دو فائدے ہیں: ایک تو اختصار۔ دوسرے ضمیر کو بار بار کہنے سے بچنا، کیوں کہ اس کے بعد ﴿ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ ﴾ آتا ہے۔ "لا یسبقونہ" بائے موحدہ کی زیر کے ساتھ باب "ضَرَبَ يَضْرِبُ" سے ہے۔ کسی نے اس کو بائے موحدہ کی پیش

[1] فتح البيان (٨/ ٣١٨۔ ٣١٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٩) الدر المنثور (٥/ ٦٢٤) [3] فتح القدير (٣/ ٥٥٣)

سے بھی پڑھا ہے، ماخوذ ''سابقته فسبقته اسبقه'' سے ہے، یہ جملہ موضع رفع میں ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ عِبَادٌ ﴾ کی صفت ہے۔ تیسری صفت یہ ہے: ﴿ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی وہ ہرگز اس کام کو نہیں کرتے، جس کا اُن کو حکم نہیں دیا گیا۔ اللہ پاک جس کام کا اُن کو حکم کرتا ہے، اس پر قائم رہتے ہیں، اس کے تابع و مطیع و فرماں بردار ہیں۔ قول و عمل میں کسی طرح اس کی مخالفت نہیں کرتے۔ چوتھی صفت یہ ہے: ﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ یعنی وہ جانتا ہے اس کام کو جس کو وہ کر چکے اور اس کام کو جس کو وہ کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ اللہ جانتا ہے اس کام کو جو فرشتوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہوا اور اس کام کو جو اُن کی پیدایش کے بعد ہوتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جانتا ہے اس شے کو جو اُن کے آگے ہے، یعنی آخرت اور اس شے کو جو اُن کے پیچھے ہے، یعنی دنیا۔ یہ جملہ تعلیل ہے ماقبل کی تعلیل کی، وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے جب یہ بات جان لی کہ اللہ پاک جانتا ہے اس کام کو جس کو انھوں نے آگے پیچھے کیا تو اُس کے حکم کے سوا کوئی کام نہ کریں گے اور نہ کوئی بات کریں گے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، ماقبل کی تعلیل اور مابعد کی تمہید کے لیے واقع ہوا ہے، کیوں کہ وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ اللہ پاک اگلے اور پچھلے اقوال و اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے وہ اپنے احوال کا ہمیشہ مراقبہ کرتے رہیں گے، پس اللہ کے امر کے بغیر کسی قول یا عمل پر پیش قدمی ہرگز نہیں کریں گے۔[1]

پانچویں صفت یہ ہے: ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ یعنی فرشتے سفارش نہیں کرتے، مگر اس کی جس سے وہ راضی ہو کہ اس کے لیے شفاعت کرنے والے شفاعت کریں اور وہ ہو بھی ان لوگوں میں سے جن سے اللہ راضی ہوا۔ کسی نے کہا: ''من ارتضٰی'' لا الہ الا اللہ والے ہیں۔ صحیح میں ثابت ہو چکا ہے کہ فرشتے دارِ آخرت میں شفاعت کریں گے۔[2] امام ابن منذر اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا قتادہ سے روایت کیا ہے کہ ''من ارتضٰی'' اہلِ توحید ہیں۔ امام عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: ''لأهل التوحيد لمن رضي عنه''۔ امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ قول لا الہ الا اللہ ہے۔[3] امام ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ نے بعث میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ لوگ ہیں کہ پسند کیا اُن کو لا الہ الا اللہ کے ساتھ۔[4] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا اور فرمایا کہ میری شفاعت اہلِ کبائر کے لیے ہے میری اُمت میں سے۔[5] (أخرجه الحاكم وصححه البيهقي في البعث)

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٦٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٤٩) الدر المنثور (٥/ ٦٢٤) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٤٢٩) الدر المنثور (٥/ ٦٢٤)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٦) مستدرك الحاكم (١/ ١٤٠) شعب الإيمان (١/ ٢٨٧) صحيح الجامع (٣٧١٤)

چھٹی صفت یہ ہے: ﴿ وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ اضافت خشیت کی طرف مفعول کے ہے: "أي من خشيتهم منه" یعنی فرشتے اللہ پاک کی عظمت و مہابت کے مارے کانپتے ہیں۔ خشیت کی اصل خوف مع تعظیم کے ہے، اسی لیے اس کے ساتھ علما خاص کیے گئے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [الفاطر: ٢٨] "بس اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علما ہی ڈرتے ہیں۔" اور اشفاق خوف مع اعتناء (غم خواری) اور توقع و ڈر ہے، پھر اگر بہ حرفِ "من" متعدی ہو تو معنی خوف کے اس میں ظاہر تر ہیں اور اگر متعدی بہ حرفِ "علیٰ" ہو تو امر بالعکس ہوتا ہے، یعنی اعتناء کے معنی زیادہ ظاہر ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے ڈر سے امن میں نہیں ہوتے، بلکہ ڈرتے لرزتے رہتے ہیں۔

انموذج میں کہا ہے: اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے وصف میں کہا ہے: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ إلیٰ قوله ﴿ مُشْفِقُوْنَ ﴾ یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ ﴾ [التحریم: ٦] یعنی وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں۔ پھر جب وہ اللہ پاک کی نافرمانی نہیں کرتے تو ڈرتے کیوں ہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یوں فرمایا: ﴿ وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ جس وقت انھوں نے وہ معاملہ قضا و قدر کا دیکھا، جو ابلیس اور ہاروت و ماروت پر گزرا تو ایسے معاملے سے ڈرے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اُن کا اللہ پاک کو زیادہ جاننا پہچاننا اور محلِ کرامتِ الٰہی میں اُن کا قرب ہی اُن کے زیادہ خوف کرنے کا موجب ہے، اسی لیے اہلِ تحقیق نے کہا ہے کہ جو شخص اللہ پاک کا زیادہ عارف ہوگا، وہی اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوگا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوگا، وہ ہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرے گا، کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

نزدیکاں را بیش بود حیرانی — ایشاں دانند سیاست سلطانی

"قریب رہنے والوں کو زیادہ پریشانی ہوتی ہے، کیونکہ وہ بادشاہی سیاست کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

بعض نے یوں کہا ہے: "یا عجبا من مطیع أمن ومن عاص خائف" یعنی تعجب ہے فرماں بردار بے خوف سے اور گنہگار خائف سے۔ ساتویں صفت یہ ہے کہ ﴿ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ﴾ یعنی جو کوئی فرشتوں میں سے بالفرض و التقدیر، کیونکہ اُن کی عصمت ثابت ہو چکی ہے، یہ بات کہے کہ اللہ کے سوا میں معبود ہوں تو اس قائل کو اس قول کے سبب ہم بطورِ فرض بدلے میں دیں گے دوزخ، جس کو اس نے کہا جس طرح کہ اس کے سوا اور مجرموں کو ہم جزا دیتے ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اس قائل سے مراد ابلیس ہے، کیوں کہ فرشتوں میں سے سوائے ابلیس کے کسی نے نہیں کہا ہے کہ میں معبود ہوں اور یہ بطورِ مجاز کے ہے، کیوں کہ وہ تو عبودیت کا معترف اور رحمتِ الٰہی سے نا اُمید ہے۔ ابلیس کا فرشتوں میں سے ہونا اس لحاظ سے ہے کہ وہ اُن میں

ملا جلا ہوا تھا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ مِنْهُمْ ﴾ کی ضمیر مطلق خلائق کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اشارہ جمیع انبیا کی طرف ہے۔

﴿ فَذٰلِكَ ﴾ موضع رفع میں مبتدا ہے، ﴿ نَجْزِيْهِ ﴾ خبر ہے اور جملہ محلِ جزم میں جواب ہے شرط کا۔ کسی نے کہا: "ذلك" محلِ نصب میں ہے فعل ناصب پر ﴿ نَجْزِيْهِ ﴾ دال ہے ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ یعنی اس سخت جزا کی مثل ﴿ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ مثل اس جزا کے ہم نے جہنم کو اس قائل کی جزا ٹھہرایا، پس اسی طرح ہم جزا دیتے ہیں ظالموں کو جو الٰہیت اور عبادت کو اس کے غیر موضع پر رکھتے ہیں۔ اس جگہ ظالمین سے مراد مشرکین ہیں۔ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ موضع نصب میں ہے۔ "نجزی" اس کا ناصب ہے: "أي جزاء مثل ذلك"

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۪ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

کیا کافروں نے نہیں دیکھا (غور کیا) کہ بے شک آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا، اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے بنائی، کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے؟ (30) اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے، تاکہ وہ ان کے ساتھ جھکنے (نہ) پائے، اور ہم نے اس میں کھلی راہیں رکھیں، تاکہ وہ (لوگ) راہ پائیں (31) اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا، جبکہ وہ اس (آسمان) کی نشانیوں سے اعراض کرنے والے ہیں (32) اور وہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا، سب اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھرتے ہیں (33)

قدرتِ الٰہی کی نشانیاں:

زمین و آسمان باہم ملے جلے تھے، یعنی ایک چیز تھے۔ زمین میں سے نہریں اور کانیں اور بھانت بھانت کے سبزے نکالے۔ آسمان میں کتنے ستارے ہیں، ہر ایک کا گھر جدا، چال جدا، اور جاندار بنائے، یعنی جانور پانی سے، یعنی نطفے سے۔ کشادہ راہیں بنائیں، تاکہ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک والوں سے مل سکیں، اگر پہاڑ ایسے ڈھب

پر پڑتے کہ راہیں بند ہوتیں تو یہ بات کہاں ہوتی۔ محفوظ چھت، یعنی کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا اور اس کے نمونے تارے اور چاند اور رات اور دن۔ اپنے اپنے مدار پر، یعنی اپنی اپنی راہ پر ہیں، اس سے نہیں ہٹتے۔

اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ تام اور سلطانِ عظیم پر آگاہ کرتا ہے کہ اشیا کے پیدا کرنے میں اور ساری مخلوقات کو مقہور (مطیع) کرنے میں کیسے پوری قدرت کا اظہار کیا ہے۔ پس یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ یعنی جو لوگ کہ الٰہیت کا جحد و انکار کرتے ہیں، اس کے ساتھ غیر کو پوجتے ہیں، کیا انھوں نے یہ بات نہیں جانی کہ اللہ پاک ہی تمام عالم کو پیدا کرنے اور اس کی تدبیر کرنے والا ہے، یعنی عالم کی پیدایش اور تدبیر میں وہی مستقل ہے، سب اسی وحدہ لاشریک لہ کا پیدا کیا ہوا ہے، اس میں اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ پھر یہ امر کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ غیر کو پوجا جائے، یا اس کے ماسوا کو اس کا شریک بنایا جائے، کیا انھوں نے نہیں جانا کہ آسمان و زمین رتق تھے، یعنی سب کے سب بعض بعض سے متصل اور ملے ہوئے تھے ابتدا میں، اور بعض بعض پر تہہ بہ تہہ تھا، لہٰذا اس کو اس سے کھولا، یعنی ایک کو دوسرے سے جدا کیا، پھر آسمانوں کو سات اور زمین کو سات کر ڈالا اور آسمانِ دنیا اور زمین کے درمیان ہوا کے ساتھ جدائی کر دی تو آسمان نے پانی برسایا اور زمین نے روئیدگی (پیداواری) کی۔ اس لیے یوں فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی وہ مخلوقات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ شیئاً فشیئاً عیاناً ظاہر ظہور پذیر ہوتی جاتی ہے، یہ سب اس قادرِ مطلق، مختارِ کل اور کارساز کے وجود پر دلیل ہے، وہ جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔ ؎

ففي كل شيء له آية تدل على أنه واحد

یعنی ہر شے میں اللہ پاک کے لیے ایک ایسی نشانی ہے کہ وہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

''عقل مند کی نظر میں سبز درختوں کا ہر ورق اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دفتر ہے۔''

امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ رات پہلے تھی کہ دن؟ تو وہ بولے تم مجھے خبر دو کہ آسمان و زمین جس وقت رتق تھے تو ان کے درمیان صرف اندھیرا تھا، یہ اس لیے ہے تاکہ تم جانو کہ رات دن سے پہلے ہے۔[1] (قاله سفيان الثوري عن أبيه عن عكرمة) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا، اُن سے اس آیت کے بارے میں پوچھتا تھا تو انھوں نے کہا تو اس شیخ کے پاس جا، اس سے پوچھ، پھر کہا تو آ کر مجھ کو خبر دے، اس بات کی جو وہ تجھ سے کہے۔ راوی کہتا ہے کہ وہ شخص سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا اُن سے

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣٦)

پوچھا تو انھوں نے کہا: ہاں آسمان رتق تھے، پانی نہیں برساتے تھے اور زمین رتق تھی، روئیدگی کے قابل نہ تھی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کے لیے اہل پیدا کیے تو اس کو پانی کے ساتھ کھولا اور اس کو روئیدگی کے ساتھ کھولا۔ پھر وہ شخص لوٹ کر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا، اُن کو خبر دی تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بولے: اب میں نے اچھی طرح جان لیا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قرآن میں علم دیے گئے ہیں۔ انھوں نے سچ کہا، اسی طرح تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں کہا کرتا تھا کہ مجھے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیرِ قرآن پر جرأت پسند نہیں، لہٰذا اب میں نے یہ بات جان لی ہے کہ وہ یقیناً قرآن پاک میں علم دیے گئے ہیں۔ (قاله ابن أبي حاتم بسنده عن عبد الله بن دينار عن ابن عمر رضي الله عنهما)

عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا: تھا یہ یعنی آسمان رتق، پانی نہیں برساتا تھا، پھر اس نے برسایا اور تھی یہ، یعنی زمین رتق، روئیدگی کے قابل نہیں تھی، پھر اس نے اُگائی۔ اسماعیل بن ابی خالد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے امام ابو صالح حنفی رحمہ اللہ سے اس آیت کا پوچھا تو کہا کہ آسمان ایک تھا، پھر اس سے سات آسمان کھولے اور زمین ایک تھی، پھر اس سے سات زمینیں کھولیں[1]، اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اتنا اور زیادہ کہا ہے کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے نہ تھے۔[2] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ زمین اور آسمان ملتزق، یعنی ملے ہوئے تھے، ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے، پھر جب آسمان کو بلند کیا اور زمین کو اس سے الگ اور خارج فرمایا تو یہ اُن دونوں کا فتق ہوا، جس کا ذکر اللہ پاک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔[3] امام حسن و قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آسمان و زمین جمیع، یعنی ملے ہوئے تھے، پھر اس ہوا سے اُن کے درمیان فصل کر دی، یعنی علاحدگی کر دی۔[4]

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ یعنی اصل کل حیوانات کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمام زندوں کی اصل پانی سے بنائی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا نبی اللہ! جس وقت میں آپ کو دیکھ لیتا ہوں تو میری آنکھ ٹھنڈی اور میرا جی خوش ہو جاتا ہے، آپ مجھے ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ کی خبر دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كُلَّ شَيْءٍ" پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ (فأخرجه ابن أبي حاتم بسنده عن أبي ميمونة عن أبي هريرة رضي الله عنه)

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ میں نے عرض کی: آپ مجھے ایسے کام کے متعلق بتائیں کہ جس وقت میں اس پر عمل کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَفْشِ السَّلَامَ وَأَطْعِمِ الطَّعَامَ وَصِلِ الْأَرْحَامَ وَقُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ ثُمَّ ادْخُلِ الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ» یعنی سلام کا افشا کر، ہر ایک کو سلام کر اور کھانا کھلا اور صلہ رحم کر اور رات کو نماز پڑھ، اس حال میں کہ لوگ سوتے ہوں، پھر تو داخل ہو جنت میں سلامتی کے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٥٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٣١) [3] الدر المنثور (٥/ ٦٢٦) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٤٣١)

ساتھ۔[1] (أخرجه الإمام أحمد عن قتادة عن أبي ميمونة عن أبي هريرهؓ و رواه أيضا عبد الصمد و عنان و بهز عن همام تفرد به أحمد وهذا إسناد علىٰ شرط الصحيحين إلا أن أبا ميمونة من رجال السنن و اسمه سليم والترمذي يصحح له وقد رواه سعيد بن عروبة عن قتادة مرسلا والله أعلم)

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ ﴾ یعنی اللہ پاک نے زمین میں پہاڑ رکھے، جن سے زمین کو ٹھہرایا اور برقرار کیا، جمایا اور اس کو بوجھل کیا، تاکہ آدمیوں کو لے کر مضطرب و متحرک نہ ہو کہ وہ اس پر قرار ہی نہ پکڑ سکیں، کیونکہ زمین پانی میں ڈوبی ہوئی ہے، سوائے چوتھائی حصے کے کہ وہ ہوا اور سورج کے لیے کھلا ہوا ہے، تاکہ زمین والے آسمان کا مشاہدہ کریں اور اس میں جو کھلی نشانیاں اور حکمتیں اور دلالتیں رکھی ہیں، اُن کو دیکھیں اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ﴾ یعنی تاکہ زمین اُن کو لے کر جھک نہ پڑے۔ ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا ﴾ یعنی اور بنائے ہم نے پہاڑوں میں رخنے کہ اُن میں راہیں چلیں ایک قطر سے دوسرے قطر کی طرف اور ایک اقلیم سے دوسرے اقلیم کی طرف، چنانچہ زمین میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ ان شہروں اور اُن شہروں کے درمیان پہاڑ حائل ہوتا ہے تو اللہ پاک اس میں شگاف اور رخنہ کر دیتا ہے، تاکہ لوگ اس میں اس جگہ سے اس جگہ کی طرف چلیں پھریں، اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ﴾ یعنی بنایا ہم نے آسمان کو زمین پر ایک محفوظ چھت۔ آسمان زمین پر ایک قبے کی طرح ہے، جس طرح کہ اللہ پاک نے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾ [الذاريات: ٤٧] ''اور ہم نے آسمان کو قوت کے ساتھ بنایا اور بلاشبہہ ہم بہت وسعت والے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴾ [ق: ٦] ''کیا پھر انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیسا بنایا اور ہم نے اسے آراستہ کیا اور اس میں کوئی شگاف نہیں۔''

بِنا، قبہ نصب کرنے کو کہتے ہیں، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ »[2] ''أي خَمْسَةِ دَعَائِمِ'' اور یہ نہیں ہوتا مگر خیموں میں، جیسے کہ عرب کی عادت معہود ہے۔ محفوظ کے معنی ہیں: عالی و محروس، یعنی ایسا عالی بلند حراست کیا ہوا کہ اس پر کوئی پہنچ نہ سکے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محفوظ کے معنے مرفوع ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ آسمان کیا ہے؟ فرمایا: یہ ایک موج ہے کہ تم سے روک دی گئی ہے۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم بسنده عن سعيد بن جبير عن ابن عباس إسناده غريب)

﴿ وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، ان میں فکر نہیں

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٥١) مسند أحمد (٢/ ٢٩٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٣/ ٢٣٧۔ ٢٣٨)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦) (3) تفسير الطبري (١٨/ ٤٣٦)

(4) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٥١)

کرتے ہیں کہ کیسی عظیم وسعت رکھتا ہے اور کیسا بلند ہے۔ یہ آیت مثل اس آیتِ کریمہ کے ہے: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ [يوسف: ١٠٥] رات میں ثوابت اور سیارہ ستاروں سے کس طرح اس کی زینت اور آرائش کی ہے۔ اس کے دن میں غور کریں کہ ایک ایسا بڑا ستارہ بنایا ہے کہ ایک دن رات میں پورے آسمان کو طے کر لیتا ہے، پھر وہ ایسی مسافت قطع کرتا ہے کہ اس کے اندازے کو کوئی نہیں جانتا، مگر اللہ تعالیٰ کہ جس نے اس کا اندازہ کیا ہے اور اس کو مسخر فرمایا ہے اور اس کو چلایا ہے۔

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے "كتاب التفكر و الاعتبار" میں ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے بعض عابدین نے تیس برس عبادت کی۔ اُن میں دستور تھا کہ جس وقت اُن میں سے کوئی آدمی تیس برس عبادت کر لیتا تو اس پر ابر سایہ کرتا تھا، لہٰذا اس شخص نے وہ چیز نہ دیکھی، جو دوسروں کو حاصل ہوا کرتی تھی، پس اس نے اپنی ماں سے اس کی شکایت کی، وہ بولی: بیٹا شاید تو نے اپنی اس عبادت کی مدت میں گناہ کر لیا ہے؟ وہ بولا: واللہ! میں اس کو نہیں جانتا، اس نے کہا: شاید تو نے قصد کیا ہو؟ وہ بولا: نہیں، میں نے قصد بھی نہیں کیا۔ اس نے کہا: شاید تو نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی، پھر تو نے اس کو پھیر لیا ہو بغیر غور و فکر کے؟ وہ بولا: ہاں، ایسا تو بہت ہوا ہے۔ اس کی ماں نے کہا: "فمن هنا أتيت"[1] یعنی یہ خرابی تجھ کو اسی جگہ سے پہنچی ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی بعض نشانیوں پر آگاہ کر کے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴾ یعنی وہی ہے جس نے رات دن بنایا، رات میں تاریکی اور سکون ہے اور دن میں روشنی اور اُنس ہے۔ دن کبھی طویل ہو جاتا ہے کبھی چھوٹا، رات کبھی لمبی ہوتی ہے کبھی چھوٹی۔

﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ﴾ یعنی سورج اور چاند بنایا۔ آفتاب کو دیکھو کہ اس کا ایک نور ہے، جو اسی کے ساتھ خاص ہے اور اس کا ایک فلک بذاتہ ہے اور ایک زمانہ جدا ہے اور ایک حرکت و سیر خاص ہے۔ چاند کو دیکھو کہ اس کا ایک اور ہی نور ہے، اور ہی فلک ہے اور ہی چال ہے اور ہی انداز ہے۔ ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ یعنی ہر ایک ایک فلک میں دور کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ گردش کرتے ہیں، جس طرح کہ تکلا دمڑکی میں گردش کرتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: پس تکلا نہیں پھرتا ہے، مگر ساتھ دمڑکی کے اور نہ دمڑ کا مگر ساتھ تکلے کے، اسی طرح ستارے و سورج و چاند نہیں پھرتے، مگر ساتھ فلک کے اور فلک نہیں پھرتا، مگر ساتھ اُن کے جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦] "وہ صبح کی سپیدی نکالتا ہے اور اس نے رات کو سکون کا باعث بنایا اور سورج اور چاند کو اپنے حساب سے چلنے والا (بنایا)، یہ سب بہت زبردست، خوب علم رکھنے والے کا اندازہ ہے۔"[2] كذا في ابن كثير.

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ ہمزہ واسطے انکار کے ہے واو سے، اور بغیر واو کے، دونوں قراءتیں سبعیہ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٨) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٣٦۔ ٢٣٨)

ہیں۔ واو عطف کے واسطے ہے مقدر پر۔ رؤیت اس جگہ قلبی ہے بمعنی علم، یعنی فکر نہیں کی اور نہ جانا۔ اس جگہ سے ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ تک جو ذکر فرمایا، اس کا حاصل توحید پر چھے دلیلیں ہیں؛ اللہ پاک نے مشرکین کے جہل کا اظہار کیا ہے، اس لیے کہ انھوں نے تکوینی نشانیوں میں غور نہ کیا، اُن کے فکر اور تامل کرنے میں کمی اور فتور کیا۔ یہ نشانیاں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ پاک اُلوہیت کے ساتھ مستقل ہے اور تمام اشیاے ماسواہ اس کے زیرِ ملکوت مقہور ہیں۔ پہلی دلیل اللہ پاک کی توحید پر یہ ہے کہ ﴿ اَنَّ السَّمٰوٰتِ... الخ ﴾ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے ﴿ كَانَتَا ﴾ بصیغۂ تثنیہ کہا۔ "کُنَّ" بصیغۂ جمع نہ فرمایا، اس لیے کہ آسمان و زمین دو صنف ہیں، یعنی دو جماعت آسمان اور زمین کی۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] حوفی نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر دو جنسوں کی طرف پھرتی ہے،[3] جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ﴾ [الفاطر: ٤١] "بلاشبہہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے (کہیں) وہ دونوں (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں۔"

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَانَتَا ﴾ اس لیے فرمایا کہ "سمٰوٰت" سے بلفظ واحد تعبیر کی جاتی ہے، کیوں کہ وہ ایک آسمان تھا اور اسی طرح زمینیں۔[4] "رتق" کے معنی "سد" ہیں، یعنی بند کرنا۔ ضد ہے "فتق" کا۔ "فتق" شگافتن و کشادن کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "رتقت الفتق ارتقه فارتتق أي التأم" یعنی میں نے بند کیا کشادہ کو تو وہ مل گیا۔ اسی باب سے یہ ہے کہ جس عورت کی شرمگاہ منضم ہوتی ہے، اس کو "رتقاء" کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ آسمان و زمین شے واحد ملے ہوئے چپکے ہوئے تھے، پھر اللہ پاک نے اُن کے درمیان میں فصل کر دی۔ ﴿ رَتْقًا ﴾ کو مفرد ذکر کیا، حالانکہ خبر ہے تثنیہ کی، اس کی کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ رتق تائے فوقیہ کے سکون سے مصدر ہے، اس میں مونث و مذکر تثنیہ و جمع برابر ہے، مبالغے کے واسطے حمل کر دیا گیا، جیسے کہ "زید عدل" میں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مضاف مقدر ہے، یعنی "ذواتي رتق"۔ تیسری یہ ہے کہ قائم مقام مفعول کے ہے، جیسے: خلق بہ معنی مخلوق، یعنی مرتوقتین۔ کسی نے اس کو بفتح تائے فوقیہ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ تقدیر "شيئاً رتقا" ہے۔

اس کے معنی بھی مرتوق کے ہیں، جس طرح کہ رفض بہ معنی مرفوض آتا ہے، رتق و فتق اس جگہ من جملہ خوب ترین بدیع واقع ہوئے ہیں، اس لیے کہ رتق کا مقابلہ فتق سے کیا ہے، آسمان و زمین کے رتق و فتق میں کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ دونوں شے واحد و حقیقت متحد تھے، اللہ پاک نے تنویع و تمیز کے ساتھ اُن کا فتق کیا۔ دوسرا یہ ہے کہ آسمان ایک تھا، مختلف حرکتوں کے ساتھ اُن کا فتق کیا گیا، یہاں تک کہ وہ افلاک ہو گئے اور زمینیں بھی ایک تھیں، پھر

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٥٤) [2] الكشاف (٣/ ١١٤) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٦) [4] معاني القرآن (٣/ ٣٩٠)

وہ باختلافِ کیفیات و احوال کئی طبقے یا کئی اقلیمیں کی گئیں، لیکن شرع شریف میں جو تفاوت و دوری آسمانوں کے درمیان ثابت ہو چکی ہے، یہ قول بظاہر اس کے مخالف ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اس طرز پر تھے کہ اُن کے درمیان فرجہ و شگاف نہ تھا، پھر اُن میں فرجہ کیا گیا۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ آسمان پانی نہیں برساتا تھا، زمین روئیدگی نہیں کرتی تھی، پھر بارش اور نبات کے ساتھ اُن کا فتق ہوا، یہ قول بھی پہلے گزر چکا ہے۔

اس قول کی بنا پر ''سمٰوٰت'' سے مراد آسمانِ دنیا ہوگا اور آسمانِ دنیا کو ''سمٰوٰت'' کہنا باعتبار آفاق کے ٹھہرے گا، یا یوں کہیں گے کہ سارے آسمانوں کو پانی برسانے میں ایک قسم کا دخل ہے، یہ سب اقوال تفسیر بیضاوی میں نقل کیے گئے ہیں۔ مدارک میں تین قول ذکر کیے ہیں: ایک یہ کہ آسمان زمین سے ملا ہوا تھا، اُن کے درمیان میں فضا نہ تھی، پھر اُن کے درمیان میں ہوا سے فصل کی گئی۔ دوسرا یہ ہے کہ آسمان مرتتق طبقۂ واحد تھے۔ پھر اللہ پاک نے اُن کو سات کر دیا اسی طرح زمین۔ تیسرا وہی چوتھا قول امام قرطبی رحمہ اللہ سے جمل میں مذکور ہے۔ اسماعیل بن ابی خالد کا قول زیرِ تفسیر آیتِ باب نقل کیا ہے کہ آسمان الگ مخلوق تھا اور زمین الگ مخلوق تھی، پھر آسمان سے سات آسمان چیرے اور زمین سے سات زمینیں چیریں، اوپر کی زمین کو پیدا کیا، پھر اس کے رہنے بسنے والے جن اور انسان کیے اور اس میں نہریں نکالیں، میوے اُگائے، دریا بنائے، عرض اس کا پانچ سو برس کی راہ ہے۔ پھر دوسری زمین پیدا کی جو چوڑائی اور موٹائی میں اس کی مثل ہے اس میں کئی قومیں بنائیں اُن کے منہ مثل کتوں کے اور ہاتھ آدمیوں کے، کان اُن کے بیلوں کے کان، بال اُن کے بکریوں کے بال، پھر جب قیامت کا قرب ہوگا تو زمین اُن کو یاجوج ماجوج کی طرف ڈال دے گی۔ پھر تیسری زمین کو پیدا کیا، اس کی موٹائی پانچ سو برس کی راہ، اور اس سے لے کر چوتھی زمین تک ہوا ہے، پھر چوتھی زمین کو پیدا کیا، اس میں تاریکی اور بچھو سیاہ خچروں کی طرح دوزخیوں کے لیے پیدا کیے اور اُن کی دُمیں گھوڑوں کی دُموں کی طرح لمبی ہیں۔ بعض بعض کو کھاتے ہیں، پھر وہ بنی آدم پر مسلط کیے جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پانچویں زمین کو پیدا کیا، اس میں سیاہ پتھر ہیں اور اسی زمین سے آدم علیہ السلام کی خاک پیدا کی گئی، یہی پتھر قیامت کے دن اُٹھائے جائیں گے، ہر پتھر بڑے پہاڑ کی طرح ہے اور وہ گندھک کے پتھر ہیں، کفار کی گردنوں میں لٹکائے جائیں گے، پھر وہ شعلے ماریں گے، یہاں تک کہ اُن کے چہروں کو اور ہاتھوں کو جلا دیں گے۔ لہٰذا یہ وہی قول اللہ پاک کا ہے ﴿ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ [التحريم: ٦] ''جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔'' پھر اللہ نے ساتویں زمین کو پیدا فرمایا، اس میں جہنم ہے، اس میں دو دروازے ہیں: ایک کا نام سجین اور دوسرے کا فلق ہے۔ سجین تو کھلا ہوا ہے اور وہ کفار کی کتاب ہے اور اصحابِ مائدہ اور قومِ فرعون اس پر پیش کیے جاتے ہیں۔ رہا فلق تو وہ بند ہے، قیامت تک کھولا نہ جائے گا۔

فتح البیان میں اسی قصے کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس بارے میں طول کیا ہے۔ کعب احبار وغیرہ سے ارضِ علیا اور سفلی کی پیدائش کے احوال نقل کیے ہیں، اس کی طرف جایا نہیں جا سکتا، مگر جبکہ اس میں سے کچھ اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے صحیح ہو۔[1] اب رہی یہ بات کہ اگر کوئی کہے کہ مشرکین نے آسمان و زمین کا رتق اور فتق کب دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کا اُن پر انکار کرتا ہے اور یوں فرماتا ہے: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا ﴾ لہٰذا مدارک میں یوں کہا ہے کہ اس کا ذکر قرآن شریف میں وارد ہے، جو معجزہ ہے تو اس کا قرآنِ مجید میں ہونا دیکھی ہوئی اور مشاہدہ کی ہوئی چیز کے برابر ہے۔ اس قول کی بنا اس پر ہے کہ رؤیت سے مراد رؤیتِ بصری ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ رؤیت بہ معنی علم ہے اور زمین و آسمان کا تلاصق و تباین عقل میں دونوں جائز ہیں۔ پس اختصاص تباین کے ساتھ نہ تلاصق کے، اس کے لیے ایک مخصص کا ہونا ضرور ہے اور وہ ذات پاک اللہ قدیم جل جلالہ کی ہے،[2] یعنی عقل کے نزدیک جب زمین و آسمان کا متصل ہونا اور جدا ہونا دونوں درست ہوسکتا ہے تو پھر اُن کو ملا کر نہ رکھنا اور جدا کر دینا، اس کے لیے ضرور کوئی فاعل اور مخصص ہے کہ اُن سے یہ کام کیا۔ اور وہ کوئی نہیں ہے، مگر اللہ سبحانہ۔

انموذج میں اس طرح تقریر کی ہے، کیا نہ جانا کفار نے آسمان و زمین کے رتق و فتق کو اگلے لوگوں کے خبر دینے سے، یا قرآن شریف میں وارد ہونے سے جو کہ فی نفسہ معجزہ ہے؟ اس کی نظیر اللہ پاک کا قول ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [النور: ٤١] ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ کی تسبیح کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴾ [النور: ٤٣] ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ ہی بادل چلاتا ہے، پھر وہ انھیں باہم ملاتا ہے، پھر انھیں تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر آپ دیکھتے ہیں کہ ان (بادلوں) کے درمیان میں سے مینہ نکلتا ہے اور وہ اس آسمان کے اندر کے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے، پھر وہ انھیں (اس پر) پہنچاتا ہے جس پر وہ چاہتا ہے اور جس سے چاہے پھیر دیتا ہے، لگتا ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں (کی روشنی) کو اُچک لے جائے گی۔''

اس کے سوا اور نظائر بہت ہیں۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ کفار کو آسمان و زمین کے رتق ہونے کا علم نہیں، لیکن نظر و فکر کر کے اس کا علم حاصل کرنے پر قدرت رکھ سکتے تھے، اس لیے کہ فتق ایک ایسا عارض ہے، جس کو موثر واجب کی طرف احتیاج ہے، یہ احتیاج ابتدائی ہو، جس طرح کہ اہلِ حق کا مذہب ہے کہ ممکنات کے درمیان کچھ شرطیت و علیت نہیں ہے، بلکہ سب کے سب ابتداءً اللہ پاک کی طرف مستند ہیں یا یہ احتیاج

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٨٣۔ ٢٨٤) فتح البیان (٨/ ٣٢٢)
[2] تفسیر النسفي (٣/ ٧٩)

بواسطہ ہو، جیسا کہ حکما کا مذہب ہے اور اُن لوگوں کا جو اُن کے پیرو ہیں یا علما سے پوچھ کر اور کتابوں کا مطالعہ کر کے علم حاصل کر سکتے تھے،[1] غرضیکہ بوجوہ مذکورہ اُن کی بے علمی کو علم قرار دے کر اُن پر انکار فرمایا۔ کازرونی رحمہ اللہ نے کہا: اس میں نظر ہے۔ اس لیے کہ کفار کا غور وفکر کر کے یہ جان لینا کہ زمین و آسمان رتق تھے، پھر فتق کیے گئے، یہ دعویٰ ممکن نہیں ہے۔ رہی دلیلِ مذکور تو اس میں یہ بات ہے کہ آسمان و زمین کا علاحدہ علاحدہ ہونا، اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ رتق ہونے کے بعد ان کو فتق لاحق ہوا ہو۔ یہ کس واسطے جائز نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں بلا رتق وفتق علاحدہ علاحدہ ہی پیدا کیے گئے ہوں۔ پھر اگر رتق وفتق پر اس طرح استدلال کیا جائے کہ اُن پر قرآن شریف نص ہے تو ہم کہیں گے کہ اُن کے اثبات میں یہی کافی شافی ہے۔ عقلی دلیل مذکور کی کوئی حاجت نہیں۔

اللہ پاک نے جو چھے دلیلیں اپنی توحید کی ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر تو ہو چکا۔ دوسری دلیل یہ ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ یعنی ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا، جس کو ہم آسمان سے نازل کرتے ہیں، پس یہ شامل ہے، حیوانوں اور نباتات کو، معنی یہ ہیں کہ پانی ہر شے کی حیات کا سبب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ پانی سے مراد نطفہ ہے۔ اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ اللہ پاک نے مشرکوں پر اپنی عجیب وغریب قدرت اور کارسازی کے ساتھ حجت قائم کی ہے کہ دیکھو ہم نے ایک رقیق شے کو ساری اشیا کی حیات کا سبب کیا ہے، ہماری کیسی عظیم الشان قدرت ہے۔ باوجود ایسی قدرت دیکھنے کے، پھر بھی تم ہماری توحید کا یقین نہیں کرتے ہو، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ ہمزہ واسطے انکار کے ہے، اس لحاظ سے کہ آیاتِ ربانی تو تقاضا کرتی ہیں کہ ایمان لایا جائے، باوجود اس کے پھر بھی وہ ایمان نہ لائے۔ امام حقناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنَ الْمَآءِ ﴾ مفعولِ ثانی مقدم ہے اور ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ مفعول اول موخر ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "جعلنا كل شيء حي كائنا و ناشئا من الماء أي متسببا عنه" یعنی ہم نے ہر شے کو زندہ کیا کائن وناشی پانی سے۔

مطلب یہ ہے کہ ہر شے کا وجود و پیدائش پانی سے ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ "جعل" ہو سکتا ہے کہ "خلق" کے معنی میں ہو، اس بنا پر ایک مفعول کی طرف متعدی ہوگا، وہ مفعول ﴿ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ ہے اور ﴿ مِنَ الْمَآءِ ﴾ فعل متقدم کے متعلق ہوگا، یہ بھی جائز ہے کہ محذوف سے متعلق ہو اس بنیاد پر کہ ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ سے حال ہو جائے، اس لیے کہ اصل میں ہو سکتا ہے کہ اس کا وصف ہو، پھر جب اس پر مقدم کیا گیا تو بنا بر حال منصوب ہوا۔ ﴿ حَيٍّ ﴾ صفت ہے شے کی اور ﴿ مِنْ ﴾ واسطے ابتدائے غایت کے ہے، ابو البقاء۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "وخلقنا من الماء كل حيوان كقوله والله خلق كل دابة من ماء"۔ مطلب یہ ہے کہ

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٩١) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٦)

"جعل" بہ معنی "خلق" ہے اور تخصیص ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ کی حیوان کے ساتھ ہے۔ اور پانی سے ہر شے حی کے پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر حیوان کو پانی کی سخت حاجت ہے، اس کے بغیر جیتا نہیں ہے۔ یا اس لیے کہ نطفے سے پیدا کیا گیا ہے، جس کا نام پانی رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جعل" بہ معنی "صَیَّرَ" ہو، اس صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوگا، دوسرا مفعول جار مجرور ٹھہرے گا۔ تقدیر یہ ہے: "صَیَّرْنَا کُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ مِنَ الْمَآءِ" بسبب "إن الماء لا بد منه له" یعنی کر دیا ہم نے ہر شے حی کو پانی سے، بہ سبب اس کے کہ پانی اس کے لیے ضروری ہے۔ کسی نے "حَیًّا" بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كُلَّ ﴾ کی صفت ہے یا مفعول ثانی ہے اور ظرف، یعنی ﴿ مِنَ الْمَآءِ ﴾ لغو ہے اور شے مخصوص بہ حیوان ہے۔[1]

انموذج میں کہا ہے: اگر کوئی کہے کہ اللہ پاک نے ﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ کس طرح فرمایا باوجود اس کے کہ فرشتے "حی" ہیں اور جن "حی" ہیں، حالانکہ پانی سے پیدا نہیں کیے گئے، بلکہ نور اور نار سے پیدا کیے گئے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴾ [الرحمن: ١٥] "اور اس نے جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔" اور اسی طرح آدم علیہ السلام مٹی سے اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی پتھر سے پیدا کیے گئے ہیں تو اس کے دو جواب ہیں: اول یہ ہے کہ ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ سے مراد بعض ہے اور وہ بعض حیوان ہے، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ سے مراد بعض ہے: ﴿ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل: ٢٣] "اور اسے (ضرورت کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے۔" اور اس آیتِ کریمہ میں: ﴿ وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ﴾ [یونس: ٢٢] "اور لہریں ان پر ہر طرف سے امڈ آتی ہیں۔" اس کے نظائر بہت سے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سب کے سب پانی سے مخلوق ہیں، لیکن بعض بواسطہ اور بعض بغیر واسطہ اور اسی لیے یوں کہا گیا ہے کہ اللہ پاک نے فرشتوں کو ایک ہوا سے پیدا کیا کہ جس کو پانی سے خلق فرمایا اور جن کو آگ سے خلق کیا کہ جس کو پانی سے بنایا اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے مخلوق کیا کہ جس کو پانی سے پیدا فرمایا، غرضیکہ سارا کارخانہ پانی ہی سے بنا ہے کوئی باواسطہ کوئی بے واسطہ۔

تیسری دلیل توحید پر یہ ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ﴾ (آیتِ باب) ﴿ رَوَاسِيَ ﴾ "راسية" کی جمع ہے، اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب کوئی شے ثابت اور راسخ ہوتی ہے، جم جاتی ہے تو "رسا الشيء" بولتے ہیں، یعنی وہ شے ثابت ہوگئی، جم گئی۔ اس جگہ ﴿ رَوَاسِيَ ﴾ سے مراد ثابت راسخ پہاڑ ہیں، اسی طرح جبال راسیہ و راسیات محکم و مضبوط و استوار پہاڑوں کو کہتے ہیں۔ "مَیْد" حرکت کرنے، دور کرنے اور ہلنے کو کہتے ہیں۔ "ماد يميد ميدا و ميدانا" بفتح یائے تحتیہ باب باع سے، ان سے پہلے مضاف مقدر ہے، یعنی "مخافة أو كراهة أن تميد" یا حرفِ لام اول میں اور "لا" آخر میں مقدر ہے، یعنی "لئلا تميد" بہ سبب عدمِ التباس کے

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٩١)

حذف ہو گیا، جس طرح کہ اسی عدمِ التباس کے لحاظ سے حرف ''لا'' زائد کیا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ﴾ [الحدید: ۲۹] ''تا کہ اہلِ کتاب یہ جان لیں۔'' یعنی ہم نے رکھے زمین میں ثابت محکم پہاڑ اس بات کے خوف اور کراہت سے کہ وہ اُن کو لے کر مضطرب ہو، حرکت کرے، یا تا کہ وہ اُن کو لے کر نہ ہلے، چکر نہ کھا جائے۔ اس کی تفسیر سورۃ النحل میں پوری طرح گزر چکی ہے۔[1]

توحید پر چوتھی دلیل یہ ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ ﴿ فِيْهَا ﴾ کی ضمیر ﴿ رَوَاسِيَ ﴾ کی طرف پھرتی ہے۔ امام محلی و خازن رحمہ اللہ کا یہی قول ہے،[2] اس قول کی بنیاد پر ﴿ فِيْهَا ﴾ کے معنی ''بینھا'' ہوں گے، یعنی اللہ پاک نے پہاڑوں کے درمیان میں فراخ راستے بنائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارض کی طرف راجع ہو۔ سمین نے اسی کو ظاہر کہا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے اور جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴾ [نوح: ۱۹۔ ۲۰] ''اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے بچھونا بنایا۔ تا کہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو۔'' ''فجاج'' بالکسر جمع ہے ''فج'' بالفتح کی۔ ''فج'' راہِ فراخ کو کہتے ہیں، جو دو پہاڑوں کے درمیان ہو۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو کہے کہ ''فجاج'' میں تو معنی وصف کے ہیں، پھر وہ سبل سے پہلے کیوں رکھا گیا اور مؤخر نہ کیا گیا، اس آیتِ کریمہ کی طرح: ﴿ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴾ [نوح: ۲۰] تو میں کہوں گا کہ بہ حالتِ صفت مقدم نہیں کیا گیا، لیکن وہ تو حال ٹھہرایا گیا۔[3] یعنی حال ذوالحال پر مقدم ہو جاتا ہے صفت موصوف پر مقدم نہیں ہوتی، لہٰذا وہ حال ہے، صفت نہیں ہے، گو اس میں معنی وصف کے ہوں۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فجاج سے مراد راستے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر مخترق، جو دو پہاڑوں کے درمیان ہو، وہ ''فج'' ہے اور ''سبلا'' فجاج کی تفسیر ہے، کیونکہ ''فج'' کبھی طریقِ نافذ مسلوک نہیں ہوتا ہے۔[4]

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''فجاجا'' جو مقدم کیا گیا، حالانکہ ''سبلا'' کا وصف ہے، یہ اس لیے ہے کہ حال ہو جائے تو اس بات پر دلالت کرے کہ اللہ پاک نے جس وقت سبل کو پیدا کیا تو اُن کو ایسا ہی خلق فرمایا، یعنی صفتِ وسعت وفراخی پر۔ یا اس واسطے تقدیم کی کہ ﴿ سُبُلًا ﴾ ﴿ فِجَاجًا ﴾ سے بدل ہو جائے تو ضمناً و التزاماً اس بات پر دلالت کرے کہ اللہ پاک نے سبل کو پیدا کیا اور اُن کو راہ چلنے والوں کے لیے وسیع وفراخ فرمایا، اس کے ساتھ ہی یہ بات ہے کہ اس میں تاکید بھی ہے۔[5] حاشیے میں اس کی یہ وجہ لکھی ہے کہ مبدل منہ بالکل حکمِ سقوط میں نہیں ہوتا، چنانچہ ثابت ہو چکا ہے، پس وقتِ ترتبِ بدل کے اس پر ملاحظہ اس کا جائز ہے، جبکہ مقام مقتضی ہو۔ صاحبِ

---

[1] رقم الآية (١٥) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٣) تفسير الخازن (٤/ ٢٩٣) [3] الكشاف (٣/ ١١٥)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٥٥) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٢)

مدارک کی تقریر یہ ہے کہ اگر تو کہے کہ درمیان ﴿ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴾ کے اور درمیان اس آیت کے کیا فرق ہے؟ تو میں کہوں گا کہ اول تو یہ امر بتانے کو کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس میں فراغ راہیں بنائیں اور دوسرا اس بات کے بیان کرنے کو ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے اُن کو پیدا کیا تو اسی صفت پر خلق فرمایا، پس یہ بیان ہے اس شے کا جس کا وہاں ابہام کیا۔[1]

توحید پر پانچویں دلیل یہ ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی بنایا ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت۔ آسمان زمین پر ایسا ہے جیسے گھر پر چھت ہوتی ہے۔ محفوظ کے یہ معنی ہیں کہ زمین پر گر پڑنے سے اس کو محفوظ رکھا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [الحج: ٦٥] ''اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر (نہ) گرے۔'' امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ستاروں کے ساتھ شیاطین سے اس کی حفاظت کی گئی ہے،[2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴾ [الصافات: ٧] ''اور ہر سرکش شیطان سے (اس کی) حفاظت کے لیے۔'' اور جیسے فرمایا: ﴿ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴾ [الحجر: ١٧] ''اور ہم نے انھیں ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا۔'' کسی نے کہا: محفوظ کے یہ معنی ہیں کہ ستون کا محتاج نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ محفوظ سے مراد اس جگہ مرفوع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شرک و معاصی سے محفوظ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہدم ونقض سے محفوظ ہے، یعنی گرتا ٹوٹتا نہیں ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے کہ فساد وانحلال سے محفوظ ہے۔ ایک وقت مقرر تک بہ سبب مشیت اللہ تعالیٰ کے۔[3]

﴿ وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو نشانیاں اپنی قدرت تام کی اس میں رکھی ہیں، کفار اس سے اعراض کرتے ہیں، اُن میں غور وفکر نہیں کرتے کہ ایمان لے آئیں۔ آیات سے مراد وہ احوال ہیں، جو کہ صانع کے وجود پر اور اس کی وحدت اور کمالِ قدرت و انتہائی حکمت پر دلالت کرتے ہیں، بعض تو اُن میں سے محسوس ومشاہد ہیں، جیسے: سورج چاند تارے اور بعض کی بحث علم طبیعیت و ہیئت میں کی جاتی ہے، جیسے کیفیت حرکات ستاروں کی اپنے افلاک ومطالع ومغارب میں، اس سے اللہ پاک کی پوری قدرت وحکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کیا کیا صنائع و بدائع رکھے ہیں۔ آیات کی اضافت آسمان کی طرف اس واسطے کی کہ وہ نشانیاں آسمان میں رکھی گئی ہیں۔

توحید پر چھٹی دلیل یہ ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ﴾ اللہ پاک اُن کو ایک اور نعمت کی یاد دلاتا ہے من جملہ ان نعمتوں کے جن کا اُن پر انعام کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے ان کے لیے رات بنائی، تاکہ اس میں اُن کو سکون و راحت و آرام ملے، دن کی مشقت وتھکان دور کریں اور دن پیدا کیا، تاکہ اس میں چلیں پھریں، روزی کمائیں، عیش و آرام کے اسباب حاصل کریں اور سورج کو دن کی نشانی اور چاند کو رات کی نشانی

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٧٩) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٨٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٢)

بنایا، تا کہ مہینے اور برسوں کی گنتی جانیں، حساب معلوم کریں، چنانچہ اس کا بیان سورت سبحان میں گزر چکا ہے۔[1]

﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾، ﴿ كُلٌّ ﴾ کی تنوین مضاف الیہ سے عوض ہے، یعنی ہر ایک سورج و چاند و ستارے جاری ہوتے ہیں وسطِ فلک میں اور تیزی سے چلتے ہیں، جس طرح کہ تیرنے والا پانی میں تیرتا ہے۔ ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ بصیغۂ جمع باعتبار مطالع کے کہا۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے جبکہ شمس و قمر و نجوم سے عاقلوں کے فعل کی خبر دی اور اُن کو اطاعت و فرماں برداری میں عاقلوں کی مانند ٹھہرایا تو اُن کے لیے عاقلوں کی ضمیر ذکر فرمائی اور "یسبحن" یا "تسبح" نہ کہا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ امام کسائی نے کہا ہے کہ ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ اس لیے فرمایا کہ سر ہے آیت کا[2] اور ﴿ فَلَكٍ ﴾ واحد ہے افلاکِ نجوم کا۔ اصل اس کلمے کی دوران سے ہے اور اسی مادے سے فلکۂ مغزل ہے، یعنی تکلے کا دمڑکا چونکہ گول ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس کو فلکہ کہتے ہیں۔ سمین نے کہا کہ جمع کا صیغہ اس لیے ذکر کیا کہ یہاں معطوف محذوف ہے، تقدیر "والنجوم" ہے، جس طرح کہ اور آیتیں اس پر دال ہیں۔

رہی جمع عقلا، لہٰذا وہ اس لیے ہے کہ جب چاند سورج کی طرف سباحت کی نسبت کی گئی جو کہ عقلا کے افعال میں سے ہے تو جمع بھی عقلا کی ذکر فرمائی، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴾ [يوسف: ٤] "میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔" اور اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ﴾ [حم السجدة: ١١] "تو ان دونوں نے کہا: ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں۔" اس آیت میں تین کلمے ہیں: ایک ﴿ كُلٌّ ﴾ دوسرا ﴿ فَلَكٍ ﴾ اور تیسرا ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾۔ مفسرین کا ﴿ كُلٌّ ﴾ کے مضاف الیہ میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے، اس میں اتفاق ہے کہ تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ پس بیضاوی کا حاصل یہ ہے کہ مضاف الیہ "کل واحد منهما" ہے، یعنی ہر ایک شمس و قمر سے اور مراد ﴿ فَلَكٍ ﴾ سے جنس ہے۔ مثل اس قول کے "كَسَاهُمُ الْأَمِيْرُ حُلَّةً"، یعنی امیر نے جماعت کو جوڑا پہنایا۔ ظاہر ہے کہ یہاں مراد جنس "حُلّه" ہے، کیونکہ یہ معنی نہیں کہ جماعت کو ایک جوڑا پہنایا، بلکہ جماعت میں سے ہر ایک کو ایک ایک حلہ پہنایا۔ اور ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ خبر ہے ﴿ كُلٌّ ﴾ کی اور ﴿ فِيْ فَلَكٍ ﴾ ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ سے متعلق ہو کر جملہ حال ہے شمس و قمر سے۔

رہی یہ بات کہ اول چار چیزیں مذکور ہیں: لیل و نہار و شمس و قمر، لہٰذا شمس و قمر کا حال میں ان سے علاحدہ ہونا بہ سبب عدمِ التباس کے ہے، کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ لیل و نہار فلک میں نہیں چلتے۔ چلنے والے شمس و قمر ہیں۔ ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ میں ضمیر انھیں کی ہے۔ رہا اس کا جمع لانا، لہٰذا باعتبار مطالع کے ہے، کیونکہ اُن کے مطالع بہت ہیں، ہر ایک کا مطلع ہر روز نیا ہوتا ہے۔ چونکہ سباحت فعل عقلاء کا ہے، اس لیے عقلاء کی جمع ذکر کی گئی۔[3] اس پر کسی نے اعتراض

---

[1] رقم الآية (١٢) [2] فتح القدير (٣/ ٥٥٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٢۔ ٩٣)

کیا ہے کہ سباحت عقلاء کا فعل کیوں کر ہو سکتا ہے، حالانکہ بہت سے حیوان سباحت کرتے ہیں۔ عقلاء کے ساتھ جو سباحت خاص ہے، وہ سباحت صناعی ہے اور سباحت کسبی ہے نہ مطلق سباحت۔ محلی ﷫ نے بلحاظِ جمعیت ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ کے مضاف الیہ شمس وقمر و نجوم کو کہا ہے۔[1] علامہ نسفی ﷫ نے فرمایا کہ تقدیر "کلھم" ہے اور ضمیر شمس وقمر کی طرف راجع ہے۔ پھر بلحاظِ جمعیت ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ کے یوں کہا کہ شمس وقمر سے مراد جنسِ طوالع ہے،[2] یعنی خاص یہی دونوں مراد نہیں ہیں، بلکہ جو ستارے کہ طلوع ہوتے ہیں، ان کی جنس مراد ہے، اس میں یہ دونوں بھی آ گئے، جمعیت درست ہوگئی۔

﴿ فَلَكٍ ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ کا قول نقل کیا ہے کہ فلک سما ہے[3] اور جمہور اس پر ہیں کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ ایک موج رُکی ہوئی ہے، آسمان کے نیچے شمس وقمر و نجوم اس میں چلتے ہیں۔ امام ابو البقاء ﷫ نے "إعراب القرآن" میں یوں لکھا ہے: "کل منھما أو منھا" اور ضمیر راجع ہے، طرف لیل و نہار و شمس وقمر کے اور ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ خبر ہے ﴿ كُلٌّ ﴾ کے معنی کی بنا پر، اس لیے کہ جس وقت ہر واحد نے اُن میں سے سباحت کی تو کل اُن کا سباحت کرتا۔ کسی نے کہا: ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ اس وجہ کی بنیاد پر حال ہے اور خبر ﴿ فِيْ فَلَكٍ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیر "کلھا" ہے اور خبر ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾ ہے اور ضمیر جمع معنی ﴿ كُلٌّ ﴾ کی بنا پر لائی گئی۔[4] امام ابو البقاء ﷫ نے کلیات میں کہا ہے کہ "السبح المر السریع في الماء والھواء" یعنی سبح پانی و ہوا میں تیز گزرنے کو کہتے ہیں۔ "یقال سبح سبحا بالفتح وسباحة بالکسر" اور استعارہ کیا جاتا ہے واسطے گزرنے ستاروں کے ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾۔[5]

رہا بیان ﴿ فَلَكٍ ﴾ کا، لہٰذا امام خازن ﷫ نے کہا کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ ستاروں کے دور کرنے کی جگہ ہے، جو کہ ان کو ضم کیے ہوئے ہو۔ اور ﴿ فَلَكٍ ﴾ کلامِ عرب میں ہر گول شے کو کہتے ہیں، جمع اس کی افلاک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ ایک چکی ہے، مثل ہیئت دمڑی تکلے کے، مراد یہ ہے کہ جس شے میں ستارے چلتے ہیں، وہ گول شے ہے، چکی کی گولائی کی طرح۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ وہ آسمان ہے جس میں وہ ستارہ ہے، پس ہر ستارہ اس آسمان میں چلتا ہے، جس میں وہ مقدر کیا گیا ہے۔ ہیئت والوں نے کہا کہ فلک اجرامِ صلبہ ہیں، نہ بھاری ہیں، نہ ہلکے، خرق و التیام و نمو اور ذبول کے قابل نہیں ہیں۔[6]

امام رازی نے کہا ہے کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ کلامِ عرب میں شے مستدیر کو کہتے ہیں، جمع اس کی افلاک ہے۔ عقلا نے اس میں اختلاف کیا ہے، لہٰذا بعض نے کہا کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ جسم نہیں ہے، وہ تو استدارت ہے، ان ستاروں کی۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ افلاک اجسام ہیں، ستارے اُن پر گردش کرتے ہیں، یہ قول ظاہر قرآن کے قریب تر ہے۔ پھر اس کی

---

(1) تفسیر الجلالین (١/ ٤٢٣) (2) تفسیر النسفي (٣/ ٨٠) (3) تفسیر الطبري (١٨/ ٤٣٧)
(4) التبیان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٧) (5) الکلیات (١/ ٥١٥) (6) تفسیر الخازن (٤/ ٢٩٤)

کیفیت میں اختلاف کیا ہے، لہٰذا بعض نے کہا کہ ﴿ فَلَكٍ ﴾ ایک موج ہے، رُکی ہوئی ہے، جس میں چاند تارے چلتے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک پانی ہے، رُکا ہوا، ستارے اس میں چلتے ہیں، حجت یہ لائے ہیں کہ سباحت صرف پانی ہی میں ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اس کو نہیں مانتے، اس لیے کہ جو گھوڑا چلنے میں اپنے اگلے پاؤں کو دراز کرتا ہے تو اس کو سابح بولتے ہیں۔ لوگوں نے ستاروں کی حرکتوں میں اختلاف کیا ہے۔ جو وجوہ کہ اُن میں ممکن ہیں، وہ تین ہیں، کیونکہ یا تو فلک ساکن ہو اور ستارے اس میں حرکت کرتے ہوں، جیسے: مچھلی کی حرکت رکے ہوئے پانی میں یا یہ کہ فلک متحرک ہو اور ستارے بھی اس میں حرکت کرتے ہوں۔ ستاروں کی حرکت یا تو فلک کی حرکت کی جہت کے مخالف ہے، یا اس کی جہت کے موافق، یہ مخالفت یا موافقت یا تو مساوی حرکت سے ہوگی، فلک کی حرکت کی تیزی میں، یا مخالف ہوگی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ فلک متحرک ہو اور ستارے ساکن۔ جس بات پر کہ قرآن شریف کے الفاظ دلالت کرتے ہیں، وہ پہلی قسم ہے کہ افلاک تو ساکن ہیں اور ستارے اُن میں چلتے ہیں، جس طرح کہ مچھلی رُکے ہوئے پانی میں تیرتی ہے۔[1] حق یہ ہے کہ آسمانوں اور افلاک اور جو کچھ اُن میں ہے، اُن کی صفت اور کیفیت انسانی سمجھ سے بالاتر ہے، مگر صادق و مصدوق ﷺ کی زبان مبارک سے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝۳۴ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵

اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی، پھر اگر آپ مر جائیں تو کیا وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟ (34) ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے برائی اور بھلائی سے آزماتے ہیں اور آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے (35)

اس دنیا میں کوئی بھی ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے:

کافر کہتے تھے کہ اس شخص کی زندگی تک ہی یہ دھوم دھام ہے، جہاں یہ مرا پھر کچھ نہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے کہ اے پیغمبر! ہم نے تم سے پہلے کسی کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی، بلکہ ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ [الرحمن: ٢٦۔ ٢٧] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔ اور آپ کے رب ذوالجلال والاکرام کا چہرہ باقی رہے گا۔''

---

[1] تفسیر الرازي (٢٢/ ١٤٤۔ ١٤٥)

ساغر فانی و بزم و ساقی فانی با ہر کہ شدی درد ملاقی فانی
بردار دل از ہستی بی بود جہان اللہ بود باقی وباقی فانی

''پیالہ فانی ہے اور مجلس اور پلانے والا بھی ختم ہو جانے والے ہیں۔ جس کسی کے ساتھ تو نے محبت سے ملاقات کی وہ بھی فنا ہو جانے والا ہے۔ دنیا کی بے بنیاد زندگی سے دل اُٹھا لے۔ اللہ کو ہمیشہ بقا ہے باقی سب فنا ہو جانے والے ہیں۔''

اس آیتِ کریمہ سے من جملہ علما اُن لوگوں نے استدلال کیا ہے، جو اس طرف گئے ہیں کہ خضر علیہ السلام مر گئے ہیں، اب تک زندہ نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ بشر تھے۔ بشر عام ہے ولی ہو یا نبی یا رسول۔ اور اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی اے پیغمبر! اگر تم مر گئے تو وہ رہ جائیں گے، یعنی وہ آرزو کرتے ہیں کہ تمھارے بعد جئیں، یہ نہ ہوگا، بلکہ سب کا انجام فنا کی طرف ہے، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ﴾ امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ان دو بیتوں کو پڑھا اور استشہاد کیا:

تَمَنّٰى رِجَالٌ أَنْ أَمُوْتَ وَ إِنْ أَمُتْ فَتِلْكَ سَبِيْلٌ لَسْتُ فِيْهَا بِأَوْحَدِ
فَقُلْ لِلَّذِيْ يَبْغِيْ خِلَافَ الَّذِيْ مَضَى تَهَيَّأْ لِأُخْرَى مِثْلَهَا فَكَانَ قَدِ

''کچھ لوگوں کی یہ تمنا ہے کہ میں مر جاؤں اور اگر میں مر جاؤں تو یہ کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر میں اکیلا ہی چلنے والا ہوں۔ جو شخص مروجہ قانون کے خلاف چاہتا ہے، اس سے کہہ دو کہ تم اس جیسی دوسری صورت حال کے لیے تیار ہو جاؤ، کیوں کہ وہ حالت آنے والی ہے۔''

اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری شادی مکن کہ بر تو ہمیں ماجرا

''اے دوست! دشمن کے جنازہ پر جب تو گزرے تو خوشی کا اظہار مت کر، کیوں کہ تیرے ساتھ یہی کچھ ہونے والا ہے۔''

﴿ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ یعنی ہم تم کو جانچتے ہیں، کبھی مصیبتوں سے، کبھی نعمتوں سے، پھر ہم دیکھتے ہیں، کون شکر کرتا ہے کون ناشکری سے پیش آتا ہے، کون صبر کرتا ہے کون آس توڑتا ہے، جس طرح کہ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ﴿ نَبْلُوْكُمْ ﴾ کے معنی ہیں ''نبتلیکم''۔ شر و خیر سے مراد شدت و رخاء یعنی تنگی و فراخی، صحت و بیماری، تمنا و فقر، حلال و حرام، طاعت و معصیت، ہدی و ضلال ہے۔ ﴿ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر ہم تم کو تمھارے اعمال کی جزا دیں گے۔[1] كذا في ابن كثير.

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۳۸)

اس آیتِ کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ کفار کہتے تھے: ﴿ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾ [الطور: ٣٠] ''اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟'' مطلب یہ ہے کہ جس طرح اور خلق مرتی ہے، یہ بھی مر جائیں گے تو یہ دھوم دھام سب جاتی رہے گی، گویا وہ آپ کا انتقال ہونے پر خوش ہوتے، اس پر اللہ پاک نے آپ سے کفار کی شماتت کی نفی کی اور یوں فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا... الخ﴾ یعنی اللہ پاک حکم جاری کر چکا ہے کہ دنیا میں کسی بشر کو ہمیشہ نہ رکھے، نہ تم کو نہ ان کو، پھر اگر مر گئے تو کیا یہ لوگ باقی رہ جائیں گے؟ ہرگز نہیں، کیوں کہ دنیا میں ہمیشہ جینا حکمتِ تکوینی و تشریعی کے خلاف ہے۔ کسی شاعر نے اس بارے میں کیا خوب کہا ہے۔ ؎

فقل للشامتين بنا أفيقوا سيلقى الشامتون كما لقينا

یعنی جو لوگ ہماری شماتت کرتے ہیں، ہماری مصیبت پر خوش ہوتے ہیں تو ان سے کہہ دے کہ ذرا ٹھہرو، عن قریب وہ بھی اسی شے سے ملیں گے جس سے ہم ملے۔

''مِتَّ'' کو میم کی زیر اور پیش دونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی فا جملے پر عطف کے لیے ہے اور دوسری واسطے جزائے شرط کے ہے۔[1] بیضاوی کا حاصل یہ ہے کہ فائے اول تعلق شرط کے لیے ہے ساتھ ماقبل کے اور ہمزہ مضمونِ جملہ شرطیہ کے انکار کے لیے ہے،[2] جس طرح کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، انکار جزا کے لیے نہیں ہے، جیسے کہ یونس کا زعم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ امر قرار پا چکا کہ کسی آدمی کو دنیا میں بقائے دوام نہیں ہے۔ لہٰذا کیا اگر تم مر گئے تو وہ ہمیشہ باقی رہیں گے، ہرگز نہیں، تم بھی مرو گے، وہ بھی مریں گے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ جملہ اخیر، یعنی ﴿ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾ محل ہے استفہام انکاری کا،[3] اس کی شرح میں امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصل کلام یوں ہے: ''أفهم الخلدون إن مت'' چونکہ ہمزہ صدارت چاہتا ہے اس لیے مقدم کیا گیا۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوسری فا اس لیے لائی گئی ہے کہ شرط پر دلالت کرے، کیوں کہ یہ جواب ہے کفار کے قول کا، وہ قول یہ ہے: ''إن محمداً سيموت'' یعنی نبی کریم ﷺ عن قریب انتقال کریں گے۔ کہا، یعنی امام فراء رحمہ اللہ نے کہ حذف و اضمار فا کا جائز ہے، معنی یہ ہیں: ''إن مت فهم يموتون أيضا'' یعنی اگر تم مر جاؤ گے اپنی اجلِ مقرر پر تو وہ بھی مریں گے، پس مرنے میں کسی طرح کی شماتت نہیں ہے۔[4] امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ پر داخل ہوئے اور آپ کا انتقال ہو چکا تھا تو صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کا بوسہ لیا اور یوں کہا: ''وا نبياه وا خليلاه وا صفياه'' پھر یہ آیت پڑھی اور یہ آیت ﴿ اِنَّكَ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٠) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٣)

[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٣) [4] تفسير القرطبي (١١/ ٢٨٧) فتح القدير (٣/ ٥٥٥)

مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ﴾[1] [الزمر: ٣٠] ''(اے نبی!) بلاشبہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں۔'' غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے کفار سے بقائے دائمی کی نفی کی اور اس کا انکار کیا، پھر اس انکار کی یہ دلیل بیان فرمائی: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ نفس سے مراد پیدا کیا گیا نفس ہے اس لیے کہ باری تعالیٰ اس میں داخل نہ ہو، کیونکہ اللہ پاک پر بھی نفس کا اطلاق آیا ہے، یعنی ہر پیدا کی ہوئی جان اپنے جسم سے جدا ہونے کی تلخی چکھنے والی ہے۔ جتنے نفوس مخلوق والے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عموم مخصوص ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ: ﴿ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ﴾ [المائدۃ: ١١٦] ''تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔'' کیونکہ اللہ پاک زندہ ہے مرے گا نہیں اور نہ اس پر موت روا ہے۔ اور ذوق اس جگہ عبارت ہے ان تکالیف اور آلامِ عظیمہ سے جو کہ موت سے پہلے پیش آتی ہیں۔ غرضیکہ دنیا میں کسی کو خلود نہیں ہے، ہر جی کو موت چکھنی ہے۔ رہی دنیا کی زندگی تو یہ آزمایش کے لیے ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً ﴾۔ بلا و فتنہ و اختبار و فتنہ سب کے معانی آزمانے کے ہیں۔ شر سے مراد شدت اور خیر سے مراد راحت ہے۔[2]

﴿ فِتْنَةً ﴾ کے نصب میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مفعول لہ ہے، یعنی ہم تجھ کو جانچتے ہیں شر اور خیر سے آزما کر، یعنی تا کہ ہم دیکھیں کہ تم شدت پر صبر اور راحت پر شکر کرتے ہو یا نہیں۔ امام محلی اور خازن رحمہما اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔[3] شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصدر ہے، موضع حال میں ''أي فاتنین لکم''، یعنی ہم تم کو خیر و شر سے جانچتے ہیں، درآں حالیکہ ہم تم کو آزمانے والے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مصدر ہے معنی عامل سے، نہ اس کے لفظ سے، یعنی مفعول مطلق ہے ''من غیر لفظه''، کیونکہ ابتلا و فتنہ کے ایک معنی ہیں، معنی یہ ہیں: جانچتے ہیں تم کو خیر و شر سے جانچنا۔ امام بیضاوی و نسفی رحمہما اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔[4] امام سمین اور ابو البقاء رحمہما اللہ نے تینوں کو نقل کیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آزمایش و امتحان وہ شخص کرتا ہے، جس کو علم نہ ہو اور علم حاصل کرنا چاہے، حالانکہ اللہ پاک بندوں کی پیدایش سے پہلے اُن کے اعمال و افعال کا عالم ہے، اس کو امتحان کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے یوں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ پاک اُن سے اس شخص کا سا معاملہ کرتا ہے کہ جو اُن کو آزمائے، ان کو جانچے، پھر اس ابتلا و امتحان پر کفایت نہ کی، بلکہ یوں فرمایا: ﴿ وَاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی اس آزمایش کے بعد خاص ہماری ہی طرف پھر

---

[1] دلائل النبوۃ للبیهقي (٧/ ٢١٣۔ ٢١٥) اس کی اصل صحیح بخاری (٣٤٦٧) اور دیگر کتب میں موجود ہے۔

[2] تفسیر الخازن (٤/ ٢٩٤) [3] تفسیر الجلالین (١/ ٤٢٣) تفسیر الخازن (٤/ ٢٩٤)

[4] تفسیر البیضاوي (٤/ ٩٣) تفسیر النسفي (٣/ ٨٠)

کر آؤ گے، ہمارے غیر کی طرف نہ جاؤ گے، نہ تو بطورِ استقلال نہ بطورِ اشتراک، پھر ہم ہی تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ دیں گے، اس کے موافق جو تم سے ظاہر ہوگا اگر خیر ہے تو خیر، شر ہے تو شر۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے مقصود آزمایش اور تعریض ہے ثواب اور عذاب کے واسطے۔[1] كذا في فتح البيان وغيره.

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۶ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝۳۷

اور جب کافر آپ کو دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو مذاق ہی کا نشانہ بناتے ہیں (کہتے ہیں:) کیا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر (اہانت سے) کرتا ہے؟ جبکہ وہ خود رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں (36) انسان جلد بازی (کے خمیر) سے تخلیق کیا گیا ہے، میں تمھیں اپنی نشانیاں جلد دکھاؤں گا، لہٰذا تم مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو (37)

کفار کا رسول اللہ ﷺ سے استہزاء:

اللہ پاک اپنے نبی کریم ﷺ سے فرماتا ہے: ﴿ وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا ﴾ یعنی کفارِ قریش، جیسے: ابوجہل اور اس کی طرح کے اور کافر ﴿ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ﴾ یعنی تم سے ٹھٹھا کرتے ہیں اور تمھارا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں: ﴿ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ﴾ یعنی کیا یہ وہی شخص ہے جو تمھارے معبودوں کو برا کہتا ہے اور تمھاری عقلوں کو سفاہت و حماقت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی وہ اللہ کے منکر ہیں اور باوجود اس کے اللہ کے رسول سے ٹھٹھا کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝۴۱ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ [الفرقان: ۴۱۔ ۴۲] ”اور (اے نبی!) جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں (اور کہتے ہیں:) کیا یہی ہے وہ جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ بے شک وہ تو ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکانے ہی لگا تھا، اگر ہم ان (معبودوں کی عبادت) پر جمے نہ رہتے اور جلد وہ جان لیں گے جب عذاب دیکھیں گے کہ سب سے زیادہ بے راہ کون ہے۔“ یہاں فرمایا: ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۱] ”اور انسان بہت عجلت والا ہے۔“ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن خلائق کو پیدا کیا تو

---

[1] فتح البيان (۸/ ۳۲۵)

اس کے آخر میں ہر شے کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پس جس وقت روح نے اُن کی دونوں آنکھوں کو اور زبان و سر کو زندہ کیا اور ان کے نیچے کے بدن میں نہیں پہنچی تھی تو آدم بولے: یا رب! تو میری خلق کو جلدی کر سورج ڈوبنے سے پہلے۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بہتر دن جس میں سورج نکلا، جمعہ کا دن ہے، اسی میں آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور اسی میں جنت میں داخل کیے گئے اور اسی میں جنت سے اتارے گئے اور اسی میں قیامت قائم ہوگی اور اسی میں ایک گھڑی ہے کہ نہیں موافقت کرتا اس کی کوئی مومن بندہ نماز پڑھتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں بند کیں، اس گھڑی کی قلت بتانے کے لیے۔ پھر وہ بندہ اللہ سے کسی خیر کا سوال کرے تو اللہ اس بندے کو وہ خیر عطا فرمائے۔[2]

امام ابو سلمہ رحمہ اللہ جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے وہ گھڑی پہچان لی ہے، وہ جمعے کے دن کی آخری گھڑی ہے اور وہ وہی گھڑی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ یہاں انسان کی عجلت ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھٹھا کرنے والوں کا ذکر کیا تو دلوں میں یہ بات پیدا ہوئی کہ اُن سے جلد انتقام لیا جائے اور نفوس نے اس کی جلدی کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔ مہلت دیتا ہے، پھر جلدی کرتا ہے اور اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ ﴾ یعنی اب دکھاتا ہوں میں تم کو اپنا انتقام، اپنا حکم اور اقتدار اس شخص پر جس نے میری نافرمانی کی، لہٰذا تم مجھ سے جلدی مت کرو۔[3] كذا في ابن كثير.

"إِتِّخَاذ" باب افتعال سے ہے، بہ معنی گرفتن، یعنی پکڑنا۔ "هُزْءٌ و هُزُوٌ" زائے معجمہ کے سکون اور بضم زاے مصدر ہے باب "سمع يسمع" سے، معنی اس کے تحریہ کے ہیں، یعنی ٹھٹھا کرنا۔ کلمہ ﴿ اِنْ ﴾ بہ معنی "ما" ہے۔ ﴿ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ خطیب نے کہا ہے کہ اس کا عطف ﴿ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴾ [طه: ٦٢] پر ہے، جو کہ اول سورت میں واقع ہوا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنْ ﴾ اس جگہ نافیہ ہے اور یہ اور جو اس کے تحت میں ہے، جواب ہے شرط کا اور شرط ﴿ اِذَا ﴾ ہے۔ کلمہ ﴿ اِذَا ﴾ اس باب میں اور آلاتِ شرط کے مخالف ہے، کیونکہ اور آلاتِ شرط کے جواب میں جب ﴿ اِنْ ﴾ یا مائے نافیہ آتا ہے تو حرفِ فا کا لانا واجب ہوتا ہے، جیسے یہ مثال ہے: "إن أتيتني فإن أهنتك" یا "فما أهنتك" یعنی اگر تو میرے پاس آئے گا تو میں تیری اہانت نہیں کروں گا،

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٤٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٩١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٣٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٣٤) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣٩)

بخلاف ﴿ اِذَا ﴾ کے کہ اس کے جواب میں حرفِ فا نہیں آتا ہے، جیسے یہ مثال: "إذا أتيتني ما أهنتك" اس بات پر یہ آیت دال ہے: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [الجاثية: ٢٥] ''اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں، جو واضح ہوتی ہیں تو ان کی دلیل بس یہی ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لاؤ۔'' دیکھو: یہاں جواب ﴿ اِذَا ﴾ منفی ہے اور حرفِ فا نہیں آیا۔ "اتخذ" اس جگہ دو مفعول کی طرف متعدی ہے: اول کاف ہے اور دوسرا ﴿ هُزُوًا ﴾۔ اس میں تین وجہیں ہیں: یا تو مضاف حذف ہے، یعنی "ذا هزو" یا مبالغہ کے لیے مصدر کے ساتھ وصف کر دیا، یا اسم مفعول کے موقع میں واقع ہے، یعنی "مهزوءً بك"۔

﴿ اِذَا ﴾ کے جواب میں دو قول ہیں: ایک تو ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ ہے، اس کے ساتھ جو اس کے تحت میں ہے، چنانچہ اس کا ذکر ہو چکا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جواب محذوف ہے اور وہ وہی قول ہے جس کے ساتھ جملہ استفہامیہ حکایت کیا گیا ہے، اس قول میں ﴿ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ﴾ اس لیے کہ تقدیر یہ ہے: "وَإِذَا رَآكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَقُوْلُوْنَ اَهٰذَا الَّذِيْ"۔ اس صورت میں جملہ منفیہ، یعنی ﴿ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ ... الخ ﴾ معترضہ ہوگا درمیان شرط کے اور درمیان جواب مقدر شرط کے۔ ﴿ يَذْكُرُ ﴾ کے معنی "يعيب" ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محاورے میں بولتے ہیں: "فلان يذكر الناس" یعنی فلاں اُن کی غیبت کرتا ہے، اُن کو عیوب کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ "وفلان يذكر الله" یعنی وہ اللہ کا تعظیم کے ساتھ وصف کرتا ہے اور اس پر ثنا کرتا ہے اور ذکر کے ساتھ وہی شے حذف کی جاتی ہے جس کے معنی معقول ہوتے ہیں[1] اور جس بنیاد پر انھوں نے کہا ہے۔ کلامِ عرب میں ذکر عیب نہیں ہوتا اور جس جگہ اس سے عیب مراد ہوتا ہے تو "سوء" کا لفظ اس سے حذف کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مدح و ذم دونوں پر ذکر کا اطلاق ہوتا ہے، ہمراہ قرینے کے، وہ قرنیہ یہ ہے کہ ذکر کرنے والا اگر دوست ہے تو وہ ذکر ثنا ہوگا اور اگر دشمن ہے تو ذم ٹھہرے گا۔

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے مراد وہی مشرکین ہیں، جو نبی اکرم ﷺ سے ٹھٹھا کرتے تھے اور جن کے حق میں اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴾ [الحجر: ٩٥] ''بلاشبہہ ہم ٹھٹھا کرنے والوں کے مقابل آپ کو کافی ہیں۔'' امام سدی رحمہ اللہ سے امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابوسفیان اور ابو جہل پر گزر فرمایا اور وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے، پس جس وقت ابوجہل نے آپ کو دیکھا تو ابوسفیان سے کہا: یہ ہے نبی بنی عبد مناف کا۔ اس پر ابوسفیان خفا ہوا۔ پھر کہا: "ما تنكرون أن يكون لبني عبد مناف نبي،

[1] معاني القرآن (٣/ ٣٩٢)

فسمعها النبي ﷺ فرجع إلى أبي جهل فوقع به وخوفه وقال ما أراك منتهيا حتى يصيبك ما أصاب عمك وقال لأبي سفيان أما إنك لم تقل ما قلت إلا حمية" اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا... الخ ﴾[1] ۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس اثر کو نقل کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ وہ شخص دیکھا جائے جس سے امام سدی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے۔[2]

﴿ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ اول ﴿ هُمْ ﴾ مبتدا ہے، ﴿ كٰفِرُوْنَ ﴾ خبر اور ﴿ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ ﴾ خبر سے متعلق ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وهم كفرون بذكر الرحمن"۔ اور دوسرا ﴿ هُمْ ﴾ تاکید ہے، اول کی تاکید لفظی، پس فصل واقع ہوئی عامل اور معمول کے درمیان موکد کے ساتھ اور موکد کے درمیان معمول کے ساتھ۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر کی تکرار تاکید کے لیے ہے اور تخصیص کے لیے اور اس لیے کہ مبتدا اور خبر کے درمیان صلہ حائل ہوگیا ہے،[3] یعنی اس واسطے تکرار مبتدا کی ضرور ہوئی، اس جملے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہے بنابر حال فاعل قول مقدر سے، یعنی وہ یہ کہتے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ اس حال پر ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حال ہے فاعل ﴿ يَتَّخِذُوْنَكَ ﴾ سے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی طرف مائل ہیں۔[4] رحمٰن کی طرف ذکر کی اضافت یا تو مصدر کی اضافت ہے فاعل کی طرف اور "ذِكْرِ" سے مراد باری تعالیٰ کا ارشاد ہے، ان کے لیے رسولوں کو بھیجنے کے ساتھ اور کتابوں کو نازل کرنے کے ساتھ، یا مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، یعنی رحمٰن کو ذکر کرنا توحید کے ساتھ، جیسا کہ تفسیر بیضاوی میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "ذِكْرِ" سے مراد قرآن ہے، یعنی وہ قرآن کے جاحد اور منکر ہیں، یا یہ معنی ہیں کہ وہ ذکر رحمٰن کے منکر ہیں، جس نے ان کو پیدا کیا، اس لیے کہ وہ کہتے تھے ہم رحمٰن کو نہیں پہچانتے، ہم تو رحمٰنِ یمامہ کو جانتے ہیں، یعنی مسیلمہ کذاب کو۔ مطلب یہ ہے کہ کفار نبیِ کریم ﷺ پر اس بات کا عیب لگاتے تھے کہ وہ اُن کے معبودوں کو برائی سے یاد کرتے ہیں، کون سے معبود جو نہ ضرر پہنچائیں نہ نفع، حالانکہ وہ اس بات کے منکر ہیں کہ اللہ پاک کا توحید کے ساتھ ذکر کریں، جو کہ اس کو لائق ہے، پس وہ زیادہ تر مستحق ہیں، اس بات کے کہ اُن کو عیب لگایا جائے اور اُن پر انکار کیا جائے اور اُن سے مذاق کیا جائے۔

انسان کی عجلت پسندی کا بیان:

﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ عجل و عجلت دونوں مصدر ہیں، اُن کے معنی ہیں: شتافتن، یعنی جلدی کرنا، بطوء کی ضد ہیں۔ باب ان کا طرب ہے۔ شے کو اس کے وقت پر مقدم کرنے کو عجلت کہتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد انسان سے جنس ہے۔ یہ جو فرمایا کہ انسان عجلت سے بنا ہے، لہٰذا اس میں استعارہ بالکنایہ ہے، کیوں کہ یہاں تشبیہ دی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٥٢۔ ٢٤٥٣) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] فتح القدیر (٣/ ٥٥٩۔ ٥٦٠)
[3] تفسیر البیضاوي (٤/ ٩٣) [4] الکشاف (٣/ ١١٨)

ہے عجلت کی، جس پر انسان کی طبیعت بنائی گئی ہے اور وہ اس کے لیے مثل جبلت کے ہو گئی ہے مادے کے ساتھ کہ وہ مٹی ہے اور اس تشبیہ کو جی میں پوشیدہ رکھا اور مشبہ بہ، یعنی مٹی کا ذکر نہ کیا اور بعض لوازمِ مشبہ بہ کے ساتھ کہ وہ کلمہ ﴿ خُلِقَ ﴾ ہے مشبہ کی طرف اشارہ کیا۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ انسان اپنے احوال میں عجلت بہت کرتا ہے تو گویا وہ اسی عجلت سے پیدا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی اس جہت سے کہ عجلت پر مطبوع ومفطور ومخلوق ہوا ہے تو وہ بہت سی اشیا کی جلدی کرتا ہے، گو وہ اس کو ضرر پہنچائیں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بنیہ وخلقت انسان کی عجلت سے ہے اور عجلت پر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ عرب کو اس بات کے ساتھ خطاب کیا گیا، جس کو وہ سمجھتے بوجھتے ہیں۔ عرب لوگ جس شخص سے کوئی شے بہت ہوتی ہے تو اس سے کہتے: "خُلِقْتَ منه" جس طرح یوں کہتے ہیں: "أنت من لعب و خلقت من لعب" یعنی تو لعب سے ہے اور لعب سے پیدا کیا گیا۔ مراد اس کے لعب کے ساتھ وصف کرنے میں مبالغہ ہے۔[1] اس معنی پر اللہ پاک کا یہ قول دال ہے: ﴿ وَكَانَ الْاِنْسٰنُ عَجُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١١] "اور انسان بہت عجلت والا ہے۔" امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ بابِ قلب سے ہے۔ اصل یہ ہے: "خلق العجل من الإنسان" بہ سبب شدت صدور عجلت کے انسان سے اور بہ سبب ملازمت عجلت کے انسان کو۔

انسان کی عجلت میں سے ایک یہ ہے کہ کفر کی طرف جلدی کرتا ہے اور وعید کی عجلت طلب کرتا ہے۔ ابو عمرو اسی طرف گئے ہیں۔ قراءتِ عبداللہ "خلق العجل من الإنسان" اس کی موید ہے۔ کلامِ عرب میں قلب بہ کثرت موجود ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں قلب نہیں ہے۔ فتح البیان میں امام ابو عبیدہ اور نحاس رحمہما اللہ کا بھی یہی قول منقول ہے۔[2] اس میں کئی تاویلیں ہیں۔ اُن میں سے خوب تر تاویل یہ ہے کہ یہ بطورِ مبالغہ ہے، ذات انسان کی ٹھہرائی گئی، گویا نفس عجلت سے پیدا ہوئی، منظور اس بات کا بتانا ہے کہ انسان عجلت کے ساتھ انتہائی طور پر متصف ہے اور عجلت اس کا مادہ ہے، جس سے وہ لیا گیا ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ عَجَلٍ ﴾ موضع نصب میں ہے ﴿ خُلِقَ ﴾ سے بنا بر مجاز "كما تقول خلق من طين" "قيل هو حال أي عجلا"[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[4]

کسی نے کہا: انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے جس وقت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اُن میں روح میں سے پھونکا تو روح اُن کے سر میں پہنچی، پس وہ اُٹھنے لگے، اس سے پہلے کہ روح اُن کے پاؤں کی طرف پہنچے تو وہ گر پڑے، اس پر کہا گیا: ﴿ خُلِقَ الْاِنْسٰنُ مِنْ عَجَلٍ ﴾۔ امام عکرمہ، سعید بن جبیر، سدی، کلبی اور

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٥٧) [2] فتح البيان (٨/ ٣٢٧)
[3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٨) [4] تفسير النسفي (٣/ ٨١)

مجاہد رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جس وقت آدم علیہ السلام میں روح پھونکی تو اُن کے سر میں پہنچی، ان کو چھینک آئی تو کہا: "الحمد لله" پس فرشتوں نے کہا: "یر حمك الله" پھر وہ اُٹھنے لگے، پہلے اس سے کہ روح اُن کے دونوں پاؤں میں لائی جائے تو وہ گر پڑے، اس پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔[1] ابو عبیدہ اور بہت سے اہلِ معانی نے کہا کہ لغتِ حمیر میں "عجل" "طین" یعنی مٹی کو کہتے ہیں، چنانچہ ان کے شاعر نے کہا ہے: ؎

والنخل ينبت بين الماء و العجل

یعنی کھجور اُگتی ہے درمیان پانی اور مٹی کے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: معنی اس کے یہ ہیں کہ آدم سے کہا گیا کہ ہو جا تو وہ ہو گئے۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جس وقت روح آدم علیہ السلام کے سر میں اور دونوں آنکھوں میں داخل ہوئی تو انھوں نے جنت کے پھلوں پر نظر کی، پھر جب اُن کے پیٹ میں داخل ہوئی تو کھانے کی خواہش کی، پھر کودے اس سے پہلے کہ روح اُن کے پاؤں تک پہنچے، جنت کے پھلوں کی طرف جلدی کرنے کے لیے تو گر پڑے، اس پر کہا گیا: ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ اور اپنے بیٹوں کو عجلت کا وارث کیا۔ کسی نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ پیدا کیا گیا انسان تعجیل سے اللہ کے پیدا کرنے میں، کیوں کہ اُن کی خلق ہر شے کے بعد ہوئی، جمعے کے دن کے آخر میں۔ پس اللہ نے اُن کی خلق میں جلدی کی آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے۔ جب روح نے اُن کے سر کو زندہ کیا تو کہا: اے رب! تو میری خلق کو جلدی کر سورج ڈوبنے سے قبل۔ کسی نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام بسرعت و تعجیل پیدا کیے گئے غیر قیاس پر اُن کی اولاد کی پیدایش کے، کیوں کہ اُن کی اولاد پیدا ہوئی ہے نطفے سے، پھر خونِ بستہ سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے، کئی طور پر ایک طور بعد ایک طور کے۔[3]

امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ آیت نازل ہوئی، جس وقت کہ نضر بن حارث عذاب کی جلدی کرتا تھا۔[4] فتح البیان میں کہا ہے کہ اس قول کا قائل یہی ہے: ﴿ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] "اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔" کسی نے کہا ہے کہ قریش کے حق میں نازل ہوئی ہے، کیوں کہ انھوں نے عذاب کی جلدی کی۔[5]

﴿ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ ﴾ یعنی اب میں تم کو دکھاتا ہوں میرے نقمات تم سے اور میرے مواعید آخرت میں تو

---

(1) الدر المنثور (٥/ ٦٣٠) فتح القدير (٣/ ٥٥٧۔ ٥٥٨) (2) تفسير القرطبي (١١/ ٢٥٣) (3) تفسير الخازن (٤/ ٢٩٤۔ ٢٩٥)
(4) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٣۔ ٩٤) تفسير النسفي (٣/ ٨٠) (5) فتح البيان (٨/ ٣٢٧)

عذابِ نار سے اور دنیا میں مثل واقع بدر کے۔ ﴿ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴾ لہٰذا تم مجھ سے اُن کے لانے کی جلدی مت کرو، کیوں کہ وہ تم پر ضرور ہی نازل ہونے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آیات سے مراد وہ معجزات ہیں، جو نبی اکرم ﷺ کے صدق پر دال ہیں اور وہ عاقبتِ محمود جس کو اللہ پاک نے آپ ﷺ کے واسطے ٹھہرا رکھا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴾ یعقوب کے نزدیک بیائے تحتیہ ہے۔ سہل و عیاش نے وصل میں یعقوب کی موافقت کی ہے۔[1]

انموذج میں کہا ہے کہ اللہ پاک نے ﴿ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴾ کیونکر فرمایا اس کے بعد کہ ﴿ خُلِقَ الْاِنْسٰنُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ فرما چکا؟ گویا یہ تکلیف ما لا یطاق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ویسی بات ہے کہ اس میں شہوت کو مرکب کیا ہے اور اس کو امر فرمایا ہے کہ اس پر غالب ہو، کیونکہ اس کو وہ قدرت دی ہے، جس کے سبب سے قمعِ شہوت و ترکِ عجلت کی طاقت رکھتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یوں فرمایا ہے کہ اول اللہ پاک نے انسان کی مذمت کی افراطِ عجلت پر اور بیان فرمایا کہ وہ اس پر مطبوع و مخلوق ہوا ہے۔ پھر اس کو منع کیا اور ڈانٹا۔ گویا یوں فرمایا کہ عجلت طلب کرنا اس سے کوئی نئی بات نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو اس پر مجبول ہے اور وہ اس کی طبیعت و خصلت ہے۔ اس لیے کہ عجلت اس میں مرکب کی گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کو استعجال سے منع کیا، حالانکہ وہ اس پر پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا یہ ویسی بات ہے کہ اس کو قمعِ شہوت کا امر فرمایا ہے، حالانکہ شہوت کو اس میں مرکب کیا ہے۔ یہ منع اس واسطے ہے کہ اس کو وہ قوت عطا کی ہے، جس سے قمعِ شہوت و ترکِ عجلت کی طاقت رکھتا ہے۔[2] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس مضمون کو ایک مختصر فقرے میں ادا فرمایا ہے کہ نہی اس شے سے جس پر اس کے نفوس پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ہے کہ نفوس کو ان کی مراد سے باز رکھیں۔[3]

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۳۹ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۴۰

اور وہ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو یہ (عذاب یا قیامت کا) وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ (38) کاش! کافر اس وقت کو جان لیں جب وہ اپنے چہروں سے آگ نہیں ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی (39) بلکہ وہ (قیامت) اچانک ہی انھیں آلے گی، وہ ان کے ہوش کھو دے گی، پھر وہ اسے ٹال نہ سکیں گے اور نہ انھیں مہلت ہی دی جائے گی (40)

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ٨١) (2) تفسير النسفي (٣/ ٨٠ـ ٨١) (3) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٤)

مشرکوں کا عذاب کو جلدی طلب کرنے کا بیان:

اللہ تعالیٰ مشرکوں کے حال کی خبر دیتا ہے کہ وہ ازراہِ تکذیب، جحود، انکار، کفر، عناد اور استبعاد اپنے اوپر عذاب واقع ہونے کی بہت عجلت چاہتے ہیں۔ پس کہا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا... الخ﴾ یعنی اگر وہ یقین کر لیں اس بات کا کہ لامحالہ اُن پر عذاب واقع ہونے والا ہے تو اس کو جلدی طلب نہ کریں اگر وہ جانیں اس وقت کو کہ ڈھانک لے گا اُن کو عذاب اُن کے اوپر سے اور اُن کے پاؤں کے نیچے سے۔ ﴿ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ﴾ [الزمر: ١٦] ''ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (بھی آگ کے) سائبان ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ﴾ [الأعراف: ٤١] ''ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا۔''

اس آیت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ ''جب وہ اپنے چہروں سے آگ نہیں ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں سے۔'' اور دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے: ﴿ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ [إبراهيم: ٥٠] ''ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے، اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپتی ہوگی۔'' غرضیکہ ساری جہتوں سے عذاب اُن کو گھیرے ہوئے ہے۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے کہ اُن کو اس بلا سے چھڑائے، جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴾ [الرعد: ٣٤] ''اور انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا کوئی نہیں۔'' ﴿ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً ﴾ کے معنی ''فجأة'' ہیں، ناگہاں آگ اُن کے پاس آجائے گی، ﴿ فَتَبْهَتُهُمْ ﴾ پھر وہ اُن کو ڈرائے گی تو وہ حیران ہوتے ہوئے اسی کے مطیع اور فرماں بردار ہو جائیں گے۔ گردن رکھ دیں گے، نہ جانیں گے کہ کیا کریں۔ ﴿ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا ﴾ یعنی اس میں اُن کو کوئی حیلہ و تدبیر نہ ہوگی۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ یعنی یہ عذاب گھڑی بھر اُن سے موخر نہ ہوگا۔[1] كذا في ابن كثير.

پہلے گزر چکا ہے کہ آیات میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ تھا کہ مراد نقمات و مواعیدِ الٰہی ہیں آخرت میں آگ کے عذاب کے ساتھ۔ لہٰذا یہی قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ اس پر دال ہے، یعنی ٹھٹھا مذاق کرنے والے کہتے ہیں کہ جس وعدۂ عذاب کا تم ہم سے کہتے ہو اس کا حصول کب ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں وعدے سے مراد قیامت ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2] امام نسفی اور بیضاوی رحمہما اللہ نے دو قول ذکر کیے ہیں: ایک تو وعدۂ عذاب اور دوسرا یہی قول۔[3] ﴿ مَتٰى ﴾ خبر مقدم ہے محلِ رفع میں،

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٣٩۔ ٢٤٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٤) [3] تفسير النسفي (٣/ ٨١) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٤)

بعض اہلِ کوفہ کا یہ زعم ہے کہ محلِ نصب میں ہے۔ بنا برظرف اور عامل اس میں فعل مقدر اس کا رافع ہے۔ تقدیر یہ ہے: "متی یجیئ ھذا الوعد" یا "متی یأتي" اور مثل اس کے قول اول مشہور ہے۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ اور مومنین کو جو کہ آیاتِ قرآنی پڑھتے ہیں کہ کون سی آیات جو قیامت کی آمد کا عذاب کے قریب آنے سے ڈراتی ہیں، یعنی اے گروہِ مومنین! اگر تم اپنے وعدے میں سچے ہو تو کب ہوگا؟ یہ بات بطورِ مذاق و استہزا کہی۔ اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ یہ بات اپنی جہالت اور غفلت کی وجہ سے کہتے ہیں۔

پھر جو اُن مذاق کرنے والوں کو حاصل ہوگا اس کا بیان فرمایا، پس کہا: ﴿ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا... الخ﴾ جملۂ مستأنفہ ہے اس میں اس بات کا بیان ہے کہ جس شے کی اپنی جہالت کی وجہ سے جلدی چاہتے ہیں، اس کی ہولنا کی اور شدت انتہائی سخت ہے۔ صیغۂ مضارع کا شرط میں اس لیے اختیار کیا ہے گو معنی ماضی کے ہیں کہ عدمِ علم کے استمرار کا فائدہ دے، یعنی اس کو انھوں نے نہ جانا اور اُن کا یہ نہ جاننا مستمر ہے، ہمیشہ رہے گا۔ اور جواب "لَوْ" کا محذوف ہے، اس واسطے کہ وعید میں جواب کا حذف زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ لہٰذا امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ جواب یہ ہے کہ اگر وہ جان لیتے اس وقت کو کہ دفع نہ کر سکیں گے اپنے منہ سے آگ کو اور نہ اپنی پیٹھ سے تو کفر و استہزا و استعجال کی صفت پر نہ ہوتے، لیکن صرف اُن کی جہالت نے اس بات کو اُن کے نزدیک سہل و آسان و بے حقیقت کر دیا ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے یہ تقدیر کی ہے کہ وعید کی جلدی نہ چاہتے۔[1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: صدق وعدے کو جان لیتے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اگر اس کو جان لیتے تو کفر پر جمے نہ رہتے۔ حوفی نے کہا: البتہ مسارعت کرتے، یعنی ایمان کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ دوبارہ اُٹھائے جانے کی صحت کو جان لیتے۔[3] امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وقوع قیامت کے حق ہونے کی تنبیہ ہے، یعنی اگر وہ اس کو یقین سے جان لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ قیامت آنے والی ہے، اس پر ﴿ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً ﴾ دال ہے۔[4] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: یہ بات نہ کہتے:[5] یعنی ﴿ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ﴾ وجوہ اور ظہور، یعنی آگے پیچھے خاص کر اس لیے ذکر کیا کہ یہ دونوں جانب سب جانبوں سے زیادہ مشہور ہیں، اس بات میں کہ اُن دونوں کا احاطہ کرنے سے یہ لازمی ہے کہ سب جانبوں کا احاطہ کر لیا جائے، اس لیے کہ وہ تمام جانبوں میں سے کسی جانب سے اس کو دور کرنے کی قدرت نہ رکھیں گے۔

﴿ حِيْنَ ﴾ مفعول بہ ہے ﴿ يَعْلَمُ ﴾ کا، منصوب بنا برظرف نہیں ہے، یعنی اگر جان لیں کہ اس وقت آگ کو ہٹا نہیں سکیں گے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يَعْلَمُ ﴾ کو بغیر متعدی بنائے چھوڑ دیا جائے تو جائز ہے، اس معنی سے

---

[1] اللباب في علوم الکتاب (۱۳/ ۵۰۳) [2] معاني القرآن (۳/ ۳۹۲۔ ۳۹۳) [3] اللباب في علوم الکتاب (۱۳/ ۵۰۳)
[4] تفسیر القرطبي (۱۱/ ۲۹۰) [5] تفسیر الجلالین (۱/ ٤٢٤)

کہ اگر اس کے پاس علم ہوتا تو وہ اس چیز سے لاعلم نہ ہوتے، جس کی جلدی سے طلب کر رہے ہیں اور ﴿ حِیْنَ ﴾ منصوب بہ مضمر ہو، یعنی جس وقت نہ روک سکیں گے اپنے منہ سے آگ کو۔ جان لیں گے اس بات کو کہ وہ باطل پر تھے،[1] اس بنیاد پر کہ ﴿ حِیْنَ ﴾ منصوب ہے ظرف کی بنا پر، کیوں کہ علم کا مفعول "إِنَّهُمْ كَانُوْا" ٹھہرایا گیا ہے۔ شیخ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ﴿ یَعْلَمُ ﴾ کا مفعول محذوف ہے، اس واسطے کہ اس کا ماقبل اس پر دال ہے، یعنی "لو يعلم الذين كفروا مجيئ الموعود الذي سألوا عنه و استبطئوه" یعنی اگر کافر موعود کے آنے کو جانتے، جس کا سوال کیا اور اس کے آنے میں دیر سمجھے اور ﴿ حِیْنَ ﴾ منصوب ہے مفعول سے کہ وہ "مجيئ" ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ باب اعمال سے ہو، بنا بر حذف مضاف اور ثانی کا اہمال کیا جائے، معنی یہ ہیں: "لو يعلمون مباشرة النار حين لا يكفونها عن وجوههم" یعنی اگر وہ جان لیں آگ کے لگنے کو، جس وقت کہ اس کو روک نہ سکیں گے اپنے منہ سے۔ كذا في السمين. مظہر کو، یعنی ﴿ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾ کو بجائے مضمر یعنی "لو يعلمون" اس لیے رکھا، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ جو شے اس امر کا موجب ہوئی ہے کہ آگ نے اُن کو سب طرف سے گھیر لیا ہے، وہ یہی کفر ہے۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ یعنی قیامت میں آگ سے اُن کو کوئی نہ روکے گا نہ کوئی اُن کی مدد کرے گا کہ اس عذاب کو اُن سے دور کرے۔

اللہ پاک نے ﴿ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ﴾ میں کفار سے نقل کیا کہ وہ عذابِ موعود جلدی چاہتے ہیں اور بیان کیا کہ اس کا سبب اُن کو علم نہ ہونا ہے، وہ نہیں جانتے کہ وقتِ مقررہ کے آنے کے وقت کس قدر ہولناکی ہوگی اور اس میں کیسا سخت عذاب ہے۔ پھر سبب بیان کرنے سے اضراب و انتقال کیا اور عذابِ موعد کے واقع ہونے کی کیفیت بیان فرمائی۔ ﴿ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً ﴾ یعنی بلکہ وہ اچانک اُن پر آ جائے گا۔ فتح القدیر میں کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ یَكُفُّوْنَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی وہ اس کو روک نہ سکیں گے، بلکہ وہ "فجأة" ناگہاں ان کے پاس آ جائے گا۔ ضمیر اس میں عدہ، یعنی وعدے کی طرف پھرتی ہے، یا نار کی طرف، یا قیامت کی طرف۔[2] ﴿ بَغْتَةً ﴾ مفعول مطلق ہے غیر لفظ فعل سے، یا مصدر ہے موضع حال میں، یا حال ہے۔ کسی نے اس کو غین معجمہ کی زبر سے پڑھا ہے۔

﴿ فَتَبْهَتُهُمْ ﴾ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بهته بهتا أخذه بغتاً"، یعنی فلاں نے فلاں کو یکا یک پکڑ لیا۔[3] مصباح میں کہا: "بَهُتَ وَبَهِتَ"، باب "قَرُبَ وَ تَعِبَ" سے دہش و تحیر اور بحرکت ہا متعدی ہوتا ہے۔ "بهته يبهته بفتحتين"،[4] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اُن کو حیران کر دے گی۔[5] کسی نے کہا ہے کہ ناگہاں اُن کے پاس آ جائے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کو دہشت میں ڈال دے گی۔ دونوں فعلوں کو یائے تحتیہ کے ساتھ پڑھا

[1] الكشاف (٣/ ١١٩) [2] فتح القدير (٣/ ٥٥٨) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩٠)
[4] المصباح المنير (١/ ٦٣) [5] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩٠)

ہے، اس کی بنیاد پر ضمیر وعد وحین کی طرف راجع ہوگی۔ اسی طرح ﴿ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا ﴾ میں، کیونکہ "وعد" بہ معنی نار ہے یا "عدۃ" کی طرف اور "حین" بہ معنی ساعت ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نار کی طرف راجع ہو یا ﴿ بَغْتَةً ﴾ کی طرف۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴾ یعنی نہ اُن کو مہلت ملے گی نہ تاخیر دی جائے گی کہ توبہ وعذر کریں۔[4] كذا في فتح البيان وغيره۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات کا یاد دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو مہلت دے رکھی ہے۔[5]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٤١﴾ قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمْنَعُهُم مِّن دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُم مِّنَّا يُصْحَبُونَ ﴿٤٣﴾

اور (اے نبی!) بلاشبہ آپ سے پہلے بھی رسولوں سے استہزا کیا گیا، پھر جن لوگوں نے ان (رسولوں) سے تمسخر کیا، انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے (41) کہہ دیجیے: رات اور دن میں کون تمھاری نگہبانی کرتا ہے رحمٰن (کے عذاب) سے؟ بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہیں (42) کیا ہمارے سوا ان کے کوئی (اور) معبود ہیں جو انھیں ہم سے بچاتے ہوں؟ وہ تو خود اپنی جانوں کی بھی مدد کی طاقت نہیں رکھتے، اور نہ وہ ہم (ہمارے عذاب) ہی سے محفوظ ہیں (43)

تمسخر کرنے والوں کے لیے گذشتہ اقوام سے عبرت:

مشرک لوگ جو نبی اکرم ﷺ کو استہزا اور تکذیب سے تکلیف پہنچایا کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کی تسلی فرماتا ہے کہ تم اس سے رنجیدہ خاطر نہ ہو کہ وہ ٹھٹھا کرتے رہیں اور جھٹلاتے رہیں۔ تم سے پہلے اور پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو چکا ہے۔ پھر جن لوگوں نے اُن کی تکذیب کی اُن پر وہی عذاب نازل ہوا جس کے واقع ہونے کو وہ بعید خیال کرتے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ ﴾ [الأنعام: ٣٤] "اور (اے نبی!) بے شک آپ سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے گئے، تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف دیے جانے پر صبر کیا، حتی کہ ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی اور اللہ کے کلمات کو

(1) فتح البيان (٨/ ٣٢٨۔ ٣٢٩) (2) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٤)

کوئی بدلنے والا نہیں، اور یقیناً آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں آ چکی ہیں۔''

پھر اللہ پاک نے اپنی نعمت کا ذکر کیا، جس کا اس نے اپنے بندوں پر انعام فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ رات دن ان کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی آنکھ سے، جس کو اُونگھ اور نیند نہیں ہے، اُن کی حراست اور نگہبانی فرماتا ہے۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ﴾ یہاں کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ بہ معنی بدل ہے، یعنی تم کہہ دو کہ کون سوائے رحمٰن کے رات دن تمھاری حفاظت کرتا ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

جَارِيَةٌ لَّمْ تَلْبَسِ الْمُرَقَّقَا وَلَمْ تَذُقْ مِنَ الْبُقُوْلِ فُسْتُقَا

یعنی ایک لڑکی ہے کہ اس نے باریک کپڑا نہیں پہنا اور نہ چکھا بدلے ترکاری کے پستہ کو، یعنی وہ خاص بداوت پر باقی ہے شہر کے ناز و نعم کی اس کو ہوا تک نہیں لگی۔

﴿ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو اُن کو نعمت دی ہے اور جو احسان اُن پر کیا ہے، اس کا اقرار و اعتراف نہیں کرتے، بلکہ اس کی نشانیوں اور نعمتوں سے منہ پھیرتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ﴾۔ یہ استفہام انکار اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، یعنی اُن کے واسطے اور معبود ہیں کہ اُن کو ضرر سے روکتے ہیں اور اُن کی حفاظت کرتے ہیں سوائے ہمارے۔ بات اس طرح نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے وہم کیا ہے اور نہ جیسا کہ ان کا زعم ہے۔ اس لیے یوں فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ ﴾ یعنی یہ معبود جن پر انھوں نے تکیہ کیا ہے، غیر اللہ ہیں، وہ تو اپنی جانوں کی مدد کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، پھر بھلا کسی اور کی کیا خاک مدد کریں گے۔ ﴿ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴾۔ عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "أي يجارون" یعنی نہ وہ ہم سے پناہ دیے جائیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ان کو پناہ دے کر بچا لے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لا يصحبون من الله بخير" یعنی نہ وہ اللہ سے منع کیے جائیں گے کہ کوئی اور اللہ کے عذاب سے اُن کو بچائے۔[2] كذا في ابن كثير.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

جملہ ﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ نبی اکرم ﷺ کی تسلی و تعزیت کے لیے لایا گیا ہے، گویا یوں فرمایا کہ اگر اُن لوگوں نے تم سے ٹھٹھا اور مذاق کیا تو تم سے پہلے جو رسول تھے، باوجود اُن کی کثرتِ تعداد اور شرفِ شان کے اُن سے بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ ﴿ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ "حِيق" بابِ باع سے ہے، اس کے معنی نزول و احاطہ و دَور کے ہیں، صلہ اس کا بہ حرفِ با ہے، یعنی پھر احاطہ کیا یا

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٤٨۔ ٤٤٧) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٠)

نازل ہوئی اس کے سبب سے اُن لوگوں پر جنھوں نے رسولوں سے ٹھٹھا کیا وہ شے، جس کے ساتھ ٹھٹھا کرتے، اُن کا احاطہ کیا۔ یہ معنی تو اس بنا پر ہیں کہ ما موصولہ ہے یا مصدریہ۔ اس سے مراد استہزا کی جزا ہے، اس بنیاد پر کہ سبب کو مسبب کے بجائے رکھا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ نفسِ استہزا نے اُن کا احاطہ کیا۔ اگر اس سے عذابِ اخروی مراد لیا جائے، اس معنی کی بنیاد تجسمِ اعمال پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اعمالِ صالحہ وسیۂ اعراض ہیں، آخرت میں سب مجسم ہوں گے، مثلاً انبیا کے ساتھ مذاق کرنے کی بھی ایک مجسم صورت ہوگی، وہی صورت مذاق کرنے والوں پر نازل ہوگی، اُن کو گھیر لے گی، غرضیکہ اللہ پاک اپنے رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا وعدہ دیتا ہے کہ منکر لوگ جو کچھ اُن کے ساتھ کرتے ہیں، اس کا وبال اُن پر نازل ہوگا، جس طرح کہ اگلے نبیوں کے ساتھ ٹھٹھا کرنے والوں پر نازل ہوا۔

﴿قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ﴾ کلاءت کے معنی حراست وحفاظت ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "كلاءه الله كلاءة بكسر و مد" یعنی اللہ نے اس کی حراست وحفاظت کی۔ ابن ہرمہ کا قول ہے ؎

إن سليمى والله يكلأها ضنت بشيء ما كان يرزءها[1]

یعنی سلیمیٰ نے، اللہ اس کو محفوظ رکھے! ایسی شے کے ساتھ بخل کیا جو اس کا نقصان نہیں کرتی ہے، یعنی وصال۔

امام ابن جریر اور ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿يَكْلَؤُكُمْ﴾ کے معنی "يحرسكم" ہیں۔[2] امام کسائی اور فراء رحمہ اللہ نے "يكلؤكم" لام کی زبر اور واؤ کی جزم کے ساتھ حکایت کیا ہے۔[3] ﴿مِنَ الرَّحْمٰنِ﴾ میں مضاف مقدر ہے، یعنی "بأس و عذاب"۔ معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر! تم ان ٹھٹھا کرنے والوں سے دھمکی اور ڈانٹ کے ساتھ کہو کہ کون رات کے وقت تمھاری حفاظت کرتا ہے، جب تم سو جاتے ہو اور دن میں جب تم اپنے معایش کی طرف جاتے ہو تو اللہ کے عذاب سے تمھاری حفاظت کرتا ہے، اس عذاب سے جس کے تم مستحق ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا معنی یہ ہیں کہ رحمٰن کے عذاب سے تمھاری کون حفاظت کرتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس شے سے جس کو دنیا اور آخرت کی عقوبات میں سے تم پر بھیجنے کا اللہ ارادہ کرتا ہے، کون تمھاری حفاظت کرتا ہے۔[4] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: "من أمر الرحمن" موضع نصب میں ہے۔ ﴿يَكْلَؤُكُمْ﴾ اس کا عامل ہے۔ نظیر اس کا "يحفظونه من أمر الله" ہے۔[5]

یہاں اللہ پاک کو رحمٰن کے نام سے ذکر فرمایا۔ لہٰذا اس میں تنبیہ ہے کہ اُن کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں سوائے اس کی رحمتِ عامہ کے اور عذاب کا دور رہنا اللہ پاک کی مہلت سے ہے، یعنی اس نے بمقتضائے رحمتِ عامہ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٤٦) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٤٦) الدر المنثور (٥/ ٦٣١) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩١)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٥٩) [5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩١٨)

مہلت دے رکھی ہے کہ عذاب نازل نہیں کرتا۔ رہی یہ بات کہ لیل کو نہار سے پہلے رکھا، پس اس لیے کہ رات کو اکثر بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ ﴿ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی وہ تو اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ پھیرتے ہیں، پس نہ اس کو یاد کرتے ہیں نہ ہی اس کا خیال اپنے دل میں لاتے ہیں، بلکہ اس سے منہ موڑتے ہیں، یا قرآن شریف سے، یا اللہ پاک کے مواعظ و نصائح سے، یا اس کی معرفت سے۔

﴿ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ﴾۔ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی "بل" ہے اور ہمزہ اضراب و انتقال کے واسطے ہے اگلے کلام سے، جس میں بیان تھا کہ اللہ پاک جو اُن کی حفاظت کرتا ہے، وہ اس سے جاہل ہیں۔ اب اس امر سے اضراب کر کے اُن کو دھمکی دی اور ڈانٹا اس بات پر کہ انھوں نے ایسوں پر اعتماد کیا ہے، جو اپنی ذات کے نفع سے اور اس سے ضرر کو دور کرنے سے عاجز ہیں، یعنی بلکہ کیا اُن کے لیے اور معبود ہیں کہ ہمارے عذاب سے روکیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أم لهم آلهة من دوننا تمنعهم"۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اس مقام میں خلاصہ مرام نہایت اچھی تقریر سے ادا فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے جب یہ بات بیان فرمائی کہ جو بات اگلے لوگوں کو پہنچی، ویسی ہی عن قریب ضروری اُن لوگوں کو بھی پہنچے گی تو یہ بیان فرمایا کہ اگلوں کی طرح اُن کو عذاب کا جلد نہ پہنچنا صرف اس لیے ہے کہ اُن کو اپنی رحمتِ عامہ کے تقاضا کے تحت محفوظ رکھا ہے۔ ایک مدت تک اُن کو مہلت دے رکھی ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو حکم فرمایا کہ اُن سے پوچھیں کہ حفاظت کرنے والا کون ہے، تاکہ وہ اقرار کریں اور متنبہ ہو جائیں، اس بات پر کہ وہ اس کے قبضے میں ہیں اور استہزا سے باز آ جائیں۔

پھر اس امر سے اس قول کے ساتھ اضراب فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم ان کو چھوڑ دو، اُن سے اس بات کا سوال مت کرو، کیوں کہ وہ اس کی لیاقت نہیں رکھتے، اس لیے کہ اللہ کے ذکر سے اعراض کرتے ہیں، لہٰذا اپنے دل میں اس کا خیال نہیں لاتے، تاآنکہ ان کو اللہ کا خوف دلایا جائے۔ پھر جب اُن کو اللہ کے عذاب سے حفظ ملا تو وہ پہچان لیں کہ اللہ ہی حافظ ہے اور وہ اس بات کے قابل ہوں کہ اللہ کا اُن سے سوال کریں۔ پھر اس بات سے اضراب فرما کر وہ بات بیان کی، جو پہلی بات سے زیادہ اہم تھی اور وہ یہ ہے کہ اُن پر اس امر میں انکار کیا، جس کا اُن کو زعم ہے کہ اُن کے واسطے اور معبود ہیں، جو اُن کی مدد کرتے ہیں، ان کو عذاب سے منع کرتے ہیں اس قسم کا منع کرنا کہ وہ ہمارے منع کرنے اور حفاظت سے زیادہ ہوتا ہے، یعنی اُن کی حفاظت ہماری حفاظت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس قول کی بنیاد اس پر ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ مصدر محذوف کی صفت ہے اور جس کی طرف "دُوْن" مضاف ہے، وہ بھی محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "تمنعهم منعا كائنا من دون منعنا أي من غير

منعنا" امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ دُوْنِنَا ﴾ صفت ہے آلہہ کی۔ "أي آلهة من دوننا تمنعهم" یعنی ایسے معبود کہ ہمارے سوا ہیں ان کو منع کرتے ہیں، عذاب سے بچاتے ہیں، رات دن کی آفات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اُن کے اُن معبودوں کا، جن کو انھوں نے اپنا ناصر و مددگار سمجھ رکھا ہے، ایسی شے کے ساتھ وصف کیا، جو کہ اُن کی کمزوری اور عاجزی پر دال ہے۔ پس فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ ﴾ یعنی وہ تو اپنے نفس کی مدد سے بھی عاجز ہیں تو پھر کسی اور کی مدد کیسے کریں گے۔ ﴿ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴾ یعنی اور نہ کفار ہمارے عذاب سے پناہ دیے جائیں گے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ پناہ دے گا اُن کو ہم سے کوئی اس لیے کہ مجیر صاحبِ جار ہے۔ عرب بولتے ہیں: "صحبك الله أي حفظك و أجارك" اسی باب سے شاعر کا قول ہے ؎

ينادي بأعلىٰ صوته متعوذا ليصحب منا والرماح دواني

یعنی بہ آواز بلند پناہ پکڑتا ہوا پکارتا ہے، تا کہ ہم سے پناہ دیا جائے، حالانکہ نیزے قریب ہو رہے ہیں۔ عرب لوگ بولتے ہیں: "أنا لك جار و صاحب من فلان" یعنی میں اس سے تجھ کو پناہ دینے والا ہوں۔ ماذنی نے کہا کہ یہ اس محاورے میں ماخوذ ہے: "أصحبت الرجل إذا منعته" یعنی تو کسی شخص کو منع کرے تو کہے: "أصحبت الرجل"۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "ينصرون أي يحفظون"[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "لا يصحبهم الله بخير ولا يجعل رحمته صاحبا لهم"[3] یعنی اللہ پاک خیر کے ساتھ اُن کا صاحب نہ ہوگا نہ اپنی رحمت کو ان کا ہم راہی کرے گا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ جملہ ﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ... الخ ﴾ مستأنفہ ہے۔ ماقبل کے انکار کی تقریر کرتا ہے اور اُن کے اعتقاد کے بطلان کو واضح کرتا ہے، یعنی وہ اپنی جانوں کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ ہی ہماری مدد اُن کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ پھر کیوں وہم کیا جائے کہ وہ اپنے غیر کی مدد کریں گے۔[4] اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ضمیریں آلہہ کی طرف راجع ہیں۔ تفسیر مدارک و بیضاوی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے[5] اور علامہ محلی رحمہ اللہ نے پہلی ضمیر آلہہ کی طرف اور دوسری کفار کی طرف راجع کی ہے۔[6]

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿44﴾ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ڮ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿45﴾ وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٥٩) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٤٨) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩٢)
[4] تفسير أبي السعود (٦/ ٦٩) [5] تفسير النسفي (٣/ ٨١۔ ٨٢) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٥) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٤)

لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ
الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ
مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿٤٧﴾

بلکہ ہم نے انھیں اور ان کے باپ دادا کو فائدہ دیا، حتیٰ کہ ان پر (مدت) عمر لمبی ہوگئی، کیا پھر وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک ہم زمین کو اس کے اطراف سے گھٹاتے آتے ہیں (کفر سمٹ رہا ہے) کیا پھر بھی وہی غالب آنے والے ہیں 44 کہہ دیجیے: بس میں تو تمھیں وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں، اور بہرے پکار کو نہیں سنتے جب وہ ڈرائے جائیں 45 اور البتہ اگر انھیں آپ کے رب کے عذاب کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی چھو جائے تو وہ ضرور کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی! بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے 46 اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا تو ہم اسے (تولنے کے لیے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں 47

مشرکوں کی گمراہی اور فریب خوری:

اللہ پاک مشرکوں کے حال کی خبر دیتا ہے کہ جس گمراہی میں وہ ہیں اس پر ان کو اسی بات نے مغرور اور آمادہ کیا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں خوب نعمتیں دیے گئے، یعنی برتنے کا ساز و سامان اور عیش و عشرت کا سامان خوب ملا اور اسی حالت میں جس میں وہ ہیں، اُن کی عمریں دراز ہوگئیں تو یہ اعتقاد کر بیٹھے کہ وہ کسی شے پر ہیں، یعنی باوجود کفر و شرک کے ایک لمبی عمر عیش و آرام اور ناز و نعمت میں بسر ہوئی تو سمجھ لیا کہ ہم بھی کچھ ہیں جبھی تو ہمیں عیش و عشرت کا ایسا ساز و سامان ملتا جاتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اُن کو نصیحت کی کہ ﴿ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ﴾۔ مفسرین نے اس کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ہم اس کو سورۃ الرعد میں ذکر کر آئے ہیں۔[1] سب سے بہتر اور خوب تر یہ ہے کہ اللہ پاک کے اس قول پاک کے ساتھ تفسیر کی جائے: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٧] ''اور البتہ تحقیق ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں، تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں۔''

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس سے کفر پر اسلام کا ظہور یعنی غلبہ مراد ہے۔[2] معنی یہ ہیں کہ کیا پس یہ عبرت نہیں پکڑتے ہیں، اس بات سے کہ اللہ فتح و نصرت دیتا ہے اپنے دوستوں کو اپنے دشمنوں پر اور جھٹلانے والی اُمتوں اور ظالم بستیوں کو ہلاک کر دیتا ہے اور اپنے ایمان دار بندوں کو نجات دیتا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَفَهُمُ

---

[1] رقم الآیة (٤١) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٤١)

﴿ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ وہ مغلوب، اسفل، اخسر و ارذل ہیں، یعنی اس نے تو بڑی بڑی زبردست، زور آور، مال دار بستیوں کا ناس کر ڈالا، اُن کے مقابلے میں ان کی کیا ہستی ہے۔ ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ﴾ یعنی جس عذاب وسزا کا میں نے تم کو ڈر سنایا، پس میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا پہنچانے والا ہوں۔ یہ نہیں ہے مگر اسی شے سے، جس کی اللہ نے میری طرف وحی کی ہے، لیکن اللہ نے جس شخص کے دل کی بینائی کو اندھا کر دیا ہے اور اس کی ہیئے کی آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں اور اس کے کانوں اور دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہے، اس کو یہ نفع نہ دے گا، اسی لیے یوں فرمایا:

﴿ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ ... الخ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اُن جھٹلانے والوں کو اللہ کا عذاب ذرا سا چھو جائے تو مقرر اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں اور اس بات کا بھی کہ بے شک وہ دنیا میں اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾۔ قسط سے مراد عدل و انصاف ہے۔ اکثر اس پر ہیں کہ ترازو صرف ایک ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کو صیغۂ جمع کے ساتھ ذکر کیا ہے، لہٰذا یہ ان اعمال کے اعتبار سے ہے، جو اس میں تولے جائیں گے۔

﴿ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾۔

جس طرح اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے ﴿ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٩] ''اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔'' اور لقمان علیہ السلام نے کہا: ﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ١٦] ''اے میرے (پیارے) بیٹے! بے شک اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو اور وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں اور زمین کے اندر کہیں بھی ہو تو اللہ اسے نکال لائے گا، بلاشبہ اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ کلمات:

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ »[1]۔ یعنی دو کلمے ہیں زبان پر ہلکے، ترازو میں بھاری، رحمٰن کو پیارے: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٤)

امام احمد نے ابوعبد الرحمٰن جبلی سے روایت کیا ہے کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ عزوجل قیامت کے دن سب کے رو برو میری اُمت میں سے ایک خاص شخص کو منتخب کرے گا، پھر اس پر ایک کم سو سجل (دفتر) کھولے گا، یعنی پھیلائے گا۔ ہر سجل حدِ نگاہ تک ہوگا، پھر فرمائے گا: کیا تو انکار کرتا ہے اس سے کہ میرے کاتبین حافظین نے تجھ پر کسی قسم کا ظلم کیا ہے؟ کہے گا: نہیں، یا رب! فرمائے گا: کیا پھر تیرا کوئی عذر ہے یا کوئی نیکی ہے؟ فرمایا: پس وہ آدمی حیران ہوگا تو کہے گا: اے رب! نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بے شک ہمارے نزدیک تیری ایک نیکی ہے، آج تجھ پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوگا۔ پھر اس کے لیے کاغذ کا ایک بطاقہ (پرزہ، ٹکڑا) نکالا جائے گا، اس میں "أشهد أن لا إله إلا الله و أن محمدا رسول الله" ہو گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس شخص کو حاضر کرو، پس وہ کہے گا: اے رب! یہ بطاقہ ان سجلات (دفاتر) کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، فرمایا: وہ سجلات ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں گے اور بطاقہ ایک پلڑے میں، فرمایا: پھر وہ سجلات ہلکے ہو جائیں گے اور بطاقہ بھاری ہو جائے گا۔ پھر فرمایا: ﴿ وَلَا يَثْقُلُ شَيْءٌ مَعَ اسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ یعنی کوئی شے اللہ کے نام کے ساتھ بھاری نہیں ہوتی۔[1] (رواه الترمذي و ابن ماجة من حديث الليث بن سعد و قال الترمذي حسن غريب)

حدیث شریف کے الفاظ: ﴿ يَسْتَخْلِصُ رَجُلًا ﴾ ہیں۔ مجمع البحار میں اس کی شرح یہ لکھی ہے: "أي استخصه و اختاره"۔[2] سجلات سجل کی جمع ہے، زیر اور تشدید کے ساتھ، اس کے معنی بڑی کتاب کے ہیں؛ بطاقہ چھوٹے رقعے کو کہتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر کی اصل میں "اسم الله الرحمن الرحيم" ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ﴿ تُوْضَعُ الْمَوَازِيْنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ یعنی قیامت کے دن ترازو رکھی جائے گی، پھر ایک شخص لایا جائے گا، پھر وہ ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور وہ چیز رکھی جائے گی، جو اس پر شمار کی گئی ہے تو ترازو اس کو لے کر جھک پڑے گی، فرمایا: وہ نار کی طرف بھیجا جائے گا۔ فرمایا: پھر اس کو لے کر پیٹھ پھیریں گے کہ اچانک رحمٰن عزوجل کی طرف سے ایک پکارنے والا کہتا ہے کہ جلدی نہ کرو اس کا ایک بطاقہ باقی رہ گیا ہے۔ پھر ایک بطاقہ لایا جائے گا اس میں لا إله إلا الله ہوگا، پھر وہ اس آدمی کے ساتھ ایک پلڑے میں رکھا جائے گا، یہاں تک کہ ترازو اس کو لے کر جھک پڑے گی۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک شخص آپ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٠) مسند أحمد (٢/ ٢١٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٥)

[2] مجمع بحار الأنوار (١/ ١٨٣) [3] مسند أحمد (٢/ ٢٢١)

کے رو برو بیٹھا۔ پھر عرض کی: یا رسول اللہ! میرے غلام ہیں، مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں، مجھ سے میری خیانت کرتے ہیں، میری نافرمانی کرتے ہیں اور میں اُن کو مارتا ہوں، اُن کو گالی دیتا ہوں۔ لہٰذا میں اُن کے ساتھ کیسا ہوں؟ پس رسول اللہ ﷺ نے اُس سے فرمایا کہ حساب کیا جائے گا اس شے کا جس کی انھوں نے تیری خیانت کی اور تیری نافرمانی کی اور تجھ سے جھوٹ بولے اور اُن پر جو تو نے سزا وغیرہ دی، پھر اگر تیرا عقاب اُن کے گناہوں کے برابر ہوگا تو وہ کافی ہو جائے گا، نہ تیرے لیے کچھ (اجر) ہوگا اور نہ تجھ پر کچھ (بوجھ) ہوگا۔ اگر تیرا عتاب اُن کو ان کے گناہوں سے کم ہوگا تو تیرے لیے فضل وکرم ہوگا اور اگر تیری سزا اُن کو اُن کے گناہوں سے بڑھ کر ہوگی تو اُن کے لیے اس کا فضل ہوگا اور تجھ سے قصاص لیا جائے گا، جو کہ تیری طرف باقی رہا ہے۔ پس وہ آدمی رسول اللہ ﷺ کے سامنے رونے لگا اور چلانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا ہے تو اللہ کی کتاب کو نہیں پڑھتا: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ ... الخ﴾؟ پھر وہ آدمی بولا: یا رسول اللہ! نہیں پاتا ہوں میں کوئی شے بہتر اُن کی جدائی سے، یعنی اس کے غلام، میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ وہ سب آزاد ہیں۔[1] كذا في ابن كثير.

اللہ پاک جب بتوں کی نفع رسانی کو باطل کر چکا کہ وہ کسی طرح اپنے پوجنے والوں کو نفع نہیں پہنچا سکتے ہیں، جیسا کہ مشرکوں نے وہم کیا کہ وہ جس حفظ وحمایت میں ہیں، وہ اس طریقے سے کہ اُن کے معبود اُن کو محفوظ رکھتے ہیں، عذاب اور سزا کو ان تک پھٹکنے نہیں دیتے تو اس سے اضراب اور انتقال فرما کر یہ بات بیان فرمائی کہ ان کا خیر و عافیت میں ہونا اور حیاتِ عاجلہ سے فائدہ اٹھانا خاص اللہ پاک کی طرف سے ہے۔ اس کے سوا اور کسی مانع کی طرف سے نہیں ہے کہ وہ اُن کو ہلاک ہونے سے روکے اور نہ کسی ناصر کی طرف سے ہے کہ اسبابِ تمتع پر اُن کی مدد اور اعانت کرے۔ پس فرمایا: ﴿ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ﴾ گویا یوں کہا گیا کہ مکے کے مشرکوں نے جو یہ زعم کیا ہے کہ اپنے معبودوں کی حفاظت کے سبب سے محفوظ ہیں۔ اے پیغمبر! تم اس بات کو چھوڑو، بلکہ جس حفظ وحمایت میں اُن کی بسر ہو رہی ہے، وہ صرف ہماری طرف سے ہے، ہم نے ان کو تکلیف اور ہلاکت سے محفوظ رکھا ہے اور اُن پر طرح طرح کے سرور اور نعمتیں برسائی ہیں اور اُن کو دنیا کی حیات کے برتنے کا ساز وسامان دیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہے کہ ہمارے ہاں اُن کی کچھ قدر ومنزلت ہے یا جو کفر وشرک کر رہے ہیں، وہ ہم کو پسند ہے، بلکہ یہ صرف ہماری طرف سے مہلت ہے کہ یہ عیش وآرام میں خوب غرقاب ہو جائیں، پھر یہی استدراج اور انہماک ان کو ہمیشہ کے عذاب کی طرف پہنچا دے۔ اس عیش وعشرت پر ان کو یہاں تک مہلت ملی کہ ان کی عمریں دراز ہو گئیں اور زمانہ ممتد گزرا تو وہ مغرور ہو گئے اور گمان کر بیٹھے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور سمجھ لیا کہ یہ فوائد اور اِمہال (مہلت) ان کے کفر کے سبب سے ہے، جس پر وہ جمے ہوئے ہیں، پس اللہ پاک نے اُن پر

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦٥) مسند أحمد (٦/ ٢٨٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٠۔ ٢٤٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٨٠)

اس بات کا رد فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کیا ہے، یہ اُن کی جھوٹی آرزو ہے۔

﴿ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ﴾ یعنی کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اس بات کو جان لیں کہ ہم کفار کی زمین کا قصد کرتے ہیں اور اس کو اس کے کناروں سے کم کرتے ہیں، اس طریقے سے کہ مسلمانوں کو اس پر مسلط کرتے ہیں اور اُن کو اس کے لوگوں پر غلبہ دیتے ہیں اور اس کو دارالاسلام بناتے ہیں۔ شہر کے بعد دوسرا شہر، زمین کے بعد دوسری زمین فتح کرتے چلے آتے ہیں، کسی کو قتل کرتے ہیں، کسی کو قید کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس شے کو مسلمانوں کے ہاتھوں پر جاری کرتا ہے اس کی یہ تصویر بیان فرمائی ہے۔ اس انداز سے کہ "إِنَّا نَنْقُصُ الْأَرْضَ مِنْ أَطْرَافِهَا" نہ کہا، ﴿ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ ﴾ زیادہ فرمایا، زمین کے نقص اور تخریب کی کیفیت کی تصویر کشی کے لیے، کیوں کہ یہ دونوں باتیں مسلمانوں کے لشکر آنے اور داخل ہونے سے ہوتی ہیں۔ وہی مشرکین کی زمین پر چڑھائی کرتے ہیں، اس کے کناروں کو کم کرتے چلے آتے ہیں۔ اصل عبارت یوں ہے: "تَأْتِي جُيُوشُ الْمُسْلِمِينَ" لیکن اللہ پاک نے اُن کی تعظیم کے لیے اُن کے آنے کو اپنی ذاتِ مقدس کی طرف منسوب کیا، گویا ہم آتے ہیں۔ یا ان کا آنا اللہ پاک کی قدرت سے ہے، اس لیے اپنی طرف اس کی نسبت کی۔ اس میں مجاہدین اور جہاد کی تعظیم ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ سورت مکی ہے اور جہاد ہجرت کے بعد فرض ہوا ہے تو یہ تقریر کیسے درست ہوگی؟ لہٰذا امام سیوطی رحمہ اللہ نے اتقان میں کہا ہے کہ یہ آیت اس صورت میں سے مستثنیٰ ہے۔ سورۃ الرعد میں اس آیت پر پوری تقریر گزر چکی ہے۔[1]

﴿ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴾ میں استفہام بمعنی تقریع (دھمکی) و انکار ہے اور حرفِ فا واسطے عطف کے ہے، جیسا کہ اس کے نظائر میں ہوا کرتا ہے، یعنی وہ کس طرح غالب ہوں گے اس کے بعد کہ ہم نے ان کی زمین کو اس کے اطراف سے کم کر دیا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ ہی غالب ہوں گے اور اُن کے اصحاب اور کافر مغلوب ہوں گے۔ جب اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ جس عذاب کے آنے کی کفار جلدی چاہتے ہیں، اس کی ہولناکی اور دہشت انتہائی سخت ہے اور اس کے آ جانے کے وقت اُن کا حال بہت برا ہوگا اور وہ اس سے جاہل ہیں، اس کو جانتے نہیں ہیں اور اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرتے ہیں، کون سا رب؟ جو اُن کو رات اور دن کے حوادث و آفات سے بچاتا ہے اور اس کے سوا اُن کے اور بد احوال کا ذکر کیا، یہ سب بیان کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ کو اس بات کا حکم دیا: ﴿ قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ ﴾ یعنی تم اُن سے کہہ دو کہ میں جو تم کو قیامت سے ڈراتا ہوں، جس کی تم جلدی چاہتے ہو۔ لہٰذا یہ وحی سے ہے، اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے، میں اسی کی طرف سے ڈراتا ہوں، یہ میری طرف سے نہیں ہے، یہی میرا حال ہے اور اسی کا اللہ نے مجھ کو حکم کیا ہے۔

---

[1] رقم الآية (٤١)

فتح البیان وغیرہ کا بیان:

فتح البیان و فتح القدیر و مدارک میں ﴿بِالْوَحْيِ﴾ کی تفسیر "بالقرآن" کی ہے۔[1] ﴿وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاۗءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ﴾ محلی رحمہ اللہ نے اس میں دو قراءتیں لکھی ہیں: ایک بہ تحقیق ہر دو ہمزہ۔ دوسری یہ ہے کہ دوسرے ہمزہ کی تسہیل درمیان ہمزہ اور درمیان حرفِ یا کے۔[2] یا تو یہ اس کلام کے تتمہ سے ہے، جس کا نبی اکرم ﷺ کو امر فرمایا ہے کہ کفار سے کہیں یا وہ کلام تمام ہو چکا اور یہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے فرماتا ہے، معنی یہ ہیں کہ جس شخص کے کانوں کو اللہ پاک نے بہرا کر دیا اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا وہ پکارنے کو نہیں سنتا ہے۔ ﴿الصُّمُّ﴾ میں الف و لام جنس کے واسطے ہے، یعنی بہروں کی کوئی جنس ہوں پکار کو نہیں سنتے۔ پس جو لوگ یہاں مخاطب ہیں وہ بدخولِ اولیٰ اس میں داخل ہوں گے، یا واسطے عہد کے ہے۔ اس صورت میں خاص انھیں مخاطبین کی طرف اشارہ ہوگا۔

اصل کلام یوں ہے: "وَلَا يَسْمَعُوْنَ إِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ"، ضمیر کی جگہ اسم ظاہر، یعنی ﴿الصُّمُّ﴾ کو رکھا، تاکہ اُن کے بہرے پن پر دلالت کرے اور اس بات پر کہ جب ڈر سنائے جاتے ہیں تو اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں اور بہرے بننے کی ان پر تسجیل اور پختگی کی جائے، چونکہ ڈرانے کو سنتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے تو مثل بہروں کے ہیں۔ انموذج میں کہا ہے کہ اللہ پاک نے کیسا فرمایا کہ بہرے پکارنے کو نہیں سنتے جبکہ وہ ڈرائے جائیں، حالانکہ وہ تو پکارنے کو اس وقت بھی نہیں سنتے، جب اُن کو خوش خبری دی جائے۔ پھر تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ﴿الصُّمُّ﴾ میں ان "مُنْذَرِيْنَ" کی طرف اشارہ ہے، جن کا ذکر ﴿قُلْ اِنَّمَاۗ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ﴾ میں ہو چکا ہے۔ سو لام عہد کا ہے جنس کا نہیں ہے۔ اگر لام جنس کا ٹھہرے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے تو تخصیص کی کیا وجہ ہوگی؟ تو تفسیر بیضاوی میں یوں کہا ہے کہ ﴿اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ﴾ کا ناصب ﴿يَسْمَعُ﴾ ہے یا دعا اور تقیید اس کے ساتھ، یعنی دونوں تقدیر پر اس لیے ہے کہ گفتگو انذار میں ہے یا واسطے مبالغے کے ہے، اُن کے بہرے بننے اور دلیری کرنے میں،[3] یعنی وہ انتہا درجے کے جری اور دلیر ہیں کہ اُن کو کتنا ہی ڈراؤ دھمکاؤ، وہ نہیں سنتے، بہرے بنتے ہیں۔

امام ابو عبد الرحمٰن سلمی و محمد بن سمیفع نے ﴿وَلَا يَسْمَعُ﴾ کو یائے تحتیہ کی پیش اور میم کی زبر کے ساتھ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے اور ابن عامر و ابو حیوہ و یحییٰ بن حارث نے بتائے فوقیہ مضمومہ و کسرِ میم بابِ افعال سے پڑھا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ تم پکار بہروں کو نہ سناؤ گے۔ ابو علی فارسی نے کہا ہے کہ اگر ایسا ہوتا، جیسا ابن عامر نے کہا ہے تو "إِذَا مَا تُنْذِرُهُمْ" ہوتا، اس لیے کہ نظم کلام حسین ہو جاتا۔ پھر جب ﴿اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ﴾ ہے تو حسین

---

[1] فتح البیان (٨/ ٣٣٢) فتح القدیر (٣/ ٥٦١) تفسیر النسفي (٣/ ٨٢)
[2] تفسیر الجلالین (١/ ٤٢٤)
[3] تفسیر البیضاوي (٤/ ٩٥)

یہ ہے کہ عامہ کی قراءت کا اتباع کیا جائے۔ ایک قراءت "یُسْمِعُ" بیائے تحتیہ باب افعال سے ہے اور ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے۔ باقی قاریوں نے بفتح یا وفتح میم و رفع ﴿ الصُّمُّ ﴾ بنا برفاعل ونصب ﴿ الدُّعَآءَ ﴾ پڑھا ہے۔[1] سمین میں ہے کہ ابن عامر نے اس جگہ "وَلَا تُسْمِعُ" بضم تائے خطاب وکسر میم ونصب ﴿ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ﴾ پڑھا ہے اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی طرح سورۃ النمل اور سورۃ الروم میں پڑھا ہے اور ساتوں میں کے باقی قاریوں نے سارے قرآن میں بفتح یائے تحتیہ ومیم ورفعِ صم ونصبِ دعا پڑھا ہے۔ جب اللہ پاک نے کفار کو عذاب کے آنے کی خبر دی تو اب اس کے چھونے کا ذکر کیا۔[2]

پس فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ ... الخ ﴾. "نفحہ" سے مراد قلیل ہے، یعنی ادنیٰ شے، ماخوذ ہے نفح مسک سے، ابن کیسان کا یہی قول ہے۔ اس بارے میں کسی شاعر کا قول ہے: ؎

وَ عَمْرَةُ مِنْ سَرَوَاتِ النِّسَاءِ　　　تَنَفَّحُ بِالْمِسْكِ أَرْدَانُهَا

یعنی عمرہ عورت سردار عورتوں کے زمرے سے ہے، اس کی آستینوں سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "النفحة الدفعة من الشيء التي دون معظمه" محاورے میں بولتے ہیں، جب کوئی شخص کسی شخص کو تلوار سے ضربِ خفیف لگائے تو کہتے ہیں: "نفحه بالسيف نفحة".[3] کسی نے کہا ہے کہ "نفحہ" کے معنی نصیب ہیں، یعنی حصہ۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی طرف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وقعہ خفیف، یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس میں تین مبالغے ہیں: ایک تو مس کا ذکر کیا، جس کے معنی چھو جانے کے ہیں۔ دوسرے "نفحہ" فرمایا، جس میں معنی قلت کے ہیں، کیوں کہ اصل "نفح" کی کسی شے کی بو کا اُڑنا ہے۔ تیسرے، صیغہ ایسا ذکر کیا جو کہ مرہ پر دال ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر تیرے رب کے عذاب سے کمتر سے کمتر شے اُن کو چھو جائے تو البتہ کہیں: اے ہماری ہلاکت وخرابی! بے شک ہم ہی تھے ظالم، یعنی ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کر کے اور شرک کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ادنیٰ سا عذاب آ لگے تو ویل و ہلاک پکارنے لگیں اور اپنی جان پر ظلم کا اقرار کر لیں۔ جس شے کا کفار کو ڈر سنایا اس کے آنے کے وقت جو اُمور واقع ہوں گے اللہ پاک نے ان کا بیان فرمایا کہ: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ ﴾ یعنی ہم ترازوئیں حاضر کریں گے۔

"موازین" میزان کی جمع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بہت سی میزانیں ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ایک میزان مراد ہو۔ اس کی تعبیر بہ لفظ جمع اس کی تعظیم کے لیے، یا اس کے اجزا کے اعتبار سے کی گئی، کیونکہ صحیح قول یہی ہے کہ وہ ایک میزان ہے تمام اُمتوں اور تمام اعمال کے لیے۔ اس سے نامۂ اعمال تولے جائیں گے۔ میزان کی صفت میں جو کچھ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، وہ کافی ہے۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ الکہف میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔[4]

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٥)　[2] فتح القدير (٣/ ٥٦١)　[3] فتح القدير (٣/ ٥٦١)

[4] سورة الأعراف: رقم الآية (٨) سورة الكهف: رقم الآية (١٠٥)

پھر موازین کی صفت ذکر فرمائی۔ ﴿ اَلْقِسْطَ ﴾ یہ مصدر ہے بہ معنی عدل۔ مبالغے کے لیے موازین کو اس کے ساتھ موصوف کیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قسط" مصدر ہے، مفرد و جمع کی صفت میں آتا ہے۔ میزانِ قسط و موازینِ قسط دونوں طرح بولتے ہیں۔ یا مضاف محذوف ہے: "أي ذوات القسط" یعنی وہ موازین عدل و انصاف والے ہوں گے۔ کسی نے قسط کو بصادِ مہملہ و طائے مہملہ بھی پڑھا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موازین کی صفت قسط کے ساتھ اس لیے کی کہ میزان کبھی مستقیم ہوتی ہے اور کبھی غیر مستقیم۔ لہٰذا اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ یہ میزانیں مستقیم ہیں، حدِ عدل پر جاری ہوتی ہیں۔[1]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ میزان ایک جسمِ مخصوص ہے، اس کی ایک زبان ہے، دو پلڑے ہیں، ایک عمود ہے۔ ہر پلڑے کی مسافت کا اندازہ مشرق اور مغرب کے درمیانی فاصلے کا ہے۔ اس کی جگہ جنت و نار کے درمیان ہے۔ اس کا داہنا پلڑا حسنات کے لیے ہے، جو کہ عرش کے دائیں جانب ہے اور بایاں پلڑا سیئات کے لیے ہے، جو عرش کے بائیں طرف ہے۔ جبریل علیہ السلام اس کا عمود پکڑیں گے، اس حال میں کہ اس کی زبان کی طرف نظر کرتے ہوں گے اور میکائیل علیہ السلام اس پر امین ہوں گے، جن اور انسان اس پر حاضر ہوں گے، اس کا وقت بعد حساب کے ہے۔ رہی اس کے جسم کی ماہیت کہ وہ کس جوہر سے ہے اور وہ اب موجود ہے یا آیندہ موجود ہوگی، لہٰذا ہم اس کی تعیین سے باز رہتے ہیں۔ اور وزن ہر ایک کے حق میں نہیں ہوگا، اس لیے کہ جس پر حساب نہیں ہے، اس کا وزن بھی نہ ہوگا، جیسے انبیا علیہم السلام اور ملائکہ کرام۔ جن اور انس میں سے جو مکلّف ہیں، ان کے لیے وزن ہوگا اور کبھی خود بندہ تولا جائے گا، جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہوا ہے کہ البتہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا پاؤں ترازو میں زیادہ بھاری ہوگا کوہِ اُحد سے۔[2] یہ بات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نہایت درجہ قصیر (چھوٹے) تھے، لہٰذا آپ نے اُن کی فضیلت سے آگاہ فرمایا کہ دنیا میں تو یہ خفت (ہلکا پن) اور آخرت میں وہ ثقل (بھاری پن)۔ اور جس شخص کا کوئی بچہ مرا ہوگا تو وہ بچہ ترازو میں رکھا جائے گا اور میزان کی کیفیت ثقل و خفت میں ویسی ہوگی جیسی دنیا میں ہوتی ہے۔

﴿ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾ میں مضاف محذوف ہے، یعنی ہم موازینِ عادلہ قائم کریں گے روزِ قیامت کی جزا کے لیے، یا اہلِ قیامت کے واسطے۔ یا لام بہ معنی "في" ہے، یعنی روزِ قیامت میں، جس طرح یہ محاورہ ہے: "جئت لخمس خلون من الشهر" یعنی میں پانچ راتوں میں آیا جو گزر گئیں مہینے سے۔ پھر فرمایا: ﴿ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ﴾ ﴿ شَيْـًٔا ﴾ مفعول ثانی ہے ﴿ تُظْلَمُ ﴾ کا، یعنی اس میزان میں ایسے عدل و انصاف سے پورا تولا جائے گا کہ ظلم نہ کیا جائے گا کوئی نفس کسی چیز کا، اس کے حق میں کچھ کم نہیں کرے گا، یعنی نہ اس کی کوئی نیکی کم ہوگی نہ کوئی بدی زیادہ ہوگی۔ یا ﴿ شَيْـًٔا ﴾ مفعول مطلق ہے، یعنی کوئی نفس کسی طرح کا ظلم نہ کیا جائے گا۔ پھر اس عدمِ ظلم کی

---

[1] تفسير الخازن (٤/ ٢٩٦) [2] مسند أحمد (١/ ٤٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٥٠)

تفصیل فرمائی: ﴿ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ﴾۔ ﴿ كَانَ ﴾ ناقصہ ہے، اسم اس کا ضمیر مستتر ہے، عمل کی طرف پھرتی ہے، اگرچہ عمل لفظاً مذکور نہیں ہوا، لیکن وضع موازین اس پر دلالت کرتا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے، کیونکہ میزان کا قائم کرنا اعمال کے تولنے ہی کے لیے ہے۔ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ظلامه" کی طرف راجع ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بہتر ہے، اس لیے کہ ﴿ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ﴾ پہلے گزر چکا ہے اور مثقال کے معنے میزان و مقدار کے ہیں،[1] منصوب ہے بنا بر خبر ﴿ كَانَ ﴾ اور ﴿ مِّنْ خَرْدَلٍ ﴾ باعتبار متعلق صفت ہے ﴿ حَبَّةٍ ﴾ کے، "أي حبة كائنة من خردل" یعنی اگر وہ عمل رائی کے دانے کے برابر ہوگا تو ہم اس کو بھی حاضر کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ گو وہ عمل انتہائی درجہ قلیل و حقیر ہوگا تو بھی ہم اس کو لے آئیں گے، کیونکہ رائی کا دانہ کم سے کم چیز کی مثال ہے۔ جمہور کی قراءت وہی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ نافع اور شیبہ اور ابوجعفر نے برفع مثقال پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ تامہ ہے، یعنی اگر ﴿ مِثْقَالَ حَبَّةٍ ﴾ واقع ہوگا یا پایا جائے گا تو ہم اس کو لے آئیں گے۔ جمہور نے ﴿ اَتَيْنَا بِهَا ﴾ کو بقصر پڑھا ہے اور حرفِ با واسطے تعدیہ کے ہے، یعنی ہم اس کو حاضر کریں گے اور اس کو لے آئیں گے، تاکہ اس پر جزا دیں اور ﴿ بِهَا ﴾ کی ضمیر "حبه خردل" کی طرف راجع ہے، یا مثقال کی طرف باعتبار مضاف الیہ کے، یعنی ہم حاضر کریں گے دانۂ خردل کے موزون کو۔ امام مجاہد اور عکرمہ رحمہ اللہ نے "آتینا" بمد پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اس کے معنی "جازينا بها" ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "آتی، يُواتي مواتاة، جازى"[2] تیسری قراءت "أثبنا بها" ہے ثواب سے۔ چوتھی "جِئنا بها" ہے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ یعنی محصین۔ اصل میں حسب کے معنی شمار کرنا ہیں اور احصا بھی شمار کرنے کو کہتے ہیں، یعنی ہم بس ہیں شمار کرنے کو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی عالمین ہیں، کیوں کہ جو شخص کسی چیز کا شمار کرتا ہے تو وہ اس کا عالم و حافظ ہوتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کے معنی عالمین حافظین لکھے ہیں اور اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ مجازین یعنی جو خیر و شر انھوں نے آگے بھیجا ہے، ہم اس پر جزا دینے کو کافی ہیں۔ اس سے غرض ڈرانا ہے، کیوں کہ جس وقت حساب لینے والا علم میں ایسا ہے کہ کوئی شے اس پر مشتبہ ہونے کا امکان نہ ہو اور وہ قدرت میں ایسا ہے کہ کسی چیز سے عاجز نہیں ہے تو عقل مند کو چاہیے کہ ایسی ذات پاک سے بہت زیادہ خوف کھائے اور اس سے لرزاں رہے۔

حکایت:

امام شبلی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ان کو کسی نے خواب میں دیکھا، پوچھا: اللہ نے تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا: ؎

[1] فتح القدير (٣/ ٥٦١۔ ٥٦٢) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩٤) [3] تفسير النسفي (٣/ ٨٣)

حاسبونا فدققوا ثم منوا فأعتقوا وكذا كل مالك بالمماليك يرفق[1]

یعنی ہم سے حساب لیا تو اس میں خوب باریکی و دقت کی، پھر احسان کیا تو آزاد کر دیا اور اسی طرح ہر مالک اپنے غلاموں کے ساتھ نرمی کرتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس اجمال کی تفصیل شروع کی، جس کا ذکر اس قول کے شروع میں گزر چکا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾ اور دس قصے ذکر کیے: پہلے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ، پھر ابراہیم علیہ السلام کا، پھر لوط علیہ السلام کا، پھر نوح علیہ السلام کا، پھر داود علیہ السلام کا اور سلیمان علیہ السلام کا، پھر ایوب علیہ السلام کا، پھر اسماعیل علیہ السلام کا، پھر ادریس علیہ السلام کا، پھر ذوالکفل علیہ السلام کا، پھر یونس علیہ السلام کا، پھر زکریا علیہ السلام کا، پھر مریم علیہا السلام اور اُن کے فرزندِ ارجمند عیسیٰ علیہ السلام کا۔ پس فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۸ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ۝۴۹ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۰

اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان (تورات) اور روشنی عنایت کی اور (ان) متقین کے لیے نصیحت (دی) 48 جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے بھی ڈرنے والے ہیں 49 اور یہ (قرآن) بابرکت ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، کیا پھر تم اس کے منکر ہو؟ 50

نزولِ تورات و قرآن:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے اس بات پر تنبیہ گزر چکی ہے کہ اللہ پاک موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اُن دونوں کی کتابوں کے ذکر کے درمیان قران فرماتا ہے، یعنی قرآن شریف میں اکثر ان دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے ساتھ یا آگے پیچھے آتا ہے، اس لیے اس سورت میں بھی یوں فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرقان سے مراد کتاب ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تورات۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد تورات کا حلال و حرام ہے اور وہ شے ہے، جس نے حق و باطل کے درمیان فرق ظاہر کر دیا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نصر ہے۔[2] نصر کو فرقان اس لیے کہا کہ دوست اور دشمن کے درمیان فرق کر دیتی ہے۔ اس بارے میں جامع بات یہ ہے کہ آسمانی کتابیں ایسی تعلیمات پر مشتمل ہیں، جو حق و باطل کے فرق کو ظاہر کرتی ہیں اور ہدایت اور گمراہی کے فرق کو اور سرکشی اور ہدایت کے فرق کو اور حلال و حرام کو ایسی شے پر جو کہ

[1] تفسير الخازن (٤/ ٢٩٧) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٥٣) الدر المنثور (٥/ ٦٣٤)

دونوں میں نور اور ہدایت اور خوف اور رجوع الی اللہ اور خشیت پیدا کر دے۔ اس لیے فرمایا: ﴿ اَلْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی پرہیز گار لوگوں کے واسطے نصیحت اور وعظ ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی صفت بیان فرمائی: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ﴾ [قٓ: ٣٣] ''جو رحمٰن سے بن دیکھے ڈر گیا اور وہ رجوع کرنے والا دل لے آیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ [الملك: ١٢] ''بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔'' ﴿ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ قیامت سے خائف و وجل و ترساں ولرزاں رہتے ہیں۔ پھر قرآن شریف کے حق میں فرمایا: ﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ یعنی ایک بابرکت ذکر ہے جس کو ہم نے نازل کیا، مراد قرآنِ عظیم ہے، کون سا قرآن، جس کے نہ آگے سے باطل آتا ہے نہ پیچھے سے۔ وہ حکیم حمید کے پاس سے اُتارا ہوا ہے۔ ﴿ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴾ پس کیا تم اس کا انکار کرتے ہو، حالانکہ وہ انتہائی روشن اور ظاہر ہے۔ یعنی اس کی ساری باتیں کھلی ہوئی ہیں۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ ایسی واضح اور ظاہر شے کا انکار کیا جائے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام ابن زید رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ فرقان سے مراد حق ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مراد دشمنوں پر کامیابی ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ ﴾ [الأنفال: ٤١] ''اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا۔'' امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول ظاہر آیت کے ساتھ زیادہ تر مشابہ ہے، اس قول کی بنا پر ﴿ وَضِيَآءً ﴾ سے مراد تورات ہوگی[3] اور جس نے کہا کہ فرقان سے مراد تورات ہے تو اس نے ﴿ وَضِيَآءً ﴾ کے واؤ کو زاید ٹھہرایا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے دی موسیٰ کو تورات روشنی۔ امام سعید بن منصور اور ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ یوں پڑھتے تھے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ضِيَآءً ﴾[4] اس قول پر فرقان حال ہوگا فرقان سے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی بغیر واؤ پڑھا ہے۔ امام فرا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واو کا حذف کرنا اور لانا ایک بات ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا کہ واو معنی کے واسطے ہوتا ہے پس وہ زیادہ نہیں کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرقان سے مراد فلقِ بحر ہے۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ تینوں، یعنی فرقان وضیاء اور ذکر تورات ہیں۔ پس وہ فرقان ہے، یعنی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے اور ضیاء ہے۔ اس سے روشنی لی جاتی ہے، یعنی جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں، اور اس کے سبب سے راہِ نجات کی طرف پہنچتے ہیں اور ذکر ہے، یعنی شرف

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٤٢)　[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٤٥٣)　[3] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٩٥)
[4] الدر المنثور (٥/ ٦٣٤)　[5] تفسیر القرطبي (١١/ ٢٩٥)

ہے، یا وعظ وتنبیہ ہے، یا اس شے کا ذکر ہے جس کے لوگ محتاج ہیں، اپنے دینی مصالح میں یہاں صفتوں پر واؤ داخل ہوا ہے، جس طرح اس آیت میں ﴿ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [آلِ عمران: ٣٩] ''اور سردار اور پارسا اور نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا۔'' مطلب یہ ہے کہ یہ آیتِ بابِ عطفِ صفات سے ہے، اُن سے مراد ایک ہی شے ہے، یعنی ہم نے اُن کو ایک ایسی کتاب دی، جو کہ ان تینوں باتوں کی جامع ہے، چونکہ اس سے متقی لوگ ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں، اس لیے خاص اُن کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾

پھر اُن کی صفت بیان کی۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ محلِ جر میں ہے بنا بر صفت، یا موضع نصب و رفع میں ہے بنا بر مدح۔ ﴿ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾۔[1] تفسیر بیضاوی میں ہے: حال ہے فاعل سے یا مفعول سے،[2] یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اس سے غائب ہیں، اس کو دیکھا نہیں ہے، یا اس حال میں کہ وہ اُن سے غائب ہے۔ یہ صفت اس لیے ذکر کی کہ یہ خشیت تقوے کا لازمی حصہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موصول متقین کا بدل ہو، یا اس کا بیان ہو۔ ﴿ بِالْغَيْبِ ﴾ حال ہے فاعل ﴿ يَخْشَوْنَ ﴾ سے، یعنی وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، اس حال میں کہ غائب ومنفرد ہونے والے ہیں لوگوں سے، یعنی خلوت وتنہائی میں اس کا خوف رکھتے ہیں، جس وقت لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہوتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ ڈرتے ہیں اپنے رب سے اس حال میں کہ وہ اس عذاب سے غائب ہیں، کیوں کہ وہ تو دنیا میں ہیں اور عذاب آخرت میں ہے۔ یا حال ہے عذاب سے، یعنی اس حال میں کہ وہ عذاب اُن سے غائب ہے۔

﴿ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴾ یعنی وہی متقی لوگ قیامت کی ہولناکیوں اور سختیوں سے خائف رہتے ہیں۔ من جملہ ذکرِ خاص بعد العام ہے، کیونکہ اللہ کے عذاب سے ڈرنے کا پہلے ذکر ہو چکا، اس میں قیامت بھی آ گئی، پھر جو اس کا علاحدہ ذکر کیا، پس اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ قیامت اعظم مخلوقات ہے، اس واسطے اس کا ذکر علاحدہ مستقل طور پر کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کفار تو قیامت کی جلدی چاہتے ہیں اور متقی لوگ اس سے خائف ہیں، لہٰذا اُن کی صفت اُن کی صفت کی ضد ہے، چونکہ اس بات پر تصریح کرنا منظور تھا، اس لیے قیامت کا ذکر مستقل کیا۔ رہی یہ بات کہ قیامت کے خوف کو جملہ اسمیہ کے پیرایہ میں ادا کیا، پس اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے خوف کا ثابت اور دائمی ہونا معلوم ہو، کیوں کہ جملہ اسمیہ ثبات و دوام کے لیے آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ متقی لوگ قیامت سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں، کسی حال میں اس کا خوف اُن کے دلوں سے جدا نہیں ہوتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ ضمیر یعنی ﴿ هُمْ ﴾ کو شروع میں لائے اور حکم کی بنا اس پر کی کہ اس میں مبالغہ وتعریض ہے،[3] مبالغہ اس لیے کہ جملہ اسمیہ بھی مؤکدات میں سے ہے، یعنی اس سے معلوم ہوا کہ جو متقی ہیں، وہی قیامت سے ڈرتے ہیں اور کوئی نہیں ڈرتا

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٣) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٦) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٦)

اور کافر لوگ اس کو جلدی چاہتے ہیں۔

﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ ﴾ اشارہ ہے قرآن شریف کی طرف۔ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ ﴾ قرآن ہے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن اس شخص کے واسطے ذکر ہے جو اس سے نصیحت پکڑے اور موعظت ہے اس کے لیے جو اس سے متّعِظ ہو، یعنی نصیحت پذیر ہو۔ ﴿ مُّبٰرَكٌ ﴾ کے معنی ہیں: بہت زیادہ خیر اور برکت،[2] یعنی قرآن بڑی ہی خیر و برکت کی چیز ہے۔ ﴿ هٰذَا ﴾ اشارہ قریب کے لیے آتا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفارِ مکہ پر اس کا اخذ کرنا آسان ہے، یعنی یہ قرآن جو تم میں سے ایک شخص پر اترا ہے اور تمھاری زبان میں ہے۔ ﴿ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ ذکر کی دوسری صفت ہے، یا خبر بعد خبر ہے۔

﴿ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴾ میں استفہام واسطے انکار کے ہے، اس لیے کہ ان سے انکار واقع ہو چکا ہے، یعنی اے اہلِ مکہ! تم اس کا کس طرح انکار کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اللہ کے پاس سے نہیں اترا باوجود اس کے کہ تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ تورات اللہ کے پاس سے نازل ہوئی ہے۔ امام محلی اور بیضاوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ استفہام ڈانٹنے کے لیے ہے۔[3] مطلب یہ ہے کہ تم تو اہلِ زبان ہو، کلام کے مزایا اور لطائف کو خوب سمجھتے ہو۔ قرآن کی بلاغت کو ایسے سمجھتے ہو کہ تمھارے علاوہ اور نہیں سمجھ سکتا، باوجود اس کے اس میں تمھارا شرف اور تمھاری نیک نامی ہے، چنانچہ اس کی طرف لفظِ ﴿ ذِكْرٌ ﴾ اشارہ کر رہا ہے، پھر اگر تمھارا غیر اس کا انکار کرتا تو تم کو یہ لائق تھا کہ اس سے لڑتے جھگڑتے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ خود تم ہی خاص قرآن کا انکار کرو اور یہود کی کتاب کا انکار نہ کرو، کیونکہ جب کوئی مشکل ان کو پیش آتی تو اس میں یہود کی طرف رجوع کرتے تھے، یہ تخصیص جار مجرور، یعنی لہ کی تقدیم سے معلوم ہوتی ہے۔ پھر اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝﴿51﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝﴿52﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝﴿53﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴿54﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۝﴿55﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٤٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٤) (2) فتح القدير (٣/ ٥٦٢)

(3) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٥) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٦)

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۵۶

اور بلاشبہ اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی دانائی دی تھی اور ہم اسے خوب جاننے والے تھے (51)
جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ کیا مورتیاں ہیں جن کے لیے تم مجاور (بنے بیٹھے) ہو؟ (52)
وہ کہنے لگے: ہم نے اپنے باپ دادا کو انھی کی عبادت کرتے ہوئے پایا (53) اس (ابراہیم) نے کہا: بلاشبہ تم
اور تمھارے باپ دادا کھلی گمراہی میں (پڑے ہوئے) ہو (54) انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے
یا تو کھیلنے والوں میں سے ہے؟ (55) اس (ابراہیم) نے کہا: بلکہ تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے
جس نے انھیں پیدا کیا اور میں اس پر (تمھارے سامنے) گواہی دینے والوں میں سے ہوں (56)

ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ:

اللہ تعالیٰ اپنے خلیل جلیل علیہ السلام کے حال کی خبر دیتا ہے کہ اس نے اُن کو نیک راہ دی پہلے سے، یعنی لڑکپن ہی سے اُن کو حق کا الہام کیا اور اُن کی قوم پر اُن کو حجت کا الہام کیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ﴾ [الأنعام: ۸۳] ''اور یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔'' تمام خبروں میں سے جو یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ اُن کے باپ نے اُن کو سرنگ میں داخل کیا اور وہ شیر خوار تھے، کئی دنوں کے بعد نکلے تو انھوں نے ستارے اور دوسری مخلوقات کی طرف نظر کی، پھر اُن میں اُن کو بصیرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ اور جو قصے مفسرین وغیرہم نے بیان کیے ہیں، وہ سب بنی اسرائیل کے قصے ہیں، اُن میں سے جو قصہ کہ حق کے مطابق ہے، کونسا حق؟ وہ حق جو کہ ہمارے نبیِ معصوم سے منقول ہے، ہم تو اس کو قبول کریں گے، اس لیے کہ وہ صحیح کے موافق ہے اور جو قصہ اس حق کے ذرا بھی خلاف ہوگا تو ہم اس کو رد کریں گے اور جو قصہ حق کے نہ موافق ہوگا اور نہ مخالف تو ہم نہ اس کی تصدیق کریں گے نہ تکذیب، بلکہ اس کو موقوف ٹھہرائیں گے اور ان قصوں میں سے جو اس قسم کا ہے تو سلف میں سے بہت لوگوں نے اس کے روایت کرنے میں رخصت دی ہے اور اس قسم میں سے بہت سے قصے اس جنس سے ہیں کہ اُن میں کسی طرح کا فائدہ نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ایسا حاصل ہے کہ اس سے دین میں کچھ نفع لیا جائے۔ اگر مکلفین کے دین میں اُن کا کسی قسم کا فائدہ ہوتا تو یہ شریعتِ کاملہ اور شاملہ اس کو ضرور بیان کر دیتی۔

اس تفسیر میں جو راہ ہم نے اختیار کی ہے، وہ یہی ہے کہ بہت سے اسرائیلی قصوں سے اعراض کرتے ہیں، کیونکہ اُن میں مفت وقت کا ضائع کرنا ہے اور اُن میں سے بہت سے قصے جھوٹ پر مبنی ہیں، کون سا جھوٹ؟ وہ جو اُن

پر رائج ہو جاتا ہے، اس لیے ان کے نزدیک صحیح اور غلط قصوں میں کوئی فرق نہیں، جس طرح کہ اس اُمت کے حفاظ متقن اماموں نے اس امر کو تحریر فرمایا ہے۔ مقصود اس جگہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی ہے کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی نیک راہ دی پہلے اس سے۔ اور ﴿ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ اس کے اہل تھے۔ پھر فرمایا: ﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾ یہ وہی رشد ہے جس کو وہ اپنے لڑکپن سے دیے گئے تھے کہ اللہ عزوجل کے سوا بتوں کی عبادت میں اپنی قوم پر انکار کیا، پس کہا: یہ کیا مورتیں ہیں، جن کی عبادت پر تم معتکف ہو رہے ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ نے بسندہ سعید بن طریف سے روایت کیا ہے۔ سعید اصبغ بن نباتہ سے روایت کرتے ہیں کہ اصبغ کا گزر ایک قوم پر ہوا، وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو اصبغ نے کہا: ﴿ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾ تم میں سے کوئی انگارے کو چھوئے، یہاں تک کہ وہ بجھ جائے، اس سے بہتر ہے کہ وہ شطرنج کو چھوئے۔[1]

﴿ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴾ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا جواب اُن کی قوم نے یہ دیا۔ سوائے گمراہ آباء و اجداد کے فعل کے اُن کے پاس اور کوئی حجت نہ تھی، اسی واسطے ابراہیم علیہ السلام نے یوں کہا: ﴿ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾۔ یعنی تمھارے باپ دادا کے ساتھ، جن کے فعل کی تم نے حجت پکڑی ہے، ویسی ہی گفتگو ہے، جیسی تمھارے ساتھ ہے، لہٰذا تم اور وہ سب گمراہ ہو، سیدھی راہ پر نہیں ہو۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کی عقلوں کو بے وقوفی اور حماقت کے ساتھ منسوب کیا اور اُن کے باپ دادا کو گمراہ ٹھہرایا اور اُن کے معبودوں کو حقیر و ذلیل اور بے حقیقت قرار دیا تو بولے: ﴿ اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴾ یعنی یہ بات جو تم سے صادر ہوئی ہے، اس کو تو کھلاڑی کے طور پر کہتا ہے یا اس میں تو سچا ہے، کیوں کہ ہم نے یہ بات تم سے پہلے نہیں سنی۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس کا یہ جواب دیا: ﴿ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ﴾ یعنی تمھارا پروردگار وہ ہے، جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور اسی نے مخلوقات کو بنایا ہے، جس کو وہ گھیرے ہوئے ہے، اسی نے ان کی پیدائش کی ابتدا کی ہے اور وہی ساری اشیا کا خالق ہے: ﴿ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ یعنی میں اس پر گواہ ہوں کہ اس کے سوا نہ کوئی اور رب ہے نہ معبود۔[2] كذا في ابن كثير.

''رشد'' سے مراد وہ رشد ہے، جو کہ ابراہیم علیہ السلام کی ذات برکت آیات کے لائق ہے اور ان کی طرح اور رسل کرام کو سزاوار ہے۔ ''رشد'' کی اضافت ان کی طرف اس لیے کی، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کا ''رشد'' انھیں کے مثل ہے اور اس کی ایک بڑی شان ہے۔ کسی نے اس کو ''رَشَد'' بہ فتحتین پڑھا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے، یعنی وہ

[1] شعب الإيمان (٥/ ٢٤١) البتہ مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٣۔ ٢٤٣)

رشدِ کامل راہ یابی ہے، ہدایتِ خاص خالص وحی کے ساتھ مستند ہے اور نوامیسِ الٰہیہ کا استعمال کر کے اصلاحِ اُمت پر اقتدار ہے۔ نوامیس ناموس کی جمع ہے۔ ناموس صاحبِ سر کو کہتے ہیں، جبریل علیہ السلام کو بھی کہتے ہیں، یہاں مراد اسرارِ الٰہیہ ہیں، جو کہ ملائکہ کے واسطے سے انبیا علیہم السلام کو بتلائے جاتے ہیں۔

﴿ مِنْ قَبْلُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو تورات دینے سے پہلے اُن کو رشد دیا گیا، یا نبی اکرم ﷺ سے پہلے، قرینۂ حال اسی پر دال ہے۔ تفسیر بیضاوی اور مدارک میں اسی طرح ذکر کیا گیا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان کے نبی ہونے یا اُن کے بالغ ہونے سے پہلے، اس لیے کہ انھوں نے یوں کہا: ﴿ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾[1] [الأنعام: ٧٩] ''بے شک میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی (اللہ) کا پرستار ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔'' امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کو قبل نبوت کے ان کی ہدایت کی، یعنی ہم نے ان کو نظر و استدلال کی توفیق دی، جبکہ ان پر رات آئی تو انھوں نے سورج چاند اور ستارے کو دیکھا۔[2] اکثر مفسر اسی قول پر ہیں۔ پہلے قول کے قائل کم مفسر ہیں۔ ﴿ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴾ میں ﴿ بِهٖ ﴾ ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہے، یعنی جو شے ہم نے اُن کو دی، وہ اس کے لائق ہیں، یا اچھے اور احسن اوصاف و خصال کے جامع ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ پاک کے فعل اختیار اور حکمت سے ہیں اور وہ جزئیات کا عالم ہے یا ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر رشد کی طرف پھرتی ہے اور جار مجرور عالمین سے متعلق ہے۔

﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ ﴾ کلمہ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف ہے ﴿ اٰتَيْنَآ ﴾ یا ﴿ رُشْدَهٗ ﴾ یا ﴿ عٰلِمِيْنَ ﴾ سے متعلق ہے یا موضع ﴿ مِنْ قَبْلُ ﴾ سے بدل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ باضمار "أعني" منصوب ہو، یا متعلق ہے، "اذکر" محذوف سے۔ "أَبٌ" سے مراد آذر ہے اور قوم سے مراد نمرود اور اس کے اتباع ہیں، یعنی اے پیغمبر! تم اُن کے اوقاتِ رشد میں سے اس وقت کو یاد کرو، جب انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے یہ بات کہی: ﴿ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾ تماثیل سے مراد اصنام ہیں۔ امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔[3] تمثال کی اصل یہ ہے کہ اللہ پاک کی مخلوقات میں سے کسی شے کے مشابہ کوئی شے بنائی جائے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مثلت الشيء بالشيء" جبکہ تو کسی شے کو کسی دوسرے شے کے ساتھ مشابہ کر دے اور جو شے مشابہ بنائی گئی، اس کا نام تمثال ہے۔ سمین نے یوں کہا ہے کہ تمثال وہ صورت ہے جو سفید نرم پتھر سے یا تانبے سے یا لکڑی سے کسی آدمی یا حیوان کی خلق کے مشابہ بنائی جاتی ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یوں فرمایا ہے کہ تماثیل وہ اصنام ہیں، جو کہ درندوں، پرندوں اور آدمی کی

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٧) تفسير النسفي (٣/ ٨٣) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩٦) [3] الدر المنثور (٥/ ٦٣٥)

صورت پر بنائے جاتے ہیں۔[1] کلمہ ﴿مَا﴾ سے سوال حقیقت کا ہوتا ہے یا شرح اسم کا، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام اُن کے بتوں کو خوب جانتے تھے کہ وہ پتھر کے ہیں یا لکڑی کے یا سونے کے۔ پس انھوں نے تجاہل کیا، گویا اُن کو جانتے ہی نہیں ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ اس سے غرض اُن کے بتوں کی تحقیر ہے اور وہ جو اُن کی تعظیم اور تکریم کرتے تھے، اس پر اُن کو جھڑکا ہے، کیوں کہ تمثال ایک بے روح صورت ہے، جو نہ نفع پہنچائے اور نہ نقصان، ایسی صورت کا پوجنا اور اس کی تعظیم کرنا کیا حماقت ہے۔

"عکوف" کسی شے پر استمرار کرنے کو کہتے ہیں، کسی غرض یا اغراض کی خاطر، پس وہ جو بتوں کی عبادت کرتے تھے اُن کی عبادت کو صرف "عکوف" سے تعبیر کیا، جس کے معنے مذکور ہوئے۔ اس میں بھی مقصود اُن کی حقارت اور ذلت ہے، یعنی یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم لگے بیٹھے رہتے ہو۔ مطلب یہ کہ جو معاملہ تم اُن سے کرتے ہو وہ ہرگز اس کے قابل نہیں ہیں، یہ صرف تمھاری بیوقوفی ہے۔ ﴿لَهَا﴾ میں لام اختصاص کے لیے ہے تعدیہ کا نہیں ہے، کیوں کہ "عکوف" کا تعدیہ "علیٰ" سے ہوتا ہے، معنی یہ ہیں کہ تم خاص انھیں بتوں کے واسطے عکوف کرنے والے ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لام بہ معنی "علیٰ" ہو، یا عکوف میں عبادت کا مفہوم بھی شامل ٹھہرایا جائے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ بہتر بت تھے۔ بعض سونے کے، بعض چاندی کے، بعض لوہے کے، بعض سیسے کے، بعض تانبے کے، بعض پتھر کے، بعض لکڑی کے اور اُن میں سے بڑا سونے کا جواہرات سے جڑا ہوا تھا، اس کی دونوں آنکھوں میں دو یاقوت چمکتے دمکتے تھے، رات کو اُن کی روشنی ہوتی تھی۔[2] غرضیکہ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا مقصد یہی تھا کہ اُن سے پوچھتے تھے کہ تم جو اُن کو پوجتے ہو تو اس کا کیا سبب ہے، یہ بت کیا ہیں، کیا پوجنے کے لائق ہیں؟ اس واسطے اُن کی قوم نے یہ جواب دیا کہ ﴿وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴾ یعنی ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا کہ اُن کو پوجتے تھے، ہم نے ان کی تقلید و پیروی کی، ہم بھی اُن کو پوجنے لگے۔

اُن سے سوائے تقلید کے اور کوئی جواب نہ بنا، یہی جواب ہر عاجز کا عصا ہے، جس پر وہ ٹیک لگاتا ہے اور ہر غریق کی رسی ہے، جسے وہ پکڑتا ہے اور یہ تمسک کرنا ہے مجرد تقلید آباء سے، یعنی ہم نے اپنے آبا کو پایا کہ ان کو پوجتے تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی اُن کی پیروی کرکے اُن کی چال چل کر اُن کو پوجا۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ یعنی تم اور تمھارے باپ دادے سب کے سب رشتۂ گمراہی میں پروئے ہوئے ہو، کون سی گمراہی؟ ایسی گمراہی کہ کھلی ہوئی ظاہر ہے، کسی عقل مند پر مخفی نہیں ہے، کیوں کہ نہ تمھارے پاس کوئی دلیل ہے نہ اُن کے پاس، پھر ایسی گمراہی سے بڑھ کر کون سی گمراہی ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقلید اگر جائز ہے تو اسی شخص کے لیے جو یہ بات جانے کہ فی الجملہ وہ حق پر ہے۔[3]

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٣) [2] تفسير الخازن (٤/ ٤٩٨) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٧)

﴿ اَنْتُمْ ﴾ کے ساتھ اس لیے تاکید کی کہ عطف درست ہو جائے، کیونکہ ایسی ضمیر پر عطف، جو حکم میں بعض فعل کی طرح ہے، ممتنع ہے۔ غرضیکہ ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ بات کہی تو اُن کی قوم نے گویا اپنے آبا کی گمراہی کو بعید سمجھا اور گمان کیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ کہا ہے، وہ بطورِ ملاعبت کہا ہے، اس لیے یوں کہا: ﴿ اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴾ یعنی یہ بات جو تم نے کہی، اس میں تم ہمارے پاس صدق لائے ہو، قصد کر کے کہتے ہو یا لعب کرتے ہو؟ مراد مجیٔ سے حقیقت مجیٔ نہیں ہے، کیونکہ وہ اُن سے غائب نہ تھے حاضر تھے اور کلمہ ام متصلہ ہے، اگرچہ اس کے بعد جملہ ہے، اس لیے کہ وہ مفرد کے حکم میں ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أي الأمرين واقع: مجيئك بالحق أم لعبك" رہی یہ بات کہ یہاں دو جملے ہیں: اول فعلیہ اور دوسرا اسمیہ ہے اور اسمیہ ثبات پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک بطور لعب کے کہنا راجح ہے، جب تو انھوں نے اس بات کو جملہ اسمیہ کے پیرائے میں ادا کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے اُن کے انکار کو ایک امرِ عظیم سمجھا اور اپنا گمراہی پر ہونا بعید جانا اور کہا کیا تم قصد کر کے کہتے ہو یا لعب کرتے ہو؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے اضراب کیا اور اُن کو خبر دی کہ میں سچ مچ کہتا ہوں، ہنسی نہیں کرتا ہوں، ملکِ علام کی ربوبیت کو اور اصنام کی ناپائیداری کو ثابت کرتا ہوں۔

پس فرمایا: ﴿ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ﴾ ﴿ هُنَّ ﴾ یہ ضمیر تماثیل کی طرف راجع ہے، اس کو زیادہ تر اُن کی گمراہی میں دخل ہے اور اُن پر حجت قائم کرنے میں، یعنی تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے بتوں کو پیدا کیا، مطلب یہ ہے کہ تم تو بتوں کو پوجتے ہو اور اُن کو رب جانتے ہو، حالانکہ وہ نہ رب ہیں نہ پوجنے کے لائق ہیں، وہ تو من جملہ مخلوقاتِ رب ہیں۔ رب وہی ہے جس نے زمین و آسمان اور ساری مخلوق کو پیدا کیا، پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ مخلوق کو پوجا جائے اور خالق کو چھوڑ دیا جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ هُنَّ ﴾ کی ضمیر سمٰوات و ارض کی طرف پھرتی ہے اور کلمہ ﴿ هُنَّ ﴾ اضراب ہے اس اعتقاد سے، جس پر انھوں نے اپنی گفتگو کی بنیاد رکھی تھی کہ بتوں کو الٰہ سمجھا تھا، گویا یوں کہا گیا کہ بات ایسی نہیں ہے، جیسی تم نے سمجھی ہے، بلکہ تمھارا رب وہی ہے، جو زمین و آسمان کا رب ہے، جس نے ان کو بنایا ہے۔

﴿ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ اور میں اس بات پر جس کا میں نے ذکر کیا شاہدین میں سے ایک شاہد ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ تمھارا رب ہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور اس کا ماسوا کوئی رب نہیں۔ میں اس کا تحقق کرنے والا یقین کرنے والا اور اس پر برہان لانے والا ہوں، بطور حقیقت کے اس کو جانتا ہوں، کیوں کہ کسی شے پر شاہد وہی شخص ہوتا ہے، جو اس کو خوب جانتا ہے، اس پر برہان قائم کرتا ہے، اس کو بیان کرتا ہے، اس پر یقین لاتا ہے۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾
فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾
قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا
سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا
بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ
فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ
كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾

اور اللہ کی قسم! تمھارے پیٹھ پھیر کر چلے جانے کے بعد میں ضرور بالضرور تمھارے بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا (57) چناں چہ اس نے ان کے بڑے (بت) کے سوا ان (سب) کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں (58) وہ کہنے لگے: کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ (حال) کیا ہے؟ بلاشبہ وہ ضرور ظالموں میں سے ہے (59) (بعض) کہنے لگے: ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے (60) انھوں نے کہا: پھر تم اسے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لے آؤ، تا کہ وہ دیکھیں (61) انھوں نے کہا: اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ (یہ کام) کیا ہے؟ (62) اس (ابراہیم) نے کہا: (نہیں) بلکہ یہ (کام) ان کے اس بڑے نے کیا ہے، لہٰذا تم ان سے پوچھ لو، اگر وہ بولتے ہیں (63)

ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کو پاش پاش کرنا:

یہ چال چلنا انھوں نے چپکے سے کہا، پھر جب وہ شہر گئے ایک میلے، میں تب بت خانے میں جا کر سب کو توڑا۔

خلیل جلیل علیہ السلام نے قسم کھائی اس طور پر کہ اپنی قوم میں سے بعض کو وہ قسم سنائی۔ قسم یہ تھی: "لیکیدن أصنامهم أي ليحرضن على أذاهم و تكسيرهم بعد أن يولوا مدبرين" یعنی البتہ برانگیختہ و آمادہ کریں گے، ان کی ایذا پر اور اُن کے توڑنے پر اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں گے، یعنی اپنی عید کی طرف۔ اُن کی ایک عید تھی، جس کی طرف شہر سے نکل کر جایا کرتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت اس عید کا وقت قریب آیا تو خلیل علیہ السلام کے والد نے کہا: بیٹا اگر تو ہمارے ساتھ ہماری عید کی طرف نکلے تو البتہ ہمارا دین تجھے پسند آ جائے، پس وہ اُن کے ہمراہ نکلے، پھر جب کچھ راستہ طے کیا تو انھوں نے خود کو زمین میں ایک طرف ڈالا اور کہا: میں بیمار ہوں۔ کسی شاعر نے اسی مضمون کو خوب نظم کیا ہے: ؎

اگر ترا بتماشای عید خود طلبند　　　خلیل دار بدیشان بگو کہ بیمارم

''اگر وہ اپنی تفریح کے تماشا کے لیے آپ کو بلاتے ہیں تو ان کو دوست رکھنے والوں سے کہہ دو کہ میں بیمار ہوں۔''

پھر لوگ اُن پر سے گزرنے لگے اور وہ گرے پڑے ہوئے تھے، اُن سے پوچھتے کہ کیا ہوا؟ تو وہ کہتے کہ میں بیمار ہوں، پھر جب ان میں سے عام لوگ گزر چکے اور ضعیف لوگ باقی رہ گئے تو خلیل علیہ السلام نے کہا: ﴿ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ﴾ لہٰذا اُن لوگوں نے اس بات کو سن لیا۔ ابن اسحاق نے ابو الاحوص عن عبد اللہ سے روایت کیا کہ ان لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے گزر کیا تو کہا: اے ابراہیم! تو ہمارے ساتھ کیوں نہیں نکلتا؟ تو وہ بولے کہ میں بیمار ہوں اور کل یہ بات کہہ چکے تھے کہ ﴿ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾۔ ان میں سے کئی آدمیوں نے اس کو سن لیا تھا۔[1] ﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا ﴾ کے معنی ''حُطَامًا'' ہیں۔ یعنی ان کو ریزہ ریزہ کر ڈالا، سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔ ﴿ اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ ﴾ مگر اُن کا بڑا بت جو اُن کے نزدیک تھا، اس کو نہیں توڑا، جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴾ [الصافات: ۹۳] ''پھر وہ انھیں دائیں ہاتھ سے مارتا ہوا متوجہ ہوا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴾ ذکر کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تیشہ کو بڑے بت کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا، شاید وہ اس بات کا اعتقاد کریں کہ بتوں کو توڑنے والا وہی بت ہے کہ اس نے اپنی ذات کے واسطے غیرت و حمیت کی کہ اس کے ساتھ یہ چھوٹے بت پوجے جائیں، اس پر اس نے اُن کو توڑ ڈالا۔ جس وقت وہ عید سے لوٹ کر آئے اور خلیل جلیل علیہ السلام نے جو معاملہ توہین اور ذلت کا اُن بتوں کے ساتھ کیا تھا، کون سا معاملہ؟ جو بتوں کی عدمِ الٰہیت اور بے چارگی پر اور اُن کے پوجنے والوں کی کم ظرفی اور اُن کی بے عقلی پر دال ہے، اس کا مشاہدہ کیا تو بولے: ﴿ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی جس شخص نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے، وہ بڑا ہی ظالم ہے۔ ﴿ قَالُوْا ﴾ یعنی جن لوگوں نے خلیل علیہ السلام کو اس بات کی قسم کھاتے سنا تھا کہ وہ ضرور کوئی چال چلیں گے، انھوں نے یہ کہا: ﴿ سَمِعْنَا فَتًى ﴾ یعنی ہم نے ایک جوان آدمی کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر کرتا ہے۔ ﴿ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ اس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا کہ نہیں بھیجا اللہ نے کوئی نبی مگر جوان اور نہیں دیا گیا علم کوئی عالم مگر حال یہ ہے کہ وہ جوان ہوتا ہے اور یہی آیت پڑھی۔ ﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴾۔[2]

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۴۳۔ ۲۴۴)　[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۴۵۵)

﴿ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ ﴾ یعنی بولے اس کو علی روس الاشہاد بڑے مجمع میں سارے لوگوں کے رو برو لے آؤ۔ خلیل علیہ السلام کا بڑا مقصد یہی تھا کہ ایسی بڑی محفل میں اُن لوگوں کی جہالت اور کم عقلی کو بیان فرمائیں، جو بتوں کے پوجنے میں ظاہر ہوتی ہے، کون سے بت؟ جو اپنی ذات سے کسی ضرر کو دور نہ کر سکیں اور نہ ہی کسی کی مدد اور نصرت کرنے کے قابل ہوں، پھر اُن سے کیوں کسی طرح کا فائدہ طلب کیا جائے یا کسی تکلیف کو دور کرنے کے لیے کہا جائے۔ ﴿ قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿62﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ ﴾۔ یعنی وہ بت جس کو چھوڑ دیا تھا توڑا نہ تھا۔ ﴿ فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ خلیل علیہ السلام کی اس قول سے یہی مراد تھی کہ وہ اپنی طرف سے جلد اس بات کا اقرار کر لیں کہ وہ بولتے نہیں ہیں اور یہ کام اس بت سے نہیں ہو سکتا، کیوں کہ وہ جمادات ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے تین توریے:

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ نہیں بولا، سوائے تین کے، دو تو اللہ کی ذات میں، یعنی اللہ پاک کے واسطے: قولہ ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ اور قولہ ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ اور ایک وقت وہ جا رہے تھے، کسی جابر بادشاہ کی سرزمین میں اور اُن کے ساتھ بی بی سارہ تھیں، ایک منزل میں اتر پڑے، پس ایک شخص اس جبار کے پاس آیا، اس نے کہا کہ اس جگہ تیری زمین میں ایک شخص اترا ہے، اس کے ہمراہ ایک انتہائی حسین عورت ہے، اس جبار نے خلیل علیہ السلام کی طرف آدمی بھیجا بلانے کے لیے، وہ آئے، جبار نے کہا کہ اس عورت سے تیرا کیا رشتہ ہے، خلیل علیہ السلام نے کہا: وہ میری بہن ہے۔ شاید اس جبار کی یہ عادت تھی کہ خاوند والی عورت سے تعرض کرتا، جب تو خلیل علیہ السلام نے بی بی کو تاویل کے ساتھ بہن کہا۔ جبار نے کہا: اب تو جا اور اس کو میرے پاس بھیج دے۔ خلیل علیہ السلام بی بی سارہ کی طرف چلے، اُن سے کہا کہ اس جبار نے مجھ سے تیرے بارے میں پوچھا تو میں نے اس کو خبر دی کہ تو میری بہن ہے، لہٰذا تو مجھے اس کے نزدیک جھوٹا نہ کرنا، کیوں کہ بے شک تو اللہ کی کتاب میں میری بہن ہے، زمین میں اس وقت سوائے میرے اور تیرے کوئی مسلمان نہیں ہے۔ پس ابراہیم علیہ السلام بی بی سارہ کو لے کر چلے، پھر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ جس وقت بی بی سارہ جبار پر داخل ہوئیں تو اس نے اُن کو دیکھا، اُن کی طرف جھکا، اُن کو لیا، یعنی ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ جبار سخت پکڑا گیا، یعنی اس کا گلا گھٹنے لگا، سانس بند ہوگئی، پاؤں مارنے لگا، جیسے مرگی والا پاؤں مارنے لگتا ہے، اس پر اس جبار نے کہا: تو میرے واسطے اللہ سے دعا کر اور میں تجھ کو ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ بی بی سارہ نے اس کے لیے دعا کی تو وہ چھوڑ دیا گیا، پھر اُن کی طرف جھکا، ہاتھ بڑھایا، پھر ویسا ہی پکڑا گیا یا اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ پکڑا گیا۔ پھر اس جبار نے تیسری بار وہی کیا، پھر پکڑا گیا، پس پہلی دو بار کی طرح اس جبار نے کہا: تو اللہ سے دعا کر اور میں تجھ کو ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ بی بی سارہ نے اس کے

لیے دعا کی تو چھوڑ دیا گیا، پھر اس نے اپنے دربانوں سے قریبی دربان کو بلایا اور کہا: تو میرے پاس انسان کو نہیں لایا، لیکن تو تو شیطان کو لایا، اس کو نکال اور اس کو ہاجر دے دے۔ پھر بی بی سارہ وہاں سے نکالی گئیں اور بی بی ہاجر ان کو دے دی گئی۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے آنے کی آہٹ پائی تو اپنی نماز سے فارغ ہوئے اور کہا: کیا ہے؟ بی بی سارہ نے کہا: اللہ نے کافر فاجر کے مکر کی کفایت فرمائی اور ہاجر مجھے خدمت میں دی۔ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جس وقت اس حدیث کو بیان کرتے تو کہتے: ”تلك أمكم يا بني ماء السماء“ یعنی ہاجر تمھاری ماں ہے اے بنی ماء السماء! اس سے مراد عرب ہیں اسماعیل علیہ السلام کی اولاد۔[1] كذا في ابن كثير۔ ”ماء السماء“ سے مراد آبِ زمزم ہے، اس پانی کو جبریل علیہ السلام نے خاص اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ کے لیے ٹھوکر مار کر نکالا۔

﴿ تَاللّٰهِ ﴾ میں حرفِ تا قسم کے لیے ہے۔ قسم کے تین حرف ہیں: ایک تو حرفِ با، دوسرا حرفِ واو اور تیسرا حرفِ تا۔ حرفِ تا واوَ کا بدل ہے اور واو بدل ہے با کا۔ حرفِ با کا دخول معرفہ میں مختص ہے، چونکہ حرفِ با قسم کے معنی میں اصل ہے، اس لیے حرفِ واو اور حرفِ تا سے کئی چیزوں کے ساتھ مستقل ہے، ایک یہ ہے کہ حرفِ با کے ساتھ فعل کا ظاہر کرنا جائز ہے۔ دوسری یہ ہے کہ مظہر و مضمر دونوں پر داخل ہوتا ہے، جیسے: ”به لأعبدنَّهٗ“. تیسری یہ ہے کہ بطورِ استعطاف حرفِ با کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے، جیسے: ”بحياتك أخبرنيْ“ یعنی قسم ہے تیری زندگی کی کہ تو مجھے فلاں امر کی خبر دے، مقصود یہاں مخاطب کا اپنی طرف مائل کرنا ہے، اس واسطے اس کی حیات کی قسم کھائی۔ واو چونکہ فرع ہے، اس لیے صرف مظہر پر داخل ہوتا ہے اور اسی طرح حرفِ تا چونکہ فرع ہے واو کی، اس واسطے داخل نہیں ہوتا، مگر مظہر واحد پر۔ کسی نے اس جگہ ﴿ تَاللّٰهِ ﴾ کے بجائے ”بِالله“ بہ حرفِ با بھی پڑھا ہے۔ حرفِ تا میں تعجب ہے، یعنی جس امر پر قسم کھائی جاتی ہے، وہ تعجب خیز ہو، ایسے مقام پر حرفِ تا کو قسم کے واسطے لاتے ہیں۔

”کید“ کے معنی مکر کے ہیں، باب اس کا ”باع يبيع“ ہے۔ محاورے میں ”كاده يكيده كيدا و مكيدة“ بولتے ہیں، یہاں ”کید“ سے مراد اجتہاد کرنا اور سعی و کوشش بجا لانا ہے بتوں کے توڑنے میں، چونکہ ادھر تو بظاہر خلیل جلیل علیہ السلام کا ضعف اور ادھر نمرود اور نمرودیوں کا زور، تکبر و جبر و ظلم وعتو و سلطنت اور اپنے دین کی نصرت پر جان دینا۔ پھر اس کے بتوں کو توڑنا اُن کی توہین و تحقیر کرنا، جن کو وہ اِلٰہ و نافع و ضار سمجھے اور اس پر جما ہوا ہو، ایسے وقت میں ایسے کام پر ہمت باندھنا اور عزم بالجزم کر لینا اور اس پر قسم کھا بیٹھنا اور اس کو سہل سمجھنا نہایت مشکل اور متعذر تھا اور کید و مکر و حیلہ و تدبیر پر موقوف تھا، اس لیے خلیل جلیل علیہ السلام نے حرفِ تا کے ساتھ قسم کھائی، جس میں تعجب کے معنی ہیں اور لفظِ ”کید“ کا ذکر فرمایا، جس میں مکر و حیلہ کے معنی ہیں، گویا اپنے ہاتھ پر کید کے آسان و سہل ہو جانے سے تعجب کیا کہ ایسا مشکل کام کیوں کر آسان ہو جائے گا۔ اگر کوئی کہے کہ ”کید“ کے معنی یہ ہیں کہ غیر پر حیلہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧١) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٣۔ ٢٤٤)

کرے، اسے ضرر پہنچانے میں جس کو وہ نہ سمجھے اور بت جماد ہیں۔ توڑے جانے سے انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ نیز بت اس قسم سے نہیں کہ اُن کو توڑنے کے لیے حیلہ گری کی جائے، کیونکہ حیلہ گری تو اس کے لیے ہوتی ہے جسے شعور اور سمجھ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ خلیل علیہ السلام نے جو ﴿ لَأَكِيدَنَّ ﴾ فرمایا تو یہ اُن کے زعم کی بنا پر ہے، کیونکہ وہ یہی زعم کیا کرتے تھے کہ بتوں کو شعور ہے اور اُن کا ضرر پذیر ہونا جائز ہے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ "لأكيدنكم في أصنامكم" یعنی تم سے تمھارے بتوں کے بارے میں کید کروں گا، کیونکہ بتوں کے توڑنے سے اُن کی عبادت کرنے والوں پر غم وہم نازل کیا۔ اس قول کی بنیاد پر کید اپنی اصل پر رہا اور اس کا تعلق عابدوں سے ہوا نہ کہ معبودوں سے، یہ تو شیخ زادہ رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل تھا۔ شہاب خفاجی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ "کید" اصل میں یہ ہے کہ مضر شے کے موجود کرنے میں اس کے اظہار کی مخالفت کرتے ہوئے حیلہ گری کرنا اور اس سے یہ بات لازم ہوتی ہے کہ اس میں اجتہاد اور کوشش کی جائے۔ لہٰذا اجتہاد و کوشش "کید" کے لیے ضروری ہے۔ پس یہاں "کید" سے مراد کوشش ہے مجازاً یا بطورِ استعارہ یا لازم میں ملزوم کے استعمال کے طور پر۔[1] غرضیکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو طریقے ہیں: ایک قول، دوسرا فعل۔

خلیل جلیل علیہ السلام نے پہلے زبانی مناظرہ کیا، ان کے بتوں کی بے بسی ثابت کی اور اللہ پاک کی توحید کو ثابت کیا اور یوں کہا: ﴿ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ... الخ ﴾۔ جب ان کو اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو طریقۂ فعل کی طرف مائل ہوئے اور ان کو خبر دی کہ اب میں زبانی حجت کو چھوڑ کر فعل سے منکر کو تبدیل کروں گا اور یہ کام اللہ پاک پر بھروسا کر کے اس کے دینِ حق کی حمایت کے واسطے بجا لاؤں گا۔ پس انھوں نے حجتِ الٰہی قائم کرنے میں قول وفعل دونوں کو جمع کیا اور یوں کہا کہ قسم ہے اللہ کی! میں تمھارے بتوں کو توڑنے پھوڑنے میں خوب سعی و کوشش کروں گا، اس کے بعد کہ تم اُن کی پوجا پاٹ کرنے کے بعد اپنے میلے کی طرف چلے جاؤ گے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ کسی نے کہا کہ خلیل علیہ السلام نے یہ بات اپنے دل میں پوشیدہ کہی تھی، ان کی قوم میں صرف ایک آدمی نے اس کو سنا تھا۔ لہٰذا اسی نے افشا کیا اور وہی اس قول کا قائل ہے: ﴿ سَمِعْنَا فَتًى ... الخ ﴾

کسی نے کہا ہے کہ ہر سال اُن کے یہاں ایک مجمع وعید، یعنی میلا ہوا کرتا تھا، پس جس وقت وہ اپنے میلے سے لوٹتے تو بتوں پر داخل ہوتے، ان کو سجدہ کرتے، پھر اپنے گھروں کو لوٹ آتے تھے۔ پس جب وہ میلا ہوا تو خلیل علیہ السلام کے والد نے اُن سے کہا: اے ابراہیم! اگر تو ہمارے ساتھ ہمارے میلے کی طرف نکلے تو تجھے ہمارا دین پسند آ جائے۔ اس پر خلیل علیہ السلام ان کے ہمراہ نکلے، پھر جب کچھ راستہ چلے تو انھوں نے خود کو زمین کی طرف ڈال دیا اور کہا: میں بیمار ہوں، میرا پاؤں بیمار ہے تو اُن لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا اور چل دیے۔ خلیل علیہ السلام نے اُن کے پچھلے لوگوں میں

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٢٥٨)

ندا کی اس حال میں کہ ضعیف لوگ باقی رہ گئے تھے: ﴿ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ﴾ پھر خلیل علیہ السلام بت خانے کی طرف لوٹے، وہ بت ایک بڑی بَہو میں تھے، گھروں کے آگے، جو گھر مقدم ہوتا ہے، اس کو بَہو کہتے ہیں اور اس کے دروازے کے سامنے ایک بڑا بت تھا، اس کے پہلو کی طرف اس سے چھوٹا بت اور بت بعض بعض کے پہلو سے لگے ہوئے تھے، ہر بت کے بعد کا بت پہلے بت سے چھوٹا تھا، اسی طرح اس گھر کے دروازے تک ناگاہ اُن کفار نے بتوں کے آگے کھانا رکھا تھا اور کہا تھا کہ جس وقت ہم لوٹ کر آئیں گے تو بتوں نے اس کھانے کو متبرک کر دیا ہوگا تو ہم اس کو کھائیں گے۔ پھر جب خلیل علیہ السلام نے بتوں کی طرف اور کھانے کی طرف نظر کی، جو اُن کے سامنے رکھا تھا تو مذاق کے طور پر کہا: ﴿ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ یعنی تم کیوں نہیں کھاتے ہو؟ پس جب انھوں نے اُن کو جواب نہ دیا تو کہا: ﴿ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴾ یعنی تم کو کیا ہوا کہ تم بولتے نہیں ہو؟

﴿ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴾ یعنی ان پر جھک پڑے سیدھے ہاتھ سے مارنے لگے اور تیشہ، جو اُن کے دست مبارک میں تھا، اس سے اُن کو توڑنے لگے، یہاں تک کہ جب سوائے بڑے بت کے اور کوئی باقی نہ رہا تو تیشے کو اس کی گردن میں لٹکا دیا۔ کسی نے کہا کہ اس کے ہاتھ میں۔ پھر نکلے، لہٰذا یہ وہی اللہ پاک کا قول ہے: ﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا ﴾ یعنی ان کو ریزہ ریزہ، پارہ پارہ کر ڈالا۔[1] "جذ" کے معنی کاٹ دینا، توڑ دینا ہے، یعنی بریدن و شکستن کاٹنا توڑنا۔ محاورے میں "جذذت الشيء، قطعته و كسرته" یعنی میں نے فلاں شے کو کاٹا اور توڑ ڈالا، بولتے ہیں اور جو اس شے سے ٹوٹ جائے اس کو "جُذا" جیم کی پیش اور زیر کے ساتھ کہتے ہیں، لیکن پیش کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔ باب اس کا "نصر ینصر". ہے۔ كذا في المختار.

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ سنگہائے زر کو "جذاذ" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ توڑے جاتے ہیں۔[2] اس میں کئی قراءتیں ہیں، ایک جمہور کی ہے، یعنی جیم کی پیش کے ساتھ، اس کو امام ابوعبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے، اس کے معنی حُطام و رُقاق کے ہیں، فعال کا وزن ہے، بہ معنی مفعول۔ دوسری بکسرِ جیم ہے۔ امام کسائی، اعمش اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔[3] بہ معنی کسر و قطع "جذیذ" کی جمع ہے۔ "جذیذ" ہشیم کو کہتے ہیں، جس طرح کہ خفیف کی جمع خفاف اور ظریف کی جمع ظراف ہے۔ تیسری بفتحِ جیم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابونہیک اور ابو السماک رحمہما اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ امام ابن جریر، ابن المنذر راو رابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے اس کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "حُطَامًا"۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ ان سے مروی "فتاتاً" ہیں۔[4] قطرب نے کہا ہے کہ ﴿ جُذٰذًا ﴾

---

[1] تفسير الخازن (٤/ ٢٩٨) [2] الصحاح للجوهري (٣/ ١٢٣) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٢٩٨)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ٤٥٧) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٥)

اپنی ساری لغتوں میں مصدر ہے۔ لہٰذا اس کا نہ تثنیہ ہوگا نہ جمع نہ تانیث۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ مضموم تو اسم ہے شیٔ مکسور کا، جیسے: حُطام۔ رفات، فتات بہ معنی شی محطم ومفتت، یعنی چیز پارہ پارہ کردہ شدہ۔ یزیدی نے کہا ہے کہ مضموم جمع ہے جذاذۃ بالضم کی، جیسے: زجاج جمع ہے زجاجہ اور مکسور جمع ہے جذیذ کی، جیسے کرام جمع ہے کریم کی اور بعض نے کہا ہے کہ مفتوح مصدر ہے بہ معنی مفعول، یعنی مجذوذین اور اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ بہ حذف مضاف ہو، یعنی ذوات جذاذٍ۔ کسی نے کہا ہے کہ مضموم جمع ہے جذاذۃ بالضم کی اور مکسور جمع ہے جذاذہ بالکسر کی اور مفتوح مصدر ہے،[1] ان میں سے دو قراءتیں مضموم ومکسور سبعیہ ہیں۔ امام محلی ونسفی رحمہما اللہ نے صرف ان دو کو ذکر کیا ہے۔[2] چوتھی یہ ہے: بضم جیم بدون الف وفتحِ ذال اول "جُذَذ" واحد اس کا "جُذَّةٌ" ہے۔ جیسے "قُبَّة" کی جمع "قبب"۔ پانچویں بضم جیم وذال اول "جُذُوْذ" واحد اس کا جذیذ، جیسے: "قليب" کی جمع "قُلُب". امام بیضاوی اور ابو البقاء رحمہما اللہ نے پانچویں کو ذکر کیا ہے۔[3]

﴿ اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ ﴾ استثنا ہے ضمیر منصوب ﴿ فَجَعَلَهُمْ ﴾ سے اور ﴿ لَهُمْ ﴾ صفت ہے "کبیر" کی اور ضمیر راجع ہے بتوں کی طرف، یا ان کے پوجنے والوں کی طرف اور حرفِ فا فصیحہ ہے، اس لیے کہ اس کے پہلے ایک جملہ محذوف ہے، فصیحہ اسی واسطے کہتے ہیں کہ ماقبل کے جملۂ محذوفہ کی خبر دیتی ہے، وہ جملہ "تَوَلَّوْا" ہے، یعنی کفار میلے کو چلے گئے تو انھوں نے سارے بتوں کو توڑ ڈالا، ریزہ ریزہ کر دیا، مگر اُن میں کے بڑے بت کو نہیں توڑا اور اس کے ہاتھ یا گردن میں تیسہ لٹکا گئے۔

﴿ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴾۔ ضمیر "إليه" کی "کبیر" کی طرف پھرتی ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے،[4] یعنی خلیل علیہ السلام نے یہ کام اس لیے کیا کہ شاید بڑے بت کی طرف رجوع کریں، جس طرح کہ حلِ مشکلات میں عالم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس سے کہیں کہ اُن بتوں کو کیا ہوا ہے کہ سب کے سب ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں اور تجھ کو کیا ہے کہ تو صحیح وسالم ویسا ہی ہے اور یہ تیسہ تیری گردن میں کیسا لٹکا ہوا ہے؟ خلیل علیہ السلام نے یہ بات اُن کی کثرتِ جہالت کی بنا پر کہی یا مذاق اور ٹھٹھا کے طور پر۔ کفار کی یہ عادت تھی کہ جب وہ بتوں کی طرف لوٹ کر آتے تو اُن کو سجدہ کرتے، پھر اپنے گھروں کو جاتے تھے۔[5] كذا قال الرازي.

یا یوں تقریر کی جائے کہ شاید وہ بڑے بت کی طرف رجوع کریں تو اس سے توڑنے والے کا حال پوچھیں، کیوں کہ معبود کی شان سے ہے کہ اہم امور میں اس کی طرف رجوع کریں، پھر جب وہ اس کی طرف رجوع کریں

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٥٢٤۔ ٥٢٥) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٦) تفسير النسفي (٣/ ٨٤)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٨) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٠۔ ٩٢١) [4] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٦)
[5] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٦)

گے تو اس کے پاس خبر کا اَتا پتا نہ پائیں گے، تب جان لیں گے کہ بت نہ کسی طرح کا نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ کسی ضرر کو دور کر سکتے ہیں، نہ بھلائی جانیں نہ برائی، نہ ہی جو حوادث اُن کو پیش آتے ہیں، اُن کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "إلیه" کی ضمیر خود خلیل علیہ السلام کی طرف راجع ہے، یعنی شاید وہ انھیں کی طرف رجوع کریں، کیوں کہ ان کا ظنِ غالب یہی تھا کہ انھیں کی طرف رجوع کریں گے، اس لیے کہ اُن کے بتوں کی عداوت کے ساتھ وہی متفرد ومشتہر، یعنی اکیلے مشہور ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ جب وہ اُن کے پاس آئیں گے تو اُن سے ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ ﴾ کے ساتھ حجت کریں گے، پھر اُن پر حجت میں غالب آ جائیں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ پاک کی طرف راجع ہے، یعنی جب وہ اپنے بتوں کی عاجزی و بے بسی کا یقین کر لیں گے تو شاید اللہ پاک کی توحید کی طرف رجوع کریں۔ فتح القدیر و فتح البیان میں اس قول کو انتہائی بعید کہا ہے۔[1] امام بیضاوی و نسفی رحمہما اللہ نے تینوں قول ذکر کیے ہیں۔ کسی قول کو بعید وقریب کچھ نہیں کہا،[2] آخر کے قول کو آخر میں ذکر کیا ہے۔ اس کے ضعف پر یہی دلیل فی الجملہ ہو سکتی ہے۔

﴿ قَالُوْا ﴾ کے بعد اتنی عبارت محذوف ہے کہ پھر جب وہ اپنے میلے سے لوٹ کر آئے اور جو حادثہ اُن کے بتوں پر واقع ہوا، اس کو دیکھا تو بولے: ﴿ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ ﴾۔ ﴿ مَنْ ﴾ استفہامیہ ہے اور استفہام انکار، ڈانٹ ڈپٹ اور طعن وتشنیع کے لیے ہے۔ ﴿ بِاٰلِهَتِنَآ ﴾ کہا۔ "بِهٰؤُلَآءِ" نہ کہا، حالانکہ وہ سب بت اُن کے رو برو تھے۔ لہٰذا اس سے غرض تشنیع میں مبالغہ ہے۔ ﴿ مَنْ ﴾ مبتدا ہے اور اس کے بعد کا جملہ خبر ہے اور جملہ ﴿ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ مستأنفہ ہے ماقبل کی تقریر وتاکید کرتا ہے، ترکیب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے، یعنی کون شخص ہے جس نے ہمارے معبودوں کا یہ حشر کیا ہے، وہ معبود جن کی ہم تعظیم وتکریم کرتے ہیں، بے شک اس کا فاعل بڑا ہی ظالم ہے۔ ظالم اس لیے ہے کہ اس نے معبودوں پر جرأت کی جو قابلِ تعظیم ہیں، یا اس لیے کہ اُن کے توڑنے پھوڑنے، ریزہ ریزہ کرنے میں زیادتی کی، یا اس لیے کہ اس نے اپنے نفس کو ورطۂ ہلاک میں ڈالا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ استفہامیہ نہیں ہے، موصولہ ہے مبتدا اور ﴿ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ خبر ہے موضع رفع میں، یعنی قائل اس قول کا ظالم ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ آگے یہ آتا ہے: ﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ ﴾ کیوں کہ یہ بات اُن میں سے بعض نے پوچھنے والوں کے جواب میں کہی ہے، اس کا قائل وہی شخص ہے جس نے خلیل علیہ السلام کو ﴿ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ﴾ کہتے ہوئے سنا تھا۔

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قول کے قائل وہی قومِ خلیل علیہ السلام کے ضعفا ہیں، جنھوں نے اس کی قسم کو سنا اور اپنے اکابر کو اس کی اطلاع دی تھی۔ سمع اس جگہ دو مفعول کی طرف متعدی ہے، اس لیے کہ شے غیر مسموع پر داخل

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٦٥) فتح البيان (٨/ ٣٤٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٨) تفسير النسفي (٣/ ٨٤)

ہو، جیسے یہ مثال کہ "سمعت كلام زيد" تو اس صورت میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہوگا، یعنی ہم نے ایک جو ان کو سنا ہے کہ وہ اُن کو برا کہتا ہے، گالیاں دیتا ہے، شاید یہ کام اُن کے ساتھ اسی نے کیا ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ يَذْكُرُهُمْ ﴾ صفت ہے ﴿ فَتًى ﴾ کی۔ تعلقِ سمع کو ﴿ فَتًى ﴾ کے ساتھ صحیح کرتی ہے، کیوں کہ مثلاً: "سمعت زیدا" بول کر اگر سکوت کیا جائے تو یہ درست نہ ہوگا، جب تک کوئی سنی ہوئی بات مذکور نہ ہو، اسی طرح اس صفت نے تعلقِ سمع کو ﴿ فَتًى ﴾ کے ساتھ درست کر دیا۔

یہ وجہ پہلی وجہ سے زیادہ بلیغ ہے، اس لیے کہ یہ وجہ پہلی وجہ کے ساتھ فاعل کی طرف نسبت کرنے میں شریک ہے، اس میں اتنی بات زیادہ ہے کہ اس کو نسبت اور وصفیت میں وجہ اول سے امتیاز ہے اور اس میں نسبت مکرر ہے اور جملہ ﴿ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ ﴿ فَتًى ﴾ کی صفت ثانی ہے، یا حال ہے ﴿ فَتًى ﴾ سے۔ کلمہ ﴿ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ میں کئی وجوہ ہیں، ایک یہ کہ مفعول "ما لم يسم" فاعلہ ہے ﴿ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ کا، یعنی کہا جاتا ہے اس کو، یہ لفظ امام ابو البقاء نے کہا ہے کہ مراد اسم ہے، مسمیٰ نہیں ہے۔ دوسری یہ ہے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی "يقال له هذا إبراهيم" یا "هو إبراهيم"، امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ تیسری یہ ہے کہ مبتدا محذوف الخبر ہے، یعنی "يقال له إبراهيم فاعل ذلك"۔ چوتھی یہ ہے کہ منادیٰ ہے اور حرفِ ندا کا محذوف ہے، یعنی "يا إبراهيم" تینوں وجہوں پر جملے سے قطع کیا ہوا ہے اور وہ جملہ حکایت کیا گیا ہے یقال سے۔ كذا قاله السمين. من جملہ غرائب تدقیقاتِ نحویہ و عجائب توجیہاتِ اعرابیہ یہ ہے کہ اعلم شنتمری اشبیلی نے کہا ہے کہ ﴿ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ مرفوع ہے بنا بر اہمال۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ اس طرف گیا ہے کہ اس کا رفع بدون کسی شے کے ہے،[1] یعنی بغیر عامل مرفوع ہے۔ ﴿ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ ﴾ قائل اس قول کے وہی سائل لوگ ہیں، جنھوں نے ﴿ مَنْ فَعَلَ هٰذَا... الخ ﴾ کہا تھا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے آپس میں یہ بات کہی اور قائل اس قول کا نمرود ہے۔ لعنه الله تعالى.

﴿ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا برحال ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر سے، یعنی تم اس کو لاؤ اس حال میں کہ وہ ظاہر و مکشوف ہو لوگوں کے لیے۔ (قاله الحفناوي)۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو لوگوں کے رو برو اس طور پر لاؤ کہ اس کی صورت لوگوں کی آنکھوں میں جمے، جس طرح کہ سوار سواری پر جمتا ہے۔[2] یہ معنی اس لیے کیے، تاکہ کلمہ کے معنی پورے پورے درست ہو جائیں۔ کہتے ہیں جب نمرود اور اس کی قوم کے اشراف کو خبر پہنچی تو اس بات کو مکروہ سمجھے کہ بغیر حجت و گواہ کے خلیل علیہ السلام کو پکڑیں اور اُن سے مواخذہ کریں، اس لیے انھوں نے یہ بات کہی، تاکہ یہ ان پر حجت ہو جائے تو جس کام کے کرنے کا اُن کے ساتھ ارادہ کیا، اس کو اس حجت سے حلال کر لیں۔ سبحان اللہ! نمرود جیسا ظالم، جابر، عاتی، متمرد کافر و مشرک بے حجت و دلیل مواخذہ کرنے کو پسند نہیں کرتا، پھر جو کوئی دعوائے

[1] فتح القدير (٣/ ٥٦٥) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٩٩)

اسلام کے باوجود بغیر حجت مؤاخذہ کرے تو معلوم ہوا کہ وہ اس حرکت میں نمرود سے بھی بڑھ کر ہے۔ اللهم وفقنا لصالح الأعمال و أجرنا من الخزي والنكال يا ذا الجلال، وصل وسلم وبارك على سيدنا محمد، و آله و صحبه خير صحب و آل، آمين.

﴿ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴾ یا تو شہادت سے ہے بہ معنی گواہی، شاید وہ گواہی دیں اُن کے فعل کی اس طریقے سے کہ کسی نے اُن کو بت توڑتے دیکھا ہو، یا اس بات کی گواہی دیں کہ کسی نے اُن کو بتوں پر طعن کرتے سنا ہو۔ اس بنیاد پر ﴿ لَعَلَّهُمْ ﴾ کی ضمیر کل آدمیوں پر راجع نہیں ہوگی، بلکہ اُن میں سے بعض مبہم کی طرف پھرے گی۔ یا شہادت بہ معنی حضور ہے، یعنی شاید لوگ اُن کے عذاب کرنے میں حاضر ہوں، تاکہ اُن کے سوا اور لوگ ڈر جائیں، ایسے کام میں ان کی پیروی نہ کریں۔ جملہ ﴿ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ ... الخ﴾ مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی نے کہا کہ جب ابراہیم علیہ السلام آئے تو اُن سے کیا کہا؟ لہٰذا یہ اس کا جواب ہے۔ یہاں عبارت محذوف ہے، یعنی پھر خلیل جلیل علیہ السلام تشریف لائے، جب اُن کو لے آئے تو اُن سے پوچھا کہ آیا تو نے یہ کام کیا ہے؟ یہ بات اس لیے کہی کہ اُن کے زعم میں خلیل علیہ السلام پر حجت قائم کریں۔ انھوں نے جواب دیا: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾، یعنی خلیل علیہ السلام نے اُن پر حجت قائم کرنے کو اور اُن کے عاجز کرنے اور ڈانٹنے کے لیے بڑے بت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، بلکہ یہ کام اُن کے اس بڑے بت نے کیا ہے، یہ وہی بت ہے جس کو چھوڑ رکھا تھا۔

﴿ فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ یعنی اگر وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو بول سکتے ہیں، بات کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، جو اُن سے کہا جائے اس کو سمجھ کر اس کے مطابق اس کا جواب دے سکتے ہیں تو اُن سے پوچھ لو، وہ بتا دیں گے۔ خلیل علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اُن سے اس بات کو بیان کر دیں کہ جو نہ بولے، نہ جانے، وہ عبادت کے لائق نہیں ہے اور نہ از روئے عقل معبود کا اطلاق اس پر درست ہے، اس لیے بات کو پیرایۂ تعریض (اشارہ) میں ادا کیا۔ ان کے ساتھ ایسی بات کے ساتھ تعریض کی کہ اُن کو اقرار کرنا پڑے اور وہ جھٹ سے اقرار کر لیں کہ جن جمادات کو انھوں نے پوجا ہے، وہ معبود نہیں ہیں، کیوں کہ جب کفار کہیں گے کہ وہ بولتے نہیں ہیں تو خلیل علیہ السلام ان سے فرمائیں گے کہ پھر تم کیوں ایسے معبودوں کو پوجتے ہو جو بولنے سے عاجز ہیں اور جس مکان میں وہ ہیں، اس میں جو حادثہ اُن کے پاس واقع ہوتا ہے، اس کے علم سے قاصر ہیں۔

پس یہ گفتگو اس باب سے ہے کہ ہمراہ خصم کے باطل کو فرض کر لیں، تاکہ اس پر حجت لازم کریں اور وہ حق کا اقرار کر لے، کیوں کہ یہ بات اس کے شبہے کی بالکل قاطع ہے اور اس مکابرے (سینہ زوری) کی نہایت دافع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خلیل علیہ السلام نے جو فعل کی نسبت بڑے بت کی طرف کی، لہٰذا اُن کی مراد یہ ہے کہ یہ کام اس نے اس

لیے کیا ہے کہ اس کو اس بات پر غیرت اور غصہ آیا کہ اس کے ساتھ چھوٹے بتوں کی بھی پوجا کی جائے۔ خلیل علیہ السلام کی غرض اس سے یہ تھی کہ اُن کو یہ باتیں بتائیں کہ ان بتوں کی پوجا کرنا، جو نہ سنیں نہ دیکھیں نہ نفع رسانی کریں نہ ضرر دور کریں، باوجود موجود ہونے خالقِ اصنام و خالقِ عابدین کے، عقلاً صحیح نہیں ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ علامہ خفاجی رحمہ اللہ نے یہاں خوب تقریر کی ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خلیل علیہ السلام نے فعل کی نسبت جو بڑے بت کی طرف کی تو یہ بطورِ کنایہ فرضیہ ہے،[1] اس لیے کہ یہ نسبت دو امر کو مستلزم ہے: ایک تو بڑے بت کے فعل کی نفی کو، دوسرے فعل کو ذاتِ خلیل علیہ السلام کے ساتھ ثابت کرنا، اس کی بنیاد اس پر ہے کہ فعل، یعنی بتوں کا توڑنا دائر ہے، درمیان عاجز و قادر کے، عاجز تو بت ہوا اور قادر جناب خلیل علیہ السلام، کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی فعل دو کے درمیان دائر ہو، ایک تو اس فعل پر قادر ہو اور دوسرا اس سے عاجز ہو اور فعل عاجز کے واسطے بطورِ تہکم (مذاق) و تمسخر ثابت کیا جائے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ فعل دوسرے میں منحصر ہے، یعنی جو اس پر قادر ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خلیل علیہ السلام نے اس قول میں استہزاء اور تذلیل کو شامل کر کے بڑے موثر ذریعے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں جو ﴿ يَنْطِقُوْنَ ﴾ کہا اور "يسمعون و يعقلون" نہ کہا، باوجود اس کے کہ سوال سمع و عقل پر موقوف ہے۔ پس اسی لیے کہ نتیجہ سوال کا جواب ہوتا ہے اور ان کا نہ بولنا ان کے عاجز کرنے میں ظاہر تر ہے۔[2]

﴿ ءَاَنْتَ ﴾ میں پانچ قراءتیں ہیں: اول تحقیق ہر دو ہمزہ مع ادخالِ الف درمیان ہر دو۔ دوسرے تحقیق ہر دو ہمزہ و ترکِ ادخالِ الف۔ تیسری تحقیق ہمزہ اول و ابدال ثانیہ بالف۔ چوتھے تسہیل ہمزہ ثانی مع ادخالِ الف درمیان مسہلہ و ہمزہ اول۔ پانچویں تسہیل ہمزہ ثانی و ترکِ ادخالِ الف۔ اس میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ فعل مقدر کا فاعل ہے، جس کی تفسیر فعل ظاہر مابعد کرتا ہے۔ تقریر یہ ہے: "أفعلت هذا بآلهتنا" پھر جب فعل حذف ہو گیا تو ضمیر منفصل ہو گئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ ءَاَنْتَ ﴾ مبتدا ہے اور جملہ مابعد خبر ہے۔ ﴿ فَعَلَهٗ ﴾ کا فاعل ﴿ كَبِيْرُهُمْ ﴾ ہے اور ﴿ هٰذَا ﴾ صفت ہے ﴿ كَبِيْرُهُمْ ﴾ کی یا بدل ہے اس سے، یا خبر ہے ﴿ كَبِيْرُهُمْ ﴾ کی، اس بنا پر کلام ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ ﴾ پر تمام ہو گیا اور فاعل محذوف ہے، یعنی "فعله من فعله" لیکن یہ وجہ بعید ہے، کیونکہ فاعل کا حذف جائز نہیں ہے۔ ﴿ فَسْـَٔلُوْهُمْ ﴾ جواب مقدم ہے ﴿ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ شرط موخر ہے۔[3] كذا قال المحلي۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ ﴾ مرتبط ہے ﴿ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ سے۔ امام طیبی رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے، معنی یہ ہیں، بلکہ کیا ہے اس کو اُن کے بڑے نے، اگر وہ بولتے ہیں تو تم اُن سے پوچھ لو، اگر یہ فعل ممکن ہے۔ یہ قول اس قول سے ظاہر تر ہے کہ جوابِ شرط بہ دلالت ماقبل محذوف مانا جائے۔ ابن

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٢٦٠) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٧٥) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٦)

سُمَیفع نے "فَعَلَّہٗ" لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ معنی یہ ہیں کہ "بَلْ فَلْعَلَّ الْفَاعِلُ کَبِيْرُهُمْ"

انموذج میں ذکر کیا ہے: اگر کوئی کہے کہ خلیل علیہ السلام نے ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ کیوں کہا، بتوں کے توڑنے کا حوالہ بڑے بت پر کیوں کیا، حالانکہ اُن کے توڑنے والے خود وہی تھے؟ تو ایک جواب اس کا یہ ہے کہ یہ بطورِ استہزا و مذاق کہا، نہ بطریق جد و قصد۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اُن کے توڑنے پر یہ امر اُن کو باعث ہوا کہ اُن کے دیکھنے سے اُن کو غصہ آیا کہ برابر صف باندھے ہوئے ترتیب وار عبادت کے لیے رکھے ہوئے ہیں، اُن کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر اُن کا غیظ و غضب بڑے بت پر تھا، کیوں کہ اس کی زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ لہٰذا اس لیے فعل کی نسبت اس کی طرف کر دی، جس طرح کہ فعل کا سبب بننے والے اور اس کے حامل کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ انھوں نے فعل کی نسبت اس کی طرف بالکل نہیں کی، بلکہ معلق شرط منتفی کے ساتھ کی، یعنی کیا ہے اس کو اس بڑے نے اگر وہ بولتے ہوں تو تم اُن سے پوچھ لو۔ اگر کوئی کہے کہ یہ ساری تقریر اس واسطے ہوئی کہ خلیل علیہ السلام سے کذب کی نفی ہو جائے، حالاں کہ یہ بات اس کے خلاف ہے جو حدیث میں وارد ہوا ہے کہ انھوں نے تین جھوٹ بولے، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں وہ کذب نہیں ہیں، بلکہ وہ من جملہ معاریض الکلام ہیں، چونکہ صورت معاریض کی صورت کذب ہے، اس لیے معاریض کو کذب کہہ دیا، ورنہ کذب کا کچھ اُتا پتا نہیں ہے۔ محض صدق و صواب ہے۔ انبیا علیہم السلام معصوم ہیں، سارے نقائص سے پاک صاف مبرا و منزہ ہیں۔

فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ؕ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

پھر وہ اپنے نفسوں میں (سوچتے ہوئے) لوٹے اور (باہم) کہنے لگے: بے شک تم ہی ظالم ہو (64) پھر وہ (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کے بل اوندھے ہو رہے (اور کہا:) کیا بلاشبہہ تو جانتا ہے کہ یہ (بت) بولتے نہیں (65) اس (ابراہیم) نے کہا: کیا پھر تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں کچھ نفع نہیں دے سکتے اور نہ تمھیں نقصان دے سکتے ہیں؟ (66) تُف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟ (67)

قوم ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بتوں کی عاجزی کا اعتراف:

اللہ پاک ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے حال کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت انھوں نے ان سے کہا، جو کچھ کہا تو وہ اپنی جانوں کی طرف رجوع ہوئے، یعنی اپنے آپ کو اس بات پر ملامت کرنے لگے کہ انھوں نے اپنے معبودوں کے واسطے احتراز وحراست نہ کی، پھر بولے: لوگو تم خود ہی ظالم ہو، اس بات میں کہ تم نے بتوں کو مہمل چھوڑ دیا، ان کے پاس کوئی نگہبان نہ رکھا۔

﴿ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ﴾ یعنی سر نیچا کر لیا زمین میں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''أَدْرَكَتِ الْقَوْمَ حَيْرَةُ سُوْءٍ'' یعنی قوم کو بری حیرت نے آ لیا۔ ﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴾۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ﴾ یعنی فتنے میں۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: رائے میں۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ظاہر تر ہے معنی میں۔ انھوں نے جو یہ کیا سو عجز و حیرت کے مارے اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴾۔ پھر تو ہم سے کیوں کہتا ہے کہ اُن سے پوچھو، اگر وہ بولتے ہیں، حالانکہ تو خود جانتا ہے کہ وہ بولتے نہیں ہیں، پس اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا، جب وہ خود اس کا اقرار کر چکے: ﴿ اَفَتَعْبُدُوْنَ ... الخ﴾ یعنی جب وہ بولتے نہیں، نہ بھلا کرتے ہیں نہ برا تو پھر تم کیوں اُن کو پوجتے ہو اللہ کے سوا۔ ﴿ اُفٍّ لَّكُمْ ... الخ﴾ پس کیا تم جس گمراہی و کفر اور گندگی میں ہو، اس کے بارے میں کچھ غور و فکر نہیں کرتے، سوچتے بوجھتے نہیں ہو، وہ گمراہی اور کفر، جو صرف ظالم، جاہل اور فاجر پر ہی چلتا ہے۔ پس اُن پر حجت قائم کی اور حجت سے اُن کو الزام دیا، اسی لیے اللہ پاک نے اور آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۚ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴾ [الأنعام: ٨٣] ''اور یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔ ہم جسے چاہیں اس کے درجے بلند کرتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب بہت حکمت والا، خوب جاننے والا ہے۔''[3] كذا في ابن كثير.

﴿ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ بعض ان کا بعض کی طرف رجوع ہوا، جس طرح وہ شخص رجوع ہوتا ہے، جو اپنی حجت سے منقطع ہو جائے، اپنے جھگڑنے والے کی حجت کی صحت کو سمجھ لے، اپنی عقل کی طرف مراجعت کرے، یہ بات یوں ہوئی کہ جب اُن کے اور خلیل علیہ السلام کے درمیان اس قسم کی گفتگو ہوئی تو وہ سمجھ گئے کہ جو شخص اپنی جان سے تکلیف دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، نہ ہی اس بات پر قادر ہے کہ جس نے اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو ابراہیم علیہ السلام نے اُن بتوں کے ساتھ کیا، اس کو ضرر پہنچائے تو ایسا شخص اس لائق نہیں ہو سکتا کہ اس کو پوجا جائے، اسی لیے بعض نے بعض سے کہا: ﴿ اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی تمھیں نے ان جمادات کو پوج کر اپنی جانوں

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٤٥٦) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٥)

پر ظلم کیا اور جس کو تم نے ﴿ إِنَّهُ لَمِنَ الظَّلِمِينَ ﴾ کہہ کر ظالم ٹھہرایا، وہ ظالم نہیں ہے، یا اس سے سوال کر کے تم نے ظلم کیا، حالاں کہ تمھارے معبود حاضر ہیں، اُن سے پوچھ لو۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس جگہ کیا خوب فقرہ لکھا ہے: ''فإن من لا يدفع عن رأسه الفأس كيف يدفع عن عابديه البأس'' یعنی جو شخص اپنے سر سے تیشہ کو دفع نہیں کر سکتا، وہ کیونکر اپنے پوجنے والوں سے بلا کو دفع کر سکے گا۔[1] تفسیر محلی، نسفی، بیضاوی، خازن، ابو السعود، فتح القدیر اور فتح البیان کا اس آیت کی تفسیر میں حاصل یہی ہے، جو مذکور ہوا۔[2]

﴿ ثُمَّ نُكِسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ ﴾ یعنی اپنے سروں پر منقلب ہو گئے، یعنی پھر مجادلہ و جہل و عناد کی طرف رجوع ہوئے اس کے بعد کہ اپنی عقلوں کی طرف رجوع کر کے سیدھے ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے باطل کی طرف لوٹنے کو نچلا حصہ اوپر کی طرف ہو جانے سے تشبیہ دی۔ مثلاً کوئی شے سیدھی ہے۔ پھر اس کی نیچے کی جانب اوپر اور اوپر کی جانب نیچے ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت انھوں نے اپنے نفوس کی طرف رجوع کیا اور فکرِ صالح کی تو سیدھے ہو گئے تھے، پھر اس حالت سے لوٹ کر مجادلہ بالباطل کرنے لگے اور مکابرہ (تکبر) کے ساتھ پیش آئے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ خلیل علیہ السلام سے شرمندہ ہو کر اپنے سر جھکا لیے۔ یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ ﴿ نَكَسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ ﴾ کاف کی زبر کے ساتھ بصیغۂ معروف نہیں کہا ہے اور فعل کا اسناد اُن کی طرف نہیں کیا کہ یہ تفسیر درست ہو، بلکہ بصیغۂ مفعول فرمایا ہے۔ عامہ کی قراءت مخفف بصیغۂ مجہول ہے، یعنی اللہ پاک نے ان کو اُوندھا کر دیا، یا شرمندہ کر دیا۔

﴿ عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ ﴾ حال ہے، یعنی ''كائنين على رءوسهم''. یہ بھی جائز ہے کہ نفس معلوم سے متعلق ہو، ''نكس و ينكس'' کے معنی ہیں ''قَلَب''۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''نَكَسَ رأسه و نَكَّسه'' مخفف و مشدد، یعنی سر کو نیچا کیا، یہاں تک کہ اس کا اوپر کا حصہ نیچے ہو گیا۔ بعض نے ''نُكِّسُوْ'' بہ تشدید کاف پڑھا ہے، یہ ایک لغت ہے مخفف میں، اس بنا پر تشدید نہ تعدیہ کے واسطے ہے نہ تکثیر کے لیے۔ اور بعض نے مخفف بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔ اس بنیاد پر مفعول محذوف ہو گا۔ تقدیر یہ ہے: ''نكسوا أنفسهم على رءوسهم'' یعنی انھوں نے اپنے نفوس کو اپنے سروں پر اوندھا کیا۔ كذا قال السمين.

﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ ﴾ قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی واللہ! معمول ہے قول محذوف کا موضع حال میں، یعنی قائلین ﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ ﴾ اور ﴿ عَلِمْتَ ﴾ اس جگہ معلق ہے اور جملہ منفیہ، یعنی ﴿ مَا هَٰؤُلَاءِ يَنطِقُونَ ﴾ موضع میں دو مفعول علمت کے لیے ہے اگر دو کی طرف متعدی ہو، یا موضع مفعول واحد میں ہے اگر ایک کی طرف متعدی ہو اور

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٥)

[2] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٦) تفسير النسفي (٣/ ٨٥) تفسير البيضاوي (٤/ ٩٩۔ ١٠٠) تفسير الخازن (٤/ ٢٩٩) تفسير أبي السعود (٦/ ٧٥) فتح القدير (٣/ ٥٦٦) فتح البيان (٨/ ٣٤٥)

کلمہ ﴿ مَا ﴾ ہوسکتا ہے کہ حجازیہ ہو تو ﴿ هٰٓؤُلَآءِ ﴾ اس کا اسم اور ﴿ يَنْطِقُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں اس کی خبر ٹھہری۔ یا ﴿ مَا ﴾ تمیمیہ ہے تو اس کے واسطے کوئی عمل نہ ہوگا۔ غرضیکہ اللہ پاک نے قول کے اول میں اُن کی زبان پر حق جاری کر دیا، پھر ان کو بدبختی نے آلیا تو اللہ پاک کی طرف سے کفر کی طرف پھیر دیے گئے، یعنی استمرار بر کفر کی طرف لوٹ گئے، اس کے بعد کہ اپنی جانوں کے ظلم کا اقرار کر چکے تھے اور بولے: قسم ہے اللہ کی! البتہ تو جان چکا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں، پھر تُو ہم کو کس طرح حکم کرتا ہے کہ ہم ان سے سوال کریں۔ پھر جب خلیل علیہ السلام کی حجت اُن پر قائم ہو چکی تو اُن کو عاجز کر کے اور اُن کی تحقیر کر کے یوں فرمایا: پھر کیا تم اللہ کے بدلے میں ایسی شے کو پوجتے ہو، جو نہ تمھارا بھلا کرے اگر تم اس کو پوجو، اور نہ کسی طرح کا برا کرے اگر تم اس کو نہ پوجو۔

پھر خلیل علیہ السلام نے جب دیکھا کہ باوجود قطع عذر اور حق واضح ہو جانے کے بتوں کی پوجا پر جمے ہوئے ہیں تو ان کو اس سے بے قراری و بے چینی ہوئی، پس گھبرا کر یہ فرمایا: ﴿ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی میں بے زار ہوں تم سے اور اُن سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ اس میں اُن کی اور اُن کے بتوں کی تحقیر ہے۔ کیا تمھاری عقلیں نہیں ہیں جن سے تم غور و فکر کرو تو اس برے کام کو جان لو جس کو تم نے کیا ہے۔ یا اس بات کو جان لو کہ یہ بت عبادت کے مستحق نہیں ہیں اور نہ اس کی لیاقت رکھتے ہیں، اس کا مستحق تو فقط اللہ پاک ہے۔ کلمۂ ﴿ شَيْـًٔا ﴾ موضع مصدر میں ہے، یعنی "نفعاً"۔ ﴿ اُفٍّ ﴾ میں تین قراءتیں ہیں: ایک فا کی زیر کے ساتھ مع تنوین، یعنی اُفٍّ، دوسری بغیر تنوین، یعنی "اُفِّ". اور تیسری فا کی زبر اور بغیر تنوین، یعنی "اُفَّ". یہ تینوں قراءتیں سبعیہ ہیں اور یہ سب بہ معنی مصدر ہیں، یعنی نتناً و قبحاً۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "اف" ایک آواز ہے، جس وقت اس کے ساتھ آواز کی جاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اف کرنے والا بے قرار، بے چین ہے۔[1] خلیل علیہ السلام نے کفار کا بتوں کی عبادت پر ثابت رہنا دیکھا، اُن کے عذر کے انقطاع کے بعد اور حق واضح ہو جانے کے بعد تو بے قرار ہو گئے تو اُن سے اف کیا اور ﴿ لَكُمْ ﴾ اور ﴿ لِمَا ﴾ میں حرفِ لام ان کا بیان کرنے کے لیے ہے جن پر اف کیا گیا، یعنی تمھارے اور تمھارے معبودوں کے واسطے یہ "تَاَفُّفْ" ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا
يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا
فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا: اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو تو اس (ابراہیم) کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو (68) ہم

[1] تفسیر النسفي (۳/ ۸۵)

نے کہا: اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا⁶⁹ اور انھوں نے اس (ابراہیم) کے ساتھ فریب کا ارادہ کیا تو ہم نے انھیں انتہائی خسارے والے بنا دیا⁷⁰

ابراہیم علیہ السلام پر آتشِ نمرود کا ٹھنڈا ہو جانا:

جب اُن کی حجت باطل ہو چکی اور عجز کھل گیا اور حق ظاہر ہو گیا اور باطل دور ہو گیا تو اس طرف مائل ہوئے کہ اپنے بادشاہ کے جاہ کو عمل میں لائیں، پس کہا: ﴿حَرِّقُوْهُ ... الخ﴾ اس کے واسطے بہت سی لکڑیاں جمع کیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہاں تک نوبت پہنچی کہ اگر عورت بیمار ہوتی تو اس بات کی نذر مانتی کہ اگر وہ اچھی ہو گئی تو ابراہیم علیہ السلام کے جلانے کے لیے لکڑیاں اُٹھا کر لائے گی۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کو زمین کے ایک گڑھے میں رکھا اور اس کو لکڑیاں جلا کر آگ کر دیا، پس اس میں سے بڑے بڑے شرارے اُڑتے تھے اور اونچے اونچے شعلے اُٹھتے تھے، کوئی آگ کبھی ویسی نہیں جلائی گئی۔ خلیل علیہ السلام کو گوپھن کے پلڑے میں رکھا۔ یہ کام اعرابِ فارس میں سے کردیوں کے ایک شخص کے اشارے سے کیا گیا۔[1] شعیب جبائی نے کہا: اس کا نام ہیزن تھا، اللہ پاک نے اس کو زمین میں دھنسا دیا، لہٰذا وہ قیامت تک زمین میں دھنستا جائے گا۔[2]

پھر جب خلیل علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تو انھوں نے کہا: "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل" جس طرح کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل" ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا جب وہ آگ میں ڈالے گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کہا: جب کفار نے کہا: ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾[3] [آل عمران: ۱۷۳] "بلاشبہ تمھارے خلاف ایک بڑی فوج جمع ہوئی ہے، پس تم ان سے ڈرو، تب اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انھوں نے کہا: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔"

حافظ ابو یعلی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو کہا: اے اللہ! بے شک تو آسمان میں ایک ہے اور میں زمین میں ایک ہوں، تجھ کو پوجتا ہوں۔[4] یہ بھی مروی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو باندھنے لگے تو انھوں نے کہا: "لا إله إلا أنت سبحانك لك الحمد ولك الملك لا شريك لك"۔ شعیب جبائی نے کہا کہ اس وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔[5] واللہ أعلم۔ بعض سلف نے کہا کہ خلیل علیہ السلام کے سامنے جبریل علیہ السلام آئے اور وہ ہوا میں تھے تو کہا: کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲٤۵) [2] تفسیر الطبري (۱۸/ ٤٦٤۔ ٤٦۵) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤۲۸۷)

[4] مسند البزار (۱٦/ ۱۹) اس کی سند میں "ابو ہشام" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۱۲۱٦)

[5] تفسیر الطبري (۱۸/ ٤٦۷)

خلیل علیہ السلام نے فرمایا کہ تجھ سے تو نہیں، ہاں اللہ سے ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو بارش کے داروغہ نے کہنا شروع کیا کہ مجھے پانی برسانے کا حکم ہو کہ میں اس کو بھیجوں، کہا: پس اللہ کا حکم اس کے امر کرنے سے زیادہ جلدی واقع ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ کہا: زمین میں کوئی آگ نہ بچی کہ وہ بجھ گئی۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دن آگ سے کسی نے فائدہ نہ اُٹھایا اور نہ ہی آگ نے ابراہیم علیہ السلام کا کچھ جلایا۔ ابراہیم علیہ السلام کو جس سے باندھا گیا تھا، صرف وہ جلا۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ﴿ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ تو اس کو مت جلانا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر اللہ عزوجل ﴿ وَّسَلٰمًا ﴾ نہ فرماتا تو اس کی سردی ابراہیم علیہ السلام کو ستاتی۔ امام جویبر رحمہ اللہ نے ضحاک رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے ایک خطیرہ (بہت بڑا ڈھیر) بڑی بڑی لکڑیوں سے بنایا تھا اور اس میں ہر طرف سے آگ دھکائی تھی، پس ابراہیم علیہ السلام نے صبح کی اس حال میں کہ اس آگ سے اُن کو کوئی نقصان نہ پہنچا، یہاں تک کہ اللہ نے اس کو بجھا دیا۔ کہا: یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام اُن کے ساتھ تھے، اُن کے چہرے سے پسینہ پونچھتے تھے، اُن کو اس آگ سے سوا اس کے کچھ نہ پہنچا۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آگ میں اُن کے ہمراہ سایوں کا فرشتہ تھا۔[2] امام علی بن ابی حاتم رحمہ اللہ نے منہال بن عمر سے روایت کیا ہے، (فتح القدیر میں امام ابن جریر رحمہ اللہ بھی ہے) کہا: مجھے خبر دی گئی کہ ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے، پھر وہ اس میں پچاس دن یا چالیس دن رہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں کبھی کسی دن رات میں اس سے زیادہ خوش نہیں تھا، جس وقت میں اس میں تھا، میں چاہتا ہوں کہ میرا سارا عیش و حیات میرے اس عیش کی طرح ہو کہ جب میں اس میں تھا۔[3]

امام ابو زرعہ بن عمرو بن جریر نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بہترین بات جو ابراہیم علیہ السلام کے والد نے کہی، جس وقت اُن سے طبق اُٹھایا اور وہ آگ میں تھے، اُن کو پایا کہ اُن کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا، اس وقت کہا: "نِعْمَ الرَّبُّ رَبُّكَ يَاِبْرَاهِيْمُ"، یعنی اچھا رب ہے تیرا رب یا ابراہیم۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس دن کوئی جانور نہیں آیا مگر اس نے ابراہیم علیہ السلام سے آگ بجھائی مگر وزغ (چھپکلی)۔[4] امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مار ڈالنے کا حکم فرمایا ہے اور اس کا نام فویسق رکھا ہے۔[5]

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٦٣٨)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٦ـ ٤٦٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٦)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٦) فتح القدير (٣/ ٥٦٨)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٦ـ ٤٦٧)
[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٣٨)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مولاۃ فاکہہ بن مغیرہ مخزومی سے روایت کیا ہے، کہا میں عائشہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئی تو میں نے اُن کے گھر میں ایک نیزہ دیکھا۔ میں نے کہا: اے ام المومنین! تم اس نیزے سے کیا کرتی ہو؟ فرمایا: ہم اس سے ان وزغوں کو مارتے ہیں، بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس وقت آگ میں ڈالے گئے تو زمین میں کوئی جانور نہ تھا، مگر وہ آگ کو بجھاتا تھا سوائے وزغ کے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر پھونکتا تھا، لہٰذا ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم فرمایا ہے۔[1]

﴿ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے ان کو مغلوب اور اسفل کر دیا، کیوں کہ انھوں نے اللہ کے نبی کے ساتھ کید کیا۔ لہٰذا اللہ نے ان کے ساتھ کید کیا اور خلیل علیہ السلام کو آگ سے نجات دی تو وہ لوگ اس جگہ مغلوب ہو گئے۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت خلیل علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو اُن کا بادشاہ آیا، تاکہ ان کی طرف دیکھے، پس ایک پتنگا اڑا تو اس کے انگوٹھے پر گر پڑا۔ پھر اس کو مثلِ صوفہ (اُون) کے جلا ڈالا، یعنی جس طرح بکری کا بال جلتا ہے، اسی طرح وہ بھی جل گیا۔[2] كذا في ابن كثير.

خلیل جلیل علیہ السلام کی قوم جب اپنے حیلہ و مکر سے اُن کو نقصان پہنچانے سے تھک گئی اور مجادلہ و مناظرہ سے تنگ ہو کر عاجز آ گئی اور مناظرے کی راہیں اُن پر تنگ ہو گئیں تو ظلم کی طرف جھکے۔ اظہارِ غلبہ کی طرف مائل ہوئے، کسی طرح سے ہو، کسی امر پر اتفاق پڑے۔ جو شخص باطل پر ہوتا ہے اور حجت و دلیل میں مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کی یہی عادت ہے کہ جب اس کے شبہے کو قطعی حجت آ کر ٹھونکتی ہے اور وہ فضیحت ہو جاتا ہے تو اس کو اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ لڑنے بھڑنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو اور جس طرح بن سکے دل کے پھپھولے پھوڑے اور اپنے غیظ و غضب کو تسکین دے۔ پس جب نمرودی ہر طرح سے عاجز ہو گئے تو بعض نے بعض سے کہا: ﴿ حَرِّقُوْهُ ﴾ یعنی ابراہیم کو جلا ڈالو، اس لیے کہ جن چیزوں سے عذاب کیا جاتا ہے، ان سب میں بڑھ کر ہولناک اور زیادہ سخت یہی آگ ہے۔ ﴿ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ ﴾ یعنی اپنے معبودوں کے واسطے ابراہیم علیہ السلام سے بدلہ لے کر اُن کو فتح مند اور کامیاب کرو، کون سے ابراہیم علیہ السلام! جس نے اُن کے ساتھ جو کیا، پس کیا۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴾ اگر تم ان کے قوی بالغ مدد کرنے والے ہو تو اس کے واسطے سب سے زیادہ ہولناک عذاب اختیار کرو، وہ یہی آگ سے جلا ڈالنا ہے، ورنہ تم نے اپنے بتوں کی نصرت میں کمی کی۔

کہتے ہیں کہ ان میں سے اس قول کا قائل نمروذ بن کنعان بن سحاریب یا سنجارنب بن نمروذ بن کوش بن حام بن نوح تھا۔ کسی نے کہا: ایک شخص اکراد فارس میں سے ہینون نامی تھا۔ (كذا في الجميل) خازن میں اس کا نام

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٣١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٨١)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٥_ ٢٤٦)

ہبرین ہے اور ابن کثیر میں ہیزن ہے۔ واللہ أعلم. جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں دھنسا دیا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے قولِ ثانی کو پہلے اور پہلے کو بلفظِ "قیل" ذکر کیا ہے اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اول کو اول اور ثانی کو ثانی رکھا ہے۔[1] پھر نمرودیوں نے بہت سی لکڑیاں جمع کیں اور سب میں آگ جلائی۔ ابراہیم علیہ السلام کو باندھا اور گوپھن میں اُن کو رکھ کر آگ میں پھینک دیا۔[2] (قاله المحلي)۔ لکڑیاں جمع کرنے کی مدت ایک مہینا تھی اور جلانے کی مدت سات دن اور آگ میں رہنے کی مدت سات دن۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چالیس دن یا پچاس اور اسی کے مثل امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] آگ میں ڈالے جانے کے وقت ابراہیم علیہ السلام سولہ برس کے تھے، یا چھبیس برس کے۔[4] (قاله الماوردي)

﴿ قُلْنَا ﴾ کے پہلے عبارت محذوف ہے، یعنی انھوں نے آگ جلائی اور خلیل علیہ السلام کو اس کی طرف لے گئے، پس اس وقت ہم نے کہا: ﴿ يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ یعنی اے آگ! ابراہیم علیہ السلام پر سرد اور سلامتی والی ہو جا، ایسی سرد ہو جا کہ مضر نہ ہو، ابراہیم علیہ السلام تجھ سے سلامت رہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر اللہ پاک یہ نہ کہتا تو وہ اپنی سردی کے مارے اُن کو ہلاک کر ڈالتی۔[5] مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس کی طبیعت کو، جس پر اس کو پیدا کیا ہے، اس سے کھینچ لیا، یعنی گرمی و جلانا اور روشنی پر اس کو باقی رکھا، جس طرح وہ تھی، اللہ پاک ہر شے پر قادر ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ آگ کا ہوائے طیب میں بدل جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، سوائے اس بات کے کہ اس طرح ہو جانا خلافِ عادت ہے۔ لہٰذا وہ اب من جملہ معجزاتِ خلیل علیہ السلام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آگ اپنے حال پر تھی، لیکن اللہ پاک نے اس کی ایذا کو ان سے دور کر دیا، جیسے تو دیکھتا ہے سمندل (ایک پرندے کا نام ہے اور اس کو آگ نہیں جلاتی) کو کہ وہ آگ میں رہتا ہے۔ اللہ پاک کا قول ﴿ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ یہی ظاہر کرتا ہے۔[6] امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے مصنف میں اور ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اول کلمہ جو ابراہیم علیہ السلام نے کہا: جس وقت اُن کو آگ میں ڈالا گیا، یہ تھا: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾۔[7]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام سدی رحمہ اللہ سے ﴿ يٰنَارُ كُوْنِيْ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے، جس نے آگ کو پکارا۔[8] امام فریابی، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "لو لم يتبع بردها سلاما لمات إبراهيم من بردها"۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ﴿ بَرْدًا ﴾ کے بعد ﴿ سَلٰمًا ﴾ نہ فرماتا تو اس کی سردی کے مارے مر جاتے۔ امام فریابی، ابن ابی شیبہ اور امام احمد رحمہم اللہ نے زہد میں اور

---

(1) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٠) تفسير النسفي (٣/ ٨٦) (2) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧)

(3) تفسير الرازي (٢٢/ ١٦٣) تفسير أبي السعود (٦/ ٧٦) (4) تفسير القرطبي (١١/ ٣٠٤) (5) تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٦)

(6) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠١) (7) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٧٦) الدر المنثور (٥/ ٦٣٩) (8) تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٥)

امام عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے معتمر بن سلیمان تیمی سے روایت کیا ہے، کہا کہ جبریل علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی طرف آئے اور اس وقت ان کو باندھا جا رہا تھا، تا کہ آگ میں ڈالا جائے، اُن سے کہا: اے ابراہیم! کیا تیری کوئی حاجت ہے؟ کہا: تیری طرف تو نہیں ہے۔[2] اس آیتِ کریمہ میں اس بنا پر کہ قائل اللہ پاک ہے، تین مبالغے ہیں: ایک یہ ہے کہ آگ جو کہ اللہ پاک کی قدرت کی مسخر تھی، اس کو مامور و مطیع ٹھہرایا۔ دوسرا یہ کہ "كوني ذات برد" کو "ابردي" کے مقام میں قائم کیا۔ تیسرا یہ ہے کہ مضاف، یعنی ذات کو حذف کیا اور مضاف الیہ، یعنی برد کو اس کی جگہ میں رکھا۔ کسی نے کہا کہ ﴿سَلٰمًا﴾ اپنے فعل سے منصوب ہے، یعنی "وسلمنا سلاما عليه"[3] (قاله البيضاوي) امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿سَلٰمًا﴾ معطوف ہے ﴿بَرْدًا﴾ پر تو یہ دونوں خبریں ہوں گی ﴿كُوْنِيْ﴾ کی اور ﴿عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ صلہ ہے ﴿سَلٰمًا﴾ کا، یعنی اس سے متعلق ہے اور ﴿بَرْدًا﴾ کا صلہ محذوف ہے، کیوں کہ یہ اس پر دال ہے، یعنی "كُوْنِيْ بَرْدًا عَلَيْهِ وَسَلَامًا عَلَيْهِ" امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: یا ﴿سَلٰمًا﴾ کی صفت ہے۔[4]

انموذج میں ہے کہ اللہ پاک نے جو نار سے خطاب فرمایا، یہ کیوں کر درست ہوا، حالانکہ خطاب عاقل ہی کے ساتھ ہوتا ہے؟ لہٰذا اس کا یہ جواب ہے کہ تحویل و تکوین کا خطاب عاقل کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ﴾ [سبا: ١٠] "(ہم نے حکم دیا:) اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح دہراؤ۔" نیز فرمایا: ﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا﴾ [حم السجدة: ١١] "تب اللہ نے اس سے اور زمین سے کہا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ۔" نیز فرمایا: ﴿وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ﴾ [هود: ٤٤] "اور کہا گیا: اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تو (برسنے سے) تھم جا۔" امام خازن رحمہ اللہ نے اس کا قصہ اس طرح نقل کیا ہے کہ جب نمرود اور اس کی قوم ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کے لیے جمع ہوئے تو اُن کو ایک گھر میں قید کیا اور ایک مکان بنایا حظیرے (قبرستان کی چار دیواری) کی طرح، جو کوثی گاؤں میں تھا، پھر ان کے لیے سخت سخت اور طرح طرح کی لکڑیاں ایک ماہ کی مدت میں جمع کیں، یہاں تک کہ کوئی آدمی بیمار پڑ جاتا تو کہتا کہ اگر میں اچھا ہو جاؤں گا تو ضرور ابراہیم علیہ السلام کے لیے لکڑیاں جمع کروں گا، عورت اپنے کسی مطلب میں نذر مانتی کہ اگر اس کو پا لے گی تو ضرور ابراہیم کی آگ میں ایندھن لائے گی اور کوئی عورت سوت کاتتی اور سوت کے عوض لکڑیاں خریدتی، اپنے دین میں اجر طلب کرنے کے لیے، کوئی آدمی اپنے مال سے لکڑیاں خریدنے کی وصیت کرتا۔

پھر جب جمع کر چکے جس کا انھوں نے ارادہ کیا تھا اور لکڑیوں میں ہر طرف آگ روشن کی، پھر وہ خوب مشتعل

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٦٤٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٧) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٠)

[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٢)

ہوگئی، یہاں تک کہ پرندے اس پر سے گزرتے تو اس کی لپٹ اور گرمی کی شدت کے مارے جل جاتے۔ پس اس کو سات دن برابر جلایا، پھر جب چاہا کہ خلیل علیہ السلام کو ڈالیں تو نہ جانا کہ اُن کو کس طرح ڈالیں۔ کہتے ہیں کہ ابلیس آیا، اس نے ان کو منجنیق کے عمل کی تعلیم دی۔ پھر خلیل علیہ السلام کی طرف گئے، اُن کو مقید کیا اور اس مکان کے سر پر اُن کو اٹھایا اور اُن کو گوپھن میں مقید و مغلول رکھا، پس آسمان و زمین اور اُن میں کے فرشتے اور ساری خلق سوائے جنوں اور انسانوں کے ایک چیخ چلائے کہ اے ہمارے رب! ابراہیم تیرا خلیل علیہ السلام آگ میں ڈالا جاتا ہے، حالانکہ تیری زمین میں ان کے سوا تیرا پوجنے والا کوئی نہیں ہے، لہٰذا تو اس کی مدد کے لیے ہمیں اِذن دے۔ اللہ پاک نے فرمایا: بے شک وہ میرا خلیل ہے، اس کے سوا کوئی میرا خلیل نہیں ہے اور میں اس کا معبود ہوں، سوائے میرے اس کا کوئی معبود نہیں ہے، پھر اگر وہ تم میں سے کسی سے استغاثہ کرے یا اس کو پکارے تو وہ اس کی مدد کرے، میں نے اس بات میں اس کو اذن دے دیا اور اگر وہ میرے غیر کو نہ پکارے تو میں اس کو خوب جانتا ہوں اور میں اس کا ولی ہوں، پس تم میرے اور اس کے درمیان میں چھوڑ دو۔

پھر جب ان کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو خلیل علیہ السلام کے پاس پانی کا داروغہ فرشتہ آیا، کہا کہ اگر تم چاہو تو میں آگ کو بجھا دوں۔ ہوا کا داروغہ آیا، کہا: اگر تم چاہو تو میں آگ کو ہوا میں اُڑا دوں۔ خلیل علیہ السلام نے فرمایا: تم سے میری کوئی حاجت نہیں ہے۔ "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ". پھر اُن کو گوپھن میں ڈال کر آگ کی طرف پھینک دیا تو جبریل علیہ السلام اُن کے سامنے آئے، کہا: اے ابراہیم! کیا تجھ کو کچھ حاجت ہے، کہا: تیری طرف تو نہیں ہے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اپنے رب سے سوال کر، خلیل علیہ السلام نے فرمایا: حَسْبِي مِنْ سَوَالِيْ عِلْمُهٗ بِحَالِيْ"، یعنی وہ میرے حال سے آگاہ ہی ہے، اس لیے مجھے اس سے سوال نہیں کرتا ہے۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے آگ بجھانے لگی، مگر وزغ کہ وہ آگ میں پھونکتا تھا۔

متفق علیہ حدیث میں ام شریک رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوزاغ کے قتل کا حکم فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے زیادہ کیا ہے اور فرمایا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر پھونکتا تھا۔[1] کہتے ہیں کہ فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بازو پکڑے، پھر اُن کو زمین پر بٹھا دیا، ناگاہ میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا اور سرخ گلاب اور نرگس، کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے ظل کے فرشتے کو خلیل علیہ السلام کی صورت میں بھیجا تو وہ اُن کے پہلو کی طرف بیٹھا، ان کو اُنس دینے لگا، یعنی تاکہ تنہائی کی وحشت دور ہو۔ کہا ہے کہ اللہ عزوجل نے جبریل علیہ السلام کو حریر جنت کا کرتا اور طنفسہ (بچھانے کا فرش یا کپڑا یا کھجور کا بوریا) دے کر بھیجا، لہٰذا انھوں نے کرتا ان کو پہنا دیا اور طنفسہ پر ان کو بٹھایا اور اُن کے پاس بات چیت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٣٧)

کرنے بیٹھ گئے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: اے ابراہیم! تمھارا رب کہتا ہے کیا تو نے نہیں جانا کہ آگ میرے دوستوں کو نقصان نہیں پہنچاتی، پھر نمرود نے نظر کی اور خلیل علیہ السلام کو اپنے محل سے جھانکا تو اُن کو دیکھا کہ ایک باغ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور فرشتہ اُن کے پہلو کی طرف بیٹھا ہے اور اُن کے گرداگرد آگ ہے، جو لکڑیوں کو جلا رہی ہے۔ پس ان کو پکارا: اے ابراہیم! تیرا بڑا معبود ہے، جس کی قدرت یہاں تک پہنچی کہ تیرے اور آگ کے درمیان حائل ہو گیا۔ اے ابراہیم! کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ اس سے نکل آئے؟ کہا: ہاں۔ نمرود نے کہا: کیا تو ڈرتا ہے کہ اگر تو ٹھہرا رہے تو وہ تجھے ضرر پہنچائے؟ کہا: نہیں، کہا: پھر تو کھڑا ہو اس سے نکل آ۔ پس خلیل علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور اس میں چلنے لگے، یہاں تک کہ اس سے نکل آئے، پھر جس وقت نمرود کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: اے ابراہیم! وہ کون آدمی تھا جس کو میں نے تیرے ساتھ تیری ہی مثل تیری صورت میں دیکھا، جو تیرے پہلو کی طرف بیٹھا ہوا تھا؟ خلیل علیہ السلام نے کہا: وہ ظل کا فرشتہ تھا، میرے رب نے میری طرف اس کو بھیجا تھا، تاکہ آگ میں میرا مونس ہو۔ پس نمرود نے کہا کہ اے ابراہیم! میں تیرے معبود کی قربت طلب کرنے والا ہوں، اس لیے کہ میں نے اس کی قدرت و عزت دیکھی، اس بات میں جو اس نے تیرے ساتھ کی جب کہ تو نے اس کی عبادت اور توحید کے سوا اور کا انکار کیا اور میں اس کے لیے چار ہزار گائے ذبح کرنے والا ہوں۔ خلیل علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تجھ سے قبول نہ کرے گا، جب تک تو اپنے دین پر ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے اور میرے دین کی طرف رجوع کرے، اس پر اس نے کہا کہ میں اپنے ملک کے چھوڑنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں، لیکن میں آیندہ اُن کو ذبح کروں گا، پھر اس نے ان کو ذبح کیا اور خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام سے باز رہا، اللہ عزوجل نے اس سے اُن کو روکا۔[1] انتهى ملخصاً.

امام ابن لقیمہ نے ذکر کیا ہے کہ خلیل علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو وزغ آیا اور وہ سام ابرص ہے۔ یہ ایک جانور ہے، اس کے پاؤں ہوتے ہیں، گھاس کی جڑوں میں دوڑتا ہے، کہتے ہیں کہ اونٹنی کا تھن پکڑ لیتا ہے اور اس کا دودھ پی جاتا ہے۔ مجمع البحار میں وزغ کے یہ معنے لکھے ہیں: زہردار ہے، فویسق اس کو اس لیے کہا ہے کہ معظم حشرات کی خلق سے نکالا گیا ہے، ان سے اس کا ضرر زیادہ ہے۔[2] مادۂ سم میں لکھا ہے سام ابرص وزغ کی ایک قسم ہے۔ صراح میں کہا ہے کہ چھپکلی کی طرح کا ایک جانور ہے، وہ سام ابرص آگ پر پھونکنے لگا، لہٰذا وہ اس وجہ سے بہرا کر دیا گیا اور نبی کریم ﷺ نے اس کے قتل کا امر فرمایا ہے اور فرمایا کہ اس لیے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام پر آگ پھونکا کرتا تھا[3] اور جو شخص کسی وزغ کو ایک ضرب میں قتل کرے تو اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور دوسری ضرب میں اس سے کم اور تیسری میں اس سے کم۔[4] بعض حکما نے ذکر کیا ہے کہ جس گھر میں زعفران ہوتی ہے، اس میں وزغ داخل نہیں ہوتا

---

[1] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٠۔ ٣٠١) [2] مجمع بحار الأنوار (٥/ ٤٨۔ ٤٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٣٧) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٠)

اور وزغ انڈے دیتا ہے۔

﴿ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا ﴾ یعنی نمرودیوں نے ابراہیم علیہ السلام کو جلانا اور اُن کو ضرر پہنچانا چاہا۔ ﴿ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴾ تو ہم نے اُن کو ہر زیاں کار سے زیادہ زیاں کار کر دیا، کیوں کہ ان کی سعی بے کار گئی اور جو انھوں نے اس کام میں صَرف کیا تھا، وہ ضائع ہوا، اُن کی مراد حاصل نہ ہوئی یا "أخسرین" کے معنی "هَالِكِيْنَ" ہیں، یعنی اللہ پاک نے نمرود پر اور اس کی قوم پر مچھر بھیجے تو انھوں نے اُن کے گوشت کو کھا لیا، اُن کا خون پی گئے۔ نمرود کے دماغ میں ایک مچھر گھس گیا تو اس کو ہلاک کر ڈالا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے،[1] یا یہ معنی ہیں کہ اُن کی سعی اس بات پر برہان قاطع ہوگئی کہ وہ باطل پر ہیں اور خلیل علیہ السلام حق پر ہیں اور خلیل علیہ السلام کے واسطے مزید درجات کی موجب ہوگئی اور اُن کے لیے بہت سخت عذاب کے استحقاق کا باعث بن گئی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2] یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے انھیں کو ہر خاسر سے زیادہ تر خاسر کر دیا اور اُن کا مکر انھیں پر پھیر دیا، پس ان کے لیے برا انجام کیا، جس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام کے واسطے اچھا انجام کیا۔ فتح القدیر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[3] كذا في فتح البيان وغيره.

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾
وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾
وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ
الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ۙ
وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ
تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ
فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ۧ

اور ہم نے اسے (ابراہیم) اور لوط کو اس زمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے اہلِ عالم کے لیے برکت رکھی تھی (71) اور ہم نے اسے اسحاق بخشا، اور یعقوب مزید (دیا)، اور ہم نے ہر ایک کو صالح بنایا (72) اور ہم نے انھیں امام بنایا، وہ ہمارے حکم سے (لوگوں کو) راہِ ہدایت بتاتے تھے اور ہم نے ان پر نیکیاں کرنے، نماز قائم رکھنے اور زکات دینے کی وحی کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار (بندے) تھے (73) اور ہم نے لوط کو حکم (نبوت) اور علم دیا اور ہم نے اسے اس بستی سے نجات دی، وہ (اس کے باشندے)

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠١) [3] فتح القدير (٣/ ٥٦٧) فتح البيان (٨/ ٣٤٦۔ ٣٤٨)

بدکاریاں کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ بہت برے اور نافرمان لوگ تھے (74) اور ہم نے اس (لوط) کو اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ صالحین میں سے تھا (75)

ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی سرزمین شام کی طرف ہجرت:

اللہ تعالیٰ خلیل جلیل علیہ السلام کے حال کی خبر دیتا ہے کہ اس نے اُن کو اس قوم کی آگ سے صحیح و سالم رکھا اور اس کے درمیان میں سے اُن کو نکالا، وہ ہجرت کر کے بلادِ شام کی طرف چلے گئے۔ من جملہ بلادِ شام زمینِ مقدس میں جا کر مقیم ہوئے، جیسا کہ ربیع بن انس نے عن ابی العالیہ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ﴿ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ شام ہے اور کوئی آبِ شیریں نہیں ہے، مگر وہ صخرے سے جو بیت المقدس میں ہے اس کے نیچے سے نکلتا ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ زمین عراق میں تھی، پس اللہ نے اُن کو شام کی طرف نجات دی۔ شام کو اعقار دار الهجرت کہتے ہیں، یعنی شام کی زمین ہجرت گاہ ہے اور جو شام سے کم ہوا، وہ فلسطین میں زیادہ کیا گیا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ محشر اور منشر کی زمین ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اسی میں نازل ہوں گے اور اسی میں مسیح دجال ہلاک ہوگا۔ کعب احبار نے ﴿ اِلَى الْاَرْضِ... الخ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ طرف حرّان کے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم و لوط علیہما السلام شام کی طرف چلے گئے تو وہ بی بی سارہ سے ملے اور وہ بادشاہ حرّان کی بیٹی تھی، انھوں نے اپنی قوم پر اُن کے دین میں طعن کی تھی، پس ابراہیم علیہ السلام نے بی بی سارہ سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اُن کو لے کر بھاگ جائیں۔[1] (رواه ابن جرير وهو غريب)

مشہور یہ قول ہے کہ بی بی سارہ ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی تھیں، اپنے بلاد سے اُن کو لے کر ہجرت کر گئے تھے۔ عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ارض سے مراد مکہ ہے، کیا تو اللہ کے اس قول کو نہیں سنتا: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (96) فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران: ٩٦] ''بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام دنیا کے لیے بڑی برکت اور ہدایت والا ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے۔'' امام عطا اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: ﴿ نَافِلَةً ﴾ سے مراد عطیہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور حکم بن عیینہ رحمہما اللہ نے کہا کہ نافلہ ولد الولد ہے، یعنی یعقوب فرزندِ اسحاق ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [هود: ٧١] ''پھر ہم نے اسے اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی۔'' عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٦٨۔ ٤٧٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٧)

نے کہا ہے کہ انھوں نے ایک مانگا تھا، لہٰذا یوں کہا: ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [الصافات: ١٠٠] ''اے میرے رب! مجھے (بیٹا) عطا فرما جو صالحین میں سے ہو۔'' پس اللہ پاک نے ان کو اسحق عطا کیا اور یعقوب زیادہ دیا۔[1]

﴿ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی سب کے سب خیر وصلاح والے ہیں۔

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً ﴾ یعنی ان کی اقتدا اور پیروی کی جاتی ہے۔ ﴿ يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ یعنی اللہ کی طرف اس کے اذن سے بلاتے ہیں اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ﴾ عطف خاص بر عام کے باب سے ہے، یعنی فعلِ خیرات عام ہے، نماز و زکات اس میں داخل ہیں۔ پھر خاص کر ان کا ذکر علاحدہ کیا۔ مزید شریف اور اہتمام کے لیے ﴿ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴾ یعنی اس کام کو کرتے تھے، جس کا لوگوں کو حکم دیتے تھے۔ پھر لوط علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ عطف کیا۔ لوط بن ہاران بن آزر ہیں، یہ ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، اُن کی پیروی کی تھی، اُن کے ساتھ ہجرت کر گئے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ﴾ [العنکبوت: ٢٦] ''پھر ابراہیم پر لوط ایمان لایا اور ابراہیم نے کہا: بے شک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔'' پس اللہ پاک نے ان کو حکم و علم دیا اور ان کی طرف وحی بھیجی اور اُن کو نبی کر دیا اور سذوم و اعمالِ سذوم کی طرف اُن کو بھیجا تو سذوم والوں نے ان کو جھٹلایا، ان کی مخالفت کی، اس پر اللہ پاک نے اُن کو ہلاک کیا، ان پر تباہی و بربادی نازل کی، جس کا قصہ اپنی کتابِ عزیز میں بہت جگہ ذکر فرمایا ہے اور اسی لیے فرمایا: ﴿ وَنَجَّيْنٰهُ... الآية ﴾[2] كذا في ابن كثير.

پہلے گزر چکا ہے کہ لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادے ہیں، اللہ پاک اس جگہ حکایت فرماتا ہے کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو زمینِ عراق سے اس زمین کی طرف نجات دی، جس میں اس نے جہان والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ نمرود کے ساتھ خلیل جلیل علیہ السلام کا واقعہ کوثی نامی گاؤں میں ہوا، کوثی حدودِ بابل زمینِ عراق میں ہے، لہٰذا اللہ پاک نے اس جگہ سے مبارک زمین کی طرف اُن کو نجات دی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ارضِ مبارک زمینِ شام ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾ [بني إسرائيل: ١] ''مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے۔'' سفیان رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ شام کی طرف نکلے، کسی نے اُن سے کہا کہ کدھر جاتے ہو، کہا: ایسے شہر کی طرف کہ جس میں ایک درہم کے عوض تھیلا بھر دیا جاتا ہے۔[3] مراد یہ ہے کہ وہاں ارزانی بہت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں ارزانی ہو، وہاں چلا جائے۔ سلف ایسا کیا کرتے تھے۔ لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام بن تارخ پر ایمان لے آئے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے کہا ہے: ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ اور لوط ہاران بن تارخ برادرِ خلیل علیہ السلام کے بیٹے تھے۔

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٧٠۔ ٤٧١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٧) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٦۔ ٢٤٧) [3] الكشاف (٣/ ١٢٧)

تارخ کو بجائے مہملہ بھی کہتے ہیں، ان کا نسب یہ ہے: لوط بن ہاران بن تارخ بن ناحور اور آزر تارخ پدر ابراہیم علیہ السلام و ہاران کا لقب ہے، لہٰذا ہاران اور ابراہیم دونوں بھائی ہوئے، ان کا ایک تیسرا بھائی ناخور اور تہایہ تھا، یہ تینوں تارخ کے لڑکے ہیں، بی بی سارہ بھی اُن پر ایمان لے آئی تھیں، یہ ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی ہیں۔ سارہ دختر ہاران اکبر عم ابراہیم علیہ السلام۔ پس خلیل علیہ السلام کوثی سے اپنے رب کی طرف ہجرت کر گئے اور اُن کے ہمراہ لوط علیہ السلام اور بی بی سارہ تھیں۔ چاہتے تھے کہ اپنے دین کو لے کر بھاگیں، خالص اپنے رب کی عبادت کریں، کوئی ان کا مزاحم نہ ہو، یہاں تک کہ حران میں پہنچے، پھر یہاں جس قدر اللہ نے چاہا اس قدر ٹھہرے، پھر یہاں سے کوچ کیا اور فلسطین (بیت المقدس کے دیہات) میں اترے۔ یہ بیابانِ شام ہے، پھر اس سے ہجرت کر کے نکلے، یہاں تک کہ مصر میں آئے، پھر مصر سے نکلے اور زمینِ شام کی طرف لوٹ آئے۔ سبع میں اترے، جمل میں یسع ہے۔ تفسیر خازن میں سبع (جگہ کا نام) ہے،[1] یہ جگہ فلسطین کی زمین سے ہے۔ اور لوط علیہ السلام مؤتفکہ میں اترے اور اللہ پاک نے مؤتفکہ والوں کی طرف ان کو نبی کر کے بھیجا۔ مؤتفکہ قومِ لوط کے دیہات ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے ان کو آسمان کی طرف اُٹھا کر زمین کی طرف اوندھا دے مارا۔ روایت کیا ہے کہ فلسطین اور مؤتفکہ کے درمیان ایک دن رات کی مسافت ہے، اللہ پاک نے زمینِ شام کو جو مبارک فرمایا، لہٰذا اس کی کئی وجہیں ہیں۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ شام کے برکاتِ عامہ یہ ہیں کہ اکثر انبیا علیہم السلام اسی میں مبعوث ہوئے، پس اُن کی شریعتیں جہان والوں میں منتشر ہوئیں، وہ شریعتیں جو کہ دینی و دنیوی کمالات و بھلائیوں کی حامل ہیں۔ کسی نے کہا: نعمتوں کی کثرت اور بہت زیادہ ارزانی۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے قولِ اول کے مثل ذکر کیا۔ پھر کہا کہ شام کی زمین ارزانی کی زمین ہے، اس میں غنی اور فقیر کا گزارہ اچھی طرح ہوتا ہے۔[3] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے شام کی زمین میں ارزانی اور درختوں اور پھلوں اور نہروں کی کثرت سے برکت دی ہے۔[4] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس میں برکت دی ہے، اس کا نام مبارک رکھا ہے،[5] اس لیے کہ نہیں ہے کوئی شیریں پانی، مگر اس کی اصل صخرے کے نیچے سے نکلتی ہے، جو کہ بیت المقدس میں ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے کہ برکت کی اصل خیر کا ثابت رہنا ہے، اسی معنی سے یہ ہے کہ جب اونٹ اپنی جگہ پکڑ لیتا ہے اور وہاں سے ٹلتا نہیں ہے تو بولتے ہیں: "بَرَكَ الْبَعِيْرُ"، یعنی اونٹ بیٹھ گیا، جم گیا، جگہ پکڑ لی۔[6] اور تفسیر عالمین کی اول گزر چکی ہے۔

شام کی فضیلت احادیث کی روشنی میں:

شام کی فضیلت میں کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، من جملہ اُن کے ایک یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ ابو قتادہ سے

---

[1] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠١) [3] تفسير النسفي (٣/ ٨٦)
[4] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٢) [5] تفسير البغوي (٥/ ٣٢٩) [6] فتح القدير (٣/ ٥٦٨) فتح البيان (٨/ ٣٤٩)

مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو مدینے کی طرف کیوں نہیں آجاتا، اس میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت گاہ اور آپ کی قبر مبارک ہے۔ کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المومنین! میں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب میں یہ بات پائی ہے کہ شام زمین میں سے اللہ کا خزانہ ہے اور اس میں اس کا خزانہ ہے، اس کے بندوں سے۔[1] دوسری حدیث یہ ہے کہ عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ فرماتے تھے: قریب ہے کہ ہجرت ہوگی بعد ہجرت کے، لہٰذا زمین والوں سے بہتر وہ ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ کو لازم پکڑنے والے ہیں۔[2] (أخرجه أبو داود)

ہجرتِ ثانی سے مراد شام کی ہجرت ہے، شام میں قیام کرنے کی رغبت دلاتے ہیں۔ تیسری حدیث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوشی ہو اہلِ شام کے لیے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ فرمایا: اس لیے کہ فرشتے اپنے پر اس پر بچھانے والے ہیں۔[3] (أخرجه الترمذي) چوتھی حدیث بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے، کہا میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھ کو کہاں کا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: اس جگہ کا اور اپنے دست مبارک سے شام کی طرف اشارہ فرمایا۔[4] (أخرجه الترمذي) غرضیکہ شام کے فضائل و خصائص بہ کثرت ہیں، اس لیے اپنے خلیل جلیل علیہ السلام کی ہجرت گاہ اس کو ٹھہرایا۔ اللہ پاک نے اپنے خلیل علیہ السلام پر کئی احسان کیے: اول تو لڑکپن ہی میں نیک راہ کا الہام کیا، پھر ظالم جابر کے پنجے سے چھڑایا، پھر ایسی بابرکت زمین رہنے کے لیے بسنے کو عطا کی۔ پھر اولادِ صالح عنایت فرمائی۔

پس ان پر اس کا احسان رکھ کر ارشاد فرمایا: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ﴾ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: نفل و نافلہ عطیۂ تطوع کو کہتے ہیں، یعنی نفلی بخشش، اس لحاظ سے کہ وہ واجب نہیں ہے، اسی باب سے نمازِ نافلہ ہے اور نافلہ ولدِ ولد کو بھی کہتے ہیں، یعنی پوتا۔ نوافل بہ معنی عطایا ہے۔ نوفل اس مرد کو کہتے ہیں جو زیادہ عطا کرنے والا ہو، پس نافلہ جو اس آیت میں مذکور ہے، ہوسکتا ہے کہ بہ معنی عطیہ ہو، یعنی اللہ پاک نے براہِ تفضّل لڑکا عطا فرمایا، اس کے علاوہ کہ جزائے مستحق ہو اور دعا پر عطا ہوا ہو۔ اس صورت میں مفعول سے اور جو اس پر معطوف ہے، سب سے حال ہوگا۔ یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب بخشے درآں حالیکہ ان میں سے ہر ایک عطیہ ہے۔ اللہ پاک نے وہ دونوں انھیں عطا فرمائے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر مصدر منصوب ہے، یعنی ﴿ وَهَبْنَا لَهٗٓ ﴾ کا مفعول مطلق ہے من غیر

---

[1] مصنف عبدالرحمن (١١/ ٢٥١) البتہ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٠٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٩٢٠)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٩٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: فضائل الشام و دمشق (١/ ١٣)

لفظه۔ معنی یہ ہیں: "وهبنا له هبة مبتدأة"۔ امام زجاج اور مجاہد رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے کہ نافلہ سے مراد عطیہ ہے۔[1]

امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ﴾ کے معنی ہیں: "أَعْطَيْنٰهُ" اور ﴿ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ﴾ کے معنی عطیہ ہیں۔[2] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ نَافِلَةً ﴾ سے مراد "ولد الولد" ہو، کیونکہ یعقوب علیہ السلام اسحاق بن ابراہیم علیہما السلام کے فرزند ہیں۔ پوتے کو نافلہ اس لیے کہتے ہیں کہ بیٹے پر زیادہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ اسحاق ولد ہیں اور یعقوب نافلہ فرزند فرزند۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[3] امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے حکم سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔[4] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ نافلہ خاص یعقوب علیہ السلام ہیں،[5] کیونکہ فرزندِ فرزند ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نافلہ سے مراد زیادت ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٩] "اور رات کے کچھ حصے میں بھی آپ اس (قرآن) کے ساتھ تہجد پڑھیں، (یہ) آپ کے لیے زائد ہے۔" یعنی فرائض سے بڑھ کر۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام اُن کے سوال سے زیادہ دیے، کیوں کہ انھوں نے صرف لڑکے کا سوال کیا تھا، لہٰذا اللہ پاک نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور اُن کو اسحٰق فرزند عطا فرمایا، تاکہ اُن کے ساتھ وحشتِ مسافرت سے ان کو اُنس ہو اور اُن کی دعا کے بغیر یعقوب علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام سے عطا فرمایا، پس یعقوب علیہ السلام نافلہ ہوئے، جس طرح کہ نفلی شے ہوتی ہے اور فرزند پر زیادہ ہوئے، کیوں کہ فرزند کے فرزند ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں نافلہ حال ہوگا فقط معطوف علیہ، یعنی یعقوب سے، جس طرح کہ ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ فقط شمس وقمر سے حال ہے بسببِ عدمِ التباس کے۔ تحبیر میں ذکر کیا ہے کہ اسحٰق علیہ السلام ایک سو سینتالیس برس زندہ رہے۔ ﴿ وَكُلًّا ﴾ مفعول اول ہے ﴿ جَعَلْنَا ﴾ کا۔ صالحین دوسرا مفعول ہے، یعنی ہم نے ان چاروں میں سے ہر ایک کو صالح کیا نہ یہ کہ بعض کو کیا بعض کو نہ کیا۔ یعنی ابراہیم، لوط، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کو۔ فتح القدیر، فتح البیان اور بیضاوی میں ﴿ كُلًّا ﴾ سے مراد انھیں چاروں کو ذکر کیا ہے۔[6] تفسیر محلی، نسفی اور خازن میں سوائے لوط علیہ السلام کے تینوں کا ذکر کیا ہے۔[7] صلاح سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان کو صلاح کی توفیق دی اور اس پر آمادہ کیا تو وہ کامل ہو گئے یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے اُن کو اللہ کا مطیع اور معصیت کا تارک کیا۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ان کو نبی کیا۔[8] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم نے دین ونبوت میں صالح کیا۔[9]

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٤٧١) فتح القدير (٣/ ٥٦٩) (2) الدر المنثور (٥/ ٦٤٣) (3) تفسير الطبري (١٨/ ٤٧١)
(4) الدر المنثور (٥/ ٦٤٣) (5) فتح القدير (٣/ ٥٦٩) (6) فتح القدير (٣/ ٥٦٩) فتح البيان (٨/ ٣٤٩) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠١)
(7) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) تفسير النسفي (٣/ ٨٦) تفسير الخازن (٤/ ٣٠٣) (8) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧)
(9) تفسير النسفي (٣/ ٨٦)

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ یعنی ہم نے ان کو مقتدا و رئیس و سردار بنایا کہ خیرات و اعمالِ صالحہ میں ان کا اقتدا کیا جائے، لوگوں کو ہماری وحی سے، جو ہم اُن پر نازل کریں راہِ حق بتائیں، وہ وحی جس کا ہم نے ان کو حکم دیا ہے اور جس کے ساتھ ہم نے ان کو بھیجا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مکمل ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ راہِ حق بتانے والے ہم ہیں اور وہ درمیان میں واسطہ ہیں، گویا جو کام وہ کرتے ہیں، اس کو ہم ہی کرتے ہیں، اس لیے کہ اُن کا کاروبار ہمارے حکم و وحی سے ہے۔ ﴿ اَىِٕمَّةً ﴾ میں دو قراءتیں ہیں: ایک تو بہ تحقیق ہر دو ہمزہ۔ دوسری ہمزۂ ثانی کا حرف یائے تحتیہ سے بدلنا، محلی نے ان کو ذکر کیا ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراءت میں یہ صحیح نہیں ہے گو عربیت میں جائز ہے۔ اگر تسہیل ہمزۂ ثانیہ کہتے تو البتہ ایک قراءتِ متواترہ من جملہ قراءتِ سبعہ ہوتی۔

﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ﴾ خیرات سے مراد سارے اعمالِ صالحہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ شرائعِ نبوات مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اول خود اُن کی صلاح کی مدح کی کہ وہ فی نفسہٖ صالح تھے اور طاعتِ الٰہی کے ساتھ عمل کرتے تھے۔ پھر اس بات کی مدح کی کہ وہ اپنے غیر کی بھی اصلاح کرتے تھے۔ اس طریقے سے کہ اُن کے رب نے اس کا اُن کو حکم دیا تھا اور اپنے بندوں کے کامل کرنے کے لیے ان کو بھیجا تھا۔ پھر اس بات کی مدح کی کہ اپنی امتوں کو ان کاموں کے کرنے پر آمادہ کریں اور انھیں رغبت دلائیں، کیوں کہ نبیوں کی طرف جن چیزوں کی وحی کی جاتی ہے اُن کو تعلیم فرمائی اور اُن کی طرف اس بات کی وحی کی کہ نیکیاں کی جائیں اور نماز قائم کی جائے اور زکات دی جائے، تاکہ علم کی طرف عمل ملنے سے اُن کا کمال پورا ہو جائے، ان چیزوں کی وحی کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اُن میں سے بڑی چیز یہی شرعی تکالیف ہوتی ہے، جو اُمت سے متعلق ہیں۔ اسی لیے امام بیضاوی، نسفی اور محلی رحمہم اللہ نے ﴿ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ ﴾ کو مصدر مجہول ٹھہرایا ہے۔[1] اس لیے کہ اگر مصدر معروف مانا جائے اور معنی کے لحاظ سے موحیٰ ﴿ اِلَيْهِمْ ﴾ کی ضمیر کی طرف مضاف ہو اور تقدیر یہ ٹھہرے کہ "فعلهم الخيرات و إقامتهم الصلاة و إيتاءهم الزكاة" تو اس سے یہ بات سمجھی جائے گی کہ یہ احکام من جملہ تکالیفِ عامہ ہیں، جن میں انبیا و اُمتیں سب شریک ہیں۔ اصل عبارت اس طرح ہے: "وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ أَنْ تُفْعَلَ الْخَيْرَاتُ وَتُقَامَ الصَّلَاةُ وَتُؤْتَى الزَّكَاةُ" یعنی ہم نے اس بات کی وحی کی کہ یہ کام کیے جائیں، اُن کو تم بھی کرو، تمھاری اُمت بھی کرے۔ پھر اس عبارت سے یہ عبارت بنائی گئی۔ "فعلا الخيرات و إقامة الصلاة و إيتاء الزكاة" یعنی ان مصدر یہ مابعد کے مصدر منون ناصب مابعد بنایا گیا۔ پھر اس مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کی گئی تو ﴿ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ... الخ ﴾ ہو گیا۔

فتح القدیر و فتح البیان میں صرف یہ معنی لکھے ہیں کہ ہم نے اُن کی طرف وحی کی کہ طاعات کریں۔ دوسرا وہی

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠١) تفسير النسفي (٣/ ٨٦) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧)

قول لکھا ہے کہ خیرات سے مراد شرائعِ نبوات ہیں،[1] رہی یہ بات کہ صلات و زکات کو خیرات کے بعد علاحدہ کر کے ذکر کیا، اس لیے کہ ان کا شرف و فضل بہ نسبت باقی خیرات کے زیادہ ہے۔ نماز افضل عباداتِ بدنیہ ہے، اللہ کے ذکر کے لیے شروع ہوئی ہے اور زکات افضل عباداتِ مالیہ ہے اور ان دونوں میں اللہ کے امر کی تعظیم ہے اور خلق اللہ پر شفقت و مہربانی۔ ﴿ اِقَامَ الصَّلٰوةِ ﴾ کی اصل اقوام ہے، پہلا الف بابِ افعال کا ہے۔ دوسرا واو سے بدل ہے، معتل عین میں ایک الف کو حذف کر کے اس کے عوض میں حرفِ تا لاتے ہیں۔ پس ﴿ اِقَامَ ﴾ اصل میں اقامت ٹھہرا، لیکن یہاں صرف تا کو اس لیے حذف کر دیا ہے کہ مضاف الیہ اس کے قائم مقام ہو گیا ہے۔ قرآن میں حرفِ تا کا اثبات مع اضافت کے بھی آیا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ﴾ [النحل: ۸۰] ''اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن۔''

شاید آیتِ باب میں تا کو تکرار کے واسطے حذف کر دیا، کیونکہ ایک حرفِ تا خیرات میں آیا ہے، دوسرا یہ ہوا۔ یا اس لیے حذف کیا کہ حروفِ کلمات کے نظم میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی برابر ہو جائے، کیوں کہ کلمہ ﴿ فِعْلَ ﴾ ثلاثی ہے اور ﴿ اِقَامَ ﴾ رباعی اور ﴿ اِيْتَآءَ ﴾ خماسی ہے آخر تک ایک حرف کی زیادتی برابر چلی آتی ہے۔ اگر اقامت بتا ہوتا تو دو خماسی ایک جگہ جمع ہو جاتے۔ رہا ظعن و اقامت، لہٰذا یہاں بھی ترقی ہے، ظعن ثلاثی اور اقامت خماسی۔ اگر اور کوئی کلمہ ہوتا تو اس کے نظمِ حروف کی رعایت کی جاتی، چونکہ یہاں دو ہی کلمے تھے، اس لیے حرفِ تا کو قائم رکھا، کیونکہ اس میں دو حرف کی ترقی ہے۔ والله أعلم بكلامه و حسن انسجامه۔

پھر جب اللہ پاک انواع و اقسام کی نعمتوں کا ذکر فرما چکا، جس کا اس نے وفائے عہدِ ربوبیت کے طور پر اُن پر انعام فرمایا تھا تو یہ بیان کیا کہ انھوں نے عہدِ عبودیت کو پورا کرنے کے لیے طاعت و عبادت میں شغل کیا، پس فرمایا: ﴿ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴾ یعنی وہ عبادت میں موحد مخلص تھے، خاص ہماری ہی پوجا کرتے تھے، بتوں کو نہیں پوجتے تھے، اسی واسطے ﴿ لَنَا ﴾ کو مقدم کیا ہے، تاکہ عبادت کا حصر ہو جائے۔ پس اے گروہِ عرب! تم تو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہو، تم اس بات میں اُن کی پیروی کرو تم بتوں کو کیوں پوجتے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عٰبِدِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہمارے مطیع و فرماں بردار تھے، جس چیز کا ہم نے اُن کو حکم دیا تھا، اس کو کرتے تھے، جس بات سے ہم نے اُن کو منع کیا تھا، اس کے تارک تھے۔

﴿ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ منصوب علی شریطۃ التفسیر ہے۔ یعنی ''وَآتَيْنَا لُوطًا آتَيْنَاهُ'' اور جملہ معطوف ہے ﴿ وَوَهَبْنَا ﴾ پر، یا منصوب بفعلِ مذکور مابعد ہے، یا ''اذکر'' محذوف اس کا ناصب ہے۔ اللہ پاک نے ابراہیم اور لوط علیہما السلام کا ایک جگہ ذکر فرمایا، پھر ہر ایک پر جو انعام کیا، اس کا بیان فرمایا۔ جب ابراہیم علیہ السلام کے انعام کا ذکر

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٦٩) فتح البيان (٨/ ٣٥٠)

ہو چکا تو لوط علیہ السلام پر جو انعام کیا، اس کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ یہاں چار نعمتوں کا ذکر کیا ہے: اول نعمت تو حکم ہے۔ حکم سے مراد حکمت ہے، یعنی وہ عمل جس کا کرنا واجب ہے، یا مراد نبوت ہے، یا جھگڑوں کا حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہ اللہ نے یہی تینوں قول ذکر کیے ہیں۔[1]

دوسری نعمت یہ ہے کہ اُن کو علم دیا۔ علم سے مراد وہ ہے جس کا جاننا انبیا علیہم السلام کے لائق ہے، یا علم سے مراد امرِ دین کی معرفت یا فقہ ہے جو اُن کے لائق ہے۔ جس صورت میں حکم سے مراد جھگڑوں کے درمیان فیصلہ کرنا اور علم سے مراد فقہ ہو تو علم کا عطف حکم پر سبب کا عطف مسبب پر ہوگا۔ تیسری نعمت یہ ہے: ﴿ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ﴾۔ قریہ سے مراد سذوم ہے، چنانچہ گزر چکا ہے کہ خبائث سے مراد لواطت ہے اور پادنا ہے، اپنی مجلسوں میں پادا کرتے تھے اور راہ چلنے والوں کو کنکریاں مارا کرتے تھے۔ مٹی کے غلے بنا کر مارتے تھے، پرندوں سے کھیلتے تھے، اس کے سوا اور برے کام ہیں، جن کا ذکر آئے گا۔

خبائث کی نسبت قریہ کی طرف یا مجازِ عقلی کے طور پر ہے یا مضاف محذوف ہے، یعنی اہلِ قریہ اور مضاف الیہ کو بجائے مضاف قائم کیا ہے۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴾ اس پر دال ہے، کیوں کہ یہ جملہ اس کے واسطے تعلیل کے مثل ہے۔ فسوق کے معنی خروج کے ہیں، فاسقین کے یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ اللہ پاک کی طاعت سے خارج تھے، جب تو ایسے افعالِ شنیعہ کے مرتکب ہوتے تھے۔ چوتھی نعمت یہ ہے کہ ﴿ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ﴾ یعنی ہم نے اس کو اس ناپاک قوم سے نجات دے کر اپنے اہلِ رحمت میں داخل کر لیا۔ یا رحمت سے مراد نبوت ہے، یا اسلام، یا ثواب، یا جنت۔ ﴿ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی لوط علیہ السلام کے واسطے یہ سب کام اس واسطے کیے کہ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے لیے اللہ پاک کی طرف سے نیکی سابق ہو چکی ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہ سب کام اُن کی نیکی پر جزا دینے کے لیے کیے، جس طرح کہ اُن کی قوم کے فساد پر عذاب کرنے کے لیے اُن کو ہلاک کیا۔ پہلا قول بیضاوی رحمہ اللہ وغیرہ کا حاصل ہے اور دوسرا قول نسفی رحمہ اللہ کا حاصل ہے۔[2] پھر اللہ پاک نے چوتھا قصہ جناب نوح علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ کی تسکین کے لیے ذکر فرمایا:

﴿ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝٧٦ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٧٧ ﴾

اور نوح کو بھی (یاد کریں) جب اس سے پہلے اس نے (ہمیں) پکارا تو ہم نے اس کی دعا قبول کی،

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠١) تفسير النسفي (٣/ ٨٦-٨٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢) تفسير النسفي (٣/ ٨٧)

چناں چہ ہم نے اسے اور اس کے اہل (مومنوں) کو بہت بڑے غم سے نجات دی (76) اور ہم نے اس کی مدد کی اس قوم کے خلاف جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، بے شک وہ برے لوگ تھے، لہٰذا ہم نے ان سب کو غرق کر دیا (77)

نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنے بندے اور رسول نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی، جس وقت انھوں نے یہ دعا کی کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [القمر: ١٠] ''تب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک میں بے بس ہوں، اب تو ہی انتقام لے۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦۔ ٢٧] ''اور نوح نے کہا: (اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔ بلاشبہہ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آیندہ) فاجر کافر ہی جنیں گے۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ ﴾ اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جو اُن پر ایمان لائے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ [هود: ٤٠] ''اور اپنے گھر والوں کو، سوائے اس شخص کے جس کی بابت پہلے حکم ہو چکا، اور ان کو بھی جو ایمان لا چکے ہیں، اور اس پر تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے تھے۔''

کربِ عظیم سے مراد شدت، تکذیب اور ایذا ہے، کیوں کہ وہ اُن میں پچاس کم ہزار برس رہے۔ اللہ عز وجل کی طرف اُن کو بلاتے تھے، اُن میں سے بہت تھوڑے لوگ اُن پر ایمان لائے اور وہ لوگ اُن کو ایذا دینے کا قصد کرتے تھے۔ ایک قرن کے بعد دوسرا قرن اور ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ برابر اُن کی مخالفت کی وصیت کرتے چلے آتے تھے۔ ﴿ وَنُوْحًا ﴾ سے یہ مراد ہے: ''ونجيناه و خلصناه منتصرا'' یعنی ہم نے اس کو نجات دی اور خلاصی دی، اس حال میں کہ وہ فتح یاب ہونے والا تھا اس قوم سے، جس نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی، وہ بری قوم تھی۔ ﴿ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو عذابِ عام سے ہلاک کر ڈالا۔ اصل کا لفظ ''أَهْلَكَهُمُ اللّٰهُ بِعَامِهِ'' ہے۔ واللہ أعلم۔ روئے زمین پر اُن میں سے کوئی باقی نہ رہا، جس طرح کہ اُن کے نبی نے ان پر بددعا کی تھی۔[1] كذا في ابن كثير۔

﴿ وَنُوْحًا ﴾ میں دو وجہیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ لوط علیہ السلام پر معطوف ہے، اس بنیاد پر کہ لوط کے ساتھ مشترک

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٤٧۔ ٢٤٨)

ہوگا اس کے عامل میں اور وہ عامل "اٰتَیْنَا" ہے، جس کی تفسیر "اٰتَیْنَا" ظاہر کر رہا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَنُوْحًا اٰتَیْنَاہُ حُکْمًا" اس بنا پر ﴿ اِذْ ﴾ بدل ہوگا نوح سے بدلِ اشتمال۔ اس قسم کی تحقیق سورت طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے باضمار "اذکر" مقدر "أي اذكر نوحا" یعنی تو اُن کے قصے اور خبر کو ذکر کر اس بنا پر ﴿ اِذْ ﴾ منصوب ہوگا، نفسِ مضاف مقدر سے۔ "أي خبرهم الواقع في وقت كان كيت وكيت" یعنی تو اُن کی خبر ذکر کر جو فلاں فلاں وقت میں واقع ہوئی۔ معنی یہ ہیں کہ تم یاد کرو نوح کو، جبکہ انھوں نے پکارا اپنے رب کو، یعنی اپنی قوم پر ہلاکت کی بددعا کی انبیا علیہم السلام مذکورین سے پہلے۔ یہ دعا تفصیلی تھی، یوں کہا تھا: ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] "(اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔" "دیار" کے معنی نازل دار، یعنی گھر میں نزول کرنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کو مت چھوڑنا، یہ دعا اس وقت کی تھی، جب اللہ پاک نے ان کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ ﴿ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ ﴾ [هود: ٣٦] "تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا، سوائے اس کے جو (پہلے) ایمان لا چکا ہے۔" انھوں نے ایک اجمالی دعا اور کی تھی، وہ یہ ہے: ﴿ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [القمر: ١٠] "بے شک میں بے بس ہوں، اب تو ہی انتقام لے۔"

جلال محلی نے سورت نوح میں اسی طرح کہا ہے۔[1] رہے خاتم النبیین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین ہمارے نبی ﷺ، آپ نے اُمت کے واسطے دعائے ہدایت یوں فرمائی تھی: «رَبِّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَفْهَمُونَ كَمَا فَهِمْنَا» یعنی اے میرے پروردگار! تو میری قوم کو ہدایت کر، کیوں کہ وہ نہیں سمجھتی ہے، جیسا ہم سمجھے ہیں، اور اسی لیے وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اُمت اہلِ محشر کا دو تہائی ہوگی اور اُن کے لیے جنت کے تین چوتھائی حصے ہوں گے، بلکہ جنت کے دس میں سے نو حصے اور باقی اُمتوں کے لیے ایک حصہ ہوگا۔ شیخ سنوسی نے شرح صغریٰ میں اس کو ذکر کیا ہے۔

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، پس ہم نے اس کو اور اس کے اہل کو بڑے کرب سے نجات دی۔ اہل سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اُن کی اولاد اور قوم میں سے مومن تھے۔[2] (قاله النسفي) محلی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جو لوگ اُن کی کشتی میں تھے۔[3] جلال الدین رحمہ اللہ نے سورت ہود کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ لوگ صرف چھے مرد تھے اور اُن کی بیویاں۔ کسی نے کہا ہے کہ سارے کشتی والے اسّی آدمی تھے، آدھے مرد اور آدھی عورتیں۔[4] کربِ عظیم سے مراد طوفان ہے، یا ایذا اُن کی قوم کی اور کرب کے معنی شدید غم ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ طوفان اور اہلِ طغیان کی تکذیب۔[6]

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٧٦٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧)

[4] تفسير الجلالين (١/ ٢٩٠) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢) [6] تفسير النسفي (٣/ ٨٧)

محلی رحمہ اللہ کا بھی یہی حاصل ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "الغرق و تكذيب قومه له"[1] امام خازن رحمہ اللہ نے اس لفظ کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔[2] فتح القدیر کے الفاظ: "من الغرق بالطوفان" ہیں۔[3]

﴿ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ اس جگہ "نصرنا" بہ معنی "منعنا" ہے، جس کا مطاوع "انتصر" بہ معنی "امتنع" ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٩٣] "اللہ کے سوا کیا وہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں یا وہ بدلہ لے سکتے ہیں؟" یعنی کیا وہ منع کرتے ہیں تم کو، یا وہ ممتنع ہوتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ نصر یہاں بمعنی منع ہے، بمعنی اعان نہیں ہے، اس کا حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ کے ساتھ متعدی ہونا، اس پر دال ہے، کیونکہ نصر بہ معنی اعان علی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "نصره الله على عدوه" یعنی اللہ نے اس کو اس کے دشمن پر نصرت دی۔ پھر جب یہاں ﴿ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ ﴾ کہا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے معنی "منعناه و حميناه منهم" ہیں۔ اسی باب سے یہ قول ہے اللہ پاک کا: ﴿ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ ﴾ [المؤمن: ٢٩] "اگر اللہ کا عذاب ہم پر آ گیا تو کون ہماری مدد کرے گا؟" اور انتصار جس طرح بہ معنی امتناع ہوتا ہے، اسی طرح بہ معنی انتقام بھی آتا ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام بیضاوی کا لفظ "جعلناه منتصرا"[4] اور نسفی کا لفظ "منعناه منهم أي من أذاهم"[5] ہے اور محلی و خازن نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[6] فتح القدیر میں یوں کہا ہے: "نصرناه نصراً مستتبعا للانتقام من القوم" امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مِنْ ﴾ بہ معنی "علی" ہے۔[7] اس سے معلوم ہوا کہ نصر اپنے معنی پر ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کو اُن لوگوں سے بچایا، محفوظ رکھا، جنھوں نے اس کی نشانیوں کی تکذیب کی، جو کہ اُن کی رسالت کی دلیل تھیں، تا کہ ان کی طرف برائی کے ساتھ نہ پہنچ سکیں۔

پھر اللہ پاک نے اس کی علت بیان فرمائی: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی وہ برے لوگ تھے تو اُن سب کو ہم نے غرق کر دیا۔ یعنی اُن میں سے کسی کو نہ چھوڑا، بلکہ ان کے چھوٹے بڑے مرد و عورت کو ڈبو دیا، اس لیے کہ وہ لوگ گناہوں پر جمے ہوئے تھے۔ تفسیر بیضاوی میں کہا ہے کہ اُن کو اس لیے غرق کیا کہ دو باتیں جمع ہو گئی تھیں: ایک تو حق کا جھٹلانا، دوسرے شر میں انہماک، یعنی برائی میں ڈوبے رہنا، یہ دونوں باتیں جس قوم میں جمع ہوئیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک ہی کر ڈالا۔[8]

نوح علیہ السلام چالیس برس کی عمر میں مبعوث ہوئے، پچاس کم ہزار برس اپنی قوم میں رہے، طوفان کے بعد ساٹھ برس تک زندہ رہے، اس بنا پر اُن کی عمر ایک ہزار پچاس برس ہوئی۔ کتاب تحبیر میں اسی طرح کہا ہے، اُن کی عمر سب

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) [2] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٣) [3] فتح القدير (٣/ ٥٦٩)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢) [5] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) تفسير الخازن (٤/ ٣٠٣)
[7] فتح القدير (٣/ ٥٦٩) [8] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢)

نبیوں سے بڑھ کر دراز ہوئی اور سب سے زیادہ تر اُن کی بلا (آزمائش) بھی ہوئی۔ پھر اللہ پاک نے پانچواں قصہ داود وسلیمان علیہما السلام کا نبی اکرم ﷺ کی تسلی وتشفی کے لیے ذکر کیا۔ پس فرمایا:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۙ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور (یاد کریں) داود اور سلیمان کو جب وہ دونوں اس کھیتی کی بابت فیصلہ کر رہے تھے، جسے رات کو (ایک) قوم کی بکریاں چر گئی تھیں، اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے (78) چناں چہ ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا، اور ہر ایک کو ہم نے حکم (نبوت) اور علم دیا، اور ہم نے داود کے ساتھ پہاڑ اور پرندے مسخر کیے تھے، وہ تسبیح کرتے تھے، اور (یہ) ہم ہی کرنے والے تھے (79) اور ہم نے اسے تمھارے لیے زرہ بنانا سکھایا تھا، تاکہ تمھاری لڑائی (کی تکلیف) سے تمھیں بچائے، پھر کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ (80) اور (ہم نے) سلیمان کے لیے تند و تیز ہوا (مسخر کر دی)، وہ اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی، اور ہم ہی ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں (81) اور کئی شیطان بھی (تابع کیے تھے) جو اس کے لیے (سمندر میں) غوطہ لگاتے، اور اس کے علاوہ بھی کئی کام کرتے تھے اور ہم ہی ان کے نگران تھے (82)

داود علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا ذکر:

دونوں کو ہم نے حکم و علم دے رکھا تھا۔ داود علیہ السلام نے بکریاں کھیتی والوں کو اُن کے نقصان کے بدلے دلوا دیں۔ ان کے دین میں چور کو غلام کر لیتے تھے، اسی کے مطابق یہ فیصلہ کیا اور سلیمان علیہ السلام لڑکے تھے، انھوں نے بھی یہ جھگڑا اپنے پاس منگوا لیا اور کھیتی والوں سے کہا کہ بکریاں رکھو اور اُن کا دودھ پیو اور بکری والے کھیتی کو پانی دیا کریں، جب کھیتی پہلے کی طرح ہو جائے، تب بکریاں واپس کر دیں اور کھیتی لے لیں، جس میں دونوں کا نقصان نہ ہو۔ پہاڑ اور

پرند کو تابع کرنا یہ ہے کہ وہ داود علیہ السلام کے ساتھ آپ ہی کی طرح کی آواز سے زبور پڑھتے تھے اور لوہے کی زرہ بناتے تھے، فقط ہاتھ سے موڑ کر جبکہ لوگ آگ سے بناتے ہیں۔ ہوا کو تابع کرنا اس طرح تھا کہ سلیمان علیہ السلام نے ایک بہت بڑا تخت بنایا تھا، اپنے سارے کارخانوں سے اور لوگوں سے مل کر۔ آپ اس پر بیٹھتے، پھر زور کی ہوا آتی اس کو زمین سے اٹھاتی، اوپر نرم ہوا چلتی، یمن سے شام تک اور شام سے یمن تک جو ایک مہینے کی راہ تھی، وہ دو پہر میں طے کرتی۔ شیاطین کا تابع کرنا یہ ہے کہ شیطانوں سے غوطہ لگواتے اور دریا میں سے جواہر نکلواتے جہاں آدمی کی قدرت نہیں تھی اور عمارتوں میں بھاری کام اُن سے کرواتے اور سفر میں حوض کے برابر تانبے کے لگن اور کنوئیں کے برابر دیگیں اٹھائے لیے چلتے اور انھیں میں کھانا پکاتے، اس کے علاوہ اور سخت سخت کام اُن سے لیتے تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ کھیتی انگور تھی، اس کے خوشے لٹک رہے تھے۔ (قاله ابن إسحق عن مرة عنه) امام شریح رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نَفَش رَعْي ہے، یعنی نفش کے معنی چرنے اور چرانے کے ہیں۔ امام شریح، زہری اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ نفش نہیں ہوتا مگر رات میں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے زیادہ کیا کہ دن میں چرنے کو "ھمل" کہتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن مرۃ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، فرمایا کہ حرث انگور تھا، اس کے خوشے اُگے ہوئے تھے، بکریوں نے اس کو بگاڑ ڈالا۔ فرمایا: پس داود علیہ السلام نے انگور والوں کو بکریاں دینے کا حکم دیا تو سلیمان علیہ السلام نے کہا: یا نبی اللہ غیر ہذا، یعنی اس کا فیصلہ اور ہے۔ داود علیہ السلام نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ انگور تو بکریوں والے کو دیے جائیں، یعنی اُن کے سپرد ہوں تو وہ اُن پر قیام کرے، یعنی اُن کی خدمت کرے، پانی وغیرہ دے، یہاں تک کہ جیسے تھے، ویسے ہو جائیں اور بکریاں انگور والے کو دی جائیں تو وہ اُن سے نفع اُٹھائے، یعنی دودھ پیے یہاں تک کہ جس وقت انگور جیسے تھے، ویسے ہو جائیں تو انگور اس کے مالک کو دیے جائیں اور بکریاں اس کے مالک کو، پس یہ وہی قول ہے اللہ پاک کا کہ ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾۔ عوفی نے بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

حماد بن سلمہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ داود علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا کہ بکریاں کھیتی والوں کو دلوا دیں، پس چرواہے نکلے اُن کے ہمراہ اور وہ فیصلے کے بارے میں بات کرتے تھے تو سلیمان علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ تمھارے درمیان کیسا فیصلہ کیا؟ انھوں نے اُن کو خبر دی تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں تمھارے مقدمے کا والی ہوتا تو اس کے سوا اور فیصلہ کرتا، اس کی خبر داود علیہ السلام کو ہوئی تو انھوں نے سلیمان علیہ السلام کو بلایا اور فرمایا تو اُن کے درمیان کس طرح فیصلہ کرتا؟ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ کھیتی والوں کو بکریاں دلاتا ہوں کہ اُن کی اولاد اور دودھ اور سَلا (پتلی جھلی جس میں لپٹا ہوا بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے) اور اُن کے منافع اُن کے لیے ہوں اور بکریوں والے کھیتی والوں کے لیے بیج ڈالیں، بوئیں مثل اُن کی کھیتی کے، پھر جس وقت کھیتی اس حال کو پہنچے، جس پر وہ تھی تو اس کو کھیتی والے

لے لیں اور بکریاں اُن کے مالکوں کو واپس کر دیں۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن مرۃ عن مسروق روایت کیا ہے کہ جس کھیتی کو بکریاں روند گئی تھیں، اس میں انگور تھے، لہٰذا اس میں نہ کوئی پتا چھوڑا نہ انگور کا کوئی خوشہ، مگر اس کو کھا لیا۔ پھر وہ داود علیہ السلام کے پاس آئے تو انھوں نے ان کو بکریاں دلا دیں۔ روایت کے الفاظ "فأعطاهم رقابها" ہیں۔ اس پر سلیمان علیہ السلام نے کہا: نہیں، بلکہ بکریاں لے لی جائیں، پھر انگور والوں کو دلائی جائیں کہ اُن کے واسطے اُن کا دودھ اور منافع ہو اور بکریوں والوں کو انگور کی کھیتی دلائی جائے کہ وہ اس کو آباد کریں اور اس کی اصلاح و درستی کریں، یہاں تک کہ وہ ویسی ہو جائے، جیسے اس رات تھی، جس میں بکریاں اس کے اندر روند گئی تھیں۔ پھر بکری والوں کو ان کی بکریاں اور انگور والوں کو اُن کی کھیتی دلا دی جائے[2] اور اسی طرح امام شریح، مرہ، مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ اور بہت لوگوں نے بھی کہا ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عامر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ دو آدمی شریح رحمہ اللہ کے پاس آئے، ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس کی بکریوں نے میرا سوت توڑ ڈالا ہے تو شریح نے کہا: دن کو یا رات کو، پس اگر وہ دن میں ہوا ہے تو بکریوں والا بَری ہے اور اگر رات میں ہے تو واقعی وہ ضامن ہے۔ پھر یہ آیت کریمہ پڑھی: ﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ... ﴾[3] یہ فیصلہ جو قاضی شریح رحمہ اللہ نے کیا، اس حدیث کے مشابہ ہے، جس کو امام احمد، ابو داود اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے حرام بن محیصہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی تو اس نے اس میں فساد کیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ باغوں والوں کے ذمے اُن کی حفاظت کرنا ہے دن میں، اور جو مویشی رات کو بگاڑیں تو مویشی والوں کے ذمے ہے۔[4] (أخرجوه من حديث ليث بن سعد عن الزهري عن حرام) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وقد علل هذا الحديث وقد بسطنا الكلام عليه في كتاب الأحكام و بالله التوفيق"[5]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حمید سے روایت کیا ہے کہ ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ کو جس وقت قاضی بنایا گیا تو اُن کے پاس حسن بصری رحمہ اللہ تشریف لائے۔ ایاس رو دیے تو حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تجھے کون سی چیز رُلاتی ہے؟ کہا: اے ابو سعید! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاضی تین ہیں: ایک وہ آدمی ہے کہ اس نے اجتہاد کیا، پھر اس نے خطا کی تو وہ دوزخ میں ہے، اور ایک وہ آدمی ہے کہ ھویٰ نے اس

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٤٧٤۔ ٤٧٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٧)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٤٧٧۔ ٤٧٨)

[4] مسند أحمد (٥/ ٤٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٣٢) السلسلة الصحيحة (٢٣٨)

[5] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٩)

کو مائل کر دیا، یعنی خواہشِ نفس نے حق سے اس کو پھیر دیا تو وہ دوزخ میں ہے اور ایک آدمی ہے کہ اس نے اجتہاد کیا، پھر وہ صحیح فیصلے پر پہنچا تو وہ جنت میں ہے۔ اس پر حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ پاک نے جو داود، سلیمان اور انبیا علیہم السلام کی خبر نقل فرمائی ہے، اس میں ایک ایسا حکم ہے کہ وہ ان لوگوں کے قول کو رد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴾

اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام پر تو ثنا فرمائی اور داود علیہ السلام کی مذمت نہ کی۔ پھر فرمایا: یعنی حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حَکَم، یعنی فیصلہ کرنے والوں پر تین باتوں کا عہد کیا ہے: ایک یہ کہ فیصلے کو تھوڑی قیمت کے بدلے نہ بیچیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں خواہشِ نفس کی پیروی نہ کریں۔ تیسری یہ کہ اس میں کسی سے نہ ڈریں۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [ص: ٢٦] ''(ہم نے کہا:) اے داود! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ﴾ [البقرة: ١٥٠] ''پس تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [البقرة: ٤١] ''اور تم میری آیتوں کو تھوڑی قیمت میں نہ بیچو۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام تو سارے معصوم ہیں۔ اللہ عزوجل کی طرف سے اُن کی تائید ہوتی ہے۔ اس بات میں علمائے محققینِ سلف و خلف میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔ رہے اُن کے سوا اور لوگ سو صحیح بخاری میں سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت حاکم نے اجتہاد کیا، پھر وہ صواب کو پہنچا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جس وقت اس نے اجتہاد کیا اور پھر اس نے خطا کی تو اس کے واسطے ایک اجر ہے۔[2] چنانچہ جس بات کا ایاس رحمہ اللہ نے توہم کیا کہ قاضی نے جس وقت اجتہاد کیا، پھر اس نے خطا کی تو وہ نار میں ہے، لہٰذا یہ حدیث اس کو قطعی طور پر رد کرتی ہے۔ واللہ أعلم۔ سنن میں وارد ہے کہ قاضی تین ہیں: ایک قاضی جنت میں ہے اور دو قاضی نار میں۔ جس شخص نے حق کو جانا اور اس کے ساتھ فیصلہ کیا تو وہ جنت میں ہے اور جس آدمی نے لوگوں کے درمیان جہالت پر فیصلہ کیا تو وہ نار میں ہے اور جس آدمی نے حق کو جان لیا اور اس کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ آگ میں ہے۔[3]

یہی قصہ جو قرآن شریف میں مذکور ہے، اسی کے قریب وہ قصہ ہے جس کو امام احمد نے اپنی مسند میں سیدنا

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٨) (2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩١٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧١٦)

(3) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٥٧٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٣٢٢) سنن النسائي الکبریٰ (٣/ ٤٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٣١٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٤٤٤٦)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو عورتیں تھیں، ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے تھے، بھیڑیا آیا تو ایک بیٹے کو لے گیا، پھر دونوں داود علیہ السلام کے پاس اپنا جھگڑا لائیں تو انھوں نے وہ بیٹا بڑی عورت کو دلوا دیا، پھر وہ نکلیں تو سلیمان علیہ السلام نے ان کو بلایا، فرمایا: چھری لاؤ کہ میں اس کو درمیان تمھارے چیروں، اس پر چھوٹی بولی: اللہ تم پر رحم کرے گا، وہ اسی کا بیٹا ہے، تم اس کو مت چیرو، پس سلیمان علیہ السلام نے وہ بیٹا چھوٹی کو دلوا دیا۔[1] (وأخرجه البخاري و مسلم في صحيحيهما و بوب عليه النسائي في كتاب القضاء "باب الحاكم يوهم خلاف الحكم ليستعلم الحق")۔

اسی طرح وہ قصہ ہے، جس کو حافظ ابو القاسم ابن عساکر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ترجمہ سلیمان علیہ السلام میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے وارد کیا ہے، وہ ایک لمبا قصہ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ بنی اسرائیل میں ایک خوبصورت عورت تھی، ان میں سے چار رئیسوں نے اسے اس کے نفس سے پھسلایا، وہ کسی کے داؤ میں نہ آئی تو انھوں نے باہم اس پر اتفاق کیا، پس داود علیہ السلام کے پاس اس بات کی گواہی دی کہ اس نے اپنے نفس پر ایک کتے کو قدرت دی، یعنی اس نے کتے سے صحبت کی ہے اور اس کو خود سے اس کام کا عادی بنا رکھا ہے، اس پر داود علیہ السلام نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا، پھر جب اس دن کی عشیہ کا وقت آیا تو سلیمان علیہ السلام بیٹھے اور اُن کے ساتھ کئی لڑکے انھیں کی طرح کے جمع ہوئے، پس وہ حاکم ہو کر کھڑے ہوئے اور اُن میں سے چار لڑکوں نے انھیں چار آدمیوں جیسی شکل بنائی اور ایک نے اس عورت کی شکل بنائی، ان چاروں نے اس عورت پر اس بات کی گواہی دی کہ اس نے اپنی جان پر کتے کو قدرت دی ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کے درمیان میں تفریق کر دو۔ ان میں سے پہلے لڑکے سے پوچھا کتے کا رنگ کیا تھا؟ اس نے کہا: سیاہ۔ پھر اس کو علاحدہ کر دیا۔ دوسرے کو بلایا، اس سے کتے کا رنگ پوچھا، اس نے کہا: سرخ۔ تیسرے نے کہا: اغبش۔ (اصل میں اسی طرح ہے۔ غبش آخر شب کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ شاید تصحیف اغبر کی ہو۔ اغبر تیرہ رنگ کو کہتے ہیں۔ واللہ أعلم)۔ چوتھے نے کہا: سفید۔ اس وقت سلیمان علیہ السلام نے ان کو قتل کا حکم دیا۔ پھر یہ قصہ داود علیہ السلام سے نقل کیا گیا تو انھوں نے اسی وقت اُن چاروں آدمیوں کو طلب کیا۔ پھر ان کو الگ الگ کر کے کتے کا رنگ پوچھا تو وہ اس پر مختلف ہوئے۔ پس داود علیہ السلام نے ان کے قتل کا حکم فرمایا۔[2]

﴿ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ داود علیہ السلام اپنی کتاب زبور کی تلاوت میں بہت خوش آواز تھے، جس وقت زبور کو خوش الحانی سے پڑھتے تو پرندے ہوا میں ٹھہر جاتے، ان کو جواب دیتے تھے۔ اصل کے الفاظ "فَتَجَاوَبَهٗ" ہیں۔ تجاوب کے معنی تحاور، یعنی باہم گفتگو کرنے کے ہیں اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٠٢) مسند أحمد (٢/ ٣٢٢)

[2] تاريخ دمشق (٢/ ٢٣٢۔ ٢٣٣)

پہاڑ رجوع کر کے ان پر رد کرتے تھے۔ (اصل کے الفاظ "وترد عليه الجبال تاويبا" ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی صدا لوٹ کر آتی تھی۔ والله أعلم۔) چونکہ داود علیہ السلام نہایت خوش آواز تھے، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے جس وقت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر گزر فرمایا اور وہ رات کو قرآن شریف پڑھ رہے تھے اور اُن کی آواز نہایت اچھی تھی تو آپ ﷺ ٹھہر گئے اور اُن کا پڑھنا سننے لگے اور فرمایا: «لَقَدْ أُوتِيَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ علیہ السلام» یعنی داود علیہ السلام کی خوش آوازی سے اُن کو خوش آوازی ملی ہے۔ (مزمار نَے (بانسری) کو کہتے ہیں، آپ نے اُن کی حسنِ صوت و حلاوتِ نغمہ کو نَے کی آواز سے تشبیہ دی۔ کلمہ "آل" زائد ہے یا بہ معنی شخص ہے۔ داود علیہ السلام خوش آوازی میں ضرب المثل ہیں)۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر میں جان لیتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں آپ ﷺ کے واسطے آواز اور اچھی طرح درست کرتا۔[1] ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی آواز کی طرح نہ کسی جھانجھ (اصل کا لفظ صنج ہے صنج پیتل کا ایک آلہ ہے، ایک کو دوسرے پر مارتے ہیں اور ایک آلہ ہے جس میں تانت لگتی ہے۔ بربط ایک آلہ ہے مثل عود کے) کی آواز سنی نہ بربط کی نہ نَے کی اور باوجود اس کے نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا: «لَقَدْ أُوتِيَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ علیہ السلام»۔

﴿ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ﴾ یعنی اللہ پاک نے اُن کو زرہیں بنانا سکھایا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زرہیں اُن سے پہلے پتر کی ہوتی تھیں، یعنی ان سے پہلے لوہے کے پتر بدن پر لگایا کرتے تھے، حلقہ وار زرہ نہ تھی۔ پہلے پہل انھیں نے ایسی زرہیں بنائیں کہ اُن کے حلقے بعض بعض میں گھسائے، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ﴾ [سبا: ۱۰۔ ۱۱] "اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کر دیا۔ کہ تو کامل کشادہ (زرہیں) بنا اور کڑیاں جوڑنے میں (مناسب) اندازہ رکھ۔" یعنی ﴿ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم حلقے کو فراخ مت کرو کہ وہ میخ کو مضطرب کر دے اور نہ میخ کو ایسا موٹا کرو کہ حلقے کو توڑ دے اور اسی لیے فرمایا: ﴿ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ﴾ یعنی تاکہ وہ زرہیں لڑائی میں تم کو محفوظ رکھیں۔ ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴾ پس کیا تم ہو شکر کرنے والے اللہ کی نعمتوں کا۔[2]

اس لیے کہ اللہ نے اپنے بندے سلیمان علیہ السلام کے واسطے زور سے چلنے والی ہوا کو تابع کر دیا تھا۔ ﴿ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ اس زمین سے مراد زمینِ شام ہے۔ ﴿ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴾ اس کا قصہ یہ ہے کہ ان کا ایک فرش تھا لکڑی کا، امورِ مملکت کی سب ضروری چیزیں اور گھوڑے، اونٹ، خیمے اور لشکر سب اس پر رکھ دیا جاتا، پھر وہ ہوا کو حکم کرتے کہ اس کو اُٹھا لے تو وہ اس کے نیچے گھس جاتی، پھر اس کو لاد لیتی، پھر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (٣/ ١٢)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٥٠)

اس کو اُٹھا لیتی اور اس کو لے کر چلتی تھی اور پرندے اس پر سایہ کرتے، گرمی سے اس کو بچاتے، جس زمین کی طرف چاہتے اس طرف لے جاتے، پھر وہ اترتے اُن کے آلات اور حشم (شان وشوکت، نوکر چاکر) رکھے جاتے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ﴾ [ص: ٣٦] ''چناں چہ ہم نے ہوا اس کے تابع کر دی تھی، وہ اس کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی جہاں کا وہ ارادہ کرتا تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ﴾ [سبا: ١٢] ''اس کا صبح کا چلنا ایک ماہ (کی مسافت) تھا اور اس کا شام کا چلنا بھی ایک ماہ (کی مسافت) تھا۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی چھے لاکھ کرسیاں تھیں، پس اُن سے قریب مومن آدمی بیٹھتے، پھر اُن کے پیچھے مومن جن، پھر پرندوں کو حکم کرتے تو وہ اُن پر سایہ کرتے، پھر ہوا کو حکم دیتے تو وہ اُن کو لاد لیتی تھی۔ عبد اللہ بن عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام ہوا کو حکم کرتے تو وہ مثل بڑے پہاڑ کے جمع ہو جاتی، پھر اپنے بچھونے کا حکم دیتے تو وہ اس کی اونچی سے اونچی جگہ پر رکھا جاتا، پھر پردار گھوڑوں میں سے کوئی گھوڑا طلب کرتے تو وہ گھوڑا بلند ہو جاتا یہاں تک کہ ان کے بچھونے پر چڑھ جاتا، پھر ہوا کو حکم دیتے تو وہ اُن کو لے کر آسمان سے ورے ہر بلندی پر بلند ہو جاتی اور وہ اپنے سر مبارک کو جھکائے ہوئے ہوتے، دائیں بائیں طرف توجہ نہیں کرتے تھے، اللہ عزوجل کی تعظیم کے واسطے اور شکر بجا لانے کے لیے، کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جس حال میں وہ ہیں، وہ حال اللہ پاک کے ملک میں صغیر اور حقیر ہے، یہاں تک کہ جس جگہ رکھنا چاہتے، اس جگہ ہوا اُن کو رکھ دیتی تھی۔[1]

﴿وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ﴾ یعنی شیطان پانی میں غوطہ لگاتے اور موتی جواہرات وغیرہ نکالتے تھے۔ ﴿وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ یعنی اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ [ص: ٣٧۔ ٣٨] ''اور شیاطین (جنات) کو (بھی تابع کر دیا) ہر عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے کو۔ اور دوسروں کو (جو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ﴾ یعنی اللہ پاک اُن کی حراست و حفاظت فرماتا تھا، کوئی شیطان کسی طرح کی برائی اُن کو نہ پہنچا سکتا تھا، بلکہ سب کے سب اُن کے قبضے میں اور اُن کے زیرِ قہر تھے، اُن میں سے کوئی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کے قریب پھٹک سکے۔ بلکہ وہی اُن میں حکم کرتے تھے چاہتے چھوڑ دیتے، ان میں سے جس کو چاہتے قید کر دیتے تھے، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾[2] [ص: ٣٨]. كذا في ابن كثير.

﴿وَدَاوٗدَ﴾ معطوف ہے ﴿نُوْحًا﴾ پر اور اسی کے عامل مذکور یا مقدر کا معمول ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ﴿وَسُلَيْمٰنَ﴾ معطوف ہے ﴿دَاوٗدَ﴾ پر۔ ﴿اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ﴾ یہ ظرف اسی عامل سے متعلق ہے جس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٨) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٤٨۔ ٢٥١)

نے داود میں عمل کیا ہے، یعنی تم ذکر کرو داود اور سلیمان ﷤ کا، ان دونوں کے فیصلہ کرنے کے وقت کا۔ ان کے ذکر سے مراد اُن کے قصے اور خبر کا ذکر ہے۔ علامہ نسفی ومحلی ﷭ نے کہا ہے کہ ﴿ اِذْ ﴾ بدل ہے ﴿ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ ﴾ سے۔[1] جمل نے کہا: اولیٰ یہ ہے کہ ﴿ اِذْ ﴾ بدل ہو مضاف مقدر سے، یعنی "قصتهما وخبرهما" جس طرح کہ اس کے نظائر میں گزر چکا ہے۔

امام ابو السعود ﷫ نے یوں کہا کہ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف ہے مضاف مقدر کا، مضارع کا صیغہ حکایتِ حالِ ماضی کے واسطے ہے، تاکہ اس کی صورت متحضر ہو جائے۔ تقدیر یہ ہے: "اذكر خبر وقت حكمهما في الحرث" یعنی حرث کی شان میں حرث کے مقدمے میں۔[2] اس حرث میں اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ وہ کرم تھا۔ کرم انگور کے درختوں کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] دوسرا قول یہ ہے کہ وہ کھیتی تھی۔ اسم حرث کا ان دونوں پر بولا جاتا ہے۔ یہی دو قول نسفی ومحلی ﷭ نے ذکر کیے ہیں۔[4] امام خازن ﷫ نے کہا ہے کہ حرث کے معنی زرع کھیتی عرف کے ساتھ زیادہ تر مشابہ ہیں۔ اسی لیے قاضی ﷫ نے اسی قول کو اول لکھا ہے اور قولِ اول کو بلفظ "قِيلَ" ذکر کیا ہے۔[5] فتح القدیر میں امام ابن جریر ﷫ کے حوالے سے مرہ ﷫ کا قول نقل کیا ہے کہ "كان الحرث نبتا" اسی قول کو فتح البیان میں "تبنا" نقل کیا ہے۔[6] نبت کے معنی ہیں روئیدگی، نبت گھاس کو کہتے ہیں۔ واللہ أعلم۔ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف ہے ﴿ يَحْكُمٰنِ ﴾ کا۔ امام نسفی وابو البقاء ﷭ نے یہی کہا ہے۔[7]

﴿ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ﴾ یعنی متفرق ومنتشر ہو گئیں اس میں بکریاں قوم کی تو اس کو چر لیا اور بگاڑ ڈالا۔[8] (قاله أبو السعود)۔ امام نسفی ﷫ نے کہا: داخل ہوئیں اس میں رات کو تو وہ اس کو کھا گئیں اور اس کو بگاڑ ڈالا۔[9] محلی ﷫ نے کہا: چر گئیں اس کو رات میں بغیر چرواہے کے اس طرح سے کہ چھٹ گئیں۔[10] امام بیضاوی ﷫ نے کہا ہے کہ چر گئیں اس کو رات میں۔[11] مختار میں کہا ہے کہ "نفشت الإبل و الغنم" یعنی اونٹوں اور بکریوں نے رات کو چرا چرواہے کے بغیر۔ باب اس کا جلس وضرب ونصر وسمع ہے۔ "نَفَش" دو زبروں کے ساتھ اس کا اسم ہے، نفش نہیں ہوتا مگر رات کو۔ "نَفَشَ الصُّوفَ وَالْقُطْنَ" باب نصر سے ہے، یعنی فلاں نے اُون اور روئی کو دُھنکا۔[12] صراح میں کہا ہے: "نفش پشم وپنبہ زدن" شیخ زادہ ﷫ نے کہا: "نفش" یہ ہے کہ بکریاں بغیر چرواہے کے رات کو منتشر ہو جائیں۔ ﴿ غَنَمُ ﴾ کے معنی گوسپند (بکری) ہیں، اسم مونث ہے، جنس کے واسطے موضوع ہے، مذکر ومونث پر

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٧٨) [3] تفسير البغوي (٥/ ٣٣١)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) [5] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢)
[6] تفسير الطبري (١٨/ ٤٧٤) فتح القدير (٣/ ٥٧٦) فتح البيان (٨/ ٣٥٢) [7] تفسير النسفي (٣/ ٨٧)
[8] تفسير أبي السعود (٦/ ٧٨) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٣) [9] تفسير النسفي (٣/ ٨٧)
[10] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) [11] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢) [12] مختار الصحاح (١/ ٦٨٨)

واقع ہوتا ہے اور ایک ساتھ دونوں پر بھی بولا جاتا ہے۔قوم سے مراد بعض قوم ہے، یعنی قومِ داود علیہ السلام، یعنی اُن کی اُمت۔

﴿ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴾ ضمیر جمع راجع ہے داود اور سلیمان علیہما السلام کی طرف، اس میں اس پر دلیل ہے کہ دو پر جمع کا اطلاق جائز ہے۔ اہلِ عربیت میں سے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے، جیسے امام زمخشری اور رازی رحمہما اللہ۔ ان سے پہلے فراء بھی اسی قول کا قائل ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس میں ضمیر جمع کی دو کے لیے ہے۔[1] رہی یہ بات کہ جمع کا وقوع تثنیہ کے موقع پر کیوں ہوا، لہٰذا یہ تو بطورِ مجاز ہے، یا اس لیے کہ تثنیہ جمع ہے، یعنی حکم جمع میں اور اقل جمع کے دو ہیں اور یہ بات کہ یہاں مراد تثنیہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ''لِحُكْمِهِمَا'' بصیغۂ تثنیہ اس پر دال ہے۔[2]

علامہ نسفی و قاضی بیضاوی نے اس کی جمعیت کو یوں بنایا ہے کہ مراد دو حاکم ہیں اور دو شخص وہ ہیں جو اُن کے پاس جھگڑا لائے، اس صورت میں جمع ہوگئے۔[3] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکم مصدر مضاف ہے طرف حاکمین کے، یعنی داود و سلیمان علیہما السلام اور محکوم علیہ کے، یہ وہی دو شخص اہلِ مقدمہ ہیں۔ اس سے دو باتیں لازم آتی ہیں: ایک یہ ہے کہ فاعل و مفعول کی طرف مصدر کی اضافت دفعتاً واحدتاً لازم آتی ہے، حالانکہ مصدر فاعل کی طرف مضاف ہوتا ہے فقط یا طرف مفعول کے فقط، یہ نہیں ہے کہ یکبارگی دونوں کی طرف مضاف ہو۔

دوسری یہ بات ہے کہ اس میں جمع بین الحقیقت والمجاز لازم آتی ہے، کیونکہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف حقیقت ہے اور مفعول کی طرف مجاز ہے۔ اور یہاں یہ دونوں باتیں جمع ہوگئیں، اس واسطے کہ حکم کی اضافت ہوئی طرف ﴿ هُمْ ﴾ کے اور اس میں چار آدمی ٹھہرے: دو حاکم دو محکوم، لہٰذا حاکم تو مصدر کے فاعل ہوئے اور محکوم مصدر کے مفعول ٹھہرے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے صرف اعتراض کرکے چھوڑ دیا، جواب سے کچھ تعرض نہ کیا، لیکن شیخ زادہ نے اول کا یہ جواب دیا ہے کہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف اس طرح پر ہے کہ وہ فاعل کے ساتھ قائم ہے اور مفعول کی طرف اس طرح پر ہے کہ وہ اس پر واقع ہے تو فاعل و مفعول دو معمول مختلف ہوئے۔ پس لفظِ واحد دونوں میں معاً مستعمل نہ ہوگا۔ دوسری کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافت صرف اختصاص کے واسطے ہے، قطع نظر اس کے کہ مضاف الیہ فاعل ہے یا مفعول ہے برطریق عمومِ مجاز، گویا یوں کہا گیا کہ ہم اس قضیے کے شاہد تھے، جو اُن کے درمیان میں واقع ہوا کہ دو حاکموں میں سے ایک تو صواب کو پہنچا اور دوسرے نے خطا کی اور دو جھگڑنے والوں میں سے ایک نے اپنا حق برطریقِ مستقیم پورا کرلیا۔

شاہدین کے معنی حاضرین ہیں۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں اسی طرح ہے۔[4] تفسیر بیضاوی میں کہا: عالمین۔[5]

---

[1] تفسير الرازي (٢٢/ ١٦٩) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٧) فتح القدير (٣/ ٥٧٠)

[2] روح المعاني (١٧/ ٧٤)

[3] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢)

[4] فتح القدير (٣/ ٥٧٠) فتح البيان (٨/ ٣٥٢)

[5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کان ذلك بعلمنا و مرایٰ منا''[1] یعنی یہ قضیہ ہمارے علم سے ہوا، ہمارے رو برو ہوا، ہم اس کو خوب جانتے ہیں۔ جملہ مذکورہ معترضہ ہے درمیان معطوف و معطوف علیہ کے اور جملہ ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ اِذْ يَحْكُمٰنِ ﴾ پر۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ صورت مضارع میں ہے، لیکن ماضی کے حکم و معنی میں ہے، کیوں کہ پیرایۂ ماضی میں صرف حکایتِ حال ماضی کے لیے لایا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں ماضی ہے۔ ضمیر منصوب قضیہ کی طرف راجع ہے، اگرچہ لفظ مذکور نہیں ہے، مگر کلام سے سمجھا جاتا ہے، یا حکومت کی طرف پھرتی ہے، جس پر لفظ حکم دال ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو لیا ہے۔[2]

علامہ نسفی اور قاضی بیضاوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ حکومت کی طرف راجع ہے یا فتویٰ کی طرف۔[3] کسی نے اس کو ''فَاَفْهَمْنَا'' پڑھا ہے، یعنی ہم نے اس قضیے میں سلیمان کو صواب سمجھا دیا، وہ قضیہ یہ ہے: مفسرین نے کہا ہے کہ دو شخص داود علیہ السلام پر داخل ہوئے اور اُن کے پاس سلیمان علیہ السلام اُن کے فرزند بھی تھے، اُن دو میں سے ایک تو کھیتی والا تھا اور دوسرا بکریوں والا۔ کھیتی والے نے کہا کہ اس شخص کی بکریاں رات کو چھوٹ گئیں اور میری کھیتی میں آ پڑیں، لہٰذا انھوں نے اس میں کچھ باقی نہ چھوڑا، اس پر داود علیہ السلام نے فرمایا: ''لَكَ رِقَابُ الْغَنَمِ'' یعنی تیرے واسطے بکریاں ہیں تو اُن کو لے لے، سلیمان علیہ السلام بولے: ''أَوْ غَيْرَ ذٰلِكَ'' یعنی یا اس کے سوا اور فیصلہ ہو، وہ یہ ہے کہ انگور والے بکریاں لے جائیں اور اُن کے دودھ اور منافع سے فائدہ اُٹھائیں اور بکریوں والے انگور کے درختوں کی اصلاح و درستی کریں، یہاں تک کہ جس وقت وہ اس رات کی طرح ہو جائیں، جس میں بکریوں نے اُن کو چرا تھا تو یہ لوگ اُن کو اُن کی بکریاں دے دیں اور وہ اُن کو اُن کے انگور حوالے کر دیں۔ اس پر داود علیہ السلام نے کہا: ''القضاء ما قضیت'' یعنی فیصلہ وہی ہے جو تو نے کہا ہے اور انھوں نے اس کا حکم دے دیا، اس وقت سلیمان علیہ السلام گیارہ برس کے تھے۔ امام قاضی، نسفی اور خازن رحمہم اللہ کا یہی قول ہے کہ اُن کی عمر اسی قدر تھی۔[4] یہ قصہ کتبِ تفسیر میں الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ پہلے تفسیر ابن کثیر میں سے بروایتِ بعض اکابر اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ داود علیہ السلام نے کھیتی والوں کو بکریاں دلوانے کا حکم اس لیے کیا کہ بکریوں کی قیمت کھیتی کی قیمت کے قریب تھی اور سلیمان علیہ السلام کے حکم میں کہا ہے کہ اس نفع کی قیمت جو بکریوں سے حاصل ہو اور اس کھیتی کی قیمت جس کو بکریوں نے بگاڑا برابر تھی۔[5] علما کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام نے بھی وحی سے حکم کیا اور سلیمان علیہ السلام نے بھی وحی سے حکم دیا، اللہ پاک نے اس وحی سے داود علیہ السلام کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ اس قول کی بنیاد پر تفہیم بطریقِ وحی ٹھہرے گی۔ جمہور کا یہ قول ہے کہ دونوں کا فیصلہ اجتہاد سے تھا۔ اہلِ علم کی گفتگو حکم اجتہادِ انبیا علیہم السلام

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨) [3] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢) تفسير النسفي (٣/ ٨٧) تفسير الخازن (٤/ ٣٠٤) [5] فتح القدير (٣/ ٥٧١)

میں مشہور و معروف ہے، وہ یہ ہے کہ بعض علما نے کہا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے لیے اجتہاد جائز ہے، تاکہ مجتہدین کا ثواب پائیں، کیوں کہ ﴿ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [الحشر: ٢] ''تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔'' حالاں کہ انبیا علیہم السلام اولی الابصار کے امام اور اُن سے افضل ہیں، پھر اُن کے لیے عبرت پکڑنا کس طرح جائز نہ ہو۔ باوجود اس کے کہ استنباط، یعنی حکم نکالنا درجاتِ علما میں بلند تر درجہ ہے تو یہ بات ضروری ٹھہری کہ نبیوں کے لیے بھی اجتہاد سے ایک حصہ ہو، ورنہ اس باب میں ہر ایک مجتہد اُن سے افضل ٹھہرے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پاک اس پر دال ہے کہ «اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ»[1] یہ اس کو مستلزم ہے کہ اجتہاد کا درجہ نبیوں کے واسطے ثابت ہو، تاکہ علما اُن سے اس کے وارث ہوں۔

بعض علما نے کہا کہ نبیوں کے لیے اجتہاد سے فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے اور کہا کہ وہ وحی کے ساتھ اجتہاد سے مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ اجتہاد کی طرف اسی وقت جاتے ہیں کہ نص (قطعی حکم) مفقود ہو، حالاں کہ نص انبیا علیہم السلام کے حق میں مفقود نہیں ہے۔ اس لیے اکثر علما کے نزدیک ان کے لیے اجتہاد جائز نہیں ہے بخلاف اہلِ سنت کے کہ یہ انبیا کے لیے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز رکھتے ہیں، پس جائز ہے کہ انبیا علیہم السلام اجتہاد کریں اور سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد صواب کو زیادہ ظاہر کرے۔ پھر اُن کے والد داود علیہ السلام اُن کے اجتہاد کی طرف رجوع فرمائیں، اس سے پہلے کہ اپنے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کریں، کیوں کہ جو فیصلہ اجتہاد کے ساتھ ہو جائے، وہ دوسرے اجتہاد سے منسوخ نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا حکم وحی سے ہو، اس وقت اس حکم کو توڑ دے گا جو اجتہاد سے ہوا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ دونوں نے اجتہاد سے فیصلہ کیا، وحی سے نہیں کیا، کیوں کہ اگر دونوں وحی سے فیصلہ کرتے تو سلیمان علیہ السلام اس قول کے ساتھ مختص نہ ہوتے کہ ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾[2] بخلاف اس کے جس وقت دونوں نے اجتہاد سے کہا اور سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد درست یا زیادہ درست ہوا تو اب جائز ہے کہ ان کے حق میں یہ کہا جائے: ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾ اور چوں کہ اجتہاد فی نفسہٖ علم کی طرف محتاج ہے اور بغیر علم کے صحیح نہیں ہے، اس لیے یوں کہا گیا: ﴿ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ یعنی ہم نے داود اور سلیمان علیہما السلام میں سے ہر ایک کو حکم و علم دیا۔ حکم سے مراد نبوت ہے اور علم سے مراد معرفت بہ موجبِ حکم۔

پھر اگر کوئی کہے کہ دونوں حکم باجتہاد ہوتے تو سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ داود علیہ السلام کے فیصلے کو نہ توڑتا، کیوں کہ اجتہاد اجتہاد کو نہیں توڑتا تو اب یہ بات متعین ہوگئی کہ دونوں فیصلے وحی سے تھے، اس کا جواب وہی ہے جو گزر چکا ہے کہ دونوں نے اجتہاد کیا اور سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد اشبہ بالصواب تھا، اس لیے داود علیہ السلام نے اُن کے اجتہاد کی طرف رجوع

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٩٧)

[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢۔ ١٠٣)

کیا، اس سے قبل کہ اپنے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کریں۔ بہت سے اخبار میں یہ بات مروی ہے کہ داود علیہ السلام نے حکم بیان نہیں کیا اس بارے میں یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام سے انھوں نے سنا کہ اس کے علاوہ زیادہ بہتر ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ داود علیہ السلام نے ان کو قسم دلائی اور اُن سے کہا کہ قسم ہے حق نبوۃ و ابوۃ کی کہ تو مجھے وہ بات بتا، جو دونوں فریق کے لیے زیادہ موافق ہو، اس پر سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ میں بکریاں کھیتی والے کو دیتا ہوں۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ فیصلہ دونوں کے اجتہاد سے تھا اور یہ بات اُن کی شریعت میں تھی۔ رہی ہماری شریعت تو اس میں ضمان (ضامنی) نہیں ہے امام اعظم رحمہ اللہ کے اور اُن کے اصحاب کے نزدیک نہ رات میں نہ دن میں، مگر اس صورت میں کہ جانوروں کے ساتھ کوئی ہانکنے والا یا کھینچنے والا ہو اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک رات میں ضمان واجب ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ صلح تھی، یعنی سلیمان علیہ السلام نے جو کہا اور داود علیہ السلام نے جو کیا، وہ حکم تھا اور صلح خیر ہے۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ داود علیہ السلام کا حکم نظیر ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کا عبد جانی میں۔ ان کا قول یہ ہے کہ غلام جب نفس پر جنایت (جرم) کرے، یعنی کسی نفس کو تکلیف پہنچائے تو مالک اس غلام کو ولیِ جنایت کو دے دے یا ارش جنایت کا دے، کیوں کہ غلام کے گناہ کا موجب اُن کے نزدیک یہ ہے کہ غلام اپنی جنایت کی جزا ہو جائے، وہ جنایت تھوڑی ہو یا بہت اور مولیٰ کے واسطے یہ ہے کہ وہ فدا یا ارش کو اختیار کرے۔ لہٰذا مقدمہ حرث میں یہی حال ہے، کیوں کہ اس میں بکریاں بہ منزلہ عبد جانی ہیں، پس بکریاں خود اُن کی جنایت کی جزا ہو گئیں اور سلیمان علیہ السلام کا حکم امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے اس شخص کے حق میں جس نے کسی غلام کو غصب کر لیا، پھر وہ اس کے ہاتھ سے بھاگ گیا،[2] تو اُن کا قول یہ ہے کہ غاصب پر حیلولت کا غرم (تاوان) واجب ہے اور وہ غلام کی قیمت کا ضامن ہے اور اس کے اور قیمت کے درمیان حیلولت کی جائے، تاکہ اس قیمت سے مغصوب منہ نفع اُٹھائے بہ مقابلہ منافع غلام کے، جس کو غاصب نے مغصوب منہ سے فوت کیا، پھر جب غلام ظاہر ہو جائے تو وہ قیمت پھیر دی جائے، کیوں کہ جو چیز مغصوب منہ سے فوت ہوئی اور جس قیمت کی غاصب اور مغصوب منہ کے درمیان حیلولت کی گئی، ان دونوں میں ہر ایک کی ملک باقی ہے۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام کا حکم ہے کہ مالک کی ملکیت بکریوں سے زائل نہ کی جائے، بلکہ اس کے اور اس کے مِلک کے درمیان حیلولت کی جائے، اس طریقے پر کہ بکریاں کھیتی والے کو دی جائیں، تاکہ کھیتی کا منافع، جو اس سے ضائع ہوا ہے، اس کے عوض میں بکریوں سے نفع اُٹھائے، یہاں تک کہ کھیتی پر جو نقصان اور ضرر پڑ گیا ہے، وہ زائل ہو جائے اور کھیتی جیسی تھی، ویسی ہو جائے۔

﴿ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مجتہد خطا سے گناہ گار نہیں ہوتا، کیوں کہ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٢)

اللہ پاک نے اگرچہ سلیمان علیہ السلام کی تعریف کی، اُن کے حق پر پہنچنے کے سبب سے اور یوں فرمایا: ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾ لیکن مخطی پر بھی ثنا کی، بہ سبب اس کے علم کے، جو اجتہاد کی طرف مودی (پہنچایا گیا) ہوا اور وہ اپنی خطا کے سبب سے گناہ گار نہ ٹھہرا۔ جبھی تو ﴿ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ کے ساتھ اس کی تعریف کی، کیوں کہ جو علم گناہ و عذاب کی طرف پہنچاتا ہے، وہ اس بات کا سبب نہیں ٹھہرتا کہ اس پر احسان رکھا جائے اور اس کے سبب سے تعریف ہو، اسی لیے قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس شخص کے قول کو پسند کیا جو اس طرف گیا ہے کہ مجتہد خطا کرتا ہے اور صواب کو پہنچتا ہے اور داود اور سلیمان علیہما السلام نے اجتہاد سے حکم کیا، مگر ہاں اتنی بات ہے کہ داود علیہ السلام چوک گئے اور سلیمان علیہ السلام صواب کو پہنچے۔ اور انبیا پر خطا جائز ہے مگر ان کو خطا پر رہنے نہیں دیا جاتا۔[1]

رہے علما تو اُن کے لیے حوادث و مقدمات میں اجتہاد ہے، جبکہ اُن میں کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نص نہ پائیں، پھر جس وقت وہ چوک جائیں تو اُن پر کسی طرح کا گناہ نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس وقت حاکم نے حکم کیا اور اجتہاد کیا، پھر وہ صواب کو پہنچا تو اس کے لیے دو اَجر ہیں اور جس وقت حکم کیا اور اجتہاد کیا، پھر چوک گیا تو اس کے واسطے ایک اجر ہے،[2] یعنی وہ اس بات پر اجر دیا جائے گا کہ اس نے حق میں اجتہاد کیا، سعی و کوشش کی، اس لیے کہ اجتہاد عبادت ہے نہ یہ کہ خطا پر اجر دیا جائے گا، مگر اس قدر ہے کہ خطا میں گناہ اس سے مرفوع ہے، جبکہ اس نے حق تک پہنچنے کے لیے خوب سعی و کوشش کی۔

حاصل یہ ہے کہ ہر حادثے میں اللہ پاک کے نزدیک حکم معین ہے اور اس پر قطعی دلیل ہے یا ظنی۔ لہٰذا جس نے اس کو پا لیا، وہ صواب کو پہنچا اور جس نے اس کو نہ پایا، وہ چوک گیا اور گناہ گار نہ ہوا۔ پھر اگر کوئی کہے کہ اگر حکم متعین ہے تو اس کے مخالف نے "ما أنزل الله" کے ساتھ حکم نہ کیا تو اب وہ فاسق ہوگا یا کافر، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٤] "اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔" لہٰذا اس کا یہ جواب ہے کہ جب اس کو اس بات کا امر کیا ہے کہ حکم کرے اس شے کے ساتھ جس کا اس نے ظن کیا ہے، گو وہ چوک گیا تو یقیناً اس نے ﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ کے ساتھ فیصلہ کیا اور اللہ پاک کا یہ قول: ﴿ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ اس بات کے خلاف نہیں کہ ان میں سے بعض مخطی ہوں، کیوں کہ مجتہد کی خطا اس بات کی موجب نہیں ہے کہ اس کے واسطے علم و حکم نہ ہو، اس لیے کہ ہر مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصوص (صریح احکام) کا عالم ہو اور احکام کے استنباط پر قدرت رکھتا ہو، کیوں کہ اگر وہ عالم نہ ہوگا، مرتبۂ اجتہاد کو پہنچا نہ ہوگا تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اجتہاد کرے اور اجتہاد کے ساتھ حکم دے۔

بعض نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہے، یعنی حادثے میں جس اجتہاد پر

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٥٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

وہ ہے، اس میں مصیب ہے، جس طرح کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ اس طرف گئے ہیں۔ صاحبِ کشاف نے کہا کہ ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾ میں اس پر دلیل ہے کہ زیادہ صحیح فیصلہ سلیمان علیہ السلام کے ساتھ تھا اور ﴿ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ میں اس بات پر دلیل ہے کہ وہ دونوں جمیعاً صواب پر تھے۔[1] استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اگر اُن میں سے ایک مصیب ہو اور اس کا مخالف مخطی ٹھہرے تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا ﴿ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ اس وجہ میں یہ نقض ہے کہ آیت جس بات پر دلیل ہے، وہ یہی ہے کہ دونوں اہلِ اجتہاد سے تھے، اس پر دلیل نہیں ہے کہ اُن میں ہر ایک مصیب تھا۔ اس بات پر جب دلالت کرے کہ یوں کہا جائے: "وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا بِمَا حَكَمَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ فِيْ تِلْكَ الْحَادِثِ" حالانکہ قرآن شریف کا نظم اس طرح نہیں ہے تو اب جائز ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ ہم نے ہر ایک کو وجوہِ اجتہاد و طرقِ احکام کا علم دیا اور یہ مراد اس کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ اس دلیل کو پہنچنے والا ہے، جو اللہ پاک نے قائم کی ہے، تاکہ اس بات پر دلالت کرے، جس کے ساتھ اس نے اس حادثے میں فیصلہ کیا ہے۔ اور نیز یہ قول کہ ہر مجتہد مصیب ہے مفہوم ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾ کے خلاف ہے، کیوں کہ یہ آیت بطریقِ مفہوم اس بات پر دال ہے کہ داود علیہ السلام نے اس حکم کو نہ سمجھا، جو کہ اللہ کے نزدیک حکم تھا اور اللہ پاک نے وہ حکم اُن کو نہیں سمجھایا، پھر وہ کیسے اپنے حکم اور اجتہاد میں مصیب ہوئے، کون سا اجتہاد، جو کہ اس حکم کی طرف مودی ہو (پہنچائے)۔

اگر کوئی کہے کہ ہم نہیں مانتے ہیں کہ قولِ مذکور آیتِ مذکورہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔ اس کے خلاف جب ہی ہوتا کہ داود اور سلیمان علیہما السلام فیصلے میں اختلاف کرتے، حالاں کہ بات یوں نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابو بکر اصم سے مروی ہے کہ ان دونوں نے ہرگز فیصلے میں اختلاف نہیں کیا، اس لیے کہ اللہ پاک نے دونوں کے واسطے سلیمان علیہ السلام کی زبان پر حکم بیان کر دیا۔[2] اور دونوں اس حکم پر متفق ہوگئے۔ رہی یہ بات کہ جب دونوں فیصلے میں متفق ہوئے، اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ فیصلہ اُن کو سمجھا دیا تھا تو ظاہر یہ بات تھی کہ اس طرح کہا جاتا: "فَفَهَّمْنَاهَا اِيَّاهُمَا" اور سلیمان علیہ السلام کا ذکر خصوصاً نہ کیا جاتا۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام چوں کہ چھوٹی عمر کے تھے اور اس عمر میں اُن کا ایسا فہم ہونا نہایت عجیب و غریب بات تھی، اس لیے خاص اُن کا ذکر کیا۔ اس ذکر سے اس بات کا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اللہ پاک نے چھوٹی عمر میں ان کو سمجھ عنایت فرمائی، پس سوال مذکور کے جواب کی تقریر یہ ہے کہ توافق کا احتمال اس بنیاد پر ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی تخصیص اس فہم کو ظاہر کرنے کے لیے تھی، جس کا فضل اللہ تعالیٰ نے اُن پر کم عمری میں کیا ہے، حالانکہ قصۂ منقول اس تخصیص کی نفی کرتا ہے۔

منقول یہ ہے کہ دونوں نے قول و فیصلے میں اختلاف کیا، کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ

---

[1] الكشاف (٣/ ١٢٩) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٥٥٣)

داود علیہ السلام نے کھیتی والے سے کہا، تو جا بکریاں تیرے واسطے ہیں۔ پھر جب دونوں خصم (جھگڑنے والے) اُن کے پاس سے نکلے اور سلیمان علیہ السلام پر گزر کیا تو انھوں نے پوچھا: تمھارے درمیان کیا فیصلہ کیا؟ انھوں نے اُن کو خبر دی، اس پر سلیمان علیہ السلام بولے کہ اگر میں قاضی ہوتا تو اس کے سوا اور فیصلہ کرتا۔ یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے یوں کہا: ”غیر هذا أرفق بالفريقين“ یعنی اس کے سوا فریقین کے لیے زیادہ نفع مند تھا، ان دونوں نے داود علیہ السلام کو اس کی خبر دی تو انھوں نے سلیمان علیہ السلام کو طلب کیا اور فرمایا: تو اُن کے درمیان کیسا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری روایت کی بنا پر سلیمان علیہ السلام کو بلایا اور کہا: قسم ہے حقِ نبوت و ابوت کی! تو مجھے وہ فیصلہ بتائے جو کہ فریقین کو زیادہ نافع ہے۔ پس سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ بکریاں کھیتی والے کو سونپی جائیں، یہاں تک کہ اُن کے منافع سے فائدہ اُٹھائے اور بکریوں والا کھیتی کی اصلاح میں کام کرے، یہاں تک کہ جیسی تھی، ویسی ہو جائے، پھر بکریاں اس کے مالک کو اور کھیتی اس کے مالک کو لوٹا دی جائے۔ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس قصے کے وجہ مذکور پر بیان اس احتمال کی نفی کرتا ہے کہ داود اور سلیمان علیہما السلام فیصلے میں متفق تھے۔ یہ سارا بیان شیخ رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل ہے۔

فتح البیان کا بیان:

اس مقام میں فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ استدلال کرنے والوں نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہے۔ بلاشک آیتِ کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ مخطی مجتہد پر سے گناہ اُٹھ جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اُن میں سے ہر ایک کا اجتہاد درست ہے تو اس پر نہ تو یہ آیت دلیل ہے نہ اس کے سوا کوئی آیت دلالت کرتی ہے۔ بلکہ حدیث متفق علیہ صحیحین وغیرہما نے یہ تصریح کی ہے کہ جس وقت حاکم نے اجتہاد کیا، پھر وہ صواب کو پہنچا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اجتہاد کیا، پھر چوک گیا تو اس کے واسطے ایک اجر ہے۔[1] پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام مخطی رکھا، پھر کیوں کر کہا جائے کہ وہ اللہ کے حکم کو پہنچنے والا ہے اور اس کے موافق ہے، کیوں کہ اللہ پاک کا حکم ایک ہے۔ مجتہدوں کے اختلاف سے بدلتا نہیں، ورنہ اللہ عزوجل کے حکم کا توقف لازم آئے گا مجتہدوں کے اجتہاد پر۔ حالاں کہ لازم باطل ہے تو ملزوم بھی اسی کے مثل ہے اور نیز اس کو مستلزم ہے کہ جس معین شے میں مجتہدوں کا اجتہاد حلال وحرام کے ساتھ مختلف ہوا ہے، وہ شے اللہ پاک کے حکم میں حلال وحرام ہو جائے، حالاں کہ یہ لازم ہونا بالاجماع باطل ہے تو ملزوم بھی اسی کے مثل ہے اور نیز یہ بات لازم آئے گی کہ بر وقت وجود ہر مجتہد کے، جس کے لیے اس حادثے میں اجتہاد ہے اللہ پاک کا حکم ہمیشہ متجدد ہوتا رہے اور جس حکم کا اللہ پاک اس حادثے میں ارادہ کرتا ہے، وہ منقطع نہ ہو، مگر انقطاعِ مجتہدین کے ساتھ، حالانکہ لازم باطل ہے تو ملزوم بھی اسی کے مثل ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

حاصل یہ ہے کہ مجتہدین کسی معاملے میں حق پر پہنچنے پر قادر نہیں ہیں، لیکن وہ خطا پر اصرار نہیں کرتے، جس طرح کہ اس جگہ داود علیہ السلام نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کی طرف رجوع کیا، جبکہ اُن کو ظاہر ہو گیا کہ وہ فیصلہ درست ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو اپنی دو کتابوں ''القول المفید'' اور ''ادب الطلب'' میں خوب واضح کیا ہے، جو شخص تحقیقِ حق پر وقوف چاہے تو وہ ان کی طرف اور ہمارے مولف کی طرف رجوع فرمائے، جس کا نام ہم نے ''حصول المامول من علم الأصول'' رکھا ہے اور ہماری کتاب ''الجنة في الأسوة الحسنة بالسنة'' ہے، ان میں وہ شے ہے، جو اُن کے غیر سے بے پروا کرتی ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو تُو حکام کو دیکھتا کہ وہ ہلاک ہی ہو چکے تھے، لیکن اللہ پاک نے اس مجتہد کی تعریف کی اس کے درست ہونے کے سبب سے اور اس مجتہد کی تعریف کی اس کے اجتہاد کے سبب سے۔[1] پھر اگر تو کہے کہ جس حادثے میں داود اور سلیمان علیہما السلام نے فیصلہ کیا، اس میں شریعتِ محمدیہ وملتِ اسلامیہ کا کیا حکم ہے؟ تو میں کہوں گا کہ یہ حدیث مروی عن براء رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے اپنی اُمت کے واسطے یہ بات مشروع فرمائی ہے کہ مویشی والوں کا یہ فرض ہے کہ رات میں مویشی محفوظ رکھیں اور باغ والوں پر یہ ہے کہ دن میں اپنے باغوں کی حفاظت کریں اور جو شے مویشی نے رات کو بگاڑ دی تو وہ مویشی والوں کے ذمے ہے،[2] یعنی اُن سے اس کا عوض لیا جائے گا اور یہ تاوان اس قدر ہے، جو اس کا نقصان ہوا یا اس کی قیمت۔

جمہور علما اس طرف گئے ہیں کہ جس حکم کو یہ حدیث شریف متضمن (شامل) ہے، اس پر عمل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے اصحاب اور کوفیوں کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے اور جانور جس وقت کھیتی کو بگاڑ ڈالیں رات میں یا دن میں تو اُن کے مالک پر کوئی شے لازم نہیں آتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول پاک کہ «جُرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ»[3] یعنی جانور کا زخمی کرنا معاف ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس قول کی عمومیت میں جانوروں کے نقصان کرنے کو داخل کیا ہے، جانور کے سارے افعال کا اس کے زخمی کرنے پر قیاس فرمایا ہے، اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ قیاس فاسد الاعتبار ہے، کیوں کہ نص کے مقابلے میں ہے۔ بعض اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ مویشی کا مالک اس شے کا ضامن ہے، جس کو اس نے بگاڑا ہے بغیر رات اور دن کے فرق کے۔ اس کا جواب اس حدیث سے دیا ہے جو سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[4]

---

(1) تفسير البغوي (٥/ ٣٣٣) تفسير الخازن (٤/ ٣٠٤)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٣٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٨)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٠)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٣٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٨)

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ''شرح منتقی'' میں اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔[1] یہ بات کہ دونوں حکم داود اور سلیمان علیہما السلام کے اللہ پاک کی وحی سے تھے، یہ اجتہاد نہ تھے۔ لہٰذا اس پر اللہ پاک کا یہ قول: ﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ دلالت کرتا ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی کہ اس نے اُن میں سے ہر ایک کو حکم و علم دیا اور یہ دونوں دو حال سے خالی نہیں: خاص ہیں یا عام، اگر خاص ہیں تو اُن کا اس قضیے پر صادق آنا جس کی حکایت اللہ پاک نے اُن سے کی ہے مقدم ہے، اُن کے صدق پر اس قضیے کے غیر کے اوپر اور اگر یہ دونوں عام ہیں تو یہ فردِ حکم و علم کی، جو کہ اس قضیے میں ہر ایک سے واقع ہوئی، اس عام کے اِفراد میں اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اس عام کے نیچے داخل ہو اور یہ عام اس پر دلالت کرے۔ رہی یہ بات کہ سلیمان علیہ السلام کو تفہیم کے ساتھ خاص کیا، اس سے یہ وہم پیدا ہوا کہ داود علیہ السلام کا حکم حکم شرعی نہ ٹھہرے۔

لہٰذا ﴿ كُلًّا اٰتَيْنَا ﴾ سے اس وہم کا دور ہونا بھی نکلتا ہے، معنی یہ ہیں کہ ہم نے اُن میں سے ہر ایک کو حکم و علم کثیر دیا، نہ تنہا سلیمان علیہ السلام کو۔ پھر جب اللہ پاک نے داود اور سلیمان علیہما السلام کی تعریف بطورِ اشتراک فرمائی تو اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ جو شے خاص تھی، اس کا ذکر کیا، پس داود علیہ السلام سے ابتدا کر کے فرمایا: ﴿ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ﴾ مختار میں کہا ہے کہ تسخیر بغیر اُجرت کام کی تکلیف دینے کو کہتے ہیں۔[2] محاورے میں بولتے ہیں: ''سخره تسخيرا'' یعنی بلا اُجرت کام کی اس کو تکلیف دی۔ مطلب یہ کہ اصل میں تسخیر بیگار سے کام لینے کو کہتے ہیں، یہاں مراد تذلیل ہے، یعنی ہم نے ذلیل اور فرماں بردار کر دیا[3] داود علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کو۔ ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ عامل ہے مع میں، اس قول کی نظیر یہ قول ہے: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ ﴾ [سبا: ۱۰]. ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ جملہ حالیہ موضع نصب میں ہے اور ﴿ وَالطَّيْرَ ﴾ معطوف ہے جبال پر، یا مفعول ہے بنا بر مفعول معہ۔ امام ابو البقاء اور سمین رحمہما اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ جملہ مستانفہ ہے۔ جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی قائل نے کہا کہ اللہ نے پہاڑوں کو کس طرح مسخر کیا تو اس کا یہ جواب فرمایا کہ ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ اس بنا پر اس جملے کا کوئی محل اعراب میں نہیں ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس قول کو بعید کہا ہے اور ﴿ مَعَ دَاوٗدَ ﴾ حال ہوگا جبال سے۔ تقدیر یہ ہے:
''سخرنا الجبال كائنة مع داود''

اب رہی یہ بات کہ داود علیہ السلام کے ہمراہ پہاڑ مسخر کرنے سے کیا مراد ہے؟ لہٰذا یا تو یہ مراد ہے کہ ان کی تسبیح کے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح کرتے تھے، یا مراد یہ ہے کہ اُن کے چلنے کے ساتھ پہاڑ بھی چلتے تھے، اس قول کی بنیاد اس پر ہے کہ ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ مشدد بہ معنی ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ ثلاثی کے ہے ماخوذ سباحت سے، تکثیر کے لیے بابِ تفعیل کی طرف

[1] نيل الأوطار (٦/ ٥٦۔ ٥٧) [2] مختار الصحاح (١/ ٣٢٦)
[3] فتح البيان (٨/ ٣٥٤۔ ٣٥٦) [4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٣)

نقل کر کے لے گئے، اگر مقصود کثرت نہ ہوتی تو ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ ثلاثی کہا جاتا اور اگر تسبیح، یعنی تقدیس سے لیا جائے تو اس صورت میں تسبیح جبال کی اُن کے ساتھ تسبیح دلالت مراد ہوگی، کیونکہ پہاڑ اللہ پاک کی تسبیح و ذکر بہ دلالت حال کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔'' ؎

نہ بلبل بر گلش تسبیح خوانیست — کہ ہر خاری بہ تسبیحش زبانے ست

''باغ میں بلبل ہی (اللہ کی) پاکی بیان کرنے والی نہیں ہے، بلکہ ہر کانٹا اس کی تسبیح بیان کرنے کے لیے ایک زبان کی حیثیت رکھتا ہے۔''

مگر اس قول میں اتنی بات ہے کہ اس معنی میں تسبیح اس بات کے ساتھ نہیں ہے کہ پہاڑ داود علیہ السلام کے ساتھ ہوں۔ شاید تخصیص کی یہ وجہ ہو کہ داود علیہ السلام پہاڑوں کی تسبیح سمجھتے تھے اور جو اُن میں پتھر اور درخت ہوتے، اُن کی تسبیح کو بھی بوجھتے تھے۔ اس لیے اُن کا یقین، تعظیم، نشاط تسبیح اور تقدیس میں اور زیادہ ہوتا تھا اور اس کی طرف اشتیاق بڑھتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول کہ داود علیہ السلام پتھر اور درخت کی تسبیح کو سمجھتے تھے،[1] اس پر دال ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ کسی شے کا خاص کر ذکر کرنا، اس پر دال نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ سے حکم کی نفی ہو جائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ داود علیہ السلام کے ہمراہ جبال کی تسبیح کرنے سے یہ مراد ہو کہ اُن کو پہاڑوں کی طرف سے تسبیح کی آواز متمثل (کسی صورت میں آنا) ہوتی تھی، جس طرح کہ اجرام صقلیۂ عالیہ سے صدا کا انعکاس ہوتا ہے، جیسا کہ وہب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ پہاڑ تسبیح سے اُن کو جواب دیتے تھے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ جس وقت داود علیہ السلام نماز پڑھتے تو پہاڑ بھی اُن کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، اس قول کو عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ رحمہم اللہ نے کتاب العظمت میں روایت کیا ہے[3] اور یہی معنی تسبیح کے ہیں۔

غرضیکہ تسبیح میں اختلاف ہے کہ مراد حقیقت ہے یا مجاز۔ لہٰذا مجاز والوں نے کہا کہ تسبیح سے خود پہاڑوں کی تسبیح مراد نہیں ہے، بلکہ جو لوگ پہاڑوں کو داود علیہ السلام کے ہمراہ چلتے ہوئے دیکھتے تو وہ براہِ تعجب تسبیح کرتے، سبحان اللہ کہتے پہاڑوں کی عظیم خلقت سے اور اُن کے خالق کی قدرت سے تعجب کرتے کہ سبحان اللہ کیا عظیم الشان ہے کہ ایسے ایسے بڑے جسموں کو ہوا کی طرح اُڑائے لیے جاتا ہے۔ حقیقت والوں نے کہا ہے کہ تسبیح سے مراد حقیقت ہے، داود علیہ السلام جس وقت تسبیح کرتے تو پہاڑ بھی اُن کے ہمراہ تسبیح کرتے تھے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ ظاہر یہی قول ہے کہ پہاڑوں سے تسبیح کا وقوع بہ نطق (زبان، آواز کے ساتھ) ہوتا تھا۔ اللہ پاک اُن میں کلام پیدا کر دیتا تھا، جس

---

[1] تفسير البغوي (٥/ ٣٣٤) [2] تفسير البغوي (٥/ ٣٣٤)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٤٧٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٨) الدر المنثور (٥/ ٦٥٠)

طرح کہ نبی اکرم ﷺ کی کفِ مبارک میں کنکریوں نے تسبیح کی تھی اور لوگوں نے اس کو سنا تھا[1] اور داود علیہ السلام پہاڑوں کی تسبیح کو تنہا خود ہی سنتے تھے۔[2]

شیخ زادہ نے کہا: جائز ہے کہ تسبیح پہاڑوں کی اس طرح ہو کہ اللہ پاک اُن میں کلام پیدا فرما دے، کیوں کہ اہلِ سنت کے نزدیک متکلم و مسبح وہ شخص ہے جس کے ساتھ کلام و تسبیح قائم ہو اور وہ اُن کے لیے محل ہو، نہ وہ جو ان کو ایجاد کرے، وجود میں لائے، بہ خلاف معتزلہ کے کہ اُن کے نزدیک متکلم وہ شخص ہے، جو کلام کو ایجاد کرتا ہے اور جبال جمادات ہیں، ان سے فعل سرزد ہونا صحیح نہیں اور نہ کلام کی اُن کی طرف اسناد صحیح ہے۔ اس طریقے سے کہ اللہ پاک اُن میں کلام پیدا کر دے، کیوں کہ اُن کے نزدیک متکلم اللہ ہی ہے پہاڑ نہیں ہیں۔ ان کے زعم کی بنیاد پر ﴿ وَالطَّيْرَ ﴾ کو برفع بھی پڑھا ہے۔ اس میں دو صورتیں ہیں یا تو مبتدا ہے اور خبر محذوف۔ تقدیر یہ ہے: "وَالطَّيْرُ مُسَخَّرَاتٌ" یا معطوف ہے ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ کی ضمیر مرفوع پر۔ یہ وجہ ضعیف ہے، اس لیے کہ یہاں نہ تاکید ضمیر منفصل کے ساتھ کی گئی ہے نہ دونوں کے درمیان میں فصل آئی۔ کوفی اس کو بغیر استقباح جائز کہتے ہیں اور بصریوں کے نزدیک بھی جائز ہے، لیکن بہ قبح۔ جبال کو طیر پر اس واسطے مقدم کیا کہ ان کی تسخیر و تسبیح زیادہ تعجب کی بات ہے اور اللہ کی قدرت پر زیادہ دال ہے اور معجزہ ہونے میں اس کو بہت دخل ہے، کیونکہ پہاڑ جماد ہیں اور طیر حیوان ناطق۔ مصباح میں ہے کہ "طیر" "طائر" کی جمع ہے، جیسے صاحب کی جمع صحب، راکب کی جمع رکب اور طیر کی جمع طیور و اطیار آتی ہے۔ طیر واحد و جمع پر واقع ہوتا ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طیر جماعت ہے، اس کی تانیث تذکیر سے اکثر ہے، واحد کو طیر نہیں کہتے، بلکہ طائر بولتے ہیں اور مونث کو طائرہ بہت کم کہتے ہیں۔[3] امام قرطبی رحمہ اللہ نے ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ داود علیہ السلام جس وقت سستی پاتے تو پہاڑوں کو حکم دیتے، وہ تسبیح کرنے لگتے تھے، اسی لیے ﴿ وَسَخَّرْنَا ﴾ فرمایا ہے، یعنی ہم نے اُن کو ایسا کر دیا کہ جب وہ اُن کو تسبیح کا حکم کرتے ہیں تو وہ اسی دم اُن کے مطیع ہو جاتے ہیں۔[4]

﴿ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ یعنی یہ تفہیم و ایتاء الحکم و تسخیر، جس کا ذکر ہوا، ہم اس کے کرنے والے ہیں، ہم سے یہ بات کوئی نئی نہیں ہے گو تمھارے نزدیک عجیب ہو۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تسخیر تسبیح جبال و طیور کو ہمراہ داود علیہ السلام کے ہم کرنے والے ہیں، گو تمھارے نزدیک عجیب ہے۔[5] خطیب کے الفاظ یہ ہیں: ایسے کاموں کا کرنا ہماری شان سے ہے اور ہر شے کو انجام دینا بھی ہماری شان ہے، ہمیں کوئی کام بڑا نہیں لگتا گو تمھارے نزدیک عجیب ہو۔ اللہ پاک کی قدرت کے روبرو جمادات کا تسبیح کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ اُمتِ محمدیہ میں بہت سے لوگوں کے واسطے اس قسم کا اتفاق ہوا، چنانچہ مطرف بن عبداللہ بن شخیر رحمہ اللہ جس وقت گھر میں داخل ہوتے تو اُن کے گھر کی دیواریں تسبیح کرنے

[1] المعجم الأوسط (٤/ ٢٤٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: ظلال الجنة (٢/ ٣٠٨) [2] البحر المحيط (٦/ ٣٠٧)
[3] المصباح المنير (٢/ ٣٨٢) [4] تفسير القرطبي (١١/ ٣١٩۔ ٣٢٠) [5] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨)

لگتی تھیں، یہ عبد اللہ ساداتِ تابعین میں سے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے دوسرے انعام کا ذکر فرمایا: ﴿ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ﴾ صنعت بنانے کو کہتے ہیں۔ لبوس اصل میں لباس ہے، یعنی جو چیز پہنی جاتی ہے، اس کو لبوس کہتے ہیں، زرہ یا اور کچھ، کسی شاعر نے کہا ہے ؎

البس لكل حالة لبوسها　　　إما نعيمها و إما بؤسها

یعنی تو ہر حالت کے واسطے اس کا لباس پہن یا راحت اس حالت کی یا اس کی تکلیف۔

یہاں حقیقتاً کپڑا پہننا مراد نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر زمانے کے لیے وہ شے تیار رکھ، جو اس کے لیے مناسب ہے، راحت میں راحت کا سامان، تکلیف میں تکلیف کا ساز و برگ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں اس کے مناسب رہنا چاہیے۔ حالت کو لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ عرب کے نزدیک لبوس سارے ہتھیاروں کو بولتے ہیں؛ زرہ ہو یا جوشن تلوار ہو یا نیزہ، یہاں لبوس سے مراد خاص زرہیں ہیں اور جس طرح رکوب بہ معنی مرکوب اور حلوب بہ معنی محلوب آتا ہے، اسی طرح لبوس بہ معنی ملبوس ہے، کیوں کہ پہنتے ہیں۔ مختار میں ہے کہ درع حدید، یعنی زرہ مونث ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: مذکر و مونث دونوں طرح مستعمل ہوتی ہے اور درع مرأۃ یعنی عورت کا کرتا مذکر ہے۔[1]

﴿ لَكُمْ ﴾ متعلق ہے ﴿ عَلَّمْنٰهُ ﴾ سے، یا صفت ہے ﴿ لَبُوْسٍ ﴾ کی، یا متعلق ہے صنعت سے۔ اول کی بنا پر لام تعلیل کا ہوگا: "أي علمناه لأجلكم" اور ﴿ لَكُمْ ﴾ میں خطاب اہلِ مکہ کو ہے تمام لوگوں کے ساتھ ﴿ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ﴾ امام حسن، ابو جعفر، ابن عامر اور حفص و رَوح نے تائے فوقیہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کی بنا پر ضمیر صنعت کی طرف راجع ہوگی، یا ﴿ لَبُوْسٍ ﴾ کی طرف بتاویل درع، کیوں کہ کلمہ درع کا مونث سماعی ہے۔ شیبہ و ابوبکر و مفضل و ابن ابی اسحق رویس نے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ضمیر اللہ پاک کی طرف پھیری ہے۔ باقی قراء نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس صورت میں ضمیر ﴿ لَبُوْسٍ ﴾ کی طرف راجع ہوگی، بہ لحاظ لفظ، یا داود علیہ السلام کی طرف، یا اللہ کی طرف۔[2]

﴿ لَكُمْ ﴾ کے لام میں تین وجہ تھیں: اول وجہ یہ تھی کہ لام تعلیل کا ہے ﴿ عَلَّمْنٰهُ ﴾ سے متعلق ہے، لہٰذا اس وجہ کی بنا پر ﴿ لِتُحْصِنَكُمْ ﴾ کا لام بھی ﴿ عَلَّمْنٰهُ ﴾ سے متعلق ہوگا اور ﴿ لَكُمْ ﴾ سے باعادۂ جار بدل ٹھہرے گا، بدلِ اشتمال، کیوں کہ ﴿ لِتُحْصِنَكُمْ ﴾ تاویل میں "لإحصانكم" کی ہے اور "إحصان" اور "لكم" کی ضمیر کے درمیان اشتمال کا ملابسہ ہے اور اخیر دو وجہ کی بنا پر ﴿ عَلَّمْنٰهُ ﴾ سے متعلق ہوگا۔ اس جگہ "بأس" سے مراد لڑائی ہے، اگرچہ اس کا اطلاق ہر قسم کی برائی پر آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے داود علیہ السلام کو زرہ بنانا سکھایا تھا، تمھارے

[1] مختار الصحاح (١/ ٢١٨)　[2] فتح القدير (٣/ ٥٧٢)

نفع کے واسطے، تا کہ وہ تم کو روکے اور تمھاری حراست اور حفاظت کرے لڑائی کی تکالیف سے، جس میں تم اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑتے ہو، مثلاً: تلوار، تیر، نیزے کے قتل وزخم سے تم کو محفوظ رکھے، تمھارے بدن پر ہتھیار اثر نہ کرے۔ ﴿ لَكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ ﴾ کا خطاب اس اُمت کے واسطے ہے اہلِ مکہ کو اور اُن لوگوں کو جو اُن کے بعد قیامت تک ہوں گے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی کہ پہلے پہل حلقہ دار زرہ داود علیہ السلام نے بنائی تھی، ان سے پہلے لوہے کہ چوڑے تختوں کی زرہیں ہوتی تھیں ان میں بوجھ زیادہ ہوتا تھا حلقہ دار زرہ میں ہلکا پن اور خوبصورتی وتحصین دونوں جمع ہیں۔ معجزہ اس میں یہ تھا کہ وہ آلات کی مدد کے بغیر بناتے تھے، نہ بھٹی کی حاجت، نہ آگ کی ضرورت، نہ ہتھوڑی وغیرہ کی ضرورت۔ اللہ پاک نے لوہے کو اُن کے دستِ مبارک میں موم کی طرح کر دیا تھا بلا تکلف بناتے تھے، چناں چہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾ [سبا: ١٠] ''اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کر دیا۔''

کہتے ہیں کہ داود علیہ السلام ایک دن صورت شکل بدل کر نکلے، ایسے شخص کو ڈھونڈتے تھے کہ اپنی مملکت میں اپنے چال چلن کے بارے میں اس سے پوچھیں۔ پس جبریل علیہ السلام اُن کے سامنے آئے، ایک آدمی کی صورت میں، انھوں نے ان کو نہ پہچانا تو اُن سے کہا تو داود کا چال چلن اور برتاؤ اپنی مملکت میں کیسا دیکھتا ہے؟ تو جبریل علیہ السلام نے ان سے کہا کہ داود اچھا آدمی ہے، اگر اس میں ایک خصلت نہ ہو۔ داود علیہ السلام نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام بولے: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ بیت المال سے کھاتا ہے، کوئی شے اس سے افضل نہیں ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ کی محنت سے کھائے۔ پھر داود علیہ السلام لوٹے اور اللہ پاک سے اس بات کا سوال کیا کہ روزی اُن کی اُن کے ہاتھ کی مشقت سے کرے، پس اللہ پاک نے اُن کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تو وہ لوہے کی زرہ بناتے اس کو فروخت کرتے اور اس کی قیمت سے گزر بسر کیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ وہی اللہ پاک کا قول ہے: ﴿ وَعَلَّمْنٰهُ ﴾ یعنی ہم نے اس کو الہام کیا، یا وحی سے زرہ بنانا سکھایا، پھر لوگوں نے اُن سے سیکھا۔

پھر یہ کام لوگوں کی میراث میں یکے بعد دیگرے برابر چلا آیا، پس آخر زمانے تک خلق میں سے جتنے حرب و ضرب والے ہیں، ان سب کو یہ نعمت عام وطام ہوگئی تو اُن کو لازم ہے کہ اس نعمتِ عظیم پر اللہ پاک کا شکر ادا کریں، لہٰذا اسی لیے اللہ پاک نے اُن پر شکر واجب کیا، پس ارشاد فرمایا: ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴾ یعنی تم اللہ پاک کا شکر کرو اس بات پر کہ اس نے تم پر اس صنعت کو آسان کر دیا اور اس کے سبب سے لڑائی اور جنگ کے نقصان سے تم کو محفوظ رکھا۔ محی السنہ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ پاک داود علیہ السلام اور اُن کے گھر والوں سے فرماتا ہے کہ تم شکر کرو۔ کسی نے کہا: مکے والوں سے فرماتا ہے، کیا تم ہو شکر کرنے والے میری نعمت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر کے؟[1] انتھی

[1] تفسير البغوي (٥/ ٣٣٥)

کلامہ۔ امام بغوی رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ جائز ہے کہ داود علیہ السلام کو اور اُن کے اہلِ بیت کو خطاب ہو بہ تقدیرِ قول، یعنی اس کے بعد کہ ہم نے اُن پر اُن نعمتوں کا انعام کیا۔ پھر ہم نے اُن سے کہا: کیا ہو تم شکر کرنے والے اُن نعمتوں کا جو اُن کو عطا ہوئیں؟ یعنی جبال وطیور کا مسخر کرنا، لوہے کا نرم کرنا، زرہ بنانے کا علم عطا کرنا۔

رہی یہ بات کہ یہاں استفہام بہ معنی حکم ہے، لہٰذا ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی کے مبالغے کے لیے امر کو استفہام کے پیرایہ میں ادا فرمایا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ یہاں ”فَاشْكُرُوْا“ کی جگہ ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴾ رکھا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ تقریع استفہام کی مباشرت فعل سے اس شے کے بیان کرنے کے بعد جو اس فعل کی مباشرت کی موجب ہے، زیادہ موثر ہے، اس فعل کے واجب کرنے میں اس واجب کرنے سے جو بہ صورتِ امر ہوتا ہے، اس لیے کہ استفہام مباشرتِ فعل سے متضمن ہے تقریع کو اس فعل کے ترک پر، بعد تحقیق اس شے کے جو اس فعل کی موجب ہے، امر بصورتِ استفہام قرآن شریف میں بہت آیا ہے، من جملہ اس کے ایک یہ ہے: ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ۹۱] ”پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟“ ”أَيِ اِنْتَهُوْا وَ أَأَسْلَمْتُمْ أَيْ أَسْلِمُوْا“ یہ سب شیخ زادہ کی تقریر کا حاصل ہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاس ساز وسامان تحصیلِ علم کا بہ ہمہ وجوہ مہیا ہو، اس سے یوں کہو کہ بھائی تم خوش فہم آدمی ہو، ہر قسم کی کتب تمھارے پاس موجود ہیں، کھانے پینے کا خوب اطمینان ہے، استاد ہر قسم کے پڑھانے کے لیے حاضر ہیں، فرصت پورے طور پر حاصل ہے، پس تم پڑھو۔ ایک یہ عبارت ہے کہ اس تقریر کے بعد اس سے یوں کہو: کیوں جی تم پڑھو گے؟ اس میں کس قدر مبالغہ وتقریع وتوبیخ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم بڑے احمق نادان ہو کہ باوجود تہیۂ اسبابِ تحصیلِ علم نہیں پڑھتے ہو، تم تو ضرور ہی پڑھو۔ اسی طرح آیتِ مذکور میں سمجھنا چاہیے۔ پھر جب اللہ پاک ان نعمتوں کا ذکر فرما چکا، جن کے ساتھ داود علیہ السلام کو خاص کیا تھا تو اب اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا، جن کے ساتھ سلیمان علیہ السلام کو اختصاص بخشا، کیوں کہ اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام کو داود علیہ السلام کے ملک ونبوت کا وارث کیا اور دو چیزیں اس سے زیادہ عطا کیں: ایک تو ہوا کی تسخیر، دوسری شیاطین کی تسخیر۔

پس ارشاد فرمایا: ﴿ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً ﴾ ریح ایک لطیف جسمِ متحرک ہے، اس کی لطافت کے مارے کوئی اس کو پکڑ نہیں سکتا ہے، بہ سبب اس کی حرکت کے حس کو ظاہر ہوتی ہے اور مارے لطافت کے آنکھ سے مخفی رہتی ہے۔ کلمۂ ”ریح“ کلامِ عرب میں مونث ہے۔ ﴿ عَاصِفَةً ﴾ زور سے چلنے والی ہوا کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”عصفت الریح“ یعنی ہوا زور سے چلی اور اس ہوا کو عاصف وعصوف بھی کہتے ہیں۔ دوسری آیت میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴾ [صٓ: ۳۶] ”چناں چہ ہم نے ہوا اس کے تابع کر دی تھی، وہ اس کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی جہاں کا وہ ارادہ کرتا تھا۔“ ﴿ رُخَآءً ﴾ کے معنی نرم

ہوا ہیں۔ غرضیکہ ہوا سلیمان علیہ السلام کی فرماں بردار تھی، جس طرح وہ چاہتے اس طرح چلتی تھی، کبھی نرم کبھی زور سے۔ جمہور کی قراءت یہی ہے کہ ﴿ اَلرِّیْحَ ﴾ منصوب مفعول ہے فعل مقدر کا، یعنی ''وسخرنا الريح لسليمان'' اور ﴿ عَاصِفَةً ﴾ حال ہے مفعول سے۔ عبدالرحمن اعرج، سلمی اور ابوبکر نے یوں پڑھا ہے: ''ولسليمان الريحُ'' برفعِ ریح، ماقبل سے اس کو قطع کیا ہے۔ ﴿ اَلرِّیْحَ ﴾ مبتدا موخر اور ''لسليمان'' ''مستقرة'' یا ''مسخرة'' سے متعلق ہو کر خبر مقدم، یا ﴿ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ ﴾ بھی محلِ نصب میں ہوگا۔ بنا بر حال مفعول سے، یا بنا بر بدلیت۔ (یعنی اول حال سے بدل ہوگا یا اس کی ضمیر سے حال ہوگا۔[1] (قاله البيضاوي))

رہی یہ بات کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے حرفِ لام اور داود علیہ السلام کے لیے کلمہ مع فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرفِ لام تملیک پر دال ہے، چوں کہ سلیمان علیہ السلام ہوا سے خدمت لیتے اور وہ اُن کی خدمت کرتی، اس لیے لام مِلک کا یہاں مناسب ہوا، کیوں کہ اُن کی طاعت میں اور اُن کے زیرِ حکم تھی مثلِ غلام کے اور جبال و طیور چوں کہ داود کے ساتھ تسبیح میں شریک تھے، اس لیے کلمہ مع یہاں مناسب ٹھہرا، کیوں کہ یہ صحبت و معیت پر دال ہے۔ بحر میں اسی طرح کہا ہے۔[2] ﴿ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ ﴾ یعنی وہ ہوا سلیمان علیہ السلام کے حکم سے چلتی، تیز چاہتے تو تیز چلتی، نرم چاہتے تو نرم چلتی۔

﴿ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ﴾ ارضِ مبارک سے مراد شام ہے، جس طرح گزر چکا، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام کے واسطے ہوا کو مسخر کر دیا۔ دراں حالیکہ وہ زور سے چلنے والی تھی۔ یعنی وہ ہوا زور سے چلنے والی ہوا کا کام کرتی تھی، باوجود اس کے کہ فی نفسہ نرم اور طیب تھی، اس لیے کہ اُن کا مکان شام میں تھا، اُن کے تخت کو ہوا ذرا سی مدت میں زمین کے اطراف سے اُٹھا کر ملکِ شام کو لے جاتی تھی بعد اس کے کہ شام کے ملک سے اسے صبح کے وقت لے کر چلتی، یعنی صبح کو ملکِ شام سے اس کو لے جاتی۔ زمین کے مختلف کونوں میں اس کے درمیان اور ملکِ شام کے درمیان زوال کے وقت تک ایک ماہ کی مسافت ہوتی، پھر زوال کے بعد وہاں سے شام کی طرف غروبِ آفتاب کے وقت لوٹ آتی تھی؛ جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ﴾ [سبا: ۱۲] ''اس کا صبح کا چلنا ایک ماہ (کی مسافت) تھا اور اس کا شام کا چلنا بھی ایک ماہ (کی مسافت) تھا۔'' رواح نقیض صباح ہے، رواح نام ہے اس وقت کا جو سورج ڈھلنے سے رات تک ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس وقت گھوڑوں نے سلیمان علیہ السلام کو مشغول کر دیا، یہاں تک کہ اُن سے عصر کی نماز فوت ہوگئی تو خفا ہوئے گھوڑوں کی کھونچیں کاٹ ڈالیں۔ ﴿ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴾ [ص: ۳۳] ''پھر وہ (ان کی) پنڈلیوں اور گردنوں پر (ہاتھ) پھیرنے لگے۔'' اس پر اللہ پاک نے اُن سے بہتر و تیز تر شے عنایت فرمائی، یعنی ہوا جہاں وہ چاہتے اُن کے حکم اور ارادے سے چلتی۔

صبح کو ایلیا سے چلتی اصطخر میں قیلولہ کرتے، پھر وہاں سے چلتے تو زمینِ شام میں رات بسر فرماتے۔ امام

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤) [2] البحر المحيط (٦/ ٣٠٨)

مقاتل ﷫ نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے واسطے شیاطین نے ایک فرش سونے کا ابریشم میں بُن دیا تھا، یہ فرش فرسخ در فرسخ تھا، یعنی ایک فرسخ کا مربع۔ اس فرش کے درمیان میں سونے کا منبر رکھا جاتا، سلیمان علیہ السلام اس پر تشریف فرماتے، اُن کے گرد تین ہزار سونے چاندی کی کرسیاں ہوتیں، سونے کی کرسیوں پر انبیا علیہم السلام جلوس فرماتے، چاندی کی کرسیوں پر علما بیٹھتے اور اُن کے گرد اور انسان ہوتے اور انسانوں کے گرد جن و شیاطین۔ پرندے اپنے پروں سے اُن پر سایہ کرتے، تاکہ دھوپ نہ پڑے۔ بادِ صبا اس فرش کو مہینے بھر کی مسافت پر صباح سے رواح تک اور رواح سے صباح تک اٹھا لاتی۔[1] سلیمان علیہ السلام ایک ایسے شخص تھے کہ لڑنے بھڑنے سے بہت ہی کم بیٹھتے تھے۔ زمین کے کسی کنارے میں کسی بادشاہ کے بارے میں سنتے تو ضرور ہی اس کے پاس جاتے اور حق کی طرف اس کو دعوت دیتے۔ شیخ زادہ وغیرہ میں اسی طرح ہے۔

﴿ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی ہم ہر شے کو خوب جانتے ہیں تو اس کو مقتضائے حکمت پر جاری کرتے ہیں۔[2] (كذا في البيضاوي) علامہ نسفی ﷫ کے الفاظ یہ ہیں کہ ہمارے علم نے ہر شے کا احاطہ کر لیا ہے تو ساری اشیا ہمارے مقتضائے علم پر جاری ہوتے ہیں۔[3] امام محلی ﷫ کا حاصل یہ ہے کہ من جملہ علمِ الٰہی ایک یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس بات کو جان لیا کہ جو شے وہ سلیمان علیہ السلام کو عطا کرے گا تو وہ اُن کو اس طرف داعی ہوگی کہ اللہ پاک کے لیے خضوع و عاجزی کریں گے، پس فعل اس کا اپنے مقتضائے علم پر ہے۔[4]

﴿ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ ﴾ کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہو یا نکرہ موصوفہ، دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے کہ محلِ نصب میں ہو بر بنا عطف بر ریح، یعنی ہم نے مسخر کر دیے سلیمان علیہ السلام کے لیے وہ شیاطین جو غوطہ لگاتے ہیں اور دریا کے نیچے گھستے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محلِ رفع میں ہو بنا بر ابتدا اور ﴿ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ خبر مقدم۔ رہی یہ بات کہ ﴿ يَغُوْصُوْنَ ﴾ بصیغۂ جمع آیا ہے، لہٰذا اس میں ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کی رعایت کی گئی ہے اور اس کو اس بات نے حسین کر دیا کہ پہلے جمع واقع ہوئی ہے، یعنی شیاطین۔ غوص کہتے ہیں پانی میں اترنے کو۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”غاص في الماء“ غواص وہ شخص ہے، جو غوطہ لگاتا ہے دریا میں موتی نکالنے کے لیے۔ جمل میں کہا ہے کہ شیاطین سے مراد کافر ہیں، مومن مراد نہیں۔[5] فتح البیان میں کہا ہے کہ مراد کافر جن ہیں، مومن جن مراد نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین سے مراد جن ہیں، ورنہ شیاطین میں مومن اور کافر کی تفریق کیسی؟ غرضیکہ اللہ پاک نے شیاطین کو سلیمان علیہ السلام کا مطیع کر دیا تھا تو اُن کے حکم سے دریا میں گھستے اور موتی و جواہر اور نفیس چیزیں نکالتے تھے۔

﴿ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ﴾ یعنی غوطہ لگانے کے سوا اور کام بھی کرتے تھے، جیسے: شہر بنانا، محل تیار کرنا اور عجیب غریب صنعتوں کا اختراع کرنا، جس طرح کہ اللہ پاک نے سورت سبا میں فرمایا ہے: ﴿ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا

[1] تفسير البغوي (٥/ ٣٣٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤) [3] تفسير النسفي (٣/ ٨٨)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨) [5] فتح البيان (٨/ ٣٥٨)

يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِيَ الشَّكُوۡرُ ﴾ [سبا: ۱۳] ''جو وہ (سلیمان) چاہتا وہ (جن) اس کے لیے وہی بنا دیتے، عالی شان عمارتیں اور مجسمے اور حوضوں جیسے (بڑے بڑے) لگن اور ایک ہی جگہ (چولہوں پر) جمی ہوئی دیگیں، اے آلِ داود! شکرانے کے طور پر (نیک) عمل کرو اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔'' امام فراء رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں ''سوی ذلك'' کہا ہے، [1] یعنی یہاں ﴿ دُوْنَ ﴾ سے مراد سوا وغیرہ ہے، اقل و ادون (قلیل اور تھوڑا) کے معنی نہیں ہیں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ سوائے غوص کے یہ اشیا ہیں، جیسے: نورہ، طاحون شیشی اور صابن، کیوں کہ اشیاے مذکورہ انھیں کی نکالی ہوئی ہیں۔ [2] کسی نے کہا ہے کہ کفار کو مسخر کیا تھا، مومنین کو مسخر نہیں کیا تھا۔ شیاطین کا لفظ اس پر دال ہے۔ اور مومن جب کسی کام میں مسخر کیا جاتا ہے تو اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ﴿ دُوْنَ ذٰلِكَ ﴾ صفت ہے ﴿ عَمَلًا ﴾ کی۔

﴿ وَكُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَ ﴾ یعنی ہم تھے شیاطین کی حفاظت کرنے والے، یعنی اُن کے اعمال کی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ پاک اُن کی بھاگنے سے نگرانی کرتا تھا، یا اس بات کی کہ وہ کام نہ کریں، یا اس سے کہ اُن کے حکم سے سرتابی کریں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس سے کہ اپنے کام کو بگاڑ ڈالیں۔ اُن کی عادت تھی کہ جو کام دن کو بناتے اسے رات کو بگاڑ ڈالتے۔ [1] کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام جب کسی شیطان کو کسی انسان کے ہمراہ بھیجتے، تاکہ ان کا کوئی کام کرے تو اس انسان سے فرما دیتے کہ جب یہ شیطان اپنے کام سے قبل رات کے فارغ ہو جائے تو اس کو دوسرے کام میں مشغول کر دینا، تاکہ جو کام اس نے بنایا ہے، اس کو بگاڑے نہیں۔

تحبیر میں کہا ہے کہ داود علیہ السلام سو برس زندہ رہے، اُن کے درمیان اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان پانچ سو انہتر برس کا فاصلہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اناسی برس کا اور اُن کے فرزند ارجمند سلیمان علیہ السلام اُنسٹھ برس زندہ رہے اور اُن کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدایش کے درمیان تقریباً ایک ہزار سات سو برس کا فاصلہ ہے۔ پھر اللہ پاک نے چھٹا قصہ ایوب علیہ السلام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے یوں بیان فرمایا:

وَ اَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ ۚ ۝ۖ ۸۳ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِكۡرٰى لِلۡعٰبِدِيۡنَ ۝ ۸۴

اور (یاد کریں) ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو سب رحم

[1] تفسير القرطبي (۱۱/ ۳۲۲) [2] تفسير البحر المحيط (۶/ ۳۰۹) [3] فتح القدير (۳/ ۵۷۳)

کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (83) چناں چہ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو بھی تکلیف اسے تھی، اس کو ہم نے دور کر دیا اور ہم نے اسے اس کے اہل وعیال بھی دیے، اور اپنی طرف سے مہربانی کے لیے ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی عطا کیے، اور عبادت گزاروں کی نصیحت کے لیے (84)

ایوب علیہ السلام کا تذکرہ:

ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب طرف سے آسودہ رکھا تھا، کھیت اور مویشی اور لونڈی غلام کمائے۔ اولادِ صالح اور اپنی مرضی کے موافق عورت اور بڑے شکر گزار تھے۔ پھر آزمانے کے لیے اُن پر شیطان کو ہاتھ دیا، کھیت جل گئے، مویشی مر گئے، اولاد اکٹھی دب مری، دوستدار الگ ہوگئے، بدن پر آبلے پڑ کر کیڑے پڑ گئے، ایک عورت ساتھی رہ گئی، جیسے نعمت کے وقت شاکر تھے، ویسے ہی آزمائش میں صابر رہے۔ ایک قرن کے بعد یہ دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے مری ہوئی اولاد کو زندہ کیا اور بھی نئی اولاد دی اور زمین سے چشمہ نکالا، اسی سے پی کر اور نہا کر بھلے چنگے ہو گئے اور سونے کی ٹڈیاں برسائیں اور سب طرح درست کر دیا۔

ایوب علیہ السلام کے مال و اولاد و جسم میں جو آزمائش ان کو پہنچی، اللہ پاک اس کی خبر دیتا ہے۔ یہ قصہ اس طرح ہوا کہ اُن کے پاس سواری کے جانور اور مویشی بہت تھے اور کھیتی بھی بہت تھی اور اولاد بہ کثرت تھی، اچھے اچھے مکان تھے، پھر اُن سب میں اُن کی آزمائش ہوئی، ساری چیزیں جاتی رہیں، پھر ان کے جسم میں آزمائش ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اُن کے سارے جسم میں جذام ہو گیا سوائے اُن کے دل اور زبان کے، جسم کا کوئی حصہ تکلیف سے نہ بچا۔ دل و زبان سے اللہ عزوجل کا ذکر کیا کرتے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ پاس بیٹھنے والا ان سے گھن کھاتا، شہر کے ایک گوشے میں تنہا رہ گئے، لوگوں میں سے کوئی اُن پر شفقت و مہربانی کرنے والا نہ رہا، کوئی ترس کھانے والا نہ تھا، سوائے اُن کی بیوی کے کہ وہ اُن کی تیمارداری کیا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کی بیوی محتاج ہو گئیں تو اُن کے واسطے لوگوں کی خدمت کیا کرتیں۔

بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں، پھر صالحین پر، پھر الامثل ثم الامثل، یعنی صالحین کے بعد پھر جس قدر جو شخص اچھا ہے، اسی قدر اس کی آزمائش سخت ہوتی ہے۔ دوسری حدیث شریف میں یہ مروی ہے کہ آدمی اپنے دین کے اندازے پر مبتلا ہوتا ہے، پس اگر اس کے دین میں سختی ہے تو اس کی آزمائش میں زیادتی کی جاتی ہے۔[1]

اللہ پاک کے نبی ایوب علیہ السلام صبر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، اس بارے میں ضرب المثل تھے۔ یزید بن

---

(1) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٩٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٢٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٣)

میسرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے، جبکہ اللہ پاک نے ایوب علیہ السلام کو آزمایا اور اُن کے گھر والے بال بچے سب مر گئے اور مال جاتا رہا اور اُن کے لیے کوئی شے باقی نہ رہی تو انھوں نے اچھا ذکر کیا، یعنی تکلیف کی شکایت نہ کی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔ پھر کہا: اے ربِ ارباب! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے مجھ پر احسان کیا، مجھے مال و اولاد عطا کی، میرے دل سے کوئی شعبہ باقی نہ رہا، مگر اس میں یہ داخل ہو گیا ہے۔ پھر تو نے یہ سب مجھ سے لے لیا اور میرے دل کو فارغ کر دیا، اب کوئی شے میرے اور تیرے درمیان حائل نہیں ہوتی۔ اگر میرا دشمن ابلیس اس بات کو جان لے جو تو نے کی تو وہ مجھ پر حسد کرے۔ راوی نے کہا کہ ”فلقي إبليس من ذلك منكرا“ یعنی یہ بات ابلیس کو بری لگی۔ راوی نے کہا: اور ایوب علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! بے شک تو نے مجھے مال و اولاد عطا کی۔ تو میرے دروازے پر کوئی کھڑا نہ ہوا کہ میرے کسی ظلم کی جو میں نے اس پر کیا ہو، اس کی شکایت کرے، حالاں کہ تو اس کو جانتا ہے کہ میرے لیے نرم بچھونا بچھایا جاتا تو میں اس کو چھوڑ دیتا اور اپنے نفس سے کہتا کہ اے نفس! تو صرف بچھونا روندنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ اس کو میں نے نہیں چھوڑا، مگر تیری ذات کو طلب کرنے کے واسطے۔ اس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1] امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے ایوب علیہ السلام کے بارے میں ایک طویل قصہ روایت کیا گیا ہے۔ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے بہ سند تا وہب اس کو بیان کیا ہے اور بہت سے متاخر مفسروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور اس میں غرابت تھی۔ بوجہ طول ہم نے اس کو چھوڑ دیا۔[2]

مروی ہے کہ ایوب علیہ السلام ایک طویل مدت تک آزمایش میں رہے۔ پھر مفسرین نے اس سبب میں اختلاف کیا ہے، جس نے ان کو یہ دعا مانگنے پر آمادہ کیا، پس حسن و قتادہ نے کہا ہے کہ ایوب علیہ السلام سات برس کئی ماہ مبتلا رہے۔ بنی اسرائیل کے گھورے (کوڑے کے ڈھیر) پر پڑے رہتے، جانور اُن کے جسم میں آمد و رفت رکھتے۔ پھر اللہ پاک نے ان سے بلا کو دور کیا اور اُن کو اجرِ عظیم عطا فرمایا اور اُن کی ثنائے حسن فرمائی۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پورے تین برس بلا میں رہے، اس سے زیادہ نہ کم۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایوب علیہ السلام کا گوشت گر پڑا تھا، یہاں تک کہ پٹھوں اور ہڈیوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ان کی بیوی ان کی خدمت کیا کرتی تھیں، ان کے پاس راکھ لاتیں، اس میں پڑے رہتے تھے۔ جس وقت اُن کی بیماری دراز ہوئی تو بی بی نے اُن سے کہا: اے ایوب! اگر تو اللہ سے دعا کرے تو وہ تجھ سے دور کر دے۔ انھوں نے کہا: میں ستر برس تندرست زندہ رہا۔ ”فهو قليل لله أن أصبر له سبعين سنة“ یعنی اس کی نسبت مرض کا زمانہ قلیل ہے، اب میں اللہ کے واسطے ستر برس صبر کروں گا۔ (تفسیر ابن کثیر میں اس طرح ہے[3]) تفسیر بیضاوی اور مدارک میں یوں ہے کہ ایوب علیہ السلام نے بیوی سے کہا کہ راحت کی مدت کتنی تھی؟ تو بی بی نے کہا: اسّی برس! ایوب علیہ السلام بولے: میں اللہ سے شرماتا ہوں کہ اس سے دعا کروں، حالانکہ میری

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۵۱) [2] تفسیر الطبري (۱۸/ ۴۸۳۔ ۴۹۳) [3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۵۱)

آزمایش کی مدت ابھی آرام کی مدت کو نہیں پہنچی۔[1] امام خازن رحمہ اللہ میں بھی یہ روایت وہب اسی کا ذکر ہے۔[2] غرضیکہ ستر ہوں یا اسی تحبیر میں جو کہا ہے کہ اُن کی عمر ترسیٹھ برس کی ہوئی، اس کے خلاف ہے، جب کل اس قدر مدت زندہ رہے تو اسی وستر کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ واللہ أعلم۔)

اُن کی بی بی اس سے گھبرا گئیں، پس نکلیں، پھر وہ اُجرت پر لوگوں کا کام کاج کرتیں، جو اُن کو ملتا، اُن کے پاس لاتیں، پھر اُن کو کھلاتیں۔ فلسطین کے دو آدمی ایوب علیہ السلام کے بھائی اور دوست تھے۔ ابلیس اُن کے پاس گیا، اُن سے کہا کہ ایوب تمھارے بھائی کو ایسی ایسی بلا پہنچی ہے، تم اس کے پاس جاؤ، اس کی زیارت کرو، اپنی زمین کی شراب اپنے ساتھ لے جاؤ، اگر وہ اس میں سے پی لے گا تو اچھا ہو جائے گا۔ یہ دونوں ایوب علیہ السلام کے پاس گئے، جس وقت انھوں نے اُن کی طرف نظر کی تو رو دیے۔ ایوب علیہ السلام نے کہا: تم کون ہو؟ بولے: ہم فلاں فلاں ہیں۔ ایوب علیہ السلام نے اُن کو مرحبا کہا اور کہا: مرحبا ہے اس کو جو کہ بلا کے وقت مجھ سے بے وفائی نہیں کرتا۔ دونوں نے کہا: اے ایوب! شاید تو کوئی شے چھپاتا تھا اور اس کے سوا اور ظاہر کرتا تھا، اس لیے اللہ نے تجھے آزمایش میں ڈالا ہے۔ انھوں نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا۔ پھر کہا وہ جانتا ہے کہ میں نے کوئی ایسی شے پوشیدہ نہیں کی، جس کے علاوہ کچھ اور میں نے ظاہر کیا ہو، لیکن میرے رب نے مجھے مبتلا کیا ہے تاکہ دیکھے کہ آیا میں صبر کرتا ہوں یا گھبراتا ہوں۔ ان دونوں نے کہا: اے ایوب! تو ہماری شراب میں سے پی لے، اس لیے کہ اگر تو اس میں سے پی لے گا تو اچھا ہو جائے گا۔

راوی نے کہا کہ ایوب علیہ السلام اس پر خفا ہوئے اور کہا تمھارے پاس خبیث آیا تو اس نے تم کو اس بات کا امر کیا، تمھارا کلام اور تمھاری شراب اور تمھارا طعام مجھ پر حرام ہے۔ پھر وہ دونوں اُن کے پاس سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی بی بی نکلیں لوگوں کا کام کیا کرتی تھیں، لہٰذا انھوں نے کسی گھر والوں کی روٹی پکائی تھی، ان گھر والوں کا ایک بچہ تھا، اس کے واسطے انھوں نے ایک قرص (ٹکیا، چھوٹی روٹی) بنایا تھا اور وہ بچہ سویا ہوا تھا، گھر والوں نے اس کو جگانا برا سمجھا تو وہ قرص ان بی بی کو دے دیا، وہ اس کو لے کر ایوب علیہ السلام کے پاس آئیں، انھوں نے قرص کو اوپرا سمجھا، یعنی خلافِ عادت اور کہا تو تُو میرے پاس یہ نہیں لایا کرتی تھی، آج تیرا کیا حال ہے؟ بیوی نے اُن سے قصہ بیان کیا۔ ایوب علیہ السلام بولے: شاید وہ بچہ جاگ اُٹھا ہوگا تو اس نے مانگا ہو، پھر اس کو نہ پایا ہو تو وہ اپنے گھر والوں پر روئے گا، اس لیے تو اس کو اسی کے پاس لے جا۔ یہ بیوی چلیں، یہاں تک کہ اُن لوگوں کے زینے تک پہنچیں اتنے میں اُن کی بکری تھی، اس نے اُن کو سینگ مارا، اس پر یہ بول اُٹھیں: ”تعس أیوب الخطاء“ یعنی ہلاک ہوا ایوب بڑا خطا کار۔ پھر جس وقت زینے پر چڑھ گئیں تو بچے کو پایا کہ وہ جاگ اُٹھا ہے اور وہی قرص مانگ رہا ہے اور اپنے گھر والوں پر رو رہا ہے، اس قرص کے سوا اور کوئی شے نہیں لیتا، اب یہ بی بی بولیں: ”رحمہ اللہ“ یعنی اللہ ایوب علیہ السلام پر رحم کرے۔

---

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٠٤) تفسیر النسفي (٣/ ٨٩) [2] تفسیر الخازن (٤/ ٣١٤)

پھر وہ قرص اس بچے کو دے دیا اور لوٹ آئیں۔

پھر اُن کی بیوی کے پاس ابلیس طبیب کی صورت میں آیا۔ اُن سے کہا کہ تیرے خاوند کی بیماری لمبی ہوگئی ہے۔ اگر وہ اچھا ہونا چاہے تو اسے چاہیے کہ ایک مکھی لے اور اس کو بنوفلاں کے بت کے نام سے ذبح کر ڈالے۔ وہ یقیناً بالکل اچھا ہو جائے گا اور اس کے بعد توبہ کر لے۔ بی بی نے یہ بات ایوب علیہ السلام کو بتائی، وہ بولے: یقیناً تیرے پاس خبیث آیا، اللہ کے واسطے مجھ پر یہ ہے کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو تجھے سو کوڑے ماروں گا، پھر وہ اُن کے واسطے محنت مزدوری کرنے کو نکلیں تو اُن سے رزق روک دیا۔ ''فجعلت لا تأتي أهل بيت فيريدونها'' یعنی اب یہ نوبت آ گئی کہ جس گھر جاتیں، کوئی ان سے کام نہ لیتا، پھر جب یہ بات اُن پر سخت ہوئی اور ایوب علیہ السلام پر اُن کو بھوک کا خوف ہوا تو اپنے سر کے بالوں کی ایک لٹ مونڈی، پھر اس کو اشراف کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کے ہاتھ بیچ دیا، انھوں نے بہت سا پاک کھانا اُن کو دیا، اس کو لے کر ایوب علیہ السلام کے پاس آئیں، ایوب علیہ السلام نے جب اس کو دیکھا تو اوپرا سمجھا اور کہا: تیرے پاس یہ کہاں سے آیا؟ کہا: میں نے ایک گھر کے لوگوں کا کام کیا تھا، انھوں نے مجھے کھانا دیا۔ ایوب علیہ السلام نے اس میں سے کھایا، پھر کل کا دن ہوا تو وہ نکلیں کام تلاش کیا نہ ملا تو ایک اور لٹ مونڈی، اسی لڑکی کے ہاتھ اس کو فروخت کیا، پھر انھوں نے اسی کھانے میں سے دیا، یہ اس کو لے کر ایوب علیہ السلام کے پاس آئیں۔ انھوں نے کہا: میں اس کو نہ کھاؤں گا، یہاں تک کہ میں جان لوں کہ وہ کھانا کہاں سے ہے؟ بی بی نے اپنی اُوڑھنی اُتار کر رکھ دی۔ ایوب علیہ السلام نے جب اُن کو سر منڈا ہوا دیکھا تو بہت ہی سخت گھبرائے۔ پس اس وقت اللہ عزوجل سے اس طرح دعا کی: ﴿ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نوف بکالی سے روایت کیا ہے کہ جو شیطان ایوب علیہ السلام میں قائم کیا گیا تھا، اس کو مبسوط کہتے تھے۔ کہا اور اُن کی بیوی کہا کرتی تھیں کہ تو اللہ سے دعا کر، وہ تجھے شفا دے، وہ دعا نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اُن کے پاس سے گزرا تو بعض نے بعض سے کہا کہ نہیں پہنچا اس کو، جو کچھ کہ پہنچا، مگر کسی بڑے گناہ کے سبب سے پہنچا ہے، پس اس وقت ایوب علیہ السلام نے کہا: ﴿ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عبید بن عمیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایوب علیہ السلام کے دو بھائی تھے، وہ ایک دن آئے، بُو کے مارے اُن کے قریب نہ آ سکے تو دور کھڑے رہے۔ پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر اللہ ایوب علیہ السلام سے کوئی نیکی جانتا تو اس کو اس بلا کے ساتھ مبتلا نہ کرتا۔ ایوب علیہ السلام اُن کی بات سے ایسے گھبرائے کہ کبھی کسی شے سے نہ گھبرائے تھے۔ پس کہا: الٰہی اگر تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی رات پیٹ بھر کر بسر نہیں کی، حالانکہ میں کسی

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۵۱۔ ۲۵۲)

بھوکے کا مکان جانتا ہوں تو تُو میری تصدیق کر، پس آسمان سے اُن کی تصدیق کی گئی اور اُن کے دونوں بھائی سن رہے تھے۔ پھر کہا: الٰہی اگر تو جانتا ہے کہ کبھی میرے پاس دو کُرتے نہ ہوئے، حالانکہ میں کسی ننگے کا مکان جانتا ہوں تو تُو میری تصدیق کر، پس آسمان سے اُن کی تصدیق کی گئی اور وہ سن رہے تھے۔ پھر کہا: "اللهم بعزتك" یعنی الٰہی! مجھے قسم ہے تیری عزت کی۔ پھر سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔ کہا: الٰہی! مجھے قسم ہے تیری عزت کی میں اپنا سر کبھی نہ اُٹھاؤں گا، یہاں تک کہ تو مجھ سے اس بلا کو دور کر دے۔ پس انھوں نے اپنا سر نہ اُٹھایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بیماری کو دور کر دیا۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بوجہ دیگر اس کے مثل انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « إِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ أَيُّوبَ لَبِثَ بِهِ بَلَاءُهُ ثَمَانِيَ عَشَرَةَ سَنَةً » یعنی ایوب علیہ السلام کی بلا اٹھارہ برس رہی تو قریب اور بعید کے لوگوں نے اُن کو چھوڑ دیا، مگر وہ شخص اُن کے بھائیوں سے، وہ اُن کے خاص اخوان میں سے تھے، صبح و شام اُن کے پاس آتے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا دوسرے سے: تو جانتا ہے، واللہ! یقیناً ایوب نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے کہ جہان والوں میں سے کسی نے اس کو نہ کیا تو اس سے دوسرے نے کہا: یہ کیا ہے؟ کہا کہ اٹھارہ برس سے اللہ نے اس پر رحم نہ کیا کہ جو بلا اس کو ہے اسے دور کر دیتا۔ پھر جب وہ دونوں ایوب علیہ السلام کی طرف گئے تو اس شخص نے صبر نہ کیا، یہاں تک کہ ایوب سے اس کا ذکر کر دیا، اس پر ایوب علیہ السلام نے کہا کہ میں نہیں جانتا تو کیا کہتا ہے سوا اس کے کہ اللہ عز و جل جانتا ہے کہ میں دو آدمیوں پر گزرتا، وہ جھگڑتے ہوتے، پھر وہ اللہ کا ذکر کرتے تو میں اپنے گھر لوٹ آتا۔ پھر اُن کی طرف سے کفارہ دیتا تھا، اس بات کی کراہیت کی وجہ سے کہ اللہ کا ذکر نہ کیا جائے مگر حق میں۔

فرمایا: وہ اپنی حاجت میں نکلا کرتے تھے۔ پھر جب وہ اس کو پورا کر لیتے تو اُن کی بی بی اُن کا ہاتھ پکڑے رہتیں، یہاں تک کہ پہنچ جائیں، پھر جس وقت کہ ایک دن ہوا تو بی بی نے آنے میں دیر کی، تو اسی جگہ اللہ نے ایوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی: ﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴾ [ص: ٤٢] "(ہم نے کہا:) اپنا پیر زمین پر مار، یہ غسل کرنے اور پینے کو (ٹھنڈا پانی) ہے۔" فتح القدیر و فتح البیان میں اتنی عبارت اور زیادہ ہے: "فاستبطأته فتلقته و أقبل عليها قد أذهب الله ما به من البلاء وهو أحسن ما كان، فلما رأته قالت أي بارك الله فيك هل رأيت نبي الله المبتلى، والله على ذلك ما رأيت رجلا أشبه به منك إذ كان صحيحا؟ قال: فإني أنا هو، قال وكان له أندران: أندر للقمح، و أندر للشعير، فبعث الله سحابتين، فلما كانت إحداهما على أندر القمح أفرغت فيه الذهب حتى فاض، و أفرغت الأخرى في أندر الشعير الورق حتى فاض"[2] أخرجه ابن أبي الدنيا و أبو يعلىٰ و ابن جرير و ابن أبي

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٩)

[2] مسند أبي يعلىٰ (٦/ ٢٩٩) تفسير الطبري (١٢/ ٢١١_ ٢١٢) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٥٩_ ٢٤٦٠) صحيح ابن حبان (٧/ ١٥٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٦٣٥) فتح القدير (٣/ ٥٧٧_ ٥٧٨) فتح البيان (٨/ ٣٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧)

حاتم والروياني و ابن حبان و الحاكم و صححه و ابن مردويه عن أنس رضی اللہ عنہ۔ أندر هو البيدر بلغة أهل الشام اسم جنس فهو مصروف و هو موضع يداس فيه الطعام" ہندی کھلیان فارسی خرمن۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کا رفع نہایت غریب ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو جنت کا حلہ پہنایا۔ پھر ایوب علیہ السلام علاحدہ ہوئے، پس ایک گوشے میں بیٹھے اور اُن کی بی بی آئیں تو اُن کو نہ پہچانا۔ پھر کہا: اے اللہ کے بندے یہ مبتلا کہاں گیا، جو یہاں تھا؟ شاید اس کو کتے لے گئے یا بھیڑیے، پھر گھڑی بھر اُن سے باتیں کرنے لگیں، وہ بولے: تیری خرابی ہو۔ میں ہی ایوب ہوں، وہ بولیں: اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے مذاق کرتا ہے، انھوں نے کہا: تیری خرابی ہو، میں ایوب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میرا جسم مجھ پر پھیر دیا۔ (وبه قال ابن عباس) اور اُن کا مال و اولاد عیاناً اُن پر پھیر دیا اور ویسے ہی اُن کے ساتھ اور عطا کیے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میں نے تیرے اہل و مال کو تجھ پر پھیر دیا اور ویسے ہی اُن کے ساتھ اور، پس تو اس پانی سے نہا لے، اس لیے کہ اس میں تیری شفا ہے اور تیرے ہمراہیوں کی طرف سے قربانی کر اور اُن کے واسطے مغفرت مانگ، کیوں کہ انھوں نے میری نافرمانی کی ہے تیرے حق میں۔ (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو عافیت دی تو اُن پر سونے کی ٹڈیاں برسائیں تو وہ اس میں سے اپنے ہاتھ سے لینے لگے اور اس کو اپنے کپڑے میں رکھنے لگے، فرمایا: پس اُن سے کہا گیا: اے ایوب! کیا تو سیر نہیں ہوتا، وہ بولے: ﴿ وَمَنْ يَّشْبَعُ مِنْ رَحْمَتِكَ ﴾ یعنی کون تیری رحمت سے سیر ہوتا ہے۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے[2] اور آیندہ دوسری جگہ آئے گی۔

﴿ وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ ﴾ پہلے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے کہ اُن کے گھر والے بعینہٖ وہی ان پر پھیر دیے گئے، عوفی نے بھی اُن سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] بعض کا زعم یہ ہے کہ اُن کی بی بی کا نام رحمت تھا، اگر اس کو سیاقِ آیت سے لیا ہے تو اِبعادِ نُجعہ کیا۔ (نجعه بروزن "رُقعه" "طلب الكلأ في موضعه" یعنی گھاس کو طلب کرنا اس کی جگہ میں۔ محاورے میں اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ پاس کی شے کو چھوڑ کر دور جاتا ہے تو بولتے ہیں: "أبعد النجعة") اور اگر اہلِ کتاب کی نقل سے لیا ہے اور یہ بات اُن سے صحیح ہوئی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦١) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٦_ ٥٠٧)

ہے تو پھر اس قسم سے ہے کہ اس کی نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب۔

امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تاریخ میں اُن کی بی بی کا نام بتایا ہے۔ کہا ہے کہ کہتے ہیں کہ ان کا نام لیّا بنت منشا بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہے۔ کہا اور کہتے ہیں کہ لیّا بنت یعقوب علیہ السلام زوجہ ایوب علیہ السلام زمین شنیہ میں اُن کے ہمراہ تھیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ایوب علیہ السلام سے کہا گیا کہ تمھارے گھر والے تمھارے لیے ہیں جنت میں، پھر اگر تم چاہو تو ہم اُن کو تمھیں دے دیں اور اگر تم چاہو تو ہم اُن کو تمھارے واسطے جنت میں چھوڑ رکھیں اور ان جیسے تمھارے واسطے یہاں پیش کر دیں۔ ایوب علیہ السلام نے عرض کیا: نہیں، بلکہ ان کو جنت میں چھوڑ رکھ، اس پر وہ اُن کے لیے جنت میں چھوڑ رکھے گئے اور اُن کے مثل دنیا میں عوض دیے گئے۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے یہ حدیث مطرف سے بیان کی تو مطرف نے کہا: ”ما عرفت وجهها قبل اليوم“ یعنی میں نے آج سے پہلے اس کی وجہ نہیں جانی تھی۔ اسی طرح امام قتادہ، سدی اور بہت سے سلف سے مروی ہے۔ ﴿رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا﴾ یعنی ہم نے یہ ایوب علیہ السلام کے ساتھ کیا، اُن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے واسطے۔ ﴿وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ﴾ یعنی اور ٹھہرایا ہم نے ایوب علیہ السلام کو اس بارے میں پیشوا، تاکہ اہلِ بلا اس بات کا گمان نہ کریں کہ ہم نے جو کچھ اُن کے ساتھ کیا، وہ ہمارے نزدیک اُن کی ذلت اور خواری کے سبب سے ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ایوب علیہ السلام کی اقتدا کریں۔ اللہ تعالیٰ کے مقدورات پر صبر کرنے میں اور اس کی آزمایش پر جو بندوں پر آتی ہے، جس شے کے ساتھ وہ چاہتا ہے، اس میں اس کی حکمتِ بالغہ ہے۔[2] كذا في ابن كثير.

﴿وَاَيُّوْبَ﴾ معطوف ہے ما قبل پر اور عامل اس میں وہی ہے، جو ما قبل میں ہے، مذکور یا مقدر جس طرح کہ گزر چکا ہے، یعنی ہم نے ایوب علیہ السلام کو اسی طرح حکم اور علم دیا۔ یا تم ایوب علیہ السلام کا ذکر کرو، یعنی اُن کی خبر اور قصے کا۔ ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ﴾ میں وہی عامل ہے جو ایوب میں ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: بدل ہے ایوب سے۔[3] ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ بفتح ہمزہ، اول میں حرفِ جر مقدر ہے۔ ”أَيْ بِأَنِّيْ“ کسی نے ہمزہ زیر کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ قول مقدر کیا ہے۔ یا اس لیے کہ ندا متضمن معنی قول کو ہے۔ ”ضُرّ“ بالضم سختی و گزند و لاغری و بدحالی کو کہتے ہیں۔ كذا في الصراح۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ”ضَرّ“ بالفتح ہر ضرر ہر شے میں شائع ہے اور بضم اس ضرر کے ساتھ خاص ہے جو نفس میں ہو، جیسے: بیماری و لاغری۔[4] ”مَسّ“ سودن (پیس کر رکھ دینا) کو کہتے ہیں، اس ضر میں اختلاف ہے کہ وہ کیا تھا؟ کسی نے کہا کہ وہ کھڑے ہوئے کہ نماز پڑھیں تو اُٹھنے پر قادر نہ ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے عجز کا اقرار کیا، لہٰذا یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ چالیس دن اُن سے وحی

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٦) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥١_ ٢٥٣)

[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤) تفسير النسفي (٣/ ٨٨)

منقطع ہوگئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک کیڑا اُن کے بدن سے گر پڑا تو انھوں نے اس کو لے کر اسی کی جگہ میں رکھ دیا۔ پس اس نے اُن سے کھایا، اس پر ﴿ مَسَّنِيَ الضُّرُّ ﴾ چلا اُٹھے۔

(تفسیر فتح القدیر و فتح البیان میں "فَأَكَلَ مِنْهُ" ہے، [1] لیکن ﴿ مَسَّنِيَ الضُّرُّ ﴾ کہنے کی یہ وجہ خوب چسپاں نہیں ہوتی۔) کسی نے کہا ہے کہ کیڑوں نے اُن کے بدن کو کھا لیا تو اس پر وہ صبر کرتے رہے، یہاں تک کہ ایک کیڑے نے اُن کے دل کو تناول کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کا ضرر یہ تھا کہ ابلیس نے اُن کی بی بی سے کہا کہ تو مجھے سجدہ کر لے، پس وہ اس کے ایمان جانے پر ڈرے۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کی قوم نے اُن سے گھن کی۔ کسی نے کہا ہے کہ "ضُر" سے مراد شماتت ہے، ان کے سوا اور قول بھی ہیں۔

امام ابن عساکر، دیلمی اور ابن نجار رحمہ اللہ نے سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام سے فرمایا: تو جانتا ہے تیرا کیا جرم ہے مجھ پر، یہاں تک کہ میں نے تجھ کو مبتلا کیا؟ کہا: نہیں یا رب! فرمایا: اس لیے کہ تو فرعون پر داخل ہوا تو تُو نے اس کے نزدیک دو کلموں میں مداہنت کی۔[2] امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: فرمایا کہ ایوب علیہ السلام کا گناہ یہی تھا کہ ایک مسکین نے کسی ظالم پر اُن سے مدد چاہی تھی کہ اس کو دفع کریں، انھوں نے اس کی مدد نہ کی، نہ امر بہ معروف کیا، نہ اس ظالم کو مسکین کے ظلم سے منع کیا، اس پر اللہ پاک نے ان کو مبتلا فرمایا۔[3] اس کی اسناد میں جویبر ہیں۔

غرضیکہ ایوب علیہ السلام نے جس وقت اپنے پروردگار کو تضرع و زاری کر کے پکارا تو اس کو انتہائی رحمت کے ساتھ موصوف کر کے یوں کہا: ﴿ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ اس کے بعد کہ اپنے نفس کا ذکر ایسی شے کے ساتھ کیا، جو کہ موجبِ رحمت ہے اور مطلب کی تصریح نہ کی۔ پس اس سوال میں انتہا درجے کا لطف و حسن ہے۔ گویا یوں کہا کہ تو اس کا اہل ہے کہ رحم کرے اور ایوب اس لائق ہے کہ رحم کیا جائے، لہٰذا تو اس پر رحم فرما اور اس سے ضرر کو دور کر دے۔ اللہ پاک کا ضار ہونا اس کے نافع ہونے کو منافی نہیں ہے، بلکہ وہ ضار و نافع ہے۔ پس اس کا ضرر دینا دفع مشقت کے لیے نہیں ہے اور اس کا نفع دینا جلبِ منفعت کے لیے نہیں ہے، بلکہ ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ ﴾ [الأنبياء: ٢٣] "وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا۔" کسی نے کہا ہے کہ ایوب علیہ السلام نے اللہ پاک کی مناجات سے لذت لینے کو اس کی طرف شکوہ کیا نہ اس لیے کہ بیماری سے ضرر پذیر ہو کر شکایت کی۔ اللہ پاک کی طرف شکوہ کرنا انتہائی قرب ہے، جس طرح کہ اس سے شکایت کرنا انتہائی دوری ہے۔

پھر اللہ پاک نے اُن کی دعا قبول کر لینے کی خبر دی کہ ﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ﴾ یعنی ہم اس کی ندا، یعنی دعا کو قبول

---

[1] فتح القدیر (٣/ ٢٧٣) فتح البیان (٨/ ٣٥٩) [2] تاریخ دمشق (١٠/ ٥٩۔ ٦٠)

[3] تاریخ دمشق (١٠/ ٦٠) اس کی سند میں "جویبر" سخت ضعیف راوی ہے۔

کرلیا۔ یا وہ ندا جس کی ضمن میں دعا تھی، اس کو ہم نے قبول کرلیا۔ ﴿ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ ﴾ یعنی جو بیماری اس کو لاحق تھی، اس سے اس کو شفا دی اور جو کچھ جاتا رہا تھا، اس کو پھیر دیا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ ﴾ کہا ہے کہ اللہ پاک نے اُن کے گھروں کو اُن کے واسطے چھوڑ رکھا اور اُن کے مثل دنیا میں دیے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔[1]

ان کے گھر والے سب مر گئے تھے سوائے ان کی بی بی کے۔ اللہ پاک نے پلک مارنے سے بھی کم زمانے میں ان کو زندہ کر دیا اور اُن کے ساتھ اُن کے مثل اور اُن کو دیے۔ ظاہر قرآن یہی ہے اور اسی کے اکثر مفسر قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ یوں ہوا کہ جتنے لوگ اُن کے مر گئے تھے، اُن سے دوگنے اور پیدا ہوئے۔ اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "أتَيْنَاهُ مِثْلَ أَهْلِهِ وَ مِثْلَهُم مَعَهُمْ" ﴿ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ﴾ منصوب ہے بنا بر علت، مفعول لہ ہے "اٰتینا" کا، یعنی "اٰتیناه ذلك لرحمتنا" اور ﴿ مِنْ عِنْدِنَا ﴾ صفت ہے۔ ﴿ وَذِكْرٰى ﴾ کے معنی "تذكرة" ہیں، یعنی وعظ و نصیحت۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ رَحْمَةً ﴾ مفعول مطلق ہو فعل مقدر کا، یعنی "رحمناه رحمة" قولِ اول ظاہر تر ہے۔ خاص عابدوں کا ذکر اس لیے کیا کہ نفع پذیر وہی ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہاں قصے کو ﴿ مِنْ عِنْدِنَا ﴾ پر ختم کیا اور سورت ص میں ﴿ مِنَّا ﴾ پر ختم فرمایا، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام نے اس جگہ تضرع و زاری میں مبالغہ کیا، یوں کہا: ﴿ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے بھی دعا قبول کرنے میں مبالغہ کیا، پس یہاں ﴿ مِنْ عِنْدِنَا ﴾ مناسب واقع ہوا، اس لیے کہ ﴿ عِنْدِنَا ﴾ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ پاک خود اس کا متولی ہوا ہے اور سورت ص میں مبالغہ نہیں ہے۔ اس لیے وہاں ﴿ مِنَّا ﴾ مناسب ہوا، کیوں کہ ﴿ مِنَّا ﴾ اس بات پر دال نہیں ہے، جس پر ﴿ عِنْدِنَا ﴾ دال ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام زکریا سے اس کو نقل کیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: رحمت واسطے ایوب علیہ السلام کے اور تذکرہ واسطے غیر ایوب کے عابدوں سے، تاکہ وہ صبر کریں، جیسا ایوب علیہ السلام نے صبر کیا تو اُن کو ثواب ملے، جیسا ایوب علیہ السلام کو ثواب ملا۔[2] امام نسفی اور محلی رحمہما اللہ نے صرف یہی قول لیا ہے۔[3]

شیخ زادہ نے کہا: اس قول کی بنا پر رحمت و ذکریٰ عابدین میں متنازع نہ ہوں گے، بلکہ متعلق رحمت کا محذوف ہے، یعنی ایوب علیہ السلام، اس لیے کہ وہ معلوم ہیں، کیوں کہ کلام انھیں میں ہے۔ دوسرا قول امام بیضاوی رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ واسطے رحمت کرنے ہمارے کے عابدوں کو اور واسطے اس بات کے کہ ہم عابدوں کو احسان کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اُن کو بھولتے نہیں ہیں۔[4] شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اس قول کی بنیاد پر رحمت و ذکریٰ میں سے ہر ایک عابدین کی طرف متوجہ ہوگا بطورِ تنازع کے۔ یہ بات کہ رحمت کو ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص نہ کریں اور اس کو عام عابدوں کی طرف متوجہ

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٢٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤)

[3] تفسير النسفي (٣/ ٨٩) تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤)

ٹھہرائیں، کیوں کہ ایوب علیہ السلام تو اُن میں بہ دخولِ اولیٰ داخل ہیں، زیادہ تر واقع کے موافق ہے اور زیادہ تر مناسب ہے واسطے مقام کے، اس سے کہ رحمت کو ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص کریں اور ﴿ ذِكْرٰى ﴾ کو غیر ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص ٹھہرائیں، ذکر پہلے قول کی بنا پر تذکرہ، یعنی وعظ ونصیحت اور دوسرے قول کی بنا پر بہ معنی ذکر ہے، یعنی نسیان کی ضد۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ایوب علیہ السلام کا نسب یوں بیان کیا کہ رومی تھے، اسحٰق علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایوب علیہ السلام روم کے ایک شخص تھے۔ ایوب بن اموص بن تارخ بن روم بن عیص بن اسحٰق علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام کی والدہ لوط بن ہاران (ابراہیم علیہ السلام کے بھائی) کی اولاد سے تھیں۔[2] امام سیوطی رحمہ اللہ نے تحبیر میں ذکر کیا ہے کہ ایوب علیہ السلام تریسٹھ برس زندہ رہے اور بلا کی مدت سات برس تھی اور اُن کے فرزند ذوالکفل، نام ان کا بشر تھا، اللہ پاک نے اُن کے والد ایوب علیہ السلام کے بعد اُن کو مبعوث کیا اور اُن کا نام ذوالکفل رکھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کا حکم فرمایا، شام میں مقیم تھے، یہاں تک کہ وفات پائی، اُن کی عمر پچھتر برس کی تھی۔ ان کی بی بی کا نام ماخر بنت میشا بن یوسف تھا، یا رحمت بنت افرائیم بن یوسف۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] ابتلا کی مدت میں اختلاف ہے۔ لہٰذا امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تین برس یا سات برس یا اٹھارہ برس۔[4] امام کرخی رحمہ اللہ نے اسی کو صحیح کہا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی تین قول ذکر کیے ہیں، مگر بجائے سات برس کے تیرہ برس کہے ہیں۔[5] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی تین قول نقل کیے ہیں، مگر یوں کہا ہے: سات برس سات مہینے سات گھڑی۔[6]

فتح البیان اور فتح القدیر میں بھی تین قول نقل کیے ہیں، مگر سات برس میں یوں کہا ہے کہ سات برس سات مہینے سات دن سات راتیں۔ دوسرا قول تیس برس کا لکھا ہے۔[7] چار چیزوں میں ابتلا ہوا: مال جاتا رہا، اولاد مر گئی، بدن پھٹ گیا، سوائے بی بی کے سب لوگوں نے چھوڑ دیا۔ اولاد: محلی نے ذکر کیا ہے کہ بیٹا بیٹی اُن کے تین یا سات تھے۔[8] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ سات بیٹے سات بیٹیاں تھیں۔ مال: علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تین ہزار اونٹ، تین ہزار بکریاں، پانچ سو فدّان، یعنی ہل، اُن کے پیچھے پانچ سو غلام چلتے تھے۔ ہر غلام کی بی بی اور اولاد اور کھجور کے درخت۔[9] امام خازن رحمہ اللہ نے یوں کہا کہ اُن کے پاس کئی قسم کا مال تھا: اونٹ، گائے، بکری، گھوڑے، گدھے۔[10] ابتلاء کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔ رہی کیفیت ابتلا کی، لہٰذا وہ بھی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ سے گزر چکی ہے۔[11] امام خازن رحمہ اللہ نے ایک طول وطویل قصہ وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے،[12] جمل نے اس کو ملخص کر کے لکھا

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٩) [2] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٨) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤) [4] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨)
[5] تفسير النسفي (٣/ ٨٩) [6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٤) [7] فتح القدير (٣/ ٥٧٣) فتح البيان (٨/ ٣٦٢)
[8] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٨) [9] تفسير النسفي (٣/ ٨٩) [10] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٨)
[11] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [12] تفسير الخازن (٤/ ٣٠٧۔ ٣١٣)

ہے، اس میں چونکہ وجہ ابتلا کی ایک نئی وجہ ہے اور ابتلا کی کیفیت بھی ہے، اس لیے یہاں لکھا جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام کے پاس قسم قسم کا مال تھا، اللہ پاک نے اُن کو برگزیدہ فرمایا، دنیا میں فراخی دی، اُن کی نبوت زمین بلقاے اعمال خوارزم مع شام کی ساری زمین کے تھی۔ اُن کے ہمراہ وہ تین آدمی بھی تھے، جو اُن پر ایمان لائے تھے، یہ تینوں آدمی نصف عمر کے تھے۔ اول زمانے میں ابلیس کو آسمانوں میں کسی شے سے حجاب نہ تھا تو اُن میں جہاں چاہتا ٹھہرتا تھا، پس اس نے سنا کہ فرشتے ایوب علیہ السلام پر درود بھیجتے ہیں، اس پر اس کو حسد آیا، کہا: الٰہی! میں نے تیرے بندہ ایوب میں نظر کی تو اس کو تیرا حامد وشا کر پایا۔ اگر تو اس کو مبتلا کرے تو وہ تیرے شکر و طاعت سے پھر جائے گا، اللہ پاک نے اس سے کہا: تو جا میں نے تجھ کو اس کے مال پر مسلط کر دیا، ابلیس چلا اور شیاطین و جن کے سرکش لوگوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ میں نے تم کو ایوب کے مال پر مسلط کیا اور اُن میں کے ایک عفریت سے کہا کہ اونٹ اور اُن کے چرواہے کہاں ہیں؟ تو چلا جا اُن کو جلا ڈال۔ پھر ابلیس ایوب علیہ السلام کے پاس آیا، اُن کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ پھر اُن سے کہا: تیرے اونٹوں کو اور چرواہوں کو آگ نے جلا ڈالا۔ ایوب علیہ السلام نے کہا: الحمد للہ! اسی نے مجھ کو دیے تھے اور وہی اُن کا لینے والا ہے۔ پھر اسی طرح بکریوں اور اُن کے چرواہوں کے ساتھ کیا۔ پھر ایوب علیہ السلام کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ تیری کھیتی کو ہوا اُڑا لے گئی، اس پر انھوں نے اللہ کی حمد وثنا کی۔ پھر ابلیس نے کہا: تو مجھ کو اس کی اولاد پر مسلط کر، اللہ پاک نے اس سے کہا: تو جا میں نے تجھ کو اس کی اولاد پر مسلط کیا تو وہ اُن کی اولاد کی طرف گیا، محل کو مع ان کے ہلا دیا اور اس کو اُن پر اُلٹا دیا، وہ سب کے سب مر گئے۔ پھر ایوب علیہ السلام کے پاس آیا، اُن کو اولاد کے مرنے کی خبر دی۔ انھوں نے استغفار کی۔ پھر کہا: تو مجھے اس کے جسم پر مسلط کر دے۔ اللہ پاک نے فرمایا: میں نے تجھ کو اس کے جسم پر مسلط کیا، سوائے دل و زبان و عقل کے۔ صرف ایوب علیہ السلام پر رحمت کرنے کے واسطے ان چیزوں پر اس کو تسلط نہ دیا، تاکہ اُن کو بڑا اجر دے اور صابرین کے لیے عبرت اور عابدین کے واسطے نصیحت ہو، تاکہ صبر اور ثواب کی اُمید رکھنے میں اُن کی پیروی کریں۔

پھر وہ ایوب علیہ السلام کے پاس آیا تو اُن کو سجدہ کرتے ہوئے پایا، پھر اُن کے چہرے کی طرف آیا تو اُن کے دونوں نتھنوں میں ایک پھونک ماری، جس سے ان کا سارا بدن مشتعل ہو گیا اور اس میں خارش پڑ گئی۔ انھوں نے ناخوں سے کھجایا، یہاں تک کہ سارے ناخن گر گئے، پھر موٹے ٹاٹ سے کھجایا، پھر ٹھیکریوں سے، پھر پتھروں سے، پھر وہ کھجاتے رہے، یہاں تک کہ ان کا جسم پاش پاش ہو گیا اور بدبودار ہو گیا، اس پر گاؤں والوں نے اُن کو نکالا، ان کا ایک گھوڑا تھا، اس پر اُن کو رکھا اور ایک چھپر اُن کے واسطے بنا دیا۔ سارے لوگوں نے اُن کو چھوڑ دیا سوائے ایک بی بی کے، وہ اُن کی خدمت کرتی تھی، کھانا پینا لاتی تھی۔ تین آدمی جو اُن پر ایمان لائے تھے، انھوں نے بھی اُن کو چھوڑ دیا

اور اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ جمل میں اسی قدر ہے۔ غرضیکہ جب ایوب علیہ السلام کی آزمایش کو طول ہوا تو وہی تین آدمی اُن کے پاس آئے، ان کو ڈانٹا، دھمکایا، ملامت کی اور کہا: جس گناہ کے سبب سے تجھے تکلیف پہنچی ہے، اس سے اللہ کی طرف تائب ہو۔ انھیں کے ساتھ ایک جوان آدمی نوعمر بھی تھا، وہ بھی ایوب علیہ السلام پر ایمان لایا تھا، اُن کی تصدیق کی تھی، اس نے ان تین آدمیوں سے کہا: اے ادھیڑ لوگو! تم نے گفتگو کی اور تم مجھ سے زیادہ بات کرنے کے مستحق ہو اپنی عمر کی وجہ سے، لیکن تم نے جو بات کہی اس سے بہتر کو ترک کیا اور زیادہ اچھی رائے کو چھوڑ دیا اور بہترین امر کو ترک کیا۔ ایوب علیہ السلام کا تم پر حق ہے اور امام اس سے برتر ہے، جو تم نے بیان کیا۔ اے لوگو! کیا تم جانتے ہو حق اس شخص کا، جس کو تم نے کم کیا اور اس کی حرمت کو جس کی تم نے ہتک کی اور وہ کون شخص ہے، جس کا تم نے عیب بیان کیا۔ اور اس کو تہمت لگائی، کیا تم نہیں جانتے ہو کہ ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی، اس کے برگزیدہ اور منتخب ہیں اہلِ زمین سے آج کے دن تک۔ پھر تم کو علم بھی نہیں نہ اللہ نے تم کو اطلاع دی ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ اُن کی کسی بات پر ناخوش ہوا ہے، جب سے کہ اللہ نے ان کو دیا ہے جو کچھ کہ دیا ہے آج کے دن تک، نہ اس پر تم کو مطلع کیا ہے، جو کرامت اس نے تم کو دی تھی، اس میں سے کچھ اُن سے چھین لی ہے نہ ایوب علیہ السلام نے اللہ پر غیر حق کہا ہے اس دراز مدت میں، جس میں تم اُن کے ساتھ رہے آج کے دن تک۔ پھر جس بلا نے تمھارے نزدیک ان کو حقیر و ذلیل کر دیا ہے تو تم جان چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ مومنین، صدیقین، شہدا اور صالحین کو آزماتا ہے اور اس کا اُن لوگوں کو آزمانا اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ وہ اللہ ان پر خفا ہے اور وہ اس کے نزدیک ذلیل ہیں، لیکن یہ ان کے واسطے عزت اور بہتری ہے۔ یہ تقریر بھی بہت طویل ہے۔

غرضیکہ پھر شیطان عاجز ہو کر اُن کی بی بی کے پاس آیا، اُن کو بہکایا، ایوب علیہ السلام بی بی سے خفا ہو گئے اُن کو بھگا دیا، وہ چلی گئیں۔ ایوب علیہ السلام نے دیکھا تو نہ کھانا ہے نہ پینا نہ دوست تو سجدے میں گرے اور کہا: ”رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ“ اس پر ان سے کہا گیا کہ تو اپنا سر اُٹھا، میں نے تیری دعا قبول کر لی، اپنا پاؤں مار، انھوں نے پاؤں مارا تو پانی کا ایک چشمہ بہہ نکلا۔ اس سے غسل کیا تو ظاہر کا میل کچیل اور بیماری کچھ باقی نہ رہی، سب دور ہو گئی، جوانی اور خوبصورتی پہلے سے بھی اچھی لوٹ کر آئی۔ پھر پاؤں مارا تو دوسرا چشمہ بہہ نکلا، اس سے پانی پیا تو پیٹ کے اندر جو بیماری تھی، وہ جاتی رہی، صحیح تندرست اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک حلہ پہنا دیے گئے، اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تو جس حال پر تھے اس میں سے کچھ دکھائی نہ دیا اور جو اہل اور مال اُن کا تھا اللہ نے اس کا دوگنا اُن کے واسطے کر دیا۔

ذکر کیا ہے کہ جس پانی سے انھوں نے غسل کیا تھا، اس میں سے ایک ٹڈی سونے کی، اُن کے سینے پر اڑی تو اس کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو وحی کی: اے ایوب! کیا میں نے تجھ کو غنی نہیں کر دیا؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، لیکن وہ برکت ہے، لہٰذا کون تیری برکت سے سیر ہوتا ہے۔ پھر وہ نکلے یہاں تک کہ ایک بلند جگہ

پر بیٹھے۔ پھر اُن کی بی بی نے اپنے جی میں کہا کہ تو ہی بتا گو اس نے مجھ کو بھگا دیا ہے، میں اس کو کس کے سپرد کروں، اس کو چھوڑ رکھوں کہ بھوک کے مارے مر جائے، ضائع ہو جائے تو درندے اس کو پھاڑ کھائیں، میں تو ضرور اس کے پاس پھر جاؤں گی، وہ لوٹ کر اُن کے پاس آئیں تو نہ گھورا دیکھا نہ وہ حالت جس کو وہ جانتی پہچانتی تھیں اور سارے کام بدل گئے تو جہاں گھورا تھا، وہاں پھرتی تھیں اور روتی تھیں اور یہ سب ایوب علیہ السلام کے رو برو ہو رہا تھا، اُن کی بی بی حُلّے والے سے ڈریں، اس کے پاس نہ آسکیں تو اس سے ایوب علیہ السلام کا پوچھا، ایوب علیہ السلام نے اُن کو بلایا اور کہا: اے اللہ کی لونڈی! تو کیا چاہتی ہے؟ وہ رو پڑیں اور کہا: میں اس مبتلا کو چاہتی ہوں، جو گھورے (کوڑے کے ڈھیر) پر پڑا ہوا تھا، میں نہیں جانتی کہ آیا وہ ضائع ہو گیا یا اس کے ساتھ کیا کیا گیا؟ ایوب علیہ السلام نے کہا ہے کہ وہ تیرا کون تھا؟ روئیں اور کہا: وہ میرا خاوند تھا۔ ایوب علیہ السلام نے کہا: کیا جب تو اسے دیکھے گی تو پہچان لے گی؟ بولیں: کیا مخفی رہ سکتا ہے اس پر جس نے اس کو دیکھا ہے۔ پھر وہ دیکھنے لگیں، ڈرتی جاتی تھیں۔ پھر کہا: سنتا ہے بے شک وہ اللہ کی خلق میں سے تیرے ساتھ بہت ملتا جلتا تھا، جبکہ وہ صحیح اور تندرست تھا۔ ایوب علیہ السلام نے کہا: میں وہی ایوب ہوں، جس سے تو نے کہا تھا کہ ابلیس کے واسطے بکری کا بچہ ذبح کر اور میں نے اللہ کی اطاعت کی اور شیطان کی نافرمانی کی تو اس نے مجھ کو لوٹا دیا، جو تو دیکھ رہی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور اکثر مفسرین رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ اللہ پاک نے اُن کے اہل و اولاد بعینہٖ واپس دے دیے، اُن کو زندہ کر دیا اور اُن کے ساتھ اُن کے مثل اور دیے۔[1] ظاہر قرآن شریف یہی ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، اس لیے کہ اپنی اجل پوری ہونے سے پہلے مر گئے تھے۔ چنانچہ اس کی تقریر پہلے سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے، یہ ایک تاویل دو تاویلوں سے ہے، جو اس باب میں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کے مثل اللہ نے عطا فرمائے۔ مروی ہے کہ اللہ پاک نے اُن کی بی بی کی جوانی پھیر دی تو اس کے بعد چھبیس بیٹے جنے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو شے اُن سے جاتی رہی تھی، اس کے بدلے میں دُگنی ملی۔[2] ظاہر قرآن اول قول ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا اور یہ قول مشابہ تر ہے آیت کے اور جواب اس کا جو ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اللہ پاک کا زندہ کرنا، اس کو جو مر گیا، اسی کے حق میں ہے، جس کو سزا کے طور پر مارا ہے۔[3] امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ ایوب علیہ السلام کے دو کھلیان تھے: ایک گیہوں کا، دوسرا جو کا، پس اللہ پاک نے دو ابر بھیجے، پس ایک نے گیہوں کے کھلیان میں سونا ڈالا اور دوسرے نے جو کے کھلیان میں چاندی ڈالی، یہاں تک کہ دونوں خوب بھر گئے، چونکہ سونے کے رنگ کو گیہوں کے ساتھ مناسبت ہے، اس لیے وہاں سونا برسا اور جو کی چاندی کے ساتھ مناسبت ہے اس واسطے وہاں چاندی برسی۔

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٦) [3] تفسير القرطبي (١١/ ٣٢٦)

یہ بھی مروی ہے کہ اللہ پاک نے ایوب علیہ السلام کی طرف ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے ایوب علیہ السلام سے کہا: تمھارا رب تم کو سلام کہتا ہے، بہ سبب تمھارے صبر کے، لہٰذا تم اپنے کھلیان کی طرف نکلو، وہ نکلے تو اللہ پاک نے اُن پر سونے کی ٹڈیاں بھیجیں، پس ایک چلی گئی تو ایوب علیہ السلام اس کے پیچھے گئے اور اس کو اپنے کھلیان کی طرف پھیر لائے اس پر فرشتے نے اُن سے کہا کہ جو تمھارے کھلیان میں ہیں، وہ تمھیں کافی نہیں ہیں؟ ایوب علیہ السلام بولے: یہ میرے رب کی برکات میں سے ایک برکت ہے اور میں اس کی برکت سے سیر نہیں ہوتا ہوں۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایوب علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایوب علیہ السلام برہنہ غسل کر رہے تھے کہ ان پر سونے کی ٹڈیاں گریں، ایوب علیہ السلام اُن کو اپنے کپڑے میں لپ بھرنے لگے، اس پر اُن کے رب نے اُن کو پکارا: اے ایوب! کیا میں نے تجھ کو غنی نہیں کیا اس چیز سے جس کو تو دیکھتا ہے؟ بولے: ہاں یا رب! لیکن مجھے تیری برکت سے غنا نہیں ہے۔[2] غرضیکہ ایوب علیہ السلام کے قصے میں بہت روایتیں ہیں، اس بارے میں قولِ فیصل وہی ہے، جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ پھر اللہ پاک نے ساتواں قصہ اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے بیان کیا۔ چونکہ یہاں ایوب علیہ السلام کے صبر کا ذکر کیا اور اُن تینوں نبیوں نے بھی مشکلات اور سختیوں اور عبادت پر صبر کیا ہے، اس لیے ان کے قصے کے بعد اُن کا ذکر فرمایا:

وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝۸۵ۚۖ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۸۶

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو (یاد کریں) یہ سب صابر تھے (85) اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ صالحین میں سے تھے (86)

اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل کا ذکر:

کہتے ہیں ذالکفل علیہ السلام ایوب علیہ السلام کے بیٹے تھے، ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید رہے اور اللہ یہ محنت سہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسماعیل علیہ السلام سے مراد ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ہیں۔ ان کا ذکر سورت مریم میں گزر چکا ہے،[3] اسی طرح ادریس علیہ السلام کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ رہے ذوالکفل، لہٰذا ظاہر سیاق یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے ساتھ اسی کا ذکر ہوتا ہے جو نبی ہوتا ہے اور لوگوں نے یوں کہا ہے کہ ذوالکفل صرف ایک نیک مرد تھے اور بادشاہ عادل و حاکم انصاف پرور تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اُن کے حق میں توقف کیا ہے۔[4] فاللّٰه أعلم۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ

---

1. تفسیر الخازن (٤/ ٣١٦)
2. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٧٥)
3. رقم الآیة (٥٤۔ ٥٦)
4. تفسیر الطبري (١٨/ ٥٠٧)

نے امام مجاہد رحمہ اللہ نے ذوالکفل کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ایک مرد صالح تھے، نبی نہ تھے۔ اپنی قوم کے نبی کے واسطے اس بات کے ضامن ہوئے تھے کہ اُن کی طرف سے اُن کی قوم کی کفایت کریں گے۔ (اصل کے الفاظ یہ ہیں: "تكفل لنبي قومه أن يكفيه الله قومه ويقيمهم له و يقضي بينهم بالعدل"[1] شاید اللہ کے بجائے "له" ہو یا "لله" ہو۔ فتح القدیر و فتح البیان میں امام مجاہد رحمہ اللہ کے قول کے الفاظ یہ ہیں: "رجل صالح غير نبي تكفل لنبي قومه أن يكفيه أمر قومه ويقيمهم له ويقضي بينهم بالعدل") اور قوم کو اُن کے واسطے سیدھا کریں گے اور اُن کے درمیان عدل سے فیصلہ کریں گے، یہ کام انھوں نے کیا تو اُن کا نام ذوالکفل رکھا گیا۔[2]

امام ابو نجیح رحمہ اللہ نے بھی امام مجاہد رحمہ اللہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ مجاہد رحمہ اللہ سے راوی ہیں کہ جس وقت یسع علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تو انھوں نے کہا کہ اگر میں کسی شخص کو لوگوں پر خلیفہ کروں کہ وہ اُن پر میری زندگی میں عمل کرے، یہاں تک کہ میں دیکھ لوں کہ وہ کیسا عمل کرتا ہے، یعنی تو کیا اچھا ہو۔ پس انھوں نے لوگوں کو جمع کیا، پھر کہا: کون شخص مجھ سے تین باتوں کو قبول کرتا ہے کہ میں اس کو خلیفہ کروں۔ دن بھر روزہ رکھے، رات بھر کھڑا رہے، یعنی نماز پڑھے اور غصہ نہ کرے؟ کہا: پس ایک آدمی کھڑا ہوا، آنکھیں اس کو حقیر جانتی تھیں، پھر اس نے کہا: میں۔ یسع علیہ السلام نے فرمایا: تو دن بھر روزہ رکھے گا اور رات بھر کھڑا رہے گا اور غصہ نہ کرے گا؟ وہ بولا: ہاں۔ کہا: اس دن لوگوں کو واپس کر دیا اور دوسرے دن ویسی ہی بات کہی تو لوگ چپ رہے اور وہی شخص کھڑا ہوا، کہا: پس میں نے اس کو خلیفہ کیا۔ کہا: پس ابلیس شیطانوں سے کہنے لگا: "عليكم بفلان" یعنی تم فلاں شخص کو لو، اس کو بہکاؤ۔ "فأعياهم ذلك" یعنی شیاطین نے اس کو خوب بہکایا، وہ اُن کے داؤ میں نہ آیا، اس نے اُن کو تھکا دیا، عاجز کر دیا، تب ابلیس نے کہا: تم مجھے اور اس کو چھوڑ دو، یعنی میں خود اس کو بہکاؤں گا۔ تو ابلیس اس کے پاس ایک بڑے بوڑھے فقیر آدمی کی صورت میں آیا، جس وقت کہ وہ قیلولہ کے واسطے اپنے بچھونے پر لیٹا، وہ شخص رات دن میں کسی وقت سوتا نہ تھا، مگر اسی قدر سوتا تھا۔ ابلیس نے دروازہ ٹھونکا، اس نے کہا: یہ کون ہے؟ ابلیس بولا کہ ایک بوڑھا مظلوم ہے۔ راوی نے کہا: پھر وہ کھڑا ہوا، دروازہ کھولا، اس سے قصہ کہنے لگا۔ کہا کہ میرے اور میری قوم کے درمیان میں جھگڑا ہے اور انھوں نے مجھ پر ظلم کیا اور میرے ساتھ یہ کیا، وہ کیا اور طول طویل باتیں کرنے لگا، یہاں تک کہ رواح حاضر ہوا، یعنی زوال کے بعد کا وقت آ گیا اور قیلولہ کا وقت جاتا رہا تو اس شخص نے کہا: جس وقت میں جاؤں، یعنی محکمے میں تو تُو میرے پاس آنا، میں تیرا حق لوں گا۔ ابلیس چل دیا اور وہ شخص گیا، اپنی مجلس میں بیٹھا، پھر دیکھنے لگا کہ کہیں وہ بوڑھا آدمی نظر آئے، مگر وہ نظر نہ آیا تو کھڑا ہوا کہ اس کو تلاش کرے، پھر جب کل کا دن ہوا تو لوگوں کے درمیان میں فیصلہ کرنے لگا اور اس بوڑھے کا انتظار کرتا رہا تو اس کو نہ دیکھا، پھر جس وقت قیلولہ کرنے کو لوٹا، اپنے بچھونے پر لیٹا تو

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٩) [2] فتح القدير (٣/ ٥٧٨) فتح البيان (٨/ ٣٦٢)

وہی بوڑھا اس کے پاس آیا، دروازہ ٹھونکا تو کہا: یہ کون ہے کہا: بڑا بوڑھا مظلوم، اس کے لیے دروازہ کھولا۔ پھر کہا: کیا میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ جب میں مجلس میں فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھوں تو میرے پاس آنا، کہا: وہ لوگ خبیث ترین لوگ ہیں، جب وہ جان لیتے ہیں کہ تو بیٹھا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تجھے تیرا حق دیتے ہیں اور جب تم اُٹھ جاتے ہو تو مجھ سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ اس نے کہا: اب تو چلا جا، پھر جس وقت میں آؤں تو تو میرے پاس آنا۔ راوی نے کہا کہ پھر اس سے قیلولہ فوت ہو گیا، پھر وہ گیا، یعنی مجلسِ حکم میں اس کا انتظار کرنے لگا اور اس کو نہیں پایا اور اُونگھ اُس پر شاق ہوئی، اب اس نے اپنے گھر والوں میں سے کسی سے کہہ دیا کہ کسی کو مت چھوڑ کہ اس دروازے کے قریب آئے، یہاں تک کہ میں سو رہوں، کیوں کہ نیند مجھ پر شاق ہوئی ہے۔ پھر جب وہی گھڑی آئی تو وہی بوڑھا آیا تو اس شخص نے کہا: جس کو پہرے پر مقرر کیا تھا کہ پیچھے ہٹ، پیچھے ہٹ، بوڑھا بولا کہ میں تو کل آیا تھا اور میں نے اپنا قصہ اس سے کہا تھا۔ پہرے والے نے کہا: نہیں، واللہ! مقرر اس نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم کسی کو نہ چھوڑیں کہ اس کے قریب جائے، پھر جب پہرے والے نے اس کو عاجز کر دیا تو اس نے نظر کی تو گھر میں ایک سوراخ دیکھا، اس سے چڑھا، تب ہی گھر میں گھس گیا، ناگاہ اندر سے دروازہ ٹھونک رہا ہے۔ راوی نے کہا اور وہ شخص گھر والا جاگ اُٹھا تو اس نے پہرے والے سے کہا: اے فلاں! کیا میں نے تجھ کو حکم نہیں دیا تھا، یعنی اس بات کا کہ کوئی دروازہ نہ ٹھونکے۔ اس نے کہا: واللہ! میری طرف سے کوئی نہیں آیا تیرے پاس۔ پس تو ہی دیکھ کہ کہاں سے تیرے پاس کوئی آیا۔ راوی نے کہا: پھر وہ دروازے کی طرف کھڑا ہوا تو ناگاہ وہ بند تھا، جیسا اس کو بند کیا تھا اور ناگاہ وہی بوڑھا گھر میں اس کے پاس ہے، پس اس کو پہچان لیا تو کہا: کیا تو اللہ کا دشمن ہے؟ اس نے کہا: تو نے مجھ کو ہر شے میں عاجز کر دیا تو میں نے وہ کام کیا، جو تو دیکھ رہا ہے، تاکہ تجھے غصے میں لاؤں۔ اس پر اس کا نام ذوالکفل رکھا گیا، اس لیے کہ ایک کام کا ضامن ہوا تو اس کو پورا کیا۔[1] وهكذا رواه ابن أبي حاتم من حديث زهير ابن إسحق عن داود عن مجاهد بمثله.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک قاضی تھا، اس کو موت حاضر ہوئی تو اس نے کہا: کون میرا قائم مقام ہوتا ہے اس بات پر کہ غصہ نہ کرے؟ راوی نے کہا کہ ایک شخص نے کہا کہ میں ہوں۔ اس پر اس کا نام ذوالکفل رکھا گیا۔ راوی نے کہا: پھر وہ شخص ساری رات نماز پڑھتا رہتا، پھر صبح سے روزہ رکھتا، پھر لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا۔ راوی نے کہا: اس کے لیے ایک وقت تھا، جس میں وہ قیلولہ کیا کرتا تھا۔ راوی نے کہا: پھر وہ اسی طرح کیا کرتا تھا۔ پس اس کی نیند کے وقت شیطان اس کے پاس آیا تو اس سے اس کے اصحاب نے کہا: تجھے کیا ہوا ہے؟ وہ بولا کہ میں ایک مسکین آدمی ہوں، میرا ایک شخص پر حق ہے اور وہ اس

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٨ـ ٥٠٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦١ـ ٢٤٦٢)

حق پر مجھ سے غالب ہو گیا ہے۔ اس کے اصحاب نے کہا تو ٹھہرا رہ، یہاں تک کہ وہ بیدار ہو۔ راوی نے کہا کہ وہ شخص اوپر سو رہا تھا۔ راوی نے کہا کہ یہ مسکین قصداً چلانے لگا، تا کہ اس کو جگا دے۔ راوی نے کہا: اس نے سن لیا تو کہا: تجھے کیا ہوا ہے؟ کہا: ایک مسکین آدمی ہوں اور میرا ایک شخص پر حق ہے، اس نے کہا تو چلا جا اور اس سے کہہ وہ تجھے دے گا، اس نے کہا: اس نے تو انکار کر دیا ہے۔ کہا تو تُو اس کی طرف جا۔ راوی نے کہا: پس وہ چلا گیا، پھر کل آیا تو حاکم نے کہا تجھے کیا ہوا؟ کہا میں اس کے پاس گیا تھا تو اس نے تیری بات کی کوئی پروا نہ کی۔ حاکم نے کہا تو اس کے پاس جا، پھر اس سے کہہ وہ تجھے تیرا حق دے گا۔

راوی نے کہا: پھر وہ گیا، پھر کل آیا، جس وقت کہ حاکم نے قیلولہ کیا۔ راوی نے کہا: اس سے حاکم کے اصحاب نے کہا: تو نکل جا۔ "فعل الله بك" یعنی اللہ تیرا برا کرے تو روزانہ اس وقت آتا ہے، جب وہ سوتا ہے، تو اس کو سونے نہیں دیتا۔ راوی نے کہا: پھر وہ چلانے لگا، اس لیے کہ میں مسکین آدمی ہوں، کاش کہ میں غنی ہوتا۔ راوی نے کہا کہ حاکم نے اس بات کو بھی سن لیا تو کہا: تجھے کیا ہوا؟ کہا میں اس کے پاس گیا تھا، اس نے مجھے مارا، کہا تو چل یہاں تک کہ میں تیرے ہمراہ آتا ہوں۔ راوی نے کہا: "فهو ممسك بيده فلما رآه ذهب معه نثريده منه ففرّ"۔ وهكذا روي عن عبد الله بن الحارث و محمد بن قيس و أبي حجيرة الأكبر وغيرهم من السلف نحو هذه القصة والله أعلم. امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے تیسرے الفاظ کنانہ بن اخنس سے یہ ہیں: کنانہ نے کہا: میں نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سنا اور وہ اس منبر پر کہہ رہے تھے کہ ذوالکفل نبی نہ تھے، لیکن بنی اسرائیل میں سے ایک مرد صالح تھا، ہر روز سو نماز پڑھا کرتا تھا، اس لیے اس کا نام ذوالکفل رکھا گیا۔ (وقد رواه ابن جرير من حديث عبد الرزاق عن معمر عن قتادة قال: قال أبو موسىٰ الأشعري فذكره منقطعاً والله أعلم)[1]۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ایک غریب حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، کہا: میں نے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ اگر میں اس کو نہ سنتا، مگر ایک بار یا دو بار، یہاں تک کہ سات بار کا شمار کیا تو میں اس کو بیان نہ کرتا، لیکن میں نے اس کو اس سے زیادہ سنا ہے، کہا کہ کفل بنی اسرائیل سے تھا۔ "لا يتورع من ذنب عمله" یعنی کسی گناہ سے پرہیز نہیں کرتا تھا، پس اس کے پاس ایک عورت آئی تو اس کو اس لیے ساٹھ اشرفیاں دیں کہ اس سے صحبت کرے۔ پھر جس وقت اس عورت سے اس جگہ بیٹھا، جس جگہ مرد اپنی بی بی سے بیٹھتا ہے تو وہ عورت کانپ اٹھی اور روئی۔ کفل نے کہا: تجھ کو کونسی چیز رُلاتی ہے، کیا میں نے تجھ سے زبردستی کی؟ عورت بولی: نہیں، لیکن یہ ایک ایسا کام ہے کہ میں نے کبھی اس کو نہیں کیا، مجھے اس کام کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا مگر میری حاجت نے۔ کفل نے کہا: "فتفعلين هذا ولم تفعليه قط" یعنی پس تو کرتی ہے یہ، حالانکہ تو نے اس کو کبھی نہیں کیا ہے۔ پھر کفل اُتر

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٢۔ ٢٤٦٣) تفسير الطبري (١٨/ ٥٠١) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٥)

پڑا، کہا تو اِن اشرفیوں کو لے جا، یہ تیری ملکیت ہیں۔ پھر کہا: واللہ! کفل کبھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے گا۔ پھر وہ اسی رات مر گیا تو صبح کو اس کے دروازے پر لکھا ہوا پایا: «قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لِلْكِفْلِ»[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے کفل کو بخش دیا، اس روایت میں کفل اسی طرح واقع ہوا ہے بغیر اضافت کے۔ واللہ أعلم۔ اصحابِ کتبِ صحاح ستہ نے اس حدیث کی تخریج نہیں کی ہے اور اس کی اسناد غریب ہے اور ہر تقدیر پر لفظِ حدیث کا اگر کفل ہے اور ذوالکفل نہیں کہا ہے تو شاید یہ شخص کوئی اور ہو۔ واللہ أعلم۔[2] كذا في ابن كثير.

اسماعیل علیہ السلام ایک سو تیس برس زندہ رہے، جس وقت اُن کے والد ماجد خلیل جلیل علیہ السلام کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر نواسی برس کی تھی اور اُن کے بھائی اسحاق علیہ السلام اُن سے چودہ برس بعد پیدا ہوئے اور ایک سو اسی برس زندہ رہے۔ ادریس بن شیث بن آدم علیہ السلام نام ان کا اخنوخ ہے۔ نوح علیہ السلام کے دادا ہیں۔ آدم علیہ السلام کی وفات سے سو برس پہلے اُن کی حیات میں پیدا ہوئے اور اُن کی وفات سے، دو سو برس بعد مبعوث ہوئے اور نبوت کے بعد ایک سو پچاس سال زندہ رہے، کل عمر اُن کی چار سو پچاس برس کی ہوئی، ان کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا فاصلہ ہے۔ تحبیر میں اسی طرح ہے۔ رہے ذوالکفل، تو اُن کی نبوت میں اختلاف ہے۔ ایوب علیہ السلام کے ذکر میں تحبیر علامہ سیوطی علیہ السلام سے گزر چکا ہے کہ اُن کا نام بشر ہے، ایوب علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کے والد کے بعد اُن کو مبعوث کیا، پس معلوم ہوا کہ امام سیوطی علیہ السلام کے نزدیک ان کا نبی ہونا اور ایوب علیہ السلام کا فرزند ہونا صحیح ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو فائدے میں لکھا ہے۔ علامہ محلی رحمہ اللہ کے کلام سے بھی اُن کی نبوت معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ انھوں نے صابرین کی تفسیر یوں کی ہے کہ "على طاعة الله و عن معاصيه"، یعنی اللہ کی طاعت پر جمنے والے اور اس کے معاصی سے باز رہنے والے اور رحمت کی تفسیر نبوت کی ہے اور صالحین کے بعد "لَهَا" متعلق نکالا ہے، یعنی وہ سب لائق و سزاوار نبوت کے تھے۔[3] قصہ لوط علیہ السلام میں رحمت کی تفسیر نبوت نہیں کی، اس لیے کہ اس قصے میں نبوت کا دینا، پہلے کے بیان سے معلوم ہوتا تھا۔ بخلاف یہاں کے اور قول عدمِ نبوت کو بلفظِ "قیل" ادا کیا۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ذوالکفل میں تین قول لکھے ہیں کہ وہ الیاس علیہ السلام ہیں، یا زکریا علیہ السلام، یا یوشع بن نون علیہ السلام۔ ان کا نام ذوالکفل اس لیے رکھا کہ وہ صاحبِ حظ، یعنی حصے اور نصیب والے تھے اللہ کی طرف سے۔ کفل کے معنی حظ ہیں۔ "صابرین" کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ لوگ سب کے سب موصوف بہ صبر تھے۔ رحمت میں دو قول لکھے ہیں کہ مراد نبوت ہے، یا نعمت ہے آخرت میں۔ ﴿مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ کی یہ تفسیر کی ہے: "ممن لا يشوب صلاحهم

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٩٦) مسند أحمد (٢/ ٢٣) اس کی سند میں "سعد مولیٰ طلحہ" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٠٨٣)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٤۔ ٢٥٥)

[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٩)

كدر الفساد"[1] یعنی وہ ایسے صالح ہیں کہ ان کے صلاح میں فساد کی کدورت نہیں ملتی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی صلاح کامل ہے۔ قاضی صاحب نے بھی یہی تین قول لکھے ہیں۔ وجہ تسمیہ ذوالکفل میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ یا صاحبِ تکفل تھے اللہ کی طرف سے، یا اُن کے واسطے اُن کے زمانے میں انبیا کے عمل و ثواب کا دوگنا تھا۔ کفل بہ معنی نصیب و کفالت وضعف آتا ہے۔

صابرین میں کہا ہے کہ مشاقِ تکالیف اور شدایدنوائب، یعنی حوادث پر صابر تھے۔ رحمت میں وہی دوقول مذکور لکھے ہیں۔ صالحین کی تفسیر میں کہا ہے: "كاملين في الصلاح" اور وہ انبیا ہیں، کیونکہ ان کی صلاح فساد کی کدر سے معصوم، یعنی محفوظ ہے۔[2] شیخ زادہ نے قاضی صاحب کے قول کی شرح میں کہا ہے کہ ذوالکفل اُن کا نام اس لیے رکھا کہ وہ صاحبِ کفالت تھے، کون سی کفالت جو کہ اللہ پاک سے متصل ہے اس جہت سے کہ جس شے کے وہ ضامن ہوئے، وہ اس قسم سے ہے جس کے ساتھ اللہ پاک کی ذات بابرکات طلب کی جاتی ہے، جیسا کہ کہا ہے کہ ذوالکفل ایک ایسے آدمی تھے کہ سونبیوں کے ضامن ہوئے تھے، یعنی اُن کو اپنی ذات سے ملا لیا تھا، یہاں تک کہ ان کو قتل سے بچایا۔ کسی نے کہا کہ ایک شخص تھے، اس بات کے ضامن ہوئے تھے کہ رات کو نماز پڑھیں، سست نہ ہوں دن کو روزہ رکھیں، افطار نہ کریں اور لوگوں میں فیصلہ کریں اور خفا نہ ہوں۔ انھوں نے اس کفالت کو پورا کیا۔ اس پر اللہ پاک نے اُن کی قدر دانی کی اور نبی کر دیا۔ کسی نے کہا کہ وہ زکریا ہیں، ذوالکفل اُن کو اس لیے کہا کہ مریم علیہا السلام کی پرورش کے کفیل ہوئے تھے۔ بالجملہ اگر کفل بہ معنی کفالت ہے تو ذوالکفل سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صاحبِ تکفل تھا اور اگر بہ معنی نصیب ہے، یا بہ معنی ضِعف تو اس سے مراد وہ شخص ہے، جو اللہ کے فضل و ثواب سے صاحبِ نصیب و بہرہ مند ہے۔ یا وہ شخص ہے جس کے واسطے اس کے زمانے کے انبیا علیہم السلام کے عمل و ثواب کا دوگنا ہے۔ غرضیکہ اُن سب تفاسیر سے ذوالکفل کا نبی ہونا قوی تر معلوم ہوتا ہے۔ فتح القدیر میں ذوالکفل کے بارے میں وہی تین قول ذکر کیے ہیں، اس کے بعد کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ذوالکفل بنی اسرائیل میں سے ایک شخص تھا، کسی گناہ سے پرہیز نہیں کرتا تھا، پھر اس نے توبہ کی تو اللہ پاک نے اس کو بخش دیا، پھر وہ قول ذکر کیا ہے کہ یسع علیہ السلام نے ایک شخص کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، پھر یہ قول ذکر کیا کہ ذوالکفل ایک شخص تھا، ہر آدمی کے کام کا متکفل ہوا کرتا تھا، جس وقت وہ مہمات میں سے کسی مہم میں واقع ہوتا۔ پھر یہ کہا ہے کہ اُن کے سوا اور قول ہیں جمہور اس طرف گئے ہیں کہ وہ نبی نہیں ہیں اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ وہ نبی تھے۔ پھر اللہ پاک نے اُن لوگوں کو موصوف بہ صبر فرمایا۔

﴿ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ یعنی ان میں سے ہر ایک جن کا ذکر ہوا اُن میں سے تھے، جو کہ قیام کرتے ہیں اس شے کے ساتھ جس کا اللہ پاک نے اُن کو مکلّف کیا ہے اور رحمت سے مراد جنت ہے۔ (انموذج میں کہا ہے کہ جنت

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٨٩) [2] تفسير الجلالين (٤/ ١٠٤۔ ١٠٥)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور نبوت مقاتل کا قول ہے) یا نبوت یا خیر علی العموم۔[2] پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اور سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے۔ اول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ سے، دوسرے کو امام عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث لکھی ہے، گو اس کا ذکر ہو چکا ہے، مگر بعض الفاظ میں فرق ہے، اس لیے اس کے الفاظ لکھ دینا فائدے سے خالی نہیں ہے۔

امام ابن ابی شیبہ، احمد اور ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی تحسین کی ہے اور امام ابن منذر، ابن حبان، طبرانی، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں بطریق سعد مولی طلحہ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «كَانَ الْكِفْلُ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا يَتَوَرَّعُ مِنْ ذَنْبٍ عَمِلَهُ فَأَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَأَعْطَاهَا سِتِّينَ دِينَارًا عَلَى أَنْ يَطَأَهَا فَلَمَّا قَعَدَ مِنْهَا مَقْعَدَ الرَّجُلِ مِنِ امْرَأَتِهِ ارْتَعَدَتْ وَبَكَتْ فَقَالَ: مَا يُبْكِيكِ أَكْرَهْتُكِ؟ قَالَتْ: لَا وَلٰكِنَّهُ عَمَلٌ مَا عَمِلْتُهُ قَطُّ وَمَا حَمَلَنِي عَلَيْهِ إِلَّا الْحَاجَةُ، فَقَالَ: تَفْعَلِينَ أَنْتِ هٰذَا وَمَا فَعَلْتُهُ اِذْهَبِي فَهِيَ لَكِ وَقَالَ: وَاللّٰهِ لَا أَعْصِي اللّٰهَ بَعْدَهَا أَبَدًا فَمَاتَ مِنْ لَيْلَتِهِ فَأَصْبَحَ مَكْتُوبٌ عَلَى بَابِهِ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لِلْكِفْلِ»[2] (و أخرجه الترمذي وحسنه و الحاكم و ابن مردويه من طريق سعد مولى طلحة و أخرجه ابن مردويه من طريق نافع عن ابن عمر و قال: فيه ذوالكفل)۔

غرض کہ فتح القدیر میں ذوالکفل کے نبی نہ ہونے کو جو صحیح کہا ہے، اس کی بنا اسی حدیث پر ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو غریب کہا ہے[3] اور اُن کے نزدیک نبی ہونا ظاہر ہے، چنانچہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ فتح البیان میں اقوالِ مذکورہ کے نقل کرنے کے بعد ذوالکفل کے نبی ہونے کو "ولعله هو الصحيح" کہا ہے۔[4] سلیمان جمل نے نبی ہونے کو صحیح کہا ہے۔ پھر شرح دلائل الخیرات سے نقل کیا ہے کہ سوائے الیاس علیہ السلام و زکریا علیہ السلام کے ذوالکفل ایک اور نبی تھے۔ مروی ہے کہ وہ ایک ہی شخص کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اس کے بعد امام کرخی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور امام مجاہد رحمہ اللہ عدم نبوت کے قائل ہیں[5] اور صحیح یہ ہے کہ وہ نبی تھے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں[6] اور اسی پر جمہور ہیں۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے ذوالکفل کے ذکر کو اسماعیل اور ادریس علیہما السلام کے ذکر کے ساتھ شامل کیا ہے اور اللہ کے بندوں میں سے جو فضلا ہیں مقصود اُن کا ذکر کرنا ہے، پس یہ بات اُن کی نبوت پر دلیل ہے اور اس واسطے کہ اس سورت کا نام سورت انبیا ہے اور اس لیے کہ اللہ پاک نے جو ذوالکفل فرمایا، اس میں دو احتمال ہیں: لقب ہو یا اسم، اولیٰ یہ ہے کہ اسم ہو، کیوں کہ اسم کا فائدہ لقب سے بہت زیادہ ہے اور جب یہ بات ثابت ہو چکی تو کفل سے مراد نصیب ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿يَكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾

[1] فتح القدير (٣/ ٥٧٤) [2] فتح القدير (٣/ ٥٧٨) نیز مرفوع حدیث کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٥) [4] فتح البيان (٨/ ٣٦٣) [5] تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٩۔ ٥١٠) [6] تفسير القرطبي (١١/ ٣٢٨)

[النساء: ٨٥] ''اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا۔'' اور ظاہر یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو اُن کا نام ذوالکفل رکھا، لہٰذا اُن کی تعظیم کے لیے پس ضروری ہوا کہ کفل سے مراد کفل کا ثواب ہو، لہٰذا اُن کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ان کا عمل و ثواب اُن کے علاوہ دوسرے کے عمل و ثواب سے دوگنا تھا، حالاں کہ اُن کے وقت میں کئی نبی تھے، چنانچہ یہ بات مروی ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ وَاَدْخَلْنٰهُمْ ﴾ کا عطف مقدر پر ہے: "أي فأعطيناهم ثواب الصابرين و أدخلنهم"، یعنی تم یاد کرو اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل کو اُن میں سے ہر ایک صابرین میں سے تھا، پس ہم نے ان کو صابرین کا ثواب دیا اور داخل کیا ہم نے اُن کو اپنی رحمت میں، بے شک وہ تھے نیک لوگوں میں سے۔ پھر اللہ پاک نے آٹھواں قصہ یونس علیہ السلام کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی خاطر بیان کیا۔ پس فرمایا:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾

اور (یاد کریں) مچھلی والے (یونس) کو، جب وہ (اپنی قوم سے) ناراض ہو کر چلا گیا تھا اور اس نے سمجھا تھا کہ ہم اس پر ہرگز تنگی نہیں کریں گے، پھر اس نے (ہمیں) اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بلاشبہہ میں ہی ظالموں میں سے ہوں (87) چناں چہ ہم نے اس کی دعا قبول کی، اور ہم نے اسے غم سے نجات دی، اور ہم اسی طرح مومنوں کو نجات دیتے ہیں (88)

یونس علیہ السلام کا تذکرہ:

حزقیل کے یاروں میں سے تھے۔ یونس علیہ السلام عبادت کے بڑے شوقین تھے اور دنیا سے الگ حکم ہوا کہ اُن کو شہر نینوا میں بھیجو، مشرکوں کو بت پوجنے سے منع کریں۔ یہ خفا ہو گئے راستے میں ایک ندی آئی، ایک بیٹا کنارے پر چھوڑا، ایک کندھے پر لیا، عورت کا ہاتھ پکڑا، ندی میں جب پانی نے زور کیا، عورت کا ہاتھ چھوٹ گیا، اس کے تھامنے سے کندھے سے لڑکا پھسل پڑا، گھبراہٹ میں دو خون ہو گئے، کنارے پر آئے، دوسرے لڑکے کے پاس، اس کو بھیڑیا لے گیا، جب اس شہر میں پہنچے، سرداروں سے ملے۔ اللہ کا پیغام دیا، وہ ٹھٹھہ کرنے لگے، ایک مدت وہاں رہے، آخر خفا ہو کر عذاب کی بددعا کی اور آپ تین دن کا وعدہ کر کے نکل گئے، تیسرے دن عذاب آیا شہر کے سب لوگ جنگل میں نکلے اللہ کے آگے توبہ کی، روئے، تمام بت توڑ ڈالے، عذاب ٹل گیا۔ شیطان نے یونس علیہ السلام کو خبر دی کہ وہ قوم اچھی بھلی ہے، اس پر عذاب نہیں آیا، یہ دل میں خفا ہوئے کہ اللہ نے مجھ کو جھوٹا کیا۔ حکم کا انتظار نہ کیا، کسی طرف چل

کھڑے ہوئے، ایک کشتی پر سوار ہوئے، وہ بھنور میں چکر کھانے لگی۔ لوگوں نے کہا کہ کشتی میں کسی کا بھاگا ہوا غلام ہے۔ اللہ کے نام سے قرعہ ڈالا تو اُن کا نام آیا، دریا میں اُن کو ڈال دیا، ایک مچھلی نگل گئی، اس اندھیرے میں رب کو پکارا، تب توبہ قبول ہوئی، مچھلی نے کنارے پر اُگل دیا۔ وہاں ایک بیل نے چھا کر اُن پر چھاؤں کی اور ہرنی نے دودھ پلایا، جب قوت پائی تو اسی قوم میں دوبارہ جانے کا حکم ہوا، وہ آرزومند تھے، آپ کی راہ تکتے تھے، اُن کی عورت اور لڑکے بھی مل گئے، بھیڑیے سے لوگوں نے چھڑا لیا تھا اور ڈوبتوں کو نکال لیا تھا۔ اسی شہر میں اُن کی قبر ہے اور یہ جو فرمایا: سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے، یعنی مہربانی کے معاملے میں اس کو راضی نہ کر سکیں گے، وہ ایسا خفا ہوا ہے اور حکومت کے معاملے میں ہر چیز آسان ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ جو یہاں اور سورت صافات اور سورت نون میں مذکور ہے،[1] وہ یہ ہے کہ یونس بن متی کو اللہ پاک نے قریہ نینویٰ کی طرف نبی بنا کر بھیجا، یہ موصل کی سرزمین کا ایک گاؤں ہے۔ یونس علیہ السلام نے وہاں کے لوگوں کو اللہ پاک کی طرف بلایا، انھوں نے انکار کیا اور اپنے کفر اور سرکشی پر جمے رہے تو یونس علیہ السلام اُن سے خفا ہو کر اُن کے درمیان سے نکل گئے اور اُن سے تین رات کے بعد عذاب کے آنے کا وعدہ کر گئے، پھر جب وہاں کے لوگوں نے اس بات کا یقین کیا اور جان لیا کہ نبی جھوٹ نہیں بولتا ہے تو وہ اپنے بچوں کو اور سواری کے جانوروں کو اور مویشیوں کو لے کر جنگل کی طرف نکلے اور ماؤں اور ان کے بچوں کو علاحدہ علاحدہ کر دیا، اللہ عزوجل سے تضرع و زاری کی، گڑگڑائے، عاجزی اور زاری سے دعا کی، اونٹ اور اُن کے بچے بلبلائے، گائے بیل اور اُن کے بچے چلائے، بکریاں اور اُن کے بچے مَیں مَیں کرنے لگے، اس پر اللہ پاک نے اُن سے عذاب اُٹھا لیا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [یونس: ۹۸] ”پھر کیوں نہ ہوئی کوئی بستی ایسی کہ وہ (عذاب سے پہلے) ایمان لائی ہو، پھر اس کے ایمان نے اسے نفع دیا ہو، سوائے قوم یونس کے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے دنیاوی زندگی میں ذلت کا عذاب ٹال دیا، اور ہم نے ایک (مقرر) وقت تک انھیں (اس سے) فائدہ (اُٹھانے) دیا۔“

اُدھر تو یہ ہوا، اِدھر یونس علیہ السلام چلے تو کچھ لوگوں کے ہمراہ کشتی میں سوار ہوئے، پس کشتی لوگوں کے ساتھ بھنور میں ڈال دی گئی، ڈرے کہ ڈوب جائیں گے تو ایک شخص پر قرعہ ڈالا کہ اس کو اپنے درمیان میں سے ڈال دیں اور اس کو ڈال کر سبکی حاصل کریں، پس قرعہ یونس علیہ السلام پر پڑا تو اُن کو ڈالنے سے انکار کیا، پھر دوبارہ قرعہ ڈالا تو انھیں پر پڑا، اب بھی انکار کیا، پھر تیسری بار قرعہ ڈالا تو بھی انھیں پر پڑا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ

[1] سورت صٓ: رقم الآیة (۱۳۹) سورة القلم، رقم الآیة (۴۸)

الْمُدْحَضِيْنَ ﴾ [الصافات: ۱٤١] ''پھر (کشتی والوں نے) قرعہ ڈالا تو وہ ہارنے والوں میں سے ہوگیا۔'' یعنی قرعہ یونس علیہ السلام پر پڑا، اب تو وہ کھڑے ہو گئے اور کپڑوں سے برہنہ ہوئے، پھر اپنی جان کو دریا میں ڈال دیا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے کہ اللہ پاک نے بحرِ اخضر سے ایک مچھلی کو بھیجا کہ دریاؤں کو چیرتی پھاڑتی چلی آ رہی ہے، یہاں تک کہ آ گئی تو جس وقت یونس علیہ السلام نے کشتی سے چھلانگ لگائی، اسی وقت وہ مچھلی اُن کو نگل گئی۔ پھر اللہ پاک نے اس مچھلی کی طرف وحی کی کہ ان کا گوشت نہ کھائے نہ ہڈی توڑے، کیوں کہ یونس تیرا رزق نہیں ہے، تیرا پیٹ اس کے لیے قید خانہ ہے۔ نون سے مراد مچھلی ہے، بایں نسبت اس کی طرف اضافت صحیح ہوگئی، یعنی یونس علیہ السلام کی اضافت مچھلی کی طرف بہ علاقۂ حال و محل ہے۔[1]

﴿ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا ﴾ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ''لِقَوْمِهٖ''[2] ﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾ أي نضيق عليه في بطن الحوت'' یعنی جب غصے سے لڑ کر چلا گیا، یعنی اپنی قوم سے، پھر گمان کیا کہ ہم ہرگز اس پر تنگی نہ کریں گے مچھلی کے پیٹ میں۔ اسی کے مثل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم سے مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴾ [الطلاق: ۷] ''اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اسے اللہ نے دیا۔ اللہ کسی شخص پر اتنی ہی ذمے داری ڈالتا ہے جتنا اس نے اسے دیا۔ اللہ تنگی کے بعد جلد آسانی فرما دے گا۔'' کو اس کا شاہد ٹھہرایا ہے۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: ''أَنْ نَقْضِيَ عَلَيْهِ''[3] گویا ''نَقْدِرَ'' کو بہ معنی تقدیر قرار دیا ہے، کیونکہ عرب ''قَدَرَ و قَدَّرَ'' کو ایک ہی معنی میں بولتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

فلا عائد ذاك الزمان الذي مضیٰ تبارکت ما تقدر یکن ذلك الأمر

یعنی جو زمانہ گزر گیا وہ پھر آنے والا نہیں ہے۔ الٰہی! تو بابرکت ہے جو تو مقرر کرتا ہے قضا کرتا ہے وہی کام ہو جاتا ہے۔

اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴾ [القمر: ۱۲] ''تو (آسمان اور زمین کا) پانی ایک امر پر مل گیا، جو بلاشبہ مقدر ہو چکا تھا۔''

﴿ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، رات کا اندھیرا۔[4] اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عمرو بن میمون، سعید

---

(1) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٥۔ ٢٥٦) (2) تفسير الطبري (١٨/ ٥١١)
(3) تفسير الطبري (١٨/ ٥١٤۔ ٥١٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٣) (4) مستدرك الحاكم (٢/ ٤١٥)

بن جبیر، محمد بن کعب، ضحاک، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ سالم بن ابی الجعد نے کہا: ”ظلمة حوت في بطن حوت آخر في ظلمة البحر“ یعنی تین اندھیرے یوں ہوئے: ایک مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، پھر وہ مچھلی دوسری مچھلی کے پیٹ میں، پھر وہ مچھلی دریا کے اندھیرے میں۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا: قصہ یوں ہوا کہ وہ مچھلی یونس علیہ السلام کو لے کر دریاؤں میں چلی، ان کو پھاڑتی جاتی تھی، یہاں تک کہ ان کو دریا کی تہہ تک لے پہنچی، یونس علیہ السلام نے دریا کی تہہ میں کنکریوں کی تسبیح سنی، پس اس وقت اور اس جگہ یہ کہا ﴿ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾[2] عوف اعرابی نے کہا ہے کہ جس وقت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں ہو چکے تو سمجھے کہ مر چکے، پھر اپنے دونوں پاؤں کو ہلایا۔ جب وہ ہلے تو اسی جگہ سجدہ کیا، پھر ندا کی: یا رب! میں نے تیرے واسطے ایسی جگہ مسجد بنائی کہ لوگوں میں سے کوئی اس جگہ کو نہ پہنچا۔[3] سعید بن ابی الحسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چالیس دن رہے، ان دونوں اقوال کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[4]

عبداللہ بن رافع مولیٰ ام سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب اللہ نے یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں قید کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کی طرف وحی کی کہ تو اس کو لے لے۔ ”ولا تخدش له لحما ولا تكسر له عظما“ یعنی اس کے کسی گوشت کو زخمی نہ کرنا، نوچ کھسوٹ مت، نہ اس کی کسی ہڈی کو توڑ پھوڑ۔ پھر جب مچھلی ان کو بحر کی تہہ تک لے کر پہنچی تو انھوں نے ایک آہٹ سنی تو اپنے جی سے کہا: یہ کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف مچھلی کے پیٹ میں وحی کی کہ یہ دریا کے جانوروں کی تسبیح ہے۔ فرمایا اور یونس نے تسبیح کی اور وہ مچھلی کے پیٹ میں تھے، پس ان کی تسبیح کو فرشتوں نے سنا تو کہا: اے ہمارے رب! ہم ایک اجنبی زمین میں ضعیف آواز سنتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ میرا بندہ یونس ہے، اس نے میری نافرمانی کی ہے، لہٰذا میں نے اس کو دریا میں مچھلی کے پیٹ میں قید کیا ہے۔ فرشتے بولے: وہ بندۂ صالح، جس کی طرف سے عملِ صالح ہر دن رات تیری طرف چڑھا کرتا تھا؟ اللہ پاک نے فرمایا: ہاں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت فرشتوں نے یونس علیہ السلام کے لیے سفارش کی تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا تو مچھلی نے یونس علیہ السلام کو کنارے پر ڈال دیا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴾ [الصافات: ۱۴۵] ”جب کہ وہ بیمار تھا۔“[5] قاله محمد بن إسحاق بن يسار عمن حدثه عن عبد الله بن رافع. (رواه ابن جرير و رواه البزار في مسنده من طريق محمد بن إسحاق بنحوه ثم قال: لا نعلمه يروي عن النبي ﷺ إلا من هذا الوجه بهذا الإسناد)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یزید رقاشی سے روایت کیا ہے، یزید کو جس شخص نے حدیث بیان کی، اس نے کہا

---

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۱٦۔ ۵۱۷) [2] تفسير ابن كثير (۳/ ۲۵٦) [3] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۱۸) [4] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۱۵)

[5] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۱۸) مسند البزار (۱۵/ ۳۴) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سنا اور میں نہیں جانتا ہوں، مگر یہ کہ اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں، وہ حدیث یہ ہے کہ یونس نبی علیہ السلام کو جب یہ بات ظاہر ہوئی کہ ان کلموں کے ساتھ دعا کریں اور مچھلی کے پیٹ میں تھے تو کہا: "اللهم لا إله إلا أنت، سبحنك إني كنت من الظلمين، فأقبلت هذه الدعوة تحن بالعرش" یعنی پس یہ دعا آئی عرش سے حنین کرتی ہوئی، یعنی عرش کے پاس آواز کرنے لگی، تو فرشتوں نے کہا: "یا رب! صوت ضعيف معروف من بلاد غريبة" تفسیر خازن میں کہا ہے: "وفي رواية صوت معروف من مكان مجهول"[1] یعنی ایک باریک آواز معروف ہے بلادِ غریب سے۔ اللہ پاک نے فرمایا: کیا تم اس کو نہیں پہچانتے ہو؟ فرشتے بولے: وہ کون ہے؟ فرمایا: میرا بندہ یونس ہے۔ عرض کیا: وہ تیرا بندہ یونس، جس کے لیے عملِ متقبل اور دعائے مستجاب ہمیشہ چڑھا کرتی تھی؟ عرض کیا: اے رب! کیا تو رحم نہیں کرتا ہے اس شے پر جس کو وہ رخا، یعنی راحت میں کیا کرتا تھا تو تُو اس کو بلا سے نجات دے؟ فرمایا: ہاں، پھر مچھلی کو حکم دیا تو اس نے اُن کو میدان میں پھینک دیا۔[2]

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ﴾ یعنی پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور مچھلی کے پیٹ سے اور اُن اندھیریوں سے اُس کو نکالا۔ ﴿ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں کہ جس وقت وہ سختیوں میں ہوں اور ہماری طرف رجوع ہو کر ہم کو پکاریں، خصوصاً جبکہ حالتِ بلا میں اس دعا کے ساتھ پکاریں، کیوں کہ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے ساتھ دعا کرنے میں ترغیب آئی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میرا گزر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر ہوا مسجد میں تو اُن کو میں نے سلام کیا، انھوں نے مجھے دیکھا، پھر سلام کا جواب نہ دیا، کہا: پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف آدمی بھیجا، اُن کو بلایا۔ پھر کہا: تجھ کو کس بات نے اس سے منع کیا ہے، اس سے کہ اپنے مسلمان بھائی کو سلام کا جواب دے؟ وہ بولے: میں نے نہیں کیا۔ سعد نے کہا کہ میں نے کہا: تم نے کیا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے قسم کھائی اور میں نے قسم کھائی، کہا: پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے یاد کیا تو کہا: ہاں اور میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں، بے شک تو ابھی مجھ پر گزرا اور میں اپنے جی سے ایک بات کو بیان کر رہا تھا، جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ قسم ہے اللہ کی! نہیں یاد کیا میں نے اس کو مگر میری آنکھ اور دل پر ایک پردہ پڑ جاتا ہے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تم کو اس کی خبر دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ذکر کیا کہ اول دعا۔ پھر ایک اعرابی آ گیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشغول کر دیا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے تو میں آپ کے پیچھے ہولیا، پھر جب میں ڈرا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کی طرف مجھ سے سبقت کر جائیں گے تو میں نے اپنے پاؤں سے زمین کو مارا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف التفات فرمایا اور کہا: یہ کون ہے؟ کیا ابو اسحٰق ہے؟ کہا: میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: پھر کیا ہے؟ میں نے

[1] تفسير الخازن (٤/ ٣١٩۔ ٣٢٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٤) اس کی سند میں "یزید رقاشی" ضعیف راوی ہے۔

عرض کی کہ آپ ﷺ نے ہم سے ذکر کیا کہ اول دعا۔ پھر یہ اعرابی آ گیا اور اس نے آپ کو مشغول کر دیا، فرمایا: ہاں، دعا ذوالنون کی، جس وقت وہ مچھلی کے پیٹ میں تھا: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ پس بے شک نہیں پکارا اس دعا کے ساتھ کسی مسلمان نے اپنے رب کو کسی شے میں کبھی، مگر اس کے واسطے دعا قبول کی۔ [1]

(ورواه الترمذي و النسائي في اليوم والليلة من حديث إبراهيم بن محمد بن سعد عن أبيه سعد به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس شخص نے یونس علیہ السلام کی دعا کے ساتھ دعا کی تو اس کے لیے قبول کی گئی۔ [2] (قال أبو سعيد يعني استاد ابن أبي حاتم يريد به كذلك ننجي المومنين) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا میں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے وہ اللہ کا نام کہ جس وقت اس کے ساتھ دعا کی جائے تو قبول کرے اور جب اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو دے، وہ یونس بن متیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ خاص واسطے یونس علیہ السلام کے ہے یا جماعتِ مومنین کے لیے عام ہے، جب وہ اس کے ساتھ دعا کریں؟ فرمایا کیا تو نے اللہ عز وجل کا قول نہیں سنا: ﴿ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ ... ﴾ لہٰذا وہ شرط ہے اللہ کی طرف سے اس شخص کے لیے، جو اس کے ساتھ دعا کرے۔ [3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کثیر بن معبد سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے حسن سے پوچھا کہ اے ابوسعید! اسم اللہ الاعظم کیا ہے، جس وقت اس کے ساتھ دعا کی جائے تو قبول کرے اور جب اس کے ساتھ مانگا جائے تو دے۔ کہا: اے بھتیجے تو قرآن نہیں پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿87﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ بھتیجے! یہ وہ اسم اللہ الاعظم ہے کہ جب اس کے ساتھ پکارا جائے تو قبول کرے اور جب اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو عطا کرے۔ [4] انتہیٰ.

مختار میں کہا ہے نُون حُوت ہے، یعنی مچھلی جمع اس کی "أَنْوَان و نِينَان" ہے اور ذوالنون یونس بن متیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ [5] دوسری جگہ کہا ہے کہ حوت سمکہ کو کہتے ہیں، اس کی جمع "حیتان" ہے اور حوت متقید بکبیر (بڑی ہونے کے ساتھ خاص) نہیں ہے بخلاف اس شخص کے، جو اس کو متقید بکبیر کہتا ہے، یعنی چھوٹی بڑی مچھلی کو حوت کہتے ہیں۔ [6]

---

(1) مسند أحمد (١/ ١٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٠٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٦٨) صحيح الجامع (٣٣٨٣)

(2) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٨)

(3) تفسير الطبري (١٨/ ٥١٩) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

(4) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٥) (5) مختار الصحاح (١/ ٦٨٨) (6) مختار الصحاح (١/ ١٦٧)

کسی نے کہا ہے کہ حوت بڑی کو بولتے ہیں۔ ایک جگہ قرآن شریف میں یونس علیہ السلام کو صاحب الحوت فرمایا ہے۔ ان کے والد ماجد کا اسم شریف متیٰ بروزن شتّیٰ ہے۔ قاموس میں یہی ذکر کیا ہے کہ متیٰ اُن کے والد کا نام ہے۔ امام ابن اثیر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ متیٰ ان کی والدہ شریفہ کا نام ہے۔ سوائے یونس اور عیسیٰ علیہما السلام کے، نبیوں میں سے اور کوئی ماں کی طرف منسوب نہیں ہوا۔ شہاب خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ صحیح کی بنا پر متیٰ اُن کے والد کا نام ہے۔[1] زکریا نے کہا: متیٰ ایک نیک آدمی تھے، ان کا انتقال ہوا تو یونس علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ میں چار ماہ کے تھے۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ یونس علیہ السلام کا نام ذوالنون اس لیے ہوا کہ مچھلی نے اُن کو نگل لیا تھا۔ کسی نے کہا کہ اس لیے ذوالنون نام ہوا کہ انھوں نے ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا تو فرمایا: "وسموا نونته" یعنی اس کے نونہ کو کالا کر دو، تا کہ اسے نظر نہ لگے۔ نونہ ایک ثقبہ ہے کہ چھوٹے بچے کی ٹھوڑی میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام میں پانچ نبی ایسے ہیں، جن کے دو دو نام ہیں۔ اسرائیل و یعقوب، الیاس و ذوالکفل، عیسیٰ و مسیح، یونس و ذوالنون اور محمد و احمد۔ علیهم الصلوت و التسلیم۔

ناصب ذوالنون کا "اذکر" محذوف ہے "اذ" بدلِ اشتمال ہے "ذوالنون" سے، ﴿مُغٰضِبًا﴾ حال ہے ضمیر "ذھب" سے۔ مغاضبہ بہ معنی مراغمہ ہے۔ مراغمہ باہم خشم کرنے کو کہتے ہیں۔ اللہ پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ تم یاد کرو مچھلی والے کو، یعنی اُن کے جانے کے وقت کو جب وہ لڑ کر غصے سے چلے۔ اس میں اختلاف ہے کہ انھوں نے کس پر غصہ کیا۔ لہٰذا ایک قول یہ ہے کہ اپنی قوم سے خفا ہوئے، جبکہ ایک زمانۂ دراز تک اُن کو دعوت دیتے رہے اور اُن کو سمجھایا اور انھوں نے نہ مانا اور کفر پر جمے رہے تو ملول ہو کر اُن سے ہجرت کر گئے، اس سے پہلے کہ اُن کو ہجرت کا حکم ہو اور اس بات کا گمان کیا کہ یہ بات جائز ہے، اس لیے کہ اس کام کو نہیں کیا ہے، مگر خاص اللہ پاک کی خاطر غصہ کر کے اور اس کے دین کی حمایت کرنے کے واسطے اور کفر اور اہلِ کفر سے بغض کر کے، حالانکہ اُن پر یہ امر لازم تھا کہ صابر رہتے اور اللہ پاک کے اذن کا انتظار کرتے ان سے ہجرت کرنے کے بارے میں۔ اس واسطے شکمِ ماہی کے ساتھ مبتلا ہوئے۔ اُن کے خروج و غضب کی یہ وجہ اس شخص کے قول پر مبنی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ یونس علیہ السلام اپنی رسالت کو ادا کرنے سے مشغول (بے پروا) ہونے کے بعد مچھلی کے پیٹ میں واقع ہوئے۔ ان کے خروج اور غضب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کو اس بات کی خبر دی کہ ایک مقرر وقت پر اللہ پاک اُن پر عذاب نازل کرے گا تو اُن سے علاحدہ ہو گئے، پھر مقررہ مدت گزر جانے کے بعد اُن کو یہ خبر پہنچی کہ اللہ پاک نے اُن کو عذاب نہ کیا اور اُن کو معلوم نہ ہوا کہ کس سبب سے اُن کو عذاب نہ کیا تو اس بات سے ڈرے کہ کذب، یعنی جھوٹ کی طرف اُن کی نسبت کی جائے اور اس کی عار دلائے جائیں، اس پر کہا کہ میں جھوٹا ہو کر اپنی قوم کی طرف نہ لوٹوں گا، پس اُن کی طرف واپس جانے کے سبب سے غضبناک ہو کر چل دیے۔

[1] حاشية الشهاب (٦/ ٢٦٨)

یہ وجہ اس پر مبنی ہے کہ رسالت کو ادا کرنے سے مشغول ہونے سے پہلے مچھلی کے پیٹ میں واقع ہوئے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یونس علیہ السلام اور اُن کی قوم فلسطین میں بستے تھے، کسی بادشاہ نے اس قوم پر چڑھائی کی اور اُن میں سے ساڑھے نو اسباط (قبیلوں) کو قید کر لیا اور اڑھائی اسباط باقی رہ گئے تو اللہ پاک نے نبی شعیب علیہ السلام کو وحی کی کہ تم حزقیل بادشاہ کے پاس جاؤ، اس سے کہو کہ تو ایک قوی امین نبی کو روانہ کر، تاکہ وہ اُن لوگوں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ بنی اسرائیل کو بھیجیں تو بادشاہ نے شعیب علیہ السلام سے کہا کہ تمھاری رائے میں کس کو بھیجیں، اس کی مملکت میں پانچ نبی تھے تو شعیب علیہ السلام نے کہا کہ یونس بن متیٰ علیہ السلام کو، کیوں کہ وہ قوی امین ہے۔ پھر بادشاہ نے یونس بن متیٰ علیہ السلام کو بلایا اور اُن کو حکم دیا کہ جائیں تو یونس علیہ السلام بولے کہ کیا اللہ نے تجھ کو میرے روانہ کرنے کا حکم دیا ہے؟ بادشاہ نے کہا: نہیں، یونس علیہ السلام نے کہا: پھر کیا اس نے تیرے واسطے میرا نام لیا ہے؟ کہا: نہیں تو یونس علیہ السلام نے کہا کہ یہاں میرے سوا اور نبی ہیں۔ پھر یونس علیہ السلام سے الحاح و اصرار کیا تو بادشاہ اور اپنی قوم پر خفا ہو کر نکلے۔ پس دریائے روم پر آئے تو دیکھا کہ ایک قوم نے کشتی تیار کی ہے، ان کے ہمراہ سوار ہو گئے، پھر جس وقت کشتی بھنور میں پڑ گئی تو اُن کو لے کر جھک پڑی، قریب تھا کہ غرق ہو جائیں۔ ملاحوں نے کہا: یہاں کوئی گناہ گار آدمی ہے یا کوئی بھاگا ہوا غلام ہے، کیوں کہ کشتی ایسا نہیں کرتی، مگر اسی وقت جب اس میں کوئی گناہ گار ہو۔ ہماری رسم ہے کہ جس وقت ہم اس بلا میں مبتلا ہوتے ہیں تو قرعہ ڈالتے ہیں، پھر جس پر قرعہ پڑ جاتا ہے اس کو دریا میں ڈال دیتے ہیں، ایک کا ڈوب جانا کشتی کے ڈوبنے سے بہتر ہے۔ پھر انھوں نے تین بار قرعہ ڈالا تو تینوں بار میں یونس علیہ السلام ہی پر پڑا۔ یونس علیہ السلام بولے: میں ہوں مرد گناہ گار اور بندۂ گریختہ۔ پھر انھوں نے اپنی جان کو دریا میں ڈال دیا، ایک مچھلی آئی اور ان کو نگل گئی۔ اللہ پاک نے مچھلی کو وحی کی کہ اس کے کسی بال کو بھی تکلیف نہ دینا، کیوں کہ میں نے تیرے پیٹ کو اس کے لیے قید خانہ بنایا ہے اور اسے تیرے لیے طعام نہیں کیا ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے مچھلی کے پیٹ سے ان کو نجات دی اور چوزۂ برکندہ مو کی طرح اُن کو میدان میں ڈال دیا، اُن پر کوئی بال نہ تھا نہ چمڑا تو اللہ پاک نے اُن پر ایک بیل اُگائی کہ اس سے سایہ لیں اور اُس کے پھل کھائیں، یہاں تک کہ قوی ہو گئے تو وہ بیل سوکھ گئی، یونس علیہ السلام اس پر غمگین ہوئے تو اُن سے کہا گیا کہ تو ایک درخت پر غم کرتا ہے اور ایک لاکھ یا زیادہ پر تو نے حزن نہ کیا جب تُو اُن کی طرف نہ گیا اور اُن کی راحت طلب نہ کی۔ پھر اللہ پاک نے ان کو وحی بھیجی اور حکم دیا کہ ان کی طرف جائیں، پس اُن کی طرف روانہ ہوئے، یہاں تک کہ اُن کی زمین میں داخل ہوئے اور وہ لوگ اُن سے کچھ دور نہ تھے تو یونس علیہ السلام اُن کے پاس آئے اور اُن کے بادشاہ سے کہا کہ اللہ پاک نے مجھ کو تیری طرف بھیجا ہے۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ بھیج دے، وہ بولے: ہم نہیں جانتے جو تو کہتا

ہے، اگر ہم جان لیتے کہ تو سچا ہے تو ہم کرتے۔ ہم تو تمھارے دیار میں آئے اور تم کو قید کیا، پھر اگر بات ویسی ہے، جیسی تو کہتا ہے تو اللہ ہم کو تم سے روکتا۔ پھر یونس علیہ السلام نے تین دن اُن پر گشت کیا، اُن کو اس بات کی طرف بلاتے رہے، انھوں نے انکار ہی کیا تو اللہ نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ تو اُن سے کہہ دے کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو ان پر عذاب آئے گا، انھوں نے اُن کو پیغام پہنچا دیا اور انھوں نے نہ مانا تو اُن کے پاس سے نکل گئے، پھر جب یونس علیہ السلام کو گم پایا تو اپنے فعل پر نادم ہوئے، اُن کو ڈھونڈنے چلے تو اُن کو نہ پایا۔

پھر اپنی بات اور یونس علیہ السلام کی بات اُن علما سے بیان کی، جو اُن کے پاس تھے، کہا کہ تم اس کو دیکھو، شہر میں تلاش کرو، اگر وہ شہر میں ہے تو جو اس نے نزولِ عذاب کا ذکر کیا ہے، اس میں سے کچھ نہیں ہے اور اگر وہ نکل گیا ہے، تو ویسا ہی ہے، جیسا اس نے کہا۔ پھر انھوں نے یونس علیہ السلام کو تلاش کیا تو اُن سے کہا گیا کہ وہ تو زوال کے بعد نکل گیا، جب اُن کی آس ٹوٹی تو اپنے شہر کے دروازے بند کر دیے۔ پس نہ اُن کے جانور شہر میں داخل ہوئے نہ اُن کی بکریاں اور ہر ماں کو اس کے بچے سے الگ کر دیا۔ اسی طرح آدمیوں میں، ماؤں کو بچوں سے علاحدہ کر دیا، پھر کھڑے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے، پھر جب پو پھوٹی تو عذاب کو دیکھا کہ آسمان سے اترا تو انھوں نے اپنے گریبان پھاڑے اور حاملہ عورتوں نے اپنے پیٹ کے بچے جنے اور بچے چیخے چلائے، بکریاں مَے مَے کرنے لگیں، گائے بیل چیخے، اس پر اللہ پاک نے اُن سے عذاب اُٹھا لیا، پھر انھوں نے یونس علیہ السلام کی طرف آدمی بھیجا، اُن پر ایمان لائے، اُن کے ہمراہ بنی اسرائیل کو بھیج دیا۔

پس اس روایت کی بنا پر یونس علیہ السلام کی رسالت مچھلی کے پیٹ میں ڈالنے کے بعد ہوئی۔ اس قول کی دلیل اللہ پاک کا قول ہے جو سورۃ الصافات میں ہے: ﴿ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ [1] [الصافات: ١٤٥۔ ١٤٧] ''پھر ہم نے اسے چٹیل میدان میں ڈال دیا جب کہ وہ بیمار تھا۔ اور ہم نے اس پر ایک بیل دار درخت (کدو) اُگا دیا۔ اور ہم نے اسے ایک لاکھ (انسانوں) کی طرف بھیجا، یا وہ (اس سے کچھ) زیادہ ہوں گے۔'' اکثر علما اس پر ہیں کہ مچھلی کا قصہ اور یونس علیہ السلام کا خفا ہو کر جانا اس کے بعد واقع ہوا کہ ان کو اُن کی طرف بھیجا اور اس کے بعد کہ اُن کی توبہ اور اخلاص کے سبب سے اُن سے عذاب ہٹا لیا۔ غرضیکہ کچھ بھی ہو یونس علیہ السلام کے نکلنے اور قوم سے خفا ہونے کا سبب وہی دو وجہیں تھیں، جن کا ذکر ہوا۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے دونوں کا ذکر کیا ہے [2] اور علامہ نسفی و محلی رحمہما اللہ نے پہلی وجہ کو۔ [3]

رہی یہ بات کہ صیغہ مفاعلہ کا طرفین کا مقتضی ہے، حالانکہ یہاں غضب اور کراہت خاص یونس علیہ السلام کی طرف سے ہے، لہٰذا یہ مفاعلہ اپنے باب پر نہیں ہے، پس اس صورت میں کسی طرح کی مشارکت نہ ہوگی، جس طرح کہ

---

[1] تفسیر الرازي (٢٢/ ١٨٤۔ ١٨٥) [2] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٠٥) [3] تفسیر النسفي (٣/ ٨٩) تفسیر الجلالین (١/ ٤٢٩)

"سافرت و عاقبت اللص" ہے، اسی واسطے امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ مُغَاضِبًا ﴾ کی تفسیر غضبان کی ہے۔[1] یا صیغۂ مفاعلہ اس لیے لایا گیا ہے کہ یونس علیہ السلام کے کمال غضب اور غضب میں مبالغے پر دلالت کرے، کیوں کہ اکثر صیغۂ مفاعلہ کا استعمال مبالغے میں ہوتا ہے اور بلا شک جو شے بہ طریق مبالغہ صادر ہوتی ہے، وہ تمام تر ہوتی ہے۔ یا مفاعلہ اپنے باب پر ہے اور مشارکت اس طرح ہوسکتی ہے کہ یونس علیہ السلام کو قوم نے اس طرح خفا کیا کہ اُن کی دعوت سے ایمان نہ لائی اور ایک مدت کفر پر جمی رہی اور انھوں نے قوم کو اس طرح خفا کیا کہ اُن کے درمیان سے نکل گئے اُن کو نزولِ عذاب کا خوف ہوا، اس لیے قوم اُن سے خفا ہوئی۔ کسی نے "مُغْضِبًا" پڑھا ہے، اس قراءت کو امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "مغاضباً لقومه" یعنی یونس علیہ السلام قوم پر خفا ہو کر گئے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسما و صفات میں اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "غضب على قومه"[3]

﴿ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "أَنْ لَّنْ نَّقْضِيَ عَلَيْهِ عُقُوْبَةً" اور ابتلا اس بات میں ہوا کہ جو انھوں نے اپنی قوم کے ساتھ کیا کہ اُن پر خفا ہوئے اور وہاں سے نکل گئے۔ فرمایا اور عقوبت اُن کی یہ ہوئی کہ مچھلی نے اُن کو پکڑ لیا۔ امام ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾ کی تفسیر میں یہ ہیں کہ "ظَنَّ أَنْ لَّنْ يَّأْخُذَهُ الْعَذَابُ الَّذِيْ أَصَابَهُ"[4] امام حسن، شعبی اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "ذَهَبَ مُغَاضِبًا لِّرَبِّهٖ" امام ابن جریر، قتیبی اور مہدوی رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص لغت کو نہیں جانتا، بسا اوقات وہ اس کا انکار کرتا ہے، حالاں کہ یہ صحیح قول ہے۔ معنی یہ ہیں: "مُغَاضِبًا لِّأَجْلِ رَبِّهٖ" جس طرح تو کہتا ہے: "غضبت لك"، "أي من أجلك" ایک گروہ نے کہا من جملہ اُن کے اخفش ہے کہ یونس علیہ السلام جو خفا ہو کر نکلے تو اس بادشاہ سے جو ان کے وقت میں تھا، نام اس کا حزقیا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ نہ اپنے رب سے خفا ہوئے نہ اپنی قوم سے نہ بادشاہ سے، لیکن یہ ﴿ مُغَاضِبًا ﴾ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "غَضِبَ إِذَا أَنِفَ" یعنی جب کوئی کنیا سے عار کرے تو "غَضِبَ" بولتے ہیں، یعنی اس نے ننگ و عار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت انھوں نے اپنی قوم سے عذاب کا وعدہ کیا اور وہ لوگ فلسطین میں رہتے بستے تھے اور یونس علیہ السلام اُن سے نکلے تو انھوں نے توبہ کر لی اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے عذاب دور کر دیا، پھر جب لوٹ کر آئے اور جانا کہ وہ ہلاک نہ ہوئے تو اس سے ننگ و عار کیا اور اُن سے نکل گئے۔ شاعرِ عرب نے غضب کا

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٩) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٥١١) الدر المنثور (٥/ ٦٦٥)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ٥١٤) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٣) [5] فتح القدير (٣/ ٥٧٤)

استعمال اسی معنی میں کیا ہے۔ ع

وأغضب أن تهجى تميم بعامر، أي أنف

یعنی میں عار کرتا ہوں اس بات سے کہ تمیم کی ہجو کی جائے عامر کے بدلے۔

﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾ جمہور نے اس کو نون کی زبر اور دال کی زیر سے پڑھا ہے۔ اس قراءت کی بنیاد پر اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ لہٰذا بعض نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ یونس علیہ السلام کے گمان میں یہ بات واقع ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اُن کے عتاب کرنے پر قادر نہیں ہوگا۔ یہ قول حسن وسعید بن جبیر رحمہ اللہ سے منقول ہے، لیکن یہ قول مردود ہے، کیوں کہ یہ گمان اللہ پاک کے ساتھ کرنا، کفر ہے۔ ایسا قول انبیا علیہم السلام سے واقع نہیں ہوتا۔ جمہور علما اس طرف گئے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یونس علیہ السلام نے یہ گمان کیا کہ ہم ہرگز اُن پر تنگی نہ کریں گے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ [الشوریٰ: ۱۲] [1] ''وہ جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور وہی (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے'' ''أي يضيق''، محاورے میں بولتے ہیں: ''قَدَرَ و قُدِرَ و قَتَرَ وَقُتِرَ'' ''أي ضيق''۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی یہی معنی اختیار کیے ہیں اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ ایک دن وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر داخل ہوئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لقد ضربتني أمواج القرآن فلم أر لنفسي خلاصاً إلا بك''، یعنی مجھ کو قرآن شریف کی موجوں نے مارا تو میں نے اپنے نفس کے لیے خلاصی نہ دیکھی مگر آپ سے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اے معاویہ! وہ کیا ہے؟ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا اللہ کا نبی گمان کرے گا کہ اللہ اس پر قدرت نہیں رکھتا؟ فرمایا کہ یہ ''قدر'' سے ہے، ''قدرة'' سے نہیں ہے۔[2] کسی نے کہا کہ ''نقدر'' قدر سے ہے، جس کے معنی قضا وحکم کے ہیں، یعنی گمان کیا کہ ہم ہرگز اس پر عقوبت کا حکم نہ کریں گے۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ماخوذ ہے قدر سے، جس کے معنی حکم کے ہیں، قدرت و استطاعت مراد نہیں ہے۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا کہ تقدیر سے ماخوذ ہے، قدرت سے نہیں۔ اسی محاورے سے یوں بولتے ہیں: ''قدر الله لك الخير يقدره قدرا''، یعنی اللہ تیرے لیے خیر مقدر کرے۔ ثعلب نے اس کی سند کے لیے یہ شعر پڑھا ہے ؎

فَلَيْسَتْ عَشِيَّاتِي اللَّوىٰ بِرَوَاجِعٍ لَنَا أَبَدًا مَا أَورق السَّلَّمُ النَّضر
وَلَا عَائِدٌ ذَاكَ الزَّمَانُ الَّذِيْ مَضٰى تَبَارَكْتَ مَا تَقْدِرُ يقع ولك الشُّكْرُ

اس معنی کے مویدات میں سے عمر بن عبدالعزیز اور زہری رحمہ اللہ کی قراءت ہے۔ انھوں نے اس کو بضم نون و تشدید دال تقدیر سے پڑھا ہے اور ماوردی نے اسی قراءت کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور نیز اس کی

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣١) فتح القدير (٣/ ٥٧٤) [2] تفسير النسفي (٣/ ٨٩)

موید قراءت عبید بن عمیر، قتادہ اور اعرج رحمہ اللہ کی ہے۔ انھوں نے اس کو بضم یا وتشدید دال بصیغہ مجہول پڑھا ہے اور یعقوب وعبداللہ بن ابی اسحق وحسن کی قراءت بضم یا وفتح دال مخفف بصیغۂ مجہول ہے۔[1]

صحیح حدیث میں جو ایک شخص کا قصہ آیا ہے، جس نے کوئی خیر نہ کی تھی کبھی، اس نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ جب وہ مرجائے تو اس کو جلا ڈالیں، پھر اس نے یوں کہا تھا: «فَوَاللّٰهِ لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ عَلَيَّ... الحديث»[2]۔ لہٰذا علما نے اس کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، جس طرح کہ اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ فتح البیان و فتح القدیر میں کہا ہے کہ ہم نے اس جگہ وہ تقریر ذکر کی ہے، جس کے ساتھ ناظر کو اس کے غیر کی طرف حاجت نہ ہوگی۔[3] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اول تو وہی دو معنے ذکر کیے ہیں: ﴿ نَّقْدِرَ ﴾ کے معنی "نضيق" ہیں یا "نقضي"۔ پھر کہا ہے: یا یہ معنی ہیں: "لن نعمل فيه قدرتنا"[4] اس معنی کی بنیاد اس پر ہے کہ ﴿ نَّقْدِرَ ﴾ قدرت سے ہے اور قدرت سے مراد اعمالِ قدرت ہے اور مباشرتِ فعل، جو اس سے ہوتی ہے بطریقِ اطلاقِ سبب اور مراد مسبب، کیوں کہ قدرت اور فعل کے درمیان میں تعلق سببیت کا ہے، پس یہ بات بعید نہیں ہے کہ اُن میں سے ایک دوسرے سے مجاز قرار دیا جائے، معنی یہ ہیں کہ یونس علیہ السلام نے گمان کیا کہ ہم اپنی قدرت کو اس میں عمل نہ کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ یونس علیہ السلام جو اپنی قوم سے حکمِ الٰہی کا انتظار کیے بغیر نکل گئے۔ لہٰذا اُن کے حال کی تشبیہ دی اس شخص کے حال سے جو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ اس پر قادر نہ ہوگا، اس معنی کی بنیاد پر ﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ ﴾ استعارۂ تبعیہ ہوگا بہ طریقِ استعارۂ تمثیلیہ۔ یا یہ ایک خطرۂ شیطانی تھا کہ اُن کے وہم کی طرف سبقت کر گیا، پس واسطے مبالغے کے اس کا نام ظن رکھ دیا، ورنہ نبی سے ایسا ظن محال ہے: "أَنْ لَّنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ" میں کلمہ "أَنْ" مخففہ ہے مثقلہ سے، اسم اس کا ضمیرِ شان محذوف ہے، یعنی "أَنَّهٗ" اور "لَنْ نَّقْدِرَ" خبر ہے۔

﴿ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ ﴾ میں حرفِ فا فصیحہ ہے، جملہ محذوفۂ ما قبل کی خبر دیتا ہے، وہ یہ ہے: "كان ما كان من التقام الحوت له" یعنی ہوا جو کچھ ہوا، مچھلی نے اُن کو نگل لیا، لہٰذا انھوں نے تاریکیوں میں ندا کی۔ "ظُلُمَاتِ" سے مراد سخت گہرے اندھیرے ہیں مچھلی کے پیٹ میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ ﴾ [البقرة: ١٧] "تو اللہ ان کی روشنی لے گیا اور انھیں اندھیروں میں چھوڑ دیا۔" یعنی جمع کا صیغہ تاریکی کی کثرت کے لیے ہے۔ یا مراد تین اندھیرے ہیں: ایک تاریکی مچھلی کے پیٹ کی، دوسری دریا کی، تیسری رات کی۔ وہ ندا یہ ہے: ﴿ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ﴾ کلمہ ﴿ اَنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے "أَيْ بِأَنَّهٗ" اور اسم اس کا ضمیرِ شان محذوف ہے اور جملہ منفیۂ ما بعد خبر ہے یا کلمہ ﴿ اَنْ ﴾ بہ معنی "أي" ہے، یعنی ﴿ اَنْ ﴾

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣١۔ ٣٣٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٦)

[3] فتح البيان (٨/ ٣٦٥) فتح القدير (٣/ ٥٧٥) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥)

تفسیر یہ ہے، کیوں کہ ما قبل اس کے معنی قول ہیں، یعنی نادی۔ معنی یہ ہیں کہ یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں یوں ندا کی کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر تو، پاک ہے تو اس سے کہ کوئی شے تجھے عاجز کرے۔ انھوں نے اپنے رب کو سارے نقائص سے پاک کیا، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مثلاً جو اس نے کیا اس کو براہِ ظلم کرے، یا خواہشِ انتقام سے پاک ہے، یا اس سے پاک ہے کہ مکروب کی تخلیص (کرب میں مبتلا شخص کی خلاصی کرنے سے) عاجز ہو، یا گناہ گار کے مواخذے سے عاجز ہو۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے جو بعد ﴿ سُبْحٰنَكَ ﴾ کے "من أن يعجزك شيء" نکالا ہے،[1] شاید اس کی بنا اس بات پر ہو کہ ﴿ نَّقْدِرَ ﴾ کے احتمالوں میں سے امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اخیر احتمال کو اختیار کیا ہو، وہ اخیر احتمال یہی تھا کہ ظن سے مراد خطرۂ وہمیہ ہے اور یونس علیہ السلام نے جو اللہ پاک کے ساتھ عجز کا وہم کیا، لہٰذا یہ تسبیح اس توہم سے اُن کی استغفار ہو جائے۔ اول تو اپنے رب کی ہر برائی سے پاکیزگی بیان کی۔ پھر اپنے ظلم کا اقرار کر کے یوں کہا: ﴿ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی بے شک میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ یعنی میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا کہ بغیر تیرے حکم کے قوم سے ہجرت کر گیا۔ امام محلی، نسفی اور بیضاوی رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول یونس علیہ السلام کی طرف سے اپنے گناہ کا اقرار ہے اور اپنی خطا سے توبہ ہے۔[3] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دعا کا اول حصہ تہلیل ہے اور اوسط تسبیح ہے اور آخر گناہ کا اقرار ہے، پھر اللہ پاک نے خبر دی کہ ہم نے اس کی دعا قبول کی:

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ﴾ کون سی دعا، جس کے ضمن میں نہایت لطیف انداز سے گناہ کا اقرار کیا تھا۔ ﴿ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ﴾ یعنی ہم نے اس کو غم سے نجات دی اس طریقے سے کہ مچھلی نے اُن کو کنارے پر ڈال دیا۔ اسی دن یا چار گھڑی کے بعد یا تین دن کے بعد یا سات یا بیس یا چالیس دن اور رات کے بعد۔ کل چھے قول ہوئے، پس اول کے پانچ قول، سوائے چار گھڑی کے امام محلی رحمہ اللہ نے سورۃ الصافات میں ذکر کیے ہیں اور دو قول ایک چار گھڑی کا دوسرا تین دن کا[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور غم سے مراد مچھلی کے نگلنے کا غم ہے یا خطا کا غم[5] یا وحشت و تنہائی کا غم۔ غم اندوہ کو کہتے ہیں۔

﴿ وَكَذٰلِكَ نُـْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی جس طرح ہم نے یونس کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دی، جب اس نے ہم کو پکارا، اس طرح ہم ایمان والوں کو اُن کے کرب اور سختی سے نجات دیتے ہیں، جب وہ ہم کو پکاریں، ہم سے استغاثہ کریں۔ اسی معنی کی بنا پر کاف صفت ہے مصدر محذوف کی۔ فتح البیان و فتح القدیر میں کہا ہے کہ ہم مومنین کو

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٩) تفسير النسفي (٣/ ٨٩) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥)
[3] فتح القدير (٣/ ٥٧٥) [4] تفسير الجلالين (١/ ٥٩٦) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥)

خلاصی دیتے ہیں، ان کے ہم سے ان کے عمل کے سبب جو پہلے ہو چکا ہے اور اس رحمت کے سبب سے جس کو ہم نے اُن کے واسطے تیار کر رکھا ہے، یہی معنی دوسری آیت کے ہیں: ﴿ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾[1] [الصافات: ۱۴۳۔ ۱۴۴] ''پھر اگر (یہ بات) نہ ہوتی کہ بے شک وہ تسبیح کرنے والوں میں سے تھا۔ تو وہ لوگوں کے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھائے جانے کے دن (روزِ قیامت) تک اسی (مچھلی) کے پیٹ میں رہتا۔''

جمہور نے ﴿ نُـۨجِي ﴾ کو دو نون سے پڑھا ہے۔ ابن عامر کی قراءت ''نُجِّيْ'' ایک نون اور جیم مشدد و سکون یائے تحتیہ کے ساتھ ہے، اس میں تین وجہیں ہیں؛ پہلی وجہ یہ ہے کہ فعل ماضی مجہول ہے اور حرفِ یا کو تخفیف کے لیے ساکن کر دیا ہے اور نائب فاعل مصدر مضمر ہے، یعنی ''وَكَذٰلِكَ نُجِّيَ النُّجَاءُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' جس طرح یہ مثال ہے: ''ضُرِبَ زَيْدًا'' یعنی ''ضُرِبَ الضَّرْبُ زَيْدًا'' اسی باب سے شاعر کا قول ہے ؎

ولو ولدت قفيزة جرو كلب   لسب بذلك الجرو الكلابا

یعنی اگر قفیزہ کتے کا پلا جنے تو اس پلے کے سبب سے کتے بھی گالی دیے جائیں گے۔

امام فراء، ابو عبیدہ اور ثعلب رحمہم اللہ نے اس قراءت کی توجیہ میں اسی طرح کہا ہے۔[2] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس توجیہ کو دو وجہ سے ضعیف کہا ہے: ایک تو آخر ماضی کو ساکن کرنا، دوسرے مصدر کو نائب فاعل ٹھہرانا، باوجود مفعول صحیح موجود ہونے کے۔[3] امام ابو حاتم اور زجاج رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس طرح سے غلط ہے کہ یہ لحن ہے، یعنی صحیح نہیں اس لیے کہ اس میں مفعول ''ما لم يسمّ'' فاعلہ کو نصب دیا ہے، حالانکہ ''نجي المؤمنون'' کہا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ''نجي'' فعل مستقبل ہے، اس کے ثانی نون کو جیم سے قلب کیا، پھر جیم کو جیم میں ادغام کیا۔ امام ابو عبیدہ و قتیبی اس کے قائل ہیں کہ نون کو جیم میں ادغام کیا ہے۔[4] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس کو بھی ضعیف کہا ہے۔[5]

امام نحاس رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ بات کسی نحوی کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس لیے کہ نون کا مخرج جیم کے مخرج سے بعید ہے تو اس میں ادغام نہ کیا جائے گا۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ اصل اس کی ''نَنَجي'' ہے بفتح نون ثانی، لیکن اس کو حذف کر دیا، جس طرح کہ ''تظاهرون'' میں دوسرے حرفِ تا کو حذف کر دیا ہے، اصل میں ''تَتظاهرون'' تھا اور ''ولا تفرقوا'' میں سے تا کو حذف کیا اصل میں ''ولا تتفرقوا'' تھا۔ یہ توجیہ علی بن سلیمان اخفش نے ذکر کی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اس سے بہتر میں نے کوئی شے نہیں سنی۔ اس توجیہ کو امام نحاس رحمہ اللہ نے اخفش سے سنا ہے۔[6] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس توجیہ کو بھی بہ سببِ دو وجہ کے ضعیف کہا ہے: ایک یہ کہ نون ثانی اصل ہے اور وہ فا کلمہ ہے، پس اس کا حذف کرنا نہایت بعید ہے۔ دوسری یہ ہے کہ ثانی نون کی حرکت اول

---

[1] فتح البيان (٨/ ٣٦٦) فتح القدير (٣/ ٥٧٥) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٤۔ ٣٣٥) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٥)
[4] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٥) [5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٥) [6] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٥)

نون کی حرکت کی غیر ہے تو دونوں کا جمع ہونا ثقیل نہ ہوگا۔ بخلاف "تظاهرون" کے تو نہیں دیکھتا کہ اگر "تتحامی المظالم" کہے تو دوسری تا کا حذف کرنا جائز نہ ہوگا۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا کہ جیسا اخفش نے کہا: ویسا ہی امام واحدی رحمہ اللہ نے ابوعلی فارسی سے نقل کیا ہے، کہا کہ نون ثانی جیم کے ساتھ اخفا کیا جاتا ہے اور اس کا ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے سامع پر اخفا ادغام کے ساتھ ملتبس ہوگیا تو اس نے گمان کرلیا کہ وہ ادغام ہے۔ اسکان یاے "نجی" اور نصب "مومنین" اس پر دال ہے، اگر فعل مجهول کی بنا پر ہوتا تو یا کو سکون نہ دیا جاتا اور مومنین کا مرفوع ہونا واجب ہوتا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابوعلی نے جو کہا ہے کہ نونِ ثانی کا ظاہر کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا ہم اس کو نہیں مانتے، کیوں کہ جمہور کی قراءت محمد بن سمیفع اور ابو العالیہ کی ہے۔

"وَ كَذٰلِكَ نُجِّي الْمُؤْمِنِيْنَ" بصیغۂ ماضی معروف، یعنی "نجا الله المؤمنين" اسی طرح نجات دی اللہ نے ایمان والوں کو۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مصحف امام، یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن شریف میں "نجیٰ" ہے، یعنی ایک نون سے۔ اس لیے جماعتِ قرا نے نونِ ثانی کا اخفا کیا ہے۔ اس لیے کہ نون حروف فم کے ساتھ اخفا کیا جاتا ہے۔[3] شیخ زادہ نے کہا یہ بات صرف اس پر دال ہے کہ یہ کلمہ ایک نون سے رسم کیا گیا ہے اور اس میں اس کی دلیل نہیں کہ قراءت بتشدید نون ہے اور نہ اس پر دلیل ہے کہ ایک وجہ ٹھہرائی جائے واسطے اخفائے جماعتِ قرا کے۔ نون ثانی ﴿نُنْجِي﴾ کو جو بضم نون اول وسکون ثانی "أَنْجَى" سے ہے۔ حروف کا اخفا ایک حالت ہے درمیان اظہار و ادغامِ حروف کے اور اخفا نہیں ہوتا ہے مگر بہ سکونِ حروف اور کبھی اخفا کا اطلاق ہوتا ہے اختلاسِ حرکتِ حرف پر اور اختلاس عدمِ اتمامِ حرکت کو کہتے ہیں، جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں اخفا کیا ہے: ﴿مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ﴾ [يوسف: ١١] "آپ ہم پر یوسف کی بابت اعتبار نہیں کرتے۔" پہلے نون کی حرکت کا مراد اخفا سے یہاں تلفظ ہے دوسرے نون کا، ایسی حالت پر جو مشابہ ہے ادغامِ نون کو جیم میں۔

پھر امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابن عامر اور ابوبکر رحمہما اللہ نے "نجي" بنونِ واحد وتشدیدِ جیم وسکونِ یا پڑھا ہے، بعد اس کے تیسری توجیہ ذکر کی ہے۔ پھر امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جو اس کو دو وجہ سے ضعیف کہا تھا، اس کا یوں جواب دیا ہے کہ نونِ ثانی اگرچہ فا کلمہ ہے پس اس کا حذف اوقع ہے حروفِ مضارع سے، جو کہ واسطے معنے کے ہیں، یعنی جب حروفِ مضارع جو کہ معنی استقبال و حال پر دلالت کرتے ہیں، وہ بلانکیر حذف ہو جاتے ہیں تو حرفِ فا کلمہ، جو بلا معنی ہے، اس کے واسطے تو حذف کا نہایت حسن موقع ہے۔ دوسری وجہ کا یہ جواب دیا ہے کہ نون ثانی کے حذف میں اختلاف دونوں نون کی حرکتوں کا قادح نہیں ہوسکتا ہے، کیوں کہ باعثِ حذف پر مثلین کا جمع ہونا ہے مع

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٥) [2] فتح القدير (٣/ ٥٧٦) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥)

تعذرِ ادغام کے۔ رہا امتناع حذف کا تحامی میں، لہٰذا وہ واسطے خوفِ التباس کے ہے،[1] یعنی اگر اس میں سے ایک تا کو حذف کر دیں تو ماضی کے ساتھ التباس ہوگا اور ”نجي“ میں بسبب سکون یائے تحتیہ کے التباس سے امن ہے۔ اسی طرح ”تظاهرون“ میں بھی کسی طرح کا التباس نہیں ہے۔

صحیحین وغیرہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ یہ کہے کہ میں یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں۔[2] یہ حدیث شریف صحیح وغیرہ میں بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی مروی ہے[3] اور صحیحین میں بروایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی وارد ہوئی ہے۔[4] مجمع البحار میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یونس علیہ السلام کا خاص ذکر اس لیے فرمایا کہ اُن کے حق میں کسی طرح کے نقص یا کمی کا وہم نہ کیا جائے، اس سبب سے کہ قرآن شریف میں اُن کا ذکر اس طرح کیا ہے: ﴿ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ [القلم: ٤٨] ”اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہوں۔“

حدیث شریف میں جو لفظ ”أنا“ واقع ہوا ہے، پس اس سے مراد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یعنی مجھ کو اُن سے بہتر مت کہو۔ یا ”أنا“ کی ضمیر سے مراد عبد ہے، کیوں کہ ایک روایت میں یوں آیا ہے: « لَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ » اول قول کی بنا پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا: پس قبل اس کے تھا کہ آپ کو اپنے فضل کا علم ہو یا کوئی جاہل بہ سبب ”إذ أبق“ کے اُن کی کمی رُتبے کا خیال کرے، لہٰذا جاہل کے تخیل سے زجر کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ «مَنْ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى فَقَدْ كَذَبَ»[5] یعنی کوئی جاہل جو کہ عبادت وعلم وغیرہ میں سعی وکوشش کرتا ہے، وہ یوں نہ کہے، کیوں کہ درجۂ نبوت یونس علیہ السلام کو ہرگز نہ پہنچے گا، گو اُن کا ذکر مکظوم وملوم کرکے آیا ہے۔[6] انتھی ملخصاً۔

تفسیر خازن میں ہے کہ جو شخص انبیا علیہم السلام سے گناہ کا ہو جانا جائز کہتا ہے، اس نے اس قصے کی کئی جگہ سے تمسک کیا ہے، ایک تو یہ ہے: ﴿ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا ﴾. دوسرا: ﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾. تیسرا: ﴿ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾۔ لہٰذا جوابِ کلی اس کا یہ ہے کہ اس واقعے میں اختلاف کیا ہے کہ یہ واقعہ قبل رسالت کے تھا یا بعد رسالت کے۔ لہٰذا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اُن کی رسالت اس کے بعد تھی کہ اُن کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا، بہ دلیل آیتِ صافات بعد ذکر اُن کے خروج کے ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٤٧] ”اور ہم نے اسے ایک لاکھ (انسانوں) کی طرف بھیجا، یا وہ (اس سے کچھ) زیادہ ہوں گے۔“ سے ثابت ہوا کہ یہ واقعہ قبل نبوت کے تھا اور یہی قول صحیح ہے۔

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٥۔ ١٠٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٧)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٢٧) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٦)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٢٨) [6] مجمع بحار الأنوار (٢/ ١٣٠)

رہا تفصیلی جواب تو ﴿ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا ﴾ کو اس بات پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کا غصہ قوم پر تھا یا بادشاہ پر، انبیا علیہم السلام کے حال کے لائق یہی بات ہے اور ﴿ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ﴾ کے معنی گزر چکے ہیں کہ "لَنْ نَضِيقَ عَلَيْهِ" ہیں۔ یہ یوں ہے کہ یونس علیہ السلام نے گمان کیا کہ وہ مخیّر ہیں، چاہیں ٹھہریں، چاہیں نکل جائیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اختیار میں اُن پر تنگی نہ کرے گا۔

رہا ﴿ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ سو ظلم کے یہ معنی ہیں کہ کسی شے کو اس کے غیر محل پر رکھنا اور یہ بعض کے نزدیک اپنے گناہ کا اقرار ہے، لہٰذا یہ گناہ یا تو یہ ہے کہ اپنے رب کے اذن کے بغیر قوم سے نکل گئے، یا جس کام کے حامل ہوئے تھے اس سے ضعیف ہو گئے، یا اپنی قوم پر عذاب کی بد دعا کی، اُن سب چیزوں میں ترک افضل ہے، باوجود اس کے کہ اس کے حاصل کرنے پر قادر تھے، پس یہ ظلم ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی رسالت اس واقعہ کے قبل تھی، بدلیل: ﴿ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ [الصافات: ١٣٩۔ ١٤٠] "اور بے شک یونس یقیناً رسولوں میں سے تھا۔ جب وہ ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گیا۔" لہٰذا اس کی بنا پر اس واقعہ کا جواب وہی تفصیل ہوگی، جو گزر چکی ہے۔[1] واللّٰه سبحانه أعلم۔ پھر اللہ پاک نے نواں قصہ زکریا علیہ السلام کا نبی اکرم ﷺ کی تسلی وتشفی کے لیے بیان کیا، فرمایا:

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝٨٩ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝٩٠

اور (یاد کریں) زکریا کو، جب اس نے اپنے رب کو پکارا تھا: اے میرے رب! تو مجھے اکیلا نہ چھوڑ، اور تو ہی بہترین وارث ہے (89) چنانچہ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور ہم نے اسے یحییٰ عطا کیا، اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا، بے شک وہ (انبیاء علیہم السلام) نیکیوں میں جلدی کرتے اور ہمیں رغبت اور ڈر سے پکارتے تھے اور وہ ہمارے لیے ہی عجز وانکسار کرنے والے تھے (90)

زکریا ویحییٰ علیہما السلام کا تذکرہ:

لوگ کہتے ہیں، جو کوئی اللہ کو پکارے توقع سے یا ڈر سے، وہ محبّ تحقیق نہیں، یہاں سے اس کی غلطی نکلی۔ انتہی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے بندے زکریا علیہ السلام کے حال کی خبر دی، جبکہ انھوں نے

---

[1] تفسیر الخازن (٤/ ٣٢٠)

خواہش کی کہ ان کو لڑکا بخشے جو اُن کے بعد نبی ہو۔ یہ قصہ اول سورت مریم اور سورت آل عمران میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔[1] اس جگہ اس سے مختصر طور پر بیان فرمایا: ﴿ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ ﴾ یعنی اپنے رب کو پکارا اپنی قوم سے پوشیدہ۔ ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا ﴾ یعنی تو مجھے ایسا مت چھوڑ کہ میرا نہ کوئی لڑکا ہو نہ کوئی وارث کہ میرے بعد لوگوں میں قائم ہو۔

﴿ وَاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ﴾ دعا و ثنا ہے مناسب دعا کے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ﴾ زوج سے مراد اُن کی بی بی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے کہا کہ وہ بانجھ تھیں، جنتی نہ تھیں، پھر انھوں نے جنا۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن کی زبان میں درازی تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کو درست کر دیا۔ (قاله عبد الرحمن بن مهدي عن طلحة بن عمرو عنه) **ایک روایت میں یوں ہے کہ اُن کے خُلق میں کچھ تھا، یعنی کج خلق تھیں۔ پھر اللہ پاک نے اُن کو درست کر دیا، یعنی ان کو خوش خلق کیا۔ امام محمد** بن کعب اور سدی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ظاہر تر سیاق سے پہلا قول ہے۔[2]

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ﴾ یعنی قربات و طاعات بجا لانے میں دوڑتے تھے۔ ﴿ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ﴾۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: واسطے رغبت کے اس شے میں جو ہمارے پاس ہے اور اس شے سے ڈر کے واسطے جو ہمارے نزدیک ہے۔ ﴿ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ﴾۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، یعنی تصدیق کرنے والے تھے اس شے کی جو اللہ نے نازل کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ سچے مومن تھے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ خائف تھے۔ امام ابو سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خشوع اس خوف کو کہتے ہیں، جو دل سے لازم رہے، اس سے کبھی جدا نہ ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ خٰشِعِیْنَ ﴾ کے معنی متواضعین ہیں۔

امام حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ عز و جل کے واسطے ذلیل ہونے والے تھے۔ یہ سب قول ایک دوسرے کے قریب ہیں۔[3] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبد اللہ بن حکیم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہم کو خطبہ سنایا۔ پھر فرمایا: اما بعد! میں تم کو اللہ کے تقوے کی وصیت کرتا ہوں اور اس پر ثنا کرو اس شے کے ساتھ جس کے وہ لائق ہے اور رغبت کو رہبت کے ساتھ ملاؤ اور الحاف کو مسئلے کے ساتھ جمع کرو۔ چمٹ کر سوال کرنے کو الحاف کہتے ہیں، کیوں کہ اللہ عز و جل نے زکریا علیہ السلام اور اُن کے اہلِ بیت پر ثنا کی اور یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ ﴾ فتح القدیر میں اس کے مخرج اتنے اور لکھے ہیں۔[4] (أخرجه ابن أبي شيبة و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و أبو نعيم في الحلية و الحاكم و صححه و البيهقي

---

[1] سورت مريم: رقم الآية (٢)، سورت آل عمران: رقم الآية (٣٧)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٢٠۔ ٥٢١) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٨) [3] تفسير الطبري (٢/ ١٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٨۔ ٢٥٩)

[4] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٩١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٦) حلية الأولياء (١/ ٣٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٤١٥) شعب الإيمان (٧/ ٣٦٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٩) فتح القدير (٣/ ٥٨٣)

في الشعب عن عبد الله بن عكيم إلىٰ آخره) اس میں عکیم بعینِ مہملہ ہے اور ابن کثیر میں حکیم بحائے مہملہ۔ واللہ أعلم.

اللہ پاک نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ تم ذکر کرو خبر زکریا کی، جبکہ پکارا اپنے رب کو، کہا: ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ یعنی اے میرے رب! تو مجھے منفرد، وحید و تنہا مت چھوڑ کہ میرا کوئی لڑکا نہ ہو، جو میرا وارث بنے۔ یہ کلام اگرچہ نہی کی صورت پر ہے، مگر ایسی عبارت جس وقت بندے کی طرف سے اپنے مالک اور سید کے لیے ہوتی ہے تو تضرع و تعوذ و دعا ہوتی ہے۔ جب زکریا علیہ السلام کی عمر سو برس کو اور اُن کی بی بی کی عمر ننانوے برس کو پہنچی اور اُن کے بچہ نہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ اللہ اُن کو کوئی لڑکا بخشے، جو اُن کا مونس ہو اور دین و دنیا کے کام پر ان کو قوت دے اور موت کے بعد اُن کا قائم مقام ہو، اس پر انھوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ ان کو بغیر لڑکے کے تنہا نہ چھوڑے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ ﴾ [مريم: ٤۔ ٥] ''چناں چہ تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر۔ جو میرا وارث بنے۔'' پھر اپنے مولیٰ کی مشیت کے تابع اور فرمانبردار ہو کر یہ کہا: ﴿ وَاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ یہ معطوف ہے مقدر پر۔ ''أي فارزقني وارثا و أنت''، یعنی پس تو کوئی وارث مجھ کو عطا فرما اور تو بہتر وارثوں کا ہے، یعنی ہر مرنے والے کے بعد جو باقی رہتے ہیں، اُن سب سے تو ہی بہتر باقی رہنے والا ہے، لہٰذا تو ہی مجھے کافی ہے اگر تو مجھے لڑکا عنایت نہ کرے گا تو مجھے کچھ اس کی پروا نہیں ہے، کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو اپنے دین کو ضائع نہ کرے گا، ضرور تیرے بندوں میں سے کوئی نہ کوئی تیرے دین کا بندوبست کرے گا، جس کو تو تبلیغ کے لیے پسند فرمائے گا۔

اصلاحِ زوج سے مراد یا تو یہ ہے کہ اُن کی بی بی کا بانجھ پن دور کرکے ولادت کے لائق کر دیا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ عقیم تھیں، پھر انھوں نے بچہ جنا۔ ولادت کے وقت اُن کی عمر ننانوے برس کی تھی۔ یا مراد ہے کہ وہ خشمناک بدخلق تھیں، اُن کو خوش خلق، بردبار کر دیا، پس پہلے قول کی بنا پر ﴿ وَاَصْلَحْنَا لَهٗ ﴾ کے معنی یہ ہوں گے کہ زکریا علیہ السلام کی دعا کے سبب سے ہم نے اس کو ولادت کے قابل کر دیا۔ دوسرے قول کی بنا پر معنے یہ ہوں گے: ہم نے اس کو صحبت اور حسنِ معاشرت کے لیے زکریا علیہ السلام کے لائق کر دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصلاح سے مراد یہ ہو کہ ہم نے اس کو خوش ہیئت خوبصورت کر دیا اس طور پر کہ اس کا خاوند اس میں رغبت کرے، کیوں کہ جو عمر زکریا علیہ السلام کی بیوی کی تھی، جب عورتیں اس عمر کو پہنچتیں ہیں تو من جملہ قواعد ہو جاتی ہیں، کوئی بھی اُن میں رغبت نہیں کرتا۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں دو قول پہلے ذکر کیے ہیں۔ پھر کہا ہے کہ کوئی اس سے مانع نہیں کہ یہ دونوں امر جمیعاً مراد ہوں، اس طرح پر کہ اللہ پاک اُن کی ذات کو صالح کر دے تو بعد بانجھ پن کے جننے والی ہو جائیں اور اُن کے اخلاق کی بھی اصلاح فرما دے تو بعد اس کے کہ اُن کا اخلاق ناپسندیدہ تھا، پسندیدہ ہو جائے۔[1]

[1] فتح البیان (٨/ ٣٦٨) فتح القدیر (٣/ ٥٨٠)

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ... الخ﴾ یہ علت ہے محذوف کی، "أي نالوا ما نالوا لأنهم" اول تین امر گزرے ہیں: ایک تو زکریا علیہ السلام کی دعا قبول کرنا، دوسرے اُن کی بیوی کی اصلاح کرنا، تیسرے اُن دونوں پر جو نیک لڑکا عطا کرنا مرتب ہوا۔ پس اللہ پاک نے ان تینوں امر کی علت بیان فرمائی کہ اُن کو جو یہ امور حاصل ہوئے، اس کی علت یہ ہے کہ وہ نیکیوں میں دوڑتے تھے، اس تعلیل میں بھی تین شرطیں ذکر فرمائیں، ایک تو خیرات میں مسارعت، کیوں کہ وسیلہ مطلب پر مقدم ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ داعی خوف و رجا کے درمیان ہو، اپنی تقصیر سے ڈرے اور اپنے اعمال پر بھروسا نہ کر بیٹھے، کیوں کہ اعمال کا اعتبار خاتموں پر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اللہ پاک کی رحمتِ واسعہ کا اُمیدوار رہے۔ تیسری یہ ہے کہ مخلص ہو ریا کار نہ ہو، جیسا کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ خشوع یہ ہے کہ اللہ پاک بندے سے اخلاص کو دیکھے گا، جبکہ بندہ اپنا پردہ چھوڑ دے اور دروازے بند کر دے۔ لہٰذا خشوع جو ہوتا ہے دل ہی سے ہوتا ہے اعضا و جوارح سے نہیں ہوتا، بایں طور کہ سخت کھائے، سخت پہنے، اپنے سر کو جھکائے رکھے اور ریا و تصنع نہ کرے اور اگر ﴿ اِنَّهُمْ ﴾ کی ضمیر سے انبیا علیہم السلام سے مراد ہیں، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو یہ علت سب کے قبولِ دعا کی ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو تفضّل اور مہربانی فرمائی ہے، اس سب کی یہی تعلیل ٹھہرے گی۔ مثلاً موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرقان دیا۔ ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو سرد کر دیا، اس سے نجات دی۔ لوط علیہ السلام نے عراق سے شام کی طرف ہجرت کی، پھر اُن کو قوم کے عذاب سے نجات دی۔ نوح علیہ السلام کو اور کشتی والوں کو طوفان سے بچایا۔ علیہم السلام۔

خیرات میں مسارعت کرنے سے مراد یہ ہے کہ طاعتِ الٰہی کی طرف جلدی کرتے، شرعی حدود کی رعایت کرتے، ان کا خیال کرتے، یہ مسارعتِ محمود ہے اور جلد بازی، جو حدود و آداب کا خیال رکھے بغیر ہو، وہ مذموم ہے۔

جمہور نے "رَغَبًا وَ رَهَبًا" کو بفتحِ غین و ہا پڑھا ہے، یہ دونوں مصدر ہیں، بروزن طلب، فاعل "يدعون" سے موقع حال میں واقع ہوئے ہیں، بتقدیر مضاف، یعنی "يدعون ذوي". "رغب و رهب" یا جمع ہیں راغب و راہب کی، جیسے: خادم و خَدَم، یعنی راجین و خائفین، یا دونوں فعل محذوف کے مفعول مطلق ہیں، یعنی "يرغبون رغبا و يرهبون رهبا" یا مفعول لہ ہیں، یعنی "للرغب و الرهب" اور اعمش نے "رُغبا و رُهبا" بضم را وسکون مابعد پڑھا ہے اور ابن وثاب کی قراءت بفتح رای ہر دو مع اسکان مابعد ہے، یہی قراءت ابوعمرو سے بھی مروی ہے۔ طلحہ بن مصرف نے "ويدعونا" ایک نون سے پڑھا ہے۔[1]

مختار میں کہا ہے کہ "رغب و رهب" دونوں بابِ طرب سے ہیں۔[2] امام ابوالسعود رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مبادرت کرتے ہیں وجوہِ خیرات میں باوجود ثبات و استقرار کے۔ اصل خیر میں یہی بھید ہے کہ کلمہ "في" کو کلمہ "إلیٰ" پر اختیار کیا ہے، کیوں کہ "إلیٰ" سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ اصل خیرات سے خارج ہیں اور اس کی

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٧) [2] مختار الصحاح (١/ ٢٦٧)

طرف متوجہ ہیں، جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] ''اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو۔'' اور یہ امر خلافِ مقصود تھا۔

﴿ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ حالتِ راحت و شدت میں ہماری طرف تضرع و زاری کرتے ہیں۔[1] یا رغبت سے مراد سیدھے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اُٹھانا ہے اور رہبت سے مراد الٹے ہاتھوں کو اُٹھانا ہے، جیسا کہ امام ابن مردویہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے اس آیت کا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « رَغَبًا هٰكَذَا وَرَهَبًا هٰكَذَا » اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلایا،[2] یعنی اُن کے بیرونی حصے کو رغبت کے بیان میں زمین کی طرف کیا اور اس کا اُلٹ رہبت میں فرمایا، یعنی ہتھیلیوں کے اندرونی حصے کو زمین کی طرف کیا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن جریج رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ﴿ رَغَبًا ﴾ اللہ کی رحمت میں اور ﴿ رَهَبًا ﴾ اللہ کے عذاب سے۔[3] پھر اللہ پاک نے دسواں قصہ مریم علیہا السلام اور اُن کے فرزندِ ارجمند کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلیِ خاطر کے واسطے بیان کیا، پس ارشاد فرمایا:

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور اس عورت کو (یاد کریں) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی، اور اسے اور اس کے بیٹے (عیسیٰ) کو اہلِ عالم کے لیے (عظیم) نشانی بنا دیا (91)

عیسیٰ و مریم علیہما السلام کا ذکر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مریم علیہا السلام اور اُن کے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کو زکریا علیہ السلام اور اُن کے فرزند یحییٰ علیہ السلام کے قصے کے ساتھ اسی طرح ملا کر ذکر کیا کرتا ہے۔ پہلے تو زکریا علیہ السلام کا قصہ بیان فرماتا ہے، پھر اس کے بعد مریم علیہا السلام کا قصہ ذکر کرتا ہے، اس لیے کہ وہ قصہ اس قصے سے مربوط ہے، کیوں کہ پہلے قصے میں لڑکے کا بڑے بوڑھے اور نہایت عمر رسیدہ مرد اور بانجھ عورت سے جو اپنی جوانی کی عمر میں بھی بچہ نہیں جنتی تھی، لڑکے کا پیدا کرنا۔ پھر مریم علیہا السلام کا قصہ ذکر کرتا ہے، یہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے، کیوں کہ اس میں صرف عورت سے بچے کا پیدا کرنا ہے بغیر مرد کے۔ اسی طرح سورت آل عمران[4] میں اور سورت مریم[5] میں واقع ہوا ہے اور یہاں زکریا علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا ہے، پھر اس کے بعد مریم علیہا السلام کا قصہ یوں بیان فرمایا ہے: ﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ اس سے مراد مریم علیہا السلام

---

[1] تفسير أبي السعود (٦/ ٨٣) [2] فتح القدير (٣/ ٥٨٣) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٥٢١)
[4] رقم الآية (٣٦) [5] رقم الآية (١٦)

ہیں، جیسا کہ سورۃ التحریم میں کہا ہے: ﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ [التحریم: ۱۲] ''(اور مثال بیان فرمائی) مریم بنت عمران کی، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس (کے گریبان) میں اپنی روح پھونکی۔'' آیت سے مراد دلالت ہے، یعنی ہم نے مریم علیہا السلام اور اس کے فرزند کو دلالت ٹھہرایا ہے؛ اس بات پر کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور وہ پیدا کرتا ہے، جو چاہتا ہے: ﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [یٰس: ۸۲] ''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔'' نیز یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [مریم: ۲۱] ''تا کہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔''

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ لِلْعٰلَمِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ مراد جن و انسان ہیں۔[1] ﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ اس میں تین وجہیں ہیں: یا تو معطوف ہے ماقبل پر، یا منصوب ہے باضمارِ ''اذکر''، یا مرفوع ہے بابتدا، اور خبر محذوف ہے، یعنی ''فيما يتلى عليكم التي أحصنت'' اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خبر ﴿ فَنَفَخْنَا ﴾ ہو۔ رہی زیادتی حرفِ فا کی خبر میں، لہٰذا یہ اخفش کی رائے پر ہے، جیسے: ''زيد فقائم'' (ذکرہ السمین) احصانِ فرج سے یہ مراد ہے کہ اپنی شرم گاہ کو اس سے بچایا کہ کوئی اس تک حلال یا حرام طریقے سے پہنچے، یعنی پورے طور پر اس کی حفاظت کی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے ایسا ہی کہا ہے۔[2] جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴾ [مریم: ۲۰] ''جب کہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہی ہوں۔'' کسی نے کہا ہے کہ حلال کا ذکر نہ چاہیے، کیوں کہ نکاح تو پرانی شریعتوں میں بھی سنت تھا، پس اس کے ترک کو فضیلت کا منشا ٹھہرانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ قول کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ تبتل اور ترہب اُن کی شریعت میں تھا، پھر منسوخ ہوگیا اور اگر مان بھی لیا جائے تو یہاں حلال کا ذکر کرنا لازم ہے، تا کہ اُن کی ولادت خارقِ عادت (معجزہ) ہو جائے۔ مریم علیہا السلام کا ذکر جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا، گو وہ اُن میں سے نہیں ہیں، لہٰذا اُن کا ذکر عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے کیا اور اس لیے کہ اُن کے قصے میں ایک کھلی نشانی ہے اللہ پاک کی قدرت پر۔

﴿ فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ چونکہ جسم میں روح پھونکنے سے مراد جسم کا زندہ کرنا ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ﴾ [الحجر: ۲۹] ''پھر جب میں اسے درست کرلوں اور اپنی روح سے اس میں پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ کرتے گر پڑنا۔'' یعنی میں نے اس کو زندہ کیا۔ تو آیتِ باب سے یہ بات سمجھی جاتی تھی کہ ہم نے مریم علیہا السلام کو زندہ کیا، حالانکہ اُن کا زندہ کرنا مراد نہیں ہے، اس لیے تقدیر کلام کی یہ ٹھہری: ''فنفخنا الروح في عيسىٰ''، معنی یہ ہوئے کہ زندہ کیا ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو مریم علیہا السلام کے پیٹ میں اس بنیاد

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۵۹) [2] تفسیر البیضاوي (٤/ ۱۰٦)

پر ﴿ فِيْهَا ﴾ حال ہوگا مفعول محذوف سے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیوں کہ مفعول اس وجہ سے ہیں کہ معنی یہ ہیں: "أَحْيَيْنَا عِيسَىٰ كَائِنًا فِيْ جَوْفِ مَرْيَمَ" پس روح سے مراد روحِ انسان ہے، جو کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے امر سے ہے اور عیسیٰ علیہ السلام میں روح پھونکنے سے مراد ان کے بدن میں روح کا داخل کرنا ہے، اس میں تشبیہ ہے، مثلاً کوئی شخص کسی شے میں پھونکتا ہے، لہٰذا بدن میں روح کے وارد کرنے کو اس شخص کے پھونکنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

پس اس صورت میں "نفخنا" استعارۂ تبعیہ ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معنی یہ ہوں: "فعلنا النفخ في مريم من جهة روحنا الذي هو جبريل" یعنی ہم نے پھونکا مریم میں ہماری روح کی جہت سے جو کہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس معنی کی بنیاد پر "نفخ" سے مراد بدن میں روح کا وارد کرنا نہ ہوگا، بلکہ اس سے مراد اس کے حقیقی معنی ہوں گے اور "نفخنا" بہ منزلۂ لازم کے ٹھہرے گا اور "نفخ" کی نسبت اللہ پاک کی طرف ایسے ہوگی، جیسے فعل کی نسبت حکم کرنے والے کی طرف ہوتی ہے، کیوں کہ جبریل علیہ السلام ہی نے مریم علیہا السلام کے کُرتے میں اللہ پاک کے حکم سے پھونکا، پھر اس پھونکنے کا اثر مریم علیہا السلام کی طرف پہنچ گیا تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوگئیں یا یہ مراد ہے: "فنفخنا فيها بعض روحنا" یعنی ہم نے پھونکی مریم میں بعض روح ہماری، یعنی بعض ارواح، جو ہماری مخلوق ہیں اور وہ بعض روح عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیوں کہ وہ روح ہوا میں پہنچی، کونسی ہوا؟ جس کو مریم علیہا السلام کے رحم کی طرف پھونکا۔ امام محلی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ فِيْهَا ﴾ میں دو مضاف محذوف ہیں "في جيب درعها" اور روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔[1] یعنی مریم علیہا السلام کے کُرتے کی جیب میں، جبریل علیہ السلام نے پھونکا اور فرج سے مراد جیب (گریبان) ہے۔

غرضیکہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہو یا عیسیٰ علیہ السلام دونوں صورتوں میں روح کی اضافت اللہ پاک کی طرف دونوں کی تشریف اور تعظیم کے لیے ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا کہ "نفخنا" سے مراد "أجرينا فيها روح المسيح" ہے،[2] یعنی ہم نے جاری کی مریم علیہا السلام میں روح مسیح علیہ السلام کی۔ فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے: "أحصنت" کے معنی "عفت" ہیں، یعنی مریم علیہا السلام عفیف و پارسا تھیں، فاحشہ وغیرہ سے باز رہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ فرج سے مراد جیب ہے کُرتے کی، یعنی وہ پاک لباس پاک دامن تھیں، یعنی انھوں نے اپنے کرتے کی جیب کو محفوظ رکھا، جب اس کو بچایا تو اس کے ماسوا کو تو بہت ہی محفوظ ومصون رکھا۔ ﴿ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ ﴿ اٰيَةً ﴾ مفعول ثانی ہے "جعلنا" کا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ آیت ان دونوں میں ایک ہے، کیوں کہ مریم علیہا السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر مرد کے جنا،[4] یعنی اس جگہ آیتین نہ فرمایا، جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ ﴾ [بني إسرائيل: ١٢] "اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔"

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٢٩)
[2] تفسير النسفي (٣/ ٩٠)
[3] فتح القدير (٣/ ٥٨١) فتح البيان (٨/ ٣٦٩)
[4] معاني القرآن (٣/ ٤٠٤)

وجہ اس کی یہ ہے کہ اُن دونوں کا حال مجموعی طور پر ایک ہی آیت ہے، وہ یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر مرد کے جناء، یا تقدیر یہ ہے کہ "جَعَلْنَاهَا آيَةً وَابْنَهَا آيَةً" پس ﴿ اٰيَةً ﴾ مفعول ہے معطوف علیہ کا اور دوسری آیت کو اس کے قرینے سے حذف کر دیا، یا محذوف آیت اول ہے اور آیت مذکور واسطے ابن کے ہے اور جس شخص نے یہاں "آیتین" پڑھا ہے، وہ قراءت اس پر دال ہے، یہ تقدیر مثل اس آیت کے ہے: ﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ [التوبة: ٦٢] "حالاں کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ انھیں راضی رکھیں۔" معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان دونوں کے قصے کو ایک پوری نشانی ٹھہرایا ہے، تکاثرِ آیات کے باوجود جو اُن میں سے ہر ایک کے بارے میں ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ آیت سے مراد جنس ہے، ہر ایک کی نشانیوں کو شامل ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے دس قصے انبیا علیہم السلام کے ذکر فرمائے، تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو تبلیغِ رسالت پر قوت ہو اور آپ کو تسلی ہو جائے کہ کچھ آپ ہی معاندین کو دعوت دینے کے لیے پہلے پہل مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ آپ سے پہلے رسالت کا سلسلہ برابر چلا آیا ہے۔ بہت سے رسول و انبیا علیہم السلام مبعوث ہوئے، اپنی قوموں کو توحید کی طرف بلایا، قوم نے طرح طرح کی ایذا دی، اس پر صبر کیا، اپنا کام کرتے رہے، پھر جس نے نہ مانا، کفر پر جما رہا، اس پر عذاب آیا، ہلاک ہو گیا اور رسول محفوظ رہے، جب اللہ تعالیٰ ان قصوں سے فارغ ہوا تو سارے لوگوں کو مخاطب کر کے یوں ارشاد فرمایا:

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾
وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ
مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ
كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾

بلاشبہ یہ تمھارا دین ایک ہی دین ہے اور میں تمھارا رب ہوں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو (92) اور انھوں نے اپنا معاملہ باہم ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، (بالآخر) سب ہماری ہی طرف لوٹیں گے (93) چناں چہ جو بھی نیک عمل کرے اور وہ مومن (بھی) ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی اور بے شک ہم اس کے لیے (اس کے اعمال) لکھنے والے ہیں (94)

تمام لوگ ایک ہی امت ہیں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، سعید بن جبیر، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ نے ﴿ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمھارا دین ایک دین ہے۔[1] امام حسن بصری رحمہ اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٢٣)

نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے واسطے وہ شے بیان فرماتا ہے جس سے بچیں اور وہ شے جس کو کریں۔ پھر کہا کہ اس سے مراد "سنتكم سنة واحدة" ہے، یعنی اُمت سے مراد طریقہ ہے، تمھارا طریقہ ایک طریقہ ہے۔ ﴿ هٰذِهٖۤ ﴾ اسم ہے ﴿ اِنَّ ﴾ کا اور ﴿ اُمَّتُكُمْ ﴾ خبر ہے ﴿ اِنَّ ﴾ کی، یعنی یہ تمھاری شریعت ہے، جو تمھارے واسطے بیان کی گئی اور تمھارے لیے واضح ہوئی اور ﴿ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ منصوب ہے بنا بر حال اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴾، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ٥١۔ ٥٢] "(فرمایا:) اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو میں اسے خوب جانتا ہوں۔ اور بلاشبہہ یہ تمھارا دین ایک ہی دین ہے، اور میں تمھارا رب ہوں، لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو۔" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ہم گروہِ انبیا علیہم السلام اولادِ علّات ہیں، دین ہمارا ایک ہے۔[1] یعنی مقصود اللہ واحد لا شریک لہ کی عبادت ہے، شریعتوں کی انواع و اقسام کے ساتھ، جو کہ اللہ کے پیغمبروں کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾ [المائدة: ٤٨] "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور طریقہ بنایا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی اُمتوں نے باہم اپنے پیغمبروں پر اختلاف کیا، لہٰذا کسی نے تو ان کی تصدیق کی اور کسی نے ان کو جھٹلایا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾ یعنی اس کا دل تصدیق کرنے والا ہے اور اس نے نیک کام کیا۔ ﴿ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴾ [الكهف: ٣٠] "یقیناً ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جس نے اچھا عمل کیا۔" سعی سے مراد عمل ہے، یعنی اس کا عمل ضائع نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کی سعی مشکور ہوگی، پھر وہ ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور اسی واسطے فرمایا: ﴿ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴾ یعنی اس کا عمل لکھا جائے گا، اس میں سے اس کا کچھ ضائع نہ ہوگا۔[2] (كذا في ابن كثير)

امت سے مراد ملت و دین ہے، جیسا کہ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] اصل میں اُمت اس قوم کو کہتے ہیں جو ایک دین پر مجتمع ہو، پھر اس میں وسعت کی گئی تو جس دین و ملت پر وہ مجتمع ہوئے، اس پر اُمت کا اطلاق کیا گیا۔ اشتقاق امت کا "أَمَّ" بہ معنی "قصد" سے ہے۔ پس قوم تو جماعتِ قاصدہ ہوئی اور جس پر وہ مجتمع ہوئے وہ ملتِ مقصودہ ٹھہری۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ ﴾ [الزخرف: ٢٢] "بلاشبہہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا۔" یعنی "على دين وملة"۔

﴿ هٰذِهٖۤ ﴾ اشارہ ہے ملتِ توحید یا اسلام کی طرف اور ﴿ اُمَّتُكُمْ ﴾ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کے زمانے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٥٩۔ ٢٦٠) [3] فتح القدير (٣/ ٥٨١)

کے لوگوں کو۔ جمہور نے ﴿ اُمَّتُكُمْ ﴾ کو مرفوع پڑھا ہے، اُن کی خبر ہونے کی بنا پر اور ﴿ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ منصوب ہے بنا برحال پہلی امت سے، یا بدل ہے ﴿ هٰذِهٖٓ ﴾ سے، اس صورت میں خبر کے ساتھ فصل ہوگی درمیان بدل و مبدل منہ کے، جیسے "إن زيدا قائم أخاك"، یعنی یہ ملتِ اسلام جو سارے نبیوں کی ملت ہے۔ اے مخاطب لوگو! وہ تمھاری ملت و دین ہے، تم پر واجب ہے کہ تم اس پر ہوؤ، پس تم اس پر قائم ہو۔ درآنحالیکہ وہ ایک ہی ملت ہے درمیان انبیا علیہم السلام کے، اس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں اور نہ صحتِ اتباع میں اس کے غیر کو کوئی مشارکت ہے، کسی طرح اس سے منحرف مت ہوؤ۔ حال میں عامل معنی اشارہ ہیں، یعنی "أشير إليها يا يشار إليها ملة واحدة غير مختلف فيها"۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دین کے سوا کوئی دین نہیں ہے نہ میرے سوا کوئی رب ہے، میں ہی عبادت کا مستحق ہوں تو تم مجھی کو پوجو، یا یہ معنی ہیں کہ یہ دین تمھارا ایک دین ہے درمیان مختلف اُمتوں کے۔

توحید میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے اور اس دین سے نکلتے نہیں ہیں مگر کافر، جو کہ اللہ پاک کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہ شریعت، جس کو میں نے تمھارے واسطے بیان کیا تمھاری کتاب میں، ایک شریعت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے ﴿ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتَكُمْ ﴾ بہ نصب پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ اسم ﴿ اِنَّ ﴾ یعنی ﴿ هٰذِهٖٓ ﴾ سے بدل ہے یا اس کا عطفِ بیان ہے اور خبر ﴿ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ ہے۔[1] کسی نے ﴿ اُمَّتُكُمْ ﴾ اور ﴿ اُمَّةٌ وَّاحِدَةٌ ﴾ کو رفع سے پڑھا ہے اس بنا پر کہ دونوں خبریں ہیں اُن کی۔ کسی نے مبتدائے محذوف کی خبر کہا ہے، یعنی "هي أمة واحدة" و قال الفراء و الزجاج على القطع بسبب مجيئ النكرة بعد تمام الكلام[2] ﴿ وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ یعنی خاص میں ہی تمھارا رب ہوں، مجھی کو پوجو، میرے غیر کی پوجا مت کرو، کوئی بھی ہو۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کیا خوب فرمایا ہے: "ربيتكم اختيارا فاعبدوني شكرا و افتخارا"[3] یعنی میں نے تمھاری پرورش کی اپنے اختیار سے، لہٰذا تم مجھے شکر اور افتخار کے واسطے پوجو اور خطاب سب لوگوں کو ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ کے معنی "وحدون" لکھے ہیں۔[4]

﴿ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ﴾ تقطع، پارہ پارہ و بخش بخش شدن و کردن، لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے، یعنی دین میں متفرق فرقے ہو گئے، یہاں تک کہ متفرق ٹکڑوں کی طرح بن گئے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا کہ دین میں اختلاف کیا[5] یہ مثل اول قول کے ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنے دین کے کام کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور فرقے فرقے ہو گئے۔[6] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ تَقَطَّعُوْٓا ﴾ سے بعض مخاطبین مراد ہیں۔ ﴿ اَمْرَهُمْ

---

(1) روح المعاني (١٧/ ٨٩۔ ٩٠) (2) تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٩) (3) تفسير النسفي (٣/ ٩٠)
(4) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠) (5) تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٩) (6) تفسير النسفي (٣/ ٩١)

﴿ بَيْنَهُمْ ﴾ أي تفرقوا أمر دينهم متخالفين فيه"[1] یعنی انھوں نے اپنے دین کے کام کو اس میں باہم اختلاف کر کے متفرق کر دیا اور یہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا کہ تفرق سے مراد تفریق ہے، اس طریقے سے کہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کے منکر ہوئے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ﴿ اَمْرَهُمْ ﴾ میں تین وجہیں ذکر کی ہیں: ایک یہ ہے کہ بحذفِ حرف جر منصوب ہے: "أي تفرقوا في دينهم" امام ازہری رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[2] دوسری یہ ہے کہ مفعول بہ ہے۔ رہا تعدیہ ﴿ تَقَطَّعُوْٓا ﴾ کا طرف اس کے سو اس لیے ہے کہ بہ معنی "قطعوا" ہے۔ تیسری یہ ہے کہ تمیز ہے۔ یہ وجہ ازروئے معنی واضح نہیں ہے اور نیز ﴿ اَمْرَهُمْ ﴾ معرفہ ہے، صناعتِ بصریین کی جہت سے اس کا تمیز ہونا صحیح نہیں ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے یوں کہا کہ "وقيل هو تمييز أي تقطع أمرهم"[3] پس اس تمیز کو فاعل سے منقول ٹھہرایا۔ فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے کہ آیت سے مقصود مشرک لوگ ہیں، اللہ پاک نے ان کی مذمت فرمائی اس بات پر کہ انھوں نے حق کی مخالفت کی اور اللہ کے سوا اور معبود ٹھہرائے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ساری خلق ہے، انھوں نے اپنے دینوں میں اپنے کام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور آپس میں اس کے حصے بخرے کر لیے تو کوئی موحد ہے، کوئی یہودی ہے، کوئی نصرانی، کوئی مجوسی، کوئی بت پرست۔[4]

رہی یہ بات کہ اصل کلام "و تقطعتم و تفرقتم" ہے، کیونکہ اوپر سے خطاب چلا آتا ہے، لہٰذا یہاں خطاب سے غیبت کی طرف التفات کیا، یعنی صیغۂ غائب استعمال کیا، التفات کا نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو دین کو بگاڑ ڈالا، اس لیے وہ قابلِ خطاب نہ رہے، اُن سے بات پھیر کر دوسروں کی طرف التفات کیا، گویا اللہ پاک دوسروں کی طرف متوجہ ہو کے اُن کے فعلِ بد کی خبر دیتا ہے اور اُن پر تشنیع کرتا ہے اور اُن کے فعل کو دوسروں کے نزدیک قبیح کر دکھاتا ہے اور اُن سے یوں فرماتا ہے: کیوں جی کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ لوگ کیسے بڑے برے کام کے مرتکب ہوئے ہیں کہ انھوں نے اپنے دین کے کام کو باہم ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ لہٰذا ہر گروہ کو دین کا ایک ایک ٹکڑا پہنچا، پھر وہ تقطع دین کے سبب سے ایسے ہو گئے، جیسے متفرق ٹکڑے ہوتے ہیں، بعض بعض کو لعنت کرتا ہے اور بعض بعض سے بے زار ہوتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان مختلف فرقوں کو یہ وعید سنائی: ﴿ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴾ جو اپنے دینِ حق پر ثابت رہا اور جو اس سے مائل ہو کر غیرِ حق کی طرف گیا، وہ سب کے سب اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جائیں گے، پھر وہ اُن سے حساب لے گا اور اُن کے اعمال کی جزا دے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل اکہتر فرقے ہو گئے، لہٰذا ستر ہلاک ہوئے اور ایک نے نجات پائی اور میری اُمت بہتر فرقے ہو گی اکہتر فرقے ہلاک ہوں گے اور ایک فرقہ خلاصی پائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون سا فرقہ ہے؟ فرمایا: جماعت۔[5] اس سے مراد

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٣٣٩)

[3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٦) [4] فتح القدير (٣/ ٥٨١) فتح البيان (٨/ ٣٧٠)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٤)

وہی جماعتِ معہود ہے، جو اس کے ساتھ چمٹی رہتی ہے، جو اللہ اور رسول نے بیان کیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے کچھ نہیں ملاتے۔ بعض نے اس حدیث کی صحت میں اس طرح اعتراض کیا ہے کہ اگر بہتر فرقوں سے مراد اصولِ ادیان ہیں تو وہ اس قدر کو نہیں پہنچے، امام نے اس کے جواب میں یوں کہا ہے کہ ﴿ سَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي ﴾ سے مراد یہ ہے کہ کسی حال میں ہوں گے، اس میں اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ تمام حالات میں اُمت کے فرقے اتنی ہی تعداد میں ہوں گے کہ اس سے زیادہ اور کم نہ ہوں۔

نکتہ:

اس جگہ تو ﴿ فَاعْبُدُوْنِ ﴿92﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا ﴾ فرمایا اور سورۃ المومنون میں ﴿ فَاتَّقُوْنِ ﴿52﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا ﴾ آیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں کفار کو خطاب ہے، اس لیے اُن کو عبادت کا امر فرمایا ہے، جس سے مراد توحید ہے۔ پھر ﴿ وَتَقَطَّعُوْٓا ﴾ واؤ کے ساتھ کہا، اس لیے کہ تقطع ان سے ہو چکا ہے قبل اس کے کہ ان سے ﴿ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ کہا اور جس شخص نے ﴿ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ کا خطاب مومنوں کے واسطے قرار دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عبادت پر مداومت کرو، کیوں کہ وہ تو مومن موحد ہیں اور سورۃ المومنون میں نبی اکرم ﷺ اور مومنین کو خطاب ہے۔ بدلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ [المؤمنون: ٥١] ''(فرمایا:) اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ'' اور انبیا و مومنین مامور بتقویٰ ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ﴾ [المؤمنون: ٥٣] یعنی ﴿ فَاتَّقُوْنِ ﴾ کہنے کے بعد ان سے تقطع ظاہر ہوا اور اس سے مراد اُن کی اُمتیں ہیں۔ (ذكره الكرخي) غرضیکہ پھر اللہ پاک نے پوری جزا دینے کی تفصیل فرمائی۔

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے یا تبعیضیہ ہے اور ﴿ اَلصّٰلِحٰتِ ﴾ سے مراد فرائض اور نوافل ہیں، یعنی پھر جو شخص اعمالِ صالح کرے گا، یا اُن میں سے بعض نیک کام بجا لائے گا اور حال یہ ہے کہ اللہ و رسول و یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہوگا تو اس کی سعی کے واسطے کسی طرح کا ضائع کرنا نہ ہوگا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ جو شخص نیک کاموں میں سے کچھ کرے گا اور وہ ایمان رکھتا ہوگا، اس شے پر جس پر ایمان واجب ہے تو بے شک اس کی سعی مشکور و مقبول ہوگی۔[1]

اس معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ نسفی کے نزدیک ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے، کیوں کہ کل اعمالِ صالح کے بجا لانے کی کوئی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سعی کا انکار اور ابطال نہ کیا جائے گا، بلکہ مشکور ہوگی اور اس پر ثواب دیا جائے گا۔[2] کفران مصدر ہے، بہ معنی کفر۔ کفر ضد ہے، ایمان کی اور کفر نعمت کے انکار کو بھی

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩١) [2] تفسير الخازن (٤/ ٣٢١)

کہتے ہیں: یہ کفر ضد ہے شکر کی۔ محاورے میں بولتے ہیں: "كفر كفورا و كفرانا"۔ منع ثواب کو تشبیہ دی کفر وجود سے، پھر اس پر کفر کا اطلاق کیا، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ﴾ [آل عمران: ۱۱۵] "اور وہ جو بھی بھلائی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔"

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ثواب عمل کے واسطے کسی طرح کا بطلان نہ ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۹] "اور جو آخرت چاہے اور اس کے لیے پوری پوری سعی کرے، جب کہ وہ مومن ہو، تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی قابل قدر ہے۔" پس کفران ثواب سے محرومی کی طرح ہے اور شکر مثل ہے اعطائے ثواب میں۔ اور ﴿ فَلَا كُفْرَانَ ﴾ میں جنس کی نفی مبالغے کے لیے ہے، یعنی مکلفین کے جزا دینے اور اُن کے اعمال پر ثواب عطا کرنے اور ثواب سے محروم رکھنے میں اللہ پاک کے سوا اور کوئی اس میں سے کسی شے کا متولی اور مالک نہ ہوگا۔ وہی خود یہ سب کچھ کرے گا، کیوں کہ وہ ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ "بدلے کے دن (قیامت) کا مالک ہے۔" ہے۔ لہٰذا ظاہر یہ تھا کہ یوں کہتا: "فلا نكفر سعيه" مگر اس طرح نہ کہا، بلکہ جنس کفران کی نفی کی مبالغے کے لیے، کیوں کہ ماہیت اور حقیقت کی نفی سے اس کے جمیع افراد کی نفی لازم آتی ہے، پس نفی کو نفیِ جنس کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہے، جیسے مطلوب کو دلیل سے ثابت کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ پاک خود اس کام کا متولی ہوگا تو نہ کسی کی ذرہ برابر نیکی ضائع ہوگی اور نہ کسی کی بدی میں ذرہ برابر زیادتی ہوگی۔ پوری پوری جزا سزا ہوگی اور کیوں کر نہ ہو۔

﴿ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴾۔ ﴿ لَهٗ ﴾ کی ضمیر سعی کی طرف راجع ہے یا طرف ﴿ مَنْ ﴾ کے، یعنی ہم تو اس کی سعی کے لکھنے والے ہیں، یعنی اس کے نامۂ اعمال میں ثابت کرنے والے ہیں، ہم کسی طرح ضائع نہ کریں گے۔ مراد یہ ہے کہ ہم اس کے نگہبان ہیں، اس طریقے سے کہ ہم ملائکہ حافظین کراماً کاتبین کو اس کے لکھنے کا حکم دیتے ہیں، وہ ذرہ ذرہ لکھتے جاتے ہیں۔ پھر ہم اس پر جزا دیں گے، اسی کے مثل اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ﴾ [آل عمران: ۱۹۵] "کہ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت۔" ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے "فلا كفر لسعيه" پڑھا ہے۔[1]

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ ... الخ ﴾ کی حسن ادا اور بلاغت پر غور کرنا چاہیے کہ اول تو کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ عام فرمایا، اس میں مرد عورت غلام لونڈی امیر فقیر عالم جاہل سب شامل ہیں۔ پھر ﴿ مِنَ الصّٰلِحٰتِ ﴾ فرمایا۔ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ اس لیے کہ نیک کام بے حساب ہیں، فرض علاحدہ ہیں اور نوافل وسنن و مستحبات علاحدہ، پھر بعضے عبادات ہیں بعض معاملات، بعض اپنی ذات سے متعلق ہیں، بعض دوسروں سے، بعض بدنی ہیں، بعض مالی اور عملِ صالح وہ ہے کہ

[1] تفسير القرطبي (۱۱/ ۳۳۹)

سنت کے مطابق اور ریا اور دکھاوے سے پاک صاف ہو۔ پھر ﴿ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾ کی قید ذکر فرمائی اور جملہ حالیہ کو بصیغہ جملۂ اسمیہ ثبوت و استمرار کے واسطے ذکر فرمایا۔ غرض اس سے یہ ہے کہ عملِ صالح میں ایمان کی قید ضرور ہے، کیوں کہ جو عمل ایمان کے بغیر ہے، وہ حقیقت میں صالح ہی نہیں ہے، غرضیکہ جو کوئی کسی طرح کا نیک کام کرے اور ایمان اس کے ساتھ ہو اور ثواب ملنے کا اعتقاد اور یقین اس کے ساتھ ہو اور پورا پورا عمل کے ختم ہونے تک برابر رہے تو اس کی جزا یہ فرمائی کہ ﴿ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ مطلب اسی قدر ہے کہ اس کا عمل ضائع نہ جائے گا، اس پر ثواب ملے گا۔ یہ مضمون یوں ادا ہوسکتا تھا کہ "نجزیه" یا "لا نضیع عمله" یا "لا نکفر عمله" مگر ان سب کو چھوڑ کر ﴿ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ فرمایا، اس کی خوبی کو سمجھنا چاہیے کہ اس میں کس قدر مبالغہ ہے۔ اول یہ کہ کفر و کفور و کفران، تینوں ہم معنی ہیں، دو کو چھوڑا، تیسرے کو لیا، کیوں کہ کفر ثلاثی مجرد، کفور رباعی، کفران خماسی سب سے بڑھ کر انکار کے معنی اس میں ہیں، کیوں کہ زیادتی لفظ کی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، پھر اس لانفی جنس کا ذکر کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مبالغہ تو نفی مصدر کا ہوا، دوسرا خاص لفظ کفران کی نفی کی۔ تیسرا، نفی جنس کی لا کے ساتھ نفی کی۔ پھر لفظ "سعی" کا ذکر کیا، اس کے معنی عمل کے ہیں، مگر اس میں اتنی زیادتی ہے کہ سعی وہ عمل ہے، جس میں خوب محنت و مشقت کی جائے۔ اس میں اشارہ ہے کہ نیک کام میں خوب سعی و کوشش کرنی چاہیے، کیوں کہ اس کا ثواب اسی کے موافق ملے گا۔ پھر اگر یہ وہم ہو کہ شاید ﴿ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ مبالغے کے لیے فرمایا ہو، حقیقت مراد نہ ہو، اس لیے یہ فرمایا: ﴿ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴾ یعنی ہم اس عمل کو لکھتے ہیں، کسی طرح اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی، پورا بدلہ ملے گا۔ بھلا جب اللہ پاک خود اس کو لکھے، اس میں کیا کمی کا احتمال ہے، اس وقت جو خوبی کلام پاک کی رائے ناقص میں آئی، وہ لکھ دی گئی، اس کے کلام کی خوبیاں طاقتِ بشری سے خارج ہیں، جو اس تقریر میں اچھائی ہے، وہ اس کی طرف سے ہے اور جو خطا ہے میری طرف سے ہے، اللہ پاک اس سے درگزر فرمائے۔ آمین

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾

اور ہر بستی جسے ہم نے ہلاک کیا ہے، اس پر لازم ہے کہ بلاشبہ وہ (اس کے باشندے دنیا کی طرف) نہیں لوٹیں گے (95) حتی کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے (دوڑتے)

آ ئیں گے (96) اور سچا وعدہ (یومِ قیامت) قریب آ پہنچے گا، تب کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، (اور وہ کہیں گے:) ہائے ہماری کم بختی! ہم اس (وعدے) سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم ہی ظالم تھے (97)

دنیا سے چلے جانے والا کبھی واپس نہیں آئے گا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حرام کے معنی ''وَجَبَ'' ہیں، یعنی یہ بات مقدر ہو چکی ہے کہ ہر بستی والے، جو ہلاک کیے گئے، وہ قیامت سے پہلے دنیا کی طرف رجوع نہ کریں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو جعفر باقر، قتادہ رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں نے اسی طرح اس کی تصریح کی ہے۔ دوسری روایت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ﴿ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ کے معنی ''لا یتوبون'' ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قولِ اول ظاہر تر ہے۔[1] واللّٰہ أعلم۔ فتح القدیر میں اس طرح ہے کہ امام فریابی، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ نے شعب میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ واجب ہوا ہلاک کرنا اس کا۔ ﴿ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ فرمایا توبہ نہ کریں گے۔

امام سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ یوں پڑھتے تھے: ''وَحَرُمَ عَلٰی قَرْیَةٍ'' فرمایا: ''وَجَبَ عَلٰی قَرْیَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ'' جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ [یٰس: ۳۱] ''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اُمتیں ہلاک کر دیں؟ بے شک وہ ان کے پاس نہیں لوٹیں گی۔'' عبد بن حمید نے عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ سے بھی اسی کے مثل روایت کیا ہے۔[2] انتهى.

یاجوج و ماجوج کا ذکر:

﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ ﴾ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ یاجوج و ماجوج سُلالہ آدم علیہ السلام سے ہیں، بلکہ نوح علیہ السلام کی نسل سے بھی ہیں، یافث ابو الترک کی اولاد سے۔ ترک انھیں میں سے ایک گروہ ہے، سَدّ سے ورے چھوڑ دیے گئے، جس کو ذوالقرنین نے بنایا تھا اور کہا: ﴿ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا (98) وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴾ [الکھف: ۹۸۔ ۹۹] ''یہ میرے رب کی طرف سے رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا تو وہ اسے ہموار کر دے گا، اور میرے رب کا وعدہ حق ہے۔ اور اس روز ہم ان کے کچھ کو چھوڑ دیں گے، وہ دوسروں میں گھس جائیں گے، اور صور میں پھونکا جائے گا، پھر ہم ان (سب) کو جمع کریں گے جمع کرنا۔'' اور اس

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۵۲۵) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲٦۰) · [2] فتح القدیر (۳/ ۵۸۳)

آیتِ کریمہ میں اس طرح فرمایا ہے: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴾ یعنی فساد کی طرف چلنے میں جلدی کریں گے۔ زمین سے اونچی جگہ کو حدب کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، ابوصالح اور ثوری رحمہ اللہ وغیرہم نے یہی کہا ہے۔[1]

فتح القدیر میں کہا ہے کہ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا ہے: "شَرَفٍ" یعنی بلندی۔ ﴿ يَنْسِلُوْنَ ﴾ فرمایا: "یقبلون" یعنی ہر بلندی سے چلے آتے ہوں گے۔[2] انتھٰی۔ جس وقت وہ نکلیں گے، یہ اس وقت کی صفت ہے، گویا سامع اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ﴿ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ [الفاطر: ١٤] "اور کوئی آپ کو خوب باخبر (اللہ) کے مانند خبر نہیں دے گا۔" جو ذات پاک ما کان وما یکون کا عالم ہے آسمان و زمین کے غیب کو جانتا ہے، یہ اس کی خبر دی ہوئی ہے لا الہ الا ھو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبیداللہ بن یزید رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بچوں کو دیکھا کہ بعض بعض پر چڑھ رہے تھے، کھیلتے تھے تو فرمایا کہ یاجوج و ماجوج اسی طرح نکلیں گے،[3] اُن کے نکلنے کے ذکر میں متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

پہلی حدیث:

یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے کہ کھول دیے جائیں گے یاجوج و ماجوج تو وہ لوگوں پر نکلیں گے، جیسا کہ اللہ عز وجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴾ پھر وہ لوگوں کو ڈھانک لیں گے اور مسلمان اُن سے علاحدہ ہو کر اپنے شہروں قلعوں کی طرف پناہ پکڑیں گے اور اپنے مویشیوں کو اپنے پاس جمع کر لیں گے اور یاجوج ماجوج زمین کے پانیوں کو پی جائیں گے، یہاں تک کہ ان میں کے بعض البتہ نہر پر گزریں گے تو جو کچھ اس میں ہوگا اسے پی جائیں گے، یہاں تک کہ اس کو خشک کر چھوڑیں گے، کوئی شخص اُن کے بعد اس نہر پر گزرے گا تو کہے گا: کبھی اس جگہ پانی تھا، یہاں تک کہ جس وقت لوگوں میں سے کوئی باقی نہ رہے گا، سوائے اس کے جو قلع یا شہر میں ہوگا تو یاجوج ماجوج میں سے کہنے والا کہے گا کہ یہ لوگ تو زمین والے تھے۔ لہٰذا ہم ان سے فارغ ہو چکے، آسمان والے باقی رہ گئے۔

فرمایا: پھر ان میں کا ایک شخص اپنی برچھی ہلائے گا، پھر اس کو آسمان کی طرف پھینک دے گا تو وہ خون میں رنگی ہوئی اس کی طرف لوٹ آئے گی، «لِلْبَلَاءِ وَالْفِتْنَةِ» یعنی یہ اس لیے ہوگا کہ اس سے ابتلاء اور امتحان منظور ہے۔ پھر وہ اس حالت پر ہوں گے کہ اللہ عزوجل اُن کی گردنوں میں کیڑے بھیجے گا ٹڈیوں کے کیڑوں کی طرح، جو اُن کی

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٣٢) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٦٠) [2] فتح القدیر (٣/ ٥٨٣۔ ٥٨٤) [3] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٢٨)

گردنوں میں نکلتے ہیں، پھر وہ صبح کو مردہ ہو جائیں گے، اُن کی کوئی آہٹ سنائی نہ دے گی تو مسلمان کہیں گے: « أَلَا رَجُلٌ يَّشْرِيْ لَنَا نَفْسَهُ » یعنی سنتے ہو، ہے کوئی شخص کہ ہمارے واسطے اپنی جان بیچے تو دیکھے کہ اُن دشمنوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ فرمایا: ایک شخص اُن میں سے اُترے گا، اپنی جان کا اجر طلب کر کے اس بات کا یقین کر کے کہ وہ مارا جائے گا، باہر نکلے گا تو وہ اُن کو پائے گا کہ مرے ہوئے ہیں، بعض بعض پر پڑے ہوئے ہیں تو وہ پکارے گا: کہ اے مسلمانوں کے گروہ! ہوشیار ہو جاؤ، خوش ہو جاؤ کہ اللہ عزوجل نے تمھارے دشمنوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنے شہروں اور قلعوں سے نکل آئیں گے اور اپنے مویشی چرنے کے لیے چھوڑ دیں گے، پھر اُن کا چارہ نہ ہوگا، مگر یاجوج ماجوج کا گوشت « فَتَشْكَرُ عَنْهُ كَأَحْسَنِ مَا شَكِرَتْ عَنْ شَيْءٍ مِنَ النَّبَاتِ أَصَابَتْهُ قَطُّ » یعنی پھر وہ گوشت کھا کر ایسے موٹے ہو جائیں گے کہ کبھی کسی چارے سے ایسے موٹے نہ ہوئے ہوں گے۔[1] و رواه ابن ماجه من حديث يونس بن بكير عن ابن إسحاق به.

دوسری حدیث:

امام احمد رحمہ اللہ نے جبیر بن نفیر حضرمی سے روایت کیا ہے، جبیر نے نواس بن سمعان کلابی رضی اللہ عنہ سے سنا، کہا کہ ایک صبح کو رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں اپنی آواز کو پست کیا اور بلند کیا، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے گوشے میں ہیں۔ (حدیث کے الفاظ « خَفَّضَ فِيْهِ وَرَفَّعَ فِيْهِ » یعنی اس کے حال میں جو آپ نے کلام کیا تو اس کی شدت سے اپنی آواز بلند کی۔ کسی نے کہا ہے کہ پست کی، یہ اس لیے کیا کہ اس کے حال کی ذلت منظور تھی اور آواز بلند کی اس کے فتنے کی شدت سے اور اس سے ڈرانے کے لیے۔) پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ دجال کے علاوہ جو فتنہ ہے، اس نے مجھ کو تمھاری طرف سے خائف کیا ہے، کیوں کہ دجال اگر نکلے گا اور میں تم میں موجود ہوا تو میں اس کا حجیج ہوں سوا تمھارے، یعنی میں اس سے جھگڑوں گا اور حجت ظاہر کر کے اس پر غالب ہوؤں گا اور اگر وہ نکلے گا اور میں تم میں نہ ہوا تو ہر شخص اپنے نفس کا حجیج ہے اور اللہ میرا خلیفہ ہے ہر مسلمان پر اور دجال ایک جوان جعد قطط ہے، یعنی اس کے بال بہت زیادہ گھنگریالے ہوں گے، یا پستہ قد موٹا ذرا ذرا سے اعضا ہوں گے، اس کی آنکھ طافیہ ہوگی، یعنی اپنی حد سے بڑھی ہوئی، یا ایسے ہوگی جیسے انگور کا دانہ اور دانوں سے نکلا ہوتا ہے۔ یا مثل حباب کے ہوگی، یعنی اُبھری ہوئی بے نور اور وہ نکلے گا اس راہ میں جو کہ شام اور عراق کے درمیان ہے۔ پھر وہ دائیں بائیں طرف فساد کرتا پھرے گا۔ اللہ کے بندو! تم ثابت قدم رہو۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! زمین میں اس کا ٹھہرنا کس قدر ہوگا؟ فرمایا: چالیس دن ایک دن مثل ایک برس کے اور ایک دن مثل ایک

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٩٣)

مہینے کے اور ایک دن مثل ایک جمعے کے، یعنی ہفتے کے برابر اور باقی دن اس کے تمھارے دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! پھر وہ دن جو ایک سال کے مثل ہوگا، کیا اس میں ایک دن رات کی نماز ہم کو کافی ہوگی؟ فرمایا نہیں، ﴿ اُقْدُرُوْا لَهُ قَدْرَهُ ﴾ یعنی تمھارے ایامِ معہود سے ایک دن کے مطابق اندازہ کرو اور اس میں اس کے اوقات کے اندازے کے مطابق نماز پڑھو۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کا زمین میں جلد پھرنا کس طرح ہوگا؟ فرمایا: ﴿ كَالْغَيْثِ اسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيْحُ ﴾ یعنی مثل بارش و بادل کے کہ ہوا اس کے پیچھے ہو جائے۔ فرمایا: پھر قبیلے پر گزرے گا، اُن کو اپنی طرف بلائے گا تو وہ اس کی دعوت قبول کر لیں گے، یعنی جو وہ کہے گا، اس کو مان لیں گے، پس وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ پانی برسا دے گا اور زمین کو تو وہ سبزہ اُگا دے گی اور اُن کے مویشی شام کو اُن کے پاس آئیں گے؛ ﴿ وَهِيَ أَطْوَلُ مَا كَانَتْ ذُرًا وَ أَمَدُّهُ خَوَاصِرَ وَأَسْبَغُهُ ضُرُوْعًا ﴾ یعنی اُن کے مویشی چراگاہ سے ایسے ہو کر آئیں گے کہ اُن کے کوہان کی بلندی پہلے سے زیادہ ہوگی اور اُن کی کوکھیں زیادہ تنی ہوئی ہوں گی اور تھن دودھ سے بھرپور ہوں گے اور ایک اور قبیلے پر سے گزرے گا؛ پھر اُن کو بلائے گا، وہ اس کی بات کو اس پر رد کر دیں گے، یعنی اس کا کہا نہ مانیں گے تو اُن کے اموال، یعنی مویشی اس کے پیچھے ہو لیں گے، پھر وہ قحط زدہ ہو جائیں گے، اُن کے مویشیوں میں سے اُن کے لیے کچھ نہ ہوگا۔

ویران جگہ پر گزرے گا تو اس سے کہے گا کہ تو اپنے خزانے نکال، پس اس کے خزانے اس کے پیچھے ہو جائیں گے۔ مہوک کے بادشاہوں کی طرح، یعنی جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے بادشاہ کے پیچھے دوڑتی ہیں، اسی طرح خزانے اس کے ساتھ دوڑیں گے۔ پھر ایک شخص کو حکم دے گا، وہ مار ڈالا جائے گا، پھر اس کو تلوار سے مارے گا۔ ﴿ فَيَقْطَعَهُ جَذْلَتَيْنِ رَمْيَةَ الْغَرَضِ ﴾ یعنی اس کے دو ٹکڑے کر دے گا اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا فاصلہ تیر پھینکنے کے نشانے تک ہوتا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ اس کو ایسی ضرب لگائے گا، جیسے تیر نشانے پر لگاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مارنے میں چوکے گا نہیں۔ پھر اس شخص کو بلائے گا، وہ اس کے پاس چلا آئے گا۔ پھر وہ اس حالت پر ہوں گے کہ اللہ عزوجل مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا تو وہ دمشق کے مشرقی جانب سفید منارہ کے نزدیک اُتریں گے۔ دو زرد کپڑوں میں، اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے۔ پھر مسیح علیہ السلام اس کے پیچھے جائیں گے تو اس کو پا لیں گے۔ (اصل لفظ یہ ہے: ﴿ بَيْنَ مَهْرُوْدَتَيْنِ ﴾ بدالِ مہملہ، یعنی "شفتين" یا "حلتين" کسی نے کہا ہے کہ مہرود وہ ہے جو ورس سے رنگا جاتا ہے۔ پھر زعفران سے تو اس کی رنگت حوذان کی کلی کی طرح ہو جاتی ہے، حوذان ایک سبزی ہے، اس کی شاخیں اور پتے اور کلیاں زرد ہوتی ہیں، اس لفظ میں دال ذال کا جھگڑا ہے، پوری تحقیق مجمع البحار میں ہے۔)[1] پھر اس کو لُد شرقی کے دروازے کے نزدیک قتل کر ڈالیں گے۔ (لُدّ بضمِ لام وتشدیدِ دال، شام میں یا فلسطین میں ایک

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٥/ ١٥١)

جگہ ہے۔ منصرف وغیر منصرف دونوں طرح آتا ہے۔)

فرمایا: پھر وہ اس حالت پر ہوں گے کہ اللہ عزوجل عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی طرف وحی کرے گا کہ میں نے اپنے بندوں میں سے ایسے بندے نکالے ہیں کہ تجھ کو اُن سے لڑنے کی قدرت نہیں ہے، پس تو میرے بندوں کو طور کی طرف سمیٹ، یعنی اُن کو اس کی طرف بطورِ جائے پناہ لے جا کر ٹھہرا۔ پھر اللہ عزوجل یاجوج و ماجوج کو بھیجے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴾ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب اللہ عزوجل کی طرف رغبت کریں گے، یعنی اس سے دعا مانگیں گے تو اللہ اُن پر نغف بھیج دے گا، جو اُن کی گردنوں میں آئے گا، نغف نغفہ کی جمع ہے، نغفہ وہ کیڑا ہے جو اُونٹ اور بکری کی ناک میں ہوتا ہے۔ « فَيُصْبِحُوْنَ فَرْسٰى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ » یعنی وہ صبح کو ایک جان کے مرنے کی طرح سب کے سب یکبارگی مر جائیں گے۔ "فرسیٰ"، جمع "فریس" بہ معنی قتیل۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب طور سے اُتریں گے تو زمین میں کوئی گھر ایسا نہ پائیں گے جہاں ان کی زہم ونتن، یعنی ان کی بدبو نے اس کو بھر نہ دیا ہو۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب اللہ عزوجل کی طرف رغبت کریں گے تو وہ اُن پر ایسے پرندے بھیجے گا، جیسے بختی اونٹوں کی گردنیں۔ پھر وہ پرندے اُن کو اُٹھا لیں گے اور وہاں لے جا کر پھینک دیں گے، جہاں اللہ چاہے گا۔

ابن جابر نے کہا کہ عطا بن یزید سکسکی نے مجھ کو بیان کیا، کعب یا غیر کعب سے کہا، پھر وہ پرندے اُن کو مہبل میں پھینک دیں گے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے کہا: اے ابو یزید! مہبل کہاں ہے؟ کہا کہ طلوعِ شمس کی جگہ پر۔ فرمایا اور اللہ تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا کہ نہ بچائے گا اس سے کوئی گھر جو ڈھیلوں سے بنا ہو یا بالوں سے بنا ہو چالیس دن تک، پھر وہ پانی زمین کو دھو ڈالے گا، یہاں تک کہ وہ آئینے کی طرح صاف شفاف ہو جائے گی اور زمین سے کہا جائے گا کہ تو اپنے پھل اُگا اور اپنی برکت برسا۔ فرمایا: پس اس دن نفر ایک انار میں سے کھا لیں گے۔ نفر آدمی کے خویش و اقارب کو کہتے ہیں، حد اس کی تین سے دس تک ہے۔ مراد یہ ہے کہ انار اس قدر بڑا ہوگا کہ اتنے آدمی اس سے پیٹ بھر لیں گے۔ « وَيَسْتَظِلُّوْنَ بِقِحْفِهَا » یعنی انار کے چھلکے سے سایہ لیں گے اور دودھ میں برکت ڈال دی جائے گی، یہاں تک کہ دودھ والی اونٹنی آدمیوں کے ایک گروہ کو کافی ہوگی اور دودھ والی گائے فخذ کو کفایت کرے گی۔ "فخذ" وہ اقربا ہیں کہ رشتہ داروں میں سے آدمی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اول درجہ شعب ہے، پھر قبیلہ، پھر فصیلہ، پھر عمارہ، پھر بطن، پھر فخذ۔ اور بکری ایک گھر والوں کو کافی ہوگی۔ فرمایا: پھر وہ اس حالت پر ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک ریح طیب، یعنی عمدہ ہوا بھیجے گا تو وہ اُن کو اُن کی بغلوں کے نیچے سے پکڑ لے گی، پھر ہر مسلم یا فرمایا مومن کی روح کو قبض کر لے گی اور بدلوگ باقی رہ جائیں گے۔ « يَتَهَارَجُوْنَ تَهَارُجَ الْحُمُرِ » یعنی کھلم کھلا عورتوں

سے لوگوں کے سامنے صحبت کریں گے، جیسے: گدھے جفتی کرتے ہیں اور انھیں پر قیامت قائم ہوگی۔[1] (انفرد باخراجه مسلم دون البخاري فرواه مع بقية أهل السنن من طرق عن عبد الرحمن بن يزيد بن جابر به وقال الترمذي حسن صحيح)

تفسیر خازن میں بھی اس حدیث شریف کو ذکر کیا گیا ہے، مگر الفاظ و عبارت میں بہت فرق ہے۔[2]

تیسری حدیث:

امام احمد رحمہ اللہ نے ابن حرملہ کی خالہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ پڑھا اور آپ اپنی انگشت مبارک کو باندھے ہوئے تھے، بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ پس فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ تمھارے لیے کوئی دشمن نہیں ہے اور تم ہمیشہ دشمن سے لڑتے رہو گے، یہاں تک کہ یاجوج ماجوج آئیں، چوڑے منہ والے، چھوٹی آنکھوں والے، سرخ سیاہی مائل بالوں والے، ہر بلندی سے پھیلتے آئیں گے، منہ اُن کے ایسے جیسے تہ پر تہ چڑھی ہوئی ڈھالیں۔[3] (وكذا روى ابن أبي حاتم من حديث محمد بن عمرو عن خالد بن عبد الله بن حرملة المدلجي عن خالة له عن النبي ﷺ فذكره مثله سواء)

چوتھی حدیث:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس رات مجھے سیر کرائی گئی، یعنی شبِ معراج میں تو میں نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی۔ فرمایا: «فَتَذَاكَرُوْا أَمْرَ السَّاعَةِ» یعنی پھر انھوں نے باہم قیامت کا ذکر کیا تو انھوں نے اپنے کام کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف رد کیا، وہ بولے: مجھے اس کا کچھ علم نہیں ہے۔ پھر انھوں نے اپنے کام کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف رد کیا تو وہ بولے: مجھے اس کا کچھ علم نہیں ہے۔ پھر انھوں نے اپنے کام کو عیسیٰ علیہ السلام کی طرف رد کیا تو انھوں نے کہا: "أَمَّا وَجْبَتُهَا فَلَا يَعْلَمُ بِهَا أَحَدٌ إِلَّا اللّٰهُ"، یعنی اس کا ہو پڑنا سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور جس چیز کا میرے رب نے مجھ سے عہد کیا ہے، یعنی جو باتیں مجھے بتائی ہیں، ان میں یہ ہے کہ دجال نکلنے والا ہے اور میرے ہمراہ دو قضیب ہوں گے۔ (قضیب کہتے ہیں درخت کی شاخ کو اور باریک نازک تلوار کو۔ واللہ أعلم کہ یہاں کیا مراد ہے۔) پھر جس وقت وہ مجھے دیکھے گا تو پگھل جائے گا، جس طرح سیسہ پگھلتا ہے۔ فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کر دے گا اور لوگ اپنے شہروں اور وطنوں کی طرف لوٹ آئیں گے۔ فرمایا: پھر اس وقت یاجوج ماجوج نکلیں گے اور وہ ہر اونچان سے پھیلتے آئیں گے۔ پھر اُن کے شہروں کو روندیں گے، جس شے پر آئیں گے، اس کو ہلاک کر ڈالیں گے اور جس پانی پر گزریں گے، اس کو پی جائیں گے۔ فرمایا: پھر لوگ اُن کی شکایت کرتے ہوئے اپنے وطنوں کو لوٹ آئیں گے۔ پس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا تو وہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٣٧) مسند أحمد (٤/ ١٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٤٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧٥)

[2] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٢۔ ٣٢٣) [3] مسند أحمد (٥/ ٢٧١)

اُن کو ہلاک کر دے گا، یہاں تک کہ زمین ان کی بدبو سے ناموافق ہو جائے گی۔ (اصل الفاظ «تَجْوَى الْأَرْضُ» ہیں۔ جویٰ مرض اور پیٹ کی بیماری کو کہتے ہیں، جب کہ وہ دراز ہو جائے، یہ اس وقت ہوتا ہے، جب آدمی کو زمین کی ہوا ناموافق ہوتی ہے۔) اور اللہ تعالیٰ پانی نازل کرے گا تو ان کے جسموں کو کھود دے گا۔ (اصل الفاظ «فَتَجْتَرِفُ أَجْسَادَهُمْ» ہیں، یعنی جس طرح سیلاب زمین کو تراشتا اور کھودتا ہے، اسی طرح وہ پانی اُن کے جسموں کو کھود کر دریا میں ڈال دے گا۔ پس جس شے کا میرے رب نے مجھ سے عہد کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ جس وقت ایسا ہوگا تو قیامت پورے دن والی حاملہ عورت کی طرح ہوگی، اس کے گھر والے نہیں جانتے کہ وہ اپنے جننے کے لیے کب اُن کو گھبرائے، رات کو یا دن کو۔ (و رواه ابن ماجه عن محمد بن بشار عن يزيد بن هارون عن العوام بن خوشب به نحوه)

اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ عوام بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کی تصدیق اللہ عز وجل کی کتاب میں پائی گئی ہے۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾[1] (ورواه ابن جرير ههنا من حديث ابن جبلة به)

اس بارے میں احادیث اور سلف کے آثار بہت کچھ وارد ہوئے ہیں۔ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے معمر عن غیر واحد عن حمید بن ہلال عن ابی الصیف سے روایت کیا ہے کہ کعب نے کہا ہے کہ جس وقت یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا وقت ہوگا تو وہ کھودیں گے، یعنی سدِ سکندری کو یہاں تک کہ جو لوگ اُن سے متصل ہیں، ان کے تیروں کی آواز کو سنیں گے۔ پھر جب رات آئے گی تو اللہ تعالیٰ اُن میں سے کسی شخص کی زبان پر اس بات کا القا کرے گا کہ وہ یوں کہیں گا کہ ہم کل آئیں گے تو نکلیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس دیوار کو ویسی ہی کر دے گا، جیسی وہ تھی۔ پھر وہ کل آئیں گے تو اس کو پائیں گے کہ اللہ نے اسے ویسا ہی کر دیا، جیسے وہ تھی۔ پھر اس کو کھودیں گے، یہاں تک کہ جو لوگ ان سے متصل ہیں اُن کے تیروں کی آواز کو سنیں گے۔ پھر جب رات ہوگی تو اُن میں سے کسی آدمی کی زبان پر اللہ تعالیٰ اس بات کا القا کرے گا کہ ہم کل آئیں گے، پھر نکلیں گے ان شاء اللہ۔ پھر کل آئیں گے تو اس کو ویسی پائیں گے، جیسی چھوڑ گئے تھے، پھر کھودیں گے یہاں تک کہ نکل آئیں گے۔ پھر پہلا گروہ بحیرہ پر گزرے گا تو اس کے پانی کو پی جائیں گے، پھر دوسرا گروہ گزرے گا تو اس کی کیچڑ کو چاٹ کھائیں گے۔ پھر تیسرا گروہ گزرے گا تو کہیں گے کہ اس جگہ کسی بار پانی تھا، پھر لوگ اُن سے بھاگیں گے، پس کوئی شے اُن کے واسطے قائم نہ رہے گی، پھر وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے تو وہ تیر خون میں رنگے ہوئے اُن کی طرف واپس لوٹ آئیں گے، اس پر کہیں گے کہ ہم زمین و آسمان والوں پر غالب آ گئے۔

پھر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اُن پر بددعا کریں گے تو یوں کہیں گے: «اَللّٰهُمَّ لَا طَاقَةَ وَلَا يَدَ لَنَا بِهِمْ فَاكْفِنَاهُمْ بِمَا شِئْتَ» یعنی اے اللہ! اُن کے مقابلے کی ہم کو نہ کسی طرح کی طاقت ہے نہ کسی قسم کی قوت، پس تو اُن سے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٨١) مسند أحمد (١/ ٣٧٥) تفسير الطبري (١٨/ ١١٩_١٢٠) السلسلة الضعيفة (٤٣١٨)

ہماری کفایت کر، جس چیز کے ساتھ تو چاہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُن پر کیڑے مسلط کرے گا، جن کو نغف کہتے ہیں تو وہ اُن کی گردنیں توڑ ڈالیں گے اور اللہ تعالیٰ پرندے بھیجے گا، جو اپنی چونچوں سے اُن کو پکڑ لیں گے اور دریا میں لے جا کر ڈال دیں گے اور اللہ تعالیٰ پانی بھیجے گا، جس کو حیات کہتے ہیں، یعنی آبِ حیات۔

اللہ تعالیٰ زمین کو پاک صاف کر دے گا اور اُس کو اُگائے گا، یہاں تک کہ ایک انار سے، البتہ سکن سیر ہو جائے گا۔ کہا گیا: اے کعب! سکن کیا ہے؟ کہا: گھر والے۔ کہا: پھر لوگ اس حال پر ہوں گے کہ اُن کے پاس صریخ آئے گا، یعنی چیختا چلاتا مخبر ایک حادثے کی خبر لائے گا کہ ذوالسویقتین عیسیٰ علیہ السلام کا ارادہ کرتا ہے۔ (شاید اس سے مراد حبشے کا بادشاہ ہے، جس کی پتلی پنڈلیاں ہوں گی، کعبے کو خراب کرے گا، اس کا خزانہ نکال لے جائے گا۔ واللہ أعلم۔) کہا: عیسیٰ علیہ السلام ایک طلیعہ بھیجیں گے، یعنی لشکر بطورِ جاسوس سات آٹھ سو آدمیوں کا، یہاں تک کہ جب وہ بعض راہ میں پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ ایک ہوائے یمانی طیب بھیجے گا تو اس میں ہر مومن کی روح قبض کرے گا۔ پھر عجاج الناس باقی رہ جائیں گے، یعنی برے بے خیر لوگ کہ نہ نیکی کو نیکی سمجھیں نہ برائی کو برائی جانیں، جیسے: چوپائے۔ پھر وہ کھلم کھلا عورتوں سے جماع کریں گے، جس طرح چوپائے جفتی کرتے ہیں، پس مثل قیامت کی مانند اس شخص کے ہے، جو کہ اپنی گھوڑی کے گرد پھرتا ہے کہ وہ کب جنے، یعنی قیامت بہت ہی قریب آ پہنچی۔ کعب نے کہا: پھر جو شخص میری اس بات کے بعد کہے یا میرے اس علم کے بعد تو وہ متکلف ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول من جملہ احسن سیاقاتِ کعبِ احبار ہے، کیوں کہ صحیح اخبار نے اس کی شہادت دی ہے، حدیث میں ثابت ہو چکا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بیتِ عتیق کا حج کریں گے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ البتہ یہ گھر حج کیا جائے گا اور البتہ عمرہ کیا جائے گا یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد۔[2] انفرد بإخراجه البخاري.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ ﴾ قریب آ پہنچا سچا وعدہ، یعنی قیامت کا دن، جس وقت یہ ہولناکیاں اور زلزلے اور بلابل موجود ہوں گے تو قیامت لگ بھگ ہوگی اور قریب آ جائے گی، پھر جب ہو پڑے گی تو کافر کہیں گے: ﴿ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴾ [القمر: ٨] ''یہ دن نہایت سخت ہے۔'' اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ یعنی بڑے بڑے اُمور کے مشاہدے کی شدت کے مارے منکرین کی آنکھیں اوپر لگ رہیں گی۔ ﴿ يٰوَيْلَنَا ﴾ کہیں گے: اے خرابی! ﴿ قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا ﴾ ہم دنیا میں اس سے غفلت میں تھے۔ ﴿ بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ اپنی جانوں پر ظلم کرنے کا اقرار کریں گے، جب کہ اُن کو یہ اقرار کرنا کچھ نفع نہ دے گا۔[3] كذا في ابن كثير.

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٢٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥١٦) مسند أحمد (٣/ ٢٧) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٠۔ ٢٦٣)

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور اہلِ مدینہ نے "حَرَامٌ" پڑھا ہے اور اہلِ کوفہ کی قراءت "حِرْمٌ" بکسر حائے مہملہ و سکون رائے مہملہ ہے، پہلی قراءت کو امام ابوعبید اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور دوسری قراءت سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ "حِرُم و حرام" دونوں دو لغت ہیں، جیسے حل و حلال۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے "حَرِمَ" بفتح حا و کسر راء و فتح میم پڑھا ہے۔ امام عکرمہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ کی قراءت "حَرُمَ" بفتح حا، ضم راء و فتح میم ہے۔[1] حرام کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ کوئی فعل مکلّف کی قدرت میں ہو اور شارع نے بنصِ قاطع اس کے کرنے سے منع کر دیا ہو، چوں کہ اس جگہ حرام کا حقیقی معنی پر حمل کرنا متعذر ہے، اس لیے حرام کے معنی ممتنع الوجود (منع کیا ہوا) کے بطور استعارہ لیے ہیں، دونوں میں تعلق یہ ہے کہ حرام اور ممتنع الوجود میں سے ہر ایک غیر مرجو الحصول ہے، یعنی دونوں کے حصول کی اُمید نہیں رکھی جاتی ہے۔

﴿ اَهْلَكْنٰهَآ ﴾ کے معنی ہیں: "قدرنا إهلاكها و حكمنا بإهلاكها" اور قریہ سے مراد اہلِ قریہ ہیں۔ یا معنی "وجدناها هالكة" ہیں اور ﴿ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ میں کلمہ "لا" زائد ہے، جس طرح کہ ﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ﴾ [الأعراف: ١٢] یعنی تو جو سجدہ نہیں کرتا تو تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے۔ میں "لا" زائد ہے۔ یعنی جن گاؤں والوں پر ہم نے اُن کا ہلاک کرنا مقدر کیا ہے اور اُن کے ہلاک کرنے کا حکم دیا ہے یا ہم نے اُن کو ہلاک پایا ہے تو اُن کا توبہ کی طرف رجوع کرنا بنا بر معنی اول، یا اُن کا دنیا کی زندگی کی طرف رجوع کرنا بنا بر معنی ثانی ممتنع الوجود ہے۔ یہ امر اُن سے متصور نہیں ہے اور جو لا زائد نہ ٹھہرے گا تو یہ معنی ہوں گے کہ جو کافر ہلاک کر دیے گئے اُن کا دارِ جزا کی طرف رجوع نہ کرنا ممتنع الوجود ہے، یعنی حساب و کتاب و سزا جزا کے واسطے اُن کا رجوع کرنا ضروری ہے۔ مقصود اس سے منکرینِ بعث کے قول کا باطل کرنا ہے۔

جملہ ﴿ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ مبتدا ہے اس کی خبر حرام ہے، تقدیر یہ ہے: "رجوعهم" اور "عدم رجوعهم ممتنع الوجود"۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حرام متبدا ہے اور اس کی خبر نہ لفظاً ہے نہ تقدیراً، کیوں کہ حرام صفتِ مشبہ ہے مثلِ جبان کے۔ جملہ مذکورہ جو اس کے بعد ہے، وہ خود اس کو بنا بر فاعلیت رفع دے گا اور وہی جملۂ ظاہر اس کی خبر کے قائم مقام ہوگا یا وہی اس کا فاعل قائم مقائم اس کی خبر کے ہوگا، اس میں اتنی بحث ہے کہ صفت کا صیغہ اپنے مابعد کے اسم ظاہر کو بنا بر فاعلیت جو رفع دیتا ہے، تو بشرطِ اعتماد کے، بدون رفع نہیں دیتا۔ مگر ہاں اخفش کے مذہب پر رفع دے سکتا ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک اعتماد شرط نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حرام مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر دلیل ہے فاعل پر۔ گویا یوں کہا گیا: "حرام عليهم توبتهم أو حياتهم بنا بر زیادتِ لا یا عدم بعثهم بنا بر عدمِ زیادتِ لا"، چوتھی صورت یہ ہے کہ حرام خبر

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٠)

ہے مبتدائے محذوف کی، وہ مبتدا بعد حرفِ واؤ کے یہ ہے: "ذلك الذي ذكر من العمل الصالح المقرون بالإيمان حرام عليهم" یعنی وہ عمل صالح جو ایمان کے ساتھ مقرون ہے جس کا ذکر ہوا حرام ہے قریہ مہلکہ پر اور ﴿ اَنَّهُمْ ﴾ بحذفِ لامِ تعلیل اس کی علت ہے، یعنی "لانهم لا يرجعون ولا منيبون"۔ کسی نے "إنهم" کو بکسرِ ہمزہ پڑھا ہے سو یہ قراءت اس کی موید ہے، کیوں کہ "إنّ" کا کسرہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کلام اس سے پہلے پورا ہو چکا اور اس کی تمامی کے واسطے محذوف کی تقدیر ضروری ہے۔ یہ سب صورتیں اس بنا پر تھیں کہ حرام کے معنی ممتنع الوجود ٹھہرے۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ حرام بہ معنی معزوم وموجب ہے، یعنی یہ بات اُن پر واجب کی گئی ہے اور اس کا عزم بالجزم کیا گیا ہے کہ وہ رجوع نہ کریں گے، کیونکہ حرام کا استعمال بہ معنی واجب آیا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا ﴾ [الأنعام: ١٥١] "آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔" کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ترکِ شرک کو تم پر واجب کیا ہے، اسی طرح سیدہ خنساء رضی اللہ عنہا کا قول اس پر دال ہے۔ ؎

وإن حراما لا أرى الدهر باكيا   على شجوه إلا بكيت على صخر[1]

خنساء ایک شاعر بی بی ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شعر سنے ہیں، ان کا بھائی صخر نام تھا (انموذج میں نام عمرو ہے) وہ مر گیا، انھوں نے اس کے مرثیے کہے، من جملہ اُن کے یہ شعر ہے، یعنی مجھ پر واجب ہے کہ زمانے میں جس رونے والے کو اپنے رنج پر دیکھوں تو میں صخر پر روؤں۔ اور نیز ایسا بہت ہوتا ہے کہ ضدین میں ایک ضد کا اطلاق دوسری پر مجازاً ہوا کرتا ہے۔ كذا في شيخ زاده وغيره. فتح القدیر و فتح البیان میں امام نحاس رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے کہ آیت مشکل ہے، جو کچھ اس کے معنی میں کہا گیا ہے، من جملہ اس کے خوب تر و بزرگ تر وہ قول ہے، جس کو امام ابن عیینہ، ابن علیہ، ہشیم، ابن ادریس، محمد بن فضل، سلیم بن حبان اور معلّٰی نے داود بن ابی ہند عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: واجب۔ ﴿ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ أي لا يتوبون یعنی جس بستی والوں پر ہم نے ان کا ہلاک کرنا مقدر کیا ہے، ان پر یہ واجب ہے کہ وہ توبہ نہ کریں گے یہ قول حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سے پہلے گزر چکا ہے۔[2] امام زجاج اور ابو علی فارسی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں اضمار ہے، یعنی کچھ عبارت مقدر ہے، وہ یہ ہے کہ اس بستی پر حرام ہے، جس کے استیصال کا ہم نے حکم کیا ہے، یا اس کے لوگوں کے دلوں پر مہر لگانے کا حکم دیا ہے یہ بات کہ ان سے کوئی عمل قبول کیا جائے، اس لیے کہ وہ رجوع نہ کریں گے، یعنی تائب نہ ہوں گے۔[3]

﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ ﴾ یہ دونوں قبیلوں کے عجمی نام ہیں، یا ہمزہ اور بے ہمزہ دونوں طرح

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٠)   [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[3] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٠) فتح القدير (٣/ ٥٨٢) فتح البيان (٨/ ٣٧١)

اُن کا پڑھنا درست ہے، اُن کے پہلے مضاف مقدر ہے، یعنی سد، جس طرح کہ قریہ سے پہلے کلمہ اہل مقدر ہے۔ ﴿ فُتِحَتْ ﴾ صیغۂ ماضی مجہول ہے ''فتح یفتح'' سے اور ابن عامر و یعقوب نے بصیغۂ مجہول بہ تشدیدِ حرفِ تا باب تفعیل سے پڑھا ہے۔[1] ﴿ حَتّٰى ﴾ متعلق ہے ﴿ حَرٰمٌ ﴾ سے اور وہ حرفِ ابتدا ہے اور ﴿ اِذَا ﴾ شرطیہ ہے جواب اس کا ﴿ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ ... الخ ﴾ ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ کے قول میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ حتیٰ فی المعنی حرام سے متعلق ہے، اپنے ماقبل کی غایت ہے اور یہ وہی حتیٰ ہے جس کے بعد کلام حکایت کیا جاتا ہے اور کلام حکایت کردہ شدہ جملۂ شرط و جزا ہے، یعنی ﴿ اِذَا ﴾ اور جو اس کے حیز میں ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ کا مذہب بھی اسی کے مثل ہے۔ یوں کہا ہے کہ حتیٰ فی المعنی حرام سے متعلق ہے،[2] یعنی جس قوم کا ہم نے ہلاک کرنا مقدر کیا ہے، اس پر ممتنع ہے اس کا توبہ کی طرف رجوع کرنا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو، پس اس وقت وہ رجوع کریں گے اور کہیں گے: اے خرابی ہماری! ہم غفلت میں تھے اس سے۔ یا جن لوگوں کو ہم نے حقیقتاً ہلاک کر ڈالا ہے، اُن پر ممتنع ہے دنیا کی طرف رجوع کرنا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو، پس اس وقت وہ اُٹھائے جائیں گے اور اُن سے حساب لیا جائے گا اور ﴿ حَتّٰى ﴾ کا کچھ عمل نہ ہوگا ﴿ اِذَا ﴾ میں۔ امام حوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَتّٰى ﴾ غایت ہے اور عامل اس میں وہ ہے جس پر معنی دلالت کرتے ہیں، وہ یہی ہے کہ طاعت میں جو انھوں نے تفریط کی ہے، اس پر تأسف کریں گے، جس وقت کہ اُن سے استدراک فوت ہوگیا۔[4]

شیخ زادہ نے کہا ہے کہ حتیٰ محذوف سے متعلق ہے، گویا یوں کہا گیا: حرام ہے ہلاک ہونے والوں پر اُن کا حیات کی طرف لوٹنا، بلکہ موت اُن پر مستمر رہے گی۔ قیامت قائم ہونے تک۔ ﴿ حَتّٰى ﴾ متعلق ہے ﴿ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ سے اس بنا پر کہ حرام خبر ہو مبتدائے محذوف کی اور معنی یہ ہوں کہ وہ عملِ صالح جس کا ذکر ہوا ممتنع ہے اُن لوگوں پر جن کا ہلاک کرنا ہم نے مقدر کیا ہے، اس لیے کہ وہ قیامت قائم ہونے تک کفر سے رجوع نہ کریں گے۔ پھر وہ عمل اُن پر کیوں کر ممتنع نہ ہو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَتّٰى ﴾ متعلق ہے ﴿ تَقَطَّعُوْٓا ﴾ سے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَتّٰى ﴾ کے ﴿ تَقَطَّعُوْٓا ﴾ سے متعلق ہونے میں بُعد ہے اس جہت سے کہ درمیان میں فصل بہت ہوگئی ہے، لیکن معنی کی جہت سے بہت خوب ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ ہمیشہ دینِ حق پر اختلاف کرتے رہیں گے قربِ آمدِ قیامت تک، پھر جب قیامت آجائے گی تو وہ اختلاف منقطع ہو جائے گا، غرضیکہ ﴿ حَتّٰى ﴾ کے متعلق میں چار وجہیں ہوئیں: ایک وجہ یہ ہوئی کہ حرام سے متعلق ہے۔ دوسری یہ ہوئی کہ محذوف سے متعلق ہے، جس پر معنی دال ہیں، یہ قول امام حوفی رحمہ اللہ کا تھا۔ تیسری یہ ہوئی کہ ﴿ يَرْجِعُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے۔ چوتھی یہ ہوئی کہ ﴿ تَقَطَّعُوْٓا ﴾ سے

[1] تفسير البغوي (٥/ ٣٥٤) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٧) [3] اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٥٩٧)

متعلق ہے اور خود ﴿حَتّٰی﴾ میں دو وجہیں حاصل ہوئیں: ایک یہ ہے کہ حرفِ ابتدا ہے، یہ قول امام زمخشری رحمہ اللہ کا ہے اور امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ حرفِ جر ہے، بہ معنی "إلی" اور جواب ﴿إِذَا﴾ میں دو وجہیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ محذوف ہے۔

لہٰذا امام ابو اسحق رحمہ اللہ نے اس کی تقدیر یہ کی ہے: "قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ" یعنی جس وقت یاجوج ماجوج کی دیوار کھول دی جائے گی تو وہ کہیں گے: اے خرابی ہماری! بصریوں کا بھی یہی قول ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ غیر ابو اسحق کے نزدیک جوابِ مقدر یہ ہے: "فحینئذ یبعثون" یعنی تو وہ اس وقت اُٹھائے جائیں گے اور ﴿فَإِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ﴾ اس مقدر پر معطوف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿إِذَا﴾ کا جواب حرفِ فا ہے، ﴿فَإِذَا هِیَ﴾ میں۔ امام حوفی، زمخشری اور ابن عطیہ رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ﴿إِذَا﴾ وہی ہے جو ﴿إِذَا﴾ مفاجات کے واسطے ہوتا ہے اور وہ مجازات میں حرفِ فا کے قائم مقام واقع ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿إِذَا هُمْ یَقْنَطُوْنَ﴾ [الروم: ٣٦] "تو وہ فوراً نا امید ہو جاتے ہیں۔"[1]

(اس لیے کہ جملہ اسمیہ جس وقت جوابِ شرط کا واقع ہوتا ہے تو دخول حرفِ فا کا اس پر واجب ہے، تاکہ اس پر دلالت کرے کہ وہ جملہ جواب و جزا ہے، مگر ہاں جس وقت ﴿إِذَا﴾ مفاجات کا اس کے شروع میں آ جاتا ہے تو وہ قائم مقام حرفِ فا کے ہو جاتا ہے، پھر جس وقت حرفِ فا اس کے ساتھ آ جاتا ہے تو شرط کے ساتھ جزا کے وصل کرنے پر ایک دوسرے کے معاون ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں مابین شرط و جزا کے جو اتصال ہے، وہ متاکد ہو جاتا ہے۔ کذا في شیخ زادہ۔) پھر جب حرفِ فا کے ساتھ آتا ہے تو شرط کے ساتھ جزا کے ملانے میں دونوں باہم ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں تو وصل جزا کا شرط کے ساتھ متاکد ہو جاتا ہے اور اگر "إِذَا هِيَ شَاخِصَة" کہا جائے تو بھی درست ہے اور امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں جس کا قائل ہوں، وہ یہ ہے کہ جواب ﴿فَإِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ﴾ میں ہے اور یہ وہی معنی ہیں جن کے ذکر کا قصد کیا گیا ہے، کیوں کہ یہی شخوصِ ابصار ان کا رجوع ہوتا ہے، جس کی وہ تکذیب کرتے تھے اور اس کا امتناع اُن پر حرام تھا۔[2] امام سمین رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے بھی اسی کو جائز رکھا ہے کہ جواب ﴿إِذَا﴾ کا ﴿فَإِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ ... الخ﴾ ہے۔[3]

﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ﴾ [آیتِ باب] ﴿حَدَبٍ﴾ بفتحتین بلند زمین کو کہتے ہیں۔ "حِدَاب" بالکسر اس کی جمع ہے۔ کذا في الصراح۔ فتح القدیر میں کہا ہے کہ ہر ٹیلہ جو زمین سے بلند ہو اس کو "حدب" بولتے ہیں۔ اس کی جمع "أحداب" ہے، ماخوذ ہے حدبہ زمین سے۔[4] "حدبة" کے معنی کوزی پشت ہیں۔ امام

[1] اللباب في علوم الکتاب (١٣/ ٥٩٧۔ ٥٩٨)
[2] اللباب في علوم الکتاب (١٣/ ٥٩٨)
[3] فتح القدیر (٣/ ٥٨٣)
[4] فتح القدیر (٣/ ٥٨٢)

سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''الحدب النشز من الأرض أي المرتفع''یعنی زمین سے جو جگہ بلند ہو وہ حدب ہے۔ اسی مادے سے پیٹھ میں جو بلندی ہوتی ہے اس کو حدب بولتے ہیں اور ہر بلندی یا ٹیلے کو حدبہ کہتے ہیں اور اسی سبب سے قبر کا نام حدبہ رکھا گیا ہے، کیوں کہ وہ روئے زمین پر ظاہر ہوتی ہے، یعنی بلند۔ ''نسلان'' قریب قریب قدم رکھنے کو کہتے ہیں جلدی چلنے کے ساتھ۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''نسل ینسل'' ماضی میں فتح اور مضارع میں کسرہ وضمہ۔ مصباح میں کہا ہے: ''نَسَلَ فِيْ مَشْيِهٖ نَسْلَانًا، أَسْرَعَ'' اس نے اپنے چلنے میں جلدی کی۔ باب اس کا ضرب ہے۔[1]

فتح القدیر میں کہا ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ''نَسَلَان'' بھیڑیے کی چال ہے، جبکہ وہ جلدی چلے۔ محاورے میں ''نَسَلَ فُلَانٌ فِي الْعَدْوِ يَنْسِلُ'' بولتے ہیں۔ بالکسر والضم نسلاً ونسولاً ونسلاناً۔ ﴿ يَنْسِلُوْنَ ﴾ کے معنی ''یسرعون'' ہیں۔ کسی نے کہا: ''یخرجون''۔ عامہ نے ﴿ يَنْسِلُوْنَ ﴾ کو بکسر سین پڑھا ہے اور بضم سین بھی پڑھا گیا ہے۔ مہدوی نے اس کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حکایت کیا ہے اور امام ثعلبی رحمہ اللہ نے امام مجاہد اور ابو الصہباء سے بھی اس قراءت کو نقل کیا ہے۔[2]

﴿ هُمْ ﴾ کی ضمیر یاجوج ماجوج کی طرف پھرتی ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اس کو ظاہر تر کہا ہے اور شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے، کیوں کہ یہ بات مروی ہے کہ یاجوج و ماجوج ضرور زمین میں سیر کریں گے اور ہر جائے بلند سے لوگوں پر غالب ہوں گے اور جلد جلد چلیں گے اور زمین میں متفرق ہو جائیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ هُمْ ﴾ کی ضمیر ساری خلق کی طرف پھرتی ہے، یعنی ساری خلق زمین موقف کی طرف جمع کی جائے گی اور وہ ہر بلند زمین سے جلد جلد اس کی طرف جائیں گے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ کسی نے بجائے ﴿ حَدَبٍ ﴾ نے ''جدث'' بجیم و ثائے مثلثہ پڑھا ہے۔ ''جدث'' قبر کو کہتے ہیں۔[3] یہ قراءت ثانی قول کی تائید کرتی ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''جدث'' بمعنی ''حدب'' ہے۔[4] امام محلی رحمہ اللہ نے قولِ اول کو اختیار کیا ہے[5] اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے قولِ اول کو پہلے ذکر کیا ہے اور ثانی کو بعد اس کے ''أو الناس کلھم'' کر کے لکھا ہے۔[6]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے: ''وھم راجع الی الناس المسوقین الی المحشر و قیل ھم یاجوج و ماجوج یخرجون حین یفتح السد''[7] انتھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک قولِ ثانی راجح ہے اور امام خازن رحمہ اللہ نے قولِ اول کو زیادہ صحیح کہا ہے اور اس کی دلیل نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ذکر کی ہے،[8] جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور ترجمہ شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین، شاہ ولی اللہ اور سعدی شیرازی رحمہم اللہ میں بھی

---

[1] المصباح المنير (١/ ٣١١) [2] فتح القدير (٣/ ٥٨٢) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٨)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٧) [5] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠) [6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٧۔ ١٠٨)
[7] تفسير النسفي (٣/ ٩١) [8] تفسير الخازن (٤/ ٣٢١۔ ٣٢٢) البتہ حدیث کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ضمیر یاجوج ماجوج کی طرف راجع ہے۔ فتح البیان و فتح القدیر میں قولِ ثانی کو بلفظ "قیل" ذکر کیا ہے۔[1]

﴿ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ ﴾ معطوف ہے ﴿ فُتِحَتْ ﴾ پر، اس صورت میں من جملہ شرط ٹھہرے گا۔ فتح القدیر میں ہے کہ اقترابِ وعد سے مراد حساب ہے، جو بعد فتحِ سدِ یاجوج و ماجوج کے ہوگا۔ امام فراء اور کسائی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وعدِ حق سے مراد قیامت ہے اور واو زاید ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جب یاجوج ماجوج کی دیوار کھولی جائے گی تو وعدۂ حق، یعنی قیامت قریب آ جائے گی، اس بنیاد پر اقتراب جواب ہوگا ﴿ اِذَا ﴾ کا۔[2] زیادتی واو کی شاہد یہ آیت ہے: ﴿ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ ﴾ [الصافات: ۱۰۳۔ ۱۰۴] "اس (بیٹے) کو پیشانی کی ایک جانب لٹا دیا۔ اور ہم نے اسے پکارا۔" درمیان میں واوَ زائد ہے۔

امام محلی، بیضاوی اور نسفی رحمہ اللہ نے ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ کو ﴿ اِقْتَرَبَ ﴾ پر معطوف ٹھہرایا ہے اور وعدِ حق سے مراد روزِ قیامت لیا ہے اور جواب ﴿ اِذَا ﴾ کا ﴿ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ کو قرار دیا ہے۔[3] اس کی دو وجہیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ ﴿ هِيَ ﴾ ضمیر قصہ کی ہے اور ﴿ شَاخِصَةٌ ﴾ خبر مقدم ہے اور ﴿ اَبْصَارُ ﴾ مبتدائے موخر ہے اور جملہ خبر ہے ﴿ هِيَ ﴾ کی، اس واسطے کہ ضمیر قصہ کی اسی جملے کے ساتھ تفسیر کی جاتی ہے کہ جس کے دونوں جزء کی تصریح کی گئی ہو، یہ مذہب بصریوں کا ہے اور یہی وجہ اجود ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ شَاخِصَةٌ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ اَبْصَارُ ﴾ فاعل، قائم مقام خبر، یہ بات نہ چلے گی مگر کوفیوں کے مذہب پر، کیوں کہ ان کے نزدیک ضمیر قصے کی ایسے مفرد کے ساتھ تفسیر کی جاتی ہے جو فعل کا عمل کرتا ہے، اس لیے کہ ایسا مفرد جملے کی قوت میں ہوتا ہے۔ ذکرہ السمین۔ یا ﴿ هِيَ ﴾ ضمیر مبہم ہے ﴿ اَبْصَارُ ﴾ اس کی توضیح و تفسیر کرتا ہے، جس طرح کہ ضمیر ﴿ اَسَرُّوا ﴾ کی تفسیر کی گئی ﴿ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ سے۔ اس قول پاک میں: ﴿ اَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ اس واسطے کہ ﴿ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾، ﴿ اَسَرُّوا ﴾ کے واو سے بدل ہے واسطے تفسیر کے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ هِيَ ﴾ پر کلام پورا ہو گیا۔ تقدیر یہ ہے: "فإذا هي يعني القيامة بارزة واقعة كأنها آتية حاضرة" پھر اور کلام شروع کیا، پس کہا: ﴿ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ بنا بر تقدیم خبر بر مبتدا، یعنی "أبصار الذين كفروا شاخصة"

﴿ اِقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ ﴾ کا عطف جبکہ ﴿ فُتِحَتْ ﴾ پر ہوا تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قیامت کا قائم ہونا یاجوج ماجوج کے نکلنے سے متاخر نہ ہوگا، جیسا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص بعد خروج یاجوج ماجوج کے گھوڑے کا بچہ پالے گا تو اس پر سوار نہ ہوگا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔[4] پھر اگر کوئی کہے کہ فتحِ سدِ یاجوج ماجوج اور اقتراب وعدِ حق کا مجموع شرط ہے اور اس مجموع کا حصول جو ہوگا، لہٰذا دنیا کے آخر ایام

---

[1] فتح البيان (٨/ ٣٧١) فتح القدير (٣/ ٥٨٢) [2] فتح القدير (٣/ ٥٨٢)

[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٨) تفسير النسفي (٣/ ٩١) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٣)

میں اور کافروں کی آنکھوں کا مارے ہولوں (ہولناکیوں کے) اوپر چڑھ جانا اس طریقے سے کہ پلک سے پلک نہ لگے، یہ جزا ہے اور اس کا حصول قیامت کے دن ہوگا، حالاں کہ شرط و جزا میں یہ امر ضروری ہے کہ زمانہ دونوں کا ایک دوسرے کے قریب ہو، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ قلیل تفاوت قائم مقام عدم کے ہوتا ہے۔ (قاله شيخ زاده)

امام شہاب رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ شخوصِ ابصار تو قیامت میں ہوگا بعد نفخۂ ثانیہ کے، پس تعقیب عرفی ہے، اس جگہ اس سے مبالغہ ارادہ کیا گیا ہے۔[1] ﴿ يٰوَيْلَنَا ﴾ معمول ہے قولِ محذوف کا، موضع حال میں ہے ﴿ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے، یعنی "حال كونهم قائلين يٰويلنا قد كنا في غفلة من هذا"، یعنی یہ بعث وحساب، جس نے ہم کو گھیر لیا ہے، ہم تو اس سے غفلت میں تھے۔ پھر اس سے اعراض کیا اور کفر اور اعراض عن الایمان جس کو قصداً کیا تھا، اس کی خبر دی۔ ﴿ بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی ہم ہی اپنی جانوں پر ظالم تھے، اس لیے کہ ہم نے رسولوں کی تکذیب کی ان کے مطیع اور فرماں بردار نہ ہوئے، انھوں نے تو ہم کو ہوشیار کر دیا تھا، مگر ہم نے اُن سے اعراض کیا، اُن کی بات کو نہ مانا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظلم یوں کیا کہ ہم نے عبادت کو اس کے غیر موضع میں رکھا۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "ظالمين لأنفسنا بالإخلال بالنظر و الاعتذار بالنذر"[3] یعنی ہم نے اپنی جانوں پر یہ ظلم کیا کہ نظر وغور میں خلل اندازی کی اور ڈرانے والوں کا کچھ اعتبار نہ کیا۔

جمل میں ذکر کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور نفخۂ اولیٰ کے درمیان ایک سو بیس برس کا فاصلہ ہے، لیکن برس بقدر مہینا ہوگا، جس طرح کہ مہینا بقدر جمعے کے اور جمعہ بقدر دن کے اور دن بقدر گھڑی کے ہوگا۔ پس معتاد برسوں سے عیسیٰ علیہ السلام اور نفخۂ اولیٰ کے درمیان بارہ برس کا فاصلہ ہوگا۔ پھر قیامت کے دن کفار اور اُن کے معبودوں کا جو حال ہو گا اللہ پاک نے اس کا ذکر فرمایا:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں، تم اس میں داخل ہونے والے ہو (98) اگر یہ (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور وہ سب ہمیشہ اس (جہنم) میں رہیں گے (99) اس میں ان کے لیے چیخنا چلانا ہوگا، اور وہ اس میں (کچھ) نہ سن پائیں گے (100)

مشرکین اور ان کے معبود جہنم کا ایندھن ہیں:

مکے والے مشرکینِ قریش اور اصنام اور اوثان کی عبادت کرنے والے جو اُن کے دین پر تھے، اللہ پاک ان

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٢٧٣) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩١) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٨)

سب کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ یعنی تم اور تمھارے معبود جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، وہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ حَصَبُ ﴾ سے مراد وقود ہے۔[1] (أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم من وجه آخر)۔ یعنی یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ [البقرة: ٢٤] ''جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ﴿ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ سے مراد شجرِ جہنم ہے۔[2] (أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم من وجه آخر)۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ ﴿ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ یعنی ''حطب جهنم'' زنجی زبان میں۔[3] (أخرجه ابن المنذر و ابن أبي حاتم)۔ امام مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ''حطبها'' اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی قراءت میں بھی اسی طرح ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ سے مراد وہ شے ہے جو اس میں پھینکی جائے گی۔[4] اور اسی طرح غیر ضحاک نے کہا ہے کہ یہ سب قول ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

﴿ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ یعنی تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔ ﴿ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ﴾ یعنی اگر یہ اصنام و انداد، یعنی بت جن کو تم نے اللہ کے سوا معبود قرار دیا ہے، صحیح ہوتے تو دوزخ میں داخل نہ ہوتے۔ ﴿ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی پوجنے والے اور اُن کے معبود سب کے سب دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ﴿ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴾ [هود: ١٠٦] ''ان کے لیے اس (آگ) میں بس چیخنا چلانا اور دھاڑنا ہوگا۔'' ''زفير خروج أنفاسهم و شهيق ولوج أنفاسهم'' یعنی زفیر سانس کا باہر آنا اور شہیق سانس کا اندر جانا ہے۔ ﴿ وَهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے والد عبد الرحمن مسعودی سے روایت کیا ہے۔ کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، جس وقت وہ لوگ باقی رہ جائیں گے، جو آگ میں ہمیشہ رکھے جائیں گے تو وہ آگ کے صندوقوں میں بند جائیں گے، اُن میں آگ کی میخیں ہوں گی، پھر اُن میں سے کوئی نہ دیکھے گا کہ اس کے سوا اور کوئی آگ میں عذاب کیا جاتا ہے۔ پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾[5] (ورواه ابن جرير من حديث حجاج بن محمد عن المسعودي عن يونس بن حبان عن ابن مسعود رضي الله عنه فذكره كذا في ابن كثير)

امام خازن رحمہ اللہ نے بھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو نقل کیا ہے، لیکن اس میں اس قدر زیادہ ہے کہ وہ لوگ آگ کے صندوقوں میں رکھے جائیں گے، پھر وہ صندوق اور صندوقوں میں رکھے جائیں گے، پھر وہ صندوق اور صندوقوں میں رکھے جائیں گے، ان پر آگ کی میخیں ہوں گی۔[6] الخ۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٥) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٥) [3] الدر المنثور (٥/ ٦٨٠) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٥_ ٥٣٦)
[5] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٧_ ٥٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٣_ ٢٦٤) [6] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٤)

تفسیر خازن، فتح القدیر، فتح البیان اور جلالین میں ہے کہ ﴿ إِنَّكُمْ ﴾ کا خطاب مشرکینِ مکہ کو ہے اور ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ سے مراد اصنام واوثان ہیں، جن کی پوجا کیا کرتے تھے۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خاص کر ان کا ذکر اس لیے کیا کہ اُن کے بڑے معبود یہی بت تھے، انھیں کو بہ کثرت پوجا کرتے تھے، ورنہ یوں تو سورج چاند بھی ثورین عقیرین ہوں گے آگ میں۔ (جبکہ اللہ پاک نے ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ میں سورج و چاند کو موصوف بہ سباحت کیا۔ پھر یہ خبر دی کہ ان کو آگ میں ڈالے گا، اُن سے اہلِ نار کو عذاب کرے گا اس طریقے سے کہ دونوں اس سے نہ ٹلیں گے تو گویا وہ ایسے ہو گئے، جیسے: دوزمن عقیر یعنی اپاہج۔ "حكاه أبو موسىٰ و هو كما تراه"[2] (كذا في مجمع البحار) چناں چہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے یہ امر صحیح ہو چکا ہے۔ بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور اصل حدیث بخاری شریف میں ہے۔[3] جمہور نے ﴿ حَصَبُ ﴾ بفتحتین پڑھا ہے، یعنی وقود و حطب۔ ﴿ حَصَبُ ﴾ نام ہے اس شے کا جو آگ میں پھینکی جاتی ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز سے تو آگ کو روشن کرے، یا اس کو بھڑکائے وہ ﴿ حَصَبُ ﴾ ہے۔

امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ما قذفته في النار فقد حصبتها به" یعنی جس شے کو تو نے آگ میں پھینکا تو مقرر تو نے آگ کو اس سے جھونکا۔[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَصَبُ ﴾ وہ شے ہے جو آگ کی طرف پھینکی جاتی ہے اور آگ اس سے بھڑکائی جاتی ہے۔ ماخوذ ہے: "حصبه يحصبه" سے باب۔ (اس کا "ضرب يضرب" ہے۔) یہ جب بولتے ہیں کہ کوئی شخص کسی شخص کو کنکری سے مارے۔[5] سمین و شیخ زادہ نے کہا کہ ﴿ حَصَبُ ﴾ نہیں کہتے ہیں، مگر اس حال میں کہ وہ آگ میں ہو اور آگ میں ہونے سے پہلے اس کو حطب و شجر و خشب اور مثل اس کے بولتے ہیں۔ کسی نے اس کو بسکون صاد پڑھا ہے۔ "حَصْب"، بسکونِ صاد مصدر ہے، بہ معنی فروزینہ و ہیزم انداختین در آتش۔ غرضیکہ بفتحِ صاد ایندھن ہوا اور بسکونِ صاد ایندھن ڈالنا ٹھہرا، واسطے مبالغے کے مصدر کے ساتھ وصف کر دیا، جس طرح "زيد عدل" کہتے ہیں، ورنہ حقیقت میں وہ لوگ محصوب ہیں، حصب نہیں ہیں۔

سیدنا علی و عائشہ رضی اللہ عنہما نے "حطب" بطائے مہملہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بضادِ معجمہ پڑھا ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ "حضب" بضادِ معجمہ اہلِ یمن کے لغت میں "حطب" ہے، بت جو آگ میں ڈالے جائیں گے، باجود اس کے کہ وہ جماد ہیں، وہ نہ اس کو سمجھتے ہیں نہ اس کا احساس کرتے ہیں۔ لہٰذا وجہ اس کی یہ ہے کہ اُن کے پوجنے والوں کی تبکیت و زیادتِ توبیخ کے لیے اور اُن کی حسرت بڑھانے

---

[1] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٣) فتح القدير (٣/ ٥٨٤) فتح البيان (٨/ ٣٧٣) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠)

[2] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٦٤١) [3] البعث والنشور للبيهقي (١/ ٢٥٤۔ ٢٥٥) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٨)

[4] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٤) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٨۔ ١٠٩)

کے واسطے اُن کو بھی آگ میں ڈال دیں گے، اُن کے معبود ہمیشہ اُن کے ساتھ رہیں گے تو اُن کا غم وحسرت وافسوس اور زیادہ ہوگا، کیوں کہ وہ انھیں کے سبب سے اس عذاب میں پڑے۔ دشمن کی صورت دیکھنا بھی ایک قسم کا عذاب ہے۔ کسی نے کہا کہ بت گرم کیے جائیں گے، پھر اُن کو کفار سے چپکائیں گے، تا کہ اُن کے عذاب میں زیادتی ہو۔ [1]

جملہ ﴿ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ﴾ میں امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے تین وجہیں جائز رکھی ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ سے بدل ہو۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جملہ بدل ہے مفرد سے، جو خبر واقع ہوا ہے اور ابدال جملے کا مفرد سے جائز ہے، جبکہ اُن میں سے ایک دوسرے کے معنی میں ہو، اس جگہ ایسا ہی ہے، کیوں کہ تقدیر یہ ہے: ”إنكم أنتم لها واردون“ دوسری وجہ یہ ہے کہ جملہ مستانفہ ہو۔ تیسری یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہو بنا بر حال جہنم سے۔ اس کو امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ [2]

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں نظر ہے، اس لیے کہ مضاف الیہ سے حال کا آنا ان جگہوں میں نہیں ہے، جن کا استثنا کیا ہے، چونکہ اسم فاعل کا عمل ضعیف ہے، اس لیے تقویت کے واسطے ﴿ لَهَا ﴾ میں لام لایا گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ لام بہ معنی ”علیٰ“ ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لام ”علیٰ“ کے عوض لایا گیا ہے اختصاص کے واسطے اور اس لیے کہ اس بات پر دلالت کرے کہ اُن کا ورود خاص جہنم کے لیے ہے۔ [3] ورود سے مراد داخل ہونا ہے اور کفار اور اُن کے معبودوں کو تغلیباً خطاب ہے۔ بہت سے اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس آیت میں عیسیٰ اور عزیر اور ملائکہ علیہم السلام داخل نہیں ہیں، اس لیے کہ کلمہ ”مَا“ غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے، اگر عموم مراد ہوتا تو اللہ پاک ”وَمَنْ تَعْبُدُونَ“ فرماتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا اور اس لیے کہ اس آیت میں مشرکینِ مکہ مخاطب ہیں۔ ان کے علاوہ مخاطب نہیں ہیں۔ ﴿ لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا ﴾ یعنی اگر یہ بت معبود ہوتے جیسا کہ تمھارا زعم ہے تو عابد و معبود آگ میں داخل نہ ہوتے۔ کسی نے کہا کہ فقط عابد داخل نہ ہوتے، لیکن وہ آگ میں داخل ہوئے تو وہ معبود نہ تھے۔ اس میں بت پرستوں کو سخت دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ [4] (كذا في فتح القدير)

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یہ بت معبود ہوتے تو آگ میں داخل نہ ہوتے، اس لیے کہ جس کو پکڑا جائے اور عذاب کیا جائے، وہ معبود نہیں ہوتا۔ [5] شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات شیطانوں کے زیادہ تر لائق ہے، کیوں کہ بت مؤاخذے کی لیاقت نہیں رکھتے، مگر ہاں یوں کہیں کہ بت پرست حقیقت میں شیطانوں کی عبادت کرتے ہیں، جنھوں نے ان کو بتوں کی عبادت کا حکم دیا ہے تو گویا انھوں نے شیطانوں کو معبود ٹھہرایا ہے۔

﴿ وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ یعنی کل عابد و معبود آگ میں ہوں گے، اس سے نہ نکلیں گے، کسی طرح اس سے

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٣۔ ٣٤٤) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٨) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٩)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٨٤۔ ٥٨٥) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٩)

اُن کی خلاصی نہ ہوگی ابد الآباد اسی میں پڑے رہیں گے۔ ﴿ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ ﴾ یعنی کفار کے لیے جو آگ میں داخل ہوئے ہیں زفیر ہوگی۔ مغموم آدمی کی سانس کی آواز کو زفیر کہتے ہیں اور اس جگہ مراد انین (نالہ و نالیدن) وتنفسِ شدید ہے، اس کا بیان سورت ہود میں گزر چکا ہے۔[1] (امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ سے مراد اصنام ہوں گے تو ﴿ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ ﴾ من جملہ اضافت فعل بعض طرف کل کے واسطے تغلیب کے ہوگا۔[2]) علامہ نسفی رحمہ اللہ نے انین و بکاء وعویل کہا ہے۔[3] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا زفیر یہ ہے کہ آدمی اپنے سینے کو غم سے پر کرے۔ پھر سانس لے۔ یا زفیر شدتِ عذاب ہے، جو اُن کو پہنچے گا۔[4] قاموس میں ہے: "زفر یزفر" باب ضرب سے ہے، یہ جب کہتے ہیں کہ آدمی سانس کھینچنے کے بعد اس کو نکالے۔[5]

﴿ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ یعنی مارے شدتِ ہول کے بعض بعض کی زفیر کو نہ سنیں گے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم کے جوش مارنے کے سبب سے کچھ نہ سنیں گے۔[6] کسی نے کہا اس لیے کہ وہ بہرے ہو کر زندہ ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] "اور ہم انھیں یومِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے۔" ان سے سننا اس لیے سلب کر لیا جائے گا کہ سننے میں ایک طرح کی راحت و اُنس ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایسی شے نہ سنیں گے جو اُن کو خوش کرے، بلکہ وہ بات سنیں گے، جو اُن کو بری لگے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر معبودوں کی طرف راجع ہے، یعنی معبود عابدوں کی چیخ و پکار اور شکوہ و شکایت کو نہ سنیں گے، معنی یہ ہیں کہ ان کی فریاد رسی نہ کریں گے نہ اُن کو نفع پہنچائیں گے، جس طرح "سمع اللہ لمن حمدہ" کہا جاتا ہے، یعنی اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی۔ کسی نے کہا کہ کفار کی طرف پھرتی ہے، یعنی وہ ہرگز کچھ نہ سنیں گے۔ اس لیے کہ عذاب کی زیادتی کے واسطے گونگے اندھے اُٹھائے جائیں گے۔ یا یہ معنی ہیں کہ کوئی نافع بات نہ سنیں گے، کیوں کہ معذب لوگوں کی آوازیں، یا عذاب پر مقرر کیے گئے فرشتوں کی آوازیں تو ضرور ہی سنیں گے۔ پھر جب اللہ پاک بدبختوں کا حال بیان کر چکا تو نیک بختوں کا حال بیان کیا، پس فرمایا:

إِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝١٠١ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝١٠٢ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝١٠٣

بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی اور بھلائی مقدر ہو چکی ہے، وہ اس سے دور

---

[1] رقم الآية (١٠٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٩) [3] تفسير النسفي (٣/ ٩٢) [4] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٤)
[5] القاموس المحيط (١/ ٥١٢) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠)

رکھے جائیں گے ﴿101﴾ وہ اس کی آہٹ (بھی) نہ سنیں گے، اور وہ ان (نعمتوں) میں ہمیشہ رہیں گے جو ان کے دل چاہیں گے ﴿102﴾ بڑی گھبراہٹ انھیں غم ناک نہیں کرے گی، اور فرشتے ان سے (یہ کہہ کر) ملیں گے: یہ ہے تمھارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿103﴾

مومنین کو جہنم سے محفوظ رکھیں گے:

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حسنیٰ" سے مراد رحمت ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کے علاوہ اوروں نے کہا کہ سعادت ہے،[1] جبکہ اللہ پاک نے دوزخ والوں کا اور اُن کے عذاب کا ذکر کیا، بہ سبب اس کے کہ انھوں نے اللہ پاک کے ساتھ شریک کیا تو اس پر سعادت والوں کے ذکر کا عطف فرمایا، من جملہ مومنین کے جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے واسطے اللہ پاک کی طرف سے سعادت سابق ہو چکی ہے اور دنیا میں اعمال صالح کر چکے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [يونس: ٢٦] "جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید (دیدارِ الٰہی) ہے۔" نیز فرمایا: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ [الرحمن: ٦٠] "احسان کی جزا تو احسان ہی ہے۔" پس جس طرح انھوں نے دنیا میں حسنِ عمل کیا، اسی طرح اللہ پاک نے بھی ان کے مرجع و مآب کو اچھا فرمایا اور عذاب سے اُن کو نجات دی اور اُن کے واسطے ثوابِ جزیل مقرر کر دیا، پس فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿101﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا﴾ حسیسِ نار سے مراد آگ کی سوزش ہے جسموں میں، یعنی دوزخ والے جو دوزخ میں جلیں گے، نیک لوگوں کو اُن کے جسم جلنے کی آواز تک بھی نہ آئے گی۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو عثمان سے روایت کیا ہے کہ "حسیس" سانپ ہیں، پل صراط پر کافروں کو ڈسیں گے۔ پھر جس وقت وہ اُن کو ڈسیں گے تو کہیں گے حِس حِس۔[2] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ پل صراط پر سانپ ہوں گے، وہ حِس حِس پکاریں گے۔[3] (فتح القدير) مجمع البحار میں ہے کہ "حِسّ" بکسر حائے مہملہ و تشدید سین مہملہ ایک کلمہ ہے کہ جس وقت آدمی کو کوئی ناخوشگوار شے غفلت میں پہنچتی ہے اور اس کو جلا دیتی ہے، جیسے: انگارہ یا ضرب وغیرہ تو اس وقت اس کلمے کو کہتا ہے۔[4]

﴿وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ﴾ پس اللہ پاک نے محذور و مرہوب سے صحیح و سالم رکھا اور مطلوب و محبوب اُن کو دے دیا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے برادر عمزادہ نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے: "قال وسمر مع علي ذات ليلة" یعنی ایک رات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس نے بات چیت کی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ فرمایا کہ میں ان میں سے ہوں اور

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٩) [3] فتح القدير (٣/ ٥٨٩) [4] مجمع بحار الأنوار (١/ ٥١٤)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اُن میں سے ہے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اُن میں سے ہے اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ اُن میں سے ہے اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اُن میں سے ہے اور سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اُن میں سے ہے، یا کہا: سیدنا سعد رضی اللہ عنہ اُن میں سے ہے۔ راوی نے کہا کہ نماز کی تکبیر کہی گئی تو وہ کھڑے ہو گئے اور میں اُن کو گمان کرتا ہوں کہ اپنے کپڑے کو کھینچتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ﴾ امام شعبہ رحمہ اللہ نے باسناد خود محمد بن حاطب سے روایت کیا ہے۔ کہا میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی ہیں۔[1] (ورواه ابن أبي حاتم أيضا و رواه ابن جرير من حديث يوسف بن سعد و ليس بابن باهك عن محمد بن كعب عن علي فذكره و لفظه عثمان منهم)

علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ لوگ اولیاء اللہ ہیں کہ پل صراط پر ایسا گزرنا گزریں گے کہ بجلی سے بھی زیادہ تیز ہوگا اور کفار گھٹنوں کے بل اس میں باقی رہ جائیں گے،[2] پس یہ اس کے مطابق ہے، جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا پوجے گئے ہیں، ان میں استثنا کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ عزیر اور مسیح علیہما السلام اُن میں سے خارج ہو گئے، جیسا کہ حجاج بن محمد اعور جریج سے اور عثمان بن عطا سے دونوں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ پھر استثناء کیا تو کہا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى ﴾ پس کہتے ہیں کہ یہ لوگ فرشتے اور عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی طرح کے اور لوگ جو اللہ کے سوا پوجے گئے ہیں۔ امام عکرمہ، حسن اور ابن جریج نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ جو شے اللہ کے سوا پوجی جاتی ہے، وہ آگ میں ہے، مگر سورج چاند اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اس کی اسناد ضعیف ہے۔

امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ کہا عیسیٰ و عزیر علیہما السلام و ملائکہ ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: عیسیٰ، مریم علیہما السلام، ملائکہ، شمس اور قمر۔ اسی طرح سعید بن جبیر و ابو صالح اور بہت سے لوگوں سے مروی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک نہایت غریب حدیث روایت کی ہے، وہ یہ ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آیتِ مذکور کی تفسیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ، عزیر علیہما السلام اور ملائکہ۔[3] بعض مفسرین نے ابن الزبعری کا قصہ اور مشرکین سے مناظرہ کا ذکر کیا ہے۔

امام ابوبکر ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن زبعری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، عرض کی کہ تم زعم کرتے ہو کہ اللہ نے تم پر آیت نازل کی ہے: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ اور کہا کہ سورج، چاند، ستارے، فرشتے، عزیر اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پوجے گئے ہیں، یہ سب ہمارے معبودوں کے ساتھ آگ میں

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٩)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٥٣٨_ ٥٤٠) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٨_ ٢٤٦٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٤_ ٢٦٥)

ہوں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝٥٧ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٥٧۔ ٥٨] ''اور جب (عیسیٰ) ابن مریم کی مثال بیان کی گئی تو آپ کی قوم اس (خوشی) سے چلا اٹھی۔ اور انھوں نے کہا: کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ (عیسیٰ؟) انھوں نے آپ سے یہ مثال محض جھگڑنے کے لیے بیان کی، بلکہ یہ لوگ نرے جھگڑالو ہیں۔'' پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾[1] (رواه الحافظ أبو عبد الله في كتابه الأحاديث المختارة. وأخرجه أبو داود في ناسخه و ابن المنذر و الطبراني من وجه آخر عنه نحوه أيضا بأطول منه) فتح القدير.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس وقت ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا کہ ملائکہ، عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ﴾ الآلهة التي يعبدون ﴿ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (وروي عن أبي كدينة عن عطاء بن السائب عن سعيد بن جبير عن أبي عباس مثل ذلك) اور کہا کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾[2] محمد بن اسحق بن یسار رحمہ اللہ نے ''کتاب السیرۃ'' میں کہا ہے کہ مجھے جو بات پہنچی ہے اس میں یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولید بن عقبہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے۔ پھر نضر بن حارث آیا، یہاں تک کہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور مسجد میں قریش کے بہت سے آدمی تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے گفتگو کی، یہاں تک کہ اس کو خاموش کر دیا اور اس پر اور اُن لوگوں پر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝٩٨ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٩٩ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۝١٠٠ ﴾.

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن زبعری سہمی آیا، یہاں تک کہ اُن کے ساتھ بیٹھ گیا، پس ولید بن مغیرہ نے عبداللہ بن زبعری سے کہا: ''واللّٰه! ما قام النضر بن الحارث لابن عبدالمطلب آنفا و لا قعد''، یعنی ابھی نضر بن حارث نے عبدالمطلب کے فرزند کے لیے نہ قیام کیا نہ قعود، مطلب یہ ہے کہ اُن کے مقابلے میں اس سے کچھ نہ بنا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زعم کیا ہے کہ ہم اور جن معبودوں کو ہم پوجتے ہیں، وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس پر عبداللہ بن زبعری نے کہا: خبردار! واللہ! اگر میں اس کو پالیتا تو البتہ اس پر غالب ہو جاتا، پس تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کہ جو شے اللہ کے سوا پوجی جاتی ہے، جہنم میں ہے مع اُن لوگوں کے جنھوں نے اس کو پوجا، پس ہم تو فرشتوں کو پوجتے ہیں اور یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو پوجتے ہیں۔ ولید نے اور جو لوگ مجلس میں اس کے ساتھ تھے، انھوں نے عبداللہ بن زبعری کی بات سے تعجب کیا اور گمان کیا کہ عبداللہ حجت اور بحث میں غالب ہوگیا۔ پھر یہ بات

[1] فتح القدير (٣/ ٥٨٩)　[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٥)

رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ شخص کہ اس بات کو پسند کرے کہ اللہ کے سوا پوجا جائے تو وہ اس شخص کے ہمراہ ہوگا، جس نے اس کو پوجا وہ تو شیطان کو پوجتے ہیں اور اس کو جس نے ان کو شیطان کی عبادت کا امر کیا ہے۔

اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ ﴾ یعنی عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام اور وہ لوگ جو احبار و رہبان میں سے پوجے گئے اور وہ اللہ کی اطاعت پر گزرے ہیں۔ پھر گمراہوں میں سے جو لوگ اُن کو پوجتے ہیں، انھوں نے اللہ کے سوا اُن کو رب ٹھہرایا ہے۔ ذکر کرتے ہیں کہ وہ لوگ فرشتوں کو پوجتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴾ [مريم: ٨٨] ''اور انھوں نے کہا: رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔'' ان کا قول تو یہ ہے کہ اللہ رحمٰن نے بھی اولاد اختیار کی ہے: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿26﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿27﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿28﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٦۔ ٢٩] ''بلکہ وہ (فرشتے) تو (اللہ کے) معزز و مکرم بندے ہیں۔ وہ بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے، اور وہ اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے، اور وہ صرف اس کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ پسند کرے گا اور وہ اس کے خوف سے ڈرنے والے ہیں۔ اور ان میں سے جو یہ کہے کہ بے شک اللہ کے سوا میں بھی معبود ہوں تو اسے ہم اس (بات) کا بدلہ جہنم دیں گے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔''

اور عیسیٰ علیہ السلام کا حال جو ذکر کیا گیا اور وہ اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں اور ولید اور اس کے حاضرین لوگ عبداللہ کی حجت و بحث سے متعجب ہوئے، لہٰذا اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿57﴾ وَقَالُوْۤا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿58﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿59﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا ﴾ [الزخرف: ٥٧۔ ٦١] ''اور جب (عیسیٰ) ابن مریم کی مثال بیان کی گئی تو آپ کی قوم اس (خوشی) سے چلا اُٹھی۔ اور انھوں نے کہا: کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ (عیسیٰ؟) انھوں نے آپ سے یہ مثال محض جھگڑنے کے لیے بیان کی، بلکہ یہ لوگ نرے جھگڑالو ہیں۔ وہ (عیسیٰ) تو صرف ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنا دیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو تم سے فرشتے بنا دیتے جو زمین میں (تمھارے) جانشین ہوتے۔ اور بے شک وہ (عیسیٰ) قیامت کی ایک نشانی ہے، لہٰذا تم اس (قیامت کے آنے) میں شک نہ کرو۔''

یعنی مردوں کا زندہ کرنا اور بیماریوں کا اچھا کرنا اُن کے سوا اور نشانیاں جو میں نے اس کے ہاتھوں پر رکھی

ہیں، لہٰذا یہی عیسیٰ علیہ السلام کے علمِ ساعت پر دلیل ہونے میں کافی ہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے کہ تم ان نشانیوں میں شک مت کرو اور میری پیروی کرو، یہ سیدھی راہ ہے۔[1] اور یہ جو ابن زبعری نے کہا ہے ایک بڑی خطا ہے، مگر اتنی بات ہے کہ آیت جو نازل ہوئی ہے، پس اسی لیے کہ اہلِ مکہ بتوں کو پوجتے تھے، جو جماد ہیں، کسی طرح کا عقل وشعور نہیں رکھتے، خاص انھیں کو اس بارے میں خطاب کیا ہے، تاکہ یہ دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ ہو جائے ان کے پوجنے والوں کو اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ پھر مسیح اور عزیر علیہما السلام کیوں اس پر وارد کیے جاتے ہیں اور اُن کی طرح کے اور لوگ جن کے واسطے عملِ صالح ہے اور اپنے عابدین کی عبادت سے خوش نہیں ہیں اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں جواب میں اس بات پر اعتماد کیا ہے کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ عرب کے نزدیک غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے، یعنی پھر مسیح اور عزیر علیہما السلام وغیرہما اس میں کیوں کر داخل ہوں گے۔ عبد اللہ ابن زبعری اس کے بعد مسلمان ہوگیا، یہ شخص مشہور شعرا میں سے تھا، پہلے مسلمانوں کی ہجو کیا کرتا، پھر عذر کر کے یوں کہا: ؎

يَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ إِنَّ لِسَانِيْ رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ إِذْ أَنَا بُوْر
إِذْ أُجَارِي الشَّيْطَانَ فِيْ سَنَنِ الغَيِّ وَمَنْ مَالَ مَيْلُهٗ مَثْبُوْرٌ

یعنی اے پیغمبر بادشاہ کے! میری زبان بند کرنے والی ہے اس کو جو کہ میں نے کھولا ہے، جب کہ میں مرد ہالک، فاسد بے خبر تھا، جبکہ گمراہی کی راہ میں شیطان کے ساتھ چلتا تھا اور جو شخص راہِ حق سے مائل ہوا، اس کا میل ہلاک شدہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ کفر اور گمراہی کی حالت میں مَیں نے مسلمانوں کی ہجو کی ہے، اب ہدایت کے بعد اُن کی مدح کروں گا، پہلے زبان کو ہجو سے کھولا تھا، اب ہجو سے بند کر کے مدح سے کھولوں گا، یہی فتق کا رتق ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد موت ہے۔ (رواہ عبد الرزاق عن یحییٰ بن ربیعة عن عطاء) کسی نے کہا ہے کہ فزعِ اکبر سے مراد صور میں پھونکنا ہے۔ (قالہ العوفي عن ابن عباس و آبو سنان سعید بن سنان الشیباني) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ جبکہ نار کی طرف بندے کو حکم کیا جائے گا۔ کسی نے کہا کہ جب کہ دوزخ اہلِ دوزخ پر بند کر دی جائے گی۔[2] (قالہ سعید بن جبیر و ابن جریج) کسی نے کہا: جب کہ بہشت اور دوزخ کے درمیان موت ذبح کی جائے گی۔ (قالہ أبوبکر الھذلي فیما رواہ ابن أبي حاتم عنه) ﴿ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ یعنی معاد کے دن جس وقت وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو فرشتے اُن کو خوش خبری دیں گے، اُن سے کہیں گے: ﴿ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی اب تم آرزو کرو اس شے کی جو تم کو خوش کرے۔[3] (کذا في ابن کثیر)

---

[1] السیرة النبویة لابن هشام (۲/ ۲۰٤۔ ۲۰۵) [2] تفسیر الطبري (۱۸/ ٥٤١۔ ٥٤٢) [3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲٦٤۔ ۲٦٦)

امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ علما نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ إِنَّ ﴾ بہ معنی "إلّا" ہے، یعنی "إلا الذين سبقت لهم منا الحسنى" [1] حسنیٰ تانیث ہے احسن کی، یعنی ایسی خصلت جو کہ حسن و خوبی میں فضیلت دی گئی ہے، یا ساری خصلتوں سے خوب تر ہے، یا منزلتِ حسنیٰ، یعنی درجہ ورُتبہ خوب تر، مراد اس سے سعادت ہے، یا توفیق طاعت کی، یا ثواب کی خوش خبری، یا جنت کا وعدۂ جمیل، یا جنت کی خوش خبری دینا، یا خود جنت، یا یہ معنی ہیں کہ طاعت پر خوش خبری کے ساتھ ہمارا کلمہ ان کے واسطے سابق ہو چکا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اس کو ظاہر تر کہا ہے۔ [2] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مِنَّا ﴾ ﴿ سَبَقَتْ ﴾ سے متعلق ہے، یا حسنیٰ سے حال ہے۔ ﴿ أُولَٰئِكَ ﴾ کا اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے، جو اس صفت کے ساتھ موصوف ہیں۔ [3]

﴿ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ﴾ یعنی جن کے واسطے ہماری طرف سے نیک خصلت مقرر ہو چکی ہے، وہ لوگ جہنم سے دور کیے گئے ہیں، اس لیے کہ وہ تو جنت میں پہنچے، یا اس لیے کہ اعلیٰ علیین کی طرف اُٹھا لیے گئے۔ جنید رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "سبقت لهم منا العناية في البداية فظهرت لهم الولاية في النهاية" [4] یعنی شروع میں اُن کے واسطے ہماری طرف سے عنایت سابق ہو چکی تو آخر میں اُن کے لیے ولایت ظاہر ہوئی۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: اگر کوئی کہے کہ وہ لوگ جہنم سے دور کیوں کر ہوں گے، حالانکہ اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ [مریم: ۷۱] "اور تم میں سے جو بھی ہے، وہ اس (جہنم) پر وارد ہونے والا ہے۔" اور اس کا وارد ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے قریب ہو تو کہیں گے کہ باوجود اس پر وارد ہونے کے اس کے عذاب اور تکلیف سے دور رہیں گے، یا معنی ہیں کہ ورود کے بعد اس سے دور رہیں گے نجات دینے کے سبب سے، جس کا ذکر ورود کے بعد آیا ہے۔ اسی طرح انموذج میں بھی ذکر کیا ہے۔

جملہ ﴿ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ﴾ ﴿ مُبْعَدُونَ ﴾ کا بدل ہے، اس لیے کہ اس کی جگہ میں آ سکتا ہے، اس سے بے پروا کر سکتا ہے، یعنی اس کے بجائے یوں کہہ سکتے ہیں: "أولئك لا يسمعون" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ أُولَٰئِكَ ﴾ کی دوسری خبر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مُبْعَدُونَ ﴾ کی ضمیر مستتر سے حال ہو۔ حس و حسیس وہ آواز ہے، جس کو تو کسی شے سے سنتا ہے، جبکہ وہ تیرے قریب سے گزرتی ہے، یعنی جس وقت وہ جنت کے اندر اپنے گھروں میں اُتر پڑیں گے تو جہنم کی آواز کو اور دوزخیوں کی حرکت کو اور اس کے شعلے مارنے کی حرکت کو نہ سنیں گے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: "صوتها الذي يحس و حركته تلهبها" یعنی اس کی آواز کو نہ سنیں گے، جو کہ محسوس ہوتی ہے، جہنم سے دور کرنے میں یہ مبالغہ ہے، یعنی وہ لوگ اس کے قریب نہ ہوں گے، تا کہ اس کی آواز کو اور اس کے لوگوں

---

[1] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٤)
[2] تفسير أبي السعود (٦/ ٨٧)
[3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٨)
[4] تفسير الرازي (٢٢/ ١٩٦)

کی آواز کو نہ سنیں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ان کے دور ہونے کی تاکید ہے، کیوں کہ جو کوئی اس سے قریب ہوگا تو وہ بھی اس کی حسیس کو سن لے گا۔ پھر اگر کوئی کہے: کیا جنت والے دوزخ والوں کو نہ دیکھیں گے؟ پھر کس طرح حسیسِ نار کو نہ سنیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے اس کو تاکید پر محمول کیا تو یہ سوال دور ہو گیا۔[1]

﴿ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴾ شہوت نفس کی لذت طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ مَا ﴾ سے مراد نعیم و کرامت ہے، یعنی وہ لوگ نعیم و کرامت میں جس کو ان کا جی چاہے گا، ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ہمیشہ انتہائی نعمتوں میں رہیں گے، کیوں کہ بہشت میں ایسی چیزیں ہیں، جن کو جی چاہتا ہے اور آنکھیں اُن سے مزہ لیتی ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْۤ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ٣١] ''اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تمھارے جی چاہیں گے اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تم مانگو گے۔'' اصل عبارت یوں ہے: ''وَهُمْ خَالِدُوْنَ فِيْمَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ'' لیکن اہتمام اور اختصاص کے واسطے ظرف کو مقدم کر دیا ہے۔

﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ﴾ اللہ پاک نے پہلے یہ بیان کیا کہ اس نے اُن کو دوزخ سے نجات دی، اس کے بعد یہ بیان کیا کہ ان کو گھبراہٹ سے بالکل نجات دی، کیوں کہ جب اُن کو فزعِ اکبر غمگین نہ کرے گی تو ضروری ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی انھیں غم ناک نہ کرے گا۔ اسی طرح امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] ابو جعفر اور ابن محیصن نے بضمِ یائے تحتیہ و کسرِ زائے معجمہ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے بفتحِ یا و ضمِ زا سے پڑھا۔ مصباح میں کہا ہے کہ ''حزن'' باب قتل سے ہے۔[3] یزیدی نے کہا ہے کہ ''حزنه'' قریش کی لغت ہے اور ''أحزنه'' بنی تمیم کی لغت ہے۔[4] فزعِ اکبر سے مراد بعث و حساب و عتاب وغیرہ اہوالِ روزِ قیامت ہیں۔ امام نسفی اور بیضاوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد نفخہ اخیرہ ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾[5] [النمل: ٨٧] ''اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے (سب) گھبرا جائیں گے۔'' یا مراد کافر کا دوزخ کی طرف جانا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[6]

یا جس وقت دوزخ اہلِ دوزخ پر بند کر دی جائے گی، یعنی اس کے بعد کہ اللہ پاک کو جس کا نکالنا منظور ہوگا، اس کو نکال لیا جائے گا، پھر بند ہو جائے گی اور نکلنے سے نا اُمید ہو جائیں گے، اس وقت اُن کو بڑی گھبراہٹ ہوگی۔ یا جس وقت دوزخ و جنت کے درمیان میں موت ذبح کر دی جائے گی۔ اسے چت کبرے مینڈھے کی صورت میں لا کر ذبح کریں گے تو دوزخ والے نکلنے سے مایوس ہو جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(1) تفسیر النسفي (٣/ ٩٢) (2) تفسیر أبي السعود (٦/ ٨٧) (3) المصباح المنیر (١/ ٧٣)
(4) تفسیر القرطبي (١١/ ٣٤٦) (5) تفسیر النسفی (٣/ ٩٢) تفسیر البیضاوی (٤/ ١١٠) (6) تفسیر الجلالین (١/ ٤٣١)

نے فرمایا ہے: تین شخص مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے قیامت کے دن، فزعِ اکبر ان کو ہولناک نہ کرے گی: ایک وہ آدمی ہے کہ اس نے کسی قوم کی امامت کی اور وہ اس سے راضی ہیں اور ایک وہ آدمی ہے کہ ہر دن اور رات میں اذان کہتا ہے۔ اور ایک وہ غلام ہے کہ اس نے اللہ کا حق ادا کیا اور اپنے موالی کا حق ادا کیا۔[1] (أخرجه أحمد والترمذي وحسنه)

﴿ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ یعنی فرشتے مبارک بادی دیتے ہوئے ان کا استقبال کریں گے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا کہ جنت کے دروازوں پر کھڑے ہوں گے، ان کو مبارک باد دیں گے۔ امام نسفی اور خازن رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قبروں سے نکلنے کے وقت فرشتے اُن کا استقبال کریں گے۔ اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ وہ دونوں حال میں استقبال کریں اور اُن سے کہیں: ﴿ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾[2] یعنی یہ وقت تمھارے ثواب کا ہے، جس کا تمھارے رب نے تم سے دنیا میں وعدہ کیا تھا اور تم کو اس کی خوش خبری دی جاتی تھی۔ اب تم خوش ہو جاؤ۔ ﴿ وَتَتَلَقّٰىهُمُ ﴾ کے پہلے قول مقدر ہے تقدیر یہ ہے: "وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ هٰذَا يَوْمُكُمْ... الخ" ﴿ فِيْ مَا اشْتَهَتْ ﴾ سے لے کر یہاں تک جتنے جملے ہیں، اُن میں سے ہر ایک اپنے ماقبل سے حال ہے یا جملۂ مستانفہ ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ سے یہاں تک۔ اس سے مراد عام مومنین ہیں، جو کہ ایمان لائے اور عملِ صالح کیا۔ مسیح، عزیر علیہما السلام اور ملائکہ مراد نہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس قول کو بہ لفظ قیل ذکر کیا ہے، دلیل اس کی وہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے، جو اوپر گزر چکا ہے۔[3] اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ جب ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ نازل ہوئی تو ابن زبعری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، عرض کی: یا محمد! کیا تمھارا زعم نہیں ہے کہ عزیر علیہ السلام نیک مرد تھے اور عیسیٰ علیہ السلام نیک مرد تھے اور مریم علیہا السلام نیک بی بی تھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ تو ابن زبعری بولا کہ ملائکہ، عیسیٰ، عزیر اور مریم علیہم السلام اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں، پس یہ لوگ آگ میں ہوں گے؟ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ اس باب کے احادیث و آثار اول گزر چکے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس قول کو اول لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک مختار یہی ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی قول معلوم ہوتا ہے اور دوسرے قول کی دلیل کو بلفظ "روي" ذکر کیا ہے۔[4]

آیتِ باب کی تفسیر میں امام بیضاوی کے قول کا حاصل یہ ہے کہ ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ سے اس بات کا احتمال

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٦) اس کی سند میں "ابو الیقظان" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ٤١)

[2] تفسير البغوي (٥/ ٣٥٧) تفسير النسفي (٣/ ٩٢) تفسير الخازن (٤/ ٣٢٥) تفسير الجلالين (١/ ٤٣١)

[3] تفسير النسفي (٣/ ٩٢) [4] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٠) تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٩۔ ١١٠)

ہے کہ اس سے مراد اوثان و ابلیس و اعوانِ ابلیس ہوں، اس لیے کہ جب مشرکین نے ان کی اطاعت کی تو اُن کے عابدوں کے حکم میں ہوئے، یعنی یہ دعویٰ کیا کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ کا عاقل و غیر عاقل کو عام ہے، اس دعوے پر یہ دلیل ذکر کی کہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ جب آپ نے مشرکوں پر آیتِ مذکور پڑھی تو ابن زبعری نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ میں تم پر غالب آ گیا، قسم ہے ربِ کعبہ کی! کیا یہود نے عزیر علیہ السلام کو نہیں پوجا اور کیا نصاریٰ نے مسیح کو اور بنو ملیح نے فرشتوں کو نہیں پوجا؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ انھوں نے تو شیاطین کو پوجا، جنھوں نے اُن کو اس کا امر کیا۔ (زبعری بکسرِ زائے معجمہ و فتح بائے موحدہ وسکونِ عینِ مہملہ و فتح رائے مہملہ و الف مقصورہ، معنی اس کے بدخلق درشت مرد کے ہیں، عبداللہ قرشی والد کا لقب ہے، اس قصے کے بعد اسلام لایا۔[1] (كذا قال الشهاب)) ابن زبعری کا یہ سوال بے وجہ ہے، اس لیے کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ کا ذوی العقول کے لیے استعمال نہیں ہوتا، پس ﴿ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴾ ملائکہ کو شامل نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ من جملہ عقلا ہیں، بلکہ اصنام پر مقصور ہوگا، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس سے مقابلہ کیا اور دوسری دلیل سے اس کو الزام دیا، منظورِ خاطر اسے اس بات پر آگاہ کرنا تھا کہ اس کے شبہہ کو دفع کرنے کے لیے متعدد طریقے ہیں۔ (كذا في شيخ زاده) اس پر اللہ پاک نے آیت: ﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ ... الخ ﴾ نازل فرمائی۔

اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ ابن زبعری نے جو ﴿ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴾ کو عاقل اور غیر عاقل کے واسطے عام کیا تو نبی اکرم ﷺ نے اس پر اس بات کو رد نہ فرمایا، بلکہ اس کو مان لیا اور دوسری وجہ سے اس کو جواب دیا، لیکن یہ جواب غور کرنے کے قابل ہے، کیوں کہ یہود وغیرہم نے ان مکرم معظم لوگوں کو جو پوجا ہے۔ تو یہ جواب اس کی نفی نہیں کرتا صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہود وغیرہم نے ان بزرگوں کو پوجا ہے، پس انھوں نے اس میں شیطان کی اطاعت کر کے شیاطین کو پوجا ہے۔ پھر ابن زبعری کے قول کا جواب کیوں کر ٹھیک ہوگا، ہاں ممکن ہے کہ یوں کہیں کہ جو شخص اس طرح پوجا جائے کہ لذاتہ عبادت کا مستحق نہ ہو اور نہ عبادت کا حکم کرے، نہ اپنے پوجے جانے کو درست رکھے، نہ اس سے راضی ہو تو ایسا شخص فی الحقیقت معبود نہیں ہوتا اور معبود جو ہوگا تو بطورِ صورت و مجاز کے ہوگا۔ معبود فی الحقیقت وہی ہوتا ہے جو اس کا حکم کرے، کیوں کہ عبادت نام ہے اطاعت و فرماں برداری کا، اور اطاعت اور فرماں برداری نہ ہوگی مگر اسی کے لیے جو اس کا امر کرے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ان مکرم لوگوں کے داخل ہونے کی زیر ﴿ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴾ کے نفی کی ہے۔ پس فرمایا کہ انھوں نے تو شیاطین کو پوجا ہے۔ پھر امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بنیاد پر خطاب عام ہوگا اور کلمہ ﴿ مَا ﴾ مأول ٹھہرے گا ﴿ مِنۡ ﴾ کے ساتھ یا اس شے کے ساتھ جو کہ عاقل اور غیر عاقل دونوں کو عام ہوگی۔[2] یعنی جس تقدیر پر کہ "ماتعبدون من دون الله" اوثان وغیرھا پر محمول ہوگا تو ﴿ اِنَّكُمۡ

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٢٧٤) [2] تفسير البيضاوى (٤/ ١٠٨)

﴿ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ کا خطاب مشرکین وغیرہم کو شامل ٹھہرے گا، جیسے: یہود ونصاریٰ و بنو ملیح، یہ ایک بطن ہے خزاعہ کا۔

یہ لوگ اس کے قائل ہیں کہ اللہ پاک نے معاذ اللہ جن کی سردار عورتوں سے مصاہرت کی تو اُن سے فرشتے پیدا ہوئے بخلاف اس کے کہ جب ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ کو خاص اصنام پر محمول کریں تو خطاب خاص مشرکوں کو ہوگا۔

پھر امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمومِ خطاب پر یہ روایت دال ہے کہ ابن زبعریٰ نے کہا: یہ ایک ایسی شے ہے کہ ہمارے معبودوں کے واسطے خاص ہے یا ہر ایک کے لیے ہے جو اللہ کے سوا پوجا گیا ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بلکہ ہر ایک کے واسطے ہے، جو اللہ کے سوا پوجا گیا ہے اور قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ... الخ ﴾ بیان ہوگا واسطے تجوز کے، یا بیانِ تخصیص ہوگا کہ خطاب سے متاخر ہوگیا۔[1]

شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اول اس تقدیر پر ہوگا کہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ... الخ ﴾ سے مقصود بیان شمولِ حکم کا واسطے غیر اہلِ حسنی کے عقلاء سے ہو اور دوسرا اس تقدیر پر ہوگا کہ مقصود تخصیص ماتعبدون کی غیر اہلِ حسنیٰ کے ساتھ ہو، باوجود اس کے کہ وہ فی نفسہ اہلِ حسنی و غیر اہلِ حسنی کو شامل ہے۔ دونوں تقدیر کی بنیاد پر ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ قبیل بیان تفسیر سے ٹھہرے گا اور ایسے بیان کی تاخیر وقت حاجت سے باتفاق جائز نہیں ہے۔ یعنی عمل کی طرف حاجت ہے، اس لیے کہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔

رہا جواز تاخیرِ بیان کا خطاب کے وقت سے، لہٰذا اس میں حنفیہ وشافعیہ کا اختلاف ہے، شافعیہ نے اس کو جائز کہا ہے، اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ نازل فرمائی اور ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ کا نزول اس سے متاخر ہوا اور وہ بیان ہے پہلی آیت کا بیانِ تجوز یا بیانِ تخصیص۔ یہاں تک کہ ابن زبعری اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان جو قصہ گزرا سو گزرا۔ حنفیہ نے اس استدلال کا یہ جواب دیا ہے کہ ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ عیسیٰ، عزیر علیہما السلام اور ملائکہ کو حقیقتاً شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ کلمہ "ما" کا غیر عقلا کے واسطے ہے، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ابن زبعریٰ سے فرمایا: تجھے کس چیز نے اپنی قوم کی لغت سے جاہل کیا اے لڑکے! کیا تو نے نہ جانا کہ ﴿ مَا ﴾ لا یعقل کے واسطے ہے، اس بنیاد پر ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ بیانِ تقریر ہوگا اور بیان تقریر کا متراخی ہونا صحیح ہے۔ رہا سوال ابن زبعریٰ کا، لہٰذا وہ عیب جوئی کے طریق پر وارد ہوا ہے، اس بنا پر کہ اس نے ﴿ مَا ﴾ کو بہ معنی "من" مجازاً مستعمل ٹھہرایا، یا اس کو تغلیب پر محمول کیا، اس لیے اپنے ظن فاسد کی بنا پر سوال کر بیٹھا، پھر نبی اکرم ﷺ نے اس کو جواب مذکور دیا، پس اس پر یوں رد فرمایا کہ ﴿ مَا ﴾ واسطے مالا یعقل کے ہے۔ اب ملائکہ وغیرہم کے ساتھ آیت پر جو نقض تم نے وارد کیا تھا، وہ وارد نہ ہوگا اور اگر یہ بات صحیح ہو جائے کہ نبی ﷺ نے یوں جواب دیا کہ اہلِ حسنیٰ کا جو تو نے ذکر کیا، انھوں نے ان کو نہیں پوجا۔ انھوں نے تو شیاطین

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٠٨)

کو پوجا، جنھوں نے ان کو اس کا امر کیا۔ لہٰذا یہ جواب بہ طریقِ تسلیم ہے، یعنی اگر یہ امر مان لیا جائے کہ ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ عقلائے فضلا کو شامل ہے، لیکن ہم اس کو نہیں مانتے کہ انھوں نے حقیقت میں اُن مکرم لوگوں کو پوجا ہو، بلکہ انھوں نے تو شیاطین کو پوجا ہے، جنھوں نے اُن کو اس کا امر کیا ہے۔

رہی یہ بات کہ ﴿ مَا ﴾ کے لفظ کے ساتھ جو اُن کی تعبیر کی ہے، پس یہ کچھ اس پر مبنی نہیں ہے کہ اس کو معنی مجازی پر محمول کیا ہو، بلکہ اس پر مبنی ہے کہ شیاطین کو بتوں کے ساتھ میں شمار کیا ہے۔ کون سے بت جو عقل وتمیز سے منزلوں دور ہیں۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا یہ قول ہے: «بَلْ لِكُلِّ مَنْ عَبَدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ»[1] اگر یہ قول آپ سے صحیح ثابت ہو تو یہ بھی تسلیم پر مبنی ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ سے مراد شیاطین ہیں اور دونوں تقدیروں پر ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ نہ عقلا میں مجازاً مستعمل ہوگا نہ اہلِ حسنیٰ کو شامل ٹھہرے گا، یہاں تک کہ یوں کہا جائے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ... الخ ﴾ بیان ہے واسطے تجوز کے، یا بیان ہے واسطے تخصیص کے کہ خطاب سے متاخر ہوا، جس طرح کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، بلکہ یہ نہیں ہے، مگر بیان تقریر کا جس کا خطاب سے متراخی ہونا صحیح ہے۔ پس ساری روایتوں کی بنا پر آیت میں ایسی شے نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ تاخیر بیانِ وقت حاجت سے جائز ہے۔ چاہیے کہ غور کیا جائے، کیوں کہ مقام محلِ التفات ہے۔ قاله شيخ زاده.

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ
خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾

جس دن ہم آسمان کو لکھے ہوئے کاغذ کے لپیٹنے کی طرح لپیٹ دیں گے، جس طرح ہم نے پہلی تخلیق کی ابتدا کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ (یہ) وعدہ ہمارے ذمے ہے، بے شک ہم اسے (پورا) کرنے والے ہیں (104)

قیامت کے دن آسمان لپیٹ دیا جائے گا:

اللہ پاک فرماتا ہے کہ قیامت کے دن یہ کام ہونے والا ہے جس دن کہ ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح کاغذ کو طومار میں لپیٹتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٧] ''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے، وہ پاک ہے اور اس شرک سے بالا تر ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٦٧٩)

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن زمینوں کو مٹھی میں لے گا اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے۔[1] (انفرد به من هذا الوجه البخاري) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لپیٹ لے گا ساتوں آسمانوں کو اس مخلوق کے ساتھ جو اُن میں ہے اور ساتوں زمینوں کو اس مخلوق کے ساتھ جو اُن میں ہے اپنے داہنے ہاتھ میں۔ یہ سب کچھ اس کے ہاتھ میں ایک رائی کے دانے کی طرح ہوگا۔[2]

﴿ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ ''سجل'' سے مراد کتاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''سجل'' سے مراد اس جگہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ ''سجل'' ایک فرشتہ ہے، پس جس وقت وہ استغفار لے کر چڑھتا ہے تو اللہ پاک اس سے فرماتا ہے۔ والله أعلم۔ فتح القدیر میں یوں ہے: ''اکتبوها نورا'' کہ تو اس کو نور لکھ۔[3] (هكذا رواه ابن جرير عن أبي كريب عن ابن يمان به) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ''سجل'' ایک فرشتہ ہے۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم و ابن عساكر)

امام سدی رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے کہ ''سجل'' ایک فرشتہ نامہ ہائے اعمال پر مقرر ہے۔ پس جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا نامۂ اعمال ''سِجل'' کی طرف اُٹھایا جاتا ہے، وہ اس کو لپیٹتا ہے اور قیامت تک اس کو اُٹھا رکھتا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ ''سجل'' ایک صحابی کا نام ہے، نبی اکرم ﷺ کے لیے وحی لکھا کرتا تھا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح ہیں کہ ''اَلسِّجِلُّ هُوَ الرَّجُلُ'' یعنی سجل ایک شخص ہے۔[6] (أخرجه النسائي و ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه و ابن عساكر و زاد ابن مردويه بلغة الحبشة۔ فتح القدير۔)

دوسرے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ ''سجل'' نبی کریم ﷺ کا کاتب ہے۔ اسی طرح امام ابو داود اور نسائی رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔[7] (أخرج أبو داود و النسائي و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و الطبراني و ابن مندة في المعرفة و ابن مردويه و البيهقي في سننه و صححه عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: السجل كاتب

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٧) ② تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٠)

③ تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٠) فتح القدير (٣/ ٥٨٩) تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٣)

④ الدر المنثور (٥/ ٦٨٣) ⑤ تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٦٩)

⑥ تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٠٨) تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٣)

⑦ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٣٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٠٨) تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ١٢٦) فتح القدير (٣/ ٥٨٩۔ ٥٩٠)

للنبي ﷺ -فتح القدير-) امام ابن عدی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ « كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَاتِبٌ يُسَمَّى السِّجِلَّ وَهُوَ قَوْلُهُ: ﴿ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ﴾ » یعنی نبی اکرم ﷺ کا ایک کاتب تھا، سجل نام کا، کہا کہ جس طرح سجل کتاب کو لپیٹتا ہے، اسی طرح آسمان لپیٹا جائے گا۔ پھر امام ابن عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غیر محفوظ ہے۔[1] خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ سجل نبی کریم ﷺ کا ایک کاتب تھا۔ (أخرجه ابن منده و أبو نعيم في المعرفة و ابن مردويه و ابن عساكر- فتح-)(أخرجه ابن المنذر و ابن عدي و ابن عساكر- فتح-)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث انتہائی منکر ہے حدیثِ نافع عن ابن عمر سے اصلاً صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح یہ روایت ابو داود وغیرہ جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حفاظ کی ایک جماعت نے اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے، اگرچہ سنن ابو داود میں موجود ہے۔ من جملہ اس جماعت کے ہمارے شیخ حافظ کبیر ابو الحجاج مزی ہیں۔ فسح الله في عمره و نسأ في أجله و ختم له بصالح عمله۔ میں نے اس حدیث کے واسطے ایک جزء علاحدہ لکھا ہے۔ ولله الحمد۔ امام ابوجعفر ابن جریر رحمہ اللہ نے اس حدیث پر انکار کرنے کے واسطے قصد کیا اور اس کا خوب پورا رد کر ڈالا اور کہا ہے کہ صحابہ میں کوئی شخص سجل نام سے معروف نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے کاتب معروف و مشہور ہیں، ان میں کوئی بھی نہیں ہے، جس کا نام سجل ہو۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس باب میں سچ کہا۔ ان کا قول اس حدیث کی نکارت پر قوی تر دلیلوں میں سے ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے سجل کو اسمائے صحابہ میں ذکر کیا ہے، انھوں نے اسی حدیث پر اعتماد کرکے کہا ہے نہ کہ اس کے علاوہ پر۔ والله أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح یہ قول ہے کہ "سجل" صحیفہ کو کہتے ہیں۔ (أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم عنه في تفسير الآية قال: كطي الصحيفة على الكتاب- فتح-) علی بن ابی طلحہ و عوفی نے اُن سے اس کو روایت کیا ہے۔[3] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ بات کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح یہ قول ہے، سو یوں نہیں ہے، کیوں کہ علی بن ابی طلحہ اور عوفی دونوں ضعیف ہیں۔ پس زیادہ بہتر یہ ہے کہ لغوی معنی پر اعتماد کیا جائے اور اسی کی طرف مصیر ہو۔[4] (فتح) امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے اور بہت سے لوگوں نے اس پر تصریح کی ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے،[5] کیوں کہ لغت میں یہی معنی معروف ہیں، پس اس کی بنیاد پر کلام کے معنی یہ ہوں گے جس دن لپیٹیں گے ہم آسمان کو مانند لپیٹنے صحیفے کے۔ للكتاب، یعنی على الكتاب بہ معنی على المكتوب۔ مطلب یہ ہے کہ لام بہ معنی على ہے

[1] الكامل لابن عدي (٧/ ٢٠٥) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٤) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٤) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٠)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٩٠) [5] تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٤)

اور کتاب کے معنی مکتوب کے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ [الصافات: ۱۰۳] ''پھر جب دونوں مطیع ہوگئے اور اس (باپ) نے اس (بیٹے) کو پیشانی کی ایک جانب لٹا دیا۔'' ''أي علی الجبین'' لغت میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔[1] واللہ أعلم۔

﴿ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ یعنی یہ ضرور ہونے والا ہے جس دن کہ اللہ تعالیٰ خلائق کا اعادہ کرے گا خلقِ جدید کرکے، جس طرح کہ ان کو پہلی بار بنایا تھا، وہ اُن کے لوٹانے پر قادر ہے اور یہ واجب الوقوع، یعنی کہ لازمی طور پر واقع ہونے والا ہے، کیوں کہ یہ من جملہ وعدۂ الٰہی ہے، کون سا وعدہ؟ جس وعدے کے خلاف نہ ہو اور نہ وہ بدلا جائے اور وہ اس پر قادر ہے اور اسی واسطے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو وعظ و نصیحت کرنے کے لیے کھڑے ہوئے، پس فرمایا کہ بے شک تم محشور ہوگے اللہ عز وجل کی طرف ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے ختنہ۔ ﴿ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ اور تمام حدیث کو ذکر کیا۔[2]

(أخرجاه في الصحيحين من حديث شعبة ذكره البخاري عند هذه الآية في كتابه و قد روى ليث بن أبي سليم عن مجاهد عن عائشة رضي الله عنها عن رسول الله ﷺ نحو ذلك) عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ ہر شے ہلاک ہو جائے گی، جیسی کہ اول بار تھی۔[3] (أخرج ابن جرير عن ابن عباس رضي الله عنه في قوله: ﴿كما بدانا أول خلق نعيده﴾، يقول: نهلك كل شيء كما كان أول مرة۔ فتح۔)

﴿ يَوْمَ ﴾ کے عامل میں کئی قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ ''اذکر'' محذوف کا ظرف ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی پر قناعت کی ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو اول ذکر کیا ہے۔ فتح القدیر میں اس کو اظہر و اوضح کہا ہے۔ فتح البیان میں اسی پر اقتصار کیا ہے۔[4] دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ ﴾ کا ظرف ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اسی پر کفایت کی ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کو اول ذکر کیا ہے۔[5] تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ تَتَلَقّٰىهُمُ ﴾ کا ظرف ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یہی دو قول ذکر کیے ہیں۔[6]

شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ ''تَلَقّی'' فرشتوں کی جنت کے دروازہ کے نزدیک ہوگی اور آسمان کا لپیٹنا بزمانۂ کثیر اس پر متقدم ہے۔ پھر یہ دونوں ایک دن میں کیسے ہوں گے تو اس کا یہ جواب ہے کہ ''یوم الطی'' کا

[1] تفسير ابن كثير (۳/ ۲٦۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۳۴۹۔ ٦١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸٦۰۔ ۲۸۵۹) مسند أحمد (۱/ ۲۵۳، ٦/ ۵۳)

[3] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۴٦) فتح القدير (۳/ ۵۹۰)

[4] تفسير الجلالين (۱/ ۴۳۱) تفسير البيضاوي (۴/ ۱۱۰) فتح القدير (۳/ ۵۸٦) فتح البيان (۸/ ۳۷۷)

[5] تفسير الخازن (۴/ ۳۲۵) تفسير النسفي (۳/ ۹۲) [6] تفسير النسفي (۳/ ۹۲)

اسم زمانۂ ممتد پر اطلاق کیا جاتا ہے، جس کا مبدأ زمانہ طی ہے اور منتہی اس کا زمانۂ دخولِ جنت ہے اہلِ جنت کا اور اہلِ نار کا نار میں داخل ہونا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ﴿ تُوْعَدُوْنَ ﴾ کے عائد محذوف سے حال مقدر ہے: "أي توعدونه، يعني توعدون ذلك اليوم مقدرا كونه يوم نطوي السماء طيا مثل طي الرجل ما في يده من الطومار لأجل الكتابة" کیونکہ کتاب مصدر ہے مثل کتابت کے اور لام تعلیل کا ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ نشر طومار کا شرط ہے واسطے لکھنے کے، پس طی طومار کتابت کی علت کیوں کر ٹھیک ہوگا؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ اول طومار لپیٹا جاتا ہے اور لپٹا ہوا محفوظ رکھا جاتا ہے اس واسطے کہ کھولا جائے اور اس میں لکھا جائے حاجت کے وقت، لہٰذا اس کی طی سے مراد یہی طی سابق ہے۔ (قاله شيخ زاده)

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ان چاروں اقوال کو ذکر کیا ہے۔[1] پانچواں قول یہ ہے کہ ﴿ نُعِيْدُهٗ ﴾ کا ظرف ہے۔ "أي نُعيده يوم نطوي السماء". چھٹا قول یہ ہے کہ ﴿ تُوْعَدُوْنَ ﴾ کی ضمیر محذوف سے بدل ہے، تقدیر یہ ہے: "الذي كنتم توعدونه يوم نطوي" یہ دو قول فتح القدیر میں ذکر کیے ہیں۔[2] ساتواں قول یہ ہے کہ "أعني" محذوف کا معمول ہے، اس کو امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[3]

﴿ نَطْوِى السَّمَآءَ ﴾ اس میں کئی قراءتیں ہیں۔ ① ابو جعفر بن قعقاع و شیبہ و اعرج و زہری نے "تطوي" بضمِ مثناۃ فوقانی ورفع سماء پڑھا ہے۔ ② مجاہد نے "يطوي" بفتح مثناۃ تحتیہ بصیغہ معروف پڑھا ہے، بایں معنی کہ "يطوي الله السماء" ③ باقی قاریوں کی قراءت بنون عظمت ہے۔ ﴿ كَطَيِّ السِّجِلِّ ﴾۔ اس میں کئی قراءتیں ہیں۔ ① یہ ہے کہ بکسرِ سین مہملہ وجیم وتشدیدِ لام۔ ② بکسرِ سین وجیم وتخفیفِ لام۔ ③ امام ابو زرعہ بن عمرو و ابن جریر رحمہ اللہ نے بضمِ سین وجیم وتشدیدِ لام پڑھا ہے۔ ④ امام اعمش اور طلحہ رحمہما اللہ کی قراءت بفتحِ سین وسکونِ جیم وتخفیفِ لام ہے۔[4] ⑤ بضمِ سین وجیم وتخفیفِ لام۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب اس میں لغات ہیں۔[5]

﴿ لِلْكُتُبِ ﴾ امام اعمش، حفص، حمزہ، کسائی، یحییٰ اور خلف رحمہم اللہ نے بصیغۂ جمع پڑھا ہے۔ یہ قراءتِ سبعیہ ہے، باقی قاریوں نے "للكتاب" بصیغۂ مفرد پڑھا ہے۔[6] اس آیت میں "طي" دو معنی کا محتمل ہے: ایک معنی یہ ہیں کہ نشر کی ضد ہے۔ طی بہ معنی درنوشتن و درنوردیدن ہے، یعنی لپیٹنا اور نشر بہ معنی گستردن ہے، یعنی بچھانا۔ اسی باب سے ہے: ﴿ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ [الزمر: ٦٧] امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر مجموعات کی ہے[7] اور سماء سے مراد جنس سماء ہے۔ دوسرے معنی طی کے اخفا وتعمیہ ومحو کے ہیں، یہ اس قول سے ماخوذ ہے: "اطوعني هذا الحديث"

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٠) [2] فتح القدير (٣/ ٥٨٦) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٨)
[4] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٦۔ ٣٤٧) [5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٢٩)
[6] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٨) فتح القدير (٣/ ٥٨٦) [7] تفسير الجلالين (١/ ٦١٥)

یعنی تو اس قصے کو مجھ سے مخفی کر۔ "سجل" صحیفہ وطومار و نامہ و کاغذ کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "سجل" صک کو کہتے ہیں۔ صک معرب ہے چک کا، چک بفتح بہ معنی براءت و وظیفہ و مواجب و بیعانہ و حجت و منشور و قبالۂ خانہ و باغ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ "سجل" مشتق ہے مساجلت سے، اس کے معنی یہ ہیں: مکاتبت اور مساجلت کی اصل "سَجْل" سے ہے۔ "سَجل" ڈول کو کہتے ہیں، جس وقت تو ایک ڈول کھینچے اور دوسرا شخص ایک ڈول کھینچے تو عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "ساجلت الرجل" پھر باہم خط و کتابت کرنے اور باہم گفتگو کے واسطے مساجلت کا استعارہ کیا گیا۔ فضل بن عباس بن عتبہ بن ابی لہب کا قول ہے:

من يساجلني يساجل ماجدا يملأ الدلو إلىٰ عقد الكرب[1]

یعنی جو شخص مجھ سے ڈول بازی کرے گا تو ایسے شریف سے ڈول بازی کرے گا جو کہ ڈول کو اس کی رسی کی گرہ تک بھر دے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "سجل" ایک فرشتے کا نام ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ فرشتہ تیسرے آسمان میں ہے، جس وقت بنی آدم کے نامۂ اعمال مرنے کے وقت اس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں تو وہ اُن کو لپیٹ کر رکھتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے کاتب کا نام ہے۔ تینوں قولوں میں سے پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ آخری قول کی تردید اوپر گزر چکی ہے۔ بالجملہ جس صورت میں طی نشر کا ضد ہو اور "سجل" بہ معنی صحیفہ و نامہ و کاغذ ٹھہرے اور ﴿لِلْكُتُبِ﴾ بصیغۂ جمع ہو تو معنی آیت کے یہ ہوں گے: "يوم نطوي السماء طيا مثل طي الرجل الصحيفة" اور ﴿لِلْكُتُبِ﴾ محذوف سے متعلق ہو کر حال ہوگا "سجل" سے، یا صفت ہوگا: "أي كائنا للكتب" یا "الكائن للكتب" اور کتب سے مراد صحائف ہوں گے اور جو کچھ اُن میں لکھا گیا ہے، پس سجل کتب کا ان کے بعض اجزاء ہیں اور انہیں کے ساتھ طی حقیقتاً متعلق ہوتی ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿لِلْكُتُبِ﴾ کے معنی ہیں: "للمكتوبات"[2]، یعنی جو معانی کثیرہ کہ اس صحیفے میں لکھے جاتے ہیں اور اضافت مصدر کی مفعول کی طرف ہے اور فاعل محذوف ہے۔ مصدر کے ساتھ فاعل کا حذف کرنا مطرد ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے آسمانوں کے لپیٹنے کی تصویر بیان فرمائی اور ایک امرِ معروف و معلوم کے ساتھ اس کی تشبیہ دی، تاکہ بندوں کے خیال میں اس کی صورت جم جائے، مثلاً: جس طرح کاتب صفحۂ کاغذ پر کوئی عبارت و مضمون لکھتا ہے اور وہ کاغذ معانیِ کثیرہ مکتوبہ کو متضمن و مشتمل ہوتا ہے، اسی طرح اللہ پاک آسمانوں کو ایک دوسرے کا متضمن و مشتمل کر کے لپیٹ لے گا۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے بھی اسی وجہ کو اختیار فرمایا ہے اور اس مضمون کو انتہائی سہل طریقے سے ادا کیا ہے۔ یوں کہا ہے: جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں کاغذ۔ طومار اصل میں عربی لفظ ہے بہ معنی صحیفہ و نامہ، مگر

---

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤٧) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٢)

اُردو میں دفتر کو اور لمبے کاغذ کو بولتے ہیں، اسی لیے مکتوب کو بھی طومار کہتے ہیں، جس سے بہت سے خط جوڑ کر اس کو بڑا لمبا تڑنگا کاغذ بنا لیتے ہیں اور اسی لیے لمبے خط کو "کھرّا" کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح مکتوب میں بہت سے کاغذ لپیٹتے ہیں، اسی طرح آسمان بھی لپیٹے جائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طی نشر کی ضد ہو اور سجل بہ معنی صحیفہ و نامہ و کاغذ اور "للکتاب" بصیغۂ مفرد ٹھہرے تو اس صورت میں طی مصدر مضاف ہوگا طرف مفعول کے اور فاعل محذوف اور الف و لام "للکتاب" کا جنس کے واسطے اور حرفِ لام واسطے تعلیل کے اور کتاب مصدر بہ معنی کتابت یا بہ معنی مکتوب تقدیر یہ ہے: "یوم نطوي السماء طیا مثل طي الرجل الصحیفة لأجل الکتابة أو لما یکتب" اور "کتب فیها" یعنی جس دن ہم لپیٹیں گے آسمان کو اس طرح جیسے آدمی کاغذ کو لکھنے کے واسطے لپیٹتا ہے، یعنی مثلاً آدمی کا لکھنے کا ارادہ ہو تو وہ کاغذ کو لپیٹ کر درست رکھتا ہے، تاکہ ضرورت کے وقت اسے دوبارہ درست نہ کرنا پڑے، پس یہ لپیٹنا کتابت سے پہلے ہوتا ہے۔ یا کاغذ کو اس لیے لپیٹنا کہ اس میں مضامین و معانی لکھے جا چکے ہیں، اس صورت میں لپیٹنا لکھنے کے بعد ہوگا۔

امام محلی رحمہ اللہ نے کہا کتاب بہ معنی مکتوب ہے اور لام بہ معنی "علیٰ"۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہوگی: "یوم نطوي السماء طیا مثل طي الصحیفة علی مکتوبها" یعنی ہم آسمان کو اس طرح لپیٹیں گے، جس طرح خط کو لکھنے والا اس کے لکھنے کے بعد لپیٹتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ "طی" ضد ہو "نشر" کی اور "سجل" سے مراد فرشتہ ہو تو اس صورت میں "طی" کی "سجل" کی طرف اضافت مصدر کی فاعل کی طرف اضافت ہوگی اور کتاب بصیغۂ مفرد ہو یا بصیغۂ جمع، اس سے مراد بندوں کے صحائفِ اعمال ہوں گے اور حرفِ لام زائد ٹھہرے گا جیسے کہ "ردف لکم" میں زائد ہے۔ تقدیر یہ ہے: "یوم نطوي السماء طیا مثل طي ملك یسمی السجل صحائف الأعمال" چونکہ یہ لام مصدر کے متصل واقع ہوا ہے اس لیے اس اتصال نے اس لام کو حسین کر دیا، مصدر کے متعدی ہونے کی تقویت کر دی، جس طرح اس مثال میں ہے: "عرفتُ ضربَ زیدٍ لعمرو" اصل میں "ضربُ زیدٍ عمراً" ہے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ "طي" سے مراد اخفاء و تعمیہ و محو ہو تو اس صورت میں ﴿نَطْوِي السَّمَآءَ﴾ کے یہ معنی ہوں گے کہ جس دن ہم آسمان کے رسوم کو محو و طمس کر دیں، اُن کو مٹا دیں، بگاڑ ڈالیں اور اس کے نجوم کو مکدر و بے نور کر دیں۔

آسمان کے رسوم کا محو کرنا یہ ہے کہ جب ستارے گر گئے تو ان کی چالوں کے سبب سے جو شکلیں، صورتیں، راہیں متخیل ہوتی تھیں، وہ بھی مٹ گئیں۔ فتح القدیر و نسفی کا حاصل یہی ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے "طي" کے معنی محو لکھے ہیں، پھر اس کی دلیل یہ بیان کی: "لأنها نشرت مظلة لبني آدم فإذا انتقلوا قوضت عنهم"[3]

[1] تفسیر الجلالین (۱/ ۴۳۱) [2] فتح القدیر (۳/ ۵۸۶) تفسیر النسفي (۳/ ۹۲) [3] تفسیر البیضاوي (۴/ ۱۱۰)

حاصل اس کا یہ ہے کہ آسمان بنی آدم کے لیے بہ منزلہ خیمہ کے ایک سایہ کرنے والی شے پھیلائی گئی تھی، جب وہ کوچ کر گئے تو اس کو اُکھاڑ لیا۔ رہی تشبیہ ﴿ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ﴾ لہٰذا اس کا کچھ بیان نہ کیا، نہ شیخ زادہ نے کچھ لکھا۔ ہاں بیضاوی کے حاشیے پر "أو المحو" کے بعد اتنا لکھا ہے کہ "فيه أن السجل لا يمحوا الكتابة فلا يصح التشبيه" انتهى. پس محشی کی غرض یہ ہے کہ سجل فرشتہ ہے، بنی آدم کے اعمال کو لپیٹ رکھتا ہے، ان کو محو نہیں کرتا ہے تو اب تشبیہ درست نہ ہوگی اور جس صورت میں کہ سجل کے معنی قرطاس وصحیفہ کے ہوں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ کاتب کبھی خط لکھتا ہے، پھر اس کو مٹا دیتا ہے، یا جس وقت اس نے خط کو لپیٹ دیا تو اس کے نقوش وخطوط کو مخفی کیا۔ یہی اس کا محو کرنا ہے، اسی طرح اللہ پاک آسمان کے ستاروں کو محو کر دے گا، اس کے رسوم کو بگاڑ ڈالے گا۔ والله سبحانه أعلم بكلامه.

﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ﴾ اللہ پاک نے خلق کے سمجھانے کو اعادے کی تشبیہ ابتدا کے ساتھ بیان فرمائی، اس بات میں کہ اس کی قدرتِ کاملہ برابر دونوں کو شامل ہے، یعنی جس طرح ہم نے اُن کو اُن کی ماؤں کے پیٹ میں ابتداءً پیدا کیا، پھر ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے ختنہ تنگ و تاریک جگہ سے زمین کی طرف نکالا، اسی طرح قیامت کے دن دوبارہ زمین سے نکالیں گے۔ امام رازی نے ذکر کیا ہے کہ اعادے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ اللہ پاک جسموں کے اجزا کو متفرق کر دیتا ہے اور اُن کو معدوم نہیں کرتا ہے، پھر انھیں اجزا کی ترکیب کا اعادہ کرے گا۔ پس اعادہ یہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام کے اجزا کو بالکل معدوم کر دیتا ہے، پھر دوبارہ بعینہٖ انھی اجزا کو ایجاد کرے گا۔ یہ آیت اسی قول پر دلالت کرتی ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے اعادے کی تشبیہ ابتدا سے دی ہے اور جب کہ ابتدا کا یہ مطلب نہیں کہ متفرق اجزا کی ترکیب ہو، بلکہ اس سے مراد عدم کے بعد ایجاد کرنا ہے تو ضروری ہوا کہ اعادہ بھی اسی طرح ہو۔ پہلے قول والوں نے اس آیت سے تمسک کیا ہے: ﴿ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ [الزمر: ٦٧] اس لیے کہ یہ آیت اس پر دال ہے کہ آسمان مطوی ہونے کی حالت میں موجود ہوں گے اور ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ [إبراهيم: ٤٨] سے استدلال کیا ہے، کیوں کہ یہ آیت اس پر دال ہے کہ زمین کے اجزا باقی ہوں گے، لیکن وہ اس زمین کو بدل کر اور کر دی گئی۔[1] اس آیت کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے قیامت کے دن کی یہ صفت فرمائی کہ اس میں آسمان لپیٹ لیا جائے گا تو اس کا یہ وصف بھی بیان کر دیا کہ اس میں ہلاک شدہ چیزیں، جیسے: آسمان و زمین اور اُن کی مخلوق دوبارہ پیدا کی جائیں گی۔

﴿ كَمَا ﴾ کے بارے میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ مَا ﴾ کافہ ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مصدریہ ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ موصولہ ہے۔ مائے کافہ وہ ہے کہ ماقبل کو مابعد میں عمل کرنے سے روکتا ہے، چنانچہ اس جگہ کاف کو عمل کرنے

[1] تفسير الرازي (٢٢/ ١٩٨)

سے باز رکھتا ہے اور فعل پر کاف کے دخول کو صحیح کرتا ہے، کیوں کہ مائے کافہ اس کے زائد ہونے کی وجہ سے کبھی تو عمل سے کافہ ہوتا ہے، جیسے: "إنما زید منطلق" یہاں "إن" کے عمل کو روک دیا اور کبھی غیر کافہ ہوتا ہے، جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] "پس (اے نبی) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہوگئے۔" کیوں کہ اگر اس میں حرف با مکفوف ہوتا تو اس کے سبب سے لفظ رحمت مجرور نہ ہوتا، پھر جب حرف با مکفوف نہ ہوا تو اس کا مجرور مفعول بہ ہوگا اور مفعول بہ کے واسطے عامل ضرور ہے فعل ہو یا معنی فعل کے۔ پھر حرفِ با کے واسطے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے کوئی شے ہو، جس سے وہ متعلق ہو بخلاف کاف بمکفوف کے، جو اس جگہ ہے، اس لیے کہ وہ اس شے کو نہیں چاہتا ہے، جس سے متعلق ہو، کیوں کہ اس کاف کا مجرور مفعول بہ نہیں ہے کہ اپنے ناصب فعل یا معنائے فعل کو چاہے۔ مائے کافہ اور مصدریہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ جس صورت میں ما کافہ ٹھہرے گا تو اول ﴿ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ﴾ کلام تام ہو جائے گا اور ﴿ كَمَا بَدَاْنَآ ﴾ اس سے ایک جملہ منقطع ٹھہرے گا، اس بنا پر کہ معنی یہ ہوں گے: "تحقق الإعادة مثل تحقق البداء" اور یہ معنی نہ ہوں گے: "إعادة مثل البدء" اور کاف کا محل ایسی جگہ میں رفع ہوتا ہے، اس بنا پر کہ خبر ہوتا ہے مبتدائے محذوف کی اور کلمہ اول ﴿ خَلْقٍ ﴾ مفعول ہے ﴿ بَدَاْنَآ ﴾ کا یا اس فعل کا جس کی تفسیر ﴿ نُعِيْدُهٗ ﴾ کرتا ہے۔

قرآن پاک کا ظاہر نظم اگرچہ اس احتمال کی مساعدت کرتا ہے، مگر یہ موقع غور وفکر کا ہے، کیوں کہ ظاہر یہ ہے کہ اول خلق سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جن کا وجود دوسروں کے وجود پر سابق ہو چکا ہے عالمِ دنیا میں، اس لیے کہ ان کے اعادہ وابداء میں بالخصوص گفتگو نہیں ہے، بلکہ گفتگو تو مجموع مکونات کے ابداء واعادہ میں ہے، کیوں کہ یہ مجموع جس وقت ہلاک ہوگا، پھر اعادہ اس سے متعلق ہوگا تو وہ موصوف باولیت ہوگا، بہ نسبت اس ایجاد ثانی کے، جو اس کے ساتھ متعلق ہوتی۔ پس یہ مجموع موصوف بہ اولیہ مفعول ﴿ بَدَاْنَآ ﴾ کا کیونکر ہوگا باوجود اس کے کہ اس پر بدء کا واقع کرنا متفرع ہے اس کے اعادے پر، کیوں کہ اس کے ساتھ اعادہ متعلق ہونے سے پہلے ہرگز موصوف باولیت نہیں ہوتا تھا۔ پس ظاہر یہ ہے کہ کاف محلِ نصب میں ہو، اس بنا پر کہ "ما أضمر عامله علی شریطة التفسیر" کی قبیل سے ٹھہرے اور تقدیر یہ ہو: "نعید أول خلق أي الخلائق الأولین نعید" اور کلام اس جگہ تمام ہو جائے، جبکہ ﴿ مَا ﴾ کافہ ٹھہرے اور جب مصدریہ مانا جائے تو تقدیر یہ ہو: "نعید أول الخلق إعادة مثل بدء نا إیاہ نعیدہ" یعنی جیسا ہم نے اس کو عدم سے نکالا ہے طرف وجود کے، ہم اس کا اعادہ کریں گے عدم سے وجود کی طرف اور جس صورت میں کلمہ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ٹھہرے گا تو کاف محذوف سے متعلق ہوگا، جس کی تفسیر ﴿ نُعِيْدُهٗ ﴾ کر رہا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "نعید مثل الذي بدأناہ" اور اول خلق ظرف ہوگا ﴿ بَدَاْنَآ ﴾ کا۔ (﴿ خَلْقٍ ﴾ مصدر ہے بہ معنی

خلائق، اسی لیے اس کو مفرد ذکر کیا ہے۔ یا حال ہوگا موصول کی ضمیر محذوف سے (یعنی "أول ما خلق") بخلاف اس کے کہ جس وقت ما مصدریہ ٹھہرے گا تو اس وقت "نعید" کا مفعول اول خلق ہوگا کاف نہ ہوگا۔ (کذا قاله شیخ زاده)

امام محلی رحمہ اللہ نے مصدریہ کو، علامہ نسفی رحمہ اللہ نے موصولہ کو اختیار کیا ہے[1] اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کافہ کو اول پھر مصدریہ کو، پھر موصولہ کو ذکر کیا ہے۔[2] فتح القدیر میں کافہ وموصولہ کا ذکر ہے۔[3] امام زمخشری اور نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اول خلق سے مراد عدم سے خلق کا ایجاد ہے، پس جس طرح اس کو پہلی دفعہ عدم سے ایجاد کیا ہے، اسی طرح دوبارہ عدم سے اس کا اعادہ کرے گا۔ ﴿ خَلْقٍ ﴾ کا نکرہ لانا ایسا ہے، جیسا اس قول میں ہے: "هو أول رجل جاءني" مراد "أول الرجال" ہے، لیکن اس کو واحد ونکرہ ذکر کیا، اس لیے کہ ارادہ رجال کی تفصیل کرنا ہے رجل رجل کر کے، پس اسی طرح اول خلق کے معنی ہیں: "أول الخلق" بہ معنی اول الخلائق ہے، اس لیے کہ مصدر کی جمع نہیں کی جاتی ہے۔[4]

فتح القدیر میں ذکر کیا ہے کہ کسی نے کہا: (یہ قول پہلے گزر چکا ہے) آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر نفس کو ہلاک کر ڈالیں گے، جیسے کہ وہ اول بار تھا، اس بنا پر یہ کلام ﴿ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ ﴾ سے متعلق ہوگا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم آسمانوں کو متغیر کر دیں گے۔ پھر اس کے طی و زوال کے بعد دوبارہ اس کا اعادہ کریں گے۔ پہلا قول اولیٰ ہے اور وہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ [الأنعام: ٩٤] "اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جس طرح کہ ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا۔"

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَعْدًا عَلَيْنَا ﴾ یہ مصدر موکد مضمون جملۂ ماقبل واقع ہوا ہے، کون جملہ؟ جس کے واسطے سوائے وعد کے اور کوئی احتمال ہی نہیں ہے تو یہ مصدر موکد لنفسہٖ ہوا، ناصب اس کا مضمر ہے، یعنی "وعدنا ذلك وعدا" یا ناصب اس کا ﴿ نُعِيْدُهٗ ﴾ ہے۔ اس لیے کہ "نعید" معنی وعد میں ہے۔ اس لیے کہ اس میں اعادے کا وعدہ ہے، یعنی ہم نے اعادے کا وعدہ کیا ہے، ہم پر اس کا پورا کرنا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس کی تاکید فرمائی: ﴿ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ یعنی ہم ضرور اس کے کرنے والے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم جس کو چاہتے ہیں، اس پر قادر ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم کرنے والے ہیں اس شے کو جس کا ہم نے تم سے وعدہ کیا ہے، اسی کے مثل یہ قول ہے اللہ پاک کا: ﴿ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ﴾[5] [بني إسرائيل: ٥] "اور یہ وعدہ (پورا) کیا ہوا تھا۔" بحر میں ہے کہ یہ جملہ تحتم خبر کی تاکید کے لیے مذکور ہوا ہے، یعنی ہم اس پر قادر ہیں کہ وہ کریں۔[6] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم اس وعدے کے محقق ہیں، یعنی اس کو وجود میں لانے والے ہیں، پس اس کے واسطے مستعد ہو جاؤ اور احوالِ قیامت سے خلاصی پانے کے لیے اعمالِ صالح آگے بھیجو۔[7]

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣١) تفسير النسفي (٣/ ٩٣) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١١) [3] فتح القدير (٣/ ٥٨٦)
[4] الكشاف (٣/ ١٣٨) تفسير النسفي (٣/ ٩٣) [5] فتح القدير (٣/ ٥٨٦۔ ٥٨٧)
[6] بحر المحيط (٦/ ٣١٨) [7] تفسير النسفي (٣/ ٩٣)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور بلاشبہہ ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے بندے زمین کے وارث ہوں گے (105) بلاشبہہ اس میں (ہمارے) عبادت گزار بندوں کے لیے ایک اطلاع ہے (106) اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے (107)

نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے:

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کے واسطے دنیا و آخرت میں سعادت و وراثتِ زمین کا حکم جاری کر چکا ہے اور اس نے اُن کے لیے اس بات کا حتمی وعدہ فرمایا ہے اور اپنے کلام پاک میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے، من جملہ اس کے ایک یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۲۸] ”بے شک زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے، اور (اچھا) انجام تو پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔“ دوسری یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [المؤمن: ۵۱] ”بلاشبہہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔“ تیسری یہ آیت ہے: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ ﴾ [النور: ۵۵] ”جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی، اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین محکم و پائیدار کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا۔“

اور یہ خبر دی کہ یہ امر کتبِ شرعیہ و قدریہ میں لکھا ہوا ہے اور ضرور ہونے والا ہے اور اسی لیے یہاں یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ ﴾ امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے اس آیت کا پوچھا تو انھوں نے کہا کہ زبور سے مراد، تورات، انجیل اور قرآن ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: زبور کتاب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام شعبی، حسن، قتادہ رحمہم اللہ اور بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ زبور وہ ہے، جو داود علیہ السلام پر نازل کی گئی اور ذکر تورات ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ ذکر قرآن ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذکر وہ ہے جو آسمان میں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: زبور کتب ہیں ذکر کے بعد اور

ذکر اللہ کے نزدیک ام الکتاب ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اسی طرح زین بن اسلم نے کہا ہے کہ ذکر کتاب اول ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوحِ محفوظ ہے۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زبور وہ کتابیں ہیں جو انبیا علیہم السلام پر اتاری گئیں اور ذکر ام الکتاب ہے جس میں اس سے پہلے اشیا لکھی جاتی تھیں۔[1]

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور زبور اور اپنے سابق علم میں پہلے، اس سے کہ آسمان و زمین ہوں، اس بات کی خبر دی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو زمین کا وارث کرے گا اور اُن کو جنت میں داخل فرمائے گا اور صالحین وہی ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کیا ہے کہ ارض سے مرادِ ارضِ جنت ہے اور اسی طرح امام ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ، سدی، ابو صالح، ربیع بن انس اور ثوری رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ ہم ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ مومنین ہیں۔[2]

﴿ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴾ یعنی بے شک اس قرآن میں جس کو ہم نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا ہے، البتہ بلاغ ہے، اس کے نفع کے واسطے اور کفایت ہے قومِ عابدین کے واسطے اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کو اس چیز کے ساتھ پوجا، جس کو اللہ نے مشروع کیا اور اس کو دوست رکھا اور پسند کیا اور اللہ کی اطاعت کو شیطان کی طاعت پر اور اپنے نفسوں کی خواہشوں پر اختیار کیا۔ ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہان کے لوگوں کے لیے رحمت ٹھہرایا ہے، یعنی اُن سب کی رحمت کے واسطے اُن کو بھیجا ہے، پس جس نے اس رحمت کو قبول کیا اور اس نعمت کا شکر ادا کیا تو وہ دنیا و آخرت میں سعید و نیک بخت ہوا اور جس نے اس کو رد کیا اور اس کا انکار کیا تو وہ دنیا اور آخرت میں زیاں کار ہوا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ [إبراهيم: ٢٨۔ ٢٩] ''کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے اللہ کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟ (یعنی) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔'' اور قرآن شریف کے بارے میں یہ ارشاد ہے: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔''

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٤٧۔ ٥٤٨) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٦٨)
[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٤٩) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٦٨)

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کہا گیا: یا رسول اللہ! آپ مشرکوں پر بد دعا کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں لعّان مبعوث نہیں ہوا ہوں، یعنی مجھے لعنت کرنے والا نہیں کیا ہے: « وَإِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً » یعنی میں تو رحمت کر کے بھیجا گیا ہوں۔[1] (انفرد بإخراجه مسلم) اور دوسری حدیث شریف میں: « إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ » ہے،[2] یعنی میں جو ہوں سو ایک رحمتِ مہداۃ ہوں۔ مطلب یہ کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کے وجودِ باجود کو خلق کے واسطے رحمت کا ہدیہ بنایا ہے اور یہ ہدیہ اُن کو عطا فرمایا ہے۔ (رواه عبد الله بن أبي عوانة و غيره عن وكيع عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة مرفوعا قال إبراهيم الحربي وقد رواه غيره عن وكيع فلم يذكر أبا هريرة رضي الله عنه و كذا قال البخاري۔ و قد سئل عن هذا الحديث فقال: كان عند حفص بن غياث مرسلًا، قال الحافظ ابن عساكر وقد رواه مالك بن سعيد بن الخمس عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة مرفوعاً ثم ساقه من طريق أبي بكر المقري و أبي أحمد الحاكم كلاهما عن بكر بن محمد بن إبراهيم الصوفي، حدثنا إبراهيم بن سعيد الجوهري عن أبي أسامة عن إسماعيل بن أبي خالد عن قيس بن أبي حازم عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: « إِنَّمَا أَنَ رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ » ثم أورده من طريق الصلت بن مسعود عن سفيان بن عيينه عن مسعر عن سعيد بن خالد عن رجل عن ابن عمر رضي الله عنهما قال رسول الله ﷺ: « إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِيْ رَحْمَةً مُهْدَاةً بُعِثْتُ بِرَفْعِ قَوْمٍ وَخَفْضِ آخَرِيْنَ »[3])

امام ابوالقاسم طبرانی نے محمد بن مطعم سے روایت کیا ہے، محمد اپنے والد جبیر سے راوی ہیں۔ جبیر نے کہا: "قال أبو جهل حين قدم مكة منصرفه عن خمره يا معشر قريش! إن محمداً نزل يثرب و أرسل طلائعه، وإنما يريد أن يصيب منكم شيئا فاحذروا أن تمروا طريقه أو تقاربوه فإنه كالأسد الضاري إنه حِنقٌ عليكم لأنكم نفيتموه نفي القِردانِ عن المناسم والله إن له لسَحَرَةً ما رأيته قط ولا أحد من أصحابه إلا رأيت معهم الشياطين و إنكم قد عرفتم عداوة ابني قَيْلَةَ يعني الأَوسَ و الخزرج فهو عَدُوٌّ استعان بعدوٍّ فقال له مطعم بن عدي: يا أبا الحكم والله ما رأيت أحداً أصدق لسانا ولا أصدق موعداً من أخيكم الذي طردتم وإذ فعلتم الذي فعلتم فكونوا كفَّ الناس عنه قال أبو سفيان بن الحارث: كونوا أشدَّ ما كنتم عليه فإن ابني قيلة إن ظفروا بكم لا يرقبوا فيكم إِلًّا ولا ذِمَّةً وإن أطعتموني الجأتموهم حير كنانة أو تخرجوا محمداً من بين ظهرانيهم فيكون وحيداً مطرودا وأما ابنا قيلة فوالله ما هما و أهل دهلك (کتبِ لغت میں "دھل" کا لفظ نہیں، ملا شاید یہ "ذھل" کی تصحیف ہو۔ "ذھل" بہ معنی عداوت و کینہ وطلبِ ثار ہے۔ والله أعلم) في المذلة إلا سواء و سأكفيكم حدَّهم وقال:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۹۹) [2] مستدرک الحاکم (۱/ ۹۱) السلسلة الصحيحة، رقم الحدیث (۴۹۰)

[3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۶۹)

سأمنح جانبا مني غليظا على ما كان من قرب بعد
رجال الخزرجية أهل ذل إذا ما كان هَزلٌ بعد جِدِّ

فبلغ ذلك رسول اللهﷺ فقال: والذي نفسي بيده! لأقتلنهم ولأصلبنهم ولأهدينهم وهم كارهون إني رحمة بعثني الله ولا يتوفاني حتى يظهر الله دينه، لي خمسة أسماء أنا محمد و أحمد و أنا الماحي الذي يمحو الله بي الكفر وأنا الحاشر الذي يحشر الناس على قدمي وأنا العاقب، وقال أحمد بن صالح: أرجو أن يكون الحديث صحيحا.[1]

یعنی ابوجہل جس وقت اپنی جماعت سے لوٹ کر مکے میں آیا تو کہا: اے گروہِ قریش! محمد یثرب، یعنی مدینے میں اترا ہے اور اس نے اپنے جاسوس بھیجے ہیں اور وہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے کسی شے کو پہنچے، لہٰذا تم اس سے بچو کہ اس کی راہ پر گزر کرو، یا اس کے قریب جاؤ، کیوں کہ وہ مثل لاگو شیر کے ہے، بے شک وہ تم پر غضب ناک ہے، اس لیے کہ تم نے اس کو ایسا نکالا دیا ہے، جیسے چیچڑیوں کو اُونٹوں کی تلیوں سے نکال دیتے ہیں۔ واللہ! اس کے واسطے تو البتہ جادوگر ہیں، جب کبھی میں نے اس کو اور اس کے اصحاب میں سے کسی کو دیکھا تو اُن کے ساتھ شیاطین کو دیکھا اور فرزندانِ قیلہ، یعنی قبیلہ اَوس وخزرج کی عداوت تو تم خوب جان چکے ہو، پس ایک دشمن نے دوسرے دشمن سے مدد چاہی ہے۔

اس پر مطعم بن عدی نے ابوجہل سے کہا: اے ابوالحکم! واللہ! میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ زبان کا زیادہ سچا اور وعدے کا زیادہ پکا ہو تمھارے بھائی سے، جس کو تم نے بھگا دیا ہے اور جبکہ تم نے کیا جو کیا تو تم سب سے زیادہ اس سے باز رہو۔ ابوسفیان بن حارث بولا کہ اب تم پہلے سے بھی زیادہ اس پر سخت ہو جاؤ، فرزندانِ قیلہ اگر تم پر ظفر مند ہوں گے تو تم میں نہ کچھ قرابت کا پاس کریں گے نہ ذمے وعہد کا لحاظ رکھیں گے، اگر تم میرا کہا مانو تو حیرِ کنانہ میں ان کو مضطر کرو، یعنی اُن کو وہاں نکال دو یا محمد کو اُن کے درمیان سے نکالو تو وہ اکیلا اور مطرود رہ جائے گا، یعنی تنہا بے یارو مددگار۔ رہے فرزندانِ قیلہ، پس قسم ہے اللہ کی کہ وہ اور تیرے دشمن ذلت وخواری میں دونوں برابر ہیں اور میں اُن کی قوت وشوکت سے تمھاری کفایت کروں گا، میں اپنی طرف سے ایک بڑی پناہ دوں گا لڑائی قریب ہو یا دور۔ خزرج کے مرد ذلیل خوار ہیں، جس وقت کہ بعد جد کے ہزل ہو، یعنی جد میں تو کیا مقابلہ کریں گے ہزل میں بھی ان سے کچھ نہیں بنتا۔ پھر یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ البتہ میں اُن کو قتل کروں گا اور اُن کو سولی دوں گا اور اُن کو ہدایت کروں گا اور وہ ناخوش ہوں گے، البتہ اللہ نے مجھ کو رحمت بنا کے بھیجا ہے اور وہ مجھے وفات نہ دے گا، یہاں تک کہ اپنے دین کو غالب کر دے گا۔ میرے پانچ نام ہیں: میں محمد ہوں اور احمد ہوں اور ماحی ہوں کہ اللہ میرے سبب سے کفر کو مٹاتا ہے اور میں حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر

[1] المعجم الكبير (٢/ ١٢٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٦/ ٨٦)

محشور ہوں گے اور میں عاقب ہوں۔ احمد بن صالح طبرانی کے استاذ نے کہا: میں اُمید کرتا ہوں یہ حدیث صحیح ہو۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عمرو بن ابی قرہ کندی سے روایت کیا ہے، کہا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ مدائن میں تھے، پس جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھیں، اُن کا ذکر کیا کرتے تھے، ایک بار حذیفہ رضی اللہ عنہ سلمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: اے حذیفہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا۔ پس فرمایا کہ جس آدمی کو میں نے اپنے غصے میں گالی دی یا اس پر لعنت کی تو میں جو ہوں ایک آدمی ہوں اولادِ آدم سے، خفا ہوتا ہوں، جیسے: وہ خفا ہوتے ہیں: « إِنَّمَا بَعَثَنِي رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ فَاجْعَلْهَا صَلَاةً عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » یعنی اللہ نے مجھے صرف عالمین کے واسطے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تو اس لعنت کو ان پر رحمت کر دے قیامت کے دن، یا بصیغۂ متکلم اس کے معنی ہوں گے کہ میں اس کو قیامت کے دن اس پر رحمت کروں گا۔ واللہ أعلم۔[1] (ورواه أبو داود عن أحمد بن يونس عن زائدة و أخرجه الطبراني عنه بلفظ: «أَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِيْ سَبَبْتُهُ سَبَّةً فِيْ غَضَبِيْ أَوْ لَعَنْتُهُ لَعْنَةً الخ » فتح القدير)

پھر اگر کوئی کہے کہ جن لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا، اُن کو نہ مانا اُن کو کون سی رحمت حاصل ہوئی تو اس کا یہ جواب ہے کہ امام ابوجعفر ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لایا تو اس کے واسطے دنیا اور آخرت میں رحمت لکھی گئی اور جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لایا تو جو خسف اور قذف پہلی اُمتوں کو پہنچا کرتا تھا، اس سے اس کو عافیت دی گئی، اسی طرح امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ سند خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔[2] واللہ أعلم۔ امام ابوالقاسم طبرانی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: ''من تبعه كان له رحمة في الدنيا والآخرة و من لم يتبعه عوفي مما كان يبتلى به سائر الأمم من الخسف والمسخ والقذف''[3] (كذا في ابن كثير)

اصل میں زبر بہ معنی ''كَتَبَ'' ہے، یعنی نوشتن محاورے میں بولتے ہیں: ''زَبَرتُ'' یعنی میں نے لکھا، اس بنیاد پر زبور کا اطلاق تورات و انجیل و کتابِ داود علیہ السلام مسمی بہ زبور پر درست ہے۔ بعض نے کہا کہ اس جگہ زبور سے مراد داود علیہ السلام کی کتاب ہے اور ذکر سے مراد تورات اور ارض سے مراد ارضِ مقدس شام کی ہے اور ''صالحون'' سے مراد بنی اسرائیل ہیں، بدلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ [الأعراف: ١٣٧] ''اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔'' مشارق و مغاربِ ارض سے مراد شام کی سرزمین اور اس کی

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٣٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٥٩) المعجم الكبير (٦/ ٥٩) فتح القدير (٣/ ٥٩١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٥٨)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٥٢) [3] المعجم الكبير (١٢/ ٢٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦٨_ ٢٧٠)

مشرقی اور مغربی اطراف ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت بالآخر اُمتِ محمد ﷺ اس کی وارث ہوگی،① معنی یہ ہیں کہ واللہ! یقیناً ہم نے داود علیہ السلام کی کتاب میں لکھا، اس کے بعد کہ ہم تورات میں لکھ چکے کہ بنی اسرائیل زمینِ مقدس کے وارث ہوں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ زبور بہ معنی کتاب ہے، یعنی مزبور مکتوب اور الف و لام جنسی ہے، یعنی جنسِ کتب جو انبیا علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زبور سے مراد ساری کتابیں ہیں؛ تورات و انجیل و قرآن اس لیے کہ زبور و کتاب ایک ہی معنی میں ہیں۔② قراءتِ حمزہ و خلف بضمِ زائے معجمہ جمع زبر بہ معنی مزبور③ اس قول کی موید ہے اور ذکر سے مراد ام الکتاب و لوحِ محفوظ ہے، اس واسطے کہ ساری کتابیں اسی سے ماخوذ ہیں۔ جو کچھ ہونے والا ہے اللہ پاک نے وہ سب اس میں لکھ رکھا ہے، تاکہ فرشتے عبرت لیں اور جان لیں کہ اللہ پاک نے سب چیز کا احاطہ کرلیا ہے اور ہر شے کا شمار کر رکھا ہے اور ارض سے مراد زمینِ جنت ہے اور صالحون سے مراد عام مومنین ہیں، جو کہ طاعتِ الٰہی کے ساتھ عمل کرتے ہیں، یا اُمتِ محمد ﷺ ہے، بدلیل قولہ تعالیٰ: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ﴾ [الزمر: ٧٤] ''اور وہ کہیں گے: سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم سے (کیا ہوا) اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور ہمیں اس سرزمین (بہشت) کا وارث بنا دیا، ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنائیں۔'' معنی یہ ہیں کہ ہم نے تورات، انجیل، زبور اور ساری کتبِ انبیا علیہم السلام میں لکھا اور بیان کیا بعد اس کے کہ ہم لوحِ محفوظ میں لکھ چکے ہیں کہ زمین جنت کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، جو کہ میری طاعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں یا اُمتِ محمد ﷺ جنت کی وارث ہوگی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ زبور سے مراد داود علیہ السلام کی کتاب اور ذکر سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ زبور سے مراد داود علیہ السلام کی کتاب اور ذکر سے مراد قرآن شریف اور کلمۂ ''بعد'' کے معنی اس جگہ ''قبل'' کے ہیں۔ اس قول کو امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔④ پانچواں یہ قول ہے کہ ارض سے مراد کافر اُمتوں کی زمین ہے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ اور آپ کی اُمتِ مرحومہ فتح کر کے اس کے وارث ہوں گے۔ امام خازن اور کرخی رحمہما اللہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے، یہ اللہ پاک کی طرف سے ایک حکم ہے کہ وہ دین کو ظاہر کرے گا اور مسلمانوں کو عزت دے گا۔⑤

فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ خوش خبری ہے نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے لیے کہ وہ کفار کی زمین کے وارث ہوں گے اور اسی قول پر اکثر مفسرین ہیں۔⑥ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اول کے دو قول ذکر کیے

---

① تفسير الرازي (٢٢/ ١٩٩) ② معاني القرآن (٣/ ٤٠٧) ③ روح المعاني (٦/ ١٧)
④ تفسير الخازن (٤/ ٣٢٥) ⑤ تفسير الخازن (٤/ ٣٢٥) ⑥ فتح القدير (٣/ ٥٨٧) فتح البيان (٨/ ٣٧٩)

ہیں۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے[2] اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اول قول یہ لکھا ہے کہ زبور سے مراد داود علیہ السلام کی کتاب ہے اور ذکر سے مراد تورات اور ارض سے مراد شام اور عبادِ صالحین سے مراد اُمتِ محمد ﷺ ہیں۔ پھر دوسرا قول ذکر کیا ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔[3] حمزہ نے ﴿ عِبَادِیَ ﴾ بہ سکون یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے بفتح یائے تحتیہ پڑھا ہے۔[4] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْۢ بَعْدِ ﴾ متعلق ہے ﴿ كَتَبْنَا ﴾ سے، یا محذوف سے متعلق ہو کر زبور کی صفت ہے، یعنی "لقد كتبنا في الزبور الكائن من بعد الذكر" اور ﴿ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا ﴾ مفعول ہے ﴿ كَتَبْنَا ﴾ کا، یعنی "كتبنا وراثة الأرض"

﴿ اِنَّ فِيْ هٰذَا ﴾ قرآن شریف کی طرف اشارہ ہے۔ امام نسفی، خازن اور محلی رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[5] امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار قول یہ ہے، یا اشارہ ہے طرف اس وعد و وعید و نصیحتوں کی خبروں کے، جو اس سورت میں مذکور ہوئے۔[6] ﴿ لَبَلٰغًا ﴾ یعنی البتہ مطلب کی طرف پہنچنا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن کا اتباع کیا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کیا تو جس ثواب کا وہ اُمیدوار ہے، وہ اس کو پہنچ گیا، یا بلاغ بہ معنی کفایت ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں کہ اس شے میں بلاغ و بلغہ و تبلغ ہے، یعنی کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جو وعد و وعید و اخبار و مواعظِ بالغہ مذکور ہیں، وہ جنت کی طرف بندوں کا زادِ راہ ہے، جس طرح کہ مسافر کا زادِ راہ ہوتا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ مقصد کی طرف پہنچنے کا سبب ہیں۔

﴿ لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴾ عبادت کے معنی خضوع و تذلیل کے ہیں، یعنی انتہا درجے کی عاجزی اور فروتنی و ذلت و انکساری اختیار کرنا اور عبادت کا سرنماز ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اس کا اہتمام رکھتے ہیں، یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی اُمت ہیں، جو پانچوں نمازیں ادا کرتے ہیں، رمضان کے روزے رکھتے ہیں، زکات دیتے ہیں، حج کرتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عابدین سے مراد موحدین ہیں اور وہ نبی اکرم ﷺ کی اُمت ہیں۔[7] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن کا اہتمام اور مقصد عبادت ہے نہ کہ عادت۔[8] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو قرآن پر عمل کرتے ہیں۔[9] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عالمین مراد ہیں۔[10] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ لوگ علم و عمل کے حامل ہیں، کیوں کہ علم درخت ہے اور عمل مثل پھل کے۔ درخت بغیر پھل کے بے فائدہ ہے اور پھل بغیر درخت کے غیر موجود۔[11]

---

(1) تفسير البيضاوي (٤/ ١١١) (2) تفسير الجلالين (١/ ٤٣١) (3) تفسير النسفي (٣/ ٩٣)
(4) فتح القدير (٣/ ٥٨٧) (5) تفسير النسفي (٣/ ٩٣) تفسير الخازن (٤/ ٣٢٥) تفسير الجلالين (١/ ٤٣١)
(6) تفسير البيضاوي (٤/ ١١١) (7) تفسير النسفي (٣/ ٩٣) (8) تفسير البيضاوي (٤/ ١١١)
(9) تفسير الجلالين (١/ ٤٣١) (10) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧١) (11) تفسير الرازي (٢٢/ ١٩٩)

فتح القدیر میں ذکر کیا ہے کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زبور سے مراد قرآن اور ارض سے مراد ارضِ جنت۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ اُن سے یہ ہیں کہ زبور سے مراد کتب اور ذکر سے مراد تورات۔ اس کی اسناد میں عوفی ہیں۔[2] سعید بن منصور کے الفاظ اُن سے یہ ہیں کہ زبور تورات، انجیل اور قرآن ہیں اور ذکر وہ اصل ہے جس سے یہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جو آسمان میں ہے اور ارض سے مراد زمینِ جنت ہے۔ امام فریابی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ کے الفاظ اُن سے یہ ہیں کہ ارضِ جنت ہے۔

امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عابدین کی تفسیر عالمین سے کی ہے،[3] اس کی اسناد میں علی بن ابی طلحہ ہیں۔ سعید بن منصور اور ابن منذر کے الفاظ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں یہ ہیں، کہا کہ پانچ وقت کی نمازیں۔ امام ابن مردویہ، ابو نعیم اور دیلمی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ پانچ نمازوں میں عبادت کے لیے شغل ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا، یعنی ﴿ لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴾ اور فرمایا کہ وہ مسجدِ حرام میں پانچوں نمازیں با جماعت ہیں۔[4]

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ استثنائے مفرغ ہے عام احوال اور علل سے، یعنی اے پیغمبر! نہیں بھیجا ہم نے تم کو کسی اور وجہ کے لیے سوائے اس کے کہ سب لوگوں کے لیے ہماری رحمتِ واسعہ ہو، کیوں کہ جس شے کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو، یعنی شریعت اور احکام وہ دارین کی سعادت کا سبب ہے اور اُن کی صلاحِ معاش اور معاد کا موجب ہے، یعنی اگر وہ اس میں غور وفکر کریں اور اُس کے احکام کی پیروی کریں تو دارین کی سعادت حاصل کریں اور جس کسی نے اس سے منہ موڑا اور تکبر کیا تو وہ اپنی طرف سے محنت میں پڑا۔ اس تقریر میں اس سوال و جواب کی طرف اشارہ ہے، جو کسی نے کیے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ کیوں کر ﴿ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ ہوئے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو سیف و استباحت (تلوار اور لوگوں کے مال لوٹنے) کا حکم لے کر تشریف لائے ہیں؟

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ خبر میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ کیا تم کو بھی اس رحمت سے کچھ پہنچا؟ انھوں نے کہا: ہاں مجھے اس رحمت سے یہ پہنچا کہ میں انجام کار سے ڈرا کرتا تھا۔ لہٰذا میں تمھارے سبب سے امن میں ہوگیا، جبکہ اللہ پاک نے اپنے اس قول سے میری تعریف فرمائی: ﴿ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿20﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴾[5] [التکویر: ۲۰۔ ۲۱]

”جو بڑی قوت والا عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ وہاں (آسمانوں میں) اس کی اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔“

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٤٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧١)

[4] فتح القدير (٣/ ٥٩٠۔ ٥٩١) [5] الشفا بتعريف حقوق المصطفىٰ (١/ ١٧) روح المعانى (١٧/ ١٠٥)

کسی نے کہا کہ کفار کے واسطے رحمت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ آپ کے سبب سے خسف و مسخ و استیصال سے امن میں ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ عالمین سے مراد خاص مومنین ہیں؛ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی دلیل سے: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [الأنفال: ۳۳] ''اور (اے نبی!) اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ آپ بھی ان کے درمیان (موجود) ہوں۔'' اور کسی نے کہا کہ مومنین کے لیے دارین میں رحمت ہیں اور کافروں کے واسطے دنیا میں، اس لیے کہ دنیا میں اُن سے عذاب مؤخر کیا گیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عالمین سے مراد اِنس و جن ہیں،[1] یعنی نیک ہوں یا بد، مومن ہوں یا کافر۔ مطلب یہ ہے کہ خسف و مسخ اور نیست و نابود کرنے کا عذاب نبی اکرم ﷺ کی برکت سے دور کیا گیا۔ یا رحمت سے مراد رحیم ہیں، یعنی نبی اکرم ﷺ کافروں پر بھی رحیم تھے۔ دیکھو جس وقت کفار نے آپ کے سر مبارک کو زخمی کیا اور دندان مبارک کو شہید کیا، یہاں تک کہ آپ غش کھا کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش آیا تو یوں فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ»[2]

امام ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جو شخص ایمان لایا اس کے واسطے دنیا و آخرت میں رحمت پوری ہوئی اور جو شخص ایمان نہ لایا تو جو مسخ و خسف و قذف کا عذاب عاجل دنیا میں اُمتوں کو پہنچتا تھا، اس سے اُسے بچایا گیا۔[3] امام طیالسی، احمد، طبرانی اور ابو نعیم نے دلائل میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے مجھ کو بھیجا ہے عالمین کے لیے رحمت اور متقین کے لیے ہدایت بنا کر۔[4]

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ ﴿ رَحْمَةً ﴾ مفعول لہ ہو، یعنی ''لأجل الرحمة''، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حال ہو واسطے مبالغے کے، خود نبی اکرم ﷺ کو نفسِ رحمت ٹھہرایا، یا مضاف محذوف ہے، یعنی ''ذا رحمة'' یا رحمت بہ معنی ''راحم'' ہے۔ پھر جبکہ اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ نبی اکرم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں تو اس کے اسباب میں سے جو بڑا سبب تھا، اس کو بیان کیا، وہ یہی ہے کہ آپ توحید و اطاعت کے داعی تھے، کیوں کہ آپ ایسے وقت میں مبعوث ہوئے کہ لوگ جاہلیت و گمراہی میں گرفتار تھے اور اہلِ کتاب اپنے دینی امور میں بہ سبب طول مکث (طویل انتظار) اور نبوت کے سلسلے کے متواتر منقطع رہنے اور کتبِ منزلہ میں اختلاف واقع ہو جانے کی وجہ سے حیران و پریشان ہو رہے تھے، وہ ایسا وقت تھا کہ طالبِ حق کو کوئی راہ نہیں ملتی تھی، چونکہ توحید کی دعوت آپ کے رحمت للعالمین ہونے کا بڑا سبب تھا، اس لیے اس کے بعد اس کا ذکر کیا، پس فرمایا:

---

[1] تفسير الجلالين (۱/ ۴۳۱) [2] الشفا بتعريف حقوق المصطفىٰ (۱/ ۱۰۵)
[3] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۵۲) المعجم الكبير (۱۲/ ۲۳) الدر المنثور (۵/ ۶۸۷)
[4] الدر المنثور (۵/ ۶۸۸) فتح القدير (۳/ ۵۹۱)

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْۤ
اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ
وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ
وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا
الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

کہہ دیجیے: میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ بس تمھارا معبود ایک ہی ہے، پھر کیا تم مسلمان ہو (108)
پھر اگر وہ پھریں تو کہہ دیجیے: میں نے تمھیں یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ جس کا
تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے، وہ قریب ہے یا بعید ہے (109) بے شک وہ (اللہ) پکار کر کہی ہوئی بات کو بھی جانتا
ہے اور جو تم چھپاتے ہو، اس کو بھی جانتا ہے (110) اور میں نہیں جانتا شاید یہ (تاخیرِ عذاب) تمھارے لیے
آزمائش اور ایک وقت تک فائدہ ہے (111) (رسول نے) کہا: اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ فرما، اور
ہمارا رب نہایت مہربان ہے، جو باتیں تم بیان کرتے ہو ان پر وہی مدد مانگے جانے کے لائق ہے (112)

وحی کا نچوڑ یہ ہے کہ معبودِ برحق صرف اللہ کافی ہی ہے:

دونوں طرف برابر، یعنی ابھی تم دونوں بات کر سکتے ہو، ایک طرف کا زور نہیں آیا۔ انتہی۔ اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کو اس بات کا امر فرماتا ہے کہ مشرکوں سے یوں کہیں: ﴿ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ "أي متبعون على ذلك مستسلمون منقادون له" یعنی پھر کیا تم اس بات پر میری پیروی کرتے ہو، اس (اللہ) کے مطیع اور فرمانبردار ہوتے ہو۔ ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا ﴾ یعنی پھر اگر وہ ترک کریں اس بات کو، جس کی طرف تم نے اُن کو بلایا، ﴿ فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ ﴾ یعنی تو تم اُن سے کہہ دو کہ میں نے تم کو اس بات کی خبر دی کہ میں تمھارے واسطے حرب ہوں، جیسے تم میرے واسطے حرب ہو، میں تم سے بے زار ہوں، جیسے تم مجھ سے بے زار ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [یونس: ٤١] "اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم اس سے بَری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بَری ہوں جو تم عمل کرتے ہو" نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ ﴾ [الأنفال: ٥٨]

''اور اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو برابری (کی سطح) پر ان کا عہد ان کے منہ پر دے ماریں۔'' یعنی چاہیے کہ تمھارا علم اور اُن کا علم عہد چھوڑنے کے ساتھ برابر ہو اور اسی طرح اس جگہ ہے: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ یعنی میں تم کو اطلاع دیتا ہوں تم سے اپنی براءت کی اور تمھاری براءت کی مجھ سے، اس لیے کہ مجھ کو اس کا علم ہے۔

﴿وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ یعنی جس کا تم کو وعدہ ملتا ہے، وہ ضرور ہی واقع ہونے والا ہے، لیکن مجھے نہ اس کے قریب ہونے کا کچھ علم ہے نہ اس کے بعید ہونے کا۔ ﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے سارے غیب کو اور جانتا ہے وہ چیز جس کو بندے ظاہر کرتے ہیں اور وہ چیز جس کو چھپاتے ہیں، وہ جانتا ہے ظواہر کو اور ضمائر کو اور جانتا ہے چھپے کو اور چھپے سے چھپے کو اور جانتا ہے وہ چیز جو بندے اپنے ظاہر کرنے اور چھپانے میں کرنے والے ہیں اور اس تھوڑے بہت پر اُن کو بدلہ دے گا۔

﴿وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ یعنی اور میں نہیں جانتا ہوں، شاید یہ جانچنا ہو تمھارے لیے اور ایک وقت تک تمھیں برتوانا ہو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: شاید اس کی تاخیر تمھارے لیے فتنہ ہو اور ایک مدتِ مقرر تک برتوانا ہو۔[1] عون نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے۔ فاللہ أعلم۔ فتح القدیر میں امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: ''ما أخبركم به من العذاب والساعة لعل تاخير ذلك عنكم فتنة لكم''[2]

﴿قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے رب! ہمارے اور ہماری قوم، جو جھٹلاتی ہے، کے درمیان انصاف کا فیصلہ کر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام یوں کہا کرتے تھے کہ ''ربنا افتح بيننا وبين قومنا بالحق وأنت خير الفاتحين'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہوا کہ یہ کہیں۔[3] امام مالک رحمہ اللہ زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت کسی غزوے میں حاضر ہوتے تو فرماتے: ﴿رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ قولہ تعالیٰ: ﴿وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ یعنی ہمارا رب رحمٰن ہے، اسی سے ہم مدد مانگتے ہیں، ان باتوں پر جو وہ کہتے ہیں اور جھوٹ بناتے ہیں اور جھٹلانے کے مقاموں میں رنگ برنگ کا جھوٹ بولتے ہیں اور طرح طرح کا جھوٹ اور الزام تراشی کرتے ہیں، اللہ سے اس بارے میں تم پر مدد مانگتے ہیں۔

آخر تفسير سورة الانبياء۔ ولله الحمد و المنة.[4] (كذا في ابن كثير)

﴿قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کی اصل

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٥٤) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧١) فتح القدير (٣/ ٥٩١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧١) [4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧٠۔ ٢٧١)

توحیدِ رب العالمین اور ارحم الراحمین کی شرک سے براءت ہے، اس لیے اللہ پاک نے توحید کے مضمون کو بڑی دھوم دھام سے بیان کیا اور نہایت مبالغہ و اہتمام سے دو قصر و حصر لا کر اس کو ثابت فرمایا کہ اے پیغمبر! تم مشرکوں سے کہہ دو کہ نہیں وحی کی جاتی میری طرف مگر اسی بات کی کہ تمھارا معبود کوئی نہیں مگر ایک معبود۔ یہاں کلمہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ دو مذکور ہوئے، ایک ہمزہ کی زیر کے ساتھ دوسرا زبر کے ساتھ، یہ دونوں کبھی تو اس لیے آتے ہیں کہ کسی حکم کو کسی شے کے لیے مخصوص کرنا ہو، جیسے یہ مثال ہے: "إنما یقوم زید" یعنی نہیں قائم ہوتا ہے مگر زید۔ مطلب یہ ہے کہ قیام مخصوص ہے زید کے لیے، اور کبھی اس واسطے وارد ہوتے ہیں کہ کسی شے کا قصر ہو حکم پر، جس طرح یہ قول ہے: "إنما زید قائم" یعنی نہیں ہے زید مگر قائم۔ مقصود یہ ہے کہ زید مقصور ہے قیام پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شے ﴿ اِنَّمَا ﴾ سے متصل ہوتی ہے، ہمیشہ قصر اسی کے واسطے ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح آیتِ کریمہ مذکورہ میں سمجھنا چاہیے کہ پہلا ﴿ اِنَّمَا ﴾ واسطے قصرِ وحی کے توحید پر ہے اور دوسرا اللہ پاک کے واسطے وحدانیت کے قصر پر ہے۔ اب اگر کلمہ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ٹھہرے گا تو معنی یہ ہوں گے کہ میری طرف جس شے کی وحی کی جاتی ہے، وہ یہی ہے کہ اللہ پاک کا وصف وحدانیت پر مقصور ہے وحدانیت کو توڑنے والی اور اس کے متضاد چیزوں، یعنی شرک کی طرف تجاوز نہیں کرتی اور اگر ﴿ مَا ﴾ کافہ ہوگا تو یہ معنی ہوں گے کہ وحی میری طرف مقصور ہے اس بات پر کہ اللہ پاک وحدت اور یکتائی کے ساتھ مستاثر و مستبد ہے، یعنی آپ کی طرف جو شے وحی کی جاتی ہے اس کا حکم ﴿ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ کے مضمون میں منحصر ہے، اس لیے کہ یہ جملہ محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ يُوْحٰٓى ﴾ کا نائب فاعل ہے۔ تقدیر یہ ہوئی: "إنما یوحی إلي وحدانية الله تعالی" اور "إنما یوحی إلي" مع اپنے نائب فاعل کے ایسا ہو جیسے: "إنما یقوم زید" یعنی قائم ہوتا ہے زید۔ زید کے علاوہ دوسرا قائم نہیں ہوتا ہے۔ پس گویا یوں کہا گیا کہ نہیں وحی کی گئی میری طرف کوئی چیز مگر توحید۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ حصر کس طرح ٹھیک ہوسکتا ہے، حال یہ ہے کہ آپ کی طرف تو سوائے توحید کے اور بہت سی چیزوں کی وحی کی گئی ہے؟ تو کہیں گے کہ آپ کی بعثت کا اصل اور اولیٰ مقصد یہی توحید ہے، باقی اشیا کی وحی اس کے تابع ہے، اس لحاظ سے گویا آپ کی وحی اسی توحید پر مقصور ہے۔

اسی طرح ﴿ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ مثل "إنما زید قائم" کے ہے، یعنی زید سوا قیام کے اور کچھ نہیں کرتا ہے اور قیام کے سوا کسی اور وصف کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا ہے تو گویا اللہ پاک کا وصف وحدانیت پر مقصور ہے سوائے وحدانیت کے اور کسی وصف کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا، حالانکہ اس کی صفات جلال و جمال سوائے توحید کے بے حد و بے شمار ہیں۔ لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حقیقی حصر نہیں ہے، بلکہ حصر ادعائی ہے، کیوں کہ اس

حصر کا مقصد اُن اوصاف کی نفی کرنا ہے جن کے ساتھ مشرکین اللہ پاک کا وصف کرتے ہیں۔ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ یعنی پھر کیا تم مطیع و فرمانبردار ہونے والے ہو معبود برحق کی وحدانیت کے، جس کی وحی میری طرف کی جاتی ہے اور اپنی عبادت کو اس کے لیے خاص کرتے ہو، جس کی تصدیق حجت و دلیل سے کی گئی ہے؟ یہ استفہام بہ معنی امر ہے، یعنی جب شد و مد کے ساتھ توحید ثابت ہو چکی تو اب تم اخلاصِ عبادت کرو، خالص اللہ پاک کو پوجو۔ حرفِ فا لانے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کلام اسی وقت کرتے ہیں جب اس سے پہلے کوئی ایسا حکم مذکور ہوتا ہے جو کسی شے کے کرنے اور مسارعت (جلدی کرنے) کا موجب ہوتا ہے تو اس قسم کا کلام اس پر آمادہ کرنے اور اس کے ترک کرنے پر ڈانٹنے کے لیے لاتے ہیں۔ چونکہ اس جگہ توحید کے سلسلے میں دو حصر لاکر مبالغہ کیا گیا تو اس کے بعد یہ کلام لایا گیا توحید کی طرف مسارعت میں مبالغے کے لیے۔ پس اسی لیے امر کو استفہام کے پیرائے میں ادا کیا۔ اس قسم کی تقریر اسی سورت کی تفسیر میں پہلے گزر چکی ہے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ یعنی اگر وہ توحید و اسلام سے منہ موڑ لیں، مسلمان نہ ہوں۔ ﴿فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ﴾ تو تم کہہ دو کہ جس شے کا مجھ کو حکم ہوا تھا، وہ میں نے تمھیں بتا دیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ میں نے تم کو اس بات کی خبر کر دی کہ میں تمھارے واسطے حرب ہوں، یعنی مجھ سے تم سے لڑائی ہے، ہمارے تمھارے درمیان کسی طرح کی صلح نہیں ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دونوں معنی ذکر کیے ہیں۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے پہلے معنی کو اختیار کیا ہے۔[2] دوسرے معنی کو امام محلی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[3] ”آذنت“ کا ہمزہ نقل کے واسطے ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ ”أذن“ منقول ہے۔ ”اَذِنَ إِذَا علم“ سے، لیکن ایذان کا استعمال اکثر انذار کے قائم مقام ہوتا ہے۔[4]

﴿عَلٰى سَوَآءٍ﴾ محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ ﴿اٰذَنْتُكُمْ﴾ کے مفعول سے حال ہے، یعنی جس چیز کا مجھے حکم ہوا ہے میں نے تم کو اس کی خبر کر دی ہے۔ درآں حالیکہ تم اس کی خبر میں برابر ہو، میں نے تم میں سے بعض کو خاص نہیں کیا، بلکہ سب کو برابر اطلاع کر دی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں مذہبِ باطنیہ کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔[5] امام زجاج رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے کہ جس بات کی میری طرف وحی کی جاتی ہے، میں نے وہ سب کچھ تمھیں بتا دیا ہے برابری پر، اس کے بتانے میں مَیں ایسا نہیں کرتا کہ کسی کو کوئی ایسی چیز ظاہر کروں جو دوسروں سے چھپاؤں۔[6] مطلب یہ ہے کہ سب کو برابر اطلاع دیتا ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فاعل و مفعول سے ایک ہی ساتھ حال ہے، یعنی میں نے تم کو لڑائی سے خبردار کر دیا۔ درآں حالیکہ میں اور تم اس کے علم میں برابر ہیں، یا آپس کی عداوت میں اس کے علم کے ساتھ میں مستقل و مستبد نہیں ہوتا،

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١١۔ ١١٢) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٣) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣١)
[4] الكشاف (٣/ ١٤٠) [5] تفسير النسفي (٣/ ٩٣) [6] تفسير القرطبي (١١/ ٣٥٠)

تمھارے بغیر کہ مجھے تو اس کا علم ہو اور تمھیں خبر نہ ہو۔ یہ اطلاع اس لیے ہے کہ تم مستعد و تیار ہو جاؤ اور اپنے ساز و سامان درست کر لو۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی قول معلوم ہوتا ہے۔[2]

تیسری صورت یہ ہے کہ ﴿عَلٰی سَوَآءٍ﴾ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ "أي إيذانا على سواء" یعنی میں نے تم کو ایسا کھلا ہوا اعلام کیا ہے کہ اس کے علم میں ہم اور تم برابر ہیں۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ "إِنَّ" محذوف مع اسم کے خبر ہے اور جملہ مستأنفہ ہے: "أي أعلمتكم إني كائن على سواء" یعنی میں نے تم کو برہان روشن سے اس بات کی خبر کر دی کہ میں عدل و استقامتِ رائے پر ہوں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ان چاروں صورتوں کو ترتیب وار ذکر کیا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[3] کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ توحید وغیرہ جو تم پر واجب تھی میں نے تم کو اس کا اعلام کر دیا، تاکہ تم ایمان میں برابر ہو جاؤ اول کی دونوں صورتوں میں، یعنی ﴿عَلٰی سَوَآءٍ﴾ مفعول ﴿اٰذَنْتُكُمْ﴾ سے حال ہو، یا فاعل و مفعول دونوں سے معاً حال ہو۔ "أذنت" "اذن" بہ معنی علم سے منقول ہوگا اور ایذان سے مراد ایذانِ حق ہوگا اور حرب کے معنی کی بنا پر بھی اگرچہ أذنت اذن" بہ معنی علم سے منقول ہوگا، مگر اتنی بات ہے کہ ایذان کا استعمال مقامِ انذار و تہدید میں آیا کرتا ہے تو ایذان حرب کا اس استعمال سے مستفاد ہوگا، گویا یوں کہا گیا کہ اب تک میں نے اپنی طاقت وقوت حق کے اعلام میں صَرف کی اور حق کی طرف تم کو ارشاد کیا، پھر جب تم نے حق کو قبول نہ کیا اور اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے تو لو اب تم اپنے عناد کی جزا کے واسطے تیار ہو جاؤ۔ شیخ زادہ کی تقریر کا حاصل یہی ہے۔

﴿وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ یعنی مجھے معلوم نہیں کہ جس شے کا تمھیں وعدہ ملتا ہے، اس کا حصول قریب ہے یا بعید۔ ﴿مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ سے مراد قیامت ہے، یعنی مجھے معلوم نہیں ہے کہ قیامت کب ہو گی، کیوں کہ اللہ نے مجھ کو اس پر مطلع نہیں کیا، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ ضرور ہونے والی ہے۔ یا مراد عذاب ہے، یعنی مجھے معلوم نہیں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب کب نازل ہوگا۔ امام نسفی اور محلی رحمہ اللہ نے یہی دو قول ذکر کیے ہیں۔[4] فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ مراد غلبۂ اسلام و اہلِ اسلام ہے کفر و اہلِ کفر پر۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو پہلے ذکر کیا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ تم سے لڑنے کے لیے مجھے کب اذن دیا جائے گا۔ اس قول کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[6]

عام اس پر ہیں کہ ﴿اِنْ اَدْرِیْۤ﴾ کی یائے تحتیہ ساکن چھوڑی جائے، کیوں کہ اس کے غیر کا کوئی موجب نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے ﴿وَاِنْ اَدْرِیَ اَقَرِیْبٌ﴾ اور ﴿اِنْ اَدْرِیَ

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣١)
[2] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٦)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١١۔ ١١٢) تفسير الخازن (٤/ ٣٢٦)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٩٤) تفسير الجلالين (١/ ٤٣١)
[5] فتح القدير (٣/ ٥٨٨) فتح البيان (١٨/ ٣٨٢) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٢)
[6] تفسير القرطبي (١١/ ٣٥٠)

﴿ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ ﴾ کو بفتح ہر دو یائے تحتیہ پڑھا ہے، اس قراءت کی تخریج اس پر کی ہے کہ یائے اضافت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔[1] (امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یائے تحتیہ کے فتح کا شاذ میں حکایت کیا گیا ہے۔ امام ابو الفتح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ ﴿ اِنْ ﴾ بہ معنی ﴿ مَا ﴾ ہے۔ امام ابو الفتح کے علاوہ نے کہا ہے کہ ہمزہ کی حرکت حرف یا پر ڈالی گئی تو وہ متحرک ہوگئی اور ہمزہ ساکن باقی رہ گیا۔ "فأبدلت ألفا لانفتاح ما قبلها ثم أبدلت همزه متحركه لأنها في حكم المبتدأ بها والابتداء بالساكن محال"[2]) جملہ استفہامیہ محل نصب میں ہے بہ سبب ﴿ اَدْرِيْٓ ﴾ کے، کیوں کہ ﴿ اَدْرِيْٓ ﴾ بہ سبب ہمزہ استفہام کے عمل سے معلق کیا گیا ہے۔ اصل کلام یوں ہے: "أقريب ما توعدون أم بعيد" لیکن آیتوں کی روی کے واسطے مستفہم عنہ کو موخر کر دیا ہے اور ﴿ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ جائز ہے کہ مبتدا ہو اور ماقبل اس کا اس سے خبر اور اس پر معطوف ہو۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس میں جائز رکھا ہے کہ ﴿ قَرِيْبٌ ﴾ کا فاعل ہو کر مرفوع ہو۔ کہا: اس لیے کہ ہمزے پر اعتماد کیا ہے۔ کہا کہ بصریوں کے قول پر یوں تخریج ہو سکتی ہے کہ ﴿ بَعِيْدٌ ﴾ سے مرفوع ہو، کیوں کہ وہ اس سے قریب تر ہے۔[3] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جائز ہے کہ مسئلہ باب تنازع سے ہو، کیوں کہ قریب و بعید دونوں وصفوں میں سے ہر ایک کا تسلط ﴿ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ پر معنی کی حیثیت سے صحیح ہے۔

﴿ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ اس سے مقصود تین امر ہیں: ایک یہ ہے کہ تعلیل ہے امر کی، جس پر ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ دال ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اسلام میں کھلم کھلا طعن کرنے اور مسلمانوں کا کینہ پوشیدہ رکھنے سے نہی ہے۔ تیسرا بیان ہے اس بات کا کہ عذاب کی تاخیر بہ سبب اُن کے اسرار و اعلان کے نہیں ہے، بلکہ بہ سبب کسی حکمت کے ہے، جو اس کی مقتضی ہوئی ہے۔ پھر کہا ہے کہ شاید وجہ حکمت کی تاخیر میں استدراج ...الخ ہو۔ (كذا قاله شيخ زاده) "حال من الجهر أي المجهور من القول"[4] (أبو البقاء) یعنی اللہ پاک ہر شے کا عالم ہے، تم جو کھلم کھلا کفر کرتے ہو اور اسلام و اہلِ اسلام پر طعن کرتے ہو اس کو اللہ جانتا ہے۔ ﴿ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴾ یعنی کینہ، بغض اور حسد مسلمانوں کا، جس کو تم اپنے دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہو، اللہ اس کو بھی جانتا ہے، تمھارا کھلا اور چھپا اس کے علم سے غائب نہیں ہے۔ پھر وہ تم کو اس پر جزا دے گا۔

﴿ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ ﴾ یعنی اور میں نہیں جانتا ہوں شاید تمھارے عذاب میں تاخیر تمھارے لیے استدراج ہو اور تمھارے لیے سزا اور عذاب میں زیادتی کا سبب ہو۔ چونکہ فتنہ و عذاب کا سبب استدراج تھا، اس لیے فتنہ کا لفظ اس پر بطورِ مجاز مرسل بولا گیا، یا امتحان کے لیے، تاکہ اللہ پاک جانچے اور دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے

---

(1) اللباب في علوم الكتاب (١٣/ ٦٢٥)
(2) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٠)
(3) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٠)
(4) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٠)

ہو۔ امتحان سے مراد بطورِ استعارہ تمثیلیہ کے ایسا معاملہ ہے، جو امتحان کے مشابہ ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ ﴿ اَدْرِیْ ﴾ کا معلق ہے۔ کوفے والے اس باب میں ترجی کو قائم مقام استفہام کے کرتے ہیں، مگر اور نحویوں نے "لَعَلَّ" کو من جملہ معلقات شمار نہیں کیا ہے، حالانکہ "لَعَلَّ" اس باب میں ظاہر ہے، جیسے یہ آیت ہے اور دوسری آیت یہ ہے ﴿ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ﴾ [عبس: ٣] "اور (اے نبی!) آپ کو کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا؟" اور ایک اور آیت ہے: ﴿ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴾ [الشوریٰ: ١٧] "اور آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی ہو؟"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی اور برتوانا ہو ایک مدتِ مقرر تک حسب مقتضائے مشیتِ الٰہی۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا اور برتوانا ہو واسطے تمھارے موت تک، تاکہ یہ تم پر حجت ہو جائے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ مقابل ہے اول کا، جس کی "لَعَلَّ" کے ساتھ ترجی کی گئی ہے، یعنی ﴿ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ ﴾ اور ثانی ترجی کا محل نہیں ہے، یعنی اس لیے کہ ثانی محقق ہے۔ امام کرخی اور شہاب رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] جمل نے کہا ہے کہ امام محلی رحمہ اللہ کی عبارت کا مقتضا یہ ہے کہ ﴿ وَمَتَاعٌ ﴾ معطوف ہے خبر "لَعَلَّ" پر، یعنی فتنہ، اس وقت یہ قول کہ ثانی ترجی کا محل نہیں ہے، ٹھیک نہ ہوگا، کیوں کہ جب ﴿ مَتَاعٌ ﴾ "لَعَلَّ" کی خبر پر معطوف ہوا تو اس کا معمول ہوگا، معمول ہوا تو "لَعَلَّ" اس پر بھی مسلط ہوگا، اس صورت میں ﴿ مَتَاعٌ ﴾ قطعاً ترجی کا محل ٹھہرے گا، اس لیے اس مقام میں اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہیں کہ ﴿ وَمَتَاعٌ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ تقدیر یہ ہے: "وهذا متاع إلى حين" یعنی اور تاخیر تمھارے عذاب کی برتنا اور نفع اُٹھا لینا ہے واسطے تمھارے ایک وقتِ مقرر تک اس بنیاد پر یہ جملہ مستأنفہ ہوگا۔ فليتأمل.

امام ابن ابی خیثمہ اور ابن عساکر رحمہما اللہ نے ربیع بن انس رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت نبی اکرم ﷺ کو شبِ معراج میں سیر کرایا گیا تو آپ ﷺ نے فلاں کو دیکھا اور وہ شخص بنی اُمیہ کا کوئی شخص ہے کہ منبر پر لوگوں کو خطبہ سنا رہا ہے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ پر شاق گزری۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ يقول هذا الملك.[3] پھر اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کی دعا نقل فرمائی: ﴿ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی اے رب! تو حکم کر میرے اور اُن جھٹلانے والوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ کہ جو تیرے نزدیک حق ہے۔ پس آپ ﷺ نے اپنے کام کو اللہ پاک کے سپرد کر دیا۔

امام حفص رحمہ اللہ نے ﴿ قٰلَ ﴾ بہ صیغۂ ماضی پڑھا ہے، اس بنا پر کہ نبی اکرم ﷺ کے قول کی حکایت ہے۔

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٤) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٢) حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٧٩)

[3] تاريخ دمشق (٥٧/ ٣٤١) یہ روایت مرسل ہے۔

عامہ نے ﴿ رَبِّ احْكُمْ ﴾ بکسر بائے موحدہ و حذف یائے اضافت کسریٰ پر اکتفا کر کے پڑھا ہے۔ امام ابو جعفر بن قعقاع و ابن محیصن رحمہما اللہ نے ﴿ رَبُّ ﴾ کو بضم بائے موحدہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ منادی مفرد معرفہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لحن ہے، یعنی غلط ہے نحویوں کے نزدیک، اُن کے نزدیک "رجل أقبل" جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ تو "یا رجل" کہے۔ امام ضحاک، طلحہ اور یعقوب رحمہم اللہ کی قراءت "ربي احكم" بسکون یائے تحتیہ و قطع ہمزہ و فتح کاف و ضم میم بصیغہ افعل تفضیل ہے۔ "رَبِّيْ" مبتدا ہے اور "احكم" خبر، یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرا رب ہر حاکم سے بڑھ کر حق کے ساتھ حکم کرنے والا ہے۔ جَحْدَرِی نے "ربي أَحْكَمَ" بصیغہ ماضی پڑھا ہے احکام سے، یعنی میرے رب نے امور کو مضبوط کیا ہے ساتھ حق کے۔ اس میں بھی "ربي" مبتدا "أحكم" خبر ہے۔

کسی نے ﴿ قُلْ ﴾ بصیغہ امر پڑھا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں صفت قائم مقام موصوف کے کی گئی ہے۔ تقدیر یہ ہے: "رب احكم بحكمك الحق" اور ﴿ رَبِّ ﴾ موضع نصب میں ہے، اس لیے کہ منادیٰ مضاف ہے طرف یائے متکلم کے۔ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو امر فرمایا کہ اپنی قوم پر جلد عذاب آنے کی دعا کریں اور یوں کہیں کہ اے میرے رب! تو فیصلہ کر درمیان ہمارے اور اہلِ مکہ کے عدل کے ساتھ، کیوں کہ عدل ان کے حق میں یہی ہے کہ اُن پر جلد عذاب لے آئے اور اُن کو مہلت نہ دے۔ پس اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ کی دعا قبول فرمائی؛ بدر کے دن اُن پر عذاب نازل کیا، پھر انجامِ خیر و غلبہ و نصر اپنے مومن بندوں کو عطا فرمایا۔[1] والحمد لله رب العالمين۔

امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق سے مراد یہ ہے کہ اُن پر عذاب نازل کر، یا مجھ کو اُن پر فتح دے۔ پس وہ بدر و اُحد و احزاب و حنین و خندق کی لڑائیوں میں عذاب کیے گئے اور نبی اکرم ﷺ مظفر و منصور ہوئے۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے: کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ تو میرے اور اُن کے درمیان ایسی شے کے ساتھ فیصلہ کر جو حق کو سب پر ظاہر کر دے، وہ یہی ہے کہ تو مجھ کو اُن پر فتح دے۔ اور اللہ پاک حق کے ساتھ حکم کرتا ہے، کوئی اس کی طلب کرے یا نہ کرے۔ طلب کے معنی طالب کی طرف سے رغبت کا اظہار ہے۔[3]

فتح القدیر میں مذکور ہے کہ امام ابن جریر اور ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ حکم نہیں کرتا مگر حق کے ساتھ۔ "وإنما يستعجل بذلك في الدنيا يسأل ربه"[4] یعنی نبی اکرم ﷺ نے جو اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کیا، سو غرض یہ ہے کہ آپ دنیا میں اس کو جلد چاہتے ہیں، اپنے رب سے اس کا سوال فرماتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کی دعا کے تتمہ کو ذکر فرمایا: ﴿ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا

---

① فتح القدير (٣/ ٥٨٨) ② تفسير الجلالين (١/ ٤٣٢)

③ تفسير الخازن (٤/ ٣٢٦) ④ تفسير الطبري (١٨/ ٥٠٤) فتح القدير (٣/ ٥٩١)

﴿ تَصِفُوْنَ ﴾ قرآن شریف میں وصف کا استعمال کذب کے معنی میں بہ کثرت آیا ہے، مثل قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٨] ''اور تمھارے لیے ان باتوں کی وجہ سے ہلاکت ہے جو تم (اللہ کے بارے میں) بیان کرتے ہو۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ﴾ [الأنعام: ١٣٩] ''جلد ہی اللہ انھیں اس طرح (خود ہی حلال اور حرام) طے کرنے کی سزا دے گا۔'' مفضل و سلمی نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے، باقی قاریوں نے بتائے فوقیہ بصیغۂ خطاب پڑھا ہے۔[1]

﴿ رَبُّنَا ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ خبر اور ﴿ اَلْمُسْتَعَانُ ﴾ مع متعلق دوسری خبر ہے۔ ﴿ مَا تَصِفُوْنَ ﴾ سے مراد شرک، کفر، کذب اور اباطیل ہے اور من جملہ اس کے یہ ہے کہ اللہ پاک کے لیے اولاد ٹھہرائی، نبی اکرم ﷺ کو شاعر و کاہن، ساحر اور قرآن شریف کو شعر اور سحر کہتے تھے اور باطل تمنائیں کرتے کہ شوکت و غلبہ انھیں کا ہوگا، اسلام کا نشان چند روز اُڑے گا، پھر ساکن ہو جائے گا اور غلبۂ اسلام کا وعدہ سچا ہوتا تو اُن پر عذاب نازل ہو جاتا، پس اللہ پاک نے ان کے گمان کی تکذیب کی اور اُن کے آمال و باطل آرزوؤں کو خائب و خاسر کر دیا اور نبی اکرم ﷺ اور مومنین کو فتح مند کیا اور کفار کو ذلیل و خوار فرمایا اور اپنے وعدۂ صادق کو پورا کیا۔ معنی یہ ہیں کہ ہمارا پروردگار اپنے بندوں پر بڑی رحمت والا ہے، اس سے ہم مدد چاہتے ہیں، ان باتوں پر جو تم بناتے ہو۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: گویا اللہ پاک نے فرمایا کہ تم مجھ سے دعا کرتے ہوئے یوں کہو کہ اے ہمارے رب! تو انصاف کا فیصلہ کر اور کفار کو وعید سناتے ہوئے اس طرح کہو: ﴿ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾[2] والله أعلم بمراده و أسرار كتابه.

الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، والصلاة والسلام على سيدنا، و مولنا محمد خير البريات، و على آله أولى الدرجات الرفيعات و صحبه ذوي المكرمات۔ أما بعد! یہ تفسیر روز شنبہ ۲۱/ ذی حجہ ۱۳۰۹ ہجری وقت زدن یازدہ شب یک شنبہ محلۂ امیر گنج شاہ جہان آباد بھوپال میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ اس کو قبول فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے جس طرح اس جلد کو پورا کیا، اسی طرح اور اجزا کو بھی بہ عافیتِ تمام پورا کر دے۔ رزقنا الله السعادة في الدين والدنيا، و أذاقنا حلاوة رضوانه الأسنىٰ بمنه وكرمه آمين آمين آمين يا رب العالمين، يا أرحم الراحمين، أنا العبد الراجي رحمة ربه الباري ذوالفقار أحمد النقوي البوفالي غفر الله له ولوالديه وأحسن إليهما وإليه، اللهم اغفر لصاحب الترجمان مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا، و غسله بالماء و الثلج والبرد، و نقه من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس آمين.

[1] تفسير القرطبي (١١/ ٣٥١)
[2] تفسير الخازن (٤/ ٣٢٦)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورة الحج

علما نے اختلاف کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورت حج مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[1] امام ضحاک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ مکی ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے یہ روایت کیا ہے کہ مدینے میں قرآن سے سورت حج اُتری، مگر چار آیتیں مکی ہیں: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَكِیۡمٌ ﴿52﴾ لِّیَجۡعَلَ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡقَاسِیَةِ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿53﴾ وَّلِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَیُؤۡمِنُوۡا بِهٖ فَتُخۡبِتَ لَهٗ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿54﴾ وَلَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فِیۡ مِرۡیَةٍ مِّنۡهُ حَتّٰی تَاۡتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً اَوۡ یَاۡتِیَهُمۡ عَذَابُ یَوۡمٍ عَقِیۡمٍ﴾ امام قرطبی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مکی ہے سوائے تین آیتوں کے۔ کسی نے کہا چار آیتیں: ﴿ثَانِیَ عِطۡفِهٖ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ ؕ وَّنُذِیۡقُهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ﴾ تک نقاش سے حکایت کیا ہے کہ سورۃ الحج سے دس آیتیں مدینے میں نازل ہوئیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمہور نے کہا ہے کہ یہ سورت مختلط ہے، بعض اس سے مکی ہے اور بعض مدنی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا صحیح یہی قول ہے، کیوں کہ آیتیں اسی بات کی مقتضی ہیں۔ اس لیے کہ ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ﴾ مکی ہے اور ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا﴾ مدنی ہے۔[2] جمل میں "هذا هو الأصح" کہا ہے۔ عزیزی نے کہا ہے کہ یہ سورت عجیب سورتوں میں سے ہے۔ رات کو اُتری، دن میں اتری، سفر و حضر میں نازل ہوئی، مکے و مدینے میں صلح و حرب میں۔ ناسخ ہے اور منسوخ ہے۔ محکمہ ہے اور متشابہ ہے۔[3]

اس کی فضیلت میں کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ امام احمد، ابو داود، ترمذی، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ نے اپنی سنن میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا سورۃ الحج کو باقی

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٣) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١) [3] فتح القدير (٣/ ٥٩٢)

قرآن پر دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے؟ فرمایا: ہاں، پس جو شخص ان دونوں کو نہ کرے تو اس کو نہ پڑھے۔ ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: "هذا حديث ليس إسناده بالقوي"[1] امام ابوداود رحمہ اللہ نے مراسیل میں اور بیہقی رحمہ اللہ نے خالد بن معدان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ الحج کو قرآن پر دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں۔[2]

امام شافعی رحمہ اللہ، ابن مبارک، امام احمد اور اسحق رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں ایک سجدہ ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ کا یہی قول ہے[3] اور امام ابن ابی شیبہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے اس کو روایت کیا ہے۔[4] اس کی آیتوں کی تعداد کے بارے میں کئی قول ہیں: ① چوہتر۔ ② پچھتر۔ ③ چھہتر۔ ④ ستتر۔ ⑤ اٹھہتر آیتیں ہیں۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام خازن رحمہ اللہ وغیرہ نے اس قول کو حکایت کیا ہے اور شاید اُن کے نزدیک راجح قول بھی یہی ہو۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اس سورت میں ۱۲۹۱ کلمے ہیں اور ۵۵۷۵ حرف ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی (ہولناک) چیز ہے ① جس دن تم اسے دیکھو گے (یہ حال ہوگا) کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی، اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی، اور آپ لوگوں کو نشے میں (مدہوش) دیکھیں گے، حالاں کہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، لیکن اللہ کا عذاب (بڑا ہی) شدید ہوگا ②

قیامت کی ہولناکیاں:

اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنے تقویٰ کا امر فرماتا ہے اور روزِ قیامت کی ہولناکیاں، حالات اور زلازل، جو آیندہ اُن

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٧٨) مستدرك الحاكم (١/ ٣٤٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (٢/ ٣١٧) امام البانی رحمہ اللہ نے حدیث کے دوسرے حصے (جو شخص ان دونوں ... پڑھے) کے علاوہ باقی روایت کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٥/ ١٤٥)

[2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٢/ ٣١٧) یہ روایت مرسل ہے۔ [3] تفسير القرطبي (١٢/ ١) [4] مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٣٧٣)

کو پیش آئیں گے، اُن کی خبر دیتا ہے۔ مفسرین نے زلزلۂ ساعت میں کہ جس دن لوگ اپنی قبروں سے اُٹھیں گے اور عرصاتِ قیامت کی طرف جائیں گے، اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ زلزلہ اس کے بعد ہوگا یا اس سے مراد زمین کا زلزلہ ہے، جو اس سے قبل ہوگا کہ لوگ اپنی قبروں سے اُٹھیں، جیسا کہ اللہ پاک فرمایا: ﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ [الزلزال: ١۔ ٢] ''جب زمین پورے زور سے ہلائی جائے گی۔ اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝١٤ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴾ [الحاقة: ١٤۔ ١٥] ''اور زمین اور پہاڑ اُٹھا کر ایک ہی چوٹ سے ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔ تو اس دن واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہوگی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝٤ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴾ [الواقعة: ٤۔ ٥] ''جب زمین نہایت بری طرح ہلائی جائے گی۔ اور پہاڑ (پھوڑ کر) بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔''

پس ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ یہ زلزلہ دنیا کی آخری عمر اور قیامت کے پہلے احوال میں ہونے والا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے علقمہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ قیامت سے پہلے ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی علقمہ سے اس کو روایت کیا ہے، کہا کہ امام شعبی، ابراہیم اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ ابو کدینہ نے عن عطاء عن عامر الشعبی سے روایت کیا ہے، کہا کہ یہ دنیا میں ہے روزِ قیامت سے پہلے۔[1] امام ابوجعفر ابن جریر اس قول کے قائل کی سند حدیثِ صور میں لائے ہیں، بہ سند خود سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جب آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے فارغ ہوا تو صور کو پیدا کیا، پھر اسے اسرافیل کو دیا، پس وہ اس کو اپنے منہ پر رکھنے والے ہیں، اپنی آنکھ عرش کی طرف بلند کرنے والے ہیں، انتظار کر رہے ہیں کہ کب امر کیا جائے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صور کیا ہے؟ فرمایا: ایک قرن ہے۔ عرض کی: پھر وہ کیسے ہے؟ فرمایا: ایک بڑا قرن ہے، یعنی سینگ، اس میں تین پھونکیں پھونکی جائیں گی: پہلی پھونک گھبراہٹ کی۔ دوسری صعق، یعنی بے ہوشی کی۔ تیسری پھونک اللہ رب العالمین کے واسطے کھڑے ہونے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ اسرافیل کو پہلے نفخہ کا حکم دے گا، پس کہے گا کہ نفخۂ فزع پھونک، تو آسمان والے اور زمین والے گھبرا جائیں گے، مگر وہ لوگ جن کو اللہ چاہے، یعنی وہ نہ گھبرائیں گے اور اللہ اسرافیل کو حکم دے گا تو وہ اس پھونک کو کھینچیں گے اور اس کو لمبا کریں گے اور سستی نہ کریں گے اور یہ وہی نفخہ ہے جس کے حق میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴾ [صٓ: ١٥] ''یہ لوگ تو بس ایک (ہولناک) چیخ کا انتظار کر رہے ہیں، جس میں کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔''

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٥٧) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٧١)

پس پہاڑ چلیں گے، پھر مٹی ہو جائیں گے اور زمین اپنے لوگوں سمیت ہلے گی زور سے ہلنا، یہ وہی زلزلہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ﴾ [النازعات: ٦۔ ٨] ''جس دن کانپنے والی (زمین) کانپے گی۔ اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی (قیامت)۔ اس دن کئی دل دھڑکتے ہوں گے۔'' پھر زمین ایسے ہو جائے گی، جیسے کشتی کہ ہلاک ہو رہی ہے، موجیں اس کو مار رہی ہیں، اسے اس کے لوگوں سمیت جھکا رہی ہیں۔ ''فیمتد الناس علی ظهرها'' یعنی پس لوگ اس کی پشت پر کھنچ جائیں گے۔ پھر دودھ پلانے والیاں غافل ہو جائیں گی، یعنی اپنے بچوں سے اور پیٹ والیاں بچے جَن دیں گی اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور شیطان بھاگتے ہوئے اڑیں گے، یہاں تک کہ قطاروں میں آئیں گے، یعنی آسمان کی اطراف اور کناروں میں جائیں گے تو اُن سے فرشتے ملیں گے، پس اُن کے منہ کو ماریں گے تو وہ لوٹ آئیں گے۔ ''ويولى الناس مدبرين'' بعض بعض کو پکاریں گے، یہ وہی حال ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ [المؤمن: ٣٢۔ ٣٣] ''باہمی پکار کے دن۔ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے تو کوئی تمھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا نہ ہوگا اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔''

پھر وہ اس حال پر ہوں گے کہ زمین شق ہو جائے گی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اور ایک امرِ عظیم دیکھیں گے۔ ''فأخذهم لذلك من الكرب ما الله أعلم به'' یعنی پھر اُن کو اس کے سبب سے وہ کرب و بے قراری پکڑے گی جس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے، پھر وہ آسمان کی طرف نظر کریں گے تو ناگاہ وہ ایسا ہوگا، جیسا پگھلا ہوا تانبا، پھر اس کے سورج اور چاند کو گہن لگ جائے گا، یعنی بے نور ہو جائیں گے اور اس کے تارے جھڑ پڑیں گے۔ ''ثم كشطت عنهم'' یعنی پھر اُن سے آسمان کھول دیا جائے گا، جس طرح خیمے کو اکھاڑ لیتے ہیں، یہ وہی آسمان کا لپیٹنا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور مردے اس سے کچھ نہ جانیں گے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: پھر وہ لوگ کون ہیں، جن کا اللہ نے استثنا کیا ہے، جس وقت کہ فرماتا ہے: ﴿ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [النمل: ٨٧] ''اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے (سب) گھبرا جائیں گے، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے۔''؟ فرمایا: وہ لوگ شہداء ہیں اور گھبراہٹ تو زندوں کی طرف پہنچے گی، وہ لوگ تو اپنے رب کے پاس ہیں، روزی دیے جاتے ہیں اور اللہ نے اس دن کے شر سے اُن کو بچا لیا ہے اور اُن کو امن دیا ہے۔ اور وہ اللہ کا عذاب ہے، اپنی بدترین مخلوق پر اس کو بھیجے گا اور وہ وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ

تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾[1] امام طبرانی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور بہت سے لوگوں نے اس حدیث کو نہایت طویل روایت کیا ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ یہ حدیث اس پر دال ہے کہ یہ زلزلہ روزِ قیامت سے پہلے ہونے والا ہے۔ اس کی اضافت قیامت کی طرف اس لیے کی کہ اس سے قریب ہے، جس طرح کہ قیامت کی نشانیاں کہتے ہیں اور اس کی مثل۔ واللہ أعلم.

دوسرے لوگوں نے کہا بلکہ یہ ہولناکیاں، زلزلے، گھبراہٹ اور سخت خوف و حراس قیامت کے دن عرصات میں ہونے والا ہے۔ لوگوں کے قبروں سے اُٹھنے کے بعد۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے[2] اور اُن لوگوں نے کئی حدیثوں سے حجت پکڑی ہے۔

❁ **حدیث اول:** امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ اپنے بعض سفروں میں تھے اور آپ چلنے والے لوگوں کے قریب ہو گئے تھے، آپ نے ان دو آیتوں کے ساتھ اپنی آواز بلند فرمائی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ پھر جب آپ کے اصحاب نے اس کو سنا تو سواریوں کو تیز کیا اور جان گئے کہ وہ نزدیک اس بات کے ہے جس کو آپ فرما رہے ہیں۔ پھر جس وقت آپ کے گرداگرد قریب ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو، یہ کونسا دن ہے؟ یہ وہ دن ہے کہ آدم علیہ السلام کو اُن کا رب عزوجل پکارے گا اور کہے گا: اے آدم! بھیج اپنے بعث کو دوزخ کی طرف، یعنی جو لوگ دوزخی ہیں دوزخ کی طرف بھیجے جائیں گے۔ پس آدم علیہ السلام عرض کریں گے: اے میرے رب! کیا ہے بعثِ نار کا، یعنی اس کا مقدار و اندازہ کیا ہے؟ تو اللہ پاک فرمائے گا کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے آگ میں اور ایک جنت میں۔ راوی نے کہا: ”فأبلس أصحابه حتى ما أوضحوا بضاحكة“ یعنی آپ کے اصحاب مارے خوف، غم اور حیرت کے یہاں تک ساکت ہو گئے کہ ہنسنے والے دانتوں میں سے ایک دانت کو بھی ظاہر نہ کیا، پھر جب آپ نے یہ حالت ملاحظہ فرمائی تو فرمایا: خوش ہو جاؤ اور عمل کرو، پس قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! بے شک تم البتہ ہمراہ ایسے دو خلق کے ہو کہ نہیں ہوتیں وہ ہمراہ کسی شے کے کبھی، مگر وہ اس کو بہت کر دیتی ہیں یاجوج ماجوج اور وہ لوگ کہ آدم علیہ السلام اور ابلیس کی اولاد میں سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ راوی نے کہا: پھر وہ رنج و غم ان سے دور ہو گیا۔ پھر فرمایا کہ عمل کرو اور خوش ہو جاؤ، پس قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٥٨۔ ٥٥٩) اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں اور ان کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٥٩)

جان ہے! نہیں ہو تم مگر لوگوں میں مثل شامہ کے، یعنی خال (تل) کے اونٹ کے پہلو میں، یا مثل رقمہ کے ذراعِ دابہ ہیں۔[1] ("هي الهنة الناتئة في ذراع الدابة من داخل وهما الرقمتان في ذراعيها" مجمع)[2] (وهكذا رواه الترمذي والنسائي في كتاب التفسير من سننيهما بنحوه وقال الترمذي حسن صحيح)

اس حدیث شریف کا ایک اور طریق ہے، وہ یہ کہ ترمذی نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے، جبکہ ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ نازل ہوئی۔ راوی نے کہا ہے کہ یہ آیت اتری اور آپ ﷺ سفر میں تھے۔ پس فرمایا: کیا تم جانتے ہو، یہ کون سے دن ہوگا کہ اللہ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا: بھیج بعثِ نار کو، آدم علیہ السلام کہیں گے: اے رب! بعثِ نار کیا ہے؟ فرمائے گا کہ نو سو ننانوے آگ کی طرف اور ایک جنت کی طرف، پس مسلمان رونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « قَارِبُوْا وَسَدِّدُوْا » یعنی تم اپنے اعمال سے سداد اور استقامت طلب کرو، یعنی میانہ روی اختیار کرو، افراط وتفریط کے درمیان کی راہ لو اور اگر اس سے عاجز ہو جاؤ تو اس سے قریب ہو‌و، اس کے سوا اور معنی بھی ہیں۔ فرمایا: اس لیے کہ کبھی کوئی نبوت نہیں ہوئی، مگر اس کے آگے جاہلیت ہوئی ہے، پس وہ شمار جاہلیت سے لیا جائے گا۔ پھر اگر پورا ہوگیا فبہا، ورنہ منافقوں سے پورا کیا جائے گا اور تمھاری اور دوسری اُمتوں کی مثال ایسے ہے، جیسے ذراعِ دابہ میں رقمہ (چوپائے کے بازو میں کتبہ) یا اونٹ کے پہلو میں ایک خال (تل)۔

پھر فرمایا: بے شک البتہ میں اُمید کرتا ہوں کہ تم جنت والوں کا چوتھا حصہ ہو، پس صحابہ نے اس کو بڑا سمجھا۔ حدیث شریف کا لفظ « فَكَبَّرُوْا » ہے، یعنی "فعظموا ذلك أو قالوا الله أكبر سروراً بهذه البشارة" پھر فرمایا: بے شک میں البتہ اُمید کرتا ہوں کہ تم اہلِ جنت کے تہائی ہو۔ پس صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو بڑا سمجھا۔ پھر فرمایا: بے شک میں البتہ اُمید کرتا ہوں کہ تم اہلِ جنت کے نصف ہو، پس صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو بڑا سمجھا۔ پھر راوی نے کہا: میں نہیں جانتا ہوں کہ آپ نے ثلثین (دو تہائی) فرمایا کہ نہیں۔[3] (رواه الإمام أحمد عن سفيان بن عيينة به ثم قال الترمذي أيضا: هذا حديث صحيح وقد رواه ابن أبي حاتم بسنده عن عمران فذكره، وهكذا روى ابن جرير عن بندار عن غندر عن عوف عن الحسن قال بلغني أن رسول اللهﷺ لما قفل من غزوة العسيرة و معه أصحابه بعد ما شارف المدينة قرأ ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴾ و ذكر الحديث و ذكر نحو سياق ابن جدعان والله أعلم)

---

(1) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٠) مسند أحمد (٤/ ٤٣٥)

(2) مجمع بحار الأنوار (٢/ ٣٦٥)

(3) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦٨) مسند أحمد (٤/ ٤٣٢) ان دونوں روایتوں کی اصل صحیح بخاری (٦١٦٥) اور صحیح مسلم (٢٢٢) میں ہے۔

❁ **حدیثِ دوم:** امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ﴾ نازل ہوئی۔[2] (وذكر يعني نحو سياق الحسن عن عمران غير أنه قال ومن هلك من كثرة الجن والإنس و رواه ابن جرير بطوله من حديث معمر)

❁ **حدیثِ سوم:** ابن ابی حاتم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھا۔[3] (فذكر نحوه وقال فيه: إني لأرجو أن تكونوا ربع أهل الجنة، ثم قال: إني لأرجو أن تكونوا ثُلُثَ أهل الجنة، ثم قال: إني لأرجو أن تكونوا شطر أهل الجنة، ففرحوا، وزاد أيضا وإنما أنتم جزء من ألف جزء)

❁ **حدیثِ چہارم:** امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم! تو وہ کہیں گے: « لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ » یعنی میں حاضر ہوں۔ پھر آواز سے ندا کرے گا کہ اللہ تجھ کو حکم کرتا ہے کہ تو اپنی اولاد سے بَعث نکالے دوزخ کی طرف۔ آدم علیہ السلام کہیں گے: یا رب! بعثِ نار کیا ہے؟ فرمائے گا کہ ہر ہزار میں سے « أُراه قال » (میرے خیال میں آپ ﷺ نے فرمایا) نو سو ننانوے۔ پس اس وقت پیٹ والی اپنے حمل کو ڈال دے گی اور بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور تو دیکھے گا لوگوں کو مست، حالانکہ وہ مست نہیں ہیں، لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔ پس یہ بات لوگوں پر شاق گزری، یہاں تک کہ اُن کے چہرے متغیر ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یاجوج ماجوج سے نو سو ننانوے اور تم سے ایک، تم لوگوں میں مثل سیاہ بال کے ہو سفید بیل کے پہلو میں، یا کالے بیل کے پہلو میں سفید بال کی طرح، میں البتہ اُمید کرتا ہوں کہ تم اہلِ جنت کے چوتھائی ہو۔ پس ہم نے اس کو بڑا جانا۔ پھر فرمایا کہ تم تہائی اہلِ جنت کے تو ہم نے اس کو بڑا جانا۔ پھر فرمایا کہ آدھے اہلِ جنت کے، پس ہم نے اس کو بڑا جانا۔[3] (وقد رواه البخاري في غير هذا الموضع ومسلم والنسائي في تفسيره من طرق عن الأعمش به)

❁ **حدیثِ پنجم:** امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ قیامت کے دن ایک منادی بھیجے گا جو کہے گا: اے آدم! بے شک اللہ تجھ کو امر فرماتا ہے کہ تو اپنی ذریت سے بعث بھیج دوزخ کی طرف، تو آدم علیہ السلام کہیں گے: اے رب! وہ کون ہیں؟ پھر اُن سے کہا جائے گا کہ ہر سو سے ننانوے۔ اس پر قوم میں سے ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کے بعد ہم میں سے وہ ناجی کون

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٢)

② تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٢- ٢٤٧٣) كشف الأستار (٣/ ٥٩- ٦٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٢٢)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٠٩)

ہے؟ فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ نہیں ہو تم لوگوں میں مگر اونٹ کے سینے میں ایک خال، یعنی تِل کی طرح۔[1]

(انفرد به السند وهذه السياق للإمام أحمد)

❁ **حدیثِ ششم:** امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تم قیامت کے دن اللہ کی طرف محشور ہو گے، ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے ختنہ۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی طرف نظر کریں گے؟ فرمایا: اے عائشہ! « إِنَّ الْأَمْرَ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهِمَّهُمْ ذٰلِكَ » یعنی حادثہ بہت سخت ہے؛ مارے شدت کے اُن کو اس کا خیال تک نہ گزرے گا۔[2] (أخرجاه في الصحيحين)

❁ **حدیثِ ہفتم:** امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا دوست قیامت کے دن اپنے دوست کو یاد کرے گا: فرمایا: اے عائشہ! تین جگہ پر تو نہیں: ترازو کے پاس یہاں تک کے بھاری ہو یا ہلکی اس وقت نہیں، اور نامۂ اعمال کے اُڑتے وقت یا دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا بائیں ہاتھ میں اس وقت نہیں، اور جس وقت آگ سے ایک عنق نکلے گی (عنق بہ معنی قطعۂ عذاب کے ہے) پھر وہ اُن پر لپیٹ دی جائے گی اور اُن پر خفا ہو گی اور وہی عنق کہے گی کہ میں مقرر کی گئی ہوں تین آدمیوں پر، مقرر کی گئی ہوں تین آدمیوں پر، مقرر کی گئی ہوں تین آدمیوں پر، مقرر کی گئی ہوں اس شخص پر جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارا اور مقرر کی گئی ہوں اس شخص پر جو روزِ حساب پر ایمان نہیں لاتا اور مقرر کی گئی ہوں ہر جبارِ عنید پر۔ جبار وہ ہے کہ جس مرتبے کا مستحق نہ وہ اس کا دعویٰ کرے اور جبارِ عنید وہ ہے کہ میانہ روی سے مائل ہو، حد سے بڑھنے والا ہو کہ باوجود حق کا علم ہو جانے کے اس کو رد کرے۔ فرمایا: پھر وہ عنق اُن پر لپٹ جائے گی اور اُن کو غمراتِ جہنم میں پھینک دے گی۔ غمراتِ جہنم وہ ہیں کہ جن جگہوں میں آگ بہت زیادہ ہو گی۔ اور جہنم کا ایک پل ہے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز اس پر کلالیب اور کشک ہیں، وہ پکڑ لیں گے اس کو جس کو اللہ چاہے گا۔ کلالیب جمع ہے کلوب کی۔ کلوب لوہے کے آنکڑے، جن کے سر ٹیڑھے ہوں گے اور خشک بفتحتین لوہے کے سخت کانٹے۔ لوگ اس پل پر مثل بجلی کے ہوں گے اور مثل پلک مارنے کے (حدیث شریف کا لفظ ہے طِرف بکسر طائے مہملہ بہ معنی فرس کریم، یعنی عمدہ رہوار گھوڑے کی طرح گزر جائیں گے اور بفتح طائے مہملہ طَرف بہ معنی آنکھ جھپکنے کے ہے)۔ اور مثل ہوا کے اور مثل تیز گھوڑوں اور اونٹوں کے اور فرشتے کہتے ہوں گے: "رب سلم سلم" یعنی الٰہی سلامت رکھ۔ "فَنَاجٍ مُسَلَّمٌ، وَمَخْدُوْشٌ مُسَلَّمٌ وَمُكَوَّرٌ فِي النَّارِ

[1] مسند أحمد (١/ ٣٨٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه إبراهيم بن مسلم الهجري وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٢٢)

[2] مسند أحمد (٦/ ٥٣) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٩)

عَلٰی وَجْهِهٖ" یعنی پل صراط پر سے گزرنے والے تین قسم کے لوگ ہوں گے: ایک تو وہ ہیں کہ صحیح وسالم اس سے پار ہوگئے، ایک وہ ہیں کہ آنکڑوں نے اُن کا گوشت نوچا کھسوٹا اور آگ کی لپیٹ سے جلے بھنے، پھر نجات پائی اور پار ہوگئے۔ ایک وہ ہیں کہ اُن کو لپیٹ کر منہ کے بل دوزخ میں ڈال دیا۔[1] نعوذ باللّٰہ من النار.

روزِ قیامت کے اہوال (ہولناکیوں) کے بارے میں احادیث اور آثار کثرت سے وارد ہوئے ہیں، ان کے ذکر کی اور جگہ ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ یعنی قیامت کا زلزلہ ایک امرِ عظیم و خطبِ جلیل و طارقِ منقطع و حادثِ ہائل و کائنِ عجیب ہے، یعنی ایک بڑا ہولناک حادثہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی حادثہ نہیں ہے۔ زلزال وہ رُعب اور گھبراہٹ ہے جو نفوس کو حاصل ہوگی، جیسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا﴾ [الأحزاب: ۱۱] "وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا مارے گئے۔"

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا﴾ یہ ضمیرِ شان کے باب سے ہے اور اسی لیے اس کی تفسیر کر کے یوں ارشاد کیا: ﴿تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ یعنی دودھ پلانے والی، جس ہول اور دہشت کو دیکھے گی تو اس کے مارے، جو شخص اس کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور سب سے بڑھ کر اس پر شفیق اور مہربان تھی، اس کے دودھ پلانے کی حالت میں اس سے غافل ہوجائے گی۔ خوف اور ہول کے مارے اس کا بھی اسے کچھ خیال نہ رہے گا۔ چونکہ دودھ پلانے کے حال میں اس کو بھول جائے گی، اس لیے ﴿كُلُّ مُرْضِعَةٍ﴾ فرمایا اور "مرضع" حرفِ تا کے بغیر نہ کہا اور فرمایا: ﴿عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ یعنی اپنے دودھ چھڑانے سے قبل کے شیرخوار بچہ سے غافل ہو جائے گی۔ ﴿وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا﴾ یعنی بہ سبب شدتِ ہول کے پورے دن ہونے سے پہلے اپنے حمل کو ڈال دے گی۔ ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى﴾ کسی نے "سکرٰی" پڑھا ہے، یعنی مارے شدت حادثے کے، جس میں وہ ہو جائیں گے، اُن کی عقلیں کھو جائیں گی اور اُن کے ذہن غائب ہو جائیں گے، پھر جو کوئی اُن کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ وہ نشے میں چور ہیں، حالانکہ نشے سے مست نہیں ہیں، لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے، یعنی اس کے سبب سے اُن کے ہوش وحواس جاتے رہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

چونکہ خاتمہ سورتِ متقدم میں اعادۂ ماقبل و مابعد اعادی کے ذکر کی طرف کلام منجر ہوا (کھچا گیا) اس لیے اللہ پاک نے اس سورت میں قیامت اور قیامت کے اہوال کے ذکر سے ابتدا کی، تاکہ تقویٰ پر اُبھارے، وہ تقویٰ جو سب سے زیادہ نفع دینے والا زادِ راہ ہے۔ پس فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ﴾ مراد ناس سے بنی آدم ہیں۔

---

[1] مسند أحمد (٦/ ١١٠) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧١۔ ٢٧٤)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ مکہ وغیرہم ہیں۔[2] فتح القدیر وفتح البیان میں کہا ہے کہ لفظِ ناس سارے مکلفین کو شامل ہے، جو کہ موجود ہیں اور جو آیندہ آئیں گے، اُن کو بھی شامل ہے۔ اس کا بیان اپنی جگہ میں ہو چکا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہم اس کی تحقیق کچھ ذکر کر چکے ہیں۔[3] شیخ زادہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ "یا أهل مكة احذروا عقاب ربكم بطاعته"یعنی اے مکے والو! یعنی تم اپنے پروردگار کی اطاعت وفرماں برداری کر کے اس کی سزا اور عذاب سے بچو، کیوں کہ جس تقویٰ کا امر فرمایا ہے، اس کا حقیقی اظہار اسی طور پر ہوتا ہے کہ سارے محرمات سے بچے اور تمام واجبات میں سے ہر واجب کو بجا لائے اور اس کو چھوڑنے سے باز رہے۔ بالجملہ مراد تقویٰ سے اس قول کی بنیاد پر بچنا ہے ہر گناہ میں ڈالنے والی شے سے، وہ شے کسی کام کا کرنا ہو یا کسی کام کا ترک کرنا ہو۔

شرعی لحاظ سے تقویٰ سے یہی معنی مراد ہیں، مگر جبکہ خطاب کو اہلِ مکہ کے ساتھ خاص کیا جائے تو اس کے مناسب یہ ہے کہ تقویٰ سے اول مرتبہ تقویٰ کا مراد لیا جائے، وہ یہی ہے کہ شرک سے بیزار ہو کر دائمی عذاب سے بچا جائے۔ چنانچہ اللہ پاک کے اس قول میں تقویٰ سے یہی مراد ہے: ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا﴾ [الفتح: ٢٦] ”اور ان کو تقویٰ کی بات پر ثابت قدم رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اہل تھے۔“ کیوں کہ اللہ پاک نے لوگوں کو تقویٰ کا امر فرمایا۔ پھر اُن پر تقویٰ واجب ہونے کی وجہ ذکرِ قیامت سے کی کہ ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ اور بڑی ہولناک صفت سے قیامت کا وصف کیا اور معنی یہ ہوئے کہ یہ عظیم تکلیف تقویٰ ہی کے سبب سے نفس سے دور ہو سکتی ہے اور نفس سے ضرر کو دور کرنا ضروری ہے، پس اس سے تقویٰ کا وجوب ثابت ہوا۔

﴿زَلْزَلَةَ﴾ شدتِ حرکت کو کہتے ہیں، تضعیف ہے "زله" کی۔ زلّ وزلّت پھسلنے کو کہتے ہیں۔ اصل اس کی اس محاورے سے ہے: "زل عن الموضع" یعنی فلاں شخص جگہ سے ٹل گیا، ہل گیا، پھسل گیا اور جس وقت کسی کا قدم قدم کی جگہ سے جلدی سے زائل ہو جاتا ہے تو عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "زلت قدمه" یعنی اس کا قدم پھسل گیا اور جب کوئی شخص کیچ میں یا گفتگو میں پھسلتا ہے تو کہتے ہیں: "زللت یا فلان تزل زللا" اور "زل" تضعیف کرنے سے متعدّی ہو جاتا ہے، جیسے: "زلزل الأرض زلزالا" یعنی ہلایا اللہ نے زمین کو زور سے ہلانا۔ "فتزلزلت" تو وہ ہل گئی، کبھی یہ بھی لازم مستعمل ہوتا ہے بہ معنی "تزلزل" کے۔ چونکہ بہ نسبت "زل" کے، "زلزله" میں حرفوں کی زیادتی ہے، اس لیے معنی میں بھی زیادتی ہے، یعنی بڑی دھوم دھام کی ہلچل۔ قیامت کی ہلچل سے بڑھ کر اور کوئی ہلچل نہیں ہے۔ اس واسطے یہی لفظ اس کے مناسب ہے، جس میں معنی کی کثرت ہے۔ بھلا اللہ

[1] تفسیر النسفي (٣/ ٩٤) [2] تفسیر الجلالین (١/ ٤٣٢) [3] فتح القدیر (٣/ ٥٩٣) فتح البیان (٩/ ٩)

پاک جس شے کو عظیم فرمائے اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ زلزلہ کی تعبیر شے سے کی، لہٰذا اس میں آگاہ کرنا ہے، اس بات پر کہ اس کے حقیقی ادراک سے عقلیں قاصر ہیں، یعنی وہ ایک ایسی عظیم الشان شے ہے بشر کی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ممکن نہیں کہ اس کی حقیقت کو پاسکے، لیکن اللہ پاک نے جو یہ ہولناک صفت بیان فرمائی ہے اپنے دل کی آنکھوں سے اس کی طرف نظر کریں اور اپنی عقلوں سے اس کا تصور فرمائیں، تاکہ اس دن کی سختیوں مصیبتوں سے اپنی جانوں کو بچائیں۔ لباسِ تقوی زیبِ تن کر کے ان گھبراہٹوں سے بے خوف ہوں۔ چونکہ زلزلہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اس لیے کواشی رحمہ اللہ نے ﴿ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ ﴾ کی تفسیر یوں کی ہے کہ "حركتها الشديدة بانزعاج" اور امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "الحركة الشديدة للأرض"[1] اور امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: "شدة الحركة على الحال الهائلة"[2] اب اس مصدر میں دو وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ مصدر مضاف ہے اپنے فاعل کی طرف۔ پھر یہ اضافت دو تقدیر پر ہے: ایک یہ ہے کہ "زلزلہ" "زلزل" لازم بہ معنی "تزلزل" سے ہو۔ تقدیر یہ ہوگی: "إن تزلزل الساعة". دوسری تقدیر یہ ہے: "زلزلہ" "زلزل" متعدی سے ہو اور مفعول محذوف ٹھہرے۔ تقدیر یہ ہوگی: "إن زلزال الساعة الناس" امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اسی طرح تقدیر کی ہے۔[3]

اس سے بہتر یہ ہے کہ تقدیر یوں کی جائے: "إن زلزال الساعة الأرض" اس کے بہتر ہونے پر دلیل یہ آیت ہے: ﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴾ [الزلزال: ١] "جب زمین پورے زور سے ہلائی جائے گی۔" دونوں تقدیروں پر نسبت "تزلزل" کی یا "زلزال" کی ساعت کی طرف بہ طورِ مجاز ہوگی۔

علامہ نسفی و بیضاوی رحمہما اللہ نے زلزلہ کو متعدی کہا ہے۔ اول نے کہا ہے کہ زلزلہ شدتِ تحریک اور ازعاج ہے۔ دوسرے نے کہا: "تحريكها للأشياء". دوسری وجہ یہ ہے کہ مصدر مضاف ہے طرف مفعول بہ کے بطور اتساع کے ظرف میں۔[4] امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کو واضح کر کے کہا ہے کہ ساعت اس بات سے خالی نہیں ہے کہ زلزلہ کے واسطے بر تقدیر فاعلیت کے ہو۔ گویا وہی ساعت اشیا کو ہلائے گی۔ بنا بر مجازِ حکمی اس صورت میں زلزلہ مصدر مضاف ہوگا اپنے فاعل کی طرف۔ یا بر تقدیر مفعول فیہ کے بطور اتساع کے ظرف میں اور قائم کرنے ظرف کے مقامِ مفعول بہ میں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾[5] [السبا: ٣٣] "بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا)۔" (ذكره السمين)

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے تین وجہیں ذکر کی ہیں: ایک یہ ہے کہ مصدر مضاف ہے طرف فاعل مجازی کے، جس طرح کہ فعل کو زمانِ فعل کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ دوسری یہ ہے کہ اضافت مصدر کی ظرف کی طرف ہے بتقدیرِ

[1] تفسير الجلالين ١٠/ ٤٣٢) [2] تفسير الخازن (٥/ ٢) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣١)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٩٤) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣) [5] الكشاف (٣/ ١٤٢)

"في"۔ تیسری یہ ہے کہ بدوں تقدیر "في" کے،[1] فرق دو وجہ اخیر میں یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ایک اگرچہ مضاف کا حقیقتاً ظرف ہے، مگر اتنی بات ہے کہ اس میں وسعت کی گئی اس کو قائم مقام مفعول بہ کے ٹھہرایا اور مصدر کو اس کی طرف مضاف کر دیا، جس طرح کہ مصدر کو مفعول بہ کی طرف بدوں کلمہ "في" کے مضاف کرتے ہیں، جیسا کہ ﴿ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ [السبا: ٣٣] میں کیا ہے بہ خلاف دوسری وجہ کے کہ ظرف میں وسعت نہ کی گئی اور اضافت مصدر کی ظرف کی طرف بتقدیر "في" ہوئی، جیسے کہ "ضرب الیوم" میں ہے اور اضافت مصدر کی معنوی ہوتی ہے، برابر ہے کہ اپنے ظرف کی طرف مضاف ہو یا فاعل کی طرف، کیوں کہ وہ صفت نہیں ہے اور اضافت لفظی اسی وقت ہوتی ہے کہ مضاف صفت ہو اپنے معمول کی طرف، یعنی اپنے مرفوع کی طرف یا اپنے منصوب کی طرف۔ یہ حاصل ہے شیخ زادہ کی تقریر کا۔ غرض کہ ساعتِ زلزلی کا فاعل مجازی ہو یا اس کا ظرف ہو، بہر طور یہ زلزلہ روزِ قیامت میں ہوگا۔ شیخ زادہ نے کہا: ظاہر یہی ہے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے اسی قول کو اول ذکر کیا ہے۔[2]

دوسرا قول یہ ہے کہ زلزلہ دنیا میں ہوگا، آخر زمانہ میں اور اس کے بعد سورج مغرب سے نکلے گا۔ اس کی اضافت ساعت کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ اس کی اشراط اور علامات سے ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو بہ لفظِ قیل ذکر کیا ہے۔ اسی طرح امام خازن رحمہ اللہ نے بھی بہ لفظ قیل کہا ہے۔[4] امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں اور نواب سید محمد صدیق حسن صاحب رحمہ اللہ مرحوم نے فتح البیان میں اس قول کو قولِ جمہور کہا ہے۔[5] کسی نے کہا: یہ زلزلہ نصف شہر رمضان میں ہوگا، اس کے بعد سورج مغرب سے نکلے گا۔ یہ قول امام قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔[6] تیسرا قول یہ ہے کہ یہ زلزلہ نفخۂ اولیٰ کے ساتھ ہوگا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ قیامِ قیامت کے ساتھ ہوگا، جبکہ لوگ نفخۂ ثانیہ میں اپنی قبروں سے حرکت کریں گے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ زلزلہ اس آیت میں روزِ قیامت کی ہولناکیوں سے مراد ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا ﴾ [البقرة: ٢١٤] "ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے۔" اور جس طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: «اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ»[7] امام قرطبی نے اخیر کے دو قول کو بہ لفظِ قیل ذکر کیا اور اخیر کے قول کو بہ لفظِ "یحتمل" کہا ہے۔[8]

فتح القدیر وغیرہ میں بھی ان قولوں کو ذکر کیا ہے، بالجملہ زلزلہ اول قولوں کی بنا پر حقیقی ٹھہرے گا اور احتمال آخر کی

---

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١١٣) [2] تفسیر البیضاوي (٤/ ١١٣) تفسیر النسفي (٣/ ٩٤) [3] تفسیر الجلالین (١/ ٤٣٢)
[4] تفسیر البیضاوي (٤/ ١١٣) تفسیر الخازن (٥/ ٢) [5] بحر المحیط (٦/ ٣٢٤) فتح القدیر (٣/ ٥٩٣) فتح البیان (٩/ ٩)
[6] تفسیر القرطبي (١٢/ ٣) [7] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٧٧٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٤٢)
[8] تفسیر القرطبي (١٢/ ٤)

بنیاد پر مجاز۔ رہی یہ بات کہ معتزلہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ معدوم پر شے کا اطلاق ہوتا ہے، کیوں کہ وہ زلزلہ ابھی واقع نہیں ہوا ہے اور اللہ پاک نے اس پر شے کا اطلاق کیا، لہٰذا اس میں اُن کے واسطے کوئی حجت نہیں ہے، کیوں کہ اسمِ شَے اس کے واسطے اس کی حالت وجود میں ہے، چوں کہ اس کا واقع ہونا اور اس کا وجود میں آنا ایک یقین شے تھا اس لیے اس پر شے کا اطلاق کیا گیا۔

﴿ يَوْمَ تَرَوْنَهَا ﴾ میں پانچ وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ تَذْهَلُ ﴾ سے منصوب ہے، یعنی اس کا ظرف ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور کوئی وجہ ذکر نہیں کی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔[1] دوسری یہ ہے کہ عظیم سے منصوب ہے۔ تیسری یہ ہے کہ باضمار "اذکر" منصوب ہے۔ چوتھی یہ ہے کہ ساعت سے بدل ہے، مفتوح اس لیے ہوا کہ بہ سبب فعل کی طرف اضافت ہونے کے مبنی ہے، یہ وجہ صرف کوفیوں کے قول پر بنے گی۔ پانچویں یہ ہے کہ زلزلہ سے بدلِ اشتمال ہے، کیوں کہ حدث و زمان میں سے ہر ایک پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ دوسری پر مشتمل ہے۔ یہ وجہ جائز نہیں ہے کہ زلزلہ سے منصوب ہو، کیوں کہ اس صورت میں مصدر اور اس کے درمیان معمول کی خبر کے ساتھ فصل لازم آئے گی۔ ﴿ تَرَوْنَهَا ﴾ کی ضمیر میں دو قول ہیں؛ دونوں میں ظاہر تر یہ ہے کہ زلزلہ کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ خبر اسی سے دی جاتی ہے۔ ﴿ تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ ﴾ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان کا مختار بھی یہی قول ہے۔[2]

دوسرا قول یہ ہے کہ ساعت کی طرف راجع ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اول کو اوّل اور ثانی کو ثانی اور امام خازن رحمہ اللہ نے ثانی کو اوّل اور اوّل کو بلفظِ قیل ذکر کیا ہے۔[3] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قول اوّل کی بنا پر ذہول اور وضع حمل حقیقت ہوگا، کیوں کہ وہ دنیا میں ہے اور دوسرے قول کی بنیاد پر بہ طورِ تعظیم و تہویل کے ہوگا، یعنی وہ قیامت اس حیثیت کے ساتھ ہوگی کہ جس دن تم اسے دیکھو گے تو ﴿ مُرْضِعَةٍ ﴾ (دودھ پلانے والی) اپنے بچے سے غافل ہوجائے گی اور حاملہ اپنے حمل کو ڈال دے گی، کیوں کہ ساعت سے مراد قیامت ہے اور یہ ایسا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴾ [المزمل: ١٧] "جو دن بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟"

جملہ ﴿ تَذْهَلُ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ضمیر ﴿ تَرَوْنَهَا ﴾ سے اس واسطے کہ رؤیتِ بصری ہے۔ یہ وجہ سوائے وجہ اوّل کے اور وجوہ میں درست ہوگی۔ رہی وجہ اوّل، یعنی ﴿ تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ ﴾ کا ناصب ہو۔ لہٰذا اس صورت میں اس جملے کا اعراب سے کوئی محل نہیں ہے، کیوں کہ مستانفہ ہے یا محل اس کا نصب ہوگا، بنا بر حال کے زلزلہ سے یا عظیم کی ضمیر سے، اگرچہ عظیم مذکر ہے، لیکن معنی میں وہی زلزلہ ہے یا ساعت سے حال ہوگا، گو ساعت

---

[1] الكشاف (٣/ ١٤٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣) فتح القدير (٣/ ٥٩٣) فتح البيان (٩/ ١١)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٩٤) تفسير الخازن (٥/ ٢)

مضاف الیہ ہے، مگر وہ یا فاعل ہے یا مفعول، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور جبکہ اس جملے کو حال ٹھہرائیں گے تو اس میں ضمیر محذوف ہوگی۔ تقدیر یہ ٹھہرے گی: "تَذْهَلُ فِيهَا" ذہول غفلت کو کہتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ پس معنی ﴿ تَذْهَلُ ﴾ کے "تغفل" ہوئے۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "الذهاب عن الأمر بدهشة"[2] یعنی دہشت کے مارے کسی کام سے رہ جانا۔ امام قطرب نے کہا: ﴿ تَذْهَلُ ﴾ کے معنی "تشتغل" ہیں، اس کی سند میں کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا ؎

ضربٌ يُزيل الهام عن مقيله ويُذهِلُ الخليل عن خليله

یعنی ایسی ضرب کہ کھوپڑی کو اس کی جگہ سے دور کر دے اور دوست کو اپنے دوست سے مشغول کر دے۔ کسی نے کہا: بہ معنی "تنسی" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "تلهو" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "تسلو". یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔[3] اس میں تین قراءتیں ہیں: ایک تو ﴿ تَذْهَلُ ﴾ بصیغۂ معروف۔ دوسری بصیغۂ مجہول۔ تیسری ﴿ تَذْهَلُ ﴾ بصیغۂ معروف بابِ افعال سے، یعنی زلزلہ اس کو غافل کر دے گا۔ ﴿ مُرْضِعَةٍ ﴾ سے مراد دودھ پلانے والی ہے، جو بالفعل دودھ پلا رہی ہے، بایں طور کہ اپنا پستان بچہ کے منہ میں دیے ہوئے ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ﴿ مُرْضِعَةٍ ﴾ بہ حرفِ تا اسی عورت کے واسطے ہے جو کہ بالفعل دودھ پلا رہی ہے اور "موضع" تا کے بغیر اس عورت کے لیے ہے کہ جس کی شان سے دودھ پلانا ہے، گو بالفعل نہ پلاتی ہو، چونکہ اس جگہ دودھ پلانے کی حالت کا بیان کرنا منظور تھا۔ اس لیے اللہ پاک نے وہ کلمہ ذکر فرمایا، جو حالتِ رضاعت پر دال ہے۔

﴿ عَمَّآ اَرْضَعَتْ ﴾ کے مابین دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مائے مصدریہ ہے، یعنی "عن إرضاعها" اس صورت میں ضمیر عائد کی حاجت نہیں ہے۔ دوسری یہ ہے کہ مائے موصولہ بہ معنی "الذي" ہے۔ (اگر کوئی یہ کہے کہ مائے مصدری کی صورت میں "عن إرضاعها" معنی ہوں گے اور موصولہ کی صورت میں "عمن أرضعته" ہوں گے یا "عن الذي أرضعته" اسی طرح کیوں نہ کہہ دیا تو کہیں گے کہ "عما أرضعته" باوجود اختصار کے، جو کہ بلاغت کا ایک رکن ہے، ایسا جامع ہے کہ یہ دونوں معنی اس میں آ گئے ہیں، یعنی وہ دودھ پلانے سے اور خود رضیع سے غافل ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ رضاعت کی حالت کا اظہار منظور تھا، جو ﴿ عَمَّآ اَرْضَعَتْ ﴾ سے سمجھا گیا۔ لہٰذا ﴿ عَمَّآ اَرْضَعَتْ ﴾ نے اس کو خوب واضح کر دیا اور اس کی تاکید بھی کر دی۔ اسی طرح یہ ہے کہ ﴿ ذَاتِ حَمْلٍ ﴾ فرمایا۔ "حبلیٰ" اور "حامل" نہ کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی نسبت ﴿ ذَاتِ حَمْلٍ ﴾ میں تصریح زیادہ ہے۔ واللہ أعلم بکنه کلامه وحسن بیانه وجزالة انسجامه) امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "مَن"، اس صورت میں عائد کا محذوف ماننا ضرور ہے،[4] یعنی "أَرْضَعَتْهُ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٤) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٤) [4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣١)

حَمْلَهَا" "وضع" بچہ جننے کو کہتے ہیں۔ ﴿ذَاتِ حَمْلٍ﴾ سے مراد حاملہ ہے۔ ﴿حَمْلٍ﴾ بالفتح جنین کو کہتے ہیں، یعنی جو بچہ کہ پیٹ میں ہو اور درخت پر جو پھل ہوتا ہے اس کو بھی حمل کہتے ہیں اور پیٹھ پر کے بوجھ کو "حِمل" بالکسر کہتے ہیں۔ اللہ پاک اس زلزلے کی ہولنا کی اور دہشت کی تصویر بیان فرماتا ہے، کیوں کہ وہ ایک ایسی ہولناک شے ہے کہ بشر کی عقل اس کی حقیقت کی نہیں پاسکتی، اس لیے اس کی ایک ایسی صورت بیان کی، جس کو لوگ سمجھ سکتے ہیں، یعنی قیامت کا بھونچال ایک بڑی ہولناک شے ہے، جس دن تم اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو اس کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس کے ہول کے مارے دودھ پلانے والی عورت پلانے کی حالت میں اپنے پستان کو شیر خوار بچے کے منہ سے کھینچ لے گی اور اس سے غافل ہو جائے گی اور حاملہ عورت اُدھورا بچہ ڈال دے گی۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ یہ زلزلہ قیامت سے پہلے دنیا میں ہوگا، انھوں نے اپنے قول پر انھیں دو باتوں سے استدلال کیا ہے، کیوں کہ قیامت کے دن نہ کوئی مرضعہ ہوگی نہ کوئی حاملہ اور جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ یہ زلزلہ قیامت کے دن ہوگا تو انھوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ پاک نے جو یہ فرمایا ہے کہ یہ تمثیل کے طور پر ہے، یعنی اگر ویسا زلزلہ دنیا میں ہو تو مرضعہ اپنے بچے سے غافل ہو جائے اور پیٹ والی پیٹ ڈال دے، اس کی ہولنا کی اور دہشت کے سبب سے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ جو حاملہ مرگئی ہے، وہ حاملہ مبعوث ہوگی تو دہشت کے مارے اپنے پیٹ کو ڈال دے گی اور جو مرضعہ مرگئی ہے، وہ ویسے ہی مبعوث ہوگی،[1] یعنی اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہوئی مبعوث ہوگی تو اس وقت زلزلہ کی حالت میں خوف کے مارے اپنے بچے سے غافل ہوجائے گی۔ واللّٰہ أعلم.

ہولنا کی اور دہشت کی پہلی تصویر جو بیان فرمائی، وہ خاص تھی، پھر عام تصویر بیان کی، جو کہ سارے لوگوں کی عام ہوگی وہ یہ ہے: ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ جمہور نے بفتح تا و را بصیغۂ مفرد مذکر مخاطب پڑھا ہے، ہر ایک کو خطاب ہے، یعنی ہر دیکھنے والا لوگوں کو دیکھے گا کہ گویا وہ مست ہیں شراب سے، حالانکہ حقیقت میں وہ شراب سے مست و مدہوش نہیں ہیں۔ جب مدہوشی کی اُن سے نفی کی تو جس سبب سے وہ مست ہونے والوں کے مشابہ ہوگئے، اس کو کھول کر بیان فرمایا، وہ یہ ہے، لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے، لہٰذا بہ سبب اس شدت وعظیم دہشت کے اُن کی عقلیں کھوگئیں اور اُن کی فہمیں مضطرب ہوگئیں، وہ نشے والوں کی طرح ہوگئے۔ وجۂ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح نشے والوں سے اچھے بھلے کی تمیز اور سمجھ چھن جاتی ہے، اسی طرح اُن سے بھی یہ چیزیں مسلوب ہوگئی ہیں۔

جمہور کی قراءت جو بفتح تا ہے، اس کی بنا پر ﴿تَرَى﴾ بہ معنی "تعلم" ہے اور ﴿النَّاسَ﴾ مفعول اول

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٤)

اور ﴿ سُكٰرٰى ﴾ مفعول ثانی ہے۔ دوسری قراءت بضم تا وکسر راء ہے، بصیغۂ معروف مؤنث اور ضمیر زلزلہ کی طرف راجع ہے، یا ساعت کی طرف، اس صورت میں تقدیر مفعول اول کی ضرور ہے، تاکہ معنی اس سے پورے ہو جائیں۔ تقدیر یہ ہے: "تري الزلزلة أو الساعة أهل الموقف الناس سكرى" یہ تیسرا مفعول ہے۔ تیسرے یہ ہے کہ بضمِ تا و فتحِ راء بصیغۂ واحد مخاطب مضارع مجہول متعدی طرف تین مفعول کے اور برفع الناس: پہلا ضمیر مخاطب قائم مقام فاعل۔ دوسرا ﴿ اَلنَّاسَ ﴾۔ تیسرا ﴿ سُكٰرٰى ﴾۔ اصل یہ ہے: "تري الزلزلة أو الساعة إياك الناس سكارىٰ" یہ قراءت دوسری قراءت کی مؤید ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ "رأيت" کا مضارع ہو، جو کہ دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور معنی یہ ہوں: "وتري أيها الرسول قوماً سكارىٰ" مفعول اول کی طرف فعل کا اسناد کیا اور دوسرے کو اپنے حال پر منصوب چھوڑ دیا۔ "ترىٰ" کی تانیث اس لیے ہے کہ ناس بتاویلِ جماعت ہے۔ یہ قراءتیں تو تفسیر بیضاوی میں مذکور ہیں۔[1]

فتح القدیر میں ایک قراءت یہ ذکر کی ہے کہ "تُرٰى" بضمِ تاء و فتحِ راء مسند طرف مخاطب کے ماخوذ "أريتك" سے، یعنی تو اُن کو گمان کرے "سُكارىٰ"۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قراءت کے لیے وجہ جیّد ہے عربیت میں۔[2] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس کے معنی یہ کہے ہیں: "أي وترى أنت أيها المخاطب أو يا محمد!" امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ایک قراءت یہ ذکر کی ہے کہ "يرى الناس" بیائے تحتیہ "أي يبصرون"، پھر کہا ہے کہ کل وجوہ پر ﴿ سُكٰرٰى ﴾ حال ہے۔[3]

کل چار قراءتیں ذکر کی ہیں، ایک تو جمہور کے "على الخطاب و تسمية الفاعل"، دوسرے بضمِ تا، تیسرے بضمِ تا، مگر برفعِ ناس، چوتھے بیائے تحتیہ۔ امام حمزہ وکسائی رحمہما اللہ نے "سكارىٰ" بدون الف پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت باثباتِ الف ہے۔ "سكرٰى و سكارٰى" دونوں دو لغت ہیں۔ "سكران" کی دونوں جمع آتی ہیں، جیسے: "كسلىٰ و كسالىٰ"۔[4] قاعدہ یہ ہے کہ جس کلمے میں علت و بیماری وضرر کے معنی ہوتے ہیں، اس کی جمع بروزن فعلیٰ آتی ہے۔ یہاں سکر کو قائم مقام علل کے ٹھہرا کر "سكران" کی جمع "سكرٰى" بنائی گئی۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ "سكرى"، مثل "حبلى"، بھی پڑھا گیا ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ "سكارى" سے محذوف ہے۔ کسی نے کہا: مثل "حبلىٰ" کے واحد ہے، گویا یوں کہا کہ "ترى الأمة سكرٰى"۔[5]

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اول تو ﴿ تَرَوْنَهَا ﴾ بصیغۂ جمع فرمایا۔ پھر یہاں ﴿ تَرَى ﴾ بصیغۂ مفرد کہا۔ لہٰذا

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣) [2] فتح القدير (٣/ ٥٩٤) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣١۔ ٩٣٢)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ٥) [5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٢)

اول جمع اس لیے فرمایا کہ وہاں رؤیت متعلق ہے زلزلہ سے اور سارے لوگ اس کو دیکھیں گے، پس جمع کا صیغہ مناسب ہے اور دوبارہ مفرد اس لیے ذکر کیا کہ یہاں رؤیت متعلق ہے لوگوں کے "سکاریٰ" ہونے سے، پس ضروری ہوا کہ ہر شخص دوسرے لوگوں کو دیکھنے والا ٹھہرایا جائے، قطع نظر اس کے کہ وہ "سکاری" میں سے ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ﴿ وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ استدراک ہے محذوف پر۔ تقدیر اس کی یہ ہے کہ احوال،[1] یعنی مرضعہ کا اپنے بچے سے غافل ہو جانا، حاملہ کا بچہ ڈال دینا، لوگوں کا مثل "سکاری" کے دیکھنا سہل و آسان ہے، لیکن اللہ کا عذاب سخت تر ہے، یعنی وہ سہل و آسان نہیں ہے، پس مابعد ﴿ لٰكِنَّ ﴾ کا ماقبل کے مخالف ہے۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے مدارک میں ذکر کیا ہے کہ مروی ہے کہ یہ دو آیتیں غزوۂ بنی مصطلق میں رات کو نازل ہوئیں، پس رسول اللہ ﷺ نے اُن کو پڑھا تو اس رات سے زیادہ تر رونے والی نہ دیکھی گئی۔[2] عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کی حدیث جو تفسیر ابن کثیر سے لکھی گئی ہے۔[3] اس میں یہ بات نہیں ہے، لیکن امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ یہ دو آیتیں غزوہ بنی مصطلق میں رات کو نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو پکارا، انھوں نے سواریاں تیز کیں، یہاں تک کہ آپ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ آپ نے ان پر ان آیات کو پڑھا تو اس رات سے زیادہ تر رونے والی نہ دیکھی گئی۔ پھر جب صبح کی تو زینوں کو سواریوں سے نہ اُتارا، نہ خیمے نصب کیے، نہ کھانا پکایا اور لوگوں میں کوئی روتا تھا، کوئی غمگین اور متفکر بیٹھا تھا، پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ کون سا دن ہوگا؟ صحابہ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: اس دن ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا: کھڑا ہو، پس بھیج اپنی اولاد میں سے آگ کا بعث اور سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے مثل ذکر کیا اور اس میں اتنا اور زیادہ کہا، پھر فرمایا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار لوگ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ستر ہزار۔ فرمایا: ہاں اور ہمراہ ہر ایک کے ستر ہزار اور۔[4] انتہیٰ۔ پھر جب اللہ پاک نے ارادہ کیا کہ منکرینِ بعث پر حجت قائم کرے تو اس سے پہلے ایک ایسا مقدمہ ذکر کیا جو سارے اہلِ جدال کو شامل ہو۔ پس ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝۳ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۴

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں علم کے بغیر بحث کرتے ہیں، اور وہ ہر سرکش

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٢٦)
[2] البحر المحيط (٦/ ٣٢٤) تفسير النسفي (٣/ ٩٥)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] تفسير الخازن (٥/ ٣)

شیطان کی اتباع کرتے ہیں③ اس کی بابت لکھ دیا گیا کہ بے شک جو کوئی اس سے دوستی کرے گا تو وہ یقیناً اسے گمراہ کرے گا اور اس کی دوزخ کے عذاب کی طرف راہنمائی کرے گا④

شیطان کے پیروکار گمراہ لوگوں کی مذمت:

جو شخص کہ بعث کو جھٹلاتا ہے اور مردوں کے زندہ کرنے پر اللہ پاک کی قدرت کا انکار کرتا ہے اور اللہ پاک نے جو کچھ اپنے نبیوں پر نازل کیا ہے اس سے منہ موڑتا ہے۔ اپنے قول و انکار و کفر میں انسانوں اور جنوں میں سے ہر شیطان بے حکم سرکش کی پیروی کرتا ہے اللہ پاک ایسے شخص کی مذمت فرماتا ہے اور یہ حال اہلِ بدعت وضلال کا ہے، جو کہ حق سے منہ موڑتے ہیں اور باطل کا اتباع کرتے ہیں، جو کھلا ہوا حق اللہ پاک نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے، اس کو چھوڑتے ہیں اور گمراہی کے سرداروں کے اقوال کی پیروی کرتے ہیں۔ کون سے سردار جو کہ اہوا اور آرا سے بدعتوں کی طرف بلاتے ہیں اور اسی لیے اُن کی شان میں اور ان کی امثال و اشباہ کی شان میں اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ یعنی لوگوں میں سے وہ شخص ہے، جو اللہ کے بارے میں بغیر صحیح علم کے جھگڑتا ہے۔ ﴿ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴾ یعنی اور پیروی کرتا ہے ہر شیطان مرید کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی شیطان کی۔[1]

﴿ كُتِبَ عَلَيْهِ ﴾ یعنی "كتابة قدرية" یعنی جس پر لکھا گیا ہے۔ تقدیر کا لکھا کہ ﴿ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ ﴾ جو کوئی اس کی پیروی کرے اور اس کا مقلد بنے۔ ﴿ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴾ یعنی وہ اس کو گمراہ کرے دنیا میں اور اس کو عذابِ سعیر کی طرف کھینچ لے جائے، یعنی وہ عذاب جو گرم، درد دینے والا، بے چین کرنے والا، جگہ سے بے جگہ کرنے والا۔ (یہ مزعج کا رجمہ ہے۔ ازعاج کے معنی از جا برکندن ہیں۔) امام سدی رحمہ اللہ نے ابو مالک سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو کعب مکی سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک خبیث نے جو کہ قریش کے خبیثوں میں سے تھا کہا کہ تو ہم کو اپنے رب سے خبر دے کہ وہ سونے کا ہے یا چاندی کا یا تانبے کا؟ پس آسمان ایک کڑک کڑکا تو اچانک اس کی کھوپڑی اس کے روبرو گری ہوئی تھی۔ (اصل لفظ یہ ہے: "فتقعقعت السماء قعقعة والقعقعة في كلام العرب الرعد" یعنی قعقعہ عرب کی زبان میں بادل کی گرج کو بولتے ہیں۔) لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی آیا اور کہا: اے محمد! تو مجھے اپنے رب کے بارے میں خبر دے کہ وہ

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٤) ② تفسير الطبري (١٨/ ٥٦٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٤)

کس شے سے ہے موتی کا ہے یا یاقوت کا؟ کہا: پس ایک صاعقہ آیا، اس نے اس کو پکڑ لیا۔ صاعقہ وہ آگ ہے، جو سخت گرج میں آسمان سے گر پڑتی ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

جبکہ اللہ پاک نے مشرکینِ مکہ کو اس بات کا حکم کیا کہ اس کی اطاعت و فرماں برداری کر کے اس کے عذاب سے بچیں تو اُن کے درمیان میں سے ایک ایسے شخص کا خاص طور سے ذکر فرمایا، جو کہ مخالفت اور نافرمانی میں غل (کینہ، خیانت، دشمنی) کیا کرتا تھا اور اس کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ اللہ پاک کے دین اور وحدانیت میں اور اس بات میں جس کی خبر نبی اکرم ﷺ نے اللہ پاک کی طرف سے دی ہے، لڑائی جھگڑا کرتا تھا، صرف اپنے ظنِ فاسد اور زعم کے ساتھ اور بغیر کسی سند کے جو اس کی تائید کرے۔ امام محلی، بیضاوی، نسفی اور خازن رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ شخص نضر بن حارث تھا، جھگڑا بہت کیا کرتا تھا، کہتا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور قرآن اساطیر الاولین ہے،[2] یعنی پہلے لوگوں کی کہاوتیں اور موت کے بعد دوبارہ اُٹھنا نہیں ہے، اللہ مُردوں کے زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

فتح القدیر و فتح البیان میں ذکر کیا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول نضر بن حارث کے بارے میں ہوا ہے۔ کسی نے کہا کہ ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے حق میں اتری ہے۔[3] اسی واسطے امام محلی رحمہ اللہ نے یوں کہا: "نزلت في نضر بن الحارث و جماعته"[4] اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "وهي تعمه وأضرابه" یعنی گو نزول اس کا نضر میں ہو یا اور کسی میں مراد آیت سے عموم ہے، اس کو اور اس جیسوں کو شامل ہے، (جیسے ابو جہل و ابی بن خلف۔) جو کوئی اپنی رائے اور خواہشِ نفسانی کے ساتھ بغیر کسی دلیل کے اللہ پاک کی قدرت اور صفات کے بارے میں جھگڑے، وہ بے شک اسی آیت کے تحت میں داخل ہے۔

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللهِ ﴾ یعنی ان میں سے وہ شخص ہے جو جھگڑتا ہے اللہ پاک کے بارے میں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی قدرت و صفات میں۔[5] فتح القدیر و فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ کی شان و قدرت میں۔[6] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے دین میں۔[7] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے دین میں جھگڑتا ہے اور اس میں وہ باطل باتیں کہتا ہے، جن میں کسی طرح کی خیر و خوبی نہیں ہے۔ ﴿ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ حال ہے ﴿ يُجَادِلُ ﴾ کی ضمیر فاعل سے، جس جہل کا کہ مجادلہ مشعر ہے، اس کی یہ حال وضاحت کرتا ہے، یعنی اللہ پاک کی قدرت میں جھگڑتا ہے۔ دراں حالیکہ ملتبس ہے ساتھ غیر علم کے، یعنی بغیر کسی علم کے اور بغیر کسی حجت کے، بغیر جانے

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩١) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧٥)

[2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣۔ ١١٤) تفسير النسفي (٣/ ٩٥) تفسير الخازن (٥/ ٣)

[3] فتح القدير (٣/ ٥٩٤) فتح البيان (٩/ ١٢)

[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤)

[5] البحر المحيط (٦/ ٣٢٦)

[6] فتح القدير (٣/ ٥٩٤) فتح البيان (٩/ ١٢)

[7] تفسير النسفي (٣/ ٩٥)

بوجھے یوں بکتا ہے کہ اللہ پاک بعث پر قادر نہیں ہے۔

﴿ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴾ یعنی جس بات کو وہ کہتا ہے اور جس کا مدعی ہے اور جس کی حجت لاتا ہے اور جس کی طرف سے جھگڑتا ہے، اس سب میں وہ ہر شیطان سرکش کی پیروی کرتا ہے۔ ﴿ مَرِيْدٍ ﴾ کے معنی متمرد علی اللہ ہیں۔ شیخ زادہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ علامہ نسفی اور خازن رحمہما اللہ نے کہا: عاتی، مستمر شر میں، یعنی شیطان کی یہ صفت ہے کہ سرکشی کرتا ہے، برائی میں ہمیشہ مستمر رہتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَرِيْدٍ ﴾ کے معنی "متجرد للفساد" ہیں۔ اصل اس کی "عُرِیٰ" سے ہے۔[1]

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی شے اپنی مثل کی حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "مرد الشيء" یعنی وہ شے اپنی حد سے آگے بڑھ گئی۔ اصل میں "مَرَدَ" کا مادہ برہنگی کے واسطے ہے، جس لڑکے کے چہرے پر بال نہیں ہوتے تو اس کو غلام "أَمْرد" کہتے ہیں اور جس ٹہنی میں پتے نہیں ہوتے اسے "غصن أَمرد" بولتے ہیں۔ چونکہ شیطان ہر خیر وخوبی سے خالی ہے اور مجرد شر و برائی میں مستمر رہتا ہے۔ اس لیے اس کو مرید کہتے ہیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاید مرید ماخوذ ہے تجرد مصارعین سے وقت مصارعت کے، یعنی کشتی والے کشتی کے وقت برہنہ ہوتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرید و مارد مکان بلند چکنے کو کہتے ہیں۔[2]

غرض اس سے بھی یہی ہے کہ شیطان صرف فساد کے واسطے برہنہ ہوا ہے۔ سوائے فساد وشر کے اس کو اور کوئی کام نہیں ہے اور ﴿ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴾ سے رؤسائے قریش مراد ہیں، جو کہ اپنے ماتحت لوگوں کو کفر کی طرف بلاتے ہیں۔ یا مراد ابلیس ہے اور اس کے لشکر۔ امام ابو السعود اور خازن رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں بھی یہی دو قول ذکر کیے ہیں۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرید پر وقف نہیں ہے، اس لیے کہ ما بعد اس کا شیطان کی صفت ہے۔[4] پہلی صفت ﴿ مَرِيْدٍ ﴾ ہے، دوسری صفت ﴿ كُتِبَ عَلَيْهِ ﴾ ہے۔

﴿ كُتِبَ ﴾ کے معنی "قضي" یا "رقم" ہیں، اس بنا پر کہ کتابت و کتاب بہ معنی حکم وقدر ہوتا ہے اور بہ معنی رقم و اثبات بھی آتا ہے، یعنی شیطان پر حکم ہو چکا ہے، یا لوحِ محفوظ میں یہ بات لکھی جا چکی ہے، یعنی اللہ پاک جن و اِنس کے ہر شیطان پر حکم جاری کر چکا ہے کہ ﴿ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ ﴾ یعنی جو کوئی شیطان کی پیروی کرے گا، اس کی بات مانے گا تو وہ اس کو صراطِ مستقیم اور دینِ قویم سے بہکا دے گا۔ جنّی شیطان تو یوں بہکاتا ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے، بری بات کو اچھے پیرائے میں دکھاتا ہے اور بڑے بڑے شبہے ڈالتا ہے۔ رہا اِنسی شیطان تو وہ اس کو اہلِ ہوا اور بدع کے مذاہب میں گرا دیتا ہے، جیسے: فلاسفہ، زنادقہ جو کہ بعث وحساب کا انکار کرتے ہیں اور

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٩٢)

[3] تفسير أبي السعود (٦/ ٩٢) تفسير الخازن (٥/ ٤) فتح القدير (٣/ ٥٩٤) فتح البيان (١٢/ ٩٨) [4] تفسير السنفي (٣/ ٩٥)

وہم و خیال و ظلمتِ طبیعت کی ملمع کی ہوئی دلیلیں اس پر قائم کرتے ہیں۔ پھر اس شیطان کے پیرو اس سے وہ باطل دلیلیں اور برے شبہے قبول کر لیتے ہیں۔

پھر اسی کے عقائد کا اعتقاد کر لیتے ہیں اور اسی کی جماعت اور زُمرے میں داخل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ [المائدة: ٥١] ''اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔'' صاحبِ کشاف نے کہا ہے کہ شیطان پر لکھا جانا ایک مثل ہے، یعنی جو شخص شیطان کی پیروی کرتا ہے تو گویا اس کا گمراہ کرنا شیطان پر لکھا گیا ہے، چونکہ اس کے حال میں گمراہی کا ظہور ہے،[1] اس لیے کتابت بہ معنی رقم و املا ٹھہرائی گئی اور جبکہ کتابت و رقم کا حقیقت پر محمول کرنا مشکل ہے، اس لیے اس کو تشبیہ پر محمول کیا اور وجہ شبہ کی یہ ٹھہرائی کہ جس طرح مثلاً کاغذ پر لکھے ہوئے کا ظہور ہوتا ہے، اسی طرح گمراہ کرنے کا ظہور شیطان پر ہے۔ پس گویا گمراہ کرنا ایک ایسی شے ہے کہ شیطان پر ثابت کی گئی ہے اور اس پر لکھی گئی ہے، کیوں کہ وہ اسی پر مجبول اور مفطور ہوا ہے، یعنی اس کی جبلت اور فطرت یہی ہے۔ صاحبِ کشاف کی غرض اس سے اپنے مذہب کی رعایت ہے۔ اہلِ سنت نے ﴿كُتِبَ عَلَيْهِ﴾ کے معنی ''قَضٰى عَلَيْهِ'' لکھے ہیں۔ یہی ٹھیک ہے۔

عامہ کی قراءت پر ہے کہ ﴿كُتِبَ﴾ بصیغۂ مجہول اور دونوں ﴿أَنَّ﴾ بفتح ہیں، اس میں دو وجہیں ہیں؛ ایک وجہ یہ ہے کہ ﴿أَنَّ﴾ ان مع اپنے ماتحت کے محلِ رفع میں ہے۔ ''کتب'' کا نائب فاعل ہے، اس صورت میں ﴿عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر اور ﴿أَنَّهُ﴾ کی ضمیر دونوں راجع ہوں گی، پہلے ﴿مَنْ﴾ اور دوسرے ﴿مَنْ﴾ کی طرف دو وجہ سے، ایک وجہ یہ کہ شرطیہ ہے اور حرفِ فا اس کا جواب ہے۔ دوسری یہ کہ موصولہ ہے اور حرفِ فا خبر میں زائد آیا ہے۔ اس لیے کہ مبتدا شرط کے مشابہ ہے اور دوسرا ﴿أَنَّ﴾ مفتوح اس واسطے ہوا کہ ﴿أَنَّ﴾ مع اپنے ماتحت کے خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ تقدیر یہ ہے: ''فشانه وحاله أنه يضله'' یا ''فإنه'' مبتدا فرض کیا جائے اور خبر محذوف ٹھہرے، یعنی ''فله أنه يضله''۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے ''أن'' کو مفتوح پڑھا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اول ''انَّ'' ﴿كُتِبَ﴾ کا نائب فاعل ہے اور دوسرا ﴿أَنَّ﴾ اس پر معطوف ہے۔[2]

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ﴿فَأَنَّهُ﴾ کو ''اِنَّهُ'' پر معطوف ٹھہراؤ گے تو ''انه'' بغیر استیفائے خبر کے باقی رہ جائے گا۔ اس لیے کہ ﴿مَنْ تَوَلَّاهُ﴾ میں مبتدا ہے، پس اگر اس ﴿مَنْ﴾ کو موصولہ ٹھہراؤ گے تو اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مستقل ہو کر ''اِنَّهُ'' کی خبر ہو جائے اور اگر اس کو شرطیہ فرض کرو تو اس کا کوئی جواب نہیں ہے، جبکہ ''فإنه'' ''اِنَّهُ'' پر معطوف ٹھہرایا جائے۔

امام شہاب الدین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیسا امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اسی طرف امام ابن عطیہ رحمہ اللہ بھی

[1] الکشاف (٣/ ١٤٤۔ ١٤٥) [2] الکشاف (٣/ ١٤٥)

گئے ہیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''انہ'' موضعِ رفع میں ہے۔ اس بنا پر کہ فاعل ہے ''کتب'' کا اور دوسرا ''أَنَّہ'' پہلے ''أَنَّ'' پر معطوف ہے، اس کا مؤکد ہے، ان دونوں قولوں کا رد امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کر دیا۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے، چونکہ دوسری مردود ہے، اس لیے امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اس کو پسند نہ کیا اور کہا کہ فتح ﴿ فَاَنَّہٗ ﴾ کا عطف کی بنا پر نہیں ہے، کیوں کہ عطف بعد تمام کلام کے ہوتا ہے۔[2]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ فا عطف کے واسطے ہے اور ''أَنَّ'' تاکید کے لیے دوبارہ لایا گیا ہے۔ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے اس قول کو رد کیا ہے۔[3] دوسری قراءت یہ ہے کہ ''أَنَّ'' کو دونوں جگہ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی توجیہ دو طرح ہے: ایک یہ ہے کہ کسرہ ''اِنَّ'' کا حکایتِ مکتوب کی بنا پر ہے، یعنی شیطان پر جو بات لکھی گئی ہے، لہٰذا ﴿ اَنَّہٗ مَنْ تَوَلَّاہُ ... الخ ﴾ اس کلام کی حکایت ہے اور اس کلام میں ''إن'' مکسور ہے، اس لیے کہ ابتدائے کلام میں واقع ہوا ہے، حکایت میں ضرور ہے کہ کلام محکی کی صورت محفوظ رہے اور جس ہیئت پر وہ تھا، اس سے نہ بدلا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ''اِنَّہٗ'' کے اول میں قیل مقدر ہے یا ﴿ کُتِبَ ﴾ میں قیل کے معنی شامل کریں گے۔ اس صورت میں ''انہ'' نائب فاعل قیل کا ٹھہرے گا، محلِ رفع میں ہوگا۔ قاری میں کہا ہے کہ یہ قراءت شاذ ہے۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اول کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ نکرۂ موصوفہ ہے اور بغیر علم موضع مفعول میں ہے یا حال ہے اور ''کتب'' کو کسی نے بصیغۂ معروف بھی پڑھا ہے: ''أي کتب الله'' اس بنا پر ''أنه'' موضع نصب میں ہوگا، یعنی بنا بر مفعول اور ﴿ فَاَنَّہٗ ﴾ موضع رفع میں ہے بہ سبب ابتدا کے اور ﴿ مَنْ ﴾ شرط ہے، جواب اس کا ﴿ فَاَنَّہٗ ﴾ ہے، یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ بہ معنی ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ ہو اور ﴿ فَاَنَّہٗ ﴾ خبر، حرفِ فا اس لیے داخل ہوا کہ ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ میں معنی مجازات کے ہیں۔[4] غرض کہ اللہ پاک نے شیطان کے دو وصف ذکر فرمائے ایک تو ﴿ مَرِیْدٍ ﴾ دوسرا وہ ہے جس کا جملہ ﴿ کُتِبَ عَلَیْہِ ... الخ ﴾ مفید ہے، رہا جملہ ﴿ وَیَھْدِیْہِ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴾ تو یہ معطوف ہے، جملہ ﴿ یُضِلُّہٗ ﴾ پر، معنی یہ ہیں کہ شیطان اس کو ایسے کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے، جو اسے دوزخ میں پہنچا دے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ یَھْدِیْہِ ﴾ کے معنی ہیں ''یدعوہ''۔[5] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اس کو موجباتِ عذابِ سعیر کی طرف بلاتا ہے، دعوت کی تعبیر ہدایت کی، بطورِ ''مِنکُمْ'' کے، یعنی واہ رے تیری ہدایت؟ کیا خوب ہدایت ہے کہ سیدھا جہنم میں پہنچا دیا۔

اب رہی یہ بات کہ امام کرخی رحمہ اللہ کے قول میں اول گزر چکا ہے کہ ﴿ عَلَیْہِ ﴾ کی اور ﴿ اَنَّہٗ ﴾ کی ضمیر

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٢٦) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤) [3] تفسير النسفي (٣/ ٩٥)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٢) [5] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣)

پہلے ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف راجع ہے۔ لہٰذا اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ بعضا شخص وہ ہے کہ اللہ کی قدرت میں جھگڑتا ہے اور اس بارے میں ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے، اسی شخص پر یہ بات لکھی گئی ہے کہ جو کوئی اس شخص کی پیروی کرے تو وہ شخص اس کو گمراہ کرے اور جہنم کی طرف اس کو لے جائے، لیکن محلی، بیضاوی، نسفی اور فتح القدیر وغیرہ نے ﴿ عَلَيْهِ ﴾ اور ﴿ اَنَّهٗ ﴾ کی ضمیر شیطان کی طرف راجع کی ہے،[1] چنانچہ اس کے موافق اول معنی گزر چکے ہیں اور یہی انسب معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جب جملہ ﴿ كُتِبَ عَلَيْهِ ﴾ شیطان کی صفت ٹھہرا تو اس کی ضمیریں بھی اسی کی طرف راجع ہونی چاہییں۔ امام عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے ﴿ كُتِبَ عَلَيْهِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہا کہ "كتب على الشيطن" اور امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے: ﴿ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ ﴾ "قال اتبعه"[2] ان دونوں قولوں سے بھی یہی معلوم ہوا کہ ضمیر شیطان کی طرف پھرتی ہے۔ واللہ أعلم۔
پھر جب اللہ پاک اس مقدمے کے ذکر سے فارغ ہوا تو جس بات کی کفار پر حجت قائم کرنا مقصود اصلی تھا، اس کا ذکر کیا۔ پس ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُـحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ۙ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اُٹھنے کے متعلق شک میں ہو تو (تمھیں علم ہونا چاہیے کہ) بلاشبہہ ہم نے ہی

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤) تفسير النسفي (٣/ ٩٥) فتح القدير (٣/ ٥٩٤)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٦٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٤)

تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے جو واضح شکل وصورت اور غیر واضح شکل وصورت والا ہوتا ہے، تا کہ ہم تمھارے لیے (اپنی قدرت وحکمت) واضح کریں، اور ہم جس (نطفے) کے متعلق چاہیں اسے مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں، پھر تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی فوت کر دیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی ناکارہ ترین عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تا کہ وہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہ جانے، اور آپ زمین بنجر اور خشک پڑی دیکھتے ہیں، پھر جب ہم نے اس پر پانی نازل کیا تو وہ لہلہا اُٹھی، اور پھولی، اور اس نے ہر طرح کی خوش نما نباتات نکالیں ⑤ یہ (سب کچھ) اس لیے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور بے شک وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور بے شک وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑥ اور یہ کہ بلاشبہہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور بے شک اللہ ان کو اُٹھائے گا جو قبروں میں (پڑے) ہیں ⑦

انسان کی تخلیق سے دوبارہ جی اٹھنے کے دلائل:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جبکہ اللہ پاک نے مخالفِ بعث اور منکرِ قیامت کا ذکر کیا تو اس بات پر دلیل ذکر فرمائی کہ وہ معاد پر قدرت رکھتا ہے اور وہ دلیل ابتدائے خلق کے ساتھ ذکر کی، جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ پس فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ﴾ یعنی اے لوگو! اگر تم بعث میں شک کرتے ہو۔ بعث قیامت ہے اور روحوں اور جسموں کا قیامت کے دن قائم ہونا ہے۔ ﴿فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ یعنی اصل پیدا کرنا اللہ کا تم کو مٹی سے ہے اور اسی مٹی سے آدم علیہ السلام مخلوق ہوئے۔ ﴿ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ یعنی ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [السجدة: ۸] ''پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے چلائی۔'' مطلب یہ ہے کہ پہلے پہل آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، پھر اُن کی اولاد کو نطفے سے پیدا کیا۔

﴿ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ﴾ یہ یوں ہوتا ہے کہ نطفہ جس وقت عورت کے رحم میں ٹھہرتا ہے تو چالیس دن تک اسی طرح ٹھہرا رہتا ہے۔ "يضاف إليه ما يجتمع إليها" یعنی ملائی جاتی ہے اس کی طرف وہ شے جو اس کی طرف جمع ہوتی۔ پھر وہ نطفہ اللہ کے اذن سے علقہ حمراء، یعنی خونِ بستہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ چالیس دن اسی طرح ٹھہرا رہتا ہے، پھر وہ مستحیل ہو جاتا ہے تو ایک مضغہ ہو جاتا ہے، یعنی گوشت کا ٹکڑا، نہ اس میں کوئی شکل ہوتی ہے نہ تخطیط (خط)، پھر تخطیط وتشکیل میں شروع کیا جاتا ہے، یعنی نقشہ بنانا شروع کیا جاتا ہے، اس سے صورت بنائی جاتی ہے، ایک سر دو ہاتھ سینہ پیٹ دو رانیں دو پاؤں اور باقی اعضا۔ پھر کبھی تشکیل وتخطیط سے پہلے عورت اس کو گرا دیتی ہے اور کبھی اس کو ڈال دیتی ہے، حالانکہ وہ شکل وتخطیط والا ہو چکتا ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ

﴿مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ یعنی جس طرح کہ تم اس کا مشاہدہ کرتے ہو۔ ﴿لِّنُبَيِّنَ لَكُمۡ ؕ وَنُقِرُّ فِى الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ یعنی اور کبھی وہ رحم میں قرار پکڑے رہتا ہے نہ عورت اس کو ڈالتی ہے نہ گراتی ہے۔ جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿مُخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ ادھورا بچہ ہے مخلوق ہے اور غیر مخلوق۔[1] (أخرج ابن أبي حاتم و صححه عن ابن عباس رضي الله عنهما في قوله: ﴿مُخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ قال: المخلقة ما كان حيا و غير مخلقة ما كان سقطا وروي نحو هذا عن جماعة من التابعين كذا في فتح القدير)[2]

پھر جب اس پر چالیس دن گزر جاتے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ مضغہ ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے تو وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کو ٹھیک کر دیتا ہے، جس طرح کہ اللہ عزوجل چاہتا ہے خوبصورت و بد صورت، نر و مادہ اور اس کا رزق لکھتا ہے اور اس کی اَجل لکھتا ہے اور یہ لکھتا ہے کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے۔ کہا: ہم کو حدیث بیان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صادق و مصدوق ہیں، یعنی آپ فی نفسہ سچے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو سچا کیا ہے کہ تم میں سے ایک کی پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں جمع کی جاتی ہے چالیس دن۔ پھر اس کی مثل وہ علقہ ہوتا ہے۔ پھر اسی کی مثل مضغہ ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے، پس اس کو چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ اس کا رزق و عمل و اَجل لکھتا ہے اور یہ لکھتا ہے کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت۔ پھر اس میں روح پھونک دیتا ہے۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے، یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کیوں کہ علقمہ اُن سے راوی ہیں اور امام علقمہ رحمہ اللہ اُن کے شاگرد ہیں، کہ جس وقت نطفہ رحم میں قرار پکڑتا ہے تو ایک فرشتہ اپنی ہتھیلی میں اس کو لے کر آتا ہے، پھر کہتا ہے: یا رب! مخلقہ ہے یا غیر مخلقہ۔ پس اگر کہا گیا کہ غیر مخلقہ ہے تو وہ نَسَمہ نہیں ہوتا، نفس و روح نہیں بنتا اور رحم خون کر کے اس کو ڈال دیتا ہے اور اگر کہا گیا کہ مخلقہ ہے تو فرشتہ کہتا ہے: اے رب! نر ہے یا مادہ، شقی ہے یا سعید، کیا اجل ہے، یعنی کتنی عمر ہے اور کیا اثر ہے؟ کہاں کہاں پھرے گا اور کون سی زمین میں مرے گا؟

کہا: پھر نطفہ سے کہا جاتا ہے: کون ہے رب تیرا؟ تو وہ کہتا ہے: اللہ! پھر کہا جاتا ہے: کون ہے رازق تیرا؟ تو وہ کہتا ہے: اللہ! پھر اس فرشتے سے کہا جاتا ہے کہ تو جا طرف کتاب کے۔ پس بے شک تو اس میں اس نطفے کا قصہ پالے گا۔ کہا: پھر وہ نطفہ پیدا کیا جاتا ہے تو اپنی اجل میں جیتا ہے اور اپنا رزق کھاتا ہے اور اپنے نقشِ قدم کو روندتا ہے، یہاں تک کہ جس وقت اس کی اجل آجاتی ہے تو مر جاتا ہے۔ پھر اسی جگہ میں دفن کیا جاتا ہے۔ پھر عامر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٨/ ٥٦٨) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٥) فتح القدير (٣/ ٥٩٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

شعبی رحمہ اللہ نے جو کہ علقمہ سے راوی ہیں، یہ آیت پڑھی: ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ ﴾ پھر جب وہ نطفہ مضغہ کو پہنچتا ہے تو چوتھی پیدائش میں قلب کیا جاتا ہے: تراب، نطفہ، علقہ، مضغہ۔ پھر وہ نسمہ، یعنی نفس و روح ہوتا ہے اور اگر وہ غیر مخلقہ ہے تو رحم خون کر کے اس کو پھینک دیتے ہیں اور اگر وہ مخلقہ ہے تو وہ نسمہ قلب کیا جاتا ہے، یعنی نفس و روح بن جاتا ہے۔[1]

دوسری روایت امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی سیدنا حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ حذیفہ اس حدیث کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں۔ کہا داخل ہوتا ہے فرشتہ نطفے پر، جب وہ رحم میں چالیس یا پینتالیس دن تک قرار پکڑ چکتا ہے تو کہتا ہے: اے رب! آیا یہ شقی ہے یا سعید؟ پس اللہ کہتا ہے اور یہ دونوں باتیں لکھی جاتی ہیں۔ پھر فرشتہ کہتا ہے: نر ہے یا مادہ؟ پس اللہ کہتا ہے اور یہ دونوں باتیں لکھی جاتی ہیں اور اس کا عمل و اثر و رزق و اجل لکھا جاتا ہے۔ پھر صحیفے لپیٹ دیے جاتے ہیں، پس جو اُن میں ہے اس پر نہ زیادہ کیا جائے نہ کم ہو۔[2] (رواه مسلم من حديث سفيان بن عيينه و من طريق آخر عن أبي الطفيل بنحو معناه)

قوله تعالىٰ: ﴿ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ ﴾ پھر ہم نکالتے ہیں تم کو بچہ، یعنی بچہ اپنے بدن و سمع و بصر و حواس و بطش (بطش کسی شے کے پکڑنے کو کہتے ہیں) و عقل میں ضعیف و کمزور ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اللہ پاک اس کو قوت دیتا ہے اور اس پر لطف فرماتا ہے رات دن کے اوقات میں۔ اس کے والدین کو اس پر مہربان کر دیتا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ﴿ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ﴾ یعنی پھر قوتیں پوری ہوتی جاتی ہیں اور وہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور عنفوانِ شباب اور حسنِ منظر تک پہنچتا ہے۔ ﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى ﴾ یعنی بعض تم میں سے اپنی حالتِ شباب و قویٰ میں وفات دیا جاتا ہے۔ ﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ ﴾ یہ وقت شیخوخت و ہرم، یعنی بڑھاپے، ضعفِ قوت و عقل اور فہم کا ہے اور مارے خرف، یعنی انتہا کا بڑھاپا و ضعفِ فکر کے تناقضِ احوال کا زمانہ ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴾ [الروم: ٥٤] ''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمھیں کمزوری (کی حالت) سے پیدا کیا، پھر اس نے کمزوری کے بعد قوت دی، پھر اس نے قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا، وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے، اور وہ خوب جاننے والا، بڑا قدرت والا ہے۔''

حافظ ابویعلیٰ احمد بن علی بن مثنی موصلی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، کہا ہے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٤۔ ٢٤٧٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧٦)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٤)

کہ مولود یہاں تک کہ بلوغ کو پہنچے، جو نیکی اس نے کی، وہ اس کے والد کی طرف یا والدین کے لیے لکھی جاتی ہے اور جو کوئی برائی کی، وہ نہ اس پر لکھی جاتی ہے، نہ اس کے والدین پر۔ پھر جس وقت وہ بلوغ کو پہنچا تو اس پر قلم جاری ہوا۔ دو فرشتے جو اس کے ساتھ ہیں، اُن کو اس بات کا حکم کیا جاتا ہے کہ حفاظت رکھیں اور سختی کریں۔ پھر جب وہ اسلام میں چالیس برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کو تین بلاؤں سے امن دیتا ہے: جنون و جذام و برص، یعنی دیوانگی اور کوڑھ اور بدن کا سفید ہو جانا۔ پھر جب وہ پچاس سال کا ہوتا ہے تو اللہ اس کا حساب ہلکا کرتا ہے۔ پھر جب ساٹھ برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کو اپنی طرف انابت، یعنی رجوع ہونا بخشتا ہے اس شے کے ساتھ جس کو وہ دوست رکھتا ہے۔ پھر جب ستر برس کو پہنچتا ہے تو آسمان والے اس کو دوست رکھتے ہیں۔ پھر جب اسی برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کے حسنات کو دیکھتا ہے اور سیئات سے درگزر فرماتا ہے۔ پھر جب نوے برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیتا ہے اور اس کے گھر والوں میں اس کی شفاعت قبول کرتا ہے اور امین اللہ لکھتا ہے اور اللہ کا اسیر ہوتا ہے اس کی زمین میں۔ (اصل لفظ "وكتب امين الله" ہے، یہ ترجمہ معروف کا ہے، اگر مجہول ہو تو معنی ہوں گے کہ امین اللہ لکھا جاتا ہے۔ واللہ أعلم۔ پھر جب ارذل عمر کو پہنچتا ہے: ﴿ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس خیر کو لکھتا ہے جو وہ اپنی صحت میں کیا کرتا تھا۔ پھر جب کوئی برائی کرتا ہے تو وہ اس پر نہیں لکھی جاتی۔[1] یہ حدیث نہایت غریب ہے اور اس میں شدید نکارت ہے، اس کے باوجود امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس کو اپنی مسند میں موقوفاً و مرفوعاً روایت کیا ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ کی روایت انس رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ جس وقت مرد چالیس برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کو مختلف قسم کی بلایا سے امن دیتا ہے، جنون و برص وجذام سے۔ پھر جب پچاس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کے حساب کو نرم کرتا ہے اور جب ساٹھ کو پہنچتا ہے تو اللہ اسے عطا فرماتا ہے اِنابت اور اس کو اس پر دوست رکھتا ہے اور جب ستر کو پہنچتا ہے تو دوست رکھتا ہے اس کو اللہ اور دوست رکھتے ہیں اس کو آسمان والے اور جب اسّی کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کی نیکیوں کو قبول کرتا ہے اور اس کے گناہوں کو مٹاتا ہے اور جب نوے کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیتا ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے اللہ کا قیدی اس کی زمین میں، اور اس کی شفاعت اپنے گھر والوں کے بارے میں قبول کی جاتی ہے، پھر عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی دوسری روایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی معمر کہ عمر دیا جائے اسلام میں چالیس برس، مگر پھیر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے تین قسم کی بلا کو، یعنی جنون، برص و جذام[3] اور تمام حدیث کو اس طرح ذکر کیا، جیسے پہلے گزر چکی۔

---

[1] مسند أبي يعلیٰ (٦/ ٣٥١) اس کی سند میں ''خالد زیات'' اور ''داود بن سلیمان'' مجہول راوی ہیں۔

[2] مسند أحمد (٢/ ٨٩) اس کی سند میں ''فرج بن فضالہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٩٨٤)

[3] مسند أحمد (٣/ ٢١٧) اس کی سند میں ''یوسف بن ابی ذرہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٩٨٤)

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ کی روایت، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے، کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے کوئی بندہ کہ اسلام میں عمر دیا جائے چالیس برس، مگر پھیر دیتا ہے اللہ اس سے کئی قسم کی بلا کو، یعنی جنون و برص و جذام۔ پھر جب پچاس برس کو پہنچتا ہے تو نرم کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے حساب کو، پھر جب ساٹھ برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کو اپنی طرف انابت عطا فرماتا ہے اس شے کے ساتھ جس کو دوست رکھتا ہے۔ پھر جب ستر برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کے واسطے اگلے پچھلے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے، اللہ کا قیدی اور آسمان والے اس کو دوست رکھتے ہیں۔ پھر جب اسّی برس کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کی نیکیوں کو قبول کرتا ہے اور اس کی برائیوں اور گناہوں سے درگزر فرماتا ہے۔ پھر جب نوے برس کو پہنچتا ہے تو بخش دیتا ہے اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہوں کو اور اس کا نام رکھا جاتا ہے اللہ کا قیدی اس کی زمین میں اور اپنے گھر والوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔[1]

﴿ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً ﴾ یہ اس بات پر دوسری دلیل ہے کہ اللہ پاک مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، جس طرح کہ اللہ مردہ دبی پڑی زمین کو زندہ کرتا ہے۔ زمینِ ہامدہ وہ ہے جو خشک پڑی ہے، اس پر کچھ روئیدگی نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هَامِدَةً ﴾ غبراء متهشمه، یعنی روئیدگی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اطراف میں غبار ہے۔ غبار آلود ہو رہی ہے۔ روئیدگی مارے خشکی کے ریزہ ریزہ ہو کر چور ہوگئی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هَامِدَةً ﴾ زمین مردہ ہے۔[2] ﴿ فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ﴾ یعنی پھر جب اللہ اس پر پانی نازل کرتا ہے تو وہ روئیدگی سے حرکت کرتی ہے اور مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے اور ربت کے یہ معنی ہیں کہ جب زمین میں نمی ساکن ہو جاتی ہے تو وہ اونچی ہوتی ہے ابھرتی ہے۔ پھر انواع واقسام کے پھل اور کھیتیاں، جو اس میں موجود ہیں، اُگاتی ہے اور طرح طرح کی روئیدگیاں، جن کے رنگ و مزے اور بُو اور شکلیں اور نفع مختلف ہیں۔ (أخرج ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما في قوله ﴿ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ﴾ قال حسن:[3] كذا في فتح القدير)۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ﴾ یعنی خوشبو دار خوبصورت، بارونق قسم قسم کی روئیدگی اُگاتی ہے، جس کا دیکھنا آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

﴿ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ یعنی اللہ پاک خالق و مدبر ہے، جو چاہتا ہے اس کا کرنے والا ہے۔ ﴿ وَأَنَّهُۥ يُحْيِ الْمَوْتَىٰ ﴾ یعنی جس طرح اس نے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس نے انواع و اقسام کی روئیدگیوں کو اُگایا، بے شک جس ذات نے اس کو زندہ کیا، البتہ وہی زندہ کرنے والا ہے مردوں کا۔ ﴿ وَأَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ اور وہی ہر شے پر قادر ہے۔ ﴿ إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴾ [يٰس: ٨٢] ''جب وہ کسی چیز کا

[1] مسند البزار (١٢/ ٣٢١) اس کی سند میں ''یوسف بن ابی ذرہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٩٨٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٥) فتح القدير (٣/ ٥٩٨)

ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔'' ﴿ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ﴾ یعنی قیامت آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ یعنی جو لوگ کہ قبروں میں پڑے ہیں، ان کا اعادہ کرے گا، اس کے بعد کہ وہ ان میں ریزہ ریزہ بوسیدہ ہو گئے۔ عدم کے بعد ان کو وجود میں لائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ۷۸۔ ۸۰] ''اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گی؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔ وہ (اللہ) جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ بنا دی، پھر یکایک تم اس سے آگ سلگا لیتے ہو۔'' اس بارے میں اس کے سوا اور بہت آیتیں ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا یا رسول اللہ! کیا ہم میں سے ہر ایک قیامت کے دن اپنے رب عزوجل کو دیکھے گا اور اس کے خلق میں اس کی کیا نشانی ہے؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَلَيْسَ كُلُّكُمْ يَنْظُرُ إِلَى الْقَمَرِ مُخْلِيًا بِهِ» یعنی کیا تم میں سے ہر ایک اکیلا چاند کو بغیر ازدحام کے نہیں دیکھ سکتا؟ ہم نے عرض کی: ہاں، یعنی ہم میں سے ہر ایک چاند کو بغیر ازدحام کے دیکھتا ہے۔ فرمایا: تو اللہ تو سب سے بڑا ہے۔ سیدنا لقیط رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا اور اس کی خلق میں اس کی کیا نشانی ہے؟ فرمایا: کیا تو اپنے گھر والوں کی وادی پر اس حال میں نہیں گزرا کہ وہ خشک پڑی ہو؟ عرض کی: ہاں۔ فرمایا: پھر تو نے اس پر گزر کیا، اس حال میں کہ وہ سبزے سے لہرا رہی ہو؟ عرض کی: ہاں۔ فرمایا: تو اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور یہ اس کی خلق میں اس کی نشانی ہے۔[1] (رواه أبو داود و ابن ماجه من حديث حماد بن سلمة به)

امام احمد رحمہ اللہ کی دوسری روایت ابو رزین عقیلی، یعنی سیدنا لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ ہے، کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تو گزرا اپنی زمین پر جو خشک پڑی ہوئی ہے، پھر تو گزرا اس پر اس حال میں کہ وہ تروتازہ ہو رہی ہے؟ عرض کی: ہاں۔ فرمایا: اسی طرح نشور ہے، یعنی مُردوں کا زندہ کرنا اسی طرح ہے۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''حسن'' کہا ہے۔ دیکھیں: ظلال الجنة (١/ ٢٧٧)

[2] مسند أحمد (٤/ ١١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''سلیمان بن موسیٰ'' کی سیدنا لقیط رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ''سلیمان بن موسیٰ'' متکلم فیہ راوی ہے۔

سے روایت کیا ہے، کہا کہ جس شخص نے جانا کہ اللہ ہی حق مبین ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں اور اللہ اُٹھائے گا اُن لوگوں کو جو قبروں میں ہیں تو وہ جنت میں داخل ہوا۔[1] (كذا في ابن كثير. وأخرجه عبد الله بن أحمد في زوائد الزهد. فتح القدير)

فتح القدیر و فتح البیان میں آیتِ باب کے متعلق ایک یہ حدیث ذکر کی ہے۔ بخاری و مسلم و اہلِ سنن وغیرہم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ہم کو، حدیث بیان فرمائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق و مصدق ہیں کہ بے شک تم میں ہر شخص کی خلق اس کی ماں کے پیٹ میں جمع کی جاتی ہے، چالیس دن نطفہ ہوتا ہے، پھر علقہ ہوتا ہے مثل اس کے، پھر مضغہ ہوتا ہے مثل اس کے، پھر اللہ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے تو وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار باتیں لکھنے کا حکم کیا جاتا ہے۔ رزق و اجل و عمل اور یہ بات کہ وہ شقی ہے یا سعید، پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے! بے شک تم میں سے ایک عمل کرتا ہے اہلِ جنت کا، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے، یعنی ایک ہاتھ کا فاصلہ، پھر سبقت کرتی ہے اس پر کتاب تو وہ اہلِ نار کا عمل کر بیٹھتا ہے، پھر اس میں داخل ہو جاتا ہے اور بے شک تم میں سے ایک البتہ اہلِ نار کا سا عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ذراع، یعنی ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر کتاب سبقت کرتی ہے تو وہ اہلِ جنت کا عمل کر لیتا ہے۔ پھر اس میں داخل ہو جاتا ہے۔[2] اس بارے میں حدیثیں بہت ہیں۔ (یہ قرب کی مثال ہے، مراد یہ ہے کہ ایسا کبھی نادر واقع ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ پاک کے اور لطف وسعتِ رحمت سے یہ لوگ شر سے خیر کی طرف بہ کثرت منقلب ہو جاتے ہیں اور اس کا عکس نہایت نادر اور قلیل ہے، کیوں کہ اللہ پاک کی رحمت اس کے غضب پر سابق ہو چکی ہے اور عکس میں وہی شخص داخل ہوتا ہے جو کہ کفر یا کسی معصیت کے ساتھ منقلب ہو جاتا ہے۔[3] نعوذ بالله منه. مجمع البحار)

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس آیت کی اس سے پہلی آیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے اس اول شخص کا ذکر کیا جو اللہ پاک کی قدرت میں بغیر علم کے جھگڑتا ہے اور کفار کا جھگڑا حشر اور قیامت کے بارے میں تھا تو اس پر دو کھلی ہوئی دلیلیں بیان فرمائیں: پہلی دلیل تو خود نفسِ انسان میں اور اس کی ابتدائے آفرینش میں اور سات حالتوں میں سے گزرنے میں ذکر کی، وہ ساتھ حالتیں یہ ہیں: تراب، نطفہ، علقہ، مضغہ، اخراجِ طفل،

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧٥-٢٧٨) فتح القدير (٣/ ٥٩٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٠٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٣٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٦) فتح القدير (٣/ ٥٩٨) فتح البيان (٩/ ١٤)

[3] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٢٣٢)

بلوغِ اشد، توفی یا ردطرف اَرذل العمر۔ دوسری دلیل زمین میں ذکر فرمائی، جس کی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ پس جب کہ ایک صاحبِ عقل انسان، انسان کی پیدایش وغیرہ کی مختلف حالتوں اور زمین کی مختلف کیفیتوں میں منتقلی کو عبرت کی نگاہ سے دیکھے گا تو اس کے نزدیک حشر ونشر کا جواز عقلاً ثابت ہو جائے گا۔ پھر جب کہ شرع اس کے واقع ہونے پر وارد ہوگئی تو اب تو اس کی تصدیق واجب ہوئی اور اس بات کی تصدیق کہ قیامت ضرور ہونے والی ہے۔[1]

پس فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ ﴾ جمہور نے بعث کو بہ سکونِ عین مہملہ پڑھا ہے اور حسن رحمہ اللہ کی قراءت بفتحِ عین ہے، یہ بھی ایک لغت ہے۔[2] کہا ہے کہ جس کلمے میں بجائے عین کلمے کے کوئی حرفِ حلقی ہو تو اس کے وسط کا متحرک کرنا قیاسِ مطرد ہے، جیسے شعر ونہر۔ کسی نے کہا ہے کہ قیاس نہیں ہے، بلکہ بہ سکون اور بفتح دونوں دولغت ہیں ایک معنی میں، جیسے: جَلْب و جَلَب اور طَرْد و طَرَد، یہ حرکت وسکون سماع پر موقوف ہے۔ ﴿ مِّنَ الْبَعْثِ ﴾ محلِ جر میں ہے، صفت ہے ﴿ رَيْبٍ ﴾ کی، یا متعلق ہے ﴿ رَيْبٍ ﴾ سے۔

ناس سے مراد اہلِ مکہ ہیں، کیوں کہ گفتگو انھیں میں ہے اور شک میں دونوں احتمال ہیں: بعث کے وقوع میں شک ہے، یا اس کے امکان میں۔ یعنی اے مکے والو! اگر تم کو بعث واعادے کے واقع ہونے میں، یا اس کے امکان اور مقدورِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو تم اپنی ابتدائے پیدایش میں غور وفکر کرو تو یہ غور وفکر تمھارے شک کو دور کر دے گا اور تمھارے باطل شبہہ کو زائل کر ڈالے گا۔ ﴿ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ... الخ﴾ اللہ پاک نے پہلے پیدایش کے مراتب ومبادی (ابتدائی باتیں) سات امور ذکر فرمائے۔ اول مرتبہ تو مٹی کا ہے، کیوں کہ سارے افرادِ انسانی کی ابتدا یہی مٹی ہے، ان کی اصل، یعنی آدم علیہ السلام کے واسطے سے۔ اللہ پاک نے اس مٹی سے اُن کو پیدا کیا۔ یا بواسطۂ غذا کے جو کہ مٹی سے پیدا ہوتی ہے اور غذا سے منی اور حیض کا خون بنتا ہے اور غذا حیوانی ہے یا نباتی۔ حیوانات کی غذا کی انتہا بھی نبات ہی کی طرف ہوتی ہے واسطے قطع تسلسل کے اور نبات اس مٹی و پانی سے پیدا ہوتی ہے۔ پس اللہ پاک نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے بنایا ہے تو دونوں اعتبار کی بنیاد پر ٹھیک ہوگیا۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ ﴾ کی جزا کیا ہے۔ لہٰذا اس کی جزا "فانظروا في بدء خلقکم... الخ" ہے، جس کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے کہ تم اپنی ابتدائے پیدایش میں غور کرو۔ الخ ﴿ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ ... الخ﴾ حقیقت میں جزا نہیں ہے، لیکن قائم مقام جزا کے ہے، اس جہت سے کہ اس کی خبر دینا، ایک سبب ہے کہ اس کے مضمون میں نظر کرنے کی طرف مؤدی (ادا کرنے والا) ہوتا ہے۔ یہی نظر اور غور اُن کے شک کو زائل کرنے والا ہے۔

دوسرا مرتبہ پیدایش کا نطفہ ہے۔ نطفہ اصل میں آبِ قلیل کو کہتے ہیں، کبھی آبِ کثیر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٢٧) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٦)

ہے۔ نطفہ قطرے کو بھی بولتے ہیں: ”نطف ینطف“ بہ معنی ”قَطر“ عرب کی بول چال میں کہا جاتا ہے۔ لیلِ نطوف اس رات کو کہتے ہیں جس میں ساری رات تقاطر ہوا کرتا ہے، اسی مادے سے نطفہ نر کے پانی کو کہتے ہیں، یعنی بہ سبب قلتِ منی کے منی کا نام نطفہ رکھا ہے۔ (امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نطفہ بہ معنی منی ہے، ماخوذ ہے نطف سے نطف صَبَّ کو کہتے ہیں۔ صَبَّ کے معنی ڈالنا ہیں،[1] یعنی چوں کہ منی رحم میں ڈالی جاتی ہے اس لیے اس کو نطفہ کہتے ہیں۔) مطلب یہ کہ خشک مٹی کا آب تازہ کو لطیف کر دینا، ایک بڑی کھلی قدرت پر مبنی ہے، ایسی قدرتِ باہرہ سے مُردوں کا دوبارہ زندہ کر دینا کچھ بعید نہیں ہے۔ تیسرا مرتبہ پیدائش کا علقہ ہے۔ علقہ خون کے جامد ٹکڑے کو کہتے ہیں اور علق دمِ عبیط کو بولتے ہیں، یعنی تازہ یا منجمد خون۔ کسی نے کہا ہے کہ سخت سرخ، مراد وہ خونِ جامد ہے جو منی سے بنتا ہے، بلاشک پانی اور خونِ جامد کے درمیان ایک سخت مباینت (ایک دوسرے سے جدا ہونا) ہے، باوجود اس کے پانی کو خونِ جامد بنا دینا عظیم الشان قدرت ہے۔ پیدائش کا چوتھا مرتبہ مضغہ ہے۔ گوشت کے ذرا سے ٹکڑے کو مضغہ بولتے ہیں۔ اتنا ٹکڑا کہ چبایا جائے، مراد اس سے وہ ٹکڑا ہے، جو علقہ سے بنتا ہے۔

﴿مُخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ جَر کے ساتھ ﴿مُضْغَةٍ﴾ کی صفت ہے۔ ﴿مُضْغَةٍ﴾ کی دو قسمیں بیان کیں: ایک تو ﴿مُخَلَّقَةٍ﴾ دوسری ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾۔ ﴿مُخَلَّقَةٍ﴾ کے معنی ہیں: ”مسواة ملساء“ یعنی ٹھیک بنایا ہوا صاف عیب سے پاک۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ”صَخْرَةٌ خَلْقَاء“ یعنی صاف چکنا پتھر جس میں کسی طرح کا عیب نہ ہو۔ مسواک کو جب درست کرتے ہیں اور نرم و صاف بناتے ہیں تو کہتے ہیں: ”خَلَقْتُ السِّوَاكَ“ یعنی میں نے مسواک صاف درست کی، ٹھیک بنائی اور ”غیر مخلقه“ غیر مسواة ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿مُخَلَّقَةٍ﴾ وہ ہے کہ اس میں روح پھونک کر اس کی خلق پوری ہوگئی، اس قسم کا بچہ مدتِ حمل پوری ہونے کے بعد زندہ پیدا ہوتا ہے اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ وہ جس کو عورت مردہ گرا دیتی ہے اور اس میں روح پھونکنے سے اس کی خلق کامل نہیں ہوئی، اکثر کا قول یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿مُخَلَّقَةٍ﴾ وہ ہے جس کی خلقت و صورت ظاہر ہوچکی اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ وہ ہے جس کی صورت نہیں بنائی گئی، بلکہ عورت اس کو ڈال دیتی ہے نطفۂ سفید یا علقہ یا مضغہ کی صورت میں، جس کی خلقت ظاہر نہیں ہوئی۔ ابن اعرابی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مُخَلَّقَةٍ﴾ مکمل پیدائش ہے اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ سقط ہے، یعنی ادھورا بچہ جو گر پڑتا ہے، اسی باب سے کسی شاعر کا شعر ہے

أ في غير المخلقة بكاء فأين الحزم ويحك والحياء[2]

شاعر عورت سے کہتا ہے: کیا ادھورے بچے میں رونا ہے، تیری خرابی ہو، دور اندیشی و شرم کہاں گئی؟!

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے پہلی تین وجوہ کو ذکر کیا ہے۔[3] اُن میں سے وجہِ اول کو اس لیے مقدم ذکر کیا کہ صیغۂ

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤) [2] فتح القدير (٣/ ٥٩٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤)

تفعیل کو وہی زیادہ تر موافق ہے۔ تخلیق تکثیر خلق پر دال ہے، یعنی چوں کہ انسان کے اعضا متباین (مختلف) ہیں اور قوتیں متفاوت ہیں۔ پھر جن اُمور سے کہ خلقتِ نوع پوری ہوتی ہے، جس وقت وہ سب امور اس میں کامل ہوگئے تو بے شک اس میں کثرت خلق کی ہوئی، اسی واسطے علامہ نسفی رحمہ اللہ نے صرف وجہ اول کو اختیار کیا ہے اور یوں کہا ہے: "مخلقة مسواة ملساء"[1] یعنی عیب ونقصان سے پاک، گویا اللہ عزوجل مضغوں کو متفاوت پیدا فرماتا ہے۔ ان میں سے بعض تو کامل الخلقت عیوب سے پاک صاف ہیں اور بعض اس کے برعکس ہیں۔ پھر اس تفاوت کے تابع لوگوں کا تفاوت ہوتا ہے، اپنی خلق وصورت وطول وقصر وتمام ہونے اور کمی بیشی ہونے میں، یعنی اس تفاوت کی وجہ سے انسان کے سارے امور میں فرق ہوتا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مضغہ کی حالت کی تفصیل ہے اور اس بات کی کہ مضغہ ایک ٹکڑا تھا، اس میں کوئی عضو ظاہر نہیں ہوا تھا۔

پھر اس کے بعد ایک ایک کر کے اعضا ظاہر ہوئے، اس ترتیب کے مطابق جس کی بنا تدریج پر تھی، مبادیِ بعید سے قریب کی طرف۔ اس ترتیب کا مقتضا یہ تھا کہ ﴿ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ ﴾ کو ﴿ مُخَلَّقَةٍ ﴾ پر مقدم کیا جائے، لیکن ﴿ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ ﴾ کو ﴿ مُخَلَّقَةٍ ﴾ سے صرف اس لیے بعد میں ذکر کیا کہ ﴿ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ ﴾ عدم الملکہ ہے۔[2] (بلکہ بہ معنی وجود ہے، جو عدم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔) امام قرطبی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو یہ ترتیب ذکر فرمائی ہے، اس میں غور وتامل کرنا چاہیے، کیوں کہ یہ ترتیب اس بات کی مقتضی ہے کہ انسان کامل اول نطفے سے پیدا کیا گیا۔ پھر دوسری بار علقے سے، پھر تیسری بار مضغے سے، باوجود اس کے کہ اصل خلق نطفے سے ہے، پھر نطفہ علقہ ہو گیا، پھر علقہ مضغہ بن گیا، چنانچہ خود اللہ پاک نے دوسری آیت میں اس کی تصریح فرمائی ہے: ﴿ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] "پھر ہم نے نطفے کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر ہم نے پھٹکی کو لوتھڑے میں ڈالا، پھر ہم نے لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی صورت میں بنا دیا، چناں چہ بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے عمدہ بنانے والا ہے۔"

عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت نطفہ رحم میں واقع ہوتا ہے، پھر اللہ ارادہ کرتا ہے اس بات کا کہ اس سے بشر کو پیدا کرے تو وہ نطفہ عورت کی جلد میں متفرق ہو جاتا ہے نیچے ہر ناخن اور بال کے، پھر وہ چالیس دن ٹھہرا رہتا ہے، پھر وہ رحم میں خون ہو جاتا ہے، پس یہی اُس نطفے کا جمع کرنا ہے اور یہ اس کے علقہ کرنے کے وقت ہوتا ہے۔[3] الخ۔ اس بات میں علما کا اختلاف نہیں ہے کہ بچے میں روح کا پھونکنا ایک سو بیس دن کے بعد ہوتا ہے اور یہ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٦) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٩٣۔ ٩٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

پورے چار مہینے ہوئے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُخَلَّقَةٍ ﴾ وہ ہے جس میں اللہ پاک نے سر اور دو ہاتھ اور دو پاؤں پیدا کر دیے اور ﴿ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ ﴾ وہ ہے جس میں کچھ پیدا نہیں کیا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ چار مہینے دس دن کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے، پس یہی عدت ہے وفات کی۔[2]

﴿ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ ﴾ میں حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے اور مفعول محذوف ہے، یعنی ہم نے تم کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک خلق سے دوسری خلق کی طرف منتقل کیا، تاکہ ہم تمھارے لیے اپنی قدرت وحکمت کو بہ سبب اس تدریج کے بیان کر دیں اور اس بات کو ظاہر کر دیں کہ جو شے تغیر وتبدل وفساد وتکون کو ایک دفعہ قبول کر چکی ہے، وہ دوبارہ بھی اس کو قبول کرے گی اور یہ بات واضح کر دیں کہ جو ذات پاک پہلی دفعہ اس کی صورت بنانے اور تغیر کرنے پر قادر ہوا ہے، وہ دوبارہ بھی اس پر قادر ہے۔

﴿ نُبَيِّنَ ﴾ کے مفعول حذف کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ پاک کے ان افعال سے اس کی وہ قدرت وحکمت ظاہر ہوتی ہے کہ جس کی نہ ذکر گنجایش رکھتا ہے نہ وصف اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔ جہاں تعمیم وتعظیم منظور ہوتی ہے، وہاں مفعول کو حذف کر دیا کرتے ہیں، یعنی اللہ پاک کے اُن کاموں سے اس کی ایسی قدرت وحکمت ظاہر و باہر ہے کہ اس کی عظمت کے مارے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ علّامہ نسفی اور شیخ زادہ رحمہما اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ لام محذوف سے متعلق ہے،[3] چنانچہ اس کے مطابق ترجمہ گزر چکا ہے۔

امام ابو حیان، حفناوی اور علامہ شوکانی رحمہم اللہ نے یوں کہا ہے کہ لام ﴿ خَلَقْنٰكُمْ ﴾ سے متعلق ہے اس بات پر کہ لام عاقبت کا ہے،[4] یعنی ہم نے تم کو پیدا کیا اس نمطِ بدیع پر اور اس طرزِ نادر پر، تاکہ ہم تمھارے واسطے اپنی کمال قدرت کو بیان کریں اور کمالِ قدرت کو اس لیے بیان کیا، تاکہ تم اس سے ہماری ابتدائے خلق اور اعادۂ خلق پر قدرت کی دلیل پکڑو۔ کیوں کہ جو ذات پاک اس پر قادر ہے کہ بشر کو مٹی سے پیدا کرے، پھر نطفے سے، حالاں کہ مٹی اور پانی میں کسی طرح کی مناسبت نہیں ہے اور جو ذات پاک اس پر قادر ہے کہ نطفے کو علقہ کرے اور علقہ کو مضغہ بنائے اور مضغے کو ہڈیاں کر دے، وہی اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ جس کو اس نے پہلے پہل اس طرزِ خاص پر بنایا، پھر دوبارہ اس کا اعادہ کر دے، یہ بات اس سے کچھ بعید نہیں ہے، بلکہ قیاسِ معتاد میں بہ نسبت اول کے زیادہ سہل وآسان ہے۔

﴿ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ جمہور نے ﴿ نُقِرُّ ﴾ کو برفع بنا بر استیناف پڑھا ہے، ماقبل کی علت نہیں ہے کہ ﴿ نُبَيِّنَ ﴾ پر معطوف ہو کر منصوب ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نُقِرُّ ﴾ میں سوائے رفع کے کچھ جائز نہیں ہے اور جائز نہیں ہے کہ اس آیت کے معنی یوں ہوں کہ یہ سب ہم نے اس واسطے کیا کہ

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٩) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٦)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٩٦) [4] بحر المحيط (٦/ ٣٢٧) فتح القدير (٣/ ٥٩٥)

تم کو رحموں میں ٹھہرائیں، کیوں کہ اللہ پاک نے خلق کو اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ رحموں میں ثابت رکھی جائے، اس کو تو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کو اس کے رُشد و صلاح کی راہ بتائے۔[1] غرض کہ جمہور کے نزدیک ﴿ لَكُمْ ﴾ پر وقف ہے اور ﴿ نُقِرُّ ﴾ جملہٴ مستأنفہ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم ثابت رکھتے ہیں رحموں میں جس کو ثابت رکھنا چاہتے ہیں۔ پس گرتا نہیں ہے اور ایک مدتِ مقرر تک اس کو ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ وہ مدت وقتِ ولادت ہے۔ ادنیٰ اس کا چھے مہینے ہے اور منتہا کی مدت پورے چار برس۔

﴿ مَا نَشَآءُ ﴾ فرمایا: "مَنْ نَّشَآءُ" نہ کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَا ﴾ سے مراد حمل ہے اور حمل روح پھونکنے سے پہلے جماد ہے، اس واسطے کلمہ ﴿ مَا ﴾ فرمایا جو کہ غیر ذوی العقول کے لیے ہے۔ ابن وثّاب نے ﴿ مَا نَشَآءُ ﴾ بکسرِ نون پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے ابو زید عن المفضل عن عاصم سے روایت کیا ہے کہ عاصم نے ﴿ نُقِرُّ ﴾ کو اور ﴿ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے ﴿ نُبَيِّنَ ﴾ پر اس کا عطف کیا ہے۔[2] معنی اس کے یہ ہیں کہ گویا اللہ پاک کا لوگوں کو اس طرزِ خاص سے پیدا کرنا، دو مصلحتوں کا حامل ہے: ایک تو اپنی قدرتِ بالغہ کا ظاہر کرنا۔ دوسری مصلحت یہ ہے کہ اُن کو رحموں میں ثابت رکھنا، یہاں تک کہ متولد ہوں اور نشو و نما پائیں، بڑھیں اور تکلیف کی حد کو پہنچیں۔ یہ حاصل ہے امام بیضاوی رحمہ اللہ کی تقریر کا۔[3] اس سے امام زجاج رحمہ اللہ کا قول رد ہو گیا، یعنی تنہا ارحام میں ثابت رکھنا خلقِ مذکور کی علت نہیں ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول اس پر وارد ہو، بلکہ خلقِ مذکور کی علت اُن امور کا مجموع ہے، یعنی مدتِ ولادت پوری ہونے تک رحم میں ثابت رکھنا اور پیدا ہونا بچہ ہو کر اور نشو و نما پانا اور حدِ تکلیف کو پہنچنا (یعنی بلوغت کو)۔

حقیقت میں علت یہی اَخیر ہے، یعنی تکلیف کی حد کو پہنچنا، یعنی یہاں تک کہ اللہ پاک کی معرفت، توحید اور طاعت کی تکلیف دیے جائیں اور اِن اُمور کے ساتھ مکلّف ہوں تو آخرت کی سعادت کو پہنچیں، لیکن چونکہ رحم میں ثابت اور اس کے سوا اور مقدماتِ بلوغ، ان سب کو زیادہ تر دخل تھا، اس واسطے اس پر آگاہ کرنے کو لامِ علت کا مقدر کیا گیا۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ لِتَبْلُغُوْٓا ﴾ کو اعادہٴ لام کے ساتھ کیوں خاص کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ منظور یہ بات بتلانا ہے کہ اجزائے غرض میں سے اوّلاً و بالذّات، دوسرا جزء غرض کا مقصود ہے اوّل نہیں ہے۔ یہ دوسرا جز وہی جز اخیر بلوغ مذکور ہے، کیوں کہ تکلیف کا وقت وہی ہے اس قراءت کی بنیاد پر۔ ﴿ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا ﴾ معطوف ہوگا ﴿ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ ﴾ پر اور قراءت رفع کی بنا پر معطوف ہوگا ﴿ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ ﴾ پر۔ کلمہ ﴿ ثُمَّ ﴾ دونوں جگہ تراخیِ رتبہ کے واسطے ہے۔

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٤١٢) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١١) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤)

مقام کے لحاظ سے زیادہ ظاہر اور مناسب یہی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تراخی زمانے کے لیے ہو، کیوں کہ بلوغِ اشد (جوانی کو پہنچنا) اخراجِ طفلا (بچے کا رحم سے نکالنا) سے متراخی ہے اور اخراج طفلا کا زمانہ رحم میں قرار پانے کے علاوہ ہے گو باعتبار ابتدائے اقرار ﴿ فِي الْاَرْحَامِ ﴾ کے ہو۔ بالجملہ ﴿ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ﴾ کے یہ معنی ہیں: پھر ہم نکالتے ہیں تم کو تمھاری ماؤں کے شکموں سے اس حالت میں کہ تم بچے ہوتے ہو، اس جگہ طفل سے مراد اطفال ہے، کیوں کہ خطاب جمع کو ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] عرب لوگ واحد کا اسم جماعت پر کثرت سے بولا کرتے ہیں۔ اسی باب سے کسی شاعر کا قول ہے ؎

يُلْحِيْنَنِي من حبها و يلمنني إِنَّ العَوَاذِلَ ليس لي بأمير

یعنی میری معشوقہ کی محبت کے سبب سے ملامت گر عورتیں مجھ سے لڑتی جھگڑتی ہیں، مجھ کو ملامت کرتی ہیں، یہ عورتیں ملامت گر کچھ میری امیر و سردار نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ میں ان کا کہنا مانوں۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طفل ایک اسم ہے مصدر استعمال ہوتا ہے، مثلاً: رضا و عدل کہ واحد وجمع پر واقع ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ﴾ [النور: ٣١] ”یا ان لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں۔“ یا مفرد اس لیے ذکر کیا کہ مراد جنس ہے، جو کہ واحد یا متعدد کو شامل ہوتی ہے، یا اس لیے کہ اصل میں مصدر ہے، یا بہ تاویل ﴿ كُلٍّ ﴾ واحد ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ طِفْلًا ﴾ بنا بر تمیز منصوب ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا ﴾[2] [النسآء: ٤] ”پھر اگر وہ اپنی مرضی سے تمھیں کچھ مہر چھوڑ دیں۔“ اس قول میں بعد ہے، ظاہر یہ ہے کہ بتاویلِ مذکور منصوب بنا بر حال ہے۔ طفل کا اطلاق چھوٹے بچے پر ولادت سے لے کر بلوغت تک ہوتا ہے۔ کبھی طفل کا تثنیہ وجمع بھی آتا ہے، چنانچہ ”طفلان“ و ”اطفال“ بولتے ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے: « سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ أَطْفَالِ الْمُشْرِكِيْنَ »[3] ایک قراءت یہ ہے کہ ”ليبين و يقر و يخرجكم“ بیائے تحتیہ پڑھا ہے اور آخر کے دو کو برفع ونصب، ہر ایک کا اسناد اللہ پاک کی طرف کیا ہے، جیسا کہ قراءتِ نون میں ہے۔ دوسری قراءت ”يَقِرَّ“ بفتح یائے تحتیہ وکسرِ قاف ونصب راء ہے، یعنی ”وَيَقِرَّ اللّٰهُ تَعَالٰى“. ماخوذ ہے: ”قَرَّا الماء إذا صَبَّه“ سے اور ایک روایت میں یعقوب نے ”نقر“ بفتحِ نون وضمِ قاف ورفعِ راء پڑھا ہے۔ ماخوذ ہے: ”قر الماء يقره إذا صبه“ سے۔

غرضیکہ پیدائش کا پانچواں مرتبہ طفل پیدا کرنا ہے اور چھٹا ہے ﴿ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ علت ہے ﴿ نُخْرِجُكُمْ ﴾ کی، معطوف ہے ایک اور علت پر جو کہ ﴿ نُخْرِجُكُمْ ﴾ کے مناسب ہے۔ گویا یوں کہا گیا

[1] معاني القرآن (٣/ ٤١٢) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ١٢) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٩)

ہے کہ "نخرجكم طفلا لتكبروا شيئا فشيئا ثم لتبلغوا إلى الأشد" یعنی ہم تم کو نکالتے ہیں لڑکا، تاکہ تم آہستہ آہستہ ذرا ذرا بڑے ہوؤ، پھر تم کمالِ قوت تک پہنچو۔ کسی نے کہا ہے ﴿ ثُمَّ ﴾ زائد ہے، اب ضرورت دوسری علت نکالنے کی نہ ہوگی۔ امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ ثُمَّ ﴾ کے بعد "نعمركم"[1] اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے "نربيكم" مقدر نکالا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ "نبين" پر معطوف ہے۔ "أشدّ" کمال عقل و کمال قوت و تمیز کو کہتے ہیں، یعنی حواس وقویٰ و جوارح و اعضا سب میں کمال قوت کا نام "أَشُدّ" ہے، یہ کمال تیس اور چالیس سال کے درمیان ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اٹھارہ برس سے تیس برس تک۔ کسی نے کہا ہے کہ تین اوپر تیس تک ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أشد" جمع ہے "شدة" کی جس طرح کہ "نعمة" کی جمع "أنعم" ہے۔ گویا کمالِ قوت وعقلِ امور میں شدت ہے،[3] یعنی چونکہ اس عمر میں سب قوتوں میں سختی اور پختگی ہوتی ہے، اس لیے اس سن کو "أشد" کہتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "أشد" ان الفاظ جمع سے ہے، جن کا واحد مستعمل نہیں ہوتا۔[4]

پیدائش کا ساتواں مرتبہ ہے: ﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى ﴾ یعنی بعض تم میں سے وہ شخص ہے کہ بلوغِ اشد کے وقت، یا اس سے پہلے مرجاتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یہی دونوں قول لکھے ہیں۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ایک قول زیادہ لکھا ہے، یعنی یا بعد بلوغِ اشد کے مرجاتا ہے۔[6] محلی، فتح القدیر، فتح البیان نے قبل بلوغِ اشد کو اختیار کیا ہے اور امام خازن رحمہ اللہ نے قبل بلوغ الکبر کہا ہے۔[7] جمہور کی قراءت بصیغۂ مجہول ہے اور کسی نے صیغۂ معروف کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ ﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ ﴾ یعنی بعض تم میں سے وہ شخص ہے کہ رد کیا جاتا ہے ارذلِ عمر کی طرف۔

"عُمُرِ" بضمِ عین مہملہ و میم ہے۔ کسی نے بسکونِ میم بھی پڑھا ہے۔ ارذلِ عمر بہ معنی اخس و ادونِ عمر ہے، یعنی انتہائی خسیس و نکمی اور بری عمر، یہ زمانہ ہَرَم و خرف کا ہے۔ ہَرَم آخری بڑھاپا ہے اور خرف بڑھاپے کے مارے عقل کے بگڑ جانے کو کہتے ہیں، جس کو ہندی میں بُڑھ بھس بولتے ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے سورۃ النحل میں نقل کیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ارذلِ عمر پچھتر برس ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسّی سال۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نوے سال،[8] چونکہ اس عمر میں آدمی کے ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں، بے عقل ہو جاتا ہے۔

اس لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ یعنی تاکہ نہ جانے بعد جاننے کے کسی شے کو اشیا سے، یا کسی شے کو علم سے، معنی یہ ہیں کہ بعد اس کے کہ اشیا کو جانتا بوجھتا سمجھتا تھا، ایسا ہو

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٦) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٩٦) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٤) [6] تفسير النسفي (٣/ ٩٦)
[7] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣) فتح القدير (٣/ ٥٩٦) فتح البيان (٩/ ١٥) تفسير الخازن (٥/ ٥)
[8] تفسير الخازن (٤/ ١٠٣)

جائے کہ اس کو نہ کسی طرح کا علم ہو نہ فہم، اسی کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ [التين: ٤۔ ٥] ''ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نیچوں سے نیچے پھینک دیا۔'' اور اس آیت کی طرح: ﴿ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٦٨] ''اور جس شخص کو ہم (زیادہ) عمر دیں (گویا) ہم اسے (حالتِ) پیدائش کی طرف لوٹا دیتے ہیں، کیا پھر وہ عقل نہیں رکھتے؟''

شیخ زادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ لِكَيْلَا ﴾ ﴿ يُرَدُّ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی تا کہ اپنی عقل اول کے بعد کسی شے کو نہ جانے اور ﴿ شَيْـًٔا ﴾ مفعول ہے ﴿ يَعْلَمَ ﴾ کا۔ اگر کوئی کہے کہ ﴿ شَيْـًٔا ﴾ نکرہ ہے، سیاقِ نفی میں واقع ہوا ہے، پس عام ہوگا باوجود اس کے کہ نہایت بوڑھا آدمی طفل کی طرح بعض اشیا کو جانتا پہچانتا ہے تو کہیں گے: مراد یہ ہے کہ اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایسا ہو جاتا ہے، گویا کسی شے کو نہیں جانتا، کیوں کہ کبھی ایسا کلام مبالغے کے لیے عقل کی نفی کے مقام میں ذکر کیا جاتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ جیسا زمانہ طفولیت میں سخیف العقل قلیل الفہم تھا، ویسا ہی اگلی ہیئت کی طرح پھر ہو جائے، تو جس شے کو جانتا تھا اسے بھول جائے اور جس شے کو پہچانتا تھا، اس سے انجان ہو جائے۔ انسان کو جو مختلف امور اور متضاد حالات پیش آتے ہیں اس سے امکانِ بعث پر دوسرا استدلال کیا گیا ہے، کیوں کہ جو ذات پاک اس پر قادر ہے، وہی اس کے نظائر پر بھی قادر ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: تا کہ نہ جانے کسی شے کو اس کے بعد کہ اس کو جانتا تھا، یا تا کہ نہ استفادہ کرے کسی علم کا اور بھول جائے اس شے کو جس کا عالم تھا۔[2]

نکتہ:

امام محلی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے قرآن پڑھا، وہ اس حالت میں نہیں ہوتا ہے۔[3] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ارذلِ عمر کی طرف رد غیر قاریِ قرآن اور غیر علما کے ساتھ خاص ہے۔ رہے قاریِ قرآن شریف اور علما، سو وہ اپنی آخر عمر میں ارذلِ عمر کی طرف رد نہیں کیے جاتے، بلکہ جتنی ان کی عمر بڑھتی ہے، اتنی ہی اُن کی عقل اور بڑھتی جاتی ہے۔ پھر اللہ پاک نے بعث کے امکان پر دوسری دلیل ذکر فرمائی: ﴿ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً ﴾ چونکہ دلیل اول میں پیدائش کے بعض مراتب آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے تھے، اس لیے وہاں ﴿ خَلَقْنٰكُمْ ﴾ فرمایا، ﴿ تَرَى ﴾ نہ کہا اور یہ دلیل چوں کہ مشاہد ببصر تھی، آنکھ سے اس کا مشاہدہ ہوتا تھا، اس واسطے یہاں ﴿ وَتَرَى ﴾ فرمایا۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔[4]

ھمود سکون وخشوع کو کہتے ہیں۔ ارضِ ہامدہ زمین مردہ خشک ہوئی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ماخوذ ہے

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٦) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٣) [4] بحر المحيط (٦/ ٣٢٨)

"همدت النار إذا صارت رمادا" سے،[1] یعنی جب آگ بجھ کر راکھ ہو جاتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "همدت النار" آگ راکھ ہوگئی۔ امام ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یعنی "ميتة يا بسة" جیسے آگ جبکہ بجھ جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ هَامِدَةً ﴾ بہ معنی دارسہ ہے، ھمود بہ معنی دروس ہے، یعنی کہنہ و بوسیدہ ہونا، کپڑا جب بوسیدہ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں: "همد الثوب" اسی سے اعشیٰ کا قول ہے ؎

قالت قُتَيْلَةُ ما لجسمك شاحبا وارىٰ ثيابَكَ باليات هُمُوداً[2]

قتیلہ (معشوقہ) کہتی ہے کہ تیرے بدن کو کیا ہوا ہے کہ متغیر ہو رہا ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ تیرے کپڑے بوسیدہ ہو رہے ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ هَامِدَةً ﴾ وہ زمین ہے جس سے تری جاتی رہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "هالكه" ہے، ان سب اقوال کے معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ غرض کہ بعث کے بارے میں جھگڑنے والے تو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے زمین کو دبی بڑی خشک بے نبات۔ ﴿ فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾ یعنی پھر جب ہم نے اس پر پانی اُتارا تو وہ روئیدگی کے سبب سے حرکت کرتی ہے اور اُبھرتی ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان و خازن میں ہے کہ اس جگہ پانی سے مراد مطر ہے، یعنی آسمان کا پانی۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا کہ مراد "ماء مطر والنهار و عيون و سواقى" ہے۔[3]

﴿ اهْتَزَّتْ ﴾ کے معنی "تحركت" ہیں۔ "اهتزاز" شدتِ حرکت کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "هززت الشيء" یعنی میں نے اس شے کو ہلایا تو وہ ہل گئی، معنی یہ ہیں کہ روئیدگی کے سبب سے ہل گئی، کیوں کہ روئیدگی زمین سے نکلتی نہیں ہے، یہاں تک کہ بعض زمین کا بعض سے حقیقی ازالہ کر دیتی ہے۔ زمین کو اِدھر اُدھر سے پھاڑ کر نکلتی ہے، اس تحرک کا نام اہتزاز مجازاً رکھا ہے۔ یعنی زمین جو اپنی نبات کو پانی کے سبب سے اُگاتی ہے، اس اُگانے کو اہتزاز مجازاً کہہ دیا ہے۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اہتزاز اس حرکت کو کہتے ہیں جو بہجت و سرور کے طور پر واقع ہوتی ہے، اس بنیاد پر "اهتز فلان لكيت وكيت" نہ کہیں گے، مگر اسی وقت کہ وہ امر منافع و محاسن سے ہوگا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی "اهتز نباتها" ہیں، مضاف حذف ہوگیا ہے اور اہتزاز نبات کا شدتِ حرکتِ نبات ہے، بہ نسبت زمین کے اہتزاز نبات میں ظاہر تر ہے۔[4]

﴿ رَبَتْ ﴾ کے معنی "ارتفعت" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "انتفخت"، معنی ایک ہی ہیں۔ اصل "رَبُو" کی زیادتی ہے۔ جب کوئی شے زیادہ ہوتی ہے بڑھتی ہے تو محاورے میں بولتے ہے: "ربا الشيء يَربُو ربوا" اسی

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٥)
[2] فتح القدير (٣/ ٥٩٦)
[3] فتح القدير (٣/ ٥٩٦) فتح البيان (٩/ ١٦) بحر المحيط (٦/ ٣٢٥)
[4] فتح القدير (٣/ ٥٩٦)

سے "رُبی و رَبُوہ" ہے۔ جمہور کی قراءت اسی مادے سے ہے، معنی اس کے زیادتی کے ہیں، کسی جہت سے ہوں۔ امام ابو جعفر رحمہ اللہ، یعنی یزید بن قعقاع، خالد بن الیاس، عبداللہ بن جعفر اور ابو عمرو نے ایک روایت میں "رَبأت" بہ ہمزہ پڑھا ہے۔[1] اس کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ مرتفع ہوگئی اور علو کی جانب سے بڑھ گئی، یہاں تک کہ مثل رائبہ کے ہوگئی۔ جو شخص بلند جگہ پر بیٹھ کر قوم کی نگہبانی کرتا ہے اس کو رابئی و رائبہ و ربیئہ کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "ربأ فلان بنفسه عن كذا"، یعنی فلاں آدمی نے فلاں کام سے اپنے نفس کو بلند کیا، یعنی اس کام کو نہ کیا، اپنے نفس کو اس سے عالی سمجھا۔ مدارک میں کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں یہ کلمہ ﴿ رَبَتْ ﴾ آیا ہے، یزید نے اس کو ہمزہ کے ساتھ "ربأت" پڑھا ہے۔

﴿ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴾ "أي أنبتت أشياء و ألوانا أو من كل زوج بهيج زوجا فالمفعول محذوف و عند الأخفش "من" زائدة۔ أبو البقا"[2] "بهجت" کے معنی حسن کے ہیں۔ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے، حقیقت میں اُگانے والا اللہ پاک ہے، مگر مجازاً اُگانے کی نسبت زمین کی طرف کر دی گئی، یعنی اور اُگائی زمین نے ہر صنفِ حسن اور اچھے اچھے رنگوں کی روئیدگی، جس کے دیکھنے سے دیکھنے والوں کو سرور ہو، ان کا دل خوش ہو۔ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ اس میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ بِاَنَّ اللّٰهَ... الخ ﴾ جار و مجرور خبر ہے اور ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کے مشار الیہ پہلے ذکر کیے گئے امور ہیں، یعنی یہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو پیدا کیا اور ان کی پیدائش میں تطویر کی اور مردہ زمین کو زندہ کیا، بہ سبب اس کے حاصل یہ ہے کہ اللہ وہی حق ہے الخ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی، یعنی "الأمر ذلك"، تیسری یہ ہے کہ منصوب بہ فعل مقدر ہے: "أي فعلنا ذلك بسبب أن الله هو الحق" اول وجہ پر حرفِ با مرفوع المحل ہوگا اور دوسری تیسری وجہ پر منصوب المحل ٹھہرے گا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ یہ جو پہلے مذکور ہوا کہ اللہ پاک نے انسان کو مختلف اطوار میں پیدا کیا اور اس کو احوالِ متضادہ پر منتقل فرمایا اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا، یہ سب اس وجہ سے ہے کہ اللہ پاک فی نفسہٖ ثابت ہے، جس کے سبب سے اشیا کا تحقق ہوتا ہے۔ ﴿ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی اور وہ قدرت رکھتا ہے مُردوں کے زندہ کرنے پر اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہوتا تو نطفے کو اور مردہ زمین کو زندہ نہ کرتا۔

﴿ وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی اور وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے، کیوں کہ اس کی قدرت لذاتہ ہے، جس کی نسبت ﴿ كُلِّ ﴾ کی طرف برابری پر ہے۔ پھر جب مشاہدے نے دلالت کی، اس کے بعض اموات کو

---

[1] روح المعاني (١٧/ ١١٩) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٣)

زندہ کرنے کی قدرت پر تو ساری اموات کو زندہ کرنے پر اسی کا اقتدار لازم آیا۔ ﴿ وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ﴾ یعنی اور بے شک قیامت آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں، اس لیے کہ تغیر انصرام کے مقدمات و طلائع سے ہے۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ یعنی اور اللہ اُٹھائے گا اُن لوگوں کو جو قبروں میں ہیں، کیوں کہ یہ اس کے وعدے کا تقاضا ہے، جو کہ خلاف کو قبول نہیں کرتا۔[1]

مفتی امام ابو السعود رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل بعض تصرف یہ ہے کہ یہ آثار اُلوہیت کے آثار سے ہیں اور اللہ پاک کی ذاتی، وصفی، فعلی قدر و منزلت کے مطابق احکام ہیں اور قیامت کا آنا اور بعث کا ہونا، جن کے وجود سے انکار کرتے ہیں ان آثارِ عجیبہ کے اسباب سے ہیں، جن کا مشاہدہ انفس اور آفاق میں کر رہے ہیں، یعنی یہ نادر کاری گری حاصل ہے بہ سبب اس کے کہ اللہ پاک ہی اپنی ذات وصفات و افعال میں تنہا حق ہے اور اپنے ماسوا اشیا کا محقق و موجد ہے۔ پس یہ آثارِ خاص قدرت عامہ و تامہ کی تمام اقسام اور مسببات سے ہیں اور اس کی اقسام و متعلقات میں سے مردوں کا زندہ کرنا ہے اور باوجود اس کے کہ یہ معاملہ ایسی اشیا میں سے ہے، جن پر اسے قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ اس کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ محلِ نزاع کی وضاحت ہو جائے اور مہربانی اور اہتمام کے لیے اس کو اور اُمور پر مقدم کیا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ السَّاعَةَ ﴾ معطوف ہے مجرور بالبا پر، جس طرح کہ اس سے پہلے کے دو جملے اس پر معطوف ہیں، یہ بھی انھیں کے ساتھ سببیت کے تحت میں داخل ہے اور اسی طرح ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ اسی پر معطوف ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نے پانچ اسباب ذکر فرمائے، اُن میں سے تین سبب پہلے تو مؤثر ہیں اور اَخیر کے دو غیر مؤثر۔ ابن جزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ ﴿ بِاَنَّ اللّٰهَ ﴾ کا حرفِ باسببیت کے واسطے نہیں ہے، بلکہ محذوف سے متعلق ہے، جس پر مقام دلالت کرتا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "ذلك المذكور من خلق الإنسان و إحياء الأرض بالنبات مشاهد بأن الله هو الحق"[3]

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ یعنی جو انسان کا زندہ کرنا اور نبات سے زمین کا زندہ کرنا مذکور ہوا، مشاہدہ کرانے والا ہے اس بات کو کہ اللہ ہی حق ہے۔ اس کے بعد کی چار چیزیں بھی اسی تقدیر سے اس پر معطوف ہیں، پس یہ پانچ امور جو حرفِ با کے بعد مذکور ہوئے ہیں، ان پر خلقِ انسان و نبات کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے، جس طرح ان ہی دونوں کے ساتھ بعث و اعادہ پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو امام حفناوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور اصل اس کی امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ بحر میں ذکر کیا ہے کہ ﴿ وَاَنَّ السَّاعَةَ ﴾ تاکید ہے ﴿ وَاَنَّهٗ

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٥) [2] تفسير أبي السعود (٦/ ٩٥)

[3] التسهيل لعلوم التنزيل (٢/ ٣٣)

﴿ يُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ کی اور خبر ہے مبتدائے محذوف کی،[1] یعنی "وَالْأَمْرُ أَنَّ السَّاعَةَ... الخ" اس بنا پر ما تقدم کی سببیت میں داخل نہ ہوگا۔

امام سمین رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ ﴿ وَاَنَّ السَّاعَةَ ﴾ میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ مجرور بالبا پر معطوف ہے، یعنی "ذٰلِكَ بِأَنَّ السَّاعَةَ إِلى آخره". دوسری وجہ یہ ہے کہ نہ مجرور بالبا پر معطوف ہے نہ سببیت کے تحت میں داخل ہے، بلکہ یہ خبر ہے اور مبتدا بہ سبب معنی کے فہم کے حذف کر دیا گیا ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "والأمر أن الساعة الخ" اور ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهَا ﴾ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ جملہ خبرِ ثانی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ حال ہے۔ امام خازن کی تقریر یہ ہے کہ جب اللہ پاک دو دلیلوں کو ذکر کر چکا تو جو مطلوب تھا، اس کو اُن پر مرتب کیا۔ پس فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ ﴾ یعنی ہم نے اس کو ذکر کیا، تاکہ تم جان لو اس بات کو کہ اللہ ہی حق ہے اور یہ چیزیں صانع کے وجود دلالت کرنے والی ہیں۔ ﴿ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی اور اس بات کو کہ جب اس سے ان چیزوں کا وجود میں لانا بعید نہیں تو مردوں کا اعادہ کرنا کیوں کر بعید ہوگا۔ ﴿ وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی جو ذات پاک ایسا ہے، وہی سارے ممکنات پر قادر ہے۔ ﴿ وَاَنَّ السَّاعَةَ ... الخ ﴾ یعنی یہ دلائل جو مذکور ہوئے، اس لیے ہیں تاکہ تم جان لو اس بات کو کہ قیامت ہونے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور وہ حق ہے اور بعث بعد الموت حق ہے۔[2]

فتح البیان اور فتح القدیر کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جملہ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ مستأنفہ ہے، جبکہ اللہ پاک نے یہ ذکر فرمایا کہ ساری موجودات اسی کی محتاج اور نیاز مند ہیں اور اس نے اپنے ارادہ و اقتدار کے موافق ان کو مسخر و مطیع کیا ہے تو اس کے بعد یہ باتیں ذکر فرمائیں: وہ یہ ہیں کہ ثابت کرنا اس امر کا کہ اللہ پاک ہی حق ہے۔ دوسری یہ کہ مُردوں کو زندہ کرنا، صرف اسی اکیلے کا کام ہے۔ تیسری یہ ہے کہ اشیا میں سے ہر شے پر قادر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان امور کو اکیلا وہی انجام دے سکتا ہے اور وہ اسی کی شان سے ہیں۔ اس کا غیر اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُن میں سے کسی شے پر قادر ہے۔ پس اللہ پاک نے اس سے یہ بات بتائی کہ حق حقیقی و غنی مطلق وہی ہے اور ہر موجود شے کا وجود اسی کا مرہونِ منت ہے۔ حق وہ موجود ذات ہے، جو کہ تغیر و زوال پذیر نہیں ہو سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ حق کے معنی یہ ہیں کہ صاحبِ حق ہے اپنے بندوں پر۔ کسی نے کہا ہے کہ حق ہے اپنے افعال میں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ موضع رفع میں ہے۔ "أي الأمر ما وصفه لكم و بين بأن الله هو الحق" یعنی بات وہی ہے جو تم سے بیان کر دی کہ حق اللہ ہی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ منصوب ہو۔

پھر اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی کہ ﴿ اَلسَّاعَةَ ﴾ یعنی قیامت آنے والی ہے زمانۂ آیندہ میں۔ کہا ہے کہ یہاں اضمار فعل کا ضرور ہے، یعنی "وَلِتَعْلَمُوْا أَنَّ السَّاعَةَ أٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا" یعنی اس میں کسی طرح کا شک

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٢٨)
[2] تفسير الخازن (٥/ ٥)

وتردد نہیں ہے، پھر اللہ پاک نے بعث کی خبر دی: ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ پھر ان کو ان کے اعمال کی جزا سزا دے گا، خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر اور یہ امر ضرور ہونے والا ہے۔[1] چونکہ آیتِ کریمہ مشکل تھی، اس لیے اکابر مفسرین کی تقریریں لکھ دی گئیں، تاکہ آیت کا مضمون بہ خوبی ذہن نشین ہو جائے ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست

''ہر پھول کا رنگ اور اس کی خوشبو ایک دوسرے سے مختلف ہے۔''

کے مصداق خوب سمجھ میں آجائے۔ اجمال وتفصیل کا فرق اور ہر ایک کے بیان کا تفاوت معلوم ہو جائے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۸ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے بحث کرتے ہیں ⑧ (تکبر کی وجہ سے حق سے) پہلو تہی کرتے ہوئے، تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بہکائے، اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور یومِ قیامت ہم اسے جلانے والا عذاب چکھائیں گے ⑨ (کہا جائے گا:) یہ اس کا بدلہ ہے جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا، اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ⑩

سردارانِ کفر و بدعات کا حال:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس وقت اللہ پاک ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ... الخ ﴾ میں گمراہ جاہل مقلدوں کا حال بیان کر چکا تو اس آیت میں سردارانِ کفر و بدعات کا حال ذکر کیا، جو دوسروں کو گمراہی کی طرف بلاتے ہیں۔ پس فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ... الخ ﴾ یعنی بعضا آدمی وہ ہے جو اللہ پاک کی بات میں بغیر عقلِ صحیح ونقلِ صریح کے، بلکہ صرف رائے اور ہویٰ کے ساتھ جھگڑتا ہے۔ ﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا ہے: "مستكبرا عن الحق إذا دعي إليه" یعنی جب حق کی طرف بلایا جائے تو اس سے تکبر کرتا ہے۔ (أخرج عبد الرزاق و عبد بن حميد و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن قتادة في قوله: ﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ قال: لاوي عنقه، و أخرج ابن أبي حاتم عن ابن عباس والسدي و ابن زيد و ابن جريج أنه المعرض، و أخرج ابن أبي

---

[1] فتح القدير (۳/ ۵۹۶۔ ۵۹۷) فتح البيان (۹/ ۱۷)

حاتم عنه يعني عن ابن عباس قال مستكبراً في نفسه۔ فتح القدير)[1]

امام مجاہد، قتادہ اور مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ ﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ کے معنی ”لاوی عطفه“ ہیں۔ عطف کے معنی رقبہ کے ہیں، یعنی حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس سے اعراض کرتا ہے اور مارے استکبار کے اپنی گردن کو موڑتا ہے۔ اس آیت کی طرح یہ آیتیں ہیں: ﴿ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴾ [الذاريات: ۳۸۔ ۳۹] ”اور موسیٰ (کے قصے) میں (عظیم نشانی ہے) جب ہم نے اسے فرعون کی طرف ایک کھلے معجزے کے ساتھ بھیجا۔ تو وہ اپنی قوت کے بل پر (حق سے) پھرا اور کہا: (موسیٰ) جادوگر یا دیوانہ ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴾ [النسآء: ٦١] ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا، اور آؤ رسول کی طرف، تو آپ منافقوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف آنے سے کتراتے ہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۵] ”اور جب ان سے کہا جائے: آؤ، رسول اللہ تمھارے لیے استغفار کریں، تو وہ (نفی میں) اپنے سر پھیر لیتے ہیں، اور آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ تکبر کرتے ہوئے رک جاتے ہیں۔“ لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا: ﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ ﴾ [لقمان: ۱۸] ”لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [لقمان: ۷] ”اور جب ایسے شخص پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ تکبر کرتے ہوئے پلٹ جاتا ہے، جیسے اس نے وہ سنی ہی نہیں، گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بہرا پن ہو، چناں چہ آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔“ نیز فرمایا: ﴿ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ بعض نے کہا کہ یہ لام لامِ عاقبت ہے، کیوں کہ کبھی وہ اس کا قصد نہیں کرتا ہے۔

(وما يترتب على فعل الفاعل المختار إن كان ترتبه عليه بطريق الاتفاق والإمضاء من غير أن يكون اقتضاء وسببية تسمى اللام الداخلة عليه لام الصيرورة وهي لام العاقبة والمآل كقوله تعالى: ﴿ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ﴾ [القصص: ۲۸] وكقوله سبحانه: ﴿ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴾ ليضل الناس، أي عاقبة كذبه و مصيره إلى الإضلال به وإن كان هناك سببية واقتضاء في نفس الأمر من غير أن يكون حاملا للفاعل عليه وباعثا له يسمى ذلك اللام لام التعليل ذكره أبو البقاء في كلياته)[2] یہ بھی احتمال ہے کہ لام تعلیل کا ہو۔ پھر یا اس

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۷۳۔ ۵۷٤) تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲٤۷٦) فتح القدير (۳/ ٦۰۲) [2] الكليات (۱/ ۷۸۱)

آیت سے مراد معاند لوگ ہیں، یا اس سے یہ مراد ہے کہ اس اضلال کا جو فاعل ہے، ہم نے اس کی جبلت اسی نکمی عادت پر کی ہے، تاکہ ہم اس کو اُن لوگوں میں سے کریں جو اللہ کی راہ سے گمراہ کیا کرتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ﴾۔ ﴿ خِزْيٌ ﴾ اہانت و ذلت کو کہتے ہیں، جس طرح اس نے اللہ پاک کی آیتوں سے استکبار کیا، اسی طرح اللہ نے اس کو دنیا میں مذلت سے ملایا اور آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اس کو معاقب کیا، کیوں کہ اس کا سب سے بڑا مقصد ومنبع علم وہی دنیا تھی، یعنی اس کے علم کا منتہیٰ اور بڑا اہتمام و خیال ومقصود اسی دنیا کا تھا۔ لہٰذا اسی میں اس کو ذلیل کیا۔ ﴿ وَنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ اور چکھائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن جلانے والا عذاب اور دھمکی اور جھڑکنے، یعنی تنبیہ وتادیب اور جھڑکنے اور ڈانٹنے کے لیے اس سے یوں کہیں گے کہ ﴿ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ ﴾ یعنی یہ عذاب بہ سبب اس عمل کے ہے، جس کو تیرے ہاتھوں نے پہلے سے بھیج رکھا ہے۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴾ [الدخان: ٤٧۔ ٥٠] ”(حکم ہوگا:) اسے پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے درمیان لے جاؤ۔ پھر اس کے سر پر تیز گرم پانی کا عذاب انڈیلو۔ (مزہ) چکھ! بے شک تو بڑا عزت والا، بڑا تکریم والا (بنا پھرتا) تھا۔ بلاشبہ یہی وہ (عذاب) ہے جس میں تم شک کرتے تھے۔“ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ایک ان کا دن میں ستر ہزار بار جلایا جائے گا۔[1] نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِهٖ وَعَذَابِ النَّارِ.

اس آیتِ کریمہ کے شانِ نزول میں تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی ہے، جس طرح کہ اگلی آیت کا نزول اسی کے بارے میں ہوا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

(أخرج ابن أبي شيبة و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم في قوله: ﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ قال يعني ابن عباس رضی اللہ عنہما: أنزلت في النضر بن الحارث و أخرج ابن مردوية عنه في الآية، قال: هو رجل من بني عبد الدار، فتح القدير)[3]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو اول لکھا ہے،[4] غرض کہ اس قول کی بنا پر یہ آیت مکرر ٹھہری تو تکرار کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے۔ پس فائدہ تکرار کا دو امر ہیں: ایک تو مذمت میں مبالغہ ہے، مثلاً: جس آدمی کی تو مذمت کرتا ہے اور اس کو توبیخ کرتا ہے اور اس کو ڈانٹتا دھمکاتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ”أنت فعلت هذا۔ أنت فعلت هذا“، یعنی مذمت اور سرزنش کے لیے بار بار اس سے کہتا ہے کہ تو نے یہ کیا، تو نے یہ کیا۔ دوسرا امر یہ ہے کہ پہلی آیت سے اس آیت میں زیادتی ہے، کیوں کہ پہلی آیت میں صرف اس قدر تھا کہ علمی ونظری سند کے بغیر جھگڑتا ہے اور اس آیت میں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٦) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٧٨۔ ٢٧٩)
[2] تفسير الخازن (٥/ ٥)
[3] فتح القدير (٣/ ٦٠٢)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٣)

یہ ذکر کیا ہے کہ اس کے جھگڑے میں اس کے پاس نہ کوئی سند ہے نہ عقلی دلیل ہے اور نہ ہی آسمانی وحی ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ [الحج: ۷۱] ''اور وہ (مشرک) اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہیں جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور جس کا انھیں کچھ علم نہیں اور (ان) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔'' بہت سے مفسرین اسی قول کے قائل ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابوجہل کے حق میں اتری ہے۔ علامہ نسفی اور امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[1] تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی آیت تابعین مقلِدین بکسرِ لام کے حق میں وارد ہوئی ہے۔

یہ آیت متبوعین اور مقلَدین بفتحِ لام کے باب میں نازل ہوئی ہے، کیوں کہ دونوں فریق میں سے ہر ایک فریق پر یہ بات صادق آتی ہے کہ ﴿ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ اگرچہ اُن میں سے ایک تابع ہے اور دوسرا وہ جس کی تابعداری کی جاتی ہے۔ اس قول کی تائید اس سے ہوتی ہے: ﴿ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کیوں کہ گمراہ کرنے والا وہ ہے جس کی تقلید اور اتباع کی جائے، وہ نہیں جو اتباع کرنے والا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو بھی ذکر کیا ہے۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ یہ قول اوفق و اظہر بمقام ہے۔[2]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول بے وجہ ہے، جس طرح وہ قول بے وجہ ہے جس نے یہ کہا ہے کہ پہلی آیت خاص ہے متبوعین کے اپنے تابعین کو گمراہ کرنے کے ساتھ اور دوسری آیت ہر گمراہی اور جھگڑے میں عام ہے۔ علامہ شوکانی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو لوگوں کو گمراہ کرنے اور بہکانے کا ارادہ کرتا ہے۔[3] بہر حال اعتبار اس کا ہے جس پر لفظ دلالت کرتا ہے، گو سبب خاص ہی کیوں نہ ہو۔ معنی لفظ کے یہ ہیں کہ لوگوں میں سے ایک ایسا فریق ہے کہ اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتا ہے پس اس میں ہر جھگڑا کرنے والا شامل ہے، جو کہ اللہ کی ذات یا صفات یا شریعتِ واضح میں جھگڑتا ہے۔ "وَمِنْهُمْ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ"، یعنی اللہ کی شان میں جھگڑتا ہے، جس طرح کہ بعض نے کہا ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بعض نے کہا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور کسی نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی صفات میں جھگڑتا ہے، وہ اس کا وصف ان صفتوں کے ساتھ کرتا ہے، جو اس کی نہیں ہیں۔[4]

﴿ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ حال ہے ﴿ يُجَادِلُ ﴾ کی ضمیر سے، یعنی "كائنا بغير علم"۔ علم سے مراد علمِ فطری ضروری بدیہی ہے، تاکہ اس پر ہدیٰ اور کتابِ منیر کا عطف صحیح ہو، اس لیے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٧) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٦) الكشاف (٣/ ١٤٦۔ ١٤٧)

[3] فتح القدير (٣/ ٥٩٩) [4] تفسير النسفي (٣/ ٩٧)

چاہیے۔ ہدیٰ و کتاب بھی علم ہیں، مگر یہ دونوں کسبی علم ہیں۔ ہدیٰ سے مراد استدلال ہے اور کتاب سے مراد وحی ہے۔ استدلال کو ہدیٰ اس لیے کہا کہ استدلال ہادی و موصل ہوتا ہے مطلوب کی طرف یا معرفت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ کتاب کو منیر اس لیے کہا ہے کہ جو علم اللہ پاک کی وحی سے حاصل ہوتا ہے وہ انتہائی ظاہر و باہر و روشن ہوتا ہے، یہ علم سب علموں سے بڑھا ہوا ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں ہوتا۔ فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ علم کو عموم پر محمول کیا جائے اور ﴿ هُدًى ﴾ اپنے لغوی معنی پر محمول ہو۔ ﴿ هُدًى ﴾ کے لغوی معنی ارشاد ہیں اور ﴿ كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴾ سے قرآن شریف مراد ہے۔ ﴿ مُّنِيْرٍ ﴾ کے معنی "النير البين الحجة الواضح البرهان" ہیں۔

﴿ كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴾ اگرچہ ﴿ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ کے تحت میں داخل ہے، لیکن اس کو علاحدہ کر کے ذکر کیا، جس طرح کہ ملائکہ کے ذکر کے بعد جبرئیل علیہ السلام کا علاحدہ ذکر کیا، یہ اس لیے ہے کہ کتابِ منیر فردِ کامل ہے اور افرادِ علم پر فائق ہے اور جس شخص نے علم کو ضروری علم پر اور ﴿ هُدًى ﴾ کو علمِ استدلالی پر محمول کیا ہے، یعنی جیسے: امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ وغیرہما مفسرین میں سے۔ اس نے کتاب کو دلیلِ سمعی پر محمول کیا ہے، اس صورت میں آیت نفی دلیل عقلی کو شامل ہوگی ضروری ہو یا استدلالی اور شامل ہوگی نفی دلیل نقلی کو اس کے اقسام کے ساتھ۔ ہم نے جو ذکر کیا ہے وہ اولیٰ ہے۔[1]

﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ حال ہے ﴿ يُّجَادِلُ ﴾ کی ضمیر سے۔ "ثنٰی" کے معنی موڑنا ہیں۔ عامہ نے ﴿ عِطْفِهٖ ﴾ کو بکسرِ عین مہملہ پڑھا ہے۔ "عطف" کے معنی جانب ہیں۔ "عطفا الرجل" آدمی کی دائیں بائیں جانبوں کو کہتے ہیں۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ "عطف" بکسرِ عین وہ جانب ہے، جس کو آدمی کسی شے سے اعراض کرتے وقت موڑتا یا جھکاتا ہے اور "ثنی عطف" عبارت ہے تکبر و خیلا (گھمنڈ) سے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ثَانِيَ ﴾ کی اضافت ﴿ عِطْفِهٖ ﴾ کی طرف اضافتِ لفظی ہے، جیسے ﴿ مُّمْطِرُنَا ﴾ کی اضافت ہے، معنی یہ ہیں "مُعْرِضًا" فتح القدیر میں ہے کہ اس کی تفسیر میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد اس سے وہ شخص ہے جو اِترانے کے لیے اور تکبر کے مارے اپنی گردن کو موڑتا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کے معنی ذکر کیے ہیں اور کہا ہے کہ اس صفت کے ساتھ متکبر موصوف ہوتا ہے اور معنی یہ ہیں کہ لوگوں میں سے وہ شخص ہے کہ اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے، اس حالت میں کہ تکبر کرنے والا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "العطف ما انثنى من العنق" دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ ثَانِيَ عِطْفِهٖ ﴾ سے مراد اِعراض، یعنی منہ پھیرنا ہے۔ "أي معرضا عن الذكر" یعنی وعظ و نصیحت سے اعراض کرتا ہے۔ امام فراء اور مفضل رحمہما اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ﴾ [لقمان: ٧] "تو وہ تکبر

---

[1] فتح القدیر (٣/ ٥٩٩) فتح البیان (٩/ ١٨۔ ١٩)

کرتے ہوئے پلٹ جاتا ہے، جیسے اس نے وہ سنی ہی نہیں۔'' نیز یہ فرمان: ﴿ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ ﴾ [المنافقون: ٥] ''تو وہ (نفی میں) اپنے سر پھیر لیتے ہیں۔'' نیز یہ فرمان: ﴿ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ﴾ [حٰمٓ السجدة۔ ٥١] ''تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور کنارہ کش ہو جاتا ہے۔''[1]

امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ ''لاویٰ عنقه تكبرا عن الإيمان''[2] مدارک میں ''لاويا عنقه عن طاعة الله تكبرا و خيلاء'' ہے[3] اور امام خازن رحمہ اللہ میں ''لاویٰ جنبه وعنقه متبخترا لتكبره معرضا عما يدعى إليه من الحق تكبراً''[4] اس پر جمل نے کہا ہے کہ جانب بہ معنی ''جنب'' ہے، یعنی پہلو، کوئی ضرورت نہیں کہ لفظ کو اس کے ظاہر سے پھیرا جائے اور عطف کو عنق پر محمول کیا جائے۔ عطف کو اس کے ظاہر پر رکھنے سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ ''ثنیٰ عطف'' اعراض سے کنایہ ہے۔ پھر لغت کی کتابوں سے یہ ثابت کیا۔ مختار میں ہے: ''عطفا الرجل'' آدمی کی دو جانب کو کہتے ہیں، اس کے سر سے لے کر دونوں سرین تک اور اسی طرح ''عطفا كل شيء'' ہر شے کی دونوں جانب کو بولتے ہیں: ''وثنیٰ عطفه عنه'' کے یہ معنی ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں سے اعراض کیا۔[5]

مصباح میں ہے: ''جنب الإنسان'' جو اس کی بغل کے نیچے سے لے کر پہلو تک ہے، اصل کا لفظ ''کشح'' ہے۔ (''کشح'' بہ معنی تھیگاہ ہے۔) اس کی جمع جنوب ہے، جیسے فلس کی جمع فلوس ہے اور جانب ناحیہ کو کہتے ہیں اور ''جنب'' کے معنی میں بھی آتا ہے، کیوں کہ ''جنب'' ایک ناحیہ ہے شخص کا۔[6] حسن رحمہ اللہ نے ''عطفه'' بفتح عینِ مہملہ پڑھا ہے۔ عطف ہے بہ معنی تعطف وبرّ۔[7] یعنی قاسی القلب سخت دل ہے کہ اپنے تعطف و بر واحسان کا موڑنے والا ہے، یعنی اس کا مانع ہے۔

قساوت (دل کی سختی) کے مارے اپنے غیر پر احسان نہیں کرتا، کسی کو کچھ خیر نہیں پہنچاتا۔ غرض کہ آدمی کو انھیں تین وجوہ سے علم حاصل ہوتا ہے: فطری ضروری بدیہی ہو یا نظری، استدلالی یا سمعی نقلی، وحیِ الٰہی، انھیں علوم سے انسان جھگڑتا ہے۔ لہٰذا بعضا آدمی نضر بن حارث ہو یا ابو جہل یا اور کوئی ''مُضِلٌّ'' ایسا ہے کہ اللہ پاک کی ذات وصفات میں جھگڑتا ہے، حالانکہ مقدمۂ ضروری ونظری وسمعی سے خالی وعاری ہے، ان علوم میں سے کوئی حجت اس کے پاس نہیں ہے۔

جدال کرتا ہے اس حال میں کہ مارے تکبر و اِترانے کے ایمان اور طاعتِ الٰہی اور وعظ ونصیحت سے اپنا پہلو موڑتا ہے، اِن اُمور سے منہ پھیرتا ہے۔ اس جدال سے اس کی غرض یہ ہے: ﴿ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی تاکہ لوگوں کو دین سے گمراہ کرے۔ فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ حرفِ لام ﴿ يُجَادِلُ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اس

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٩٩) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤) [3] تفسير النسفي (٣/ ٩٧) [4] تفسير الخازن (٥/٥)
[5] مختار الصحاح (١/ ٤٦٧) [6] المصباح المنير (١/ ٦١) [7] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ٢٧)

کی غرض اللہ کی راہ سے گمراہ کرنا ہے، گو وہ اس کا اقرار نہ کرے۔ کسی نے ﴿ لِيُضِلَّ ﴾ کو بفتحِ یا پڑھا ہے، اس بنا پر کہ حرفِ لام لامِ عاقبت ہے، گویا اس کی گمراہی اس کے جدال کی غرض و غایت ٹھہرائی گئی۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قراءت کو ابن کثیر، ابو عمرو اور رویس رحمہم اللہ کی طرف منسوب کیا ہے،[2] چوں کہ اس قراءت پر یہ بات وارد ہوتی تھی کہ وہ مجادلہ کرنے والا ہدایت یافتہ نہ تھا کہ بہ سببِ جدال کے ہدایت سے گمراہی کی طرف نکل جائے، اس لیے یوں کہا ہے کہ جو دلائل و آیات قائم کیے گئے، ان میں غور و فکر کر کے ہدایت پانے پر قدرت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے ان کو ترک کیا، ان سے منہ پھیرا اور باطل کے ساتھ جھگڑنے پر متوجہ ہوا تو وہ ایسا قرار دیا گیا، جیسے کوئی ہدایت سے گمراہی کی طرف نکلے۔ پھر یہ بات وارد ہوتی تھی کہ جدال سے اس کی غرض یہ نہ تھی کہ خود ہدایت سے گمراہ ہو، یا اپنے غیر کو اس سے گمراہ کرے۔ پس ﴿ لِيُضِلَّ ﴾ کیوں فرمایا؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ جب گمراہی کا انجام اس کے جدال پر مترتب تھا، اس لیے اس کی مطلوبہ غرض کو ضلال کے ساتھ تشبیہ دی گئی، یعنی جبکہ اس کے جدال کی عاقبت گمراہی ٹھہری، تو گویا جدال سے اس کی مطلوبہ غرض یہی گمراہی تھی، اس واسطے لام علت کا لایا گیا۔

جملہ ﴿ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ﴾ مستأنفہ ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ اس کو جدالِ باطل کی کیا سزا ملی؟ لہٰذا اس کا یہ جواب ہے کہ جدال کے سبب سے دارین میں اس کو عقوبت حاصل ہوئی۔ ﴿ خِزْيٌ ﴾ ذلت و رسوائی کو کہتے ہیں۔ پس دنیا کی ذلت تو یہ ہوئی کہ دنیا میں عجلت کا عذاب اس کو پہنچا اور لوگوں کی زبانوں پر برائی کے ساتھ اس کا ذکر جاری ہوا۔ امام محلی، نسفی اور خازن رحمہم اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ خزیِ دنیا سے مراد قتل ہے،[3] کیوں کہ نضر بن حارث اور ابو جہل بدر کے دن دونوں مارے گئے اور جو شخص اس کا قائل ہے کہ کسی معین شخص کے حق میں آیت کا نزول نہیں ہوا ہے تو اس نے خزیِ دنیا کو اس پر محمول کیا ہے کہ مراد مومنین کا مذمت کرنا لعنت کرنا اور قہر کرنا ہے کفار کو، کیوں کہ خزی توہین اور فضیحت کو کہتے ہیں۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ خزی قتل ہی سے ہو۔

رہی آخرت کی عقوبت تو اس کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴾ حریق بہ معنی محرق صفت آگ کی ہے، یعنی جلانے والی آگ کا عذاب۔ یہ بھی جائز ہے کہ اضافت موصوف کی طرف ہو۔ اصل یہ ہے: ''العذاب الحریق''، یعنی محرق جس طرح کہ سمیع بہ معنی مسمع آتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اِس کو اضافتِ مسبب سے طرف سبب کے قرار دیا ہے اور حریق بہ معنی محرق سے نار مراد لی ہے۔[4] امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ حریق طبقاتِ جہنم میں سے ایک طبقہ ہے۔[5] نعوذ باللّٰہ منہا.

---

[1] فتح القدير (٣/ ٥٩٩) فتح البيان (٩/ ١٩) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٦)

[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤) تفسير النسفي (٣/ ٩٧) تفسير الخازن (٥/ ٥)

[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٦) [5] بحر المحيط (٦/ ٣٢٩)

﴿ ذٰلِكَ ﴾ اشارہ ہے عذابِ دنیوی و اُخروی کی طرف اور مبتدا ہے، اس کی خبر ﴿ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ ﴾ ہے۔ حرفِ با سببیت کے واسطے ہے اور غیب سے حاضر کی طرف التفات ہے۔ یا قولِ مقدر ہے، یعنی قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ یہ عذاب جو تجھ پر نازل ہوا ہے، اس کفر اور معاصی کے سبب سے ہے، جس کو تو نے آگے بھیجا ہے۔ شخص کی تعبیر یدین کے ساتھ کی، اس لیے کہ اکثر افعال انھیں ہاتھوں سے ہوتے ہیں۔ امام کرمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت کے علاوہ اور سورتوں میں ﴿ اَيْدِيْكُمْ ﴾ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت تنہا ابو جہل کے حق میں اُتری ہے اور دوسری سورت میں اُس آیت کا نزول ایک جماعت کے حق میں ہوا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ﴿ اَنَّ ﴾ وما بعد کا محل۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ میں رفع ہے۔ اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أي والأمر أنه سبحانه لا يعذب عباده بغير ذنب"[1] یعنی یہ بات ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کو بغیر گناہ کے عذاب نہیں کرتا۔

امام حفناوی اور نسفی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَاَنَّ... الخ ﴾ "ما" پر معطوف ہے: "أي: بِأَنَّ اللّٰهَ"[2] یعنی محلِ جر میں حرفِ با کے تحت میں ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا اور آخرت کا عذاب اس بات کے سبب سے ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا کہ کسی کو بغیر گناہ کے پکڑے، یا دوسرے کے گناہ کا اس سے مواخذہ کرے وہ تو اُن کو انھیں کے اعمال کا بدلہ دے گا، حالاں کہ اللہ پاک مالک ہے اپنے بندے کا اور وہ اپنی ملک میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اس کا حکم عدل و انصاف ہی ہے اور وہ ظالم نہیں ہے۔ وہ ذرہ برابر کسی پر ظلم روا نہیں رکھتا، ہر خیر و شر کی پوری پوری کانٹے کی تول جزا و سزا دیتا ہے۔ کیا مجال ہے کہ ذرا سی کمی و بیشی ہو۔ اگر کوئی کہے ظاہر یہ تھا کہ "لَيْسَ بِظَالِمٍ لِلْعَبِيْدِ" فرمایا ہوتا، تا کہ اصل ظلم کی نفی کو مفید ہوتا۔ صیغۂ مبالغہ کی نفی اصل نفی ظاہر نہیں کرتی، بلکہ زیادتی کی نفی ہوتی ہے اور اصل باقی رہ جاتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اصل ظلم کی نفی ہے۔ مبالغہ کا لفظ "عَبِيْد" کی کثرت کی وجہ سے ذکر فرمایا ہے، یا اس لیے کہ اللہ پاک کی طرف سے قلیل ظلم باوجود اس کے کہ وہ ظلم کی برائی جانتا ہے اور مستغنی ہے، ہمارے بہت زیادہ ظلم کی طرح ہے۔ اوّل وجہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے قول کی تفصیل ہے اور دوسری وجہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے۔[3] بالجملہ جب کہ اللہ پاک نے اُن لوگوں کا حال بیان کیا جو کہ شرک کو کھلم کھلا ظاہر کرتے تھے اور اس میں جھگڑتے تھے تو اس کے بعد متزلزل اور مذبذب لوگوں کے حال کا ذکر کیا۔ پس ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ
اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ قف

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٠٠) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٧) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٦) تفسير النسفي (٣/ ٩٧)

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ يَدْعُوْا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ
الْبَعِيْدُ ۝ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى
وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝

اور لوگوں میں سے کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے (شک) پر، پھر اگر اسے بھلائی مل گئی تو اس پر مطمئن ہوگیا، اور اگر اسے کوئی آزمائش آپڑی تو اپنے چہرے کے بل پلٹ جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت میں خسارہ اُٹھایا، یہی کھلا خسارہ ہے (11) وہ اللہ کے سوا اسے پکارتا ہے جو اسے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ اسے نفع دے سکتا ہے۔ یہی دور کی گمراہی ہے (12) وہ اسے پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بلاشبہہ وہ برا کارساز ہے اور بلاشبہہ وہ برا ساتھی ہے (13)

کنارے پر رہ کر عبادت کرنے کا مفہوم:

کنارے پر عبادت کرنا ایسا ہے کہ دنیا کی نیکی پائے تو بندگی پر قائم رہے اور تکلیف پائے تو چھوڑ دے۔ اِدھر دنیا گئی اُدھر دین گیا، کنارے پر کھڑا ہے، یعنی دل ابھی نہ اِس طرف ہے نہ اُس طرف ہے، جیسے کوئی مکان کے کنارے کھڑا ہے، جب چاہے نکل جائے۔ انتہی۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما کے نزدیک ﴿ حَرْفٍ ﴾ سے مراد شک ہے۔[1] اُن کے سوا اور لوگوں نے کہا ہے کہ ﴿ حَرْفٍ ﴾ کے معنی طرف ہیں، اسی معنی سے طرفِ کوہ کو حرف کہتے ہیں، یعنی وہ شخص دین میں داخل ہوا ہے کنارے پر، پس اگر اپنے محبوب سے شے پائی تو جما رہا ورنہ منقبض ہوگیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ آدمی مدینے میں آتا۔ پھر اگر اس کی عورت نے لڑکا جنا اور اس کے گھوڑوں کی اولاد ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ اچھا دین ہے اور اگر اس کی عورت نے نہ جنا اور نہ ہی اس کے گھوڑوں کی اولاد ہوئی تو کہا کہ یہ برا دین ہے۔[2] فتح القدیر میں ہے: "أخرجه البخاري و ابن أبي حاتم و ابن مردوية عن ابن عباس رضي الله عنهما"

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ بدوی لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو مسلمان ہوتے، پھر جب لوٹ کر اپنی بستیوں کو جاتے تو اگر انھوں نے بارش اور سستے کا سال اور اولاد پیدا ہونے کا سال اچھا پایا تو کہتے کہ بے شک یہ ہمارا دین اچھا ہے، پھر اس کو پکڑے رہتے اور اگر انھوں نے خشک سالی اور ولادتِ سوء اور قحط

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٧٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٦) فتح القدير (٣/ ٦٠٢)

سالی پائی تو کہتے کہ ہمارے اس دین میں کوئی خیر نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ باب نازل فرمائی۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم و ابن مردوية عنه بسند صحيح، فتح القدير)

یہ دونوں روایتیں امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے واسطے سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ عوفی کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ اُن میں کوئی مدینے میں آتا اور وہ وبائی زمین تھی، پھر اگر اس کا جسم تندرست رہا اور اس کے گھوڑے نے اچھا بچھڑا جنا اور اس کی عورت نے لڑکا جنا تو دین سے خوش ہوا اور اس کی طرف مطمئن رہا اور کہا کہ جب سے میں اپنے اس دین پر ہوں، مجھے بھلائی ملی ہے اور اگر اس کو فتنہ پہنچا اور فتنہ آزمایش ہے، یعنی اگر اس کو مدینے کی بیماری پہنچی اور اس کی عورت نے لڑکی جنی اور صدقہ اس سے متاخر ہوا تو اس کے پاس شیطان آیا، پس کہا: واللہ! جب سے تو اس دین پر ہے، تجھے برائی کے سوا کچھ نہیں ملا اور فتنہ یہی ہے۔ امام قتادہ، ضحاک، ابن جریج رحمہم اللہ اور بہت سے سلف نے اس آیت کی تفسیر میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ (أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه عنه أيضا نحوه و في إسناده العوفي، فتح القدير)

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شخص منافق ہے، اگر اس کی دنیا اس کے لیے درست ہوئی تو عبادت پر قائم رہا اور اگر اس کی دنیا اس پر فاسد ہوئی اور متغیر ہوگئی تو پھر گیا۔ پس وہ عبادت پر صرف اسی لیے قائم رہتا ہے کہ اس کی دنیا بن گئی، پھر اگر اس کو کوئی فتنہ پہنچا یا کچھ سختی یا امتحان یا تنگی، تو اس نے اپنا دین چھوڑ دیا اور کفر کی طرف پھر گیا۔ نعوذ بالله منه۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ﴾ "أي ارتد كافرا"[2] یعنی لوٹ کر پھر کافر ہوگیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ﴾ یعنی پھر نہ دنیا سے اسے کوئی چیز حاصل ہوئی۔ رہی آخرت سو اللہ عظیم کا منکر ہی ہو چکا تو آخرت میں تو انتہا درجے کی بدبختی اور توہین میں ہوگا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی یہ بڑا ہی خسارہ وصفقۂ خاسرہ ہے کہ دنیا بھی گئی اور دین، جو راس المال تھا، وہ بھی گیا۔ وہی ہندی مثل پوری ہوئی کہ دو دین سے گئے پانڈے، نہ حلوا ملا نہ مانڈے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ﴾ یعنی اللہ کے سوا بتوں اور اللہ کے شریکوں سے فریاد رسی کرتا ہے، بتوں سے مدد اور رزق مانگتا ہے، حالانکہ نہ وہ اس کو نفع پہنچا سکیں نہ اس کو ضرر پہنچا سکیں۔ ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ یعنی یہ بڑی دور کی گمراہی اور پرلے درجے کی بے وقوفی ہے کہ عاقل بالغ آدمی ایسے سے روزی مانگے، مدد چاہے اور فریاد رسی کرے، جو نہ سنے نہ بولے، وہ کیا خاک فریاد رسی کرے گا؟!

﴿ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ﴾ یعنی دنیا میں آخرت سے قبل اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٦) فتح القدير (٣/ ٦٠٢)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٧٥۔ ٥٧٧) تفسير ابن أبي حاتم (٢٤٧٧) فتح القدير (٣/ ٦٠٢)

نزدیک ہے۔ رہی آخرت تو اس میں تو اس کا ضرر یقینی اور حقیقی ہے۔ ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وثن ہے،[1] یعنی یہ شے جس کو اس نے اللہ کے سوا پکارا ہے بُرا ولی اور ناصر ہے اور "بِئْسَ الْعَشِيْرُ" سے مخالط و معاشر مراد ہے، یعنی صاحب، ساتھی، دوست اور مددگار، جو شب و روز خلط ملط رکھتا ہے، ملتا جلتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ مراد یہ ہے: "لبئس ابن العم والصاحب ﴿ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ﴾" امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول کہ اس سے مراد وثن ہے، سیاقِ کلام کے قریب تر ہے۔[2] والله أعلم كذا في ابن كثير.

فتح القدیر و فتح البیان میں آیتِ باب کے شانِ نزول میں ایک یہ روایت لکھی ہے کہ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہود کا ایک آدمی اسلام لایا تو اس کی بینائی اور مال و اولاد سب جاتی رہی، پس اس نے اسلام کو شوم سمجھا، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، عرض کی: "أقلني، أقلني" یعنی مجھ سے اسلام پھیر لو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام پھیرا نہیں جاتا۔ وہ بولا کہ میں اپنے اس دین میں کسی خیر کو نہیں پہنچا، میری بینائی جاتی رہی اور میرا مال گیا اور میری اولاد مرگئی۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے یہودی! اسلام گلاتا ہے مردوں کو جس طرح آگ لوہے اور سونے چاندی کے میل کو گلاتی ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾[3] (أخرجه ابن مردويه من طريقه يعني طريق العوفي)

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ حرف سے مراد شک ہے، اصل اس کی حرفِ شے سے ہے۔ حرفِ شے کنارۂ شے کو کہتے ہیں، جیسے: پہاڑ کا کنارہ، دیوار کا کنارہ۔ پس جو شخص دیوار کے کنارے پر یا کنارۂ کوہ پر کھڑا رہتا ہے، وہ قرار پذیر نہیں ہوتا اور جو شخص کہ اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے پر، یعنی اپنے دین میں قلق و اضطراب پر ہے، ثابت قدم اور مطمئن نہیں ہے، ایسا شخص اس شخص کی مانند ہے جو کنارۂ کوہ وغیرہ پر ہوتا ہے، بے چین و بے قرار ہوتا ہے اور اس کا قیام ضعیف ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص اپنے دین میں شک کرنے والا ہے، اس کو یوں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کنارے پر کرتا ہے، کیوں کہ وہ اللہ پاک کے وعدے اور وعید پر یقین نہیں رکھتا بخلاف مومن کے، کیوں کہ وہ یقین اور بصیرت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ کنارے پر نہ ہوا۔[4]

امام ابوحیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے، یعنی ایسا شخص کمزور یقین رکھتا ہے اور عقیدے سے انحراف پر ہے اور دین کے کنارے پر ہے، دین کے وسط اور قلب میں نہیں ہے۔[5] شیخ زادہ کا حاصل یہ ہے کہ حرف و ناحیہ و وسط و

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٧٩)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٧٨۔ ٥٧٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٧٩۔ ٢٨٠)
[3] فتح القدير (٣/ ٦٠٢) فتح البيان (٩/ ٢١)
[4] فتح القدير (٣/ ٦٠٠)
[5] البحر المحيط (٦/ ٣٢٩)

طرف اجسام کے اوصاف میں سے ہیں استعارہ تمثیلیہ کے طور پر دین کا وصف اس کے ساتھ کیا ہے، جو شخص کہ اللہ کی عبادت اس حال میں کرتا ہے کہ اپنے دین میں قلق پر ہے، ثابت قدم اور مطمئن نہیں ہے اس کے حال کی تشبیہ اس شخص کی حالت سے دی، جو لشکر کے کنارہ پر ہے، اگر اس نے کامیابی اور غنیمت کے ملنے کا احساس کیا تو ٹھہرا رہا، ورنہ بھاگ گیا۔ علامہ نسفی اور بیضاوی رحمہما اللہ کا حاصل بھی اسی طرح ہے۔

﴿ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ حال ہے ﴿ يَعْبُدُ ﴾ کی ضمیر سے، یعنی "يعبد الله مضرباً متزلزلًا"۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ حَرْفٍ ﴾ بہ معنی شرط ہے، یعنی بعضا آدمی اللہ کی شرط پر عبادت کرتا ہے، وہ شرط یہ ہے: ﴿ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ ﴾ یعنی اگر اس کو کوئی دنیوی بھلائی پہنچی، جیسے: صحت وسلامتی جان و مال کی اور فراخی و عافیت اور کثرتِ مال تو اپنے دین پر ثابت قدم رہا اور عبادت کرتا رہا یا جو خیر اس کو ملی، اس سے اس کا دل مطمئن ہوا۔ ﴿ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ ﴾ یعنی اور اگر اس کو کوئی فتنہ پہنچا، یعنی کوئی ایسی شے جس سے اس کا امتحان کیا جائے، مثلاً: کوئی ناپسندیدہ بات اس کے اہل یا مال یا جان میں پہنچی تو ﴿ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ﴾ تو مرتد ہوگیا اور اسی کفر کی طرف لوٹ گیا، جس پر پہلے تھا۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اس جگہ فتنے سے مراد وہ شے ہے جس کو طبیعت ناپسند کرتی ہے اور جان پر گراں گزرتی ہے، جیسے: قحط، بیماری اور باقی تکالیف اور اگر یہ مراد نہ ہو تو درست نہیں ہے کہ فتنہ کو خیر کے مقابل ٹھہرایا جائے، کیوں کہ خیر بھی ایک قسم کا فتنہ اور امتحان ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [الأنبياء: ٣٥] "اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے برائی اور بھلائی سے آزماتے ہیں۔"[1]

رہی یہ بات کہ "إِنْ أَصَابَتْهُ شَرٌّ" نہ فرمایا، باوجود اس کے کہ شر خیر کا مقابل ہے۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شے سے طبیعت نفرت کرتی ہے، وہ فی نفسہٖ شر نہیں ہے، بلکہ بہ شرطِ تسلیم و رضا بالقضا کے وہ تو قربت کا سبب ہے اور درجے کی بلندی کا سبب ہے۔ پھر جب وہ اپنی اگلی حالت پر پھر گیا تو اللہ پاک نے اس کا حال بیان کیا کہ انقلاب کے بعد اس کی یہ گت ہوئی: ﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ﴾ یعنی دنیا اور آخرت دونوں اس سے جاتی رہیں، دونوں گم ہوگئیں، نہ دنیا میں اس کا کوئی فائدہ ہوا، نہ غنیمت ہاتھ آئی، نہ تعریف ہوئی نہ آخرت میں اجر ملا۔ نہ وہ حاصل ہوا جو اللہ پاک نے اپنے صالح بندوں کے واسطے تیار کر رکھا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: دنیا کا نقصان یہ ہوا کہ عصمت جاتی رہی، یعنی اسلام کے سبب سے معصوم الدم (اس کا خون حرام) ہوگیا تھا، اب مرتد ہونے کی وجہ سے حلال الدم (اس کا خون حلال) ہوگیا۔ آخرت کا نقصان یہ ہوا کہ مرتد ہونے کے سبب سے اس کا عمل ضائع ہوگیا۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: دنیا کا خسران بہ سبب قتل کے ہوا اور آخرت کا نقصان آگ میں ہمیشہ رہنے کے سبب سے ہوا۔[3] کسی

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٦۔ ١١٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٧) [3] تفسير النسفي (٣/ ٩٧)

نے کہا ہے کہ دنیا کا نقصان یہ ہوا کہ جس بات کی اُمید کی تھی، وہ فوت ہوگئی، یعنی کثرتِ مال و اجتماع باحباب یا عزت و کرامت و حصولِ غنیمت و اہلیتِ شہادت و امامت وقضا۔ عامہ کی قراءت "خَسِرَ" بصیغۂ فعل ماضی ہے، اس میں تین وجوہ ہیں۔ جملہ مستأنفہ ہے یا جملہ حالیہ ہے فاعل ﴿ انْقَلَبَ ﴾ سے۔ صحیح مذہب کی بنا پر تقدیر "قد" کی حاجت نہیں ہے۔ یا بدل ہے ﴿ انْقَلَبَ ﴾ سے، جس طرح کہ "يلق أثاما يضاعف" میں مضارع بدل آیا ہے۔ (قاله السمين)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے حالیت کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ "قد" مقدر ہے، دلیل اس کی قراءتِ روح و زید ہے۔ "خاسر الدنيا والآخرة"[1] اسی طرح امام مجاہد، حمید بن قیس، اعرج، زہری اور ابن ابی اسحٰق رحمہم اللہ نے بھی بصیغۂ اسم فاعل منصوب بنا برحال پڑھا ہے۔ کسی نے برفع خاسر بھی پڑھا ہے اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے،[2] یعنی "هو خاسر الدنيا والآخرة" یا اس بنیاد پر کہ ﴿ انْقَلَبَ ﴾ کا فاعل ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اسمِ ظاہر کو بجائے ضمیر کے رکھا، کیوں کہ ظاہر بات یہ تھی کہ ﴿ انْقَلَبَ ﴾ میں ضمیر ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف راجع ہوتی، پس "خسرانِ منقلب" پر تصریح کرنے کے لیے "خاسر الدنيا و الآخرة" کو ﴿ انْقَلَبَ ﴾ کا فاعل ٹھہرایا۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ہے خسرانِ دنیا و آخرت کی طرف اور مبتدا ہے۔ اس کی خبر ﴿ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ ہے۔ یعنی یہ خسران دنیا و آخرت کا۔ یہی ظاہر و واضح خسران ہے، جس کی طرح اور کوئی خسران نہیں ہے۔ فصل کی ضمیر اس پر دال ہے کہ خسرانِ بین اسی خسران میں منحصر ہے۔

﴿ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ﴾ یعنی یہ شخص جو اپنی جہت پر منقلب ہوگیا ہے اور کفر کی طرف پھر گیا ہے، عبادت کرتا ہے اس حال میں کہ تجاوز کرنے والا ہے۔ اللہ کی عبادت کو بتوں کی عبادت کی طرف پوجتا ہے، ایسی شے جو اس کو ضرر نہ پہنچائے، اگر وہ اس کی عبادت نہ کرے اور نہ ہی اسے نفع پہنچائے اگر اس کو پوجے، کیوں کہ وہ معبود تو جماد ہے نہ ضرر پر قدرت رکھتا ہے یا نفع پر۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ہے دعا کی طرف، جو کہ فعل ﴿ يَدْعُوْا ﴾ سے سمجھی جاتی ہے اور مبتدا ہے اس کی خبر ﴿ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ ہے، یعنی یہ پکارنا بڑی دور کی گمراہی ہے حق اور ہدایت سے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بعید" بہ معنی طویل ہے،[3] یعنی بڑی لمبی گمراہی ہے۔

توحید و طاعت وحق کی تشبیہ مساحت حسی سے دی ہے، یعنی اُس راہ سے، جس میں لوگ چلتے پھرتے ہیں اور توحید وغیرہ سے عدول کرنے کی تشبیہ صراطِ مستقیم سے گمراہ ہونے کے ساتھ دی ہے اور عدولِ حق سے علو کرنے کی تشبیہ راہِ حسی سے بُعد کے ساتھ دی ہے، کیوں کہ قرب اور بُعد مسافتِ حسی کے عوارض میں سے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا حال ایسا ہے، جیسے کوئی شخص جنگل میں راہ بھول کر سیدھے راستے سے دور چلا گیا ہو، جس طرح اس کی

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٧) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٠) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ١٨)

مسافت بعید کی گمراہی ہے، اسی طرح اس کی بھی راہِ حق سے دور کی گمراہی ہے۔ ضلالِ بعید بطورِ استعارہ کے فرمایا ہے، یعنی وہ مقصد سے بغایت دور جا پڑا ہے۔

﴿ يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ﴾ اس میں اشکال یہ ہے کہ پہلی آیت میں بتوں سے ضرر و نفع کی نفی کی ہے اور اس آیت میں بتوں کے واسطے اس کا اثبات ہے۔ اس کے کئی جواب ہیں: ایک یہ ہے کہ جب آیت کے معنی سمجھ میں آجائیں گے تو یہ وہم جاتا رہے گا۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے پہلی آیت میں فرمایا ہے: ﴿ مَا لَا يَضُرُّهٗ ﴾ یعنی بت کی عبادت کو چھوڑ دینا عابد کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتا اور ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بت کی عبادت کا ضرر۔ جواب کی دوسری تقریر یہ ہے کہ اول آیت کے معنی یہ ہیں کہ بت بنفسہٖ بذاتہٖ ضرر و نفع نہیں پہنچاتا ہے۔ دوسری کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عبادت ضرر کا سبب ہے، اس قدر بت کی طرف ضرر کی اضافت کرنے میں کافی ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے بتوں کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ﴾ [إبراهيم: ٣٦] ”بے شک انھوں نے بہت سے لوگ گمراہ کیے ہیں۔“ یہاں اضلال کی اضافت بتوں کی طرف اس لیے کی کہ وہ گمراہی کے اسباب ہیں۔ لہٰذا اسی طرح اس جگہ پہلے اُن سے ضرر کی نفی کی، اس معنے میں کہ وہ ضرر کے فاعل نہیں ہیں اور دوسری آیت میں اُن کی طرف ضرر کی نسبت اس معنے میں کی کہ ان کی عبادت ضرر کا سبب ہے اور اسی طرح نفع جو اُن کی طرف منسوب ہے، وہ بھی فی نفسہٖ ان کا نفع نہیں ہے، بلکہ اُن کے عابدوں کے زعم اور توقع میں نفع ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ پاک نے کافر کو سفیہ اور احمق ٹھہرایا ہے، اس لحاظ سے کہ وہ جماد کو پوجتا ہے، جو نہ کسی طرح کے ضرر کا مالک ہے نہ کسی طرح کے نفع کا اور حال یہ ہے کہ وہ اس کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اس کی شفاعت کرے گا۔

پھر فرمایا کہ قیامت کے دن یہی کافر پکار کر چلا کر کہے گا، جس وقت کہ بتوں کے سبب سے اپنا نقصان دیکھے گا اور اسے اُن سے شفاعت کے کوئی آثار نظر نہیں آئیں گے۔ ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى ﴾ یعنی برا ناصر اور صاحب۔ ﴿ وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ اور برا مصاحب۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی جواب کو اختیار کیا ہے۔[1] چوتھا جواب یہ ہے کہ آیت کا اخیر رؤسائے کفار کے حق میں ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف اہم امور میں کفار رجوع کیا کرتے تھے، کیوں کہ ضرر و نفع پہنچانا ان سے درست ہوسکتا ہے۔ اس قول کی حجت یہ ہے کہ اللہ پاک نے پہلی آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ بت نہ ضرر دیتے ہیں نہ نفع پہنچاتے ہیں اور دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا اس میں ذکر ہے، وہ ضار اور نافع ہو، پس جو اس میں مذکور ہے، وہ بت ٹھہریں تو تناقض لازم آئے گا، اس سے ثابت ہوا کہ جو اس میں مذکور ہے وہ رؤسا ہیں، بت نہیں ہیں، بدلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ یعنی ناصر و مصاحب معاشر۔

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٨)

یہ جواب اور پہلے تینوں جواب خازن رحمہ اللہ نے اختصار کے ساتھ ذکر کیے ہیں۔[1] شہاب خفاجی رحمہ اللہ نے انتہائی اختصار کے ساتھ جواب دیا ہے کہ رفع تنافی یوں ہے کہ نفی تو باعتبار اس شے کے ہے جو نفس الامر میں ہے اور اثبات باعتبار ان کے زعمِ باطل کے ہے۔[2] یہ جواب پہلے جوابوں کے ضمن میں ادا ہو چکا ہے۔ اس قول کی تائید میں یہ بات ہے کہ نفی میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ فرمایا ہے، جو کہ غیر عاقل کے لیے ہے، کیوں کہ بت نفس الامر میں بے جان، جماد، غیر عاقل ہیں اور اثبات میں کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ فرمایا، جو کہ عاقل کے لیے ہے، اس واسطے کہ کفار کے زعم میں بت عاقل و نافع و ضار ہیں۔

اس جگہ نحویوں کی رائیں مختلف واقع ہوئی ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ حرفِ لام اپنے ماقبل کے فعل کو مابعد میں عمل کرنے سے معلق کرتا ہے، جبکہ وہ فعل افعالِ قلوب سے ہو، حالاں کہ یہاں ﴿ يَدْعُوْا ﴾ من جملہ افعالِ قلوب نہیں ہے۔ اس باب میں نحویوں کے دو طریق ہیں: ایک طریق یہ ہے کہ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ اپنے مابعد میں نہ لفظاً عامل ہے نہ تقدیراً، اس بنیاد پر اس میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ دوسرا ﴿ يَدْعُوْا ﴾ پہلے ﴿ يَدْعُوْا ﴾ کی تکرار ہے، اس صورت میں اس کے واسطے کوئی معمول نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ بہ معنی "الذي" ہے۔ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ کی وجہ سے موضع نصب میں ہے، یعنی "يدعو الذي هو الضلال"، لیکن مفعول مقدم کیا گیا ہے، یہ بات اس شخص کے قول پر ہے، جس نے "ذا" کو غیر استفہام کے ساتھ ﴿ الَّذِيْ ﴾ کے معنی میں ٹھہرایا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ تقدیر اس طرح ہے کہ "ذلك هو الضلال البعيد يدعوه" پس ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدائے اول اور ﴿ هُوَ ﴾ مبتدائے ثانی یا بدل یا عماد اور ﴿ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ خبر مبتدا اور "يدعوه" حال تقدیر "مدعوًا" ہے، اس وجہ میں ضعف ہے۔ ان وجھوں کی بنیاد پر ﴿ يَدْعُوْا ﴾ کے بعد کا جملہ مستأنفہ ہوگا اور ﴿ مَنْ ﴾ مبتدا، خبر ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى ﴾ ہوگی۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ اپنے مابعد سے متصل ہے۔ اس بنا پر اس میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ یدعو افعالِ قلوب کے مشابہ ہے، کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں: "يسمي من ضره أقرب من نفعه إلها" حالانکہ یہ بات صادر نہیں ہوتی ہے، مگر اعتقاد سے تو گویا یوں کہا کہ ﴿ يَظُنُّ ﴾۔ بہتر یہ ہے کہ تقدیر اس کی "يزعم" ہو۔ قول مع اعتقاد کے ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ بہ معنی ﴿ يَقُوْلُ ﴾ ہے اور ﴿ مَنْ ﴾ مبتدا اور ﴿ ضَرُّهٗٓ ﴾ مبتدائے ثانی۔ ﴿ اَقْرَبُ ﴾ اس کی خبر اور جملہ صلہ ﴿ مَنْ ﴾ کا اور خبر ﴿ مَنْ ﴾ کی محذوف ہے۔ تقدیر اس کی "إله" یا "إلٰهي" ہے اور محل جملے کا نصب ہے قول سے اور ﴿ لَبِئْسَ ﴾ کلامِ مستانف ہے، کیوں کہ حکایت میں اس کا دخول صحیح نہیں ہے اس واسطے کہ کفار اپنے بتوں کی طرف سے ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى ﴾ نہیں کہتے۔ تیسری وجہ امام فراء رحمہ اللہ کا قول ہے، وہ یہ ہے کہ تقدیر "يدعو من نصره" پھر لام اس کی جگہ پر مقدم کیا گیا۔ یہ قول بعید

[1] تفسیر الخازن (٥/ ٦۔ ٧) [2] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٨٥)

ہے، اس لیے کہ جو شے "الذي" کے صلہ میں ہوتی ہے، وہ اس پر مقدم نہیں ہوتی۔[1] (ذکرہ أبو البقا)

فتح القدیر و فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ بہ معنی "يقول" ہے۔ ماقبل میں جو کچھ مذکور ہوا ہے کہ یہ دعا ضلالِ بعید ہے، لہٰذا یہ جملہ اس کی تقریر اور تثبیت کرتا ہے۔ اصنام میں بہرحال کسی طرح کا نفع نہیں ہے، بلکہ وہ تو اُن کے پوجنے والوں کے واسطے خالص ضرر ہیں، کیوں کہ انھیں کے پوجنے سے وہ آگ میں داخل ہوئے۔ رہا صیغۂ تفضیل کا لانا باوجود اس کے کہ بتوں میں بالکل نفع کا نام تک نہیں ہے۔ لہٰذا مبالغہ کرنے کے واسطے تقبیح حال داعی مذکور میں ہے یا ﴿ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [سبا: ٢٤] "اور بلاشبہہ ہم یا تم البتہ ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں۔" کے باب سے ہے۔ حرفِ لام توطۂ قسم کا ہے، یعنی یہاں قسم مقدر ہے، کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہے یا موصوفہ۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے من جملہ استعمال قرآن شریف یہ بات ہے کہ ارادہ جنس کا ہو تو ﴿ مَنْ ﴾ موصوفہ ہوتا ہے اور عہد کا ارادہ ہو تو موصولہ موصوفہ نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے، اس میں تخصیص نہیں ہوتی ہے۔ ﴿ ضَرُّهٗٓ ﴾ مبتدا ہے ﴿ اَقْرَبُ ﴾ اس کی خبر ہے جملہ ہو کر موصول کا صلہ ہوا اور جملہ ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ جواب ہے قسم کا۔ معنی یہ ہیں کہ کہے گا وہ کافر قیامت کے دن قسم ہے اللہ کی، البتہ معبود اس کا جس کا ضرر اس کے نفع سے قریب تر ہے، البتہ برا مولی، یعنی ناصر ہے اور البتہ برا عشیر، یعنی ساتھی ہے۔ تو امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جائز ہے کہ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ موضع حال میں ہو اور ہائے ضمیر اس میں محذوف ٹھہرے، یعنی "ذلك هو الضلال البعيد يدعوه"۔ اس قول کی بنا پر ﴿ يَدْعُوْا ﴾ کے اوپر وقف کیا جائے گا اور ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ﴾ کلامِ مستانف ہوگا۔ مرفوع بابتدا ٹھہرے گا خبر اس کی ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى ﴾ ہوگی۔ جملۂ مستانفہ اس لیے قرار دیا گیا کہ لام واسطے یمین و تاکید کے ہے، اس واسطے اس کو شروع کلام میں رکھا، اس لام کو لامِ ابتدا بھی کہتے ہیں، یہ وہی لام جو مبتدا پر یا "إِنَّ" کی خبر پر داخل ہوتا ہے۔

امام زجاج اور فراء رحمہما اللہ نے کہا جائز ہے کہ ﴿ يَدْعُوْا ﴾ مکرر ہوا اپنے ماقبل پر اس لحاظ سے کہ منظور فعل دعا کی کثرت ہے، یعنی "يدعو ما لا يضره وما لا ينفعه يدعو" جس طرح کہتے ہیں: "ضربت زيدا ضربت"۔ امام فراء، کسائی اور زجاج رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ معنی کلام کے قسم ہیں اور لام اپنے موضع پر مقدم کیا گیا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "يدعو من ضره أقرب من نفعه" اس صورت میں "من" موضع نصب میں ہے "يدعو" سے اور لام جواب ہے قسم کا اور ﴿ ضَرُّهٗٓ ﴾ مبتدا ﴿ اَقْرَبُ ﴾ اس کی خبر۔ لام میں جو تقدیم و تاخیر کے ساتھ تصرف کیا جاتا ہے، اس کا شاہد شاعر کا یہ قول ہے ؎

خالي لأنت و من جرير خاله ينل العلٰى ويكرّم الأخوالا

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٤۔ ٩٣٥)

"أي لخالي أنت" یعنی البتہ ماموں میرا تو ہے اور جس شخص کا ماموں جریر ہے تو وہ مرتبۂ بلند کو پہنچے گا اور اپنے ماموؤں کی تکریم و تعظیم کرے گا۔ امام نحاس رحمہ اللہ کہتے ہیں: علی بن سلیمان نے محمد بن یزید سے ہم کو حکایت کی کہ محمد نے کہا ہے کہ کلام میں حذف ہے، معنی یہ ہیں: "يَدْعُوْ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ اِلٰهًا" امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اس قول کو محمد بن یزید سے غلط گمان کرتا ہوں، شاید وجہ اس کی یہ ہو کہ اس لام کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا ہے۔ نیز امام فراء و قفال نے کہا ہے کہ یہ لام زائد ہے، معنی یہ ہیں: "يدعو من ضره أقرب من نفعه أي يعبده" اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بحذفِ لام ہے اور لام اس قول کی بنا پر ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ میں توطیہ قسم کا ہوگا۔[1]

امام سمین رحمہ اللہ نے ساتویں وجہ یہ ذکر کی ہے کہ لام مفعول بہ میں زائد ہے۔ من موصولہ اور بعد کا جملہ صلہ، موصول و صلہ مل کر مفعول بہ ہوا۔ "يدعو" کا لام اس میں زیادہ کیا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ رَدِفَ لَكُمْ ﴾ [النمل: ۷۲] میں زیادہ کیا گیا ہے۔ ان اقوال میں سے محلی نے زیادتِ لام کو اختیار کیا ہے اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے تکرار "يدعو" کی وجہ کو اختیار فرمایا ہے۔[2] یہی وجہ شاہ عبدالقدیر صاحب ۔قدس سرہ۔ کی مختار ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ اور شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ترجموں میں "مَنْ" کو "يدعو" کا مفعول قرار دیا ہے۔ اول نے فرمایا ہے میخواند کسے را کہ زیاں اونزدیک تر است از سودا اور دوسرے نے کہا ہے: پکارتا ہے اس شخص کو کہ اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے: البتہ ضرر اس شخص کا بہ سبب اس کے معبود ہونے کے اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، جس کی وہ اس کی عبادت کے سبب سے توقع کرتا ہے، وہ نفع شفاعت اور اس کا وسیلہ پکڑنا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ بات، یعنی اس کا غیر اللہ کو معبود پکڑنا دنیا میں اس کے لیے موجبِ قتل ہے اور آخرت میں موجبِ عذاب ہے۔ لام معلق کرنے والا ہے "يدعو" کا اس لحاظ سے کہ "يدعو" بہ معنی "يزعم" اور زعم قول مع اعتقاد ہے،[3] یعنی تعلیق افعالِ قلوب کی خاصیت ہے اور "يدعو" افعالِ قلوب سے نہیں ہے کہ لام ابتدا اس کا معلق ہو، اس لیے یوں کہا ہے کہ بہ معنی "يزعم" ہے اور "يزعم" افعالِ قلوب سے ہے تو اب حسبِ قاعدہ لامِ ابتدا اس کا معلق ہو جائے گا۔ اس جواب میں تناقض کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ بتوں سے ضرر اور نفع کی نفی اللہ پاک کی طرف ایک حکم ہے۔ اللہ نے اُس کافر پر اس کا حکم کیا ہے، جو اپنے منہ پر منقلب ہو گیا

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٠٠۔ ٦٠١) فتح البيان (٩/ ٢٢۔ ٢٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤) تفسير النسفي (٣/ ٩٨)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٧)

ہے، وہ یہ ہے کہ وہی کافر پکارتا ہے اور پوجتا ہے اللہ کے سوا، اس لیے کہ جو نہ اس کا ضرر کرتی ہے بنفسہ نہ اس کو نفع پہنچاتی ہے بنفسہ۔ پھر اللہ پاک نے اس کافر سے یہ بات نقل فرمائی کہ قیامت کے دن کہے گا اور اعتقاد کرے گا، جبکہ وہ بت پوجنے کی وجہ سے ضرر پائے گا۔

﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۚ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى ﴾ پس بہ سبب اختلاف حاکم کے تناقض دفع ہوگیا۔ اس صورت میں جملہ ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ ﴾ کا مفعول "یدعو" کی "حِیز" میں ہے، مگر بہ سبب لامِ ابتدا کے فعل عمل سے معلق ہوگیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو جملہ مفعول واقع ہوا ہے لام اس پر داخل ہے، اس لیے کہ "یدعو" کو قائم مقام یقول کے ٹھہرایا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جس وقت کافر بت پوجنے کی وجہ سے اپنا ضرر پانا دیکھے گا تو اس وقت پکار کر اور چیخ کر کہے گا: ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۚ ﴾ یعنی یہ مقامِ حکایت قول کافر کا مقام ہے، مگر "یدعو" کو "یقول" کی جگہ رکھ دیا ہے، تاکہ ایسے قول پر دلالت کرے، جس میں پکارنا چلانا ہو۔ پھر جب دوسرا "یدعو" بمعنی "یقول" صراخ و دعا کے معنی میں ٹھہرا تو ضرر و نفع کی بتوں سے نفی کرنے والا اللہ پاک ہوا اور مثبت اُن کا کافر ٹھہرا۔ اس وجہ سے بھی تناقض دور ہوگیا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، اس بنا پر کہ "یدعو" پہلے "یدعو" کی تکریر ہے اور "من" مبتدا، خبر اس کی ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ ہے۔ یعنی جملہ ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ ﴾ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ مفعول "یدعو" کے "حِیز" میں ہے، مستانفہ ہے، اعراب کا اس کے لیے کوئی محل نہیں ہے تو دوسرا "یدعو" پہلے کی تکریر و تائید ہوگا، اس کا کوئی معمول نہ لفظاً ہوگا نہ تقدیراً۔

گویا یوں کہا گیا کہ "يدعو من دون الله الذي لا يضره و لا ينفعه يدعو" اس بنیاد پر ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ ﴾ درمیان موکَّد و موکِّد کے جملہ معترضہ ٹھہرے گا، اس لیے کہ اس میں کلام کی تشدید و تاکید ہے اور ﴿ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ ﴾ کلامِ مستانف ہوگا اور لام ابتدا کا اور "من" موصولہ اور "ضرہ" مبتدا، اقرب اس کی خبر اور جملہ صلہ "من" کا اور ﴿ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴾ جواب قسم مقدر کا اور قسم مع اپنے جواب کے خبر مبتدا کی، یعنی موصول کی۔ یہ بیان شیخ زادہ کا ہے۔ جمل میں کہا ہے کہ مولیٰ بطور تہکم کے کہا ہے، یعنی بطورِ مذاق کے کہا کہ واہ رے مددگار و ہم صحبت خوب مدد کی، خوب ہم صحبتی کا حق ادا کیا اور خوب سعی و سفارش کی کہ ابدالآباد کے لیے جہنم مل گیا۔ نعوذ باللہ منہ۔ پھر جب اللہ پاک ان مشرکوں کا ذکر کر چکا، جو کہ باطل کے ساتھ جھگڑتے تھے، اللہ پاک کی عبادت کنارے پر کرتے تھے اور اُن کا انجام کار بیان کر دیا تو اب ان ایمان داروں کا ذکر کیا، جو ایمان پر جمے ہوئے ہیں اور اعمالِ صالح پر ثابت قدم ہیں اور آخرت میں جو ثوابِ جمیل و اجرِ جزیل ملے گا اس کا بیان کیا، پس ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، بے شک اللہ جو چاہے وہی کرتا ہے ⑭

نیک لوگوں کا بدلہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جبکہ اللہ پاک اہلِ ضلالت بدبختوں کا ذکر کر چکا تو ابرار اور نیک بختوں کے ذکر کے ساتھ عطف کیا، یعنی وہ لوگ جو کہ اپنے دلوں سے ایمان لائے اور اپنے ایمان کی افعال سے تصدیق کی، پس تمام قسم کی قربات سے نیک کام کیے اور منکرات کو چھوڑا تو اس بات نے جنت کے باغوں میں ان کو اعلیٰ درجات میں رہنے اور بسنے کا وارث بنا دیا اور جب اللہ پاک نے یہ ذکر فرمایا کہ اُن کو تو گمراہ کیا اور ان کو ہدایت سے سرفراز فرمایا تو یوں کہا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾ یعنی اللہ پاک جو چاہتا ہے کرتا ہے کسی کی کیا مجال کہ دم مار سکے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے خبر دی کہ مومنین نیک اعمال کرنے والوں کو ان جنتوں میں داخل کرے گا، جن کی یہ صفت ہے۔ جنتوں کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ پہلے کلام گزر چکا ہے اور ہم بیان کر آئے ہیں کہ اگر جنات سے مراد وہ گھنے درخت ہیں جو اپنے نیچے کی چیزوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں تو اس کے نیچے سے نہروں کا بہنا ظاہر ہے اور اگر اُن سے مراد زمین ہے تو تقدیر مضاف کی ضرور ہوگی، یعنی ان کے درختوں کے نیچے سے۔

جملہ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، یعنی اللہ پاک جس کام کا ارادہ کرتا ہے، اس کو کر ڈالتا ہے، کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں ہے، پس ثواب دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے اور عذاب کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے۔ جو کوئی اس کی فرماں برداری کرتا ہے، اس کا اکرام فرماتا ہے، جو کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے، اس کی توہین کرتا ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ موحد صالح کو ثواب دیتا ہے اور مشرک کو سزا دیتا ہے، اس کا کوئی دافع اور مانع نہیں ہے۔[3] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صالحات سے مراد فرض اور نوافل ہیں۔[4] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: یہ وعدہ ہے اس شخص کے لیے جس نے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، اس کے واسطے نہیں ہے جس نے اللہ کی عبادت کی کنارے پر۔[5]

---

① تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٠) ② فتح البيان (٩/ ٢٣ـ ٢٤) ③ تفسير البيضاوي (٤/ ١١٨)
④ تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤) ⑤ تفسير النسفي (٣/ ٩٨)

امام ابو حیان ﷫ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ پاک اُن لوگوں کا حال بیان کر چکا، جو کہ حرف وسَفَہ رائے پر، یعنی بے وقوفی وحماقت پر اس کی عبادت کرتے ہیں اور آخرت میں خسارے اور نقصان کی ان کو وعید سنائی تو اس کے بعد اُن کے مخالفین، یعنی اہلِ ایمان کے حال کا ذکر کیا اور جو اچھا وعدہ اُن سے کیا ہے، اس کا بیان کیا، پھر انھیں اگلے لوگوں کی توبیخ میں شروع فرمایا، گویا اللہ پاک یوں فرماتا ہے کہ یہ لوگ کنارے پر عبادت کرنے والے قلق و بے زاری ان کے ساتھ ہوئی، انھوں نے اس بات کا گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ اور اُن کی اتباع کرنے والوں کی ہرگز مدد نہ کرے گا، حالاں کہ ہم نے تو اُن کو صبر کرنے کا اور ہمارے وعدے کا انتظار کرنے کا حکم کیا ہے، پھر جو شخص اس کے سوا گمان کرے تو اسے چاہیے کہ تانے ایک رسّی آسمان کو الخ۔[1] امام جمل ﷫ نے کہا ہے کہ اس عبارت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دو کلام جو ﴿مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ سے متعلق ہیں ان کے درمیان میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ ... الخ﴾ کا ذکر استطراداً کیا گیا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

جو یہ سمجھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں ہرگز اس (رسول) کی مدد نہ کرے گا تو چاہیے کہ وہ آسمان تک رسی دراز کرے، پھر اسے کاٹ ڈالے اور دیکھے کہ کیا اس کی تدبیر اس کے غصے کو لے جاتی ہے (15) اور اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو واضح آیات کی صورت میں نازل کیا ہے اور بے شک اللہ جسے چاہے اسے ہدایت دیتا ہے (16)

اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کی یقیناً مدد فرمائے گا:

دنیا کی تکلیف میں جو کوئی اللہ سے نا اُمید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزوں کو پوجے جن کے ہاتھ نہ بھلا ہے نہ برا، وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ صورت قیاس کرلے، جیسے ایک شخص اونچی لٹکتی رسی سے لٹک رہا ہے، اگر چڑھ نہیں سکتا تو توقع تو ہے کہ رسی اوپر کھنچے تو چڑھ جائے، جب رسی توڑ دی، پھر کیا توقع رہی۔ کہا اللہ کی اُمید کو اور آسمان کو تانے یعنی اونچان کو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ محمد ﷺ کی ہرگز مدد نہ کرے گا دنیا اور آخرت میں، تو چاہیے کہ ایک رسی تانے ﴿اِلَى السَّمَآءِ﴾ یعنی اپنے گھر کی چھت کی طرف ﴿ثُمَّ لْيَقْطَعْ﴾ فرماتا

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٣٢)

ہے کہ پھر اِس سے گلا گھونٹ لے۔ فتح القدیر میں اتنا زیادہ ہے "حتی یموت" یعنی یہاں تک کہ مرجائے۔[1]

(أخرجه الفريابي و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم والحاكم و صححه و ابن مردويه عنه) امام مجاہد، عکرمہ، عطاء، ابو الجوزا اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے: "فَلْيَمْدُدْ إِلَى السَّمَآءِ" یعنی چاہیے کہ توصل کرے آسمان کی طرف پہنچنے کے لیے، کیوں کہ محمد ﷺ کو جو مدد آتی ہے وہ آسمان سے آتی ہے، پھر چاہیے کہ اس مدد کو ان سے قطع کر دے، اگر اس پر قادر ہے۔[2]

معنی کے لحاظ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اُن کے اصحاب کا قول زیادہ صحیح اور ظاہر ہے اور زیادہ موثر ہے تہکم میں، یعنی ٹھٹھا اور مذاق میں، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ جو شخص اس بات کا گمان کرتا ہے کہ اللہ نبی اکرم ﷺ کی مدد کرنے والا نہیں ہے اور نہ ہی اُن کی کتاب اور دین کی مدد کرنے والا ہے تو چاہیے کہ چلا جائے، پھر چاہیے کہ اپنے نفس کو قتل کر ڈالے، اگر یہ امر اس کو غصہ دلانے والا ہے، اس لیے کہ اللہ تو ضرور اُن کی مدد کرنے والا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴾[المؤمن: ٥١] "بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔"

اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴾. امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا يَغِيظُ ﴾ یعنی "من شان محمد ﷺ"۔ امام عطا خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پھر چاہیے دیکھے آیا شفا دیتا ہے اس کو یہ غیظ، جسے اپنے سینے میں پاتا ہے۔ ﴿ كَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ ﴾ یعنی قرآن شریف ﴿ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ﴾ یعنی آیتیں جو کہ اپنے لفظ اور معنی میں واضح ہیں اور اللہ پاک کی طرف سے لوگوں پر حجت ہیں۔ ﴿ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ ﴾ یعنی اللہ گمراہ کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے اور راہ بتاتا ہے جس کو چاہتا ہے، اس بات میں اُسی کے لیے حکمتِ تامہ و حجتِ قاطعہ ہے: ﴿ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ﴾ [الأنبيآء: ٢٣] "وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔" اللہ پاک سے جو کوئی نہیں پوچھ سکتا تو اس کی حکمت، رحمت، عدل، علم، قہر اور عظمت کے سبب سے، اس کے حکم کو کوئی پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے۔ ﴿ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴾ [الرعد: ٤١] یعنی وہ جلد حساب لینے والا ہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان وغیرہ کا بیانِ فاتح یہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے، اس میں

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٨١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٧) فتح القدير (٣/ ٦٠٢_٦٠٤)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٨٠_ ٥٨٣) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٠)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٠_٢٨١)

سے بہتر یہ معنی ہیں، جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کی ہرگز مدد نہ کرے گا اور اس کو یہ بات میسر ہے کہ جو مدد اُن کو ملی ہے، اسے قطع کر دے گا تو ﴿ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ﴾ یعنی تو چاہیے کہ کوئی ایسا حیلہ و تدبیر تلاش کرے، جس سے آسمان تک پہنچے۔ ﴿ ثُمَّ لْيَقْطَعْ ﴾ یعنی پھر چاہیے کہ قطع کرے اس نصر کو اگر اس کے واسطے یہ معاملہ مہیا اور آسان ہوگیا ہے۔ ﴿ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴾ یعنی اب دیکھے کہ آیا اس کا کید و مکر اس شے کو لے جاتا ہے، جو اسے غیظ و غضب میں لاتی ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ کی نصرت و مدد۔ اس کلام میں فائدہ یہ ہے کہ جب اس کو کید و حیلہ اس بات کا میسر نہیں ہوا ہے کہ ایسا کرے تو وہ قطع نصر کی طرف نہ پہنچے گا۔[1] كذا في القرطبي۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ جو شخص گمان کرتا ہے کہ اللہ نبی ﷺ کی ہرگز مدد نہ کرے گا، یہاں تک کہ ان کو کل دین پر غالب کر دے تو چاہیے کہ غصے کے مارے مر جائے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے قول سے اس کی تفسیر کی: ﴿ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ﴾ یعنی تو چاہیے کہ اپنے گھر کی چھت میں ایک رسّی باندھے۔ ﴿ ثُمَّ لْيَقْطَعْ ﴾ پھر چاہیے کہ اس رسّی کو کھینچے یہاں تک کہ ٹوٹ جائے تو گلا گھٹ کر مر جائے۔ معنی یہ ہیں کہ غصے کے مارے گلا گھونٹ لے، یہاں تک کہ مر جائے، کیوں کہ اللہ پاک تو ان کا مدد کرنے والا اور اُن کو غالب کرنے والا ہے۔ اس کا غصہ اسے نفع نہ دے گا۔ اور ﴿ كَيْدُهٗ ﴾ کے معنی ”صنيعه و حيلته“ یعنی اس کی کاری گری اور تدبیر ہے۔ ﴿ مَا يَغِيْظُ ﴾ سے مراد غیظ ہے کلمہ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ يَنْصُرَهُ ﴾ کی ضمیر کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف پھرتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ اسے رزق نہ دے گا تو چاہیے کہ خود کو مار ڈالے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر دین کی طرف پھرتی ہے، یعنی جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ ہرگز اپنے دین کی مدد نہ کرے گا۔ کوفیوں نے ﴿ ثُمَّ لْيَقْطَعْ ﴾ میں لام کو سکون سے پڑھا ہے۔[2] امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت عربیت سے بعید ہے۔[3] جمہور کی قراءت بکسرِ لام ہے۔ ”وقرئ بإسكانها على تشبيه ثم بالواو و الفاء لكون الجميع عواطف“ (قاله أبو البقاء)

﴿ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ﴾ یعنی مثل اس انزالِ بدیع کے اُتارا ہم نے اس کو آیات بینات، یعنی کھلی نشانیاں اپنی مدلولات پر ظاہر الدلالت۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴾ یعنی اللہ ہدایت کرتا ہے، جس کی ہدایت چاہتا ہے، ابتداءً یا جو شخص پہلے سے ہدایت یافتہ تھا تو اس کی ہدایت کو زیادہ کرتا ہے۔ یہ قول کہ نصر سے مراد رزق ہے، اس کو امام عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بایں الفاظ روایت کیا ہے: ﴿ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ ﴾ يقول: أَلَّنْ يَّرْزُقَهُ اللّٰهُ ﴿ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ﴾ فَلْيَأْخُذْ حَبْلًا فَلْيَرْبِطْهُ فِيْ سَمَآءِ بَيْتِهِ فَلْيَخْتَنِقْ بِهِ ﴿ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴾ قَالَ: فَلْيَنْظُرْ هَلْ يَنْفَعُهٗ

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٢١) فتح البيان (٩/ ٢٤) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٢) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٦)

ذٰلِكَ أَوْ يَأْتِيهِ بِرِزْقٍ"[1]

امام ھناوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ ﴾ معنی میں تفریع ہے محذوف پر اور ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴾ سے مرتبط ہے۔ تقدیرِ کلام یہ ہے: "ومن جملة ما يريد نصرة نبيه محمد ﷺ فمن كان..."۔ یعنی اللہ پاک جس شے کا ارادہ فرماتا ہے، من جملہ اس کے اپنے نبی اکرم ﷺ کی نصرت ہے۔ امام ابن جزی رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ سے مراد کفار ہیں اور ﴿ يَنْصُرَهُ ﴾ کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کفار میں سے جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز مدد نہ کرے گا نبی کریم ﷺ کی تو چاہیے کہ کسی رسّی سے اپنا گلا گھونٹ لے، کیوں کہ اللہ تو اپنے رسول کی ضرور ہی مدد کرے گا۔ (سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا ذکر اوپر نہیں گزرا ہے، لیکن سارا کلام تو آپ ﷺ پر دال ہے، اس لیے کہ پہلے ایمان کا ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا ایمان وہی ایمان باللہ والرسول ہے اور دین سے منقلب ہونے کا ذکر آیا ہے۔ پس وہی دین ہے، جس کو نبی اکرم ﷺ لائے ہیں۔ بہرحال سیاقِ کلام آپ ﷺ پر دال ہے۔) گلا گھونٹنے کا موجب غیظ ہے اور کید کے معنی ہیں: حیلہ کرنا۔ گلا گھونٹنے کا نام کید اس لیے رکھا کہ وہ "کید" کی جگہ میں رکھا گیا ہے، کیوں کہ اس کے حیلہ و تدبیر کی غایت وہی ہے۔

معنی یہ ہیں کہ جب وہ اپنے غصے کے سبب سے اپنے نفس کو گھونٹ لے گا تو آیا یہ فعل اس شے کو لے جائے گا، جو اسے غصے میں لاتی ہے، یعنی نصرت نبی اکرم ﷺ کی اُن کے دشمنوں پر۔[2] انتھی۔ یہ بات کہ "مَنْ" سے مراد کفار ہیں۔ کلامِ محلی کے موافق ہے اور اسی کی مثل عمادی میں ہے۔[3] رہی یہ بات کہ "کید" حیلہ گری کو کہتے ہیں، یعنی دوسروں کو ضرر پہنچانا اور یہاں اپنے نفس کو ضرر پہنچانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہ ضرر گلا گھونٹنا ہے، لہٰذا وجہ اس کی یہ ہے کہ جس بات پر وہ قدرت رکھتا ہے، غایت ومنتہا اس کا یہی ہے، چنانچہ "کید" بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ گازرونی نے اسی طرح کہا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے فعل کا نام "کید" بطورِ استہزا رکھا ہے، کیوں کہ اس نے اس کے ساتھ کید نہیں کیا ہے، جس سے وہ حسد کرتا ہے، بلکہ اس سے تو اس نے اپنے نفس سے کید کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ شے ہے، وہ اس کے غیظ کو دور کرنے والی نہیں ہے۔[4] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی دنیا اور آخرت میں ضرور مدد کرنے والا ہے، بغیر کسی پھیرنے والے کے جو اس کو پھیر دے اور بغیر کسی موڑنے والے کے جو اس کو موڑے۔[5]

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٨) (2) التسهيل لعلوم التنزيل (٢/ ٣٥)
(3) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤) تفسير أبي السعود (٦/ ٩٩) (4) تفسير النسفي (٣/ ٩٨) (5) تفسير أبي السعود (٦/ ٩٩)

(امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "كلام فيه اختصار والمعنى أن الله ناصر رسوله في الدنيا والآخرة فمن كان يظن خلاف ذلك و يتوقه من غيظه" علامہ نسفی رحمہ اللہ کے الفاظ بھی اسی کے لگ بھگ ہیں۔)[1] آپ کے دشمنوں اور حاسدوں میں سے جس شخص کو یہ بات غیظ میں لائے اور وہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کام کو نہ کرے گا، اس سبب سے کہ وہ شخص بعض اُمور میں اس کی مدافعت کرے گا اور حیلے بہانے کر کے اس کو رد کرے گا تو چاہیے کہ وہ اپنی سعی و کوشش میں خوب مبالغہ کرے اور ہر مقررہ اور معروف حد سے تجاوز کرے، پس اس کی سب کوششوں کے بے کار جانے اور اس کے تمام ترارادوں اور تگ و دو کا نتیجہ نہ نکلنے کے سبب سے اس کے نقشِ قدم اور کام کا انجام یہ ہوگا کہ اپنا گلا گھونٹ لے۔ "فَلْيَمْدُدْ إِلَى السَّمَآءِ" یعنی پس چاہیے کہ اپنے گھر کی چھت سے ایک رسّی لٹکائے۔ ﴿ثُمَّ لْيَقْطَعْ﴾ یعنی پھر چاہیے کہ پھانسی لگا لے۔ قطع کے معنی پھانسی لگا لینے کے ہیں، اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ جب کوئی گلا گھونٹ لیتا ہے تو کہتے ہیں: "قطع"، یعنی اس نے پھانسی لگا لی۔

اس محاورے کی وجہ یہ ہے کہ پھانسی لگانے والا سانس کے جاری رہنے کو روک کر اپنے سانس کو قطع کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اس رسّی کو پھانسی لگا لینے کے بعد قطع کرے، اس بنا پر کہ اس سے مراد قطع کا فرض کرنا اور مقدر کرنا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿فَلْيَنْظُرْ﴾ میں نظر سے مراد تقدیر و تصویرِ نظر ہے۔ پس چاہیے کہ اپنے جی میں نظر کا تصور کرے کہ آیا اس کا مکر و ترکیب جو کہ مخالفت اور نقصان پہنچانے میں انتہا درجے کا ہے، اسے اس نصر کی طرف لے جائے گا، جو اسے غصہ دلاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ حرفِ فا واسطے تراخیِ رُتبے کے ہے (یعنی رُتبے کو مؤخر ظاہر کرنے کے لیے)۔ یہ بھی جائز ہے کہ مراد یہ ہو کہ پس چاہیے کہ اب اس بات پر غور کرے کہ اگر یہ کام کرے تو اس سے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ کسی نے کہا معنی یہ ہیں کہ چاہیے کہ تانے ایک رسّی آسمان کی طرف اور چاہیے کہ اس پر چڑھے۔ پھر چاہیے کہ وحی کو قطع کرے۔ کسی نے کہا چاہیے کہ مسافت طے کرے، یہاں تک کہ آسمان کی جانب پہنچے، جو اس کے اطراف سے تیرے لیے معترض ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ کرنے میں کوشش کرے۔ انتہی

غرضیکہ نصر میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد مدد ہے، اس بنا پر ضمیر ﴿يَنْصُرَهُ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوگی یا دین کی طرف۔ دوسرا یہ ہے کہ نصر بہ معنی رزق ہے۔ عرب لوگ بولتے ہیں: "من ينصرني نصره الله، أي من يعطيني أعطاه الله" اس صورت میں ﴿يَنْصُرَهُ﴾ کی ضمیر ﴿مَنْ﴾ کی طرف پھرے گی۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص گمان کرے کہ اللہ ہرگز اس کو رزق نہ دے گا دنیا و آخرت میں تو چاہیے کہ انتہا درجے کی گھبراہٹ کو پہنچے، وہ یہی گلا گھونٹ لینا ہے۔ اس لیے کہ اس فعل سے اسے رزق حاصل نہ ہوگا۔ اس معنی کو امام خازن اور بیضاوی رحمہما اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2]

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٨) تفسير النسفي (٣/ ٩٨) [2] تفسير الخازن (٥/ ٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٨)

شیخ زادہ کی تقریر یہ ہے کہ تمام رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، وہ کسی بندے کو اللہ کی مشیت کے بغیر نہیں ملتے، اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم سے راضی رہے، کیوں کہ جو شخص اللہ کے رزق سے راضی نہ ہوا اور جو اسے ملے اس پر صبر نہ کرے اور جو کچھ اللہ پاک نے اس کی قسمت میں کیا ہے، اس پر صابر و شاکر نہیں ہے تو چاہیے کہ انتہا درجے کی بے صبری کو اختیار کرے اور وہ یہ ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لے، پس بے شک یہ اپنی قسمت پر غالب نہیں آئے گا۔ ''سماء'' کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کے معنی گھر کی چھت ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر کا قول یہی ہے۔[1]

''كل ما علاك فهو سماء'' یعنی جو شے تیرے اوپر ہے، وہ سماء ہے۔ امام نسفی اور محلی رحمہما اللہ نے صرف اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ مراد آسمانِ دنیا ہے۔ ﴿ ثُمَّ لْيَقْطَعْ ﴾ کے معنی ہیں: ''ليختنق به''. امام محلی اور نسفی رحمہما اللہ کا مختار یہی قول ہے۔[3] ﴿ فَلْيَنْظُرْ ﴾ کا حکم بطورِ فرض و تقدیر کے ہے، کیوں کہ اختناق کے بعد نظر ممکن ہے، لیکن یہ قول ایسا ہے جیسا کہ حاسد سے کہتے ہیں: ''مُتْ غَيْظًا'' اس کی نظیر سورت آل عمران میں ہے: ﴿ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ﴾ [آل عمران: ١١٩] ''مگر جب تنہا ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں چباتے ہیں غصے کے مارے۔ (ان سے) کہیے: تم اپنے غصے ہی میں مر جاؤ۔''

﴿ فَلْيَمْدُدْ ﴾ جواب ہے شرط کا اگر ﴿ مَنْ ﴾ شرطیہ ہو۔ ظاہر یہی ہے، امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[4] یا موصول کی خبر ہے، اگر ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہو اور حرفِ فا اس واسطے آیا ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ شرط کے مشابہ ہے۔ ﴿ هَلْ يُذْهِبَنَّ ﴾ جملہ استفہامیہ محلِ نصب میں ہے۔ بنا بر اسقاطِ خافض، اس لیے کہ نظر استفہام سے متعلق ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ينظر'' کی وجہ سے موضع نصب میں ہے۔[5] اور جب نظر بہ معنی فکر ہوگی تو متعدی بہ حرف ''في'' ٹھہرے گی: ''أي في أنه هل يذهبن''. ''ما يغيظ'' کا ''ما'' موصولہ ہے، بمعنی ''الذي'' اور عائد اس میں ضمیر مستتر ہے اور کلمہ ''ما'' مع اپنے صلہ کے مفعول ہے ﴿ يُذْهِبَنَّ ﴾ کا، یعنی ''هل يذهبن كيده الشيء الذي يغيظه وهو نصرة النبي ﷺ''۔ اس صورت میں ''يغيظه'' کی ضمیر مرفوع تو ''الذي'' کی طرف راجع ہوگی اور ضمیر منصوب ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف راجع ہوگی۔ (قاله السمين)

﴿ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ﴾ موصوف و صفت مل کر ﴿ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے۔ ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴾ معطوف ہے ﴿ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر منصوب پر، معنی یہ ہیں: ''وأنزلنا أن الله يهدي من يريد، أي

[1] تفسير الخازن (٥/ ٧)
[2] تفسير النسفي (٣/ ٩٨) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٤)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٩٨) تفسير الجلالين (١/ ٣٢٤)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٥)
[5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٦)

أنزلنا هداية الله لمن يريد هدايته" پس ﴿ أَنَّ ﴾ مع اپنے صلہ کے محلِ نصب میں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ محلِ رفع میں خبر ہو، مبتدائے مضمر کی، تقدیر یہ ہے: "والأمر أن الله يهدى من يريد"۔ (قاله السمين)

علامہ نسفی اور بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو محذوف سے متعلق کیا ہے۔ اول کی تقدیر یہ ہے: ولأن الله يهدي به الذين يعلم أنهم يؤمنون أو يثبت الذين آمنوا ويزيدهم هدى أنزله كذلك مبينا"[1] یعنی اور مثل اس اتارنے کے اُتارا اللہ نے سارے قرآن کو آیاتِ واضحات اور اس واسطے کہ اللہ اس سے اُن لوگوں کو ہدایت کرتا ہے، جنھیں جانتا ہے کہ وہ ایمان لائیں گے یا ثابت رکھتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں اور زیادہ دی ان کو ہدایت، اُتارا اس کو اسی طرح مبین۔ دوسرے کی تقدیر یہ ہے: "ومثل ذلك الإنزال أنزلناه، أنزلنا القرآن كله آيات بينات واضحات، ولأن الله يهدي به أو يثبت على الهدى من يريد هدايته أو إثباته أنزله كذلك مبينا"[2] (امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: "﴿ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي ﴾ أي و أنزلنا أن الله يهدي، والتقدير ذكر أن الله، و يجوز أن يكون التقدير ولأن الله يهدي بالآيات من يشاء أنزلناها"[3])

آیتِ باب کے شانِ نزول کے بارے میں امام خازن رحمہ اللہ نے بلفظ "روي" ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اسد و غطفان کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، نبی اکرم ﷺ نے اُن کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ان کے اور یہود کے درمیان محالفہ تھا، یعنی وہ باہم ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ وہ بولے: ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم اسلام لائیں، کیوں کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ محمد ﷺ کی مدد نہ کی جائے اور اُن کو غلبہ نہ ہو تو ہمارے اور یہود کے درمیان محالفت منقطع ہو جائے، پھر وہ ہم کو نہ غلبہ دیں اور نہ جگہ دیں۔[4]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بلفظِ قیل ذکر کیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انھوں نے اللہ کی مدد میں دیر سمجھی مشرکوں پر شدتِ غیظ اور اپنی جلد بازی کے سبب سے،[5] بالجملہ اللہ پاک نے جب یہ فرمایا کہ اللہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تو اس کے بعد اُن لوگوں کا بیان کیا جن کو ہدایت کرتا ہے اور اُن لوگوں کا ذکر کیا جن کو ہدایت نہیں کرتا۔ پس فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١٧﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابی (بے دین) اور نصاریٰ اور مجوسی اور وہ لوگ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٩٨) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٦)
[4] تفسير الخازن (٥/ ٧) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩)

جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، بے شک اللہ ان کے مابین یوم قیامت فیصلہ کرے گا، یقیناً اللہ ہر شے پر شاہد ہے (17)

اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مختلف فرقوں کے درمیان فیصلہ کرے گا:

مجوسی آگ پوجتے ہیں اور ایک نبی کا بھی نام لیتے ہیں، معلوم نہیں یہ بعد میں بگڑے ہیں یا سرے سے غلط ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے ان مختلف دین والے مومنین کی اور جو اُن کے علاوہ یہود اور صابئین ہیں۔ سورۃ البقرہ میں ہم اُن کی تعریف اور اُن میں جو لوگوں کا اختلاف ہے اس کو ذکر کر آئے ہے۔[1] نصاریٰ اور مجوس ومشرکین نے تو اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجا، لہٰذا اللہ پاک قیامت کے دن ان کے درمیان میں فیصلہ کرے گا اور عدل کے ساتھ ان میں فیصلہ فرمائے گا، پس جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں، ان کو جنت میں داخل کرے گا اور جو اس کے منکر ہیں، اُن کو آگ میں ڈالے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے افعال پر گواہ اور ان کے اقوال کا نگہبان ہے، ان کی خفیہ باتوں کو جاننے والا ہے اور جس شے کو ان کے ضمیر چھپاتے ہیں، اس کو خوب جانتا ہے۔[2]

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ وہ لوگ ہیں جو اللہ پاک پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے ہیں، یا جو آیاتِ بینات مذکور ہوئی ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں اور ﴿ وَالَّذِیْنَ هَادُوْا ﴾ یہود ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی ملت کی طرف منسوب ہیں اور صابئین وہ ہیں جو ستاروں کو پوجتے ہیں اور اُن کی تعظیم کرتے ہیں۔ ماخوذ ہے: "صبا الرجل عن دينه إذا خرج منه إلى دين آخر" یعنی جب کوئی شخص اپنے دین سے نکل جاتا ہے دوسرے دین کی طرف، تو محاورۂ عرب میں "صبا الرجل" بولتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک قوم تھی کہ فرشتوں کو پوجتی تھی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قبیلہ ہے یہود میں سے۔[3]

امام محلی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، کہا ہے کہ یہود سے ایک طائفہ ہے۔[4] اس پر امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فروع میں صحیح اور طے شدہ بات یہ ہے کہ صابئین نصاریٰ کا ایک گروہ ہے۔ علامہ خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کہا گیا ہے کہ دین چھے ہیں: ایک دین تو اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہ اسلام ہے اور پانچ شیطان کے ہیں اور اسلام کے علاوہ ہیں۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اَدیان پانچ ہیں: چار تو شیطان کے ہیں اور ایک رحمٰن کا ہے اور صابئین نصاریٰ کی ایک قسم ہے۔ پس چھے نہ ہوں گے۔[6] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے صابئین میں دو قول لکھے ہیں: ایک یہ ہے کہ ایک قوم تھی، ستاروں کو پوجتی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صابئین جنسِ نصاریٰ سے ہیں۔ پھر کہا کہ یہ قول صحیح نہیں ہے، بلکہ صابئین

---

[1] رقم الآية (٦٢)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨١)
[3] تفسير الطبري (٢/ ١٤٧۔ ١٤٦)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥)
[5] تفسير الخازن (٥/ ٧)
[6] تفسير النسفي (٣/ ٩٨)

ایک معروف فرقہ ہے۔ جو ملتیں کہ انبیا علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں، ان میں سے اس کا کسی ملت سے تعلق نہیں ہے۔

"مَجُوْسَ" میں اہلِ علم نے اختلاف کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک قوم ہے جو آگ کو پوجتی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ سورج اور چاند کو پوجتی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ نصاریٰ سے علاحدہ ہوگئی تھی اور ٹاٹ پہن لیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نے کچھ نصاریٰ کے دین سے لیا اور کچھ یہود کے دین سے، یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عالم کے دو معبود ہیں نور اور ظلمت۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک قوم ہے کہ نجاستوں کا استعمال کرتی ہے۔[7] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَجُوْسَ" کی اصل "نجوس" یعنی نون کے ساتھ ہے نون کو میم سے بدل لیا ہے۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں، جو بتوں کو پوجتے ہیں۔ اس کی تحقیق سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے،[8] لیکن اللہ تعالیٰ نے وہاں نصاریٰ کا نام صابئین سے پہلے لیا ہے اور یہاں ان کا نام صابئین سے بعد میں لیا ہے۔

سورۃ البقرہ میں نام پہلے لینے کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ اہلِ کتاب ہیں، صابئین کتاب والے نہیں ہیں اور اس سورت میں صابئین کا نام پہلے اس لیے رکھا ہے کہ اُن کا زمانہ نصاریٰ کے زمانے سے پہلے ہے۔ امام عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے ﴿ وَالصّٰبِـِٕيْنَ ﴾ کی تفسیر میں قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: وہ ایک قوم ہے کہ فرشتوں کو پوجتی ہے اور قبلے کی طرف نماز پڑھتی ہے اور زبور پڑھتی ہے اور مجوس نے آفتاب و ماہتاب و آگ کو پوجا ہے اور ﴿ اَلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ﴾ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بتوں کو پوجا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ ﴾ کہا کہ دین چھے ہیں۔ پانچ تو شیطان کے ہیں اور ایک دین اللہ عزوجل کا ہے۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام عکرمہ رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا: "فصل قضاه بينهم فجعل الخمسة مشتركة و جعل هذه الأمة واحدة" امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فرمایا کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ هَادُوْا ﴾ یہود ہیں اور صابئین کے واسطے کوئی کتاب نہیں ہے اور مجوس اصحابِ اصنام ہیں اور مشرکین نصارائے عرب ہیں۔[4]

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ معنی فصل کے یہ ہیں کہ اللہ پاک ان کے درمیان حکم کے ساتھ فیصلہ کرے گا، اس طریقے سے کہ یہ باطل والا ہے اور حق والا۔ حق والے کو باطل والے سے ایک ایسی علامت سے علاحدہ کرے گا، جس سے ان میں کا ہر ایک پہچانا جائے گا۔ یا فصل بہ جزا مراد ہے، اس طریقے سے کہ سب کو ایک جگہ اکٹھا نہ کرے گا، بلکہ ہر ایک کو وہ جزا دے گا، جو اس کے لائق ہوگی اور جو گھر اس کے لیے تیار کر رکھا ہے، اس میں اس کو داخل کرے گا، پس اُن میں سے مومنین کو جنت میں اور کافروں کو آگ میں داخل فرمائے گا۔ ﴿ اِنَّ

(1) فتح القدير (٣/ ٦٠٣)　(2) رقم الآية (٦٢)

(3) تفسير الطبري (١٨/ ٥٨٤۔ ٥٨٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٨)　(4) الدر المنثور (٦/ ١٦۔ ١٧)

اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیۡدٌ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، (یعنی اللہ پاک اپنی خلق کے ہر فعل وقول پر شہید ہے، کوئی شے اس سے غائب نہیں ہوتی۔ یعنی ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡصِلُ ﴾ کی تعلیل ہے، گویا کسی قائل نے کہا کہ کیا یہ فیصلہ علم سے ہوگا یا نہیں تو کہا گیا کہ ﴿ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴾ یعنی اللہ ہر شے کا عالم ہے، فیصلہ علم سے ہوگا۔)

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا کہ ان میں سے جو شخص جس شے کا مستحق ہے، پس اس کے فیصلے میں کچھ ظلم وحیف جاری نہ ہوگا۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "عالم به حافظ له" یعنی اللہ پاک اس کا عالم وحافظ ہے۔ پس چاہیے کہ ہر آدمی اپنے معتقد وقول وفعل کو دیکھے، یہ بہت موثر وعید ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "عالم به مراقب لأحواله"[3] یعنی اللہ پاک ہر شے کا جاننے والا اور اس کے احوال کا نگاہ رکھنے والا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عالم به علم مشاهدة أي بكل شيء من عملهم"[4] یعنی اللہ پاک ہر شے کو مشاہدے کا جاننا جانتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ پاک کی صفات میں کلمہ ﴿ شَہِیۡدٌ ﴾ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی۔ حاصل یہ ہوا کہ مذکورہ فرقوں کے ہر فرد سے جو کچھ صادر ہوا ہے، وہ اس کی تفاصیل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡصِلُ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴾ مع اپنے اسم وخبر کے محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ ... الخ﴾ کی خبر ہے، جس طرح کہ اس قول میں ہے: "إن زيداً أن الخير عنده لكثير" شیخ زادہ اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[5] فتح القدیر میں ہے کہ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ "إن زيدا أن أخاه منطلق" کلام میں جائز نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے امام فرّاء رحمہ اللہ کے قول کو رد کیا ہے اور جو شے آیت کی مماثل ٹھہرائی ہے، اس کا انکار کیا ہے۔ "إن زيداً أن الخير عنده لكثير" اور "إن زيداً أنه منطلق" کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔[6]

امام سمین رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ اس آیت میں دو وجہیں ہیں: ایک وجہ تو وہی ہے جو مذکور ہو چکی۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جملے کے دونوں جز پر "إنَّ" داخل کیا گیا تو وہ دونوں کے معطوفوں کے درمیان زیادہ تاکید کے لیے ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو ذکر کیا ہے۔[7] جو طولِ فصل واقع ہوا ہے لہٰذا اس نے "إنَّ" کے دخول کو خبر میں حسین کر دیا، اگرچہ جملہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر واقع ہوا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرا ﴿ اِنَّ ﴾ پہلے ﴿ اِنَّ ﴾ کی تکرار ہے بطورِ تاکید کے۔ یہ بات قاعدے کے طور پر جاری ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس وقت حرفِ تاکید کے لیے مقرر کیا جاتا ہے تو جو شے اس حرف کے ساتھ متصل ہوتی ہے، وہ بھی اس کے ساتھ دہرائی جاتی ہے، یا جو شے اس حرف کے ساتھ متصل ہے، اس کی ضمیر کا اس کے ساتھ اعادہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے ﴿ اِنَّ ﴾ کے ساتھ وہ شے اعادہ

---

[1] تفسير الخازن (٥/ ٨) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٨۔ ٩٩) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩) [4] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥)
[5] تفسير النسفي (٣/ ٩٨) [6] فتح القدير (٣/ ٦٠٤) [7] الكشاف (٣/ ١٤٩) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩)

کی گئی، جو اس کے ساتھ پہلے متصل ہوئی تھی، یعنی لفظ پاک اللہ۔ پس یہ متعین نہ ہوئی کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ ﴾ پہلے ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہو، جیسا کہ مذکور ہوا ہے۔ اس قول میں نظر ہے۔ اس لیے کہ پہلے ﴿ اِنَّ ﴾ کے ساتھ لفظ ﴿ اَللّٰهَ ﴾ کب متصل ہوا تھا کہ دوسرے ﴿ اِنَّ ﴾ کے ساتھ اس کا اعادہ کیا گیا۔ یہ نظر بعض علمائے مصر نے وارد کی ہے اور ٹھیک ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے دو وجہ یہی ذکر کی ہیں، لیکن اختصار کے ساتھ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ پہلے ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مفترقون یوم القیمة" یا مثل اس کے اور خبر مذکور محذوف کی تفسیر ہے۔[1]

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝۱۸ ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں میں اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے لوگ (بھی۔) اور بہت سوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں، بے شک اللہ جو چاہے کرتا ہے (18)

ہر چیز اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والی ہے:

ایک سجدہ ہے کہ سب اس میں شامل ہیں آسمان زمین میں جو کوئی ہے، وہ یہ کہ اللہ کی قدرت میں بے بس ہیں۔ اور ایک سجدہ ہے ہر ایک کا علاحدہ، وہ یہ کہ اس کو جس کام کا بنایا اس کام میں لگا رہے۔ یہ بہت آدمی کرتے ہیں، بہت سے نہیں کرتے مگر اور ساری مخلوق کرتی ہے۔

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ عبادت کا مستحق وہی اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ بے شک اس کی عظمت کے واسطے ہر شے طوعاً و کرہاً سجدہ کرتی ہے اور ہر شے کا سجدہ کرنا اس شے کی طرح ہے، جو اُس کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٨] "کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور (اس کے سامنے) وہ سب عاجز ہیں۔" اور اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی سجدہ کرتے ہیں فرشتے آسمانوں کے اقطار و اطراف میں اور حیوان زمین کی تمام اطراف میں، یعنی انسان و جن و

[1] التبیان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٦)

چار پائے و پرندے۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو۔''

نہ بلبل بر گلش تسبیح خوانیست — کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانیست

''باغ میں بلبل ہی (اللہ کی) پاکی بیان کرنے والی نہیں ہے، بلکہ ہر کانٹا اس کی تسبیح بیان کرنے کے لیے ایک زبان کی حیثیت رکھتا ہے۔''

﴿ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ ﴾ ان تینوں کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ یہ اللہ کے سوا پوجے گئے ہیں۔ لہٰذا بیان کیا کہ یہ تو اپنے خالق کو سجدہ کرتے ہیں اور مربوب و مسخر ہیں: ﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ [حٰم السجدة: ٣٧] ''تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو تم اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) کو پیدا کیا ہے۔''

صحیحین میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو جانتا ہے کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: بے شک وہ جاتا ہے، پس سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے، پھر حکم طلب کرتا ہے، پس قریب ہے کہ اس سے کہا جائے کہ لوٹ جا، جہاں سے تو آیا ہے۔[2]

مسند، سنن ابی داود، نسائی اور ابن ماجہ میں حدیثِ کسوف میں آیا ہے کہ بے شک سورج اور چاند دو مخلوق ہیں اللہ کی مخلوق میں سے اور وہ کبھی منکسف نہیں ہوتے، یعنی ان کو گرہن نہیں لگتا کسی کی موت کے واسطے نہ کسی کی حیات کے واسطے، لیکن اللہ عزوجل جس وقت کسی شے کے لیے تجلی فرماتا ہے تو وہ اس کے لیے خشوع کرتی ہے،[1] یعنی اس کی تجلی کے مارے دب جاتی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں ہے کوئی تارا اور نہ سورج اور نہ چاند آسمان میں، مگر گرتا ہے اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہوا، جس وقت کہ غائب ہوتا ہے، پھر وہ نہیں لوٹتا، یہاں تک کہ اس کو اِذن دیا جاتا ہے تو وہ لیتا ہے سیدھی جانب کو، یہاں تک کہ اپنے مطلع کی طرف رجوع کرتا ہے۔[3] رہے پہاڑ اور درخت تو اُن کا سجدہ اُن کے سائے کے دائیں اور بائیں طرف ڈھلنا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں نے خود کو

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩)

② مسند أحمد (٤/ ٢٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٦٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ البتہ حدیث کے آخری جملے (جس وقت کسی... خشوع کرتی ہے) کے علاوہ صحیح بخاری (٩٩٦) اور صحیح مسلم (٩١٥) میں بھی مروی ہے۔

③ تفسير الطبري (١٨/ ١٥٨٦)

آج کی رات دیکھا اور میں سو رہا ہوں کہ گویا ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں۔ پھر میں نے سجدہ کیا تو میرے سجدے کے سبب اس درخت نے بھی سجدہ کیا، پھر میں نے اس کو یہ کہتے سنا کہ "اللهم اكتب لي بها عندك أجرا، وضع عني بها وزراً، واجعلها لي عندك ذخراً، وتقبلها مني كما تقبلتها من عبدك داود" یعنی اے اللہ! تو لکھ واسطے میرے بہ سبب اس سجدے کے اپنے نزدیک اجر اور اس کے سبب مجھ سے گناہ اُتار اور اس کو میرے واسطے ذخیرہ کر اور قبول کر اس کو مجھ سے، جیسا تو نے اس کو اپنے بندے داود (علیہ السلام) سے قبول کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی سجدہ پڑھا، پھر سجدہ کیا تو میں نے آپ کو سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اس شے کی مثل جس کی خبر اس آدمی نے درخت کے قول میں سے دی تھی۔[1] (رواه الترمذي وابن ماجه وابن حبان في صحيحه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ الدَّوَآبُّ ﴾ یعنی سارے حیوانات۔ حدیث شریف میں مروی ہے امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیوانوں کی پشت کو منبر ٹھہرانے سے منع فرمایا، کیوں کہ بسا اوقات، بلکہ اکثر سواری اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کی رُو سے اپنے سوار سے بہتر ہوتی ہے۔[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ یعنی بہت سے لوگ سجدہ کرتے ہیں اللہ کو "طوعاً مختاراً متعبداً بذلك"، یعنی خوشی سے مطیع ہوکر مختار ہوکر اور اس کو عبادت سمجھ کر سجدہ کرتے ہیں۔ ﴿ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ یعنی بہت سے ان لوگوں میں سے جو باز رہے اور انھوں نے انکار و استکبار کیا، ان پر عذاب ٹھہر چکا۔

﴿ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے جعفر بن محمد عن ابیہ عن علی روایت کیا ہے محمد کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ یہاں ایک شخص ہے جو مشیت میں کلام کرتا ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا: اے اللہ کے بندے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا جیسا چاہا، یا جیسا تو نے چاہا، وہ بولا: بلکہ جیسا اس نے چاہا۔ پھر فرمایا کہ پھر وہ تجھے شفا دیتا ہے، جس وقت چاہتا ہے یا جس وقت تو چاہتا ہے، کہا: بلکہ جس وقت وہ چاہتا ہے۔ فرمایا: پھر وہ تجھے داخل کرے گا، جس جگہ تو چاہے گا، یا جس جگہ وہ چاہے گا۔ کہا: بلکہ جس جگہ وہ چاہے گا۔ فرمایا: واللہ! اگر تو اس کے سوا کہتا تو البتہ میں تلوار سے اس شے کو مارتا جس میں تیری دونوں آنکھیں ہیں۔[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، جس وقت ابن آدم سجدہ پڑھتا ہے تو شیطان علاحدہ ہوکر روتا ہے۔ کہتا ہے: "یاویله"، یعنی اے خرابی اس کی! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کیا، پس اس کے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٥٣) صحيح ابن حبان (٦/ ٤٧٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٨٢)

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٣٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ البتہ حدیث کا پہلا جملہ "سنن أبي داود" (رقم الحديث: ٢٥٦٧) اور دیگر کتب میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٩)

لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم کیا گیا تو میں نے انکار کیا، پس میرے لیے آگ ہے۔[1] (رواه مسلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو مصعب معافری سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں نے سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے سنا، کہا میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا فضیلت دی گئی سورۃ الحج باقی قرآن پر دو سجدوں کے ساتھ؟ فرمایا: ہاں، پھر جو شخص وہ دو سجدے نہ کرے تو ان دونوں کو نہ پڑھے۔[2] (و رواه أبو داود و الترمذي من حديث عبد الله بن لهيعة به وقال الترمذي: ليس بقوي وفي هذا نظر فإن ابن لهيعة قد صرح فيه بالسماع و أكثر ما نقموا عليه تدليسه) امام ابو داود رحمہ اللہ نے مراسیل میں خالد بن معدان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ الحج کو باقی قرآن پر دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی۔[3] (ثم قال أبو داود وقد أسند هذا، يعني من غير هذا الوجه ولا يصح) حافظ ابوبکر اسماعیلی نے ابو الجہم سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ الحج میں دو سجدے کیے اور وہ حدیبیہ میں تھے اور فرمایا کہ یہ سورت دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔ امام ابو داود اور ابن ماجہ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں ان کو پندرہ سجدے پڑھائے، اُن میں سے تین تو مفصل میں اور سورۃ الحج میں دو سجدے۔[4] پس یہ شواہد ہیں، بعض بعض کی مضبوطی کرتے ہیں۔[5] (كذا في ابن كثير)

﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ میں رؤیت قلبی ہے، بصری نہیں ہے، یعنی "اَلَمْ تَعْلَمْ" وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ کو سجدہ کرنے کی روایت جو ہمارے پاس آئی ہے، وہ طریقِ عقل سے آئی ہے، کیوں کہ ہم اس کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ اس وجہ کو حفناوی نے ذکر کیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی "اَلَمْ تَعْلَمْ" کہا ہے۔[6] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: "ألم تعلم وقيل ألم تر بقلبك"[7] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: "ألم تعلم يا محمد ﷺ علما يقوم مقام العيان"[8] یعنی خطاب خاص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور رؤیت سے مراد وہ علم ہے جو قائم مقام عیان کے ہے۔

فتح القدیر و فتح البیان میں ہے: "اَلَمْ تَعْلَمْ" اور خطاب ہر اس شخص کے واسطے ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ وہ شخص ہے جس سے رویت حاصل ہوتی ہے۔ (ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت سے مراد بصری رؤیت ہے، جب تو خطاب کو عام کرے، مگر یہ بات بنے گی نہیں، کیوں کہ خود ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کا ترجمہ "ألم تعلم" کیا ہے اور

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨١)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٧٨) امام البانی رحمہ اللہ نے حدیث کے دوسرے حصے (جو شخص ان ... پڑھے) کے علاوہ باقی روایت کو "حسن" کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٥/ ١٤٥)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٢/ ٣١٧) یہ روایت مرسل ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٥٧) اس کی سند میں "عبداللہ بن منین" اور "حارث بن سعید" مجہول راوی ہیں۔ دیکھیں: ضعيف أبي داود (٢/ ٧٢)

[5] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨١۔٢٨٢) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥) [7] تفسير الخازن (٥/ ٨) [8] تفسير النسفي (٣/ ٩٩)

رؤیت کو قلبی کہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ خطاب خاص نبی اکرم ﷺ کو ہو۔ واللہ أعلم)

سجود سے اس جگہ مراد مکمل فرماں برداری ہے، سجودِ طاعت مراد نہیں ہے، جو کہ عقلا کے ساتھ خاص ہے۔ برابر ہے کہ کلمہ ﴿مَنْ﴾ عقلا کے ساتھ خاص ٹھہرایا جائے یا عام مانا جائے ان کو اور اُن کے غیر کو، اور اسی لیے شمس وقمر و نجوم و جبال وشجر و دواب کا عطف ﴿مَنْ﴾ پر کیا ہے، کیوں کہ یہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ سجودِ انقیاد (مکمل فرماں برداری کا سجدہ) ہے، وہ طاعت نہیں ہے جو عقلا کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ ان امور کا علاحدہ ذکر کیا باوجود اس کے کہ وہ ﴿مَنْ﴾ کے نیچے داخل ہیں برتقدیر اس کے کہ "مَنْ" کو عام ٹھہرائیں، لہٰذا اس لیے کہ ان اُمور کے ساتھ قیام سجودِ عادت میں نہیں ہے۔[1] (امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "إفرادا لها بالذكر لشهرتها واستبعاد ذلك منها"[2] یعنی چوں کہ یہ اشیا مشہور و معروف تھیں اور سجود کا ہونا عادتاً اُن سے بعید تھا، اس لیے علاحدہ کر کے ان کا ذکر کیا۔ انتہی)

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جملہ آٹھ چیزیں مذکور ہیں۔ شمس وقمر و نجوم کا عطف خاص ہے۔ ﴿مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ﴾ پر۔ ان پر تصریح اس لیے کی کہ یہ وارد ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو پوجا ہے۔ اور جبال کا عطف خاص ہے ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ پر۔ نص اس پر اس لیے کی کہ وارد ہوا ہے کہ بعض ان کو پوجا کرتے تھے، یعنی پہاڑوں سے جو چیز لی جاتی ہے، اس کو پوجتے تھے۔ مراد بت ہیں ایسا ہی درختوں اور جانوروں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب کے سب اللہ پاک کو سجدہ کرتے ہیں، لیکن ہم اس پر وقوف نہیں رکھتے، جس طرح کہ اُن کی تسبیح پر ہم کو وقوف نہیں ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] "اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔"

اور کہا ہے کہ غیر مکلّف کی اللہ پاک کے لیے اطاعت اس کے افعال میں جو کہ غیر مکلّف سے سرزد ہوتے ہیں اور غیر مکلّف کی اللہ پاک کے واسطے تسخیر، اسْ اطاعت و تسخیر کا نام سجود رکھا، اس لیے کہ غیر مکلّف کی اطاعت کو مکلّف کے سجود کے ساتھ تشبیہ دی، وہ سجود جس کے مقابلے میں ہر خضوع وعاجزی پست تر ہے۔[3] امام خازن رحمہ اللہ نے چار قول ذکر کیے ہیں: اوّل یہ ہے کہ ان اشیا کا سجود اُن کے سایوں کا ایک طرف سے دوسری طرف ہوجانا اور منتقل ہونا ہے۔ دوسرا قول وہی امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کا قول ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اشیائے مذکور کے سجود کے معنی اطاعت ہیں، کیوں کہ کوئی جماد نہیں ہے، مگر وہ اللہ پاک کا مطیع و فرماں بردار ہے، اس کے واسطے عاجز ہے اور اس کی تسبیح کرتا ہے، جس طرح کہ خشیت اور تسبیح کے ساتھ اس کا وصف کیا ہے۔ یہ مذہب ہے اہلِ سنت کا، وہ یہی

[1] فتح القدير (٣/ ٦٠٤) فتح البيان (٩/ ٢٦۔ ٢٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩) [3] تفسير النسفي (٣/ ٩٩)

ہے کہ یہ اجسام جبکہ سارے اعراض کے قابل ہیں، جن کو اللہ پاک نے ان میں پیدا فرمایا ہے، بغیر کسی امتناع کے تو وہ اپنی اطاعت کی وجہ سے فعلِ مکلّف کے مشابہہ ہوگئے اور فعلِ مکلّف سجود ہے، جس سے ہر خضوع پست ہے۔

یہ قول وہی علامہ نسفی رحمہ اللہ کا دوسرا قول ہے۔ فی الجملہ بیان کا فرق ہے، پھر اگر تو کہے کہ اس تاویل کو قولہ تعالیٰ ﴿ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ باطل کرتا ہے، کیوں کہ بہ معنی مذکور سارے لوگوں میں عام ہے۔ پس نسبت اس کی ﴿ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ کی طرف تخصیص بے فائدہ ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ معنی مذکور گو ''کُلّ'' کے حق میں عام ہے، مگر بعض نے تمرد کیا اور تکبر کیا اور ظاہر میں سجود کو چھوڑ دیا، لہٰذا یہ بعض اگرچہ بذاتہ ساجد ہیں، لیکن بہ ظاہر متمرد ہیں۔ رہا مومن، وہ بذاتہ اور بہ ظاہر ساجد ہے، پس اس فرق کے واسطے تخصیص بالذکر حاصل ہوئی۔ (یعنی ذکرِ کثیر۔) چوتھا قول یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو کوئی زمین میں ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اس کو بہت سے لوگ، پس پہلا سجود بہ معنی انقیاد ہے، یعنی تابعداری اور دوسرا بہ معنی اطاعت وعبادت ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ لفظ عام ہے تو اس میں لوگ داخل ہیں۔ پھر ﴿ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ کیوں فرمایا؟ لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر پہلے الفاظ پر اکتفا کیا جاتا تو یہ وہم ہوتا کہ سارے لوگ سجدہ کرتے ہیں، پس بیان کر دیا کہ بہت سے لوگ خوشی اور رغبت سے سجدہ کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔ یہ وہی ہیں، جن کے حق میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ یہ لوگ کفار ہیں، بہ سبب ان کے کفر و ترکِ سجود کے اُن پر عذاب ثابت ہو چکا ہے اور باوجود اُن کے کفر اور امتناع کے سجدہ سے اُن کے سائے اللہ عزوجل کو سجدہ کرتے ہیں۔[1]

شیخ زادہ کے بیان کا حاصل یہ ہے، جبکہ ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ کے عموم میں کافر آدمی اور سرکش جن اور شیطان اور سارے حیوانات اور جمادات داخل ہیں، حالاں کہ اُن میں کوئی نہیں ہے، جو اطاعت و عبادت کا سجدہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خضوع و عاجزی کر کے زمین پر پیشانی رکھنے کو سجودِ طاعت وعبادت کہتے ہیں اس واسطے سجود کو مجازی معنی پر محمول کیا جو کہ ہر موجود ممکن میں متصور ہو سکتی ہیں۔ وہ مجازی معنی یہ ہیں کہ موجود ممکن کا اللہ پاک کی قدرت ومشیت کے لیے فرمانبردار، مسخر ومطیع ہونا۔ اللہ پاک کے افعال و تدبیر، جو اس میں حادث ہوتی ہے، اس میں سے کسی شے کا انکار نہ کرنا۔ اس فرماں برداری اور اطاعت کو حقیقی سجود سے تشبیہ دی، جو مکلّف سے صادر ہوتا ہے اور سجود مشبہ بہ کا اسم انقیاد مشبہ پر اطلاق کیا، بطورِ استعارہ تصریحی اصلی کے۔

پھر اس سجود سے ان معنوں میں لفظِ ﴿ يَسْجُدُ ﴾ نکالا تو اس استعارے نے ﴿ يَسْجُدُ ﴾ کی طرف تبعاً سرایت کی، معنی یہ ہوئے کہ ساری مکونات (ہونے والی چیزیں) موجودات اور مخلوقات اللہ پاک کی مطیع وفرماں بردار ہوتی ہیں۔ دوسرے معنی مجازی سجود آیت میں مالکِ حقیقی اور مدبر کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں، کیوں کہ جو حقیقی سجود

---

[1] تفسير الخازن (٥/ ٨)

ہوتا ہے وہ بطورِ خضوع وتعظیم ہی ہوتا ہے، پس لا محالہ وہ عظمتِ کبریا پر دلالت کرے گا، لہٰذا اسی طرح یہ ساری اشیا مذکور عظمت وکبریائی پر دلالت کرتی ہیں، اس لیے اس دلالت کو حقیقی سجدے سے تشبیہ دی، پھر اس سجود کا اس دلالت پر اطلاق کیا، معنی یہ ہوئے کہ ساری موجودات وممکنات اپنی ذلت وعاجزی سے اپنے مالک ومدبر کی عظمت وکبریائی پر دلالت کرتی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مرفوع بہ فعلِ مضمر ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان میں اس وجہ کو اظہر کہا ہے۔[1] تقدیر یہ ہے کہ "وَيَسْجُدُ لَهٗ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ سُجُوْدَ طَاعَةٍ وَعِبَادَةٍ" (قاله البيضاوي والنسفي) یہ وجہ اس شخص کے نزدیک ہے جو لفظ مشترک کو اس کے دو معنی میں استعمال کرنا جائز نہیں رکھتا۔ اور ایک کلمہ میں حقیقت اور مجاز کو جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ جس سجود کی غیر عقلا کی طرف نسبت کی گئی ہے وہ اس سجود کا غیر ہے جو عقلا کی طرف منسوب ہوا ہے۔ تو اب ﴿ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ ماقبل پر معطوف نہ ہوگا، اس واسطے کہ جو فعل غیر عقلا اور عقلا کی طرف منسوب ہوا ہے، وہ معنی میں مختلف ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ غیر عقلا کا سجود اطاعت واذعان، یعنی فرماں برداری اور تابع فرمانی ہے اللہ پاک کے امر کے لیے اور عقلا کا سجود ایک مخصوص کیفیت ہے، یعنی خود کو انتہائی ذلیل سمجھ کر پیشانی کو زمین پر رکھنا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ماقبل پر معطوف ہے۔ اس وجہ میں تین تاویلیں ہیں: پہلی تاویل یہ ہے کہ سجود سے مراد قدرِ مشترک ہے درمیان کل کے، یعنی سجود کے ایسے معنی لیے جائیں جو عاقل اور غیر عاقل دونوں کو شامل ہیں، وہ یہی خضوع اور اطاعت ہے، یہ امر اشتراکِ معنوی کے باب سے ہے۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ سجود مشترک باشتراک لفظی ہے اور مشترک کا استعمال اپنے دو معنوں میں جائز ہے۔ تیسری تاویل یہ ہے کہ جو سجود عقلا کی طرف منسوب ہے وہ حقیقت ہے اور جو غیر عقلا کی طرف منسوب ہے وہ مجاز ہے اور حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع کرنا جائز ہے۔ ان چیزوں میں اختلاف ہے۔

اس کی تقریر کے لیے اور جگہ ہے، وہ جگہ یہاں سے زیادہ بہتر ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ كَثِيْرٌ ﴾ مرفوع بابتدا ہے اور ﴿ مِّنَ النَّاسِ ﴾ صفت ہے۔ اور خبر اس کی محذوف ہے، تقدیر اس کی مثّاب ہے، اس کا مقابل یعنی ﴿ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ اس تقدیر پر دال ہے۔[2] (قاله النسفي) امام زمخشری رحمہ اللہ نے اسی طرح تقدیر کی ہے۔[3] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے یہ تقدیر کی ہے: "مطیعون" یا "مثابون" یا مثل اس کے جیسے[4] "حق له الثواب" قدره البيضاوي یا "ليستحق الثواب" كذا قدره في فتح القدير[5] (ذكره السمين) امام بیضاوی نے بھی یہی

[1] فتح القدير (٣/ ٦٠٤) فتح البيان (٩/ ٢٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩) تفسير النسفي (٣/ ٩٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٩)
[3] الكشاف (٣/ ١٥٠) [4] التبيان في إعراب القرآن (٣/ ٩٣٧) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩) فتح القدير (٣/ ٦٠٤)

تین وجہ ذکر کی ہیں، مگر اختصار کے ساتھ اور نسفی نے دو وجہ ایک تو پہلی اور تیسری ذکر کی ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ کی تقریر یہ ہے: "أي تخضع له بما يراد منه ﴿ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ وهم المؤمنون بزيادة على الخضوع في سجود الصلاة"[2] انتهى.

اس سے معلوم ہوا کہ ﴿ وَكَثِيرٌ ﴾ کا عطف ماقبل پر کیا اور سجودِ اوّل سے سجود بہ معنی خضوع و اطاعت مراد لیا اور سجودِ ثانی سے سجود بہ معنی عبادت و طاعت مراد لیا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے بھی مثل علامہ نسفی رحمہ اللہ کے ﴿ كَثِيرٌ ﴾ کے مرفوع ہونے کی وہی دو وجہ ذکر کی ہیں۔ پھر ﴿ مَنْ ﴾ پر معطوف نہ ہونے کی یہ وجہ لکھی ہے کہ "سجود كثير من الناس سجود طاعة"، ہے، جو کہ عقلا کے ساتھ خاص ہے اور پہلے سجود سے مراد فرماں برداری ہے، پس اگر ﴿ كَثِيرٌ مِّنَ ﴾ پر معطوف ہو کر مرفوع ہو تو اس میں دو مختلف معنوں کے درمیان جمع ہوگی ایک لفظ میں، حالانکہ تو اس بات سے خوب واقف ہے کہ سجود کو فرماں برداری پر محمول کرنے کے بعد اس کی طرف کوئی ملجی نہیں ہے۔ بے شک یہ بات صحیح ہے کہ ﴿ كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ کے سجود سے ان کا انقیاد (فرماں برداری) مراد لیا جائے نہ کہ نفسِ سجودِ خاص۔ پس ﴿ كَثِيرٌ ﴾ کا بنا برعطف مرفوع ہونا بے کھٹکے ہے، گو صاحبِ کشاف اور اُن کے پیرو اس کے منکر ہوں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مرفوع بابتدا ہے اور ما بعد اس کا خبر ہے۔ (قال أبو البقاء: و التقدير و كثير منهم ولا يكون معطوفا على قوله: ﴿ مَنْ فِي السَّمَٰوٰتِ ﴾ لأن الناس داخلون فيه وقيل هو معطوف عليه وكرر للتفصيل۔[3] انتهى) کسی نے کہا ہے کہ پہلے ﴿ كَثِيرٌ ﴾ پر معطوف ہے، معنی یہ ہیں کہ بہت سے لوگ سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے اُن میں کے اس کا انکار کرتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں بہت سے لوگ جنت میں ہیں اور بہتوں پر عذاب ٹھہر چکا ہے۔ ابن انباری رحمہ اللہ نے اسی طرح بیان کیا ہے۔[4]

امام بیضاوی رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے: "﴿ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ بكفره و إبائه عن الطاعة"[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "أي وكثير منهم حق عليه العذاب بكفره و إبائه السجود"[6] امام محلی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے: "وكثير حق عليه العذاب و هم الكافرون لأنهم أبوا السجود المتوقف على الإيمان"[7] ان قولوں سے معلوم ہوا کہ ﴿ كَثِيرٌ ﴾ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دو قول اور ذکر کیے ہیں: ایک یہ ہے: جائز ہے کہ ﴿ وَكَثِيرٌ ﴾ پہلے ﴿ وَكَثِيرٌ ﴾ کی

---

(1) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩) تفسير النسفي (٣/ ٩٩)
(2) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥)
(3) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٧)
(4) فتح القدير (٣/ ٦٠٤)
(5) تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩)
(6) تفسير النسفي (٣/ ٩٩)
(7) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥)

تکریر ٹھہرایا جائے، مبالغے کے لیے ان لوگوں کی تکثیر میں، جن پر عذاب ثابت کیا گیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے: جائز ہے کہ ﴿ وَكَثِيْرٌ ﴾ موصوف ﴿ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ صفت، موصوف وصفت مل کر "ساجدین" پر معطوف ہو اور ساری معطوفات میں عامل سجود بہ معنی عام ہو،[1] یعنی خضوع و انقیاد اور یہ جو ذکر کیا ہے، اور یہ بیان شیخ زادہ کا ہے فی الجملہ معنی اس کے خازن کے قول میں گزر چکے ہیں، مگر بیان اور اسلوب کا فرق ہے کہ اس صورت میں ذکرِ کثیر کی تخصیص لغو ٹھہرے گی، کیوں کہ جب سجود بہ معنی عام لیا گیا تو بایں معنی ساری مکونات ساجد ہیں، تخصیص کثیر کے کیا معنی ہیں؟ لہٰذا اُن کا جواب یہ ہے کہ ذکرِ کثیر کا کثیر کے ساتھ حکم کی تخصیص کے واسطے نہیں ہے۔ اور نفی حکم کی اُن کے ماسوا، تا آنکہ لغو و بے کار ٹھہرے۔ بلکہ ذکر کثیر سے مراد لوگوں کی تفصیل ہے کہ ایک وہ لوگ ہیں جو بذواتھم و بظواھرھم ساجد ہیں اور ایک وہ لوگ ہیں جو بذواتھم ساجد اور "بظواھرھم" متمرد ہیں (سرکش ہیں)۔ اور بیان ہے اس امر کا کہ سب کے سب بہ معنی عام اللہ پاک کو سجدہ کرنے والے ہیں۔

﴿ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ﴾ یعنی جس شخص کی اللہ پاک اہانت کرے، اس طریقے سے کہ اس کو کافر شقی ٹھہرائے تو اس کے لیے کوئی عزت و اکرام کرنے والا نہیں ہے کہ اس کا اکرام کرے تو وہ سعید اور عزیز ہو جائے۔ امام اخفش، کسائی اور فراء رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ جس شخص کی اللہ اہانت کرے تو "فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ أي إكرام"[2] یعنی نہیں ہے اس کے واسطے کوئی اکرام۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ یعنی اللہ پاک کرتا ہے جو چاہتا ہے ان چیزوں سے، جن میں شقاوت وسعادت و اکرام و اہانت شامل ہے، جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت اور اس سے پہلی آیت کا ظاہر معتزلہ کے قول کا توڑ کرتا ہے، کیوں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے چاہا اشیا کو، مگر نہ کیا، حالانکہ وہ یوں فرماتا ہے: ﴿ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾[3]

"دَوَابُ" کو کسی نے بہ تخفیف حرفِ با بحذفِ بائے اولیٰ پڑھا ہے تضعیف کی کراہت کے واسطے، یا دو ساکن حروف کے جمع کرنے کی کراہت کے واسطے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[4] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بعید ہے، اس لیے کہ دبیب سے ماخوذ ہے، پھر اس کی توجیہ مذکور ذکر کی ہے۔[5] ﴿ حَقَّ ﴾ کو "حُقَّ" بضم اور "حَقًّا" باضمارِ فعل بھی پڑھا ہے، اس واسطے کہ حق لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "حققت الشيء بمعنی أثبته وحق الشيء أي ثبت" اس قراءت کو بھی امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[6] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ ﴾ میں کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ مفعول مقدم ہے اور شرطیہ ہے، جواب اس کا حرفِ فا مع مابعد فا ہے۔ عامہ کی قراءت "مکرِم" بکسر را ہے بصیغۂ اسم فاعل۔ ابن ابی عَبلہ نے بفتحِ راء پڑھا

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩۔ ١٢٠)
[2] تفسير القرطبي (١٢/ ٢٤)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٩٩)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١١٩)
[5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٦)
[6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٠)

ہے۔ "مکرَم" بفتح را اسم مصدر ہے۔ "أي فما له من إكرام" اس کو امام بیضاوی اور ابو البقاء رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔[1] [2]

امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ سجدہ عزائم سجود قرآن سے ہے، پڑھنے والے اور سننے والے کے لیے مسنون ہے کہ اس کی تلاوت یا اس کے سننے کے وقت سجدہ کرے۔[3] انتھی۔ پھر جب اللہ پاک بیان کر چکا کہ لوگ دو قسم ہیں: ایک قسم وہ لوگ ہیں جو سجدہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا ہے اور بلاشک دونوں فریق کے طریق سے یہ لازم آتا ہے کہ اس جھگڑے کو بیان کیا جائے، جو اُن کے درمیان میں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے جھگڑنے کی کیفیت ذکر کی۔ پس ارشاد فرمایا:

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾

یہ دو جھگڑنے والے (گروہ) ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، چناں چہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا (19) اس سے وہ سب کچھ گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور (ان کی) کھالیں بھی (20) اور ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے (21) اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو! (22)

شانِ نزول:

صحیحین میں ابو مجلز عن قیس بن عباد عن ابی ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ثابت ہوا ہے: "إنه كان يقسم قسما" یعنی ابوذر رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ آیت: ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ﴾ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کے دو ساتھی، عتبہ اور اس کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی۔ "يوم برزوا في بدر"[4] یعنی جس دن یہ سب بدر میں مقابلے کے لیے میدان میں آئے۔ "لفظ البخاري عند تفسيرها" یعنی یہ لفظ بخاری کا ہے اس آیت کی تفسیر میں۔ (اسی کی مثل صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ یہ لوگ اسبابِ نزول کو زیادہ تر جانتے

[1] روح المعاني (١٧/ ١٣٣)
[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٠) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٧)
[3] تفسير الخازن (٥/ ٨)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٣٣)

تھے دوسروں کی نسبت۔[1] (كذا في فتح البيان و فتح القدير)) پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا: "أنا أول من يجثو بين يدي الرحمن للخصومة يوم القيمة" یعنی قیامت کے دن پہلے پہل میں ہی رحمٰن کے روبرو خصومت کے واسطے گھٹنوں کے بل بیٹھوں گا۔ قیس نے کہا: انھیں کے حق میں ﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ﴾ نازل ہوئی ہے۔ کہا وہ لوگ جو بدر کے دن میدان میں آئے۔ سیدنا علی، حمزہ، عبیدہ رضی اللہ عنہم، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ۔[2] (انفرد به البخاري)

سعید بن ابی عروبہ نے قتادہ سے اسی آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ مسلمان اور اہلِ کتاب جھگڑے تو اہلِ کتاب بولے کہ ہمارے نبی تمھارے نبی سے پہلے ہیں، ہماری کتاب تمھاری کتاب سے پہلے ہے۔ "فنحن أولى بالله منكم" یعنی ہم تم سے زیادہ تر مقرب ہیں اللہ کے۔ مسلمان بولے: "كتابنا يقضي على الكتب كلها" یعنی ہماری کتاب ساری کتابوں پر حکم کرتی ہے اور ہمارے نبی خاتمِ انبیا ہیں، پس ہم تم سے زیادہ اللہ کے مقرب ہیں۔ "فأفلج الله الإسلام على من ناواه" یعنی پھر اللہ نے اسلام کو اس پر غالب کر دیا جس نے اس سے عداوت کی اور یہ آیت نازل فرمائی۔[3] اسی طرح امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ شعبہ نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ مثل کافر اور مومن کی ہے کہ دونوں نے بعث میں جھگڑا کیا۔ ایک روایت میں امام مجاہد اور عطا رحمہما اللہ نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ وہ مومنین اور کافرین ہیں۔

کفار کی سزا کا بیان:

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ﴾ جنت اور نار ہیں۔ نار نے کہا تو مجھے عقوبت کے واسطے کر۔ جنت نے کہا تو مجھے رحمت کے واسطے کر۔ امام مجاہد اور عطا رحمہما اللہ کا قول ہے کہ اس سے مراد کافرین و مومنین ہیں۔ سارے قولوں کو شامل ہوتا ہے اور اس میں روزِ بدر کا قصہ وغیرہ منتظم ہو جاتا ہے، کیوں کہ مومنین تو اللہ عزوجل کے دین کی نصرت چاہتے ہیں اور کافر ایمان کا نور بجھانا اور حق کا خذلان اور باطل کا ظہور چاہتے ہیں۔

یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، یعنی ان کا مختار و پسندیدہ ہے اور بہتر ہے اور اسی واسطے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ﴾ "أي فصلت لهم مقطعات من النار.[4] (أي ثياب قصار لأنها قطعت عن بلوغ التمام، وقيل هو كل ما يفصل و يخاط من قميص وغيره وما لا يقطع منها كالأزر والأردية[5] (مجمع البحار)) امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "من

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٠٤۔ ٦٠٥) فتح البيان (٩/ ٢٨)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٧)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٩)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٥٨٩۔ ٥٩٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣)
[5] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٢٩٥)

نحاس وهو أشد الأشياء حرارة إذا حمي" [1] یعنی ان کے واسطے قطع کیے گئے کپڑے تانبے سے، تانبا حرارت میں سب چیزوں سے زیادہ تر سخت ہے، جبکہ گرم ہوتا ہے۔ (یعنی یہ کپڑے پگھلے ہوئے تانبے کے ہوں گے، تانبا مثل آگ کے ہو جائے گا۔ دوسری آیت میں جو سرابیل مذکور ہے، وہ یہی ثیاب ہیں۔ [2] (كذا في فتح القدير))

﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿19﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴾ یعنی جس وقت کہ ڈالا جائے گا، اس کے سر پر "حَمِيْمُ" یعنی انتہائی گرم پانی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "حَمِيْمُ" پگھلا ہوا تانبا ہے۔ (فتح القدیر میں سعید کے الفاظ یہ ہیں: "﴿ قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ﴾ قال: من نحاس وليس في الآنية شيء إذا حمي أشد حرا منه وفي قوله: ﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴾ قال: النحاس يذاب على رءوسهم وقوله ﴿ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ ﴾ قال تسيل أمعاءهم ﴿ وَالْجُلُوْدُ ﴾ قال تتناثر جلودهم" [3] (أخرجه عبد بن حميد وابن المنذر وابن أبي حاتم عنه))

پگھلا ڈالے گا اُن کے پیٹ کی چربی کو اور آنتوں کو" قالہ ابن عباس و مجاہد و سعید بن جبیر وغیرہم" [4] اور اسی طرح اُن کے چمڑے پگھل جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "تساقط" [5] یعنی ان کے چمڑے گر پڑیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک حمیم البتہ ڈالا جائے گا ان کے سروں پر۔ پس وہ نفوذ کرے گا کھوپڑی میں، یہاں تک کہ اس کے پیٹ میں پہنچے گا، پس لے جائے گا اس چیز کو جو اس کے پیٹ میں ہے۔ (اصل کے الفاظ ہیں: فيسلت ما في جوفه" سلت مسح کو کہتے ہیں، یعنی پیٹ کی شے کو پونچھ کر سونت کر گزرتا ہوا نکل جائے گا۔) یہاں تک کہ اس کے دونوں قدموں میں پہنچے گا۔ (فتح القدیر میں ہے: "حتى يمرق في قدميه" یعنی اس کے دونوں قدم سے نکل جائے گا۔ مخرج اس حدیث کے یہ لوگ ہیں: "عبد بن حميد و ترمذي و صححه و عبد الله بن أحمد في زوائد الزهد و ابن جرير و ابن أبي حاتم و حاكم و صححه و أبو نعيم في الحلية و ابن مردوية عن أبي هريرة رضي الله عنه۔")"وهو الصهر" [6] یعنی اس آیت میں جو صہر مذکور ہوا ہے، وہ یہی ہے۔ پھر عود کیا جائے گا جیسا تھا۔

ورواه الترمذي من حديث ابن المبارك و قال: حسن صحيح، وهكذا رواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن أبي نعيم عن ابن المبارك۔ ثم قال ابن حاتم حدثنا: علي بن الحسين، حدثنا أحمد بن أبي الحواري قال: سمعت عبدالله السري۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٥٩٠_ ٥٩١) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨١) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨١) فتح القدير (٣/ ٦٠٧) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٥٩٢_ ٥٩٣)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨١_ ٢٤٨٢)

[6] تفسير الطبري (١٨/ ٥٩١_ ٥٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٢) فتح القدير (٣/ ٦٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٧٠)

عبداللہ نے کہا: آئے گا اس کے پاس فرشتہ اُٹھائے ہوئے برتن کو سنسی سے اس کی گرمی کے مارے۔ (اصل الفاظ بکلبتین من حرارتہ ہیں۔) پھر جب اس برتن کو اس کے منہ کے قریب کرے گا تو وہ اس سے کراہت کرے گا۔ کہا پس اُٹھائے گا موگری کو، جو اس کے ساتھ ہوگی تو اس سے اس کے سر کو مارے گا۔ "فيفرغ دماغه ثم يفرغ الإناء من دماغه فيصل إلىٰ جوفه من دماغه" یعنی پس خالی کر دے گا اس کے دماغ کو، پھر انڈیل دے گا اس برتن کو اس کے دماغ میں تو پہنچے گا اس کے دماغ میں سے اس کے شکم میں، پس یہ وہی قول ہے اللہ پاک کا ﴿ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴾۔[1] (فتح القدیر میں امام ابن ابی حاتم کے الفاظ ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ہے: "قال: يمشون و أمعاءهم تتساقط وجلوذهم وفي قوله: ﴿ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ قال: يضربون بها فيقع كل عضو على حياله فيدعون بالويل والثبور وأخرجه ابن جرير عنه في الآية قال: يسقون ماء إذا دخل في بطونهم أذابها والجلود مع البطون"[2])

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر لوہے کی ایک موگری زمین میں رکھی جائے، پھر اس کے لیے ثقلان، یعنی تمام انسان اور جن جمع ہوں تو اس کو زمین سے اُٹھا نہ سکیں۔[3] (فتح القدیر میں امام احمد، ابویعلی، ابن ابی حاتم، حاکم وصححہ، ابن مردویہ، بیہقی فی البعث والنشور کے الفاظ ابوسعید سے یہ ہیں: "لو أن مقمعها من حديد وضع في الأرض فاجتمع الثقلان ما أقلوه من الأرض ولو ضرب الجبل بمقمع من حديد لتفتت ثم عاد كما كان" امام احمد رحمہ اللہ کی ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر لوہے کی ایک موگری پہاڑ پر ماری جائے تو البتہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ پھر وہ عود کرے گا جیسا کہ تھا یعنی کافر۔ اور اگر غساق کا ایک ڈول یعنی دوزخیوں کا نچوڑ دنیا میں بیٹ دیا جائے تو تمام دنیا والوں کو بدبودار کر دے۔[4])

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: "يضربون بها فيقع كل عضو على حياله" (حيال الشيء قبالته مطلب یہ ہے کہ اس مار سے ہر ہر عضو جدا جدا اپنے مقابلے میں گر پڑے گا۔) "فيدعون بالثبور" یعنی ان موگریوں سے ماریں گے تو ہر عضو اس کے روبرو گر پڑے گا، پس وہ ہلاکت پکاریں گے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾۔

امام اعمش رحمہ اللہ نے عن ابی ظبیان عن سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ آگ سیاہ تاریک ہے، نہ اس کا

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣۔ ٢٨٤) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٧) تفسير الطبري (١٨/ ٥٩٣)

[3] مسند أحمد (٣/ ٢٩) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٣٤٩)

[4] تفسير الطبري (٣/ ٨٣) فتح القدير (٣/ ٦٠٧) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' اور ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

شعلہ روشن ہوتا ہے نہ اس کا انگارا۔ پھر آیتِ مذکور پڑھی۔[1] (فتح القدیر میں ابن مبارک، سعید بن منصور، ہناد، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، حاکم وصححہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "النار سوداء مظلمة لا يضيئ لهبها ولا جمرها ثم قرأ ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾"[2])۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ دوزخ والے دوزخ میں سانس نہ لیں گے۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "والله ما طمعوا في الخروج لأن الأرجل لمقيدة وأن الأيدي لموثقة ولكن يرفعهم لهبها و تردهم مقامعها"[3] یعنی قسم ہے اللہ کی دوزخیوں نے طمع نہ کی نکلنے میں، کیوں کہ پاؤں تو بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اور ہاتھ بندھے، لیکن آگ کا شعلہ اُن کو اُٹھائے گا اور اس کی موگریاں اُن کو واپس پھیر دیں گی۔ ﴿ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح: ﴿ وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [السجدة: ٢٠] "اور ان سے کہا جائے گا کہ اس آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔" معنی کلام کے یہ ہیں کہ وہ قولاً وفعلاً عذاب سے اہانت کیے جائیں گے۔[4] (كذا في ابن كثير)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان سے معلوم ہوا کہ آیتِ باب کے شانِ نزول میں چار قول ہیں۔ یہی چاروں خازن نے بھی ذکر کیے ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ چھے آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا حمزہ، علی، عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم یہ گروہ مسلمان ہیں اور عتبہ بن ربیعہ وشیبہ بن ربیعہ ولید بن عتبہ یہ لوگ کافر ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور شیبہ کا بھتیجا ولید بن عتبہ نکلے اور مقابلے کے لیے میدان میں آنے کی دعوت دی تو انصار کے تین آدمی اُن کی طرف نکلے۔ عوف ومعوذ پسرانِ حارث اور اُن کی والدہ عفراء ہے اور عبداللہ بن رواحہ۔ پس انھوں نے کہا: تم کون ہو؟ تو یہ بولے کہ انصار کا ایک گروہ۔ جب نسب بیان کیا تو وہ بولے اکفائے کرام ہمارے مقابلے کے لیے ہمارے ہمسر شریف چاہییں۔ پھر اُن کے منادی نے آواز دی کہ اے محمد! تم ہماری طرف ہماری قوم سے ہمسروں کو نکالو، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کھڑا ہو اے عبیدہ بن حارث اور اے حمزہ بن عبدالمطلب اور اے علی بن ابی طالب! پھر جب یہ لوگ اُن سے قریب ہوئے تو وہ بولے تم کون ہو؟ انھوں نے اپنی ذات کا ذکر کیا تو بولے: "نعم أكفاء كرام" یعنی ہاں تم ہمسر شریف ہو۔ پھر عبیدہ رضی اللہ عنہ نے مقابلہ کیا عتبہ سے، عبیدہ سب سے عمر میں بڑے تھے اور حمزہ رضی اللہ عنہ شیبہ کے مقابلے میں آئے اور علی رضی اللہ عنہ ولید بن عتبہ کے مقابلے میں آئے۔ پس حمزہ رضی اللہ عنہ نے کچھ دیر نہ کی کہ شیبہ کو مار ڈالا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ولید کو مار دیا۔

"واختلف عبيدة وعتبة بينهما ضربتان كلاهما أثبت صاحبه" یعنی عبیدہ وعتبہ نے باہم ایک

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨١۔ ٢٨٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٤) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٧)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٢) [4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٣۔ ٢٨٤)

دوسرے کو ایسی ضرب لگائی کہ دونوں بے کار ہو گئے۔ پس حمزہ اور علی رضی اللہ عنہما نے اپنی تلواروں سے عتبہ پر حملہ کیا تو دونوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور عبیدہ کو اس کے ہمراہیوں کی طرف اُٹھا لائے، اس حال میں کہ عبیدہ کا پاؤں کٹ چکا تھا اور اس کا گودا بہہ رہا تھا۔ پھر جب اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو اس نے کہا: یارسول اللہ! کیا میں شہید نہیں ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں تو شہید ہے، پس عبیدہ نے کہا کہ اگر ابو طالب زندہ ہوتے تو البتہ جان لیتے کہ میں اُن سے زیادہ اس بات کا مستحق ہوں، جو وہ کہتے ہیں: ؎

ونسلمه حتى نصرع حوله   ونذهل عن أبناءنا والحلائل

(شاید واللہ اعلم یہ شعر اسی قصیدے کا ہے، جس میں ابوطالب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کیے ہیں، معنی یہ ہیں کہ کیا ہم حوالے کر دیں گے ان کو، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے ہرگز نہیں، یہاں تک کہ ہم پچھاڑے جائیں گرد ان کے اور غافل ہو جائیں ہم اپنے بیٹوں اور جوروں سے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے، ہم ہرگز اُن کو قوم کے حوالے نہ کریں گے۔ لہٰذا عبیدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس قول کا ان سے زیادہ حق دار ہوں، کیوں کہ اُن کے زمانے میں لڑائی بھڑائی کا اتفاق نہ ہوا اور میں آپ کی نصرت و مدد میں اس نوبت کو پہنچا کہ حیاتِ مستعار و فانی سے رہائی پائی اور حیاتِ جاودانی بطفیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کے نصیب ہوئی۔ الحمد للّٰہ علیٰ ذلك۔)

دوسرا قول یہ ہے کہ مسلمین اور اہلِ کتاب کے حق میں اتری ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: اہلِ کتاب نے کہا کہ ہم از روئے کتاب، اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ اولیٰ اور مقدم ہیں اور ہمارے نبی تمھارے نبی سے پہلے ہیں۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم اللہ کے نزدیک زیادہ حق پر ہیں۔ ہم اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمھارے نبی پر ایمان لائے اور اس کتاب پر ایمان لائے جو اللہ نے نازل کی اور تم ہمارے نبی اور ہماری کتاب کو پہچانتے ہو اور مارے حسد کے تم نے انکار کیا، لہٰذا یہ ان کا جھگڑا ہے اپنے رب کے بارے میں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مومن اور کافر دو خصم ہیں کسی بھی ملت کے ہوں، پس مومن ایک خصم ہیں اور کافر ایک خصم۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ﴿ خَصْمٰنِ ﴾ جنت و نار ہیں۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "احتجت النار والجنة، فقالت هذه: يدخلني الجبارون والمتكبرون، و قالت هذه: يدخلني الضعفاء و المساكين فقال الله تعالىٰ لهذه: أنت عذابي أعذب بك من أشاء، وقال لهذه: أنت رحمتي أرحم بك من أشاء، ولكل واحدة منكما ملؤها"[2] وأخرجه البخاري و مسلم والترمذي وقال: حديث حسن صحيح ومعنى احتجت النار والجنة

[1] تفسير الخازن (٥/ ٨۔ ٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٦١) تفسير القرطبي (١٢/ ٢٥)

أي حجت كل واحدة منهما صاحبتها وخاصمتها انتهى، قال في مجمع البحار: هذه المحاجة تمثيلية أو حقيقة لأنه مقدور لله تعالىٰ وفيها شائبة من معنى الشكاية ولذا اسكتهما الله تعالىٰ بما يقتضيه مشيئته" اور "كلام النار مفاخرة و كلام الجنة شكاية"[1] انتهى

اس اختصام کی حدیث بروایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بعض الفاظ کے فرق سے بخاری، مسلم، ترمذی، تذکرۂ قرطبی وخازن میں مروی ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اور پہلے اقوال صحت کے زیادہ قریب ہیں، کیوں کہ کلام کو اس کے ظاہر پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ ﴾ چھے دین والوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مومنین ایک خصم ہیں اور پانچ ملتوں کے کافر ایک خصم ہیں۔[2] (امام محلی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "رجع إلى أهل الأديان المذكورة فالمؤمنون خصم وسائر الخمسة خصم"[4]) امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے، ان میں سے ایک نجس ترین فرقہ ہے؛ یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس، مشرکین اور دوسرا فریق مسلمان ہیں۔[5] پس یہ دونوں فریق مختصم ہیں (جھگڑنے والے)۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خصم اصل میں مصدر ہے، غالباً اسی لیے واحد مذکر ہے۔

قولہ تعالیٰ ﴿ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴾ [صٓ: ٢١] ''اور کیا آپ کے پاس جھگڑنے والوں کی خبر آئی جب وہ دیوار پھاند کر کمرے میں آ گئے۔'' اسی بنا پر ہے کہ تثنیہ ومونث لانا بھی جائز ہے۔ آیتِ باب اسی بنیاد پر ہے۔ چوں کہ ہر خصم ایک ایسا فریق ہے کہ اپنے تمام جماعتی ٹکڑوں کا مجموعہ ہے، اسی لیے ﴿ اِخْتَصَمُوْا ﴾ بصیغۂ جمع فرمایا، جیسا کہ اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ [الحجرات: ٩] ''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو۔'' پس جمع لانا واسطے مراعاتِ معنی کے ہے۔ انتہی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِخْتَصَمُوْا ﴾ کہا اور "اختصما" نہ فرمایا، اس لیے کہ خصم جمع ہے، یعنی معنی میں اور اگر "اختصما" فرماتا تو بھی جائز ہوتا، یعنی باعتبار لفظ کے۔[6]

شیخ زادہ نے فرمایا ہے کہ خصم صفت ہے ایسے موصوف کی جو لفظ میں مفرد اور معنی میں مجموع ہے، جیسے لفظ فوج وفریق کا، اور ﴿ خَصْمٰنِ ﴾ معنی "فوجان مختصمان" ہے اور ہر فوج ایک جماعتِ کثیرہ ہے، اس لیے اسناد ﴿ اِخْتَصَمُوْا ﴾ کا ضمیر جمع کی طرف صحیح ہوا۔ پس ﴿ هٰذٰنِ ﴾ تثنیہ لایا گیا "خصم" کے معنی کے اعتبار کے واسطے اور اگر اس کے برعکس کیا جاتا تو بھی جائز ہوتا، جس طرح کہ فقط معنی کا اعتبار جائز ہے کہ یوں کہا جائے:

---

[1] مجمع بحار الأنوار (١/ ٤٥٢) [2] تفسير الخازن (٥/ ٩-١٠) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٩٩) [5] فتح القدير (٣/ ٦٠٤) [6] فتح القدير (٣/ ٦٠٥)

"هؤلاء خصمان اختصموا" اور لفظ کا اعتبار یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے: "هذان خصمان اختصما في ربهم أي في دينه"[1] (قاله المحلي) یعنی مضاف محذوف ہے دینِ رب میں۔ خصام یہ ہے کہ بعض نے اس کا اثبات کیا، بعض نے اس کا انکار کیا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: "في دينه و صفاته"۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: "في دينه و أمره"[3] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "في دينه أو في ذاته و صفاته"۔[4] فتح البیان میں ہے: "في شأن ربهم أي في دينه أوفي ذاته أوفي صفاته أوفي شريعته لعباده أو في جميع ذلك"۔[5]

امام کرخی رحمہ اللہ نے ابو حیان رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ اختصام آخرت میں ہوگا۔ دلیل اس کی یہ کہ ﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ میں حرفِ فا کے ساتھ تقسیم کی ہے اور حرفِ فا تعقیب پر دال ہے اور اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: "أنا أول من يجثو يوم القيامة للخصومة بين يدي الله تعالىٰ"[6] اور اگر ہم یوں کہیں کہ یہ حکم اور فیصلہ دنیا میں ہے، قیامت میں نہیں ہے تو جواب یہ ہے کہ جب تحقیق اس کے مضمون کی اس دن میں ہوگی، بایں اعتبار قیامت کا دن اس کے واسطے ظرف ٹھہرانا صحیح ہوا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جملہ ﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ... الخ﴾ اس جھگڑے کے فیصلے کی تفصیل و بیان ہے، جو "إن الله يفصل بينهم يوم القيمة" سے مراد رکھا گیا ہے، اس بنا پر قولہ تعالیٰ: ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ﴾ کلامِ معترض ہوا اور جملہ ﴿اِخْتَصَمُوْا﴾ کا حالیہ ٹھہرے گا مؤکدہ نہ ہوگا، کیوں کہ یہ جملہ اخص ہے مطلق خصومت سے، جو خصمان سے سمجھی جاتی ہے۔

﴿قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "يلبسونها" یعنی "أحيطت بهم النار"[7] مطلب یہ کہ قطع کیے گئے منکروں کے لیے آگ کے کپڑے وہ، ان کو پہنیں گے، اس میں استعارہ ہے کہ آگ ان کا ایسا احاطہ کرے گی، جیسے کپڑے اپنے پہننے والے کا احاطہ کرتے ہیں۔ آگ کے کپڑے قطع کیے جانے سے غرض یہ ہے کہ کپڑوں کی طرح آگ اُن کے محیط کر دی گئی ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گویا اللہ مقدر کرے گا، اندازہ کرے گا آگوں کو اُن کے جثوں کی مقدار پر، وہ آگیں، اُن پر مشتمل ہوں گے، جیسے: کپڑے قطع کیے جاتے ہیں۔ (ثیابِ ملبوسہ یعنی پہننے کے کپڑے۔) لفظ ماضی کا اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہ امر ضرور ہونے والا ہے تو وہ مثل ثابت متحقق کے ہے۔[8]

قاضی صاحب کے الفاظ یہ ہیں: "﴿قُطِّعَتْ لَهُمْ﴾ قدرت على مقادير جثثهم ﴿ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾ نيران تحيط بهم إحاطة الثياب"[9] امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس واسطے کہ نئے کپڑے پہننے والے کی

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ٩٩) [3] تفسير الخازن (٥/ ٨)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٠) [5] فتح البيان (٩/ ٢٩) [6] تفسير الطبري (١٨/ ٥٨٧۔ ٥٨٨)
[7] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥) [8] تفسير النسفي (٣/ ٩٩) [9] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٠)

مقدار بدن پر قطع وفصل کیے جاتے ہیں، پس تقطیع مجاز ہے تقدیر سے، ذکر مسبب کا کیا، یعنی تقطیع کا اور مراد سبب لیا، یعنی تقدیر وتخمین۔ مطلب یہ ہے کہ جب نئے کپڑے کا قطع کرنا منظور ہوتا ہے تو پہلے پہننے والے کے بدن سے اس کا اندازہ وتخمینہ کر لیتے ہیں۔ پھر قطع کرتے ہیں، اندازہ کرنا قطع کرنے کا سبب ہے۔

پس اللہ پاک نے بطورِ مجاز بجائے قدرت کے ﴿ قُطِّعَتْ ﴾ فرمایا ہے، یعنی منکروں کے واسطے آگ کے کپڑے اُن کے بدن کے موافق بیونت لیے گئے ہیں۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو قطع کر کے پہنا دیے جائیں گے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ اس کے بعد قاضی صاحب نے تقطیعِ ثیاب کو استعارۂ تمثیلیہ تہکمیہ ٹھہرایا۔ آگ کے تیار رکھنے اور اُن کو اس کے احاطہ کرنے کی تشبیہ اُن کے لیے تفصیلِ ثیاب کے ساتھ دی۔[1] مطلب یہ ہے کہ بطورِ ٹھٹھے کے فرمایا کہ اُن کے لیے آگ کا لباس اور خلعت قطع کر رکھا ہے، یعنی لباس کی طرح آگ ان کو گھیر لے گی۔ امام ازہری رحمہ اللہ کا قول یہ ہے: "سُوِّیَت و جعلت لبوساً لهم"[2] یعنی آگ اُن کے لیے لباس بنائی گئی۔ آگ کی تشبیہ کپڑوں سے دی، اس لیے کہ آگ اُن پر اس طرح مشتمل ہے، جیسے کپڑے مشتمل ہوتے ہیں۔ اس امر کے وقوع کی حقیقت پر آگاہ کرنے کے لیے مستقبل کی ماضی کے ساتھ تعبیر کی۔

رہی یہ بات کہ ﴿ ثِيَابٌ ﴾ بلفظِ جمع فرمایا، لہٰذا اس کی دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ مقابلہ جمع بہ جمع کے باب سے ہے، یعنی چونکہ ﴿ لَهُمْ ﴾ جمع ہے، اس لیے ﴿ ثِيَابٌ ﴾ بلفظِ جمع کہا، تاکہ جمع کا مقابلہ جمع سے ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آگ ان پر متراکم ہو گی جیسے پہننے والے کپڑے کہ بعض ان کا بعض پر ہوتا ہے، یعنی تہ بہ تہ۔ یہ وجہ پہلی وجہ سے زیادہ قابلِ فہم ہے۔ ثیاب کے قطع کرنے کو ماضی سے اس لیے تعبیر کیا کہ اُن کے واسطے اور اعدادِ ثیابِ نار کے معنی میں ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: جملہ ﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ﴾ میں تین احتمال ہیں: خبر ثانی ہو موصول کی، یا حال ہو ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر سے، یا جملہ مستانفہ ہو۔

"حَمِيمُ" سے مراد گرم پانی جہنم کی آگ سے جوش دیا ہوا ہے اور جملہ ﴿ يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ ﴾ حالیہ ہے "حَمِيمُ" سے یا ضمیر ﴿ لَهُمْ ﴾ سے۔ "صهر" پگھلانے کو کہتے ہیں۔ "صهارہ" وہ شے ہے جو اس سے پگھل گئی۔ محاورے میں بولتے ہیں: "صهرت الشيء فانصهر" یعنی میں نے اس شے کو پگھلایا تو وہ پگھل گئی۔ "صهير" پگھلائی ہوئی شے ہوئی، معنی یہ ہیں کہ "أمعاء و أحشاء" آنتیں وغیرہ، جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہوگا وہ سب پگھلا دیا جائے گا۔

﴿ وَالْجُلُودُ ﴾ اس میں دو وجہ ہیں۔ ظاہر تر وجہ یہ ہے کہ مائے موصولہ پر معطوف ہے، یعنی گلا دی جائیں گی

---

[1] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٨٨) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٥)

آنتیں جو ان کے شکم میں ہیں اور چمڑے بھی گلا دیے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ظاہر اور باطن پگھلا دیا جائے گا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔ ان کے الفاظ یوں ہیں: "يؤثر من فرط حرارته في بطونهم تأثيره في ظاهرهم فتذاب به أحشاءهم كما تذاب به جلودهم" علامہ نسفی رحمہ اللہ کی مختار بھی یہی وجہ ہے۔[1] دوسری وجہ یہ ہے کہ مرفوع بہ فعلِ مقدر ہے، یعنی "و تحرق الجلود" وجہ اس کی یہ ذکر کی ہے کہ چمڑے پگھلائے نہیں جاتے۔ چمڑے تو جس وقت آگ سے جلائے جاتے ہیں تو سکڑ جاتے ہیں، اس لیے فعل چمڑوں کی مناسبت سے مقدر کیا جائے گا، مثلاً: "تحرق"۔ مثال اس کی کسی شاعر کا قول ہے ؎

عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَاءًا بَارِدًا

یہاں "ماءً" کا فعل مقدر ہے، یعنی "سقيتها ماءً بارداً" کیوں کہ گھاس چراتے ہیں اور پانی پلاتے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے، اسی واسطے "وتشوی" فعل مقدر نکالا۔[2] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مخفی نہ رہے کہ اس وجہ کی طرف کوئی شے ملجا نہیں ہے، کیوں کہ جب حمیم اُن کے پیٹوں کے اندر کی چیزوں کو پگھلا ڈالے گا تو ظاہری جلد کو بالاولیٰ پگھلا دے گا۔[3] غرض کہ اُن کے نزدیک بھی وجہ اول مختار ٹھہری۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ تاخیر ﴿ وَالْجُلُوْدُ ﴾ کی، یعنی اول وجہ کی بنا پر دو وجہ سے ہے: یا تو فواصل کی رعایت کے واسطے، یا شدتِ حرارت کی انتہا کی خبر دینے کو اس بات کا ابہام کر کے کہ باطن میں حرارت کی تاخیر ظاہر میں اس کی تاثیر سے قوی تر ہے، باوجود اس کے کہ اس کی ملابست اس کے برعکس ہے۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ جب ثوب اس شے میں ظاہر تھا جو جسم کو ڈھانک دے سوائے سر کے تو ﴿ يُصَبُّ ﴾ فرما کر اس شے کا ذکر کیا جو سر کو پہنچے گی اور جب وہ شے ذکر کی جس سے ظاہر جسم کو عذاب کیا جائے گا تو وہ شے ذکر فرمائی، جس سے باطن جسم کو عذاب ہوگا، وہ شے حمیم ہے، جو پیٹ کے اندر کی آنتوں وغیرہ کو گلا ڈالے گا اور یہ گلنا ظاہر کی طرف پہنچے گا تو اس میں ایسی تاثیر کرے گا جیسی کہ باطن میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴾[4] [محمد: ۱۵] "جو اُن کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ کی ضمیر میں دو وجہ ہیں، ظاہر تر وجہ یہ ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ کی طرف راجع ہے۔ اب لام میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ لام استحقاق کے واسطے ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ بمعنی "علیٰ" ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ ﴾ [المؤمن: ٥٢] "اور ان کے لیے لعنت ہے۔" یہ قول کچھ نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ضمیر زبانیہ اعوانِ جہنم کی طرف راجع ہے۔ سیاقِ کلام انھیں پر دال

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٠) تفسیر النسفي (٣/ ٩٩) [2] تفسیر الجلالین (١/ ٤٣٥)
[3] فتح القدیر (٣/ ٦٠٥) [4] البحر المحیط (٦/ ٣٣٤)

ہے۔ اس قول میں بُعد ہے۔ ﴿ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ صفت ہے ﴿ مَقَامِعُ ﴾ کی۔ ﴿ مَقَامِعُ ﴾ "مِقمعه" کی جمع ہے بکسرِ میم، اس لیے کہ "مقمعه" آلہ قمع ہے، جب کوئی شخص کسی شخص کو کسی شے سے زجر و ذلیل کر کے مارتا ہے تو کہتے ہیں: "قمعه يقمعه" باب قطع سے۔ "مِقمعه" بہ معنی "مِطرقه" ہے، یعنی ہتھوڑا۔ کسی نے کہا: "سوط" ہے، یعنی کوڑا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ کہا ہے کہ ﴿ مَقَامِعُ ﴾ لوہے کے کوڑے ہیں، اُن سے مارے جائیں گے۔ "مقمعه" کی جمع ہے۔ "مقمعه" کی حقیقت ایک شے ہے جس سے قمع کیا جاتا ہے،[1] یعنی سختی کے ساتھ باز رکھا جاتا ہے۔

فتح القدیر میں ہے: ﴿ مَقَامِعُ ﴾ "مقمعة و مقمع" کی جمع ہے۔ معنی "قمته" کے یہ ہیں کہ میں نے اس کو مقمع سے مارا۔ مقمع لوہے کا ایک قطع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اُن کے لیے مقامع ہیں، اُن سے مارے جائیں گے، یعنی کفار۔ مقامع کا نام مقامع اس لیے رکھا کہ وہ مضروب کو قمع کرتے ہیں، یعنی اس کو ذلیل کرتے ہیں۔ ابن سکیت نے کہا ہے "أقمعت الرجل عني إقماعا" یہ قول تو اس وقت کہتا ہے کہ جس وقت وہ تجھ پر ظاہر ہو، پھر تو اس کو خود سے دور کر دے۔[2]

﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾، ﴿ مِنْ غَمٍّ ﴾ میں کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ تعلیل کا ہے، ﴿ يَخْرُجُوْا ﴾ سے متعلق ہے، ارادہ اس جگہ قرب کو ظاہر کرنا ہے، یعنی جب وہ اس کے قریب ہوں گے کہ آگ سے نکلیں بہ سبب غم و کرب کے، جو اُن کو آگ سے لاحق ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ آگ اُن کو اونچا اُٹھائے گی اور آگ کی بلندی کی طرف پھینکے گی، ان کے خروج، یعنی نکلنے کے لیے نہیں، کیوں کہ اللہ پاک نے دوزخیوں کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ [البقرة: ١٦٧] "وہ ہرگز جہنم سے نہ نکلیں گے۔" اور اسی واسطے ﴿ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾ فرمایا۔ "إِلَيْهَا" نہ کہا۔ اور بعض نے ارادے کو اپنی حقیقت پر باقی رکھا ہے اور "مَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا" کے دو جواب دیے ہیں: ایک یہ ہے کہ خروج پر استمرار نہ کریں گے۔ دوسرا یہ کہ عود کبھی "في" سے متعدی ہوتا ہے، تا کہ تمکن و استقرار پر دلالت کرے اور ارادے کا ذکر اس لیے کیا کہ اُن کی رغبت پر دلالت کرے خروج میں۔[3] (كذا قال الشهاب)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿ مِنْ غَمٍّ ﴾، ﴿ مِنْهَا ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے باعادۂ جار۔ یا پہلا ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے واسطے ہے اور دوسرا بہ معنی "من أجل"۔[4] (فتح القدیر میں ﴿ مِنْ غَمٍّ ﴾ کو مفعول لہ کہا ہے۔ "أي لأجل غم شديد من غموم النار"[5] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنوین غم کی تعظیم کے واسطے ہے۔) یعنی

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٥) [3] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٨٩)
[4] تفسير النسفي (٣/ ٩٩-١٠٠) [5] فتح القدير (٣/ ٦٠٥)

جب وہ ارادہ کریں گے آگ سے نکلنے کا بہ سبب غم کے، جو اُن کو لاحق ہوگا، پس وہ نکلیں گے تو موگریوں سے، پھر اسی میں لوٹا دیے جائیں گے۔ (اسی طرح امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ ﴿أُعِيْدُوْا﴾ سے پہلے "فخرجوا" نکالا ہے اور کہا ہے: اس لیے کہ اعادہ نہیں ہوتا، مگر خروج کے بعد۔[1])

امام حسن بصری رحمہ اللہ کے نزدیک خروج کے معنی یہ ہیں کہ آگ اُن کو اپنے شعلے سے مارے گی تو اُن کو اپنی بلندی کی طرف ڈال دے گی، پھر وہ موگریوں سے مارے جائیں گے تو وہ اس میں ستر خریف کے سفر جتنا جھک پڑیں گے[2] اور مراد یہ ہے کہ اُن کو بڑی آگ کی طرف لوٹایا جائے گا، نہ یہ کہ وہ اس سے بالکل جدا ہو جائیں گے، پھر اس کی طرف اعادہ کریں گے۔

﴿وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ یہاں قول مقدر ہے، یعنی اسی آگ کے اندر ڈال دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو عذاب جلانے والا۔ "حریق" کی اصل "احتراق" سے اسم مصدر ہے۔ "تحرق الشيئ بالنار و احترق حُرقةً واحتراقاً" ذوق ایک ایسی مماسّت ہے کہ جس کے ساتھ ذائقہ معلوم ہوتا ہے اور یہاں اس میں وسعت کی گئی ہے۔ مراد اُس سے درد اور تکلیف کا ادراک ہے۔[3] (كذا في فتح القدير وفتح البيان) امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "﴿عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ أي النار البالغة في الإحراق"[4] یعنی "حریق" بہ معنی "محرق" ہے، جیسے "سمیع" بہ معنی "مسمع"۔ "محرق" چھوڑ کر صیغۂ فعیل اس لیے اختیار کیا کہ مبالغے پر دلالت کرے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "هو الغليظ من النار المنتشر العظيم الإهلاك"[5] امام محلی رحمہ اللہ کے الفاظ: "البالغ نهاية الإحراق" ہیں۔[6]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے "هٰذَانِّ" بہ تشدیدِ نون پڑھا ہے اور "قُطِعَتْ" بہ تخفیف حرفِ طائے مہملہ پڑھا گیا اور "رُءُوْسِهِمْ" بکسرِ ہا و میم قراءتِ بصری ہے اور بضمِ ہر دو حمزہ، علی رضی اللہ عنہ اور خلف نے پڑھا ہے اور بکسرِ ہا و ضمِ میم اُن کے علاوہ دوسروں نے اور "یصھر" بہ تشدید واسطے تکثیر کے پڑھا ہے۔ اول کو شوکانی نے اور ثانی اور رابع کو بیضاوی نے اور ثالث کو علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[7] رحمهم الله تعالیٰ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ یعنی جو حال و مآل کہ مذکور ہوا یہ احد الخصمین (برسرپیکار ایک فریق) کے لیے ہے اور دوسرے فریق، یعنی مومنین کے حق میں یہ ارشاد فرمایا:[8]

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) [2] تفسير الرازي (٢٣/ ٢٠) [3] فتح القدير (٣/ ٦٠٥) فتح البيان (٩/ ٣١)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) [5] تفسير النسفي (٣/ ١٠٠) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٥)
[7] فتح القدير (٣/ ٦٠٥) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٠) تفسير النسفي (٣/ ٩٩) [8] فتح القدير (٣/ ٦٠٥)

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴿٢٤﴾

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، یقیناً اللہ ان کو (ایسے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا (23) اور انھیں پاکیزہ بات کی ہدایت دی گئی، اور قابلِ تعریف (اللہ کی) راہ دکھائی گئی (24)

مومنوں کی جزا و بدلہ:

یہ جو فرمایا کہ وہاں کا گہنا اور وہاں کی پوشاک تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں یہاں نہیں اور گہنوں میں سے کنگن اس لیے کہ غلام کی خدمت پسند آتی ہے تو اسے کڑے ڈالتے ہیں۔ پاکیزہ بات، یعنی بہشت میں لڑنا جھگڑنا اور بکواس نہیں، سوائے خوشی کی بات کے اور اللہ کا شکر، یا دنیا میں توحید کا راستہ پایا اور مسلمانی کی راہ۔ انتھی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ نار کے حال کی خبر دی۔ عَيَاذًا بِاللّٰهِ مِنْ حَالِهِمْ۔ اور اُس عذاب، سزا اور حریق و اغلال کی خبر دی جس میں وہ ہیں اور آگ کے اس لباس کی جو اُن کے لیے تیار کر رکھا ہے تو اہلِ جنت کے حال کا ذکر کیا۔ نسأل الله من فضله و كرمه۔ پس فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ ... الخ﴾ یعنی جنتوں کے اکناف، ارجاء، جوانب اور اطراف میں اُن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کو جہاں چاہیں گے پھیر لے جائیں گے اور جنتوں میں زیور پہنائے جائیں گے، جو سونے اور موتیوں کے کنگن ہوں گے، یعنی اُن کے ہاتھوں میں، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے متفق علیہ حدیث میں فرمایا کہ مومن کا زیور وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک وضو پہنچتا ہے۔[1] کعب احبار نے کہا ہے کہ جنت میں ایک فرشتہ ہے، اگر میں چاہوں کہ اس کا نام بتاؤں تو بتا دوں، وہ زیور گھڑ رہا ہے اہلِ جنت کے لیے، جب سے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے روزِ قیامت تک۔ اگر اس میں سے ایک کنگن ظاہر کیا جائے تو سورج کی شعاع کو رد کر دے، جس طرح کہ سورج چاند کے نور کو رد کر دیتا ہے۔[2]

﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾ یعنی جنت والوں کا لباس جنت میں ریشم ہوگا، یہ لباس اہلِ نار کے لباس کے مقابلے میں فرمایا ہے، جو اُن کے لیے قطع ہو چکا ہے۔ ان کا لباس استبرق و سندس حریر کا ہوگا (سندس ریشم کا ایک باریک کپڑا اور استبرق ریشم کا موٹا کپڑا ہے) جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠) (2) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٤)

وَّاِسْتَبْرَقٌ ۘ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَّسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿21﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾ [الدھر: ۲۱۔ ۲۲] ''ان (کے تن) پر باریک، سبز اور دبیز ریشم کے کپڑے (لباس) ہوں گے، اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور اُن کا رب انھیں شراب طہور پلائے گا۔ (کہا جائے گا:) بلاشبہہ یہ تمھاری جزا ہے اور تمھاری سعی قابلِ قدر ہے۔'' صحیح میں مروی ہے کہ مت پہنو تم حریر اور نہ دیباج دنیا میں، پس بے شک جو شخص اس کو دنیا میں پہنے گا تو آخرت میں اس کو نہ پہنے گا۔[1] (فتح القدیر میں یوں ہے: "وفي الصحيحين وغيرهما عن عمر رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِيْ الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِيْ الْآخِرَةِ» وفي الباب أحاديث"۔) عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: جو شخص آخرت میں حریر نہ پہنے گا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴾[2]

﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (أخرج ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن ابن عباس رضي الله عنهما في قوله: ﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ قال: الهموا. و أخرج ابن أبي حاتم عن أبي العالية. قال: ﴿هدوا إلى الطيب من القول﴾ في الخصومة إذ قالوا: الله مولانا و لا مولىٰ لكم۔ و أخرج ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن إسماعيل بن أبي خالد في الآية، قال: القرآن: ﴿ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴾ قال: الإسلام. و أخرج ابن أبي شيبة و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن الضحاك في الآية، قال: الإسلام و أخرج ابن أبي حاتم عن ابن زيد قال: لا إلٰه إلا الله، والله أكبر، و الحمد لله، الذي قال: ﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ﴾[1] (فتح القدير))

جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴾ [إبراهيم: ٢٣] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہ ایسی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ وہاں ان کی (ملاقات کی) دعا ''سلام'' ہوگی۔'' اور جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿23﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ [الرعد: ٢٣۔ ٢٤] ''اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ (اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو، اس لیے کہ تم نے صبر کیا، لہٰذا آخرت کا گھر بہت خوب ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿25﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ [الواقعة: ٢٥۔ ٢٦] ''اور وہ اس (جنت) میں نہ لغو سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔ (ہاں!) مگر ایک بول

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٩) مسند أحمد (١/ ٣٧)

سلام ہے سلام ہے۔''

پس وہ راہ بتائے گئے اس مکان کی طرف کہ جس میں سنیں گے ستھری بات۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴾ [الفرقان: ٧٥] ''اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ ان کا استقبال ہوگا۔'' پس جس طرح کہ دوزخ والے اہانت کیے جائیں گے ایسی بات کے ساتھ، جس سے اُن کو ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کی جائے گی، ان سے کہیں گے: ﴿ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ یعنی تم چکھتے رہو جلن کی مار۔ مومنوں کو ﴿ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴾ اس مکان کی طرف راہنمائی کی جائے گی جس میں اپنے رب کی حمد کریں گے اس شے پر، جس کا اس نے اُن پر احسان و انعام کیا اور جو شے اُن کو عطا فرمائی، جیسا کہ حدیثِ صحیح میں مروی ہے کہ وہ الہام کیے جائیں گے تسبیح و تحمید کا، جس طرح کہ الہام کیے جائیں گے سانس کا،[2] یعنی جس طرح سانس میں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوتی، اسی طرح بلا تکلف ''سبحان الله و الحمد لله'' کہتے رہیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قولِ طیب سے مراد قرآن شریف ہے، بعض نے کہا: ''لا إله إلا الله''۔ کسی نے کہا: اذکارِ مشروعہ اور صراطِ حمید سے مراد صراطِ مستقیم ہے دنیا میں اور یہ سب اس کے منافی نہیں، جو ہم ذکر کر آئے ہیں۔ والله أعلم.

سیدنا معاویہ جد بہز بن حکیم رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک جنت میں پانی کا دریا ہے اور شہد کا دریا ہے اور دودھ کا دریا ہے اور شراب کا دریا ہے۔ پھر اس کے بعد نہریں پھاڑی جائیں گی، یعنی اُن سب دریاؤں سے نہریں پھاڑ کر مومنین کے ہمراہ کی جائیں گی، جہاں وہ جائیں گے اُن کے ساتھ چلی جائیں گی، جس نہر سے پینا چاہیں گے، فوراً اُن کے منہ سے آلگے گی: ''سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم''[3] (أخرجه الترمذي فقال: حديث صحيح)

متفق علیہ حدیث میں سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: دو جنتیں ہیں چاندی کی، یعنی اُن کے برتن اور جو کچھ اُن میں ہے سب چاندی کا ہے اور دو جنتیں سونے کی، اُن کے برتن اور جو کچھ اُن میں ہے سب سونے کا ہے اور نہیں قوم کے اور اس بات کے درمیان کہ اپنے رب کی طرف دیکھیں جناتِ عدن میں، مگر اس کے منہ پر کبریائی کی چادر ہے۔[4] سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اُن پر ایسے تاج ہیں کہ اُن کا ادنیٰ سا موتی مشرق اور مغرب کے درمیان روشنی کر دے گا۔[5] (أخرجه الترمذي و قال: حديث غريب كذا في الخازن)

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٤٨٣) فتح القدير (٣/ ٦٠٧۔ ٦٠٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٥)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٢٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٦٢) تفسير الخازن (٥/ ١١) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٨٨٢)

آیت باب تمہ ہے فصلِ خصومت سے اور اس آیت کے مقابلے میں ہے: ﴿ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ﴾۔ پس مناسب اسلوب اس کا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحٰتِ أُعِدَّتْ لَهُمْ جَنّٰتٌ"، مگر مومنین کی تعظیمِ شان اور اُن کے حال کی تعریف کرنے کے لیے اسلوبِ کلام کو بدل دیا اور جنت میں داخل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور اس کو حرفِ تحقیق کے ساتھ مؤکد کر کے یوں کہا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ پھر جو ساز و برگ، ناز و نعمت و عیش و عشرت کا دخول جنت کے بعد مومنین سے عاملین بالصالحات کے لیے مہیا کر رکھا ہے، اس میں سے بعض کا بیان فرمایا کہ ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ﴾۔ "أنهار" ہے جمع "نَهَر" بفتحتین کی۔ اور ہا کے سکون کے ساتھ "نَهْر" کی جمع "أَنْهُر" آتی ہے، جیسے: "فَلْس" کی جمع "أَفْلُس" ہے۔ (قاله الحفناوي)

جمہور کی قراءت بضمِ "تحتیه" وفتحِ لام مشددہ بصیغۂ مجہول ہے، "تحلیه" باب تفعیل سے ہے، جب کوئی شخص عورت کو زیور پہناتا ہے تو کہتا ہے: "حلیتها"، یعنی میں نے اس کو زیور پہنایا۔ کسی نے اس کو "يُحْلَوْنَ" بہ تخفیفِ لام بہ صیغۂ مجہول علی باب "ضَرَبَ" سے پڑھا ہے۔ معنی دونوں قراءتوں کے ایک ہیں۔ (شیخ زادہ نے کہا: "يقال حليت المرأة أحليها حَليا وحلّيتها تحلية إذا جعلت لها حَلْيا" اس سے معلوم ہوا کہ "يحلون" بہ تخفیفِ لام باب ضرب سے ہے اور امام سمین رحمہ اللہ نے دونوں قراءتوں کے ذکر کے بعد یوں کہا ہے: "كأنهم عدوه تارة بالتضعيف و تارة بالهمزة" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "يحلون" بہ تخفیفِ لام إحلاء باب افعال سے ہے۔ واللہ أعلم.

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: بہ تخفیف اس قول سے ہے: "أحلي: ألبس الحلي" اور یہ بہ معنی مشدد ہے اور بفتح یا وتخفیفِ لام بھی پڑھا ہے، یہ ماخوذ ہے اس محاورے سے "حليت المرأة تحلى إذا لبست الحلي" یہ بھی جائز ہے کہ اس محاورے سے ہو: "حلي بعيني كذا إذا حسن" اور ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہو، یا مفعول محذوف ٹھہرے اور ﴿ مِنْ اَسَاوِرَ ﴾ اس کی نعت ہو۔ کسی نے کہا: اس محاورے سے ماخوذ ہے: "حليت بكذا إذا ظفرت به" اور ﴿ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ نعت ہے ﴿ اَسَاوِرَ ﴾ کی۔[1]) جنت والے جنت میں زیور پہنائے جائیں گے، یعنی اللہ پاک ان کو زیور پہنائے گا، یا فرشتے اس کے حکم سے پہنائیں گے۔

﴿ مِنْ اَسَاوِرَ ﴾ کے ﴿ مِنْ ﴾ میں تین وجہ ہیں: یا تو تبعیض کے واسطے ہے، یعنی ﴿ يُحَلَّوْنَ ﴾ بعض ﴿ اَسَاوِرَ ﴾، یا بیانِ جنس کے واسطے، یا زائدہ ہے اور ﴿ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ بیان کے واسطے ہے۔

---

(1) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٨)

"أَسَاوِر" "أسورة" کی جمع ہے اور "أسورة" "سوار" کی جمع ہے۔ سوار میں دو لغت ہیں: بکسر سین اور بضم سین۔ تیسری لغت اس میں "اسوار" ہے۔ "سوار" کنگن کو کہتے ہیں، جس کو ہاتھ میں پہنتے ہیں فارسی میں اس کو یارہ و دست برنجن و دست اورنجن بولتے ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مِنْ اَسَاوِرَ﴾ صفت ہے مفعول محذوف کی اور ﴿مِنْ ذَهَبٍ﴾ بیان ہے ﴿اَسَاوِرَ﴾ کا۔[1] شیخ زادہ نے کہا یعنی "يحلون فيها حليا كائنا من أساور" أو "ملبوسا كائنا من أساور" اس میں بحث ہے اس واسطے کہ "حلَيت وحلَّيت مخفف و مشدّد" ایک معنی میں ہیں، یہ دونوں ایک ہی مفعول کی طرف متعدی ہوتے ہیں۔ پھر ﴿يُحَلَّوْنَ﴾ کے لیے مفعول منصوب کیوں کر مقدر کیا جائے گا، مگر یہ کہ ﴿يُحَلَّوْنَ﴾ کو بہ معنی "يلبسون" ٹھہرائیں۔ ظاہر یہ ہے کہ ﴿مِنْ﴾ ابتدائیہ قرار دیا جائے اور ﴿يُحَلَّوْنَ﴾ سے متعلق ہو۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مِنْ ذَهَبٍ﴾ کا ﴿مِنْ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے اور نعت ہے ﴿اَسَاوِرَ﴾ کی۔ ﴿وَلُؤْلُؤًا﴾ میں دو قراءتیں ہیں۔ امام نافع، ابن کثیر، عاصم، شیبہ، یعقوب، جحدری اور عیسیٰ بن عمر نے اس کو بہ نصب پڑھا ہے،[2] اس کی توجیہ دو طرح پر ہے: ایک یہ ہے کہ معطوف ہے ﴿اَسَاوِرَ﴾ کے محل پر۔ تقدیر یہ ہے: "ويحلون حليا من أساور" پس ﴿اَسَاوِرَ﴾ موضع نصب میں ہے، اس بنا پر کہ صفت ہے مفعول محذوف کی۔

جب ﴿لُؤْلُؤًا﴾ اس پر معطوف ہوا تو تقدیر یہ ہوئی: "ويحلون لؤلؤا" یعنی پہنائے جائیں گے ایسا زیور کہ وہ سونے کے کنگن ہیں اور پہنائے جائیں گے موتی۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس کا فعل ناصب محذوف ہے، مثلاً: "ويؤتون لؤلؤا" یعنی پہنائے جائیں گے سونے کے کنگن اور دیے جائیں گے موتی۔ امام زمخشری اور نسفی رحمہما اللہ نے اسی توجیہ پر اکتفا کیا ہے اور امام محلی رحمہ اللہ نے اول پر اور بیضاوی و فتح القدیر نے دونوں کو ذکر کیا ہے۔[3] یہ قراءت رسمِ مصحف کے موافق ہے، اس لیے کہ یہ حرف مصحفِ امام میں الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری قراءت باقی قراء، یعنی جمہور کی بہ خبر ہے۔ توجیہ اس کی یہ ہے کہ ﴿ذَهَبٍ﴾ پر معطوف ہے، جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اس پر مبنی ہے کہ کنگن مرکب ہیں سونے اور موتی سے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی صورت یہ بیان کی ہے کہ موتی مرصع کیے جائیں گے سونے سے، یعنی سونے سے موتی جڑ کر کنگن بنائے جائیں گے اس صورت کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ منظورِ نظر بعض کے قول کا دفع کرنا ہے۔ (امام محلی رحمہ اللہ کا لفظ یہ ہے کہ "بأن يرصع اللؤلؤ بالذهب"[4] اس پر امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ عبارتِ مفسر میں قلب ہے۔ اصل یوں ہے: "بأن يرصع الذهب باللؤلؤ كما يدل عليه عبارة البيضاوي"[5])

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) [2] فتح القدير (٣/ ٦٠٦)

[3] الكشاف (٣/ ١٥١) تفسير النسفي (٣/ ١٠٠) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) فتح القدير (٣/ ٦٠٦)

[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١)

آیتِ کہف میں ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ ہے۔ اس میں لولو کا ذکر نہیں ہے۔ سورت ﴿هَلْ أَتَىٰ﴾ میں ﴿ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ﴾ ہے، اس میں نہ موتی کا ذکر ہے نہ سونے کا۔ پس اُن کے واسطے اُن سب چیزوں سے زینت کی جائے گی، تنہا سونے سے، تنہا چاندی سے اور سونے اور موتیوں سے۔) کسی نے کہا ہے کہ موتی کا کنگن معہود و معروف نہیں ہے اور ﴿ لُؤْلُؤًا ﴾ ﴿ أَسَاوِرَ ﴾ پر معطوف ہے، ﴿ذَهَبٍ﴾ پر معطوف نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے: ﴿ لُؤْلُؤًا ﴾ ﴿ أَسَاوِرَ ﴾ پر معطوف ہے، ﴿ ذَهَبٍ ﴾ پر معطوف نہیں ہے کہ عام طور سے کنگن موتی کا نہیں ہوتا اور موتی کا زیور ہونا صحیح ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ پر معطوف ہے۔[2] قاضی صاحب نے فرمایا ہے کہ ﴿ أَسَاوِرَ ﴾ پر معطوف ہے ﴿ مِنْ ﴾ پر نہیں ہے، کیونکہ سوار موتی سے معہود نہیں ہے، مگر یہ کہ سوار موتیوں سے مرصع مراد لیے جائیں۔[3] یعنی معنی یہ ہوتے ہیں کہ کنگن کبھی صرف سونے سے بنتے ہیں، کبھی تنہا موتیوں سے، مگر تنہا موتیوں سے کنگن کا بننا معہود نہیں ہے۔

رہا عطف ﴿ وَلُؤْلُؤًا ﴾ کا ﴿ ذَهَبٍ ﴾ پر، سو وہ اسی بنا پر جائز ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہوں کہ کنگن سونے اور موتیوں کے ہوں اس طریقے سے کہ موتی سونے میں مرصع کیے جائیں اور جڑاؤ کنگن بنیں۔ ظاہر یہ ہے کہ کبھی کنگن تنہا موتیوں سے بھی بنتا ہے، بعض موتی بعض سے ملائے جاتے ہیں۔ جو کچھ باب میں ہے، اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ مفسرین کے زمانے میں یہ امر عام نہ ہو۔ یہ حاصل ہے شیخ زادہ کے بیان کا۔ غرض کہ دنیا میں صرف موتیوں کا کنگن بنے یا نہ بنے، اس سے کیا بحث، یہاں تو جنت کا بیان ہے، جس میں ایک ایک مجوف موتی کے بڑے بڑے محل ہیں اور ایسی ایسی عجیب و غریب چیزیں ہیں جو کسی آنکھ نے نہ دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی بشر کے قلب پر اس کا خیال تک گزرا۔ ایسی جگہ کا کیا ذکر ہے، یہاں اگر صرف موتیوں کے کنگن ہوں تو کیا تعجب ہے۔

فتح القدیر میں بھی یہی کہا ہے کہ ﴿ أَسَاوِرَ ﴾ پر عطف ہے: "أي يحلون من أساور ومن لؤلؤ"۔ موتی وہ شے ہے جو دریا سے سیپ کے اندر سے نکالی جاتی ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: مراد کنگن کا موتیوں سے مرصع کرنا ہے اور یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ جنت میں ٹھوس موتیوں کا کنگن ہو، جس طرح کہ وہاں سونے کے کنگن ہیں۔[4] سلیمان جمل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے تذکرۂ قرطبی میں دیکھا کہ جنت میں مومن کو تین کنگن پہنائے جائیں گے: ایک کنگن سونے کا اور ایک کنگن چاندی کا اور ایک کنگن موتیوں کا۔ پس یہ وہی قول ہے اللہ پاک کا ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴾ مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ جنت میں سے کوئی نہیں ہے، مگر حال یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں تین کنگن ہوں گے: ایک سونے کا، ایک چاندی کا اور ایک موتیوں کا۔ صحیح

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٨) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠٠)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) [4] فتح القدير (٣/ ٦٠٦)

میں مروی ہے کہ مومن کا زیور وہاں پہنچے گا جس جگہ وضو پہنچتا ہے۔[1] سلیمان جمل رحمہ اللہ کی غرض اس قول کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ امام قرطبی رحمہ اللہ کے قول سے صرف موتی کا کنگن ہونا معلوم ہوگیا، اب کچھ ضرورت نہیں ہے کہ موتی کا کنگن یوں بنایا جائے کہ موتیوں اور سونے سے اس کو مرصع کہیں، جیسا کہ علامہ محلی و قاضی صاحب نے فرمایا ہے۔[2] وللہ الحمد.

لفظ ''لؤلؤ'' کی رسم (تحریر) میں اختلاف ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ مصحف امام میں ''لؤلؤ'' بغیر الف کے ہے واؤ کے بعد۔ جحدری نے نقل کیا ہے کہ امام میں واؤ کے بعد الف ہے۔ یہی اختلاف بعینہٖ قراءۃً و توجیہاً حرفِ فاطر میں بھی جاری ہے۔ حفص نے ''لؤلؤ'' کو دو ہمزوں سے پڑھا ہے۔ اس کو عاصم سے روایت کیا ہے اور ابوبکر نے عاصم سے ''لؤلو'' روایت کیا ہے، دوسرے ہمزے کو واؤ میں مدغم کیا ہے۔ اور ''لولیا'' بھی پڑھا گیا ہے، پہلے ہمزے کو واو سے اور دوسرے کو حرفِ یا سے بدلا ہے۔ اصل میں ''لؤلؤ'' دو ہمزہ کے ساتھ ہے، ان میں کا ہر ایک واو سے بدلا گیا تو آخر اسم متمکن کا واو ہوا کہ جس کے پہلے ضمہ ہے، یہ بات کلامِ عرب میں عام نہیں ہے، مگر کلمہ ﴿هُوَ﴾ میں ہے۔ پس اس میں وہ بات کی گئی جو اول جمع ''وَلُو'' میں کی گئی اس طریقے سے کہ واو کو یا سے اور ضمہ کو کسرے سے قلب کیا۔ اسی طرح اس شخص نے بھی کیا ہے، جس نے ''لیلیا'' دو یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر پہلے واو کو قلب میں دوسرے کا تابع کیا۔ کسی نے ''ولولٍ'' بجر پڑھا ہے، مجرور ماقبل پر اس کا عطف کیا ہے، اصل ''لؤلؤ'' ہے، دو ہمزے دو واؤ سے بدلے گئے۔ پھر اول کا اعلال کیا گیا اس طریقے سے کہ ضمۂ لام کو کسرے سے اور واؤ کو حرف یا سے قلب کیا، پھر قاض کا اعلال کیا گیا۔ کذا قالہ شیخ زادہ وغیرہ۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ پہلے ہمزہ کو ترک کر کے سارے قرآن میں ابوبکر و حماد نے پڑھا ہے۔[3]

﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾ یعنی بہشتیوں کا لباس جنت میں ریشم کا ہوگا۔ ظاہراً طرزِ کلام یہ ہے کہ یوں کہا جاتا: ''ولؤلؤاً و حریراً'' بہ نصب ہر دو کلمہ یا بجر ہر دو بطورِ عطف مفرد بر مفرد یا ''ویلبسون حریرا'' بطورِ عطف جملہ بر جملہ، لیکن اسلوبِ کلام کو بدلا۔ اس کی دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ منظور آگاہ کرنا ہے، اس بات پر کہ بہشتیوں کی پوشاک معتاد یہی ریشم ہے، کیوں کہ جملہ اسمیہ ثبوت و دوام پر دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک جنت میں اُن کو وہ لباس عطا فرمائے گا جس کو دنیا میں اُن پر حرام کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص دنیا میں حریر پہنے گا تو وہ آخرت میں اس کو نہ پہنے گا۔ پھر اگر وہ جنت میں داخل ہوگیا تو جنت والے اس کو پہنیں گے، مگر وہ نہ پہنے گا۔[4]

محل اس کا اس شخص کے حق میں ہے جو اس پر اصرار کرتا ہوا مرگیا۔ یہ وجہ امام کرخی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے اور

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١)

[3] تفسير النسفي (٣/ ١٠٠) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٩)

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو مختصراً ذکر کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فواصل کی ہیئت محفوظ رکھنا منظور ہے۔[1] (قاله البيضاوي) لیکن یہ وجہ نصب کی صورت میں بنے گی، کیوں کہ اگر "حریراً" بہ نصب ہو تو اس کلمے کی ہیئت حدید و حریق وحمید کی ہیئت پر حالتِ وقف میں نہ رہے گی، اس واسطے کہ کتابت و وقف میں آخر حرف فاصلے کا الف ہوگا، بخلاف کلماتِ باقیہ کے کہ اُن کے آخر میں الف نہیں ہے، ہاں اگر ﴿ حَرِيْرٌ ﴾ بجر ہو تو اس میں ہیئت فواصل کی محفوظ رہے گی۔ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے امام کرخی رحمہ اللہ کے قولِ مذکور کو نقل کرنے کے بعد کہا کہ پھر میں نے تذکرۂ قرطبی میں دیکھا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ حدیث شریف میں مروی ہے کہ جس شخص نے دنیا میں شراب پی، وہ اس کو آخرت میں نہ پیے گا۔[2] اسی طرح دنیا میں حریر (ریشم) پہننے والا ہے اور اسی طرح وہ شخص ہے جس نے دنیا میں سونے چاندی کے برتن کا استعمال کیا ہے۔[3]

سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے گانے بجانے کی آواز کی طرف کان رکھا تو اس کے لیے اس واسطے اِذن نہ دیا جائے گا کہ روحانیین کو سنے، پس کسی نے کہا: یا رسول اللہ! روحانیین کون ہیں؟ فرمایا: اہلِ جنت کے قراء۔[4] (أخرجه الترمذي في نوادر الأصول) کسی نے کہا ہے کہ شراب کا پینا، ریشم کا پہننا، سونے چاندی کے برتن میں پینا اور روحانیوں کی آواز سننا، اس شخص کا ان سب چیزوں سے محروم ہونا، اسی وقت میں ہوگا کہ جس میں آگ کے اندر عذاب کیا جائے گا اور "طينة الخبال" (دوزخیوں کا پیپ اور خون) اسے پلایا جائے گا۔ پھر جس وقت وہ شفاعت کے سبب سے، یا رحمتِ عامہ کے سبب سے نار سے نکلے گا تو جنت میں داخل کیا جائے گا اور من جملہ اشیائے مذکورہ کسی شے سے محروم نہ ہوگا، نہ شراب سے نہ حریر وغیرہ سے، اس واسطے کہ دنیا کی لذات میں سے کسی لذت سے بھی محروم ہونا، اس شخص کے لیے جو جنت میں ہو ایک طرح کی سزا اور مواخذہ ہے، حالاں کہ بہشت عنبر سرشت کسی طرح کی سزا کا گھر نہیں ہے اور نہ ہی کسی طرح کا مؤاخذہ اس میں ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد کسے را با کسے کارے نہ باشد

"بہشت وہ جگہ ہے جہاں کسی قسم کا دُکھ نہیں ہوگا اور کسی فرد کا کسی دوسرے سے کوئی بھی معاملہ متعلق نہیں ہوگا۔ ہر ایک آزاد اور بے نیاز ہوگا۔"

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابو سعید اور ابو موسی رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اس قول کو رد کرتی ہے، جس طرح کہ کم رُتبے والا اپنے سے بلند رُتبے والے کا مرتبہ نہ چاہے گا اور یہ کسی طرح کی عقوبت نہیں ہے۔[5] مطلب یہ

---

1. تفسير البيضاوي (٤/ ١٢١) 2. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣) 3. التذكرة للقرطبي (١/ ٩٤٢۔ ٩٤٣)
4. نوادر الأصول (٣/ ٢٨٥) اس کی سند میں "حماد بن عمرو" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٦٥١٦)
5. التذكرة للقرطبي (١/ ١٠٢٤)

ہے کہ جنت خوشی کا گھر ہے، اس میں کم مرتبہ و بلند رُتبہ اپنے اپنے مرتبے سے خوش ہوں گے، ایک دوسرے کا مرتبہ نہ چاہے گا، اس کی خواہش اُن کے دل سے جاتی رہے گی۔ فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ ﴿ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو لباس وہ پہنیں گے وہ سارا حریر ہے، چنانچہ لباس کی ﴿ لَهُمْ ﴾ کی طرف اضافت کے یہی معنی ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مراد لباس کی یہ قسم ہو جو دنیا میں اُن پر حرام تھی، آخرت میں اُن کے لیے حلال ہوگئی اور جو لباس جنت میں زیبِ تن کریں گے، من جملہ اُن کے ایک قسم حریر کا لباس بھی ہے، کیوں کہ جنت میں تو وہ شے ہے جس کو جی چاہتے ہیں اور ہر شخص کو وہی چیز دی جائے گی جس کا اس کا جی چاہے گا اور اس کی من مانی چیز اس کو ملے گی۔

﴿ وَهُدُوٓا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ راہ بتائی گئی طرف پاکیزہ بات کے۔ کسی نے کہا ہے کہ "لآ إله إلا الله" کسی نے کہا ہے کہ "الحمد لله". کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ خوش خبریاں جو اللہ کی طرف سے اُن کے پاس آئیں گی۔ قرآن شریف میں وہ قول وارد ہوا ہے جو اس مجمل قول پر دال ہے، یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ ﴾ [الزمر: ٧٤] "سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم سے (کیا ہوا) اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔" ﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا ﴾ [الأعراف: ٤٣] "سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ سیدھی راہ دکھائی۔" ﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ﴾[1] [الفاطر: ٣٤] "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔" امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ "طیب" سے حال ہے، یا "طیب" کی ضمیر مستکن سے حال ہے اور ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے یا بیان کا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "طیب من القول" کلمہ توحید ہے اور صراطِ حمید اسلام۔ یا اللہ پاک نے اُن کو ہدایت کی اور اُن کو الہام کیا کہ یوں کہیں: ﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ ﴾ [الزمر: ٧٤] اور اُن کو جنت کی راہ بتائی۔ حمید، اللہ ہے جو ہر زبان سے سراہا گیا ہے۔[2]

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صراطِ حمید دین اللہ ہی ہے۔ یعنی اسلام اور حمید اللہ ہے جو اپنے افعال میں سراہا گیا ہے۔[3] فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ صراطِ حمید و صراطِ محمود وہ طریقِ جنت ہے، یا اللہ کا راستہ جو اللہ کا دینِ قویم ہے، یعنی اسلام۔[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "﴿ إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴾ المحمود نفسه أو عاقبته وهو الجنة الحق أو المستحق لذاته الحمد وهو الله تعالى و صراط الإسلام"[5] یعنی راہ بتائی گئی طرف صراطِ جنت کے کہ جس کی ذات محمود ہے، یا طرف صراطِ حق کے کہ جس کی عاقبت محمود ہے، یا طرف اللہ تعالیٰ کے صراط کے، وہ اللہ جو لذاتہ مستحق حمد و ثنا کا ہے اور اس کی صراط اسلام ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "طریق الله المحمودة و دينه"[6] یعنی صراطِ حمید سے مراد طریق اللہ ہے، جنت کی طرف اور دین سے مراد اسلام ہے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٠٦) فتح البيان (٩/ ٣٢) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠٠) [3] تفسير الخازن (٥/ ١١)
[4] فتح القدير (٣/ ٦٠٦) فتح البيان (٩/ ٣٢) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)

غرض کہ صراطِ حمید کی دو تفسیریں کیں: ایک تو وہ راستہ جو جنت کی طرف پہنچاتا ہے، دوسری دین، یعنی اسلام۔ اس بنا پر صراط کی ہدایت دنیا اور آخرت میں ہوگی اور ﴿ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ کی ہدایت دنیا میں ہوگی۔ (قاله الحفناوي) یعنی اس لیے کہ امام محلی رحمہ اللہ نے قولِ طیب سے مراد لا الہ الا اللہ لیا ہے۔[1] بالجملہ جبکہ اللہ پاک نے مومنین اور کافرین کے درمیان کی خصومت کا فیصلہ کیا تو حرمتِ بیت اللہ کی عظمت اور اُن کفار کے کفر کی عظمت بیان فرمائی۔ پس ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٥﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، جسے ہم نے (سب) لوگوں کے لیے بنایا ہے، اس میں مقیم اور بادیہ نشین (باہر سے آنے والے) برابر ہیں اور جو اس میں ظلم کے ساتھ کج روی کا ارادہ کرے، ہم اسے نہایت دردناک عذاب چکھائیں گے ﴿25﴾

اللہ تعالیٰ کی راہ اور مسجدِ حرام سے روکنے والوں کی وعید:

یعنی جنھوں نے لوگوں کو وہاں، یعنی مسجدِ حرام میں جانے سے روکا وہ سزا پائیں گے۔ انتہی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کفار پر اس بات سے انکار فرماتا ہے کہ انھوں نے مومنوں کو مسجد الحرام میں آنے سے اور اس میں مناسکِ حج ادا کرنے سے روکا، حالاں کہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اللہ کے دوست ہیں۔ ﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٤] ''اس کے متولی تو متقی لوگ ہی ہیں اور لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔'' اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ سورۃ الحج مدنی ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے سورۃ البقرہ میں فرمایا ہے: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢١٧] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے۔'' اور یہاں یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ یعنی ان کی صفت سے یہ بات ہے کہ باوجود اپنے کفر کے

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)

اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، یعنی مسجد حرام سے اس شخص کو روکتے ہیں جو مومنین میں سے اس کا ارادہ کرتا ہے، کون سے مومنین جو سب لوگوں سے زیادہ ترنفس الامر میں اس کے حق دار ہیں۔ اس آیت میں یہ ترتیب اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ [الرعد: ۲۸] ”جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں، آگاہ رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔“

﴿ اَلَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ یعنی مسجد الحرام کی طرف پہنچنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں، حالاں کہ اللہ نے اس کو برابر ٹھہرایا ہے، اس میں کچھ فرق نہیں ہے اس شخص کے درمیان جو اس میں مقیم ہے، رہتا بستا ہے اور اس شخص کے درمیان جو اس سے دور ہے، اس کا گھر اس سے بعید ہے دونوں اس میں برابر ہیں اور اسی سے لوگوں کا مکے کے گھروں میں ہونا اور اس کے گھروں میں رہنا بسنا برابر ہے، جس طرح کہ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ سَوَآءَ ۨالْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ مکے والے اور اُن کے غیر اُتریں مسجد الحرام میں۔[1]

(عبد بن حمید کے الفاظ ﴿ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ ہیں: ”قال الحرم كله وهو المسجد الحرام ﴿ سَوَآءَ ۨالْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ قال: خلق الله فيه سواء، و أخرج ابن أبي شيبة عن سعيد بن جبير مثله“[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ ہیں: ”قال: هم في منازل مكة سواء فينبغي لأهل مكة أن يتوسعوا لهم حتى يقضوا مناسكهم، وقال: البادي و أهل مكة سواء يعني في المنزل والحرم“[3] (فتح القدير))

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ مکہ و غیر اہلِ مکہ اس میں برابر ہیں منازل میں۔ اسی طرح امام ابو صالح، عبدالرحمٰن بن سابط اور عبدالرحمٰن بن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے عن معمر عن قتادہ روایت کیا ہے کہ اس میں اس کے اہل اور غیر اہل برابر ہیں۔[4] یہ وہ مسئلہ ہے جس میں امام شافعی رحمہ اللہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے مسجدِ خیف کے اندر اختلاف کیا تھا اور امام احمد رحمہ اللہ بن حنبل بھی حاضر تھے۔ پس امام شافعی رحمہ اللہ اس طرف گئے کہ مکے کے گھر ملک کیے جاتے ہیں اور میراث میں دیے جاتے ہیں اور کرائے پر دیے جاتے ہیں اور اس حدیث سے حجت پکڑی کہ امام زہری رحمہ اللہ نے علی بن حسن عن عمرو بن عثمان عن اسامۃ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اُسامہ نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ کل اپنے گھر میں اُتریں گے، جو کہ مکے میں ہے؟ فرمایا اور کیا چھوڑا ہے

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۹۶) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲٤۸۳) فتح القدير (۳/ ٦١٢) [4] تفسير الطبري (۱۸/ ۵۹۵_ ۵۹٦)

ہمارے واسطے عقیل نے کوئی گھر؟ یعنی نہیں۔ پھر فرمایا کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور نہ مسلمان کافر کا۔[1]

یہ حدیث شریف صحیحین میں تخریج کی گئی ہے اور اس اثر سے تمسک کیا ہے، جو ثابت ہوا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مکے میں ایک گھر صفوان بن اُمیہ سے چار ہزار درہم کے عوض خریدا، پھر اس کو قید خانہ بنایا۔ امام طاؤس اور عمرو بن دینار رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] امام اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ مکے کے گھر میراث میں نہیں دیے جاتے، نہ کرائے پر دیے جاتے ہیں۔ یہ سلف میں سے ایک گروہ کا مذہب ہے۔ اور امام مجاہد اور عطا رحمہما اللہ نے اس پر نص کی ہے۔ امام اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ ابن ماجہ نے علقمہ بن نضلہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما وفات پا گئے۔ "وما تدعى رباع مكة إلا السوائب من احتاج سكن ومن استغنى أسكن" یعنی اور حال یہ ہے کہ مکے کے گھر نہیں پکارے جاتے تھے مگر سوائب۔ جو شخص حاجت مند ہوا وہ رہا بسا اور جو مستغنی ہوا اس نے دوسرے کو بسا دیا۔ (رواه ابن ماجه عن أبي بكر بن أبي شيبة عن عيسىٰ بن يونس عن عمر بن سعيد بن أبي حضرة عن عثمان بن أبي سليمان عن علقمة فذكره۔ فتح القدير)[3]

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے "عن ابن مجاهد عن أبيه عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما" سے روایت کیا ہے کہ حلال نہیں ہے مکے کے گھروں کی خرید وفروخت اور نہ اُن کا کرایہ لینا اور ابن جریج رحمہ اللہ سے بھی روایت کیا ہے کہ وہ منع کرتے تھے حَرَم میں کرایہ سے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام عطاء رحمہ اللہ نے مجھے خبر دی کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منع کیا کرتے تھے مکے کے گھروں کے دروازے بنانے سے، اس واسطے کہ حاجی اُن کے میدانوں میں اُتریں۔ (امام عطا رحمہ اللہ کا قول یہاں تک امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[4] كذا في فتح القدير)

پس پہلے پہل سہیل بن عمرو نے اپنے گھر کا دروازہ بنایا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں سہیل کی طرف آدمی بھیجا، پس سہیل نے کہا: اے امیرالمومنین! تم مجھے مہلت دو، کیوں کہ میں ایک تاجر آدمی ہوں۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ میں دو دروازے بناؤں کہ میرے واسطے میری سواری کو روکیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب یہ تیرے لیے ہے، یعنی دروازے بنانے کی اجازت دے دی عذر مذکور کے سبب سے۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے "عن معمر عن منصور عن مجاهد" روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے مکے والو! تم گھروں کے دروازے مت بناؤ، تاکہ بادی، یعنی مسافر جہاں چاہے اُترے۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے کہا اور خبر دی ہم کو معمر رحمہ اللہ نے اس شخص سے جس نے عطا رحمہ اللہ سے سنا۔ امام عطا رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿سَوَآءًۨ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ﴾ کہا کہ اتریں جہاں چاہیں۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۵۱۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۳۵۱)
[2] مصنف عبد الرزاق (۵/ ۱۴۷)
[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۱۰۷) فتح القدير (۳/ ۶۱۲) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] فتح القدير (۳/ ۶۱۲)
[5] مصنف عبدالرزاق (۵/ ۱۴۶۔ ۱۴۸)

سنن دارقطنی میں "من حديث ابن أبي نجيح عبد الله بن عمرو" سے موقوفاً روایت کیا ہے کہ جس شخص نے مکے کے گھروں کا کرایہ کھایا اس نے آگ کھائی۔[1] (امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کے الفاظ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی یہ ہیں: "من أخذ من أجور بيوت مكة إنما يأكل في بطونه نارا"[2] امام دارقطنی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوعاً یہ ہیں: «مَنْ أَكَلَ كِرَاءَ بُيُوْتِ مَكَّةَ أَكَلَ نَارًا»[3] امام ابن سعد رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں: "إن رجلا قال له عند المروة: يا أمير المؤمنين! أقطعني مكانا لي ولعقبي فأعرض عنه عمر و قال: هو حرم الله سواءن العاكف فيه والباد"[4] امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے صحیح سند سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: "قال: قال رسول الله ﷺ: فی قوله: ﴿سَوَآءٌ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ﴾ قال: سواء المقيم والذي يدخل"[5]

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: "أن رسول الله ﷺ قال: «مَكَّةُ مُبَاحَةٌ لَا تُؤْجَرُ بُيُوْتُهَا وَلَا تُبَاعُ رِبَاعُهَا»[6] امام احمد رحمہ اللہ نے توسط اختیار کیا۔ پس کہا کہ ملک میں دیے جائیں اور میراث کیے جائیں اور کرایہ نہ دیے جائیں جمع کرنے کے واسطے درمیان دلیلوں کے۔ والله أعلم۔ ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ من جملہ اہل عربیت بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جگہ حرف با زائد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ﴾ "أي تنبت الدهن" اسی طرح ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ﴾ ہے۔ تقدیر یہ ہے: "ومن يرد فيه الحادا" اور جس طرح کہ امام اعشیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

ضَمِنَتْ بِرِزْقِ عَيَالِنَا أَرْمَاحُنَا ... بَيْنَ الْمَرَاجِلِ وَالصَّرِيْحِ الْأَجْرَدِ

(یعنی "ضمنت أرماحنا رزق عيالنا فالباء زائدة") کسی دوسرے شاعر نے کہا ہے:

بِوَادٍ يَمَانٍ يُنْبِتُ الشَّتَّ صَدْرُه ... وَأَسْفَلُهٗ بِالْمَرْخِ وَالشَّبَهَانِ[7]

("شتّ" ایک نباتِ خوشبو ہے، اس سے چمڑے پکاتے ہیں۔ "صدر" اعلیٰ مقدم اور ہر شے کے اول کو کہتے ہیں۔ "مرخ" شجر سریع الوری کو کہتے ہیں۔ "شبہان" بالتحریک ایک خاردار سبزی ہے، اس کا پھول سرخ لطیف ہوتا ہے، یعنی وادی یمانی کی مقدم جانب تو شت کو اُگاتی ہے اور اس کی اسفل جانب مرخ و شبہان کو اُگاتی ہے۔

[1] سنن الدارقطني (٣/ ٥٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٥۔ ٢٨٦) [2] الدر المنثور (٦/ ٢٥)

[3] سنن الداقطني (٢/ ٢٩٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢١٨٦)

[4] الدر المنثور (٦/ ٢٥)

[5] المعجم الكبير (١٢/ ٦٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عبدالله بن مسلم بن هرمز وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٧١)

[6] الدر المنثور (٦/ ٢٦) [7] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٦)

غرض یہ ہے کہ "بالمرخ" کا با زائد ہے، باعتبار عطف کے "ینبت" کا مفعول ہے۔)

بہتر اور خوب تر یہ ہے کہ یہاں فعل، یعنی ﴿ يُرِدْ ﴾ "یھم" کے معنی دیتا ہے، اسی واسطے اس کو حرفِ با سے متعدی کیا ہے۔ پس ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِإِلْحَادٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص قصد و خیال کرے اس میں کبیرہ گناہوں میں سے کسی قبیح کام کا۔ ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں: "عَامِداً قَاصِدًا إنه ظلم ليس بمتاوّل كما قال أبو جريج عن ابن عباس رضی اللہ عنہما هو المتعمد"[1] یعنی قصد کر کے اس کبیرہ گناہ کو کرے اور اس کو ظلم سمجھتا ہو، اس کی تاویل نہ کرتا ہو، جان بوجھ کر اس کا مرتکب ہو۔ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ کے معنی "بشرك" ہیں۔ (وأخرجه عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عنه)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں غیر اللہ کو پوجے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ اور غیر واحد نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ برائی کرنا یا قتل کرنا جس کو اللہ نے تجھ پر حرام کیا ہے تو حرم سے اس کو حلال سمجھے۔ پس اس پر ظلم کرے جو تجھ پر ظلم نہیں کرتا اور جو تجھ کو قتل نہیں کرتا تو اسے قتل کرے۔ پھر جب یہ کام کیا تو مقرر عذابِ الیم واجب ہوا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ حرم میں برا کام کرے۔[2]

یہ بات حرم کی خصوصیت سے ہے کہ اس میں برائی کی نیت کرنے والا عقاب کیا جاتا ہے، جبکہ اس کا ارادہ کرے، اگرچہ اس برائی کو وقوع میں نہ لائے، جیسا کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے آیتِ مذکور کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس میں "إِلْحَادٍ بِظُلْمٍ" کا ارادہ کرے اور وہ عدن اَبین میں ہو تو البتہ اللہ اس کو عذابِ الیم سے چکھائے گا۔[3] امام شعبہ رحمہ اللہ راوی کہتے ہیں کہ امام سدی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ہمارے واسطے مرفوع کیا ہے اور میں تمھارے واسطے اس کو مرفوع نہیں کرتا ہوں۔ (وأخرجه الفريابي و سعيد بن منصور و ابن راهويه و أحمد و عبد بن حميد و البزار و أبو ليلىٰ و ابن جرير و ابن المنذر و الطبراني و الحاكم و صححه و ابن مردويه عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ رفعه). (سعید بن منصور اور طبرانی رحمہما اللہ کے الفاظ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ "قال: من هم بخطيئة فلم يعملها في سوى البيت لم تكتب عليه حتى يعملها، ومن هم بخطيئة في البيت لم يمته الله من الدنيا حتى يذيقه من عذاب أليم"[4] فتح القدير))

یزید بن ہارون رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شعبہ نے اس کو مرفوع کر دیا ہے۔ (رواه أحمد عن يزيد بن هارون به) حافظ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠١) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٠۔ ٦٠١) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٣)

[4] المعجم الكبير (٩/ ٢٢٢) فتح القدير (٣/ ٦١٢۔ ٦١٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه الحكم بن ظهير وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٧٢)

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اسناد صحیح ہے شرطِ بخاری پر اور وقف اس کا اشبہ ہے اس کے رفع سے اور اسی واسطے شعبہ نے اس کے وقف کی تصمیم کی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے کلام کی بنا پر۔ وكذلك رواه أسباط و سفيان الثوري عن السدي عن مرة عن ابن مسعود موقوفا والله أعلم، وقال الثوري عن السدي عن مرة عن عبد الله قال: ما من رجل يهم بسيئة فتكتب عليه ولو أن رجلا بعدن أبين همّ أن يقتل رجلا بهذا البيت لأذاقه الله من العذاب الأليم. یعنی نہیں ہے کوئی آدمی کہ ارادہ کرے کسی گناہ کا، پھر وہ اس پر لکھا جائے اور اگر کوئی آدمی عدنِ ابین میں اس بات کا ارادہ کرے کہ کسی آدمی کو خانہ کعبہ میں قتل کرے تو البتہ اللہ چکھائے گا اس کو عذابِ الیم سے۔ اسی طرح امام ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کے الفاظ منصور عن مجاہد سے مروی یہ ہیں: "الحاد فيه لا والله و بلى والله" یعنی لغو قسم کھانا، جیسے بات چیت میں "لا والله بلى والله" کہتے ہیں، حرم میں یہ بھی الحاد ہے۔[1] (ورُوي عن مجاهد عن عبدالله بن عمرو مثله)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "شتم الخادم ظلم فما فوقه" یعنی خادم کو گالی دینا اور جو اس سے زیادہ ہے یہ ظلم ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کے الفاظ "عن عبدالله بن عطاء عن ميمون بن مهران عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" یہ ہیں: "تجارة الأمير فيه" یعنی حرم میں امیر کا تجارت کرنا ﴿ بِظُلۡمٍ بِظُلۡمٍ ﴾ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مکے میں طعام کا بیچنا الحاد ہے۔[2] حبیب بن ابی ثابت نے کہا کہ "المحتكر بمكة" یعنی مکے میں غلے کا روکنے والا ﴿ وَمَنۡ يُّرِدۡ فِيۡهِ بِاِلۡحَادٍۢ بِظُلۡمٍ ﴾ ہے۔ اسی طرح بہت لوگوں نے کہا ہے۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یعلیٰ بن اُمیہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "احتكار الطعام بمكة إلحاد" یعنی مکے میں طعام کا روکنا الحاد ہے۔[4] (وأخرجه عبد بن حميد والبخاري في تاريخه و ابن المنذر و ابن مردويه عن يعلىٰ و لفظه احتكار الطعام في الحرم إلحاد فيه) (سعید بن منصور و بخاری کا لفظ تاریخ میں اور ابن منذر کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ہے: "احتكار الطعام بمكة إلحاد بظلم"[5] عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: "قال: بيع الطعام بمكة إلحاد"[6] امام بیہقی رحمہ اللہ کے الفاظ شعب میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: "قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: « إِحۡتِكَارُ الطَّعَامِ بِمَكَّةَ إِلۡحَادٌ »[7] (فتح القدير))

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں بروایت سعید بن جبیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے،

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠١ـ ٦٠٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٦ـ ٢٨٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٤)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٢)
[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٢٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ دیکھیں: ضعيف أبي داود للألباني (٢ ١٩٢)
[5] الدر المنثور (٦/ ٢٧) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٤) [7] شعب الإيمان (٧/ ٥٢٧) فتح القدير (٣/ ٦١٣)

فرمایا کہ عبداللہ بن انیس کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، ان میں سے ایک مہاجر تھا اور دوسرا انصاری، انھوں نے انساب میں فخر کیا۔ اس پر عبداللہ بن انیس کو غصہ آیا تو انصاری کو مار ڈالا۔ پھر اسلام سے پھر گیا، پھر مکے کی طرف بھاگ گیا، پس اس کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَنۡ يُّرِدۡ فِيۡهِ بِاِلۡحَادٍۢ بِظُلۡمٍ ﴾ [1] یعنی جو شخص کہ پناہ پکڑے طرف حرم کے الحاد کے ساتھ، یعنی اسلام سے مائل ہونے کے ساتھ۔ یہ آثار اگرچہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ چیزیں من جملہ الحاد ہیں، لیکن الحاد ان سے عام تر ہے، بلکہ ان آثار میں اس شے پر آگاہ کرنا ہے، جو تمام اشیا سے زیادہ غلیظ اور سخت ہیں۔ اور اسی لیے جب اصحاب الفیل نے بیت اللہ کے خراب کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ پاک نے ان پر طیر ابابیل کو بھیجا۔ ﴿ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۞ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ﴾ [الفیل: ٤۔ ٥] ”جو اُن پر کھنگر کی کنکریاں پھینک رہے تھے۔ پھر اللہ نے انھیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔“ یعنی اللہ پاک نے اُن کو ہلاک کر ڈالا اور جو کوئی بیت اللہ سے برائی کا ارادہ کرے تو اصحابِ فیل کو اس کے واسطے عبرت و نکال (سزا) ٹھہرایا اور اسی لیے حدیث شریف میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «يَغْزُوْ هٰذَا الْبَيْتَ جَيْشٌ حَتّٰى إِذَا كَانُوْا بِبَيْدَاءَ مِنَ الْأَرْضِ خُسِفَ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ» [2] (الحدیث) یعنی ایک لشکر اس گھر پر چڑھائی کرے گا، یہاں تک کہ جب وہ میدان میں پہنچیں گے تو اگلے پچھلے سب زمین میں دھنسا دیے جائیں گے۔ امام احمد نے بہ سند خود روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور فرمایا: اے ابن زبیر! ”إياك والإلحاد في حرم الله“ یعنی تو اللہ کے حرم میں الحاد کرنے سے ڈر، کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے: «إِنَّهُ سَيُلْحِدُ فِيْهِ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ لَوْ تُوْزَنُ ذُنُوْبُهُ بِذُنُوْبِ الثَّقَلَيْنِ لَرَجَحَتْ فَانْظُرْ لَا تَكُنْ هُوَ» یعنی قریب ہے کہ قریش کا ایک شخص حرم میں الحاد کرے گا، اگر اس کے گناہ جن و انس کے گناہوں سے وزن کیے جائیں تو وہ بھاری ہوں، پس تو نظر کر تو وہ شخص نہ ہو۔ [3]

امام احمد رحمہ اللہ سے مروی دوسرے الفاظ یہ ہیں: ”أتى عبد الله بن عمر عبدالله بن الزبير و هو جالس في الحجر، فقال: يا ابن الزبير! إياك والإلحاد في الحرم فإني أشهد لسمعت رسول الله ﷺ يقول: يُحِلُّهَا وَيُحِلُّ بِهِ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ لَوْ وُزِنَتْ ذُنُوْبُهُ بِذُنُوْبِ الثَّقَلَيْنِ لَوَزَنَتْهَا، قَالَ: فَانْظُرْ لَا تَكُنْ هُوَ» (لم يخرجه أحد من أصحاب الكتب من هذين الوجهين) [4] انتهى.

﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ﴾ یعنی بے شک جو لوگ کہ منکر ہوئے اس شے کے جس کو خاتم النبیین، شفیع المذنبین،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٤) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٨٧) اس کی سند میں ”ابن لہیعہ“ ضعیف راوی ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢١١٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٨٢)

[3] مسند أحمد (٢/ ١٣٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٣١٠٨)

[4] مسند أحمد (٢/ ٢١٩) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٤٦٢)

رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ ﷺ لائے۔ ﴿ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، یعنی اور لوگوں کو۔ فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ ”صَدّ“ سے مراد منع ہے اور اللہ کی راہ اللہ کا دین ہے،[1] یعنی جو شخص اللہ کے دین میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا ہے، اس کو منع کرتے ہیں۔ اسی طرح علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد ہجرت و جہاد و اسلام ہے۔ علامہ محلی رحمہ اللہ نے کہا: اطاعتِ الٰہی ہے۔[2]

﴿ وَيَصُدُّوْنَ ﴾ میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ كَفَرُوْا ﴾ پر معطوف ہے، اس صورت میں ماضی پر مضارع کا عطف لازم آتا ہے۔ لہٰذا اس کی تین تاویلیں ہیں: پہلی تاویل یہ ہے کہ کبھی مضارع سے زمانہ معین، یعنی حال و مستقبل پر دلالت مقصود نہیں ہوتی، صرف استمرار مراد لیا جاتا ہے۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [الرعد: ۲۸] ”جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔“ کیوں کہ مومنین کے قلوب کا اطمینان اللہ کے ذکر سے زمانہ معین میں مقصود نہیں، بلکہ استمرارِ اطمینان مراد ہے، یا مثلاً: یوں کہتے ہیں کہ ”فلان يحسن إلى الفقراء“ یعنی فلاں شخص فقیروں پر احسان کرتا ہے، اس سے مراد کوئی معین زمانہ نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ احسان کا وجود اس سے مستمر ہے، ہمیشہ فقرا کو دیا کرتا ہے، اسی طرح یہاں ہے، گویا یوں کہا گیا ہے کہ جو لوگ منکر ہوئے اُن کی شان سے یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ چوں کہ مضارع سے مجرد استمرار مراد ہے، اس لیے اس کا عطف ماضی پر حسین ہوا۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی تاویل کو پسند فرمایا ہے۔[3] دوسری تاویل یہ ہے کہ مضارع موؤل بہ ماضی ہے، اس لیے کہ ماضی پر اس کا عطف ہوا ہے۔ ﴿ يَصُدُّوْنَ ﴾ سے مراد گذشتہ ”صَدّ“ ہے، اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [النسآء: ۱٦۷] ”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا۔“ فتح القدیر میں اس کو پہلے ذکر کیا ہے۔[4] تیسری تاویل یہ ہے کہ مضارع اپنے حال پر باقی ہے اور ماضی ماقبل موؤل بہ مستقبل ہے۔

﴿ يَصُدُّوْنَ ﴾ میں دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ وَيَصُدُّوْنَ ﴾ حال ہے فاعل ﴿ كَفَرُوْا ﴾ سے۔ امام ابوالبقاء رحمہ اللہ نے ابتدا اسی وجہ سے کی ہے اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے صرف اسی وجہ پر قناعت کی ہے۔ قاضی صاحب نے اس کو بہ لفظ قیل ذکر کیا ہے۔[5] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: یہ وجہ ظاہراً فاسد ہے، اس لیے کہ مضارع مثبت ہے اور مضارع مثبت، جب حال پڑتا ہے تو اس پر واو نہیں آتا اور جو اس قسم کا مضارع شاذ و نادر وارد ہوا ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔ پس قرآن شریف ایسی وجہ پر محمول نہیں ہوتا ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جملہ حالیہ جب فعلیہ ہو اور فعل مضارع مثبت ہو تو

---

[1] فتح القدير (۳/ ٦۰۸) فتح البيان (۹/ ۳۳) [2] تفسير النسفي (۳/ ۱۰۰) تفسير الخازن (٥/ ۱۱) تفسير الجلالين (۱/ ٤۳٦)

[3] تفسير البيضاوي (٤/ ۱۲۲) [4] فتح القدير (۳/ ٦۰۸)

[5] التبيان في إعراب القرآن (۲/ ۹۳۸) تفسير النسفي (۳/ ۱۰۰) تفسير البيضاوي (٤/ ۱۲۲)

اس پر واؤ کا دخول ممتنع ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ﴾[المدثر: ٦] ''اور حصولِ کثرت کے لیے احسان نہ کیجیے۔'' اور جو اسباب سے بہ قلت وارد ہوا ہے، جیسے بعض عرب کا یہ قول ہے: ''قُمۡتُ وَأَصُكُّ وَجۡهَهٗ'' یعنی میں کھڑا ہوا درآں حالیکہ اس کے منہ کو کوٹتا مارتا تھا اور یہ قول ؎

فلما نشبت أظافيرهم نجوت وأَرْهَنُهم مالكا

یعنی جس وقت ان کے ناخن گڑے، یعنی ان کے ہتھیار چبھے تو میں نے نجات پائی اس حال میں کہ ان کے پاس گرو رکھتا تھا۔ لہٰذا ان دونوں قولوں کی یوں تاویل کی گئی ہے کہ مبتدا محذوف ہے، یعنی ''وأنا أصك وجهه وأنا أرهنهم'' اول تو یہ وجہ قلیل ہے، پھر تاویل کی گئی ہے، پس قرآن پاک کو اس پر محمول نہ کرنا چاہیے۔ چوں کہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے اس واسطے مبتدا محذوف نکالا ہے اور یوں کہا ہے: ''وهم يصدون، أي الصدود منهم مستمر دائم''[1]

غرض کہ ان دونوں قولوں کی بنیاد پر ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر محذوف ہے، آیت کا آخر اس پر دال ہے، یعنی ''مُعَذَّبُوْن''. اب اس میں اختلاف ہے کہ اس خبر محذوف کا محل کون سی جگہ ہے۔ لہٰذا قاضی صاحب کے ظاہر کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محل ﴿ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ﴾ کے بعد ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اسم کے اپنے متعلقات کے ساتھ مکمل ہونے سے قبل خبر کا مقدر کرنا بعد سے خالی نہیں ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے بعد ﴿ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ﴾ کے مقدر کی ہے۔ یعنی ''إِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ نُذِيۡقُهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ إِلِيۡمٍ''[2] یہ تقدیر اس واسطے کی ہے کہ ﴿ نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴾ اس پر دال ہے، مگر اس میں بھی خرابی ہے، کیوں کہ اجنبی کے ساتھ فصل لازم آتی ہے موصوف اور صفت کے درمیان۔ اجنبی خبر ﴿ اِنَّ ﴾ ہے۔ ترکیب یوں ہوتی ہے: ''إن الذين كفروا ويصدون عن سبيل الله والمسجد الحرام نذيقهم من عذاب أليم الذي جعلناه للناس'' لیکن امام زمخشری رحمہ اللہ کی طرف سے یہ جواب ہوسکتا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيۡ جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ ﴾ مسجد کی صفت نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے مقطوع ہے، ''أعني'' سے منصوب ہے، یا ''هو'' سے مرفوع۔ ظاہر یہ ہے کہ محلِ تقدیرِ خبر بعد ''و الباد'' کے ہے۔ اس میں کسی طرح کی خرابی نہیں ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اسی طرح تقدیر کی ہے: ''إن الذين كفروا خسروا'' یا ''هلكوا'' یا مثل اس کے اور کوئی لفظ۔

امام ابوحیان رحمہ اللہ نے بھی بحر میں اسی کو پسند کیا ہے۔[3] تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ وَيَصُدُّوۡنَ ﴾ کی واو خبر ﴿ اِنَّ ﴾ میں زائد ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَصُدُّوۡنَ''، امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: واو کی زیادتی کوفی مذہب ہے،

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٠) [2] الكشاف (٣/ ١٥٢) [3] المحرر الوجيز (٤/ ١٤٠) البحر المحيط (٦/ ٣٣٦)

اس کا بطلان پہلے گزر چکا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ﴿ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾[1] ہے، یہ قول مردود ہے، اس لیے کہ اگر یہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہوتا تو مجزوم نہ ہوتا اور بالفرض اگر یہ خبر ہوتو ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ﴾ شرط بغیر جواب کے رہ جائے گی۔ پس زیادہ بہتر یہی ہے کہ خبر محذوف ہے، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ معطوف ہے ﴿ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ پر۔ تفسیر فتح القدیر، خازن، محلی اور نسفی سے یہی معلوم ہوتا ہے،[2] یعنی اور روکتے ہیں مسجد الحرام سے اور اس میں داخل ہونے سے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کے اسم مبارک پر معطوف ہے،[3] یعنی روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد الحرام کی راہ سے۔ اس میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مسجد الحرام سے مراد نفسِ مسجد ہے، چنانچہ ظاہر نظمِ قرآنی یہی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مراد سارا حرم ہے، کیوں کہ مشرکوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حدیبیہ کے دن حرم سے روکا تھا۔ تیسرا یہ ہے کہ اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے، بدلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ٰ ۨالْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ یعنی ہم نے اس کو علی العموم لوگوں کے واسطے بنایا ہے کہ اس میں نماز پڑھیں اور اس کا طواف کریں، درآں حالیکہ برابر ہے اس میں عاکف، یعنی اس میں رہنے والا، اس کا لازم پکڑنے والا اور بادی، یعنی وہ شخص جو جنگل سے آپہنچا ہے۔ مراد اس سے طاری آفاقی ہے بغیر فرق کے درمیان اس بات کے کہ وہ اہلِ بادیہ سے ہو یا اس کے علاوہ، یعنی وہاں کے جنگل کا ہو یا کسی اور بستی سے آگیا ہو، یہ سب بادی میں داخل ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ٰ ۨالْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾، ﴿ اَلَّذِيْ جَعَلْنٰهُ ﴾ میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ محلِ جر میں ہے ﴿ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ کی نعت ہے، یا بدل، یا بیان۔ اس سے غرض ان لوگوں کے لیے ڈانٹ ڈپٹ میں زیادتی ہے جو اس سے روکتے ہیں۔ دوسری وجہ نصب ہے باضمار فعل، یعنی "أعني"۔ تیسری وجہ رفع ہے باضمار مبتدا، یعنی "هو"۔ "جعل" میں دو وجہ ہیں: ایک بہ معنی "صيّر"، متعدی دو مفعول کی طرف۔ دوسری یہ ہے کہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے۔ عامہ کی قراءت برفع ﴿ سَوَآءَ ﴾ ہے۔ حفص کی قراءت عاصم سے بہ نصب ہے۔ اس جگہ اور سورۃ الجاثیہ میں ﴿ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ﴾۔ جاثیہ میں جو ہے اس پر اخوان نے حفص کی موافقت کی ہے، عن قریب اس کی توجیہ آئے گی۔ قراءتِ رفع کی بنا پر اگر ہم "جعل" کو بہ معنی "صيّر" کہیں تو مفعول ثانی ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ میں تین وجہ ہوں گی: ایک یہ ہے کہ جملہ ﴿ سَوَآءَ ٰ ۨالْعٰكِفُ فِيْهِ ﴾ کا مفعول ثانی ہوگا، یہ وجہ ظاہر تر ہے۔ پھر بہتر رفع ﴿ سَوَآءَ ﴾ میں کہ خبر مقدم ہو اور ﴿ اَلْعٰكِفُ ﴾ ﴿ وَالْبَادِ ﴾ مبتدائے موخر ہو۔ رہی یہ

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٤٢٠)

[2] فتح القدير (٣/ ٦٠٨) تفسير الخازن (٥/ ١١) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) تفسير النسفي (٣/ ١٠٠)

[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢)

بات کہ خبر واحد آئی اور مبتدا دو۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ سَوَآءً ﴾ اصل میں مصدر ہے، اس کے ساتھ وصف کیا گیا ہے، اس میں واحد اور تثنیہ برابر ہے۔ سورۃ البقرہ کے شروع میں یہ بات گزر چکی ہے۔

بعض نے یہ جائز رکھا ہے کہ ﴿ سَوَآءً ﴾ مبتدا اور ما بعد اس کا خبر۔ اس قول میں ضعف ہے یا ممانعت اس لیے کہ ابتدا نکرہ کے ساتھ جائز نہیں ہے اور اس لیے کہ جب معرفہ اور نکرہ جمع ہوں تو معرفہ مبتدا کیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مفعول ثانی ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کا ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ ہے اور جملہ ﴿ سَوَآءَنِ الْعٰكِفُ ﴾ محلِ نصب میں ہے، بنا برحال اور یہی جملہ "مَحَطّ" فائدہ ہے۔ (جائے نزول، یعنی جملہ ﴿ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ ﴾ کا فائدہ وغرض جملہ ﴿ سَوَآءَنِ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ میں ہے۔) تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ مفعول ثانی محذوف ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "الذي جعلنه قبلة ومتعبّدا"[1] یعنی مسجد الحرام سے لوگوں کو روکتے ہیں، جس کو ہم نے قبلہ اور عبادت گاہ ٹھہرایا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کی اقتدا کرتے ہوئے یوں کہا ہے: "جعلناه منسكا ومتعبدا"[2] ("منسك"، بفتحِ میم وسکونِ نون وفتحِ سین وہ جگہ ہے، جس میں قربانیاں ذبح کی جاتی ہیں۔)

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قبلة لصلاتهم ومنسكا متعبدا"[3] مگر امام ابوحیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تقدیر کی حاجت نہیں ہے، مگر یہ کہ مراد تفسیر معنی کی ہو، نہ اعراب کی تو جائز ہے، کیوں کہ جملہ یعنی ﴿ سَوَآءَنِ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ موضع مفعول ثانی میں ہے، اس تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تین وجہ تو اس صورت میں تھیں کہ "جعل" کو دو مفعول کی طرف متعدی ٹھہرایا تھا۔ اور اگر اس کو ایک مفعول کی طرف متعدی قرار دیں تو ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ "جعل" سے متعلق ہوگا، اس بنیاد پر کہ "جعل" کی علت ہے۔ رہی حفص کی قراءت بہ نصب ﴿ سَوَآءً ﴾ (اعمش کی بھی یہی قراءت ہے۔[4] فتح) لہٰذا اگر ہم "جعل" کو دو مفعول کی طرف متعدی کہیں تو ﴿ سَوَآءً ﴾ مفعول ثانی ہوگا ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کا اور اگر ایک مفعول کی طرف متعدی ٹھہرائیں تو ہائے ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ سے حال ہوگا۔ دونوں تقدیر پر عاکف مرفوع ٹھہرے گا بنا بر فاعلیت، کیوں کہ ﴿ سَوَآءً ﴾ مصدر ہے، اس کے ساتھ وصف کیا گیا ہے، پس وہ قوت میں اسم فاعل مشتق کے ہے۔ تقدیر یہ ہے: "جعلناه مستويا فيه العاكف والباد"۔ تیسری قراءت یہ ہے کہ ﴿ سَوَآءً ﴾ منصوب اور ﴿ اَلْعٰكِفُ ﴾ مجرور صفت ہے ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ کی، جیسا کہ فتح القدیر میں کہا ہے۔ یا بدل ہے ﴿ لِلنَّاسِ ﴾ سے، جیسا کہ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ تقدیر یہ ہے "جعلناه للناس العاكف والباد سواء"۔[5] ابن کثیر رحمہ اللہ نے والبادی وصل و وقف میں حرفِ یا کے اثبات سے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے (منهم نافع، فتح) نے وصل و وقف میں حرفِ یا کو حذف کیا ہے[6] اور مصحفِ امام میں محذوف ہے۔ (قاله السمين)

---

[1] المحرر الوجيز (٤/ ١٤٠) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) [3] تفسير الخازن (٥/ ١١)

[4] فتح القدير (٣/ ٦٠٨۔ ٦٠٩) [5] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٩) [6] فتح القدير (٣/ ٦٠٩)

تسویہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ مسجد الحرام کی تعظیم و احترام کرنے میں اور مناسک ادا کرنے میں مقیم و بادی دونوں برابر ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ تسویہ کے معنی یہ ہیں کہ مسجد الحرام کے اترنے میں مقیم و بادی برابر ہیں۔ اُن میں سے ایک دوسرے سے زیادہ مستحق نہیں ہے کہ مسجد الحرام سے اترے۔ اگر کوئی کسی منزل کی طرف سبقت کر گیا ہے، پہلے جا پہنچا ہے، وہی اُس منزل کا مستحق ہے، کوئی اس کو وہاں سے نہ اُٹھائے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نفسِ مسجد الحرام میں برابر ہونے پر لوگوں نے اجماع کیا ہے۔[1] مکہ مکرمہ میں اختلاف ہے۔ امام مجاہد اور مالک رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ مکے کے گھر اور اس کی منازل میں مقیم و طاری، یعنی اور کہیں سے آیا ہوا برابر ہیں۔ سیدنا عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور ایک جماعت اس پر ہیں کہ آنے والے کو حق پہنچتا ہے کہ جہاں جگہ پائے اُترے اور گھر والے پر یہ ہے کہ اس کو جگہ دے۔ "شاء أم أبى" یعنی اس کا جی چاہے یا نہ چاہے ضرور اُسے جگہ دے۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ مکے کے گھر اور اس کی منازل مسجد الحرام کے مثل نہیں ہیں۔ گھر والوں کو حق ہے کہ طاری کو ان میں اُترنے سے روکیں۔

حاصل یہ ہے کہ اس باب میں گفتگو دو اصل کی طرف راجع ہے: اصلِ اول وہ ہے جو اس آیت میں آیا ہے کہ مسجد الحرام سے مراد نفسِ مسجد ہے یا سارا حرم یا مکہ معظّمہ علی الخصوص۔ علامہ مقبلی نے اتحاف میں قوی دلیلیں اس بات پر ذکر کی ہیں کہ مسجد الحرام سے مراد نفسِ مسجد ہے۔ اصل دوم یہ ہے کہ آیا مکہ صلحاً فتح ہوا ہے یا عنوتاً، یعنی باہم صلح ہو کر فتح ہوا ہے یا زبردستی غلبے سے، اور بالفرض اس کی فتح عنوتاً ہوئی ہے تو آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کو مکے والوں کے ہاتھ میں علی الخصوص برقرار رکھا ہے یا جو لوگ اس میں عام طور پر اُتریں اُن کے واسطے اس کو ٹھہرایا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے "نيل الأوطار" میں اس مسئلے کو خوب واضح کر کے لکھا ہے۔ اس میں فریقین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس بات پر کہ مکہ مکرمہ عنوتاً فتح ہوا ہے، واضح ترین دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پاک ہے: "وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِيْ سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ"[2] یعنی مکہ میرے واسطے صرف دن کی ایک ساعت میں حلال کیا گیا تھا، کیوں کہ یہ تصریح ہے اس بات کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مکہ اسی گھڑی میں حلال کیا گیا تھا کہ اس میں خون ریزی فرمائیں اور اس گھڑی میں اس کی حرمت جاتی رہی تھی، اس کے بعد پھر عود کر آئی تھی اور اگر صلحاً مفتوح ہوتا تو اس قول کے فرمانے کے کچھ معتد بہ معنی نہ ہوتے۔[3] انتهى.

قاضی صاحب مرحوم کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ حنفیہ نے مسجد الحرام کی تاویل مکے سے کی ہے اور قولہ تعالیٰ ﴿ اَلَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ﴾ سے اس بات پر استشہاد کیا ہے کہ مکے کے گھروں کی بیع

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٥)

[3] فتح القدير (٣/ ٦٠٩) فتح البيان (٩/ ٣٤)

اور اُن کو کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ "وهو مع ضعفه معارض بقوله تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیٰرِهِمْ ﴾ و شراء عمر دارالسجن فيها من غير نكير" یعنی حنفیہ نے کہا ہے کہ مسجد الحرام سے مراد سارا حرم ہے، جس طرح کہ اللہ پاک کے اس کلام میں ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [بنیٓ إسرائیل: ۱] "پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا۔" کیوں کہ نبی اکرم ﷺ اُم ہانی، ہمشیرہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، کے گھر سے معراج کو تشریف فرما ہوئے، ان کا کاشانہ برکت مکہ مکرمہ میں تھا نہ کہ مسجد الحرام میں اور اس آیت سے اس امر پر استدلال کیا کہ اراضیِ مکہ مملوک نہیں ہوتی ہیں اور کہا کہ اگر وہ مملوک ہو جائیں تو اُن میں عاکف اور بادی برابر نہ ہوگا۔ پھر جب دونوں برابر ہوئے تو ثابت ہوا کہ اراضیِ مکہ کی سبیل مسجد کی سبیل ہے اور اس حدیث شریف سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: « مَكَّةُ مَنَاخٌ لِمَنْ سَبَقَ إِلَيْهَا »[1] یعنی مکہ اُونٹ بٹھانے کی جگہ ہے، اس شخص کے لیے جو اس کی طرف سبقت کر آیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس جگہ اترا وہ اسی کی جگہ ہے، دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کو وہاں سے اُٹھائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ مکے کے گھروں کی بیع اور اُن کا کرایہ پر دینا جائز ہے اور فرمایا: ﴿ سَوَآءَ ِۨ الْعٰكِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ ﴾ سے مراد مقیم و بادی کا مسجد الحرام کی تعظیم و حرمت میں اور اس کے اندر مناسک ادا کرنے میں برابر ہونا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے جو کہا ہے: "وهو مع ضعفه" (یعنی اپنے ضعف کے ساتھ) لہٰذا اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ضعف کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ سَوَآءً ﴾ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ مکے کے منازل اور گھروں سے نفع لینے میں مساوات ہو۔ جائز ہے کہ ﴿ سَوَآءً ﴾ سے مسجد الحرام کی تعظیم میں اور اس کے اندر عبادت کرنے میں برابری مراد لی جائے، اس معنی میں کہ مقیم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس میں عبادت کرنے سے بادی کو روکے یا بادی مقیم کو منع کرے۔ اس کی تائید نبی اکرم ﷺ کا یہ قول کرتا ہے کہ اے بنی عبد المطلب! جو شخص تم میں سے لوگوں کے اُمور سے کسی شے کا والی ہو تو ہرگز منع نہ کرے کسی کو، جو اس گھر کا طواف کرے، یا اس میں رات کے وقت یا دن کی کسی گھڑی میں نماز پڑھے۔[2]

امام شافعی رحمہ اللہ نے تین حجتیں اُن لوگوں پر قائم کی ہیں جو مکہ مکرمہ کے گھروں کے کرایہ میں اور اُن کی بیع میں رخصت نہیں دیتے: ایک حجت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیٰرِهِمْ ﴾ [الحشر: ۸] "جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے۔" فرمایا کہ گھروں کی اضافت اُن کے مالکوں کی طرف کی یا غیر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۱۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۸۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۰۰۶) اس میں "مکہ" کے بجائے "منیٰ" کے الفاظ مروی ہیں۔ نیز اس کی سند میں "مسیکہ کیہ" مجہول راویہ ہے۔ دیکھیں: ضعيف أبي داود للألباني (۲/ ۱۹۰)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (۵۸۵) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۲۵٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦۳۸۰)

مالکوں کی طرف۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: جس شخص نے اپنا دروازہ بند کر لیا تو وہ پناہ دیا گیا ہے۔[1]

تیسری حجت یہ ہے کہ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قید خانے کا گھر خرید فرمایا، کیا تو دیکھتا ہے کہ اس کو اس کے مالک سے خریدا یا غیر مالک سے۔ غرض کہ ہر فریق کے پاس کتاب وسنت سے دلیل و حجت ہے: ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست'' یعنی ہر گل کی رنگت اور خوشبو مختلف ہوتی ہے۔ ﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ [البقرۃ: ۱۴۸] ''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے، لہٰذا تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔'' ''وإنما لكل امرئ مانوى. رحمهم الله تعالىٰ و رضي عنهم و أرضاهم'' یہ شیخ زادہ رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ ﴾ صراح میں ہے: ''الحاد از دین برگشتن وستم کردن درحرم'' یعنی دین سے پھرنے اور حرم میں ظلم کرنے کو الحاد کہتے ہیں۔ مختار میں ہے: ''ألحد في دين الله أي حاد عنه و عدل'' یعنی دین سے مائل ہوا اور اس سے کنارہ کیا۔ ''لحد'' بابِ قطع سے ایک لغت ہے ''ألحد'' میں۔ ''و ألحد الرجل ظلم في الحرم ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ ﴾ أي إلحاداً بظلم والباء زائدة.''[2] انتہی۔ عامہ کی قراءت ''یرد'' بضم تحتیہ ہے ارادہ سے، اس کی بنیاد پر اس کے مفعول میں اختلاف ہے کہ وہ محذوف ہے یا موجود۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ محذوف ہے۔ پھر اس میں خلاف ہے کہ وہ محذوف کیا ہے۔ لہٰذا کسی نے کہا ہے کہ ''مراداً أيَّ مرادٍ'' ہے۔ کسی نے کہا: ''مراداً مّا'' ہے۔ کسی نے کہا: ''تَعدِّياً'' ہے۔ اس صورت میں حرفِ با ﴿ بِاِلْحَادٍ ﴾ میں زائد ہوگا، وجہ حذف مفعول کی یہ ہے کہ ہر متناول کو شامل ہو، اگر کوئی خاص شے مذکور ہوتی تو معلوم ہوتا کہ مقصود وہی شے ہے اور جب حذف کر دیا تو جس الحاد و ظلم کا ارادہ کرے گا، وہ سب اس میں شامل ہو جائے گا۔ مقامِ وعید کے مناسب یہی حذف ہوتا ہے۔

اب رہا ﴿ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ ﴾ لہٰذا یہ دونوں حالِ مترادفہ ہیں، کیوں کہ الحاد سے مراد ''عدول عن القصد والاعتدال'' ہے، یعنی میانہ روی اور راستی سے یکسو ہونا بھی الحاد ہے اور ظلم بھی اسی کے لگ بھگ ہے تو دونوں ہم معنی ٹھہرے۔ گویا یوں فرمایا: ''ومن يرد فيه مرادا مّا عادلا عن القصد ظالما نذقه من عذاب اليم في الآخرة''، یعنی جو کوئی مسجد الحرام میں کسی مراد کا ارادہ کرے اس حال میں کہ وہ کنارہ کرنے والا، جھکنے والا ہے میانہ روی اور راستی سے اس حال میں کہ ظلم کرنے والا ہے تو چکھائیں گے ہم اس کو دردناک عذاب سے آخرت میں۔ یہ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۸۰) [2] مختار الصحاح (۱/ ۶۱۲)

معنی تو علامہ نسفی رحمہ اللہ کے مختار ہیں۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ بھی حذفِ مفعول و ترادفِ حالین کے قائل ہیں۔ دوسرا قول یہ ذکر کیا ہے کہ ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ بدل ہے ﴿ بِإِلْحَادٍ ﴾ سے باعادۂ جار۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ متعلق ہے ﴿ بِإِلْحَادٍ ﴾ سے۔ "أي ملحدا بسبب الظلم کا لإشراك و اقتراف الآثام"[2] یعنی جو کوئی ارادہ کرے اس میں کسی مراد کا درآں حالیکہ الحاد کرنے والا ہے ظلم کے سبب سے، جیسے شرک کرنا اور گناہوں کا کسب کرنا۔ کسی نے کہا: مفعول محذوف "الناس" ہے۔ تقدیر یہ ہے: "ومن یرد الناس بالحاد"۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مفعول موجود ہے، یعنی بالحاد۔ اس صورت میں حرفِ با زائد ہوگا، من جملہ قائلینِ زیادت با مفعول میں اخفش ہیں، ان کے نزدیک معنی یہ ہیں: "وَ مَنْ یُّرِدُ فِیْهِ إِلْحَادًم بِظُلْمٍ" اس کا شاہد یہ قول ہے:

نحن بنو جعدة أصحاب الفلج   نضرب بالسيف ونرجو بالفرج

اسی کے مثل یہ شعر ہے

ألم يأتيك والأنباء تنمي   بما لاقت لبون بني زياد

اول کی تقدیر "نرجو الفرج" ہے، ثانی کی "ما لاقت" ہے۔ علامہ محلی کا مختار یہی قول ہے کہ حرفِ با مفعول میں زائد ہے اور ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ کی با سببیہ ہے ﴿ إِلْحَادٍ ﴾ سے متعلق ہے۔ "أي بسببه بأن ارتكب منهيا ولو شتم الخادم"[3] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ بدل ہے باعادۂ جار، یعنی "إلحاداً ظلماً"۔ دوسرا یہ قول لکھا ہے کہ ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ حال ہے،[4] یعنی "إلحاداً ظالماً" دوسری قراءت "ومن یرد" بفتحِ تحتیہ ہے "ورود" سے، بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[5] شیخ زادہ نے فرمایا: "أي من أتى فيه بإلحاد ظلما" اس بنا پر کہ حرفِ با واسطے تعدیہ کے ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس قراءت کو شاذ ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ اس کی بنیاد پر ﴿ بِإِلْحَادٍ ﴾ حال ہوگا۔[6] "أي متلبسا بإلحاد" یعنی جو شخص وارد ہو مسجد الحرام میں، درآں حالیکہ ملتبس ہونے والا ہے الحاد کے ساتھ۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ ﴿ بِإِلْحَادٍ ﴾ کے معنی "بأن یلحد" ہیں۔ (فتح القدیر کی عبارت یہ ہے: "قال الكوفيون: دخلت الباء لأن المعنى بأن يلحد و الباء مع أن تدخل و تحذف"[7])

اصل لغت میں الحاد کے معنی میل ہیں، مگر اللہ پاک نے اس جگہ بیان فرمایا کہ الحاد میل ہے ساتھ ظلم کے۔ گازرونی نے کہا ہے کہ ﴿ بِإِلْحَادٍ ﴾ کے بعد ﴿ بِظُلْمٍ ﴾ کا مقصد یہ ہے کہ الحاد کبھی بہ حق ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٠۔ ١٠١)
[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٩)
[5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢)
[6] التبيان في إعراب القرآن ٢٠/ ٩٣٩)
[7] فتح القدير (٣/ ٦١٠)

ظلم کے مقابلے میں ہے، جس طرح کہ اللہ پاک کے اس قول میں ہے: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔'' اس قول کو جمل نے حفناوی سے نقل کیا ہے۔ اس ظلم میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے، پس بعض اقوال تو پہلے گزر چکے ہیں۔ بعض یہ ہیں: کسی نے کہا ہے کہ ''إلحاد بظلم'' ہر منع کی ہوئی چیز ہے، قول ہو یا فعل، یہاں تک کہ غلام کو گالی دینا۔ کسی نے کہا ہے کہ بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا۔ یا ممنوعاتِ حرم میں سے کسی شے کا مرتکب ہونا، مثلاً: شکار کا قتل کرنا، درخت کاٹنا۔

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان کے دو خیمے تھے ایک حل میں دوسرا حرم میں، پھر جب وہ اپنے گھر والوں پر عتاب کرنا چاہتے تو حل میں ان پر عتاب کرتے۔ کسی نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا: ہم حدیث کیے جاتے تھے اس بات کی کہ حرم میں من جملہ الحاد یہ ہے کہ آدمی کہے: ''كلا والله! و بلى والله!''[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکے میں سیئات مضاعف کیے جاتے ہیں، جس طرح حسنات مضاعف کیے جاتے ہیں۔[2] یہ اقوال امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔[3]

فتح القدیر و فتح البیان میں فرمایا ہے کہ کسی نے کہا: حرم میں جھوٹی قسمیں کھانا ہے۔ کسی نے کہا: اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اس مکان میں صرف معصیت کا ارادہ کر لینے پر عذاب کیا جاتا ہے۔ اسی طرف عبداللہ بن مسعود و عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم گئے ہیں۔ یہاں تک کہا ہے کہ اگر حرم میں کوئی شخص ارادہ کرے کسی آدمی کو قتل کرنے کا عدن میں تو البتہ اللہ اس کو عذاب کرے۔ (امام سدی رحمہ اللہ نے کہا مگر یہ کہ وہ توبہ کرے۔[4] كذا في الخازن)

حاصل یہ ہے کہ یہ آیت اس پر دال ہے کہ جو شخص بیت الحرام میں ہے تو وہ صرف ظلم کے ارادے پر بھی پکڑا جائے گا، پس جو یہ وارد ہوا ہے کہ اللہ پاک نے اس اُمت کے لیے وہ شے بخش دی ہے، جس کے ساتھ اس کے جی نے بات کی۔ لہٰذا یہ آیت اس کی مخصص ہے۔ ہاں مگر یوں کہیں کہ اس میں ارادہ صرف حدیثِ نفس پر زیادہ ہے۔ بالجملہ اس کی بحث اور اس میں حق بیان کرنا ایسے طریقے سے کہ تمام دلیلوں کو جمع کر دے اور اشکال کو دور کرے، انتہائی طویل ہے۔ اسی آیت کی مثل یہ حدیث شریف ہے کہ جس وقت دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ملیں تو قاتل و مقتول آگ میں ہیں۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! یہ تو قاتل ہے، پس مقتول کا کیا حال ہے؟ فرمایا: بے شک وہ اپنے صاحب کے قتل پر حریص تھا،[2] پس وہ آگ میں داخل ہوا اس جگہ صرف اس حرص کی بنا پر جو اس نے اپنے صاحب کے قتل کے بارے میں کی تھی۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس بحث کو ایک مستقل رسالے میں لکھا ہے۔[3]

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٤) (2) الدر المنثور (٦/ ٢٩) (3) تفسير الخازن (٥/ ١٢)
(4) تفسير الخازن (٥/ ١٢) (5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)
(6) فتح القدير (٣/ ٦٠٩) فتح البيان (٩/ ٣٦۔ ٣٧)

(اس رسالے میں جو بات ثابت کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ خاص ہے حدیثِ نفس کی بخشش کے بارے میں۔ رہی حدیث شریف تو اس کے بارے میں یوں کہا ہے کہ مجرد حرص فقط نہ تھی، تا آنکہ اس باب سے ہو، بلکہ وہ حرص قوت سے فعل کی طرف خارج ہوئی، کیوں کہ اس نے دوسرے سے ملاقات کی اور اپنے ہتھیار برہنہ کیے۔ واللہ أعلم كذا على هامش، فتح القدير۔) اور سیدنا ابو الوفا الصدیق رحمہ اللہ نے "عون الباري شرح تجريد البخاري" میں اور دیگر مولفات میں اس بحث کو نہایت تفصیل سے تحریر فرمایا ہے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَٰهِيمَ مَكَانَ ٱلْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِى شَيْـًٔا وَطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْقَآئِمِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ﴿٢٦﴾ وَأَذِّن فِى ٱلنَّاسِ بِٱلْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾

اور (یاد کریں) جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ مقرر کر دی (اور اسے حکم دیا) کہ تو میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کر اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع، سجدے کرنے والوں کے لیے میرا گھر پاک رکھ ﴿26﴾ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیدل (چل کر) اور ہر لاغر سواری پر (سوار ہو کر) آئیں گے جو ہر دور دراز رستے سے آئیں گی ﴿27﴾

تعمیرِ کعبہ اور اعلانِ حج:

کہتے ہیں کہ کعبہ شریف کی جگہ پہلے سے بابرکت تھی، پھر مدتوں کے بعد نشان نہ رہا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا، پھر عمارت بنائی اور تازہ کیا۔ ایک بادل غیب سے آ کر کھڑا ہوا، اس کی چھاؤں پر لکیر ڈالی اور بنیاد رکھی۔ دوسری اُمتوں میں رکوع نہ تھا، یہ خاص اسی اُمت میں ہے۔ خبر دی کہ بعد میں لوگ ہوں گے اس کو آباد کرنے والے۔ ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے پکارا کہ لوگو تم پر اللہ نے حج فرض کیا ہے، حج کے لیے آؤ۔ جن کی قسمت میں حج ہے، انھوں نے باپ کی پشت میں لبیک کہا، ایک بار یا دو بار یا زیادہ۔ اپنے شوق سے ہزاروں لوگ پا پیادہ آتے ہیں، لیکن فرض تب ہے کہ سواری مل جائے اور اگر مکہ نزدیک ہے، یا کسی شخص کو چلنے کی عادت ہے تو امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں فرض ہے۔

جس زمین کی بنیاد اول دن سے اللہ وحدہ لا شریک لہ کی توحید و عبادت پر رکھی گئی ہے، قریش میں سے جن لوگوں نے ایسی مبارک جگہ میں غیر اللہ کو پوجا اور اس کے ساتھ شرک کیا، ان لوگوں کے لیے اس آیت میں ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ہے۔ یعنی یہ جگہ تو اس لائق ہے کہ اس میں اکیلے اللہ کو پوجا جائے، کیوں کہ شروع دن سے اس کی بنیاد اسی واسطے رکھی گئی ہے۔ ایسی بابرکت جگہ پر اس کو تو نہ پوجا، اس کے غیر کو پوجنے لگے، اس سے بڑھ کر کیا بے وقوفی

ہوگی کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی عبادت کے پیچھے پڑے، پس اللہ پاک نے ذکر فرمایا: "إنه بوأ إبراهيم مكان البيت أي أرشده إليه وسلمه له و أذن له في بنائه" یعنی اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ بتائی اور اس کو اُن کے سپرد کیا اور اس کے بنانے کا ان کو اذن دیا۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے ہی پہلے پہل بیتِ عتیق کو بنایا اور اُن سے پہلے اس کی بنا نہیں ہوئی، اُن میں سے بہت لوگوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ صحیح میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کون سی مسجد پہلے بنائی گئی؟ فرمایا: مسجد الحرام۔ میں نے عرض کی: پھر کون سی؟ فرمایا: بیت المقدس۔ میں نے عرض کی: اُن کے درمیان کتنا زمانہ ہے؟ فرمایا: چالیس برس۔[1] اور خود اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ [البقرة: ١٢٥] "اور ہم نے حکم دیا ابراہیم اور اسماعیل کو کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے۔"

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ڬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٩٦۔ ٩٧] "بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام دنیا کے لیے بڑی برکت اور ہدایت والا ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے، اللہ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ ساری دنیا سے بے پروا ہے۔" احادیثِ صحاح اور آثار جو بیت اللہ کی بنیاد اور تعمیر کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، ہم ان کا ذکر پہلے کر آئے ہیں، یہاں ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔[2] اس جگہ اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا ﴾ یعنی تنہا میرے نام پر اس کو بنا۔

﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ ﴾ امام قتادہ اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا اور پاک کر میرے گھر کو شرک سے۔[3] ﴿ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَالْقَآىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ یعنی اس کو خاص ان لوگوں کے واسطے ٹھہرا، جو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرتے ہیں، پس اس کا طواف کرنے والا تو مشہور و معروف ہے، طوافِ خاص ترین عبادات ہے، بیت اللہ کے نزدیک، کیوں کہ طواف اس کے سوا کسی اور قطعۂ زمین میں نہیں کیا جاتا۔ اور قائمین وہ لوگ ہیں جو نماز میں کھڑے رہتے ہیں اور اسی لیے ﴿ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ فرمایا۔ پس طواف کو نماز کا قرین (ساتھی) کیا، کیوں کہ یہ دونوں بیت اللہ کے ساتھ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٦) [2] سورة البقرة، رقم الآية (١٢٥) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٤)

خاص طور پر مشروع ہیں۔ لہٰذا اکثر احوال میں طواف بیت اللہ کے نزدیک ہوتا ہے اور نماز اس کی طرف پڑھی جاتی ہیں، مگر تین نمازیں اس سے مستثنیٰ ہیں: ایک تو وہ نماز ہے جو وقتِ اشتباہ قبلہ (جب قبلہ کی سمت کے بارے میں شک ہو) پڑھی جاتی ہے۔ دوسری وہ نماز ہے جو لڑائی کے دوران میں پڑھتے ہیں۔ تیسری نفلی نماز ہے سفر میں۔ واللہ أعلم.

﴿ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ یعنی پکار دے لوگوں میں دراں حالیکہ تو بلانے والا ہے اُن کو اس گھر کے حج کی طرف، جس کے بنانے کا ہم نے تجھ کو حکم دیا ہے۔ پس ذکر کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: ''یا رب! کیف أبلغ الناس وصوتي لا ینفذھم'' یعنی اے رب! میں لوگوں کو کیسے پہنچاؤں، حالاں کہ میری آواز اُن کو نہ پہنچے گی۔ اس پر یہ ارشاد ہوا: ''نَادِ وَعَلَيْنَا الْبَلَاغُ'' یعنی تو تو پکار دے، پہنچانا ہم پر ہے۔ جب یہ سنا تو اپنے مقام پر کھڑے ہوئے، یعنی مقامِ ابراہیم پر، جو کہ معروف ہے۔ کسی نے کہا: حجر پر، یعنی حجرِ اسود پر۔ کسی نے کہا ہے کہ کوہِ صفا پر۔ کسی نے کہا ہے کہ جبلِ ابوقبیس پر اور کہا: ''يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ قَدِ اتَّخَذَ بَيْتًا فَحُجُّوْهُ'' یعنی لوگو! بے شک تمھارے پروردگار نے ایک گھر بنایا ہے، لہٰذا تم اس کا حج کرو۔ پس کہتے ہیں کہ پہاڑ پست ہوگئے، یہاں تک کہ زمین کے سب کناروں میں آواز پہنچ گئی اور اُن لوگوں کو بھی سنا دیا جو ماں کے رحم میں اور باپ کی پشت میں تھے اور سنگ وکلوخ و درخت میں سے ہر شے نے اس کو سنا اور اُن لوگوں نے سنا جن کے واسطے اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ وہ حج کریں گے روزِ قیامت تک اور سب نے اس کا یہ جواب دیا: ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ'' یعنی الٰہی! ہم حاضر ہیں۔ یہ مضمون ہے اس روایت کا، جو کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر رحمہم اللہ اور بہت سے سلف سے مروی ہے۔ واللہ أعلم۔ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے اس کو مطول وارد کیا ہے۔[1]

﴿ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ ﴾ علماء میں سے جو لوگ اس طرف گئے ہیں کہ جو شخص پیادہ پا چلنے پر قدرت رکھتا ہے، اس کے واسطے پیادہ پا چل کر حج کرنا افضل ہے سوار ہو کر حج کرنے سے، وہ لوگ بھی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں، اس لیے کہ پیادہ پا چلنے والوں کا پہلے ذکر فرمایا ہے۔ پس اُن کا نام پہلے لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ مہتم بالشان ہیں، جبھی تو اُن کا ذکر اَوروں سے پہلے کیا اور اُن کی ہمت کی قوت اور اُن کے عزم کی شدت کی دلیل ہے، یعنی وہ لوگ بڑے قوی الہمت و شدید العزم ہیں کہ پیدل حج کر آتے ہیں، وہ اسی کے مستحق ہیں کہ اُن کا ذکر سب سے پہلے ہو۔ وکیع نے عن ابی العمیس عن ابی حلحلہ عن محمد بن کعب عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: ''ما أساء علي شيء إلا أني وددت أني كنت حججت ماشيا لأن الله يقول يأتوك رجالا''[2] یعنی مجھ پر کسی شے نے برائی نہیں کی، مگر اس بات نے کہ میں نے دوست رکھا اس بات کو کہ میں

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ٦۰۵۔ ٦۰۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲٤۸٦۔ ۲٤۸۸)

[2] تفسیر الطبري (۱۸/ ٦۰۷۔ ٦۰۸) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۸۸)

پیدل چل کر حج کرتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ وہ آئیں گے تیرے پاس پیدل چل کر اور جس بات پر اکثر لوگ ہیں وہ یہ ہے کہ سوار ہو کر حج کرنا افضل ہے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے لیے، کیوں کہ آپ ﷺ نے اپنی کمال قوت کے باوجود سوار ہو کر حج کیا ہے۔

﴿ يَأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴾ ﴿ فَجٍّ ﴾ سے مراد راستہ ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا ﴾ [الأنبياء: ٣١] ''اور ہم نے اس میں کھلی راہیں رکھیں۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ عَمِيْقٍ ﴾ سے مراد بعید ہے۔ امام مجاہد، عطا، سدی، قتادہ، مقاتل بن حیان، ثوری رحمہم اللہ اور بہت سے لوگ اسی کے قائل ہیں۔[1] یہ آیت اُس آیت کی طرح ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے، جس جگہ کہ انھوں نے اپنی دعا میں کہا ہے: ﴿ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾ [إبراهيم: ٣٧] ''چناں چہ تو بعض لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہونے والے کر دے۔'' مگر نہیں ہے کوئی اہلِ اسلام سے مگر حال یہ ہے کہ وہ کعبہ کو دیکھنے کا شوق رکھتا ہے اور طواف کی طرف جھکتا ہے۔ ساری اطراف و جہات سے لوگ کعبہ کا قصد کر کے آتے ہیں۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح القدیر و فتح البیان میں بعض روایات آیتِ باب کے متعلق ذکر کی ہیں۔ زیادتِ بصیرت کے لیے یہاں لکھی جاتی ہیں: ① سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ بنانے کا حکم ہوا تو اُن کے ہمراہ اسماعیل علیہ السلام اور ہاجرہ علیہا السلام نکلے، پھر جب مکے میں آئے تو ایک ٹیلے پر بیت اللہ کی جگہ میں بادل کی طرح دیکھا، اس میں سر کی مثل تھی، پس اُس سر نے ابراہیم علیہ السلام سے باتیں کیں۔ کہا: اے ابراہیم! تو میرے سائے پر بنا، یا میرے اندازے پر اور نہ زیادہ کر نہ کم کر۔ پھر جب بن چکا تو ابراہیم علیہ السلام نکلے اور اسماعیل و ہاجرہ علیہما السلام کو چھوڑ گئے، یہ اس وقت کا ذکر ہے جس کا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ ﴾[3] (أخرجه ابن جرير و الحاكم وصححه) ② امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: ''﴿ وَالْقَآئِمِيْنَ ﴾ المصلين عنده''[4] (أخرجه ابن ابى شيبة و ابن جرير و ابن المنذر وابن أبي حاتم عنه و أخرج عبد الرزاق وابن جرير عن قتادة معناه)

③ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس وقت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہو چکے تو عرض کی: اے میرے رب! میں فارغ ہو چکا تو فرمایا: ﴿ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ ''قال: رب وما يبلغ صوتي؟ قال: أذن و علي البلاغ، قال: رب كيف أقول؟ قال: قل يأيها الناس! كتب عليكم الحج إلى البيت العتيق'' یعنی تو لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔ عرض کی: اے رب! اور کیا میری آواز پہنچ جائے گی؟ فرمایا: تو تو پکار دے اور آواز کا پہنچانا میرا کام ہے۔ عرض کی: میں کیا کہوں؟ فرمایا: کہہ دے اے لوگو! تم پر حج فرض کیا

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٨) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٨۔ ٢٨٩)

[3] تفسير الطبري (٣/ ٦٨۔ ٦٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٦٠١) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٤) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٦)

گیا ہے بیتِ عتیق کی طرف۔ پس سن لیا اس کو اُن لوگوں نے جو کہ آسمان میں ہیں اور زمین میں، کیا تو نہیں دیکھتا ہے کہ وہ جواب دیتے ہیں، بعید ترین زمین سے لبیک پکارتے ہوئے۔[1] (أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف و ابن منيع و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و الحاكم و صححه والبيهقي في السنن عنه) اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار ایک جماعت سے مروی ہیں۔

﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ ﴾ کلمہ ﴿ اِذْ ﴾ بہ معنی وقت اور حین کے ہے جو "اذکر" محذوف سے متعلق ہے۔ خطاب ہے نبیِ کریم رسول رؤف رحیم نبی ﷺ کو۔ علامہ نسفی، بیضاوی، محلی اور ابو البقاء رحمہم اللہ نے یہی تقدیر کی ہے۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں بھی اسی طرح ہے۔[2]

"تبوء" کی اصل مکان کا کر دینا ہے مباءۃ مَقَرّ۔ مباءۃ اسم مکان ہے بَاءَ بہ معنی رجع سے، یعنی قرار گاہ اور ٹھکانے کو مباءت بولتے ہیں، کیوں کہ جس کسی کا جو ٹھکانا ہوتا ہے اِدھر اُدھر پھر پھرا کر اسی طرف لوٹ آتا ہے۔ "تبوئه" بلا واسطہ اور بواسطۂ حرفِ لام دونوں طرح متعدی ہوتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "بوأته منزلا وبوأت له" جس طرح کہ تمکین کا حال ہے کہ "مكنتك" اور "مكنت لك" دونوں طرح کہتے ہیں۔ اس جگہ معنی ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کے یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے واسطے مکان بیت اللہ کو مباءت کر دیا، یعنی اس کو اُن کے لیے مرجع ٹھہرایا کہ وہ عبادت اور عمارت کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ اس کے معنی میں کئی قول ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "بوأنا له بينا" یعنی بیان کر دیا ہم نے اس کے واسطے اس جگہ مکان بیت اللہ کا، تاکہ وہ اس کو بنائے اور اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے مرجع ہو جائے، تاکہ اس کی طرف رجوع کریں اور اس کا حج کریں۔ یہ تو شیخ زادہ نے ذکر کیا ہے۔ فتح القدیر میں زجاج کے الفاظ یوں ہیں کہ کر دیا ہم نے مکانِ بیت کو ٹھکانا ابراہیم علیہ السلام کے لیے اور ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کے واسطے بیت کی جگہ کا بیان کر دیا۔ (عربی الفاظ یہ ہیں: "قال الزجاج: معناه: جعلنا مكان البيت مبوأ لإبراهيم ومعنى ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ بينا له مكان البيت" فتح البیان میں یوں کہا ہے: "وقيل معنى بوأنا... الخ"[3] فتأمل)

امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "إذ عيناه وجعلناه له مباءة"[4] یعنی کر دیا ہم نے مکانِ بیت کو اور کر

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٣٢٩) تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٦۔ ٢٤٨٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٢١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ١٧٦) فتح القدير (٣/ ٦١٣۔ ٦١٤)

[2] تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٩) فتح القدير (٣/ ٦١٠) فتح البيان (٩/ ٣٧)

[3] فتح القدير (٣/ ٦٠١) فتح البيان (٩/ ٣٧)

[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢)

دیا اس کو ٹھکانا اس کے لیے۔ شیخ زادہ نے کہا: چونکہ بیان کرنے اور معین کرنے سے مقصد یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام مکانِ بیت کو قرارگاہ اور ٹھکانا بنائیں اس واسطے "عیناہ" کے بعد "جعلناہ لہ مباءۃ" کہا اور جب ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ باء بہ معنی رجع سے منقول تھا، ارادۂ تعدیت (متعدی کرنا) کے تو ظاہر یہ تھا کہ "بوأنا إبراهيم" بغیر لام کے کہتے۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ "جعلناه له مباءة" کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ "مكان البيت بوأنا" کا مفعول بہ ہے اور حرفِ لام اس واسطے لائے کہ ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کو "جعلنا" کے معنی کا متضمن کیا ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ کے نزدیک قولِ مختار یہی ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: "واذكر حين جعلنا لإبراهيم مكان البيت مباءة"۔ یہ قول کہ ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ بہ معنی "جعلنا" ہے،[2] امام خازن رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ کسی نے کہا: بہ معنی "وطّأنا" ہے۔[3] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: بہ معنی "هيأنا" ہے۔[4] ان معانی کی بنا پر حرفِ لام زائد نہیں ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی عدمِ زیادتِ لام مختار ہے، اسی واسطے ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کے معنی "بينا" لکھے ہیں۔[5] امام قرطبی رحمہ اللہ نے بلفظِ قیل یہ معنی ذکر کیے ہیں کہ "أريناه أصله ليبنيه" یعنی دکھا دی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی اصل، تاکہ وہ اس کو بنائے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ لام زائد ہے اور ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ ظرف ہے۔[6] "أي أنزلنه فيه" یعنی اُتارا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ میں۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس قول کو پہلے ذکر کیا ہے تو گویا اُن کے نزدیک مختار یہی ہے اور کہا ہے کہ دلیل اس پر یہ آیت ہے: ﴿ وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾[7] [يونس: ٩٣] "اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانا دیا۔" امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر معربین اسی کے قائل ہیں، لیکن امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو بلفظِ قیل ذکر کیا ہے،[8] گویا اُن کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ شیخ زادہ نے اس کے پسند نہ ہونے کی یہ وجہ لکھی ہے کہ یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ لام اسی وقت زیادہ کیا جاتا ہے، جبکہ معمول مقدم ہو اور عامل فرع ہو، حالاں کہ یہاں اُن میں سے کوئی شے موجود نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَكَانَ الْبَيْتِ ﴾ ظرف ہے تو حق اس کا یہ ہے کہ فعل اس کی طرف بکلمہ "في" متعدی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ بنا بر قولِ اول اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت کی جگہ کی تعیین اور بیان کس طرح کیا، لہٰذا اس بارے میں باختلافِ روایت کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ زمانۂ طوفان میں بیت اللہ آسمان کی طرف اُٹھا لیا گیا تھا یا مٹ گیا تھا، پس اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک ہوا بھیج کر اس کی جگہ معلوم کرا دی، اس ہوا نے بیت

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢۔ ١٢٣) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠١) [3] تفسير الخازن (٥/ ١٢)
[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٩) [5] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) [6] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٦)
[7] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٣٩) [8] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢)

اللہ کے گرداگرد کو جھاڑ ڈالا تو انھوں نے اس کی پرانی بنیاد پر اس کو بنایا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو بلفظِ قیل ذکر کیا ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "وكان قد رفع زمن الطوفان". علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اس قول کو ذکر کیا ہے اور بجائے "ماحو له" کے "مكان البيت" کہا ہے اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ بیت اللہ سرخ یاقوت کا تھا۔[2]

امام خازن رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ ﴿ مَكَانَ الْبَيْتِ ﴾ صرف اس لیے ذکر کیا کہ زمانۂ طوفان میں کعبہ آسمان کی طرف اُٹھا لیا گیا تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا تو انھوں نے نہ جانا کہ کس طرف بنائیں، پس اللہ تعالیٰ نے ریح حجوج بھیجی تو اس نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت اللہ کی بنیاد کے گرداگرد جھاڑ دیا۔[3] تفسیر البیضاوي۔ (مجمع البحار میں الفاظ اس طرح ہیں: "شديدة المرور في غير استواء،[4] باد سخت در پیچان كذا في الصراح") امام قرطبی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے: "درس بالطوفان وغيره" یعنی بسبب طوفان وغیرہ کے بیت اللہ کا نشان مٹ گیا تھا، پھر جب ابراہیم علیہ السلام کی مدت آئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بنانے کا اُن کو حکم دیا تو وہ اس کے موضع کی طرف آئے اور نشان ڈھونڈنے لگے، پس اللہ پاک نے ریح ہفافہ کو بھیجا تو اس نے بنیادِ آدم علیہ السلام کو کھول دیا۔ (ریح ہفافہ اس ہوا کو کہتے ہیں جو اپنے چلنے میں نہایت جلد گزرنے والی ہو۔) "فرتب قواعده عليه" یعنی اس بنیاد پر اس کی بنیاد مرتب کی، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔[5]

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ پاک نے بیت اللہ کے برابر ایک ابر بھیجا تو وہ اس کی برابری میں کھڑا ہوگیا اور اس میں ایک سر تھا، جو بولا کہ اے ابراہیم! تو میرے اندازے پر بنا، پس انھوں نے اس پر بنایا۔ یہ الفاظ امام خازن رحمہ اللہ کے ہیں۔[6] خطیب کے الفاظ ابن علی دَوری سے یہ ہیں، یعنی تو میرے دور پر بنا۔ جمل نے کہا ہے کہ بیت اللہ کے بنائے جانے کے بعد انبیاء علیہم السلام اس کی جگہ کا حج کیا کرتے تھے اور اس کو جانتے نہ تھے، یہاں تک کہ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے واسطے اس کا ٹھکانا ٹھیک کر دیا تو انھوں نے اس کو آدم علیہ السلام کی بنیاد پر بنایا اور طول اس کا آسمان کی جانب میں سات ذراع رکھا اپنے ذراع سے، اور زمین میں تیس ذراع ان کے ذراع سے اور حطیم کو بیت اللہ میں داخل کیا اور اس کی چھت نہیں بنائی اور اس کا ایک دروازہ رکھا اور اس کے لیے ایک کنواں کھودا کہ بیت اللہ کے لیے جو چیز ہدیہ کی جائے، وہ اس میں ڈال دی جائے۔ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے شیث علیہ السلام نے بنایا اور اُن سے پہلے آدم علیہ السلام نے اور اُن سے پہلے ملائکہ نے۔ سورۃ البقرہ میں اس پر پوری گفتگو گزر چکی ہے۔[7]

تعمیرِ بیت اللہ کی تاریخ:

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ مروی ہے کہ کعبۂ مکرمہ پانچ بار بنایا گیا ہے: ایک تو آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتوں

---

① تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢) ② تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) ③ تفسير الخازن (٥/ ١٢)
④ مجمع بحار الأنوار (٢/ ١٣) ⑤ تفسير القرطبي (١٢/ ٣٦) ⑥ تفسير الخازن (٥/ ١٢-١٣) ⑦ رقم الآية (١٢٥)

نے بنایا اور وہ سرخ یاقوت کا تھا، پھر زمانۂ طوفان میں آسمان کی طرف اُٹھا لیا گیا۔ دوسری بنا (تعمیر) ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ مروی ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بنائے بیت اللہ کا حکم دیا تو انھوں نے نہ جانا کہ کہاں بنائیں، پس اللہ پاک نے اُن کی طرف سکینہ بھیجا۔ سکینہ ریحِ جوج ہے، اس نے بیت اللہ کی جگہ کو مثل ڈھال کے گھیر لیا، پھر اس نے بیت اللہ کو کھول دیا، یعنی ماحولِ بیت کو اور پرانی بنیاد کو ظاہر کر دیا تو انھوں نے بنیادِ قدیم پر اس کو بنایا۔ تیسری بنا قریش کی ہے، جاہلیت کے زمانے میں۔ اس تعمیر میں نبی علیہ السلام حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت جوان مرد تھے۔ پھر جب قریش نے حجرِ اسود کے اٹھانے کا ارادہ کیا تو اس بارے میں جھگڑے، ہر قبیلے نے چاہا کہ اس کے اُٹھانے کا وہی متولی ہو، پھر اس بات پر متفق ہوئے کہ جو مرد اس گلی سے پہلے نکلے وہی اُن کے درمیان فیصلہ کرے، پس نبی ﷺ ہی پہلے نکلے تو آپ ﷺ نے اُن کے درمیان یہ فیصلہ فرمایا کہ حجرِ اسود کو ایک چادر میں رکھیں، پھر اس کو سارے قبیلے اُٹھائیں، پس سب نے اس کو اُٹھایا، پھر نبی ﷺ چڑھے، انھوں نے اس کو اُٹھایا اور اس کی جگہ میں اس کو رکھ دیا۔ قریش آپ ﷺ کو امین کہا کرتے تھے۔ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے مبعوث ہونے سے پندرہ برس پہلے بنائے کعبہ ہوئی ہے۔ چوتھی بنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ہے۔ پانچویں بنا حجاج کی ہے، یہی بنا آج تک موجود ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا ﴾ میں چار قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ "اَن" تفسیر یہ ہے، لیکن "اَن" تفسیر یہ کی شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک جملہ ہو اور اس میں قول کے معنی ہوں حروفِ قول نہ ہوں اور اس کے مابعد کے معنی ماقبل سے متحد ہوں، حالاں کہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ اور شرک سے نہی کرنا اور تطہیرِ بیت کا حکم کرنا "تبوئه" کی تفسیر کیسے ہوسکتا ہے؟ پس مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ "اَنْ" "بَوَّاْنَا" کی تفسیر ہے اور ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ میں معنی قول کے ہیں، اس لحاظ سے کہ بیت اللہ کی جگہ کو معین کرنا اور ابراہیم علیہ السلام کے واسطے اس کو جائے قرار ٹھہرانا اس سے صرف عبادت مقصود ہے تو گویا یوں فرمایا کہ "تعبدنا إبراهيم قلنا له لا تشرك بي شيئا" اور تعبد میں قول کے معنی ہیں، اس لیے کہ تعبد شخص اس سے عبارت ہے کہ امر و نہی کی تکلیف میں اس کو اپنے غلام کی مثل کر لے تو گویا یوں کہا گیا: "كلفنا إبراهيم أن لا تشرك بي شيئا... الخ" یہ تو قاضی صاحب کے قول کی تشریح ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کی تفسیر "بينا" کی اور "أَن" سے پہلے "و أمرناه" مقدر نکالا۔[1] (یہ بھی ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کی تفسیر ہے)۔ غرض اس سے یہ ہے کہ "اَن" تفسیر یہ ہو جائے، کیوں کہ "أمرناه" میں ہر دو شرط مذکور موجود ہیں۔ پس ﴿ بَوَّاْنَا ﴾ کے معنی "قلنا لا تشرك و قلنا طهر بيتي" ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ کی تقدیر یہ ہے: "عهدنا إلى إبراهيم وقلنا له لا تشرك بي شيئا"۔ علامہ نسفی اور ابو البقاء رحمہما اللہ کی تقدیر یہ ہے:[2] "قائلين له لا

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٣) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠)

تشرك بي شيئا" دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ أَنْ ﴾ مصدریہ ہے۔

مشہورتر مذہب یہ ہے کہ ﴿ أَنْ ﴾ مصدریہ کا صلہ امر و نہی نہیں ہوتا اور جس میں معنی طلب کے ہیں، وہ بھی "أَنْ" کا صلہ نہیں پڑتا ہے، لیکن سیبویہ نے اس کو جائز رکھا ہے۔ ان کے نزدیک "أمرته أن اقرء، و أمرته أن قم، أي بأن قم" جائز ہے۔ معنی یہ ہیں: "بالقيام"۔ جو ﴿ أَنْ ﴾ مصدریہ مضارع کو نصب دیتا ہے، سیبویہ کے نزدیک ماضی و مضارع و امرونہی سے اس کا صلہ کیا جاتا ہے۔ پس آیتِ کریمہ میں جو ﴿ أَنْ ﴾ ہے، جائز ہے کہ مصدریہ ہو نہی سے موصول ہو لامِ علت مقدر سے مجرور المحل ہو محذوف سے متعلق ہو، معنی یہ ہوں کہ "فعلنا ذلك لئلا تشرك" مگر اس وجہ کی بنا پر ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے: "أن لا يشرك" غیب کی یا کے ساتھ۔ ایک قراءت میں اسی طرح ہے۔ اسی واسطے امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراءت بالیاء ﴿ أَنْ ﴾ مصدریہ کی مقوی ہے۔[1]

عامہ کی قراءت بحرفِ تا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام من جملہ التفات ہے، غیب سے حاضر کی طرف۔ پس جو ہم ذکر کر آئے ہیں، اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کلمہ ﴿ أَنْ ﴾ آیتِ کریمہ میں مصدریہ ناصبہ ہو سکتا ہے، باوجود اس کے کہ ﴿ لَا تُشْرِكْ ﴾ لائے ناہیہ سے مجزوم ہو، گویا معنی یہ ہیں: "بوأنا له مكان البيت وفعلنا ذلك لئلا يجعل لي شريكا في العبادة"۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ مصدریہ کے قائل ہیں۔ امام بیضاوی اور ابو البقاء رحمہما اللہ نے دونوں قول نقل کیے ہیں۔ علامہ نسفی اور محلی رحمہما اللہ نے صرف قولِ اول نقل کیا ہے۔[2] تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ أَنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے۔ شیخ زادہ نے فرمایا ہے کہ یہ جائز نہیں اس لیے کہ مخففہ کا صلہ نہ امر و نہی ہوتا ہے نہ وہ شے جس میں معنی طلب کے ہیں، یہ بات بالاجماع ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ﴿ أَنْ ﴾ زائدہ ہے۔ کواشی وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ (کواشی منسوب ہے طرف کواشہ کے، یہ نواحِ موصل میں ایک قلعہ ہے، اُن کی ولادت اسی میں ہوئی۔ امام یافعی رحمہ اللہ نے ٦٨٠ ہجری کے حوادث کے ذیل میں تاریخ "مرأة الجنان" میں تحریر فرمایا ہے: "وفيها توفي الشيخ المفسر العلامة المقري المحقق الزاهد القدوة موفق الدين أبو العباس أحمد بن يوسف بن حسن الشيباني الموصلي الكواشي اشتغل حتى برع في القراءات و التفسير والعربية وكان منقطع القرين و رعا و زهدا و صلاحا و تبتلا وله كشف و كرامات)[3]

فتح القدیر میں چاروں قول ذکر کیے ہیں، لیکن اجمالاً پھر کہا ہے۔ کسی نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ وحی کی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس بات کی کہ مت پوج میرے غیر کو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: گویا اُن سے یوں کہا گیا کہ تو

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠)

[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢۔ ١٢٣) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)

[3] مرأة الجنان (٤/ ١٤٥)

میری توحید کر اس گھر میں، کیوں کہ ﴿ لَا تُشْرِكْ بِيْ ﴾ کے معنی ہیں: "وحدني وطهر بيتي من الشرك و عبادة الأوثان" یعنی تو میری توحید کر اور میرے گھر کو شرک اور بتوں کی عبادت سے پاک صاف کر۔ بیت اللہ کے رہنے بسنے والوں میں سے جن لوگوں نے شرک کیا، ان پر اس آیت میں طعن ہے۔ یعنی یہ شرط تھی تمھارے باپ پر اور اُن پر جو اُن کے بعد ہوئے۔ لہٰذا تم نے وہ شرط پوری نہ کی، بلکہ تم نے شرک کیا۔ ایک فرقے نے کہا کہ ﴿ لَا تُشْرِكْ ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔[1]

﴿ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ ﴾ یعنی پاک کر میرے گھر کو اوثان و اقذار (پلیدی، ناپاکی) سے جیسا کہ علامہ نسفی اور بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی بتوں اور گندگیوں سے اس کو پاک صاف کرو۔ مطلب یہ ہے کہ معنوی وحسی گندگی سے اس کی طہارت مراد ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے صرف اوثان کا ذکر کیا ہے۔[3] امام قرطبی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ تطہیر بیت کی عام ہے کفر و بدعت اور تمام نجاستوں اور قتل و غارت کے خون میں، یعنی کفر و بدعت و نجاست وخون وغیرہ سب سے اس کو پاک صاف رکھنا چاہیے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد بتوں سے پاک کرنا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ ﴾ [الحج: ٣٠] "لہٰذا تم بتوں کی گندگی سے بچو۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ جرہم و عمالقہ کے بت تھے کعبے کی جگہ میں اور اس کے اردگرد قبل اس کے کہ ابراہیم علیہ السلام اس کو بنائیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کو منزہ و پاک کر اس سے کہ اس میں کوئی بت پوجا جائے۔ یہ حکم ہے اس میں توحید کا اظہار کرنے کا، یعنی اس کو غالب کرنے کا۔ فتح القدیر و فتح البیان میں بھی اس میں سے دو قول ذکر کیے ہیں۔ پھر کہا ہے کہ سورت براءت میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔[4] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ﴿ بَيْتِيَ ﴾ بفتح تحتیہ قراءتِ مدنی وحفص ہے۔[5]

﴿ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار یہ قول ہے کہ طائفین سے مراد لوگ ہیں، جو خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور قائمین سے مراد مصلین ہیں،[6] کیوں کہ نماز پڑھنے والا اپنی نماز میں ضرور قیام و رکوع و سجود کا جامع ہوتا ہے۔ اس کے بعد رکوع سجود کا ذکر ارکانِ نماز کے بیان کے لیے کیا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ عبادت عظیم الشان ہے، اس کا ہر رکن مستقل اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کے ادا کرنے والے کے لیے تطہیر کا حکم ہو۔ پھر جب وہ سب ارکان جمع ہو جائیں تو اس کا کیا کہنا ہے۔ طواف کو نماز کے ساتھ اس لیے رکھا کہ یہ دونوں بیت اللہ کے علاوہ اور کسی جگہ مشروع نہیں ہیں۔ لہٰذا طواف تو اس کے نزدیک ہوتا ہے اور نماز اس کی طرف۔ شیخ زادہ نے ذکر کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا کہ قائمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ

[1] فتح القدير (٣/ ٦١٠) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٧) فتح القدير (٣/ ٦١٠) فتح البيان (٩/ ٣٨) [5] تفسير النسفي (٣/ ١٠١)
[6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٢۔ ١٢٣)

میں اقامت گزیں ہیں، اس صورت میں طائفین سے مراد وہ لوگ ہوں گے، جو کعبے کا طواف کرتے ہیں اور وہ آفاقی ہیں، وہاں کے رہنے بسنے والے نہیں ہیں۔ علامہ نسفی اور خازن رحمہ اللہ کا مختار یہی قول معلوم ہوتا ہے اور امام محلی رحمہ اللہ کا بھی۔ تینوں نے "قائمین" کے معنی "مقیمین" اور "رکع سجود" کے "مصلین" لکھے ہیں۔ دونوں راکع اور ساجد کی جمع ہیں۔[1]

﴿ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ جمہور کی قراءت ﴿ أَذِّنْ ﴾ بفتح ہمزہ وتشدیدِ ذال معجمہ بصیغۂ امر ہے تاذین سے۔ صراح میں ہے: "تاذین دستوری دادن کسے را بر کارے۔" علامہ نسفی، محلی اور بیضاوی رحمہم اللہ نے کہا ہے: "نَادِ فِيهِمْ"[2] امام حسن اور ابن محیصن رحمہما اللہ نے "آذِن" بمد وتخفیفِ ذالِ معجمہ بصیغۂ امر پڑھا ہے[3] "إیذان" سے۔ صراح میں کہا ہے: "ایذان وتاذن آگاہانیدن واذان آگاہی دادن"۔ شیخ زادہ نے فرمایا ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ فِي النَّاسِ ﴾ اس قراءت کو بعید کرتا ہے، کیوں کہ اس وقت یہ لائق تھا کہ "آذن الناس" کہا جاتا بغیر کلمہ "فِيْ" کے، اس لیے کہ ایذان خود بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے۔ ﴿ بِالْحَجِّ ﴾ میں مضاف محذوف ہے: "أي بدعوة الحج والأمر به" جیسا کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: "الحج هو القصد البليغ إلى المقصد المنيع"[4] یعنی عالی مقصد کی طرف پورے طور پر قصد کرنے کو حج کہتے ہیں۔ مختار میں کہا ہے کہ اصل میں حج قصد ہے۔ اور عرف میں نسک ادا کرنے کی خاطر مکہ کا قصد کرنے کو حج بولتے ہیں۔ باب اس کا ردّ ہے، یعنی "حج يحج" بروزن "نصر ينصر"

فتح القدیر و فتح البیان میں ذکر کیا ہے، امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے، جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہو چکے تو جبریل علیہ السلام اُن کے پاس تشریف لائے، اُن کو امر کیا کہ لوگوں میں ندائے حج کریں تو وہ بولے: اے رب! میری آواز کو کون پہنچائے گا؟ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ تو تو پکار دے پہنچانا میرے ذمے ہے، پس ابراہیم علیہ السلام مقام پر چڑھے تو وہ اُن کو لے کر بلند ہوا، یہاں تک کہ بلند ترین پہاڑ کی طرح ہو گیا، پھر انھوں نے اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں ڈالیں اور اپنا چہرہ دائیں بائیں مشرق ومغرب کی طرف کیا اور کہا: اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے بیت اللہ کی طرف، پس تم اپنے رب کو جواب دو، پس اُن کو جواب دیا ان لوگوں نے جو کہ مردوں کی پشتوں میں اور عورتوں کے رحموں میں تھے: "لبيك اللهم لبيك"۔[5] امام

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير الخازن (٥/ ١٣) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)

[2] تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣)

[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٣٧) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣) تفسير النسفي (٣/ ١٠١)

[5] فتح القدير (٣/ ٦١٠۔ ٦١١) فتح البيان (٩/ ٣٨۔ ٣٩)

خازن رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ مقام پر چڑھے اور یہ الفاظ کہے: "يأيها الناس ألا إن ربكم قد بنى بيتا وكتب عليكم الحج إلى البيت فأجيبوا ربكم" ان کو ہر اس شخص نے جواب دیا جو حج کرے گا، اپنے باپوں کی پشتوں اور اپنی ماؤں کے رحموں سے: "لبيك اللهم لبيك"۔ پہلے پہل جس نے جواب دیا وہ لوگ یمن والے تھے، لہٰذا وہ سب لوگوں سے زیادہ حج کرنے والے ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ اس قول کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔[2]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبلِ ابوقبیس پر چڑھے اور الفاظ یہ ہیں: "يا أيها الناس حجوا بيت ربكم" پس اُن کو جواب دیا اس شخص نے جس کے لیے مقدر کیا گیا ہے کہ وہ حج کرے گا باپوں کی پشتوں اور ماؤں کے رحموں سے "لبيك اللهم لبيك"۔ امام بیضاوی نے بھی ابوقبیس کہا ہے اور الفاظ بھی بعینہٖ مثل علامہ نسفی رحمہ اللہ کے ہیں۔ پس سنا دیا اللہ پاک نے اس آواز کو اُن لوگوں کو جو مردوں کی پشتوں اور عورتوں کے رحموں میں تھے، مشرق و مغرب کے درمیان اُن لوگوں میں سے کہ اللہ کے علم میں طے ہو چکا تھا کہ وہ حج کریں گے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی ابوقبیس کہا ہے۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت وہ اس پر چڑھے تو پہاڑوں نے اپنے سر پست کر دیے اور بستیاں اُن کے واسطے بلند کر دی گئیں تو انھوں نے لوگوں میں حج کی ندا کی۔ پس ہر شے نے ان کو جواب دیا۔[4] شیخ زادہ نے تین قول نقل کیے ہیں: ایک کوہِ صفا۔ دوسرا جبلِ ابوقبیس۔ تیسرا مقام۔ یہ قول پہلے بھی گزر چکے ہیں اور ندا کے الفاظ یہ ہیں: "ياأيها الناس ألا إن ربكم قد بنى لكم بيتا وكتب عليكم الحج إليه فأجيبوا ربكم وحجوا بيته الحرام يثيبكم به الجنة ويجيركم من النار" پس آسمان اور زمین کے درمیان لوگوں نے اس ندا کو سنا، پھر کوئی شے باقی نہ رہی، جس نے ان کی آواز سنی، مگر وہ لبیک کہتے ہوئے متوجہ ہوئی۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ایک بار جواب دیا، وہ ایک بار حج کرے گا، جس نے دو بار جواب دیا وہ دو بار حج کرے گا، اسی مقدار کے مطابق زیادہ ہوگا۔[4] اب رہا خطاب ﴿ اَذِّنْ ﴾ کا، لہٰذا روایات و اقوالِ سابقہ سے معلوم ہو چکا کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ خطاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر! تم لوگوں کو یہ بات بتا دو کہ اُن پر حج فرض ہے اس قول کی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام کا خطاب ﴿ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ کے نزدیک ختم ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا ان کا خطاب ﴿ مَكَانَ الْبَيْتِ ﴾ پر تمام ہوگیا اور ﴿ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا ﴾ اور اس کا مابعد ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو قیل کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے[5] اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کو حسن بصری رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا۔ پھر کہا کہ پہلا قول زیادہ ظاہر

---

(1) تفسير الخازن (٥/ ١٣) (2) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦)
(3) تفسير القرطبي (١٢/ ٣٨) (4) تفسير الرازي (٢٣/ ٢٥) (5) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣)

ہے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے اس کو "زعم الحسن" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے، پھر حدیث مسلم کی ذکر کی ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ سنایا، پس فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، پس تم حج کرو۔[2] انتھی. جمہور نے ﴿ بِالْحَجِّ ﴾ بفتحِ حائے مہملہ پڑھا ہے اور ابن ابی اسحٰق کی قراءت سارے قرآن میں بکسرِ حا ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَأْتُوكَ رِجَالًا ﴾ جواب ہے امر کا۔ ﴿ رِجَالًا ﴾ میں چار قراءتیں ہیں: ایک تو بکسرِ رائے مہملہ وتخفیفِ جیم جمع ہے "راجل"، ضد فارس کی (یعنی سوار کی ضد)۔ کسی نے کہا: جمع ہے "رجل" کی۔ علامہ نسفی، محلی، بیضاوی اور خازن رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "رجال" "راجل" کی جمع ہے، جس طرح کہ قائم کی جمع قیام ہے۔[4] دوسری قراءت "رُجَالًا"، بضمِ راء وتخفیفِ جیم۔ امام ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔[5] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وزن جمع میں قلیل ہے۔[6]

تیسری قراءت "رُجَّالًا"، بضمِ راء وتشدیدِ جیم ہے، جیسے "صائم" کی جمع "صُوَّام" ہے۔ چوتھی قراءت "رُجَالٰی" ہے بضمِ راء وتخفیفِ جیم والف مقصورہ درآخر بروزن فعالیٰ، جیسے: "کسالیٰ و عجالیٰ"۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔[7] "رجالا" کے معنی "مُشَاۃ" ہیں، ترکیب میں ﴿ يَأْتُوكَ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے۔ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ لوگ تمھاری دعوت کا جواب دیں گے، پیادہ پا چلتے ہوئے تمھارے پاس آئیں گے۔ ﴿ يَأْتُوكَ ﴾ فرمایا، حالاں کہ لوگ تو بیت اللہ میں آئیں گے، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص حاجی ہو کر کعبے میں آیا تو مقرر وہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا، کیوں کہ اس نے ان کی ندا کا جواب دیا ہے تو گویا وہ انھیں کے پاس آیا، یا مضاف مقدر ہے: "أي يأتوا بيتك"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ ﴾ معطوف ہے ﴿ رِجَالًا ﴾ پر۔ یہ بھی حال ہے: "أي وَ رُكْبَانًا على كل بعير مهرذل"۔ "ضمر" کہتے ہیں لاغری کو۔ ﴿ ضَامِرٍ ﴾ وہ لاغر اونٹ ہے، جس کو سفر نے تھکا دیا ہو۔ محاورے میں بولتے ہیں: "ضمر يضمر ضمورا"۔ "ضامر" بغیر تائے تانیث کے نر اور مادہ دونوں پر بولا جاتا ہے، جس طرح کہ "بعیر" کا اطلاق مذکر ومونث دونوں پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ پا پیادہ چل کر اور دبلے دبلے اُونٹوں پر سوار ہو کر دور دراز سفر طے کر کے تمھارے پاس آئیں گے، مسافت ومشقتِ سفر کے مارے اُن کے اونٹ لاغر اور کمزور ہو جائیں گے۔ ﴿ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴾ صفت ہے ﴿ ضَامِرٍ ﴾ کی باعتبار معنی

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) (2) تفسير الخازن (٥/ ١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧) (3) فتح القدير (٣/ ٦١١)

(4) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٦) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣) تفسير الخازن (٥/ ١٣)

(5) تفسير القرطبي (١٢/ ٣٩) (6) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠) (7) تفسير القرطبي (١٢/ ٣٩)

کے، کیوں کہ ﴿ضَامِرٍ﴾ معنی "ضوامر" میں ہے، یعنی جماعتِ شتران لاغر یا جملۂ مستانفہ ہے۔ اس صورت میں ضمیر ﴿اَلنَّاسِ﴾ کی طرف راجع ہوگی، یعنی جب اللہ پاک نے پہلے یوں فرمایا: ﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ﴾ تو مثلاً: کسی نے کہا ہے کہ وہ کہاں سے آئیں گے تو فرمایا کہ راہ دور سے آئیں گے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے "يأتون" پڑھا ہے، یہ صفت ہے رجال ورکبان کی۔[1] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اسی کو قراءتِ شاذہ ٹھہرایا ہے اور تقدیر یہ نکالی ہے: "أي يأتون على ضامر" وقيل يأتون مستانف[2] اور ﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ اس سے متعلق ہے۔

فتح القدیر میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب نے اور ابن ابی عبلہ اور ضحاک نے "يأتون" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿رِجَالًا﴾ کی صفت ہے۔ ﴿فَجٍّ﴾ راہِ فراخ کو کہتے ہیں۔ فجاج اس کی جمع ہے اور عمیق بہ معنی بعید ہے۔[3] تفسیر بیضاوی میں ذکر کیا ہے کہ کسی نے "معيق" پڑھا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "بئرٌ بعيد العمق والمعق"[4] دونوں کے ایک معنی ہیں۔ (جس کنوئیں کی تہ نہایت گہری ہوتی ہے، اس کو "بئر بعيد العمق" کہتے ہیں۔) امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں ذکر کیا ہے کہ "رجالا و ركبانا" سے۔ بعض نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ راکبِ بحر پر حج واجب نہیں ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، اس لیے کہ مکہ مکرمہ سمندر پر نہیں ہے، اس کی طرف تو انھیں دو حالتوں سے وصول ہوتا ہے، چل کر یا سوار ہو کر۔ لہٰذا اللہ پاک نے اسی شے کا ذکر فرما دیا کہ جس سے اس کی طرف وصول ہوتا ہے۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ رجال کو رکبان پر مقدم فرمایا واسطے اظہارِ فضیلت پیدل چلنے والوں کی، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔[6] انتهى.

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ سوار حاجی کے واسطے ہر قدم کے عوض جس کو اس کی سواری چلتی ہے، ستر نیکیاں ہیں اور پیدل حاجی کے واسطے ہر قدم کے عوض جس کو وہ چلتا ہے، سات سو نیکیاں ہیں حرم کی نیکیوں سے۔ کسی نے عرض کی کہ حرم کی نیکیاں کیا ہیں؟ فرمایا: "الحسنة بمائة ألف حسنة"[7] یعنی ایک نیکی ایک لاکھ نیکی کے برابر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے پیادہ پا چل کر حج کیا ہے اور جس وقت وہ حرم سے قریب ہوتے تو اپنی جوتیاں اُتار لیتے تھے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے اور کسی کا نام نہیں لیا ہے۔

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) (2) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠) (3) فتح القدير (٣/ ٦١١)

(4) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣) (5) البحر المحيط (٦/ ٣٣٨) (6) تفسير النسفي (٣/ ١٠١)

(7) المعجم الكبير (١٢/ ٧٥، ١٠٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔ مزید دیکھیں: [illegible]

فتح البیان میں امام کرخی رحمہ اللہ کا قول نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس باب میں معتمد یہ ہے سوار ہونا پیدل چلنے سے افضل ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے سواری پر سوار ہو کر حج کیا ہے، جیسا کہ صحیح مشہور روایات میں آیا ہے اور اتباع کی فضیلت غیر اتباع سے زیادہ ہوتی ہے، اگرچہ چلنا فی نفسہٖ فضیلت ہو۔ برابر ہے کہ چلنے پر قادر ہو یا نہ ہو احرام سے پہلے اور اس کے بعد۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے جو حدیث امام غزالی و رافعی رحمہ اللہ کی پیروی کر کے ذکر کی ہے وہ ضعیف ہے۔ "علی ما فیه قاله ابن علان في مثير شوق الأنام إلی بيت الله الحرام" اور جن لوگوں نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، من جملہ ان کے ابن حجر مکی ہیں، شرح عباب و شرح منہاج میں۔ تقدیم کا جواب یہ ہے کہ تقدیم کبھی تفضیل کی قطعاً مفید نہیں ہوتی ہے، یا بنا بر اصح کبھی مفضول متقدم ہوتا ہے اور افضل بعد میں ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ [التغابن: ۲] "پھر تم میں سے کوئی کافر اور کوئی مومن ہے۔" نیز فرمایا: ﴿لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾ [الحشر: ۲۰] "آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔" نیز فرمایا: ﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ [الإنشراح: ٦] "بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔" "إلی غير ذلك من الآيات فليعلم"، انتہٰی. اور علامہ نسفی رحمہ اللہ کے قول: "قدم الرجال علی الركبان إظهار الفضيلة المشاة" کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: "وليس بشيء لأن الاستطاعة المفسرة بالزاد و الراحلة في الحديث الصحيح شرط في فريضة الحج"[1] انتهى. (لیکن یہ تعلیل منافی قولِ نسفی کے نہیں۔ قولِ نسفی اور یہ قول کہ حج کی فرضیت کے واسطے زاد و سواری شرط ہے، دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔) علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے تقدیم کی وجہ یہ لکھی ہے: "قدم الرجال علی الركبان في الذكر لزيادة تعبهم في المشي"[2] یعنی پیدل چلنے والوں کو چوں کہ چلنے میں زیادہ تھکاوٹ ہوتی ہے، اس لیے سواروں سے پہلے اُن کا ذکر کیا۔ اگر کسی شخص پر حج فرض نہیں ہے اور مارے شوق کے پیدل حج کو گیا اور نیت درست ہے اور اخلاص اور صدقِ محبت پورا پورا ہے تو اللہ پاک کی قدردانی سے اُمید ہے کہ اس کو اجر علی قدر النصب عطا فرمائے۔

حکایت:

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، محمد بن یاسین نے کہا ہے کہ طواف میں مجھ سے ایک شیخ نے کہا کہ تو کہاں کا ہے؟ میں نے کہا: خراسان۔ کہا کہ تمھارے اور بیت اللہ کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ میں نے کہا: دو ماہ یا تین ماہ کی راہ ہے۔ اس نے کہا: تم تو بیت اللہ کے پڑوسی ہو، میں نے کہا: تو کہاں سے آیا ہے؟ کہا: پانچ برس کی راہ سے، میں جوان نکلا تھا، اب اُدھیڑ ہو گیا، میں نے کہا: واللہ یہ ہے طاعتِ جمیلہ و محبتِ صادقہ، اس پر اس نے یہ دو شعر پڑھے ؎

---

[1] فتح البیان (۹/ ۳۹۔ ٤٠) [2] فتح القدير (٣/ ٦١١)

زر من هويت وإن شطت بك الدار وحال من دونه حجب وأستار
لا يمنعنك بعد عن زيارته إن المحب لمن يهواه زوار [1]

یعنی جس شخص کو تو چاہتا ہے اس سے محبت رکھتا ہے، اس کی زیارت و ملاقات کیا کر گو اس کا گھر تجھ سے دور ہو اور اس کے ورے پردے حائل ہوں، تجھے چاہیے کہ اس کی زیارت سے ہرگز دوری تیری مانع نہ ہو، کیوں کہ دوست تو اپنے دوست کی ضرور ہی زیارت کرتا رہتا ہے۔ امام یافعی رحمہ اللہ نے کتاب "روض الریاحین" میں (۱۰۴) حکایت بعنوان "عن بعضهم" باختلافِ بعض الفاظ اس کو ذکر فرمایا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: بعض صالحین سے مروی ہے، کہا: میں نے طواف میں ایک مرد میانہ سال کو دیکھا کہ اسے عبادت نے ضعیف کر ڈالا تھا، اس کے ہاتھ میں عصا تھا، اس پر تکیہ لگائے ہوئے طواف کر رہا تھا، میں نے اس سے اس کے شہر کے بارے میں پوچھا تو کہا: خراسان۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ تم اس راہ کو کتنی مدت میں طے کرتے ہو؟ میں نے کہا: دو ماہ یا تین ماہ میں، وہ بولا: پھر تم ہر سال حج کیوں نہیں کرتے؟ میں نے اس سے کہا کہ تمھارے اور اس گھر کے درمیان میں کتنا فاصلہ ہے؟ اس نے کہا: پانچ برس کی راہ۔ میں نے کہا: واللہ! بے شک فضلِ مبین و محبتِ صادقہ یہی ہے، اس پر وہ ہنسا اور اشعارِ مذکور پڑھنے لگا۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

تاکہ وہ اپنے منافع کے لیے حاضر ہوں، اور معلوم ایام میں (ذبح کرتے وقت) ان چوپائے مویشیوں پر اللہ کا نام ذکر کریں، جو اللہ نے انھیں دیے ہیں، پھر تم (خود بھی) ان کا گوشت کھاؤ اور لاچار فاقہ کش فقیر کو کھلاؤ (28) پھر چاہیے کہ وہ اپنا میل کچیل دور کریں، اور چاہیے کہ اپنی نذریں پوری کریں، اور چاہیے کہ قدیم گھر (بیت اللہ) کا طواف کریں (29)

حج میں دنیا و آخرت کے فائدے:

جو شکرانے کا ذبح ہو یا نفل کا، وہ آپ کھائے اور جو قصور کا بدلہ ہو، اس میں سے آپ نہ کھائے اور کئی دن فرمایا تین دنوں کو، یعنی ذی الحجہ کی دس، گیارہ اور بارہ تاریخ، ان دنوں میں بڑی قبولیت کا کام یہی اللہ کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ جہاں سے لبیک شروع کرتے ہیں، حجامت اور ناخن نہیں کاٹتے، بالوں میں تیل نہیں ڈالتے، بدن سے

[1] تفسير النسفي (۳/۱۰۱)

ننگے رہتے ہیں۔ اب دسویں تاریخ سب تمام کرتے ہیں، حجامت کر کے غسل کر کے کپڑے پہن کر طواف کو جاتے ہیں، جس کو ذبح کرنا ہے، وہ پہلے ذبح کر لیتا ہے اور یہیں اپنی مرادوں کے لیے جو منت مانگی ہو، وہ ادا کریں، اصل منت اللہ کی ہے اور کسی کی نہیں۔ انتھی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ منافع دنیا و آخرت کے۔ آخرت کے منافع تو اللہ کا رضوان، یعنی اس کی خوشنودی اور دنیا کے منافع سو بدنوں اور ذبیحوں کے منافع ہیں، جس کو وہ پہنچتے ہیں، یعنی اونٹ، گائے بکری کی قربانیوں سے نفع لیتے ہیں، ان کو کھاتے پیتے ہیں اور تجارتیں ہیں، یعنی اشیا کی تجارت کرتے ہیں، اس سے ان کو نفع حاصل ہوتا ہے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم عنه) منافع کی تفسیر میں اُن کا دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کے بازار تھے۔ نہیں ذکر کیا اللہ نے منافع کا مگر دنیا کے۔ اس کو ابن جریر و ابن منذر و ابن ابی حاتم نے اُن سے روایت کیا ہے۔[2] كذا في فتح القدير۔) اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے اور بہت لوگوں نے کہا ہے کہ وہ منافع دنیا اور آخرت کے منافع ہیں۔[3] کقولہ تعالیٰ: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [البقرة: ١٩٨] ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔''

عشرۂ ذوالحجہ کی فضیلت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ کی تفسیر میں شعبہ و ہشیم نے ابی بشر عن سعید عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ ایامِ عشر ہیں، یعنی ذوالحجہ کے دس دن۔[4] (و أخرجه أيضا أبوبكر المروزي في كتاب العيدين عنه كذا في فتح القدير) امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بصیغۂ جزم اس کو معلق کیا ہے[5] اور اسی کے مثل سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، قتادہ، عطا، سعید بن جبیر، حسن، ضحاک، عطاء خراسانی اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے مروی ہے اور یہی مذہب ہے امام شافعی رحمہ اللہ کا اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی یہی قول مشہور ہے۔[6]

امام بخاری رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا الْعَمَلُ فِيْ أَيَّامٍ أَفْضَلَ مِنْهَا فِيْ هٰذِهِ، قَالُوْا: وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ إِلَّا رَجُلٌ يَخْرُجُ يُخَاطِرُ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فَلَمْ يَرْجِعْ بِشَيْءٍ».

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٨) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٩) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٨) فتح القدير (٣/ ٦١٤)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٠٩) [4] فتح القدير (٣/ ٦١٤) [5] صحيح البخاري (١/ ٣٢٩) [6] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٨٩)

یعنی ان دنوں میں عمل کرنے سے دوسرے دنوں میں عمل کرنا زیادہ فضیلت نہیں رکھتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اور نہ اللہ کی راہ میں لڑنا؟ فرمایا: اور نہ اللہ کی راہ میں لڑنا، مگر وہ شخص کہ نکلے جہاد کے لیے، اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالے، پھر کوئی شے لے کر نہ لوٹے، یعنی اپنے مال سے کچھ لے کر نہ پھرے، یا وہ خود نہ پھرے نہ ہی اُس کا مال۔[1]

(رواه الإمام أحمد و أبو داود و الترمذي و ابن ماجه بنحوه وقال الترمذي: حديث حسن غريب صحيح، وفي الباب عن عمر و أبي هريرة و عبد الله بن عمرو و جابر رضي الله عنهم)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ان طریقوں کا استقصا کیا ہے اور اُن کے واسطے ایک جزو علاحدہ مستقل بنایا ہے۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بروایتِ مجاہد عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہیں کوئی ایام جو اللہ کے نزدیک زیادہ فضیلت والے ہیں، ان دس دنوں سے، اور نہ ان دنوں میں عمل کرنے سے کوئی اور دن عمل کے لحاظ سے زیادہ محبوب ہیں، پس تم ان دنوں میں تہلیل (لا الٰہ الا اللہ کہنا) وتکبیر (اللہ اکبر کہنا) اور تحمید (الحمد للہ کہنا) بہت کیا کرو، یعنی اللہ پاک کے نزدیک ان دنوں میں عمل کرنے سے زیادہ پسند اور کسی دن میں عمل کرنا نہیں ہے۔ جب یہ بات ٹھہری تو تم ان دنوں میں لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ بہت کہا کرو۔[2] (و روي من وجه آخر عن مجاهد عن ابن عمر نحوه)

دوسرے امام احمد رحمہ اللہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بے شک یہ وہی دس دن ہیں جن کی اللہ پاک نے اپنے اس قول میں قسم کھائی ہے: ﴿ وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴾[3] [الفجر: ١۔ ٢] ”قسم ہے فجر کی۔ اور دس راتوں کی۔“ تیسرے بعض سلف نے فرمایا ہے کہ یہی عشر اس قول سے مراد ہے: ﴿ وَأَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ ﴾ [الأعراف: ١٤٢] ”اور ہم نے انھیں (مزید) دس راتوں کے ساتھ پورا کیا۔“ چوتھے سنن ابو داود میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عشرے میں نو روزے رکھا کرتے تھے۔[4] پانچویں بخاری نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان دنوں میں بازار کی طرف نکلا کرتے تو تکبیر کہا کرتے تھے اور لوگ ان کی تکبیر کے سبب سے تکبیر کہتے تھے۔[5] چھٹے یہ عشرہ روزِ عرفہ پر مشتمل ہے، جس کے بارے میں صحیح مسلم کی حدیث میں ابو قتادہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرفے کے دن روزہ رکھنے کا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْآتِيَةَ »[6] یعنی میں گمان کرتا ہوں اللہ پر کہ کفارہ کر دے، سالِ گزشتہ اور سالِ آیندہ کا۔ ساتویں اور مشتمل ہے روزِ نحر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٢٦) مسند أحمد (١/ ٢٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٥٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٢٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ٧٥) المعجم الكبير (١١/ ٨٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٥)

[3] مسند أحمد (٣/ ٣٢٧) [4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٣٧) صحيح أبي داود (٧/ ١٩٦)

[5] صحيح البخاري (١/ ٣٢٩) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٢)

پر حجِ اکبر کا دن ہے۔ آٹھویں: "وقد ورد في حديث أنه أفضل الأيام عند الله"[1] یعنی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ روزِ نحر یا عشرۂ ذی الحجہ اللہ کے نزدیک افضل ایام ہے۔

بالجملہ اس عشرے کے حق میں کہا گیا ہے کہ وہ بہترین ایام ہیں سال کے، چناں چہ اس بات پر حدیث ناطق ہے۔ اس کی فضیلت رمضان کے عشرۂ اخیر پر بہت ہے، اس لیے کہ جو نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ اس میں مشروع ہے، وہ اس میں بھی مشروع ہے اور یہ اس سے اس بات میں ممتاز ہے کہ فرض حج خاص کر اسی میں ادا ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ افضل ہے اس لیے کہ وہ مشتمل ہے شبِ قدر پر، جو ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ اور لوگوں نے توسط اختیار کیا تو یوں کہا کہ دن اس کے افضل ہیں اور راتیں اس کی افضل ہیں۔ اس قول سے دلیلوں کا تفرق جمع ہو جاتا ہے۔ واللہ أعلم۔

ایامِ تشریق کا بیان:

﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ حکم نے عن مقسم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا ہے کہ ﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ روزِ نحر ہے اور تین دن اس کے بعد۔[2] (أخرجه عبد بن حميد و ابن المنذر وابن أبي حاتم عنه وأخرج ابن جرير عنه أيضاً قال: أيام التشريق. وأخرج عبد بن حميد و ابن المنذر عنه أيضا في الأيام المعلومات، قال: قبل يوم التروية بيوم و يوم التروية و يوم عرفة یعنی ساتویں آٹھویں نویں۔ كذا في فتح القدير)

یہ قول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے اور اسی طرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ گئے ہیں في رواية عنه۔ تیسرا قول یہ ہے کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نافع سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ ﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ روزِ نحر ہے اور دو دن اس کے بعد، اور ایامِ معدودات تین دن ہیں روزِ نحر کے بعد۔[3] (هذا إسناد صحيح إليه وقاله السدي) (شیخ زادہ نے نقل کیا ہے کہ ایامِ معدودات ایامِ تشریق ہیں، یہ قول اختیار امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا ہے۔ "وعن ابن عباس ﷺ في رواية عنه أن الأيام المعلومات هي أيام الحج وهي يوم عرفة و يوم النحر و أيام التشريق") یہ مذہب ہے امام مالک بن انس رحمہ اللہ کا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ اس قول کی اور اس سے پہلے کے قول کی تائید کرتا ہے، مراد اس سے اللہ کا ذکر ہے اس کے ذبح کرنے کے وقت۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ روزِ عرفہ اور روزِ نحر اور ایک اور دن ہے اس کے بعد۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ امام ابن وہب رحمہ اللہ نے کہا: فرزند زید بن اسلم رحمہ اللہ نے اپنے والد سے مجھے حدیث کی کہ زید نے کہا ہے کہ ﴿ مَعْلُوْمٰتٍ ﴾ روزِ عرفہ و روزِ نحر اور ایامِ تشریق ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ یعنی اونٹ اور گائے اور بکری، جس طرح کہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٦٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٦٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٩) فتح القدير (٣/ ٦١٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٨٩)

اللہ پاک نے سورت انعام میں اس کی تفصیل فرمائی ہے: ﴿ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾[1] [الأنعام: ١٤٣۔ ١٤٤] ''یہ آٹھ قسمیں (پیدا کی) ہیں دو بھیڑ میں سے اور دو بکری میں سے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا اس (اللہ) نے دونوں کے نر حرام کیے ہیں یا دونوں کی مادائیں یا وہ بچے جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہوں؟ (ٹھیک ٹھیک) علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اور دو اونٹوں میں سے اور دو گایوں میں سے۔ کہہ دیجیے: کیا اللہ نے دونوں کے نر حرام کیے ہیں یا دونوں کی مادائیں یا وہ بچے جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے تمھیں یہ تاکیدی حکم دیا تھا؟ پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا، تاکہ وہ بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرے۔ بے شک اللہ (ایسے) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اختلاف کیا ہے کہ ایامِ نحر کتنے ہیں، پس امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تین دن ہیں: نحر کا دن اور دو دن اس کے بعد۔ امام ابو حنیفہ، ثوری اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں اور یہ قول سیدنا ابوہریرہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے بغیر اختلاف کے ان سے مروی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ چار دن ہیں: روزِ نحر اور تین دن اس کے بعد۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہ قول سیدنا علی، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اُن سے امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے قول بھی مروی ہیں۔ کسی نے کہا: ایامِ نحر خاص نحر کا دن ہے، یہ دن ذوالحجہ کی دسویں تاریخ ہے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر اور جابر بن زید سے روایت کیا ہے، دونوں نے کہا ہے کہ نحر امصار میں ایک دن ہے اور منیٰ میں تین دن۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ سے اس بارے میں تین روایتیں ہیں: ایک تو امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مثل ہے۔ دوسری آخر ایام ذی الحجہ تک ہے، پھر جب محرم کا چاند دکھائی دیا تو اضحیٰ نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول سلیمان بن یسار اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کا ہے۔ ان دونوں نے ایک حدیث مرسل مرفوع روایت کی ہے، دارقطنی نے اس کی تخریج کی ہے، وہ حدیث یہ ہے: ''الضحايا إلى هلال المحرم''[2] یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ ہماری دلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ ہے۔ وهذا جمع قلة لكن المتيقن منه الثلاثة، وما بعد الثلاثة غير متيقن فلا يعمل به. (قوله منه غير۔ اصل قرطبی میں اسی طرح ہے، لیکن لفظ ''منه'' اور غیر کے درمیان بیاض ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا شک یہاں سے عبارت ساقط ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ عبارت اس طرح ہو:

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٨٩۔ ٢٩٠)
[2] سنن الدارقطني (٤/ ٢٧٥) یہ روایت مرسل ہے۔

"لكن المتيقن منه ثلثة و الزائد غير متيقن الخ محمد عبدالعزيز نائب افتا عفا الله عنه")

امام ابوعمر بن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما نے اجماع کیا ہے اس بات پر کہ یوم نحر یوم اضحیٰ ہے اور اس پر اجماع کیا ہے کہ ذی حجہ کے تمام ہونے کے بعد اضحیٰ نہیں ہے اور نہ میرے نزدیک ان قولوں میں کوئی صحیح ہے، مگر دو قول: ایک قول تو امام مالک و کوفیوں کا اور دوسرا قول امام شافعی و شامیوں کا اور یہی دونوں قول صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، پس ان کے ماخلف کے ساتھ مشغول ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں، کیوں کہ اُن کے ماخلف کے واسطے سنت میں کوئی اصل نہیں ہے اور نہ قولِ صحابہ میں اور جو قول ان دونوں کے علاوہ ہیں، وہ اُن کے سبب سے متروک ہیں۔[1]

امام قتادہ سے ایک چھٹا قول مروی ہے، وہ یہ ہے کہ اضحیٰ یوم النحر ہے اور چھے دن اس کے بعد، یہ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے قول سے خارج ہے۔ پس اس کے واسطے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیالی نحر میں اختلاف ہے کہ آیا دِنوں کے ساتھ داخل ہیں کہ اُن میں نحر کی جائے یا نہیں۔ لہٰذا امام مالک رحمہ اللہ سے مشہور قول میں مروی ہے۔کہ راتیں داخل نہیں ہیں، پس رات میں ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ جمہور اصحابِ امام مالک اور اصحابِ رائے اسی پر ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ پس ذکر ایام کا اس پر دلیل ہے کہ رات میں ذبح جائز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، اسحٰق اور ابوثور رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ راتیں دنوں میں داخل ہیں، اُن میں ذبح کرنا جائز ہے۔ امام مالک و اشہب سے اس کے مثل مروی ہے۔ اشہب نے "هَدْي" اور "أضحيه" کے درمیان فرق کیا ہے۔ لہٰذا "هَدْي" کو رات میں جائز رکھا ہے اور "أضحيه" کو رات میں ناجائز۔[2] انتهى.

قربانی کا گوشت تناول کرنے کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ جو شخص اس طرف گیا ہے کہ قربانیوں سے کھانا واجب ہے، اس نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ یہ قول غریب ہے۔ جس بات پر لوگوں کی اکثریت ہے، وہ یہ ہے کہ امر بابِ رخصت سے ہے یا استحباب سے، جیسا کہ ثابت ہوا ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہدی نحر کیا تو ہر اونٹ سے ایک ایک ٹکڑے کا حکم دیا کہ وہ پکایا جائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گوشت سے تناول فرمایا اور اس کے شوربے سے نوش کیا۔[3] عبداللہ بن وہب نے کہا: مجھ سے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: میں پسند کرتا ہوں کہ جس کی تو نے قربانی کی ہے تو اس سے کھائے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا ﴾ امام ابن وہب رحمہ اللہ نے کہا اور میں نے لیث سے پوچھا تو ویسا ہی کہا۔

---

(1) الاستذكار (٥/ ٢٤٦) (2) تفسير القرطبي (١٢/ ٤٣۔ ٤٤)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨١٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٢/ ٤٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٧٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٦/ ١٥٦)

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے "عن منصور عن إبراهيم" روایت کیا ہے، کہا ہے کہ مشرکین اپنی قربانیوں سے کھایا نہیں کرتے تھے، پس مسلمانوں کے لیے رخصت دی گئی تو جو شخص چاہے کھائے جو نہ چاہے نہ کھائے۔① امام مجاہد اور عطا رحمہما اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ہشیم نے عن حصین عن مجاہد روایت کیا ہے، کہا: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا ﴾ ایسا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ﴾ [المآئدة: ٢] "اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو۔" نیز فرمایا: ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ [الجمعة: ١٠] "پھر جب نماز پوری ہو جائے، تو تم زمین میں پھیل جاؤ۔" امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔② جس شخص نے اس قول کی نصرت کی ہے کہ قربانیوں میں سے آدھا خیرات کر دے۔ اس نے ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ سے استدلال کیا ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے قربانیوں کے دو ٹکڑے فرمائے: نصف تو قربانی کرنے والے کے واسطے اور نصف فقرا کے لیے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی کے تین حصے کیے جائیں: ایک حصہ تو قربانی کرنے والے کا، دوسرا حصہ ہدیہ دے، یعنی خویش و اقارب اور دوست و آشنا کے ہاں بھیجے ہدیہ کے طور پر اور تیسرا حصہ خیرات کر دے، اس لیے کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾ [الحج: ٣٦] "تو تم ان کا گوشت کھاؤ اور قناعت پسند اور سوالی (محتاج) کو بھی کھلاؤ۔" عن قریب اس آیت کی تفسیر کے وقت اس پر گفتگو آئے گی۔ إن شاء الله تعالیٰ وبه الثقة.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "هو المضطر الذي عليه البؤس والفقير المتعفف"، یعنی جو شخص بے چارہ ہے سخت حاجت مندی اس پر طاری ہے، مارے پارسائی کے سوال نہیں کرتا ہے وہ بائِس فقیر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ شخص ہے کہ اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا۔③ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ "زَمِن" ہے، یعنی لُنجاہ برجا ماندہ، ایک جگہ پڑا ہوا ہے، چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔④ (أخرج ابن جرير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: البائس الزمن كذا في فتح القدير)⑤ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: وہ ضریر ہے، یعنی نابینا ہے۔⑥

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ ﴾ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قضائے "تفث" احرام اُتارنا ہے، یعنی سر منڈانا کپڑے پہننا، ناخن تراشنا اور اس جیسے اور کام۔ اسی طرح امام عطا اور مجاہد رحمہما اللہ نے ان سے روایت کیا ہے اور ایسا ہی امام عکرمہ اور محمد بن کعب قرظی رحمہما اللہ نے کہا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: "التفث المناسك"، یعنی حج کے ارکان ادا کرنا یہی

① تفسير الطبري (١٨/ ٦٣٥) ② تفسير الطبري (١٨/ ٦١١) ③ تفسير الطبري (١٨/ ٦١٢)
④ الدر المنثور (٦/ ٣٩) ⑤ تفسير الطبري (١٨/ ٦١١) فتح القدير (٣/ ٦١٤) ⑥ تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٠)

قضائے "تفث" ہے۔ [1] (أخرج ابن أبي شيبة و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر عن ابن عمرﷺ قال: التفث المناسك كلها و أخرج هؤلاء عن ابن عباسﷺ نحوه، و أخرج سعيد بن منصور و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن ابن عباسﷺ قال: التفث حلق الرأس والأخذ من العارضين ونتف الإبط و حلق العانة والوقوف بعرفة والسعي بين الصفاء والمروة وقص الأظفار وقص الشارب والذبح.[2] كذا في فتح القدير)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ﴾ علی بن ابی طلحہ کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں، یعنی "ما نحر ما نذر من أمر البدن" یعنی نذر کی بدنوں (اونٹوں) کو نحر کرنا، یہی وفائے نذر ہے۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ کے الفاظ مجاہد رحمہ اللہ سے یہ ہیں: "نذر الحج والهدي وما نذر الإنسان من شيئ يكون في الحج" یعنی نذور سے مراد نذرِ حج و ہدی ہے اور جو کچھ آدمی نے حج میں نذر کی ہے۔ امام ابراہیم بن میسرہ رحمہ اللہ کے الفاظ مجاہد سے یہ ہیں: "الذبائح" یعنی نذور سے مراد ذبیحے ہیں۔ لیث بن ابی سلیم کے الفاظ مجاہد سے یہ ہیں: "كل نذر إلى أجل"، یعنی اپنے وقت تک کی نذر۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کے الفاظ "حجهم" ہے، یعنی نذور سے مراد یہی حج کرنا ہے۔ اسی طرح امام ابن ابی حاتم نے سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نذورِ حج، پس جو شخص حج میں داخل ہوا تو جو عمل اس میں اس پر لازم ہے، اس میں سے بیت اللہ کا طواف کرنا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا اور عرفہ میں وقوف کرنا اور مزدلفہ میں ٹھہرنا ہے اور کنکریاں مارنا ہے، اس شے کی بنا پر جس کا ان کو حکم ہوا ہے۔ امام مالک سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: نحر کے دن طواف واجب ہے۔[3] (أخرج ابن جرير و ابن المنذر عن ابن عباسﷺ هو طواف الزيارة يوم النحر، قال في فتح القدير: ورد في وجه تسمية البيت بالعتيق آثار عن جماعة من الصحابةﷺ و ورد في فضل الطواف أحاديث ليس هذا موضع ذكرها)[4] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابوحمزہ سے روایت کیا ہے، کہا: مجھ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تو سورۃ الحج پڑھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ پس مناسک کا آخر بیتِ عتیق کا طواف کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے، کیوں کہ آپ نحر کے دن جس وقت منیٰ کی طرف لوٹے تو رمیِ جمرہ سے ابتدا فرمائی۔ پس جمرہ کو سات کنکریوں سے مارا۔ پھر اپنے ہدی کو نحر کیا اور سر مبارک منڈوایا، پھر لوٹے، یعنی مکے کی طرف تو بیت اللہ کا طواف کیا۔[5] صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: "أمر الناس أن يكون آخر عهدهم بالبيت الطواف إلا أنه خفف عن المرأة الحائض."[6] (عہد کے معنی کئی ہیں: یمین و امان و ذمہ و

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦١٢_ ٦١٤)
[2] فتح القدير (٣/ ٦١٤)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦١٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٠_ ٢٩١)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٠)
[4] فتح القدير (٣/ ٦١٤)
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩١)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢٨)

حفاظ و رعایتِ حرمت و وصیت، احادیث میں یہی معنی آتے ہیں۔ یہاں رعایتِ حرمت کے معنی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم۔) اس طواف سے مراد طوفِ وداع ہے، وہ واجب ہے، مگر حائضہ سے اس کی تخفیف کی گئی ہے۔

بیت اللہ کو بیت العتیق کہنے کی وجہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿ بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ میں اس شخص کے لیے دلیل ہے، جو اس طرف گیا ہے کہ طواف حطیم کے وَرے سے واجب ہے، یعنی حطیم کو لے کر طواف کرنا چاہیے، اس واسطے کہ حطیم اصل بیت اللہ سے ہے، جس کو ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا، گو قریش نے اس کو بیت اللہ سے خارج کر دیا ہے، جبکہ ان کو خرچ نے قاصر کر دیا، یعنی بیت اللہ کے بنانے میں انھوں نے اہتمام کیا کہ پاک کمائی لگائیں، سود وغیرہ کے پیسے سے اس کو بچائیں، لہٰذا پاک کمائی نے کمی کی تو کمیِ خرچ کی وجہ سے حطیم کی زمین کعبے میں داخل کرنے سے رہ گئی، حالاں کہ وہ زمین کعبے میں داخل ہے اور اسی واسطے رسول اللہ ﷺ نے حطیم کے وَرے سے طواف فرمایا ہے اور خبر دی ہے کہ حجر، یعنی حطیم بیت اللہ سے ہے اور آپ نے شامی دو رُکنوں کو نہیں چوما، اس واسطے کہ وہ دونوں ابراہیم علیہ السلام کی بنیادِ قدیم پر تمام نہیں کیے گئے اور اسی واسطے امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن رجل عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: جب یہ آیت: ﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حطیم کے وَرے سے طواف کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا: ”لأنه أول بیت وضع للناس“[1] یعنی چاہیے کہ بیتِ عتیق کا طواف کریں، اس واسطے کہ وہ پہلا گھر ہے، جو لوگوں کے واسطے بنایا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کو عتیق کہنے کی یہی وجہ مذکور ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بیتِ عتیق اس لیے نام رکھا گیا کہ زمانہ نوح علیہ السلام میں غرق کے دن آزاد کیا گیا۔ (یعنی غرق سے اس کو محفوظ رکھا، آسمان کی طرف اُٹھا لیا۔) خُصَیف نے کہا: عتیق کے کہنے کی یہ وجہ ہے کہ کبھی کوئی جبار اس پر غالب نہیں ہوا۔ امام ابن ابی نجیح ولیث نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ جباروں سے آزاد کیا گیا کہ اس پر مسلط کیے جائیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ حماد بن سلمہ نے عن حمید عن الحسن بن مسلم عن مجاہد روایت کیا ہے: ”لأنه لم یردہ أحد بسوء إلا ھلك“ یعنی عتیق اس لیے کہا ہے کہ جس کسی نے اس سے برائی کا ارادہ کیا تو وہ ہلاک ہی ہوا۔ امام عبدالرزاق نے معمر عن الزہری عن الزبیر روایت کیا ہے، کہا: بیتِ عتیق اس لیے نام رکھا گیا کہ اللہ پاک نے اس کو جبابرہ سے آزاد کر دیا ہے۔[3] ترمذی نے عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَنَّهُ سُمِّيَ الْبَيْتَ الْعَتِيقَ لِأَنَّهُ لَمْ يَظْهَرْ عَلَيْهِ جَبَّارٌ»[4] یعنی بیت العتیق اسی

---

[1] تفسیر ابن حاتم (۸/ ۲٤۹۰) [2] تفسیر الطبري (۱۸/ ٦١٥) [3] تفسیر الطبري (۱۸/ ٦١٤۔ ٦١٥) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۹۱)

[4] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۱۷۰) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۹۱) اس کی سند میں ”عبداللہ بن صالح“ ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۳۲۲۲)

لیے نام رکھا گیا ہے کہ کوئی جبار ظالم اس پر غالب نہیں ہوا۔ (وكذا رواه ابن جرير عن محمد بن سهل المحاربي عن عبد الله بن صالح به وقال: إن كان صحيحا، وقال الترمذي: هذا حديث حسن غريب، ثم رواه من وجه آخر عن الزهري مرسلا)

﴿ لِيَشْهَدُوْا ﴾ کے حرفِ لام میں دو قول ہیں: ﴿ اَذِّنْ ﴾ سے متعلق ہے یا ﴿ يَأْتُوْكَ ﴾ سے۔ امام ابو البقاء، نسفی، سمین اور شیخ زادہ رحمہم اللہ وغیرہ نے یہی دو قول ذکر کیے ہیں۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے ثانی قول کو اظہر کہا ہے۔ اسی واسطے فتح القدیر و فتح البیان میں اس کو پہلے ذکر کیا ہے اور اوّل کو بلفظِ قیل۔[2] "شھود" کے معنی حضور ہیں: "أي ليحضروا" "منافع لھم" میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ منافعِ دنیا مراد ہیں، یعنی ایامِ حج میں تجارت کریں۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: اس واسطے کہ حاجیوں کے واسطے تجارت بلا کراہت جائز ہے، جبکہ سفر سے مقصود تجارت ہی نہ ہو۔[3] بعض نے کہا ہے کہ منافعِ آخرت مراد ہے، یعنی عفو و مغفرت و مناسکِ حج۔ کسی نے کہا ہے کہ منافع دنیا و آخرت کے منافع کو عام ہے۔

شیخ زادہ نے اس قول کو اولیٰ کہا ہے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[4] فتح القدیر و فتح البیان میں اسی کو اول لکھا ہے۔[5] امام محلی رحمہ اللہ نے تینوں کو بالاجمال ذکر کیا ہے۔[6] منافع کو مُنَکَّر (نکرہ) اس لیے فرمایا ہے کہ اس سے مراد منافع کی ایسی قسم ہے، جو اسی عبادت کے ساتھ خاص ہے، دینی ہو یا دنیاوی، اس کے سوا اور عبادتوں میں پائی نہیں جاتی ہے۔ اس وجہ کو امام زمخشری رحمہ اللہ، علامہ نسفی اور بیضاوی رحمہما اللہ نے ذکر کیا ہے،[7] لیکن علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس خاص قسم کی عبادت کا بیان ایسے فصیح و بلیغ بیان اور معانی اور ایسے الفاظِ رائقہ وفقراتِ فائقہ سے ادا کیا ہے کہ جن کو دیکھنے سننے سمجھنے سے آنکھوں کو نور، کانوں کو لذت اور دل کو سرور حاصل ہو۔ چوں کہ ایسا ساطع البرہان (چمکتی ہوئی دلیلوں والا) بیان کسی تفسیرِ قرآن میں نہیں دیکھا، اس لیے جی میں آیا کہ گو طول ہو، عربی کے الفاظ مع ترجمہ یہاں لکھ دیے جائیں، تاکہ ہر خاص و عام اس سے لذت حاصل کرے اور ان کی ادیبانہ عبارت کی داد دے:

"وَهٰذَا لِأَنَّ الْعِبَادَةَ شُرِعَتْ لِإِبْتِلَاءِ بِالنَّفْسِ كَالصَّلَاةِ وَالصَّوْمِ أَوْ بِالْمَالِ كَالزَّكَاةِ وَقَدِ اشْتَمَلَ الْحَجُّ عَلَيْهِمَا مَعَ مَا فِيْهِ" یعنی عباداتِ حج ایسی عبادت ہے کہ دینی اور دنیاوی منافع کے ساتھ مخصوص ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ عبادت آزمانے کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ یہ آزمایش دو طرح ہے: نفس کے ساتھ ہے، جیسے: نماز و روزہ، یا مال کے ساتھ، جیسے: زکات اور حج ایسی عبادت ہے کہ جانی و مالی دونوں آزمایش پر مشتمل ہے، باوجود

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) [2] فتح القدير (٣/ ٦١١)
[3] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٩٢) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣) تفسير النسفي (٣/ ١٠١)
[5] فتح القدير (٣/ ٦١١) فتح البيان (٩/ ٤١) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧)
[7] الكشاف (٣/ ١٥٣) تفسير النسفي (٣/ ١٠١) تفسير البيضاوي (٣/ ١٢٣)

اس کے کہ اس میں اور اُمور ہیں، جن کا ذکر آگے آتا ہے: "مِنْ تَحَمُّلِ الْأَثْقَالِ وَرُكُوْبِ الْأَهْوَالِ وَخَلْعِ الْأَسْبَاب وَقطيعة الْأَصْحَابِ وَهَجْرِ الْبِلَادِ وَالْأَوْطَانِ وَفُرْقَةِ الْأَوْلَاد وَالْخُلَّان وَالتَّنْبِيْهُ عَلَى مَا يَسْتَمِرُّ عَلَيْهِ إِذَا انْتَقَلَ مِنْ دَارِ الْفَنَاءِ إِلَى دَارِ الْبَقَاءِ" یعنی بوجھ لادنا، ہولناک چیزوں پر سوار ہونا، اپنی جان کو خطرہ اور خوف میں ڈالنا، اسباب کا ترک کرنا، تعلقات سے علاحدہ ہونا، یاروں سے قطع تعلق کرنا، اپنے وطن اور بستی کو چھوڑنا، اولاد و احباب کی جدائی برداشت کرنا، یہ سب امور حج میں پیش آتے ہیں، ان کے سوا اس میں ایک اور امر ہے اور وہ یہ ہے کہ جس وقت دارِ فانی سے دارِ بقاء کی طرف جائے گا تو جن اُمور پر مرور کرتا رہے گا، اُن پر تنبیہ ہے، اُن کے نمونے اس میں پورے موجود ہیں۔

"فَالْحَاجُّ إِذَا دَخَلَ الْبَادِيَةَ لَا يَتَّكِلُ فِيْهَا إِلَّا عَلَى عَتَادِهِ وَلَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ زَادِهِ هٰكَذَا الْمَرْءُ إِذَا خَرَجَ مِنْ شَاطِئِ الْحَيَاةِ وَرَكِبَ بَحْرَ الْوَفَاةِ لَا يَنْفَعُ وَحْدَتَهُ إِلَّا مَا سَعَى فِيْ مَعَاشِهِ لِمَعَادِهِ وَلَا يُؤْنِسُ وَحْشَتَهُ إِلَّا مَا كَانَ يَأْنَسُ بِهِ مِنْ أَوْرَادِهِ" پس حاجی جس وقت جنگل میں داخل ہوتا ہے تو اس میں بھروسا نہیں کرتا ہے مگر اسی ساز و سامان پر جس کو مہیا کر کے اپنے ساتھ لایا ہے اور اسی توشے سے کھاتا ہے جس کو ہمراہ رکھ لیا ہے، اسی طرح آدمی جس وقت کنارۂ حیات سے نکلتا اور دریائے وفات پر سوار ہوتا تو اس کی تنہائی کو وہی شے نفع دیتی ہے جس کو اس نے اپنی معاش میں اپنی معاد کے واسطے کما رکھا ہوتا ہے اور اس کی وحشت کو کوئی شے اُنس نہیں دیتی ہے، مگر وہی اس کے اوراد و وظائف جن کے ساتھ وہ مانوس ہوا کرتا تھا۔ "وَغُسْلُ مَنْ يُّحْرِمُ وَتَأَهُّبُهُ وَلُبْسُهُ غَيْرَ الْمَخِيْطِ وَتَطَيُّبُهُ مِرْآةٌ لِّمَا سَيَأْتِيْ عَلَيْهِ مِنْ وَضْعِهِ عَلَى سَرِيْرِهِ لِغُسْلِهِ وَتَجْهِيْزِهِ مُطَيَّبًا بِالْحَنُوْطِ مُلَفَّفًا فِيْ كَفْنٍ غَيْرِ مَخِيْطٍ" یعنی جو شخص احرام باندھتا ہے، اس کا نہانا، تیاری کرنا، بے سیئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا، آئینہ اور نمونہ ہے اس حال کا جو عن قریب اس پر گزرنے والا ہے کہ تختۂ غسل پر نہلانے کے واسطے اس کو رکھیں گے اور کافور وغیرہ خوشبوئے میت سے اس کو خوشبودار کر کے تیار کریں گے، بے سیئے کفن میں اس کو لپیٹیں گے۔

"ثُمَّ الْمُحْرِمُ يَكُوْنُ أَشْعَثَ حَيْرَانَ فَكَذَا يَوْمُ الْحَشْرِ يَخْرُجُ مِنَ الْقَبْرِ لَهْفَانَ" یعنی پھر محرم کی یہ حالت ہوتی ہے کہ احرام کی وجہ سے پراگندہ حال ہوتا ہے بالوں میں کنگھی نہیں کرتا ہے اور ارکانِ حج ادا کرنے کی وجہ سے پریشان حال پریشان بال ژولیدہ مو مُغبّرُ الرّاس حیران ہوتا ہے، اسی طرح حشر کے دن قبر سے پریشان حال، حیران، افسوس کرتا اور غمگین نکلے گا۔ "وَوُقُوْفُ الْحَجِيْجِ بِعَرَفَاتٍ آمِلِيْنَ رَغَبًا وَّ رَهَبًا سَائِلِيْنَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَهُمْ بَيْنَ مَقْبُوْلٍ وَّ مَخْذُوْلٍ كَمُوْقِفِ الْعَرَصَاتِ لَا تُكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ" یعنی میدانِ عرفات میں حاجیوں کا ٹھہرنا اس حال میں کہ رغبت و خوف سے بھلائی کی اُمید کر رہے ہیں، ڈر

اور لالچ سے اپنا مقصد مانگ رہے ہیں اور اُن میں سے کوئی مقبول ہے کوئی غیر مقبول۔ لہٰذا یہ کیفیت مثل میدانِ قیامت کے ہے، جس میں ساری مخلوق چپ چاپ کھڑی ہوگی، کوئی شخص اُن میں سے بات نہ کرے گا مگر اللہ کے حکم سے۔ پھر اُن میں سے کوئی بدبخت ہے اور کوئی نیک بخت۔ ''وَالْإِفَاضَةُ إِلَى الْمُزْدَلِفَةِ بِالْمَسَاءِ هُوَ السَّوْقُ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ'' یعنی شام کو عرفات سے مزدلفے کی طرف لوٹ کر آنا، یہ ایسا ہے جیسے میدانِ قیامت سے فیصلے کے لیے ہانک کر لے جائے جائیں گے۔ ''وَمِنىٰ هُوَ مَوْقِفُ الْمِنٰى لِلْمُذْنِبِيْنَ إِلَى شَفَاعَةِ الشَّافِعِيْنَ'' یعنی منیٰ جائے وقوف گناہ گاروں کے لیے سفارش کرنے والوں کی سفارش کو طلب کرنے کے لیے ہے، یعنی منیٰ میں آکر ٹھہرنا ایسا ہے جیسا کہ گناہ گار لوگ ایک جگہ شفاعت کی اُمید پر ٹھہریں گے کہ کوئی ہماری سفارش کر کے ہم کو بخشوائے۔

''وَحَلْقُ الرَّأْسِ وَالتَّنْظِيْفُ كَالْخُرُوْجِ مِنَ السَّيِّئَاتِ بِالرَّحْمَةِ وَالتَّخْفِيْفِ'' یعنی سر منڈوانا، صفائی ستھرائی حاصل کرنا ایسا ہے، جیسا کہ قیامت کے دن گناہ گار لوگ رحمت کے سبب سے گناہوں سے نکلیں گے اور معاصی کے بارِگراں سے ہلکے پھلکے ہو جائیں گے۔ ''وَالْبَيْتُ الْحَرَامُ الَّذِيْ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا مِنَ الْإِيْذَاءِ وَالْقِتَالِ أُنْمُوْذَجٌ لِّدَارِ السَّلَامِ الَّتِيْ هِيَ مَنْ نَزَلَهَا بَقِيَ سَالِمًا مِنَ الْفَنَاءِ وَالزَّوَالِ غَيْرَ أَنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِمَكَارِهِ النَّفْسِ الْعَادِيَةِ كَمَا أَنَّ الْكَعْبَةَ حُفَّتْ بِمَتَالِفِ الْبَادِيَةِ'' یعنی بیت الحرام کو اس میں جو داخل ہوا، ایذا و قتال سے امن میں ہوگیا ہے، ایک نمونہ ہے دارالسلام کا کہ جو شخص اس میں نازل ہوا، وہ فنا و زوال سے سالم رہے گا، سوائے اس کے کہ جنت گھیری گئی ہے مکارہ عادیہ نفس سے، جس طرح کہ کعبہ گھیرا گیا ہے مہالکِ بادیہ سے۔ مکارہ سے مراد ہے یعنی جن اُمور کا کرنا نفس پر عادتاً شاق گزرتا ہے اور ناگوار ہے ان کے بغیر جنت میں داخل ہونا نہیں ہوتا، اسی طرح جنگل کی مہلک جگہوں سے گزرے بغیر کعبے میں نہیں پہنچ سکتا۔ ''فَمَرْحَبًا بِمَنْ جَاوَزَ مَهَالِكَ الْبَوَادِيْ شَوْقًا إِلَى اللِّقَاءِ يَوْمَ التَّنَادِيْ'' پس جس نے اس کی ملاقات کے شوق میں اپنی جان کا خیال نہ کیا اور جنگل کی مہلک جگہوں سے گزر گیا تو ایسے شخص کو مرحبا اور آفرین ہے۔[1] انتھیٰ۔

﴿ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ یعنی ہدایا ضحایا (قربانی کے جانور) کو تیار کرنے اور اُن کو ذبح کرنے کے وقت اللہ پاک کا نام لیں۔[2] (قاله البيضاوي) مطلب یہ ہے کہ اس وقت اللہ پاک کا نام لینا واجب ہے۔ خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذبح وغیرہ کے وقت تکبیر وغیرہ کے ساتھ اللہ کا نام ذکر کریں، جو کہ سارے کمالات کا جامع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے نام کا ذکر نحر کرنے سے کنایہ ہے، اس لیے کہ مسلمان کا ذبح کرنا اللہ کے ذکر سے علاحدہ نہیں ہوتا۔ یہ کنایہ اس بات کے آگاہ کرنے کو کیا کہ جس شے کے ساتھ اللہ پاک کی طرف تقرب کیا جاتا ہے، اس کا مقصد یہی ہے کہ اس کا پاک نام ذکر کیا جائے۔ ﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ میں کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ عشرۂ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠١۔ ١٠٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣)

ذی حجہ ہے۔ اکثر مفسرین کا قول یہی ہے اور یہی قول امام ابوحنیفہ و امام شافعی رحمہما اللہ کا مختار ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ عشرۂ ذی حجہ لوگوں کے نزدیک معلوم ہے، چوں کہ حج کا وقت اُن کے آخر میں ہے، اس واسطے اس کے جاننے کے لیے لوگ حرص کرتے ہیں۔ پھر اسی عشرے سے منافع کے اوقات بھی مشہور و معروف ہیں، جیسے: عرفہ و مشعر الحرام کا دن اور اُن ذبیحوں کے واسطے بھی ایک وقت اسی عشرے سے مقرر ہے، یعنی روزِ نحر۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ﴾ عشرۂ ذی حجہ ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اور آخر اُن کا روزِ نحر ہے اور یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایامِ نحر ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول صاحبین کا ہے اور یہی قول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] تیسرا قول یہ ہے کہ روزِ عرفہ آخر ایامِ تشریق تک۔ چوتھا قول روزِ نحر سے ایامِ تشریق تک ہے۔ اس کی دلیل ﴿ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ ہے، کیوں کہ "أنعام" اونٹ گائے بکریاں ہیں، اُن کے ذبح و نحر کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیں۔ لہٰذا ان کا نحر و ذبح انھیں ایام میں ہوتا ہے۔

شیخ زادہ نے ذکر کیا ہے کہ صاحبِ قولِ اوّل کی طرف سے اس استدلال کا یہ جواب ہے کہ ایامِ عشر ذی الحجہ میں سے دسواں دن من جملہ ایامِ نحر ہے، یہ دن بہترین ایامِ نحر ہے اور کلمہ "في" واسطے مطلق ظرفیت کے ہے، استغراق کا مقتضی نہیں ہے۔ انتہٰی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ان قولوں میں سے دو قول اوّل ذکر کیے ہیں اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی یہی دو قول نقل کیے ہیں اور امام محلی رحمہ اللہ نے تین قول، یعنی ایک پہلا اور دو آخری اور فتح القدیر میں بذیلِ درایت دو قول اوّل کے، لیکن ثانی کو پہلے اور پہلے قول کو قیل کے لفظ سے ذکر کیا ہے۔ فتح البیان میں بھی یہی دو اور چار قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نقل کیے ہیں، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[2] ایامِ معدودات و معلومات پر گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے[3] اور اضحیہ (قربانی) کے وقت کے بارے میں کلام کتبِ فقہ و شروحِ حدیث شریف میں معروف ہے۔

﴿ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ کلمہ ﴿ بَهِيْمَةِ ﴾ جنگلی اور دریائی ہر چوپائے میں مبہم ہے، اس لیے "أنعام" سے اس کا بیان کیا گیا۔ "أنعام" اونٹ گائے بھیڑ بکری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایا ضحایا ان ہی حیواناتِ مذکورہ سے ہوتے ہیں، اُن کے غیر سے نہیں ہوتے۔ چوں کہ ﴿ بَهِيْمَةِ ﴾ مطلق چوپایہ کو کہتے ہیں، اس لیے اس کا بیان انعام سے کر دیا۔ فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ ﴿ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ وہی انعام ہیں۔ لہٰذا اس میں ایسی اضافت ہے، جیسی مسجد الجامع اور صلاۃ الاولیٰ میں ہے،[4] یعنی اضافتِ بیانی۔ اب رہی یہ بات کہ اصل مطلب اسی قدر ہے کہ ایامِ معلومہ میں جانوروں کے ذبح پر اللہ کا نام ذکر کریں، لیکن اللہ پاک نے ﴿ مَا رَزَقَهُمْ ﴾

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٢)

[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٣۔ ١٢٤) تفسير النسفي (٣/ ١٠٢) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) فتح القدير (٣/ ٦١١) فتح البيان (٩/ ٤١۔ ٤٢)

[3] رقم الآية (٢٠٣، ١٩٧)

[4] فتح القدير (٣/ ٦١١) فتح القدير (٩/ ٤٢)

زیادہ کیا ہے اور ﴿ بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ سے اس کا بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کی یہ وجہ لکھی ہے کہ فعلِ ذکر کو مرزوق سے متعلق کیا اور بہیمہ سے اس کا بیان فرمایا، تقرب الی اللہ پر برانگیختہ کرنے اور ذکر کے تقاضے سے آگاہ کرنے کے لیے۔[1] یعنی جب یہ جانور اللہ پاک کے دیے ہوئے اور اس کے عنایت کیے ہوئے ہیں تو ضروری ہوا کہ اُن کے ذبح کرتے وقت اُن پر اسی کا نام لیں اور اُن کی قربانی کرنے سے اسی کا تقرب چاہیں، کیوں کہ وہ اسی کی خلق اور ملکیت ہیں، اس نے محض اپنے فضل و کرم سے تم کو عطا کیے ہیں تو تم کو چاہیے کہ اُن کے ذبح پر اسی کا نام لو اور اسی کا تقرب چاہو اور اس کا شکر ادا کرو۔

﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا ﴾ میں مضاف مقدر ہے، یعنی تم اُن کے گوشت سے کھاؤ۔ جمہور کے نزدیک امر واسطے ندب و استحباب کے ہے، ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ امر واسطے وجوب کے ہے۔ اوّل سب صیغے غائب کے ہیں، یہاں امر کیا تو یہ غائب سے حاضر کی طرف التفات ہوا۔ واللہ أعلم۔ شاید التفات کا نکتہ یہ ہو کہ جب لوگ دور دور سے سفر کی تکالیف گوارا کر کے بیت اللہ کے حج کو آئے اور دین و دنیا کے منافع میں حاضر ہوئے اور اپنی قربانیوں پر اللہ پاک کا نام ذکر کیا اور اس سے اسی وحدہ لاشریک لہ کا تقرب چاہا تو وہ اس بات کے مستحق ہوئے کہ اُن سے غیبت کا پردہ دور ہو اور انھیں شرفِ خطاب بخشا جائے اور اُن سے دوبدو کہا جائے کہ لو اب تم اپنی قربانیوں کے گوشت کھاؤ اور کھلاؤ۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امر اباحت کے واسطے ہے اور ہدی تطوع، یعنی نفلی قربانی اور متعہ و قران، یعنی حجِ تمتع اور حجِ قران کرنے والوں کی قربانیوں میں سے کھانا جائز ہے، کیوں کہ وہ دمِ نسک ہے، پس وہ اضحیہ کے مشابہ ہوگیا اور باقی ہدایا سے کھانا جائز نہیں ہے۔[2] قاضی صاحب مرحوم کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ جاہلیت والے جس بات پر تھے، اس کے مباح کرنے اور دور کرنے کو اللہ پاک نے کھانے کا امر فرمایا، یعنی وہ لوگ فقیروں پر تکبر کرنے کے لیے اپنے ذبیحوں سے کھاتے نہ تھے۔ لہٰذا اللہ پاک نے معلوم کرا دیا کہ یہ جائز ہے، چاہے کھائے، چاہے نہ کھائے۔ کسی نے کہا: امرِ ندب ہے، کیوں کہ اس میں کفار کی مخالفت ہے اور فقیروں کی دل جوئی، یعنی اُن کی خبر گیری اور تواضع و فروتنی کا برتاؤ۔[3]

علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہدی اگر نفلی ہو تو مُہدِی کو اس میں سے کھانا جائز ہے اور اسی طرح نفلی اضحیہ کا حال ہے، اس واسطے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے قصہ حجۃ الوداع میں روایت کیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ یمن سے بُدنے لے کر آئے، یعنی اونٹ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو (۱۰۰) بدنے ہانک لائے، پس آپ نے بنفسِ نفیس تریسٹھ بدنے نحر فرمائے اور باقی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نحر کیے اور آپ نے اُن کو اپنے بدنوں میں شریک فرمایا، پھر ہر بدنے سے ایک ایک ٹکڑے کا حکم دیا تو وہ ایک دیگ میں رکھے گئے اور پکائے گئے، پھر آپ نے ان کے گوشت سے کھایا اور اُن کے

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٣۔ ١٢٤) [2] تفسیر النسفي (٣/ ١٠٢) [3] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٤)

شوربے سے پیا۔[1] انتهى۔ یہ نفلی ہدی تھے۔ رہا ہدی واجب، اس میں علما کا اختلاف ہے، جیسے: دم تمتع وقران ونذور و کفارات کا اور وہ دم جو جبرِ نقصان (نقصان کی تلافی) کے واسطے کیا جاتا ہے اور وہ جو حج کے فاسد کرنے اور اس کے فوت ہونے اور شکار کے بدلے سے واجب ہوتا ہے۔ آیا ہدیہ کرنے والے کے لیے جائز ہے کہ اُن میں سے کچھ کھائے؟ تو ایک قوم تو اس طرف گئی ہے کہ ہدیہ کرنے والے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ان میں سے کھائے، من جملہ اُن کے امام شافعی رحمہ اللہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ جزائے صید و نذر سے نہ کھائے اور اس کے علاوہ سے کھائے۔ امام احمد و اسحاق رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہدیِ تمتع سے کھائے اور ہر ہدی سے جو اس پر واجب ہوا ہے، مگر فدیۂ اذیٰ و جزائے شکار و نذر سے نہ کھائے۔ ائمۂ حنفیہ رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں کہ دمِ تمتع و قِران سے کھائے، کیوں کہ یہ دونوں شکر کے دم ہیں، جنایت (جُرمانے) کے دم نہیں ہیں اور اُن کے سوا اور واجب دم سے نہ کھائے۔

﴿ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ ﴾ یعنی کھلاؤ اس شخص کو جسے شدت پہنچی ہے۔ ﴿ اَلْفَقِيْرَ ﴾ یعنی محتاج۔[2] (قاله البيضاوي)

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: "بائس" وہ شخص ہے جس کو "بؤس" پہنچا ہے، یعنی شدت اور فقیر وہ ہے جس کو اعسار (تنگ دستی) نے ضعیف کر ڈالا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] اعسار تنگی و مفلسی کو کہتے ہیں۔ فقیر ماخوذ ہے فقارِ ظہر سے، یعنی پشت کی گُربی۔ مطلب یہ ہے کہ مارے ضعف و فقر کے پیٹھ کی گربی نظر آتی ہے۔ کسی نے کہا: "بائس" شدید الفقر ہے کہ جس کی حاجت انتہا درجے کو پہنچی ہے اور فقیر وہ محتاج ہے جس کے واسطے کوئی غنا نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "بائس" وہ ہے، جس کی "بأس" یعنی شدت اس کے کپڑوں اور چہروں میں ظاہر ہوئی ہے اور فقیر وہ ہے جو ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے کپڑے نقی، یعنی صاف ہوں اور اس کا چہرہ غنی کا چہرہ ہو۔ یہ تو شیخ زادہ رحمہ اللہ کا بیان تھا۔

فتح القدیر و فتح البیان میں ہے کہ "بائس" "ذو البؤس" ہے اور بؤس شدتِ فقر کو کہتے ہیں، پس ذکر فقیر کا بعد اس کے مزید وضاحت کے لیے ہے۔[4] اسی لیے امام محلی رحمہ اللہ نے بائسِ فقیر کی تفسیر شدید الفقر کی ہے۔[5] امام خازن رحمہ اللہ کا قول یہ ہے: "الزَّمِنُ الَّذِيْ لَا شَيْءَ لَهُ"[6] یعنی لُنجا بر جا ماندہ جس کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ رہا امر لہٰذا بیضاوی نے کہا ہے کہ وہ وجوب کے لیے ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان میں بھی اسی طرح کہا ہے۔ دوسرا قول اُن

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨١٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٢/ ٤٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧٤)

(2) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤) (3) تفسير النسفي (٣/ ١٠٢) (4) فتح القدير (٣/ ٦١١) فتح البيان (٩/ ٤٢)

(5) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) (6) تفسير الخازن (٥/ ١٤)

میں قیل کے لفظ کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ندب کے واسطے ہے۔[1]

﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ ﴾ قضا سے مراد یہاں ادا یہ ہے، یعنی چاہیے کہ اپنے میل کے دور کرنے کے لیے ادا کریں، کیوں کہ تفث وسخ ہے، یعنی میل کچیل اور قذارت وکراہت کہ بالوں ناخنوں کے بڑھ جانے سے حاصل ہوتی ہے، اس پر مفسرین کا اجماع ہے، جیسا کہ نیسابوری نے اس کو نقل کیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت والے ''تفث'' کو جانتے پہچانتے نہیں ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شعر (بالوں) میں وہ چیز نہیں آئی جس سے ''تفث'' کے معنی میں حجت پکڑی جائے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ''تفث'' کی اصل لغت میں ہر قاذورہ ہے، یعنی پلیدی وگندگی جو انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حاجی کا قضائے ''تفث'' اس کا تیل ڈالنا ہے، اس واسطے کہ حاجی غبار آلود اور پریشان بال ہوتا ہے، سر میں نہ تیل ڈالتا ہے، نہ اُسترہ لیتا ہے، پھر جب اس نے اپنا نسک پورا کر لیا، یعنی ارکانِ حج ادا کر چکا اور احرام سے نکلا تو سر منڈایا، کپڑے پہنے تو یہی قضائے ''تفث'' ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویا قضائے ''تفث'' احرام سے احلال کی طرف نکلنا ہے۔ فتح القدیر وفتح البیان میں اسی طرح ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''ثم ليزيلوا عنهم أدرانهم'' یعنی چاہیے کہ خود سے اپنے میل کچیل کو دور کریں۔ نفطویہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اور محلی نے بھی ''يقضوا'' کی تفسیر ''يَزِيْلُوْا'' کی ہے۔[4]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قضا کی تفسیر ازالہ سے تفسیر مجازی ہے۔ اس لیے کہ اصل میں قضا قطع وفصل کو کہتے ہیں؛ یعنی کاٹنا، جدا کرنا۔ لہٰذا یہاں اس سے ازالہ مراد لیا ہے اور ''تفث'' اصل میں ناخن وغیرہ کے میل کو کہتے ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ ''تفث'' کی اصل ''تَفَّ'' سے ہے، ''تَفَّ'' ناخنوں کے میل کو بولتے ہیں۔ حرفِ فا کو حرفِ ثائے مثلثہ سے قلب کر لیا، جس طرح کہ مغثور ومعفور میں کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تفث، وسخ وقذر ہے، یعنی میل اور پلیدی۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''ما اتفثك؟'' یعنی کس شے نے تجھے میلا کر دیا؟ قطرب نے نقل کیا ہے کہ جب کسی شخص کا سفر میں میل بہت ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں: ''تفث الرجل'' یعنی اس کا میل بہت ہو گیا ہے۔ باب اس کا تعب ہے۔ ''تفث'' وہ آدمی ہے کہ تیل لگانا استرہ لینا چھوڑ دے، پھر اس پر میل چڑھ آئے۔ مصباح میں کہا ہے کہ قضائے تفث مباح کر لینا ہے اس شے کا جو اس پر حرام کی گئی تھی، احرام کی وجہ سے حلال ہونے کے بعد۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لْيَقْضُوْا ﴾ کے معنی ''ليصنعوا'' ہیں، یعنی چاہیے کہ وہ کام کریں جس کو محرم اپنے احرام کو کھولنے کے وقت کرتا ہے، یعنی بالوں وغیرہ کا دور کرنا، اس کے ضمن میں سارے مناسک کا ادا کرنا آ گیا، کیوں کہ یہ کام کل مناسک ادا کرنے کے بعد ہی کرے گا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ثُمَّ ﴾ کے بعد

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤) فتح القدير (٣/ ٦١١) فتح البيان (٩/ ٤٢)
[2] فتح القدير (٣/ ٦١١ ـ ٦١٢) فتح البيان (٩/ ٤٢)
[3] تفسير النسفي (٣/ ١٠٢)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧)

اتنی عبارت حذف ہے: "ثم بعد حلھم وخروجھم من الإحرام وبعد الإتیان بما علیھم من النسك لیقضوا تفثھم" یعنی پھر احرام کھولنے کے بعد اور سارے ارکانِ حج ادا کر لینے کے بعد چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں، مونچھیں ناخن تراشیں، بغل کے بال اُکھاڑیں، استرہ لیں اور سر منڈائیں۔ عامہ کی قراءت بکسرِ لام ہے، یہ لام امر کا لام ہے۔ نافع اور کوفیوں نے بہ سکونِ لام پڑھا ہے، اس لیے کہ منفصل کو متصل کے قائم مقام کیا ہے۔ (قالہ السمین)

﴿ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ﴾ اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ نذور سے مراد وہ نیکی کے کام ہیں جن کی حج میں نذر کر لی ہے تو چاہیے کہ اس کو پورا کریں، کیوں کہ جس وقت حج کیا یا عمرہ کیا، پھر اپنی جان پر ہدی وغیرہ سے کوئی چیز ایسی واجب کر لی کہ اگر اس کا واجب کر لینا نہ ہوتا تو اس کا حج مقتضی نہ ہوتا، پس جب خود واجب کر لی ہے تو اس کو پورا کرے۔ (فتح القدیر و فتح البیان میں اس کے بعد کہا ہے کہ امر وجوب کے لیے ہے۔) دوسرا قول یہ ہے کہ نذور سے مراد مواجبِ حج ہیں،[1] یعنی انواع واقسام کے مناسک جن کو احرام میں داخل ہونے نے واجب کر دیا ہے اور حج میں داخل ہونے کے سبب سے وہ واجب ہوگئے ہیں، اُن کو ادا کریں۔ نذر کا ایجاب قول سے ہوتا ہے اور مناسکِ حج کا ایجاب بہ طریقِ فعل ہوا ہے۔ لہٰذا اس کی تشبیہ ایجابِ قولی سے دے کر اعمالِ حج کا نام نذور رکھ دیا۔ اگر آدمی پر نذور مطلق ہوں تو افضل یہ ہے کہ مکے والوں پر اُن کو خیرات کر دے۔ یہ حاصل ہے شیخ زادہ کے بیان کا۔ امام بیضاوی، شوکانی اور نسفی رحمہ اللہ نے یہی دو قول ذکر کیے ہیں، لیکن دو اول نے اوّل قول کو اوّل اور دوسرے کو بلفظِ قیل ذکر کیا ہے۔ اور تیسرے نے ثانی کو اول لکھا ہے اور کہا ہے کہ جو شخص اس شے سے خارج ہوا، جو اس پر واجب ہوئی تھی تو عرب لوگ اس کے واسطے کہتے ہیں: "وفیٰ بنذرہ" اس نے اپنی نذر پوری کی، اگرچہ اس نے نذر نہیں کی تھی۔[2]

مطلب یہ ہے کہ واجب سے خارج ہونے کو نذر بولتے ہیں۔ اسی طرح اعمالِ حج کا حال ہے کہ حاجی نے ان کی نذر نہیں کی تھی، بلکہ وہ حج میں داخل ہونے سے واجب ہوگئے تھے، لہٰذا ان کا ادا کر دینا، یہی وفائے نذر ہے۔ ﴿ وَلْيُوفُوا ﴾ کو بہ تخفیف حرف پڑھا ہے اور ابوبکر کی قراءت بہ سکونِ لام و تشدیدِ حرفِ فا ہے۔ ﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اس طواف سے مراد طوافِ رکن ہے، جس سے پورے طور پر حلال ہونا ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ قرینہ ہے قضائے "تفث" کا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد طوافِ وداع ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دونوں قول نقل کیے ہیں، لیکن دوسرے کو بلفظِ قیل ذکر کیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے صرف قولِ اوّل لکھا ہے اور اُن کے الفاظ طواف الافاضہ ہیں۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی قولِ اول پر اکتفا کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طوافِ زیارت ہے، جو حج کا رکن ہے اور جس سے پورا تحلل واقع ہوتا ہے۔ نزدیک غیر ابن عیاش و ابوعمرو کے تینوں لام

[1] فتح القدیر (٣/ ٦١٢) فتح البیان (٩/ ٤٣) [2] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٤) فتح القدیر (٣/ ٦١٢) تفسیر النسفي (٣/ ١٠٢)

[3] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٤) تفسیر الجلالین (١/ ٤٣٧)

ساکن ہیں۔[1] فتح القدیر و فتح البیان میں لکھا ہے کہ یہ طوافِ افاضہ ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں متاولین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔[3]

حج کے طواف تین ہیں: ایک طوافِ قدوم ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص مکے میں آتا ہے تو سات بار کعبے کے گرد طواف کرتا ہے، تین بار میں رمل کرتا ہے حجرِ اسود سے لے کر، یہاں تک کہ اسی تک پہنچتا ہے۔ یہ طواف سنت ہے، اس کے تارک پر کوئی شے نہیں۔ دوسرا طوافِ افاضہ ہے، یہ طواف یوم النحر، یعنی بقر عید کے دن بعد رمیِ جمار اور سر منڈانے کے ہوتا ہے، اس کو طوافِ زیارت بھی بولتے ہیں، یہ رکن ہے، اس کے کیے بغیر احرام سے حلال ہونا حاصل نہیں ہوتا۔ حدیث متفق علیہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ صفیہ رضی اللہ عنہا "لیلة النفر"، یعنی چلنے کی شب کو حائضہ ہوگئیں تو کہا کہ میں گمان نہیں کرتی ہوں اپنے آپ کو مگر تمھیں روکنے والی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « عقریٰ حلقی » (زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں صفتیں شوم عورت کی ہیں، یعنی مارے شومی کے قوم کا استیصال کرے گی، ان کا ناس کر ڈالے گی۔ ظاہر میں بد دعا ہے، لیکن حقیقت میں بد دعا نہیں ہے، اس قسم کے کلمے بدون قصدِ حقیقت عرب کے زباں پر جاری ہوتے ہیں بطور تلف کے، جیسے: "لا أم لك وثكلتك أمك" اور ہندی میں کہتے ہیں: گنجی سر منڈی۔ اس کے معنی میں اور بھی اقوال ہیں۔) نحر کے دن طواف کر لیا ہے؟ عرض کی گئی کہ ہاں، فرمایا: تو چل۔[4]

اس سے ثابت ہوا کہ اگر نحر کے دن طواف نہ کر لیتیں تو اُن کو جائز نہ ہوتا کہ چلی جائیں۔ تیسرا طواف الوداع ہے، جو شخص مسافتِ قصر تک مکے سے مفارقت کرنا چاہے (یعنی جتنے فاصلے پر نماز کو قصر کرنا جائز ہو جاتا ہے) تو اس کے لیے اس بات میں رخصت نہیں ہے کہ مکے سے مفارقت کرے، یہاں تک کہ سات بار کعبے کا طواف کر لے۔ پھر جو شخص اس کو ترک کرے تو اس پر دم ہے، مگر حیض والی، کیوں کہ اس کے لیے طوافِ وداع کو چھوڑنا جائز ہے بدلیلِ حدیث شریف مذکور۔ رہا رمل، یعنی تین پھیروں میں کاندھے ہلا کر تیز چلنا، لہٰذا یہ طوافِ قدوم کے ساتھ خاص ہے، طوافِ افاضہ و طوافِ وداع میں رمل نہیں ہے۔

کعبے کو جو بیتِ عتیق کہتے ہیں، اس میں چند قول ہیں، چناں چہ کئی قول پہلے گزر چکے ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دو قول ذکر کیے ہیں: ایک یہ ہے کہ عتیق بہ معنی قدیم ہے، چوں کہ پہلے پہل یہی گھر بنا ہے، اس لیے اس کا نام عتیق ہوا۔ (امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: "القول الأول أصح للنظر و الحديث الصحيح، قال مجاهد: خلق الله البيت قبل الأرض بألفي عام لهذا سمي عتيقا"؟[5] دوسرا یہ ہے کہ جباروں ظالموں کے تسلط سے آزاد کیا گیا ہے۔[6] کتنے ظالم اس کے ڈھانے کو چل کر آئے، اللہ پاک نے اُن کے شرّ سے اس کو روکا۔ رہا حجاج بن

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٢) [2] فتح القدير (٣/ ٦١٢) فتح البيان (٩/ ٤٣) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٦١٥ ـ ٦١٦)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٨٢) [5] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٣) [6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤)

یوسف، اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ کیا تھا، یہ نہیں ہوا کہ اس پر متسلط ہوا ہو، صرف اُن کے نکالنے کے لیے حیلہ و تدبیر کی تھی، جو کچھ نقصان ہوا تھا اس کو پھر بنایا، درست کر دیا، چناں چہ اب تک اسی کے وقت کا بنا ہوا موجود ہے اور جب ابرہہ نے اس پر تسلط کا ارادہ کیا تو جو معاملہ اس کے ساتھ کیا گیا، وہ مشہور و معروف ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے صرف پہلا قول نقل کیا ہے۔[1]

خطیب نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ کبھی کسی کی مِلک نہیں کیا گیا۔ یہ تیسرا قول ہوا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ غرق ہونے سے آزاد کیا گیا، کیوں کہ زمانۂ طوفان میں آسمان کی طرف اُٹھا لیا گیا تھا۔ پانچواں یہ ہے کہ عتیق بہ معنی کریم ہے، یعنی بڑے شرف و بزرگی والا ہے۔ اسی معنی سے عمدہ نسل کے گھوڑوں کو عتاق الخیل کہتے ہیں اور اسی باب سے عتاق الرقیق آزاد غلاموں کو بولتے ہیں، اس لیے کہ غلامی کی ذلت سے نکل کر آزادی کے شرف کو پہنچے ہیں۔ چھٹا یہ ہے کہ اللہ پاک گناہگاروں کی گردنوں کو اس میں عذاب سے آزاد فرماتا ہے۔

ان میں سے چار پہلے قول خازن رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیے ہیں۔ فتح البیان میں پانچوں قول مذکور ہیں۔ فتح القدیر میں بھی پانچ قول ہیں، لیکن دو پہلے اور تین آخری۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے پانچ پہلے قول ذکر فرمائے۔ اس کے بعد بیت اللہ شریف کی مدح میں چند فقرے نہایت فصیح و بلیغ اور طرب انگیز لکھے ہیں، جن کے سنتے ہی سچے مسلمان اس کی زیارت کے مشتاق ہو جاتے ہیں اور مشاقِ سفر اختیار کر کے دیدارِ فائض الانوار بیت اللہ سے مشرف ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ فقرے یہ ہیں: ”وهو مطاف أهل الغبراء كما أن العرش مطاف أهل السماء، فإن الطالب إذا هاجته معية الطرب وجذبته جواذب الطلب جعل يقطع مناكب الأرض مراحل، ويتخذ مسالك المهالك منازل“ یعنی کعبۂ معظّمہ زمین والوں کی جائے طواف ہے، جس طرح کہ عرشِ معلّٰی آسمان والوں کی طواف گاہ ہے۔ طالب بیت اللہ کو، جس وقت معیتِ طرب اُبھارتی ہے اور طلبِ صادق کی کشش اس کو کھینچتی ہے تو اطرافِ زمین کو منزل منزل کر کے قطع کرتا ہے اور ہلاکت کی راہوں کو منزلیں بناتا ہے۔

(معیت بہ معنی مصاحبت ہے اور طرب سبکی و خفت ہے، جو نشاط و خوشی سے حاصل ہوتی ہے، یعنی جس وقت طرب کی مصاحبت اس کو ہیجان میں لاتی ہے۔ مصر کے نسخے میں معیت ہے، مگر یہ معنی چنداں چسپاں معلوم نہیں ہوتے ہیں، اگر معمعہ کی تصحیف ہو تو دور نہیں ہے۔ معمعہ نیستان (سرکنڈے) کے جلنے کی آواز کو کہتے ہیں اور معرکہ میں دلیر لوگوں کی آواز کو بھی بولتے ہیں، یہ معنی فی الجملہ خوب معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم.)

”فإذا عاين البيت لم يزده التسلي به إلا اشتياقا، ولم يفده التشفي باستلام الحجر إلا

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٥) فتح البيان (٩/ ٤٣) فتح القدير (٣/ ٦١٢)

احتراقا، فيرده الأسف لهفان، ويردده اللهف حوله في الدوران" پھر جب وہ بیت اللہ شریف کا معاینہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ تسلی ہونا نہیں بڑھاتا، مگر اشتیاق کو اور حجرِ اسود کو چوم کر تشفی ہونا فائدہ نہیں دیتا اس کو مگر سوزش کا، پس اندوہ وغم رد کرتا ہے اس کو اس حال میں کہ دریغ کھانے والا ہے اور دریغ و اندوہ گردا گرد بیت اللہ شریف کے بار بار اس کو گردش میں لاتا ہے۔ "وطواف الزيارة آخر فرائض الحج الثلاث و أولها الإحرام وهو عقد الالتزام يشبه الاعتصام بعروة الإسلام حتى لا يرتفض بارتكاب ما هو محظور فيه و يبقىٰ عقده مع ما يفسده و ينافيه كما أن عقد الإسلام لا ينحل بازدحام الآثام و ترتفع ألف حوبة بتوبة"، یعنی طوافِ زیارت حج کے تین فرضوں میں کا آخر فرض ہے۔ پہلا فرض احرام ہے اور وہ لازم کر لینے کی گرہ لگاتا ہے، گوشۂ اسلام کے ساتھ چنگل مارنے کے مشابہ ہے، یہاں تک کہ جو شے اس میں ممنوع ہے اس کے کرنے سے چھٹتا نہیں ہے اور جو شے اُس کے مفسد و منافی ہے، اُس کے ساتھ باقی رہتا ہے، جس طرح کہ اسلام کی گرہ کثرتِ گناہ سے کھلتی نہیں ہے۔ ہزار گناہ ایک سچی توبہ سے دور ہو جاتے ہیں۔

"وثانيها الوقوف بعرفات بسمة الابتهال، في صفة الاهتبال، و صدق الاعتزال، عن دفع الاتكال، على مراتب الأعمال، وشواهد الأحوال"[1] دوسرا فرض میدانِ عرفات میں ٹھہرنا ہے، زاری و عاجزی کرنے کے طور پر اس وقت خود کو ان صفتوں کے ساتھ متصف کرے۔ ایک یہ ہے کہ اس وقت کی دعا و زاری کو غنیمت سمجھے۔ دوسری یہ ہے کہ سچے طور پر ان چیزوں سے کنارہ کرے، یعنی اعمال کے مراتب اور احوال کے شواہد پر اعتماد کرنے سے علاحدہ ہو، اُن پر ہرگز نظر نہ کرے، صرف اللہ پاک کے کرمِ فیاض پر معتمد ہو کے جہاں تک بنے دعا و زاری و عاجزی و فروتنی میں مشغول ہو، کیوں کہ اللہ پاک کی رحمت انتہائی وسیع ہے اور اس کا فضل بے انتہا ہے، ایسے تھوڑے وقت میں ایسی جگہ میں کہ جہاں پر بارانِ رحم و کرم برس رہا ہے، گناہوں کے پہاڑ ہبائے منثور (پراگندہ ذرے) ہو رہے ہیں، طرح طرح کی رحمت دھوم دھام سے گر رہی ہے، خود سے اور اپنے اعمال و احوال کی رویت (مشاہدے) سے فانی ہو کر اسی سے دعا کرے اور جو کچھ مانگا جائے مانگے، وہاں کسی طرح کی کمی نہیں ہے، آدمی کیا اور اس کا عمل و حال کیا کہ اس پر نظر کرے اور معتمد ہو، قابلِ اعتماد اور لائقِ بھروسہ تو اللہ ہی کا فضل و کرم ہے۔ اللهم إنا نسألك من فضلك العظيم، و كرمك الجسيم و رحمتك الواسعة، أن تسعنا رحمتك الوسيعة، و كرمك الجزيل، وصل وسلم علىٰ سيدنا محمد و آله وصحبه أجمعين، آمين.

---

[1] تفسير النسفي (۳/ ۱۰۲۔ ۱۰۳)

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰ حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۱

یہی (حکم) ہے اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے تو یہ اس کے رب کے ہاں اس کے لیے بہت بہتر ہے اور تمھارے لیے چوپائے حلال کیے گئے ہیں سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جا چکے ہیں، لہٰذا تم بتوں کی گندگی سے بچو، اور جھوٹی بات سے بھی بچو (30) اللہ کے لیے یکسو ہو جاؤ نہ کہ اس کے ساتھ شرک کرنے والے، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا کسی دور دراز جگہ لے جا پھینکے (31)

نافرمانیوں اور گناہوں سے پرہیز کا ثواب:

بڑائی رکھی اللہ کے ادب کی، یعنی قربانی کے جانور آئے ہوئے، نہ موٹے اور قیمتی جانور لائے اور جھول اس پر اچھی ڈال کر، پھر وہ بھی خیرات کرے اور چوپائے تم پر حلال ہیں، یعنی جو کھانے میں رواج ہے اور بہت سے چوپائے حرام بھی ہیں اور بچو بتوں کی گندگی سے، یعنی جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا وہ مردار ہے اور جھوٹی بات سے بچو، یعنی جو کسی کے نام کا کر کے ذبح کیا وہ بھی حرام ہے اور جو شریک کرے، اس کی مثال فرمائی، اس لیے جس کی نیت ایک اللہ پر ہے وہ قائم ہے اور جہاں نیت دوسروں کی طرف گئی، وہ سب اس کو راہ میں سے اُچک لے گئے، یا سب سے منکر ہو کر دہریہ ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ طاعتیں اور عبادتیں ہیں جن کا ہم نے مناسک کے ادا کرنے میں حکم کیا ہے اور وہ ثواب جزیل جو اُن کے ادا کرنے والوں کے لیے ہے۔ ﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ ﴾ یعنی جو شخص کہ اللہ پاک کی نافرمانیوں اور حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرے اور حال یہ ہے کہ فی نفسہ ان کا مرتکب ہونا ایک امرِ عظیم ہے ﴿ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ یعنی اس کے لیے اس میں بڑی خیر اور بہت ثواب ہے۔ پس جس طرح طاعات کے کرنے پر بہت بڑا اجر اور ثواب ہے، اسی طرح محرمات کے چھوڑنے پر اور ممنوعہ چیزوں سے بچنے پر بہت بڑا ثواب ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے وحرمتِ مکہ کہ حج وعمرہ ہے اور اللہ پاک کے ساری معاصی سے بچنا جن سے منع فرمایا ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے۔[1]

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٦١٧)

حلال مویشیوں کا ذکر:

﴿ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی حلال کر دیے ہم نے تمھارے لیے سارے چوپائے سوائے اُن کے جو ہم سناتے ہیں۔ (یہ الفاظ یعنی ''مگر جو ہم سناتے ہیں۔'' تفسیر ابن کثیر میں نہیں ہیں، مگر فقرہ پورا کرنے کو لکھے ہیں۔) ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ﴾ [المائدة: ۱۰۳] ''اللہ نے نہیں بنایا کسی کو بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی مگر وہ چند چیزیں جن کی تحریم تم کو سنائی جاتی ہے۔ اس کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [المائدة: ۳] ''تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور، خون، سوٗر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مرجانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مر جانے والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں، سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔ آج وہ لوگ نا امید ہو گئے جنھوں نے تمھارے دین کا انکار کیا، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھی سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے پسند کر لیا تمھارے لیے اسلام کو بطورِ دین کے، پس جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے، جب کہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو، تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' یہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اس کو قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[1]

شرک اور جھوٹ سے بچاؤ کا حکم:

﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴾ حرفِ ''مِنْ'' یہاں جنس کے بیان کے لیے ہے؛ یعنی تم پلیدی سے بچو جو بت ہیں۔ قولِ زور کو شرک باللہ کا قرین کیا، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۳۳] ''کہہ دیجیے: بے شک میرے

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦١٧ ـ ٦١٨)

رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے، چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی اور گناہ کو اور ناحق ظلم کو بھی اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم اللہ کے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہو جو تم نہیں جانتے۔'' اسی باب سے شہادتِ زور ہے، یعنی جھوٹی گواہی۔

صحیحین میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا خبر نہ دوں میں تم کو بڑے گناہوں سے بھی بڑے گناہ کی؟ ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا، اور آپ تکیہ لگائے ہوئے تھے تو بیٹھ گئے، پھر فرمایا: ''أَلَا وَقَوْلَ الزُّوْرِ أَلَا وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ'' یعنی خبردار جھوٹی بات، خبردار اور جھوٹی گواہی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تکرار کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا: کاش آپ سکوت فرماتے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے أیمن بن خریم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ پس فرمایا: جھوٹی گواہی برابر کی گئی ہے، اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے سے، تین بار اس کلمے کو دھرایا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴾[2] (وهكذا رواه الترمذي عن أحمد بن منيع عن مروان بن معاوية ﷺ به، ثم قال: غريب إنما نعرفه من حديث سفيان بن زياد، وقد اختلف عنه في رواية هذا الحديث ولا نعرف لأيمن بن خريم سماعا من النبي ﷺ)

امام احمد رحمہ اللہ نے خریم بن فاتک اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھی۔ ''فلما انصرف قام قائما'' پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو اُٹھ کھڑے ہوئے، درآں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام کرنے والے تھے۔ پھر فرمایا: « عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ الْإِشْرَاكَ بِاللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ » یعنی جھوٹی گواہی اللہ عزوجل کے ساتھ شرک کرنے کے برابر کی گئی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿30﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ﴾[3]۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن عاصم بن ابی النجود عن وائل بن ربیعۃ عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا ہے کہ جھوٹی گواہی اشراک باللہ کے برابر ہوتی ہے۔ پھر یہی آیت پڑھی۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ ﴾ یعنی خالص کرنے والے دین کو واسطے اللہ کے، منحرف ہونے والے باطل سے حق کی طرف قصد کر کے اور اسی لیے فرمایا: ﴿ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ﴾۔ پھر اللہ پاک نے مشرک کی مثل بیان فرمائی

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧)

(2) مسند أحمد (٤/ ١٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٩٩) اس کی سند میں ''فاتك بن فضاله'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١١١٠)

(3) مسند أحمد (٤/ ٣٢١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٧٢) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١١٠)

(4) تفسير الطبري (١٨/ ٦١٩)

اس کی گمراہی اور ہلاکت کی اور ہدایت سے دور ہونے کی۔ پس فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ﴾ یعنی جو شخص شریک بناتا ہے اللہ کا تو گویا گر پڑا آسمان سے ﴿ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ ﴾ یعنی پھر پرندے ہوا میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔

﴿ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴾ یعنی یا لے ڈالتی ہے اس کو ہوا دور کسی جگہ میں کہ جو اس میں گرا اس کو ہلاک کر ڈالتا ہے، اسی واسطے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ بے شک کافر جس وقت موت کے فرشتے اس کو وفات دیتے ہیں اور اس کی روح کو لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں تو اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہیں جاتے ہیں، بلکہ اس جگہ سے اس کی روح پھینک دی جاتی ہے، پھینک دیا جانا، پھر یہی آیت پڑھی۔[1] سورت ابراہیم کی تفسیر میں یہ حدیث شریف بہ حروفہ والفاظہ وطرقہ گزر چکی ہے۔[2] اللہ پاک نے سورۃ الانعام میں مشرک کی ایک اور مثال بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے: ﴿ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ ﴾ [الأنعام: 71][3] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو ہمیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ اور جب اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اس کے بعد اُلٹے پاؤں پھر جائیں، اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا ہو، وہ زمین میں حیران پھرتا ہو، اس کے کچھ ساتھی ہوں جو اسے سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آ جا؟ کہہ دیجیے: بے شک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔''

﴿ ذٰلِكَ ﴾ میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ ''أي الأمر أو الشأن ذلك المذكور'' اس صورت میں محل اس کا رفع ہے بنا بر خبر۔ (امام قرطبی رحمہ اللہ نے ''الفرض ذلك أو الوجب ذلك'' کہا ہے اور نصب کی صورت میں ''امتثلوا ذلك'' مقدر نکالا ہے۔) امام محلی، بیضاوی، نسفی، خازن اور ابو البقاء رحمہم اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان میں بھی اوّل اسی کو لکھا ہے۔[4] دوسرا قول یہ ہے کہ مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے۔ اس کو صرف فتح القدیر میں ذکر کیا ہے۔[5] تیسرا یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہے، مفعول ہے فعل محذوف کا۔ فتح القدیر و فتح البیان میں ''افعلوا ذلك'' تقدیر کی ہے اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ''ليفعلوا ذلك'' مقدر نکالا ہے۔[6]

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦) [2] رقم الآية (٢٧) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٢۔ ٢٩٣)

[4] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٣) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤) تفسير النسفي (٣/ ١٠٣) تفسير الخازن (٥/ ١٥۔ ١٦) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٠) فتح القدير (٣/ ٦١٤) فتح البيان (٩/ ٤٣)

[5] فتح القدير (٣/ ٦١٤۔ ٦١٥) [6] فتح القدير (٣/ ٦١٥) فتح البيان (٩/ ٤٣) تفسير النسفي (٣/ ١٠٣)

مشار الیہ اس کا حج کے اعمال و افعال ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ شیخ زادہ نے کہا، یعنی جو کچھ ﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا ﴾ سے لے کر ﴿ الْعَتِيْقِ ﴾ تک مذکور ہوا ہے، کیوں کہ یہ آیتیں احکام پر مشتمل ہیں، ان میں سے بعض امور تو مامور بہ ہیں اور بعض "منھیٰ عنه" (جن سے منع کیا گیا) ہیں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ کلمہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ اس جگہ ایسا ہے، جیسے کہ منشی اپنے خط کا ایک جملہ بعض معانی و مطالب میں مقدم کرتا ہے، پھر جب دوسرے معنی و مطلب میں غور و خوض کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے: "هذا وقد كان كذا" یعنی اس بات کو لو اور یہ بات ہو چکی۔ اب دوسری بات سنو، غرض کہ کلمۂ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ یا "هذا" ایسے مقام میں دو کلام کے درمیان فصل کرنے کے لیے، یا ایک ہی کلام کے دو طرفوں کے درمیان جدا کرنے کو ذکر کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں اس جگہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ فرمایا ہے۔ اسی طرح ایک اور آگے آتا ہے اور اسی قسم کے مقام میں لفظ "هذا" بھی فرمایا ہے۔[1]

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ ﴾ ﴿ حُرُمٰتِ ﴾ "حرمة" کی جمع ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: حرمت وہ شے ہے جس کے ساتھ قیام واجب ہے اور اس میں کمی کرنا حرام ہے۔ حرمات اس آیت میں وہ چیزیں ہیں جن سے نہی کی ہے اور اُن میں واقع ہونے سے منع فرمایا ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، حرمت وہ شے ہے جس کا ہتک حلال نہیں۔ (ہتک پردہ پھاڑنے کو کہتے ہیں، تاکہ جو شے اس کے پیچھے ہے، وہ ظاہر ہو جائے۔ (قاله الشهاب[3]۔) اور مناسکِ حج وغیرہ جن کے ساتھ اللہ عزوجل نے بندے کو مکلّف کیا ہے، وہ سب اسی صفت کے ہیں۔ پس حرمات میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ پاک کی ساری تکالیف میں عام ہوں۔ دوسرا یہ ہے کہ اُن تکالیف کے ساتھ خاص ہوں جو حج سے متعلق ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حرمات سے مراد بیت الحرام و مشعر الحرام و شہرِ حرام و بلدِ حرام و مسجدِ حرام ہیں۔ غرض کہ حرمت کے تین معنی ٹھہرے۔[4]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی یہی تین معنی ذکر کیے ہیں۔ الفاظ ان کے یہ ہیں: "أحكامه و سائر ما لا يحل هتكه أو الحرم و ما يتعلق بالحج من التكاليف، وقيل الكعبة و المسجد الحرام و البلد الحرام والشهر الحرام والمحرم"[5] یعنی حرمات اللہ سے مراد اللہ پاک کے احکام ہیں، جو مکلفوں کے فعلوں کے متعلق ہیں، کوئی حکم کسی شے کے واجب کرنے کا ہے، کوئی حکم کسی شے کے حرام کرنے کا ہے اور اسی جیسے اور احکام ہیں اور وہ سب اشیا جن کا ہتک حلال نہیں ہے، ان سب کی حرمت بایں معنی عام ہے اور کبھی حرمت خاص ہوتی ہے حرم کے ساتھ اور حج کے متعلق تمام احکام کے ساتھ اور کبھی پانچوں محرمات کے ساتھ خاص ہوتی ہے کہ من جملہ اُن کے ایک مُحرِم ہے، یہاں تک کہ حلال ہو جائے۔

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٣٩) [2] فتح القدير (٣/ ٦١٥) [3] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٩٣)
[4] تفسير النسفي (٣/ ١٠٣) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤)

دوسرے معنی میں حرمت اگرچہ پہلے معنی کی حرمت سے خاص تر ہے، مگر تیسرے معنی کی حرمت سے عام تر ہے۔ تیسرے معنی وہی ہیں جو مذکورہ احکامات کے قبیل سے نہیں۔ یہ بیان شیخ زادہ کا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے صرف پہلے معنی کو جو علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کیے ہیں ذکر کیا ہے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے پانچ قول نقل کیے ہیں: ایک یہ ہے کہ حرمات سے مراد اللہ پاک کے معاصی ہیں، جن سے منع فرمایا ہے، اُن کی تعظیم یہ ہے کہ اُن کی ملابست کو ترک کرے، یعنی اللہ پاک کی نافرمانیوں میں آلودہ نہ ہو، اُن سے بچے۔ دوسرا قول وہی نسفی کا پہلا قول ہے۔ تیسرا قول بعینہٖ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے، جو مذکور ہو چکا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس جگہ ﴿ حُرُمٰتِ ﴾ سے مراد مناسکِ حج ہیں، اُن کی تعظیم یہ ہے کہ اُن کو قائم کرے اور اُن کو پورا ادا کرے۔ پانچواں قول وہی قولِ سوم نسفی وغیرہ کا ہے۔ اس کی بنا پر تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کو یقینی جانے اور اعتقاد کرے کہ محرماتِ خمسہ مذکورہ کی مراعات کے ساتھ قیام واجب ہے اور اُن کی حرمت کا خیال رکھنا واجب ہے، لیکن امام خازن رحمہ اللہ نے چار چیزیں ذکر کی ہیں: بیت الحرام، بلد الحرام، مسجد الحرام، شہرِ حرام۔[2]

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں صرف دو قول ذکر کیے ہیں: ایک تو مناسکِ حج کے تمام احکام اور غیر مناسک حج کے احکام۔ دوسرا قول یہ ہے کہ احتمال ہے کہ ﴿ حُرُمٰتِ ﴾ اس شے کے ساتھ خاص ہو، جو حج سے متعلق ہو، جیسے: لڑنا جھگڑنا، جماع کرنا اور شکار کرنا۔[3] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ ﴿ حُرُمٰتِ ﴾ سے مراد افعالِ حج ہیں، جن کی طرف ﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ ﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے اور مواضع کی تعظیم اس میں داخل ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ اس کی جامع یہ بات ہے کہ یوں کہو کہ حرمات امتثالِ امر ہے، حج کے فرائض و سنن سے۔[4] فتح القدیر و فتح البیان میں فرمایا ہے کہ جو بات آیت سے ظاہر ہے، وہ یہ ہے کہ حج میں ہر حرمت کا عموم ہے اور غیر حج میں بھی، چنانچہ لفظ کی عمومیت یہی معنی دیتی ہے، گو سبب خاص ہی کیوں نہ ہو۔[5]

﴿ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ﴾ یعنی حرماتِ الٰہی کی تعظیم کرنا اس کے لیے بہتر ہے۔ ﴿ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ اس کے رب کے نزدیک ازروئے ثواب۔[6] (قاله البيضاوي) یعنی رب کے پاس اس تعظیم کا ثواب بہتر ملے گا۔ شیخ زادہ نے کہا: اس میں دلیل ہے ثوابِ موخر پر، کیوں کہ جو خیرات میں سے کوئی خیر حاصل ہو چکی ہے اس کے حق میں ﴿ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ نہیں کہتے۔ اسی واسطے امام محلی رحمہ اللہ نے اس کے بعد ''فِي الْآخِرَةِ'' مقدر نکالا ہے۔[7] فتح القدیر و فتح البیان میں فرمایا ہے کہ تعظیم اس کے لیے اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے، تمام حرمات میں سے کسی حرمت کی تحقیر کرنے سے۔ کسی نے

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٦) [3] البحر المحيط (٦/ ٣٣٩)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٣) [5] فتح القدير (٣/ ٦١٥) فتح البيان (٩/ ٤٤) [6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤)
[7] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧)

کہا ہے کہ اس جگہ صیغۂ تفضیل سے اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ تعظیم ایک خیر ہے، اس سے منتفع ہوگا، پس یہ آیت ایک خیر کا وعدہ ہے۔[1] امام حفناوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو لیا ہے کہ ایک قربت و طاعت ہے، اللہ کے پاس اس پر ثواب دیا جائے گا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں یہی دو قول لکھے ہیں۔[2]

﴿ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ﴾ انعام سے مراد اونٹ، گائے، بکری ہیں، یعنی حلال کیا گیا تمھارے واسطے اُن چوپایوں کا کھانا ذبح کے بعد، مگر وہ چوپائے جن کے حرام ہونے کے بارے میں آیت تم پر پڑھی جاتی ہے اللہ پاک کی کتاب میں۔ مراد سورۃ المائدہ کی یہ آیت ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ﴾ (اس آیت کا ترجمہ اوپر کر دیا گیا ہے)۔ اس کے پہلے یوں فرمایا: ﴿ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ [المآئدة: ١] ''تمھارے لیے چوپائے مویشی حلال کیے گئے ہیں، سوائے ان کے جن کے نام تمھیں (ابھی) پڑھ کر سنائے جائیں گے، جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار کو حلال نہ جانو۔'' معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے تمھارے واسطے سارے چوپائے حلال کر دیے ہیں، مگر وہ جن کا بیان اپنی کتاب میں کر دیا ہے، پس تم کو چاہیے کہ اس کی حدوں کو نگاہ میں رکھو اور اس کے حلال کیے ہوئے سے کسی شے کو حرام مت کرو، جس طرح کہ بعض نے بحیرہ وغیرہ کو حرام کر لیا اور اس کی حرام کی ہوئی شے کو حلال مت کرو، جس طرح کہ انھوں نے موقوذہ و میتہ وغیرہ کو حلال کر لیا۔

جبکہ اللہ پاک نے اپنی حرمات کی تعظیم پر آمادہ کیا تو اس کے بعد بتوں سے اور قولِ زور سے بچنے کا امر فرمایا: ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ بت اور جھوٹی بات بہت بڑی حرمات میں سے ہیں اور ممانعت کے لحاظ سے سب سے پہلے حرام کردہ چیزوں سے ہیں۔ ﴿ مِنَ الْاَوْثَانِ ﴾ بیان ہے ﴿ اَلرِّجْسَ ﴾ کا۔ ﴿ اَلرِّجْسَ ﴾ پلیدی کو کہتے ہیں، یہ ایک مبہم شے ہے، بہت سی چیزیں اس میں شامل ہیں، گویا یوں فرمایا گیا کہ تم بچو اس پلیدی سے جو کہ بت ہیں۔ بتوں کا نام ''رِجس'' بطورِ تشبیہ کے رکھا، یعنی جس طرح تم طبعًا پلیدی سے نفرت کرتے ہو، اسی طرح تم پر لازم ہے کہ بتوں سے نفرت کرو۔ زور کہتے ہیں کذب و بہتان کو، یا مراد جھوٹی گواہی ہے۔ زُور زَور سے ماخوذ ہے، زَور انحراف اور مائل ہونے کو بولتے ہیں۔ شرک اور قول زور کے درمیان اس لیے جمع کیا کہ شرک بھی زُور کے باب سے ہے، کیوں کہ مشرک اس بات کا زعم کرتا ہے کہ بت عبادت کے لائق ہے، حالاں کہ یہ بات زور وکذب ہے، بت کو پوجے جانے سے کیا واسطہ، وہ تو جماد ہے نہ حرکت کرے نہ

[1] فتح القدير (٣/ ٦١٥) فتح البيان (٩/ ٤٤) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٤)

بولے، ایسے کو کیا پوجنا؟! یہ حاصل ہے علامہ نسفی رحمہ اللہ کے بیان کا۔[1]

شیخ زادہ نے امام بیضاوی رحمہ اللہ کا حاصل یہ لکھا ہے: چونکہ جائز تھا کہ خیال اس طرف جائے کہ احرام نے جبکہ شکار کو حرام کر دیا جس کا قتل جائز تھا تو وہ چوپایوں کو حرام کر دے گا، اس واسطے اللہ پاک نے بیان فرما دیا کہ احرام چوپایوں کو حرام نہیں کرتا ہے، وہ جس طرح غیر محرم کے واسطے حلال ہیں، اسی طرح محرم کے لیے بھی حلال ہیں۔ پھر جو چوپائے بوجہ عارض حرام ہوگئے ان کا استثنا فرمایا، جیسے: مردار جانور اور ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾۔ اوثان اور قولِ زور سے بچنے کا حکم ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ﴾ پر متفرع کیا، باوجود اس کے کہ ان دونوں سے بچنا تعظیمِ حرمات اللہ میں داخل ہے، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ منظور آگاہ کرنا ہے، اس بات پر کہ توحید و صدق قولِ اعظم حرمات سے ہے اور شرک اور قولِ زور کو ایک رشتے میں جمع فرمایا، اس واسطے کہ شرک بابِ زور سے ہے، بلکہ وہ تو سر ہے زُور کا، کیوں کہ وہ اس بات کا زعم کرنا ہے کہ وثن کے واسطے عبادت کا حق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جاہلیت والے اپنے تلبیہ میں یوں کہا کرتے تھے کہ "لبيك لا شريك لك لبيك إلا شريكا لك تملكه وما ملك"۔ تو گویا یوں کہا گیا کہ تم بتوں کے پوجنے سے بچو، جو کہ سر ہے زور کا اور ہر قسم کے قولِ زُور سے پرہیز کرو، اس میں سے کسی شَے کے پاس مت پھٹکو۔ پھر تمھارا اس شے کے بارے میں کیا گمان ہے جو عبادتِ اوثان کی قبیل سے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ﴾ اور ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ فرمایا: اس سے غرض تحریم بحائر و سوائب کا رد کرنا ہے کہ جس پر کفار جمے ہوئے تھے اور اس کے بعد ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ ذکر کیا اور اس کے پیچھے ﴿وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ فرمایا۔ مقصود اس سے ان کے افترا کا رد کرنا ہے۔ وہ لوگ اللہ پاک پر جھوٹ باندھتے تھے کہ اس نے اس کا حکم دیا ہے۔ حالاں کہ یہ محض ان کی افترا پردازی ہے، اس واسطے صاف فرما دیا کہ تم شرک سے اور جھوٹی بات سے بچو، اللہ پاک کو کیا پڑی ہے کہ ایسی خرافات باتوں کا حکم دے، وہ اس افترا سے بَری اور پاک ہے۔

﴿اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ میں کلمۂ ﴿مَا﴾ موصولہ ہے اور مسند الیہ ﴿يُتْلٰى﴾ کا محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إلا المتلو عليكم تحريمه، أي آية تحريمه في سورة المائدة"۔ استثناء میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ استثنا متصل ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مستثنیٰ وہ چوپائے ہیں جو کسی عارض کے سبب سے حرام ہوگئے ہیں، جیسے: موت۔ یا ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کیوں کہ مرا ہوا جانور اور غیر اللہ کے نام پر پکارا ہوا انعام میں داخل ہے اور عارضہ وغیرہ سے حرام ہو گیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ استثنا منقطع

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٣) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤)

ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ المائدہ کی آیت میں جو مذکور ہے وہ انعام کی جنس سے نہیں ہے، جیسے: دم اور لحمِ خنزیر۔ کسی نے کہا: وجہ انقطاع کی یہ ہے کہ انعام میں کوئی محرم نہیں ہے، کیوں کہ انعام یہی اونٹ گائے بکری ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اس قول کو پہلے لکھا ہے اور پہلے قول کو بلفظِ "یجوز" ذکر کیا ہے۔[1]

اب رہی یہ بات کہ ﴿ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ ﴾ کو حج سے کیا تعلق ہے، لہٰذا اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ حج میں ذبح ہوتا ہے، اس لیے جس جانور کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا حلال ہے، اس کا بیان کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ یعنی حالتِ احرام میں شکار کرنا درست نہیں ہے، لہٰذا بیان فرما دیا کہ شکار کرنا درست نہیں، باقی چوپائے درست ہیں، اللہ کا نام لے کر ذبح کرو اور کھاؤ۔ یہ دونوں باتیں امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔[2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: "رجس" کی اصل لغت میں قذر واؤ ساخ ہے، یعنی پلیدی اور میل کچیل کو "رجس" کہتے ہیں۔ بتوں کی عبادت معنوی گندگی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: "رجس" شَے قذر ہے، یعنی پلید چیز اور وثن لکڑی لوہے یا سونے چاندی وغیرہ کی تمثال وصورت کو کہتے ہیں، عرب لوگ ان صورتوں کو کھڑا کرتے تھے اور اُن کو پوجتے تھے۔ نصاریٰ صلیب کو نصب کرتے ہیں اور اس کی عبادت و تعظیم کرتے ہیں۔ صلیب بھی مثل تمثال کے ہے۔ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور میری گردن میں سونے کی صلیب تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَلْقِ هَذَا الْوَثَنَ عَنْكَ »[3] مراد صلیب ہے، یعنی تو اس کو خود سے ڈال دے۔ وثن کی اصل اس محاورے سے ہے: "وثن الشيء، أي أقام في موضعه" یعنی جب کوئی شے اپنی جگہ میں قائم ہوتی ہے تو کہتے ہیں: "وثن الشيء" یعنی وہ اپنی جگہ میں قائم ہوگئی۔

صنم کا نام وثن اس لیے رکھا کہ وہ اپنی جگہ میں منصوب ومرکوز ہوتا ہے، اس سے ٹلتا نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ بتوں کی عبادت سے بچو، یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابن جریج رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ بتوں کا نام "رجس" اس لیے رکھا، کیوں کہ وہ رجز کا سبب ہیں اور رجز بہ معنی عذاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے بتوں کو "رجس" کے ساتھ موصوف فرمایا اور "رجس" بہ معنی نجس ہے، لہٰذا بت حکماً نجس ہیں۔ نجاست ان کا ذاتی وصف نہیں، صرف احکامِ ایمان میں سے ایک شرعی وصف ہے، پس وہ زائل نہیں ہوتا، مگر ایمان سے جس طرح کہ حسی نجاست زائل نہیں ہوتی، مگر پانی سے۔[4] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ اجناس میں سے ایک

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٩٣) [4] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٤)

جنس کی تخلیص کے لیے ہے۔[1]

(امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: " مِنْ لبيان الجنس، أي اجتنبوا الرجس من هذا القبيل وهو بمعنى ابتداء الغاية هنا"[2] یعنی تم بچو رجس سے جو کہ بت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پلیدی بہت قسم کی ہوتی ہے، لہٰذا اس میں سے ایک قسم کی پلیدی کو علاحدہ کر کے بیان کر دیا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقط رجسِ اوثان سے ممانعت واقع ہوگی، اس کے سوا باقی پلیدیاں رہ جائیں گی، ان کی ممانعت دوسری جگہ ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من ابتدائے غایت کے واسطے ہو، گویا عموماً رجس سے اُن کو منع کیا، پھر اُن کے لیے رجس کا مبدا معین کیا کہ جس سے ان کو رجس لاحق ہوتا ہے، کیوں کہ بت کی پوجا ہر فساد اور پلیدی کا مجموعہ ہے اور جس شخص کا یہ قول ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے تو اس نے آیت کے معنی کا قلب کر دیا اور اس کو فاسد کر ڈالا۔[3]

امام محلی، بیضاوی اور نسفی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں کہ ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے،[4] یعنی پلیدی سے بچو، کون سی پلیدی، وہ بت ہیں۔ جس طرح نجاستوں سے بچتے ہیں، اسی طرح بتوں سے بچو۔ بتوں کی تعظیم سے منع کرنے میں اور اُن کی عبادت میں نفرت دلانے میں اس طرز کا بیان انتہائی درجے کا مبالغہ ہے کہ اس سے بڑھ کر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَاجْتَنِبُوا ﴾ کا حرفِ فا تفریعیہ ہے۔ ﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ ﴾ پر تفریع ہے، جبکہ حدودِ الٰہی کی حفاظت اور شرک کو ترک کرنے کی رغبت دلائی تو اس سے یہ بات متفرع ہوئی کہ بتوں کی عبادت سے اجتناب کرو، خالص پکے موحد بن جاؤ، صرف اللہ پاک کو پوجو۔[5]

﴿ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴾ تعمیم بعد تخصیص ہے، کیوں کہ بتوں کی عبادت سر ہے زُور کا۔ زُور کے معنی باطل اور کذب ہیں۔ کذب کا نام زور اس واسطے رکھا گیا کہ کذب حق سے مائل ہوتا ہے۔ زور ماخوذ ہے زَور سے۔ زَور کے معنی ہیں: انحراف، جس طرح کہ اِفک ماخوذ ہے اَفک سے، اَفک بہ معنی صرف، چوں کہ کذب واقع ہوتا ہے اور نفس الامر سے منحرف و مائل ومصروف ہوتا ہے، اس لیے اس کو زور و افک بولتے ہیں۔ اسی باب سے اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ تَزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ﴾ [الكهف: ١٧] "ان کے غار سے دائیں طرف ہٹ جاتا ہے۔" یعنی سورج وقت طلوع وغروب کے اصحابِ کہف کے غار سے منحرف ہو کر اور کترا کر دائیں بائیں جانب کو چلتا ہے، تا کہ ان کو دھوپ کی ایذا نہ پہنچے۔

مدنیۂ زوراء بھی اسی باب سے ہے، یعنی مائل۔ جو شے حق کے سوا ہے وہ کذب و باطل و زُور ہے۔ اس جگہ قول زور سے مراد عموم ہے، یعنی ہر قول جو واقع سے منحرف ومصروف ہو، برابر ہے کہ قبیلِ شہادت سے ہو یا نہ ہو اور سب

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٤٢٥) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤١) [3] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٤)

[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٤) تفسير النسفي (٢/ ١٠٣)

[5] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٢٩٤)

سے بڑا زُور اللہ پاک کے ساتھ شرک کرنا ہے، کسی بھی لفظ سے کیوں نہ ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ قولِ زُور سے مراد یہ ہے کہ کفار بعض چوپایوں کو حلال کرتے اور بعض کو حرام، اور یوں کہتے کہ "هذا حلال وهذا حرام"۔[1] کسی نے کہا: مراد جھوٹی گواہی ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے دو قول ذکر کیے ہیں: ایک یہ ہے کہ کفار اپنے تلبیہ میں شرک باللہ کرتے تھے۔ دوسرا شہادتِ زُور۔[2]

﴿حُنَفَآءَ لِلّٰهِ﴾ کلمہ ﴿حُنَفَآءَ﴾ اضداد سے ہے، استقامت و میل دونوں پر واقع ہوتا ہے۔ اسی واسطے امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر "مسلمين عادلين عن كل دين سوى دينه"[3] کی ہے، یعنی اسلام لانے والے مائل ہونے والے ہر دین سے سوائے اس کے دین کے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے "مستقيمين أو مسلمين مائلين إلى الحق" کہا ہے۔[4] امام بیضاوی اور خازن رحمہما اللہ کی تفسیر "مخلصين له" ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کی صرف "مسلمين" ہے۔[5] فتح القدیر میں "مستقيمين على الحق أو مائلين إلى الحق" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿حُنَفَآءَ﴾ کے معنی "حجاجا" ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: "هذا تخصيص لا حجة فيه"۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی امام قرطبی رحمہ اللہ کی پیروی کر کے اس کا قول نقل کرنے کے بعد کہا ہے: "ولا وجه لهذا"۔[6] ترکیب میں ﴿حُنَفَآءَ﴾ حال ہے ﴿وَاجْتَنِبُوْا﴾ کی ضمیر سے۔ اسی طرح ﴿غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ﴾ بھی حال ہے۔ (لیکن پہلا حال مؤسسہ ہے اور دوسرا حال مؤکدہ، چناں چہ امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے،[7]) یعنی درآں حالیکہ اللہ پاک کے ساتھ شریک کرنے والے نہ ہو اشیا میں سے کسی شے کو۔ چنانچہ حذفِ مفعول اس عموم کا مفید ہے۔ امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "حُجَّاجاً لله غير مشركين به"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت والے شرک کرتے ہوئے حج کیا کرتے تھے۔ پھر جب اللہ پاک نے اسلام کو غالب کیا تو مسلمانوں نے فرمایا کہ اب تم حج کرو، اس حال میں کہ اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے نہ ہو۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔[8] اگر یہ دونوں روایتیں پایۂ صحت کو پہنچی ہوئی ہیں تو پھر اس قول کو بے وجہ کہنے کی کیا وجہ؟! غایت درجہ یہ ہے کہ سببِ خاص میں نزول ہوا ہے، لیکن عموم مراد ہے، جس طرح کہ اکثر آیات میں ہوا کرتا ہے، مگر بے وجہ کہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ والله أعلم.

چوں کہ اللہ پاک نے اول شرک سے بچنے کا حکم دیا، اس لیے اس کے بعد مشرک کی ایک مثال بیان فرمائی،

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٤٢٥) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ٥٥) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٥) تفسير الخازن (٥/ ١٧) تفسير النسفي (٣/ ١٠٣)
[6] فتح القدير (٣/ ٦١٥) تفسير القرطبي (١٢/ ٥٥) [7] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) [8] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩١)

کیوں کہ مثال سے ہر شے کی بھلائی یا برائی خوب ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ﴾ یہ جملہ مبتدا ہے، امر بالا جتناب کی تاکید کرتا ہے، یعنی شرک سے بچو، شرک بہت ہی بری چیز ہے اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا زمین کی طرف، کیوں کہ ایمان کی بلندی سے کفر کی پستی اور گڑھے کی طرف گر پڑا۔

﴿ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ ﴾ پھر جھپٹ لیتے ہیں اس کو پرندے، اس لیے کہ اس کی مہلک خواہشیں اس کی فکروں کو متفرق و پریشان کر ڈالتی ہیں۔ "خطف" تیزی سے پکڑ لینے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "خطفه يخطفه إذا سلبه" اسی باب سے ہے: ﴿ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ﴾ [البقرة: ٢٠] "قریب ہے کہ بجلی اُچک لے جائے ان کی آنکھیں۔" مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ آسمان سے گرا تو پرندے اپنے پنجوں سے اس کے گوشت کو جھپٹ لیتے ہیں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ امام ابوجعفر اور نافع نے طا کی شد اور خا کی فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] اصل اس کی "تخطفه" تھی، پھر ادغام ہو گیا۔ دوسری قراءت بکسرِ خا اور طا ہے۔ تیسری بکسرِ تا مع کسرۂ خا اور طا ہے۔ چوتھی بسکون خا اور تخفیف طا۔

﴿ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ﴾. ﴿ تَهۡوِىۡ بِهِ ﴾ کے معنی ہیں: "تسقطه" یا "تقذفه و ترمي به۔" ﴿ سَحِيۡقٍ ﴾ کے معنی ہیں بعید۔ جب کوئی شخص دور چلا جاتا ہے تو عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "سحق يسحق سحقا فهو سحيق" اسی باب سے اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ فَسُحۡقًا لِّاَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ ﴾ [الملك: ١١] "چناں چہ دوزخ والوں پر لعنت ہے۔" اور نبی اکرم ﷺ کا قول: « فَسُحْقًا سُحْقًا »[2]۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے یہ بات بتا دی کہ جس شخص نے اللہ پاک کے ساتھ شرک کیا، اس کی دوری حق سے اس شخص کی سی دوری ہے جو آسمان سے گر پڑا، پھر اس کو پرندے لے جاتے ہیں، یا لے ڈالا اس کو ہوا نے کسی دور کی جگہ میں۔[3]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ شیطان نے اس کو حیران کر دیا، اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ کلمۂ ﴿ اَوۡ ﴾ تخییر کے واسطے ہے، جس طرح کہ ﴿ اَوۡ كَصَيِّبٍ ﴾ میں ہے۔ یا تنویع کے لیے ہے، کیوں کہ مشرکوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کے واسطے ہرگز کسی طرح کی خلاصی نہیں ہے اور بعض ایسے ہیں کہ توبہ سے اُن کی خلاصی ممکن ہے، لیکن دوری پر۔[4] مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں تشبیہ مفرق کی تشبیہ کے قبیل سے ہے، اس واسطے کہ مشبہ و مشبہ بہ کی دونوں طرفوں سے ہر ایک طرف متعدد اُمور ہیں۔ مشبہ بہ کی طرف میں سے ہر امر کی تشبیہ دی ہے مشبہ بہ کی طرف میں کے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦١٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩)
[3] معاني القرآن (٣/ ٤٢٥) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٥)

ہر امر کے ساتھ۔ دیکھو مشبہ کی طرف میں ایمان، شرک، اہوا اور شیطان ہیں اور مشبہ بہ کی طرف میں آسمان اور آسمان سے گرنے والا اور پرندے اُچکنے والے اور ہوا۔ ایمان کی تشبیہ دی آسمان سے علو و بلندی میں اور مشرک جو اپنی اصلی فطرت کے سبب سے ایمان پر قادر اور متمکن تھا، سو اس کی تشبیہ اس شخص سے دی جو آسمان کی طرف چڑھا اور اس سے گر پڑا۔ اور جن اہوا اور خواہشوں نے اس کے افکار کو متفرق کر ڈالا، ان کی تشبیہ دی جھپٹنے والے پرندوں سے اور شیطان نے جو اس کو گمراہی کے جنگلوں میں حیران و سرگردان کیا، اس کی تشبیہ اس ہوا سے دی جو اپنی اُڑائی ہوئی شے کو کسی مہلک گڑھے میں لے جا کر ڈال دیتی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تشبیہ مرکب کے باب سے ہو۔ تشبیہ مرکب کے یہ معنی ہیں کہ چند مختلف چیزوں کی طرف قصد کیا جائے، پھر ان سے ایک ہیئت انتزاع کی جائے اور اس کو مشبہ یا مشبہ بہ قرار دیا جائے اور اسی واسطے صاحبِ مفتاح نے تشبیہ مرکب بمرکب میں یہ تصریح کی ہے کہ مشبہ و مشبہ بہ میں سے ہر ایک ایک ہیئت منتزعہ ہو۔ اب آیت میں سمجھنا چاہیے کہ تشبیہ مرکب بمرکب کیوں کر واقع ہوئی؟ پس صورت اس کی یہ ہے کہ مشبہ تو مشرک باللہ تعالیٰ کو قرار دیا اور مشبہ بہ اس شخص کو ٹھہرایا جو آسمان سے گر پڑا، پھر اس وقت اس کو پرندوں نے جھپٹ لیا، یا ہوا نے اس کو کسی دور جگہ میں لے جا کر ڈال دیا، دونوں طرفین تشبیہ کی مرکب ہیں۔ مشبہ بہ کا مرکب ہونا ظاہر ہے۔

رہا مشبہ تو اس کی ترکیب اس طرح ہے کہ مشرک وہ شخص ہے جس نے اللہ پاک پر ایمان لانے کو ترک کیا اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا۔ اگر کوئی کہے کہ سماء، طیر اور ریح اس لائق ہیں کہ استعارہ ہو، کیوں کہ ان میں مشبہ بہ کے ذکر کے ساتھ اکتفا ہوا ہے تو کہیں گے: ﴿خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ کے مجموع میں اداۃِ تشبیہ داخل ہوا ہے اور استعارہ اسی وقت ہوتا ہے کہ کلام حرفِ تشبیہ سے خالی ہوتا ہے، غرض کہ تشبیہ مرکب کی بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص اللہ پاک کے ساتھ شرک کرتا ہے تو بے شک اس کی جان ہلاک ہوئی، ایسی ہلاک کہ دو ہلاک میں سے ایک کے مشابہ ہے۔ امام زمخشری، نسفی اور بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی یہی دو صورتیں ذکر کی ہیں۔[1] امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿خَرَّ﴾ بہ معنی "یخر" ہے، اسی واسطے "تَخْطَفُهُ" اس پر معطوف ہوا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر یوں ہو: "فهو یخطفه" تو اس صورت میں اس جملے کا عطف پہلے جملے پر ہوگا۔[2]

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝۳۲
لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝۳۳

[1] الكشاف (٣/ ١٥٧) تفسير النسفي (٣/ ١٠٣۔ ١٠٤) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٥) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤١)

یہی (حکم) ہے، اور جو شخص اللہ کی (عظمت کی) نشانیوں کی تعظیم کرے، تو بلاشبہ یہ دلوں کی پرہیز گاری سے ہے (32) تمھارے لیے ان (چوپایوں) میں ایک مقرر وقت تک منافع ہیں، پھر ان کے حلال (ذبح) ہونے کی جگہ قدیم گھر (بیت اللہ) کے پاس ہے (33)

شعائر اللہ کی تعظیم اور قربانی کے جانوروں کی صفات کا بیان:

جتنے مویشی ہیں ان کا حق یہی ہے کہ کام لے لیجیے، پھر کعبے کے پاس لے جا کر چڑھا دیجیے، مگر یہ بات دشوار ہے تو جہاں "بسم الله الله أكبر" کہا اور ذبح کیا، یہ نشان ہے کہ اللہ کی نیاز کعبے کو چڑھا یا دور یا نزدیک ہو۔ انتہیٰ.

اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ ذٰلِكَ ﴾ "أي هذا" یعنی یہ احکام جو مذکور ہوئے ان کو لو۔ ﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد اللہ پاک کے احکام ہیں، یعنی جو کوئی تعظیم کرے، بڑائی رکھے اللہ کے حکموں کی ﴿ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ تو وہ دلوں کی پرہیز گاری سے ہے اور اسی باب سے ہے تعظیم ھَدَایَا و بُدن کی، جیسا کہ حکم نے عن مقسم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے: "تعظيمها استسمانها واستحسانها"[1] یعنی ہدیوں و بُدنوں کی تعظیم یہ ہے کہ ان کو موٹا فربہ اور اچھا خوبصورت منتخب کر کے خریدے۔ ("هدايا" "هدی" کی جمع ہے۔ "هدي" اس قربانی کو کہتے ہیں جسے حرم میں بھیجتے ہیں اور "بُدُنَ" "بَدُنَه" کی جمع ہے۔ "بَدُنَه" قربانی کے اونٹ یا گائے کو کہتے ہیں، جسے مکے میں قربانی کرتے ہیں۔ كذا في الصراح۔) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ عن ابن ابی نجیح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ہیں کہ "الاستسمان والاستحسان والاستعظام"[2] یعنی ہدیوں بدنوں کی تعظیم یہ ہے کہ اُن کو فربہ موٹا خوبصورت بڑے جسم کا چن کر لے۔ دُبلا، بدشکل چھوٹا نہ خریدے۔ (هكذا أخرجه ابن أبي شيبة و ابن جرير و ابن المنذر عنه، كذا في فتح القدير)[3]

(خلاصہ اسمائے رجال کی عبارت کا یہ ہے: "(ع) أسعد بن سهيل بن حنيف الأوسي الأنصاري أبو أمامة المدني، ولد في حياة النبي ﷺ، وروي عنه مرسلًا في (س ق)، و عن أبيه و عائشة، وعنه الزهري ويحيىٰ بن سعيد الأنصاري و ابناه محمد وسهل ابنا أبي أمامة، توفي سنة مائة وله مائة سنة، وقيل: اثنتان وتسعون" انتهىٰ.) ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم مدینے میں اُضحیہ کو فربہ کیا کرتے تھے اور مسلمان لوگ بھی فربہ کیا کرتے تھے۔[4] (رواه البخاري)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: « دَمُ عَفْرَاءَ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ دَمِ سَوْدَاوَيْنِ »[5] (رواه أحمد و ابن ماجة) یعنی سپید اُضحیہ کا خون زیادہ محبوب ہے اللہ کو دو سیاہ اُضحیہ سے۔ کہا ہے کہ عفراء

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٢) [3] فتح القدير (٣/ ٦١٨)
[4] صحيح البخاري (٥/ ٢١١١) [5] مسند أحمد (٢/ ٤١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٦١)

سفید کو کہتے ہیں، لیکن خالص سفید نہ ہو۔ (جیسے روئے زمین کا رنگ ہوتا ہے۔) اس سے معلوم ہوا کہ سفید غیر سفید سے افضل ہے اور غیر سفید بھی کفایت کرتا ہے، اس لیے کہ صحیح بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دُنبے چتکبرے سینگ والے قربانی فرمائے۔ (حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: «ضَحَّى بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ أَقْرَنَيْنِ»[1] املح وہ ہے جس کی سفیدی سیاہی سے زیادہ ہو۔ کسی نے کہا: خالص سفید۔[2] (كذا في مجمع البحار) سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: «أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ ضَحَّى بِكَبْشٍ أَقْرَنَ فَحِيلَ يَأْكُلُ فِي سَوَادٍ يَنْظُرُ فِي سَوَادٍ وَيَمْشِي فِي سَوَادٍ»[3] (رواه أهل السنن وصححه الترمذي أي فيه بلق سواد في هذه الأماكن) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سینگ والے دُنبے کی قربانی فرمائی، جس کے پلک چشم خلقی سیاہ تھے۔ کھاتا تھا سیاہی میں اور دیکھتا تھا سیاہی میں اور چلتا تھا سیاہی میں، یعنی اس کی ان جگہوں میں سیاہی تھی۔ غرض یہ ہے کہ ابلق چت کبرا تھا۔

سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ «أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ ضَحَّى بِكَبْشَيْنِ عَظِيمَيْنِ سَمِينَيْنِ أَقْرَنَيْنِ أَمْلَحَيْنِ مُوْجُوءَيْنِ»[4] یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دُنبے بڑے موٹے سینگ والے چت کبرے خصی قربانی فرمائے۔ اسی طرح امام ابو داود اور ابن ماجہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ «ضَحَّى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِكَبْشَيْنِ أَقْرَنَيْنِ أَمْلَحَيْنِ مَوْجُوءَيْنِ»[5] کہا ہے کہ "موجوءین" بہ معنی "خصیین" ہے۔ (خصی دنبے قربانی کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خصی خوب فربہ ہوتا ہے، گوشت بہت نکلتا ہے اور قربانی میں گوشت کی کثرت مقصود ہوتی ہے۔ والله أعلم۔) کسی نے کہا: "موجوءین وہ ہیں جن کے خصیے کچل دیے گئے اور کاٹے نہ گئے۔ والله أعلم۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا: «أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْأُذُنَ وَأَنْ لَّا نُضَحِّيَ بِمِقَابَلَةٍ وَّلَا مُدَابَرَةٍ وَّلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ»[6] (رواه أحمد و أهل السنن وصححه الترمذي، ولهم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٦) [2] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٦٠٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٨) مستدرك الحاكم (٤/ ٢٥٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٢) یہ روایت سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ البتہ "مسند أحمد" (٦/ ٨) میں سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٦٠)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢١) مسند أبي يعلىٰ (٣/ ٣٢٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ٤/ ١٩)

[6] مسند أحمد (١/ ١٠٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٦١_٣٦٤)

عنه قال: «نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نُّضَحِّيَ بِأَعْضَبِ الْقَرْنِ وَالْأُذُنِ»[1] یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم خوب غور سے قربانی کے جانور کی آنکھ اور کان کو دیکھیں اور قربانی نہ کریں مقابلہ کی نہ مدابرہ کی اور نہ شرقا کی نہ خرقا کی اور منع فرمایا ہے نبی اکرم ﷺ نے اس بات سے کہ ہم قربانی کریں سینگ اور کان کٹے ہوئے جانور کی۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عضب آدھا کان ہے اور اس سے زیادہ، یعنی اگر آدھا کان یا سینگ کٹا ہوا ہے یا اس سے زیادہ تو ممنوع ہے اور اس سے کم ہے تو جائز ہے۔ بعض اہلِ لغت نے یوں کہا ہے کہ اگر بکرے وغیرہ کا اوپر کا سینگ ٹوٹ گیا ہے تو وہ قصماء ہے۔ رہا عضب، پس وہ اسفل جانب کا ٹوٹنا ہے اور عضبِ اذن بعض کان کے کاٹنے کو کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے ساتھ اضحیہ کافی ہے، لیکن مکروہ ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سینگ اور کان کٹے ہوئے کے ساتھ اضحیہ کافی نہیں ہوتا، بہ سبب اسی حدیث شریف کے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ سینگ سے اگر خون بہتا ہو تو کافی نہیں ہے، ورنہ کافی ہے۔ واللّٰه أعلم۔ رہے مقابلہ، پس وہ بکری وغیرہ ہے جس کے کان کے اوپر کا حصہ کاٹ دیا گیا اور مدابرہ وہ ہے جس کے کان کے موخر سے کاٹ دیا گیا ہے۔ شرقاء وہ ہے جس کا دن طول میں کاٹا گیا ہے، یہ بات امام شافعی اور اصمی رحمہما اللہ نے فرمائی ہے۔ اور خرقاء وہ ہے کہ "خرقت السمة أذنها خرقا مدورا" یعنی جس آلے سے بکری وغیرہ کے کان میں چیر کر علامت کرتے ہیں۔ لہٰذا خرقاء وہ ہے جس کے کان میں اس آلے نے چیر کر گول شگاف کر دیا ہو۔ واللّٰه أعلم.

سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَرْبَعٌ لَا تَجُوْزُ فِي الْأَضَاحِيْ: اَلْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا وَالْمَرِيْضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَالْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ضَلْعُهَا وَالْكَسِيْرَةُ الَّتِيْ لَا تُنْقِيْ»[2] (رواه أحمد و أهل السنن و صححه الترمذي) یعنی چار طرح کے مویشی قربانیوں میں جائز نہیں: ایک تو کانا جس کا کانا پن کھلا ہوا ہے۔ دوسرے بیمار جس کی بیماری ظاہر ہے۔ تیسرے لنگڑا جس کا لنگڑا پن کھلا ہوا ہے۔ چوتھے ضعیف کہ مارے ضعف کے اس میں گودا باقی نہیں رہا ہے۔ یہ عیوب گوشت کو کم کرتے ہیں بہ سبب ضعف کے، اور عاجز ہونے کی وجہ سے پورے طور پر چارہ نہیں کھا سکتا، کیوں کہ بکریوں کو چراگاہ کی طرف سبقت کر کے لے جاتے ہیں، یعنی اور بکریاں تو سبقت کر کے خوب چر لیتی ہیں اور اس قسم کی بکریاں ضعف کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہے اور اچھی طرح چرنے سے عاجز ہوتی ہیں۔ پس اسی لیے امام شافعی وغیرہ ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک اس قسم کی بکریوں کے ساتھ قربانی کرنا کافی نہیں

---

[1] مسند أحمد (١/ ٨٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو ضعیف کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٦١۔ ٣٦٤)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٨٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٨٦)

ہوتا ہے (اور اسی طرح گائے اور اونٹ کا حکم ہے)۔

چناں چہ ظاہر حدیث یہی ہے۔ اور جو بکری وغیرہ خفیف سے مرض کی وجہ سے مریض ہے، اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول مختلف ہے۔ اس میں اُن کے دو قول ہیں؛ امام ابو داود نے عتبہ بن عبد السلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ «أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُصْفَرَةِ وَالْمُسْتَأْصِلَةِ وَالْخِقَاءِ وَالْمُشَيَّعَةِ وَالْكَسِيْرَةِ» [1] پس مصفرہ کسی نے کہا ہے کہ دبلی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جڑ سے کان کٹی ہوئی ہے اور مستاصلہ سینگ ٹوٹی ہوئی ہے اور نجقاء کانی ہے اور مشیعہ وہ ہے جو ہمیشہ بکریوں کے گلے سے پیچھے چلتی ہے، ضعف کے مارے اُن کے ساتھ چل نہیں سکتی اور کسیرہ لنگڑی کو کہتے ہیں۔ پس یہ سارے عیب قربانی کے کافی ہونے سے مانع ہیں۔

پھر اگر اضحیہ کے معین کر لینے کے بعد کوئی عیب پیدا ہوا ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ بات مضر نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اس میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے ایک دنبہ خریدا کہ اس کی قربانی کروں، پھر بھیڑیا دوڑ پڑا تو اس دُنبے کی چکتی لے گیا، میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اس کی قربانی کر۔ [2] اور اسی واسطے حدیث شریف میں یوں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم آنکھ اور کان کو خوب غور کر کے دیکھ لیں، [3] یعنی ہدیہ یا اضحیہ فربہ خوبصورت قیمتی ہو، جیسا کہ امام احمد و ابو داود نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عمدہ اونٹنی کو ہدیہ کیا، پھر اس کے عوض اُن کو تین سو دینار ملے تو وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی: یارسول اللہ! میں نے ایک عمدہ اونٹنی کا ہدیہ کیا، پھر اس کے عوض مجھے تین سو دینار ملے۔ پس کیا میں اسے بیچ ڈالوں اور اس کی قیمت سے کئی بُدنے خرید لوں۔ فرمایا: نہیں، خاص اسی کو نحر کر۔ [4]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بُدنے اللہ کے شعائر سے ہیں۔ محمد بن ابی موسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وقوف، یعنی عرفات میں ٹھہرنا اور مزدلفہ و جمار و رمی و حلق و بُدنے اللہ کے شعائر سے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تمام شعائر سے زیادہ محترم بیت اللہ شریف ہے۔ [5]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ ﴾ یعنی بُدنوں میں تمھارے لیے نفع ہیں، یعنی اُن کے دودھ اور پشم اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٣) اس کی سند میں ''ابوحمید رعینی اور یزید'' مجہول راوی ہیں۔ (ضعيف أبي داود: ٢/ ٣٧٦)

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٢) اس کی سند میں ''محمد بن قرظہ'' مجہول اور جابر جعفی ضعیف راوی ہے۔

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] مسند أحمد (٢/ ١٤٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٥٦) اس کی سند میں ''جہم بن جارود'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف أبي داود: ٢/ ١٤٦)

[5] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٤)

بال اور اُن پر سوار ہونا۔ ﴿ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ مقسم (بكسر أوله و سكون ثانيه ابن بجرة بضم الموحدة، أو ابن نجدة بنون مولى عبد الله بن الحارث بن نوفل عن عائشة و أم سلمة، و لزم ابن عباس رضي الله عنهما فنسب إليه بالولاء، وعنه ميمون بن مهران والحكم بن عتيبة و طائفة، قال أبو حاتم: لا بأس به، قال ابن سعد: توفي في سنة إحدى ومائة، له في البخاري فرد حديث) نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ جب تک وہ بُدن نے نام نہیں رکھے گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: سورار ہونا اور دودھ اور اولاد، پھر جس وقت اُن کا نام بدنہ یا ہدیہ رکھا گیا تو یہ سب جاتا رہا۔ امام عطا، ضحاک، قتادہ اور عطا خراسانی رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] (أخرج ابن أبي حاتم عن ابن عباس رضي الله عنهما في قوله تعالىٰ: ﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ ﴾ قال: البدن، و أخرج ابن أبي شيبة و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن ابن عباس رضي الله عنهما في قوله تعالىٰ: ﴿ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ قال: إلى أن تسمى بدنا، و أخرج هؤلاء عن مجاهد نحوه، وفيه قال: ﴿ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ في ظهورها وألبانها و أوبارها (جمع وبر بمعنى پشم) و أشعارها و أصوافها إلى أن تسمى هديا، فإذا سميت هديا ذهبت المنافع ﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ ﴾ يقول حين تسمى ﴿ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾، و أخرج عبد بن حميد و ابن المنذر عن عكرمة قال: إذا دخلت الحرم فقد بلغت محلها، كذا في فتح القدير)[2]

دوسرے لوگوں نے کہا: بلکہ اس کے واسطے جائز ہے کہ ان سے نفع لے گو وہ ہدی ہوگئی، جبکہ وہ اس کا حاجت مند ہو، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ بُدنہ کو ہانک رہا ہے۔ فرمایا: اس پر سوار ہو جا۔ عرض کی کہ وہ تو بُدنہ ہے۔ فرمایا: اس پر سوار ہو جا، "وَيْحَكَ" یعنی تیری خرابی ہو۔ یہ کلمہ دوسری بار میں یا تیسری بار میں فرمایا۔[3] صحیح مسلم کی روایت میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِرْكَبْهَا بِالْمَعْرُوْفِ إِذَا أُلْجِئْتَ إِلَيْهَا»[4] یعنی جس وقت تو بُدنے پر سوار ہونے کی طرف مضطر ہو تو اس پر دستور کے موافق سوار ہو جا۔ غرض یہ ہے کہ ضرورت کے وقت ذرا دیر بیٹھ لے، پھر اتر پڑے، یہ نہیں کہ سارے راستے میں سوار ہی رہے۔ شعبہ نے بسندِ خود علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو اونٹ ہانکتے ہوئے دیکھا اور اس کے ہمراہ اس کا بچہ تھا تو فرمایا کہ تو اس کے دودھ سے مت پینا، مگر وہ دودھ جو اس کے بچے سے فاضل رہ جائے، پھر جب نحر کا دن ہو تو اس کو اور اس کے بچے کو ذبح کر دینا۔

﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ یعنی ہدی کا محل اور اس کی انتہا بیتِ عتیق تک ہے، اس سے مراد کعبہ ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾ [المآئدة: ٩٥] "یہ (فدیہ) بطور قربانی کعبہ پہنچایا جائے گا۔" نیز فرمایا ہے: ﴿ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ﴾ [الفتح: ٢٥] "اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢٣_ ٦٢٤) [2] فتح القدير (٣/ ٦١٨)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢٢) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢٤)

تک پہنچنے سے روکے رکھا۔'' بیتِ عتیق کے معنی پر عن قریب کلام گزر چکا ہے۔ وللہ الحمد۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے امام عطاء رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ ہر اس شخص نے کہ بیت اللہ کا طواف کر لیا تو یقیناً وہ حلال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

﴿ ذٰلِكَ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی ''أي الأمر و الشان ذلك''، یعنی بات وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے کہ حرماتِ الٰہی کی تعظیم بہتر ہے اور شرک اور قولِ زور مذکور سے بچنا ایک امرِ واجب اور ضروری ہے۔ اس کا بیان اوّل ''ذٰلك'' میں عن قریب گزر چکا ہے۔ شعائر جمع ہے شعیرہ کی، یا شعارہ بالکسر بوزن قلادہ کی۔ شعیرہ بہ معنی علامت و نشانی ماخوذ ہے اشعار سے، اشعار کہتے ہیں اعلام کو اور شعور بہ معنی علم ہے۔ اسی معنی سے شعار القوم ہے لڑائی میں، یعنی قوم کی علامت، جس کو وہ باہم جانتے پہچانتے ہیں۔ اسی باب سے اشعار البدن ہے، یعنی بُدنوں کے کوہان میں دائیں بائیں جانب سے کونچا دیتے ہیں، یہاں تک کہ خون بہہ نکلے تو معلوم ہو جائے کہ وہ ہدی ہے۔ پھر اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔ پس شعائر اللہ ہر وہ شے ہے جس میں اللہ پاک کا شعار و نشان ہو۔ شعائر اللہ میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ مراد اس سے کیا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ مراد اللہ کا دین ہے، ہر عبادت اس میں داخل ہے جس سے اللہ پاک کی طرف تقرب کیا جاتا ہے، جیسے: روزہ و دعا ہے اور ذبیحہ وطواف بیت اللہ و رمیِ جمار ہے، کیوں کہ یہ سب اللہ پاک کے دین کی نشانیوں سے ہیں اور حج کی ہدایا اس میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٥٨] ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔'' ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ اس قول کی تائید کرتا ہے۔ اس قول کی بنا پر شعائر اللہ کی تعظیم سے یہ مراد ہوگی کہ ہر عبادت کو اپنے موقع و محل پر مع رعایتِ شروط و آدابِ خاص اللہ پاک کے واسطے ادا کرے۔ اخلاص اور حسنِ نیت کے ساتھ بجا لائے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو اس کے حکم کے مطابق بجا لائے اور ممنوعات سے پورے طور پر بچے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد فرائضِ حج اور مواضعِ نسکِ حج ہیں، یعنی وہ عبادت جو حج سے اور اس کی قربانیوں کے مقامات سے متعلق ہے۔ ان کو شعائر اس لیے کہا کہ یہ سب حج کی نشانیاں ہیں۔ اس صورت میں تعظیم سے یہ مراد ہے کہ اُن امور کو پورا ادا کرے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد خاص ہدایا (قربانی کے جانور) ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ پہلے گزر چکی ہے، یعنی ہدایا کو شعائر اس لیے کہا ہے کہ اُن کے کوہان میں دائیں اور بائیں جانب سے تیز دھار آلے سے کونچا دیتے ہیں کہ خون بہہ نکلے تو معلوم ہو جائے کہ وہ ہدایا ہیں، پھر اُن سے کوئی تعرض نہ کرے۔ پس ہدایا حج کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، بلکہ یہ نشانی حج کی تمام نشانیوں سے زیادہ ظاہر اور مشہور ہے۔ اس قول کی بنا پر

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٩٣۔ ٢٩٤)

تعظیم سے مراد یہ ہوگی کہ ہدایا کو خوبصورت، موٹی تازی اور گراں قیمت چُن کر خریدے۔

آدمی کو چاہیے کہ ہدایا کی قیمت میں مشاحت (بخیلی) نہ کرے، کیوں کہ یہ بات وارد ہو چکی ہے کہ ہدایا وضحایا وعتق غلاموں (غلاموں کو آزاد کرانا) میں مشاحت کو ترک کرنا چاہیے، یعنی اُن اُمور میں جھگڑا اور تکرار نہ کرے، جس طرح اور اُمور میں کی جاتی ہے۔ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک سو اونٹ قربان کیے، اُن میں ایک اونٹ ابوجہل کا تھا، جس کی ناک میں سونے کا ایک حلقہ تھا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بدنے پر قبطی کپڑوں کی جھول ڈال کر لایا کرتے تھے، یہ کپڑے سفید باریک مصر سے آیا کرتے تھے۔ پھر اُن کو خیرات کر دیتے تھے۔[2] مطلب یہ ہے کہ بُدنوں کی تعظیم یہی ہے کہ خوبصورت موٹے تازے اور قیمتی ہوں، کیوں کہ یہ کام خاص اللہ پاک کا تقرب چاہنے کے لیے کیا جاتا ہے تو جس قدر عمدہ اور بیش بہا چیز اس کی بارگاہِ عالیہ میں پیش کرے گا، اسی قدر اجر وثواب پائے گا۔ اور زمرۂ اہلِ تقویٰ میں شامل ہوگا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم کرنا، دل کی پرہیزگاری والوں کے افعال سے ہے۔ ضمیر ﴿ فَاِنَّهَا ﴾ کی حذف مضاف کے اعتبار سے شعائر کی طرف راجع ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے: "فإن تعظيمها منه من أفعال ذوي تقوى القلوب" (امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ ضمیر مصدر مؤنث کی طرف راجع ہے،[3] یعنی "فإن العظمة أو الحرمة أو الخصلة من تقوى القلوب" "أو الخصلة" یہاں چار چیزیں مقدر ہیں: ایک تو کلمۂ تعظیم، دوسری منہ، تیسری افعال، چوتھی ذوی۔ ان سب چیزوں کی تقدیر ضروری ہے، ان کے بغیر معنی تمام نہیں ہوتے۔

تعظیم کی ضرورت اس لیے ہے کہ جملہ شرطیہ کے لانے سے مقصود تعظیم شعائر پر رغبت دلانا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ منہ کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں: ایک فائدہ تو یہ ہے کہ جزا کا شرط سے ربط ہو جائے۔ دوسرا فائدہ اصحابِ افعال کا معین کرنا ہے۔ افعال اور ذوی کی طرف ضرورت اس واسطے ہے کہ معنی یہ ہیں کہ شعائر کی تعظیم تقویٰ کے حامل بعض افعال ہیں، کیوں کہ شرعی لحاظ سے تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب اور واجب چیزوں کو ترک کرنے سے جو شے گناہ میں ڈالے، اُن سب سے بچے ہر ایک سے پرہیز کرے۔ اور جو کوئی اُن چیزوں میں سے کسی سے پرہیز نہیں کرے گا تو وہ عرفِ عام میں متقی نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ضروری ہے کہ کسی چیز کے ایک جز سے فائدہ اُٹھانا، وہ خواہ چھوٹے سے چھوٹا جز کیوں نہ ہو، کل سے فائدہ اُٹھانے کی نیت بن جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ شعائر اللہ کی تعظیم اصحابِ تقویٰ کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ مضافاتِ مذکورہ کی تقدیر کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کے واسطے ٹھہرے۔ پس یہ مضافات لفظ میں محذوف ہیں، اس واسطے کہ قرینے سے معلوم

[1] مسند البزار (۲/ ۲۲۲) [2] روح المعانی (۱۷/ ۱۵۰) [3] التبیان فی إعراب القرآن (۲/ ۹۴۱)

ہوتے ہیں اور حذف بالقرینہ انواعِ بلاغت میں سے ایک قسم ہے اور معنی میں مراد ہیں، کیوں کہ ان کے بغیر ﴿ مِنْ ﴾ کی تبعیض کی بنا پر معنی نہیں بن سکتے۔

اضافت تقویٰ کی قلوب کی طرف اس واسطے کی کہ تقوی اور فجور کا منشا دل ہی ہوتے ہیں اور یہی قلوب تقوی و فجور کا حکم کرنے والے ہیں اور یہی اُن کے مرکز ہیں، وہ دونوں انھیں میں جمتے ہیں۔ جب ان میں جم جاتے ہیں تو باقی اعضا میں ان کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ مضافاتِ مذکورہ کی تقدیر کو امام زمخشری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے بھی انھیں کی پیروی کی ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ تقدیر یہ ہے: ”فإن تعظيمها ناشیء من تقوى القلوب، أي من تقوى قلوبهم“. کوفیوں کے مذہب کی بنا پر الف ولام مضاف الیہ سے عوض ہے، یعنی شعائر اللہ کی تعظیم اُن کے دلوں کی پرہیزگاری سے پیدا ہونے والی ہے، اس صورت میں عائد کی ضرورت نہ رہی، اس لیے کہ الف ولام ضمیر سے بدل ہوگیا نہ دو مضاف کی تقدیر کی حاجت رہی اور معنی تمام ہوگئے اور ربط بھی حاصل ہوگیا۔

علامہ محلی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے، کیوں کہ انھوں نے ﴿ اَلْقُلُوْبِ ﴾ کے بعد ”منهم“ مقدر نکالا ہے۔[2] فتح القدیر کی عبارت یہ ہے: ”فإن تعظيمها من تقوى القلوب، أي من أفعال القلوب التي هي من التقوىٰ فإن هذا التعظيم ناشیء من التقوى“[3] یعنی شعائر اللہ کی تعظیم افعالِ قلوب سے ہے، جو تقویٰ سے ہیں، کیوں کہ یہ تعظیم تقویٰ سے پیدا ہونے والی ہے۔ اول تو اللہ پاک نے شعائر کی تعظیم پر رغبت دلائی۔ گویا فی المعنی شعائر کی تعظیم کا حکم فرمایا، کیوں کہ اس کو متقین کے افعال میں سے ٹھہرایا ہے اور تقویٰ فی نفسہٖ مامور بہ ہے، لیکن اس امر کو ترغیب کے پیرایہ میں ادا فرمایا، اس واسطے کہ اس ادا میں بہ نسبت صریح امر کے زیادہ تر مبالغہ ہے۔

پھر ترغیب کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ یعنی باوجود اس کے کہ شعائر کی تعظیم متقیوں کا کام ہے، اس میں تمھارے واسطے ایک مدتِ مقرر تک منافع بھی ہیں۔ اب یہ بات سمجھنی چاہیے کہ شعائر میں تین قول پہلے گزر چکے ہیں، ان کے مطابق اس جملے کے معنی کیسے بنیں گے۔ پس اول دو قول کی بنیاد پر یہ جملہ اور ﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴾ یا تو قصۂ انعام سے متصل ہے، یعنی ﴿ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ سے جن کا ذکر پہلے ہو چکا اور ﴿ فِيهَا ﴾ اور ﴿ مَحِلُّهَآ ﴾ کی ضمیر بھی انعام کی طرف راجع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تمھارے واسطے چوپائیوں میں نفعے ہیں ایک وقتِ مقرر تک، پھر اُن کو پہنچنا ہے بیتِ عتیق تک۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے فائدے میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہی وجہ پسند فرمائی ہے۔ یا یہ

[1] الكشاف (٣/ ١٥٨) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٥) تفسير النسفي (٣/ ١٠٤)

[2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٧) [3] فتح القدير (٣/ ٦١٦)

دونوں جملے شعائر اللہ سے متعلق ہیں، لیکن شعائر کے پہلے قول کی بنا پر اُن سے مراد یہ ہے کہ تمھارے لیے شعائر میں دینی منافع ہیں جن سے تم ایک مقررہ مدت تک نفع لیتے۔ اجل مسمی سے مراد موت ہے۔ پھر محل انھیں شعائر کا ایک بڑا نفع ہے، اس حال میں کہ وہ پہنچنے والے ہیں بیتِ عتیق کی طرف، کون سا بیتِ عتیق، جس کی طرف اعمال چڑھائے جاتے ہیں، یعنی بیت المعمور، یا جس میں شعائر کا نفع ہوتا ہے، یعنی جنت۔ دوسرے قول کی بنیاد پر یہ امر ہے کہ تمھارے لیے فرائض و مواضعِ مناسک وعباداتِ حج میں بازاروں میں تجارت کے منافع ہیں، جو تمھارے لوٹنے کے وقت حاصل ہوتے ہیں، پھر اُن سے نکلنے کا وقت ایک نفع ہے، درآں حالیکہ وہ کعبہ مکرمہ کا طوافِ زیارت کرنے کے بعد احرام کھولنے کے ساتھ منتہی ہونے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے موسمِ حج میں تجارت کو حلال کیا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ مناسکِ حج ادا کرنے میں تم کو دینی و دنیاوی دونوں نفعے ہیں۔ دینی نفع تو یہ ہے کہ ایامِ حج پورے ہونے تک اجر وثواب ملتا ہے۔ دنیاوی یہ ہے کہ بازاروں میں تجارت کرتے ہو، نفع اٹھاتے ہو، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ سے نکلو۔ پھر یہ نفع ہے کہ کعبہ مکرمہ کا طوافِ فرض ادا کر کے احرام کھول ڈالتے ہو، سارے ارکانِ حج سے فارغ ہو جاتے ہو، جو کام اس سے پہلے حرام تھے، اب حلال ہو جاتے ہیں۔ شعائر کے تیسرے قول کی بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ تمھارے واسطے بُدنوں اور ہدیوں میں اس طرح سے منافع ہیں کہ اُن کی نسل لے لو، اُن کے صوف اور ریشم سے نفع اُٹھا لو۔ ضرورت کے وقت اُن کا دودھ پی لو، حاجت ہو تو اُن پر سوار ہو لو۔ اتنا بوجھ لاد لو کہ اُن کو ضرر نہ پہنچے، یہاں تک کہ وہ نحر کیے جائیں۔

﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَآ ﴾ معطوف ہے منافع پر اور ''محل'' ماخوذ ہے محاورۂ ''حل الدين إذا وجب'' سے، ''محل'' اسمِ زمان ہے بہ تقدیرِ مضاف بہ معنی ''وقت نحرها أي وقت حلول نحرها، و وجوب نحرها إلى البيت العتيق'' حال ہے ضمیر ﴿ فِيْهَا ﴾ سے۔ حال میں عامل وہی استقرار ہے جس سے کلمۂ ''فِيْ'' متعلق ہے، کلمۂ ''ثم'' ''تراخي في الوقت و تراخي في الرتبة'' دونوں کا متحمل ہے، معنی یہ ہیں کہ تمھارے واسطے بُدنوں میں وقتِ نحر تک دنیاوی منافع ہیں۔ پھر اُن منافع کے بعد یہ بڑا دینی نفع ہے، یعنی اُن کے نحر کا وقت دراں حالیکہ وہ پہنچنے والے ہیں بیتِ عتیق کی طرف۔ بلا شک شعائر میں سب دینی منافع سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ ان کو خاص اللہ پاک کے واسطے نحر کیا جائے۔ رہی یہ بات کہ وجوبِ نحر کے وقت کو بڑا فائدہ ٹھہرانا کیا ہے، سو یہ اس باب میں مبالغہ ہے، کیوں کہ جب کسی فعل کے وقت کا فائدہ جلیل اور عظیم ٹھہرا تو اس فعل کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ یہاں بیت العتیق سے مراد حرم ہے جو کہ بیت اللہ کے حکم میں ہے، کیوں کہ اس سے مراد سارا حرم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾ [التوبة: ٢٨] ''لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔''

بیت اللہ سے اس جگہ حرم شریف مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف اور گردا گرد اس کا شہر مکہ معظمہ ہدایا کے خون بہانے سے منزہ و پاک رکھا گیا ہے اور منیٰ جائے نحر قرار دیا گیا ہے۔ غرض کہ شعائر میں تین قول تھے جن کا بیان ہو چکا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے قولِ سوم کو اختیار کیا ہے اور محل کو ظرفِ مکان قرار دیا ہے اور "مکان حل نحرھا" اس کی تفسیر کی ہے اور کلمۂ ﴿ إِلَى ﴾ کو بہ معنی "عند" کہا ہے۔[1] اسی طرح خازن نے بھی "منحرھا عند البیت العتیق" تفسیر کی ہے۔ فتح القدیر و فتح البیان میں بھی ظرفِ مکان ٹھہرایا ہے۔[2]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی قولِ سوم کو پسند فرمایا ہے اور قولِ ثانی کو بلفظِ قیل لکھا ہے۔ پھر کہا ہے: "ومحلها إلى البیت العتیق یأباہ"[3] یعنی یہ جملہ اس قول کے منافی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے محل کو امام بیضاوی رحمہ اللہ کی طرح ظرفِ زمان قرار دیا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے "وجوب نحرھا أو وقت وجوب نحرھا" کہا ہے۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے تینوں قول ذکر کر کے تیسرے کی نسبت "وھو أوفق لظاھر ما بعدہ"[4] کہا ہے، یعنی شعائر کے معنی ہدایا لینا، یہی قول اپنے ما بعد کے ظاہر سے زیادہ تر موافق ہے، کیوں کہ ﴿ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ ... الخ ﴾ کا ظاہر اس بات پر دال ہے کہ مہدی کو جائز ہے کہ وقتِ نحر تک اپنی ہدی سے نفع لے، اس طرح سے کہ حاجت کے وقت اس پر سوار ہو جائے، اس کا دودھ پی لے، اس کا صوف اور پشم لے لے۔ ہدی پر سوار ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔

امام مالک، شافعی، احمد اور اسحق رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اس پر سوار ہونا اور بغیر ضرر دیے ہوئے بوجھ لاد لینا جائز ہے، اس قول کی دلیل پہلے گزر چکی ہے۔ اصحابِ رائے نے کہا ہے کہ اس پر سوار نہ ہو، مگر صرف اسی صورت میں کہ وہ اس کے لیے مجبور ہو۔ (اس قول کی دلیل بھی مسلم سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: «اِرْكَبْهَا بِالْمَعْرُوْفِ إِذَا أُلْجِئْتَ إِلَيْهَا»[5]۔) جبکہ اللہ پاک نے یہاں ذبائح کا ذکر کیا تو اس کے بعد فرمایا کہ اس سے کوئی اُمت خالی نہیں رہی ہے۔ ذبائح من جملہ شرائعِ قدیمہ ہے۔ پس ارشاد فرمایا:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ

---

[1] تفسیر الجلالین (١/ ٤٣٧۔ ٤٣٨)
[2] تفسیر الخازن (٥/ ١٧) فتح القدیر (٣/ ٦١٦) فتح البیان (٩/ ٤٨)
[3] تفسیر النسفي (٣/ ١٠٤)
[4] الکشاف (٣/ ١٥٨) تفسیر النسفي (٣/ ١٠٤) تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٦)
[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٢٤)

قُلُوْبُهُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۟

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی، تاکہ وہ (ذبح کے وقت) چوپائے مویشیوں پر اللہ کا نام ذکر کریں، جو اللہ نے انھیں دیے، پھر (سمجھ لو کہ) تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، لہٰذا تم اسی کی فرمانبرداری کرو، اور عاجزی کرنے والوں کو بشارت دیجیے (34) وہ لوگ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جو صابر ہیں اس (تکلیف) پر جو انھیں پہنچے اور جو نماز قائم کرنے والے ہیں، اور ہم نے انھیں جو رزق دیا، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں (35)

قربانی ہر امت کے لیے مشروع تھی:

یعنی مویشی ذبح کرنے اللہ کی نیاز کے لیے ہر دین میں عبادت رکھا ہے۔ اس کے سوا اور کی نیاز ذبح کرنا اُس کی عبادت ہوگئی تو شرک ہوا۔ انتہی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اللہ کے نام پر قربانیوں کا ذبح کرنا اور خون بہانا ساری ملتوں میں ہمیشہ سے مشروع چلا آیا ہے۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ منسک سے مراد عید ہے۔ (أخرجه ابن أبي حاتم) امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذبح ہے۔ (أخرجه ابن أبي حاتم) امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منسک مکہ ہے۔ نہیں ٹھہرایا اللہ نے کسی اُمت کے لیے کبھی کوئی منسک سوا اس کے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم عنه و أخرج ابن أبي شيبة وعبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عن مجاهد في الآية قال: إهراق الدّماء، كذا في فتح القدير)

﴿ لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو دنبے چت کبرے سینگ والے لائے گئے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہا اور تکبیر کہی اور اپنا پاؤں مبارک ان کے صفاح پر رکھا۔[2] (صفاح بالکسر جمع ہے صفح بضم صاد و فتح صاد کی۔ صفح ذبیحہ سے مراد جانب ذبیحہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صفاح بہ معنی پہلو ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صفحہ کی جمع ہے اور صفحہ منہ کی چوڑائی ہے۔[3] (كذا في مجمع البحار)) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، سیدنا زید نے کہا: میں نے کہا، یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا هٰذِهِ الْأَضَاحِيُّ؟ قَالَ: سُنَّةُ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ، قَالُوْا: مَا لَنَا مِنْهَا؟ قَالَ: بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ، قَالَ: فَالصُّوْفُ، قَالَ: بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِنَ الصُّوْفِ حَسَنَةٌ" یعنی یا رسول

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٢) فتح القدير (٣/ ٦١٨)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٦) (3) مجمع بحار الأنوار (٣/ ٣٢٧)

اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ فرمایا: تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ہمارے واسطے اُن میں سے کیا ہے؟ فرمایا: ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے۔ عرض کی: پھر صوف کا کیا حال ہے؟ (صوف بھیڑ کے بالوں کو کہتے ہیں۔) فرمایا: صوف کے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے۔[1] (وأخرجه أبو عبد الله محمد بن يزيد بن ماجه في سننه من حديث سلام بن مسكين به)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ یعنی تمھارا معبود ایک ہے، گو نبیوں کی شریعتیں قسم قسم کی ہوئیں اور بعض نے بعض کو منسوخ کیا۔ پس سارے نبی اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی طرف دعوت دیتے ہیں، چناں چہ خود اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔'' اور اسی لیے فرمایا: ﴿ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ﴾ یعنی اخلاص کرو اور اس کے حکم و اطاعت کے واسطے مطیع و فرماں بردار ہو جاؤ۔ ﴿ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی ہیں: ''مطمئنين''[2] (أخرجه عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم عنه)

امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: ''متواضعين''۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''وجلين''[3] یعنی جو لوگ اپنے رب پر مطمئن ہیں، اس کی اطاعت پر جمے ہوئے ہیں، یا فروتنی کرنے والے ہیں، یا خائف و ترساں ہیں، ان کو خوش خبری سناؤ۔ عمرو بن اُوس نے کہا: ''مخبتین'' وہ لوگ ہیں، جو ظلم نہیں کرتے اور جب کوئی ان پر ظلم کرے تو بدلہ نہیں لیتے۔[4] (أخرجه سعيد بن منصور و ابن أبي شيبة وعبد بن حميد و ابن أبي الدنيا في ذم الغضب و ابن المنذر و ابن أبي حاتم والبيهقي في شعب الإيمان عنه)

امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: ''المطمئنين الراضين بقضآء الله المستسلمين له''[5] یعنی مطمئن راضی بقضائے الٰہی ہیں، اس کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ مخبتین کے سب سے بہتر معنی وہ ہیں کہ اپنے ما بعد کے ساتھ تفسیر کیا جائے، یعنی ﴿ اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ ﴾ یعنی جو مصائب اُن پر آ پڑیں، ان کو سہنے والے ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''والله لتصبرن أو لتهلكن'' یعنی قسم ہے اللہ کی! البتہ تم ضرور صبر کرو، ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٧) مسند أحمد (٤/ ٣٦٨) اس کی سند میں ''ابو داود نفیع بن حارث اور عائذ اللہ'' سخت ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٢٧)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢٨)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٣)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢٩) الدر المنثور (٦/ ٤٨)

[5] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٥)

﴿ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ﴾ جمہور نے باضافت پڑھا ہے۔ سات قاریوں نے اور باقی عشرہ نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ ابن سمیقع کی قراءت "والمقيمين الصلاة" بہ نصب ہے۔ (فتح القدیر میں ہے: "وقرأ ابن محيصن بإثبات النون على الأصل ورويت هذه القراءة عن ابن مسعود"[1]) امام حسن بصری رحمہ اللہ سے "والمقيمي الصلاةَ" مروی ہے۔ (امام ابوعمرو رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح پڑھا ہے، بنابر توہم بقائے نون۔ کسی نے کہا ہے کہ ابوعمرو رحمہ اللہ نے یہ قراءت نہیں پڑھی۔[2] (فتح)) اور نون جو یہاں محذوف ہوا ہے، تخفیف کے واسطے ہے اور اگر اضافت کے لیے حذف کیا جاتا تو ﴿ الصَّلٰوةِ ﴾ کا جر واجب ہوتا۔ "ولكن على سبيل التخفيف، فنصبت" معنی یہ ہیں کہ اللہ نے جو اپنے فرائض کا ادا کرنا ان پر واجب کیا ہے، اس میں اللہ کے حق کو ادا کرنے والے ہیں۔[3] (محشی مصر نے نسخۂ طبع مصر پر یوں لکھا ہے: "هي في بعض النسخ و في بعض آخر محلها بياض و علىٰ كل فحرر" غرض یہ ہے کہ عبارت قابلِ حل ہے، معنی ظاہر نہیں ہیں۔ والله أعلم.

حل اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن رحمہ اللہ کی قراءت، جو بحذفِ نون ونصبِ "الصلاۃ" ہے، اس کی توجیہ بیان کرتے ہیں کہ نون اضافت کی وجہ سے حذف نہیں ہوا ہے، بلکہ صرف تخفیف کے واسطے کیوں کہ اگر اضافت کی وجہ سے حذف ہوتا تو "الصلوة" کا جر واجب ہوتا، حالاں کہ "الصلاة" منصوب ہے۔ پھر یہ کہا ہے کہ اگر حذفِ نون اضافت ہی کی وجہ سے مانا جائے تو بھی نصب "الصلوة" کا یوں بن سکتا ہے کہ "مقيمين" منصوب ہے، اس کے قرب کی وجہ سے "الصلوة" کو نصب دے دیا۔ گویا یہ نصب بالجوار ہے، جس طرح کہ جرِ جوار ہوتا ہے۔)

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ یعنی اللہ نے جو پاک رزق ان کو دیا ہے، اسے اپنے اہل، اقارب، فقرا اور حاجت مندوں پر خرچ کرتے ہیں اور خلق کے ساتھ احسان کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ اللہ پاک کی حدود پر محافظ و مداوم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرائض و واجباتِ الٰہی کو پورے طور پر بجا لاتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ کی مخلوق پر احسان بھی کرتے ہیں۔ یہ صفات منافقین کی صفات کے برعکس ہیں، کیوں کہ منافق لوگ اُن سب کے بالعکس ہیں، جیسا کہ اس کی تفسیر سورت براءت میں گزر چکی ہے۔[4]

امت، جماعت کو کہتے ہیں جو ایک مذہب پر مجتمع ہو۔ فتح البیان اور فتح القدیر میں اسی طرح ہے۔[5] امام خازن اور نسفی رحمہما اللہ نے کہا: جماعتِ مؤمنہ جو تم سے پہلے گزر چکی ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے، امام بیضاوی رحمہ اللہ نے "ولكل أهل دين" تفسیر کی ہے۔[6] منسک کو کوفیوں نے سوا عاصم کے بکسرِ سینِ مہملہ پڑھا ہے۔ باقی

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦١٧) [2] فتح القدير (٣/ ٦١٧) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٥)

[4] رقم الآية (٦٧) [5] فتح القدير (٣/ ٦١٦) فتح البيان (٩/ ٤٨)

[6] تفسير الخازن (٥/ ١٧) تفسير النسفي (٣/ ١٠٤) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٨) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٦)

قاریوں نے سین کی زبر سے پڑھا ہے۔ امام محلی اور نسفی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ منسک بفتحِ سین مصدر ہے اور بکسرِ سین اسمِ مکان ہے۔[1] مصباح میں یوں کہا ہے کہ منسک بفتح و کسرِ سین زمان و مصدر و اسمِ مکان ہوتا ہے۔[2]

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح و کسر دونوں مصدر میں دو لغت ہیں اور فتح اس میں اکثر ہے۔ اور جائز ہے کہ بالکسر موضعِ نسک یا وقتِ نسک ہو۔ غرض کہ کچھ بھی ہو باب اس کا "نسك ينسك"، "قتل يقتل" سے ہے۔ جس وقت کوئی قربانی کو ذبح کرتا ہے تو اس وقت نسک بولتے ہیں اور نسیکہ ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ اول اس میں تین قول گزر چکے ہیں، باقی یہ ہیں: امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں منسک سے مرادنحر کی جگہ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں منسک موضع معتاد ہے خیر میں ہو یا شر میں۔ امام ابن عرفہ رحمہ اللہ نے کہا: منسک مذہب ہے طاعت اللہ سے۔ یہ ماخوذ ہے اس محاورے سے کہ جب کوئی شخص اپنی قوم کے مذہب پر چلتا ہے تو کہتے ہیں: "نسك قومه"۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: منسک عید ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے گزر چکا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: حج ہے۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: خون بہانا ہے۔[4]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: متعبد یا قربان ہے،[5] یعنی تعبد و تقرب، یعنی ہم نے ہر اُمت کے واسطے ایک قسم کا تعبد و تقرب ٹھہرایا ہے۔ اس سے مراد خاص اللہ پاک کے واسطے خون بہانا۔ معنی یہ ٹھہرے کہ ہم نے ہر اُمتِ مومنہ کے واسطے اس بات کو مشروع کیا ہے کہ اللہ پاک کے لیے قربانی کریں۔ فتح القدیر و فتح البیان میں اسی قول کو اولیٰ کہا ہے اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے اظہر ٹھہرایا ہے۔[6]

اس لیے کہ اللہ پاک نے اس کے بعد یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾ یعنی اس کے ذبح کے وقت اکیلے اللہ پاک کا نام ذکر کریں اور اپنی قربانیوں کو خاص اسی کے واسطے ٹھہرائیں۔ ﴿لِيَذْكُرُوا﴾ کو ﴿جَعَلْنَا﴾ کی علت اسی واسطے قرار دیا کہ منظور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ قربانیوں کا مقصد معبود کو یاد کرنا ہے، کیوں کہ اَنعام کا خالق و رازق اور عطا کرنے والا وہی ہے تو اُن کے ذبح کرتے وقت اسی کا نام لینا چاہیے نہ کہ اس کے غیر کا۔ قاموس میں کہا ہے کہ ہر چار پاؤں والے کو بہیمہ کہتے ہیں، اگرچہ وہ پانی میں ہو۔ یا ﴿بَهِيْمَةِ﴾ ہر زندہ ہے، جو تمیز نہیں رکھتا ہے۔ جمع اس کی "بهائم" ہے اور "أبهم" بے زبان کو کہتے ہیں، جو بات نہیں کرتا ہے۔[7] ﴿بَهِيْمَةِ﴾ کی اضافت جو انعام کی طرف کی اس میں اس بات کی تنبیہ ہے کہ جو "بهائم" من جملہ انعام نہیں ہیں، جیسے: گھوڑا، خچر، گدھا ان کا قربانیوں میں ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر اللہ پاک نے خبر دی

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٨) تفسير النسفي (٣/ ١٠٤) [2] المصباح المنير (١/ ٣١١) [3] تفسير القرطبي (٢/ ٥٨)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٦٢٨) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٦)
[6] فتح القدير (٣/ ٦١٦) فتح البيان (٩/ ٤٩) تفسير القرطبي (١٢/ ٥٨) [7] القاموس المحيط (١/ ١٣٩٨)

کہ منفرد بالٰہیت وہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

﴿ فَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ حرفِ فا مابعد کی ترتیب کے واسطے ہے ماقبل پر، یعنی ذبح پر اکیلے اللہ کا نام ذکر کرو، کیوں کہ معبود ایک ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس میں دلیل ہے اس بات پر کہ اللہ کا نام لینا ذبح کی شرط ہے،[1] یعنی اللہ پاک نے ہر اُمت کے لیے مشروع کیا ہے کہ تقرب کی وجہ کے لیے اسی اللہ کے واسطے ذبح کریں اور اس میں یہ علت ٹھہرائی کہ ذبائح پر اس کا نام پاک ذکر کیا جائے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو حکم فرمایا کہ اس کو مانیں، اسی کی عبادت و اطاعت کے لیے مطیع اور فرماں بردار ہوں۔ ﴿ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ﴾ حرفِ فا مثل فائے اوّل کے ہے اور "لہ" کو حصر اور قصر کے لیے پہلے ذکر کیا۔ یعنی جب تمھارا معبود ایک اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک و نظیر نہیں ہے تو تم اسی کو مانو، اسی کی اطاعت پر جمے رہو، خالص اسی کا ذکر کرو۔ ذکر کو اسی کے واسطے سالم و خالص ٹھہراؤ، اس میں شرک کا میل جول مت کرو۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ جو لوگ اس کے بندوں میں سے تواضع کرنے والے خشوع و خضوع کرنے والے اور مخلص ہیں، ان کو خوش خبری دیں۔

﴿ اَلْمُخْبِتِيْنَ ﴾ ماخوذ ہے خبت سے، خبت کہتے ہیں پست زمین کو۔ حقیقت میں مخبت وہ شخص ہے جو پستی میں جائے۔ عربی کی بول چال میں جب کوئی شخص پست زمین میں جاتا ہے تو کہتے ہیں: "أخبت الرجل" چوں کہ "إخبات" تواضع اور اخلاص کے لوازمات سے ہے، اس لیے متواضعین و مخلصین سے مخبتین کا کنایہ ٹھہرانا صحیح و درست ہوا۔ یہاں جو متواضعین کو مخبتین کے پیرایہ میں بیان فرمایا، اس میں ایک عجیب حسن ہے، اس لحاظ سے کہ زمین پست پر نزول حجاج کے مناسبِ حال ہے، اس لیے کہ ان میں متواضع لوگوں کی صفات ہوتی ہیں، جیسے: لباس سے مجرد ہونا، سر کھولنا، اہل و عیال و یار دوست و وطن سے علاحدگی اختیار کرنا۔ غرض کہ ﴿ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ جب تمھارا معبود وحدہ لاشریک لہٗ ہے تو تم اس کی ساری تکالیف کے مطیع اور فرماں بردار ہو جاؤ۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرماں بردار ہوتا ہے تو وہ مخبت ہو جاتا ہے، یعنی متواضع و مخلص۔

پس اسی لیے اس کے بعد یوں فرمایا: ﴿ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تو ان کو خوش خبری سنا، اس ثوابِ جزیل و عطائے جلیل کی جس کو اللہ پاک نے ان کے واسطے مہیا کر رکھا ہے۔ پھر خود اللہ پاک نے ان کا وصف ذکر فرمایا کہ مخبتین وہ لوگ ہیں کہ جس وقت اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور اس کی مخالفت سے حذر کرتے ہیں، یعنی بچتے ہیں۔ ذکرِ الٰہی کے وقت جو خوف اُن کو حاصل ہوتا ہے سو یہ دلیل ہے ان کے کمال یقین اور قوتِ ایمانی کی۔ پھر اُن کی دوسری صفت بیان فرمائی کہ جو بلائیں اور مصائب و مشکلات ان کو اللہ پاک کی اطاعت میں پہنچتی ہیں، اُن پر صبر کرتے ہیں۔ یہ صفت اس لیے بیان کی کہ حجاج کو اپنے وطن، دوست احباب اور اہل و عیال

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٤)

سے علاحدہ ہو کر تکلیف پہنچتی ہے، اس پر وہ صبر کرتے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں زحمت کو رحمت سمجھتے ہیں۔ پھر اُن کی تیسری صفت ذکر فرمائی کہ نماز کو قائم رکھتے ہیں، یعنی اس کے اوقات کی کمال درجے کی پابندی کرتے ہیں۔

یہ وصف اس لیے ذکر کیا ہے کہ سفر میں کمی رہ جاتی ہے، یعنی سفر میں نماز کا پورے طور پر ادا کرنا ایک مشکل کام ہے، لہٰذا وہ لوگ باوجود سفر کے نماز کو اوقات اور شروط کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اُن کی ایک اور صفت بیان فرمائی کہ جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خیرات کرتے ہیں اور نیکی کی راہوں میں اسے خرچ کرتے ہیں، مواضعِ خیر میں اس کو رکھتے ہیں، اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صدقۂ واجب بالاولیٰ دیا کرتے تھے، اس آیت کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢] ''(سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔''

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾

اور قربانی کے اونٹ بھی جنھیں ہم نے تمھارے لیے اللہ کے شعائر میں سے بنایا ہے، تمھارے لیے ان میں بہت بھلائی ہے، لہٰذا (نحر کے وقت) جب وہ پاؤں بندھے کھڑے ہوں تو تم ان پر اللہ کا نام ذکر کرو، پھر جب ان کے پہلو (زمین پر) گر جائیں تو تم ان کا گوشت کھاؤ اور قناعت پسند اور سوالی (محتاج) کو بھی کھلاؤ، اسی طرح ہم نے چوپائے تمھارے تابع کر دیے، تاکہ تم شکر کرو (36)

اونٹ کو نحر کرنے کا حکم:

اونٹ کو ذبح کرنے کے بجائے نحر کرنا ہے، اسے کھڑا کیجیے قبلے کے سامنے، پھر چھاتی میں زخم دیجیے، جب سارا خون نکل جائے اور وہ گر پڑے تو پھر کاٹنے لگیے۔ محتاج دو بتائے: پہلا وہ ہے جو مانگتا نہیں اور دوسرا وہ جو مانگتا ہے۔ انتہی۔

اللہ پاک نے جو اپنے بندوں کے واسطے بُدنے پیدا کیے اور اُن کو اپنے شعائر سے ٹھہرایا، پس اس میں ان پر احسان رکھ کے فرماتا ہے اور وہ یہی ہے کہ بُدنوں کو قرار دیا کہ اس کے بیت الحرام کی طرف ہدیہ کیے جاتے ہیں، بلکہ جو کچھ بیت اللہ کی طرف ہدیہ بھیجا جاتا ہے بُدنے اس سب سے بہتر و برتر ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ لَا

تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآىِٕدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [المآئدۃ: ۲] ''اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ حرمت والے مہینوں کی، نہ حرم میں قربان ہونے والے اور نہ پٹے پہنائے جانوروں کی، اور نہ بیت الحرام کا قصد کرنے والوں کی وہ اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں صرف اس لیے ان سے زیادتی کرنے پر آمادہ نہ کرے کہ انھوں نے تمھیں مسجدِ حرام سے روک دیا تھا، اور تم نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام عطا رحمہ اللہ نے بُدن کی تفسیر میں کہا ہے کہ گائے اور اُونٹ ہیں۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سعید بن میسّب، امام حسن بصری رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بُدن تو اُونٹوں سے ہوتے ہیں۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بُدنہ کا اطلاق اُونٹ پر متفق علیہ ہے۔ گائے پر بدنہ کے اطلاق کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے دو قول پر۔ زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ شرعی لحاظ سے بُدنہ کا اطلاق گائے پر بھی کیا جاتا ہے، چناں چہ اس بارے میں صحیح حدیث وارد ہو چکی ہے۔

اونٹ اور گائے کی قربانی میں کتنے افراد کی شرکت شروع ہے:

پھر یہ بات ہے کہ جمہور علما اس پر ہیں کہ بُدنہ سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے اور گائے بھی سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہوتی ہے، جس طرح کہ یہ بات سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیث سے جو صحیح مسلم میں ہے، ثابت ہو چکی ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم فرمایا کہ ہم قربانیوں میں شریک ہوں، بُدنہ سات آدمی سے اور گائے سات سے۔[2] امام اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: بلکہ گائے اور اونٹ کافی ہوتے ہیں دس سے۔ (وقد ورد به حديث في مسند الإمام أحمد و سنن النسائي وغيرهما. فالله أعلم)[3]

(حدیث جو سنن نسائی و جامع ترمذی وغیرہما میں موجود ہے، وہ یوں ہے: فاشتركنا في البقرة سبعة وفي البعير عشرة''[4] یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور نسائی کے الفاظ یہ ہیں: ''فاشتركنا في البعير عن عشرة و

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣٠) تفسير ابن أبي حاتم (٢٤٩٣)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣١٨)
[3] مسند أحمد (١/ ٢٧٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٩٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٥۔ ٢٩٦)
[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠١)

البقرة عن سبعة"[1] خلاصہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں بمقدمہ گائے اشتراکِ دس کا ذکر نہیں، بلکہ ہفت کا عدد منصوص ہے۔ صرف اونٹ کے بارے میں لفظ دس کا ہے۔ اسی طرح امام اسحق رحمہ اللہ کا مذہب ہے، جو جامع ترمذی میں منقول ہے، وہ الفاظ یہ ہیں کہ اسحق کا مذہب جمہور کے مذہب کے موافق ہے، یعنی اونٹ اور گائے ہر ایک سات سات کی طرف سے کافی ہوتے ہیں، مگر امام اسحق رحمہ اللہ نے اتنا اور بھی کہا ہے کہ اونٹ دس سے بھی کافی ہو جاتا ہے، پس اسحق رحمہ اللہ کی طرف گائے کے بارے میں دس کے اشتراک کی نسبت اس بنا پر صحیح نہیں ہے۔ واللہ أعلم۔ حافظ محمد عبدالعزیز نائب افتا۔ عفا اللہ عنہ۔)

قربانی کا اجر و ثواب:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ﴾ یعنی دارِ آخرت میں تمھارے واسطے ثواب ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نحر کے دن ابن آدم کا کوئی عمل خون بہانے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ « وَإِنَّهَا لَتَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَأَظْلَافِهَا وَأَشْعَارِهَا وَإِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَّقَعَ مِنَ الْأَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا »[2] (رواہ ابن ماجه والترمذي وحسنه) یعنی بے شک قیامت کے دن ذبیحہ آئے گا، اپنے سینگوں اور کھروں اور بالوں کے ساتھ اور بے شک خون واقع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جگہ میں اس سے پہلے کہ وہ واقع ہو زمین پر، یعنی زمین پر گرنے سے پہلے اللہ پاک کے نزدیک قبول ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تم اس سے اپنے جی کو خوش کرو۔

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابو حازم رحمہ اللہ قرض لیا کرتے اور بُدنے ہانک کر لے جایا کرتے تھے۔ پس کسی نے ان سے کہا کہ تم قرض لیتے ہو اور بُدنے ہانک کر لے جاتے ہو، کہا کہ میں نے اللہ سے سنا ہے، وہ یوں فرماتا ہے: ﴿ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ﴾[3] یعنی تمھارے واسطے اُن میں بھلائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خود اللہ پاک فرمائے کہ اُن میں تمھارے لیے بھلائی ہے تو میں قرض کر کے کیوں نہ لے جاؤں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَا أُنْفِقَتِ الْوَرِقُ فِيْ شَيْءٍ أَفْضَلَ مِنْ نَحِيْرَةٍ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ »[4] (رواہ الدارقطني في سننه) "أنفقت" میں معروف و مجہول دونوں کا احتمال ہے۔ واللہ اعلم کہ روایت کیا ہے۔) یعنی نہیں خرچ کیا میں نے روپیہ کسی شے میں کہ وہ بہتر ہو عید کے دن قربانی سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: خیر سے مراد اجر و

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٩٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٦٢) اس کی سند میں ''سلیمان بن یزید ابوالمثنی'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٢٦)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٦)

[4] سنن الدارقطني (٢/ ٢٨٢) اس کی سند میں ''ابراہیم بن یزید خوزی'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٢٤)

منافع ہیں۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا کہ دودھ اوران پر سوار ہونا ہے کہ جس وقت طرف اُن کے حاجت مند ہو۔[1]

ذبح کے وقت کی مسنون دعائیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ﴾ مطلب بن عبداللہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے بقرعید کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو آپ ﷺ کے پاس ایک دُنبہ لائے، پس آپ ﷺ نے اس کو ذبح کیا اور فرمایا: « بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَنِّي وَعَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِي »[2] (رواه أحمد و أبو داود و الترمذي) یعنی آپ نے ذبح کے وقت تکبیر کہی، پھر فرمایا: الٰہی! یہ قربانی ہے میری طرف سے اور اس شخص کی طرف سے جس نے میری اُمت میں سے قربانی نہیں کی۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ نے دو دُنبے قربانی کیے۔ پھر جب قبلے کی طرف اُن کا منہ کیا تو فرمایا: « وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّأُمَّتِهِ » پھر اللہ کا نام لیا اور تکبیر کہی اور ذبح کیا۔[3] (قاله محمد بن إسحاق عن يزيد بن حبيب عن ابن عباس رضي الله عنهما عن جابر رضي الله عنه) علی بن حسین رحمہ اللہ سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت قربانی فرماتے تو دو دنبے موٹے سینگ والے چت کبرے خرید کرتے، پھر جس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ چکتے اور لوگوں کو خطبہ سنا چکتے تو ان دُنبوں میں سے ایک آپ ﷺ کے پاس لاتے اس حال میں کہ آپ ﷺ اپنی نماز گاہ میں کھڑے ہوتے، پس آپ ﷺ بذاتِ خود چھری سے اُس کو ذبح کرتے۔

پھر فرماتے: « اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَنْ أُمَّتِيْ جَمِيْعِهَا مَنْ شَهِدَ لَكَ بِالتَّوْحِيْدِ وَشَهِدَ لِيْ بِالْبَلَاغِ » یعنی الٰہی! یہ دُنبہ میری ساری امت کی طرف سے ہے جس نے تیرے واسطے توحید کی گواہی دی ہے اور میرے واسطے تیرے حکم پہنچانے کی گواہی دی ہے۔ پھر دوسرے دُنبے کو آپ ﷺ کے پاس لاتے تو خود آپ ﷺ ہی اس کو ذبح کرتے۔ پھر فرماتے: « هٰذَا عَنْ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ » یعنی یہ دنبا محمد و آلِ محمد کی طرف سے ہے ﷺ۔ پھر وہ دونوں دنبے سارے مساکین کو عطا فرماتے اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے گھر والے اُن میں سے کھا لیتے تھے۔ (رواه أحمد

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣١)

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٥٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٢١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٤٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٩٥) اس کی سند میں ''محمد بن اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

و ابن ماجه) حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: « فَيُعْطِيَهُمَا جَمِيعًا لِّلْمَسَاكِيْنِ وَيَأْكُلُ هُوَ وَأَهْلُهُ مِنْهُمَا »[1]
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیتِ مذکور کی تفسیر میں فرمایا ہے: "قياما على ثلاث قوائم معقولة يدها اليسرى يقول: بسم الله، والله أكبر، لا إله إلا الله، اللهم منك ولك" (قاله الأعمش عن أبي ظبيان عنه) یعنی تم ذکر کرو اللہ کا نام بُدنوں پر اس حال میں کہ وہ تین پاؤں پر کھڑے ہوں، بایاں پاؤں ان کا بندھا ہوا ہو۔ (وكذلك روي عن مجاهد و علي بن أبي طلحة و العو في عن ابن عباس رضی اللہ عنہما نحو هذا الحديث) امام لیث رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے یوں روایت کیا ہے کہ جب اُن کا بایاں پاؤں باندھا جائے گا تو وہ تین پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ (وروى ابن أبي نجيح عنه نحوه) امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک پاؤں باندھ دے تو وہ تین پر ہو جائیں گے۔[2]

اونٹ نحر کرنے کا طریقہ:

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ایک شخص پر آئے کہ اس نے بُدنے کو بٹھایا تھا اور وہ اسے نحر کر رہا تھا تو فرمایا کہ وہ اسے اُٹھا دے۔ "قياما مقيدة سنة أبي القاسم صلی اللہ علیہ وسلم"[3] یعنی بُدنوں کو کھڑا کر کے پاؤں باندھ کر نحر کرنا چاہیے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یوں ہی ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم بُدنوں کو نحر کیا کرتے تھے، بایاں پاؤں بندھا ہوا باقی پاؤں پر کھڑے ہوئے۔[4] (رواہ أبو داود) امام ابن لہیعہ کہتے ہیں کہ مجھے عطا بن دینار رحمہ اللہ نے حدیث کی کہ سالم بن عبداللہ نے سلیمان بن عبدالملک سے کہا ہے کہ تو بدنے کی سیدھی جانب سے کھڑا ہو اور اس کی بائیں جانب سے نحر کر۔[5] صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حجۃ الوداع کی صفت میں مروی ہے، اس میں کہا ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے تریسٹھ بُدنے نحر فرمائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ شریف میں ایک برچھی تھی، اس سے ان کو چونکا لگا دیتے تھے۔[6]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ، یعنی قراءت میں ''صوافن'' ہے۔ "أي معقلة قياما، قاله عبد الرزاق أخبرنا معمر عن قتادة" یعنی اس قراءت کے معنی یہ ہیں کہ بُدنوں کو پاؤں باندھ کر کھڑا کر کے نحر کرے۔ سفیان ثوری نے "عن منصور عن مجاهد" کہا ہے کہ جس نے اس کو "صوافن" پڑھا ہے اس نے اس کے معنی "معقولة" کہے ہیں اور جس نے اسے صواف پڑھا ہے۔ اس نے یوں کہا ہے: "تصف

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٥١۔ ٣٥٢)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣٢۔ ٦٣٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢٠)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٦٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٦/ ١٥)

[5] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٦) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)

بين يديها"۔ امام طاؤس اور حسن رحمہ اللہ وغیرہما نے ﴿صَوَآفَّ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے، یعنی "خالصة لله عزوجل" (وكذا رواه مالك عن الزهري) یعنی ذکر کرو اللہ کا نام ان پر، درآں حالیکہ وہ خالص اللہ عزوجل کے لیے ہوں۔ عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ نے کہا: "﴿صَوَآفَّ﴾ ليس فيها شرك كشرك الجاهلية لأصنامهم"[1] یعنی صواف کے یہ معنی ہیں کہ ان میں کسی طرح کا شرک نہ ہو، جس طرح کہ جاہلیت والے اپنے بتوں کو شریک کیا کرتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا﴾ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، یعنی بُدنے گر پڑیں زمین کی طرف اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی ایک روایت ہے اور اسی طرح امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، یعنی "نُحرت"۔ غرض یہ ہے کہ وجب جنوب سے مراد نحر ہے۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "ماتت"۔ مراد۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ کی مراد یہی قول ہے۔ کیوں کہ بُدنہ جب نحر کیا جاتا ہے تو اس سے کھانا جائز نہیں ہے، جب تک وہ مر نہ جائے اور اس کی حرکت سرد نہ پڑ جائے۔ مرفوع حدیث میں مروی ہے: «لَا تُعَجِّلُوا النُّفُوسَ أَنْ تَزْهَقَ»[3] یعنی جان نکلنے سے پہلے نفوس پر جلدی مت کرو، جب جان نکل چکے تب کھاؤ۔ (وقد رواه الثوري في جامعه عن أيوب عن يحيىٰ بن أبي كثير عن فرا قصة الحنفي عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ أنه قال ذلك) سیدنا شداد بن اُوس سے مروی حدیث، جو صحیح مسلم میں ہے، اس حدیث کی تائید کرتی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ إِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ»[4] یعنی اللہ پاک نے ہر شے پر احسان فرض کیا ہے۔ جب تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔ اور تیز کر لے تمھارا ایک چھری کو اور چاہیے کہ راحت دے اپنی قربانی کو۔ سیدنا ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شے کاٹی گئی چوپائے سے اور وہ زندہ ہے تو وہ مردار ہے۔[5] (رواه أحمد و أبو داود و الترمذي وصححه)

فقراء کو قربانی کا گوشت کھلانے کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ بعض سلف نے کہا ہے کہ یہ امرِ اباحت ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مستحب ہے۔ غیر مالک نے کہا ہے کہ واجب ہے، یہ قول بعض شافعیہ کے لیے ایک وجہ ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣٤ـ ٦٣٣) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٥)

[3] سنن الدارقطني (٤/ ٢٨٣) اس کی سند میں "سعید بن سلام عطاء" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٢٦٠)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٥٥)

[5] مسند أحمد (٥/ ٢١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٥٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٨٠) صحيح الجامع (٥٦٥٢)

قانع ومعتر میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ پس امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "القانع المستغني بما أعطيته وهو في بيته" یعنی قانع وہ شخص ہے کہ جو تو نے اس کو دے دیا، اس سے مستغنی ہو جاتا ہے اور وہ اپنے گھر میں ہے۔ "والمعتر الذي يتعرض لك ويلم بك أن تعطيه من اللحم ولا يسأل" یعنی معتر وہ آدمی ہے کہ تیرے روبرو آتا ہے اور تجھ پر نزول کرتا ہے کہ تو اس کو گوشت میں سے دے اور مانگتا نہیں ہے۔ امام مجاہد اور محمد بن قرظی رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ علی بن ابی طلحہ کا قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ قانع متعفف ہے اور معتر سائل۔ (وهذا قول قتادة و إبراهيم النخعي و مجاهد في رواية عنه)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، زید بن اسلم، کلبی، حسن بصری، مقاتل بن حیان اور مالک بن انس رحمہم اللہ نے کہا ہے: "القانع هو الذي يقنع إليك ويسئلك" یعنی قانع وہ شخص ہے کہ تجھ سے خضوع و فروتنی کرتا ہے اور تجھ سے مانگتا ہے۔ "والمعتر الذي يعتريك يتضرع ولا يسئلك" یعنی معتر وہ ہے کہ تیرے روبرو آتا ہے تضرع و زاری کرتا ہے اور تجھ سے مانگتا نہیں ہے۔ یہ الفاظ حسن رحمہ اللہ کے ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قانع سائل ہے۔ کہا: کیا تو نے قول شماخ کا نہیں سنا ہے ؎

لمال المرء يصلحه فيغني مفاقره أعف من القنوع

"قال يعني من السوال، وبه قال زيد" مطلب یہ ہے کہ اس قول میں قنوع کے معنی سوال کے ہیں۔

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: قانع وہ مسکین ہے کہ گشت کرتا ہے اور معتر دوست ہے اور ضعیف ہے، جو کہ زیارت کرتا ہے، یعنی ملاقات۔ یہی قول عبدالرحمٰن فرزندِ زید سے بھی ایک روایت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ قانع تیرا غنی پڑوسی ہے، تیرے گھر میں جو کچھ داخل ہوتا ہے، وہ اسے دیکھتا ہے اور معتر وہ شخص ہے کہ تیرے روبرو آتا ہے لوگوں میں سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے دوسرا قول یہ بھی مروی ہے کہ قانع طامع ہے اور معتر وہ شخص ہے کہ بُدنوں سے متعرض ہوتا ہے غنی یا فقیر۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ قانع مکے والے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ قانع تو سائل ہے، اس لیے کہ وہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنا ہاتھ سوال کے لیے اُٹھاتا ہے تو کہتے ہیں: "أقنع بيده" اس نے سوال کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اور معتر ماخوذ ہے اعتراء سے۔ (اس بنا پر معتر مخفف ہوگا معتری سے۔) اور معتر وہ شخص ہے جو کہ گوشت کھانے کے واسطے متعرض ہوتا ہے۔[1]

اس آیتِ کریمہ سے اس شخص نے حجت پکڑی ہے جو من جملہ علما اس طرف گیا ہے کہ اضحیہ کے تین حصے کیے جائیں: پس ایک تہائی تو قربانی کرنے والے کے لیے ہے کہ اس کو کھائے اور ایک تہائی اپنے دوستوں کو ہدیہ دے اور

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣٦۔ ٦٤٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٧)

ایک تہائی فقرا کو خیرات کر دے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا ہے کہ بے شک میں نے تم کو منع کیا تھا قربانیوں کے گوشت کو تین دن سے زیادہ تک ذخیرہ کرنے سے، پس تم کھاؤ اور ذخیرہ کرو جب تک کہ تمھارے واسطے ظاہر ہو۔[1]

ایک روایت میں یوں ہے کہ کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور خیرات کرو۔[2]

ایک روایت میں یہ ہے کہ کھاؤ اور کھلاؤ اور خیرات کرو۔[3] دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی کرنے والا نصف کھائے اور نصف خیرات کرے، اس لیے کہ اگلی آیت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴾ اور حدیث شریف میں یہ فرمایا ہے: «فَكُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَتَصَدَّقُوْا»[4] پھر اگر کل قربانی کو کھالیا تو ایک قول یہ ہے کہ کسی شے کا ضامن نہ ہوگا، شافعیہ میں سے امام ابن شریح رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کل اضحیہ کا ضامن ہوگا، مثل اضحیہ کا یا اس کی قیمت کا۔ کسی نے کہا: نصف اضحیہ کا ضامن ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی قیمت کا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں سے ادنیٰ جزء کا۔ یہ قول مشہور ہے مذہب امام شافعی سے۔ رہے چمڑے سو مسند امام احمد میں سیدنا قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اضاحی میں مروی ہے، پس کھاؤ اور صدقہ کرو اور اُن کے چمڑوں سے فائدہ لو اور اُن کو مت بیچو۔[5] من جملہ علما وہ شخص ہے کہ اس نے اُن کی بیع میں رخصت دی ہے اور اُن میں سے وہ شخص ہے کہ اس نے کہا ہے کہ ان میں فقیروں سے مقاسمہ کرے۔ واللہ أعلم۔

مسئلہ:

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک پہلی چیز جس سے اس دن کی ابتدا کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ نماز پڑھیں، پھر لوٹ کر آئیں تو نحر کریں، پس جس شخص نے نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق کیا، وہ ہماری سنت کو پہنچا اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کرلیا تو وہ صرف ایک گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لیے آگے کرلیا، وہ کسی شے میں سے نسک نہیں، یعنی قربانی نہیں ہے۔[6] (أخرجاہ) اسی لیے امام شافعی اور علما کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ قربانیوں کے ذبح کرنے کا اول وقت وہ ہے جب سورج طلوع ہو نحر کے دن اور نمازِ عید اور دو خطبوں جتنا وقت گزر جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کیا ہے اور یہ کہ امام ذبح کرے بعد اس کے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ ذبح نہ کرو، یہاں تک کہ امام ذبح کرے۔[7]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٩٧٧) [2] صحیح مسلم، رقم الحديث (١٩٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٤٩) صحیح مسلم، رقم الحديث (١٩٧٣)

[4] صحیح مسلم، رقم الحديث (١٩٧١) [5] مسند أحمد (٤/ ١٥)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٢٢) صحیح مسلم، رقم الحديث (١٩٦١)

[7] صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ اس کے ہم معنی روایت مروی ہے۔ دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٤)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "أما أهل السواد من القرى و نحوها فلهم أن يذبحوا بعد طلوع الفجر" یعنی رہے گاؤں وغیرہ اطراف کے لوگ، پس ان کو جائز ہے کہ طلوعِ فجر کے بعد ذبح کریں، اس لیے کہ اُن کے نزدیک اُن کے لیے نمازِ عید مشروع نہیں ہے اور شہروں کے لوگ تو وہ ذبح نہ کریں یہاں تک کہ امام نماز پڑھ لے۔ والله أعلم۔ پھر کہا گیا ہے کہ ذبح مشروع نہیں ہے مگر صرف نحر کے دن۔ کسی نے کہا ہے کہ نحر کا دن تو اہلِ امصار کے لیے ہے، قربانیوں کے نزدیک سے مل جانے کے سبب سے۔ رہے گاؤں والے پس اُن کے لیے روزِ نحر اور اس کے بعد ایامِ تشریق میں قربانی کی جاسکتی ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سب کے لیے روزِ نحر اور اس کے بعد ایک دن ہے۔ کسی نے کہا اور دو دن اس کے بعد۔ امام احمد رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ نحر اور تین دن ایامِ تشریق کے اس کے بعد۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ كُلُّهَا ذَبْحٌ»[1] یعنی سارے ایامِ تشریق ذبح کے ہیں۔ (رواه أحمد و ابن حبان) کسی نے کہا ہے کہ ذبح کا وقت ذوالحجہ کے اخیر تک ہے۔ امام ابراہیم نخعی اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ یہ قول غریب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اسی طرح ہم نے ان کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے، یعنی ہم نے اُن کو تمھارے لیے ذلیل کر دیا ہے اور اُن کو تمھارا فرماں بردار، مطیع اور جھکنے والا بنا دیا ہے، تم چاہو اُن پر سوار ہو لو چاہے اُن کا دودھ دوہ لو، چاہے ذبح کر ڈالو، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿71﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿72﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۷۱۔ ۷۳] "کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں، ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چناں چہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان (چوپایوں) میں (اور بھی) فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا پھر وہ شکر نہیں کرتے؟" اور اس آیتِ کریمہ میں یوں کہا: ﴿ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾[2] (كذا في ابن كثير)

امام ابن ابی اسحٰق رحمہ اللہ نے "وَ الْبُدُنَ" بضم بائے موحدہ و دالِ مہملہ پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے بسکونِ دال۔ یہ دونوں دولغت ہیں۔[3] پھر جمہور کی قراءت بہ نصب ہے بنا بر اشتغال، یعنی ناصب اس کا "جَعَلْنَا" محذوف ہے، جس کی تائید بعد کا ﴿ جَعَلْنٰهَا ﴾ کر رہا ہے، یہ راجح ہے، اس لیے کہ اس کے پہلے جملہ فعلیہ ہے۔ کسی نے برفع

[1] مسند أحمد (٤/ ٨٢) صحيح ابن حبان (٩/ ١٦٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٧٦)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٥۔ ٢٩٨)

[3] فتح القدير (٣/ ٦١٨)

بھی پڑھا ہے۔ اس بنا پر ﴿وَالْبُدْنَ﴾ مبتدا ہوگا اور ما بعد خبر ٹھہرے گی۔ "بُدن" بضمہ با وسکونِ دال جمع ہے بدنۃ کی جس طرح کہ "خشب"، جمع ہے "خشبة" کی، لیکن امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ بات پسند کی ہے کہ ضمہ دال کا صل ہے اور سکون تخفیف کے واسطے ہے۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ سکون اصل ہو، اس بنا پر کہ "بُدن"، جمع ہو "بادن" کی، جیسے "بزل"، جمع ہے "بازل" کی۔ "بَدنَہ" خاص ہے اونٹ کے ساتھ نزدیک امام شافعی رحمہ اللہ کے۔ اونٹ کا نام "بدنہ" اس لیے رکھا ہے کہ وہ فربہ کیا جاتا ہے۔ بدانت موٹاپے کو کہتے ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک بُدنہ کا اطلاق گائے پر بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ گائے بھی موٹاپے پر مشتمل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لغت میں تو بُدنہ خاص اونٹ کا نام ہے، لیکن شریعت میں اونٹ اور گائے کو اس لیے شامل ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گائے کو سات آدمیوں سے کافی ہونے میں اُونٹ کے ساتھ ملحق کیا ہے۔ پھر جب گائے نے اونٹ کا حکم لیا تو بُدنہ کا نام اس پر اطلاق کیا گیا شریعت میں، اور اس لیے نہیں کہ لفظِ حقیقت لغوی ہے ہر ایک میں۔ امام زرقانی رحمہ اللہ نے مصباح سے نقل کیا ہے کہ بُدنہ اونٹنی ہے، یا گائے جو مکے میں نحر کی جاتی ہے، یہ نام اس لیے رکھا کہ اس کو فربہ کیا کرتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بُدنہ اونٹ کے لیے خاص ہے۔

امام ابن لقیمہ نے قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ بُدن اونٹ کے ساتھ خاص ہے امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اُونٹ اور گائے دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ پس شافعیہ کا کلام امام ازہری رحمہ اللہ کے کلام کے موافق ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کلام صحاح کے کلام کے موافق ہے۔ رہا ہدی سو وہ اونٹ، گائے و بکری کو شامل ہے۔ امام عبد بن حمید و ابن منذر رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا ہم نہیں جانتے ہیں بُدن کو مگر اونٹ اور گائے سے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان سے یہ قول روایت کیا ہے کہ بُدن ذات الجوف ہے۔ امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ نہیں ہیں بُدن مگر اونٹوں سے۔ اُن سب نے حَکَم سے قولِ مذکور کے مثل اور امام عطا رحمہ اللہ سے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مثل روایت کیا ہے۔[1] (و أخرج ابن أبي شيبة عن سعيد بن المسيب نحوه و أخرج ابن أبي حاتم عن الحسن نحوه أيضا) کسی نے کہا ہے کہ بکری کا نام بُدنہ نہیں رکھا جاتا، اس کے صغر (چھوٹا ہونے) کے سبب سے۔ یہ قول کہ بُدنہ کا نام اونٹ کے ساتھ خاص ہے، فتح البیان اور فتح القدیر میں اس کو اولیٰ کہا ہے دو وجہ سے: ایک یہ ہے کہ جو اوصاف آیندہ آیت میں مذکور ہیں وہ اونٹ میں ظاہر ہیں۔[2]

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٩۔ ٥٠) فتح القدير (٣/ ٦٢٠)
[2] فتح القدير (٣/ ٦١٨) فتح البيان (٩/ ٥٠)

دوسری وجہ یہ ہے کہ کتبِ لغت اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ اسم اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔ (یہ قول کہ کتبِ لغت اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ بُدنہ کا نام اونٹ کے ساتھ خاص ہے، دو وجہ سے تحقیق کے خلاف ہے: پہلی وجہ یہ کہ جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے بُدنہ کی تفسیر میں بقر کو ذکر کیا ہے اور وہ لوگ اہلِ لسان تھے تو اِن کتبِ لغت کو اُن پر کیسے ترجیح ہوسکتی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ابن لقیمہ کے بیان کے مطابق صحاح سے بقر تفسیرِ بدنہ میں داخل ہے اور اسی طرح قاموس میں مذکور ہے۔[1] پس علی الاطلاق اس کی نسبت کتبِ لغت کی طرف ٹھیک نہیں۔) امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ گائے جو سات آدمیوں سے کافی ہونے میں اُونٹ کے ساتھ شریک ہوئی، اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ بُدنہ کا نام شرعاً اس کو شامل ہو، بلکہ وہ حدیث اس کی مانع ہے۔[2]

﴿ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد اعلامِ شریعت ہیں، یعنی اللہ پاک نے بُدنوں کو اپنے دین کی نشانیوں سے ٹھہرایا ہے۔ اضافتِ شعائر کے اسمِ مبارک کی طرف تعظیمِ شعائر کے واسطے فرمائی ہے۔ شعائر کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ مفعول ثانی ہے "جَعَلَ" بمعنی "التصییر" کا اور جملہ ﴿ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ ﴾ یا تو حال ہے ﴿ جَعَلْنٰهَا ﴾ کی ضمیر مفعول سے یا ﴿ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ سے۔ یہ دونوں قول اس پر مبنی ہیں کہ ضمیر ﴿ فِیْهَا ﴾ کی راجع ہے بُدن کی طرف، یا شعائر کی طرف۔ اوّل قول جمہور کا ہے۔ امام ابو السعود نے کہا ہے کہ یہ جملہ مستأنفہ ہے اپنے ماقبل کی تقریر کرتا ہے، معنی یہ ہیں کہ تمھارے واسطے بُدنوں میں دین و دنیا کے منافع ہیں۔ جب اللہ پاک نے تم کو ایسی شے عطا کی ﴿ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا ﴾ تو تم اُن کو نحر کرتے وقت اسی کا نام لو اور یوں کہو: "الله أكبر لا إله إلا الله والله أكبر اللهم منك وإليك"۔ یہ قول تفسیر بیضاوی، ابو السعود اور فتح البیان میں اسی طرح ہے۔[3] یعنی اے اللہ! یہ عطا ہے تیری طرف سے اور اس کے ساتھ تقرب ہے تیری طرف۔

﴿ صَوَآفَّ ﴾ حال ہے "علیها" سے، یعنی بُدنوں کو نحر کرو، اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوئے ہوں۔ بہ تشدیدِ حرفِ فا جمہور کی قراءت ہے، "صافة" کی جمع ہے ماخوذ "صف" سے۔ یہ کنایہ ہے قیام سے، کیوں کہ جس وقت اُونٹ کھڑا ہوتا ہے تو اپنے پاؤں کی صف باندھ لیتا ہے۔ امام حسن، اعرج، مجاہد، زید بن اسلم رحمہم اللہ اور سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے "صوافي" پڑھا ہے۔ یہ جمع ہے "صافیة" کی۔[4] یعنی نحر کرو اُن کو اس حال میں کہ خالص لوجہ اللہ ہوں، ان کے نحر کے وقت اللہ پاک کے غیر کا نام شریک مت کرو۔ کسی نے "صوافیا" پڑھا ہے، اصل اس کی "صوافیا" بالف ہے، پھر جب تو نے اس پر وقف کیا تو "صوافیا" کہا۔ کبھی اسی الف کو حذف کر دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں تنوین کو لاتے ہیں، جس طرح کہ اس قول میں ہے ع

---

[1] القاموس المحيط (١/ ١٥٢٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٧)

[3] تفسير أبي السعود (٦/ ١٠٧) تفسير البيضاوي (/ ١٢٧) فتح البيان (٩/ ٥١) [4] تفسير القرطبي (١٢/ ٦١)

أقلي اللوم عاذل والعتابن

اصل اس کی "والعتابا" ہے، اس تنوین کو تنوینِ ترنم بولتے ہیں۔ کسی کی قراءت "صَوَافٍ" ہے، بکسر و تنوین، اصل اس کی صوافی تھی، جو شخص حرفِ یا کو مطلقاً ساکن کرتا ہے، اس کے قول پر اس یا کو ساکن کیا، پھر کسرے پر اکتفا کر کے یا حذف کر دی گئی، باوجود ثقل جمع کے، پھر اس یا کے عوض میں تنوین لائی گئی، جس طرح کہ "جوارٍ" میں بحالتِ رفع و جر ہوا کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام ابوجعفر محمد بن علی رحمہ اللہ نے "صَوَافِنَ" بنون پڑھا ہے، یہ جمع ہے "صافنة" کی۔[1] "صافنه" وہ ہے کہ بسبب باندھ دینے کے اس کا ایک اگلا پاؤں اُٹھایا گیا ہے، تاکہ مضطرب و بے قرار نہ ہو، اسی باب سے ہے قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴾ [صٓ: ٣١] "اصیل تیز رو گھوڑے۔" یہ وصف اصل میں گھوڑوں میں ہوتا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "صفن الفرس" جبکہ وہ تین پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے اور چوتھے کو موڑ لیتا ہے، جبکہ یہ وصف اصل میں گھوڑوں کا ہے اور یہاں اونٹوں کا وصف ہوا تو اس کا استعمال اونٹوں میں بطورِ استعارہ ٹھہرے گا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وجوب کے معنی سقوط ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "وجبت الشمس" یعنی سورج گر گیا۔ "وجب الجدار" یعنی دیوار گر پڑی۔ اسی باب سے لفظ واجب شرعی ہے۔ گویا وہ ہم پر گر پڑا اور ہم پر لازم ہو گیا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: یہ کنایہ ہے موت سے۔ یہ بات کہ جنوب کو بلفظِ جمع ذکر کیا باوجود اس کے کہ اُونٹ جب گرتا ہے تو ایک پہلو پر گرتا ہے، لٰہذا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جمع بمقابلۂ جمع بُدن ہے۔

فتح البیان و فتح القدیر میں ہے کہ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ ﴿ فَكُلُوْا ﴾ کا امر واسطے ندب کے ہے اور ﴿ اَطْعِمُوا ﴾ کا امر کہا گیا ہے کہ یہ بھی پہلے امر کی طرح ندب کے واسطے ہے۔ امام مجاہد، نخعی، ابن جریر اور ابن شریح رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعی اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ وجوب کے لیے ہے۔[2] "قانع و معتر" میں مختلف اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار یہ قول ہے کہ قانع وہ ہے کہ اس شے سے راضی ہے جو اس کے پاس ہے اور اس شے سے جو بغیر سوال کیے اس کو دی جاتی ہے۔ اس معنی کی تائید یہ بات کرتی ہے کہ "القنع" بغیر الف پڑھا گیا ہے۔[3]

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: قنع راضی ہے لا غیر، یعنی قنع وہ ہے کہ جو اس کے پاس ہے اس سے راضی ہے،[4] یہ ماخوذ ہے قناعت سے، نہ قنوع سے، بخلاف قانع کے کہ وہ دونوں معنی میں مشترک ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قانع سائل ہے، ماخوذ ہے "قنعت إليه قنوعا إذا خضعت له في السؤال" اور معتر متعرض بہ سوال ہے۔ امام

---

[1] تفسیر القرطبي (١٢/ ٦٢)
[2] فتح القدير (٣/ ٦١٩) فتح البيان (٩/ ٥٢)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٧۔ ١٢٨)
[4] الكشاف (٣/ ١٦٠)

حسن رحمہ اللہ نے "والمعتري" پڑھا ہے، معنی اس کے مثل معتر کے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "عرّه واعترّه وعرّاه واعتراه أيضا إذا اعترض للمعروف من غير مسألة" امام نحاس رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے: "إذا تعرض لما عنده أو طلبه"[1]

امام محلی رحمہ اللہ کا قولِ مختار یہ ہے: قانع وہ ہے کہ جو اُسے دیا جاتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے اور سوال نہیں کرتا، نہ متعرض ہوتا ہے، اور معتر سائل ہے یا متعرض۔[2] امام نسفی رحمہ اللہ کا مختار قول قانع میں یہ ہے کہ قانع سائل ہے۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "قنعت إليه إذا خضعت له و سألته قنوعا"۔ معتر میں دو قول لکھے ہیں: ایک یہ کہ معتر وہ ہے کہ تجھ کو اپنے آپ کو دکھاتا ہے اور متعرض ہوتا ہے مانگتا نہیں ہے۔ "وقيل القانع الراضي بما عنده و بما يعطى من غير سوال من قنعت قنعا و قناعة و المعتر المتعرض للسؤال"[3]

فتح البیان و فتح القدیر میں اس آیت کی تفسیر میں تابعین سے مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں۔ مرجع لغوی معنی ہیں، خصوصاً باوجود اس کے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور من بعدہم کے درمیان اختلاف ہے۔[4] کسی عربی شاعر نے قنوع کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

العبد حر إن قنع والحر عبد إن قنع
فاقنع ولا تقنع فما شيء يشين سوى الطمع

یعنی اگر غلام قناعت کرے تو وہ آزاد ہے اور آزاد اگر سوال کرے تو وہ غلام ہے، اس لیے تو قناعت کر اور سوال مت کر، کیوں کہ سوائے طمع کے کوئی شے نہیں ہے، جو عیب ناک کرے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اطعام کو دو بار اس لیے ذکر کیا ہے کہ پہلا اطعام تو مرتب ہے ﴿ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ کے ذبح پر، جو کہ بُدن و بقر و غنم کو شامل ہے اور دوسرا اطعام خاص بُدن کے ذبح پر مرتب ہے، گو گائے اور بکری کا ذبح کرنا حکم کے لحاظ سے اس کے موافق ہے۔ ﴿ كَذَٰلِكَ ﴾ صفت ہے مصدر محذوف کی، یعنی مثل اس تسخیرِ بدیع کے مسخر کیا ہم نے بُدنوں کو تمھارے واسطے، سو وہ تمھارے مطیع اور فرمانبردار ہو گئے ہیں کہ نحر کے مقام کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں، پھر تم اُن کو نحر کرتے ہو اور ان سے نفع اٹھاتے ہو بعد اس کے کہ پہلے اس لیے مسخر کیے تھے کہ تم ان پر بوجھ لادو، ان کی پشت پر سوار ہو، ان کا دودھ دوہو اور بھی اس کے مثل کام لو۔ یا یہ معنی ہیں کہ باوجود ان کی عظمت، قوتِ جسمانی اور قدرت کے ہم نے ان کو تمھارے لیے مسخر کر دیا، ایسا مسخر کرنا، جیسا ہم نے نحر کے وقت اُن کا حال بیان کیا کہ وہ ﴿ صَوَآفَّ ﴾ ہوتے ہیں، یعنی تین پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک پاؤں بندھا ہوتا

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٦٥)
[2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٨)
[3] تفسير النسفي (٣/ ١٠٥)
[4] فتح القدير (٣/ ٦٢١) فتح البيان (٩/ ٥٣)

ہے، پھر تم اُن کے سینوں میں چونکا مارتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں پر اس تسخیر کا احسان رکھتا ہے اور اس پر اُن سے شکر طلب کرتا ہے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی شاید تم ایسی منتِ عظیم کا احسان مانو اور شکر کرو۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جیسا ہم نے تم کو اُن کے نحر کرنے کا حکم کیا، ویسا ہی ہم نے ان کو تمھارا مسخر بنا دیا۔ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ مثل ﴿ ذٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُّعَظِّمْ ﴾ کے ہے۔ پھر استیناف کیا تو فرمایا کہ ہم نے ان کو تمھارا مسخر کر دیا، یعنی باوجود اُن کی قوت اور جسمانی عظمت کے ہم نے اُن کو تمھارا مطیع کر دیا، تاکہ تم اُن کے نحر کرنے پر قادر ہو۔[1]

پھر جب اللہ پاک یہ بات بیان کر چکا کہ بُدنے شعائر اور معالمِ دین میں سے ہیں اور اُن کے نحر پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرنے کا حکم دیا اور اُن میں سے کھانے اور کھلانے کا ارشاد فرمایا تو اب یہ امر ذکر فرمایا کہ اُن کے نحر کرنے میں معتبر صرف اُن کا خون بہانا اور اُن کے گوشت کا کھانا اور کھلانا ہی نہیں ہے، بلکہ معتبر وہ شے ہے جو اس کے ساتھ لگی رہتی ہے، یعنی تقویٰ جو اللہ پاک کی تعظیم کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے تقرب اور اخلاص کی طرف بلاتا ہے۔ پس ارشاد فرمایا:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۭ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۷

اللہ تک ان (قربانی کے جانوروں) کا گوشت ہرگز نہیں پہنچتا اور نہ ان کا خون، لیکن اس تک تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے، اسی طرح اس نے ان (چوپایوں) کو تمھارے تابع کر دیا، تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور نیکی کرنے والوں کو بشارت دیجیے (37)

قربانیوں کا مقصود تقویٰ ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ان ہدایا وضحایا کا نحر کرنا جو اس نے تمھارے واسطے مشروع کیا ہے، لہٰذا صرف اس لیے کہ اُن کے ذبح کرتے وقت تم اس کو یاد کرو، کیوں کہ خالق رازق تو وہی ہے، نہ یہ کہ اُن کے گوشت اور خون سے اسے کچھ پہنچے، اس لیے کہ وہ تو اپنے ماسوا سے غنی اور بے پروا ہے۔ جاہلیت میں لوگ جس وقت بُدنوں کو اپنے بتوں کے واسطے ذبح کرتے تو قرابین کے گوشت میں سے لے کر اُن پر رکھتے اور اُن کے خون سے ان پر چھڑک دیتے تھے، اس پر اللہ پاک نے یہ فرمایا: ﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا ﴾

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جاہلیت والے بیت اللہ پر اُونٹوں کا گوشت اور

(1) تفسير النسفي (٣/ ١٠٥)

خون چھڑکتے تھے، اس پر اصحابِ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ ہم تو اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ چھڑکیں تو اللہ پاک نے آیتِ مذکورہ نازل فرمائی،[1] یعنی اللہ پاک تقویٰ کو قبول کرتا ہے اور اس پر جزا دیتا ہے، جس طرح کہ صحیح میں مروی ہے کہ بے شک نہیں دیکھتا اللہ پاک تمھاری صورتوں کی طرف اور نہ تمھارے مالوں کی طرف، لیکن وہ نظر کرتا ہے تمھارے دلوں اور تمھارے عملوں کی طرف۔[2] حدیث شریف میں مروی ہے کہ بے شک صدقہ البتہ واقع ہوتا ہے رحمان کے ہاتھ میں اس کے قبل کہ سائل کے ہاتھ میں واقع ہو اور بے شک خون البتہ واقع ہوتا ہے اللہ سے ایک مکان میں اس سے پہلے کہ واقع ہو زمین پر، جیسا کہ حدیث میں مقدم ہو چکا ہے۔[3] (رواه ابن ماجه والترمذي و حسنه عن عائشة رضي الله عنها مرفوعاً)

پس اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سبقت کر گیا اللہ کی طرف سے قبولیت کے واسطے اس شخص کے لیے جس نے اپنے عمل میں اخلاص کیا۔ اس معنی کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہیں جو علمائے محققین کے نزدیک متبادر (ذہن میں آنے والے) ہوں۔ واللہ أعلم۔ امام وکیع رحمہ اللہ نے یحییٰ بن مسلم بن ضحاک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عامر شعبی سے قربانیوں کی کھال کے بارے میں پوچھا تو عامر نے کہا: ﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا ﴾ اگر تو چاہے تو بیچ ڈال، چاہے تو روک رکھ، چاہے تو خیرات کر دے۔[4] (پہلے گزر چکا ہے کہ قربانی کی کھال نہ بیچے۔ فلیعلم۔)

قولہ تعالیٰ ﴿ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ ﴾ "أي من أجل ذلك سخر لكم البدن" ﴿ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ "أي لتعظموه" یعنی اسی لیے بُدنوں کو تمھارا مسخر کیا ہے، تاکہ تم اللہ پاک کی عظمت بیان کرو، جس طرح کہ اس نے تم کو اپنے دین وشرع کی ہدایت کی اور اس شے کی جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور پسند فرماتا ہے اور منع کیا تم کو اس شے سے جس کو وہ مکروہ رکھتا ہے اور اس سے اِبا فرماتا ہے (انکار کرتا ہے)۔ ﴿ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تم خوش خبری دو محسنین کو، یعنی اُن لوگوں کو جو اپنے عمل میں احسان کا برتاؤ کرتے ہیں، اللہ کی حدود پر قائم ہیں، جو اس نے اُن کے لیے مشروع کیا ہے اس کا اتباع کرتے ہیں۔ رسول ﷺ نے جو کچھ اُن کو پہنچایا اور اپنے رب عزوجل کے پاس سے اس کو لائے، اس میں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مسئلہ:

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام ثوری رحمہم اللہ اس قول کی طرف گئے ہیں کہ جو شخص صاحبِ نصاب ہے، اضحیہ اس پر واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اقامت کی شرط بھی زیادہ فرمائی ہے۔ اُن کی حجت یہ حدیث شریف ہے کہ جس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٥) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٦) اس میں حدیث کے پہلے حصے (بے شک صدقہ ... واقع ہو) کا ذکر نہیں ہے۔ نیز سند میں "ابومثنیٰ سلیمان بن یزید" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٥٢٦)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٨۔ ٢٩٩)

شخص نے فراخی پائی، پھر قربانی نہ کی تو وہ ہرگز ہماری نمازگاہ کے قریب نہ آئے۔[1] (رواه ابن ماجه و أحمد بإسناد رجاله كلهم ثقات عن أبي هريرة رضي الله عنه على أن فيه غرابة و استنكره أحمد بن حنبل) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس برس مدینے میں اقامت فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کرتے تھے۔[2] (رواه الترمذي)

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ قربانی واجب نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے، اس لیے کہ حدیث شریف میں یوں مروی ہے کہ مال میں کوئی حق نہیں ہے سوائے زکات کے۔[3] اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کی طرف سے قربانی فرمائی، لہٰذا اُس نے اس کے وجوب کو اُن سے ساقط کر دیا۔ سیدنا ابو سریحہ غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما کا پڑوسی تھا، لہٰذا وہ قربانی نہیں کرتے تھے اس خوف سے کہ لوگ اُن کی اقتدا کریں گے۔ بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ قربانی سنتِ کفایہ ہے، جبکہ اہلِ دار یا محلّہ یا بیت میں سے کسی ایک نے کر لی تو باقی لوگوں سے ساقط ہوگئی، اس واسطے کہ مقصد اظہارِ شعار ہے، یعنی قربانی سے غرض دینِ اسلام کی نشانی کا ظاہر کرنا ہے، لہٰذا وہ ایک کے کرنے سے حاصل ہوگئی۔

مخنف بن سلیم سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرفات میں فرماتے ہوئے سنا: «عَلَى كُلِّ أَهْلِ بَيْتٍ فِيْ كُلِّ عَامٍ أُضْحَاةٌ وَّعَتِيْرَةٌ» یعنی ہر گھر والوں پر ہر برس میں قربانی ہے اور عتیرہ۔ کیا تم جانتے ہو کہ عتیرہ کیا ہے؟ وہ ہے جس کو تم رجبیہ کہتے ہو۔[4] (رواه الإمام أحمد و أهل السنن و حسنه الترمذي وقد تكلم في إسناده) سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آدمی ایک بکری اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربانی کرتا تو وہ کھاتے اور کھلاتے۔ "حتى ينالها الناس فصار كما ترى"[5] (رواه الترمذي وصححه ابن ماجه) (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن یہ لفظ "تباهى الناس" معلوم ہوتا ہے۔ ترمذی میں دیکھا تو یہی ہے، یعنی یہاں تک کہ لوگوں نے باہم مفاخرت کی تو قربانی ایسی ہوگئی، جیسی تو دیکھ رہا ہے، یعنی مارے فخر کے بہت کرتے ہیں۔ والله أعلم۔) سیدنا عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری قربانی کیا کرتے تھے۔[6] (رواه البخاري)

---

(1) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٣) مسند أحمد (٢/ ٣٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٩٠)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٧) اس کی سند میں ''حجاج بن ارطاۃ'' متکلم فیہ راوی ہے۔

(3) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٨٩) اس کی سند میں ''ابو حمزہ میمون اعور'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٣٨٣)

(4) مسند أحمد (٥/ ٧٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٥)

(5) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٥٥)

(6) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٨٤)

قربانی کے جانور کی عمر کا بیان:

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مت ذبح کرو تم مگر مُسِنّہ، مگر یہ کہ مشکل ہو تم پر تو جذعہ ضان سے ذبح کرو۔[1] اسی جگہ سے امام زہری رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ جذعہ کافی نہیں ہوتا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے اس کا مقابلہ کیا تو وہ اس طرف گئے کہ ہر جنس سے جذعہ کافی ہے، یہ دونوں قول غریب ہیں۔ جس قول پر جمہور ہیں وہ یہ ہے کہ سوا اس کے نہیں کہ ثنی کافی ہوتا ہے (دو سال کی عمر کا جس کو تیسرا سال شروع ہو) اونٹ، گائے اور بکری سے، یا جذعہ ضان سے۔ رہا ثنی اونٹ سے، پس وہ پانچ برس کا ہے اور چھٹے میں داخل ہوا ہے اور گائے سے وہ ہے کہ دو برس کا ہو اور تیسرے میں داخل ہوا ہو، کسی نے کہا کہ تین برس کا ہو اور چوتھے میں داخل ہوا ہو اور بکری سے وہ ہے جو دو برس کا ہو۔[2] رہا جذع بھیڑ سے تو کسی نے کہا ہے کہ جذع (بھیڑ، دنبہ) سال بھر کا ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ دس مہینے کا۔ کسی نے کہا ہے کہ آٹھ کا۔ کسی نے کہا ہے کہ چھے کا۔ اس کی عمر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں کم سے کم یہ قول ہے[3] اور اس سے جو کم ہے تو وہ حمل ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ حمل وہ ہے جس کی پشت کے بال قائم ہیں اور جذع وہ ہے کہ اس کی پشت کے بال نائم ہیں۔ قد انفرق صدغين.[4] والله أعلم.

فتح البیان وغیرہ کا بیان یہ ہے کہ ہرگز نہیں چڑھتے اللہ پاک کی طرف، نہ اس کی رضا کو پہنچتے ہیں، نہ اس کے نزدیک درجۂ قبولیت حاصل کرتے ہیں قربانیوں کے گوشت، جن کو تم خیرات کرتے ہو اور نہ اُن کے خون جو نحر کے وقت بہائے جاتے ہیں اس حیثیت سے کہ وہ گوشت اور خون ہیں، لیکن اس کی طرف تو تمھارے دلوں کا تقویٰ پہنچتا ہے اور باوجود ایمان کے وہ صرف اسی کو قبول کرتا ہے اور اسی پر جزا دے گا، جو تم نے عملِ صالح میں اخلاص کیا ہے اور اس سے خاص اسی کی ذات پاک کا ارادہ کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لحوم و دماء سے مراد اصحابِ لحوم و دماء ہیں، یعنی قربانی کرنے والے اور گوشت اور خون سے اپنے رب کی طرف تقرب کرنے والے ہرگز راضی نہ ہوں گے گوشت اور خون سے لیکن تقویٰ کے ساتھ، یعنی وہ راضی نہ ہوں گے، مگر نیت و اخلاص اور تقویٰ کی شروط کے ساتھ۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے یہ بات بتائی ہے کہ جو شے اس کی طرف پہنچتی ہے، وہ تقویٰ الٰہی و طاعتِ الٰہی ہے، اس شے میں جس کا وہ حکم فرماتا ہے۔[5] اس کلام کی حقیقت معنی قبول کی طرف راجع ہے، اس کی

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٣)

[2] فاضل مفسر کی یہ رائے صحیح نہیں۔ قربانی کے جانوروں (اونٹ، گائے اور بکری) میں عمر کا لحاظ نہیں ہوگا، بلکہ ان کا مُسِنّہ ہونا ضروری ہے۔ مُسِنّہ کا مطلب، جس کے دودھ والے دانت گر کر دوسرے دانت آ گئے ہوں، چاہے ان کی عمر کچھ بھی ہو۔ [ص۔ ی]

[3] جذع (بھیڑ، دنبہ) کا یک سالہ ہونا ضروری ہے۔ اس سے کم عمر کا جذع قربانی کے لیے جائز نہیں۔ [ص۔ ی]

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٢٩٨۔ ٣٠٠)

[5] فتح القدير (٣/ ٦٢٠)

وجہ یہ ہے کہ جس شے کو انسان قبول کرتا ہے تو محاورے میں یوں بولتے ہیں: "قد ناله و وصل إليه" یعنی اس نے اس شے کو قبول کر لیا، پس جس طرح خلق کی عادت تھی اپنے مخاطبات و محاورات میں، اسی طرح اللہ پاک نے ان سے خطاب فرمایا۔ امام ابن منذر اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "قال: كان المشركون إذا ذبحوا استقبلوا الكعبة بالدماء فيضحون بها نحو الكعبة، فأراد المسلمون أن يفعلوا ذلك فأنزل الله: ﴿ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا ﴾"[1] (و أخرج ابن أبي حاتم عن ابن جريج نحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ ﴾ کو دو وجہ سے مکرر ذکر فرمایا: ایک یہ ہے کہ منظور نعمت کا یاد دلانا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ ﴿ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ ﴾ سے اس کی علت بیان کرنا ہے، یعنی بُدنوں کو تمھارا مسخر کیا ہے، تاکہ تم اللہ پاک کی عظمت کو پہچانو اس طریقے سے کہ جس شے پر اس کا غیر قدرت نہیں رکھتا ہے، وہ اس پر قادر ہے تو تم بزرگی اور بڑائی کے ساتھ اس کی توحید کرو۔ یا تکبیر سے مراد قربانی کرنے والے کا قول اللہ اکبر ہے نحر کے وقت۔ پس اوّل آیت میں تو اللہ کا نام ذکر کرنے کا حکم کیا اور اس آیت میں تکبیر کا ذکر فرمایا۔ منظور یہ بات بتانا ہے کہ تسمیہ اور تکبیر کو جمع کرنا مشروع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تکبیر سے مراد احرام کھولنے کے وقت تکبیر کہنا ہے۔

﴿ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے جو تم کو بُدنوں کی تسخیر کا طریقہ بتایا اور اُن کے ساتھ تقرب کرنے کی کیفیت سکھائی، تم اس پر اس کی بزرگی بیان کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں تکبیر سے مراد شکر ہے، یعنی اللہ پاک نے جو تم پر اس بات کا انعام کیا کہ اپنے دین و معالم حج و نسک کی راہ بتائی، تم اس پر اس کا شکر کرو، اس طرح کہ احرام کھولتے یا ذبح کرتے وقت تکبیر و تہلیل کرو۔ کلام کو مختصر کر دیا ہے، اس طرح سے کہ تکبیر کے معنی کو شکر میں شامل کیا اور تکبیر کو کلمہ ﴿ عَلَىٰ ﴾ سے متعدی فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر شکر کے معنی میں شامل ہے۔ ﴿ مَا ﴾ کا کلمہ مصدریہ ہے یا موصولہ، معنی یہ ہیں: "على هدايته إياكم" یا "على ما هداكم إليه" اور ﴿ عَلَىٰ ﴾ متعلق ہے ﴿ لِتُكَبِّرُوا ﴾ سے، اس لیے کہ اس میں شکر کے معنی شامل ہیں۔ محسنین سے مراد موحدین ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب فرمایا ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: وہ لوگ ہیں کہ اللہ پاک کے احکامات کو مانتے ہیں۔ ان کو ثواب کی خوش خبری سناؤ۔[4] فتح البیان و فتح القدیر میں ہے کہ ان سے مراد مخلصین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ موحدین۔ ظاہر یہ ہے کہ ان سے مراد ہر وہ شخص ہے جس سے من جملہ خیر وہ شے صادر ہوتی ہے جس کے سبب سے اس پر محسن کے اسم کا اطلاق درست ہوتا ہے۔[5]

---

(1) الدر المنثور (٦/ ٥٥۔ ٥٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٥) فتح البيان (٩/ ٥٣۔ ٥٤) (2) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٨)
(3) تفسير الخازن (٥/ ١٩) (4) تفسير النسفي (٣/ ١٠٥) (5) فتح القدير (٣/ ٦٢٠) فتح البيان (٩/ ٥٤)

امام بیضاوی ﷫ کا مختار قول یہ ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں کہ جس کام کو کرتے ہیں اور جس کو چھوڑتے ہیں اس میں مخلصین ہیں،[1] یعنی وہ لوگ اللہ پاک کی عبادت کرتے ہیں گویا اس کو دیکھ رہے ہیں اور اس سے اس کے فضل اور رضوان کو چاہتے ہیں، اس کام پر جس کو وہ کرتے ہیں اور جس کام کو چھوڑتے ہیں، اس کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضوان کو حاصل کرنے کے لیے ہی چھوڑتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ جو کام کرتے ہیں اور جس کام کو چھوڑ دیتے ہیں، ان میں سے کسی کام کے ساتھ نہ اُن کے دلوں پر کوئی بوجھ ہوتا ہے اور نہ کوئی ملال ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے افعالِ حج کو جو ﴿ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ پر ختم فرمایا تو اس کا مقصد اس بات کی رغبت دلانا اور اس پر آمادہ کرنا ہے کہ سارے افعالِ حج اور دیگر عبادات میں احسان کے معنی ساتھ لگے رہیں، گویا سارے اعمالِ صالح کی روح یہی احسان ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿٣٨﴾

یقیناً اللہ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے، بے شک اللہ ہر خائن (اور) ناشکرے کو پسند نہیں کرتا (38)

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے:

جب تک نبی اکرم ﷺ مکے میں رہے، حکم تھا کہ مسلمان صبر کریں۔ کافروں کی بدی پر صبر کرتے رہے۔ پھر جب مدینے میں آئے تو حکم ہوا کہ جو تم سے بدی کرے، تم بھی بدلہ لو، تب جہاد شروع ہوا۔ اگلی آیت میں حکم ہے۔ انتھی.

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے شریروں کے شر کو اور فاجروں کے مکر و فریب کو دور کر دے گا، جنھوں نے اس پر بھروسا کیا ہے اور جو اس کی طرف رجوع ہوئے ہیں اور اُن کو محفوظ رکھے گا اور اُن کی مدد کرے گا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ [الزمر: ٣٦] ''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں؟'' اور فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ [الطلاق: ٣] ''اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہے اپنے بندوں میں سے اس بندے کو جو اس وصف کا حامل ہو، وہ وصف یہی ہے کہ عہد و میثاق میں خیانت کرتا ہے، جو کہتا ہے اس کو وفا نہیں کرتا۔ کفر کے معنی ہیں نعمتوں کا انکار کرنا، یعنی نعمتوں کا انکار کرتا ہے، ان کا اقرار نہیں کرتا۔[2] (كذا في ابن كثير)

ابوعمرو اور ابن کثیر نے ''يَدْفَعُ'' پڑھا ہے، باقی قاریوں نے ﴿ يُدٰفِعُ ﴾۔ صیغہ مفاعلہ کا اس جگہ اپنے اصلی

---

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٢٨)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٠٠)

معنی پر ہیں، اصل معنی اس کے دونوں طرف سے فعل کا واقع ہونا ہے، جس طرح کہ دوسری قراءت اس پر دال ہے اور بہت وقت یہ صیغہ وارد ہوتا ہے اور اس کے اصل معنی مراد نہیں ہوتے، جیسا کہ "عاقبت اللص" وغیرہ میں ہے،[2] پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں اس صیغے کو مبالغے کے واسطے لایا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تکررِ واقع پر آگاہ کرنے کو لائے ہیں، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک مومنین سے مشرکین کی آفتوں کو دور کرے گا اور اُن کی دھوکے بازیوں کو اُن سے دفع کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کی حجت کو بلند کر دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو توفیق دے گا اور جملہ مستأنفہ ہے، یہ بات بیان کرنے کو لایا گیا ہے کہ مومنین کو رب العالمین کی طرف سے یہ مزیت (فضیلت) اور شرف حاصل ہے کہ اللہ پاک خود اُن سے مدافعت کرنے کا متولی ہوا ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ذکر نہیں کیا کہ اُن سے کیا شے دفع کرے گا۔ اس واسطے کہ بہت افضل، عظیم اور اعم ہو جائے،[2] یعنی جو شے اُن سے دفع کرے گا، وہ انتہائی بزرگ ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی۔

جملہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴾ پہلے جملے کا مقرر ہے، کیوں کہ اللہ پاک کا مشرکوں کو مومنوں سے دور کرنا پوری خبر دے رہا ہے کہ وہ مشرک لوگ مبغوض ہیں، اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کسی نے اللہ کے نام کے سوا غیر کا نام ذکر کیا اور اپنے ذبیحہ سے بتوں کی طرف تقرب کیا تو وہ "خوان کفور" ہے۔ دونوں کلمے بصیغۂ مبالغہ یہ بات بتانے کے لیے ذکر فرمائے ہیں کہ واقع میں وہ ایسے ہی ہیں، نہ اس واسطے کہ جس کی خیانت اُن سے کم ہے، یا اس کا کفران کے کفر سے ہلکا ہے۔ اس کے خارج کرنے کو ذکر کیے ہیں۔[3] (كذا في فتح البيان وغيره)

شیخ زادہ نے کہا ہے کہ آیتِ مذکور متصل ہے اس آیت سے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [الحج: ٢٥] "بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ اور مسجدِ حرام سے روکتے ہیں۔" جو کفار کہ جہاد و ہجرت و مسجد الحرام سے روکتے تھے، جب کہ اللہ پاک نے ان کو وعید سنائی اور اس پر بیان اعمالِ حج اور مناسکِ حج کی تفریع کی اور جس چیز میں دنیا اور آخرت کے منافع ہیں، اس کا بیان کیا تو جو حال مومنوں کا کفار کے ساتھ تھا پھر اس کے ذکر کی طرف منتقل ہوئے، کون سے کفار، وہ جو مومنوں کو طاعتِ الٰہی سے روکتے ہیں۔ پس فرمایا: تم مومنوں کو خوش خبری دو اس بات کی کہ اللہ پاک ان کو کفار پر بلند کر دے گا اور خبر دو کہ اللہ اُن سے مشرکوں کی دھوکے بازی کو دفع فرما دے گا اور اس کی علت یہ بیان کی کہ کفار اللہ پاک کی امانت میں بڑی خیانت کرنے والے ہیں، اس لحاظ سے کہ انھوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہو کر اپنی جانوں کو ہلاک کیا ہے۔ اس

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢١) [2] البحر المحيط (٦/ ٣٤٦) [3] فتح البيان (٩/ ٥٤)

سے بڑھ کر اللہ کی خیانت اور کون سی ہوگی، کیوں کہ سوائے اللہ کے نام کے غیر کا نام ذکر کرنا اور ذبیحہ سے بتوں کی طرف تقرب چاہنا، یہی تو کفرِ نعمت ہے، پھر کیوں کر اللہ ان کی مدد کرے گا۔ یا وہ جو مومنوں کو تکلیف دینے پر جمے ہوئے ہیں، ان کو کس طرح ایسے ہی چھوڑ رکھے گا، یعنی ہرگز نہیں، بلکہ ان کو مغلوب اور مقہور کرے گا۔ اس آیت کی مثل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [المؤمن: ۵۱] ''بلاشبہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں۔''

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے، انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا، اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے (39) وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں، جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے (40)

قتال کا حکم اور جہاد کی پہلی آیت:

جو اس کی مدد کرے گا، یعنی اس کے دین کی اور اس کے رسول کی، اللہ قادر ہے، جو چاہے ایک دم میں کرے، لیکن انسان سے یہی معاملہ ہے کہ بھلے برے آپس میں سزا پائیں۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حق میں نازل ہوئی ہے، جبکہ مکے سے نکالے گئے۔ سلف میں سے بہت لوگوں نے کہا، جیسے: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عروہ بن الزبیر، زید بن اسلم، مقاتل بن حیان اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کہ

یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے۔ امام مجاہد، ضحاک، قتادہ اور غیر واحد رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے نکالے گئے تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انھوں نے اپنے نبی کو نکالا ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٦] ''بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔'' البتہ ہلاک ہوگی قوم۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس میں پہچان گیا کہ عن قریب قتال ہوگا۔ (رواه الإمام احمد عن اسحق بن يوسف الأرزق به) اتنا زیادہ کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ پہلی آیت ہے، جو قتال میں نازل ہوئی۔[2] (رواه الترمذي و النسائي في التفسير من سننيهما و ابن أبي حاتم من حديث إسحاق بن يوسف، زاد الترمذي و وكيع كلاهما عن سفيان الثوري به وقال الترمذي: حديث حسن و قد رواه غير واحد عن الثوري و ليس فيه ابن عباس رضي الله عنهما)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾ یعنی وہ قادر ہے اپنے مومن بندوں کی مدد پر بغیر قتال کے، لیکن وہ اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ اس کی اطاعت میں اپنی جہد اور طاقت کو خرچ کریں، چناں چہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ڕ ذٰلِكَ ړ وَلَوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَانْتَـصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴾ [محمد: ٤۔٦] ''چناں چہ جب تم (جہاد میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو (ان کی) گردنیں مارو، حتیٰ کہ جب تم انھیں خوب قتل کر چکو تو (قیدیوں کو) بیڑیوں میں مضبوطی سے باندھ دو، پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے، حتیٰ کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے، (حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا، لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے، تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ وہ جلد ان کی راہنمائی کرے گا اور اُن کے حال کی اصلاح کرے گا اور وہ انھیں (اس) جنت میں داخل کرے گا جس کی ان کو خوب پہچان کروا چکا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٤٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٠)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٤٣، ٦٤٤) مسند أحمد (١/ ٢١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٨٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٧٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٤۔ ١٥] ''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا۔ اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔'' نیز فرماتا ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٦] ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمھیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا؟ جب کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ ان کی خوب خبر رکھتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٤٢] ''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ ﴾ [محمد: ٣١] ''اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے، حتی کہ تم میں سے مجاہدین کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں، اور ہم تمھارے حالات جانچ لیں۔''

اس بارے میں آیاتِ کریمہ بہت ہیں اور اسی واسطے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾۔ اور اسی واسطے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: ''وقد فعل'' یعنی اللہ پاک نے ایسا کر دیا اور جہاد کو جو اس نے مشروع کیا، لہٰذا ایسے وقت میں جو اس کے لیے بہت موزون تھا، کیوں کہ جس وقت وہ مکے میں تھے تو مشرکوں کی تعداد زیادہ تھی، لہٰذا اگر مسلمانوں کو حکم ہوتا کہ وہ باقی لوگوں سے قتال کریں، اس حال میں کہ وہ ان کے عشر (دسویں حصے) سے بھی کم تھے تو البتہ اُن پر شاق گزرتا اور اسی لیے جبکہ یثرب والوں نے شبِ عقبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور وہ اسی سے کچھ زیادہ تھے تو عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم وادی والوں پر حملہ نہ کریں، ان کی مراد منیٰ والے تھے، منیٰ کی راتوں میں، پس ہم ان کو مار ڈالیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس کا حکم نہیں ہوا۔[1]

پھر جب مشرکوں نے بغاوت کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے درمیان سے نکالا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو متفرق کر کے بھگا دیا، لہٰذا اُن میں سے ایک گروہ تو حبشہ چلا گیا اور دوسرے لوگ مدینہ منورہ کو چلے گئے، پھر جب مدینہ منورہ میں قرار پکڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بچایا اور صحابہ رضی اللہ عنہم آپ پر جمع ہو گئے اور آپ کی مدد کے ساتھ قیام کیا اور مدینہ اُن کے واسطے دارالاسلام ہو گیا اور ایک قلعہ بن گیا کہ اس کی طرف

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٦٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: تخریج الظلال للألباني (١/ ٢٣١)

پناہ پکڑیں۔ اب اللہ پاک نے دشمنوں کے ساتھ جہاد کو مشروع کیا۔

پس یہ پہلی آیت ہے جو اس بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ ﴾ تا ﴿ بِغَيْرِ حَقٍّ ﴾۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے مکے سے مدینے کی طرف بغیر حق کے نکالا، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو۔[1] ﴿ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ یعنی انھوں نے اپنے قول سے کوئی برائی نہیں کی نہ اُن کا کوئی گناہ تھا، مگر صرف یہ کہ انھوں نے اللہ کی توحید کی اور اسی وحدہٗ لاشریک لہ کو پوجا۔ بہ نسبت ما فی نفس الامر کے یہ استثنا منقطع ہی رہا مشرکوں کے نزدیک، لہٰذا اللہ پاک کو ایک جاننا ان کے نزدیک بہت ہی بڑا گناہ ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ [الممتحنة: ١] ”وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلا وطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“ قصۂ اصحابِ اخدود میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ [البروج: ٨] ”اور انھیں ان (مومنوں) کا یہی کام برا معلوم ہوا کہ وہ اللہ، غالب، قابلِ تعریف پر ایمان لائے تھے۔“ اسی لیے مسلمان جس وقت خندق کھودتے وقت رجز پڑھتے تو یوں کہتے تھے:

اللهم لولا أنت ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا
فأنزلن السكينة علينا وثبت الأقدام إن لاقينا
أن الألٰى قد بغت علينا إذا أرادوا فتنة أبينا

یعنی الٰہی اگر تو نہ ہوتا تو ہم راہ نہ پاتے، نہ ہم صدقہ کرتے نہ نماز پڑھتے، پس تو ہم پر سکینہ اُتار اور قدموں کو ثابت رکھ جب کہ ہم دشمنوں سے ملیں، بے شک مشرکوں نے ہم پر بغاوت کی ہے، جب وہ فتنہ چاہیں گے، یعنی شرک، تو ہم انکار کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ بھی صحابہ کی موافقت کرتے اور اُن کے ساتھ آخر قافیہ کو کہتے، لہٰذا جس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم ”إذا أرادوا فتنة أبينا“ کہتے تو آپ ﷺ ”أبينا“ کو لمبی آواز سے ادا فرماتے۔[2]

مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہیں:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ﴾ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ایک قوم کے ساتھ ایک قوم سے دفع کرے اور ایک لوگوں کے شر کو ان کے غیر سے روکے، ان اسباب کے ساتھ جن کو وہ پیدا کرتا ہے اور مقدر فرماتا ہے تو زمین بگڑ جاتی اور طاقتور کمزور کو ہلاک کر ڈالتا۔ ﴿ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ ﴾ سیدنا عبداللہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٣)

بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ابو العالیہ، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ صوامع رہبان کے چھوٹے عبادت خانے ہیں۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ صابئین کے عبادت خانے ہیں۔ اُن سے ایک روایت میں یہ ہے کہ صوامع مجوس ہیں۔ مقاتل بن حیان نے کہا: ﴿ صَوَامِعُ ﴾ وہ گھر ہیں، جو راہوں پر ہوتے ہیں اور ﴿ بِيَعٌ ﴾، ﴿ صَوَامِعُ ﴾ سے زیادہ وسیع ہوتے ہیں اور عابد لوگ اُن میں ﴿ صَوَامِعُ ﴾ کی نسبت زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ ﴿ بِيَعٌ ﴾ بھی نصاریٰ کے ہیں۔ امام ابو العالیہ، قتادہ، ضحاک، ابن صخر، مقاتل ابن حیان اور خصیف رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔

امام ابن جبیر رحمہ اللہ نے امام مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ ﴿ بِيَعٌ ﴾ یہود کے کنیسے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے "عمن حدثه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما" نقل کیا ہے کہ ﴿ بِيَعٌ ﴾ یہود کے کنیسے ہیں اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے جو کہا ہے، پس وہ کنیسے کہا ہے۔ والله أعلم. امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ صلوٰت کنیسے ہیں۔ اسی طرح امام عکرمہ، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ صَلَوٰتٌ ﴾ یہود کے کنیسے ہیں، یہ لوگ کنیسوں کا نام صلوٰت رکھتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے عمن حدثہ عن ابن عباس نقل کیا ہے کہ صلوٰت نصاریٰ کے کنیسے ہیں۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ صابئین کے عبادت خانے ہیں۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ صلوٰت اہلِ کتاب کی مسجدیں ہیں اور اہلِ اسلام کی راہوں میں ہیں۔ رہی مساجد پس وہ مسلمانوں کی ہیں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ﴾ کی ضمیر میں کہا ہے کہ مساجد کی طرف پھرتی ہے، کیوں کہ جو اشیا اس سے پہلے مذکور ہیں، ان سب سے یہ قریب تر ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ "لهدمت صوامع الرهبان وبيع النصارىٰ وصلوٰت اليهود" یہ یہود کے کنیسے ہیں۔ "ومساجد المسلمين التي يذكر فيها اسم الله كثيرا" اس واسطے کہ مستعمل و معروف کلامِ عرب میں یہی ہے۔[1] بعض علما نے کہا ہے کہ یہ ترقی ہے قلیل کی طرف سے کثیر کی طرف، یہاں تک کہ انتہا ہے مساجد کی طرف، انھیں کے آباد کرنے والے اور عبادت کرنے والے بہت ہیں اور یہی لوگ صحیح قصد والے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ۷۔ ۸] "اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور وہ (اللہ) ان کے اعمال ضائع کر دے گا۔" قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ٦٥٠۔ ٦٥١)

﴿لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کا قوت اور عزت کے ساتھ وصف فرمایا۔ پس اس نے اپنی قوت سے تو ہر شے کو پیدا کیا، ﴿فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيرًا﴾ اور اس کی عزت کے سبب سے کوئی قاہر اس کو مقہور نہیں کرسکتا، نہ کوئی غالب اس پر غالب ہوسکتا ہے، بلکہ ہر شے اس کے سامنے ذلیل وخوار ہے، اس کی طرف محتاج ہے اور جو شخص ناصر، قوی، عزیز ہو تو وہی منصور ہوتا ہے اور اس کا دشمن مقہور۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧١﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿١٧٢﴾ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ [الصافات: ١٧١۔ ١٧٣] ''اور درحقیقت ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے ان بندوں کے لیے صادر ہو چکا ہے جو رسول ہیں۔ کہ یقیناً انہی کی مدد کی جائے گی۔ اور بلاشبہہ ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ [المجادلة: ٢١] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔''

امام ابوعمرو اور عاصم نے ﴿أُذِنَ﴾ کو بصیغۂ مجہول پڑھا ہے، باقی قاریوں نے بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔ رہا ﴿يُقَاتَلُونَ﴾ تو امام نافع، ابن عامر اور حفص نے مجہول پڑھا ہے، باقیوں نے معروف پڑھا ہے۔ دونوں فعلوں میں یہ بات حاصل ہوئی کہ نافع وحفص ﷬ نے دونوں کو مجہول پڑھا۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی ﷭ نے دونوں کو معروف پڑھا ہے۔ امام ابوبکر و ابوعمرو ﷬ نے پہلے کو مجہول دوسرے کو معروف اور ابن عامر نے اس کا عکس کیا۔ پس یہ چار قراء تیں مرتب ہیں:[1] اول: فعل معروف ہو یا مجہول بہرحال فاعل اس کا اللہ پاک ہے۔ ثانی: فعل کو، جبکہ مجہول پڑھیں گے تو معنی یہ ہوں گے کہ جن لوگوں سے مشرک لڑتے ہیں، ان کو اللہ پاک نے قتال کا اذن دیا۔

معروف کی صورت میں یہ معنی ہیں کہ جو لوگ مشرکین سے لڑتے ہیں، (یعنی لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں، باعتبار مایؤل کے کہہ دیا ہے۔ مجہول کی قراءت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔) ان کو اللہ پاک نے قتال کا حکم دیا۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک کی طرف سے اذن ہے اپنے مومن بندوں کو، اس بات کا کہ جس وقت مشرک اُن سے لڑیں یا وہ خود صالح و لائق قتال کے ہوں تو اُن سے لڑیں۔ جس شے کا اذن دیا، یعنی قتال، اُس کا ذکر نہ کیا، اس لیے کہ وہ معلوم ہے ﴿يُقَاتَلُونَ﴾ اس پر دال ہے۔

﴿بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا﴾ میں حرفِ باسببیت کے واسطے ہے، ﴿أُذِنَ﴾ سے متعلق ہے، یعنی قتال میں اذن ملنے کا یہ سبب ہے کہ کافر ومشرک ان پر ظلم کرتے ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ مکے کے مشرک صحابۂ رسول اللہ ﷺ کو اپنی زبانوں اور ہاتھوں سے ایذا دیا کرتے تھے، وہ لوگ اس کی شکایت آپ ﷺ کے پاس لاتے تو آپ ﷺ فرماتے کہ صبر کرو، کیوں کہ مجھے قتال کا حکم نہیں ملا۔ یہاں تک کہ آپ نے ہجرت فرمائی، پھر اللہ پاک نے مدینہ منورہ میں یہ آیت نازل فرمائی۔ پہلی آیت جو قتال کے بارے میں اُتری وہ یہی ہے، اس کے بعد کہ ستّر سے کچھ اوپر آیات میں

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٤)

قتال سے ممانعت ہو چکی تھی۔ ان میں آپ ﷺ کو صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہوا تھا۔ اس آیت نے ان سب کو منسوخ کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک معین قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ مہاجر ہو کر مکے سے مدینے کی طرف نکلے تو مشرکین اُن کے آڑے آئے، اس پر اللہ پاک نے اُن لوگوں کے قتال میں اذن دیا، جو اُن کو ہجرت سے منع کرتے تھے۔ یہ آیت بھی ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ ﴾ [الحج: ٣٨] کے مضمون کی تقریر و تائید کرتی ہے، کیوں کہ قتال کا مباح کرنا اسی بات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے مدافعت کرے گا۔

پھر اللہ پاک نے مومنین سے اس بات کا وعدہ کیا کہ مشرکین پر ان کو مدد دے گا، جس طرح کہ ان سے دفع کرنے کا وعدہ کیا، پس ارشاد فرمایا: ﴿ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ﴾ اس میں بھی مدافعت کی تاکید ہے اور انتہا درجے کی تاکید، کیوں کہ پہلے تو جملہ اسمیہ ذکر فرمایا جو دوام و ثبات پر دال ہے، پھر اس کو مصدر بحرف تحقیق کیا۔ قدیر صیغۂ مبالغہ ذکر فرمایا، پھر اس پر تاکید کا لام بڑھایا اور اس کے متعلق کو اس پر مقدم کیا، لیکن یہ وعدہ بطرر رمز و کنایہ ہے، کیوں کہ صریح عبارت یہ ہے: "وإنه ينصرهم"۔ چوں کہ کنایہ میں بہ نسبت تصریح کے زیادہ مبالغہ ہوتا ہے، اس لیے وعدۂ نصرت کو کنایہ کے پیرائے میں ادا فرمایا، اس لیے کہ احکم الحاکمین، رب العالمین شہنشاہ کا کنایہ ہزار تصریح سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یا اس لیے کہ اگر صریح وعدہ ہو تو اس پر بھروسا کر کے اپنے کام میں تقاعد و تکاسل (سستی) کریں اور پوری سعی و جدوجہد بجا نہ لائیں۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفار سے قتال کرنا بغیر اللہ تعالیٰ کے اذن کے جائز نہیں ہے اور اسی واسطے موسیٰ علیہ السلام نے جب قبطی کافر کو مکا مارا اور اسے مار ڈالا تو کہا: ﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ﴾ [القصص: ١٥] ''یہ (قتل) شیطان کے عمل سے ہے۔'' یعنی قبطی کا مار ڈالنا، شیطان کے کام سے ہے، کیوں کہ وہ اس بارے میں اللہ پاک کی طرف سے مامور نہ تھے۔

غرض کہ اللہ پاک نے جب مومنین کو کفار کے قتال کا اذن دیا اور اس کی علت یہ بیان کی کہ وہ مظلوم ہیں اور بطورِ رمز و کنایہ نصرت کا بھی وعدہ کیا تو اب اُن کے مظلوم ہونے کی تفسیر ذکر کی۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ الَّذِيْنَ ﴾ محلِ جر میں ہے اس بنا پر کہ ﴿ لِلَّذِيْنَ ﴾ کی صفت ہے یا بدل یا بیان۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محلِ نصب میں ہو، بنا بر مدح، یا موضعِ رفع میں ہو اس بنیاد پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو، یعنی "هم الذين"۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے تین وجہیں لکھی ہیں: ایک بدل ﴿ لِلَّذِيْنَ ﴾ سے۔ دوسرے نصب بہ اضمار "أعني"۔ تیسری رفع بنا بر خبر مبتدائے محذوف۔[2] "دِيَار" سے مراد مکہ معظّمہ ہے۔ ﴿ بِغَيْرِ حَقٍّ ﴾ متعلق ہے مفعول مطلق محذوف سے "أي إخراجاً بغير موجب استحقوا الخروج به"۔ ﴿ حَقٍّ ﴾ مصدر ہے "حق الشيئ يحق بالكسر أي وجب" کا۔ معنی یہ ہیں کہ وہ

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠٦)

لوگ اپنے گھروں سے نکالے گئے، نکالے جانا بغیر کسی موجب کے کہ جس کے سبب سے وہ نکلنے کے لائق ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ بلاقصور ناحق اُن کو اُن کے گھروں سے نکالا ہے۔

﴿ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ میں دو قول ہیں: سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے اس میں "إلا" بمعنی "لکن" ہوتا ہے۔ محل اس کا نصب ہے، اس واسطے کہ ایسا استثناء کے نصب پر عرب کا اجماع ہے، کیوں کہ اس پر عامل کا مسلط کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر تم یوں کہو گے کہ "الذين أخرجوا من ديارهم بلاحق إلا بأن يقولوا ربنا الله" تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ وہ نکالے گئے بغیر کسی حق کے، جو اُن کے اخراج کا موجب ہو، لیکن ان کا قول "ربنا الله وحده" حالاں کہ یہ قول تو اُن کی تعظیم کا موجب ہے اور اس کا موجب ہے کہ وہ اپنے گھروں میں جمے رہیں، اس بات کا موجب نہیں کہ گھر سے نکال دیے جائیں۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ استثنا متصل ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا بأن يقولوا ربنا الله" امام بیضاوی رحمہ اللہ کا بھی مختار قول یہی ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو لیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو لکھا ہے۔ عامل اس کا محذوف نکالا ہے، استثنائے مفرغ و متصل ٹھہرایا ہے۔[1] محل ﴿ اَنْ يَّقُوْلُوْا ﴾ کا جر ہے بنا بر بدل حق سے، یعنی نکالے گئے اپنے گھروں سے بغیر کسی موجب کے سوائے توحید کے، کون سی توحید؟ وہ جو اس کی سزاوار ہے کہ تمکین کی موجب ہو نہ کہ نکالے جانے کی موجب۔ نہیں نکالے گئے بسبب کسی شے کے، مگر بسبب اُن کے قول کے کہ ﴿ رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾۔ اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ [المآئدة: ٥٩] "کیا تم ہم سے صرف اس وجہ سے ناراض ہوتے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔" اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٦] "اور (اے فرعون!) تو ہمیں صرف اس بات کی سزا دے رہا ہے کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لے آئے ہیں، جب وہ ہمارے پاس آ گئیں۔ اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں اس حال میں فوت کر کہ ہم مسلمان ہوں۔" اسی کی مثل نابغہ کا یہ قول ہے:

لا عيب فيهم غير أن سيوفهم بهن فلول من قراع الكتائب

اس کو مدح بما یشبہ الذم بولتے ہیں، یعنی ان لوگوں میں کسی طرح کا عیب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اُن کی تلواروں میں لشکروں کے مارنے ٹھونکنے سے دندانے پڑ گئے ہیں، حالانکہ یہ کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ یہ تو بڑا ہنر ہے۔ غرض کہ اللہ پاک نے قتال میں اذن دینے کا اول یہ سبب بیان کیا کہ مومنین مظلوم ہو رہے تھے۔ پھر اس ظلم کا بیان کیا کہ وہ ظلم یہ تھا کہ مومنین کو ان کے گھروں سے بلاقصور ناحق نکال دیا۔ ان کا کوئی گناہ نہ تھا کہ ان کو نکالا جاتا، سوائے

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢٢) تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٩) تفسير النسفي (٣/ ١٠٦) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٩)

اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ہے، یہ کوئی گناہ نہیں ہے، بلکہ توحید تو ساری نیکیوں کا سر ہے، کوئی نیکی اس کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ اس بیان کے بعد ایک اور علت اذن کی ذکر کی، پس ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ﴾ ﴿ بَعْضَهُمْ ﴾ بدلِ بعض ہے ناس سے۔ مراد ﴿ بَعْضَهُمْ ﴾ سے کفار ہیں اور ﴿ بِبَعْضٍ ﴾ مومنین ہیں، یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ پاک مجاہدین کو اعدائے دین کے ساتھ قتال کا اذن دیتا تو عبادتیں منقطع ہو جاتیں۔ عبادت خانے اُجاڑ ہو جاتے، لہٰذا اللہ پاک مومنین پر احسان رکھتا ہے اس بات کا کہ مشرکین کی دھوکے بازی کو اُن سے دور کر دے گا اور یہ بات بیان کرتا ہے کہ اس کی عادت یہ ہے کہ اپنے دینِ قویم کو یوں محفوظ رکھتا ہے کہ اپنے اہلِ دین کو کفار کے ساتھ جہاد کرنے کا اذن دیتا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو مشرکین مختلف ملت والوں پر اُن کے زمانوں میں غالب ہو جاتے اور اُن کے عبادت خانوں کو ڈھا دیتے۔

نصاریٰ کے واسطے نہ کوئی بیع چھوڑتے، نہ اُن کے رہبانوں کے واسطے صومع، نہ یہود کے لیے صلوات، یعنی کنیسے، نہ مسلمانوں کے لیے مسجدیں چھوڑتے اور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کی اُمت کے وقت مشرک لوگ مسلمانوں پر اور اہلِ کتاب پر جو اس وقت میں ہیں، غالب ہو جاتے تو دونوں فریق کے عبادت خانوں کو گرا دیتے۔ اس کا واضح بیان یہ ہے کہ اگر یہ دفع نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کنیسے ڈھا دیے جاتے اور عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں صوامع اور بیع اور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مسجدیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیتِ کریمہ کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سب میں یہ قول سب سے صحیح ہے۔[1]

پس اس کی بنا پر اللہ پاک نے جو اُن سے دفع کیا، پس یہ اس وقت تھا کہ جب وہ حق پر تھے اپنے دین کی تحریف اور اس کے منسوخ ہونے سے قبل۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ ظالموں کے ظلم کو عدل والے حاکموں کے ساتھ دفع نہ کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب کو نیکوں کی دعا سے دور کرنا نہ ہوتا۔ امام ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اصحابِ محمد ﷺ کے حق میں اُتاری گئی ہے، فرمایا کہ اگر اللہ اصحابِ محمد ﷺ کے ساتھ تابعین سے دفع نہ کرتا ﴿ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ ﴾[2]

امام ابوحیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اُمتوں میں ایسی ہی عادت جاری فرمائی ہے، اس طرح کہ اس سے کام کا انتظام ہو جائے اور شریعتیں قائم ہو جائیں اور عبادت خانے تباہی سے محفوظ رہیں اور اُن کے لوگ قتل ہونے سے اور متفرق ہونے سے بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ﴾ [البقرة: ٢٥١] ''اور داود نے جالوت کو قتل کیا۔'' اور یہ فرمان: ﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ ﴾ [البقرة: ٢٥١]

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٧٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٤٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٧)

''اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا۔'' اس کا موید ہے۔[1] نافع کی قراءت ''دفاع'' اور ''لَهُدِمَتْ'' بہ تخفیفِ دال ہے، باقی قاریوں نے ''دفع'' اور بہ تشدیدِ دال پڑھا ہے۔ پس جن لوگوں نے ''يُدٰفِعُ'' اور دفاع پڑھا ہے، جیسے: امام نافع، ابن عامر اور کوفیین،[2] لہٰذا صیغۂ مفاعلہ کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دفع میں مبالغے پر دلالت کرے، جس طرح کہ مبالغہ کرتا ہے وہ شخص جو دفع میں مغالبہ کرتا ہے، اس لیے کہ مغالبہ کرنے والے کا فعل زیادہ مضبوط اور زیادہ موثر ہوتا ہے۔ ''ھدمت'' کو جو بہ تشدیدِ دال پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی جگہوں کے اعتبار سے یہی صیغہ مناسب ہے، کیوں کہ اس میں حرف کی زیادتی ہے اور لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ہدم جو یہاں مذکور ہے، پس اس کے معنی حقیقی ہیں، یعنی ڈھا دینا، جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مجازی معنی ہیں، یعنی عبادت خانوں کا عبادت سے معطل ہونا۔ ﴿صَوَامِعُ﴾ ''صومعہ'' کی جمع ہے۔ ''صومعہ'' اونچی عمارت کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''صمع الثريدة إذا رفع رأسها'' یعنی جس وقت کوئی شخص ثرید کے سر کو بلند کرتا ہے تو اس وقت کہتے ہیں: ''صمع الثريدة''. ''رجل أصمع القلب'' مردِ حاد الفطنت کو کہتے ہیں، یعنی تیز طبیعت زیرک۔ اصمع دوسرے لوگوں میں سے مرد حدید القول ہے، یعنی جس کی گفتگو تیز ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اصمع مرد صغیر الاذن ہے۔ پھر صوامع کا ان مواضع میں استعمال کیا گیا، جن پر اسلام میں اذان دی جاتی ہے۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ صومعہ وہ جگہ ہے جس میں رہبان عبادت کرتے ہیں اور عبادت کے لیے اس میں تنہا رہتے ہیں۔ ''بیع'' جمع ہے ''بیعہ'' کی۔ یہ نصاریٰ کے وہ کنیسے ہیں جن کو شہروں میں بناتے ہیں، تاکہ عبادت کے لیے اُن میں جمع ہوں۔ اور صوامع بھی نصاریٰ ہی کے ہیں، مگر وہ اُن کو خالی جگہوں میں بناتے ہیں، جیسے: پہاڑ اور جنگل، الگ تھلگ رہ کر عبادت کرنے کے لیے۔

﴿صَلَوٰتٌ﴾ یہود کے کنیسے ہیں۔ ﴿صَلَوٰتٌ﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ اُن میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ یہاں تقدیرِ مضاف کی ضرورت ہے، یعنی موضعِ صلوٰت، تاکہ ہدم اس پر مسلط ہو سکے۔ یا ''ھدمت'' میں ''عطلت'' کے معنی میں شامل کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿صَلَوٰتٌ﴾ کلمۂ معرب ہے، عبرانی زبان میں اس کی اصل ''صلواث'' بثائے مثلثہ ہے۔ ''صلواث'' ان کی زبان میں بہ معنی مصلی ہے۔ اس صورت میں مضاف مقدر کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے ﴿صَلَوٰتٌ﴾ میں نو قراءتیں ذکر کی ہیں،[4]

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے ان کی تفصیل کی ہے: ایک تو ''صَلَوٰات''، بفتحِ صاد وسکونِ لام۔ دوسری ''صِلوٰات''

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٤٧)
[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٢٩) البحر المحيط (٤/ ٣٤٦)
[3] معاني القرآن (٣/ ٤٣٠۔ ٤٣١)
[4] تفسير القرطبي (١٢/ ٧١)

بکسرِ صاد و سکونِ لام۔ تیسری "صُلُوات" بضمِ صاد و لام۔ چوتھی "صُلَوات" بضمِ صاد و بفتحِ لام۔ پانچویں "صُلْوات" بضمِ صاد و سکونِ لام، جس طرح کہ حجرہ میں تین لغت آئی ہیں۔ چھٹی "صُلُوْت" بضمِ صاد و لام و سکونِ واؤ، جیسے: صلب و صلوب۔ ساتویں "صَلُوثیا" بفتحِ صاد و اسکانِ لام و یاء بعد واو و ثائے مثلثہ۔ آٹھویں "صَلُوثا" بفتحِ صاد و ضمِ لام۔ نویں "صَلَوات" ہے بفتحِ صاد و لام۔[1] ما سوائے مساجد کو، مساجد سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ وہ تعمیر اور وجود کی بنا پر مساجد سے زیادہ پرانی اور سابق ہیں، یا اس لیے کہ اس میں شریف سے اشرف کی طرف انتقال ہو جائے، یعنی لوٹنا ہو، یا اس لیے کہ تہدیم سے اُن کو قرب ہے۔

جملہ ﴿ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴾ چاروں مذکورہ جگہوں کی صفت ہے، کیوں کہ اُن میں سے ہر ایک جمع ہے یا صفت ہے مساجد کی، تفضیل کے لیے اس صفت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ﴿ كَثِيْرًا ﴾ منصوب ہے اس لیے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یا وقت محذوف کی صفت ہے یعنی "ذکراً کثیراً" یا "وقتاً کثیراً". حرفِ لام ﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ﴾ میں قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی اللہ کی، البتہ مدد کرے گا اللہ اس کی جو اس کی مدد کرے گا۔ اللہ کی مدد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے دین کی اور اس کے دوستوں کی مدد کرے۔ اور اللہ کا مدد کرنا یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو اُن کے دشمنوں پر فتح دے اور کامیاب کرے۔ اور نصر ہوتی ہے قوت اور بہادری دینے کے اور ساتھ واضح کرنے دلائل اور بینات کے اور معرفتِ حق اور اطاعتِ الٰہی پر اعانت کرنے کے ساتھ۔ اللہ پاک نے اپنے وعدے کو اس طرح سے پورا کر دیا کہ مہاجرین کو عرب کے صنادید (سرداروں) اور عجم کے اکاسرہ و قیاصرہ پر مسلط فرما دیا اور اُن کے ممالک اور دیار کا انھیں وارث کر دیا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے اولیا کی مدد کرنے پر قوی ہے، اپنے اعدا کے انتقام پر عزیز و غالب ہے۔ ﴿ لَقَوِيٌّ ﴾ وہ ہے کہ ہر شے پر قادر ہے اور ﴿ عَزِيْزٌ ﴾ جلیل و شریف کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ "الممتنع الذي لا يرام ولا يدافع ولا يمانع" یعنی ایسے جاہ والا ہے کہ اس تک کوئی پہنچ نہیں سکتا نہ اس کی مدافعت کر سکتا ہے اور نہ ممانعت کر سکتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿41﴾

(یہ) وہ لوگ (ہیں) کہ جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں (تو) وہ نماز قائم کریں اور زکات دیں، اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے ﴿41﴾

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٤) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٧٢)

اقتدار کے وقت مسلمانوں کے فرائض:

یعنی یہ اُمت دین قائم کرے گی، ایک مدت آخر اللہ ہی جانے۔ انتہٰی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے محمد سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ ... ﴾ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر حق کے، مگر یہ کہ ہم نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر ہم مقدور دیے گئے زمین میں تو ہم نے کھڑی کی نماز اور دی زکات اور حکم کیا بھلے کام کا اور منع کیا برے کام سے۔ ﴿ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ یہ آیت میرے لیے ہے اور میرے اصحاب کے لیے۔ (امام عبد بن حمید اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے بھی تھوڑے سے فرق سے اس کو روایت کیا ہے۔ كذا في فتح القدير)[1] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ صباح بن سوارہ کندی نے کہا ہے کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو خطبہ پڑھتے سنا اور وہ کہہ رہے تھے: ﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾ پھر کہا: خبردار بے شک یہ آیت تنہا والی پر نہیں ہے، لیکن وہ والی اور رعایا پر ہے۔ کیا خبر نہ دوں میں تم کو اس شے کی جو تمھارے واسطے ہے والی پر اس سے اور اُس شے سے جو والی کے لیے ہے تم پر اس سے؟ بے شک اس سے تمھارے لیے والی پر یہ ہے کہ تم کو ان حقوق اللہ کے ساتھ پکڑے جو تم پر ہیں اور لے تمھارے لیے بعض کے جو بعض پر حقوق ہیں اور یہ کہ بتا دے تم کو وہ راہ جو نہایت سیدھی ہے، جب تک کہ وہ طاقت رکھے۔

”وإن عليكم من ذلك الطاعة غير المبزوزة ولا المستكره بها ولا المخالف سرها علانيتها“ یعنی تم پر اس سے اطاعت و فرماں برداری ہے والی کی، لیکن یہ طاعت تغلب کی نہ ہو، نہ زبردستی کی، نہ اس کا باطن مخالف ہو اس کے ظاہر سے۔ مطلب یہ ہے کہ تم پر والی کی سچی اطاعت ہے، منافقانہ اطاعت نہ ہو۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ ﴾ [النور: ٥٥] ”جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا۔“ اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٨] ”اور (اچھا) انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے۔“ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ یعنی اللہ کے نزدیک ہے ثواب اس کام کا جو انھوں نے کیا۔[2]

امام سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ ﴾ اس موصول میں وہی شے جائز ہے جو اس سے پہلے کے موصول میں جائز تھی، اُس پر اس قدر اور جائز ہے کہ اس میں یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ﴾ کے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢٣_ ٦٢٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٢)

﴿ مَنْ ﴾ سے بدل ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے،[1] یعنی "ولينصرن الله الذين إن مكنهم"۔ فتح القدیر میں امام زجاج رحمہ اللہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ موضع نصب میں ﴿ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ﴾ کے ﴿ مَنْ ﴾ کی صفت ہے۔ غیر زجاج نے کہا ہے کہ موضع جر میں ہے، صفت ہے ﴿ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ ﴾ کی۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ... الخ﴾ جواب ہے شرط کا۔ شرط و جزا مل کر صلہ ہے ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ کا اور اس کے پہلے "هم" مبتدا مقدر ہے۔[3] مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو قتال کا اذن ملا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم اُن کو ملک میں مقدور دیں، اس طرح سے کہ ان کو ان کے دشمنوں پر فتح یاب کریں تو وہ اُمور مذکور بجا لائیں۔ کہا ہے کہ ان سے مراد مہاجرین اور انصار اور اُن کے تابعین باحسان ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ پانچوں نمازیں پڑھنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ والیانِ عادل ہیں۔ کسی نے کچھ اور کہا ہے۔ آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایجاب ہے اس شخص پر جس کو اللہ پاک نے ملک میں مقدور دیا اور اس کے ساتھ قائم ہونے پر اس کو قادر کیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ سارے امور کا مرجع اللہ پاک ہی کے حکم اور تدبیر کی طرف ہے، نہ اس کے غیر کی طرف۔ امام ابن ابی حاتم، عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہم اللہ نے اس کی تفسیر میں زید بن اسلم رحمہ اللہ سے، روایت کیا ہے کہ "أرض" سے مراد ارضِ مدینہ ہے، نماز سے مراد فرض نماز ہے، زکات سے مراد فرض زکات ہے، معروف سے مراد "لا إله إلا الله" ہے، منکر سے مراد شرک باللہ ہے۔ ﴿ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ میں کہا ہے: "وعند الله ثواب ما صنعوا"۔[4] خطیب رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ... الخ﴾ وصف ہے مہاجرین کا اور یہ اللہ پاک کی طرف سے اس بات کی خبر بالغیب ہے کہ آیندہ جس پر مہاجرین اور انصار کی سیرت ہوگی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "هذا والله ثناء قبل بلاء"۔[5] مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف کی، اس سے پہلے کہ وہ اس خیر کا اِجرا کریں، جس کا انھوں نے اجرا کیا۔ اللہ پاک تو پہلے سے اُن کی مدح وثنا فرمائے اور رافضی خارجی لوگ اُن کی شان میں بے ادبی سے پیش آئیں، ان پر بے جا طعن کریں، اللہ پاک ان کو سمجھے! ایسی بے انصافی کی ان کو جزا دے! امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثنائے مہاجرین میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو خلفائے راشدین بنے، وہ صحیح امر تھا، کیوں کہ اُن کے سوا اور مہاجرین اُن امور کے مستجمع نہیں ہوئے۔[6]

شیخ زادہ نے اُن کی امامت اور خلافت پر استدلال کی وجہ اس آیتِ کریمہ سے یوں بیان کی ہے کہ اللہ پاک

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۴۳۱) [2] فتح القدير (۳/ ۶۲۳) [3] تفسير الجلالين (۱/ ۴۳۹)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲۴۹۸) [5] روح المعاني (۱۷/ ۱۶۴) [6] تفسير البيضاوي (۴/ ۱۲۹)

نے مہاجرین کا یہ وصف کیا کہ اگر وہ اُن کو زمین میں مقدور دے اور اُن کو خلق پر سلطنت اور نفاذِ قول عطا کرے تو وہ چار امور بجا لائیں گے: نماز قائم کرنا، زکات دینا، ہر نیک کام کا امر کرنا، ہر برے کام سے منع کرنا۔ اور یہ بات ثابت ہو چکی کہ اللہ پاک نے چاروں خلفا کو زمین میں مقدور دیا اور اس پر ان کو سلطنت عطا فرمائی تو واجب ہوا کہ انھوں نے چاروں اُمور ادا کیے، ورنہ اللہ پاک کے کلام کا خلاف لازم آئے گا اور جب انھوں نے ہر معروف کیا اور ہر منکر سے منع کیا تو یہ بات واجب ہوئی کہ وہ حق پر ہوں، پس اس وجہ سے اس آیت نے ان کی امامت پر دلالت کی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ آیندہ مہاجرین کی سیرت کیا ہوگی، اگر ان کو زمین میں مقدور دے گا اور اُن کو دنیا میں فراخی بخشے گا اور اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ کیسے امرِ دین کو قائم کریں گے اور اس میں خلفاے راشدین کی خلافت صحیح ہونے کی دلیل ہے، اس لیے کہ اللہ عزوجل نے ان کو اقتدار اور دین کو نافذ کرنے کی صلاحیت اور سیرتِ عادلہ عطا فرمائی تھی۔ اور امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ لوگ اُمتِ محمد ﷺ ہیں۔ ﴿ وَلِلّٰهِ عٰقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ یعنی امور کا مرجع اللہ پاک کے حکم و تقدیر کی طرف ہے اور اللہ پاک نے جو اپنے اولیاء کے اور اُن کے کلمے کے بلند کرنے کا وعدہ کیا ہے، اس میں اس کی تاکید ہے۔[1]

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿٤٣﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٤٤﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿٤٥﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿٤٦﴾

اور (اے نبی!) اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو بلاشبہہ ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد اور ثمود نے بھی (اپنے اپنے انبیاء کو) جھٹلایا 42 اور قومِ ابراہیم اور قومِ لوط نے بھی 43 اور مدین والوں نے بھی، اور موسیٰ کو بھی جھٹلایا گیا، چناں چہ (پہلے تو) میں نے کافروں کو ڈھیل دی، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا، چناں چہ میرا عذاب کیسا تھا! 44 چناں چہ کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جبکہ وہ ظالم تھیں، تو وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر،

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٦)

اور (کتنے ہی) کنویں بے کار، اور (کتنے ہی) مضبوط محل (ویران پڑے ہوئے ہیں!)﴿45﴾ کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے، یا کان (ہوتے) جن سے وہ سنتے، پس بے شک قصہ یہ ہے کہ (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں ﴿46﴾

جھٹلانے والوں کا انجام:

نبی اکرم ﷺ کی قوم میں سے جن لوگوں نے آپ ﷺ کی مخالفت و تکذیب کی، اس بارے میں اللہ پاک اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر یہ لوگ تمھاری تکذیب کریں تو یہ کوئی نہیں بات نہیں ہے، ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم تکذیب کر چکی ہے۔ یہاں تک فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا، یعنی باوجود اس کے کہ وہ کھلی کھلی نشانیاں اور واضح دلیلیں لے کر آئے۔ ﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ یعنی پھر اُن پر میرا انکار کرنا اور عذاب کرنا کیسا رہا۔ بعض سلف نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے جو اپنی قوم سے ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٤] ”میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔“ کہا تھا، اس قول کے اور اس کے کہ اللہ پاک نے اس کو ہلاک کیا، چالیس برس کا زمانہ تھا۔

صحیحین میں سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ البتہ ڈھیل دیتا ہے ظالم کو، یہاں تک کہ جس وقت اس کو پکڑ لیتا ہے تو اس کو نہیں چھوڑتا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [هود: ١٠٢] ”اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔“[1]

ظالم بستیوں کی تباہی:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ﴾ یعنی کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر ڈالیں۔ ﴿ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴾ یعنی وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والی تھیں۔ ﴿ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ﴾ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ”سقوفها“[2] یعنی اُن کے گھر اُجاڑ ہو گئے اور اُن کے مکان و آبادی معطل ہو گئی۔ ﴿ وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ ﴾ یعنی کتنے کنوئیں ہیں کہ اُن سے پانی نہیں بھرا جاتا نہ اُن پر کوئی وارد ہوتا ہے، حالاں کہ کبھی اُن پر آنے والوں کی کثرت تھی اور ازدحام ہوتا تھا۔ ﴿ وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی کتنے محل چونے سے سفید کیے ہوئے۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، عطا، سعید بن جبیر، ابو الملیح اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے[3] اور لوگوں نے کہا: ”منيف مرتفع“ یعنی اونچا بلند۔ دوسروں نے کہا: ”منيع حصين“ یعنی استوار مضبوط محکم۔ یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٣)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٢) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٤۔ ٦٥٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٣)

سب قول ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، اُن کے درمیان کچھ تضاد نہیں، کیوں کہ محل والوں کو محل کی پختگی بنانے بچایا نہیں، نہ اس کی بلندی و مضبوطی و استواری نے اللہ کے عذاب اُترنے سے اُن کو محفوظ رکھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ [النسآء: ۷۸] ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔''

بطور عبرت کھنڈرات کی سیاحت کرنا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی کیا پھرے نہیں زمین میں اپنے بدنوں سے اور نیز اپنے تفکر سے اور یہ کافی ہے، جیسا کہ ابن ابی الدنیا نے ''کتاب التفکر'' میں مالک بن دینار رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسی بن عمران علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی: ''یا موسی! اتخذ نعلین من حدید و عصا ثم سح في الأرض ثم اطلب الآثار و العبر حتی یتخرق النعلان و تنكسر العصا'' یعنی اے موسیٰ! تو لوہے کی جوتیاں بنا اور ایک لاٹھی لے، پھر زمین میں چل، پھر ڈھونڈ اگلوں کی نشانیوں کو اور عبرتوں کو، یہاں تک کہ جوتیاں پھٹ جائیں اور لاٹھی ٹوٹ جائے۔

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے کہا: بعض حکما نے کہا ہے: ''احي قلبك بالمواعظ، و نوره بالتفكر، و موته بالزهد، وقوه باليقين، وذَلله بالموت، وقرره بالفنا، و بصره فجائع الدنيا، و حذِّره صولة الدهر، و فحش (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن ''فحص'' معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم) تقلب الأيام، واعرض عليه أخبار الماضيين، و ذكره ما أصاب من كان قبله، وسيره في ديارهم و آثارهم، و انظر ما فعلوا و أين حلوا وعَمَّ انقلبوا'' یعنی تو اپنے دل کو وعظ و نصیحت سے زندہ کر اور تفکر سے اس کو روشنی بخش اور زہد سے اس کو مار اور یقین سے اس کو قوی کر اور موت سے اس کو ذلیل کر اور فنا سے اس کو انداز پر لا اور دنیا کے حوادث اس کو دکھا اور زمانے کے دبدبے سے اس کو ڈرا اور زمانے کے لوٹ پھیر کو تلاش کر، گزشتہ لوگوں کی خبریں اس پر پیش کر، اس سے پہلے کے لوگوں کو جو کچھ پہنچا ہے اس کی یاد اسے دلا اور اُن کے دیار و آثار میں اس کو سیر کرا اور دیکھ انھوں نے کیا کیا اور وہ کہاں جا اترے اور کس سبب سے چلے گئے، یعنی دیکھو کہ جھٹلانے والی اُمتوں پر کیا کیا عذاب اور سزا اور انتقام اور وبال نازل ہوا۔

﴿ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ﴾ یعنی یہ چیزیں ہوں تو ان سے عبرت پکڑیں۔ ﴿ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ یعنی اندھا پن سر کی آنکھ کا اندھا ہونا نہیں ہے، اندھا پن تو دل کی آنکھ کا اندھا ہونا ہے، گو قوتِ باصرہ صحیح و سلامت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ

یہ عبرتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتی اور نہ جانتی ہے کہ کیا خبر ہے۔ اس بارے میں بعض شعرا نے کیا خوب کہا ہے۔ یہ شخص ابو محمد عبداللہ بن محمد بن سارہ اندلسی شنتری ہیں، اُن کی وفات ۵۱۷ھ میں ہوئی ہے:

يا من يصيح إلىٰ داعي الشقاء وقد	نادى به الناعيان الشيب والكبر
إن كنت لا تسمع الذكرىٰ ففيم ترى	في رأسك الواعيان السمع والبصر
ليس الأصم ولا الأعمى سوى رجل	لم يهده الهاديان العين والأثر
لا الدهر يبقى ولا الدنيا ولا الفلك	الأعلى ولا النيران الشمس والقمر
ليرحلن عن الدنيا وإن كرها	فراقها الثاويان البدو و الحضر

كذا في ابن كثير۔[1]

مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت کا نزول نبی اکرم ﷺ کی تسلی کے لیے ہوا ہے، اس واسطے کہ پہلے وہ بات بیان ہو چکی ہے، جو مشرکین کی ایذا دہی پر دال ہے کہ انھوں نے آپ کو ایذا دی اس طریقے سے کہ آپ کی تکذیب کی اور آپ کو مع مومنین کے اپنے گھروں سے نکلنے پر ناحق مجبور کیا۔ پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ اس نے مشرکین سے لڑنے میں مظلوموں کو اذن دیا اور آپ کے لیے نصرت کا ضامن ہوا اور ﴿ وَلِلّٰهِ عٰقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ سے اس کی تاکید کی، اس لیے یہ مقام مقامِ تسلی ٹھہرا، لہٰذا اللہ پاک آپ کو تسلی دیتا ہے کہ قومِ نوح علیہ السلام نے اپنے نبی کی تکذیب کی اور عاد نے ہود علیہ السلام کو، ثمود نے صالح علیہ السلام کو اور قومِ ابراہیم علیہ السلام اور قومِ لوط علیہ السلام نے اپنے نبیوں کو، یعنی ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو جھٹلایا اور مدین والوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی۔ پھر فرمایا کہ میں نے جو انبیا سے وعدہ کیا تھا کہ اُن کو اُن کے دشمنوں پر فتح یاب اور منصور کروں گا اور ملک میں ان کو مقدور (اقتدار) دوں گا۔ لہٰذا یہ سب میں نے اُن کو عطا کیا۔ پھر مکذبین میں سے ہر ایک قوم کو ایسی عقوبت کے ساتھ پکڑا جو اس کے ساتھ خاص تھی، پس کیسا ہوا میرا انکار ان پر۔ پس اللہ پاک آپ ﷺ کی تسلی و تعزیت کرتا ہے اور اس کے ضمن میں وعدہ کرتا ہے کہ آپ کے جھٹلانے والوں کو بھی ہلاک کرے گا، جس طرح کہ آپ سے پہلے انبیا کے مکذبین کو ہلاک کیا اور اس میں آپ کو ارشاد ہے اس بات کا کہ اپنی قوم کی ایذا دہی پر صبر کریں اور اس بارے میں پہلے انبیا کی پیروی فرمائیں، یعنی اے اشرف الخلق! تم تکذیب میں کچھ تنہا نہیں ہو، تمھاری قوم سے پہلے اُن لوگوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ہے، تم اُن سے تسلی حاصل کرو۔

ان اُمتوں کا ذکر اور اُن سے اور اُن کے نبیوں سے جو کچھ معاملہ ہوا اور اُن کا کیسا انجام ہوا، یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔ چوں کہ قوم کے معنی اُمت یا قبیلہ کے ہیں، اس لحاظ سے ﴿ كَذَّبَتْ ﴾ بصیغۂ مؤنث ارشاد فرمایا۔ عاد و ثمود

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٣_٣٠٤)

میں قوم کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ یہ دونوں اسی مختصر نام کے ساتھ مشہور ہیں۔ تعبیر میں اصل علم ہوتا ہے اور اُن کے غیر کے واسطے کوئی علم نہیں ہے۔ اس لیے قومِ ہود اور قومِ صالح نہ کہا۔ رہی یہ بات کہ قوم شعیب علیہ السلام کیوں نہ کہا؟ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ قومِ شعیب علیہ السلام میں اصحابِ مدین اور اصحابِ ایکہ شامل ہیں۔ شعیب علیہ السلام کی تکذیب میں اصحابِ مدین پہلے ہیں اصحابِ ایکہ سے، چوں کہ اصحابِ مدین تکذیب میں سابق (پہلے) ہیں، اس لیے خاص انھیں کا ذکر کیا۔ کذبِ موسیٰ میں طرزِ کلام کو بدل دیا، فعل مجہول ذکر کیا اور قومِ موسیٰ نہ کہا، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل تھی، سوانھوں نے ان کی تکذیب نہیں کی، بلکہ ان کو قبط قومِ فرعون اور فرعون نے جھٹلایا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی تکذیب کا ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَكُذِّبَ مُوسٰى ﴾ ایضاً، یعنی موسیٰ کی بھی تکذیب کی، باوجود اس کے کہ اُن کی نشانیاں کھلی ہوئی تھیں اور اُن کے معجزے بڑے بڑے تھے۔ پھر اُن کے غیر کے ساتھ کیا گمان ہے۔

پہلی وجہ کو فتح البیان و فتح القدیر و محلی نے ذکر کیا ہے[1] اور امام خازن، نسفی اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے دونوں کو لکھا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے وجہ ثانی کو اختیار کیا ہے،[2] چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ فَاَمْلَيْتُ ﴾ میں حرفِ فا ترتیبِ اِمہال کے لیے ہے تکذیب پر۔ املاء کے معنی ہیں: اِمہال، یعنی میں نے ان سے سزا کو مؤخر کیا اور اُن کو مہلت دی، یہاں تک کہ اُن کی مقدر کی گئی اجلیں پوری ہوگئیں۔ ﴿ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ فرمایا، ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر رکھا، اس لیے کہ اس میں ان پر زیادہ تشنیع (برا بھلا کہنا) ہے اور کفر کی صفت کے ساتھ اُن کو پکارا گیا ہے۔ ﴿ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ﴾ یعنی مہلت کی مدت گزر جانے کے بعد ساتوں جھٹلانے والی قوموں میں سے ہر ایک کو میں نے عذاب کے ساتھ پکڑا۔

﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ میں استفہام تقریر کے واسطے ہے، یعنی جس شے کو مخاطب جانتا ہے، اس کے ساتھ اقرار کرنے پر اس کو آمادہ کرنا۔ معنی یہ ہیں، پس چاہیے کہ مخاطب لوگ اس بات کا اقرار کریں کہ اُن لوگوں کو میرا ہلاک کرنا اپنے موقع میں واقع ہوا۔ اس استفہام کو تعجب پر محمول کرنا زیادہ تر واضح ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، امام ابو حیان نے کہا ہے کہ تعجب کے معنی اس استفہام کے ساتھ لگے رہتے ہیں، گویا یوں کہا گیا: "ما أشد ما كان إنكاري عليهم"[3] نکیر اسم ہے منکر سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "ثم أخذتهم فأنكرت أبلغ إنكار" امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نکیر و انکار تغییرِ منکر کو کہتے ہیں۔[4]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ نکیر مصدر ہے بہ معنی انکار، پس انکار سے مراد ضد کا ضد سے تغیر کرنا ہے،

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢٤) فتح البيان (٩/ ٦٠) تفسير الجلالين (١/ ٤٣٩)

[2] تفسير الخازن (٥/ ٢٠) تفسير النسفي (٣/ ١٠٧) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٣)

[3] البحر المحيط (٦/ ٣٤٨) [4] فتح القدير (٣/ ٦٢٥)

اس طرح کہ اُن کی حیات کو بدل دیا اُن کی ہلاکت اور موت سے اور اُن کی عمارت کو تباہی سے، یہ انکار بہ معنی لسانی و قلبی انکار نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھو تو ان پر میرا انکار کیسا ہوا کہ نعمت کو محنت سے بدل دیا اور حیات کو ہلاکت سے اور عمارت کو بربادی سے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "أي إنكاري عليهم تكذيبهم بإهلاكهم"[1] یعنی میرا انکار ان پر کیسا ہوا کہ اُن کی تکذیب کو اُن کی ہلاکت سے بدل دیا۔ انھوں نے تو تکذیب کی اور میں نے اس کے بدلے اُن کو ہلاک کر ڈالا۔ نکیر کا کلمہ قرآن شریف میں جہاں کہیں واقع ہوا ہے، ورش اس کی یا کو حالتِ وصل میں ثابت رکھتا ہے اور وقف میں حذف کرتا ہے۔ باقی قراء وصل و وقف دونوں حالتوں میں حذف کرتے ہیں۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اقوامِ مکذبہ کی تفصیل بیان کی کہ فلاں فلاں قوم نے اپنے اپنے نبی کو جھٹلایا، پھر جو اُن کا انجام ہوا اس کا ذکر کیا، اس کے بعد اُن کے سوا اور بہت سی قوموں نے اپنے نبیوں کی تکذیب کی اُن کا حال اجمالی طور پر ذکر کیا۔

پس فرمایا: ﴿ فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ﴾ "كَأَيِّن" میں دو وجہیں جائز ہیں: ایک یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہو فعل مقدر سے اشتغال کی بنا پر، جس کی تفسیر ﴿ اَهْلَكْنٰهَا ﴾ کر رہا ہے۔ "أي وكثيرا من أهل القرى الذين كذبوا أنبياءهم سوى المكذبين المذكورين في الآية المتقدمة أهلكنا أهلكناها" یعنی بہت سے بستیوں والوں کو جنھوں نے اپنے نبیوں کی تکذیب کی سوائے ان مکذبین کے جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے ہلاک کیا ہم نے ہلاک کیا ان کو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "كَأَيِّن" موضعِ رفع میں ہو بنا بر ابتدا اور خبر "أهلكناها" ہو، "أي و كثير أهلكناها" یعنی بہت سی بستیوں والے ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ امام ابو عمرو اور یعقوب نے بلحاظ موافقت "فَأمليت للكافرين أهلكتها" پڑھا ہے۔ باقی قاریوں نے ﴿ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ کی موافقت خیال کر کے ﴿ اَهْلَكْنٰهَا ﴾ بنون پڑھا ہے۔[2] ﴿ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴾ کی نسبت قریٰ کی طرف باعتبار اہلِ قریٰ کے ہے، یعنی بستیوں والے بہ سبب کفر و شرک کے ظالم تھے۔ ﴿ فَهِيَ خَاوِيَةٌ ﴾ مشتق ہے "خوى النجم إذا سقط" سے، یعنی جس وقت ستارا گرتا ہے تو عرب لوگ کہتے ہیں: "خوى النجم" یعنی ستارہ گر پڑا، معنی خاوی کے ساقط ہوئے۔

﴿ عَلٰى عُرُوْشِهَا ﴾ متعلق ہے ﴿ خَاوِيَةٌ ﴾ سے۔ عروش بہ معنی سقوف ہے، اس لیے کہ ہر اونچی شے جو تجھ پر سایہ کرے، گھر کی چھت ہو یا خیمہ یا چھتری یا انگور کی بیل تو وہ عریش ہے۔ "هِيَ" کی ضمیر جو ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ کی طرف راجع ہے، اس سے مراد قریہ کی دیواریں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قریہ کی دیواریں اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، اس طرح سے کہ قریہ کی بنیان (بنیاد) معطل ہوگئی ہے تو اس کی چھتیں گر پڑیں، پھر اس کی دیواریں ڈھے گئیں تو وہ چھتوں کے اوپر گر پڑیں۔ سقوط علی العرش کی نسبت دیواروں کی طرف اس لیے کی کہ دیواریں چوں کہ بنیان میں عمدہ

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٩) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ١٠٨)

ہیں تو ان کو بجائے کل بنیان کے قرار دیا۔

دوسرا قول ﴿خَاوِيَةٌ﴾ کے معنی میں یہ ہے کہ خاوی بہ معنی خالی ہے، اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب گھر اپنے گھر والوں سے خالی ہوتا ہے تو عرب لوگ بولتے ہیں: "خوى المنزل" یعنی مکان گھر والوں سے خالی ہوگیا۔ اس صورت میں ﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ظرفِ مستقر ہوگا موضعِ نصب میں اس بنیاد پر کہ ﴿خَاوِيَةٌ﴾ کی ضمیر سے حال ٹھہرے گا اور اس سے متعلق ہوگا، لیکن ایسا متعلق ہوگا، جیسے حال اپنے عامل سے متعلق ہوتا ہے نہ اس طرح کہ جس طرح جار مجرور کا تعلق اپنے عامل سے ہوتا ہے، کیوں کہ ایسا تعلق جب ہوگا کہ ﴿خَاوِيَةٌ﴾ بمعنی "ساقطة" کے ٹھہرے۔ معنی یہ ہیں کہ ان بستیوں کے لوگ ہلاک کر دیے گئے تو وہ خالی پڑی ہیں اس حال میں کہ اپنی چھتوں پر کھڑی ہیں، یعنی چھتیں اُن کی صحیح سالم باقی ہیں، مگر اس میں بسنے والا کوئی نہیں۔

دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ﴿فَهِيَ﴾ کی دوسری خبر ہو۔ ایک خبر تو ﴿خَاوِيَةٌ﴾ بمعنی "خالية" اور دوسری ﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ٹھہری۔ اس بنا پر ﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ کا تعلق ﴿خَاوِيَةٌ﴾ سے نہ ہوگا، بلکہ "مطلة" محذوف سے متعلق ٹھہرے گا۔ "أي هي خالية وهي على عروشها أي مطلة عليها، يعني مشرفة مائلة" یعنی وہ خالی ہیں اور مائل ہو رہی ہیں اپنی چھتوں پر اس طرح کہ چھتیں تو گر پڑیں اور دیواریں چھتوں پر جھکی ہوئی باقی رہ گئیں۔ اب رہی یہ بات کہ جملہ ﴿فَهِيَ خَاوِيَةٌ﴾ معطوف ہے ﴿اَهْلَكْنٰهَا﴾ پر، ﴿وَهِيَ ظَالِمَةٌ﴾ "وهي ظلمة" پر معطوف نہیں ہے، اس واسطے کہ یہ جملہ ﴿اَهْلَكْنٰهَا﴾ کی ضمیر منصوب سے حال ہے اور اُن کا ہلاک کرنا سقوط علی العروش کے حال میں نہیں ہوا ہے۔ پس جس صورت میں کہ ﴿فَهِيَ خَاوِيَةٌ﴾ "أهلكنها" پر معطوف ٹھہرا تو اس کے لیے اعراب کا کوئی محل نہ ہوگا، جبکہ ﴿اَهْلَكْنٰهَا﴾ کو ناصب "كَأَيِّن" کا مفسر ٹھہرائیں گے، اس واسطے کہ فعل مفسر کے لیے اعراب کا کوئی محل نہیں ہوتا ہے، لہٰذا جو اُس پر معطوف ہے، اس کا حال بھی اسی طرح ہے اور جب "كَأَيِّن" کو مبتدا اور ﴿اَهْلَكْنٰهَا﴾ کو اس کی خبر ٹھہرائیں گے تو جملہ ﴿فَهِيَ خَاوِيَةٌ﴾ بھی محلِ رفع میں ہوگا۔ ﴿وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ﴾ معطوف ہے ﴿قَرْيَةٍ﴾ پر، یعنی "وكم من بئر"۔ (امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "وكم من أهل قرية ومن أهل بئر معطلة وقال الفراء: أنه معطوف على عروشها" [1] (فتح القدير))

﴿بِئْرٍ﴾ ماخوذ ہے "بأرت الأرض" سے، یعنی میں نے زمین کو کھودا۔ اسی معنی سے تابیرِ نخل ہے۔ تابیرِ نخل یہ ہے کہ مادہ کھجور کے خوشے کے کوزون کو چیرتے ہیں اور نر کھجور کے خوشے کو اس میں بربراتے ہیں۔ ﴿بِئْرٍ﴾ بروزن فعل بہ معنی مفعول ہے، جس طرح ذبح بہ معنی مذبوح ہے یعنی کھودا ہوا۔ ﴿بِئْرٍ﴾ کا کلمہ عربی زبان میں مؤنث

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢٥)

آتا ہے، کبھی بہ معنی قلیب لے کر مذکر بھی بولتے ہیں۔ "معطلة" بہ معنی مہملہ ہے، تعطیل سے ماخوذ ہے۔ تعطیل اہمال (یوں ہی چھوڑ دینا) کو کہتے ہیں۔ (یہ قراءت حسن بصری رحمہ اللہ کی ہے۔ قاله في الكشاف[1]) کسی نے یہ تخفیف بھی پڑھا ہے، ماخوذ ہے اعطال سے بہ معنی تعطیل سے۔ مراد معطلہ سے متروکہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے لوگوں سے خالی ہے، اس لیے کہ وہ ہلاک ہو گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ غائرہ، یعنی اس کا پانی تہ میں چلا گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ڈولوں رسیوں سے معطل ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے لوگوں نے اسے معطل کر دیا اور چھوڑ دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کنواں ہے کہ چھوڑ دیا گیا ہے، اس کے کوئی لوگ نہیں ہیں۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ کے مختار معنی یہ ہیں: اور کتنے کنوئیں ہیں آباد جنگلوں میں چھوڑ دیے گئے ہیں، اُن سے پانی نہیں بھرا جاتا ہے، اُن کے لوگوں کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے۔[3] یعنی "معطلة" کے معنی یہ ہیں کہ وہ کنوئیں آباد ہیں، اُن میں پانی ہے اور اُن کے پاس پانی بھرنے کے آلات بھی ہیں، مگر وہ چھوڑ دیے گئے ہیں، اُن کے لوگوں کے ہلاک ہو جانے کی وجہ سے اُن سے پانی نہیں بھرا جاتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے یہ قول بعد کو لکھا ہے، پہلا قول یہ لکھا ہے: "أي متروكة لفقد دلوها ورشائها وفقد تفقدها"[4] یعنی وہ متروک ہیں، اُن کے ڈول و رسی کے نہ ہونے کی وجہ سے اور اس سبب سے کہ کوئی ان کی خبر گیری نہیں کرتا ہے۔ ﴿ وَقَصۡرٍ مَّشِيۡدٍ ﴾ معطوف ہے ﴿ قَرۡيَةٍ ﴾ پر اور ﴿ مِّنۡ قَرۡيَةٍ ﴾ تمیز ہے "كَأَيِّن" کا جو دال ہے تکثیر پر۔ ﴿ قَصۡرٍ مَّشِيۡدٍ ﴾ کہتے ہیں محلِ مرفوع البنیان کو۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ عدی بن زید کا قول بھی اسی پر دال ہے ؎

شاده مرمرا و جلّله كلسا فللطير في ذراه وكور

محاورۂ عرب میں "شادَه"، بمعنی "رفعه" آتا ہے، یعنی اس محل کو سنگِ سفید سے بلند کیا اور اس پر چونا لگایا، اب اس کی بلندیوں میں پرندوں کے گھونسلے ہیں۔ امام سعید بن جبیر، عطا، عکرمہ اور امام مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد ﴿ مَشِيۡدٍ ﴾ سے "مجصص" ہے۔[5] یہی قول امام عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام عبدالرزاق و عبد بن حمید رحمہما اللہ نے عطا رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل نقل کیا ہے۔[6] اس قول کی بنا پر ﴿ مَشِيۡدٍ ﴾ ماخوذ ہے "شيد" سے۔ "شيد" "جَصّ" کو کہتے ہیں، یعنی چونا۔ مدینے والے "جَصّ" کو "شيد" بولتے ہیں۔

امام کلبی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ﴿ مَشِيۡدٍ ﴾ بہ معنی "حصين" ہے، یعنی محکم و استوار۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَشِيۡدٍ ﴾ وہ ہے جو "شيد" سے بنایا جاتا ہے۔ "شيد" بالکسر ہر وہ شے ہے، جس سے تو دیوار کو

[1] الكشاف (٣/ ١٦٣) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٤) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٠)
[4] تفسير النسفي (٣/ ١٠٧) [5] تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٤ ـ ٦٥٧) [6] الدر المنثور (٦/ ٦١)

طلا کرے، چونا ہو یا گارا۔ اور ''شید'' بالفتح مصدر ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''شادہ یشیدہ شیدا جصصہ'' اور ''مشیّد'' بہ تشدید مطول کو کہتے ہیں۔ امام کسائی نے کہا ہے کہ ''مشیّد'' واحد کے واسطے ہے، اللہ پاک کے اس قول سے [1] ﴿ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ﴾ [النساء: ۷۸] ''خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔'' امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں ﴿ مَشِیْدٍ ﴾ کا صیغہ بنایا ''شادہ'' سے اور سورۃ النساء میں ''شیدہ'' سے۔ لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں واقع ہوا ہے بعد جمع کے اس لیے تکثیر مناسب ہوئی اور یہاں واقع ہوا ہے مفرد کے بعد اس لیے تخفیف مناسب ٹھہری اور اس واسطے کہ راس آیت و فاصلہ ہے، معنی یہ ہیں کہ کتنے ﴿ قَصْرٍ مَّشِیْدٍ ﴾ معطل ہیں مثل ﴿ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ ﴾ کے۔

قصر میں تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ وہ معطل ہے اپنے اہل سے، یا اپنے آلات سے، یا مثل اس کے۔ امام محلی رحمہ اللہ کے مختار معنی یہ ہیں کہ کتنے قصر رفیع خالی ہیں اپنے اہل کی موت کے سبب سے۔[2] امام زمخشری اور نسفی رحمہ اللہ نے ﴿ مَشِیْدٍ ﴾ میں دو قول لکھے ہیں: مرفوع یا مجصص۔[3] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''رفیع طویل عال و قیل مجصص''۔[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی دو ہی قول ذکر کیے ہیں: مرفوع یا مجصص۔ پھر کہا ہے کہ یہ مقوی ہے اس بات کو کہ ﴿ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ﴾[5] کے معنی یہ ہیں کہ وہ بستیاں خالی ہیں اپنی چھتوں کے باقی رہنے کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ ﴿ بِئْرٍ ﴾ کا وصف ﴿ مُعَطَّلَةٍ ﴾ سے کیا اور ﴿ قَصْرٍ ﴾ کا ﴿ مَشِیْدٍ ﴾ سے، یہ وصف کرنا اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ﴿ عَلٰی عُرُوْشِهَا ﴾ میں ''علی'' بہ معنی ''مع'' ہے، کیوں کہ اُن میں سے ہر ایک کے وصف مذکور کے ساتھ موصوف ہونے کو زیادہ تر دخل ہے اعتبار میں، یعنی بڑی عبرت اسی میں ہے کہ کنوئیں اچھے خاصے ہیں، پانی بھرا ہوا ہے اور محل اونچے پکے مضبوط کھڑے ہیں اور مکانات کی چھتیں صحیح و سالم کھڑی ہیں، مگر خالی پڑی ہیں، رہنے بسنے والا کوئی نہیں، سب کے سب عذابِ الٰہی سے ہلاک ہوگئے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کتنی بستیاں ہیں کہ ہم نے اُن کو ہلاک کر ڈالا اور کتنے کنوئیں ہیں کہ ان کے پانی بھرنے والوں سے اُن کو معطل کر دیا اور کتنے محل گچے یا بلند ہیں کہ ان کے رہنے بسنے والوں سے ہم نے ان کو خالی کر دیا۔[6] یعنی بادیہ و حاضرہ سب کو ہلاک کر ڈالا، نہ جنگل کی آبادی کو چھوڑا نہ شہر کی آبادی کو، لہٰذا محل تو اپنے لوگوں سے خالی ہوگئے اور کنوئیں اپنے واردین سے خالی ہوگئے۔ ظاہر تر یہ قول ہے کہ ﴿ بِئْرٍ ﴾ اور ﴿ قَصْرٍ ﴾ عموم پر ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ یہ کنواں اور محل حضر موت میں مشہور و معروف ہے، پس محل تو پہاڑ کی چوٹی پر مشرف و مائل ہے، اس کی طرف کسی حال میں چڑھا نہیں جا سکتا اور کنواں اس پہاڑ کے نچلے حصے میں

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢٥) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٣٩) [3] الكشاف (٣/ ١٦٣) تفسير النسفي (٣/ ١٠٧)
[4] تفسير الخازن (٥/ ٢٠) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٠) [6] تفسير النسفي (٣/ ١٠٧)

ہے، جو شے اس میں گرتی ہے ہوا اس کو قرار پکڑنے نہیں دیتی، مگر اس کو نکال ڈالتی ہے۔ اصحاب قصر کے حضر تھے اور کنوئیں کے اصحاب ملوکِ بدو۔ ثعلبی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ کنواں یمن کے عدن میں تھا، ایک شہر میں جس کو حضورا کہتے تھے۔ چار ہزار آدمی اس میں اُترے، اُن لوگوں میں سے جو صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور انھوں نے عذاب سے نجات پائی اور اُن کے ہمراہ صالح علیہ السلام تھے۔ پھر صالح علیہ السلام نے وفات پائی تو اس مکان کا نام حضر موت رکھا گیا، اس واسطے کہ صالح علیہ السلام جس وقت وہاں حاضر ہوئے تو مر گئے، پس انھوں نے حضورا کی بنا کی اور اس کنوئیں پر بیٹھے اور اپنے اوپر ایک شخص کو امیر بنا لیا، اس کا نام جلہس بن جلاس تھا، وہاں ایک مدت قیام کیا، پھر کافر ہوگئے اور بت پوجا۔ اللہ تعالیٰ نے حنظلہ بن صفوان کو نبی بنا کر اُن کی طرف بھیجا، یہ اُن میں حمال تھے۔ لہٰذا بازار میں ان کو قتل کر ڈالا، اس پر اللہ پاک نے اُن کو ہلاک کیا اور اُن کے کنوئیں کو معطل کر دیا اور اُن کے محلوں کو اُجاڑ ڈالا۔

پھر ایک قصہ طویل ذکر کیا۔ اس کے بعد کہا: ﴿ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴾ وہ قصر ہے جس کو شداد بن عاد بن ارم نے بنایا، جس جیسا اور زمین میں نہیں بنایا گیا "فیما ذکروا و زعموا" اس محل کا حال بھی چاہِ مذکور کے حال کی طرح ہے کہ انس کے بعد اس کو موحش (وحشت میں ڈالنے والا) کر دیا اور آباد کرنے کے بعد اُجاڑ دیا۔ کئی میل پر کوئی شخص طاقت نہیں رکھتا کہ اس کے نزدیک جائے، اس لیے کہ اس میں جنوں کی آواز اور بری بری آوازیں سنائی دیتی ہیں، اس کے بعد کہ وہاں راحت، آرام اور عیش و عشرت کا وسیع ساز و سامان تھا اور ملک کی رونق اور انتظام لوگوں کا موتی کی لڑی کی طرح تھا، پھر وہ سب ہلاک ہوگئے اور لوٹ کر نہ آئے، پس اللہ پاک نے اس آیت میں نصیحت اور عبرت کے واسطے اُن کا ذکر کیا، کہا اور کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بختِ نصر نے ہلاک کیا، اس کا قصہ سورۃ الانبیاء میں آیتِ کریمہ: ﴿ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ ﴾ [الأنبيآء: ١١] ''اور ہم نے کتنی ہی بستیاں تہس نہس کر دیں۔'' کی تفسیر کے ذیل میں گزر چکا ہے۔[1] لہٰذا ان کا کنواں معطل ہو گیا اور اُن کے محل اُجاڑ ہو گئے۔

جب اللہ پاک نے ان اگلی اُمتوں کا ذکر کیا، جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور کفارِ مکہ کے پاس اُن کے احوال میں سے کچھ خبریں تھیں کہ اُن کو نقل کیا کرتے تھے اور اُن کے شہروں کو جانتے تھے اور بہت وقت اُن میں سے بہت مقامات پر گزر بھی کیا کرتے تھے تو اس لیے یوں ارشاد فرمایا ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ اُن کو سفر کرنے پر رغبت دلاتا ہے، تاکہ کفار کی ہلاکت کے مقامات کا مشاہدہ کریں تو عبرت پکڑیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سفر کیا اور مقامات کو دیکھا، لیکن عبرت حاصل نہ کی تو وہ اس شخص کی طرح ہوئے جس نے نہ سفر کیا نہ دیکھا، اس لیے ان کے حق میں بطورِ انکار کہا گیا، پس نہیں پھرے زمین میں جس طرح کہ اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٣٧۔ ١٣٨] ''اور بلاشبہ تم صبح کو ان

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٧٥۔ ٧٦)

(کی تباہ شدہ بستیوں) پر سے گزرتے ہو۔ اور رات کو بھی، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟'' حرفِ فا واسطے عطفِ ما بعد کے ہے مقدر پر، جس کا مقام مقتضی ہے، یعنی ''اغفلوا فلم یسیروا فیها'' اس بنا پر استفہام اپنی حقیقت پر نہیں ہے۔

﴿ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ ﴾ منصوب ہے بنا بر جوابِ استفہام اور تقریع ہے منفی پر تو یہ بھی منفی ہوگا، یعنی غافل ہوئے تو ملک میں پھرے نہیں کہ اُن کے دل ہوتے، جن سے جھٹلانے والی اُمتوں کا حال بوجھتے کہ انھوں نے کیا کیا اور اُن کے ساتھ کیا کیا گیا، یا کان ہوتے کہ اُن سے اُن کی خبریں سنتے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ زمین میں پھرے اور پھرے بھی تو کیا پھرے کہ عبرت حاصل نہ کی تو پھرنا اور نہ پھرنا دونوں برابر رہے، نہ اُن کے ایسے دل نہ ایسے کان۔ یا یہ معنی ہیں کہ جن عبرتوں کا انھوں نے مشاہدہ کیا اس کے سبب سے اُن کے دل ہوتے جن سے سمجھتے اس شے کو، جس کا سمجھنا واجب ہے، جیسے: توحید وغیرہ۔ عقل کرنے کی نسبت قلوب کی طرف اس لیے کی کہ وہ عقل کا محل ہیں، جس طرح کہ سننے کا مقام کان ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عقل کی جگہ دماغ ہے، اس سے کوئی مانع نہیں ہے، اس لیے کہ عقل کے ادراکِ عقل کا باعث یہی قلب ہوتا ہے، گو اس کا محل اس سے خارج ہو۔ علمائے معقول نے عقل کے محل اور ماہیت میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے، لیکن یہ مقام اس کے ذکر کا نہیں ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عقل سے مراد علم ہے، اس لیے کہ ﴿ يَعْقِلُونَ ﴾ کا ترجمہ ''یعلمون'' کیا ہے۔[1]

﴿ أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کے کان ہوتے جن سے وہ شے سنتے جس کا سننا واجب ہے، یعنی اللہ پاک کا کلام و وحی جس کو اُن کے نبیوں نے اُن پر پڑھا اور ہلاک کی گئی اُمتوں کی خبریں، جن کو اہلِ اخبار نے اُن کی طرف منتقل کیا۔ ﴿ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ ﴾ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ ہا عماد ہے، جائز ہے کہ ''فإنه'' کہا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہی ہے۔ معنی ایک ہی ہیں۔ ضمیر کو مذکر ذکر کرنا خبر کی بنا پر ہے اور مونث رکھنا بلحاظ ابصار و قصہ ہے۔ یعنی ابصار اندھے نہیں ہیں، یا قصہ یہ ہے کہ ابصار اندھے نہیں ہیں۔ ابصار سے مراد ابصارِ عیون ہیں۔[2]

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَإِنَّهَا ﴾ ضمیر قصہ ہے اور ﴿ لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ ﴾ اس کا مفسر ہے۔ ضمیر میں تانیث کو اس بات نے حسین کر دیا کہ اس کے بعد فعل مونث آگیا اور تذکیر باعتبار امر و شان کے ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَإِنَّهَا ﴾ کی ضمیر قصہ کے واسطے ہے، یا ضمیر مبہم ہے کہ ابصار اُس کی تفسیر کرتا ہے اور ﴿ تَعْمَى ﴾ میں ضمیر ابصار کی طرف راجع ہے اور اسمِ ظاہر ضمیر کے قائم مقام کیا گیا ہے۔[3] مطلب یہ ہے کہ ابصار ضمیر مبہم کا مفسر ہے، اس کا ممیز نہیں ہے، جس طرح کہ ''رُبَّهُ رَجُلًا'' میں ''رَجُلًا'' ضمیر مبہم کا ممیز ہے، ورنہ اس کا نکرہ منصوبہ ہونا واجب ہوتا۔ چنانچہ ممیز میں حق یہی ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ﴿ فَإِنَّهَا ﴾ کی ضمیر سے جو مراد ہے، وہ ﴿ الْأَبْصَارُ ﴾

[1] تفسير الخازن (٥/ ٢١) [2] تفسير القرطبي (١٢/ ٧٧) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣١)

سے معلوم ہوتی ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَلْاَبْصَارُ ﴾ ﴿ تَعْمَى ﴾ کا فاعل نہیں ہے، ورنہ وہ ضمیر مبہم کا مفسر نہ ہوتا، بلکہ ﴿ اَلْاَبْصَارُ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی اور فاعل ﴿ تَعْمَى ﴾ کا اس میں ضمیر مستتر ہے، راجع ہے اس شے کی طرف کہ جس کی طرف "إنها" کی ضمیر راجع ہے، گویا جس وقت کہا گیا: ﴿ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى ﴾ تو کسی نے پوچھا کہ وہ کیا ہے، اس کا یہ جواب دیا گیا کہ ﴿ اَلْاَبْصَارُ ﴾ یعنی "هي الأبصار"

﴿ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ یعنی ان کی ابصار اندھی نہیں ہیں، لیکن ان کے دل اندھے ہیں، جو کہ سینوں میں ہیں عبرت لینے سے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے مشاعر وحواس میں خلل نہیں ہے، خلل جو ہے وہ ان کی عقلوں میں ہے، ہوائے نفس کی پیروی کے سبب سے اور آبا و اجداد کی تقلید میں منہک ہونے سے اُن کی عقلیں آفت رسیدہ ہوگئی ہیں، اس لیے وہ مواطنِ حق اور عبرت کے مقامات کو سمجھ نہیں سکتے۔ صدور کا ذکر تین سبب سے کیا ہے: ایک تو تاکید کے لیے، امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس تاکید سے ہے جس کو عرب لوگ کلام میں زیادہ کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾ [البقرة: ١٩٦] "یہ پورے دس (روزے) ہیں۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٦٧] "وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے۔" نیز فرمایا: ﴿ يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ﴾[1] [الأنعام: ٣٨] "دونوں پَروں سے اُڑنے والا" دوسری وجہ یہ ہے کہ نفی تجوز کے لیے ذکر کیا ہے، یعنی کوئی خیال نہ کرے کہ یہاں شاید قلوب کے مجازی معنی مراد ہوں، جبکہ ﴿ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ کہہ دیا تو مجاز کا احتمال جاتا رہا۔ تیسری یہ ہے کہ زیادتِ تنبیہ کے واسطے ہے، اس بات پر کہ حقیقی نابینائی مشہور ومعروف نابینائی نہیں ہے، جو کہ بصر کے ساتھ خاص ہے، بلکہ حقیقی نابینائی دل کی ہے، کون سا دل جو سینے میں ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان کی "أبصار" "إبصار" سے اندھی نہیں ہوئیں، بلکہ اُن کے دل عبرت پکڑنے سے اندھے ہوئے ہیں۔ ہر انسان کی چار آنکھیں ہیں: دو تو اس کے سر میں ہیں اور دو اس کے دل میں ہیں۔ پس جب دل کی آنکھ بینا ہوئی اور سر کی نابینا تو یہ اس کو مضر نہیں ہے اور اگر سر کی آنکھ بینا ہوئی اور دل کی نابینا تو یہ اس کو نفع نہ دے گی۔ صدور کا ذکر یہ امر بیان کرنے کے لیے کیا ہے کہ علم کا مقام دل ہے اور اس لیے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ قلب سے مراد اس عضو کا غیر ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ "القلب لب كل شيء"، یعنی قلب ہر شے کا خلاصہ ہے۔[2]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت ﴿ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى ﴾ [بني إسرآئيل: ٧٢] "اور جو اس دنیا میں اندھا رہا" نازل ہوئی تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں تو دنیا میں اندھا ہوں، سو کیا میں آخرت میں بھی اندھا ہی ہوں گا۔ اس پر آیتِ مذکور نازل ہوئی۔[3] واللہ أعلم۔ پھر جب اللہ پاک

[1] فتح القدير (٣/ ٦٢٦) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠٧۔ ١٠٨) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣١)

نے مشرکین کی قباحتوں میں سے یہ بات ذکر کی کہ وہ اللہ کی راہ سے اور مسجد الحرام سے روکتے ہیں اور تکذیبِ عظیم پر جمے ہوئے ہیں تو اس کے بعد ان کی برائیوں سے ایک اور برائی ذکر کی، وہ یہ ہے کہ وہ تکذیب اور استہزا کے طریقے سے عذابِ موعود کی جلدی کرتے ہیں۔ پس ارشاد فرمایا:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۴۷ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝۴۸

اور وہ آپ سے جلد عذاب مانگتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا اور بلاشبہہ آپ کے رب کے ہاں ایک دن تمھاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس کی طرح ہے (47) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے (48)

کافروں کا جلد عذاب مانگنا:

یعنی ہزار برس کا کام ایک دن میں کرسکتا ہے۔ انتہیٰ۔ اللہ پاک اپنے نبی ۔صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔ سے فرماتا ہے: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ یعنی یہ کافر ملحد اللہ کے جھٹلانے والے اور اس کی کتاب، رسول اور یوم آخر کی تکذیب کرنے والے تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ۳۲] ”اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ [صٓ: ۱۶] ”اور انھوں نے کہا ہے کہ اے ہمارے رب! ہماری سرنوشت تو ہمیں روزِ حساب سے پہلے ہی دے دے۔“ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ یعنی اللہ نے جو وعدہ کیا ہے کہ قیامت قائم کرے گا اور اپنے اعدا سے انتقام لے گا اور اپنے اولیا کی تعظیم و تکریم کرے گا، لہٰذا وہ ہرگز اس وعدے کو نہ ٹالے گا۔

حکایت:

امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں ابو عمرو بن العلا کے پاس تھا کہ اُن کے پاس عمرو بن عبید آیا تو کہا: اے ابو عمرو! ”هل يخلف الله الميعاد“ یعنی کیا اللہ خلافِ وعدہ کرے گا؟ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: نہیں، اس پر عمرو نے آیتِ وعید کا ذکر کیا تو ابو عمرو نے اس سے کہا: کیا تو عجم سے ہے؟ عرب لوگ تو وعدے سے رجوع کرنے کو قابلِ ملامت

عمل شمار کرتے ہیں اور وعید سے پھرنے کو کرم جانتے ہیں، کیا تو نے شاعر کا قول نہیں سنا ہے؟!: ؎

ليرهب ابن العم والجار سطوتي ولا أنثني عن سطوة المتهدد
فإني وإن أوعدته أو وعدته لمخلف إيعادي ومنجز موعدي [1]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ یعنی اللہ پاک جلدی نہیں کرتا اس واسطے کہ اس کے خلق کے نزدیک ہزار برس کا مقدر اللہ پاک کے نزدیک ایک دن کی مثل ہے بہ نسبت اس کے حلم کے، کیوں کہ وہ اس بات کو جانتا ہے کہ وہ انتقام لینے پر قادر ہے اور کوئی چیز اس سے فوت نہیں ہوتی ہے، گو وہ تاخیر کرے، مہلت دے، چھوڑ رکھے اور اسی لیے اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ... الخ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فقرا مساکین جنت میں اغنیا سے آدھا دن، یعنی پانچ سو برس پہلے داخل ہوں گے۔[2] (رواه الترمذي والنسائي من حديث الثوري عن محمد بن عمرو به وقال الترمذي حسن صحيح)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو موقوفاً روایت کیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فقرائے مسلمین جنت میں اغنیا سے قبل داخل ہوں گے آدھے دن کی مقدار کے برابر۔ سمیر بن نہار راوی کہتے ہیں: میں نے کہا کہ آدھے دن کی مقدار کیا ہے؟ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تو قرآن نہیں پڑھتا؟ میں نے کہا: ہاں پڑھتا ہوں۔ فرمایا: ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾[3]

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک البتہ میں اُمید کرتا ہوں کہ میری اُمت اپنے رب کے نزدیک اس بات سے عاجز نہ ہو کہ وہ اُن کو نصف یوم کی تاخیر دے۔ سعد سے کہا گیا کہ نصف یوم کیا ہے؟ کہا: پانچ سو برس۔[4] (رواه أبو داود في آخر كتاب الملاحم من سننه) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا ان ایام میں سے جن میں اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔[5] (و رواه ابن جرير عن ابن يسار عن ابن مهدي وبه قال مجاهد و عكرمة، ونص عليه أحمد بن حنبل في كتاب الرد على الجهمية)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٥٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٧٦)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٩) [4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٥٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤٨١)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٩) تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٨ـ ٦٥٩)

اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴾ [السجدة: ٥] ''وہ آسمان سے لے کر زمین تک (ہر) کام کی تدبیر کرتا ہے۔ پھر (وہ کام) ایک ایسے دن میں اس کی طرف چڑھ جاتا ہے، جس کا اندازہ تمھاری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے، وہ ایک آدمی سے، جو اہلِ کتاب سے تھا، روایت کرتے ہے، وہ آدمی مسلمان ہوگیا تھا، اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو چھے دن میں پیدا کیا ہے اور ایک دن تیرے رب کے نزدیک ہزار برس کی مثل ہے اس گنتی سے جو تم گنتے ہو اور دنیا کی مدت چھے دن ٹھہرائی ہے اور قیامت کو ساتویں دن میں قرار دیا ہے اور تیرے رب کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کے مثل ہے اس گنتی سے جو تم گنتے ہو۔ لہٰذا چھے دن تو گزر چکے اور تم ساتویں دن میں ہو، پس اس کی مثال حاملہ عورت کی طرح ہے جبکہ وہ اپنے مہینے میں داخل ہو: ''ففي أية لحظة ولدت كان تماما'' یعنی پھر وہ جس گھڑی میں جَن دے وہی پورا ہوا۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان وغیرہ کا بیان یہ ہے کہ جس تکذیب و استہزا پر کفار جمے ہوئے تھے، اللہ پاک نے اس کی ان سے حکایت کی ہے، پس فرمایا: ﴿ وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ ﴾ یعنی وہ تجھ سے عذاب کی عجلت طلب کرتے ہیں، کیوں کہ وہ لوگ عذاب آنے کے سخت منکر تھے۔ رہا عذاب کا جلد طلب کرنا، لہٰذا یہ استہزا اور ٹھٹھے کے طور پر تھا، گویا جس وقت وہ انبیا کو کہتے ہوئے سنتے کہ اللہ پاک نے ان پر عذاب اُتارنے کا وعدہ کیا ہے تو اس وقت ہنسی اُڑاتے ہوئے کہتے کہ عذاب جلد کیوں نہیں آتا؟! اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ ﴾ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس آیت میں اُن کے لیے وعدہ ہے عذاب کا دنیا اور آخرت میں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے ایک اور وجہ ذکر کی یوں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اطلاع دی ہے کہ اس سے کوئی شے فوت نہیں ہوتی اور ایک دن اس کے نزدیک اور ہزار برس اس کی قدرت میں ایک ہے وقوعِ عذاب کے درمیان، جس کی جلدی چاہتے ہیں اور اس کے تاخیر کرنے کی قدرت میں کوئی فرق نہیں، مگر اللہ پاک نے مہلت دے کر اپنا فضل و کرم فرمایا ہے۔[2] انتھی

جملہ ﴿ وَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ ﴾ کا محل نصب ہے بنا بر حال، یعنی وہ لوگ تو عذاب کی جلدی چاہتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اللہ اپنے وعدے کا خلاف کبھی نہیں کرے گا اور وعدہ سابق ہو چکا ہے، پس وہ یقینی ضرور ہی آئے گا بغیر آئے ہوئے نہ رہے گا۔ یا جملۂ اعتراضیہ ہے اپنے ماقبل کا مبین (بیان کرنے والا) ہے۔ پہلے قول کی بنیاد پر جملۂ ﴿ وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴾ مستأنفہ ٹھہرے گا، یعنی سوالِ مقدر کا جواب ہوگا۔ مثلاً

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٤۔ ٣٠٥)
[2] فتح البيان (٩/ ٦٢٦)

کوئی کہے کہ وہ لوگ تو عذاب کی جلدی کرتے ہیں اور اللہ نے عذاب کا وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے تو پھر عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ لہٰذا یہ اس کا جواب ہے کہ ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار برس کے برابر ہے۔ اور دوسرے قول کی بنا پر ماقبل کے جملے پر معطوف ہوگا۔ غرض اس سے ان کا عذاب کو جلدی طلب کرنے کے بارے میں بیان ہے اور اُن کے خطاب کے ساتھ اللہ پاک کا بیان ہے، جس میں اس کا کمال حوصلہ ظاہر ہوتا ہے، کیوں کہ اُس کے نزدیک جو تھوڑی مدت ہے، وہ اُن کے نزدیک طویل مدت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًاۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴾ [المعارج: ٦۔ ٧] ''بے شک وہ (لوگ) اس کو دور دیکھتے ہیں۔ اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں۔''

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ وعید ہے اُن کے لیے اس بات کی کہ اُن کا عذاب آخرت میں ممتد (دراز کیا گیا) ہوگا، یعنی ایک دن ان کے ایامِ عذاب سے آخرت میں ہزار برس کے برابر ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ خوف و شدت کا ایک دن آخرت میں ہزار برس کے برابر ہے دنیا کے برسوں سے جن میں خوف و شدت ہو۔ اسی پر قیاس کر کے عیش و آرام کے دن کا بھی اسی طرح حال ہے۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے ''یعدون'' بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ ﴾ کی مناسبت سے امام ابو عبید نے اس قراءت کو پسند کیا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ... الخ﴾ میں اللہ پاک کی طرف سے اس بات کی اطلاع ہے کہ اس نے کتنی قوموں کو مہلت اور تاخیر دینے کے بعد پکڑ لیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ اب پھر اس کو تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا اور حقیقت میں یہ کچھ تکرار نہیں ہے۔ اس لیے کہ پہلے تو ﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ کی مناسبت سے مہلت دینے کے بیان کو ذکر کرنے کے لیے لایا گیا۔ گویا یوں کہا گیا کہ کتنی بستیوں والے ہیں کہ تمھاری مثل ظالم تھے، میں نے ان کو ایک زمانہ مہلت دی، پھر اُن کو عذاب سے پکڑ لیا اور مرجع سب کا میرے حکم کی طرف ہے۔ اس بنا پر جملہ ﴿ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ کا تقریر ماقبل کی تذییل ہے۔

امام ابو حیان نے بحر میں کہا ہے کہ ضمیر ''يَسْتَعْجِلُوْنَ'' کی قریش کی طرف راجع ہے۔ نبی اکرم ﷺ اللہ کے عذابوں سے اُن کو ڈراتے تھے اور دنیا اور آخرت میں اس کی وعید اُن کو سناتے تھے اور وہ اس کی تصدیق نہ کرتے اور اس کے وقوع کو بعید جانتے تھے۔ پس ان کا عذاب کو جلد طلب کرنا استہزاء کے طور پر تھا۔ کہتے کہ جس شے کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو، وہ واقع نہ ہوگی اور مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا نہیں ہے۔ یہ آیت اس بات کو شامل ہے کہ دنیا میں ان پر عذاب نازل ہوگا۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٧٨) فتح البيان (٩/ ٦٣۔ ٦٤)

اللہ پاک نے اس کا ذکر ﴿ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ میں کیا ہے اور اس بات کو کہ آخرت میں اُن پر عذاب اترے گا اس کا ذکر ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ میں فرمایا ہے۔ پس معنی یہ ہیں کہ ہرگز اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا، یعنی دنیا میں تم پر عذاب نازل کرنے میں اور تمھارے ایامِ عذاب سے آخرت میں ایک دن ہزار برس کے برابر ہے دنیا کے برسوں سے۔ ہزار کی تشبیہ دینے پر اکتفا اس لیے کیا کہ ہزار بلاتکرار آخری عدد ہے۔[1] انتہی ملخصًا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ کیوں تم سے عذاب کی جلدی کرتے ہیں، گویا وہ فوت کو صحیح سمجھتے ہیں اور فوت اسی شخص کے وعدے پر جائز ہوتا ہے کہ جس پر خلاف جائز ہے، حالاں کہ اللہ پاک ہرگز اپنے وعدے کا خلاف نہ کرے گا، جو اس نے وعدہ کیا ہے، وہ ضرور اُن کو پہنچے گا، اگرچہ ایک زمانے کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

﴿ وَاِنَّ يَوْمًا... الخ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس ذات کے عذاب کی کیوں کر جلدی کرتے ہیں کہ جس کے ایامِ عذاب سے ایک دن ہزار برس جتنا لمبا ہے تمھارے برسوں میں سے، اس لیے کہ سختی کے دن لمبے ہوتے ہیں۔[2] شیخ زادہ اور قاضی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت کا نزول نضر بن حارث کے بارے میں ہوا ہے، اس واسطے کہ اسی نے کہا تھا: ﴿ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔'' یہ بات اس پر دال ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو عذاب کا خوف دلاتے تھے، اگر وہ اپنے کفر پر استمرار پذیر ہوں، یعنی جمے رہیں اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ پس اللہ پاک نے اس وعدے کو بدر کے دن پورا فرمایا، ستر آدمی تو مارے گئے اور ستر قید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس استعجال (عذاب کو جلد طلب کرنا) کا ان پر انکار کیا اور انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ استعجال جو ہوتا ہے وہ خوف کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، حالاں کہ اللہ نے جس بات کا وعدہ کیا ہے، وہ ٹلے گی نہیں، بلکہ لا محالہ اُن کو پہنچے گی۔ ''ولو بعد حین'' یعنی گو ایک زمانے کے بعد ہی کیوں نہ پہنچے۔ ''ولو بعد حین'' کلمۂ ﴿ لَنْ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے، اس واسطے کہ ﴿ لَنْ ﴾ مستقبل کی نفی کی تاکید کے لیے آتا ہے اور یہ نفی چوں کہ اللہ پاک کے صبور ہونے کو ظاہر کرتی ہے، اس لیے ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ ﴾ سے اللہ پاک کے صبر کی انتہا کا بیان ہوا۔

اللہ پاک کے نزدیک جو تھوڑی مدت ہے، اس کی تشبیہ اس مدت سے دی جو مخاطبین کے نزدیک طویل ہے، لہٰذا اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس ذات پاک پر زمانہ جاری نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود زمانے کا جاری کرنے والا ہے، اس کے نزدیک زمانہ برابر ہے۔ ایام اور زمانے کا ہونا یا نہ ہونا اور دونوں کا چھوٹا ہونا اور بڑا ہونا برابر ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک نہ صبح ہے نہ شام، نہ دن ہے نہ رات، پس اس بنا پر ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا ﴾ متعلق ہے

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٥٠) [2] تفسير النسفي (٣/ ١٠٨)

﴿ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ ﴾ سے، اس کے مقصود کا متمم ہے۔ یا ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا ﴾ بیان ہے ایامِ عذاب الٰہی کی درازی اور طول کا۔ اس بنیاد پر ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ ﴾ سے متعلق ہوگا اور بیان مستقل ٹھہرے گا استعجالِ عذاب کے انکار کی وجہ کا۔ گویا یوں کہا گیا کہ جلدی چاہتے ہیں ایک دن کے عذاب کی اس کے ایامِ عذاب میں سے، جو تمھارے برسوں میں سے لمبائی میں ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ یہ یا تو اس لحاظ سے ہے کہ ایامِ عذابِ الٰہی کا طول حقیقتاً ہے یا اس لحاظ سے کہ سختی کے دن دراز ہوتے ہیں۔

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ﴾ اصل میں "وكم من أهل قرية" ہے۔ مضاف، یعنی "أهل"، کو حذف کیا اور مضاف الیہ یعنی ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ کو اس کے قائم مقام کیا اعراب و رجوع ضمائر و احکام میں تعمیم و تہویل میں مبالغے کی خاطر۔ یعنی ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ لفظ ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ مجرور باضافت ہوتا مجرور "بمن" نہ ہوتا اور ضمائر اہل کی طرف راجع ہوتے اور املاء، ظلم اور پکڑ تعلق اہل سے ہوتا قریہ سے نہ ہوتا، لیکن جب قریہ قائم مقام اہل کے کیا گیا لفظاً تو وہ سارے اُمور میں اس کے قائم مقام کیا گیا، اس سے غرض تعمیم اور تہویل میں مبالغہ ہے، گویا یہ سارے امور خود بستی کے ساتھ کیے گئے، بستی والے بالضرور اس میں آگئے۔ اب یہ بات رہی کہ اوّل آیت میں "كَأَيِّن" کا عطف بحرفِ فا کیا اور یہاں بحرف واو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا بدل ہے ﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ سے اور یہ "كَأَيِّن" دو پہلے جملوں کے حکم میں ہے اس بات کے بیان کے لیے کہ جس بات کی ان کو وعید سنائی ہے، وہ لامحالہ ان پر نازل ہوگی اور اس کی تاخیر عادتِ الٰہی کے سبب سے ہے۔ (یعنی ﴿ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ یہ دونوں واو کے ساتھ معطوف ہیں۔) یہی وجہ امام زمخشری، بیضاوی اور نسفی رحمہم اللہ نے ذکر کی ہے۔ اس آیت میں ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ﴾ کے بعد ﴿ اَمْلَيْتُ لَهَا ﴾ فرمایا، وجہ اس کی یہ ہے کہ ﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ دال ہے اس بات پر کہ اسی وقت اُن پر عذاب نہیں آیا، اس لیے ذکر املاء (مہلت دینا) حسین ہوا اور اول بعد ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ کے "أهلكتها" کہا، اس واسطے کہ وہ متصل ہے "فأمليت للكافرين ثم أخذتهم" بہ معنی "أهلكتهم" سے۔ كذا قال الكرماني.

امام ابن منذر رحمہ اللہ نے امام عکرمہ رحمہ اللہ سے ﴿ اِنَّ يَوْمًا... الخ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ روزِ قیامت ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام عکرمہ رحمہ اللہ سے یہ روایت کیا ہے کہ دنیا ایک جمعہ ہے آخرت کے جمعوں سے سات ہزار برس اور اُن میں سے چھے ہزار برس گزر چکے۔ امام ابن عدی اور دیلمی رحمہما اللہ نے انس رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل مرفوعاً روایت کیا ہے۔[1] دنیا کی گذشتہ اور باقی مدت کی بحث صاحب فتح البیان رحمہ اللہ نے کتاب "لقطة العجلان" میں خوب تحریر فرمائی ہے۔ امام عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن

[1] الدر المنثور (٦/ ٦٢۔ ٦٣)

عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "قال: من الأيام الستة التي خلق الله فيها السمٰوٰت والأرض"[1] یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو ذکر کیا ہے اور اقوال کے ذکر کے بعد، بلفظِ "قِيلَ" یہ لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک ایک دن اور امہال کے ہزار برس برابر ہیں، کیوں کہ وہ قادر ہے جب چاہے پکڑ لے۔ تاخیر کی وجہ سے کوئی شے اس سے فوت نہیں ہوتی ہے، پس اس کی قدرت میں ہے اس عذاب کا واقع ہونا، جس کی وہ جلدی کرتے ہیں، اور اس کی تاخیر دونوں برابر ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اس کے بعد یوں کہا ہے: "وهذا معنى قول ابن عباس رضی اللہ عنہما"[2]

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٥١﴾

کہہ دیجیے: اے لوگو! میں تو بس تمھیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں (49) چنانچہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے مغفرت اور عزت کا رزق ہے (50) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں (ہمیں) عاجز کرنے کی کوشش کی، وہی دوزخ والے ہیں (51)

اچھے اور برے لوگوں کی جزا وسزا:

اللہ پاک اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ جس وقت کفار اُن سے عذاب کا واقع ہونا طلب کریں اور اس کی جلدی چاہیں تو اُن سے کہہ دیں کہ مجھ کو تو اللہ نے تمھاری طرف نذیر بنا کر بھیجا ہے آگے ایک سخت عذاب کے۔ میری طرف تمھارے حساب سے کوئی شے نہیں ہے، کام تمھارا اللہ کی طرف ہے، اگر وہ چاہے تو تمھارے لیے عذاب جلد لے آئے اور اگر چاہے تو اس کو تم سے مؤخر کر دے اور چاہے تو جو شخص اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس پر رجوع ہو اور چاہے تو جس شخص پر شقاوت (بدبختی) لکھی ہے اس کو گمراہ کر دے، وہ کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے اور جس کا ارادہ کرتا ہے اور اختیار کرتا ہے، کوئی اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی جن لوگوں کے دل ایمان لائے اور اپنے ایمان کی اپنے اعمال سے تصدیق کی ﴿ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ تو اُن کے واسطے بخشش ہے ان گناہوں کی جو پہلے ہو چکے ہیں اور اُن کے تھوڑے سے حسنات پر اچھا بدلہ ہے۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو اللہ کو یہ فرماتے سنے: ﴿ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ تو وہ جنت ہے۔ ﴿ مُعٰجِزِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: "يثبطون

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٥٨) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٩٩)
[2] تفسير الخازن (٥/ ٢١ـ ٢٢)

الناس عن متابعة النبيﷺ" یعنی لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی پیروی سے باز رکھتے ہیں۔ اسی طرح عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے "مثبطین" کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مراغمین"۔ (مراغمہ خشم کردن باہم، یہ قول تو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا لفظ ان سے "مشاقین" ہے۔[1])

جحیم آگ گرم درد دینے والی ہے، جس کا عذاب و نکال سخت ہے۔ أجارنا الله تعالیٰ منها آمين۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴾ [النحل: ۸۸] "جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔"[2] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ لوگوں کو خبر دیں کہ وہ اُن کے لیے ڈرانے والے ہیں قیامت سے پہلے، ان کے لیے وہ شے بیان کرنے والے ہیں جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے۔ پس جو شخص ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہ فائز بمغفرت اور ستر ذنوب (بخشش اور گناہوں کی پردہ پوشی) ہوا اور جو کوئی اس کے برخلاف ہے تو وہ آگ میں ہے۔ ہر قسم سے کریم وہ شے ہے، جو اس قسم کے فضائل اور اس کے کمالات کی جامع ہو۔ ﴿ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے باطل کرنے میں کوشش کی، قرآن شریف کو کہا ہے کہ شعر ہے، یا سحر یا اساطیر الاولین۔ محاورے میں بولتے ہیں: "عاجزه سابقه" اس واسطے کہ دونوں میں سے ہر شخص دوسرے کو عاجز کرنا چاہتا ہے، پھر جب وہ اس پر سابق ہوا تو کہتے ہیں: "أعجزه وعجزه"۔ امام اخفش رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُعٰجِزِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "ظانين و مقدرين"، یعنی وہ اس بات کا گمان و تخمین کرتے ہیں کہ اللہ پاک کو عاجز کر دیں گے اور اس سے فوت ہو جائیں گے تو وہ اُن کو عذاب نہ کرے گا، امام زجاج رحمہ اللہ کا قول یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "معاندين"، یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے۔ جحیم کہتے ہیں: "نار موقدة" کو، یعنی دہکتی آگ۔[3]

اس آیت میں صرف ﴿ نَذِيْرٌ ﴾ پر اکتفا کیا، بشیر و نذیر نہ کہا، باوجود اس کے کہ بعد میں دو فریق کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ سیاقِ کلام مشرکین کے بارے میں ہے اور ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ انھیں کے واسطے ندا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے حق میں ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا ﴾ کہا ہے اور ان کو باستعجالِ عذاب موصوف کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ مومنین اور اُن کے ثواب کا ذکر کیوں کیا، یہ اس لیے ہے کہ مشرکین کو غیظ ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۴۹۹۔ ۲۵۰۰) تفسیر الطبري (۱۸/ ۶۶۱۔ ۶۶۲)
[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۰۵)
[3] فتح القدير (۳/ ۶۲۷) فتح البيان (۹/ ۶۵۔ ۶۶)

کہ آیت میں اکتفا ہے، اس کی دلیل وہ عمومیت ہے جو مذکور ہے مابعد میں تقدیر یہ ہے: "إنما أنا نذير لكم و أنا بشير للمؤمنين"۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اوّل کو پسند فرمایا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے دونوں کو لکھا ہے۔[1]

﴿ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ کے معنی ہیں: "بين الأنذار" یعنی جس شے سے تم کو ڈراتا ہوں، اس کو میں تمھارے لیے واضح کرتا ہوں۔ ﴿ اِنَّمَآ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ میرا کام صرف تم کو ڈرانا ہے، وگرنہ میرے ہاتھ میں نہ عذاب کا جلد لانا ہے نہ اس کی تاخیر۔ پھر مومنین اور عاملین صالحات کو پہلے بشارت دی، اس بات کی کہ ان کے لیے مغفرت ہے، یعنی صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی۔ (قاله الحفناوي)۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ پردہ ہے واسطے صغیرہ گناہوں کے۔ کسی نے کہا ہے کہ توبہ کے ساتھ بڑے گناہوں کے لیے بھی پردہ ہے۔ اور رزقِ کریم ہے، یعنی ایسی روزی جو کبھی منقطع نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جنت ہے۔ امام محلی اور امام بیضاوی رحمہما اللہ نے اسی کو اختیار کیا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے رزقِ حسن کہا ہے۔[2]

پھر ﴿ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا ﴾ میں کفار کو وعید سنائی۔ جب کوئی شخص اپنی سعی سے کسی کے کام کو فاسد کر دے، بگاڑ ڈالے تو اس وقت محاورۂ عرب میں کہتے ہیں: "سعى في أمر فلان" یعنی فلاں کے کام کو بگاڑ ڈالا۔ آیات سے مراد قرآن شریف ہے اور مضاف محذوف ہے، یعنی "في إبطال آيٰتنا" امام ابوعمرو اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے ﴿ مُعٰجِزِيْنَ ﴾[3] بصیغۂ اسمِ فاعل جیم کی تشدید سے پڑھا ہے، اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ ہیں کہ جو لوگ سعی کرتے ہیں، ہماری آیتوں کے باطل کرنے میں اس طرح سے کہ ان کو شعر کہتے ہیں، یا سحر یا اساطیر الأولین، اس حال میں کہ نبی کے متبعین کو عجز کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اُن کو ایمان سے باز رکھتے ہیں، اس بنا پر ﴿ مُعٰجِزِيْنَ ﴾ کا مفعول "مومنین" محذوف ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ "مقدرين عجزنا عنهم" یعنی اس حال میں کہ گمان و اعتقاد کرنے والے ہیں ہمارے عجز کو اُن سے، اس بنا پر ﴿ مُعٰجِزِيْنَ ﴾ کا مفعول اللہ ہے، یعنی معجزين الله سبحانه۔ ایک قراءت میں "معاجزين" ہے، یعنی اس حال میں کہ مسابقین ہیں ہم سے۔ گمان کرتے ہیں کہ بعث و عقاب کا انکار کر کے ہم سے فوت ہو جائیں گے۔ معنی مسابقت کے اُن کی جانب سے تو یہ ہیں کہ اللہ کے عذاب سے بھاگ جائیں گے اور اللہ پاک کی طرف سے یہ معنی ہیں کہ اللہ اُن پر عذاب نازل کرے گا اور وہ اس سے نہ بھاگیں گے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قراءت کے معنی ایک اور وجہ سے بیان کیے ہیں۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ مسابقت ہمراہ

---

[1] تفسير الجلالين (٤٤٠/١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٢) تفسير النسفي (٣/ ١٠٨)

[2] تفسير الخازن (٥/ ٢٢) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٠) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٢) تفسير النسفي (٣/ ١٠٨)

[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٧٩)

مومنین کے ہے، یعنی مومنین سے مسابقت و معارضہ کرتے ہیں، پس جس وقت مومنین اظہارِ حق کے طالب ہوتے ہیں تو یہ لوگ ابطالِ حق کی طلب کرتے ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿مُعٰجِزِیْنَ﴾ کو حالِ مقدرہ قرار دیا ہے،[1] اس لیے کہ اعجاز و تعجیز اُن کی سعی کی مقارن نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں اس سے متاخر ہیں، بخلاف معاجزین کے کہ وہ حالِ مقارنہ ہے، کیوں کہ معاجزہ حالتِ سعی میں ہوتا ہے، غرض کہ جن لوگوں کے وہ کرتوت ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا وہی لوگ اصحابِ جحیم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جحیم نار ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نارِ موقدہ۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک درکہ (جہنم کا طبقہ) کا نام ہے، غرض کہ مراد دوزخ ہے۔ أعاذنا الله منها.

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۙ﴿52﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۙ﴿53﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿54﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا، جب وہ تلاوت کرتا تو شیطان اس کی تلاوت میں (اپنی طرف سے کچھ) ڈال دیتا، پھر اللہ اسے زائل کر دیتا جو شیطان نے (وسوسہ) ڈالا ہوتا، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کر دیتا، اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (52) تاکہ جو (وسوسہ) شیطان نے ڈالا ہے اللہ (اس کو) ان لوگوں کے لیے فتنہ بنا دے جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور ان کے دل سخت ہیں، اور بے شک ظالم تو دور کی مخالفت میں (پڑے) ہیں (53) اور تاکہ وہ لوگ جان لیں جنھیں علم دیا گیا ہے کہ بے شک یہ (قرآن) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، چناں چہ وہ اس پر ایمان لائیں، پھر ان کے دل اس (حق) کے لیے جھک جائیں، اور بے شک اللہ ایمان لانے والے لوگوں کو ضرور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دینے والا ہے (54)

شیطان کے وسوسے اور قصہ غرانیق:

نبی کو ایک حکم اللہ سے آتا ہے، اس میں ہرگز تفاوت نہیں اور ایک اپنے دل کا خیال اس میں، جیسے اور آدمی،

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٢)

خیال کبھی ٹھیک پڑا کبھی نہ پڑا، جیسے نبی کریم ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مدینے سے مکے میں گئے، عمرہ کیا، خیال میں آیا کہ شاید اب کے برس، وہ ٹھیک پڑا اگلے برس۔ یا وعدہ ہوا کافروں پر غلبہ ہوگا، خیال آیا کہ اب کی لڑائی میں، اس میں نہ ہوا، پھر اللہ جتلا دیتا ہے کہ جتنا حکم تھا اس میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی اس میں گمراہ اور بہکتے ہیں، لہٰذا ان کا کام ہے بہکنا اور ایمان والے اور مضبوط ہوتے ہیں کہ اس کلام میں بندے کا دخل نہیں، اگر ہوتا تو یہ بھی بندے کے خیال کی طرح کبھی صحیح کبھی غلط ہوتا اور جس کی نیت اعتقاد پر ہو، اس کو اللہ یہ بات سُجھاتا ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بہت سے مفسروں نے قصہ غرانیق کا اس جگہ ذکر کیا ہے اور یہ بات بیان کی ہے کہ جو لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے، ان میں سے بہت لوگ لوٹ آئے، یہ گمان کر کے کہ مشرکینِ قریش مسلمان ہوگئے، لیکن یہ قصہ ایسے طرق سے مروی ہے کہ سب کے سب مرسل ہیں، میں نے اس کو کسی وجہِ صحیح سے مسند نہیں دیکھا ہے۔ واللہ أعلم۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مکے میں سورۃ والنجم پڑھی، جس وقت آپ اس جگہ پہنچے: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴾ [النجم: ١٩۔ ٢٠] ''کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے۔'' (نزول سورۃ النجم کا ماہِ رمضان سنہ ۵ مبعث میں ہوا اور حبشہ کی طرف ہجرت اسی سال کے ماہِ رجب میں ہوئی اور اسی سال کے ماہِ شوال میں مہاجرین مکے کی طرف آئے، شرح مواہب)۔ کہا تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ کلمہ ڈال دیا: "تلك الغرانيق العلىٰ، وإن شفاعتهن ترتجى" کافر بولے کہ آج سے پہلے ہمارے معبودوں کا خیر سے ذکر نہیں کیا، پھر آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور لوگوں نے سجدہ کیا، اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾[1] (رواه ابن جرير عن بندار عن غندر عن شعبة به بنحوه وهو مرسل، وقد رواه البزار في مسنده عن يوسف بن حماد عن أمية بن خالد عن شعبة عن أبي بشر عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فيما أحسب الشك في الحديث أن النبي ﷺ قرأ بمكة سورة النجم حتى انتهى إلى ﴿أفرأيتم اللات والعزى﴾ و ذكر بقيته، ثم قال البزار: لا نعلمه يروى متصلا إلا بهذا الإسناد تفرد بوصله أمية بن خالد وهو ثقة مشهور، و إنما يروى هذا من طريق الكلبي عن أبي صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

(غرانیق اصل میں طیورِ آب کے ذکور کو کہتے ہیں، واحد اس کا غرنوق کفر دوس ہے یا غرنوق بروزن عصفور، یا غرنیق بروزن علیق یا بروزن مسکین۔ یہ نام اس کی سفیدی کے سبب سے رکھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ کرکی ہے اور

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٠۔ ٢٥٠١) تفسير الطبري (١٨/ ٦٦٦) كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/ ٧٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٥۔ ٣٠٦) یہ روایت مرسل ہے۔

غرنوق جوان ابیض ناعم کو بھی کہتے ہیں۔ کفار کا زعم یہ تھا کہ بت ان کو اللہ سے قریب کرتے ہیں اور اُن کے واسطے شفاعت کرتے ہیں، اس لیے بتوں کی تشبیہ اُن پرندوں سے دی ہے جو آسمان میں بلند ہوتے ہیں۔ مواہب وشرح آن۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ "ویطلق الجمیع علی السادات" یعنی غرنیق وغرنوق وغرانیق کا اطلاق سرداروں پر ہوتا ہے)۔ پھر اس حدیث کو ابن ابی حاتم نے امام ابو العالیہ اور سدی رحمہم اللہ سے مرسلاً روایت کیا ہے اور اسی طرح امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی محمد بن کعب قرظی و محمد بن قیس رحمہما اللہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ امام قتادہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ مقام کے نزدیک نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ اُونگھ گئے تو شیطان نے آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمہ ڈال دیا: "وإن شفاعتها ترتجى و إنها لمع الغرانيق العلٰى" پس مشرکوں نے اس کو یاد کر لیا اور شیطان نے جرأت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کو پڑھا ہے۔ "فذلت بها ألسنتهم" یعنی وہ کلمہ مشرکوں کی زبانوں پر چڑھ گیا، اس پر اللہ پاک نے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا... الخ﴾ نازل فرمائی۔

پس اللہ پاک نے شیطان کو مطرود کر دیا۔ پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن شہاب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سورۃ النجم نازل کی گئی اور مشرک کہا کرتے تھے کہ اگر یہ شخص ہمارے معبودوں کا ذکر خیر سے کرتا ہوتا تو ہم اس کو اور اس کے اصحاب کو برقرار رکھتے، لیکن وہ تو یہود و نصاریٰ کا، جو اس کے دین کے مخالف ہیں، اس گالی اور برائی کے ساتھ ذکر نہیں کرتا جس کے ساتھ ہمارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب کو جو ایذا و تکذیب مشرکوں سے پہنچی تھی، یہ بات آپ پر سخت گزری اور اُن کی گمراہی نے آپ ﷺ کو غمگین کیا، لہٰذا آپ ﷺ ان کے ہدایت یاب ہونے کی تمنا فرماتے تھے۔

پھر جب اللہ پاک نے سورۃ النجم نازل کی، کہا: ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝١٩ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝٢٠ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى﴾ تو شیطان نے اس آیت کے نزدیک کئی کلمے القا کیے، جبکہ اللہ نے بتوں کا ذکر کیا تو شیطان نے کہا: "و إنهن لهن الغرانيق العلٰى، و إن شفاعتهم لهي التي ترتجى" اور یہ شیطان کے سجع و فتن سے تھا، پس مکے میں ہر مشرک کے دل میں یہ دو کلمے واقع ہو گئے اور اُن کی زبانوں پر چڑھ گئے اور اُن سے خوش ہوئے اور بولے کہ بے شک محمد اپنے اگلے دین اور اپنی قوم کے دین کی طرف رجوع کر گئے، پھر جس وقت رسول اللہ ﷺ آخر نجم کو پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور مسلم یا مشرک، جو لوگ حاضر تھے، ان سب نے بھی سجدہ کیا سوائے ولید بن مغیرہ کے کہ یہ ایک بڑا آدمی تھا، پس اس نے اپنی مٹھی بھر مٹی اُٹھائی، پھر اس پر سجدہ کیا۔ (تفسیر خازن میں یوں ہے کہ مسجد میں مومن و کافر کوئی باقی نہ رہا، مگر اس نے سجدہ کیا سوائے ولید بن مغیرہ اور ابو احیحہ سعید بن العاص کے کہ اُن دونوں نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور اپنی پیشانیوں کی طرف اُٹھائیں اور اُن پر سجدہ کیا، اس واسطے کے

یہ دونوں بڑے بوڑھے تھے، سجدے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔[1] واللہ أعلم)

پس دونوں فریق نے اپنی اپنی جماعت سے تعجب کیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے سجدے کے سبب سے سجدہ کیا، مسلمانوں نے تو اس لیے تعجب کیا کہ مشرکوں نے بغیر ایمان و بغیر یقین اس کے ساتھ سجدہ کیا، مسلمانوں نے وہ بات نہیں سنی تھی جس کو شیطان نے مشرکوں کے کانوں میں ڈال دیا تھا، لہٰذا اُن کے نفوس تو مطمئن ہو گئے تھے، اس بات کی وجہ سے جس کو شیطان نے اُمنیۂ رسول اللہ ﷺ (قراءت) میں القا کیا اور شیطان نے ان سے کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو سورت میں پڑھا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے معبودوں کی تعظیم کے واسطے سجدہ کیا، پھر یہ کلمہ لوگوں میں فاش ہو گیا اور شیطان نے اس کو ظاہر کر دیا، یہاں تک کہ زمینِ حبشہ میں پہنچا اور جو لوگ مسلمان وہاں تھے: عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی، ان سے بات چیت کی کہ مکے والے سارے مسلمان ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور یہ بات ان کو پہنچی کہ ولید بن مغیرہ نے مٹی پر اپنی ہتھیلی میں سجدہ کیا اور اُن سے بیان کیا گیا کہ مسلمان مکے میں موجود ہو گئے، پس وہ جلدی کرتے ہوئے متوجہ ہوئے، حالاں کہ شیطان نے جو القا کیا تھا، اللہ پاک نے اس کو منسوخ کر دیا اور اللہ پاک نے اپنی آیتوں کو پکا کیا اور بہتان سے اس کو محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿52﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ﴾

پھر جب اللہ پاک نے اپنی قضا کو بیان کر دیا اور شیطان کے سجع سے اس کو مبرا و منزہ فرمایا تو مشرکین اپنی اسی گمراہی اور مسلمانوں کی دشمنی میں لوٹ پڑے اور اُن پر سخت اور درشت ہوئے۔ یہ حدیث بھی مرسل ہے۔ (وفي تفسير ابن جرير عن الزهري عن أبي بكر بن عبد الرحمن بن الحارث بن هشام نحوه، وقد رواه الحافظ أبو بكر البيهقي في كتابه دلائل النبوة فلم يجزبه موسى بن عقبة ساقه من مغازيه بنحوه قال: وقد روينا عن أبي إسحاق هذه القصة) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق نے سیرت میں اس قصے کو اسی کے مثل ذکر کیا ہے اور سب کے سب مرسلات ومنقطعات ہیں۔[2] واللہ أعلم۔ اور اسی کی مثل بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ وغیرہما کے کلام سے مجموعہ کر کے ذکر کیا ہے۔[3]

پھر یہاں ایک سوال کیا ہے کہ باوجود عصمت کے، جس کا ضامن اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کے لیے ہوا ہے ایسا کیوں کر واقع ہوا؟ پھر لوگوں سے کئی جواب نقل کیے ہیں، اُن میں سے سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ شیطان نے

---

(1) تفسير الخازن (٥/ ٢٢)
(2) تفسير الطبري (١٨/ ٦٦٣-٦٦٦) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٠-٢٥٠٢)
(3) تفسير البغوي (٥/ ٣٩٣)

مشرکوں کے کانوں میں اس کو ڈال دیا، لہٰذا انھوں نے وہم کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے صادر ہوا ہے، حالاں کہ حقیقتاً اس طرح نہ تھا، بلکہ وہ تو شیطان کی کاریگری سے تھا نہ کہ رسولِ رحمن ﷺ کی طرف سے۔ اسی طرح اس کی صحت کو متصور کر کے متکلمین نے بھی طرح طرح کے جوابات دیے ہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کتاب الشفا میں اس سے تعرض کیا ہے اور اس شے سے جواب دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ قصہ اسی طرح ہے بسبب اس کے ثبوت کے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ ﴾ اس میں اللہ پاک کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے، یعنی یہ بات ہرگز تم کو جنبش نہ دے، بے قرار نہ کرے، کیوں کہ تم سے پہلے جو رسول و نبی گزرے ہیں، ان کو بھی اسی طرح کا اتفاق ہو چکا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: "إذا حدث ألقى الشيطن في حديثه فيبطل الله ما يلقي الشيطن ثم يحكم الله آياته"[2] یعنی جس وقت کوئی رسول و نبی حدیث (بات) کرتا ہے تو شیطان اس کی حدیث (بات) میں ڈال دیتا ہے، پھر جو شیطان ڈالتا ہے، اللہ اس کو باطل کر دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے۔

علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "يقول: إذا حدث ألقى الشيطان في حديثه" امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "إذا تمنى يعني قال"[3] ويقال ﴿ اُمْنِیَّتِہٖ ﴾ قراءته ﴿ اِلَّآ اَمَانِیَّ ﴾ يقرء ون ولا يكتبون" مطلب یہ ہے کہ ﴿ تَمَنّٰٓی ﴾ بمعنی قول ہے اور ﴿ اُمْنِیَّتِہٖ ﴾ کے معنی قراءت۔ (قراءت کا نام امنیہ اس لیے رکھا کہ قاری جس وقت آیتِ رحمت پر پہنچتا ہے تو اس کے حصول کی تمنا کرتا ہے اور جب آیتِ عذاب پر پہنچتا ہے تو اس بات کی تمنا کرتا ہے کہ اس میں مبتلا نہ ہو۔ رازی)۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا: اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ تَمَنّٰٓی ﴾ کے معنی "تلا" ہیں، یعنی جس وقت کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے تو شیطان اس کی تلاوت میں ڈال دیتا ہے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جس وقت قتل ہوئے تو کسی شاعر نے اُن کے حق میں یوں کہا ہے: ؎

تمنى كتاب الله أول ليلة   وآخرها لاقى حمام المقادر[4]

یعنی اول رات میں تو کتاب اللہ کی تلاوت کی اور آخر میں مقدر کی موت سے ملے۔

(امام خازن رحمہ اللہ نے اس شعر کو سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔[5] علامہ نسفی و امام بیضاوی رحمہما اللہ نے دوسرا مصرع یوں لکھا ہے ؎

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٠٥۔ ٣٠٧) فاضل مفسر رحمہ اللہ نے خوامخواہ قصہ غرانیق کی بابت اتنی روایات اور مختلف جوابات و تطبیقات جمع کر دی ہیں، جب کہ یہ قصہ سراسر بے اصل ہے، اس پر بحث کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ [ص۔ ی]

[2] صحيح البخاري (٤/ ١٧٦٦) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٦٧)

[4] تفسير البغوي (٥/ ٣٩٤) [5] تفسير الخازن (٥/ ٢٣)

تمنى داود الزبور على رسل ①

والله أعلم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ﴾ حقیقت نسخ کی لغت کی رُو سے ازالہ و رفع ہے۔ یعنی لغت میں نسخ کسی شے کے زائل کرنے اور رفع کرنے کو کہتے ہیں۔ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، یعنی پس اللہ سبحانہ و تعالیٰ باطل کرتا ہے اس شے کو جس کا القا شیطان کرتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام اس چیز کو نسخ کرتے ہیں جسے شیطان القا کرتا ہے اور اللہ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے۔①

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ﴾، یعنی جو امر و حوادث ہوتے ہیں، اللہ اُن کو خوب جانتا ہے کوئی مخفی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ اپنی تقدیر و خلق و امر میں بڑی حکمت والا ہے۔ حکم تامہ و حجتِ بالغہ اسی کے لیے ہے اور اسی لیے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ مرض سے مراد شک، شرک، کفر اور نفاق ہے، جیسے: مشرک لوگ جب تو وہ اس سے خوش ہو گئے اور اعتقاد کر بیٹھے کہ وہ صحیح ہے اللہ کے پاس سے، حالاں کہ وہ شیطان کی طرف سے تھا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: "اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" منافق لوگ ہیں اور ﴿ اَلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ﴾ مشرکین ہیں۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ یہود ہیں۔② ﴿ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴾ یعنی ظالم لوگ گمراہی و مخالفت و عناد میں ہیں، جو کہ حق اور صواب سے بہت دور ہے۔

﴿ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ ﴾ سے ﴿ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ ﴾ تک، یعنی اور تاکہ جانیں وہ لوگ جو دیے گئے ہیں علمِ نافع، جس سے فرق کرتے ہیں حق و باطل کے درمیان اور اللہ و رسول پر ایمان لانے والے، اس بات کو کہ ہم نے جس شے کی تیری طرف وحی کی ہے، وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے، جس نے اس کو اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت و حراست کی ہے، اس بات سے کہ کہیں اس میں کوئی اور چیز خلط ملط نہ ہو جائے، بلکہ وہ تو ایک ایسی کتاب عزیز ہے کہ باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے نہ پیچھے سے وہ حکیم حمید کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ ﴿ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس کی تصدیق کریں اور اس کے مطیع اور فرماں بردار ہو جائیں۔ ﴿ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ﴾ یعنی ان کے دل اس کے واسطے خاضع و ذلیل ہوں۔ ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یعنی اللہ مومنین کو دنیا اور آخرت میں سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔ دنیا میں تو اس طرح کہ ان کو حق اور اتباعِ حق کی راہ بتاتا ہے اور باطل کی مخالفت اور اس سے بچنے کی ان کو توفیق دیتا ہے اور آخرت میں ان کو سیدھی راہ بتائے گا

① تفسير النسفي (٣/ ١٠٩) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٤) ② تفسير الطبري (١٨/ ٦٦٨)

③ تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٧) الدر المنثور (٦/ ٦٩)

جو اُن کو جنت کے درجات کی طرف لے جائے گی اور عذابِ الیم اور جہنم کے طبقات سے ان کو دور کر دے گا۔

آیتِ باب میں رسول و نبی کے درمیان فرق کے ثبوت کے لیے روشن دلیل ہے، بخلاف اس شخص کے جو یہ کہتا ہے کہ دونوں ایک ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس بارے میں تین قول لکھے ہیں: پہلا یہ ہے کہ رسول وہ شخص ہے، جس کو اللہ پاک نے جدید شریعت دے کر بھیجا ہے کہ اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور نبی عام ہے اس شخص کے لیے جس کو سابق شریعت کو مقرر رکھنے کے واسطے بھیجا ہے، جیسے: بنی اسرائیل کے نبی، جو کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان ہوئے ہیں اور اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے علمائے اُمت کو ان سے تشبیہ دی ہے، اس لیے کہ نبی عام تر ہوتا ہے رسول سے اور اسی بات پر یہ حدیث شریف دلالت کرتی ہے کہ کسی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیا کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔ پھر پوچھا کہ ان میں سے رسول کتنے ہیں تو فرمایا کہ تین سو تیرہ «جَمًّا غَفِيرًا»[1] (یہ ابتدائے کلام ہے، یعنی وہ ایک جماعتِ کثیر تھی) لیکن کہا ہے کہ یہ حدیث من جملہ آحاد ہے، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ انبیا کی تعداد کے بارے میں تعرض نہ کیا جائے، اس واسطے کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾ [المؤمن: ٧٨] ''ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان کر دیا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔''

عدد کے ذکر میں اس بات کا خطرہ ہے کہ جو اُن میں ہے وہ اُن سے خارج ہو جائے اور جو اُن میں سے نہیں ہے وہ اُن میں داخل ہو جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کے درمیان فرق یہ ہے کہ رسول وہ شخص ہے جس نے جمع کیا ہے طرف معجزے کے کتاب کو، جو اس پر نازل کی گئی ہے اور نبی وہ ہے کہ اس پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی، اس کو صرف اس بات کا حکم ہے کہ اپنے سے پہلے کی شریعت کی طرف دعوت دے۔ یہ قول صاحبِ کشاف کا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے دوسرے قول کا حاصل بھی یہی ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو بلفظِ ''قیل'' ذکر کیا ہے اور اُن کا مختار قول پہلا قول ہے اور دوسرے قول کو شاید اس لیے پسند نہ کیا کہ رسولوں کی تعداد کتابوں کی تعداد سے زیادہ ہے، کیوں کہ کتابیں ایک سو چار ہیں، لیکن ان دونوں قولوں کی بنا پر یہ بات لازم آتی ہے کہ اسحٰق، یعقوب، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان علیہم السلام رسول نہ ہوں، اس لیے کہ یہ سب کوئی نئی شریعت اور پہلی شریعت کو منسوخ کرنے والی کتاب لے کر نہیں آئے تھے۔ تیسرا قول بلفظِ ''قیل'' یہ ذکر کیا ہے کہ رسول وہ شخص ہے، جس کے پاس فرشتہ وحی لے کر آئے اور نبی اس شخص کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو جس کی طرف خواب میں وحی کی جاتی ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ کا

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٦٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه علي بن يزيد وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ١/ ٣٩٣)

[2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٣) الكشاف (٣/ ١٦٥۔ ١٦٦)

مختار دوسرا قول ہے اور ایک قول بلفظِ "قیل" یہ لکھا ہے کہ رسول واضع شرع (شریعت رکھنے والا) ہے اور نبی اپنے سے علاوہ کی شریعت کی حفاظت کرنے والا ہے۔[1]

فتح البیان اور فتح القدیر میں دو قول لکھے ہیں: ایک یہ ہے کہ رسول وہ شخص ہے کہ خلق کی طرف بھیجا گیا، جبریل علیہ السلام کے اس کی طرف عیاناً بھیجنے کے ساتھ اور جبریل علیہ السلام سے بالمشافہ بات چیت کرنے کے ساتھ۔ اور نبی وہ ہے کہ اس کی وحی الہاماً ہو یا مناماً (خواب میں)۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رسول وہ شخص ہے جو شریعت کے ساتھ بھیجا گیا اور اس کی تبلیغ کے ساتھ مامور ہوا اور نبی وہ ہے کہ اس کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ اپنے سے پہلے کی شریعت کی طرف دعوت دے اور اس پر کوئی کتاب نازل نہ ہو۔ اور رسول اور نبی دونوں کے لیے ظاہری معجزہ کا ہونا ضروری ہے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ کا مختار قول یہ ہے کہ رسول ایسا نبی ہے کہ جس کو تبلیغ پر مامور کیا گیا اور نبی تبلیغ پر مامور نہیں ہے۔[3] امام عبد بن حمید اور ابن الانباری رحمہما اللہ نے مصاحف میں عمرو بن دینار رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یوں پڑھتے تھے: "وما أرسلنا من قبلك من رسول ولا نبي ولا محدث"۔[4] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف سے اس کی مثل روایت کیا ہے، اتنا زیادہ کہا ہے کہ "مُحَدَّثْ"، منسوخ کیا گیا۔ کہا اور "مُحَدَّثُوْنَ" صاحب یٰس ولقمان ومومنِ آلِ فرعون وصاحبِ موسیٰ علیہم السلام ہیں۔[5]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مِنْ قَبْلِكَ﴾ میں کلمۂ ﴿مِنْ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ اور ﴿مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ میں ﴿مِنْ﴾ زائد ہے استغراقِ جنس کا فائدہ دیتا ہے اور جملۂ شرطیہ جو ﴿و﴾ کے بعد واقع ہوا ہے موضع النصب میں ہے بنابر حال "من نبي" سے اور بسبب دلالتِ ثانی کے اول سے حذف کر دیا گیا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وما أرسلنٰه إلا وحاله هذه"، امام سمین رحمہ اللہ نے اس جملے میں تین وجہیں ذکر کی ہیں: ایک یہ ہے کہ محلِ نصب میں ہے، بنابر حال ﴿مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ سے، معنی یہ ہیں: نہیں بھیجا ہم نے اس کو مگر حال اس کا یہ ہے اور حال محصورہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محل میں صفت رسول کی ہے، سو اس صورت میں اس کے موضع پر جر کا حکم کیا جائے گا باعتبار لفظِ موصوف کے اور نصب کا باعتبار محلِ موصوف کے، کیوں کہ "مِنْ" اس میں زیادہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ موضع استثناء میں ہے غیر جنس سے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ کا یہی قول ہے،[6] یعنی استثنا منقطع ہے۔ اور کلمہ ﴿إِذَا﴾ ہوسکتا ہے کہ شرطیہ ہو اور یہی ظاہر ہے۔ حوفی اسی طرف گئے ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجرد ظرفیت کے لیے ہو۔

﴿تَمَنّٰى﴾ کو مفرد اس لیے ذکر کیا، حالاں کہ اس سے اوّل دو چیزیں ہیں کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١٠٨) [2] فتح القدير (٣/ ٦٢٨) فتح البيان (٩/ ٦٦) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٠)

[4] الدر المنثور (٦/ ٦٥) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٠) فتح القدير (٣/ ٦٣١) [6] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٥)

ہے: "و ما ارسلنا من قبلك من رسول و لا نبی إلا إذا تمنی ولا نبي إلا إذا تمنی" جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ [التوبة: ٦٢] ''حالاں کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ انھیں راضی رکھیں۔''

رہا حذف تو وہ اول سے ہو یا ثانی سے۔ ضمیر ﴿ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ نبی کی طرف راجع ہے اور یہی قول "كما ينبغي" ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ رسول کی طرف پھرتی ہے۔ رہی تفسیر نبی و رسول کی تو وہ پہلے گزر چکی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے، معنی ﴿ تَمَنّٰۤى ﴾ کے "تلا" ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے سببِ نزول کے بارے میں کہا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ پر اپنی قوم کا اعراض شاق گزرا تو آپ ﷺ نے اپنے جی میں یہ تمنا کی کہ آپ ﷺ پر کوئی ایسی چیز نازل نہ ہو، جو آپ سے ان کو نفرت دلائے، کیوں کہ آپ ﷺ ان کے ایمان پر حرص کرتے تھے۔ پس ایک دن آپ ﷺ اپنی قوم کی کسی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ پر سورت ﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ اس کو ان پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴾ کو پہنچے اور وہ تمنا آپ ﷺ کے جی میں تھی، لہٰذا من جملہ القائے شیطان آپ کی زبانِ مبارک پر یہ کلمے جاری ہوگئے: "تلك الغرانيق العلٰی، و إن شفاعتهن لترتجی"

پھر جب قریش نے یہ سنا تو خوش ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ اپنی قراءت پر چلتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے سورت ختم فرمائی، پھر جب آپ ﷺ نے اس کے آخر میں سجدہ کیا تو مجلس میں جو لوگ مسلمان و مشرک تھے، ان سب نے آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا، پھر قریش اس سے خوش ہوتے ہوئے متفرق ہوگئے اور کہا کہ بے شک محمد نے بہترین ذکر کے ساتھ ہمارے معبودوں کا ذکر کیا۔ پھر جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور کہا: تم نے کیا کیا؟ تم نے لوگوں پر وہ شے پڑھ دی جس کو میں اللہ کی طرف سے تمھارے پاس نہیں لایا، اس پر رسول اللہ ﷺ غمگین ہوئے اور بہت سخت خائف ہوئے، پس اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی، مفسرین نے اسی طرح کہا ہے، حالاں کہ اس میں سے کچھ صحیح نہیں ہے اور نہ بوجہ من وجوہ ثابت ہے۔ اور باوجود اس کے صحیح نہ ہونے، بلکہ باطل ہونے کے محققین نے اللہ پاک کی کتاب سے اس کو دفع کیا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴾ [الحاقة: ٤٤- ٤٦] ''اور اگر

یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴾ [النجم: ٣] ''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٤] ''اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بلاشبہ قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جاتے۔'' پس اللہ پاک نے اس آیت میں مائل ہونے کی قربت کی نفی فرمائی، سو مائل ہونے کا کیا ذکر؟!۔ یہ تو آیاتِ قرآنی ہیں، جن سے مذکورہ قصے کا بطلان ہوتا ہے، اب حفاظِ محدثین کے اقوال سنیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں:

امام بزار رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ ایک ایسی حدیث ہے کہ ہم اس کو نہیں جانتے کہ نبی اکرم ﷺ سے متصل اسناد کے ساتھ مروی ہو۔[1] امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قصہ نقل ہونے کے لحاظ سے غیر ثابت ہے۔ پھر کلام کرنا شروع کیا ہے کہ اس قصے کے راویوں میں طعن کی گئی ہے۔ امام الائمہ ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ قصہ زنادقہ نے گھڑا ہوا ہے، یعنی زندیقوں نے جو قصے گھڑے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔[2] قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفا میں کہا ہے کہ اُمت نے اجماع کیا ہے کہ جس شے کا طریق بلاغ ہے، اس میں آپ معصوم ہیں، اس بات سے کہ کسی ایسی شے کی خبر دیں نہ قصداً و عملاً نہ سہواً نہ غلطاً کہ جو اس کے خلاف ہو، جس پر وہ ہیں۔[3]

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قصہ باطل من گھڑت ہے، اس کے ساتھ قائل ہونا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [النجم: ٣۔ ٤] ''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴾ [الأعلیٰ: ٦] ''ہم جلد آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ نہ بھولیں گے۔'' بلاشک جس شخص نے بتوں کی تعظیم رسول ﷺ پر جائز رکھی تو وہ یقیناً کافر ہوا، اس لیے کہ یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ کی بڑی سے بڑی سعی بتوں کے مٹانے میں ہے اور اگر ہم اس بات کو جائز رکھیں تو آپ ﷺ کی شریعت سے امان (امانت) اُٹھ جائے اور احکام اور شریعت میں سے ہر ایک میں جائز رکھیں کہ وہ بھی اسی طرح ہو، یعنی اسی کے جملے سے ہو کر شیطان نے آپ کی زبان پر اس کا القا کر دیا ہو اور اللہ پاک کا یہ قول اس کو باطل کرتا ہے: ﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ [المآئدۃ: ٦٧] ''آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔'' کیوں کہ عقل کے نزدیک وحی میں سے کچھ گھٹانے یا اس میں کچھ بڑھانے میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے، پس ان وجوہِ نقلیہ و عقلیہ سے بطورِ اجمال ہم نے جان لیا کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہے۔[4] انتھی ملخصاً۔

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/ ٧٢)
[2] نصب المجانيق للألباني (١/ ٤٦)
[3] الشفا بتعريف حقوق المصطفىٰ (٢/ ١٢٣)
[4] تفسير الرازي (٢٣/ ٤٤۔ ٤٥)

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس کے بعد یوں کہا ہے: حاصل یہ ہے کہ اس بارے میں ساری روایتیں یا تو مرسل ہیں یا منقطع، ان میں سے کسی شے کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی اور اس بحث میں حفاظ سے وہ شے نقل کر آئے ہیں جو کافی ہے۔ اس باب میں اور بھی روایتیں ہیں، جو شخص اُن سب سے واقفیت حاصل کرنا پسند کرے تو اسے چاہیے کہ تفسیر درمنثور سیوطی میں ان کو دیکھ لے، یہاں اُن کے ذکر سے طول دینا فائدہ مند نہیں ہے۔ ہم تم کو پہلے ہی یہ بات بتا آئے ہیں کہ ان سب کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اہلِ صحت میں سے نہ کسی نے ان کو روایت کیا ہے نہ کسی ثقہ نے بسند صحیح یا سلیم متصل ان کو مسند کیا ہے۔ ان کو ان مفسروں مورخوں نے روایت کیا ہے جن کو ہر عجیب وغریب اور نادر کا شوق و ذوق ہے اور صحف و کتب میں ہر صحیح و غلط کو اکھٹا کر دیا کرتے ہیں۔ اس قصے کے ضعف پر یہ اُمور دال ہیں: ایک تو اس کے راویوں کا اضطراب، دوسرے اس کی سند کا انقطاع، تیسرے اس کے لفظوں کا اختلاف۔ صحیح میں جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے، وہ اسی قدر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم پڑھی، پھر آپ نے اس میں سجدہ کیا اور جو لوگ آپ کے ہمراہ تھے انھوں نے سجدہ کیا، سوائے ایک شیخ کے قریش میں سے کہ اس نے مٹھی بھر کنکریاں یا مٹی لی، پھر اس کو اپنی پیشانی کی طرف اُٹھایا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پس البتہ یقیناً میں نے اس کو دیکھا کہ اس کے بعد کافر مارا گیا۔[1] (أخرجه البخاري و مسلم) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مروی حدیث سے یہ بات صحیح ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمین اور مشرکین اور جن وانس نے سجدہ کیا۔[2] (رواه البخاري)

پس یہ وہ ہے جو صحیح میں آیا ہے۔ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں کو ذکر کیا اور نہ اُن کو پڑھا۔ اور جو بات مفسرین نے اس قصے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کی ہے، اس کو کلبی راوی نے ان سے روایت کیا ہے۔ کلبی راوی انتہائی ضعیف، بلکہ متروک ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ اور اسی طرح امام نحاس رحمہ اللہ نے ایک اور سند سے اس کو روایت کیا ہے، اس میں واقدی راوی ہیں۔ پس یہ اس قصے کے ضعیف ہونے کے لیے کافی ہے اور من حیث المعنی بوجوہِ دیگر اس کا جواب دیا ہے۔ ان کے ذکر میں بھی سوائے طوالت کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ امام خازن اور نسفی رحمہما اللہ نے اپنی تفسیروں میں ان کا استیفا کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قصے کی فی الجملہ ثبوتِ اصل پر تنبیہ کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی تین سندیں شرطِ صحیح پر ہیں، لیکن وہ مرسل ہیں۔ غرض کہ جب تم کو اس کا باطل ہونا ثابت ہوگیا تو تم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ معنی ﴿ تَمَنّٰۤی ﴾ کے "قرأ و تلا" ہیں، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے مفسرین سے اس کو نقل کیا ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ معنی ﴿ تَمَنّٰۤی ﴾

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۰۱۷) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۷۶) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۰۲۱)

کے ”تلا و قرأ کتاب اللّٰہ“ ہیں۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اشبہ بتاویل کلام کہا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ ﴾ [البقرۃ: ۷۸] ”وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے۔“ کی تفسیر میں جو گزر چکا ہے، وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ تَمَنّٰٓى ﴾ کے معنی ”حدث“ ہیں اور ﴿ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ کے معنی ”في حديثه“ ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ تَمَنّٰٓى ﴾ کے معنی ”قال“ ہیں۔ پس آیتِ کریمہ کے حاصل معنی یہ ہیں کہ شیطان نے مشرکوں کے کان میں اس کو ڈال دیا، بغیر اس کے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ تکلم فرمائیں اور آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر وہ جاری ہو، اس بنا پر یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہوگی، یعنی یہ بات تم کو ہول میں نہ ڈالے نہ تم کو رنجیدہ کرے اس کے مثل تو تم سے پہلے جو رسول و نبی گزرے ہیں، ان کو بھی اتفاق ہوا ہے اور اس تقدیر پر کہ ﴿ تَمَنّٰٓى ﴾ کے معنی ”حدث نفسه“ ہوں، جس طرح کہ امام فراء اور کسائی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جب کوئی آدمی اپنے جی سے بات کرتا ہے تو محاورے میں ﴿ تَمَنّٰٓى ﴾ بولتے ہیں۔[4] پس معنی یہ ہوں گے کہ جس وقت کوئی رسول و نبی اپنے جی سے کوئی بات کرتا ہے تو شیطان اس کے ساتھ تکلم کرتا ہے اور لوگوں کے کانوں میں اس کو ڈال دیتا ہے، اس کے علاوہ کہ رسول اور نبی اس کے ساتھ تکلم کرے اور اس کی زبان پر جاری ہو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان کا القا صرف انھیں الفاظِ مسموعہ کے واسطے تھا کہ جن کی وجہ سے فتنہ واقع ہوا۔[5]

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وجہ بہترین وجوہ ہے اور اسی کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے اور اسی طرح امام ابن العربی رحمہ اللہ نے بھی اس تاویل کو مستحسن کہا ہے اور کہا: ﴿ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ ”في تلاوته“ کسی نے اس آیت کی تاویل میں یوں کہا ہے کہ غرانیق سے مراد ملائکہ ہیں، لیکن یہ تاویل مردود ہے، اس واسطے کہ اس کے بعد اللہ پاک نے ﴿ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ﴾ فرمایا ہے، یعنی اللہ القائے شیطان کو باطل کرتا ہے، حالاں کہ ملائکہ کی شفاعت باطل نہیں ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ قول نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک پر سہواً ونسیاً جاری ہوگیا تھا اور یہ دونوں انبیا پر جائز ہیں۔ یہ قول بھی مردود ہے، اس واسطے کہ جس شے کا طریق بلاغ ہے، اس میں سہو ونسیان جائز نہیں ہے، چنانچہ یہ بات بجائے خود مقرر ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَمَنّٰٓى ﴾ سے مراد تلاوت وقراءت ہے۔[6]

﴿ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ ﴾ یعنی نسخ کرتے ہیں جبریل علیہ السلام اللہ کے حکم سے وہ شے جو شیطان نے نبی اکرم ﷺ کی زبان پر ڈالی۔[7] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اِذَا تَمَنّٰٓى ﴾ ”أي تكلم و أمنيته كلامه“ پس اللہ پاک نے اس آیت

---

(1) تفسیر البغوي (٥/ ٣٩٤) (2) تفسیر الطبري (١٨/ ٦٦٨) (3) تفسیر الطبري (١٨/ ٦٦٧)
(4) فتح القدير (٣/ ٦٢٩) (5) تفسیر القرطبي (١٢/ ٨٥) (6) تفسیر الطبري (١٨/ ٦٦٨)
(7) تفسیر الطبري (١٨/ ٦٦٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٣)

میں اس بات کی خبر دی کہ اللہ کا طریقہ اپنے رسولوں میں یہ ہے کہ جس وقت وہ کوئی بات کہتے ہیں تو شیطان اپنی طرف سے اس میں زیادہ کر دیتا ہے، لہٰذا یہ قول اس بات میں نص ہے کہ شیطان نے نبی اکرم ﷺ کے قول میں زیادہ کر دیا نہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کو ادا فرمایا ہو، کیوں کہ آپ ﷺ معصوم ہیں: ”وقد سبق إلى ذلك الطبري مع جلالة قدره وسعة علمه وشدة ساعده في النظر فضوب هذا المعنى، قاله الحافظ في الفتح“ [1]

آیتِ باب کی تفسیر میں علامہ نسفی رحمہ اللہ کا مختار قول یہ ہے کہ ﴿ تَمَنّٰۤى ﴾ بہ معنی ”قرأ“ ہے اور ﴿ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ بہ معنی تلاوتہ۔ پھر قصہ غرانیق کا نقل کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ قول پسندیدہ نہیں ہے، کیوں کہ یہ قول اس بات سے خالی نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عملاً اس کے ساتھ تکلم فرمایا، حالاں کہ یہ امر جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ کفر ہے، کیوں کہ آپ ﷺ تو بتوں پر طعن کرنے والے مبعوث ہوئے ہیں نہ کہ اُن کی تعریف کرنے والے، یا یہ کہ شیطان نے اس کلمے کو آپ ﷺ کی زبان پر زبردستی جاری کر دیا اس طریقے سے کہ آپ ﷺ اس سے باز رہنے پر قادر نہ ہوئے۔ یہ بات بھی ممتنع ہے، اس واسطے کہ اس بات پر تو شیطان آپ ﷺ کے سوا اور کسی کے حق میں قادر نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [الحجر: ٤٢] ”بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں۔“ تو پھر آپ ﷺ کے حق میں تو بطریقِ اولیٰ قادر نہ ہوگا۔ یا یہ کہ وہ کلمہ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر بطور سہو وغفلت جاری ہو گیا ہو۔

یہ بات بھی مردود ہے، کیوں کہ ایسی غفلت حالتِ تبلیغِ وحی میں آپ ﷺ پر جائز نہیں ہے اور اگر یہ جائز ٹھہرے تو آپ ﷺ کے قول پر اعتماد باطل ہو جائے اور اس واسطے کہ جو شے آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے، اس کی صفت میں اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٤٢] ”باطل اس کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا، اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے۔“ نیز فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [2] [الحجر: ٩] ”بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

پس جبکہ یہ تینوں وجہیں باطل ٹھہریں تو صرف ایک وجہ باقی رہی وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ﴿ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴾ کے نزدیک سکوت فرمایا تو شیطان نے متصل آپ ﷺ کی قراءت کے ان کلمات کے ساتھ تکلم کیا، لہٰذا بعض مشرکین کے نزدیک یہ بات واقع ہوئی کہ خود آپ ﷺ ہی نے ان کے ساتھ تکلم کیا ہے، پس یہ ہے القا نبی اکرم ﷺ کی قراءت میں۔ نبی مکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں شیطان کلام کیا کرتا تھا اور اس کا کلام سنائی دیتا تھا، چنانچہ مروی ہے کہ جنگِ اُحد کے دن اس نے یہ ندا کی تھی کہ ”إن محمداً قد قتل“ اور جنگِ بدر کے دن کہا

[1] فتح الباري (٨/ ٤٤٠) فتح البيان (٩/ ٦٦۔ ٧٠)
[2] تفسير النسفي (٣/ ١٠٨۔ ١٠٩)

تھا: ﴿ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ﴾ [الأنفال: ٤٨] ''کوئی بھی آج تم پر غالب نہیں آسکتا، میں خود بھی تمھارا حمایتی ہوں۔'' اور مشرکین دارِ ندوہ میں جمع ہوئے (ندوہ مکے میں کفار کے بیٹھنے کی ایک جگہ تھی)۔ اس مقصد سے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکر کریں، لہٰذا شیطان شیخ نجدی کی صورت میں اُن کے پاس آیا اور اُن کے مشورے میں گفتگو کی، بعض کی رائے کو صحیح کہا اور بعض کو خطا کے ساتھ منسوب کیا۔ غرض کہ اس تقریر کا حاصل یہ نکلا کہ قصہ غرانیق کو مانا، لیکن اس میں جو یہ تھا کہ وہ کلمات نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک پر جاری ہوئے اس کو رد کیا اور کہا ہے کہ آپ ﷺ کی قراءت میں شیطان نے القا کیا، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ تکلم نہیں فرمایا۔ امام محلی رحمہ اللہ کا مختار قول بھی یہی ہے کہ ﴿ تَمَنّٰى ﴾ بہ معنی ''قرأ'' اور ﴿ أُمْنِيَّتِهٖ ﴾ بہ معنی ''قراءته'' ہے۔ پھر وہی قصہ غرانیق کا باختصار ذکر کیا ہے۔[1]

قاضی صاحب مرحوم کا مختار قول یہ ہے کہ ﴿ إِذَا تَمَنّٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں: ''إذا زوّر في نفسه ما يهواه'' ﴿ أَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ أُمْنِيَّتِهٖ ﴾ ''في تشهيه ما يوجب اشتغاله بالدنيا'' یعنی جس وقت کوئی رسول و نبی آراستہ و درست کرتا ہے اپنے جی میں اس شے کو جسے وہ چاہتا ہے تو شیطان اس کی خواہش میں وہ شے القا کرتا ہے، جو اس کے دنیا میں مشغول ہونے کا موجب ہوتی ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: «وَإِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي فَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِينَ مَرَّةً»[2] یعنی میرے دل پر ڈھانک دیا جاتا ہے تو میں اللہ سے دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا دلِ فیض منزل ہر دم یادِ الٰہی میں مستغرق رہا کرتا تھا، پھر کبھی کسی وقت کوئی عارضی بشری اُمورِ اُمت و مصالحِ ملت سے عارض ہو جاتا تو یہ ذنب اور تقصیر شمار ہوتا، اس واسطے آپ ﷺ استغفار فرمایا کرتے تھے۔ غین سے مراد سہو ہے، جو آپ ﷺ کے قلب پر چھا جاتا، جس سے کوئی بشر خالی نہیں رہتا، جبکہ اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ وسوسہ انبیا علیہم السلام کی طرف راہ پا جاتا ہے تو اس کو زائل کرنے کی کیفیت بیان کی۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ﴾ یہاں نسخ سے مراد نسخِ لغوی ہے شرعی نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ القائے شیطان کی تاثیر کو باطل و زائل کر دیتا ہے، اس طریقے سے کہ اس کی طرف مائل ہونے سے آپ ﷺ کو بچاتا ہے اور وہ بات بتاتا ہے جو اس کو دور کر دے۔

﴿ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ﴾ یعنی پھر ثابت کرتا ہے اللہ اپنی آیتوں کو جو امرِ آخرت میں استغراق کی طرف بلانے والی ہیں۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ لوگوں کے احوال کو خوب جانتا ہے اور جو کچھ ان کے ساتھ کرتا ہے اس میں حکمت والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے جی سے زوالِ مسکنت کی حدیث کی تھی، یعنی جی

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٠) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٢) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٣_ ١٣٤)

میں خیال باندھا تھا کہ مسکنت دور ہو جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے ایمان پر حرص تھی، اس واسطے یہ تمنا کی کہ آپ ﷺ پر وہ شے نازل ہو جو قوم کو آپ ﷺ کی طرف قریب کر دے اور یہ تمنا مستمر رہی، یہاں تک کہ اپنی قوم کی مجلس میں تھے اور اس کے بعد وہی قصہ غرانیق کا ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ محققین کے نزدیک یہ قول مردود ہے اور اگر صحیح ہے تو آزمایش ہے کہ اس کے سبب سے ایمان پر ثابت رہنے والا اس شخص سے متمیز ہو جائے جو اس میں متزلزل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ تَمَنّٰٓى ﴾ بہ معنی "قرأ" ہے اور ﴿ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ بہ معنی "قراءته" ہے۔

شیطان کا القا اس میں یہ ہے کہ اس نے اپنی آواز بلند کر کے اس کے ساتھ اس طرح سے تکلم کیا کہ سننے والوں نے یہ گمان کیا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی قراءت سے ہے، اس قول کا یوں رد کیا ہے کہ یہ بھی قرآن پر وثوق ہونے میں مخل ہے اور ﴿ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ﴾ سے مندفع نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ یہ بھی اسی کا احتمال رکھتا ہے۔ پہلے دو احتمالوں کی بنا پر آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیا علیہم السلام پر سہو جائز ہے اور اُن کی طرف وسوسہ راہ پا جاتا ہے۔

غرض کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے جو پہلے قول کو اختیار کیا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ قصہ غرانیق کا محققین اور رؤسائے اہلِ سنت و جماعت کے نزدیک باطل ہے، چنانچہ شیخ زادہ نے قرآنِ مجید اور سنتِ مطہرہ و معقول سے اس کا باطل ہونا ثابت کیا ہے، اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ پھر کہا ہے کہ ہم جو ذکر کر آئے ہیں، اس سے یہ امر ظاہر ہوا کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہے۔ غایت ما فی الباب یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ لوگ کثرت میں حدِ تواتر کو نہیں پہنچے ہیں اور خبرِ واحد عقلی اور نقلی دلیلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسی لیے امام بیضاوی رحمہ اللہ نے آیت کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ "ألقى الشيطن في تشهيه ما يوجب اشتغاله بالدنيا"[1] اور یہ نہ کہا ہے کہ "ما يوافق تشهيه من الكلام" پھر کہا ہے: اگر وہ صحیح ہے تو آزمایش ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ صحت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے بعد ﴿ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴾ کے سکوت فرمایا تو شیطان نے ان کلمات کے ساتھ تکلم کیا، کیوں کہ جتنے احتمال مذکور ہوئے، اُن سب سے قریب تر صحت کی طرف یہی احتمال ہے، معنی یہ ہوں گے کہ تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں کہ ہم نے شیطان کو اس بات کی قدرت نہ دی ہو کہ ان کی قراءت میں القا کرے، جس طرح اس نے تمھاری قراءت میں القا کیا، جبکہ تم نے تمنا کی، پس آپ اس وجہ سے غمگین مت ہوں، کیوں کہ ہم تو ایک قوم کو گمراہ کرنے کے لیے اور دوسری قوم کو ہدایت کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں، تاکہ ہم اس شخص کے درمیان جو ایمان پر جما ہوا ہے اور اس شخص کے درمیان

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٣)

جو متزلزل ہے، تمیز کریں۔

پھر شیخ زادہ نے ایک قول بلفظِ "قیل" ذکر کیا ہے کہ آیت کی سب سے بہتر تاویل یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ﴿ تَمَنّٰۤى ﴾ بہ معنی قراءت ہے۔ پس ﴿ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ رسول کے متبعین کے دلوں میں شبہہ ڈالیں، تاکہ ان کو رسول کی پیروی سے باز رکھیں، جس طرح یہ ہوا کہ جس وقت کفار نے رسول کا قول ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾ [المآئدة: ٣] "تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور" سنا تو کہا کہ اپنا ذبیحہ تو حلال کرتا ہے اور اللہ کا ذبیحہ حرام کرتا ہے۔ پس جو بات شیطان نے کفار کے دلوں میں القا کی اللہ پاک اپنا قول نازل کر کے اس کو منسوخ کرتا ہے، یعنی: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ﴾ [الأنعام: ١٢١] "اور تم اس (جانور) کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ پڑھا گیا ہو، کیوں کہ یہ (کھانا) یقیناً نافرمانی ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١١٨] "چناں چہ تم اس (جانور) کا گوشت کھاؤ جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو۔"

پس اللہ پاک نے بیان کر دیا کہ یہ جو حلال ہوا، پس اس واسطے کہ اس پر اللہ کا نام ذکر ہوا ہے اور دوسرا اس لیے حرام ہوا کہ اللہ کا نام اس پر مذکور نہیں ہوا۔ اور جس طرح یہ اتفاق ہوا کہ جس وقت انھوں نے یہ قول سنا: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ [الأنبيآء: ٩٨] "بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں۔" تو کہا ہے کہ عیسی علیہ السلام اللہ کے سوا پوجے گئے ہیں اور فرشتے بھی اللہ کے سوا عبادت کیے گئے ہیں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو غمگین نہ کرے گا، پس اللہ پاک نے ان کے اس قول کو اپنے اس قول سے منسوخ کر دیا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبيآء: ١٠١] "بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی نیکی اور بھلائی مقدر ہو چکی ہے، وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔" اللہ پاک نے عیسی علیہ السلام اور ملائکہ کا استثنا ﴿ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [الأنبياء: ٩٨] سے بیان کر دیا کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ سے مراد صرف اصنام (بت ہیں)۔

سلیمان جمل نے مذکورہ قصے کے بارے میں مواہب کی عبارت نقل کی ہے، اس میں امام رازی رحمہ اللہ کا قول لکھا ہے، جس کے مطابق قصہء مذکور بے اصل ہے،[1] چناں چہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پھر کہا ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس قصے کی اصل ہے۔ پھر اس قصے کے مخرجین (گھڑنے والوں) کا ذکر کیا ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس کے سارے طرق مرسل ہیں اور اس کو کسی وجہ سے صحیح سند سے نہیں دیکھا ہے۔[2] اس کے بعد کہا ہے کہ یہ قول متعقب ہے، کیوں کہ ایک جماعت نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تخریج کی ہے۔

[1] تفسير الرازي (٢٣/ ٤٤) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٥)

پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے اس کے ثبوت کا اصل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ساری باتیں قواعدِ محدثین پر جاری نہیں ہوتی ہیں، کیوں کہ جس وقت طرق بہ کثرت ہوں اور اُن کے مخارج مختلف ہوں تو یہ اس بات پر دال ہے کہ اس کی کچھ اصل ہے اور ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس کی تین سندیں شرطِ صحیح پر ہیں اور وہ مرسل ہیں، ایسے مرسل کے ساتھ وہ شخص حجت پکڑتا ہے، جو مرسل کے ساتھ حجت پکڑتا ہے اور اسی طرح جو شخص مرسل کے ساتھ حجت نہیں پکڑتا، وہ بھی ایسے مرسل کے ساتھ حجت پکڑتا ہے، اس لیے کہ بعض طرق بعض سے معتضد ہیں۔[1] جب یہ بات ثابت ہوئی تو جو بات اس قصے میں مستنکر واقع ہوئی ہے، اس کی تاویل کرنا متعین ہوا، وہ شے مستنکر یہی ہے کہ شیطان نے نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک پر "تلك الغرانيق العلىٰ و إن شفاعتهن لترتجى" کا القا کیا، کیوں کہ اس کا اپنے ظاہر پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ پر یہ بات محال ہے کہ قرآن میں عملاً کوئی بات زیادہ کریں، اسی طرح سہواً جبکہ وہ توحید کے منافی ہو، جس کو آپ ﷺ لے کر آئے ہیں، کیوں کہ آپ معصوم ہیں۔ علما نے اس کی تاویل میں قریب سات مسلک اختیار کیے ہیں۔ پھر اُن مسالک کا ذکر کیا ہے، وہ سب مخدوش ہیں، ان میں سے صرف ایک مسلک عمدہ ہے، جس کو قاضی عیاض اور ابن العربی نے پسند کیا ہے[2] اور علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس کو اختیار فرمایا ہے۔[3] اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

جملہ ﴿ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے جس شے سے اس لام کا تعلق ہے، اس میں تین وجہیں ہیں: ان میں سے ظاہر تر وجہ یہ ہے کہ ﴿ يُحْكِمُ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی "ثم يحكم الله آيته ليجعل" اور جملہ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ اعتراضیہ ہے، علت و معلول کے درمیان میں یہ بات بتانے کے لیے لایا گیا ہے کہ شیطان نے جو القا کیا، اللہ اس کو خوب جانتا ہے اور شیطان کو جو اس پر قدرت دی، اس میں وہ حکمت والا ہے، اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ یا اللہ پاک لوگوں کے احوال کو خوب جانتا ہے اور جو کچھ اُن کے ساتھ کرتا ہے اس میں حکمت والا ہے۔ یا جس بات کی اپنے نبی کی طرف وحی کرتا ہے اس کو اور شیطان کے ارادے کو خوب جانتا ہے، حکیم ہے اس کو نہ چھوڑے گا، یہاں تک کہ اس کا کشف کر دے گا اور اس کو زائل فرما دے گا۔ حوفی کا رجحان اس وجہ کی طرف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ فَيَنْسَخُ ﴾ سے متعلق ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں، یہ وجہ بھی ظاہر ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اَلْقَى ﴾ سے متعلق ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ان وجوہ کو ذکر کیا ہے اور اس وجہ کو کہا ہے کہ ظاہر نہیں ہے، لیکن امام بیضاوی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہی مختار ہے، کیوں کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ﴿ لِيَجْعَلَ ﴾ کو تمکینِ شیطان کی علت

---

[1] درست بات یہ ہے کہ اس قصے کی تمام روایات سخت ضعیف ہیں جو باہم مل کر بھی تقویت حاصل نہیں کرتیں اور قابلِ رد ہیں۔

[2] فتح الباري (٨/ ٤٣٩۔ ٤٤٠) المواهب اللدنية (١/ ١٤٨۔ ١٥٣) [3] تفسير النسفي (٣/ ١٠٩)

ٹھہرایا ہے۔[1] یعنی ﴿ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ ﴾ اس تمکین پر دال ہے، اس صورت میں حرفِ لام بمعنی "کے" ہوگا اور ﴿ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ ﴾ سے متعلق ٹھہرے گا تمکین کے اعتبار سے، جس پر وہ دال ہے۔ شیخ زادہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ لام لامِ عاقبت ہے۔ اس کو جو لامِ علت کہتے ہیں تو اس امر کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ اصل میں وہ علت کے واسطے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے شیطان کو القا کی قدرت دی، تا کہ جس شے کا شیطان القا کرتا ہے، اس کو منافقوں اور مشرکوں کے دھوکے دینے کا سبب بنائے اور مومنوں کے ثابت رکھنے کا اس شے پر جس پر وہ قائم ہیں، یعنی وہ توحید کا اعتقاد رکھتے ہیں اور اس بات کا کہ قرآن حق ہے، اللہ کے پاس سے اترا ہے، اسی اعتقاد پر ان کو ثابت رکھے۔

﴿ مَا يُلْقِى ﴾ میں کلمہ ﴿ مَا ﴾ ظاہر یہ ہے کہ بہ معنی "اَلَّذِيْ" ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصدریہ ہو۔ ﴿ فِتْنَةً ﴾ سے مراد محنت و ابتلاء ہے، یعنی امتحان۔ ﴿ مَرَضٌ ﴾ سے مراد شک و نفاق ہے۔ جن کے دلوں میں شک و نفاق ہے وہ لوگ منافق ہیں۔ ﴿ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ﴾ میں الف و لام موصولہ ہے اور صفت اس کا صلہ ہے۔ اور ﴿ قُلُوْبُهُمْ ﴾ اس کا فاعل ہے اور ضمیر "ھم" جس کی طرف قلوب مضاف ہے موصول کی طرف راجع ہے۔ صلہ کی تانیث اس واسطے ہے کہ اس کا مرفوع مؤنث مجازی ہے اگر بجائے اس کے فعل رکھا جاتا تو اس کی تانیث جائز ہوتی۔ اس کا عطف ﴿ لِلَّذِيْنَ ﴾ پر ہے، یعنی "فتنة للذين في قلوبهم مرض وفتنة للقاسية قلوبهم" ان سے مراد مشرکین مکذبین ہیں۔ ان کو سخت دل اس لیے فرمایا کہ ان کے دل حق کے واسطے کبھی نرم نہیں ہوتے ہیں، نہ کسی حال میں صحیح اور سیدھے راستے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے منافقین اور مشرکین دونوں فریق پر تسجیل "بظلم" کی۔

پس فرمایا: ﴿ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ یعنی یہ دونوں گروہ ظالم ہیں اور رسول یا مومنین کے حق میں سخت عداوت میں ہیں۔ ﴿ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ فرمایا، "إنهم" نہ کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ظلم کا حکم لگانے کے لیے اسم مظہر کو بجائے مضمر کے قائم کیا۔ شقاق کا وصف بعید کے ساتھ کیا، حالاں کہ حقیقت میں موصوف بعد، یعنی دور تو وہ ہیں، جن کے ساتھ شقاق قائم ہے۔ لہٰذا یہ مبالغے کے لیے ہے، جبکہ اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ القا شیطان کا اہلِ نفاق و اہلِ شک اور مشرکین کے حق میں فتنہ تھا تو اب یہ بات بیان کی کہ مومنین کے حق میں جو کہ اللہ پاک کو خوب جانتے پہچانتے ہیں حصولِ علم کا سبب ہے، یعنی یہ بات جاننے کا باعث ہے کہ قرآن حق و صدق ہے۔

پس ارشاد فرمایا: ﴿ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ علم سے مراد توحید و قرآن ہے اور اس بات کی تصدیق کہ اللہ جو چاہتا ہے منسوخ کرتا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد علم باللہ و بدینہ و بالآیات ہے۔ ﴿ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ امام محلی اور نسفی رحمہما اللہ کا

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٥) [2] تفسير الخازن (٥/ ٢٤)

یہی قول ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار قول بھی یہی ہے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: ''الذي أحكم الله من آيات القرآن هو الحق من ربك''[2] یعنی آیاتِ قرآن جن کو اللہ نے محکم کیا ہے، وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہیں۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ تمکینِ شیطان من الالقاء کی طرف راجع ہے،[3] یعنی شیطان کو جو القا کی قدرت دی یہ قدرت دینا حق ہے، صادر ہے اللہ پاک کی طرف سے، کیوں کہ آدم علیہ السلام کے عہد سے انسانوں کی جنس میں اس کے ساتھ اللہ پاک کی عادت جاری ہے۔ لیکن فتح البیان و فتح القدیر میں ہے کہ اس قول کو ﴿ فَيُؤْمِنُوا بِهِ ﴾ رد کرتا ہے، اس لیے کہ اس میں ﴿ بِهِ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن کے ساتھ ایمان لانے پر ثابت رہیں،[4] مگر یہ رد ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ رد کا مدار اس بات پر ہے کہ ﴿ بِهِ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہو اور جب ﴿ بِهِ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف پھیری جائے تو رد کی کوئی وجہ نہیں، یعنی جس وقت ﴿ اَنَّهُ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہوگی تو ﴿ بِهِ ﴾ کی ضمیر بھی اسی طرف پھرے گی اور جب ﴿ اَنَّهُ ﴾ کی ضمیر تمکین کی طرف راجع ہوگی تو ﴿ بِهِ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف پھرے گی۔ اسی لیے امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ﴿ فَيُؤْمِنُوا بِهِ ﴾ کے بعد ''بالقرآن أو بالله''[5] کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَيُؤْمِنُوا بِهِ ﴾ معطوف ہے ﴿ لِيَعْلَمَ ﴾ پر، چوں کہ قرآن کے ساتھ ایمان اس بات کے جاننے پر متفرع تھا کہ وہ حق ہے، اللہ کے پاس سے نازل ہوا ہے، اس واسطے اس کا عطف اس پر بحرفِ فا کیا۔ اسی طرح اللہ پاک کے ساتھ ایمان متفرع تھا اس امر کے جاننے پر کہ تمکین حق ہے، صادر ہے اللہ کی طرف سے۔ ﴿ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوْبُهُمْ ﴾ یعنی جب وہ قرآن پاک پر یا اللہ پاک پر ایمان لائیں گے تو فرماں برداری اور خشیت کے ساتھ اُن کے دل اس کے لیے دبیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی کہ یہ ایمان و اخبات جو حاصل ہوتا ہے، پس محض اللہ پاک کی مہربانی اور ہدایت سے ہوتا ہے۔ پس فرمایا: ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یعنی اللہ پاک ان لوگوں کو جو ایمان لائے اُن کے امورِ دین میں راہِ راست و درست کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے، جس راہ میں کسی طرح کی کجی نہیں ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ صِرٰطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ وہ صحیح نظر ہے، جو اُن کو اس شے کی طرف پہنچا دے جو حق ہے۔[6] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: دینِ اسلام۔[7] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ ان کو سیدھی راہ بتانے والا ہے تو دین میں جو بات مشتبہ ہوتی ہے، اس کی صحیح صحیح تاویلیں کرتے ہیں اور جو کوئی مشکل دینی امر ہوتا ہے، اس کے لیے ایسے محمل تلاش کرتے ہیں، جس کا محکم اصول تقاضا کرتے ہیں، تاکہ اُن کو کوئی حیرت اور شبہہ لاحق نہ ہو۔[8] ابو حیوہ رحمہ اللہ نے ﴿ لَهَادٍ ﴾ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔[9]

---

(1) تفسير النسفي (٣/ ١٠٩) تفسير الجلالين (١/ ٤٤١) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٦)
(2) تفسير الخازن (٥/ ٢٤)
(3) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٦)
(4) فتح القدير (٣/ ٦٣٠) فتح البيان (٩/ ٧١)
(5) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٦)
(6) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٦)
(7) تفسير الجلالين (١/ ٤٤١)
(8) تفسير النسفي (٣/ ١١٠)
(9) تفسير القرطبي (١٢/ ٨٧)

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿٥٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٥٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٥٧﴾

اور کافر اس (قرآن) کی بابت ہمیشہ شک میں رہیں گے، حتی کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر نہایت بانجھ (ہر خیر سے خالی) دن کا عذاب آجائے (55) اس دن بادشاہی اللہ ہی کی ہوگی، وہ ان کے مابین فیصلہ کرے گا۔ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہ نعمتوں والے باغوں میں ہوں گے (56) اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، تو وہی ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے (57)

کفار ہمیشہ شک وشبہے میں رہیں گے:

اللہ تعالیٰ کفار کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ قرآن کے متعلق ہمیشہ شک وشبہے میں رہیں گے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کا یہی قول ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، یعنی ﴿مِنْهُ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے۔[1] امام سعید بن جبیر اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: "﴿مِنْهُ﴾ أي مما ألقى الشيطن" یعنی شیطان نے جس شے کا القا کیا، ﴿مِنْهُ﴾ کی ضمیر اس کی طرف پھرتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿بَغْتَةً﴾ کے معنی ہیں: "فجاءة"، یعنی ناگہاں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: "بغت القوم أمر الله" یعنی ناگہاں آلیا قوم کو اللہ کے امر نے۔ اللہ پاک نے نہیں پکڑا کسی قوم کو کبھی مگر اس کے سکون کے وقت اور اُن کے نعمتوں میں منہمک ہونے اور مغرور ہونے کے وقت، پس تم مغرور نہ ہو اللہ سے، کیوں کہ اللہ سے صرف فاسق قوم ہی مغرور ہوتی ہے۔[2]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿يَوْمٍ عَقِيْمٍ﴾ یوم بدر ہے۔ اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ رحمہم اللہ اور بہت لوگوں نے کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی قول ہے۔

امام عکرمہ اور مجاہد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ روزِ قیامت ہے، اس کی کوئی رات نہیں ہے۔ اسی طرح امام ضحاک اور حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] صحیح یہی قول ہے اگرچہ روزِ بدر من جملہ ان امور کے ہے، جن کی ان کو وعید سنائی گئی، لیکن مراد یہی ہے، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ﴾ جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [الفاتحة: ٤] "بدلے کے دن (قیامت) کا مالک ہے۔" اور اللہ تعالیٰ

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٦٧١) (2) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٨) (3) تفسير الطبري (١٨/ ٦٧٢۔ ٦٧١)

کا فرمان ہے: ﴿ اَلْمُلْكُ یَوْمَىِٕذِ ِۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۚ وَكَانَ یَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٦] ''اس دن حقیقی بادشاہی رحمان ہی کی ہوگی، اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی جن لوگوں کے دل ایمان لائے اور اللہ کی اور اس کے رسول کی تصدیق کی اور علم کے تقاضے کے مطابق عمل کیا اور اُن کے دل اور اُن کے اقوال و اعمال باہم موافق ہوئے۔ ﴿ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴾ یعنی اُن کے واسطے وہ نعیم مقیم ہے جو زائل نہ ہو، نہ فنا پذیر ہو، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم و برقرار رہے۔ ﴿ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ﴾ یعنی جن لوگوں کے دلوں نے حق کا کفر و انکار کیا اور اس کو جھٹلایا اور رسولوں کی مخالفت کی، ان کی پیروی سے تکبر کیا۔

﴿ فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴾ ان کے تکبر اور حق کا انکار کرنے کی بدولت ذلت کا عذاب ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''[1] أي صاغرين، كذا في ابن كثير. أعاذنا الله منها. آمين!

جب کہ اللہ پاک نے پہلے کفار کا حال بیان کیا، پھر مومنین کا حال بیان کیا تو کافروں کے حال کی تشریح کرنے کی طرف پھر رجوع کیا، لہٰذا ﴿ وَلَا یَزَالُ ﴾ رجوع ہے ﴿ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ﴾ کی طرف۔ ﴿ مِرْیَةٍ ﴾ بکسر وضم دو لغت مشہور ہیں۔ ظاہر کلام ابو البقاء رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ دونوں دو قراءت ہیں۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: میں اس جگہ ضم کو محفوظ نہیں رکھتا ہوں۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ نے بضم میم پڑھا ہے۔[3] ﴿ مِنْهُ ﴾ کی ضمیر کے بارے میں چار قول ہیں: ایک یہ ہے کہ قرآن کی طرف راجع ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے صرف یہی قول لکھا ہے۔[4] دوسرا یہ ہے کہ دین کی طرف راجع ہے، جس پر صراطِ مستقیم کا ذکر دال ہے۔

امام خازن رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "من القرآن، وقيل من الدين الذي هو صراط مستقيم" علامہ نسفی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: "من القرآن أو من الصراط المستيقم"۔[5] تیسرا یہ ہے کہ القائے شیطان کی طرف پھرتی ہے، یعنی کفار کہیں گے: کیا حال ہے اس کا کہ بتوں کا ذکر بھلائی سے کیا، پھر اس سے پھر گیا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ رسول کی طرف راجع ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے تین قول لکھے ہیں: قرآن و رسول و القا۔[6] ساعت سے مراد موت کی گھڑی ہے، یا قیامت کا دن، یا علاماتِ قیامت۔

﴿ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے اس واسطے کہ اس کے بعد کوئی دن نہیں ہے، لہٰذا اس لحاظ سے وہ

---

(1) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٨) (2) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٦) (3) تفسير القرطبي (١٢/ ٨٧)
(4) تفسير الجلالين (١/ ٤٤١) (5) تفسير الخازن (٥/ ٢٥) تفسير النسفي (٣/ ١١٠) (6) تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٦)

عقیم ہوا۔ عقیم لغت میں وہ ہے جس کے بچہ نہیں ہوتا، چوں کہ ایامِ متوالی یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں، اس واسطے اس کو ہیئتِ ولادت کے مثل قرار دیا اور جب کہ روزِ قیامت کے بعد کوئی دن نہیں ہے، اس لیے اس کو عقم کے ساتھ موصوف کیا۔ لیکن جبکہ ﴿ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴾ سے مراد قیامت ہوگی تو اس قول کی بنا پر ساعت سے مراد ساعت کی نشانیاں لیں گے، یا یوں کہیں گے کہ تقدیر یہ ہے: "أو یأتیھم عذابھا"۔ اسم ظاہر کو ڈرانے دھمکانے کے لیے ضمیر کی جگہ پر رکھ دیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴾ جنگ کا دن ہے، جس میں وہ قتل کیے جائیں گے، جیسے: جنگِ بدر کا دن۔ لڑائی کے دن کو عقیم اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں عورتوں کی اولاد ماری جاتی ہے تو وہ بانجھ عورتوں کی طرح ہو جاتی ہیں، یا اس واسطے کہ لڑنے والے لڑائی کے بیٹے ہوتے ہیں، پس جب مارے گئے تو لڑائی عقیم ہوگئی، پھر جو وصف لڑائی کا تھا، اس کے ساتھ دن کو مجازاً موصوف کر دیا، یا یومِ بدر کو اس لیے ﴿ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴾ کہا ہے کہ اس کا کوئی مثل ونظیر نہیں ہے، کیوں کہ اس میں فرشتے آسمان سے آ کر لڑے ہیں۔ یومِ جنگ کو ﴿ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴾ کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کی نرمی اور رحمت نہیں ہوتی تو گویا وہ خیر سے عقیم ہے۔

اسی باب سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴾ [الذاریات: ٤١] "جب ہم نے ان پر بے خیر و برکت ہوا بھیجی۔" غرض کہ عقیم سے مراد وہ شے ہے جس میں کوئی خیر نہیں ہوتی ہے تو ﴿ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴾ وہ دن ٹھہرا جس میں کوئی خیر نہ ہو۔ پھر جبکہ اس روزِ بے خیر سے مراد روزِ بدر لیا جائے تو اس صورت میں عقیم کے اندر استعارہ بالکنایہ یوں ہوگا کہ ذہن میں زمانۂ بے خیر کی تشبیہ بانجھ عورتوں سے دی، جس طرح کہ ان سے اس ہوا کی تشبیہ دی جو نہ بادل اُٹھاتی ہے نہ درختوں کو باردار کرتی ہے اور بے خیر زمانے کے لیے عقم کو ثابت کیا۔ یہ تخییل ہوئی۔ اسی طرح اگر اس دن سے مراد روزِ قیامت لیا جائے تو بھی استعارہ بالکنایہ ہوگا، اس طرح کہ جو دن سارے دنوں سے منفرد ہے، اس کی تشبیہ ذہن میں بانجھ عورتوں سے دی اور اس دن کے لیے عقم کو ثابت کیا۔ یہ تخییل ہوئی۔ کیوں کہ بعض ایام بعض کے واسطے نتائج ہوتے ہیں۔ ہر دن اپنے مثل کو جنتا ہے اور روزِ قیامت ایسا ایک تنہا دن ہے کہ اس کے بعد نہ کوئی دن ہے نہ رات تو گویا وہ مثل بانجھ عورت کے ہوا جو بچہ نہیں جنتی ہے۔ یہ حاصل ہے شہاب رحمہ اللہ کا۔[1]

﴿ اَلْمُلْكُ ﴾ سے مراد ظاہر حکومت اور مکمل غلبہ ہے۔ ﴿ یَوْمَئِذٍ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ تنوین اس جملے کا عوض ہے، جو بعد غایت کے محذوف ہے، (یہ تقدیر اس واسطے ہے کہ ان کا ایمان لانا زوال مریت کو لازم ہے اور دوسری تقدیر بلحاظ ﴿ وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً ﴾ کے لیے۔ کذا قال، ذکر الکرخي فتدبر۔) یعنی بادشاہت۔ جس دن وہ ایمان لائیں گے، یا جس دن اُن کا شک وشبہہ زائل

[1] حاشیۃ الشھاب علیٰ تفسیر البیضاوي (٦/ ٣٠٧)

ہوگا، اکیلے اللہ پاک کے لیے ہے۔ نہ اس میں اللہ سے کوئی جھگڑنے والا ہے، نہ دنیا کے بادشاہوں میں سے کوئی مدافعت کرنے والا ہے۔ اس دن میں کسی کی بادشاہت نہ ہوگی۔ ظاہر یہی ہے کہ ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے اور مابعد کی تقسیم بھی اسی خیال کو تقویت دیتی ہے اور جو شخص روزِ بدر کا قائل ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس دن اللہ کے واسطے بادشاہت ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دن صرف اکیلے اللہ پاک کا حکم جاری ہوگا اور قضائے الٰہی کے سوا، جو کچھ ہے، باطل ہوگا اور وہ جس کو عذاب دینے کا ارادہ کرے گا، اس میں اس کا حکم نافذ اور جاری ہوگا اور تقسیم مابعد کی اخبار مترتب ٹھہرے گی اُن کے حال پر اس دن عقیم میں، یعنی اُن کے ایمان و کفر پر، امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔[1]

جملہ ﴿ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ﴾ مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی نے کہا ہے کہ جس دن خاص اللہ پاک کے لیے بادشاہت ہوگی تو اُن سے کیا معاملہ کرے گا؟ لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن کافروں اور مومنوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے یا جملۂ حالیہ ہے، یعنی جس دن وہ ایمان لائیں گے، یا اُن کا شک وشبہہ دور ہوگا، اس دن خاص اللہ پاک کا راج ہوگا، درآنحالیکہ فریقین کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ امام سمین رحمہ اللہ کا قول یہی ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس فیصلے کی تفصیل بیان فرمائی۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ یعنی جن لوگوں نے ایمان اور عملِ صالح کو جمع کیا، یعنی ایمان لائے اور نیکیاں بھی کیں، ان کی جزا یہ ہے کہ جنتوں کی زمین میں ہمیشہ ہمیشہ قرار پکڑیں گے، وہاں ابد الآباد تک رہیں گے، بسیں گے، جنت کے عیش و آرام میں ڈوبے رہیں گے اور یہ سب کچھ محض اللہ پاک کے فضل و کرم سے ان کو ملے گا۔ پھر دوسرے فریق کی جزا کا ذکر فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ یعنی جن لوگوں نے اللہ کا انکار کیا اور اس کی باتوں کی تکذیب کی، دونوں باتوں کے جمع کرنے والے ہوئے، پس ان کا بدلہ یہ ہے کہ اُن کے لیے عذاب ہے، جس کی صفت ﴿ مُّهِيْنٌ ﴾ ہے، یعنی انتہائی سخت ہے اور اُن کو ذلیل کرنے والا ہے۔ انتہائی درجے کا ایذا دینے والا ہے اور اس قسم کا عذاب اُن کے کفر اور اعمالِ بد کی وجہ سے ہے۔

نکتہ:

پہلے فریق کی جزا میں حرفِ فا ذکر نہ کیا اور دوسرے فریق کی جزا میں ذکر فرمایا، پس اس کی وجہ یہ ہے کہ ثواب کا عطا کرنا محض اللہ پاک کے فضل سے ہے، اُن کے اعمال کی وجہ سے نہیں ہے (یعنی اصل ثواب جس کو دخولِ بہشت

---

[1] البحر المحيط (٦/ ٣٥٤)

عنبر سرشت کہتے ہیں، محض اللہ پاک کے فضل سے ملتا ہے، ہاں جنت کے درجات کا ملنا اعمال کے سبب سے ہوتا ہے، جیسا جس کا عمل ہوگا، ویسا ہی اس کو درجہ ملے گا، یہ بات اپنے موقع پر ثابت ہو چکی ہے)۔ اور عذاب کا دینا ان کے کفر اور معاصی کے سبب سے ہے، گویا عذاب کا عطا ہونا اُن کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ اس عذاب کا باعث اُن کے اعمال ہوئے ہیں۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا اور اسی لیے ﴿لَهُمْ عَذَابٌ﴾ فرمایا اور "هم في عذاب" نہ فرمایا۔[1] جبکہ اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ قیامت کے دن اسی کا راج ہوگا اور وہی فریقین کے درمیان فیصلہ کرے گا اور مومنوں کو جنت میں اور کافروں کو دوزخ میں داخل کرے گا تو اس کے بعد مومنین کی فضیلت اور شان کی بڑائی کے اظہار کے لیے ان کا علاحدہ ذکر کیا۔ پس فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰

اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، پھر وہ قتل کیے گئے یا مر گئے تو اللہ ضرور انھیں اچھا رزق دے گا اور بلاشبہہ اللہ ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے (58) وہ انھیں اس مقام میں ضرور داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے، اور بے شک اللہ بڑا جاننے والا، خوب بردبار ہے (59) (بات) یہی ہے، اور جو شخص بدلہ لے مثل اس کے جتنی اسے تکلیف دی گئی، پھر اگر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت مغفرت والا ہے (60)

مہاجرین کے اجرِ عظیم کا بیان:

یعنی واجبی بدلہ لینے والے کو عذاب نہیں کرتا، اگرچہ بدلہ نہ لینا بہتر تھا۔ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں نے بدلہ لیا، کافروں کو ایذا پہنچائی، پھر کافر زیادتی کرنے کے لیے اُحد اور احزاب میں آئے۔ پھر اللہ نے پوری مدد کی۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اُن لوگوں کی خبر دیتا ہے جو اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور اس کے پاس جو اجر و ثواب ہے اسے طلب کرنے کے لیے اس کی راہ میں ہجرت کر کے نکلے اور اپنا وطن اور گھر والے

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٧)

اور یار دوستوں کو چھوڑ آئے اور اللہ و رسول کے لیے اور اس کے دین کی مدد کرنے کے لیے اپنے شہروں سے جدائی اختیار کی۔ ﴿ ثُمَّ قُتِلُوْٓا ﴾ یعنی پھر جہاد میں مارے گئے۔ ﴿ اَوْ مَاتُوْا ﴾ یعنی یا بغیر لڑے بھڑے اپنی طبعی موت سے اپنے بچھونوں پر مر گئے تو یقیناً انھوں نے اجرِ جزیل پایا اور ثنائے جمیل حاصل کی، جس طرح کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [النسآء: ۱۰۰] ''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔''

اللہ کی راہ میں مرنے والوں کا رزقِ کریم و اجرِ عظیم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک اپنے فضل و رزق سے البتہ جاری رکھے گا ان پر جنت سے وہ شے، جس سے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ﴿ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ﴾ سے مراد جنت ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴾ [الواقعة: ۸۸۔ ۸۹] ''پس لیکن اگر وہ (مردہ) مقربین میں سے ہو۔ تو (اس کے لیے) راحت اور خوشبو اور نعمتوں والا باغ ہے۔'' پس اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ اس کو راحت، رزق اور جنتِ نعیم حاصل ہوگی، جس طرح اِس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ﴾ پھر یہ فرمایا: ﴿ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ﴾۔

﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہجرت کرتا ہے اور اس کی راہ میں لڑتا ہے، اللہ پاک اس کو اور اس شخص کو جو اس کا استحقاق رکھتا ہے خوب جانتا ہے۔ ﴿ حَلِيْمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ حلم کرتا ہے، درگزر فرماتا ہے اور اُن کے گناہوں کو بخشتا ہے اور انھوں نے جو اس کی طرف ہجرت کی اور اس پر توکل کیا، اس کے سبب سے اُن سے اُن گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے۔ اب یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں مارا گیا، مہاجر ہو یا غیر مہاجر، تو بے شک وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہے، اسے رزق ملتا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱٦۹] ''ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''

اس بارے میں حدیثیں بہت ہیں، چنانچہ پہلے گزر چکی ہیں۔ رہا وہ شخص جو اللہ کی راہ میں مر گیا ہے، مہاجر ہو یا غیر مہاجر، پس یقیناً یہ آیتِ کریمہ احادیثِ صحیحہ کے ساتھ یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس پر رزق جاری ہوتا ہے اور اس پر اللہ

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۹۱۳) تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲۵۰۳) تفسير ابن كثير (۳/ ۳۰۹) البتہ صحیح مسلم میں آیت کا ذکر نہیں ہے۔

پاک کا بڑا احسان رہتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو عبیدہ بن عقبہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ شرحبیل بن سمط نے کہا ہے کہ ارضِ روم میں ایک قلعہ پر ہماری رباط (ٹھہرنا) واقامت دراز ہوئی، پس سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مجھ پر گزر ہوا تو وہ بولے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص رباط کرتا ہوا، یعنی نگہبانی کرتا ہوا مرتا ہے تو اللہ اس پر اس کے اجر کے مثل جاری کرتا ہے، اور جاری کرتا ہے اس پر رزق اور وہ امن میں ہوتا ہے فتانین سے، یعنی منکر ونکیر اس سے سوال نہیں کرتے اور تم پڑھو اگر چاہو: ﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ ہمام نے ابوقبیل وربیعہ بن سیف مغافری کو کہتے ہوئے سنا، یہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم رودس میں تھے اور ہمارے ساتھ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، ان پر دو جنازوں کا گزر ہوا، ان میں سے ایک تو مارا گیا تھا اور دوسرا اپنی موت سے مرا تھا تو لوگ اس پر مائل ہوئے جو مارا گیا تھا۔ اس پر فضالہ بولے: مجھے کیا ہے! میں دیکھتا ہوں کہ اِس کے ہمراہ مائل ہوئے اور اُس کو چھوڑا؟ لوگوں نے کہا کہ یہ قتیل فی سبیل اللہ ہے۔ پس فضالہ نے کہا: واللہ! میں پروانہیں کرتا ہوں کہ میں اُن دونوں کے کسی گڑھے سے اُٹھایا جاؤں، تم سنو اللہ کی کتاب کو: ﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾[2]۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ عبدالرحمٰن بن جحدم خولانی فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے پاس بحر میں دو جنازوں کے ہمراہ حاضر تھے، اُن میں سے ایک کو تو منجنیق لگی تھی اور دوسرا اپنی موت سے مرا تھا۔ لہٰذا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ اس شخص کی قبر کے پاس بیٹھے جو اپنی موت سے مرا تھا، اس پر اُن سے کسی نے کہا کہ تم نے شہید کو چھوڑ دیا اور تم اس کے پاس نہ بیٹھے۔ سیدنا فضالہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں پروانہیں کرتا کہ میں اُن دونوں کے کسی گڑھے سے اٹھایا جاؤں، بے شک اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ پس اے بندے تو کیا چاہتا ہے، جبکہ تو ایسی جگہ داخل کیا گیا جس کو تو پسند کرتا ہے اور رزقِ حسن تجھے دیا گیا، قسم اللہ کی میں پرواہ نہیں کرتا کہ ان دونوں کے کسی گڑھے سے اٹھایا جاؤں۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "عن يونس عن عبد الأعلى عن وهب أخبرني عبدالرحمن بن شريح و سلامان بن عامر قال: كان فضالة بن عبيد برودس أميراً على الأرباع فخرج

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٩) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٩)

(والظاهر خرجوا) بجنازتي رجلين أحدهما قتيل والآخر متوفى فذكر نحو ما تقدم» قولہ تعالیٰ:
﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ﴾ امام مقاتل بن حیان اور ابن جریر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت سریۂ صحابہ رضی اللہ عنہم (صحابہ کے لشکر کا ایک حصہ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ ماہِ محرم میں مشرکین کی ایک جماعت سے ماہِ محرم میں ملے تو مسلمانوں نے ان کو قسم دلائی کہ حرمت والے مہینے میں نہ لڑیں۔ مگر مشرکین نہ مانے، لڑائی کی اور بغاوت کی، مسلمان ان سے لڑے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان پر فتح یاب کیا۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان مہاجرین سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ بعض نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے وطنوں سے کسی لشکر کے ایک حصے میں یا کسی لشکر میں ہجرت کی۔ دونوں امر پر اس کو محمول کرنا کچھ بعید نہیں ہے اور ہر ایک کی ہجرت اللہ کی راہ میں اور اس کی اطاعت میں ہے۔ فتح البیان و فتح القدیر میں اسی طرح ہے۔[2] امام بیضاوی اور نسفی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، مروی ہے کہ بعض صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! یہ لوگ جو مارے گئے، ہم جان چکے جو خیر اللہ پاک نے ان کو عطا کی اور ہم آپ کے ساتھ جہاد کرتے ہیں، جس طرح انھوں نے جہاد کیا، لہٰذا ہمارے واسطے کیا ہے، اگر ہم مرجائیں؟ اس پر یہ دو آیتیں نازل ہوئیں۔[3] شیخ زادہ کا بیان یہ ہے کہ مہاجر میں اختلاف ہے۔ پس کسی نے کہا ہے کہ مراد وہ شخص ہے جس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت چاہنے کو اور اللہ پاک کی طرف تقرب طلب کرنے کے لیے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسروں نے کہا ہے کہ بلکہ مراد وہ شخص ہے جس نے جہاد کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ کیے گئے لشکروں کے ساتھ نکلا دین کی مدد کرنے کے لیے اور اسی لیے اس کے بعد قتل کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن میں سے بعض نے دونوں امر پر اس کو محمول کیا ہے۔

﴿سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ سے مراد جہاد ہے، جیسا کہ علامہ نسفی رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔[4] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: "طاعة الله وطلب رضاء الله"[5] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "طاعة الله" میں مکے سے مدینے کی طرف نکلے۔[6] امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ "طاعة الله" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت ہے۔ اس کا نزول کئی گروہ کے بارے میں ہوا ہے، جو کہ مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کے لیے نکلے اور مشرکوں نے ان کا پیچھا کیا، پھر وہ ان سے لڑے۔ امام ابن عامر اور اہلِ شام نے ﴿قُتِلُوْٓا﴾ کو بہ تشدید حرفِ تا پڑھا ہے تکثیر کی بنا پر۔ باقی قاریوں کی قراءت بہ تخفیف ہے۔[7] ﴿لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ﴾ میں حرفِ لام قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی "وَاللّٰهِ

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٧٤ ـ ٦٧٥)
[2] فتح القدير (٣/ ٦٣٢) فتح البيان (٩/ ٧٣)
[3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٧) تفسير النسفي (٣/ ١١٠)
[4] تفسير النسفي (٣/ ١١٠)
[5] تفسير الخازن (٥/ ٢٥)
[6] تفسير الجلالين (١/ ٤٤١)
[7] تفسير القرطبي (١٢/ ٨٩)

لَیَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ“ اور جملہ قسمیہ خبر ہے موصول کی۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جملہ قسمیہ خبر مبتدا واقع ہوتا ہے۔ اور جو شخص اس کو منع کرتا ہے۔ وہ قول مضمر نکال کر اس کو خبرِ مبتدا کہتا ہے، یعنی ”والذين هاجروا مقول في حقهم ليرزقنهم“ لیکن اس شخص کا قول مرجوح ہے، مگر فتح القدیر میں اسی تقدیر ”قول“ کو اختیار کیا ہے۔[1]

﴿ رِزْقًا حَسَنًا ﴾ کا نصب یا تو اس بنا پر ہے کہ رزق بہ معنی مرزوق ہو کہ ”لیرزقن“ کا مفعول ثانی ہے، یا مصدر مؤکد ہے۔ رزقِ حسن میں گفتگو ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جنت کا رزق ہے، یعنی بہشت کی نعمتیں۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رزقِ حسن وہ ہے جو کبھی منقطع نہ ہو۔ امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] حاصل ایک ہی ہے، کیوں کہ جنت کی کوئی شے فنا پذیر نہیں ہے اور ہر چیز من مانتی اس میں موجود ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد غنیمت ہے، کیوں کہ وہ حلال طیب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد علم وفہم ہے، جیسا کہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا ہے: ﴿ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ﴾ [هود: ۸۸] ”اور اس نے مجھے اپنی طرف سے اچھا رزق دیا ہو (تو کیسے اس کی نافرمانی کروں؟)۔“ جملہ ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ تذییل ہے ماقبل کی تقریر کرتا ہے، کیوں کہ اول تو قسمیہ جملے سے رزق کا وعدہ کیا اور اب کمال تاکید کے ساتھ اپنا ﴿ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ ہونا ارشاد فرمایا، اس وعدے کی استواری کا کیا ٹھکانا ہے۔ اللہ پاک ﴿ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ اس واسطے ہے کہ بے حساب رزق دیتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی وجہ کو اختیار کیا ہے[4] اور جو رزق بندوں کے ہاتھ پر جاری ہوتا ہے، ایک دوسرے کو لیتا دیتا ہے، پس وہ بھی اسی کی طرف سے ہے، اس کے سوا نہ کوئی رازق ہے نہ کوئی عطا کرنے والا۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کیا خوب وجہ لکھی ہے: ”لأنه المخترع للخلق بلا مثال، المتكفل للرزق بلا ملال“[5] یعنی اس کے ﴿ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ ہونے کا کیا پوچھنا وہ تو بلا مثال خلق کا اختراع اور ایجاد کرنے والا ہے اور بغیر ملال روزی کی ضمانت دینے والا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: ”أفضل المعطين“[6]، یعنی سب دینے والوں سے بہتر دینے والا ہے۔ یہاں افعل تفضیل اپنے باب پر ہے، اس واسطے کہ اللہ پاک اس بات کے ساتھ مختص ہے کہ جو وہ رزق دیتا ہے اس پر اس کے علاوہ کوئی اور قدرت نہیں رکھتا ہے اور رزق میں اصل وہی ہے اور اس واسطے کہ اس کا غیر اپنے ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں رزق دیتا ہے یہ نہیں ہے کہ رزق کو وہ بناتا ہے اور یہ وجہ ہے کہ غیر اس کا جو رزق دیتا ہے، سو لوگوں سے اپنا نفع لینے کو دیتا ہے، وہ اس سب میں بدلے کا طالب ہے اور اللہ پاک کی طرف سے جو رزق ہے، وہ تو محض احسان ہے۔[7] كذا قال الرازي.

امام کرخی رحمہ اللہ نے افضل عطا کرنے والوں کا بیان یوں کیا ہے: یہ بات معلوم ہے کہ ہر رزق اسی کی طرف

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٣٢) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤١) [3] تفسير الخازن (٥/ ٢٥)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٧) [5] تفسير النسفي (٣/ ١١٠) [6] تفسير الجلالين (١/ ٤٤١) [7] تفسير الرازي (٢٣/ ٥١)

سے ہے، فرق صرف اس وجہ سے ہے کہ اللہ پاک اس بات کے ساتھ مختص ہے کہ وہ جو رزق دیتا ہے، اس پر اس کا غیر قادر نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ غیر اس کا جب رزق دیتا ہے تو اپنا نفع لینے کے لیے دیتا ہے۔ یا تو اس لیے دیتا ہے کہ اس پر کوئی شے واجب ہے کہ اس سے خارج ہو۔ یا اس واسطے کہ اس کے سبب سے وہ تعریف کا مستحق ہو کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور کہیں کہ بڑا داتا ہے۔ یا اپنے ہم جنس کے ساتھ رقت اور رحمت کی وجہ سے دیتا ہے۔ رہا اللہ پاک تو اس کا کمال اس کی ایک ذاتی صفت ہے، وہ کسی شے سے کوئی زیادہ کمال حاصل نہیں کرتا، پس اس سے جو رزق صادر ہوتا ہے، وہ محض احسان ہی احسان ہے اور کچھ نہیں۔ غرض کہ اللہ پاک نے پہلے تو مہاجرین کے رزق کا وصف نہایت خوش اسلوبی اور پوری تاکید کے ساتھ بیان کیا، اب ان کے مسکن کا ذکر فرمایا۔

﴿ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ﴾ جس طرح وہاں لام قسم ونونِ تاکید تھا، ویسا ہی یہاں ہے اور جیسے وہاں رزقِ حسن کہا، ویسے ہی یہاں مدخل کا وصف ﴿ يَرْضَوْنَهٗ ﴾ سے فرمایا۔ یہ جملہ یا تو مستانفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی نے کہا کہ اُن کی روزی و رزق کا حال تو سنا مسکن ان کا کیسا ہوگا؟ لہٰذا یہ اس کا جواب ہے کہ اللہ ان کو ایسے مسکن میں بسائے گا جس کو وہ پسند کریں گے، اس سے راضی ہوں گے۔ یا یہ جملہ ﴿ لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ ﴾ سے بدل ہے۔ اہلِ مدینہ نے مدخل کو بفتحِ میم پڑھا ہے اسم ظرف ہونے کی وجہ سے، یعنی داخل ہونے کی جگہ۔ باقی قاریوں کی قراءت بضمِ میم ہے اسم مکان ہونے کی بنا پر، مراد جنت ہے۔ اور نصب اس کا اس بنیاد پر ہے کہ مفعول ثانی ہے یا مصدر میمی ہے مؤکد ہے فعل مذکور کا، اس صورت میں مفعول ثانی محذوف ہوگا، یعنی "ليدخلنهم الجنة إدخالا"۔ سورت سبحان میں اس کی مثل پر کلام گزر چکا ہے۔[1] اس میں بندوں پر وہ احسان ہے اور اُن کے لیے وہ خوش خبری ہے جس کا اندازہ بیان میں نہیں آ سکتا ہے، کیوں کہ جس مدخل کو وہ پسند کریں گے، وہ اُن کے نفوس کے لیے نہایت موزوں ہوگا اور اُن کے مطلب کے بہت قریب ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ ہوگا کہ جنت میں وہ شے دیکھیں گے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ یہ وہی شے ہے جس سے وہ راضی ہوں گے اور رضا سے بھی کہیں بڑھ کر۔ اللهم ارزقنا بفضلك وكرمك يا سيدنا ومولانا.

اب رہی یہ بات کہ اللہ پاک نے جو ﴿ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا ﴾ فرمایا ہے، یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص جہاد میں مارا گیا اور وہ شخص جو اپنے بچھونے پر مر گیا، ان دونوں کا حال برابر ہے، جبکہ ارادے میں اور تقرب الی اللہ اور نصرت رسول اللہ ﷺ میں اور اصل عمل، یعنی ہجرت میں برابر ہوں، اس لحاظ سے کہ اللہ پاک نے وعدے میں دونوں کو جمع کیا ہے، اس کی تائید نبی کریم ﷺ کا یہ قول کرتا ہے: « اَلْمَقْتُوْلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُتَوَفّٰى فِيْ

[1] رقم الآية (٨٠)

سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ قَتْلٍ هُمَا فِي الْأَجْرِ شَرِيْكَانِ ﴾[1] شرکت کا لفظ ان دونوں کی برابری کو ظاہر کرتا ہے، ورنہ ان دونوں کے خاص کر ذکر کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہ رہے گا۔ شیخ زادہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں یوں کہا ہے کہ رزق کے وعدے میں برابری اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ جن کو رزق عطا کیا جائے گا، ان کا درجہ ایک دوسرے سے افضل یا برابر ہوگا۔ پھر اگر تو درجہ افضل ہے تو اور دلیل سے ہوگا اور کتب فروع میں جو بات ثابت کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ مقتول افضل ہے، کیوں کہ وہ شہید ہے۔

﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ کا مطلب یہ کہ اللہ پاک عمل کرنے والوں کے درجوں کو اور اُن کے استحقاق کے مرتبوں کو خوب جانتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ مفرطین (کمی کرنے والے) ہیں، ان کی تفریط سے حلم فرماتا ہے، ان پر جلدی عقوبت نہیں کرتا۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی نیتوں کو خوب جانتا ہے اور اُن کو سزا دینے کے لیے حلم فرماتا ہے۔[2] یعنی اللہ پاک عقاب سے بے پروا ہے، جو شخص معصیت پر اقدام کرتا ہے اس پر جلد عقوبت نہیں فرماتا، بلکہ مہلت دیتا ہے، تاکہ اس سے توبہ کا وقوع ہو تو جنت کا مستحق ہو جائے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "لعليم بأحوال من قضي نحبه مجاهداً و آمال من مات وهو ينتظر معاهداً حليم بإمهال من قاتلهم معانداً"[3] یعنی جس شخص نے جہاد کر کے اپنی نذر پوری کی، اللہ پاک اس کے احوال کو خوب جانتا ہے اور جو شخص مرگیا، اس حال میں کہ اپنے عہد کا انتظار کرتا رہا، اس کی آرزوؤں سے خوب واقف ہے اور جس نے اُن سے عناد کر کے قتال کیا اس کی مہلت دینے کے ساتھ بڑا حلم والا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ ان کے احوال کو اور اُن کے دشمنوں کے احوال کو خوب جانتا ہے، سزا کی جلدی نہیں کرتا ہے۔[4]

﴿ ذٰلِكَ ﴾ اس شے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "الأمر ما قصصنا عليكم من إنجاز الوعد للمهاجرين خاصة إذا قتلوا أو ماتوا"[5] یعنی بات وہ ہے جس کا ہم نے تم پر بیان کیا ہے کہ خاص مہاجرین کے واسطے جو ہم نے وعدہ کیا ہے اس کو پورا کریں گے، جب وہ مارے جائیں گے یا مریں گے، اس بنیاد پر ﴿ ذٰلِكَ ﴾ خبر ہوگا مبتدائے محذوف کا اور اس کا ما بعد کلام مستانف ٹھہرے گا۔ ﴿ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ﴾ مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ﴾ ہے۔ کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہے اور شرطیہ بھی ہو سکتا ہے۔ ﴿ بِمِثْلِ ﴾ میں حرف با آلہ کے واسطے ہے اور ﴿ بِهٖ ﴾ کا حرف با سببیت کے واسطے ہے۔

﴿ عَاقَبَ ﴾ کے معنی ہیں جازیٰ، یعنی جس شخص نے ظالم کو بدلا دیا، اس جیسے ہی فعل کے ساتھ جس کے ساتھ

---

[1] روح المعاني (١٧/ ١٨٨) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤١) [3] تفسير النسفي (٣/ ١١٠)
[4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٧) [5] فتح القدير (٣/ ٦٣٣)

اس ظالم نے اس پر ظلم کیا اور بدلہ لینے میں کسی طرح کی زیادتی نہ کی۔ ﴿ عَاقَبَ ﴾ ماخوذ ہے تعاقب سے۔ تعاقب ایک شے کے دوسری شے کے بعد آنے کو کہتے ہیں تو عقاب و عقوبت اس جزا اور بدلے کا نام ہے جو جرم کے بعد ہوتا ہے اور یہاں ﴿ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ﴾ میں جو ظلم مشرکین سے ابتداءً صادر ہوا ہے، اس کا نام عقوبت رکھا ہے، حالاں کہ وہ کسی جرم و گناہ کی جزا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ایسا مشاکلت و ازدواج کے واسطے کیا ہے، جس طرح کہ ان دو آیتوں میں آیا ہے: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔'' اور ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرۃ: ١٩٤] ''پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم اس کے برابر اس پر زیادتی کرو جو زیادتی اس نے تم پر کی۔''

دوسری وجہ یہ ہے کہ بطورِ مجاز مرسل کے ہے، اس لیے کہ جو فعل پہلے پہل واقع ہوا ہے، وہ اس فعل کا سبب ہے جو جزا و عقوبت کے واسطے واقع ہوا ہے، لہٰذا جو مسبب کا نام تھا، وہ نام سبب کا رکھ دیا۔ حاصل یہ ہے کہ ﴿ عَاقَبَ ﴾ بہ معنی ''جازی'' حقیقتِ لغوی ہے اور ﴿ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ﴾ مجاز ہے مشاکلت کی قبیل سے، یا سبب کا نام مسبب کے نام کے ساتھ رکھنے کے باب سے۔ دو آیتوں کی مثال جو پہلے ذکر کی گئی۔ قرطبی، فتح القدیر اور فتح البیان میں اسی طرح ہے۔[1] لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جزائے عقوبت کا نام عقوبت رکھا ہے اور مجاز ﴿ عَاقَبَ ﴾ میں ہے۔ حالاں کہ یہ بات ٹھیک نہیں، کیوں کہ ﴿ عَاقَبَ ﴾ بمعنی ''جازی'' لغوی حقیقت ہے اور اس میں مجاز نہیں ہے۔ مجاز جو ہے وہ ﴿ عُوْقِبَ بِهٖ ﴾ میں ہے۔ فتأمل۔ مثلیت سے مراد یہ ہے کہ ظلم پہلے اس پر کیا گیا تو اس نے اس کے بدلے میں اسی مقدار کا ظلم کیا، اس پر زیادتی نہ کی۔

﴿ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ظالم نے جو ابتدا میں ظلم کیا تھا اس ظلم کے بعد پھر اور ظلم کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس ﴿ بُغِيَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مشرکین نے اپنے نبی کی تکذیب کی اور جو لوگ ان پر ایمان لائے اُن کو ایذا دی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو مضطر (بے چین) کیا اور اُن کو اُن کے وطن سے نکالا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ پھر مجازی طور پر مبغی علیہ ہو، یعنی بدلہ لینے والا پھر مظلوم ہو۔ ﴿ ثُمَّ ﴾ کے معنی رُتبہ کا فرق ہے، کیوں کہ پہلے پہل لڑنے میں ایک طرح کا ظلم ہے، جس طرح کہ امثالِ عرب میں بولتے ہیں: ''البادي أظلم'' یعنی ظالم تو وہی ہے جو ابتدا کرتا ہے۔

﴿ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ﴾ میں حرفِ لام قسم کا جواب ہے، یعنی واللہ! البتہ ضرور مدد کرے گا اس کی اللہ تعالیٰ۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں مقاتل رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ محرم کی دو راتیں باقی رہ گئی تھیں، ان میں نبی کریم ﷺ نے ایک لشکر بھیجا تو وہ لوگ مشرکین سے ملے، بعض مشرکوں نے بعض سے کہا ہے کہ تم اصحاب محمد

[1] تفسیر القرطبي (١٢/ ٩٠) فتح القدیر (٣/ ٦٣٣) فتح البیان (٩/ ٧٥)

سے لڑو، کیوں کہ وہ ماہِ حرام میں لڑنے کو حرام سمجھتے ہیں اور اصحابِ محمد ﷺ نے اُن کو قسم دلائی اور اُن سے اللہ کا ذکر کیا کہ اُن سے لڑنے کے لیے سامنے نہ آئیں اور صحابہ ماہِ حرام میں لڑنے کو حلال نہیں جانتے ہیں۔ ہاں اس شخص سے لڑتے ہیں جو اُن سے لڑائی کی ابتدا کرے۔ پھر مشرکین ابتداء کرتے ہوئے اُن سے لڑے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس وقت اُن سے لڑنے کو حلال کیا اُور اُن سے لڑے اور اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اُن پر نصرت دی۔[1]

(بعض روایات میں اس کے بعد یہ الفاظ ہیں کہ مسلمانوں کے جی میں ماہِ حرام میں لڑنے سے کوئی شے واقع ہوئی، یعنی ہم سے برا کام ہوا۔ اس روایت کی بنا پر ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴾ کو ﴿ لَيَنْصُرَنَّهُ اللَّهُ ﴾ کی تعلیل کہنے میں کچھ اشکال نہیں ہے، علت ظاہر ہے۔ واللہ أعلم۔) یہ حدیث مرسل ہے۔ فتح القدیر میں اس کو ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس کو لکھا ہے، لیکن کچھ فرق ہے۔[2] چناں چہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی بعض الفاظ کے فرق کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح امام خازن رحمہ اللہ نے بھی بعض الفاظ کے فرق کے ساتھ اس کو لکھا ہے۔[3] امام ابن منذر رحمہ اللہ نے امام ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ مشرکوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کے خلاف آپس میں تعاون کیا، پھر آپ ﷺ کو نکال دیا۔ اس پر اللہ پاک نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا اس بات کا کہ آپ ﷺ کی مدد کرے گا اور یہ آیت قصاص میں بھی ہے۔[4] كذا في فتح القدير و فتح البيان.

امام قرطبی رحمہ اللہ نے "قیل" کے لفظ سے ایک اور شانِ نزول یہ لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکوں کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انھوں نے اُحد کے دن مسلمانوں کی ایک قوم کا مثلہ کیا اور اُن کو مار ڈالا، یعنی ان کے ناک کان کاٹ کر اُن کو قتل کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اُسی کے مثل ان کے ساتھ کیا۔[5] فتح القدیر و فتح البیان میں "قیل" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور قصاص اور جراحات کے بارے میں ہے۔[6] ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴾ یعنی اللہ پاک بدلہ لینے والے کی مدد کرے گا، اس واسطے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور بڑا بخشنے والا ہے۔ اس تعلیل میں یہ بحث ہے کہ عفو و غفران چاہتے ہیں کہ پہلے کوئی جرم و گناہ ہوا ہو، حالاں کہ یہاں عوض لینے والے سے کوئی گناہ بدلہ لینے میں صادر نہیں ہوا، کیوں کہ اس نے تو اپنا حق پورا لے لیا، کسی پر کچھ ظلم نہیں کیا، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ عفو کسی پہلے گناہ کے سرزد ہونے کا مقتضی ہے، لیکن یہ لازمی نہیں کہ گناہ کا ارتکاب کسی حرام کام کے کرنے سے ہو۔ بلکہ گناہ کبھی کسی مندوب و مستحب کو ترک کر دینے سے بھی ہوتا ہے اور زجر و توبیخ اور سختی کے لیے اس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٣_ ٢٥٠٤) یہ حدیث مرسل ہے۔ [2] فتح القدير (٣/ ٦٣٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠٩_ ٣٠١)
[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٩٠) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢) تفسير الخازن (٥/ ٢٥) [4] فتح القدير (٣/ ٦٣٥) فتح البيان (٩/ ٧٥)
[5] تفسير القرطبي (٩٠/١٢) [6] فتح القدير (٣/ ٦٣٣) فتح البيان (٩/ ٧٦)

ترک کو بھی جرم کہہ دیتے ہیں۔ چوں کہ بدلہ لینے والے نے بدلہ لینے میں اپنی خواہش کی پیروی کی اور اللہ پاک نے جس بات کی رغبت دلائی تھی کہ ﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [الشوریٰ: ٤٣] ''اور البتہ جو صبر کرے اور معاف کر دے تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''پھر جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ [البقرة: ٢٣٧] ''اور تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

اس سے اعراض کیا اور اُن ترغیبوں سے متاثر نہ ہوا اور ترکِ عفو کیا، اور بدلہ لیا اس واسطے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا ہے۔ اس نے جو افضل شے کو ترک کیا، اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس میں اشارتاً بندوں کو عفو و مغفرت پر آمادہ کرتا ہے، کیوں کہ جب وہ اپنی کمال قدرت کے باوجود معاف کرتا ہے اور بخشتا ہے تو بندے تو زیادہ تر اس کے لائق ہیں۔ اور اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ وہ قادر ہے کہ گناہ کی ابتدا کرنے والے کو سزا دے، کیوں کہ عفو کے ساتھ وہ ہی موصوف ہوتا ہے جو اس کے برعکس کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ ذکر کیا ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک مومنوں کے لیے ماہِ حرام میں اُن کے جنگ کرنے سے عفو و غفور ہے۔[2]

جمل نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے جو ماہِ حرام میں اُن کے لڑنے کو معاف کیا، اس کے باوجود کہ اس وقت لڑنا حرام تھا، اس لیے کہ مومنین تو حملہ آور کے مقابلے کے لیے لڑے تھے تو وہ اُن پر واجب ہونے کی قبیل سے تھا۔ شیخ زادہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے ماقبل سے تعلق کی وجہ یہ ہے کہ اول تو اللہ پاک نے مہاجرین کے رزق و مسکن کا وصف بیان کیا۔ پھر اس آیت میں یہ فرمایا کہ باوجود اس کے کہ میں آخرت میں اس وعدے کے ساتھ اُن کی عزت کروں گا، دنیا میں ان کی نصرت کو اس شخص پر جو اُن پر بغاوت و زیادتی کرے گا، نہ چھوڑوں گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾

یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور بے شک اللہ خوب سننے والا، بہت دیکھنے والا ہے (61) یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور بلاشبہ جسے وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہی باطل ہے اور بلاشبہ اللہ ہی بلند تر، بہت بڑا ہے (62)

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٧) تفسير النسفي (٣/ ١١١) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢)

اللہ تعالیٰ ہی دنیا کا خالق ومتصرف ہے:

یعنی اسی طرح کفر میں اسلام غالب کرے گا۔ انتہیٰ۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ اپنی خلق میں جس شے کے ساتھ چاہتا ہے تصرف کرنے والا ہے اور وہی پیدا کرنے والا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [آل عمران: ٢٦۔ ٢٧] ''آپ کہہ دیجیے: اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور تو ہی جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ تو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو مُردے سے زندے کو اور زندے سے مردے کو نکالتا ہے اور جسے تو چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔'' اللہ کا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کے معنی اس کا اس سے اس میں اور اس سے اس میں داخل کرنا ہے۔ لہٰذا کبھی تو رات بڑھ جاتی ہے اور دن کم ہو جاتا ہے، جیسا کہ سردی کے موسم میں ہوتا ہے اور کبھی دن بڑھ جاتا ہے اور رات گھٹ جاتی ہے، جیسا کہ گرمی کے موسم میں ہوتا ہے۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کی باتوں کو سنتا ہے، اُن کو دیکھتا ہے، ان کے احوال وحرکات وسکنات میں ان کی کوئی پوشیدہ شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ جب یہ بات کھل گئی کہ وہ وجود میں تصرف کرنے والا ایسا حاکم ہے کہ اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں تو یہ ارشاد فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ یعنی وہی معبود برحق ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، کیوں کہ وہ ایسی عظیم سلطنت والا ہے کہ جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا اور ہر شے اسی کی طرف محتاج ہے، اس کے روبرو ذلیل وخوار ہے۔ ﴿ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبٰطِلُ ﴾ یعنی اصنام وانداد واوثان اور ہر وہ شے جو اللہ کے سوا پوجی گئی، یہ سب باطل وغلط ہیں، کیوں کہ وہ نہ کسی ضرر کے مالک ہیں نہ کسی نفع کے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥] ''اور وہ بلندتر، نہایت عظمت والا ہے۔'' جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴾ [الرعد: ٩] ''(وہ) بہت بڑا، نہایت بلند ہے۔'' پس ہر شے اس کے قہر وسلطان وعظمت کے نیچے ہے، اس کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ کوئی رب ہے، کیوں کہ وہ ایسا بڑا ہے کہ اس سے بڑھ کر بڑا کوئی نہیں ہے، وہ ایسا اوپر ہے کہ اس سے زیادہ اوپر

کوئی نہیں ہے۔ ایسا کبیر ہے کہ اس سے اکبر کوئی نہیں ہے۔ تعالیٰ و تقدس و تنزہ عزوجل عما یقول الظالمون المعتدون علوا کبیرا۔[1]

پہلے گزر چکا ہے کہ جس شخص پر بغاوت و زیادتی کی گئی ہے، اللہ اس کی ضرور مدد کرے گا، لہٰذا ﴿ذٰلِكَ﴾ کا اشارہ اسی مدد کی طرف ہے اور مبتدا ہے، اس کی خبر ﴿بِاَنَّ اللّٰهَ﴾ ہے اور حرفِ باسببیت کے واسطے ہے، یعنی یہ مدد کرنا اس بات کے سبب سے ہے کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں، یہ داخل کرنا نصرت کا سبب ہے، حاصل یہ ہے کہ حقیقی سبب تو اللہ پاک کی قدرت ہے جو ساری ممکنات پر ہے، مگر اتنی بات ہے کہ اس نے قدرت کی دلیل و اثر کو مقامِ قدرت میں قائم کیا ہے۔ یعنی یہ نصر اس بات کے سبب سے ہے کہ اللہ پاک قادر ہے اور یہ اس کے آثارِ قدرت سے ہے کہ وہ رات اور دن ہر ایک کو ایک دوسرے میں داخل کرتا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

امام بیضاوی رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ یہ نصر اس بات کے سبب سے ہے کہ اللہ پاک قادر ہے امور کے لوٹ پوٹ کرنے پر۔ بعض کو بعض پر لوٹ پوٹ کر دیتا ہے۔ جو اشیا باہم عناد رکھتی ہیں، ایک دوسرے کی ضد ہیں، اُن کے درمیان پھرانے پر اس کی عادت جاری ہے۔[3] کبھی کسی کو غالب کرتا ہے، کبھی کسی کو، اُن باتوں میں سے ایک رات اور دن میں سے ہر ایک کو دوسرے میں داخل کرنا ہے۔ چونکہ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ شبِ تاریک کا روزِ روشن میں داخل کرنا حقیقتاً ہو اور اسی طرح اس کے برعکس، باوجود اس کے کہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تاریکی اور نور ایک زمانے میں جمع ہوئے، اس لیے کہا ہے کہ ایلاج مذکور کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زمانۂ تاریک زمانۂ روشن میں داخل کیا جائے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ شب و روز میں سے کسی ایک کی گھڑیوں میں سے جو کم ہوا اس کا دوسرے میں داخل کرنا ہے، لہٰذا دو زمانوں کا فرق لازم آتا ہے اُن کی زیادتی اور کمی کے مطابق، ایک زمانے میں دو متضاد چیزوں کا جمع ہونا لازم نہیں آتا۔ یا یہ معنی ہیں کہ شب کی تاریکی کا دن کی روشنی کی جگہ میں سورج کو غائب کر دینے سے حاصل کرنا ہے اور اس کا برعکس آفتاب کو طلوع کر دینے سے حاصل کرنا ہے۔ سورت آلِ عمران میں اس ایلاج کے معنی گزر چکے ہیں۔[4]

عامہ نے ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ﴾ کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اوّل ان پر معطوف ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کی قراءت بکسر ہے بطورِ استیناف، یعنی الگ جملہ ہے ماقبل سے جدا ہے۔ ﴿سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر سننے کی شے کو سنتا ہے، ایک کو سننا دوسرے کے سننے سے اس کو باز نہیں رکھتا ہے۔ ہر دیکھنے کی چیز کو دیکھتا ہے۔ یا معنی یہ ہیں کہ اقوال کو سنتا ہے، افعال کو دیکھتا ہے، ذرہ برابر اس سے غائب نہیں ہوتا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنین کی دعا کو سنتا ہے، اُن کو دیکھتا ہے اس حیثیت سے کہ اُن میں ایمان رکھا ہے، پھر اُن کی دعا قبول کی۔[5] امام

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣٠١) [2] تفسير الرازي (٢٣/ ٥٣) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٨)

[4] رقم الآية (٢٧) [5] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢)

بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدلہ لینے والے کی بات کو، جس سے بدلہ لیا اس کی بات کو سنتا ہے، دونوں کے افعال کو دیکھتا ہے تو ان کو مہمل نہ چھوڑے گا۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مدد کرنا مظلوم کے لیے ہے، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اس شے پر جس کو چاہتا ہے اور اس کی قدرت کی نشانیوں سے یہ ہے کہ رات سے دن میں زیادہ کرتا ہے اور دن سے رات میں، یا بسبب اس کے کہ وہ دن اور رات کا خالق ہے اور ان کو گردش دینے والا ہے۔ سو جو خیر و شر، ظلم و انصاف اس کے بندوں کے ہاتھوں پر ان میں جاری ہوتا ہے، وہ اس پر پوشیدہ نہیں ہے اور بے شک وہ سنتا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ ایک سننا دوسرے سننے سے اس کو باز نہیں رکھتا، گو دن میں آوازیں مختلف ہوں اور طرح طرح کی زبانوں میں ہوں، جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کو دیکھتا ہے اور نہیں چھپتی اس سے کوئی شے کسی شے کے ساتھ راتوں میں، گو تاریکیاں متوالی ہوں۔[2]

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ پاک کمال قدرتِ باہرہ اور مکمل علم کا حامل ہے، اسی کی طرف ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ہے، یعنی اللہ پاک کا اوصافِ مذکورہ کے ساتھ متصف ہونا اس وجہ سے ہے کہ ﴿ هُوَ الْحَقُّ ﴾، یعنی اللہ پاک صاحبِ حق ہے، پس دین اس کا حق ہے، عبادت اس کی حق ہے، اس کا اپنے دوستوں کی اپنے دشمنوں پر مدد کرنا حق ہے، اس کا وعدہ حق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور سارے افعال و صفات میں حق ہے۔

﴿ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبٰطِلُ ﴾ یعنی جس شے کو وہ پکارتے ہیں معبود، یعنی اصنام وہ ایسا باطل ہے کہ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، نہ اس کے معبود ہونے کے واسطے کسی ثبوت کی ضرورت ہے۔ امام نافع، ابن کثیر اور ابن عامر رحمہم اللہ نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مشرکوں کو خطاب ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اسی قراءت کو پسند کیا ہے۔ باقی قاریوں کی قراءت بیائے تحتیہ ہے خبر ہونے کی بنا پر۔ امام ابو عبیدہ کی مختار یہی قراءت ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ کسی نے ﴿ يُدْعُوْنَ ﴾ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے، اس صورت میں ضمیرِ جمع کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کی طرف راجع ہوگی، اس واسطے کہ ﴿ مَا ﴾ الٰہ کے معنی میں ہے۔ آیت کے معنی جو مذکور ہوئے اسی طرح فتح البیان اور فتح القدیر میں دیے گئے ہیں۔[3]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هُوَ الْحَقُّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ثابت فی نفسہٖ ہے، تنہا واجب لذاتہ ہے، کیوں کہ اس کا وجوبِ وجود اور اس کی وحدت یہ دونوں اس کے مقتضی ہیں کہ وہ مبدا ہو ہر اس شے کے واسطے جو اس کے سوا پائی جاتی ہے، عالم ہو اپنی ذات کا اور اپنے ما سوا کا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ثابت الالٰہیہ ہے۔[4] یعنی اس کی الٰہیت و معبودیت ثابت ہے اور الٰہیت کے لائق صرف وہی ہوتا ہے جو قادر عالم ہے اور اس کے سوا جس کو پکارتے ہیں وہی

---

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٣٨) [2] تفسیر النسفي (٣/ ١١١)
[3] فتح القدیر (٣/ ٦٣٣) فتح البیان (٩/ ٧٦۔ ٧٧) [4] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٣٨)

باطل ہے، یعنی فی حد ذاتہ وہ معدوم ہے، یا اس کی الوہیت باطل ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''حق'' بہ معنی ثابت ہے اور ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ بہ معنی ''یعبدون'' اور ''باطل'' زائل ہے۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ باطل سے مراد شیطان ہے۔[2]

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنی قدرت کے سبب سے عالی ہے ہر شے پر، متقدس ہے اشباہ اور انداد سے، یعنی اس کا مشابہ، نظیر اور ضد کوئی نہیں ہے۔ صفاتِ کمال کا مالک ہے۔ ظالم و معطل اس کی جو صفات اپنی طرف سے تراشتے ہیں، اُن سے مبرا و منزہ ہے۔ کبیر ہے، یعنی ذو الکبریاء ہے، بڑی بزرگی والا ہے، ہر شے اس کے سوا صغیر وحقیر ہے۔ اس سے مراد اللہ پاک کی ذات کا کمال اور اس کی عظیم قدرت اور بادشاہت ہے اور الٰہیت کے ساتھ اس کا منفرد ہونا ہے۔[3] كذا في فتح البيان.

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے زیرِ تفسیرِ آیت باب یوں کہا ہے کہ یہ وصف کہ اللہ پاک رات اور دن کو پیدا کرتا ہے اور جو کچھ اُن میں جاری ہوتا ہے، اس کا احاطہ کرتا ہے اور اُن کے قول و فعل کو جانتا ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ حق ہے، اس کی الٰہیت ثابت ہے اور ہر وہ شے جو اس کے سوا معبود پکاری جاتی ہے، اس کا پکارا جانا باطل ہے اور کوئی شان و شوکت اور غلبے میں اس سے اعلیٰ اور بڑا نہیں ہے۔[4] پھر اللہ پاک نے اپنی قدرت کے کمال پر ایک اور دلیل ذکر کی، پس ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ
مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝۶۳ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶۴ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ
سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ
بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۵ وَهُوَ الَّذِيْ اَحْيَاكُمْ ؗ
ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝۶۶

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے (مردہ زمین پر) پانی نازل کیا، پھر اس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ بے شک اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے (63) اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور بلاشبہہ اللہ ہی بے نیاز، لائقِ حمد ہے (64) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤) [3] فتح البيان (٩/ ٧٧) [4] تفسير النسفي (٣/ ١١١)

اللہ نے تمھارے تابع فرمان کر دیا جو کچھ زمین میں ہے، اور کشتیاں جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر (نہ) گرے۔ بے شک اللہ لوگوں کے لیے البتہ زیادہ شفقت کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے 65 اور وہی ہے جس نے تمھیں زندہ کیا، پھر وہ تمھیں مارے گا، پھر وہی تمھیں زندہ کرے گا، بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے 66

قدرتِ الٰہی کی نشانیاں:

یعنی اس کا حق نہیں مانتا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظیم بادشاہت پر دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔ اللہ پاک ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اُٹھاتی ہیں، پھر وہ خشک زمین پر برستا ہے، جو دبی پڑی سوکھی ہوئی سیاہ ہوتی ہے۔ ﴿ فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾ [الحج: ٥، حٰمٓ السجدة: ٣٩] ''پھر جب ہم اس پر بارشیں برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے۔'' حرفِ فا ﴿ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ﴾ میں تعقیب کے واسطے ہیں، یعنی زمین پانی نازل ہونے کے بعد سبز ہو جاتی ہے۔ ہر شے کی تعقیب اسی شے کے مطابق ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] ''پھر ہم نے نطفے کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر ہم نے پھٹکی کو لوتھڑے میں ڈالا، پھر ہم نے لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی صورت میں بنا دیا، چناں چہ بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے عمدہ بنانے والا ہے۔'' حالاں کہ صحیحین میں ثابت ہو چکا ہے کہ ہر دو شے کے درمیان چالیس دن کی مدت ہے[1] اور باوجود اس کے حرفِ فا کے ساتھ اس کی تعقیب کی گئی ہے۔ اسی طرح اس جگہ کہا ہے: ﴿ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ﴾ یعنی سوکھنے کے بعد سرسبز ہو جاتی ہے۔ بعض زمین حجاز کا ذکر کیا ہے کہ وہ پانی برسنے کے بعد صبح کو سبز ہو جاتی ہے۔ واللہ أعلم.

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ زمین کے اطراف اور کناروں اور حصوں میں جو دانہ ہوتا ہے، گو کتنا ہی چھوٹا ہو، اللہ پاک اس کو خوب جانتا ہے، اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں سے ہر ایک کی طرف پانی میں سے اس کا حصہ پہنچاتا ہے، پھر اس پانی سے اس کو اُگاتا ہے، جیسا کہ لقمان نے اپنے فرزند سے کہا: ﴿ یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴾ [لقمان: ١٦] ''اے میرے (پیارے) بیٹے! بے شک اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں اور زمین کے اندر کہیں بھی ہو تو اللہ اسے نکال لائے گا، بلاشبہ اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [النمل: ٢٥] ''یہ کہ وہ اس اللہ کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزیں نکالتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [يونس: ٦١] ''اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔'' اسی لیے اُمیہ بن ابی الصلت نے یا زید بن عمرو بن نفیل نے اپنے قصیدے میں کہا ہے ؎

وقولا له من ينبت الحب في الثرى؟ فيصبح منه البقل يهتز رابيا
و يخرج منه حبه في رؤسه ففي ذاك آيات لمن كان واعيا

یعنی اس سے کہو کہ خاکِ نمناک میں دانوں کو کون اُگاتا ہے، پھر صبح کو اس پانی سے روئیدگی ہلتی اُبھرتی ہوئی ہو جاتی ہے اور نکالتا ہے اس کے دانوں کو اس کے سروں میں، پس اس سب میں نشانیاں ہیں اس شخص کے لیے جو یاد رکھتا ہے۔

﴿ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ساری چیزیں اس کی ملکیت ہیں اور وہ اپنے ماسوا سے بے پروا ہے اور ہر شے اسی کی محتاج ہے اور اس کے نزدیک عبد ہے، یعنی مطیع و فرماں بردار ہے۔ ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ زمین میں جتنے حیوان و جماد ہیں اور کھیتیاں اور پھل ہیں، سب کو تمھارا مسخر کر دیا ہے، تم جو چاہتے ہو کرتے ہو۔ جیسا کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثية: ١٣] ''اور اس نے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب تمھارے تابع کر دیا۔'' یعنی یہ سب اللہ پاک کے فضل و احسان سے ہے۔

﴿ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک کے مسخر کرنے اور چلانے کی وجہ سے دریائے شور انگیز اور موجوں کے تھپیڑوں میں کشتیاں اپنے لوگوں کو لیے ہوئے بامراد ہوا کے ساتھ نرمی اور آہستگی کے ساتھ چلتی ہیں۔ ساز و سامان اور اسبابِ تجارت جو چاہتے ہیں ان میں لادتے ہیں، ایک شہر سے دوسرے شہر کو ایک

کنارے سے دوسرے کنارے کو لے جاتے ہیں، جو کچھ اُن کے پاس ہوتا ہے اس کو اُن کے نزدیک لاتے ہیں، جس طرح کہ جو کچھ اُن کے پاس تھا اس کو اپنے پاس لے گئے، ان چیزوں میں سے جن کی اُن کو ضرورت تھی اور وہ اُن کو طلب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں۔

﴿ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ ﴾ یعنی اگر اللہ پاک چاہتا آسمان کو حکم دیتا تو وہ زمین پر گر پڑتا، پھر جو لوگ اس میں ہیں وہ مرکھپ جاتے، لیکن وہ اپنے لطف و رحمت و قدرت سے آسمان کو تھامے ہوئے ہے، اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے حکم سے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک لوگوں پر بڑا مہربان ہے باوجود اُن کے ظلم کے۔ جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [الرعد: ٦] ”اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود البتہ انھیں بخشنے والا ہے، اور یقیناً آپ کا رب البتہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴾ (آیتِ باب)۔ نیز فرمایا: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢٨] ”تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالاں کہ تم مردے تھے، پھر اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر تمھیں موت دے گا، پھر وہی تمھیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ [الجاثية: ٢٦] ”(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اللہ ہی تمھیں زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے، پھر وہی تمھیں روزِ قیامت جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ [المؤمن: ١١] ”وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار زندہ کیا۔“

کلام کے معنی یہ ہیں کہ تم کیوں اللہ کے ہمسر ٹھہراتے ہو اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہو، حالاں کہ پیدا کرنے، رزق دینے اور ہر قسم کا اختیار رکھنے کے ساتھ وہی مستقل ہے اور وہی ہے جس نے تم کو زندہ کیا، یعنی اس نے تم کو پیدا کیا اس کے بعد کہ تم کوئی شے نہ تھے جس کا ذکر مذکور ہو، پھر وہ تم کو وجود میں لایا، پھر تم کو مارے گا، پھر تم کو زندہ کرے گا، یعنی قیامت کے دن۔ ﴿ كَفُوْرٌ ﴾ کے معنی ہیں: ”جحود“ [1] یعنی بڑا منکر بڑا ناشکرا۔

پہلے اللہ پاک نے اپنی کمال قدرت پر یہ دلیل دی تھی کہ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں، اس کے بعد اور کئی قسم کی دلیلیں اپنی قدرتِ کاملہ پر ذکر فرمائیں، چنانچہ چھے دلیلیں ذکر کیں۔ پہلی دلیل پانی کا

نازل کرنا ہے آسمان سے، جس سے زمین کا سبز ہونا ہوتا ہے۔ چوں کہ پانی گو دکھائی دیتا ہے، لیکن یہ امر سر کی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا کہ اللہ پاک اس کو آسمان سے اُتارتا ہے، اس لیے مفسرین نے ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کے معنی "ألم تعلم" لکھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ وجہ سے اس جگہ رویت (دیکھنا) آنکھ سے نہیں ہے، بلکہ علمی طور پر ہے۔ رہا استفہام تو وہ تقدیر کے واسطے ہے۔ ﴿ فَتُصْبِحُ ﴾ میں حرفِ فا عطف کے لیے ہے، ﴿ اَنْزَلَ ﴾ پر اس کا عطف ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ استفہام کے بعد مضارع مع حرفِ فا منصوب ہوا کرتا ہے، لیکن ﴿ فَتُصْبِحُ ﴾ اس جگہ مرفوع ہے اس کی تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ استفہام تقریری بہ منزلہ خبر کے ہوتا ہے، جیسا کہ خلیل وسیبویہ نے کہا ہے۔ خلیل نے کہا معنی یہ ہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا تو ایسا ایسا ہوا، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ألم تسمع الربع القواء فينطق وهل يخبرنك اليوم بيداء سلمق

یعنی کیا نہیں سنا تو نے منزل خالی سے کہ وہ بولتی ہے۔ اور آیا خبر دے گا تجھ کو آج میدان بے نبات۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نے اس سے سوال کیا تو وہ بولی۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ خبر ہے، جیسے تو کلام میں کہتا ہے کہ اللہ اُتارتا ہے آسمان سے پانی تو صبح کو ہو جاتی ہے زمین ﴿ مُخْضَرَّةً ﴾۔ ﴿ مُخْضَرَّةً ﴾ کے معنی ہیں ذاتِ خضرہ، یعنی سبزی والی، جس طرح تو سبزی والی زمین کو مبقلہ کہتا ہے اور درندوں والی زمین کو مسبعہ کہتا ہے۔[1] غرض یہ ہے کہ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ یہاں استفہام تقریری مؤول بہ خبر ہے، معنی اس کے "قد رأيت" ہیں اور خبر کے واسطے کوئی جواب نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں سببیت نہیں بن سکتی، اس واسطے کہ رویت سے زمین کا سبز ہونا متسبب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا موجب تو پانی اُتارنا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ استفہام کے جواب سے شرط و جزا منعقد ہوتی ہیں، حالاں کہ وہ یہاں بن نہیں سکتی، کیوں کہ یوں نہیں کہہ سکتے کہ اگر تو پانی کے اُتارنے کو دیکھے تو زمین سبز ہو جائے۔ یہ تلخیص ہے شہاب کی۔[2] حاصل یہ ٹھہرا کہ مذکورہ بالا وجود سے ﴿ فَتُصْبِحُ ﴾ استفہام کا جواب نہیں ہے کہ حسبِ قاعدہ منصوب ہو، بلکہ ﴿ اَنْزَلَ ﴾ پر معطوف ہے اور رفع اس کا متعین ہے، کیوں کہ اگر اس کو منصوب ٹھہرائیں گے تو جو معنی آیت سے مقصود ہیں، وہ منعکس ہو کر سبزی کی نفی کی طرف پھر جائیں گے، حالاں کہ مقصود اس کا اثبات ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جب ﴿ فَتُصْبِحُ ﴾ ﴿ اَنْزَلَ ﴾ پر معطوف ہوا تو "فأصبحت" کیوں نہ کہا، مضارع کیوں اختیار کیا؟ پس اس میں یہ نکتہ ہے کہ پانی کا اثر ایک زمانے کے بعد ایک زمانے میں باقی رہنا معلوم ہو، کیوں کہ مضارع تجددِ فعل پر دلالت کرتا ہے، مثلاً: محاورے میں یوں سمجھو کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص نے مجھ پر انعام کیا ہے تو میں اس کا شکر ادا کرنے کے لیے صبح و شام جاتا ہوں اور اگر وہ یوں کہے کہ میں صبح و شام گیا تو یہ قول

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٩١۔ ٩٢) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٦/ ٣٠١)

اس موقع میں واقع نہ ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ ﴿ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ﴾ سے یہ مراد ہے کہ زمین پانی کے نزول کے بعد روئیدگی جلد اُگاتی ہے اور عادتاً اسی طرح مستمر رہتی ہے اور مستقبل کا صیغہ سبزی کی صورت حاضر کرنے کے واسطے ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بتانا ہے کہ پانی کا اثر بار بار ہوتا رہتا ہے اور استمرار پذیر ہوتا ہے، یہ معنی مستقبل کے صیغے سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین کا اس طرح سبز ہو جانا شبِ باراں کی صبح کو صرف مکہ اور تہامہ میں ہوتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے: ظاہر بات یہ ہے کہ سبز ہونے سے مراد فی نفسہٖ زمین کا سبز ہونا ہے نہ کہ اس میں روئیدگی کے اعتبار سے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾ [الحج: ٥] ''پھر جب ہم نے اس پر پانی نازل کیا تو وہ لہلہا اُٹھی، اور پھولی۔'' اسی طرح فتح البیان میں بھی ہے۔[1]

صاحبِ فتح القدیر نے تو اس کو ظاہر فرمایا ہے، لیکن میری فکرِ ناقص میں یہ غیر ظاہر ہے، اس لیے کہ سارے مفسروں نے زمین کا سبز ہونا روئیدگی کے اعتبار سے کہا ہے، اس قسم کا مجاز حال ومحل کا قرآن شریف میں جابجا موجود ہے اور بلاغت کا ایک حصہ ہے اور ظاہر حقیقت میں اور دیکھنے میں بھی یہی ہے کہ خود زمین سبز نہیں ہوتی، بلکہ روئیدگی اُگتی ہے، اس کی وجہ سے زمین سبز معلوم ہوتی ہے، زمین کا جو رنگ ہے، وہی رہتا ہے پانی برسنے سے فی نفسہٖ زمین سبز نہیں ہو جاتی۔ ﴿ اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾ کو جو اس کا شاہد ٹھہرایا ہے یہ بھی ٹھیک نہیں، کیوں کہ اہتزاز وربو کی نسبت جو زمین کی طرف کی ہے باعتبار روئیدگی کے ہے، کیوں کہ جب روئیدگی اُگتی ہے تو زمین اس کی وجہ سے متحرک ہوتی ہے، اُبھرتی ہے، یہاں بھی نبات کا دخل ہے۔ معلوم نہیں کیوں ایسی بات کو ظاہر فرمایا، حالاں کہ کسی طرح اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ أعلم وعلمه أتم.

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ پاک کا علم ہر شے باریک اور موٹے کی طرف پہنچتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''لطیف بأرزاق عبادہ''، کسی نے کہا ہے کہ روئیدگی کے نکالنے میں لطیف ہے۔ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا علم یا فضل ہر شے کی طرف پہنچنے والا ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے بندوں پر پانی سے روئیدگی نکالنے میں لطف فرما ہے۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا علم یا اس کا لطف ہر جلیل و دقیق کی طرف پہنچتا ہے۔[4]

﴿ خَبِيْرٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے بندوں کی تدبیر اور جو شے اُن کے لائق ہے اس کی خبر رکھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بارش کی تاخیر میں اُن کو جو قنوط اور نا اُمیدی ہوتی ہے، اس سے باخبر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اُن کی حاجت اور فاقے کو خوب جانتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: مصالح اور منافعِ خلق کو خوب جانتا ہے۔ یا لطیف کے معنی

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٣٤) فتح البيان (٩/ ٧٧) [2] تفسير النسفي (٣/ ١١١)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢) [4] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٨)

ہیں مختص بتدبیرِ باریک۔ ﴿ خَبِيْرٌ ﴾ کے معنی احاطہ کرنے والا ہر قلیل وکثیر کا ہیں۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بارش کے وقت جو کچھ اُن کے دلوں میں ہے، اس سے اچھی طرح خبردار ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاہری اور باطنی تدبیروں کو خوب جانتا ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے دوسری دلیل اپنی قدرت کی ذکر فرمائی: ﴿ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی خلق وملک وتصرف وعبید کی راہ سے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا ہے، سارے اس کی روزی کے محتاج ہیں، اُن میں سے بارش برسانا اور نباتات کا جانداروں کے نفع کے لیے پیدا کرنا ہے، باوجود اس کے کہ اللہ پاک نہ اس کا نیازمند ہے اور نہ اس سے کچھ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کہ ﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ وہ کسی شے کا محتاج نہیں ہے، ہر حال میں لائقِ حمد ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے بندوں سے بے نیاز ہے، اپنے دوستوں کا سراہنے والا ہے۔[4] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی ذات میں ہر شے سے غنی اور اپنی صفات اور افعال کے باعث حمد کا مستحق ہے۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی کمال قدرت کے سبب سے بے نیاز ہے۔ ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کے فنا ہو جانے کے بعد بھی وہ تعریف کیا گیا ہے اپنی نعمت کے سبب سے، "من في السموت والأرض" کے ثنا کرنے سے بھی پہلے۔[6]

پھر اللہ پاک نے اپنی قدرت کی تیسری دلیل بیان فرمائی: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ﴾ اللہ پاک اپنے بندوں کو ایک عظیم النفع نعمت یاد دلاتا ہے کہ زمین میں چوپائے، جانور، درخت، نہریں، لوہا اور آگ وغیرہ جو کچھ ہے اور اُن کو اس کی حاجت ہے، ان سب کو اُن کا مطیع اور فرماں بردار کر دیا ہے، جس طرح چاہتے ہیں اس کو برتتے ہیں۔ حیوانوں میں سے کسی کو کھاتے ہیں، کسی پر سوار ہوتے ہیں، کسی پر بوجھ لادتے ہیں، کسی کی طرف دیکھتے ہیں، جیسے: بعض حیوانات اور طرح طرح کے اور قسم قسم کے خوبصورت اور خوش شکل پرندے کہ اُن کو دیکھنے سے جی خوش ہوتا ہے۔ غرض کہ زمین بھر کی اشیا بندوں کے منافع کے لیے پیدا کیں، پھر اُن کو اُن کا فرماں بردار کیا، بالفرض اگر وہ اُن کے مطیع نہ ہوتے تو وہ اُن سے نفع کیسے لیتے۔ یہ تو وہ نعمتیں ہیں جو جنگل اور خشکی میں بندوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

اب چوتھی قدرت ونعمت اور بیان فرمائی: ﴿ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ﴾ یعنی دریا میں نفع لینے کے لیے اپنی تقدیر و اِذن سے کشتیاں جاری کیں اور اُن کے فائدے کے لیے ان کو پانی اور ہواؤں سے مسخر کیا۔ اگر اللہ ان کو مسخر نہ کرتا تو وہ دریا میں غوطہ مار جاتیں، یا دریا کی پشت پر ٹھہر جاتیں اور نہ چلتیں، یہ اسی کی قدرت اور نعمت ہے

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١١) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٨)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢) [5] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٨) [6] تفسير النسفي (٣/ ١١١-١١٢)

کہ بلاتکلف سامان و اسباب اور آدمی لادے ہوئے چلتی پھرتی ہے۔ جمہور کی قراءت ﴿ اَلْفُلْكَ ﴾ کے نصب سے ہے، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ مَا فِي الْاَرْضِ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی "سخر لكم ما في الأرض وسخرلكم الفلك" اور جملۂ ﴿ تَجْرِيْ ﴾ حال ہے "فلك" سے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسمِ ﴿ اَنَّ ﴾ پر معطوف ہے، بایں تقدیر کہ "ألم تر أن الفلك تجري في البحر" اس صورت میں جملہ ﴿ تَجْرِيْ ﴾ خبر ہے۔ عبدالرحمٰن اعرج نے ﴿ وَالْفُلْكَ ﴾ برفع پڑھا ہے بنا بر ابتدا اور ما بعد اس کی خبر ہے۔[1]

فلک کا اطلاق واحد وجمع پر ایک ہی صیغے سے ہوتا ہے، لیکن لحاظِ حرکت کے اعتبار سے فرق ہے، واحد میں تو کہیں گے کہ اس کی حرکت مثلِ قفل کے ہے اور جمع میں کہیں گے کہ اس کی حرکت مثل بُدن کے ہے۔ چوں کہ اس نعمت کے ساتھ احسان جتانا ظاہر تھا اور اس کو تسخیر کرنا دوسری مسخر چیزوں کے مقابلے میں عجیب وغریب تھا، اس لیے اس کو علاحدہ کر کے ذکر کیا، اگرچہ ﴿ مَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کے تحت بطورِ عموم شامل تھی۔ کشتیوں کا چلنا اگرچہ اس طرف منسوب ہے کہ پانی اور ہوا اُن کے چلنے کے لیے مناسب اور موافق ہو، مگر چوں کہ اُن کے لیے اس حلت کا ثبوت اللہ پاک کے حکم اور تکوین سے ہوا ہے، اس واسطے اُن کے چلنے کی نسبت اللہ کے امر کی طرف کی، کیوں کہ یہ بات اللہ کی عظمت وکمال قدرت کے لیے زیادہ تر مناسب ہے۔

پھر پانچویں قدرت اور نعمت کا ذکر فرمایا: ﴿ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ ﴾ یعنی آسمان کا زمین پر گر پڑنے سے روکے رکھنا ایک عظیم الشان نعمت وقدرت ہے، کیوں کہ جتنی نعمتیں اوپر مذکور ہوئیں، وہ اسی نعمت سے پوری ہوتی ہیں۔ آسمان ایک بوجھل جسم ہے اور جسم ایسا ہوتا ہے وہ ضرور ہی گر پڑتا ہے، اگر اس کو روکنے والا گرنے سے نہ روکے، وہ مانع صرف اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کو روک رکھا ہے، تاکہ گر نہ پڑے۔ اگر گر پڑے تو جن نعمتوں کا ہم پر احسان رکھا ہے، وہ باطل ہو جائیں۔ ﴿ اَنْ تَقَعَ ﴾ یا تو محلِ نصب میں ہے، اس واسطے کہ ﴿ السَّمَآءَ ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے، یعنی "ويمسك وقوعها بمعنى يمنعه"۔ کسی نے کہا ہے کہ محلِ نصب میں ہے بنا بر مفعول لہ۔ بصریوں کی تقدیر "كراهة أن تقع" ہے اور کوفیوں کی "لئلا تقع"۔ امساک آسمان کا یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس میں سکون پیدا فرمایا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے پہلی اور تیسری کے احتمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔[2]

فتح القدیر میں ہے: "كراهة أن تقع" اور امساک کے معنی یہ ہیں کہ اس کو ایسی صفت پر پیدا کیا ہے جو امساک کو مستلزم ہے اور جملہ معطوف ہے ﴿ تَجْرِيْ ﴾ پر۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محفوظ رکھتا ہے اس کو اس

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٩٢) [2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٢) [3] فتح القدير (٣/ ٦٣٤)

سے کہ گر پڑے۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: "من أن تقع أو كراهة أن تقع" یعنی اس کو گرنے سے روکتا ہے، اس طرح سے کہ اس کو ایسی صورت پر پیدا کیا ہے کہ وہ استمساک کی طرف متداعی ہے۔[2] بصریوں اور کوفیوں کا اس کی تقدیر پر اختلاف جو پہلے مذکور ہو چکا ہے، اس کی بنیاد ایک مسئلہ کلامیہ پر ہے، وہ یہ ہے کہ ارادات و کراہات آیا عدم سے متعلق ہوتے ہیں یا نہیں؟ پس جو شخص اس کا مانع ہے وہ تاویلِ ثانی کی طرف گیا ہے اور صحیح یہی قول ہے اور جو شخص اس کو جائز رکھتا ہے، وہ اول کی طرف گیا ہے۔ كذا قال شيخ زاده

قولہ: ﴿ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مگر اللہ کی مشیت کے ساتھ اور یہ قیامت کے دن ہوگا، اس میں اس بات کا رد ہے کہ آسمان کا روک رکھنا بذاتہ ہے، کیوں کہ جسمیت کے لحاظ سے آسمان دوسرے اجسام کے برابر ہے تو جس طرح آسمان کے سوا اور اجسام قابل میل ہابط ہیں (نیچے گرانے والے کی مرضی پر چلتے ہیں) اسی طرح وہ بھی اس کے قابل ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بِاِذْنِهٖ ﴾ "بأمره أو بمشيئته"[4] فتح البیان و فتح القدیر میں ہے: "بإرادته و مشيئته"[5] شیخ زادہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ﴿ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ استثنائے مفرغ ہے اعم احوال سے، حالاں کہ یہ استثنا کلام موجب میں واقع نہیں ہوتا ہے، مگر ﴿ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ ﴾ نفی کی قوت میں ہے، اسی لیے اس میں تفریغ جائز ہوئی، کیوں کہ تقدیر یہ ہے کہ اللہ نہ چھوڑے گا آسمان کو کہ گر پڑے کسی حال میں، مگر اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں حرفِ با ملابست کے واسطے ٹھہرے گا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک لوگوں پر بہت زیادہ مہربانی اور رحمت کرنے والا ہے، جب ہی تو اس نے اپنے بندوں کے واسطے ان چیزوں کو مسخر کیا ہے اور اُن کے لیے معاش کے اسباب مہیا فرمائے ہیں اور آسمان کو گرنے سے روک رکھا ہے کہ وہ ہلاک نہ ہو جائیں۔ یہ اس کی طرف سے اپنے بندوں پر محض اپنا فضل وکرم اور انعام ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے کہ رؤف رحیم ہے، جب ہی تو اس نے اُن کے واسطے استدلال کے اسباب مہیا کر دیے اور اُن پر اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیے اور اُن کو نقصان پہنچانے والی چیزیں اُن سے دور کر دیں۔[6] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کی تسخیر کی وجہ سے رؤف ہے اور آسمان کو زمین پر گرنے سے روکنے کی وجہ سے رحیم ہے۔ اللہ پاک کی نعمتوں کا شمار اس کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ مقرون (پیوستہ) ہے، تاکہ اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کریں اور اس کے اسما کے ساتھ اس کا ذکر کریں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اللہ کا اسم اعظم آٹھ آیتوں میں ہے، اُن کو پڑھنے والے کی دعا ضرور قبول کی جاتی ہے۔[7]

پھر اللہ پاک نے چھٹی نعمت اور قدرت کا ذکر فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ﴾ یعنی وہی ہے جس نے تم کو

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٩) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٩) [4] تفسير النسفي (٣/ ١١٢)
[5] فتح القدير (٣/ ٦٣٤) فتح البيان (٩/ ٧٨) [6] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٩) [7] تفسير النسفي (٣/ ١١٢)

زندہ کیا، اس کے بعد کہ تم جماد عناصر تھے اور اپنی ماؤں کے رحموں میں نطفے تھے۔ ﴿ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ﴾ پھر تمھیں مارے گا جب تمھاری اَجل آجائے گی، یا تمھاری اَجل کا وقت پورا ہو جائے گا۔ ﴿ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ پھر تم کو آخرت میں جزا دینے کے لیے یا حساب کتاب اور جزا سزا کے لیے زندہ کرے گا۔ غرض کہ زندہ کرنا، پھر مارنا، پھر زندہ کرنا ان سب سے اس بات پر آگاہ فرمایا ہے کہ یہ نعمتیں اس کے واسطے ہیں جس کو اللہ پاک نے زندہ کیا، لہٰذا پہلی دفعہ زندہ کرنے کے ساتھ دنیا میں اپنی اُن نعمتوں سے آگاہ کیا ہے کا ذکر پہلے ہو چکا اور مارنے اور دوبارہ زندہ کرنے کا ذکر کر کے اپنے ان انعامات کے متعلق بتایا ہے جو وہ آخرت میں ہم پر فرمائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ مذکورہ نعمتوں کی تفصیل بیان کر چکا تو ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴾ یعنی باوجود اُن نعمتوں کے ظہور کے انسان بڑا ہی ناشکرا ہے کہ اس کی توحید نہیں کرتا، اِدھر اُدھر سر مارتا پھرتا ہے۔ اس انکار اور ناشکری سے جو بعض افراد نکلے ہوئے ہیں، اس کو یہ منافی نہیں ہے، اس لیے کہ مراد ساری جنسِ انسانی کا وصف بیان کرنا ہے اس جنس کے افراد سے جن میں یہ وصف پایا جاتا ہے، اُن کی تعداد چوں کہ بہت زیادہ ہے اس لیے مبالغتاً جنس کو اس وصف کے ساتھ موصوف کر دیا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: کفور کے معنی یہ ہیں کہ مصیبتوں کو شمار کرتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔[1]

علامہ نسفی کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو انسان پر طرح طرح کی نعمتوں کا افاضہ فرمایا اور قسم قسم کی سزائیں اور تکلیفیں اس سے دور کی ہیں، ان سب کا سخت منکر ہے۔ کیا وہ اپنے پیدا ہونے کی نعمت کو نہیں پہچانتا جس سے وہ وجود میں آیا، نہ وہ اپنے فنا ہونے کو جانتا ہے جو اس کو موعود (قیامت) سے قریب کرنے والی ہے اور نہ دوبارہ زندہ کیے جانے کو سمجھتا ہے جو اس کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اس امر کا بیان کیا جس کے لوگ مکلّف کیے گئے، اس کے ساتھ ہی اُن لوگوں کو ڈانٹ پلائی جو مختلف دین والے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود ہیں اور آپ ﷺ سے جھگڑا کرتے ہیں، پس فرمایا:

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ
وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿67﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ
فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿68﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا
كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿69﴾

ہر امت کے لیے ہم نے طریقِ عبادت مقرر کیا ہے، وہ اس پر عمل پیرا ہیں، لہٰذا وہ اس امر میں آپ سے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤) [2] تفسير النسفي (٣/ ١١٢)

ہرگز جھگڑا نہ کریں، اور آپ اپنے رب کی طرف دعوت دیں، یقیناً آپ راہِ راست پر ہیں 67 اور اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیجیے: تم جو عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے 68 اللہ ہی یومِ قیامت تمھارے مابین ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے 69

ہر امت کے لیے ایک شریعت ہے:

یعنی اصل دین ہمیشہ سے ایک ہے اور احکام ہر دین میں الگ آتے ہیں ہر حکم کے واسطے کیوں پوچھتے ہیں۔ انتہٰی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ہر قوم کے واسطے عبادت کا ایک طریقہ اس نے ٹھہرا دیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر نبی کی اُمت کے لیے اس نے ایک منسک ٹھہرایا ہے، کہا کلامِ عرب میں منسک وہ جگہ ہے جس کی انسان کو عادت ہوتی ہے اور اس کی طرف آیا جایا کرتا ہے، خیر کے واسطے ہو یا شر کے واسطے اور اسی لیے مناسکِ حج کا نام بھی رکھا ہے کہ لوگ ان کی طرف آمد و رفت رکھتے ہیں اور اُن پر لوگ عکوف کرتے ہیں اور اُن پر لگے بیٹھے رہتے ہیں۔[1] پس اگر بات ویسی ہے، جیسی امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لیے ہم نے ایک منسک ٹھہرایا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ﴾ سے مراد یہ مشرک لوگ ہوں گے اور اگر مراد یہ ہوگی کہ ہر اُمت کے لیے ہم نے قدرے ایک منسک ٹھہرایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ [البقرة: ١٤٨] ''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے، لہٰذا تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو'' اور اسی لیے یہاں ﴿هُمْ نَاسِكُوهُ﴾ فرمایا ہے، یعنی وہ اس کو کرنے والے ہیں، تو ضمیر اس جگہ اُن لوگوں کی طرف راجع ہوگی جن کے واسطے مناسک اور طرائق ہیں، یعنی یہ لوگ جو یہ کام کرتے ہیں، سو اللہ پاک کی قدر و ارادے سے ہے ؎

ہر قوم راست راہے و دینے و قبلہ گاہے　　　من قبلہ راست کردم برطرف کج کلا ہے

''ہر قوم کی ایک خاص روش اور دینی قبلہ گاہ ہوتی ہے، میں نے یکسو ہو کر اپنے محبوب کی طرف قبلہ سیدھا کر لیا ہے۔''

پس وہ لوگ جو تم سے جھگڑا کرتے ہیں تم اس سے متاثر مت ہو اور جس حق پر تم قائم اور ثابت ہو، اس سے یہ جھگڑا کرنا تم کو نہ پھیرے، اور اسی لیے اللہ پاک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب فرمایا: ﴿وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ﴾ یعنی تم اپنے رب کی طرف بلائے جاؤ، کیوں کہ تم ایک ایسی راہ پر ہو جو واضح اور سیدھی ہے اور منزلِ مقصود کی طرف پہنچانے والی ہے، یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٦٧٨۔ ٦٧٩)

اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ﴾ [القصص: ٨٧] ’’اور وہ (کافر) آپ کو اللہ کی آیات (کی تبلیغ) سے نہ روک دیں، اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف اُتاری گئیں اور آپ (انھیں) اپنے رب کی طرف بلائیں۔‘‘ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [یونس: ٤١] ’’اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم اس سے بَری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بَری ہوں جو تم عمل کرتے ہو۔‘‘

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ شدید قسم کی ڈانٹ ہے اور سخت وعید ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ﴾ [الأحقاف: ٨] ’’جو گفتگو تم اس (قرآن) کے بارے میں کرتے ہو وہ اس کو خوب جانتا ہے۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان (بطور) گواہ کافی ہے۔‘‘ در اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾[1] [الشوریٰ: ١٥] ’’لہٰذا آپ اسی (دین) کی طرف (سب کو) بلائیں اور ثابت قدم رہیں، جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کہہ دیجیے: اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے، میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ (روزِ قیامت) ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

اس آیت کی نظیر پہلے گزر چکی ہے، لیکن وہ معطوف بحرفِ واؤ تھی، اور یہ آیت واو کے بغیر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ آیت بعد ان آیتوں کے واقع ہوئی تھی جو اس کے مناسب قربانیوں کے بارے میں وارد ہوئی تھیں، اس لیے اس کا عطف اپنے اشباہ و امثال پر بحرفِ واو کیا گیا۔ دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مابعد کے واسطے تمہید ہو جائے، ورنہ تکرار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور یہ آیت ان آیتوں کے بعد واقع ہوئی ہے، جو اس کے معنی سے بعید ہیں، اس لیے حرفِ واو چھوڑ دیا گیا۔ رہی اس کی ماقبل سے مناسبت، وہ یہ ہے کہ یہ آیت تکلیفی نعمتوں پر مشتمل ہے اور اس سے ماقبل کی آیت غیر تکلیفی نعمتوں پر مشتمل ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے پہلے تو مہاجرین کا آخرت میں ثواب ذکر کیا، پھر یہ بیان فرمایا کہ باوجود اس کے دنیا میں بھی ان کو اس شخص پر نصرت دے گا، جو اُن پر بغاوت کرے گا، پھر اس بات پر

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣١١۔ ٣١٢)

دلائلِ مذکورہ سے اپنی قدرت بیان کی اور اس سے اس شے کو ختم کیا جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے متعلق ہے: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الحج: ٥٦]

پھر اپنے رسول ﷺ کو دین کی طرف دعوت دینے میں کوشش کرنے کا حکم فرمایا اور اُن کے ساتھ معاملہ کرنے کی وجہ بتائی اور اُن پر حجت قائم کرنے کا طریقہ سکھایا، پس ارشاد فرمایا: ﴿ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ ﴾ یعنی ہم نے ہر اُمتِ گذشتہ کے واسطے ایک حزب، یعنی وردِ عبادت کا مقرر کیا کہ وہ اس کے عامل ہیں اور اس پر قائم ہیں۔ ﴿ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ ﴾ یعنی پس بقایائے امتوں سے کسی کو تم سے جھگڑنا لائق نہیں ہے۔ ﴿ فِي الْاَمْرِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان شرائع و احکام میں جن کا تم اپنی اُمت کو حکم کرتے ہو، کیوں کہ ان کے لیے شرائع و احکام ہیں کہ بعض بعض کے مخالف ہیں، اسی طرح یہ شریعت ہے، اگرچہ ان شریعتوں کے مخالف ہے، پس ان کو حق نہیں پہنچتا کہ اس شریعت میں تم سے جھگڑا کریں۔ یہ حاصل ہے شیخ زادہ کی تقریر کا۔ فتح البیان و فتح القدیر میں ہے کہ اُمت سے مراد قرن ہے اور منسک سے مراد شریعتِ خاصّہ، یعنی ہر قرن کے لیے پہلی قرون میں سے ہم نے ایک ایسی خاص شریعت وضع کی ہے کہ ان میں سے جس اُمت کے لیے جو شریعت معین کی گئی ہے، وہ اس سے دوسری شریعت کی طرف تجاوز نہیں کرتی، نہ استقلالاً نہ اشتراکاً۔[1]

﴿ هُمْ نَاسِكُوْهُ ﴾ صفت ہے منسک کی اور ضمیر راجع ہے کل اُمت کی طرف، یعنی وہی اُمت اس شریعت پر عمل کرنے والی ہے نہ اس کے علاوہ کوئی دوسری اُمت۔ سو تورات تو منسک ہے اس امت کا جو موسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے سے عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے تک ہے اور انجیل منسک ہے اس امت کا جو عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے سے نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے تک ہے اور قرآن شریف منسک ہے روزِ قیامت تک کے مسلمانوں کا۔ منسک مصدر ہے اسمِ مکان نہیں ہے، جس طرح کہ ﴿ هُمْ نَاسِكُوْهُ ﴾ اس پر دال ہے، یعنی منسک اگر اسمِ مکان یا زمان ہوتا تو اللہ پاک "هم ناسكون فيه" فرماتا، اس واسطے کہ فعل غالباً متعدی نہیں ہوتا ضمیرِ ظرف کی طرف، مگر کلمۂ ﴿ فِي ﴾ کے ساتھ۔ ہاں اگر ظرف میں وسعت کی جائے اور قائم مقام مفعول بہ کے ہو جائے تو اس صورت میں فعل ضمیرِ ظرف کی طرف بنفسہٖ متعدی ہو جاتا ہے جس طرح اس قول میں ہے: "ومشرب أشربه يعني أشرب فيه"۔ کسی نے کہا ہے کہ منسک اطاعت ادا کرنے کی جگہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذبائح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قربانیوں کی جگہ ہے، جس میں ذبح کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عبادت کی جگہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عید ہے۔ یہ چھے قول ہوئے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے تین قول لکھے ہیں: ایک تو متعبّد یعنی مألف شے مالوف، جس سے اُلفت رکھتے ہیں اور اس کے خوگر ہو رہے ہیں، کوئی مکان معین ہو یا زمانہ معین اطاعت ادا کرنے کے لیے۔ دوسرا قول شریعت ہے۔ تیسرا عید ہے۔[2]

[1] فتح القدير (٣/ ٦٣٦) فتح البيان (٩/ ٧٩) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٩)

شیخ زادہ نے بلفظِ "قیل" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دو قول نقل کیے ہیں: ایک تو منسک شریعت ہے۔ دوسرا عید جس میں ذبح کرتے ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اُن سے روایت کیا ہے: ﴿ نَاسِكُوْهُ ﴾ کی تفسیر "ذابحوه"۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے: منسک بفتح و کسرِ سین شریعت ہے۔ ﴿ هُمْ نَاسِكُوْهُ ﴾ "عاملون به"[2] شیخ زادہ نے بلفظِ "قیل" ذکر کیا ہے کہ یہ قول کہ منسک شریعت ہے، زیادہ صحیح ہے، اس واسطے کہ منسک ماخوذ ہے نسک سے اور نسک کہتے ہیں عبادت کو، اور جب اسم ہر عبادت پر واقع ہو تو اس کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بعض عبادت کے ساتھ خاص کریں، اسی طرح اس کو عبادت کی جگہ اور وقت پر محمول کرنا بلا وجہ ہے، چنانچہ اس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے، اسی کے لگ بھگ رازی و شہاب رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور یہ اس شخص کے قول کی تردید ہے، جو یوں کہتا ہے کہ ذبح اللہ کی شریعت نہیں ہے، کیوں کہ ذبح تو ہر اُمت کی شریعت ہے۔[4] عمادی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

﴿ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ﴾ میں حرفِ فا ما قبل پر ترتیب نہی کے واسطے ہے اور ضمیر ان اُمتوں کی طرف راجع ہے، جن کے آثار باقی ہیں، یعنی ہم نے ہر اُمت کے واسطے ایک شریعت معین کر دی ہے اور تمام اُمتوں میں سے یہ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ امر اس بات کا موجب ہے کہ جو لوگ اُن میں سے باقی رہے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا نہ کریں، اُن کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ دین کے معاملے میں اُن کے مطیع ہو جائیں، یہ نہی غائب یا تو اپنی حقیقت پر ہے، یعنی اللہ پاک تمام اُمتوں کے لوگوں کو منع کرتا ہے کہ دین کے معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا نہ کریں، کیوں کہ وہ لوگ دو حالتوں سے خالی نہیں ہیں یا جاہل نادان ہیں تو جاہل کو حق نہیں پہنچتا کہ عالم و دانا سے جھگڑا کرے۔ یا اہلِ عناد ہیں، جان بوجھ کر دشمنی کی بنا پر جھگڑا کرتے ہیں تو بھی عقل کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آدمی جان بوجھ کر جھگڑا کرے، یا اس واسطے کہ تمھارا دین اس سے زیادہ ظاہر ہے کہ وہ جھگڑا کرنے کے قابل ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی سے، یعنی اللہ پاک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرماتا ہے کہ تم اُن کی طرف التفات مت کرو اور اُن کو مناظرے کی قدرت مت دو، جو اُن کے ساتھ جھگڑے کا باعث ہو، کیوں کہ مناظرہ تو طالبِ حق کو نفع دیتا ہے اور یہ لوگ صرف جھگڑا کرنے والے ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے ساتھ جھگڑنے سے منع کرنا ہے، یعنی تم خود اُن سے تنازع نہ کرو، جس طرح محاورے میں بولتے ہیں: "لا يخاصمك فلان"، یعنی فلاں تجھ سے مخاصمہ نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اس سے مخاصمہ مت کر اور جس طرح کہتے ہیں: "لا يضاربنك فلان"، یعنی فلاں تجھ سے مضاربہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤)
[2] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٣)
[3] تفسير الرازي (٢٣/ ٥٧) حاشية الشهاب (٦/ ٣١١)
[4] تفسير النسفي (٣/ ١١٢)

نہ کرے۔[1] غرض یہ ہے کہ تو اس سے مضاربہ مت کر، وجہ اس کی یہ ہے کہ بابِ مفاعلہ ضمناً مقابلے کا مقتضی ہوتا ہے، کیوں کہ دو کے درمیان میں منازعت ہوتی ہے تو ایک شریک کو منازعت سے منع کرنے سے دوسرے کو منع کرنا لازم آتا ہے۔ پس ایک نہی دوسرے سے کنایہ ہوسکتی ہے۔ دیکھو "لا یضربنك فلان" کہو اور اس سے مراد "لا تضربه" سو تو جائز نہیں ہے، لیکن بعض نے جو افعالِ مغالبہ میں اس کو محصور کیا ہے تو یہ حصر ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ "لا یغرنکم باللہ الغرور" میں ہوسکتا ہے کہ "لا تغروا" سے کنایہ ہو، حالاں کہ غرور افعالِ مغالبہ سے نہیں ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے آیت کے معنی میں بیان کیا ہے کہ ﴿ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ ﴾ کے معنی "فلا یجادلنك" ہیں۔[2] کہا ہے کہ اس معنی پر ﴿ وَإِنْ جَادَلُوكَ ﴾ دال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت کفارِ خزاعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا تھا تمھیں کیا ہے کہ تم اس کو کھاتے ہو جو تم نے قتل کیا اور اس کو نہیں کھاتے جسے اللہ نے قتل کیا؟! اسی قول کی بنا پر یہ قول ہے کہ ﴿ فِي الْأَمْرِ ﴾ سے مراد "في أمر النسائك والذبائح" ہے۔ چنانچہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فِي الْأَمْرِ ﴾ کی تفسیر میں "في أمر الذبائح" روایت کیا ہے[3] اور امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔ امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل تخریج کی ہے۔ امام ابن منذر نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ ﴿ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ﴾ قول ہے اہلِ شرک کا: "أما ما ذبح الله بيمينه فلا تأكلوه و أما ما ذبحتم بأيديكم فهو حلال"[4]

علامہ نسفی اور محلی رحمہما اللہ نے بھی ﴿ فِي الْأَمْرِ ﴾ کی تفسیر "في أمر الذبح" کی ہے۔[5] (لیکن محلی نے صرف یہی قول لیا ہے اور علامہ نسفی نے اس کے بعد "أو الدين" بھی کہا ہے) اور یہی شانِ نزول لکھا ہے اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کو بلفظ "قیل" ادا کیا ہے۔[6] ابومجلز نے "فلا ينزغنك" ﴿ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ ﴾ پڑھا ہے۔ "أي فلا يستخفنك ولا يغلبنك على دينك" باقی قاریوں کی قراءت منازعت سے ہے۔[7] نزع بہ معنی جذب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر ایسے جمے رہو کہ اُن کو اس بات کا طمع نہ ہو کہ تم کو کھینچ لیں، تاکہ تم کو اس سے پھسلا دیں، رہی یہ بات کہ کفار کو اس بات سے نہی کرنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے دین سے نہ کھینچیں، یہ کیوں کر اس بات کا کنایہ ہوسکتا ہے کہ اُن کو دین پر ثابت رہنے کا حکم ہے، باوجود اس کے کہ نزع افعالِ مغالبہ سے نہیں ہے، لہٰذا اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ نزع اس نزع سے نہیں ہے جو ایک سے صادر ہوتا ہے، بلکہ اس نزع سے ہے جس کی نسبت من

---

1. فتح القدير (٣/ ٦٣٦) 2. فتح القدير (٣/ ٦٣٦) 3. تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤)
4. الدر المنثور (٦/ ٧٣) 5. تفسير النسفي (٣/ ١١٢) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٣)
6. تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٩) 7. تفسير القرطبي (١٢/ ٩٤)

جملہ متنازعین غالب کی طرف ہوتی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "نازعته فنزعته انزعه" یعنی میں نے اس سے کھینچا کھانچی کی تو میں اس پر غالب ہوگیا، معنی یہ ہیں کہ منازعت میں وہ لوگ تم پر غالب نہ ہو جائیں۔

امام ابو السعود فرماتے ہیں کہ ﴿ فَلَا يُنَٰزِعُنَّكَ ﴾ سے یہ مراد لینا کہ نبی اکرم ﷺ کو اُن کی منازعت سے نہی ہے۔ لہٰذا مقام اس قول کی مساعدت نہیں کرتا اور اسی طرح امرِ "نسائك" کے ساتھ اس کو خاص کرنا اور قولِ خزاعیین وغیرہم سے اس کو مراد ٹھہرانا اس کی طرف ہرگز کوئی راہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کو مقتضی ہے کہ مردار کا کھانا من جملہ ان مناسک وشرائع کے ہے، جن کو اللہ نے بعض اُمتوں کے لیے ٹھہرایا ہے، حالاں کہ اس بات کے غلط ہونے میں کسی عقل مند کو شک نہیں۔[1] شاید اسی لیے فتح القدیر اور فتح البیان میں فرمایا ہے کہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ خصوصِ سبب کا کچھ اعتبار ہے۔[2]

خاکسار، عفا اللہ عنہ، عرض کرتا ہے کہ مفتی امام ابو السعود رحمہ اللہ نے تخصیص اور شانِ نزول کو بڑی زور دار عبارت سے باطل ٹھہرایا ہے، یہ قول کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے، اس واسطے کہ ﴿ فِى ٱلْأَمْرِ ﴾ کی تفسیر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "في أمر الذبح" گزر چکی ہے اور شانِ نزول امام مجاہد سے مروی ہے۔[3] یہی وجہ ہے کہ امام محلی اور نسفی رحمہما اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ منسک میں کئی قول تھے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اُن سے قولِ ذبح کو پسند فرمایا۔[4] غرض کہ یہ تخصیص اوپر سے چلی آتی ہے، ہاں یہ بات مسلم ہے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے خصوصیتِ سبب کا نہیں، لیکن وہ اس عموم میں بدخولِ اولیٰ داخل ہے، جیسے گزر چکا ہے کہ اولیٰ قول منسک میں یہ ہے کہ مراد دین اور شریعت ہے، پس اس میں ذبائح باعتبار شانِ نزول کے بدخولِ اولیٰ داخل ہیں، اگر کوئی یوں کہے کہ مراد ذبائح ہیں، اس کے سوا اور کوئی مراد نہیں ہے تو یہ قول البتہ ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ عمومِ لفظ کے مخالف ہے اور مفتی صاحب نے جو یہ فرمایا: یہ قول اس کو مقتضی ہے کہ مردار کا کھانا من جملہ ان شریعتوں کے ہو، جن کو اللہ نے بعض اُمتوں کے واسطے قرار دیا ہے، یہ قول بھی غور کے قابل ہے، یہ مقتضا کس طرح نکل سکتا ہے؟!

﴿ لِّكُلِّ أُمَّةٍ ﴾ دو حال سے خالی نہیں ہے: یا تو اُمت سے مراد اہلِ دین ہیں، یعنی وہ لوگ جن کے لیے کوئی ملت وشرع کسی نبی کی ہو، گو منسوخ ہوگئی ہو، فقط مشرکین مراد نہیں ہیں اور شانِ نزول خزاعہ وغیرہ کا قول ٹھہرایا جائے کہ اللہ کا مارا مردار اور اپنا مارا ہوا حلال، پس اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے ہر نبی کی اُمت کے واسطے ذبح مقرر کیا ہے کہ براہِ تقرب اللہ کے واسطے ذبح کیا کریں، اسی طرح یہ اُمت ہے، اس کے لیے بھی ذبح مقرر کیا ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اے مشرکین! تم نہ کوئی کتاب رکھتے ہو نہ دین، تم کیوں اس

---

[1] تفسیر أبي السعود (٦/ ١١٨۔ ١١٩)
[2] فتح القدير (٣/ ٦٣٦) فتح البيان (٩/ ٧٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤) الدر المنثور (٦/ ٧٣)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٣) تفسير النسفي (٣/ ١١٢)

بارے میں جھگڑا کرتے ہو، تم کو حق نہیں پہنچتا کہ تم ہمارے رسول سے جھگڑا کرو۔ اس معنی کی بنیاد پر ﴿ جَعَلْنَا ﴾ کا "جعل" تشریعی ٹھہرے گا۔ یا مراد اُمت سے غیر اہلِ دین ہیں، جیسے مشرک وغیرہم، جنھوں نے اپنی طرف سے دین کے طریقے ٹھہرائے ہیں اور نفس الامر میں کسی نبی کی اُمت نہیں ہیں اور شانِ نزول وہی خزاعہ وغیرہم کا قول قرار دیا جائے، پس معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے ہر قول کے واسطے ذبح وغیرہ کا ایک طریقہ مقدر کیا ہے کہ وہ اس کو ہماری تقدیر، ارادہ اور مشیت سے کرتے ہیں۔

اے مشرکین! ہم نے جو اپنے رسول کی اُمت کے لیے ذبح وغیرہ کا طریقہ مشروع کیا ہے اور اس کو شرع ٹھہرایا ہے اور پسند فرمایا ہے، تم اس کے بارے میں ہمارے رسول سے کیوں جھگڑا کرتے ہو، تم کو ہرگز جھگڑا کرنے کا حق نہیں پہنچتا، کیوں کہ جو تم کرتے ہو وہ ہماری قدر و مشیت سے ہے اور ہمارے رسول کی اُمت جو کرتی ہے وہ ہماری پسند کی ہوئی شرع ہے، اس بنا پر "جعل" قدری قرار پائے گا۔ اب کہیے کہ دونوں معنوں کی بنا پر مردار کا کھانا من جملہ شرائع کیوں کر ہوا؟! شاید مفتی صاحب نے "جعل" تشریعی و تقدیری میں فرق نہ کر کے یہ معجون مرکب بنائی جس کا مزاج یہ قرار پایا کہ تخصیص و شانِ نزول سے یہ لازم آیا کہ مردار کا کھانا من جملہ شرائع ٹھہرا۔ واللہ أعلم، عفا اللہ عنا وعنہ۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا، وہ عرض کیا، اگر صحیح ہے تو اللہ پاک کی طرف سے ہے اور خطا ہے تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ پاک درگزر فرمائے اور خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین

﴿ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ﴾ یعنی تم اُن جھگڑنے والوں کو، یا علی العموم سارے لوگوں کو دین کی طرف اور اللہ پاک کی توحید کی طرف اور اس پر ایمان لانے کی طرف بلائے جاؤ۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: اپنے رب کی عبادت کی طرف۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے رب کی توحید و عبادت کی طرف۔[2] مفعول کا ذکر تعمیم کے واسطے نہ کیا۔ معنی یہ ہیں کہ تم سارے لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہو اور وہ مامور ہیں کہ تمھاری پیروی کریں اور تمھارے دین اور شریعت کے ساتھ متدین ہوں تو تم اُن کو اپنے رب کے دین کی طرف بلائے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ایک اُمت کو خاص کر کے دعوت دو، دوسری کو نہ دو، اس لیے کہ سارے لوگ تمھاری اُمت ہیں۔ ﴿ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ تم تو ایک ایسی سیدھی راہ پر ہو کہ اس میں کسی طرح کی کجی نہیں ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هُدًى ﴾ سے مراد دین ہے۔[3]

﴿ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ ﴾ یعنی اگر وہ تم سے جدال کریں اس کے بعد کہ حق ظاہر ہو گیا اور حجت لازم ہو گئی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ شک و شبہہ اور عیب جوئی اور سرکشی کے طور سے تم سے جدال کریں، اس کے بعد کہ تم نے اس بات میں سعی و کوشش کی کہ تمھارے اور اُن کے درمیان میں جھگڑا اور تنازع نہ ہو۔[4] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: امرِ دین میں تو تم اُن سے یہ بات کہہ دو جو وعید پر مشتمل ہے کہ ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی تم جو باطل جھگڑا

[1] تفسیر النسفي (٣/ ١١٢) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ١٣٩) [3] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٣) [4] تفسير النسفي (٣/ ١١٢)

وغیرہ کرتے ہو، اللہ پاک اس کو خوب جانتا ہے، تم کو اس پر بدلہ دے گا۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم اُن سے جدال مت کرو اور یہ بات کہہ کر اُن کو دور دفع کر دو۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک تمھارے اعمال کو خوب جانتا ہے اور جس جزا کے تم مستحق ہو، اس سے خوب واقف ہے، پس وہ تم کو اس کی جزا دے گا۔ یہ وعید اور ڈرانا ہے، لیکن نرمی کے ساتھ۔[2]

﴿ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنوں اور کافروں کو خطاب ہے، یعنی جس امرِ دین میں تم اختلاف کرتے تھے اللہ پاک قیامت کے دن تمھارے درمیان اس کا فیصلہ کر دے گا ثواب اور عقاب کے ساتھ، جس طرح کہ دنیا میں حجت اور آیات کے ساتھ فیصلہ کیا۔ قیامت کے دن حق اور باطل کھل جائے گا۔ اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی ہے اس ایذا اور سختی سے جس کو آپ کفار سے برداشت فرمایا کرتے تھے۔ اور اس اُمتِ مرحومہ کو اس بات کی تعلیم ہے کہ جو شخص اُن سے باطل طور پر جھگڑا کرنے کا ارادہ کرے تو انھیں چاہیے کہ اس سے اس کو جواب دیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بھی اس قول کو ذکر کیا ہے۔

لیکن جمل نے اس پر کہا ہے کہ یہ قول اسی وقت صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ ... الخ ﴾ سے مراد اُن کے قتال سے باز رہنا ہو، حالاں کہ یہ بات کچھ متعین نہیں ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ معنی یہ ہوں کہ تم اُن کے جدال کو چھوڑ دو اور یہ بات کہہ کر اپنے کام کو اللہ پاک کے سپرد کر دو کہ ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ تو یہ اُن کے واسطے وعید ہو جائے گی اُن کے اعمال پر۔ اس آیت کو آیتِ سیف منسوخ نہیں کرتی ہے، بلکہ بسبب عدمِ منافات کے قتال کی مشروعیت کے بعد بھی وہ باقی ہے۔ واللہ أعلم۔ پھر جب اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو اس بات کا حکم کیا کہ بعد لزوم کے اور حجت کی وضاحت کرنے کے بعد جدال کرنے والوں کو روزِ قیامت کے حکم سے ڈرائیں تو اس کے بعد یہ ذکر کیا کہ وہ یہ بات جان لیں کہ ہر ایک جس شے کا مستحق ہے اللہ پاک اس کا علم رکھتا ہے اور اُن کے درمیان عدل سے فیصلہ کرے گا نہ کہ جور و ظلم سے۔ پس ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝۷۰ ﴾

کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، بلاشبہہ یہ (سب کچھ) کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے، بے شک یہ اللہ پر بالکل آسان ہے (70)

اللہ تعالیٰ تخلیقِ کائنات سے پہلے بھی اس کا پورا پورا علم رکھتا تھا:

یعنی بندوں کے عمل بھی ایک کتاب میں لکھے ہیں۔ انتھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے

[1] تفسیر الجلالین (۱/ ٤٤٣) [2] تفسیر النسفي (۳/ ۱۱۲)

کمال علم کی خبر دیتا ہے، جو اس کو اپنی خلق کا ہے، اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں، وہ اس کا محیط ہے۔ لہٰذا اس سے ایک ذرہ بھی غائب نہیں ہوتا زمین میں، نہ اس سے چھوٹا نہ بڑا اور اللہ تعالیٰ ساری کائنات کو اس کے وجود میں آنے کے قبل اُسے جان چکا ہے اور اس کو اپنی کتاب لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، بے شک اللہ نے تمام خلائق کی مقادیر کو آسمانوں اور زمین کی پیدایش سے پچاس ہزار برس پہلے مقدر کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔[1]

سنن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی، وہ قلم ہے، اس سے فرمایا: لکھ، وہ بولا: « وَمَا أَكْتُبُ؟ » یعنی میں کیا لکھوں؟ فرمایا: وہ شے لکھ جو ہونے والی ہے، پس قلم چلا اس شے کے ساتھ جو قیامت تک ہونے والی ہے۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر رحمہ اللہ روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ نے لوحِ محفوظ کو پیدا کیا مثل سو برس کی راہ سے اور اس سے پہلے کہ مخلوق کو پیدا کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ عرشِ اعظم پر ہے، اس نے قلم سے فرمایا کہ لکھ تو قلم بولا: کیا لکھوں؟ فرمایا: میرا علم میری خلق میں اس دن تک کہ قیامت قائم ہو۔ پس قلم چلا اور اس نے ہر وہ چیز جو قیامت تک اللہ کے علم کے مطابق ہونے والی ہے، لکھ دی۔ پس یہ وہ قول ہے اللہ عزوجل کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کہ ﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾[3] (وكذا رواه ابن مردويه) اور یہ اللہ تعالیٰ کے تمام علم سے ہے کہ اس نے اشیا کو اُن کے ہونے سے پہلے جان لیا ہے اور اُن کو مقدر کیا ہے اور لکھ بھی رکھا ہے۔ لہٰذا بندے جو کچھ کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو جان چکا ہے قبل اس کے کہ اس کو کرتے ہیں، پس جانتا ہے پیدا کرنے سے پہلے کہ یہ اپنے اختیار سے اطاعت کرے گا اور یہ اپنے اختیار سے نافرمانی کرے گا اور اس کو اپنے پس لکھ رکھا ہے اور علم کی راہ سے ہر شے کا احاطہ کر لیا ہے اور وہ اس پر آسان ہے اور اس کے نزدیک سہل ہے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ ﴾ جملہ مستأنفہ ہے اپنے ماقبل کے مضمون کی تقریر کرتا ہے۔ استفہام تقریر کے واسطے ہے، یعنی اے پیغمبر! تم جان چکے ہو اور تم نے یقین کر لیا ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ ﴿ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ کو جانتا ہے، اُن میں سے وہ اختلاف ہے جس پر تم ہو۔ ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ ﴾ یعنی یہ اللہ کی معلومات

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٣)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠١٧)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤_ ٢٥٠٥) الدر المنثور (٦/ ٧٤) (4) تفسير ابن كثير (٣/ ٣١٢)

جو آسمان و زمین میں ہیں ﴿ فِیْ كِتٰبٍ ﴾ یعنی اللہ کے پاس ام الکتاب میں لکھی ہوئی ہیں۔ ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ ﴾ یعنی یہ حکم اللہ پاک کی طرف سے ہے اپنے بندوں کے درمیان اس بات میں جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔ ﴿ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ﴾ یعنی اللہ پاک پر آسان ہے۔ یا احاطۂ علمِ الٰہی ﴿ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ کو جملتاً وتفصیلاً اس پر سہل ہے، گو مخلوق پر مشکل ہی کیوں نہ ہو۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: جو تم کر رہے ہو، وہ کیوں کر اللہ پر مخفی رہ سکتا ہے، حالاں کہ جو لوگ عالم باللہ ہیں، ان کو یہ بات معلوم ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں واقع ہوتا ہے، اللہ اس کو جانتا ہے۔ ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ ﴾ یعنی جو آسمان و زمین میں موجود ہے۔ ﴿ فِیْ كِتٰبٍ ﴾ وہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ ﴾ یعنی اللہ کا ان سب کو جاننا "عَلَيْهِ یَسِیْرٌ" اس پر سہل ہے۔[2] قاضی بیضاوی کا بیان یہ ہے کہ اللہ پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔

﴿ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ ﴾ یعنی یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔ اس کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے لوح میں اس کو لکھ رکھا ہے۔ لہٰذا کفار کا کام تم کو غم میں نہ ڈالے، باوجود اس کے کہ ہم اس کو جانتے ہیں اور ہم نے اس کو محفوظ رکھا ہے ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ ﴾ یعنی اس کا احاطہ کرنا اور لوح میں اس کا اثبات کرنا یا تمھارے درمیان فیصلہ کرنا اللہ پر آسان ہے، اس لیے کہ اس کا علم مقتضا ہے اس کی ذات کا جو کہ کل معلومات سے برابر متعلق ہے۔[3] شیخ زادہ فرماتے ہیں کہ کفار جھگڑا کرنے والے جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کے نزدیک وہ محفوظ ہے، نہ وہ اس سے غائب ہوتا ہے اور نہ اس کو بھولتا ہے، کیوں کہ اللہ پاک جس شے کو زمین میں حادث کرتا ہے، اس سب کو لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ یہ بات یہ وہم پیدا کرتی ہے کہ اللہ پاک کا علم کتاب سے مستفاد ہے اور نیز اس کتاب کا فائدہ کیا ہے؟ تو پہلی بات کا یہ جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کتاب میں ان اشیا کا اُن کے وقوع سے پہلے اُن کے موجود ہونے کے موجودات کے مطابق لکھ رکھنا اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ اللہ پاک اپنے علم میں اس کتاب سے بے نیاز ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ فرشتے اس میں نظر کرتے ہیں، پھر جس وقت اللہ تعالیٰ اس کے مطابق واقعات کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو فرشتوں کے لیے یہ ایک مزید دلیل ہو جاتی ہے اس بات پر کہ اللہ پاک کل معلومات کا عالم ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے سورۃ البروج کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ لوح کا نام محفوظ اس لیے رکھا ہے کہ وہ محفوظ رکھی گئی ہے شیاطین سے اور جو شے اس میں ہے وہ تبدیل ہونے سے محفوظ ہے۔ اس کا طول اتنا ہے جتنا کہ آسمان و زمین میں فاصلہ ہے اور عرض اس کا اتنا ہے جتنا کہ مشرق و مغرب کے درمیان فاصلہ ہے اور وہ سفید موتی کی ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ہوا میں معلق ہے۔[4] پھر جس شرک اور نافرمانی پر کفار جمے ہوئے ہیں باوجود اس کے کہ اس کی

[1] فتح البیان (٩/ ٨١۔ ٨٢) [2] تفسیر النسفي (٣/ ١١٣) [3] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٤٠) [4] تفسیر الجلالین (١/ ٨٠٢)

وحدانیت کی دلیلیں ظاہر و باہر ہیں اور وہ بڑی شان اور بڑائی والا ہے اور اس کی نعمتیں بندوں کو پورے طور پر پہنچ رہی ہیں، اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا۔ پس ارشاد فرمایا:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿71﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿72﴾

اور وہ (مشرک) اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہیں جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور جس کا انھیں کچھ علم نہیں اور (ان) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ﴿71﴾ اور جب ان پر ہماری کھلی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، تو آپ ان کافروں کے چہروں پر ناگواری پہچانتے ہیں، لگتا ہے کہ وہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں گے جو ان پر ہماری آیتیں پڑھتے ہیں، کہہ دیجیے: کیا پھر میں تمھیں اس سے زیادہ بدتر کی خبر دوں؟ (وہ) آگ ہے، جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے، اور بری ہے وہ لوٹنے کی جگہ ﴿72﴾

مشرکوں کا غیر اللہ کی عبادت کرنے کا بیان:

مشرک لوگ جس بات کے جاہل اور منکر ہوئے اور جس کی اللہ نے سند نہیں اُتاری اس کے سوا اسے پوجا، اللہ پاک اُن کی طرف سے اس بات کی خبر دیتا ہے۔ سلطان سے مراد حجت و برہان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المومنون: ١١٧] ”اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو یقیناً اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، بے شک کافر فلاح نہیں پائیں گے۔“ اور اسی لیے اس جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ یعنی جس بات کو انھوں نے اپنی طرف سے بنا لیا اور بہتان کیا ہے، اس میں ان کو کچھ علم نہیں ہے، وہ تو ایک ایسی بات ہے کہ بغیر دلیل و حجت کے اپنے آبا و اسلاف سے اس کو لیا، اس کی اصل من جملہ ان امور کے ہے جن کو شیطان نے اُن کی نظر میں اچھا کر دکھایا ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے اُن کو یہ وعید سنائی: ﴿ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ یعنی جو عذاب اور سزا اُن پر نازل ہوگی، اللہ کی طرف سے اُن کا کوئی مددگار نہ ہوگا کہ اُن کی مدد کرے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ﴾ یعنی جس وقت قرآن شریف کی آیتیں اور اللہ پاک کی توحید پر اور اس پر کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس کے رسل کرام حق ہیں اور سچے ہیں حجتیں اور کھلی دلیلیں اُن سے ذکر کی جاتی ہے تو ﴿ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ یعنی جو لوگ قرآن کی صحیح دلیلوں سے اُن پر حجت قائم کرتے ہیں تو قریب ہوتے ہیں کہ ان پر دوڑ پڑیں اور اپنے ہاتھ اور زبانیں برائی کے ساتھ اُن کی طرف دراز کریں۔ اے پیغمبر! تم اُن لوگوں سے کہہ دو: ﴿ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ یعنی آگ اور اس کا عذاب و سزا سخت تر و شاق تر (شاق گزرنے والا) و طام تر و عظیم تر (عظیم ہنگامہ) ہے، اس سے جس کے ساتھ تم اللہ کے اولیائے مومنین کو ڈراتے ہو دنیا میں۔ آخرت کا عذاب تمھارے اس کام سے اور بدگوئی سے جو تم کرتے ہو بہت بڑا ہے، اگر تم نے اپنے زعم اور ارادے میں بدگوئی کی ہے۔

﴿ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آگ بہت ہی بری ٹھہرنے کی جگہ اور منزل اور مرجع و موئل و مقام ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی برا ٹھکانا نہیں ہے۔ ﴿ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٦] ''بے شک وہ (جہنم) ٹھہرنے اور قیام کرنے کی بری جگہ ہے۔''[1] كذا في ابن كثير.

یہ آیت مشرکین کی بعض فضیحتوں کا بیان ہے، یعنی انھوں نے بتوں کو پوجا کہ اُن کے پوجنے میں اُن کے پاس اللہ پاک کی طرف سے کوئی روشن دلیل نہیں تھی، یہ دلیل نقلی کی نفی ہوئی۔ ﴿ وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے جو دوسری وجوہات کے ساتھ بتوں کی عبادت پر دلالت کرے۔ غرض یہ ہے کہ نہ اللہ پاک نے اس بارے میں کوئی آسمانی حجت اُتاری اور نہ عقلی استدلال اور ضرورت کے ساتھ اُن کو اس کا کوئی علم حاصل ہوا، تو اب بتوں کے پوجنے میں ہرگز کوئی حجت اُن کے پاس نہیں ہے، صرف محض جہالت سے اُن کو پوجتے ہیں۔ چوں کہ کسی غیر مستحقِ عبادت کو پوجنا ظلم ہے، اس لیے ''وَمَا لَهُمْ'' نہ کہا، بلکہ اُن پر ظلم کی آواز لگانے کو اسم مظہر بجائے مضمر قائم کر کے، اس طرح ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ یعنی جن لوگوں نے شرک کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور ایسے سخت ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں، اُن کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے کہ اُن کے مذہب کو ثابت کرے یا اُن سے اللہ پاک کے عذاب کو دور کرے۔ سورت آلِ عمران میں اس آیت پر کلام گزر چکا ہے۔[2]

جملہ ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا ﴾ معطوف ہے ﴿ يَعْبُدُوْنَ ﴾ پر اور ﴿ بَيِّنٰتٍ ﴾ منصوب ہے بنا برحال۔ اللہ پاک اُن کو توبیخ کرتا ہے کہ باوجود ان کے جہلِ مفرط کے جس وقت ان پر ہماری آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، درآں حالیکہ وہ واضح اور ظاہر ہیں اور مضبوط راستے اور صراطِ مستقیم پر کھلی دلالت کرتی ہیں تو ﴿ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ﴾ یعنی تو پہچانے اُن کے منہ میں جو کافر ہیں ایسی بات جس کا انکار کیا جاتا ہے۔ اس

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٣١٣) [2] رقم الآية (١٩٢)

امر سے مراد اُن کی ناراضی اور ترش روئی ہے، جس کا وہ آیات سننے کے وقت اظہار کرتے ہیں۔ یا منکر سے مراد انکار ہے، یعنی تو اُن کے منہ سے انکارِ آیات کو پہچانے۔ مطلب یہ ہے کہ منکر اگرچہ بروزن مفعول ہے، لیکن مصدر میمی بہ معنی انکار ہے اور مضاف محذوف ہے، یعنی تو اُن کے منہ میں انکار کا اثر پہچانے۔ کسی نے کہا ہے کہ منکر سے مراد تجبر و ترفع ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ پہچانے تو کفار کے منہ میں انکار کو اُن کے حق کے ساتھ تکبر کرنے کی وجہ سے اور اُن باطل باتوں کے لیے غصہ کرتے ہوئے، جن کو انھوں نے تقلیداً اختیار کیا ہے، اور اسی امر پر آگاہ کرنے کے لیے ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ بجائے ضمیر رکھا ہے۔ یا منکر سے مراد وہ شر ہے جس کا قصد کرتے ہیں،[1] یعنی اُس شخص سے جس نے ان پر آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفر کے وصف کی ان پر شہادت دینے کے لیے اسم ظاہر کو موقع ضمیر میں واقع کیا ہے۔

جملہ ﴿ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ ﴾ مستأنفہ ہے، جواب ہے سوال مقدر کا۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ وہ منکر کیا ہے جو اُن کے منہ میں پہچانا جاتا ہے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ وہ لوگ نزدیک ہوتے ہیں کہ ان پر دوڑ پڑیں جو ہماری آیتیں سناتے ہیں۔ ''سطو'' وثب وبطش کو کہتے ہیں۔ وثب کے معنی ہیں برجستن اور بطش بولتے ہیں، حملہ کردن وسخت گرفتن کو اور ''سطوة''، شدتِ بطش ہے۔ عرب کی بول چال میں ''سطا به يسطو'' کہتے ہیں جبکہ کوئی شخص کسی پر ضرب کے ساتھ حملہ کرے، یا گالی دینے کے ساتھ، یا ہاتھ پکڑنے کے ساتھ۔ اصل سطو کی قہر ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جملہ مذکورہ حال ہے یا تو ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ سے گو وہ مضاف الیہ ہے، اس لیے کہ مضاف، یعنی وجوہ اس کا جز ہے، یا حال ہے وجوہ سے، اس لیے کہ اس سے مراد اصحابِ وجوہ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴾ [عبس: ٤٠] ''اور کئی چہروں پر اس دن خاک اُڑ رہی ہوگی۔'' اس کے بعد فرمایا:

﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴾ [عبس: ٤٢] ''یہی لوگ کافر و فاجر ہیں۔''

﴿ يَسْطُوْنَ ﴾ میں ''يبطشون'' کے معنی شامل ہیں، اس لیے اس کی مثل متعدی ہوا ورنہ ''سطو'' ''علیٰ'' سے متعدی ہوتا۔ محاورے میں ''سطا عليه'' بولتے ہیں اور ''سطو'' کی اصل قہر اور غلبہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تسلط اس شے کا ظاہر کرنا ہے جو ہول میں ڈالے ڈارانے کے لیے۔ یہ قول کہ ''ولفلان سطوة'' اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے تسلط وقہر ہے۔ انتہی۔ یہی تضمین کے معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ چنانچہ امام ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اُن سے روایت کیا ہے کہ ''يسطون يبطشون''۔[2] حال کی بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ جس وقت ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو اُن کے منہ میں تو انکار کو پہچان لے، درآں حالیکہ وہ ان لوگوں پر دوڑ کر حملہ کرنے کے قریب ہوتے ہیں جنھوں نے اُن پر قرآن پڑھا، یہ لوگ نبی کریم ﷺ اور آپ کے

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٦٨٣)

اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہ حملہ آوری پڑھنے والوں پر غیظ وغضب کی شدت کی وجہ سے ہے، کون سا غصہ ہے؟ وہ جو اُن کو قرآن شریف سننے سے لاحق ہوتا ہے۔ پس اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو اس بات کا حکم کیا کہ وعید سے اُن کا مقابلہ کریں، وہ یہ ہے: "قل لهم أفأنبئكم بشر من ذلكم" حرفِ فا کے اول میں فعل محذوف ہے، اس پر ما بعد کا عطف ہے۔ "أي أخاطبكم فأنبئكم" یعنی میں تم کو مخاطب کرتا ہوں، پھر تم کو خبر دیتا ہوں اس سے بھی زیادہ بری شے کی۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص تم پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے تم کو اس پر سخت غیظ وغضب آتا ہے اور اس پر قریب ہوتے ہو کہ دوڑ پڑو، یا اس کے پڑھنے کی وجہ سے جو ملال اور پریشانی تم کو لاحق ہوتی ہے، کیا اس سے بڑھ کر بری اور مکروہ شے کی تم کو خبر دوں؟ یا قرآن شریف کے پڑھنے والے کو جو ایذا اور تکلیف تمھاری طرف سے پہنچتی ہے اور تم اس کو ڈانٹتے اور دباتے ہو، اس پر حملہ کرتے ہو، کیا اس سے زیادہ بُری چیز کی تم کو خبر دوں؟ وہ شے آگ ہے، جس کا اللہ نے منکروں کو وعدہ دیا ہے۔

اس بنا پر ﴿ اَلنَّارُ ﴾ مرفوع ہے بنا بر خبر اور مبتدا محذوف ہے۔ دونوں مل کر جملۂ مستأنفہ جواب ہے سوال مقدر کا، گویا کسی نے کہا کہ جس بات سے ہم ایذا پاتے ہیں اور اس کی مشقت اُٹھاتے ہیں، اس سے بڑھ کر بری کون سی شے ہے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ وہ آگ ہے۔ کسی نے ﴿ اَلنَّارُ ﴾ کو بتقدیر "أعني" منصوب پڑھا ہے اور کسی نے مجرور بنا بر بدل بشر سے۔ فتح البیان و فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ جس طرح قرآن شریف سننے کے وقت کفار کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مارے غیظ کے پھٹے پڑتے ہیں، اسی طرح بدعتی گمراہ لوگوں کا حال ہے کہ اُن میں سے جس وقت کوئی کسی عالم کو سنتا ہے کہ کتابِ عزیز کی آیات سے کوئی آیت یا سنتِ صحیحہ سے کوئی صحیح حدیث شریف اس پر پڑھتا ہے، جس باطل وگمراہی کا اس نے اعتقاد کیا ہے وہ اس کی مخالف ہوتی ہے تو تو منکر سے اس کے منہ میں وہ شے دیکھے گا کہ اگر اس کو اس عالم پر حملہ کرنے کی قدرت ہو تو ضرور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرے، جو وہ مشرکوں کے ساتھ نہ کرے، ہم اہلِ بدعت سے اُن امور میں سے ایسے اُمور دیکھ چکے ہیں اور سن چکے ہیں کہ ان کا بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ والله ناصر الحق و مظهر الدين و مدحض الباطل و دامغ البدع و حافظ المتكلمين بما أخذه عليهم المبينين للناس ما نزل إليهم و هو حسبنا و نعم الوكيل۔[1]

امام حفناوی نے کہا ہے کہ جب ﴿ اَلنَّارُ ﴾ خبر مبتدائے محذوف کی ٹھہرے گی تو ﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ پر وقف ہوگا، یا ﴿ اَلنَّارُ ﴾ پر۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾ مبتدا ہو اور ﴿ وَعَدَهَا اللّٰهُ ﴾ اس کی خبر ہو۔ اس بنا پر ﴿ كَفَرُوْا ﴾ پر وقف ہوگا۔ امام سمین رحمہ اللہ کی تبیین یہ ہے کہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾ کو تینوں حرکتوں سے پڑھا ہے۔ رفع کی دو وجہیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ رفع بنا بر مبتدا ہے اور خبر جملہ ﴿ وَعَدَهَا اللّٰهُ ﴾ ہے اور جملے کا کوئی محل نہیں ہے،

[1] فتح القدير (٣/ ٦٣٧) فتح البيان (٩/ ٨٢۔ ٨٣)

اس لیے کہ شر متقدم کی تفسیر کرتا ہے، گویا یوں کہا ہے کہ اس سے بڑھ کر بڑی شے کون ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا کہ ﴿ اَلنَّارُ وَعَدَهَا ﴾۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ اس سے بڑھ کر بری کیا چیز ہے؟ تو یہ جواب دیا کہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾، یعنی "هو النار". اس بنیاد پر ﴿ وَعَدَهَا اللّٰهُ ﴾ میں دو وجہیں جائز ہوں گی: ایک تو رفع اس بنا پر کہ خبر بعد خبر ہوگا۔ دوسری یہ ہے کہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾ سے بدل ٹھہرے گا، اس میں نظر ہے کہ مبدل منہ مفرد ہے اور بدل جملہ۔ دوسری قراءت زید بن علی اور ابن ابی عبلہ کی ہے بنصب، اس کی تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ منصوب بہ فعل مقدر ہے، جس کی تفسیر فعل ظاہر کر رہا ہے، یہ مسئلہ اشتغال کے باب سے ہے۔ دوسری یہ ہے کہ منصوب علی الاختصاص ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1]

تیسری یہ ہے کہ منصوب باضمار "أعني" ہے، یہ وجہ ماقبل کے قریب ہے یا بعینہٖ وہی ہے۔ تیسری قراءت ابن ابی اسحق اور ابراہیم بن نوح کی بجر ہے، اس بنا پر ﴿ اَلنَّارُ ﴾ بدل ہوگا شر سے۔[2] شیخ زادہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَعَدَهَا ﴾ کی ضمیر میں ظاہر یہ ہے کہ مفعول اول ہے، اس معنی میں کہ اللہ پاک نے نار سے کفار کا وعدہ کیا ہے کہ آگ کو کافر کھلائے گا، کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ [ق: ٣٠] "اور وہ کہے گی: کیا کچھ مزید ہے؟"

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ضمیر مفعول ثانی ہو اور ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ اول، جیسا کہ اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ ﴾ [التوبة: ٦٨] "اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے۔" امام سمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لائق یہ ہے کہ یہی ثانی وجہ متعین ہو، کیوں کہ جو فعل دو مفعول کی طرف متعدی ہوا کرتا ہے، جب اس کے بعد ایسی دو شے جمع ہوں کہ دوسری پہلی سے مراد نہ ہو تو فاعل معنوی کا رُتبہ تقدیم ہے اور وہی مفعول اول ہے۔ مفعول اول سے مراد وہ ہے کہ اس سے فعل ہوسکتا ہو، جیسی یہ مثال ہے کہ "وعدت زيدا ديناراً"، اس میں دینار مفعول ثانی ہے، اس لیے کہ اس سے فعل نہیں ہوسکتا ہے، اسی کی نظیر "أعطيت زيدا درهما" ہے، زید فاعل ہے، کیوں کہ دراہم کا لینے والا ہے۔

امام محلی رحمہ اللہ کا کلام پہلے احتمال پر جاری ہوتا ہے، کیوں کہ انھوں نے "بأن مصيرهم إليها" کہا ہے تو ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ کو موعود بہ قرار دیا ہے، اس صورت میں ضمیر مفعول اول ہوگی۔ "أي وعدها الله بمصير الكفرة إليها"، یعنی اللہ نے آگ سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں گے اور اس کا طعام ہوں گے تو وہ کھانے والی ہوگی اور وہ کھائے گئے۔ چوں کہ کفار کا یہ دعویٰ کہ اللہ پاک کے واسطے شریک ہے غرابت و شہرت میں تمام امثال کے قائم مقام تھا، اس لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا:

---

[1] الكشاف (٣/ ١٧٢)
[2] اللباب في علوم الكتاب (١٤/ ١٤٨)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ
يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ
وَالْمَطْلُوْبُ ﴿73﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿74﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، لہٰذا تم اسے غور سے سنو، بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے، اگرچہ وہ (سارے بھی) اس کے لیے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب و مطلوب (عابد و معبود دونوں) کمزور ہیں ﴿73﴾ انھوں نے اللہ کی قدر (اس طرح) نہیں کی، جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے، بے شک اللہ بہت قوت والا، نہایت غالب ہے ﴿74﴾

بت حقیر اور ان کی پوجا کرنے والے بیوقوف ہیں:

چاہنے والا کافر ہے اور جس کو چاہتا ہے وہ اُن کے بت، مکھی چاٹتی ہے بت کو نہ وہ مورت اڑاتی ہے نہ اس کا شیطان۔ انتہٰی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک آگاہ فرماتا ہے بتوں کی حقارت پر اور اُن کے پوجنے والوں کی حماقت اور کم عقلی پر۔ ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ ﴾ یعنی جو لوگ اللہ پاک سے جاہل ہیں، اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں، جس شے کو وہ پوجتے ہیں اللہ پاک اس کی ایک مثال بیان کرتا ہے۔ ﴿ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ﴾ یعنی لوگو پس تم اس کے سننے کے لیے چپ رہو اور سوچو سمجھو، وہ مثال یہ ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ ﴾ یعنی اگر بت اور شریک جن کو تم پوجتے ہو، سب کے سب اس پر جمع ہوں کہ ایک مکھی کے بنانے پر قادر ہو جائیں تو وہ اس پر قادر نہ ہوں، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، فرمایا اور کون زیادہ تر ظالم ہے اس شخص سے جو چلا ہے کہ میری مخلوق کی طرح کی کوئی چیز پیدا کرے، پس چاہیے کہ میری مخلوق کی طرح ایک ذرہ ہی پیدا کریں یا ایک مکھی یا ایک دانہ۔[1] بخاری و مسلم نے بطریق عمارہ عن ابی زرعہ عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے، فرمایا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: اور کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو چلا ہے کہ میری مخلوق کی طرح پیدا کرے، پس چاہیے کہ وہ ایک ذرہ یا ایک جو یا دانہ ہی پیدا کریں۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ﴾ یعنی وہ ایک مکھی کے پیدا

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٣٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٣٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١١١)

کرنے سے عاجز ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انتہائی عاجز ہیں کہ مکھی کا مقابلہ کریں اور اس سے بدلہ لیں۔ بتوں پر جو خوشبو لگی ہے، اگر مکھی اُن سے اس میں سے کچھ چھین لے، پھر وہ چاہیں کہ وہ اس کو اس سے چھڑا لیں تو وہ ہرگز اس پر قادر نہ ہوں، یہ سن چکے، حالاں کہ مکھی اللہ پاک کی ایک ضعیف ترین اور حقیر ترین مخلوق ہے اور اسی لیے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ طالب تو صنم ہے اور مطلوب مکھی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی ظاہر سیاق ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ طالب عابد ہے اور مطلوب صنم ہے۔[2] پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ یعنی اللہ پاک کی قدر و عظمت کو نہیں پہچانا، جبھی تو اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجا اُن چیزوں میں سے جو کہ اپنی کمزوری اور عاجزی کے مارے ایک مکھی سے مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ ہی قوی ہے کہ اس نے اپنی قدرت و قوت سے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے کہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ زندہ کرے گا اور یہ دہرانا اس پر زیادہ آسان ہے۔ ﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴾ [البروج: ۱۲۔ ۱۳] ''بے شک آپ کے رب کی پکڑ نہایت سخت ہے۔ بے شک وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ [الذاریات: ۵۸] ''بلاشبہ اللہ تو خود رزق دینے والا ہے، بڑی قوت والا، نہایت طاقت ور ہے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ عَزِيْزٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر زبردست ہے تو اس کو مقہور کیا ہے اور اس پر غالب ہوا ہے۔ اس کی عظمت و بادشاہت و غلبے کے مارے نہ کوئی اس کو روک سکتا ہے نہ اس پر غالب آ سکتا ہے۔ "وھو الواحد القھار" وہی تنہا سب کا مقہور کرنے والا ہے۔[3]

یہ آیت متصل ہے: ﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ﴾ [الحج: ۷۱] سے۔ اللہ پاک نے پہلے بیان فرمایا کہ مشرکین اللہ کے سوا ایسی چیز کو پوجتے ہیں کہ اس کی عبادت کے صحیح ہونے کے بارے میں انھوں نے نہ تو کسی آسمانی دلیل کو پکڑا ہے جو کہ وحی کی شکل میں ہوتی ہے نہ کسی ضروری علم نے اُن کو اس طرف لگایا ہے اور نہ ہی کوئی عقلی دلیل اُن کے لیے غیر اللہ کی عبادت کا باعث بنی ہے۔ پھر اس آیت میں وہ بات بیان فرمائی جو اُن کے حال کے باطل ہونے اور عقل کی خرابی اور قول و فعل کی غلطی پر دال ہے۔ ضربِ مثل صرف اس لیے فرمایا کہ اللہ پاک کے حجتیں اُن پر قائم کرنا مثالیں بیان کر کے ان کے فہموں کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ مثل مضروب کہاں ہے تو کہیں گے کہ اس میں دو وجہیں ہیں: ایک تو اخفش کا قول ہے کہ یہاں کوئی مثل نہیں ہے، معنی صرف اسی قدر ہیں کہ انھوں نے میرے واسطے ایک مثل بیان کی ہے، لہٰذا تم ان کی بات کو سنو، یعنی کفار نے اللہ پاک

---

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۶۸۵۔ ۶۸۶) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۵۰۵) [3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۱۳۔ ۳۱۴)

کے غیر کو پوج کر اس کے لیے ایک مثل ٹھہرایا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ میری عبادت میں انھوں نے میرے لیے ایک شبیہ ٹھہرایا ہے، لہٰذا تم اس شبیہ کی خبر سنو۔ (شیخ زادہ نے کہا ہے کہ "ضُرِبَ" کو "جُعِلَ" کے معنی میں کہنا بعد سے خالی نہیں ہے)۔

دوسری وجہ قتیبی کا قول ہے، معنی یہ ہیں: لوگو! ایک مثال بیان کی گئی، یعنی ایسے معبود پوجے گئے کہ وہ ایک مکھی نہیں بنا سکتے اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے اس کو چھڑا نہیں سکتے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: جو شے اللہ کے سوا پوجی جاتی ہے، اللہ عزوجل نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو کچھ کہا ہے، اس کے اچھے سے اچھا یہی قول ہے، یعنی اللہ پاک نے تمھارے اور تمھارے معبود کے واسطے ایک شبہ بیان کیا ہے۔[1] كذا قال القرطبي۔ مشرکوں کا یہ دعویٰ کہ اللہ پاک کے لیے کوئی شریک ہے، اس کی تعبیر مثال سے اس واسطے کی کہ اس دعوے کی غرابت میں مثل سائر کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ مثل کی اصل یہ ہے کہ مثل ایک جملہ ہوتا ہے کلام کا جس کو سب لوگ قبول کرتے ہیں، لوگوں میں وہ مشہور ہوتا ہے، اُن کے نزدیک غریب سمجھا جاتا ہے، لوگوں نے اس کی جائے بیان کو اس کے وارد ہونے کی جگہ کے مثل قرار دیا ہے۔ پس لفظ ﴿مَثَلٌ﴾ کا قول سائر میں حقیقت عرفی ہے اور کبھی اس کا عجیب وغریب قصہ اور نادر صفت کے لیے استعارہ کرتے ہیں، کیوں کہ غرابت میں وہ اسی کی طرح ہوتی ہے، جس طرح کہ اس آیت میں قصہ مذکورہ ہے۔ اللہ پاک نے مشرکوں کو پکارا ہے، تاکہ ان کی طرف ایک ایسی عجیب وغریب حالت اور نادر قصے کا القا کرے، جس کو باستحسان وقبول لیا ہے، وہ یہ ہے کہ مشرکوں نے اللہ پاک کی مخلوق میں سے عاجز سے عاجز، ذلیل سے ذلیل، خوار سے خوار مخلوق کو اُلوہیت اور عبادت کے استحقاق میں اس کا شریک ٹھہرایا، اللہ پاک شریک وند ونظیر سے کہیں بلند و برتر ہے۔ رہی یہ بات کہ اس حالتِ غریب کی تعبیر ماضی کے لفظ، یعنی "ضَرَبَ" سے کی اور ماضی چاہتی ہے کہ مثال کا بیان بھی زمانہ ماضی میں ہو، حالاں کہ اللہ پاک اس کو ابتداءً فرما رہا ہے، لہٰذا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عجیب حالت جو وارد کی جاتی ہے تو یہ خوب وضاحت اور ظہور کے سبب ایسے امر کے مثل ہے جس کا بیان ہو چکا ہے۔

پھر ضربِ مثل میں جس بات کا اجمال اور الہام کیا تھا، اب اللہ پاک نے اس کو کھول کر بیان فرما دیا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ بلاشک جو کوئی قدر اور جثّہ میں حقیر ترین مخلوق بنانے پر قادر نہ ہو، اس کو الٰہ و معبود قرار دینا ایک عجیب وغریب حالت اور مثل سائر کے مشابہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس حقیر ترین اور ادنیٰ مخلوق کی برابری کرنے پر قادر نہیں اور عاجز ہے کہ اپنی جان سے اس کو دور کرے۔ ضعف کی

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ٩٦۔ ٩٧)

مثال مشہور ہے کہ جس سے اپنی جان سے مکھیاں اُڑائی نہیں جاتیں، اس سے کسی دوسرے کو نفع پہنچانے کی کیا اُمید ہے؟! غرض یہ کہ جس شے کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں، اس سے مراد وہ بت ہیں جو کعبہ مکرمہ وغیرہا کے اردگرد تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد سردار ہیں، جنھوں نے ان کو اللہ کی عبادت سے باز رکھا، کیوں کہ اہلِ حل وعقد ان میں وہی تھے۔ بست وکشاد اور معاملات کا نظم ونسق چلانا انھیں کے ذمے تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد شیاطین ہیں، جنھوں نے ان کو اللہ پاک کی معصیت و نافرمانی پر آمادہ کیا۔ پہلا قول مقام سے موافق تر ہے اور تمثیل میں زیادہ تر ظاہر ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار بھی قولِ اول ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی آلہۂ باطلہ کہا ہے۔

امام محلی رحمہ اللہ نے بھی اصنام کو اختیار کیا ہے۔ سہل و یعقوب نے "یدعون" بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔[2] کسی کی قراءت بیائے تحتیہ بہ صیغۂ مجہول ہے، یہ تین قراءتیں ہوئیں، دو اول کی بنا پر ضمیر راجع موصول کی طرف محذوف ہوگی، تیسری میں خود فعل کی ضمیر اس کی طرف پھرے گی۔ ذباب نام ہے مکھی کا، نر اور مادہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جمع قلت اس کی "أَذِبَّه" اور جمع کثرت "ذِبَان" بالکسر، جیسے: "غراب و أغربه و غِربان اورغربان بر وزن قضبان ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "ذُباب" معروف ہے واحد "ذبابة" ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "ذُباب" کو ذباب اس لیے کہتے ہیں کہ جس وقت وہ بسبب اس کے استقذار (کراہت) کے اُڑائی جاتی ہے تو اپنے استکبار کی وجہ سے لوٹ آتی ہے۔[4]

حرف ﴿ لَنْ ﴾ تاکید نفی مستقبل کے لیے آتا ہے اور اس جگہ اس کی تاکید اس لیے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ مکھی کا بنانا اُن کے لیے محال ہے، گویا یوں کہا: محال ہے کہ وہ بنائیں۔ "ذُباب" کا ذکر خاص کر اس واسطے کیا کہ وہ ذلیل، حقیر، ضعیف، مکروہ اور وہ گندی ہے، اس سے گھن آتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ ہرگز قادر نہ ہوں گے کہ ایک مکھی بنا سکیں باوجود اس کے کہ وہ ایک چھوٹے سے جسم والی حقیر سی چیز ہے اور سارے حیوانوں سے جاہل تر ہے، کیوں کہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا کرتی ہے اور اس کی زندگی کی مدت چالیس دن ہے۔ اس کی پیدایش کی اصل عفونات (بدبو) سے ہے۔ پھر ایک کا دوسرے سے باہم توالد و تناسل ہوا کرتا ہے، اس کا فضلہ سفید شے پر گرے تو سیاہ اور سیاہ پر گرے تو سفید دکھائی دیتا ہے۔ بالجملہ باوجود اس ذلت وخواری کے پھر بھی اس کی پیدایش میں عجیب وغریب چیزیں ہیں۔ فسبحان الله وبحمده.

جملہ ﴿ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ﴾ معطوف ہے دوسرے جملۂ شرطیہ محذوفہ پر۔ "أي لولم يجتمعوا له لن يخلقوه ولو اجتمعوا له"۔ اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "لن یخلقوه" یہ دونوں جملے محلِ نصب

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤١) [2] تفسير النسفي (٣/ ١١٣) تفسير الجلالين (١/ ٤٤٤)

[3] تفسير القرطبي (١٢/ ٩٧) [4] تفسير النسفي (٣/ ١١٣)

میں ہیں حال کی بنا پر، یعنی اگر وہ جمع نہ ہوں مکھی بنانے کے لیے تو ہرگز اس کو نہ بنائیں اور اگر جمع ہوں تو ہرگز نہ بنائیں۔ حاصل یہ ہے کہ دونوں حال میں ہرگز اس کو نہ بنا سکیں۔ ان کا ہر حال میں مکھی کو بنانا ممکن نہیں اور اگر اُن میں یہ حالت ہوتی جو کہ ذباب کو پیدا کرنے کی مقتضی ہے تو وہ اس کو بناتے۔ گویا اللہ پاک نے یوں فرمایا کہ یہ اگر جمع ہو جائیں تو ایک مکھی کے بنانے پر قادر نہیں ہوتے ہیں، باوجود اس کی حقارت و ذلت و خواری کے۔ پھر کس طرح ایک عقل مند کو لائق ہے کہ ان کو معبود بنائے اور اُن کو خالق السموت والارض کا شریک اور ہم سر ٹھہرائے، ہرگز نہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ قریش کے جاہل بنانے میں اور اُن کے اظہارِ جہالت میں جو آیتیں نازل ہوئیں، ان سب سے زیادہ مبالغے کے ساتھ اس آیت میں اُن کی جہالت کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ الٰہیت جس کا تقاضا تھا کہ سارے مقدورات پر اقتدار ہو، ساری معلومات کا احاطہ ہو، لہٰذا انھوں نے اس کے ساتھ ایسی صورتوں اور مورتوں کو متصف کیا جس کو اللہ پاک کی سب سے کم تر اور ذلیل تر مخلوق پیدا کرنے کی بھی قدرت نہیں، اگرچہ اس کام کے لیے وہ سب کے سب ہی کیوں نہ جمع ہو جائیں۔[1] پھر اللہ پاک نے بتوں کی انتہائی عاجزی اور کمزوری کا بیان کیا۔

پس ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ ﴾ سلب کہتے ہیں ربودن کو اور استفعال بروزن استفعان بہ معنی اِفعال ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”أنقذه من كذا“ یعنی فلاں نے فلاں کو فلاں شے سے نجات دی اور اس کو چھڑا لیا۔ معنی یہ ہیں کہ یہ چھوٹی سی ذلیل سی اور کمزور سی مخلوق اگر اُن سے کوئی چیز جلدی سے جھپٹ لے تو اپنی کمال عاجزی اور کمزوری کے مارے اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ امام عبد بن حمید اور ابن منذر رحمہما اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے: ”لا يستنقذ الأصنام ذلك الشيء من الذباب“[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کافر لوگ بتوں پر زعفران چپڑتے اور اُن کے سروں پر شہد لگا دیتے تھے۔ پھر جب مکھی اُن سے چھین لیتی تو بت اس کے لینے سے عاجز ہوتے، اسی جیسے اور قول ہیں۔ غرض کہ بت ایسے حقیر حیوان کو بنانے سے عاجز نکلے اور جو شے وہ اُن سے چھین لے اس کے چھڑانے سے عاجز ہوئے، پھر جو حیوان جسم میں اس سے بڑا ہے اور قوت میں اس سے زیادہ سخت ہے، اس کو بنانے سے تو انتہائی طور پر عاجز اور ضعیف ہوں گے۔ پھر اللہ پاک نے اصنام و ذباب کے ضعف سے تعجب دلایا۔

پس ارشاد فرمایا: ﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ بت تو مثل طالب کے ہے، کیوں کہ وہ مکھی کا بنانا طلب کرتا ہے یا جو مکھی نے اس سے چھین لیا ہے، اس کے چھڑانے کو طلب کرتا ہے اور مطلوب مکھی ہے۔ یہ گویا ضعف میں اُن کے اور مکھی کے درمیان برابری کرنا ہے اور اگر تو خوب تحقیق کر کے دیکھے تو طالب کو زیادہ ضعیف پائے گا، کیوں کہ مکھی تو حیوان ہے اور بت جماد ہے، مکھی غالب ہے اور بت مغلوب۔ کسی نے کہا ہے کہ طالب عابدِ صنم ہے

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ١١٣۔ ١١٤) [2] الدر المنثور (٦/ ٧٥)

اور مطلوب صنم۔ کسی نے کہا ہے کہ طالب مکھی ہے اور مطلوب آلہہ۔ امام ابن جریر اور ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: طالب ان کے آلہہ ہیں اور مطلوب مکھی۔[1]

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ مشرکوں نے جو اللہ کے سوا ایسے معبودوں کو پوجا کہ وہ عاجزی میں اس درجے کو پہنچے ہوئے ہیں جس کا بیان ہوا تو انھوں نے اللہ پاک کو نہ پہچانا، جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق تھا، پس فرمایا: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ یعنی اس کی تعظیم نہ کی جیسا کہ اس کی تعظیم کرنے کا حق ہے، جب تو نے ان بتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا، باوجود اس کے کہ اُن کا یہ حال ہے۔ اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔[2] ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ﴾ یعنی اللہ پاک ہر شے کی خلق پر قوی ہے۔ ﴿عَزِیْزٌ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ غالب ہے، کوئی اس پر غالب نہیں ہوسکتا، بخلاف معبودین مشرکین کے کہ وہ جماد ہیں نہ نفع دے سکتے ہیں نہ ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ کسی شے پر قدرت رکھتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قادر و غالب ہے، پھر کیوں کر عاجز اور مغلوب اس کا شبیہ ٹھہرایا جاتا ہے یا قوی ہے، یعنی اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہے۔ ﴿عَزِیْزٌ﴾ ہے کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے۔[3] پھر اللہ پاک نے چاہا کہ مشرک لوگ نبوات و الٰہیات میں جو اعتقاد رکھتے ہیں اس کو ان پر رد کرے۔ پس ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۷۵ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۷۶

اللہ فرشتوں میں سے کچھ پیغام رساں چن لیتا ہے اور لوگوں میں سے (بھی)، یقیناً اللہ بہت سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے (75) وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں (76)

اللہ تعالیٰ کا فرشتوں اور انسانوں سے پیغمبروں کا انتخاب:

یعنی ساری مخلوق میں سے بہتر وہ لوگ ہیں جو پیغام پہنچانے والے ہیں اور فرشتوں میں بھی وہ فرشتے اعلیٰ ہیں جو اللہ کا پیغام انبیاء علیہم السلام کو پہنچاتے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر بتوں کو مانتے ہو۔ نکمے۔ وہ ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے، اختیار ہر چیز میں اللہ کا ہے۔ انتہی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے اس بات کی کہ وہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو پسند کرتا ہے، جس شے میں وہ چاہتا ہے اپنی شرع و قدر سے اور آدمیوں میں سے بھی اپنی رسالتوں کے پہنچانے کے لیے پسند کرتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی باتوں کا سننے

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٨٥) [2] رقم الآية (٩١) [3] تفسير النسفي (٣/ ١١٤)

والا ہے، ان کا دیکھنے والا ہے، جو اُن میں سے اس کام کا مستحق ہے اس کو خوب جاننے والا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:
﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ''اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ...﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک جانتا ہے جو کچھ کہ اپنے رسولوں کے ساتھ کرتا ہے، جس کام میں اُن کو بھیجا ہے، پس اس پر اُن کے کاموں میں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ [الجن: ٢٦۔ ٢٨] ''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے۔ تاکہ وہ معلوم کرے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں، اور اس نے ان (کے گرد و پیش) کا احاطہ کیا ہوا ہے اور اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔'' پس اللہ پاک ان پر رقیب ہے، جو کچھ اُن سے کہا جاتا ہے اس پر گواہ ہے، ان کا حافظ و نگہبان ہے، ان کی جناب کا ناصر ہے۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [المائدة: ٦٧] ''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا اور بلاشبہ اللہ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے پیغمبروں کو چن لیتا ہے، جیسے جبرائیل، اسرافیل، میکائیل، عزرائیل علیہم السلام اور آدمیوں میں سے پیام بروں کو چن لیتا ہے، وہ لوگ انبیا علیہم السلام ہیں، پس بھیجتا ہے فرشتے کو نبی کی طرف اور نبی کو لوگوں کی طرف۔ یا فرشتے کو بھیجتا ہے اپنی مخلوقات کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے، یا وہ چیز حاصل کرنے کے لیے جو اُن کو فائدہ دے، یا اُن پر عذاب نازل کرنے کے لیے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ نے برگزیدہ کیا موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلام کے ساتھ اور ابراہیم علیہ السلام کو خلّت کے ساتھ۔[2] (أخرجه الحاكم وصححه) سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ موسیٰ بن عمران صفی اللہ ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣١٤)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٦٢٩) اس کی سند میں ''احمد بن یحییٰ حلوانی'' کا ترجمہ نہیں ملا۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٠٤٨)

[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٦٢٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٦٤)

(أخرجه الحاكم وصححه) امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت جب نازل ہوئی تو مشرکوں نے یوں کہا: ﴿ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا﴾[1] [صٓ: ٨] ''کیا ہم میں سے اسی پر ذکر (قرآن) اُتارا گیا ہے؟'' یعنی وہ ہم سے کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں نہ ہم سے بڑھ کر شریف ہیں۔ اس قول کا قائل ولید بن مغیرہ تھا۔ اس آیت کی ماقبل سے مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت اللہ پاک نے اس شے کا ذکر کیا جو الٰہیات سے متعلق تھی تو یہاں اس بات کا ذکر فرمایا جو نبوات سے متعلق ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وجہ مناسبت یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے ماقبل میں بتوں کی عبادت کو باطل کیا تو اس جگہ فرشتوں کی عبادت کو باطل فرمایا۔[2] ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ بندوں کی باتوں کو خوب سنتا ہے، جس شخص کو اپنی مخلوق میں سے برگزیدہ کرتا ہے اس کو خوب دیکھتا ہے۔

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو اعمال انھوں نے آگے بھیجے ہیں اور جو خیر وشر چھوڑتے ہیں، اس سب کو اللہ پاک جانتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ [يٰسٓ: ١٢] ''اور جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے انھیں ہم لکھ رہے ہیں اور ان کے آثار (نشاناتِ قدم) کو بھی، اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔'' کسی نے کہا ہے کہ مراد وہ شے ہے جو گزر گئی اور وہ شے جو ابھی نہیں آئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ کام جس کو کر چکے اور وہ کام جسے آیندہ کریں گے، یا مراد امرِ دنیا و امرِ آخرت ہے۔ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ یعنی اسی کی طرف لوٹتا ہے ہر کام کا نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔[3]

علامہ نسفی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ مشرکوں نے جو بشر کے رسول ہونے کا انکار کیا تھا، یہ آیت اس کا رد ہے اور بیان ہے اس بات کا کہ اللہ پاک کے رسول دو قسم ہیں: فرشتے اور بشر۔ پھر دوسرا شانِ نزول بلفظِ ''قیل'' ذکر کیا ہے، (اس کا ذکر بحوالہ امام محلی رحمہ اللہ پہلے ہو چکا ہے۔)[4] ﴿سَمِيْعٌ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس بات کو عقلیں قبول کرتی ہیں، اس میں رسولوں کے اقوال کو سنتا ہے اور رد وقبول میں احوالِ اُمم کو دیکھتا ہے۔ ﴿تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ سارے کاموں کا مرجع اسی کی طرف ہے اور جن ذات میں یہ تمام صفات ہوں اس سے کوئی نہیں پوچھتا جو وہ کرتا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ اس کے حکم وتدبیروں میں اور رسولوں کو برگزیدہ کرنے میں اس پر اعتراض کرے۔ ﴿تُرْجَعُ﴾ شامی، حمزہ اور علی رحمہم اللہ کی قراءت ہے۔[5]

شیخ زادہ رحمہ اللہ کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نے نبوت کو اس بات سے ثابت کیا کہ اس نے بعض

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٤) [2] تفسير الرازي (٢٣/ ٦١۔ ٦٢) [3] فتح البيان (٩/ ٨٦۔ ٨٧)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٤) [5] تفسير النسفي (٣/ ١١٤)

لوگوں کو رسالت کے لیے چن لیا ہے اور جو لوگ فرشتوں کو پوجتے ہیں اُن کے طریقے کو اس آیت سے غلط ثابت کیا کہ ﴿ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا ﴾ اس کے بعد اگلی آیت میں بتوں کے پوجنے والوں کے قول کو باطل فرمایا۔ پس اس آیت کا مقصد فرشتوں کے پجاریوں کے قول کو باطل کرنا ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ فرشتوں کا بلند درجہ کچھ اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ معبود ہیں اور عبادت کے مستحق ہیں، بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ باعزت بندے ہیں، یعنی اللہ پاک کے نزدیک ان کی آؤ بھگت ہے، اللہ نے اُن میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کیے ہیں کہ اللہ پاک اور انبیا علیہم السلام کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کو منتخب کرنے سے یہ مراد ہو کہ اللہ پاک فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے پسند کرتا ہے، فرشتوں کی طرف بعض عبادات اور طاعات میں جن کا ان کو مکلّف کیا ہے۔ اُن میں سے انھیں کی طرف رسول بنا کر بھیجتا ہے ان عبادات کو پہنچانے کے لیے جس طرح کہ آدمیوں میں سے ان کی طرف پیغام پہنچانے والے منتخب کیے ہیں، جس امر کا اُن کا مکلّف کیا ہے، اس میں ان کو بھیجتا ہے۔ اس آیتِ شریفہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ پاک ہی نے اُن کو رسالت کے لیے چھانٹ لیا ہے نہ بسبب کسی شے کے جس کی وجہ سے وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن اللہ پاک کی طرف سے یہ ایک فضل اور انعام ہے ان پر۔ جب ہی تو اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ ﴾ ویسی بات نہیں جو معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ پسند نہیں کرتا رسالت کے لیے مگر اس شخص کو جس میں وہ بات ہو جس کی وجہ سے اس کا مستحق ہوتا ہے۔

﴿ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ میں مکمل علم کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ قدرتِ تامہ کی طرف اشارہ ہے اور الٰہیت اور حکم کے ساتھ اکیلا ہونے کی طرف اور اُن دونوں کا اکٹھا ذکر کرنا معصیت پر پیش قدمی کرنے پر سخت ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ غرض کہ جب یہ بات ذکر کی کہ سارے اُمور اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو ضمناً اس میں بندوں کو زجر بھی ہو گیا کہ اس کی معصیت سے بچیں اور اس کی طاعت کے بجا لانے پر مستعد ہوں۔ اب جو مقصود تھا اس کی تشریح کی۔ پس فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا
الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ۝۷۷ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ
اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ
اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ
الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِیْمُوا

الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾

اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو، اور اپنے رب کی عبادت کرو اور بھلائی (کے کام) کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ⑰ اور تم اللہ کی راہ میں (اس طرح) جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمھیں (اپنے دین کے لیے) چن لیا ہے اور اس نے دین میں تمھارے لیے کوئی تنگی نہیں رکھی، اپنے باپ ابراہیم کے دین کی (اتباع کرو)، اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر شہادت دینے والا ہو اور تم لوگوں پر شہادت دینے والے ہو، لہٰذا تم نماز قائم کرو اور زکات دو اور اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے تھامو، وہی تمھارا کارساز ہے، اور (وہ) اچھا کارساز اور اچھا مددگار ہے⑱

عبادت و جہاد کا حکم:

اس نے تمھارا نام مسلمان رکھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے یا ابراہیم علیہ السلام نے پہلے دعا میں کہا ہے کہ اُمت مسلمان پیدا کر اور اس قرآن میں شاید انھیں کے مانگنے سے یہ نام پڑا ہو اور تاکہ رسول بتانے والا ہو، یعنی پسند کیا تم کو اس واسطے کہ تم اور اُمتوں کو سکھاؤ اور رسول تم کو سکھائے اور یہ اُمت جو سب سے بعد میں آئی سب کی غلطی اسے معلوم ہوئی، سب کو صحیح راہ بتائی ہے۔ انتہی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورۃ الحج کے دوسرے سجدے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ آیا اس میں سجدہ کرنا مشروع ہے یا نہیں دو قول پر۔ پہلے سجدے کے ذکر میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورۃ الحج کو دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے، لہٰذا جو کوئی اُن میں سجدہ نہ کرے تو اُن کو نہ پڑھے۔[1]

﴿وَجٰهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے مالوں اور زبانوں اور جانوں سے جہاد کرو، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] ''اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اے امت! اللہ نے تم کو چھانٹ لیا اور ساری اُمتوں پر تم کو اختیار کیا اور تم کو فضیلت دی اور تم کو شرف بخشا اور تم کو کامل تر رسول اور کامل تر شریعت کے ساتھ خاص فرمایا۔

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۴۰۲) سنن الترمذي، رقم الحديث (۵۷۸) امام البانی رحمہ اللہ نے حدیث کے دوسرے حصے (جو شخص ان... پڑھے) کے علاوہ باقی روایت کو ''حسن'' کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (۵/ ۱۴۵)

شریعتِ محمدیہ کی رخصتیں:

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ جس چیز کی تم طاقت نہیں رکھتے ہو، اس کی تمھیں تکلیف نہیں دی، جو شے تم پر شاق گزرتی ہے اس کو تمھارے لیے لازمی نہیں کیا، مگر اللہ نے کوئی کشایش اور نکلنے کا راستہ تمھارے واسطے ٹھہرایا، پس نماز جو شہادتین کے بعد اسلام کا بڑے سے بڑا رکن ہے، حضر میں چار رکعتیں واجب ہیں اور سفر میں دو تک کم ہو جاتی ہیں اور خوف میں بعض ائمہ ایک رکعت پڑھتے ہیں، چنانچہ اس بارے میں حدیث شریف وارد ہوئی ہے اور پیدل اور سوار ہو کر دونوں طرح پڑھی جاتی ہے، قبلے کی طرف منہ ہو یا نہ ہو اور اسی طرح سفر میں نفلی نماز کا حال ہے کہ قبلہ وغیر قبلے کی طرف پڑھی جاتی ہے اور بیماری کے عذر کی وجہ سے اس میں قیام ساقط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مریض اس کو بیٹھ کر پڑھے، پھر اگر نہ پڑھ سکے تو اپنے پہلو پر پڑھے، یعنی لیٹ کر۔ اس کے سوا باقی فرائض و واجبات میں اور رخصتیں اور تخفیفیں ہیں اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: « بُعِثْتُ بِالْحَنِفِيَّةِ السَّمْحَةِ »[1] یعنی میں یک رنگی آسان شریعت دے کر بھیجا گیا ہوں اور جس وقت آپ ﷺ نے معاذ بن جبل اور ابو موسی رضی اللہ عنہما کو امیرِ یمن بنا کر بھیجا تو اُن سے یوں فرمایا: « بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا »[2] یعنی تم خوش خبری سناؤ، نفرت مت دلاؤ، آسانی کرو، مشکل مت ڈالو۔ اس کے بارے میں حدیثیں بہت ہیں اور اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ مِنْ حَرَجٍ ﴾ کی تفسیر میں "من ضيق" فرمایا ہے،[3] یعنی اللہ پاک نے اس دینِ متین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی ہے۔

﴿ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصب اس معنی کی تقدیر پر ہے کہ نہیں کیا تم پر دین میں کوئی حرج، یعنی کچھ تنگی، بلکہ وسیع و فراخ کیا اس کو تم پر، تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی طرح۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بر تقدیر "الزموا"، منصوب ہو، یعنی لازم پکڑو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کو۔[4] حافظ صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی اس آیت کے مثل ہیں: ﴿ قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ [الأنعام: ١٦١] "(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے، صحیح اعلیٰ اقدار کے حامل دین کی، ایک رب کے پرستار ابراہیم کے طریقے کی، اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔"

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٦٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٣)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٨٩) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٦٩١)

﴿سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ کا مفہوم:

امام عبداللہ بن مبارک نے ”عن ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ﴾“ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ اللہ عزوجل نے، یعنی ﴿سَمّٰكُمُ﴾ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ (و أخرج ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم من طرق عن ابن عباس رضی اللہ عنہما في قوله: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ قال الله عزوجل: ﴿سَمّٰكُمُ﴾ وروى نحوه عن جماعة من التابعين. فتح القدير) [1]

امام مجاہد، عطا، ضحاک، سدی، مقاتل بن حیان اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں، یہ اس لیے ہے کہ انھوں نے یوں فرمایا ہے: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ [البقرة: ۱۲۸] ”اے ہمارے رب! اور ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو بھی اپنا فرماں بردار (بنا)۔“ (پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا ہمارے حق میں قبول فرمائی)۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول بے وجہ ہے، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے قرآن میں اس اُمت کا نام مسلمین نہیں رکھا ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے تمھارا نام مسلمین رکھا ہے پہلے سے اگلی کتابوں میں اور ذکر میں۔ ﴿وَفِيْ هٰذَا﴾ سے مراد قرآن شریف ہے اور اسی طرح غیر امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ [2]

حافظ صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ صحیح یہی قول ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ پھر جس شے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر عالم میں رونق افروز ہوئے، اس پر اُن کو یوں آمادہ و برانگیختہ کیا کہ وہ اُن کے باپ ابراہیم خلیل جلیل علیہ السلام کی ملت ہے، یعنی اس کو نہایت خوشی سے قبول کریں، کیوں کہ وہ کوئی نئی شے نہیں ہے، اُن کے دادا کا مذہب و ملت ہے، پھر جو اللہ پاک نے قدیم زمانے کے انبیا علیہم السلام کی کتابوں میں اس اُمت کو بلند آوازہ کیا اور اس کی تعریف اور صفت کی اور وہ احبار اور رہبان پر پڑھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس پر اس بات کا احسان اور فضل رکھنے کا ذکر کیا۔ پس ارشاد فرمایا: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ یعنی اس منت و احسان اور فضل و امتنان کو تو ذرا چشمِ بینا سے دیکھو اور دلِ دانا سے جانو بوجھو کہ تم پر کتنا فضل و کرم کیا ہے کہ خالص اس نے تمھارا نام مسلم رکھا قرآن سے پہلے اور اس فرقان میں۔ حارث اشعری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَإِنَّهُ مِنْ جُثَا جَهَنَّمَ» یعنی جو شخص پکارے جاہلیت کا پکارنا تو وہ یقیناً جہنم کے جُثا سے ہے، ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! گو

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۶۹۱) تفسير ابن أبي حاتم (۸/ ۲۵۰۷) فتح القدير (۳/ ٦٤٢) [2] تفسير الطبري (۱۸/ ۶۹۱۔ ۶۹۳)

وہ روزہ رکھے، نماز پڑھے؟

فرمایا: ہاں اگرچہ وہ روزہ رکھے، نماز پڑھے، پس تم پکارو ساتھ پکارنے اللہ تعالیٰ کے، جس کے ساتھ تمھارا نام مسلمین، مومنین عباد اللہ رکھا۔[1] (رواه النسائي عند تفسير هذه الآية و أخرجه الطيالسي وأحمد و البخاري في تاريخه و الترمذي و صححه و أبو يعلى و ابن حبان و البغوي و الباوردي و أبو قانع و الطبراني و الحاكم و ابن مردوية و البيهقي في شعب الإيمان عن الحارث الأشعري ﷺ الخ۔ فتح القدير) (''جثا'' جمع ہے ''جثوة'' کی۔ ''جثوة'' کہتے ہیں شے مجموع کو، جیسے: پتھر جمع کیے ہوئے، یا ریت جمع کی ہوئی، مطلب یہ ہے کہ وہ دوزخ کے ڈھیروں سے ہے۔ جاہلیت کی پکار یہ ہے کہ مثلاً: رونے کے وقت مردے پر کفر کا کلمہ بکے، یا حرام کو حلال کرے، یا مثلاً: فریاد رسی کے وقت یا آلِ فلاں، یا یالفلاں بولتے تھے۔ مجمع البحار سے اسی طرح معلوم ہوا ہے۔[2] والله أعلم)۔ حافظ صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو بطولہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کے زیر تفسیر ذکر کر چکے ہیں: ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢١] ''اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔''

قیامت کے دن امتِ محمدیہ کی دوسری امتوں پر گواہی:

اسی واسطے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ یعنی ہم نے جو تم کو ایسی اُمت قرار دیا کہ تم کو اُمتِ وسط اور عدل والی اور بہترین اُمت قرار دیا اور ساری اُمتوں کے نزدیک تمھارے عدل کی گواہی دی گئی، یہ اسی لیے کہ قیامت کے دن تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ، کیوں کہ اس دن ساری اُمتیں اس اُمت کی ہر اُمت پر سرداری اور فضیلت کا اقرار کریں گی، پس اسی سبب سے قیامت کے دن اُن پر اس اُمت کی گواہی قبول کی جائے گی، اس بات میں کہ پیغمبروں نے اپنے رب کی رسالت ان کو پہنچا دی تھی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ [البقرة: ١٤٣] ''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔'' کی تفسیر میں اس بات پر کلام گزر چکا ہے۔ نوح علیہ السلام اور اُن کی اُمت کی حدیث اس طور پر ذکر کر آئے ہیں کہ اس کے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٢) مسند الطيالسي (١/ ١٥٩) مسند أحمد (٤/ ٢٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٦٣) مسند أبي يعلىٰ (٣/ ١٤٠) صحيح ابن حبان (١٤/ ١٢٤) المعجم الكبير (٣/ ٢٨٩) مستدرك الحاكم (١/ ٥٨٢) شعب الإيمان (٦/ ٥٩) فتح القدير (٣/ ٦٤٢۔ ٦٤٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٢٤)

[2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٣٢٢)

﴿ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اس عظیم نعمت کا مقابلہ کرو، اس کے شکر پر قائم ہونے سے، پس جو اس نے فرض کیا ہے اس کے ادا کرنے میں اور جو واجب کیا ہے اس کی طاعت میں اور جو حرام کیا ہے اس کے چھوڑنے میں اللہ پاک کا حق جو تم پر ہے اس کو ادا کرو اور اُن سب سے زیادہ اہم جو شے ہے وہ نماز کا قائم کرنا اور زکات کا دینا ہے۔ زکات اللہ کی مخلوق پر احسان کرنا ہے، اس شے کے ساتھ جو غنی پر فقیر کو دینا واجب کیا ہے، یعنی اپنے مال سے ذرا سا حصہ نکالنا سال بھر میں ضعیفوں اور حاجت مندوں کے لیے، چناں چہ سورت توبہ کی آیتِ زکات میں اس کا بیان تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔[1]

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ اللہ سے اعتضاد (مدد) و استعانت کرو، یعنی اس سے مدد چاہو اور اس پر بھروسا کرو، اس کے ساتھ قوی ہو جاؤ۔ ﴿ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ﴾ یعنی وہی تمھارا حافظ و ناصر و فتح یاب کرنے والا ہے تمھارے دشمنوں پر ﴿ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴾ یعنی اچھا ولی ہے اور اچھا مدد کرنے والا ہے دشمنوں سے۔ وہیب بن ورد (وهب بن الورد القرشي أبو عثمان المكي الزاهد عن عطاء فقيل مرسلا وثقه ابن معين و النسائي قال ابن حبان: مات سنه ۱۵۳، قول ميسور) نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو مجھے یاد کر جس وقت تو غصے ہو، تو میں تجھ کو یاد کروں گا جس وقت میں غصے میں ہوں گا، لہٰذا تجھ کو محق نہ کروں گا، ان میں جن کو محق کروں گا (محق باطل کردن و پاک کردن و کاہانیدن و سوختن گرما چیزے را و محقه الله أي ذهب ببر كته)۔ اور جب تو مظلوم ہو تو صبر کر اور میری نصرت کے ساتھ راضی ہو جا، کیوں کہ میری نصرت تیرے واسطے بہتر ہے تیری نصرت سے اپنی جان کے لیے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم والله أعلم)

پھر جب اللہ پاک جو بات الٰہیات سے متعلق تھی، اس کا ذکر کر چکا، پھر اس کا ذکر کیا جو نبوات سے متعلق تھی تو بعد اس کے جو شے شریعتوں اور احکام سے متعلق ہے، اس کا ذکر فرمایا۔ پہلے سب سے افضل عبادت اور اہم طاعت کی اُن کو تکلیف دی، یعنی نماز، پس فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا ﴾ مطلب یہ ہے کہ جو نماز تمھارے لیے مشروع کی ہے، اسے پڑھو اس لیے کہ نماز نہیں ہوتی مگر رکوع و سجود سے اور یہ دونوں سب سے بڑے رکن ہیں نماز کے، یا یہ معنی ہیں کہ تم اپنی نماز میں رکوع اور سجدہ کیا کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اسلام کے شروع میں لوگ رکوع کرتے تھے، سجدہ نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ حاصل یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ دونوں کرو۔ یہ قول تو شیخ زادہ نے نقل کیا ہے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اسلام کے شروع میں رکوع اور سجدہ دونوں نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ نماز رکوع اور سجود دونوں کے ساتھ ہو۔[3]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اعمال من جملہ ایمان نہیں ہیں اور یہ سجدہ نماز کے لیے

---

[1] رقم الآية (٦٠) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٣١٤۔ ٣١٦) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٢)

ہے نہ کہ تلاوت کے واسطے۔[1] یا یہ معنی ہیں کہ اللہ کے واسطے خضوع وفروتنی کرو اور اس کے لیے سجدے میں گرو، پھر عبادت کی جو قسمیں کہ نماز وغیرہ کو شامل ہیں اور اُن سے اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، اس کو لازمی کیا۔ پس فرمایا: ﴿ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ یعنی ساری عبادتیں جن کا اللہ پاک نے حکم دیا ہے اُن کو بجا لاؤ۔ یا یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک کی توحید کرو اپنے رکوع وسجود سے، اللہ پاک کی ذات کا قصد کرو نہ کہ بت کا، پھر جو شے معبود کی خدمت اور تعظیم کو شامل ہے اور اس کے خلق پر احسان کرنے کو عام ہے، اس سے مراد بھلائی کے کاموں سے اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنا ہے، جیسے کہ صلۂ رحم اور اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ لہٰذا اس کے ساتھ بندوں کو مکلّف کیا۔

پس فرمایا: ﴿ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ گویا اللہ پاک نے یوں فرمایا کہ تم کو نماز کی تکلیف دی گئی، پھر جو شے اس سے عام تر تھی اس کی تکلیف دی گئی، یعنی عبادت، پھر جو اس سے زیادہ عام تھی اس کا مکلّف کیا، یعنی خیرات۔ کلمۂ خیر عام تر ہے واجب اور مستحب طاعت سے۔ کسی نے کہا ہے کہ خیر سے مراد مندوبات (مستحبات) ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: چوں کہ ذکر کو اپنے سوا اور طاعت پر فضیلت اور شرف ہے، اس لیے مومنین کو پہلے نماز کی طرف بلایا، جو خالص ذکر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طٰہٰ: ١٤] ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔'' پھر نماز کے علاوہ دوسری عبادت کی طرف دعوت کی، جیسے: روزہ اور حج، پھر عموماً باقی خیر کے کاموں پر رغبت دلائی۔

پھر اس سب کی یہ علت بیان کی: ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾[2] فلاح آخرت کی نعمتوں پر کامیابی حاصل کرنے اور منصور ہونے کو کہتے ہیں، یعنی جس وقت تم یہ سب کام کرو گے تو فلاح کے اُمیدوار ہوگے۔ یہ جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ اُرْكَعُوْا ﴾ وغیرہ کے واو سے، یعنی تم اُن کاموں کو کرو اس حال میں کہ فلاح کی اُمید رکھنے والے ہو۔ ﴿ تَرْجِيْ ﴾ کا کلمہ ﴿ لَعَلَّكُمْ ﴾ اس لیے ذکر کیا ہے کہ اللہ پاک نے انسان کو جن اُمور کا مکلّف کیا ہے، اُن کے ادا کرنے میں کمی اور خرابی سے پاک بہت ہی کم رہتے ہیں، ضرور ہی اُن میں کچھ نہ کچھ نقصان رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اُن سے عہدہ برآ ہونے میں یقین پر نہیں ہے، یہاں تک کہ جو اُن کاموں کو بجا لائے تو ثوابِ موعود کے حاصل ہونے کا یقین ہو جائے، غرض کہ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جنت میں داخل ہونا کچھ اعمال پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ایسے امور ہیں کہ اللہ پاک نے شرعاً ہم کو ان کا مکلّف کیا ہے، رہا اُن کا قبول ہونا، لہٰذا یہ ایک اور شے ہے، اللہ پاک ہم پر اس کا تفضّل فرمائے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ذکر فرمایا ہے کہ یہ آیت من جملہ مواضع سجود تلاوت ہے امام شافعی رحمہ اللہ اور اُن کے موافقین کے

[1] تفسیر النسفي (٣/ ١١٤) [2] تفسیر النسفي (٣/ ١١٤)

نزدیک۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جو اُن کے قائل ہیں، اُن کے نزدیک یہ مقامات سجودِ تلاوت سے نہیں ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ سورت دو سجدوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔[1] یہ اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ کرنے کے ثبوت کی دلیل ہے۔ تلاوت کے سجدوں کی گنتی میں اختلاف ہے۔ اکثر اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ کل چودہ ۱۴ سجدے ہیں، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حج میں دو سجدے ہیں اور سورت صٓ کے سجدے کو ساقط کیا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سورۃ الحج میں ایک سجدہ ہے اور سورت صٓ کے سجدے کو ثابت کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ پندرہ سجدے ہیں۔ ایک قوم نے کہا کہ مفصل میں کوئی سجدہ نہیں ہے۔ پس اس بنا پر گیارہ سجدے ہوتے ہیں۔ سجودِ تلاوت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سنت ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک واجب۔ ان قولوں کی دلیلیں بجائے خود مبسوط (پھیلی ہوئی) ہیں۔[2]

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو سنامِ (کوہان) دین و اعظم اعمال ملتِ متین، یعنی دین کے اعلیٰ عمل کا حکم کیا، پس فرمایا: ﴿ وَجٰهِدُوْا فِي اللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ کی ذات میں اور اس کے واسطے جہاد کرو۔ اس سے مراد جہادِ اکبر ہے یعنی کفار سے لڑنا اور اُن کو دفع کرنا، جبکہ وہ مسلمانوں کے شہروں پر چڑھائی کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ جہاد سے مراد اُن امور کا بجا لانا ہے جن کا اگلی آیت میں امر کیا ہے یا عام طور سے تمام احکام کی بجا آوری اور ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کا حکم ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کے لیے اس کے دین کے ظاہری دشمنوں سے لڑو، جیسے: اہلِ زیغ اور باطنی دشمنوں سے، جیسے دل کی خواہش اور نفس۔[3]

(اس پر عبدالحکیم نے کہا ہے: اگر کوئی کہے کہ یہ بات اس کے خلاف ہے جو پہلے سورت کے شروع میں کہہ آئے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے، مگر چھے آیتیں، کیوں کہ جہاد کا حکم ہجرت کے بعد ہوا ہے تو ہم کہیں گے: ہوسکتا ہے کہ مراد دعوتِ دین پر ثابت قدمی ہو اور جو مشقتیں مشرکین سے لاحق ہوتی ہیں، اُن پر صبر و استقامت مراد ہو۔) نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ غزوۂ تبوک سے لوٹے تو فرمایا کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے۔[4] عبدالحکیم نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ کسی نے عرض کی کہ جہادِ اکبر کیا ہے؟ فرمایا: بندے کا اپنی خواہشات سے جہاد ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لڑائی کا حکم ہے، یا نفس اور خواہشات کا مقابلہ کرنے کا حکم ہے، یہی جہادِ اکبر ہے، یا ظالم امیر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔[5]

﴿ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ کے معنی ہیں، مبالغہ اس جہاد کا حکم کرنے میں، یعنی اپنی طاقت کو اس میں خوب خرچ کرو،

---

[1] اس حدیث کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] فتح البيان (٩/ ٨٧۔ ٨٨) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٢)

[4] الزهد الكبير للبيهقي (١/ ١٦٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٤٦٠)

[5] تفسير النسفي (٣/ ١١٤)

اس لیے کہ حق کو جہاد کی طرف مضاف کیا ہے، حالاں کہ اصل اضافت جہاد کی حق کی طرف ہے، یعنی ایسا جہاد کرو کہ خالص اللہ ہی کے واسطے ہو، لہٰذا مبالغے کے لیے اس کا عکس کیا ہے۔ (شیخ زادہ نے کہا: اصل معنی یہ ہیں: ”جاهدوا في الله تعالىٰ من أجله جهادا حق جهاد“ کا وصف حق سے کیا، اس سے یہ بات نکلی کہ اس جگہ ایک جہاد واجب ہے اور مطلوب اس کا بجا لانا ہے، پھر جب اس کا عکس کیا اور اضافت صفت کی موصوف کی طرف کی، اس کے بعد کہ اس کو اللہ کی طرف مضاف کیا تو اس سے ایسے جہاد کا اثبات ہوا جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور مطلوب اس کے واجب اور شرائط کے ساتھ قائم ہونا ہے، تمام وسعت اور طاقت کے بعد۔ یہ معنی اس وقت ہیں کہ حق کی اضافت مبالغے کے لیے جہاد کی طرف کی گئی، کیوں کہ صفت کی اضافت موصوف کی طرف اس لیے ہوتی ہے کہ اس بات پر دلالت کرے کہ اس سے مراد وہ شے ہے، جو اپنی شان اور حالت میں کامل ہے۔) محاورے میں بولتے ہیں: ”هو حق عالم وجد عالم“ یعنی وہ سچا پکا جید عالم ہے۔ نصب حق کا بنا بر مصدر ہے، کلمہ ﴿ فِي ﴾ کو حذف کر دیا ہے۔ گویا اصل یوں ہے: ”جهاداً حقا فيه و لأجله“۔ رہی جہاد کی ضمیر کی طرف اضافت تو یہ بطورِ اتساع (وسعت دینے) کے ہے، جس طرح کہ اس مصرع میں ہے۔ ع

ويوم شهدناه سليما وعامرا۔ أي شهدنا فيه

یعنی جس دن ہم حاضر ہوئے سلیم و عامر کے پاس۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اضافت میں ادنی ملابست و اختصاص کافی ہوتا ہے۔ یا اضافت اس لیے کی کہ جہاد اللہ پاک کے ساتھ مختص ہے، اس لحاظ سے کہ خاص اسی کی ذات کے لیے اور اسی کے واسطے کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈریں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس شے کا فارغ کر ڈالنا ہے جو ان کی وسعت اور طاقت میں ہے، اللہ پاک کے دین کے زندہ کرنے میں۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ”چناں چہ جہاں تک تمھاری استطاعت ہو تم اللہ سے ڈرو۔“ جس طرح کہ ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آل عمران: ١٠٢] ”اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔“ اس سے منسوخ ہے، لیکن اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ تکلیف قدرت کے ساتھ مشروط ہے، پس نسخ کی طرف جانے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔[1]

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مجھ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہم پڑھتے نہ تھے، جس میں کہ پڑھتے تھے: ”وجاهدوا في الله حق جهاده في آخر الزمان كما جاهدتم في أوله“، میں نے کہا: ہاں اے امیرالمومنین! یہ پھر کب ہوگا، فرمایا: جبکہ بنی اُمیہ امیر ہوں گے اور بنی مغیرہ وزیر۔

[1] فتح القدير (٣/ ٦٤٠)

(وأخرجه البيهقي في الدلائل عن المسور بن مخرمة قال: قال عمر لعبد الرحمن بن عوف فذكره)[1] فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مجاہد وہ شخص ہے کہ اپنے نفس سے مجاہدہ کرے اللہ کی اطاعت میں۔[2] (أخرجه الترمذي وصححه ابن حبان و ابن مردوية والعسكري في الأمثال)

پھر اللہ پاک نے شانِ مکلفین کی تعظیم کی اور یوں ارشاد فرمایا: ﴿ هُوَ اجْتَبٰكُمْ ﴾ یعنی اللہ نے اپنے دین اور نصرت کے لیے تم کو پسند کیا ہے۔ اس میں اُن کی بہت بڑی بزرگی ہے اور تنبیہ ہے اس بات پر جو کہ جہاد کی مقتضی ہے اور اس کی طرف دعوت دینے والی ہے، یعنی یہ جملہ مستانفہ ہے امر بالجہاد کی علت بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے، کیوں کہ دین کی نصرت نہیں ہوتی، مگر اس کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے سے، چوں کہ بعض حالات میں اس حکم میں نفس پر سختی تھی، اس لیے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ یعنی اللہ پاک نے دین میں کوئی تنگی اور شدت نہیں رکھی ہے۔ یہ جرح جس کو اللہ نے دور کیا ہے، اس مین علما کا اختلاف ہے۔ لہٰذا کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ اللہ پاک نے دو دو تین تین چار چار عورتیں حلال کر دی ہیں اور ملکِ یمین، یعنی لونڈیاں۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز کا قصر اور روزے کا افطار ہے مسافر کے لیے اور جو شخص اشارے کے سوا اور طرح پر قدرت نہیں رکھتا، اس کو حکم ہے کہ اشارے سے نماز ادا کرے۔ لنگڑے، اندھے اور بیمار سے جہاد ساقط کر دیا ہے۔ ضرورت کے وقت مردار کا کھانا مباح فرمایا ہے۔ چاند کے اختلاف کی وجہ سے روزوں کی تقدیم و تاخیر میں جو خطا ہوتی ہے اس کو معاف کیا ہے۔ اسی طرح عید و بقرعید میں بھی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو شے اُن پر شاق گزرتی ہے، اس کی تکلیف دے کر ان پر تنگی نہیں رکھی، بلکہ اُن کو ایسی بات کی تکلیف دی جس کی وہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور جن تکالیف میں حرج تھا اُن کو ان سے دور کر دیا، لہٰذا اُن کو ان کے ساتھ متعبد (لازمی) نہیں کیا، جس طرح کہ بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ متعبد کیا تھا۔ کسی نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ بندوں کے لیے گناہ سے نکلنے کا راستہ مقرر کر دیا، مثلاً: توبہ کا دروازہ کھول دیا، استغفار کو قبول کر لیا، جس میں کفارہ و ارش مشروع ہے اس میں کفارہ دینا ٹھہرا دیا، یا جنایات (گناہ کرنا۔ قصور) میں قصاص مقرر کر دیا، یا غصب میں مال کا لوٹا دینا، یا اس کا مثل، یا اس کی قیمت ادا کر دینا قرار دے دیا اور اسی طرح دوسرے احکام۔

پس دینِ متین اسلام میں ایسی کوئی شے نہیں کہ بندہ اس میں گناہوں اور سزاؤں سے خلاصی پانے کی طرف راہ نہ پائے۔ کسی نے کہا ہے کہ دین سے مراد توحید ہے اور اس میں کسی طرح کا حرج نہیں، بلکہ اس میں تخفیف اور آسانی ہے، کیوں کہ جو کچھ شرک وغیرہ کیا ہو، گو زمانۂ دراز کیوں نہ گزر گیا ہو، اس سب کو توبہ دفعتاً مٹا دیتی ہے اور اس کا بجا

[1] الدر المنثور (٦/ ٧٨) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٢١) صحيح ابن حبان (١٠/ ٤٨٤) صحيح الجامع (٦٦٧٩)

لانا کسی زمان و مکان پر موقوف نہیں ہے۔ تفسیر قرطبی میں مذکور ہے، [1] علما نے فرمایا ہے کہ حرج کا دور کرنا اسی شخص کے واسطے ہے جو کہ شریعت کی شاہراہ پر استقامت پذیر ہے اور بال برابر اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتا، بلکہ راحت و تکلیف میں اسی پر قائم و دائم ہے۔ رہے چور اور بدکار جو اللہ کی حدوں کو توڑنے والے ہیں یا جن پر شرعی حدود لاگو ہوتی ہیں تو اُن پر حرج ہے، خود انھوں نے ہی دین سے علاحدگی کر کے اپنی جانوں پر اس کو رکھا ہے، شرع میں اس سے بڑھ کر کوئی حرج نہیں ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک آدمی کے ثابت رہنے کو دو آمیوں کے واسطے لازم کیا ہے، لیکن صحت یقین و پکے عزم کے ساتھ، یہ بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ انتهى۔

پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ آیتِ باب اس سے عام تر ہے، بلاشک تمام تکالیف میں سے جس تکلیف میں اس کے بندوں پر سختی تھی تو اللہ پاک نے وہ تکلیف دور فرما دی، یا تو اصل ہی سے اس کو ساقط کر دیا اور اس کا مکلّف ہی نہیں کیا، جس طرح کہ اس امت کے سوا اور اُمتوں کو اس کے ساتھ مکلّف کیا، یا اس میں تخفیف کر دی، یا پھیر کر اس کا ایک ایسا متبادل تجویز کیا، جس میں کسی طرح کی مشقت نہیں۔ یا گناہ سے خلاص ہونے کی مشروعیت اس وجہ سے کی جس کو اللہ نے مشروع کیا ہے۔ یہ آیتِ شریفہ کیا نافع ترین آیت ہے اور کیا اچھا موقع ہے اور کتنا بڑا فائدہ ہے، اسی کے مثل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ”چناں چہ جہاں تک تمھاری استطاعت ہو تم اللہ سے ڈرو۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥] ”اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔“ نیز فرمایا: ﴿ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٨٦] ”اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں وہ ہم سے نہ اٹھوا۔“

حدیثِ صحیح میں مروی ہے کہ اللہ پاک نے ”قد فعلت“ فرمایا ہے۔ [2] یعنی میں نے کر دیا جس کی تم نے دعا کی، چناں چہ اس کا بیان اس آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ اس بارے میں حدیثیں بہت سی ہیں۔ بعض حدیثیں جو اس آیت کی تفسیر سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کا پوچھا: ﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ فرمایا: « اَلضِّيْقُ » یعنی حرج سے مراد تنگی ہے۔ [3] (أخرجه ابن جرير والحاكم وصححه و ابن مردوية) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: کیا دین میں ہم پر کچھ حرج نہیں ہے کہ ہم چوری کریں یا زنا کریں؟ ”قال: بلی“ یعنی فرمایا: ہاں حرج ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر یہ آیت کیا

---

[1] تفسير القرطبي (١٢/ ١٠٠۔ ١٠١) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٦)

[3] تفسير الطبري (١٨/ ٦٨٩۔ ٦٩٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٢٤) اس کی سند میں ”حکم بن عبداللہ ایلی“ ضعیف راوی ہے۔

ہے؟ فرمایا: وہ اصر جو بنی اسرائیل پر تھا، اس کو تم سے موقوف کر دیا۔ (أخرجه ابن أبي حاتم عن محمد) **سیدنا عبداللہ** بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ﴿مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ "توسعة الإسلام ما جعل الله من التوبة والكفارات"[1] (أخرجه ابن أبي حاتم من طريق ابن شهاب) **یعنی اس آیت سے مراد اسلام کی وسعت ہے** کہ اس نے توبہ اور کفارے مقرر کر دیے ہیں۔

امام سعید بن منصور، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے بطریق عثمان بن یسار عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ یہ رمضان کے چاند میں ہے، جب کہ لوگ اس میں شک کریں اور حج میں ہے جس وقت کہ بقرعید وعید میں شک کریں اور اُن کے اشباہ میں۔ سعید بن منصور، عبد بن حمید اور ابن منذر نے سعید بن جبیر کے طریق سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے حرج کا حال پوچھا تو فرمایا کہ میرے واسطے ہذیل کا ایک شخص بلا لا، پس وہ اُن کے پاس آیا تو پوچھا کہ تم میں حرج کیا ہے۔ اس نے کہا: "حَرَجَه" درختوں میں سے وہ درخت ہے جس میں مخرج نہیں ہے، اس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ شے ہے کہ جس کے لیے مخرج نہیں ہے۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کسی نے اُن سے حرج کا پوچھا تو فرمایا: یہاں کوئی ہذیل کا آدمی ہے؟ ایک بولا: میں ہوں۔ پس فرمایا: تو "حرجه" کو کیا شمار کرتے ہو؟ کہا: تنگ چیز۔ فرمایا: وہ یہی ہے۔[2] (أخرجه سعيد بن منصور و ابن المنذر والبيهقي في سننه من طريق عبيد الله بن أبي يزيد) امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں محمد بن زید بن عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی، فرمایا کہ میرے لیے ایک شخص بنی مدلج کا بلا لاؤ۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم میں حرج کیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ ضیق، یعنی تنگی۔[3]

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ میں ملت کا نصب بنا بر مصدر ہے، یعنی مفعول مطلق ہے، اس فعل کا جس پر اس کا ماقبل دال ہے۔ "أي وسع عليكم دينكم توسعة ملة أبيكم إبراهيم"[4] (قاله الزمخشري) (امام سمین رحمہ اللہ نے اس وجہ کو اظہر الوجوہ کہا ہے۔) یعنی اللہ پاک نے تمھارے دین کو تم پر وسیع و فراخ کر دیا تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت وسیع کرنے کی طرح۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "اتبعوا ملة أبيكم إبراهيم"[5] مطلب یہ کہ فعل محذوف کا مفعول بہ ہے، یعنی تم پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی۔[6] (قاله الحوفي وتبعه أبو البقاء) امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: منصوب ہے بنا بر تقدیر کاف "أي كملة أبيكم إبراهيم"[7] کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "وافعلوا الخير كفعل أبيكم إبراهيم" یعنی تم بھلائی کرو اپنے باپ ابراہیم کے کرنے کی طرح۔ ملت کو فعل کے مقام میں قائم کر دیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نصب بنا بر اغرا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٦) [2] الدر المنثور (٦/ ٧٩) [3] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ١١٢)
[4] الكشاف (٣/ ١٧٥) [5] معاني القرآن (٣/ ٤٤٠) [6] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٩٤٩) [7] تفسير القرطبي (١٢/ ١٠١)

بنا بر اختصاص، یعنی "أعني بالدین ملة أبیکم" امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام سدی رحمہ اللہ سے ﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ "دین أبیکم"۔[1]

اللہ پاک نے جو ابراہیم علیہ السلام کو ان کا باپ قرار دیا، اس لیے کہ وہ قاطبتاً عرب کے باپ ہیں اور اس واسطے کہ غیر عرب کے نزدیک، جو اُن کی ذریت سے نہ تھے، حرمتِ عظیم تھی، جیسے حرمت باپ کی بیٹے پر ہوتی ہے، کیوں کہ وہ اُن کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہیں تو گویا اُن کی اُمت کے باپ ہوئے، اس لیے کہ رسول کی اُمت اس کی اولاد کے حکم میں ہوتی ہے، چناں چہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِنَّمَا أَنَا لَکُم مِثْلُ الْوَالِدِ»[2] یعنی میں جو تمھارے واسطے ہوں، سو مثل باپ کے ہوں۔

﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی پہلی کتابوں میں ﴿ وَفِيْ هٰذَا ﴾ یعنی قرآن شریف میں۔ ﴿ سَمّٰىكُمْ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ امام محلی اور نسفی رحمہما اللہ نے اسی پر اکتفا کیا ہے، اس کی دلیل سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے: "اللہ سماکم"۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے تمھارا نام مسلمین رکھا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل۔ ﴿ وَفِيْ هٰذَا ﴾ یعنی اُن کے حکم میں یہ ہے کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے، وہ مسلم ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول علماے اُمت کے قول کے خلاف ہے۔[4]

پھر اللہ پاک نے مسلم نام رکھنے کی یہ وجہ ذکر فرمائی: ﴿ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی اس لیے کہ قیامت کے دن رسول تم پر گواہ ہو جائے اس بات کا کہ اس نے اللہ کی رسالت تم کو پہنچا دی۔ ﴿ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ اور تم لوگوں پر اس بات کے گواہ ہو جاؤ کہ رسولوں نے اپنی اُمتوں کو رسالت پہنچا دی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لِيَكُوْنَ ﴾ متعلق ہے ﴿ سَمّٰىكُمْ ﴾ سے۔[5] امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: دونوں وجہوں پر، یعنی ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہو یا ابراہیم علیہ السلام کی طرف، حرفِ لام عاقبت کے واسطے ہے، کیوں کہ تعلیل یہاں ظاہر نہیں ہے، جس طرح کہ کہا ہے، ظاہر بات یہ ہے کہ تعلیل سے کوئی مانع نہیں ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے یا ابراہیم علیہ السلام نے جو ان کا نام مسلمین رکھا، اس نام رکھنے نے اُن کے اسلام و عدالت کا حکم کیا اور یہ سبب ہے قبولِ شہادتِ رسول کے اور رسول اُن میں بدخولِ اولیٰ داخل ہے اور سبب ہے اس اُمت کی شہادت دوسری اُمتوں پر قبول ہونے کا۔[6]

گازرونی کا بیان یہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ اُن کا نام مسلمین رکھنا اُن پر رسول کی شہادت کا سبب نہیں ہے،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٨) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣١٣) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٢٣٤٦)

[3] تفسیر الجلالین (١/ ٤٤٥) تفسیر النسفي (٣/ ١١٥) [4] تفسیر القرطبي (١٢/ ١٠١)

[5] تفسیر البیضاوي (٤/ ١٤٤) [6] حاشیة الشهاب علیٰ تفسیر البیضاوي (٦/ ٣١٧)

شہادت کا سبب تو خود اُن کا اسلام ہے تو کہیں گے کہ اللہ پاک نے جو اُن کا نام مسلمین رکھا، اس نے اُن کے اسلام کا حکم کیا، اُن کے موجود ہونے کے وقت، لہٰذا حقیقت میں یہی نام رکھنا اُن کے اسلام کا سبب ہے۔ اگر کوئی کہے کہ نبی کریم ﷺ کا اپنی اُمت پر اس بات کی گواہی دینا کہ انھوں نے اُن کو رسالت پہنچا دی، پس یہ اپنے واسطے گواہی ہوئی، پھر قبول کیوں کر ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس واسطے مقبول ہوگی کہ آپ معصوم ہیں۔ اور یوں بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی تعدیل اپنی اُمت کے واسطے، چوں کہ اس بات پر موقوف ہے کہ آپ نے رسالت پہنچا دی اور یہ بات نہ ہوئی مگر آپ ﷺ کی گواہی سے، اس لیے وہ تعدیل حقیقت میں آپ ﷺ کی ذات کے واسطے گواہی ہے اور باوجود اس کے وہ مقبول ہوئی آپ ﷺ کی عصمت کے سبب سے۔ اور جبکہ آپ ﷺ کی گواہی اپنی مومن اُمت کے حق میں بمعنی تعدیل ہے تو ظاہر یوں تھا کہ ﴿ عَلَيْكُمْ ﴾ کے عوض "شهيدا لكم" فرمایا جاتا، مگر چوں کہ آپ اپنی اُمت پر مثل رقیب مہیمن کے ہیں، اس لیے شہادت کو بکلمہ ﴿ عَلَى ﴾ متعدی کیا، کیوں کہ ﴿ عَلَى ﴾ کبھی بہ معنی لام مستعمل ہوتا ہے، جس طرح کہ ﴿ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾ [المائدۃ: ۳] میں ہے۔ كذا في زاده.

پھر اللہ پاک نے اُن کو اسلام کے اعظم ارکان کا حکم کیا، پس ارشاد فرمایا: ﴿ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ خاص کر اُن دو کو اس لیے ذکر کیا کہ اُن کا شرف زیادہ ہے، کیوں کہ نماز تو اشرف اعمالِ بدنیہ ہے اور زکات اشرف اعمالِ مالیہ۔ امام محلی رحمہ اللہ نے چوں کہ "اركعوا و اسجدوا" کے معنی "صلوا" پسند کیے تھے، اس لیے یہاں ﴿ اقيموا الصلوة ﴾ کے معنی "دَاوِمُوا" لکھے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے رکوع و سجود کو اپنے معنی پر رکھا تھا، اس لیے "أقيموا الصلاة بواجباتها و آتوا الزكوة بشرائطها" فرمایا۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے: "فتقربوا إلى الله بأنواع الطاعات لما خصكم بأنواع الفضل والشرف"[3] یعنی اللہ پاک نے تم کو انواع و اقسام کے فضل و شرف کے ساتھ خاص کیا تو تم انواعِ طاعات کے ساتھ اس کی طرف تقرب کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اول ﴿ اِجْتَبٰكُمْ ﴾ اور ﴿ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ فرمایا ہے۔ اس کے بعد ﴿ فَأَقِيمُوا ﴾ لہٰذا حرفِ فا کے ساتھ یہ تفریع یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ "اجتبا و تسمیه" اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب کے واجب ہونے کی وجہ ہیں، مختلف قسم کی طاعات کے ساتھ، یعنی جب اللہ پاک نے تم پر طرح طرح کے انعامات کیے اور تم کو عزت و آبرو اور شرف عطا کیا تو تم کو چاہیے کہ تم بھی طرح طرح کی طاعتیں کر کے، عبادتیں بجا لا کر اس کا تقرب حاصل کرو۔

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ پاک کو اپنا بچاؤ ٹھہراؤ اس شے سے جس سے تم خوف و خطر رکھتے ہو اور ڈرتے ہو اور اپنے سارے امور میں اس کی طرف پناہ پکڑو اور اسی سے اعانت اور نصرت طلب کرو۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "وثقوا به و توكلوا عليه لا بالصلاة والزكاة"[4] یعنی اس پر وثوق اور توکل کرو نہ کہ نماز اور زکات پر۔

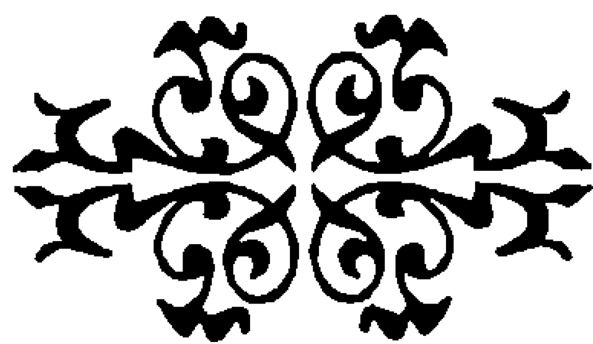
[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٤٤۔ ٤٤٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ١١٥) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٤۔ ١٤٥) [4] تفسير النسفي (٣/ ١١٥)

کسی نے کہا ہے کہ "تمسکوا بدین الله"، یعنی اللہ کے دین کو خوب مضبوط پکڑو۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے رب سے اس بات کی دعا کرو کہ اپنے دین پر تم کو ثابت رکھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اعتصام کتاب وسنت کے ساتھ تمسک ہے۔ ﴿هُوَ مَوْلٰكُمْ﴾ یعنی وہ تمھارا ناصر ومتولی اُمور ہے، چھوٹے بڑے سب کا۔ ﴿فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ پس کیا اچھا مولی ہے وہ اور کیا اچھا تمھارا مددگار ہے وہ، یعنی تمھارے اُمور کی ولایت میں اور تمھارے دشمنوں پر نصرت دینے میں اس کا کوئی مماثل اور نظیر نہیں ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ ولایت ونصرت میں اللہ پاک کا مثل کوئی نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں اس کے سوا نہ کوئی مولا ہے نہ ناصر۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ﴿نِعْمَ الْمَوْلٰى﴾ اس لحاظ سے ہے کہ تمھاری نافرمانی کے باعث تمھاری روزی تم سے نہیں روکی اور ﴿نِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ اس لحاظ سے ہے کہ تمھاری طاعت پر تمھاری اعانت کی، بے شک جس کا وہ مولیٰ و ناصر ہے اس نے فلاح پائی اور مراد کو پہنچا۔[2] والله سبحانه أعلم بالكتاب وهو الموفق بالصواب.

بیسویں تاریخ ماہِ شوال ۱۳۱۰ھ ہجری کو محلّہ امیر گنج شاہ جہان آباد میں بروز یکشنبہ بوقت زدن ہشت ساعت روز یہ تفسیر تمام ہوئی۔

الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، ختم الله لنا بالحسنٰى، وأذاقنا حلاوة رضوانه الاسنىٰ وصلى الله علىٰ سيد العالمين سيدنا محمد رسول الله صلى الله عليه وآله وصحبه وبارك وسلم، آمين يارب العالمين.

۲۲ر ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ ہجری سے اس سورت کی تفسیر کا لکھنا شروع ہوا تھا، سو آخر ماہِ صفر تک تحریر جاری رہی۔ پھر شروع ربیع الاوّل سے بہ سبب امراض تحریر ملتوی رہی ۱۱ر شعبان ۱۳۱۰ھ ہجری سے پھر تحریر شروع ہوئی تو ۲۰ ماہِ شوال کو اللہ پاک کے فضل وکرم سے سورت تمام ہوگئی، اس حساب سے مدتِ تحریر اس سورت کی چار مہینے اٹھارہ دن ہوتے ہیں، اس میں بھی اگر غور سے اصل مسودہ کے جز کے شروع کی تاریخ دیکھی جائے تو اور بھی ایام کم ہوں گے، کیوں کہ بعض اُمور ضروریہ کی وجہ سے تحریر میں انقطاع آ گیا تھا۔



[1] تفسير البيضاوي (٤/ ١٤٥) [2] تفسير النسفي (٣/ ١١٥)